ملتان — دائم آباد
(ملتان۔ تاریخ، ادب، ثقافت اور تصوف)
خلیل احمد

ملتان ــــ دائم آباد

(ملتان۔تاریخ،ادب،ثقافت اور تصوف)

مرتب:

خلیل احمد

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

نام کتاب : ملتان ــــ دائم آباد
(ملتان۔ تاریخ، ادب، ثقافت اور تصوف)
مرتب : خلیل احمد
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : فکشن ہاؤس لاہور
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت : 2014ء
قیمت : -/1600 روپے

تقسیم کار:
کتاب نگر: حسن آرکیڈ ملتان کینٹ، فون: 061-4510444
فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 62- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس
لاہور ● حیدر آباد ● کراچی
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

ملتان سے محبت کرنے والوں کے نام

فہرست

تاریخ

تصوف

ادب

ثقافت

مَیں اور میرا ملتان

یادوں کے دریچے میں جب اپنا بچپن دیکھتا ہوں تو اندرون دہلی گیٹ گلی کمنگراں والی کے قریب اپنے آبائی گھر پہنچ جاتا ہوں۔ پانچ کمروں پر مشتمل اس گھر میں ایک چھوٹا سا صحن بھی ہوا کرتا تھا جہاں پر نہ تو کوئی پودا اور نہ ہی کوئی سایہ تھا۔ دومنزلہ اس گھر کا کل اثاثہ میری بی بی جی (نانی اماں)، میاں جی (نانا ابو)، والدین، بھائی اور بہنیں تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گھروں میں اتنی گرمی نہ ہوتی تھی۔ ایئر کنڈیشنر اور ایئر کولر کا کہیں پر تصور نہ تھا۔ رات کو سونے کے لیے چھت پر چارپائیاں بچھا کر پانی کا چھڑکاؤ کر کے ہم سو جاتے۔ جس رات زیادہ گرمی ہوتی اُس رات ہماری چارپائیوں کے قریب ایک پرانا سا پیڈسٹل فین ساری رات ہمیں ہوا دیتا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے چھت پر ہی ریڈیو ملتان سے بچوں کی کہانی سنے بغیر ہم نیند کی وادی میں نہیں جاتے تھے۔

اُس زمانے میں ہمارے گھر میں صبح کا منظر بہت ہی دلفریب ہوتا تھا۔ تہجد کے وقت میاں جی اور بی بی جی اُٹھ کر مصلے پر کھڑے ہو جاتے اور پھر دیر تک عبادات میں مصروف رہتے۔ ہماری چارپائیاں دوسری منزل کی چھت پر ہوتی تھیں جبکہ بی بی جی اور میاں جی پہلی منزل کی چھت پر بیٹھ کر تلاوت کرتے تھے۔ اُن کی قرأت کی آواز پہلی اور دوسری منزل تک جاتی تھی جس سے ہمیں اس بات کی اطلاع ہو جاتی کہ صبح ہوگئی۔ کیا بھلا زمانہ تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے ہی ہماری آنکھ کھل جاتی تھی اور اب یہ دور آ گیا ہے کہ جب سورج نکلنے میں تین چار گھنٹے رہ جائیں ہم سونے کے لیے بستر پر جاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیمی اداروں میں جمعے کی چھٹی ہوا کرتی تھی اور جمعے کی صبح ہمارے ہمسائے کے گھر سے نامور قوال عزیز میاں کی قوالی ''شرابی مَیں شرابی'' کی آواز سے ہمیں یہ معلوم ہو جاتا آج جمعۃ المبارک ہے اور چھٹی ہے۔

گھر میں صبح کا آغاز نماز کے فوراً بعد ناشتے سے ہوتا تھا۔ عام طور پر یہ ناشتہ گھر میں تیار کیا جاتا تھا۔ توے کا پراٹھا اور رات کا بچا ہوا سالن ہمارا پسندیدہ ناشتہ ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھار حسین آگاہی کے چنے، حلوہ پوری اور مرغ چنے گھر میں آتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے آج ہماری خوب تواضع ہو رہی ہے۔

ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مسلم ہائی سکول میں حاصل کی۔ جہاں مَیں اپنے بڑے بھائی وحید الرحمٰن کے ساتھ موٹر سائیکل پر جایا کرتا تھا۔ وحید بھائی کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے میٹرک تک مجھے سکول لے جانے اور لانے

کی ذمہ داری پوری کی اور اسی زمانے میں ہی مجھے موٹر سائیکل چلانے کا شوق ہوا جو آج بھی ہیوی بائیکس چلانے کی صورت میں میرے ساتھ چل رہا ہے۔

ہمارے گھر کی سب سے اہم شخصیت بی بی جی ہوا کرتی تھیں۔ جنہوں نے ملتان کے ہزاروں بچے اور بچیوں کو قرآن پاک پڑھایا۔ جبکہ میاں جی نے بھی اپنے شاگردوں کو قرآن کی تعلیم دی لیکن اپنے کاروبار کی وجہ سے وہ اس شعبے کی طرف زیادہ وقت نہ دے سکے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ملتان میں سب سے پہلے ملتانی سوہن حلوے کی دکان انہوں نے اندرون دہلی گیٹ اور گلی کمنگراں والی کے درمیان قائم کی جو ملتانی سوہن حلوے کی پہلی دکان تھی۔ دکان کے قریب ہی محلہ شاہ دانا شہید کے قریب ایک چھوٹے سے کارخانے میں لکڑیوں کے چولہے پر حلوہ تیار کیا جاتا اور اسی روایت کو لے کر ہمارا خاندان اب تک اسی کاروبار سے وابستہ ہے۔

گھر میں سب سے چھوٹا نواسہ ہونے کی وجہ سے مَیں میاں جی اور بی بی جی کی آنکھ کا تارا تھا۔ بی بی جی کی کوشش ہوتی تھی کہ مَیں کھیلوں تو اُن کے ساتھ۔ وہ مجھ سے باتیں کم اور قرآن زیادہ پڑھانے کی کوشش کرتیں۔ میری والدہ ماجدہ مجھے بتاتی ہیں کہ مَیں اکثر کھیلتے کھیلتے بی بی جی کے کندھوں پر سوار ہو جاتا یا وہ لیٹی ہوتیں تو ان کے پیٹ پر بیٹھ جاتا اور وہ مجھے کبھی بھی منع نہیں کیا کرتی تھیں۔ بس ان کی خواہش تھی کہ مَیں جب پہلا لفظ بولوں تو 'اللہ' بولوں۔ ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی یوں بی بی جی کی وجہ سے مَیں نے جو پہلا لفظ توتلی زبان سے بولا وہ 'اللہ' ہی تھا۔

بھلا وقت تھا شہر میں مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا عید میلاد النبی ﷺ، محرام الحرام اور عیدین مل کر مناتے تھے۔ مجھے اب بھی یاد ہے جس زمانے میں محرام الحرام سردیوں میں آتا تھا شبِ عاشور حیدری کمیٹی الگ دولت گیٹ سے ایک جلوس برآمد ہوتا تھا۔ جلوس کے شرکاء کے لیے نیاز کی کھیر بی بی جی اپنے ہاتھوں سے بناتی تھیں۔ اس رات بی بی جی کے پاس پڑھنے والے بچے اور بچیوں کو چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ شبِ عاشور تمام بچے مل کر گرم گرم کھیر ٹھنڈی ٹھنڈی ٹھوٹھیوں میں ڈالا کرتے تھے اور جیسے ہی حیدری کمیٹی کا جلوس ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتا تو تمام بچے عزادارانِ امام حسینؑ کو اپنے ہاتھوں سے نیاز تقسیم کرتے اور پھر ہر بچے کو بی بی جی کی طرف سے ہدایت ہوتی تھی کہ کوئی بھی شخص بغیر کھیر کے نہ جائے۔ بی بی جی خود اور بچوں سے ذوالجناح کی زیارت کراتیں اور دُعا مانگتیں۔ اُسی زمانے میں ہمارے ہمسائے میں دودھ فروش اللہ بخش جلوس کے شرکاء کے لیے کشمیری چائے بنا کر ان کو پیش کرتا تھا۔ جو لوگ جلوس میں شریک نہیں ہوتے تھے وہ اپنے گھروں کے جھروکوں میں کھڑے ہو کر دُعا اور منتیں مانگتے۔ اسی طرح دس محرم الحرام کو ہمارے گھر کے سامنے سے دو تعزیے گزرا کرتے تھے اور جب تک میاں جی زندہ رہے وہ جلوس کے شرکاء کے لیے دودھ کی سبیل لگاتے تھے جبکہ بی بی جی اپنی روایت کے مطابق کھیر کی ٹھوٹھیاں دس محرم کو بھی تقسیم کرتی تھیں۔

عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر پورا محلہ سجایا جاتا۔ جگہ جگہ ٹیپ ریکارڈرز پر نعتیں اور قوالیاں لگائی جاتیں۔ بچے اور بڑے عربی لباس پہن کر گیلانی خاندان کے جلوس میں شریک ہوتے۔ چاولوں کی دیگیں تقسیم کی جاتیں اور رات کو گھروں اور بازاروں میں چراغاں دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ نکل آتے۔ اُس زمانے میں عیدین کی نماز ہم

قلعہ کہنہ قاسم باغ حضرت بہاء الدین زکریا کے دربار میں پڑھنے جاتے تھے۔ گلی کمنگراں والی سے پیدل ہی براستہ حسین آ گاہی ہم قلعے کی طرف جب روانہ ہوتے تو اہلِ محلہ کی ایک بڑی تعداد میاں جی کے ہمراہ ہوتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چاند رات کو ہم ابا جی کے ساتھ جا کے حسین آ گاہی بازار سے جوتیاں خریدتے۔ عید کی صبح ہمیں نئے نوٹوں کی عیدی دی جاتی جن کو خرچ کرنے کے لیے ہم گھر میں فضول فضول چیزیں لے آتے جس پر والدین سے ڈانٹ بھی پڑتی۔

مسلم ہائی سکول میں پڑھنے کے دوران ایک مرتبہ اُردو کے ماسٹر مرحوم عبداللہ صاحب نے کہا کہ مجھے بتایا جائے کہ آپ میں سے کن بچوں کو اخبار اور کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ مَیں نے بے دھیانی میں ہاتھ کھڑا کر دیا۔ ہاتھ کھڑا کرنے کے بعد جب مَیں نے پوری کلاس پر نظر دوڑائی تو مَیں اکیلا ہی ہاتھ بلند کیے کھڑا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے کونسی کتاب پڑھی ہے اور کونسا اخبار پڑھتے ہو؟ تو بے ساختہ مَیں نے جواب دیا ’روزنامہ امروز‘ میرے گھر آتا ہے اور ماہنامہ ’تعلیم و تربیت‘ اور ’نونہال‘ مَیں باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ انہوں نے مجھے شاباش دی لیکن مَیں دل ہی دل میں خوب شرمندہ ہوا کہ مَیں نے تو کبھی نہ امروز اخبار پڑھا تھا اور نہ ہی بچوں کا کوئی رسالہ۔ گھر میں میرا شوق مختلف قسم کے پرندے پالنا تھا۔ میری اکثر جیب خرچی انہی پرندوں پر صَرف ہوتی تھی۔ ایک دن مَیں چوزے لینے گیا تو وہ دکان بند تھی۔ سامنے ہی مجھے ”گوشۂ ادب“ کے نام سے ایک بک سٹال نظر آ گیا۔ جہاں پر ایک نورانی چہرے والے بزرگ کھڑے تھے مسکراتے ہوئے انہوں نے مجھ سے پوچھا بیٹا کیا چاہیے؟ مَیں نے کہا مجھے بچوں کا کوئی ناول پڑھنا ہے۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں اشتیاق احمد کا ناول ’انسپکٹر جمشید سیریز‘ تھما دیا۔ مَیں چوزے کی بجائے وہ ناول لے کر گھر آیا۔ ماسٹر صاحب کی ہدایت کو ذہن میں رکھا، اسے پڑھنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ اس انداز سے چلا کہ پھر مظہر کلیم کی عمران سیریز کو مَیں نے خریدنا شروع کیا۔ اُس دور میں امروز ملتان کا بچوں کا صفحہ منگل کو آیا کرتا تھا۔ وہ اخبار خرید کر گھر لاتا یوں آہستہ آہستہ میرے اردگرد کتابوں کا ہجوم ہو گیا۔ اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ گھر میں میرے پرندے کم ہونے لگے اور کتابیں بڑھنے لگیں۔ کتابوں کے شوق نے میرے نصابی شوق کو بھی مہمیز کیا۔ یوں نصابی کتب کے علاوہ مَیں غیر نصابی کتب میں بھی دلچسپی لینے لگ گیا۔ اخبار، کتابیں اور بک سٹال میری پسندیدہ جگہ ہوا کرتے تھے۔ کبھی مَیں گھنٹہ گھر کے باہر ایک کھوکھے سے کتاب خریدتا تو کبھی اخبار لینے کے لیے چوک دولت گیٹ چلا جاتا۔ کینٹ میں کاروان بک سنٹر میری پسندیدہ جگہ ٹھہری۔ اسی طرح لاہور جب بھی جانا ہوتا تو فیروز سنز جائے بغیر میرا چکر پورا نہ ہوتا۔ جو سلسلہ اشتیاق احمد کے ناول سے شروع ہوا وہ آج بھی جاری و ساری ہے۔

گھر کے تمام لوگ کھانے پینے کے بہت شوقین تھے لیکن مجھے باہر کے کھانے شروع سے ہی پسند رہے۔ جمعرات کی رات مَیں اپنے دوستوں کے ساتھ دہلی گیٹ ملتان میں ارشاد احمد کی دیسی مرغ کڑاہی کھانے جایا کرتا تھا۔ آج کل ارشاد احمد کی دکان دولت گیٹ کے قریب امام بارگاہ حسین آباد کے ساتھ ہے۔ اب وہاں جا کر کھانے کی بجائے گھر میں پارسل منگوا لیتا ہوں۔ لیکن میرے دور کے بچے فارمی چکن شوق سے کھاتے ہیں ان کو سینڈوچ، برگر اور

پیزا پسند ہیں۔ مَیں آج بھی سویٹ ڈش کی جگہ پر قلفی کو ترجیح دیتا ہوں۔ یا بہت دل کرے تو والدہ ماجدہ سے کھیر بنانے کا کہتا ہوں اور وہ کھیر بھی مٹی کی ٹھوٹھی میں کھاتا ہوں کہ اس طرح اس کھیر میں بی بی جی کا ذائقہ آ جاتا ہے۔ اور مَیں کئی سال پیچھے شبِ عاشور کو یاد کرتا ہوں جب گلی کمنگراں والی سے حیدری کمیٹی کا ماتمی جلوس گزرتا تھا اور ہم سب بچے اپنے ہاتھوں سے ان کو کھیر کھلایا کرتے تھے۔ آج کے بچے نہ قلفی کو پسند کرتے ہیں، نہ کھیر کھاتے ہیں۔ اُن کو آئس کریم پسند ہے اور وہ بھی وہی آئس کریم جس کی مشہوری ٹیلیویژن پر آتی ہے۔ میرے شہر کے بچے میری طرح ملتان کی چیزوں سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ موبائل، انٹرنیٹ اور فیس بک کے زمانے میں اپنی ترجیحات طے کر رہے ہیں۔ مَیں عید کی نماز کے بعد اپنے ابو سے گھگھو گھوڑے لینے کی فرمائش کرتا تھا۔ اور آج کے بچے عید کی نماز کے بعد والدین سے گاڑیوں کی فرمائش کرتے ہیں۔ زمانہ تبدیل ہو گیا لیکن مَیں ابھی تک گلی کمنگراں والی میں ہی موجود ہوں۔ جہاں ہم اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی گھروں کو سجانے کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ پرچم، جھنڈیاں اور لائٹنگ ہر گھر کا خاصا ہوتے تھے۔ اب جب بھی اگست آتا ہے مَیں اپنی کالونی کے بچوں کی طرف دیکھتا ہوں کہ ان میں سے شاید کوئی مجھ سے یہ فرمائش کرے کہ ہم نے گھر کی چھت پر پاکستان کا پرچم لگانا ہے۔ جھنڈیوں کی فرمائش کا انتظار کرتا ہوں لیکن میرے محلے کے بچوں میں سے کوئی بھی مجھ سے فرمائش نہیں کرتا اور پھر میرے اندر کا چھوٹا بچہ بازار جاتا ہے، پرچم لاتا ہے، چودہ اگست سے پہلے اپنے گھر کی چھت پر وہ بچہ ایک مرتبہ پرچم لہراتا ہے اور وہ بچہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ میرا وہ بچپن کہاں گیا؟ مجھ کو 'اللہ' سکھانے والے کدھر گئے؟ گلی کمنگراں کے مکین (میاں جی اور بی بی جی) کیا پیر عمر کے قبرستان میں دفن ہمیں یاد کرتے ہیں؟ آج کل میری رہائش جمال پورہ کالونی میں ہے لیکن میری یادوں کا جمال آج بھی گلی کمنگراں والی میں رات کو چمکتا ہے۔ مَیں چودھویں کی رات کو جمال پورہ کالونی میں اپنے گھر کی چھت پر کبھی کبھار جاتا ہوں۔ وہاں سے گلی کمنگراں والی کو دیکھتا ہوں۔ شہر میں آہستہ آہستہ بڑی عمارتوں نے گلی کمنگراں والی کو بہت نیچے کر دیا ہے۔ لیکن میری یادوں میں گلی کمنگراں والی کے مکین، گلی میں آنے والے غبارے بیچنے والے، کھیر، قلفی، گول گپے، دہی بڑے فروخت کرنے والے آج بھی اسی طرح بستے ہیں جس طرح آج سے چالیس سال پہلے اُس گھر میں ہم بستے تھے۔ مَیں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج کے بچوں کا بچپن مجھ سے بہت ہی مختلف ہو گا۔ مَیں نے بچپن کا بہت سا وقت سائیکل چلاتے ہوئے گزارا۔ آج کے بچوں نے نہ ہی کبھی سائیکل کے ٹیوب کا پنکچر لگوایا ہے اور نہ ہی اس میں ہوا بھری ہے۔ انہیں شاید یہ معلوم ہی نہیں کہ اُس زمانے میں سائیکل پر ہوا بھرنا کتنا مشکل کام ہوا کرتا تھا۔ شکر ہے یہ مشکل کام میرے حصے میں آئے، میرے دَور کے بچے مشکل دور کے آسان ترین بچے ٹھہرے۔ اُن کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ آج کل ہر گھنٹے بعد بجلی جاتی ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ بند ہو جاتا ہے۔ جبکہ ہم تو شدید گرمی میں بھی بغیر پنکھے کے سو جاتے تھے اور کبھی صبح اُٹھ کر گرمی کا شکوہ نہیں کرتے تھے۔ یہ سب چیزیں دیکھ کر مَیں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مَیں نے زندگی کا بہترین وقت گلی کمنگراں والی میں گزارا اور اب جو مَیں آسودگی کی زندگی گزار رہا ہوں وہ اصل میں مشکلات کا وہ باب ہے جس میں جگہ جگہ میرے شہر کے بچے مجھ سے سوال

کرتے ہیں کہ کیا یہ وہی ملتان ہے جس سے آپ اتنی محبت کرتے ہیں۔ کہ اب اس شہر میں کوئی تہوار ہم مل کر نہیں مناتے، میلے ٹھیلے ختم ہو گئے۔ عیدین کے دن بھی ہم سو کے گزارنا پسند کرتے ہیں۔ مسجدوں کے باہر اب فرقہ بندی کی تخصیص ہو گئی ہے۔ لوگ محرم کے جلوس دیکھنے والوں کو کافر، میلاد النبی ﷺ کے جلوس کو بدعت اور نجانے کیا کیا خرافات ہمارے ہاں آ گئی ہیں۔

مَیں اچھے زمانے کو یاد کرتا ہوں تو مجھے میاں جی، بی بی جی، حافظ صاحب (والد محترم حبیب الرحمٰن)، والدہ محترمہ یاد آتے ہیں۔ جنہوں نے مجھے ملتان اور اہلِ ملتان سے محبت کرنا سکھائی۔ یہ کتاب اُسی محبت کے تحت مَیں نے ترتیب دی ہے۔ مجھے شکریہ ادا کرنا ہے اُن ادیبوں اور محققین کا جن کی کتابوں سے مَیں نے یہ مضامین انتخاب کیے۔ خدا ان تمام کو اپنی محبتوں سے نوازے کہ اُن کے ان مضامین کی وجہ سے مَیں نے اپنے ماضی کی کچھ یادوں کو محفوظ کر لیا جو آہستہ آہستہ میرے ذہن سے محو ہو رہی تھیں۔ اگر کتاب آپ کو پسند آئے تو یہ تمام کریڈٹ اُن اہلِ قلم کو جاتا ہے جن کے مضامین اس کتاب میں شامل ہوئے۔ اور اگر کسی مرحلے پر آپ کو کتاب پڑھتے پڑھتے اُکتاہٹ ہو تو یہ سمجھ کر درگزر کر دیجئے گا کہ یہ تمام مضامین مَیں نے ملتان کی محبت میں انتخاب کیے ہیں۔ میری محبت میں اگر کوئی شریک ہونا چاہتا ہے تو بسم اللہ۔ ورنہ..................

خلیل احمد

تاریخ

ابنِ حنیف

ملتان ...... ملوہہ (وسطی پنجاب) کا سب اہم شہر

ملتان کی قدامت

اندرون فصیل ملتان کی گلیوں اور سڑکوں پر گزرتے وقت اکثر مجھے خیال آیا کرتا ہے کہ ان گلیوں کے نیچے، ان سڑکوں کے نیچے گہرائیوں میں ہزاروں برس پہلے کا وہ ملتان سویا ہوا ہے جو صدیوں تک بار بار اجڑتا اور آباد ہوتا رہا اور جب اب سے ساڑھے چار ہزار سال پہلے بھی ملوہہ، ولمون اور ماگان یعنی پورے پاکستان کے چند اہم ترین شہروں میں سے تھا۔ بعض ٹھوس وجوہات، بیشتر معقول قیاسات اور منطقی نتائج کی بنا پر کم از کم مجھے تو پختہ یقین ہے کہ ملتان آج سے ہزاروں برس پیشتر بھی آباد تھا اور دریا کے کنارے ملتان کے موجودہ مقام پر پہلی بستی کم از کم ساڑھے پانچ ہزار سال قبل کے لگ بھگ ان دنوں بسائی گئی تھی جب پاکستان کے مختلف علاقوں میں جلیل پور، لیہ، ونی وال، رحمان ڈھیری، ہتھالہ، گوملا، کوٹ ڈیجی، موہنجوڈارو، ہڑپہ، دمب سادات، کلی گل محمد، امری اور ایسی ہی چھوٹی ان گنت بستیاں پہلے پہل آباد ہوئی تھی۔ یہ سب بستیاں زراعت کاروں کی تھیں۔ نہ صرف پاکستان بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بھارت اور بنگلہ دیش میں بھی اتنا بڑا اور اہم اور کوئی شہر آج ایسا نہیں ہے جو ملتان کی طرح پانچ چھ ہزار برس سے نہ صرف برابر آباد چلا آرہا ہو بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت اور ہر طرح کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا ہو۔ پاکستان کے دو معروف ترین قدیم شہر ہڑپہ اور موہنجوڈارو کوئی ساڑھے تین ہزار برس پہلے جو آخری تباہی سے دوچار ہوئے تو پھر آباد ہی نہ ہو سکے۔ ہڑپہ کی نئی بستی میں گو آج بھی چند ہزار لوگ بستے ہیں، لیکن یہ اب عظمت رفتہ سے یکسر محروم ہو چکا ہے۔ البتہ ملتان وہ منفرد شہر ہے جو مستقل طور پر زوال آشنا تو کیا ہزاروں برس سے برابر ترقی اور سربلندی کی منزلیں طے کرتا آرہا ہے۔

فصیل کے اندر ملتان شہر کی صورت حال ذہن میں رکھیں تو یہ حقیقت نکھر آئے گی کہ سارا شہر کافی اونچائی پر واقعہ ہے۔ گلیوں اور بازاروں میں چلیں پھریں تو بے شمار نشیب و فراز سامنے آتے ہیں۔ گلیاں کہیں تو بہت اونچی ہو جاتی ہیں اور کہیں بہت نیچی۔ جس اونچائی پر ملتان آباد ہے وہ قدرتی ہرگز نہیں ہے بلکہ ہزار ہا برس کے مسلسل تعمیری اور تخریبی عمل کے نتیجے میں صورت پذیر ہوئی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ گزشتہ کم از کم ساڑھے پانچ ہزار برس کے

دوران ملتان کتنی ہی بار آباد اور برباد ہوا اور یہ تباہ کاریاں دریائی سیلابوں اور حملہ آوروں کی بھی لائی ہوئی ہو سکتی ہیں اور دیگر آفات سماوی کی نازل کردہ بھی۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ ماقبل تاریخ سے لے کر آخری تباہی تک ملتان کو کتنی بار حملہ آوروں کی زبردستی اور تاخت و تاراج کا سامنا کرنا پڑا اور ان قدیم دنوں میں کتنی مرتبہ سیلاب تباہ کاریاں مچاتا ملتان کے سر سے گزرا یہ شہر ہر آفت کے بعد پھر آباد ہوتا رہا حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ ہزاروں برس پہلے کا ملتان ایک عظیم الشان شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ غرض تباہی و آبادی کے اس عمل مسلسل سے وہ بلندیاں وجود میں آئیں جن پر آج کا ملتان زندگی گزار رہا ہے اور اجڑنے بسنے کا یہ عمل محض چند برسوں یا چند صدیوں پر محیط نہیں تھا بلکہ اسے تو کوئی ہزار برس لگے تھے۔ ہڑپہ اور موہنجو ڈارو کی بلندیاں بھی اسی طرح رونما ہوئی اور آج کے آباد شہروں اور قصبوں میں پاک پٹن، دیپالپور، قبولہ شریف، حیدر آباد، اوچ شریف، تلمبہ اور روہڑی سکھر وغیرہ کی بھی مثال قدامت کی اسی ضمن میں دی جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں یہ مذکورہ شہر و قصبے بھی اپنے دامن میں ہزار ہا سال پرانے کھنڈر سمیٹے ہوئے ہیں ۔ ملتان کی قدامت اور اہمیت کے سلسلے میں ایک بات اور ذہن میں رہنی چاہیے اور وہ یہ کہ نہ صرف سکندر اعظم بلکہ ''عروج یافتہ ہڑپائی دور'' (۲۵۰۰ ق۔م تا ۲۰۰۰ ق۔م) میں بھی ملتان میں قلعہ اور فصیل موجود تھی۔ ہڑپائی دور میں بالفرض نہ سہی تو کم از کم سکندر اعظم کے زمانے میں تو ملتان میں عظیم الشان اور مضبوط مستحکم قلعہ بہر حال موجود تھا۔ چنانچہ سوا دو ہزار سال قبل ملتان میں قلعہ کی موجودگی سے با آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسے اتنا بڑا مرکزی اور اہم شہر بننے میں کتنا عرصہ صرف ہوا ہوگا کہ جہاں قلعہ بھی بن سکے۔ ظاہر ہے کہ شہر کا یہ تدریجی ارتقا چند برسوں میں تو ہونے سے رہا ہزاروں سال ہی لگے ہوں گے۔

میرے پاس ایسے پرانے برتن ہیں جن پر قدیم رسم الخط کے حروف یا اجزاء اور علامتیں رقم ہیں اور یہ بظاہر مختلف ادوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حروف یا علامات کوزہ گر اس وقت بنا دیتے جب برتن ابھی گیلے ہوتے تھے۔ حروف لکھنے کے بعد برتنوں کو پکا لیا جاتا تھا۔ ان برتنوں اور ان پر نقش علامتوں اور حروف سے بھی ملتان کی قدامت کا ٹھوس ثبوت ملتا ہے۔ ملتان کی قدامت کے سلسلے میں ایک اور اہم نکتہ قابل غور ہے اور وہ یہ کہ پاکستان مصر اور عراق تینوں ایسے ملک ہیں جہاں ساڑھے چار اور پانچ ہزار سال قبل کی درمیانی مدت میں زراعت کاری اور زرعی تہذیب پورے عروج پر تھی اور یہاں دریاؤں کی بدولت شاندار تہذیبیں بیک وقت پھل پھول رہی تھیں۔ عراق کو قابل ذکر دو اور مصر کو صرف ایک ہی دریا نصیب ہوا اس کے باوجود دونوں ملکوں میں ہی چار ساڑھے چار ہزار برس قبل بھی بیک وقت بہت سارے بڑے بڑے شہر اور قصبے آباد تھے اور عراق میں تو یہ بہت قریب قریب بھی تھے۔ ہمارے ملک پاکستان کو قدرت نے ایک دو نہیں کم از کم سات بڑے دریاؤں سندھ، جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج اور سرسوتی (موجودہ ہاکڑہ۔ گھگرہ) کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا اور رقبے میں بھی پاکستان عراق اور مصر سے کہیں بڑا تھا لیکن پاکستان میں اب تک صرف دو ہی قدیم بڑے شہر یعنی ہڑپہ اور موہنجو ڈارو برآمد ہوئے ہیں اور ان دونوں کا بھی باہمی فاصلہ سو پچاس نہیں کو چار سو میل کا ہے۔ تو کیا اس طویل درمیانی فاصلے میں کوئی ایک بھی بڑا شہر ہڑپہ اور موہنجو ڈارو

کے زمانے میں آباد نہیں تھا؟ میں سمجھتا ہوں کہ صورت حال یہ نہیں تھی بلکہ موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے درمیان زیادہ نہ سہی تو ایک ہی اور بہت بڑا شہر ضرور ہونا چاہیے تھا جو سیاسی، عسکری، اقتصادی اور تجارتی لحاظ سے درمیانی علاقے کو کنٹرول کر سکتا اور جس کی منڈیوں میں دیہاتی کاشت کاروں کی اجناس اور کاری گروں کی مصنوعات کھپ سکتیں۔ چنانچہ مجھے اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک اور بہت بڑا اور عظیم شہر یقیناً تھا اور وہ ملتان تھا۔ (اور یوں تو میرے خیال میں اوچ شریف کے علاوہ سکھر، روہڑی اور موجودہ حیدر آباد کے قریب بھی ہڑپائی دور میں بڑے بڑے شہر ہونے چاہئیں) ملتان جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے موہنجوڈارو اور ہڑپہ سے بھی زیادہ اہم جگہ آباد ہے۔ میری اس تمام تر بحث کا مطلب اپنے اس پختہ یقین کا اظہار ہے کہ چار ساڑھے چار ہزار برس پہلے پاکستان میں ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے علاوہ متعدد اور بھی بڑے بڑے شہر اور قصبے آباد تھے۔ پاکستان کے ان شہروں کی حیثیت ہزاروں برس قبل جنوبی عراق کی قدیم سومیری شہری ریاستوں کی سی تھی یا یہ کسی اور طرح کے سیاسی نظام کی کڑی میں پروئے ہوئے تھے؟ جو بھی صورت رہی ہو ملتان کو تجارتی، عسکری، سیاسی اور مرکزی اہمیت اس وقت بھی حاصل تھی۔

اور اب ان حضرات کی معصومانہ غلطی دور کرنا چاہتا ہو جو ملتان کو لاکھوں برس پرانا شہر سمجھتے ہیں۔ یہ سب اساطیری روائتیں ہیں جن کا حقیقی علمی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ علمی اور اثریاتی حقائق کی دنیا میں اس قسم کی مضحکہ خیز اور بے سروپا باتوں اور دعوؤں کی کوئی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔

ملتان کی جغرافیائی اہمیت

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ ملتان ہزاروں سال پہلے بھی نہ صرف ملوہہ، یعنی وسطی پنجاب بلکہ پورے پاکستان میں انتہائی اہم مقام تھا اور اپنے محل وقوع کے پیش نظر تجارتی، تہذیبی، سیاسی، عسکری اور اقتصادی خوشحالی کے لحاظ سے اسے شاید ہڑپہ اور موہنجوڈارو پر بھی تقدم حاصل تھا۔ وسطی پنجاب (ملوہہ) کے اہم علاقے میں اپنے محل وقوع کے لحاظ سے ملتان ابتدا میں گاؤں پھر سب سے اہم قصبہ اور ہڑپہ وموہنجوڈارو کے عروج کے دنوں میں سب سے اہم اور سب سے بڑا شہر تھا موہنجوڈارو اور ہڑپہ سے بھی بڑا اہم شہر قدیم ادوار میں ملتان کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ نہ صرف ایک دریا کے کنارے ہی آباد تھا بلکہ دو عظیم الشان دریاؤں راوی اور چناب کا سنگم بھی اس کے پاس ہی تھا۔ ملتان کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ اندرون اور بیرون ملک تجارت اور آمد ورفت کے نقطہ نظر سے یہ شہر بہت نمایاں حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ پرانے زمانوں میں افغانستان کے ساتھ جن جن راستوں یا پہاڑی دروں کے ذریعے پاکستان کی تجارت ہوتی تھی ان میں درہ گومل کو ایک مخصوص حیثیت حاصل ہے۔ درہ گومل کے ذریعے گزر کے زمانوں افغانستان کے ساتھ پاکستان کی تجارت جس کثرت سے ہوتی تھی اتنی کسی اور راستے یا درے کے ذریعے نہیں ہوئی اور یہ راستہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سب سے قدیم تجارتی راستہ ہے۔ گومل کا درہ دریائے گومل کی راہ سے گزرتا ہے اور اس درے کا راستہ ڈیرہ جات کے علاقے سے گزرتا ہوا ملتان پہنچتا ہے۔ اسی

طرح پرانے وقتوں میں ایک اور تجارتی راستہ تھا جو سلسلہ کوہ سلیمان کے سخی سرور کے درے سے گزرتا ہوا ملتان پہنچتا تھا۔ اس راستے سے پاکستان کی تجارت جنوبی افغانستان کے ساتھ ہوتی تھی۔ مغربی جانب یہ راستہ قندھار سے جا ملتا ہے اور وہاں سے ایران۔ دہلی میں لوٹ مار کے بعد نادر شاہ اسی سخی سرور والے درے سے گزر کر ایران واپس گیا تھا۔ مذکورہ راستوں کے ذریعے تاریخی اور ماقبل تاریخی ادوار میں تاجروں کے قافلے ملتان آتے جاتے رہے تھے۔ آبی شاہراہوں اور خشکی کے راستوں کے ذریعے آمد و رفت اس کے علاوہ تھی۔

چونکہ ملتان نہ صرف اہم ترین آبی بلکہ بری تجارتی شاہراہوں پر واقع تھا اس لیے یہ شہر وسطی پنجاب (ملوہہ) بلکہ پورے پاکستان کے ہی قلب میں واقع ہونے اور اپنے جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت کی وجہ سے تقریباً پورے پاکستان کی دریائی اور کافی حد تک بری تجارت کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں تھا اور کر بھی رہا تھا اور میرے خیال میں وادی سندھ کی ''ہڑپائی تہذیب کے دور'' یعنی اب سے ساڑھے چار ہزار برس قبل سے لے کر (۱۵۰۰ ق۔م) میں پاکستان پر آریائی حملے یعنی اب سے ساڑھے تین ہزار برس قبل تک بھی ملتان کو تجارتی اور سیاسی بالا دستی حاصل رہی۔ چنانچہ اس کی اسی مرکزی اور مقتدر حیثیت کے باعث اُسے نہ صرف ملوہہ (وسطی پنجاب) بلکہ پاکستان کے تمام پرانے ہم عصر شہروں میں ممتاز ترین درجہ حاصل ہو گیا۔ مختلف شواہد کی روشنی میں یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بری راستوں کے علاوہ پاکستان کے طویل ساحل اور دریاؤں کے ذریعے نہ صرف اندرونی بلکہ بین الاقوامی تجارت ہوتی تھی۔ اور اندرونی تجارت کے سلسلے میں اپنے مخصوص محل وقوع کی بنا پر ملتان ایک خاص کردار ادا کرتا رہا ہے اور ملتان ہزاروں برس پہلے ملوہہ (وسطی پنجاب) کی انتہائی اہم بندرگاہ تھی۔ (یہاں سے آگے اوچ شریف کو بھی کم و بیش یہی مقام حاصل تھا) ملتان کے ذریعے ان پرانے زمانوں میں نہ صرف پاکستان کے بالائی اور زیریں حصوں کے مابین تجارت ہوتی تھی بلکہ تجارتی جہاز یہاں سے ہوتے ہوئے سمندر تک جاتے تھے اور پھر وہاں سے ملوہہ (وسطی پنجاب) دلمون (سندھ و جنوبی بلوچستان) سمیت پاکستان کے دوسرے حصوں کا تجارتی مال جہازوں کے ذریعے ماگان (مکران بلوچستان) کے ساحل سے ہوتا ہوا عراق وغیرہ پہنچتا تھا۔ پاکستان میں پرانے زمانے سے ہی نہ صرف ملتان اور اوچ شریف بلکہ ہڑپہ، موہنجو ڈارو اور پٹالہ (حیدر آباد) کے بعد کے زمانوں میں شکلاوتی بھی دریائے سندھ اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں کے ذریعے ہونے والی تجارت پر چھائے رہے۔

ملتان کی اہمیت اور قدامت اس ہجرت سے بھی اجاگر ہوتی ہے جو وادی گومل کے باشندوں نے ہزاروں سال پہلے ملتان کی طرف کی تھی۔ 1971ء میں صوبہ سرحد میں جو آثار کاویاں کی گئیں ان کے نتیجے میں وہاں بھی پاکستان کی وادی سندھ کی قدیم تہذیب کے آثار مل گئے۔ ان آثار کا انکشاف ڈیرہ اسماعیل خان سے چھتیس میل دور وادی گومل میں ہٹھالہ کے مقام پر ہوا ہے ہٹھالہ کی کھدائی سے معلوم ہوا کہ اب سے کوئی پانچ ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے ہٹھالہ کے لوگوں نے ڈیرہ غازی خان اور ملتان کی طرف ہجرت کی تھی۔

۱۲۴۶۴۳۳۹

ملتان کے مختلف نام اور اس شہر سے وابستہ قدیم روایات

سوال یہ ہے کہ ملتان کا نام ہزاروں برس پہلے کیا تھا؟ مجھے خیال ہوا کرتا ہے کہ کسی زمانے میں اس کا ایک نام ملوہہ یا اس سے ملتا جلتا کوئی نام بھی رہا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ اسی نام پر اس عظیم شہر کے زیر اثر علاقے یعنی وسطی پنجاب کو ملوہہ کہا جاتا ہو جیسا کے ایک وقت میں بابل شہر کے نام پر اس کے زیر اثر عراق کے ایک مخصوص و بڑے حصے کو ملک بابل بھی کہا گیا۔ ملتان کے نام کے سلسلے میں ہمیں پاکستان پر حملہ کر کے عسکری اور سیاسی بالا دستی حاصل کرنے والے وحشی اور ادارہ خرام آریاؤں کی عظیم کتاب ''رگ وید'' کی طرف بھی نظر ڈال لینی چاہیے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ رگ وید میں جغرافیائی مرکز کی حیثیت پنجاب کو حاصل ہے۔ جن دریاؤں کا ذکر رگ وید میں سب سے زیادہ آیا ہے ان میں دریائے سندھو (سندھ) سرسوتی (موجود ہاکڑہ۔گھگر) درشدوتی، شندری (ستلج)، وپاس (بیاس) پروشنی (راوی)، اسکنی (چناب) اور وتستا (جہلم) شامل ہیں۔ رگ وید ضبط تحریر میں خواہ کسی بھی وقت آیا ہو یہ بات بحیثیت مجموعی تقریباً مسلم ہے کہ رگ وید کا بیشتر حصہ آج سے ساڑھے تین ہزار سال سے لے کر تین ہزار برس قبل یعنی ۱۵۰۰ ق۔م تا ۱۰۰۰ ق۔م کے بین بین مختلف شاعروں نے تخلیق کیا تاہم میرے نزدیک اس کے متعدد گیت اس مذکورہ دور سے بھی یقینی طور پر قدیم ہیں۔ یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھنی چاہیے کہ رِوید کا بہت بڑا حصہ آریائی شعراء نے پاکستان میں نظم کیا تھا۔ البتہ بہت سارے گیت ایسے بھی ہیں جو پاکستان میں آریاؤں کی آمد سے قبل کی ان کے گیت کار کہیں اور مثلاً افغانستان ایران اور شاید عراق میں تخلیق کر چکے تھے۔ خیال یہ کہ رگ وید کی مناجاتوں سے وابستہ انتہائی تقدیس کی بنا پر رگ وید کو چودھویں صدی عیسوی یعنی اب سے صرف پانچ چھ سو برس قبل پہلی مرتبہ ضبط تحریر میں لایا گیا۔ چودھویں صدی عیسوی کا زمانہ رگ وید کے مشہور شارح اور مفسر سایانا (سایان آچاریہ) کا زمانہ تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ رگ وید کو تحریری صورت چودہویں صدی عیسوی میں نہیں چھٹی صدی قبل مسیح میں دی گئی گویا اب سے اڑھائی ہزار سال پہلے۔ بہر کیف رگ وید کے گیتوں کو تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح میں جمع کر کے انہیں ترتیب دی گئی اور یوں رگ وید کی تمام مناجاتیں تقریباً تین ہزار برس تک زبانی نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی چودہویں صدی عیسوی تک چلی آئیں ان گیتوں کو حیران کن حد تک اصلی حالت میں رکھا گیا اس طرح اس میں آئے ہوئے نام خصوصاً شہروں اور دریاؤں وغیرہ کے نام موجودہ ناموں سے بالکل مشابہ ہیں مثلاً ہڑپہ رگ وید میں اس قدیم شہر کا نام ہری یوپیا (ہری یوپیا) آیا ہے اور یہ ہڑپہ اس زمانے میں ایک عظیم الشان شہر تھا۔ یہی نام ہری یوپیا ساڑھے تین ہزار برس بعد بھی قدرے اختلاف کے ساتھ ''ہڑپہ'' کی صورت میں' آج بھی برقرار ہے اور یہ بات تو مجھے بالکل یقینی لگتی ہے کہ آریائی شاعروں نے رگ وید میں ہڑپہ کا وہ قدیم نام (ہری یوپیا) جوں کا توں یا اس سے بالکل ملتا جلتا استعمال کیا تھا جو آریاؤں سے پہلے بھی معروف تھا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہڑپہ کا نام آریاؤں سے پہلے بھی ہری یوپیا یا تقریباً اس جیسا ہی کوئی نام تھا۔ اس قسم کی مثال افغانستان اور پاکستان کے دریاؤں، علاقوں اور دوسرے ناموں کی

بھی دی جا سکتی ہے۔ رگ وید کی رو سے شہروں کا ذکر تو ہم آگے چل کر کریں گے دریاؤں اور خود پاکستان کے نام کی بات پہلے کرتے چلیں۔ رگ وید میں ہزاروں برس قبل موجودہ دریائے سوات کو سواستو، کابل کو کبھا، قرم کو کرومو اور گومل کو گوماٹی لکھا گیا ہے۔ ان موجودہ اور قدیم ناموں کی مماثلت منہ سے بول رہی ہے اس طرح پاکستان کے دوسرے مشہور اور بڑے دریاؤں کو رگ وید میں سندھو (سندھ) وتاستا (وتستا، جہلم) اشکنی (اسکنی، چناب) پرشنی (راوی، وپاس (بیاس) شتدری (ستودری، ستلج) اور سرسوتی (موجودہ ہاکڑہ، گھگر) کہا گیا ہے۔ راوی کے بعد کے زمانوں میں ایراوتی، بیاس کو ویا سا اور چناب کو چندر بھاگ اور سندو بھاگ بھی کہتے تھے۔ آریائی دور کے بہت بعد یونانیوں نے دریائے راوی کو ہائیڈریٹس، بیاس کو ہالیفاسس اور ستلج کو ''زارڈرس' یا سائی ڈرس'' سندھ کو انڈس، جہلم کو ہائیڈاسپس اور چناب کو اکسائنس کہا۔

جہاں تک رگ وید میں مندرج پاکستان کے نام کا سوال ہے سو آریاؤں کی اس اہم کتاب جس کا بیشتر حصہ ہزاروں برس قبل پاکستان ہی میں تخلیق ہوا تھا۔ یعنی رگ وید میں پاکستان کو سپت ''سندھوا'' (سپت سندھاوا) کہا گیا (VIII : ۲۴: ۲۷) ''یعنی سات دریا'' اور ''سات دریاؤں کی سرزمین''۔ سندھ کے معنی دریا کے بھی لئے جاتے تھے۔ اور یہ وہی سرزمین تھی جسے موجودہ بھارت کے شمال اور شمال مغرب میں دریائے سندھ اور اس کے معاون سیراب کرتے تھے۔ اور آج بھی کرتے ہیں یعنی پاکستان کے سرحد، پنجاب اور سندھ پر مشتمل سرزمین (جس زمانے میں مہا بھارت کی مشہور) کی کہانی نل و منیتی، تخلیق ہوئی یعنی اب سے کوئی اڑھائی ہزار برس قبل، اس وقت بھی پاکستان کو سندھو دیش کہتے تھے۔ یہاں کے گھوڑے اس پرانے زمانے میں بھی اپنی تیز رفتاری کے سبب بھارت کے صوبہ بہار اور جنوبی بھارت تک مشہور تھے) رگ وید میں سپت سندھو، سے عمومی مراد متعدد بار ''سات دریا'' لی گئی ہے تاہم ایک جگہ اس سے مراد پاکستان کے اس علاقے سے بھی ہے جہاں آریہ آباد تھے۔ غرض اب سے کوئی ساڑھے تین ہزار برس قبل آریائی حملے کے بعد پاکستان خصوصاً پاکستان کے علاقہ موجود پنجاب کا نام سپت سندھو، یعنی سات (سپت) دریاؤں کی سرزمین تھا۔ وہ سرزمین جسے دریائے سندھ اور اس کے عظیم معاون دریا جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج اور سرسوتی سیراب کرتے تھے۔ شروع شروع میں لفظ سندھو ''بڑا دریا'' کے معنی میں استعمال ہوتا تھا البتہ بعد میں یہ نام صرف دریائے سندھ کے لیے مخصوص ہو گیا۔ ادھر ایران کی قدیم ترین ادبی تخلیق ''اوستا'' میں پاکستان کا نام ''ہندو'' آیا ہے۔ یہ نام دریائے سندھ کے پرانے نام ''سندھو'' سے مشتق تھا اور اوستا میں دریائے سندھو کے نام پر ہندو (ہسپت ہندو) اس علاقے یا خطوں کو کہا گیا جو دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں سے ملحق تھے۔ اوستا کے پہلے باب کی رو سے ایرانیوں کے خدائے عظیم اہورامزدا' نے سولہ ملک یا خطے پیدا کئے تھے اور ان میں پندرھویں ملک کا نام ہسپت ہندو، تھا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ اوستا کا یہ پہلا باب کتنا قدیم ہے تاہم زرتشت اعظم کو کم از کم ۶۶۰ ق۔م تا ۵۸۳ ق۔م کا زمانہ دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اوستا کے پہلے باب، کا زمانہ تصنیف سے کوئی سات سو قبل مسیح رہا ہو گا اور یوں گویا سات آٹھ سو قبل مسیح بھی پاکستان کا نام ''ہسپت ہندو'' (سات دریا، سات دریاؤں کی سرزمین) تھا۔

اوستا میں پاکستان (ہسپت ہندو) کو بے حد گرم علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ ایرانی مؤرخوں نے یہ نام (ہسپت ہندو) یقیناً انہی علاقوں (پاکستان) کو دیا تھا جنہیں ''رگ وید'' میں ''سپت سندھاوا'' کہا گیا ہے بعض محققین نے اوستا، کی اس اصطلاح یعنی ''ہسپت ہندو'' سے مراد ''سات دریا'' نہیں بلکہ ''سات بادشاہتیں'' (سیات ریاستیں) لی ہے اور فردوسی (گیارہویں صدی عیسوی) تک کے زمانے بھی ''سات بادشاہتوں'' کی روایت یا اصطلاح چلی آ رہی تھی۔ مثلاً فردوسی نے اپنے ''شاہنامہ'' میں ایک جگہ ''ہندستان'' کے سات بادشاہوں (بادشاہتوں) کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں (i) شاہ کابل، (ii) شاہ سندھ (iii) شاہ ہند (iv) شاہ صندل (v) شاہ چندل (vi) شاہ کشمیر اور (vii) شاہ مولستان۔

فارسی میں لفظ ''ہندو'' کے معنی ''چور'' اور کالا (سیاہ فام) بھی ہیں۔ اور رگ وید میں بھی پاکستان کے دراوڑوں کو حقارت سے کالے چور جیسے القاب سے نوازا گیا ہے اس لحاظ سے قدیم پاکستانیوں کے بارے میں بد دماغ نسبتاً وحشی اور نسلی تفاخر میں جاہلیت کی حد تک سرشار پاکستان میں نو وارد آریاؤں کے رگ وید میں بیانات اور ان کے بھائی بند ایرانی آریاؤں کی زبان ''ہندو'' کے معنی (کالا۔ چور) میں قطعی طور پر مطابقت پائی جاتی ہے۔

بہر حال بعد میں یونانیوں نے دریائے سندھ کو ''انڈس'' کہا اور اسی دریا ''انڈس'' کی مناسبت سے ہی انہوں نے پاکستان کا نام ''انڈ'' رکھا۔ اور یہی ''انڈیا'' بن گیا۔ ایرانی دریائے سندھو (سندھ) کو ''ہندو'' کہتے تھے۔ اور اسی ''ہندو'' کی مناسبت سے ہندوستان، بن گیا اور یہاں کے رہنے والوں کو ہندو کہا جانے لگا۔ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ جس زمانے میں یونانیوں نے دریائے سندھ کی مناسبت سے پاکستان کو ''انڈ'' کا نام دیا تھا موجودہ بھارت نام اس زمانے میں بھی بھارت ہی رہا ہو کیونکہ یہ بات تو خیر ثابت ہے کہ کسی زمانے میں موجودہ بھارت کو بھارت ورش کہا جاتا تھا خواہ وہ دور کوئی بھی تھا۔

جیسا کہ لکھا گیا ہے کہ پاکستان کا ایک قدیم نام ''سندھو'' یا ''سندھاوا'' تھا (جو آریاؤں نے بھی لکھا) اور اسی سے ''ہند'' اور ''انڈ'' (یونانی) مشتق ہوا۔ میرے خیال میں ''سندھو'' یا ''سندھاوا'' کے معنی ''چاند کی سرزمین'' کے بھی ہو سکتے ہیں۔ سندھو میں شامل لفظ سن کے معنی ہیں چاند (اور چاند دیوتا بھی) عراق کے سامی النسل اکادیوں اور بابلیوں کے دور میں وہاں چاند اور چاند دیوتا کو سن کہا جاتا تھا۔ اور چاند دیوتا کی ''سن'' کے نام سے پوجا ہوتی تھی۔ غرض ہزاروں برس پیشتر اہل عراق چاند کو ''سن'' کہتے تھے۔ عراق میں ''سن'' یعنی چاند دیوتا کی بہن زمین زراعت اور حسن و عشق کی دیوی تھی جس کا سامی دور میں مقبول عام نام ''عشتار'' تھا۔ ادھر پاکستان میں اس زمانے مادری اور زرعی تہذیب کا دور دورہ تھا اور یہاں زمین کی دیوی اور چاند کے دیوتا کی پرستش لازمی تھی۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ''سن'' یا اس سے ملتے جلتے نام سے چاند دیوتا کی پوجا پاکستان میں بھی اتنے وسیع اور بھرپور پیمانے پر ہوتی ہو کہ نہ صرف یہاں کے سب سے بڑے دریا (سندھ) بلکہ خود اس ملک (پاکستان) کا نام ہی ایک وقت میں سن (چاند) کے نام پر ''سندھ'' پڑ گیا ہو اور دریائے سندھ کا کوئی اساطیری تعلق ''سن'' دیوتا سے سمجھا جاتا ہو۔ لفظ سن (چاند) آج بھی اپنی مختلف صورتوں میں پاکستان اور بھارت دونوں ہی ملکوں میں پایا جاتا ہے مثلاً سندھ، کرشن، چندر (چن ور) چندر ماں،

چن (چاند) چاند، امرسین، گوپال سین، رام چندر، اور چناب وغیرہ دریائے چناب کا نام پرانے زمانے میں چندر بھاگ اور سند و بھاگ بھی تھا۔

بہر حال رگ وید میں جو شہروں کے نام آئے ہیں ان میں ملتان وغیرہ کے ناموں کی تلاش ضرور کرنی چاہیے چاہے خواہ ناکام ہی سہی۔ اس ناکام یا کامیاب کوشش اور چھان پھٹک کی وجہ سے ہمیں یہ پتہ چل جائے گا کہ آیا ہڑپہ کی طرح کسی اور موجودہ شہر خصوصاً ملتان کا بھی کوئی ملتا جلتا ہی نام رگ وید میں موجود ہے؟ اور اگر موجود ہے تو زیادہ تر قرین قیاس بات یہ ہے کہ یہ نام آریائی دور سے پہلے کے پاکستان میں مروج رہا ہوگا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اگر ملتان سے ملتا جلتا ہی اس شہر کا کوئی نام رگ وید میں آیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ملتان کا موجودہ نام ساڑھے تین ہزار برس سے بھی زیادہ مدت سے چلا آ رہا ہے۔

پاکستان کا پہلا معروف بیرونی حملہ آریاؤں کا تھا۔ ان وحشی، خونخوار، برخود غلط اور آوارہ گرد لوگوں نے پاکستان کی رفیع الشان اور خیرہ کن بسی بسائی تہذیب کو بری طرح تہس نہس کیا۔ شہر اور قصبے کے قصبے آگ اور خون کی بارش میں نہلا کر سپرد زمین کر دیئے گئے۔ وسطی پنجاب یعنی ہڑپہ اور ملتان کے علاقے میں بھی انہوں نے ہولناک تباہی مچائی۔ ہڑپہ شہر کو ان غیر ملکی آریاؤں کے ہاتھوں عبرت انگیز تباہی کا ذائقہ چکھنا پڑا۔ ایک جدید خیال یہ ہے کہ ہڑپائی دور کے پاکستانی شہروں کو آریاؤں نے ۱۷۵۰ ق۔م یعنی اب سے کوئی پونے چار ہزار برس بیشتر برباد کیا تھا۔ رگ وید سے آریائی لوگوں کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ایسے (آریہ) قبائل کی ہے، جو وحشی تھے۔ اپنے تیز گھوڑوں اور ہلکے رتھوں پر ناز و فخر کرتے تھے، بھیڑ بکریاں اور مویشی پالتے تھے۔ پہلے پہل جو بوتے تھے پھر چاول اور گندم بھی کاشت کرنے لگے۔ وہ ''ایاس'' نامی دھات کے اوزار بناتے تھے اسے رگ وید میں گا ہے گا ہے'' سرخ دھات'' بتایا گیا ہے اس طرح یہ تانبا یا کانسی رہی ہوگی۔ رگ وید میں لوہے کا ذکر نہیں بلکہ بعد یں ویدی لٹریچر میں ملتا ہے اتھر وید اور یجر وید کے دور سے لوہا زیادہ مستعمل ہونے لگا تھا۔ آریائی بربریت، ظلم و ستم اور پاکستان کے اصل مہذب باشندوں سے آریاؤں کی نفرت اور گھن کا پتہ خود رگ وید سے چلتا ہے ارفع و اعلیٰ مہذب پاکستانیوں کے مقابلے میں کہیں غیر مہذب اور کمتر حملہ آور آریہ بلاوجہ جس مکروہ نسلی تفاخر کا شکار تھے اس کے شاہد بھی رگ وید کے اوراق ہیں۔ مثلاً آریاؤں نے رگ وید میں اپنے دیوتا اندر کو پورن دھر، کا بھی خطاب دیا جس کے معنی ہیں ''شہروں کو تباہ کرنے والا''۔ رگ وید میں آگ کے دیوتا ''اگنی'' سے مخاطب ہو کر ایک جگہ کہا گیا ہے ''جب تو (آریائی قبیلے) پورو کی خاطر خیرہ کن انداز میں چمکتا ہے تو تیرے خوف سے کالے رنگ والے لڑائی کا انتظار کئے بغیر ہی اپنا مال اسباب چھوڑ کر بھاگ نکلتے ہیں تو ان کے شہر تباہ کرتا ہے'' (vii: ۵،۳)۔ اس کے علاوہ انہی آریاؤں نے شائستگی اور تہذیب میں رچے بسے قدیم پاکستانیوں کو ملیچھ (ناپاک) داسو (غلام) اور راکشس (شیطان بدطینت) وغیرہ جیسے گھناؤنے نام دیئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان ناکندہ تراش اور تہذیب ناآشنا آریاؤں کی تخریب کاریوں کی زد ہڑپہ کے ساتھ ساتھ ملتان پر بھی پڑی تھی؟ رگ وید کے مناجاتوں اور معقول منطقی قیاس آرائی کی بنا پر یہ بات بلا تامل کہی جا

سکتی ہے کہ جب گیتوں میں وہ ہر شہر، ہر قلعہ ہر قصبے کی تباہی کی دعا اپنے جنگجو دیوتا سے مانگ رہے ہیں اسے اکسا رہے ہیں، جب انہوں نے ہڑپہ کو نہیں چھوڑا تو ملتان جیسا مرکزی، متمول و مہذب شہر ان کے دست برد سے کیسے بچ سکتا تھا؟ اور اگر آریاؤں نے ملتان کو شکست دے کر اس پر قبضہ بھی کر لیا تھا (اور یقیناً کر لیا ہو گا) تو یہ ملتان کی سخت جانی اور اہالیان ملتان کی بار بار اجڑنے کے بعد پھر سے اسی شہر کو آباد کر لینے کی صلاحیت اور ہمت کا کھلا ثبوت ہے کہ عظیم اور شہروں کا بے مثل ملتان اپنے ہم عصر ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے برعکس اب تک بھرپور انداز میں آباد چلا آ رہا ہے۔

رگ وید میں متعدد ایسے پاکستانی شہروں کے نام آئے ہیں جہاں آریاؤں نے جنگیں لڑیں۔ جنہیں ان کے دیوتاؤں (گویا خود آریاؤں) نے تباہ کیا اور جن کی بربادی کی انہوں نے دعائیں مانگیں۔ ان میں چار شہر نارمنی (نرمنی)، ہری یوپیا (ہری یو پی یا)، ویل استھان کا، اور مہاویل استھا، بھی شامل تھے اور ان چاروں کا رگ وید میں خصوصی طور پر تذکرہ ملتا ہے۔ پہلے شہر نارمنی، کو رگ وید کی پہلی کتاب کی رو سے آریائی دیوتا اگنی (آگ) یعنی خود آریاؤں نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا (۱:۱۴۹:۳)

ایک اور شہر ہری یوپیا (ہری یو پی یا) تھا جس کا ذکر رگ وید کی چھٹی کتاب کے ستائیسویں گیت (vi: ۲۷: ۵) میں آیا ہے۔ ہری یوپیا، کے لفظی معنی ہیں "سنہری (طلائی) قربان گاہیں" رگ وید کا یہ ہری یوپیا دراصل وہی عظیم الشان شہر تھا جس کے ہزاروں برس قدیم تباہ شدہ کھنڈر اور پاس ہی آباد نئے قصبے کا نام آج بھی ہڑپہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ساہیوال سے کوئی سولہ میل کے فاصلے پر آباد موجودہ ہڑپہ کا ہی نام رگ وید کے دور میں "ہری یوپیا" (ہری یو پی یا) تھا۔ رگ وید کی چھٹی کتاب کے اس انتہائی اہم ستائیسویں گیت کے مطابق یہاں دریائے راوی کے کنارے غیر ملکی آریاؤں نے پاکستانیوں سے سخت لڑائی لڑی تھی۔ ان کے دیوتا اندر نے ہری یوپیا کے مقام پر درچھی ون نامی ایک آریہ دشمن اشورا (عفریت) کے ہراول دستے کو شکست دے کر تباہ کر دیا تھا اور درچھی ون کی عقبی فوج خوف زدہ ہو کر بھاگ گئی تھی۔ درچھی ن پاکستان کا ہی رہنے والا تھا جب کہ آریہ ابھی پاکستان میں بس آئے ہی تھے۔ اصل میں یہ لڑائی بیرونی حملہ آوروں آریاؤں اور پاکستان کے ایک مقامی حکمران قبیلے میں ہوئی تھی۔ اس قبیلے کی حکومت ہڑپہ اور ملتان کے زیر اثر علاقے پر تھی کتنے علاقے پر یہ حکومت قائم تھی اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس قبیلے کا سربراہ "درچھی ون" نامی ایک شخص تھا۔ اب یہاں دو صورتیں ممکن ہیں ایک تو یہ کہ دراصل اس قبیلے کا نام ہی درچھی ون رہا ہو اور اسی نام کی مناسبت سے رگ وید کے اس گیت کے خالق نے قبیلے کے حکمران کو اس کے اصل نام سے پکارنے کی بجائے "درچھی ون" لکھ دیا ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اس پاکستانی حکمران کا ہی نام "درچھی ون" ہو اور اس کی عظیم شخصیت کی وجہ سے ویدی شاعر نے اس کے پورے خاندان یا قبیلے کو ہی اسی نام کی رعایت سے درچھی ون پکارا ہو۔ جو صورت بھی رہی ہو مذکورہ لڑائی میں درچھی ون کے بیٹے بھی تیروں کا شکار ہوئے یہاں بیٹوں سے مراد قبیلے کے لوگوں سے ہے؟ اس گیت کے مطابق لڑائی کی خاطر تین ہزار آریہ جنگجو زرہ بکتر پہنے "وے دیاتی" نامی دریا کے کنارے جمع ہوئے اور انہوں نے

پاکستانیوں سے سخت جنگ لڑی۔ یہ دریا غالباً راوی تھا۔ جسے آریہ پروشنی بھی کہتے تھے اور بعد میں اسے ایرادتی کہا جانے لگا تھا۔ ہڑپہ دریائے راوی کے کنارے تھا اور آج کل بھی ہے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دریائے راوی کی کوئی شاخ اس ہزاروں برس پہلے کے دور میں ہڑپہ کے ساتھ سے گزرتی ہو اور اسے وے ویاتی کہا جاتا ہو۔ جو بھی ہو اس سے یہ بات ثابت ہے کہ ہڑپہ والوں نے اپنے نادر روزگار شہر کی حسرت ناک تباہی سے قبل تباہ کاریوں اور بربادیوں کے متوالے آریاؤں کا خود ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا، بنا لڑے بھڑے جی نہیں چھوڑ دیا تھا۔ اسی اہم ستائیسویں گیت میں درشکھ نامی ایک سرکردہ پاکستانی سردار کا بھی ذکر آیا ہے آریاؤں نے اپنی عادت بد سے مجبور ہو کر حسب معمول اس پاکستانی سرکار کو بھی ''اشورا'' (عفریت) کہا۔ یہ درشکھ درچھی ون قبیلے کا سب سے بڑا سردار تھا اور اس درشکھ کے سب سے بڑے بیٹے کا نام بھی درچھی ون تھا۔ اس طرح گویا ملتان و ہڑپہ کے قدیم علاقے ملوہہ (وسطی پنجاب) کے رگ ویدی زمانے (کم از کم سوا تین ہزار برس قبل) کے اک قبیلے، کچھ سرکردہ اشخاص اور ایک دریا کے نام تو اس گیت سے معلوم ہوئے اسی ستائیسویں گیت سے پتہ چلتا ہے کہ درشکھ اور درچھی ون نامی پاکستان کے سرداروں یا حکمرانوں سے ہڑپہ کے مقام پر ہونے والی اس لڑائی (اور اسی علاقے میں غالباً متعدد دوسری جھڑپوں) میں پنجہ آزما ہونے والے آریائی حکمران (سردار، راجہ جرنیل) کا نام ابھیا ورتن چھایا من تھا جو دیوادت کا بیٹا اور پرتھو نامی مشہور آریہ سردار کی اولاد سے تھا اور پارتھو نام کے آریہ قبیلے یا قوم کا سربراہ تھا۔ پارتھو قبیلہ پاکستان کے درشکھ اور درچھی ون نامی قبیلے کا دشمن تھا۔ چھٹی کتاب کے اس اہم گیت یا مناجات کا خالق رشی شاعر اندر دیوتا سے مخاطب ہے۔

''تیری (اندر کی) عظیم قوت کا مشاہدہ ہماری آنکھوں نے اس وقت کیا
ہے۔ جب تو نے درشکھ کی اولاد کو قتل کیا''
جب تیری نیچے کو لپکتی ہوئی برق کی محض آواز سن کر ہی ان (مخالفین)
کے سب سے دلیر سورما بھی ہلاک ہو گئے۔'' (چوتھا بند)

''اندر نے ابھیا ورتن چھایا من کی مدد کی اور درشکھ کا تخم تباہ کر دیا۔
ہری یو پیا کے مقام پر اس (اندر) نے درچھی ون (لوگوں) کا ہراول
برباد کر دیا اور عقبی (فوجی) حصہ مارے دہشت کے فرار ہو گیا''
(پانچواں بند)

''اے اندرا! زرہ بکتر پہنے تین ہزار (آریہ سورما) وے ویاتی کے
کنارے شہرت پانے کی خاطر جمع ہوئے، درچھی ون کے بیٹے تیر کھا کا
کر گرے، (وہ) تباہ ہو جانے والی کشتیوں کی طرح برباد ہو گئے''
(چھٹا بند)

رگ وید میں ملتان کا ذکر

ہری یو پیا (ہری یو پی یا) کے علاوہ رگ وید میں دو اور شہروں کے نام بھی ملتے ہیں اور وہ ہیں ''ویل استھان کا'' اور ''مہاویل استھا''۔ ان دونوں شہروں کا تذکرہ رگ وید کی پہلی کتاب کے ۱۳۳ ویں گیت میں ہے۔ دونوں ہی شہروں کے بارے میں اندر دیوتا سے استدعا کی گئی ہے۔

''اے مگھون! (اندر) تباہ شدہ شہر ویل استھا کا اور تباہ شدہ شہر مہاویل استھا میں جادوگرنیوں کے غول کو تباہ کردے!''

اس گیت سے یہ بات تو ظاہر ہے کہ ان دونوں شہروں ویل استھان کا اور مہاویل استھا کو آریہ پہلے ہی مسمار کر چکے تھے۔ اسوال ہے کہ یہ آخر کون سے شہر ہو سکتے ہیں؟ ملتان کا ایک نام مول استھان، (ملی استھان) یا ''مہاویل استھا'' تین سوا تین ہزار برس پیشتر ملتان ہی ہو اور ملتان ہی کا نام اس وقت ویل استھان کا ہو؟ میرے نزدیک ایسا ممکن تو ہے کہ ''ویل استھان کا'' زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج تغیر تبدل کے سبب ''مول استھان'' بن گیا ہو۔ ایک صورت اور بھی سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ رگ وید کے دور میں ملتان کا نام مول استھان (مل استھان) ہو۔ آریائی شاعر نے اپنی نظم میں مول استھان یا اس سے بالکل ملتا جلتا ہی کوئی ایسا نام باندھا جو صرف میم (م) سے شروع ہوتا ہو مگر جب مدتوں بعد اس گیت کو ضبط تحریر میں لایا گیا تو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تلفظ بھی تبدیل ہو جانے سے لوگوں کی زبانوں پر اس کا نام ویل استھان چڑھ گیا ہو اور لکھا گیا ہو۔ بہر کیف میرے خیال میں یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ''ویل استھان کا'' مول استھان اور پھر ''مولستان'' بنا ہو یا ''مول استھان کا'' کو آریاؤں نے ''ویل استھان کا'' کا نام دیا ہو اور یہی لکھا بھ ہو۔ اگر میری یہ قیاس آرائی درست ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکندر کے حملے سے بھی ہزار بارہ سو سال قبل ملتان کا نام ''ویل استھان کا'' ''مہاویل استھا'' مول استھان یا پھر ان سے ملتا جلتا ہی کوئی نام ہوگا۔ ''رگ وید'' میں آریاؤں کے دو زبردست دشمنوں ''ورتر'' اور ولا (ول) کا ذکر ہے ان دونوں کو اندر نے قتل کیا تھا۔ ورتر اژدھا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ ولا اور ورتر دراصل ایسی قوموں کے سردار ہوں جو آریائی نہیں بلکہ پاکستانی ہی تھیں اور وج سانپ کی پرستش کرتی تھیں۔ اور ان کا نشان بھی سانپ تھا چنانچہ اسی نسبت سے آریاؤں نے ولا اور ورتر کو اژدھا یا سانپ کہا یعنی سانپ کو پوجنے والی قوموں کے سردار۔ چونکہ یہ اقوام سانپ کی پجاری تھیں چنانچہ یقینی طور پر پاکستانی تھیں اس لیے کہ ابتداً آریہ قبائل سانپ کے پجاری نہیں تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ولا یا ول، جس قوم کا سردار تھا اس کا نام بھی ولا (ول) ہی تھا اور اس قوم کا یہی نام رفتہ رفتہ ملا ملی اور ملوئی وغیرہ بن گیا؟ پھر کیا یہ بھی امکان ہے کہ ''ویل استھان کا'' (ویلا ستھان کا) یا ''ولا استھان کا'' اس قوم (ولا) کا مرکزی اور اہم ترین شہر تھا اور یہ ''ویل استھان کا'' ہی دراصل ملتان تھا؟ میرے نزدیک یہ سب باتیں ممکن ہیں اور اگر یہ ممکن ہیں تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ''رگ وید'' کا ''ویل استھان کا'' ہی دراصل ملتان تھا۔ مذکورہ بالا چار شہروں نارمنی،

ہری یوپیا، ویل استھانکا اور مہاویل استھا کے علاوہ بعد کی ویدی عبارتوں میں دریائے سرسوتی (موجودہ ہاکڑہ، گھگر) کے کنارے ''ویارنا'' نامی ایک تباہ شدہ مقام کا بھی ذکر ملتا ہے۔ بعد کے ویدی لٹریچر کی رو سے سوسوتی کے کنارے تباہ شدہ آبادیوں کے ڈھیر تھے۔ انہیں ''نیتاندھوا'' کہا گیا ہے۔ انہی تباہ شدہ آبادیوں میں سے ایک کا نام ''ویارنا'' تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چولستان میں دریائے سرسوتی کے کنارے آبادیاں بعد کے ویدی لٹریچر کی تخلیق سے بہت پہلے ہی تباہ ہو چکی تھیں۔ بعد کے ویدی لٹریچر کی ایک اور عبارت کی رو سے ''...... وہ دریائے درسدوتی کے دائیں کنارے چلتا چلتا اس (دریا کے) منبع کے قریب تباہ شدہ آبادی پر پہنچ جائے پھر وہ دائیں طرف مڑ جائے۔'' بہر کیف رگ وید کے زمانے میں آبادیوں کے تباہ شدہ آثار بڑے بڑے ٹیلوں کی صورت میں موجود تھے۔ ان برباد شدہ آبادیوں کو آریاؤں نے اس علاقے کے قدیم باشندوں کی بتلایا۔

ملتان کا قدیم نام ''کیسپ پورہ'' بھی تھا، اس کی تصدیق یونانی مؤرخوں کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ ہرودوٹس (۴۸۰ ق۔م تا ۴۲۵ ق۔م) اور ہکاٹائیس ۵۰۰ ق۔م نے ملتان کو کیسپ پورس اور ٹالیمی (دوسری صدی عیسوی) نے کیسپرا لکھا ہے۔ قدیم سنسکرتی لٹریچر میں بھی کیسپ پورہ کا نام ملتا ہے اور یہ بھاگ پورہ، سمبا پور اور ہنس پور کے ساتھ آیا ہے۔ ہندو دیو مالائی کہانیوں کی رو سے ملتان کو مہارشی کیسپ نے آباد کیا تھا یوں یہ شہر ''کیسپ پورہ'' کہلایا۔

''کیسپ'' کے معنی کچھوے کے ہیں۔ کیسپ ویدی دور کے ساتھ عظیم ترین رشیوں میں سے تھا۔ ہرنیا کسپو کے چھوٹے بیٹے پرہلاد کے نام پر ملتان کو ہلاد پورہ بھی کہا جانے لگا تھا۔ ملتان کا ایک نام مول استھان پورہ بھی بتایا جاتا ہے۔ ہیون سانگ نے اس شہر کا نام ''میولوسان پولو'' لکھا ہے وہ ۶۴۱ء میں یہاں آیا تھا۔ اس وقت ملتان پر راجہ چچ کی حکمرانی تھی۔ چچ کا بھائی اور جانشین چندا بدھ مذہب کا پرجوش حامی تھا۔ ہیون سانگ نے ملتان شہر کا محیط قریباً پانچ میل لکھا ہے۔ راجہ چچ کے زمانے میں ملتان کے قلعہ کو ''سکہ'' کہتے تھے یہ قلعہ شہر کے مقابل دریا کے پار تھا۔ چچ نے ملتان کے حکمران راج ہرا کو شکست دے کر سکہ پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر دریا کو عبور کر کے شہر کو محاصرے میں لے لیا تھا۔ ہندوؤں کی کتاب ''وایو پران'' میں ملتان اور جہراور کے علاقے اور یہاں کے لوگوں کو ساؤویرا (سوویرا) اور سندھ کو ''سندھو'' کہا گیا ہے۔ ہندو عالم وراہ مہر نے اپنی کتاب ''سم ہتا'' میں ملتان اور جہراور کو (جہ راور) کو ساؤویر (سوویر) اور سندھ کو ''سندھو'' لکھا ہے۔ البیرونی نے ملتان اور جہراور کے علاقوں اور یہاں کے لوگوں کو ساؤویرا اور سندھ کے لوگوں کو ''سندھو'' کہا ہے البیرونی ہی نے ملتان کو مولستان اور المعمورہ بھی بیان کیا ہے ملتان کا ایک نام ''ملی تان'' ملتا ہے۔

آریائی اور غیر آریائی آویزش

ہندوؤں کی مذہبی روایتوں کی رو سے کیسپ رشی نے ملتان کو آباد کیا اور یہاں آفتاب پرستی کی بنیاد رکھی۔

یہاں میں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ ملتان کا روائتی بانی رشی کیسپ اور ملتان کے ایک دیو مالائی کردار بھگت پرہلاد کا باپ ہرنیا کسپو جداگانہ ہستیاں تھیں جب کہ بعض مؤرخین مغالطے کی بنا پر کیسپ اور ہرنیا کسپو میں کوئی فرق روانہیں رکھتے۔ان مؤرخین نے ملتان کے دیو مالائی حکمران ہرنیا کسپو کی بجائے رشی کیسپ کو ہی پرہلاد کا باپ لکھ دیا ہے۔حالانکہ ایسا نہیں ہے۔کیسپ تو ویدی دور کا ایک مہارشی تھا۔مہا بھارت، رامائن اور پرانوں کی رو سے وہ برہما دیوتا کے بیٹے مرچھی کا بیٹا تھا۔لیکن اتھروید کے مطابق کیسپ ''وقت (زمانے)'' سے خود بخود پیدا ہوا تھا۔وہ تمام جاندار مخلوق کا باپ تھا۔اس لحاظ سے اسے بعض اوقات ''پرجاپتی'' بھی کہا جاتا ہے۔مہا بھارت اور اس کے بعد ہندو نوشتوں کے مطابق کیسپ نے ادیتی سے شادی کی۔اس کے علاوہ اس نے پرجاپتی (مخلوق کا باپ) دکش (دکشا) کی ساٹھ بیٹیوں میں سے بارہ اور بعض روایات کی رو سے تیرہ بیٹیوں سے بھی شادی کی تھی۔پہلی بیوی ادیتی (ابدیت) کے بطن سے کیسپ رشی کے ہاں شمسی دیوتاؤں کی تعداد چھ تھی۔یعنی درونا، مترا، آریامن (آریہ مت) بھاگ دکش اور انسا۔درونا کا مرتبہ ان میں سب سے بلند تھا۔اکثر و بیشتر دکش کو ان چھ شمسی دیوتاؤں میں شامل نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ان میں اندر، ساوتری (سورج) اور دھرتی کو شامل کیا جاتا تھا۔کچھ دیو مالائی روائتوں کی رو سے ادیتی کے دراصل آٹھ بیٹے تھے مگر وہ دیوتاؤں کے پاس اپنے سات بیٹوں کو لے کر پہنچی تھی۔آٹھویں بیٹے مارٹنڈا (سورج) کو الگ کر دیا تھا۔بعض عبارتوں میں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آٹھواں ''ادیتیا'' آگ کا دیوتا تھا۔بعد کے زمانوں میں ادیتیاؤں کی تعداد بارہ ہوگئی اور یہ سب سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر مہینے کے سورج کی نمائندگی کرتے تھے۔بعض عبارتوں میں ان بارہ ادیتیاؤں کے نام بھی سورج کے ہی بارہ مختلف نام آئے ہیں سورج دیوتا کے کئی نام تھے پرانوں کی رو سے ایک نام ادیتیا بھی تھا۔ان بارہ ادیتیاؤں کا سربراہ اندر تھا۔یہ سب خیر کی قوتیں کہلاتے تھے اور راست روی اور پاکبازی کے نگران تھے۔وہ آسمان اور نور کے دیوتا تھے۔انہی بارہ شمسی دیوتاؤں میں ایک کا نام ''مترا'' تھا جس کے نام پر ملتان میں ایک عظیم الشان مندر موجود تھا۔

کیسپ کی دوسری بیویوں سے اس کے ہاں بے شمار اور متنوع اولاد پیدا ہوئی مثلاً شیاطین، دیو، ناگ، رینگنے والے جانور، پرندے اور ہر قسم کی جاندار مخلوق۔کیسپ رشی کی ایک اور بیوی کا نام ''دیتی'' تھا۔دیتی کے بطن سے کیسپ کے جو بیٹے پیدا ہوئے وہ ادیتیاؤں (خیر کی قوتوں) کے سوتیلے بھائی ہونے کے باوجود شر اور فساد کے علم بردار تھے۔دیتی کے بطن سے جنم لینے والے ہی دیتا (شیاطین) کہلاتے تھے۔وہ دیوتاؤں سے لڑتے رہتے تھے۔انہی ''دیتاؤں'' میں ایک شیطان ہرنیا کسپو (معنی سنہری یا طلائی پوشاک) تھا۔مہا بھارت اور پرانوں کی رو سے ہرنیا کسپو نے دس لاکھ برس کے لیے تینوں دنیاؤں کی حکمرانی حاصل کر لی تھی۔پرھلاد اسی شیطان (دیتا) ہرنیا کسپو کا بیٹا تھا۔پرھلاد پیدائشی طور پر تو ''دیتا'' (شیطان) تھا مگر طبعاً بڑا نیک اور وشنو پرست تھا۔جس کی وجہ سے باپ کے ساتھ اس کی کبھی نہیں بن سکی بالاخر اس کا باپ قتل ہوا۔

سوال یہ ہے کہ ہندوؤں کی کتابوں (پرانوں) میں روایتی طور پر ملتان (کیسپ پورہ) کو مہارشی کیسپ کا

آباد کردہ کیوں بتایا جاتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ملتان کے آباد ہونے کے متعلق ہندوؤں نے کیسپ رشی سے روائتیں اس لیے منسوب کر دیں کہ ان روائتوں کی تخلیق سے صدہا برس پہلے ہی ملتان نہ صرف ملوہہ (وسطی پنجاب) بلکہ پاکستان کے باقی خطوں اور بھارت میں خصوصی اہمیت حاصل کر چکا تھا اور آریائی غلبے اور اثرات کے سبب آفتاب پرستی کا بھی عظیم مرکز بن چکا تھا چنانچہ اس کی اسی قدامت اور عظیم خصوصیت کے پیش نظر پرانوں میں لکھ دیا گیا کہ ملتان کو کیسپ رشی نے آباد کیا تھا اور کیسپ رشی، جیسا کہ ہم اوپر تفصیل سے لکھ چکے ہیں، بارہ شمسی (سورج) دیوتاؤں کا باپ تھا۔ ملتان آفتاب پرستی کا اہم ترین مرکز تھا اور ساتھ ہی وشنو پرستی کا بھی۔ اب اگر ہم کیسپ رشی، ہرنیا کسپو اور پرھلاد وغیرہ کی ملتان سے متعلق دیو مالائی کہانیوں کی توضیح کریں تو میرے نزدیک بات کچھ یوں بنے گی کہ شمس پرستی سے قبل ملتان میں کسی اور دیوتا کی پرستش ہوتی تھی اور میرے خیال میں وہ دیوتا غیر آریائی یعنی پاسکتان کے اصل باشندوں کا معبود تھا۔ اگر میں بالفرض یہ مان بھی لوں کہ وہ مقبول ترین دیوتا غیر آریائی نہیں بھی تھا تب بھی میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پوجا میں غیر آریائی پاکستانیوں کے مذہبی اثرات بہت ہی نمایاں تھے اور ملتان پر غیر آریائی یعنی یہیں کے قدیم مذہب ترین باشندوں کے غلبے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ ملتان سے متعلقہ اساطیری کہانیوں کی رو سے یہاں کا حکمران ہرنیا کسپو دیتا (شیطان) تھا۔ ظاہر بات ہیکہ پاکستان میں نو وارد آریائی ہندو، اپنے سے قدیم پاکستان باشندوں اور ان کے دیوتاؤں کو شیاطین ہی قرار دے سکتے تھے جنھیں وہ اپنا بدترین دشمن خیال کرتے تھے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ ہرنیا کسپو غیر آریائی حکمران تھا اور جیتا جاگتا انسان تھا۔ مگر اس کے بیٹے پرھلاد نے آریہ مذہب و عقائد اختیار کر لیے تو اس پر آریہ اور پاکستان کے اصل غیر آریائی باشندوں میں خوب ٹھن گئی جس کا نتیجہ جنگ نکلا۔ ہرنیا کسپو قتل ہو گیا تو آریاؤں نے ملتان پر اپنا تسلط اچھی طرح جما لیا اور یہاں سورج دیوتا کی پوجا کو خوب فروغ دیا۔ اس طرح ملتان سے وابستہ مذکورہ بالا اور دوسری قدیم روایات میرے نزدیک دراصل آریاؤں اور پاکستان کے غیر آریاء باشندوں کی لڑائیوں، بھڑائیوں، مناقشوں، مخالفتوں اور ملتان میں آریاؤں کے ہاتھوں سورج دیوتا کی پرستش رائج ہونے کی عکاس ہیں۔

آریاؤں نے اپنے دیوتاؤں کے دشمنوں بالفاظ دیگر پاکستان کے غیر آریائی باشندوں کے معبودوں کو کئی مخالفانہ اور قابل اعتراض نام دے رکھے تھے مثلاً اشورا، راکش، دنواس اور مکیشا وغیرہ ان تمام الفاظ میں سے ہندو لٹریچر میں اشورا زیادہ مستعمل ہوا ہے شور (شورا) کے معنی دیوتا کے ہیں اور شورا غیر غیر دیوتا کے معنی دیتا ہے۔ شور (شورا) کے ایک اور بھی معنی ہیں ''وہ جو روحانی شراب پیتا ہے'' اس طرح اشورا، کے معنی ہوئے ''وہ جو روحانی شراب نہیں پیتا'' بات یہ ہے کہ آریہ شراب بے حد پیتے تھے اور اشورا، نہ تو اتنی شراب پیتے تھے اور نہ ہی شریب کشید کرنے کے فن میں ایسے ماہر تھے۔ ایک اور مناجات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شراب کی دیوی دودھ کے سمندر سے سورا، (شراب) کا پیالہ لیے نمودار ہوئی تو دیوتاؤں نے تو شراب ڈٹ کر پی مگر ان کے دشمنوں نے نہیں پی۔ چنانچہ یہ شراب نہ پینے والے دشمن اشورا، کہلائے۔ ویسے اشورا کے متعلق بعض مغربی محققین کا یہ خیال بھی ہے کہ عراق کی اشوری قوم کو

ہندوؤں (آریاؤں) نے اشورا، کہا کیونکہ آریہ کسی زمانے میں اشوریوں کے دشمن تھے اور ان سے لڑتے بھڑتے رہتے تھے اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب عراق پر آریہ نسک کے کسدیوں کی حکومت تھی اور عراق کے آس پاس آریہ آباد ہو چکے تھے۔ بعض عبارتوں میں لفظ اشورا ان غیر آریائی نسلوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جنہیں پاکستان پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد آریاؤں نے جنگلوں میں دھکیل دیا تھا۔ آریاؤں نے اس ملک یعنی پاکستان میں پہلے سے بسنے والے ''کالے رنگ'' کے لوگوں کا ذکر داسا، یا داسیو' کے نام سے بھی کیا ہے۔ بعد کے زمانوں میں داسیو، کے معنی غلام، کے تھے۔ ان کالے، لوگوں کی ناک چپٹی تھی۔ یہاں کہ ان مقامی باشندوں کے پاس مویشی بڑی تعداد میں ہوتے تھے اور یہ فصلوں کے اندر بنے ہوئے شہروں یا قلعوں میں رہتے تھے رگ وید میں قلعوں اور شہروں کے لیے پور، کا لفظ آیا ہے آریاؤں نے پانی، نام کی قوم یا لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ مویشیوں اور دولت سے مالا مال تھے۔ گو آریہ قبائل ایک دوسرے کے خلاف بھی لڑتے رہتے تھے مگر داسا، (داس) یعنی پاکستان کے اصل باشندوں کے خلاف لڑتے وقت وہ ایک ہو جاتے تھے۔ آریاؤں نے اپنے جنگجو دیوتا (اندر) کو پورندھر، بھی کہا ہے جس کے معنی ہیں ''شہروں کو تباہ کرنے والا''۔ آریاؤں کے داسا حکمرانوں کو ''شیاطین'' (عفریت) کے خطاب سے بھی نوازا۔

ازمنہ قدیم میں پاکستان پر بھارتی مذاہب و روایات کی یلغار

یہاں پہلے میں ایک بات کی وضاحت کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ ازمنہ قدیم میں بھارت کے ہندو، بدھ اور جین مذہب والوں نے تلوار اور سیاسی بالادستی کے پیدا کردہ جبر و تشدد سے کام لے کر اپنے مختلف مذہبی عقائد نظریات اور اپنے داستانی کرداروں، اپنے مقدس شہروں، دریاؤں اور پہاڑوں وغیرہ سے وابستہ تصورات روایات پاکستانی علاقوں اور یہاں کے لوگوں پر زبردستی ٹھونس دیں۔ ویسے اس سلسلے میں گاہے بگاہے پر امن تبلیغ سے بھی کام لیا گیا۔

ہندو غلبے اور اس سے قبل آریائی حملے سے بھی پیشتر پاکستان میں ابتدا اور اصلاً ''مادر عظیم''، یعنی زمین کی دیوی، شو اور چاند دیوتا کی پوجا ہوتی تھی ہندو آریائی دیوتا برہما، وشنو، اندر، اگنی اور دایو وغیرہ کی نہیں۔ اسی طرح رام کرشن بھگتی اور بدھ، جین اور وشنومت وغیرہ سے پاکستانیوں کو ہرگز کوئی تعلق نہیں تھا۔ پاکستان کی وادی سندھ سے نہ صرف دھرتی کی دیوی کی ننھی منی مورتیاں مل چکی ہیں بلکہ شو دیوتا کی بھی پسو پتی، کے روپ میں شبیہہ ایک مہر پر کندہ دستیاب ہوئی ہے۔ اسی طرح پاکستانیوں کے رزمیہ یا دیومالائی سورما، بھارت کے رام چندر ارجن اور بھیم وغیرہ نہیں تھے بلکہ یہاں کا داستانی سورما تو وہ تھا جس کی شبیہہ پاکستان کی ہزاروں برس قدیم ایک مہر پر کندہ ملی ہے۔ مذکورہ مہر پر ہزاروں سال پہلے کے اس نہ معلوم پاکستانی سورما، (داستانی ہیرو) کو چیتے سے لڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے اپنی اس حالت میں یہ پاکستانی سورما عراق کے مشہور عالم داستانی سورما کلگامش سے مشابہ ہے کہ کلگامش کو بھی اہل عراق اپنے آرٹ کے نمونوں میں شیر سے لڑتے اور اسے بغل میں دبائے ہوئے دکھاتے تھے۔ اصل میں ہزاروں برس پہلے

بھی پاکستان اور بھارت کے درمیان مذہبی چپقلش اور مذہبی بالا دستی کے لیے کشمکش طویل عرصے تک جاری رہی اور ایک پر دوسرے کے مذہبی اثرات پڑتے رہے۔ بھارت کے معبود صوبہ بہار کے حکمران چندر گپت موریہ نے ۳۲۲ ق۔م کے لگ بھگ پاکستانی علاقوں کو بزور شمشیر غلام بنالیا تھا اور یہ دور غلامی چندر گپت موریہ کے بیٹے بندو سار اور پوتے اشوک کے عہد میں بھی جاری رہا۔ بدھ مذہب اور بدھ مذہب کے نام لیوا بھارتی حکمران کے پاکستان پر جبری تسلط اور قبضے کے لیے راہ دراصل پاکستان علاقے جہلم کے راجہ پورو (یونانی پورس) نے کھولی تھی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پورو کو صرف اس بنا پر یہ، سورما اور محبّ الوطن کہا گیا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ بیرونی حملہ آور سکندر اعظم سے ایک تیز و تند جنگ لڑی اور بس۔ اور پھر پورو نے سیاست آمیز اور چالبازانہ جواب سکندر کو دیا کہ ''میرے ساتھ وہی سلوک کرو جو بادشاہ بادشاہ کے ساتھ کیا کرتے ہیں''۔ بس لوگ اس کے اس جواب کی بنا پر پورو، (پورس) کو آسمان پر اٹھائے پھرتے ہیں ورنہ اصل میں تو اس جواب سے اس نے اپنی زندگی اور معافی کی بھیک سکندر اعظم سے مانگی تھی۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اس ایک جی دار قسم کی جنگ کے بعد پور کا کردار کس قدر شرمناک، گھٹیا اور رسوا کن رہا۔ سکندر یونانی سے دلیرانہ شکست کھانے کے بعد سکندر کی غلامی اختیار کر کے پورو نے انتہائی گھناؤنے، غدارانہ کردار کا مظاہرہ کیا۔ پورو نے سکندر کے ہم رکاب ہو کر پاکستان کے دوسرے سرداروں اور زبردست مقابلہ کرنے والے قبائل کو جس غداری، کمینگی اور سنگدلی و سفاکی کے ساتھ قتل کرایا کم از کم میں اسے اپنے ملک کی تاریخ کا ایک انتہائی افسوسناک اور سیاہ باب سمجھتا ہوں۔ پورہ (پورس) نے سکندر کی نوکری میں آنے کے بعد گھر کا بھیدی بن کر دوسرے پاکستانی قبائل کی عسکری قوت بیدردی کے ساتھ کچل دینے میں سکندر کا پورا پورا ہاتھ بٹایا۔ شہر اور قصبے بلا تامل آگ میں جھونک دیئے گئے۔ انہیں اس خوفناک حد تک مغلوب کر کے پارہ پارہ کر دیا کہ چندر گپت موریہ جیسے غیر ملکی بھارتی حکمرانوں کے لیے پاکستان پر حملہ کر کے اسے طول طویل مدت تک بھارت کا غلام بنائے رکھنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ بھارت کے موجودہ علاقے بہار کا حکمران چندر گپت موریہ پہلا مشہور بھارتی جنرل تھا جس نے تلوار خونریزی اور بربریت کے بل پر پاکستان پر قبضہ جمایا۔ پھر تو چندر گپت اور دوسرے بھارتی حکمران پاکستان کی دولت جی بھر کے لوٹتے اور سمیٹتے بھارت پہنچاتے رہے۔ چندر گپت موریہ، اس کا بیٹا بندو سار اور پورا اشوک اعظم وہ پہلے معروف غیر ملکی یعنی بھارتی حکمران تھے جنھوں نے پاکستانی علاقوں کو غلامی اور استبداد کے پنجے میں جکڑ رکھا تھا اور انہوں نے یہاں بدھ اور جین مت پھیلانے کے لیے ہر طریقہ، ہر حربہ آزمایا۔ بہر حال پاکستان کی بیرونی غلامی کے اسی زمانے کے اور بعد کے ادوار میں بھارت والوں نے ہندو، بدھ اور جین مذہب سے وابستہ مختلف عقائد و تصورات، دیوی دیوتا، مذہبی اور غیر مذہبی کہانیاں، رامائن و مہا بھارت کی مشہور رزمیہ داستانیں اور ان کے کردار، رام چندر، سیتا، لکشمن، رادھا، ارجن، بھیم اور درو پدی بھگوت گیتا (گیتا دراصل مہا بھارت کا ہی حصہ ہے) بھارتی ہندوؤں کے متبرک دریا اور مقدس شہر مثلاً گنگا، جمنا، متھرا، بنارس (وارا ناسی، کاشی) پریاگ (الہٰ آباد) اور کوروکشیتر، مختلف استعارات، تشبیہات، علامات، الفاظ اور بھارتی ثقافت کے متعدد گوشے پاکستانیوں پر بھرپور انداز میں مسلط کر دیئے۔ مذکورہ بالا

بھارتی مذہبی عقائد کتابوں، شہروں، دریاؤں اور کرداروں کا تعلق پاکستانی علاقوں سے ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ یہ سب بھارتی علاقوں کی پیداوار تھے اس لحاظ سے یہ غیر ملکی اور اجنبی تھے۔ بدھ مذہب اور جین مذہب کا آغاز بھارت سے ہوا تھا۔ رام چندر، سیتا، کرشن، ارجن اور دروپدی وغیرہ جیسے ہندو کردار حقیقی تھے یا فرضی اس سے مَیں اس مرحلے پر بحث نہیں کروں گا یہ بہرحال حقیقت ہے کہ ان سب کرداروں کی جسمانی یا افسانوی تخلیق بھارت ہی میں ہوئی تھی، بھارت کے ان علاقوں یعنی موجودہ صوبہ یو پی اور صوبہ بہار وغیرہ میں جہاں کی زبان، ثقافت، بہت سارے مذہبی تصورات و عقائد اور زندگی کے کتنے ہی دوسرے آداب اس زمانے میں پاکستانیوں کے لیے غیر مانوس اور غیر ملکی تھے۔ بدھ مذہب کا بانی گوتم بدھ اور جین مذہب کا بانی مہاویر وردہمن پاکستان میں نہیں بھارت (صوبہ بہار) میں پیدا ہوئے تھے اور پاکستان والوں کے لیے اجنبی تھے۔ اس طرح مہاتما بدھ اور مہاویر کا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مذکورہ بالا دریا اور شہر پاکستان کے نہیں بھارت کے تھے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آریائی دور یعنی کوئی ساڑھے تین ہزار برس قبل کے زمانے سے اس صورت حال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ آریائی قبائل نے پہلے پاکستان پر حملہ کیا۔ یہاں صدیوں تک آباد رہے اور پھر یہ آریہ پاکستان سے بھارت پہنچے اور ساتھ وہ ایسے مذہبی اثرات، دیوی دیوتا اور دوسری اساطیری کہانیاں وغیرہ بھی بھارت لے گئے تھے جو پاکستان میں موجود تھیں اور وہ بھی جو آریہ باہر سے اپنے ساتھ لے کر پاکستان میں وارد ہوئے تھے۔

قبل از اسلام ملتان کی اہمیت

قدیم سنسکرت یا برہمنی لٹریچر میں وسطی پنجاب (ملوہہ) یعنی ملتان اور ہڑپہ کے وسیع علاقے کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور یہاں کے اہم ترین شہر ملتان کے بارے میں تو اس لٹریچر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے (ہڑپہ اس سے کہیں پہلے ہی مکمل طور پر تباہ و برباد ہو چکا تھا) ملتان شہر سمیت ملوہہ کے دوسرے علاقے سے مختلف اساطیری روائتیں وابستہ ہیں۔ ہندوؤں کے مختلف پرانوں میں ملتان کا ذکر آیا ہے۔ (ہندوؤں کی ان اہم کتابوں یعنی پرانوں کی تعداد اٹھارہ ہے ان میں مجموعی طور پر چار لاکھ بند ہیں۔ پران چھٹی صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی تک لکھے گئے تھے۔ پرانوں میں دیوی دیوتاؤں کے کارناموں کا ذکر ہے۔ ان اٹھارہ کتابوں کے پانچ موضوعات ہیں (i) تخلیق کائنات، (ii) کائنات کی تباہی اور از سر نو تخلیق، (iii) دیوتاؤں اور سورموں کے شجرہ ہائے نسب (vi) منو کی حکمرانیاں (v) سورج اور چندر بنسی حکمرانوں کی تاریخ۔ بہر حال ملتان کو قدیم زمانوں سے ہی مذہبی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور ایک وقت تو ایسا بھی آیا تھا جب نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت کے جنوبی علاقوں تک سے ہندو یہاں کے مشہور بت کی زیارت کو آتے تھے اور زر و جواہر کی شکل میں چڑھاووں کے انبار لگا دیتے تھے اور ہندو پجاری اور براہمن اس بے پناہ دولت پر سانپ بنے بیٹھے رہتے تھے۔ یہ پروہت اور پنڈت

ملتان میں سورج دیوتا مترا کے اہم مندر اور بت کی آڑ لے کر نہ صرف وسطی پنجاب بلکہ پاکستان کے دوسرے حصوں اور بھارت کے غریب ہندوؤں اور عقیدت مندوں کا بری طرح استحصال کر رہے تھے۔ یہ استحصال نقدی، دوسری اشیاء اور نسائی جسموں کی صورت میں ہو رہا تھا۔ حریص پجاری دیوتا کے عقیدت کشیوں کی کمائی کی پائی پائی نچوڑ لینے کی فکر میں رہتے تھے اور ان گنت معصوم لڑکیاں اور پجارنیں ان پجاریوں کے ہاتھوں مندروں کی پراسرار تاریکیوں میں دن رات جنسی شکست و ریخت کا شکار ہوتی رہتی تھیں۔ صدیوں سے اس مندر میں جو بے انداز دولت جمع ہو رہی تھی اس کا قطعاً کوئی مصرف نہیں تھا۔ پجاری اسے دانتوں سے پکڑ کر بیٹھے رہتے تھے۔ اس طرح بے پناہ مالی وسائل ملک میں گردش کرنے کی بجائے ملتان کے اس عظیم الشان مندر کے پیچ در پیچ اندھیاروں میں منجمد پڑے تھے۔ بالآخر مسلمانوں نے اس مندر کی استحصالی مرکزیت اور پنڈتوں کی افسوسناک کارگزاریوں کا خاتمہ کیا اور صدیوں سے بے کار طریقے پر جمع شدہ بے پایاں سرمائے اور دولت کو اپنے کسی بھی مصرف میں لا کر پھیلا دیا۔

ہندوؤں کے زمانے تک آتے آتے ملتان کو مذہبی اہمیت اور مرکزیت حاصل ہوئے تھی۔ ظاہر ہے کہ اس تک پہنچنے میں دس بیس نہیں ہزار ہا برس لگے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہزاروں سال پہلے جو ملتان پہلی بار بڑا شہر یا قصبہ بنا تھا تو اس وقت بھی اسے اگر پاکستان کے بہت بڑے علاقے میں نہیں تو کم از کم ملوہہ یعنی وسطی اور اس کے ساتھ زیریں پنجاب میں مذہبی اہمیت ضرور حاصل تھی اس مذہبی اہمیت کی مثال عراق کے قدیم شہروں اردک، ار، لاگاش اور بالآخر بابل سے دی جا سکتی ہے۔

آریائی دور (۱۵۰۰ قبل مسیح) سے قبل بھی ملتان میں وسیع پیمانے پر سالانہ مذہبی تہوار اور رسوم منائی جاتی تھیں خصوصاً سال نو کا زرعی تہوار۔ فی الحال ٹھوس ثبوت میسر نہ ہونے کی بنا پر یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تہوار خصوصاً سال نو کا زرعی تہوار کس طرح اور کس انداز میں منایا جاتا تھا تاہم میرے نزدیک یہ یقینی ہے کہ ان تہواروں اور پوجا کا ایک لازمی جزو رقص و سرور ضرور ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں باقی دنیا کے قدیم خاص طور پر زرعی تہواروں کے بارے میں جو معلومات اب تک فراہم ہو چکی ہیں ان سے ملوہہ کے مرکزی مقام ملتان میں منائے جانے والے زرعی تہواروں کی نوعیت کا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ہزاروں برس پہلے ملتان کے مرکزی مندر میں اس موقع پر کوئی داستان پڑھ کر سنائی جاتی ہو۔ ناٹک اور سوانگ بھرے جاتے ہوں انسانی قربانی کی جاتی ہو اور سب کے سامنے مندر میں جنسی ملاپ مذہبی رسم کی حیثیت سے کیا جاتا ہو۔

ملتان فی الحقیقت آفتاب پرستی بہ الفاظ دیگر سوریہ (سورج دیوتا) کی پوجا کا اہم ترین مرکز تھا، اتنا کہ نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت کے بعید گوشوں میں بھی اس کا شہرہ تھا، اور یہاں سورج دیوتا کو پوجنے پاکستان تو پاکستان بھارت تک کے دور دراز حصوں سے یاتری آتے تھے۔ یہ بت سورج دیوتا مترا، کا تھا اور سونے کا بنا ہوا تھا بھوشیہ پران میں بھی اس طلائی مجسمے کا ذکر آیا ہے۔ ہندو روایتوں کی رو سے پرہلاد کا پڑپوتا سمبا سورج دیوتا

مترا، کا سرگرم اور پرجوش عقیدت مند تھا۔ سمبا جذام (کوڑھ) کا مریض تھا۔ مترا دیوتا نے اسے اچھا کر دیا چنانچہ سمبا نے شکر گزاری کے طور رپ مترا، کا ایک عظیم الشان طلائی بت بھی بنوایا اور مندر بھی تعمیر کرایا۔ مندر کا نام ادی استھان تھا اور مترا کا وہ سونے کا بت ''ادیتیا'' کہلاتا تھا۔ ادی استھان کا مطلب ''اولین معبد'' مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے بھی اپنے سفر نامے میں سورج دیوتا مترا کے بت کا ذکر کیا ہے جو اس نے خود دیکھا تھا۔ ہیون سانگ کے مطابق پاکستان اور بھارت کے تمام حکمران اس دیوتا کے مندر میں بیش بہا تحائف بھیجا کرتے تھے۔

مسلمان سیاحوں نے بھی مترا کے اس بت کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ بغداد کا المسعودی ۹۱۵ء میں پاکستان کی سیاحت پر آیا تھا اس نے ۹۴۲ء کے لگ بھگ اپنی تصنیف کردہ کتاب میں ملتان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے ملتان کے بارے میں مسعودی نے لکھا ہے:

> ''یہ مسلمانوں کے مضبوط تین سرحدی شہروں میں سے ہے اور اس کے قرب و جوار میں ایک سو بیس قصبے اور دیہات ہیں۔ سندھ اور ہند کے دور دراز کے حصوں میں رہنے والے لوگ یاترا کے لیے (ملتان) آیا کرتے ہیں۔ وہ سیم و زر، قیمتی پتھر (ہیرے جواہرات) اور قسم کی خوشبوئیں ایلوے (عود؟) کی لکڑی (مترا کے بت کے حضور) نذر گزارتے ہیں اس بت کو جو نذرانے پیش کئے جاتے ہیں ملتان کا والی انہی میں سے اپنے محصولات کا بیشتر حصہ نکال لیتا ہے۔''

اصطخری اور ابن حوقل نے مترا کے اس بات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان (بہ الفاظ دیگر سورج دیوتا کے بت) کی ہندو بے حد تکریم کرتے تھے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ یہ نذرانے مندر اور اس کے متعلقین (پنڈتوں پروہتوں اور دیو داسیوں وغیرہ) پر خرچ کئے جاتے تھے۔ مندر تین سو فٹ اونچا تھا اور بہت مضبوط و مستحکم بنا ہوا تھا۔ مندر شہر کے سب سے زیادہ گنجان آباد بازار میں ہاتھی کا دانت کا کاروبار کرنے والوں کی گلیوں اور ٹھٹھیروں کے گھروں کے قریب واقع تھا۔ یہ مجسمہ تقریباً چھتیس فٹ اونچا تھا اور مندر کے وسط میں ایک قبہ یا گنبد کے نیچے تھا۔ اس کے گرداگرد مندر سے وابستہ پنڈت اور پجاری رہتے تھے۔ یہ مجسمہ اینٹوں سے بنے ہوئے شہ نشین پر نصب تھا۔ (اس وقت یہ لکڑی کا تھا اس سے پہلے جعلم بن شعبان نے سونے کا مجسمہ توڑ ڈالا تھا) اس کی صورت انسانی تھی اور اس پر سرخ قرطبی چمڑا منڈھا ہوا تھا دیوتا آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے۔ انگلیاں باہم ملی ہوئی تھیں دونوں آنکھوں میں دو یاقوت جڑے تھے اور سر پر سنہری تاج تھا۔

البیرونی جب ملتان آیا تو اس وقت نہ تو مندر تھا اور نہ ہی بت۔ قرامطہ اسے برباد کر چکے تھے حالانکہ

ان سے قبل محمد بن قاسم فاتح سندھ نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ بہرحال البیرونی نے اپنی تحریروں میں اس بت کو لکڑی کا بتایا ہے۔ گو قدیم نوشتوں اور ہیون سانگ وغیرہ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سونے کا بنا ہوا تھا اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو یہ کہ یہ ابتداً سونے کا ہی تھا مگر البیرونی سے پیشتر کسی غنیم نے اسے تباہ کر دیا اور دوبارہ اسے خالص سونے سے نہیں بلکہ لکڑی سے بنایا گیا اور اس پر سونے کا کام کر دیا گیا۔ یا پھر شروع سے ہی یہ بت چوبی رہا ہوگا۔ لیکن اس پر سونے کا کام تھا۔ اس لیے چوبی ہوتے ہوئے بھی ابتدا سے ہی یہ سونے کا مشہور ہو گیا۔ البیرونی نے مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کر کے اس بت کے بارے میں اپنی مشہور تصنیف ''کتاب الہند'' میں لکھا:

> ''ملتان میں ہندوؤں کا مشہور بت تھا جو سورج دیوتا کا بت تھا۔ اسی لیے یہ ''ادیتیا'' کہلاتا تھا۔ یہ مجسمہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس پر قرطبہ کا چمڑا منڈھا تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں دو سرخ یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ روایت یہ ہے کہ یہ بت کرت جگ، کے بالکل آخری حصے میں بنایا گیا تھا۔ اس دور کو بیتے ہوئے دو لاکھ سولہ ہزار چار سو بتیس برس گزر چکے ہیں ...... جب (محمد بن قاسم کے بعد) قرامطہ نے ملتان پر قبضہ کیا تو غاصب جعلم بن شعبان نے اس بت کے ٹکڑے اڑا دیئے اور پجاریوں کو قتل کر دیا۔ اس (جعلم) نے اینٹوں سے ایک اونچی جگہ اپنا محل بنوایا ......لکڑی اتنی طویل مدت تک کیسے برقرار رہ سکتی ہے خصوصاً ایسی جگہ جہاں آب و ہوا اور زمین نسبتاً نم ہیں۔''

البیرونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملتان کے لوگ ایک تہوار مناتے ہیں۔ اس تہوار کو سامب پوریاترا کہتے ہیں۔ یہ تہوار سورج (دیوتا) کی تعظیم میں منایا جاتا ہے اور وہ سورج کی پوجا کرتے ہیں البیرونی کے کوئی دو سو سال بعد جب ۱۱۳۰ء میں مشہور مسلم جغرافیہ داں الادریسی نے اپنی کتاب لکھی تو ملتان میں سورج دیوتا کی پوجا اسی زور شور سے پھر شروع ہو چکی تھی ادریسی نے ملتان کے مندر اور بت کے بارے میں لکھا ہے۔

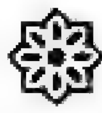
> ''یہ مندر شہر کے وسط میں مصروف ترین بازار میں ہے۔ عمارت گنبد نما ہے۔ گنبد کے اندرونی حصے پر سونا (آب زر) پھیرا گیا ہے۔ گنبد اور مندر کے دروازے انتہائی مضبوط بنائے گئے ہیں۔ ستون بہت اونچے ہیں اور دیواروں کو مختلف رنگوں سے مزین کیا گیا ہے۔ سندھ یا ہند میں کوئی بت ایسا نہیں جس کی تعظیم کی جاتی ہو۔ لوگ اسے

قانون (فرض) کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس (دیوتا) کی موجودگی سے الوہی حفاظت مل جاتی ہے اور وہ اسے تمام مصائب اور بدبختیوں کے خلاف محافظ خیال کرتے ہیں۔ جب کوئی آس پاس کا حکمران ملتان کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے تو پجاری حملہ آور کو سورج دیوتا کے غیض و غضب سے ڈراتے ہیں اور اس (غنیم) کی تباہی کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ چنانچہ حملہ آور فوراً واپس آ جاتے ہیں۔''

ذکریا القزوینی نے ۱۲۶۳ھ کے لگ بھگ اپنی کتاب میں لکھا:

''ملتان ایک بہت بڑا مضبوط و مستحکم شہر ہے، یہاں کا مندر ہندوؤں کی جائے یاترا اور پرستش ہے، جیسے کہ مسلمانوں کے لیے مکہ ہے۔''

(سات دریاؤں کی سرزمین – ابن حنیف)



محمد اسلم میتلا

ملتان میں اہلِ ہنود

ظہور اسلام سے صدیوں قبل ملتان ہندو تہذیب وتمدن کا مرکز تھا۔ ہندوؤں کی دیو مالا کے مطابق برہما کے لڑکے کشپ نے اسے آباد کیا اور اسی کے نام پر اس کا نام کشپ پورہ تجویز ہوا۔ کشپ کا بیٹا پر ہلاد خدا کے وجود کا قائل تھا۔ جس پر باپ بیٹے میں اختلاف بھی ہوا۔ اس کے عہد میں اس کا نام پر ہلاد پورہ تھا۔ ازاں بعد سنب پورہ ہنس پور بھاگ پور اور مول استھان بھی اس نے نام رہے۔ مول استھان سے ملتان بن گیا۔

سکندر اعظم کے وقت میں ہندوؤں کی ایک شاخ مالی یہاں آباد تھی۔ یہ 327 قبل مسیح کا زمانہ یہ سکندر اعظم کے ملتان پر قبضے کے بعد اس کی سلطنت کے حصے بخرے ہوئے تو چندر گپت موریہ نے موقع پا کر یونانیوں کو بھگا دیا اور مغربی ہند پر قابض ہو گیا۔ سلوکس جو سکندر اعظم کا ساتھی تھا اس نے پھر ملتان کا رخ کیا اور قبضہ جما لیا۔ اس نے ہندوستانی راجوں سے صلح کر لی اور اپنی بیٹی کی شادی چندر گپت موریہ سے کر دی۔ مشہور یونینی سیاح میگنیتھیسز نے اپنی کتاب انڈیکا میں لکھا ہے کہ چندر گپت کی فوج ایک لاکھ ساٹھ ہزار پیادوں اور تین ہزار سواروں پر مشتمل تھی۔ چندر گپت کا پوتا اشوک اعظم رفاہ عامہ میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے کنوئیں تالاب بنوائے اور درخت لگوائے۔ اس کا صدر مقام ٹیکسلا تھا۔ اس زمانے میں کشمیر ملتان اور بلوچستان اور افغانستان پر مشتمل ایک صوبہ تھا اور سلطنت چار صوبوں پر مشتمل تھی۔

آغاز اسلام کے دور میں رائے سہارس کی سندھ پر حکومت تھی۔ اس کی سلطنت بھی چار صوبوں پر مشتمل تھی اور ملتان ایک صوبہ تھا۔ یہ حکمران عوام میں بہت مقبول تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ساہسی حکمران ہوا جس کی رانی نے اسے دھوکہ دیا اور ایک پجاری چچ کو اپنا لیا۔ سہارس کے انتقال کے بعد صوبے خود مختار ہو چکے تھے۔ چچ نے بھاٹیہ اور اسکلندہ کے قلعے فتح کرنے کے بعد ملتان کا رخ کیا جہاں سہارس رائے کا رشتہ دار بھجڑہ حکمران تھا۔ جس نے خونریز جنگ کے بعد صلح کر لی اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ کشمیر چلا گیا۔ اس نے ناجائز ٹیکس بھی معاف کر دیئے۔ چچ کے بعد راجہ داہر سندھ کا حکمران ہوا اور اس نے اپنے بھتیجے گوڑسنگھ کو ملتان گورنر مقرر کر دیا۔

خلیفہ بن ولید بن عبدالمالک کے دور میں مسلمان عورتوں سے بدسلوکی پر محمد بن قاسم نے راجہ داہر پر حملہ کیا

اور سرخرو ہوا۔ اس کے بعد ملتان پر 712ء پر قبضہ کرلیا۔ اس زمانے میں ملتان میں قدیم عہد کے آدیتا دیوتا کے طلائی بت کا وجود ملتا ہے جسے انسان سمجھ کر محمد بن قاسم نے اس کا سر اڑانے کے لیے تلوار نکال لی تھی یہ بت پر ہلاد مندر کے قریب تھا۔ مشہور سیاحین اصطخری اور ابن رستہ نے بھی اس بت کی قدامت کا تذکرہ کیا ہے۔ مسعودی 951ء میں لکھتا ہے کہ جب ہندو راجے ملتان پر حملہ آور ہوتے تو ملسمان دھمکی دیتے کہ اس بت کو توڑ دیں گے۔ تو فوجیں واپس چلی جاتی تھیں۔ پنڈت گرہم گوپت نے ملتان میں علم ہیئت پر ایک کتاب جس میں سیاروں سورج گرہن چاند گرہن کے بارے میں معلومات تھی ''سدھانت'' کے عنوان سے لکھی جس کا عربی میں ترجمہ ''السند ہند'' کے طور پر 771ء میں ریاضی دان ابراہیم فرازی نے کیا۔ عرب پہلے عدد لفظوں میں لکھتے تھے اس کے بعد ہندوسوں میں لکھنے لگے۔ جنہیں وہ ارقام ہندیہ کہتے تھے۔ درلب ملتانی نے ایک جنتری ترتیب دی۔ جس میں طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے اوقات درج تھے۔ علم نجوم سے متعلق ایک کتاب شکہت برت کے نام سے لکھی۔ براماہر فن تعمیر کا ماہر تھا اور اس نے فن تعمیر پر ایک کتاب تصنیف کی۔

ماسوائے مختصر عرصہ کے مسلمانوں کا عہد 1818ء تک جاری رہی۔ جب رنجیت سنگھ نے ملتان پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کی طرف سے یہاں سکھدیال بدن ہزاری مٹھامل مختصر عرصے کے لیے صوبیدار ملتان رہے۔ مگر شاہی خزانہ میں رقم داخل نہ کر سکے اور موقوف ہوئے۔ دیوان ساون محل کو دیوان ملتان مقرر کیا گیا تو اس نے انصاف پروری میں نام پیدا کیا۔ جس کے دور میں چوری ختم ہوگئی۔ ایک چور کی جب سفارش کی گئی تو چور کو سفارشی کے گھر کے سامنے پھانسی پر لٹکا کر سفارش کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ زنا اور بدکاری بند ہوگئی زانی اور زانیہ کو گھسیٹ گھسیٹ کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ عام خاص باغ اور تالاب سورج کنڈ کی مرمت کرائی۔ تاہم شاہ سبزواری کی خانقاہ کو گوردوارہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور سکھوں کی مشہور کتاب گرنتھ صاحب پڑھی جاتی تھی۔ 1844ء میں دیوان ساون مل کو اس کے اپنے ہی ایک سپاہی خدادادخان نے گولی کا نشانہ بنا دیا۔

دیوان مولراج دیوان ساون مل کا بڑا لڑکا تھا جو اس کا جانشین ہوا۔ انگریزوں نے کاہن سنگھ کو حاکم ملتان مقرر کیا تو قبضہ دلانے کے لیے دو انگریز مسٹر ایگنیو اور لیفٹیننٹ اینڈرسن 16 اپریل 1848ء کو ملتان پہنچے۔ دیوان مولراج نے ان کا استقبال کیا۔ 19 اپریل کو مولراج کاہن سنگھ اور متذکرہ بالا دو انگریزوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ امیر چند سپاہی نے برچھی کا وار کر کے مسٹر ایگنیو کو گرا دیا اور خود بھاگ گیا۔ جس پر مولراج نے اپنے محل کا رخ کیا جہاں اس کی والدہ نے طعن وتشنیع کی۔ جنگ کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ جس سے قلعہ کی عمارت کو نقصان پہنچا اور قلعہ کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا۔ دیوان کو اس کے مقربین نے ہتھیار ڈال دینے کی صلاح دی بصورت دیگر زہر کھا لینے کا مشورہ دیا۔ دیوان نے ایک درخواست برائے جان بخشی جنرل وش کے نام بھجوائی اور 22 جنوری 1849ء کو دولت دروازے کے جنرل مقام پر اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ اس پر انگریزوں نے قتل کا مقدمہ کلکتہ میں چلایا اور عبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور 1850ء میں انتقال ہوا۔

انگریزوں کے عہد میں ہندو آبادی نے انگریزی تعلیم کی طرف سے بھرپور توجہ دی جبکہ مسلم آبادی نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی حتیٰ کہ انگریزی دور کے آخری حصہ میں سال 38-1937ء میں بھی اعداد وشمار کی روشنی میں صورتحال کچھ اس طرح تھی کہ جماعت دہم میں 305 طلبا ہندو تھے جبکہ مسلمان طلبہ کی تعداد 118 تھی۔ ایمرسن کالج میں 1938ء میں لالہ اسد انند (علم طبیعات) پنڈت گپت رائے (ہندی) لالہ جے دیال (انگریزی) لالہ کندن لال (تاریخ) لالہ دیس راج (ریاضی) لالہ بالکشن ملک (بیالوجی) ہیرا لال آنند (کیمسٹری) بطور استاد خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

ہندو آبادی میں معاشرتی مدارج کے مطابق القاب مروج تھے اعزازی القاب میں ہندو بھی ملک اور چوہدری کا لقب اختیار کئے ہوئے تھے۔ خوشحال اروڑوں کو مہتہ بھی کہا جاتا تھا۔ برہمن پنڈت کہلاتے تھے۔ ملتان کے کھتری ملک یار رائے زادہ کہلاتے تھے۔ اس علاقے میں اہل ہنود کی زیادہ آبادی اروڑہ قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ جو عام طور پر تجارت اور ملازمت پیشہ تھی۔ اروڑہ قوم کی بڑی ذاتوں میں دھنہ، بجاج، تنیجہ، بربجہ، بترہ کرہ، سدانہ، چوپڑہ، ککڑ، منجال، کنیجہ، دوریجہ، گدڑا، اتردھی، تھریجہ، چاولہ، تانکپال، ٹھکرال، کلریجہ، سچدیو اور اچھلانی تھیں۔ بھاٹیہ قوم تعداد میں کم تھی مگر شجاع آباد میں اس کی وسیع زمینداری تھی۔ یہ راجپوت تھے اور اس کی 84 شاخیں تھیں۔ مگر بیلہ مشہور شاخ ہے۔ 1860ء میں دیوان ساون مل نے بھاٹیہ بیلہ خاندان کے چوہدری جیسمل سے انتظام میں مشورہ لیا۔ ان کے بیٹے چوہدری موہن سے بھی دیوان کے مراسم تھے۔ چوہدری کھیم سنگھ خلف چوہدری، مومن لعل پر انگریز بہت اعتماد کرتے تھے۔ اور اس نے مہربان دوست کا لقب حاصل کیا۔ ان کے پوتے چوہدری بھگوان سنگھ 1905ء میں ڈویژنل درباری مقرر ہوئے۔ شجاع آباد کمیٹی کے 1927ء میں صدر منتخب ہوئے۔ چوہدری نرائن سنگھ کے بیٹے چوہدری پرتاب سنگھ بھی شجاع آباد کمیٹی کے صدر رہے۔ شجاع آباد کے چاولہ خاندان کے چوہدری چیلا رام ذیلدار علاقہ اور تین مواضعات کے نمبردار تھے۔ اسی طرح چوہدری جمیعت رائے ذیلدار ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی چوہدری شام سنگھ بیس سال سے زائد عرصہ تک شجاع آباد کمیٹے کے ممبر رہے۔

پنڈت جیون لعل متواتر پندرہ سال تک کنٹونمنٹ بورڈ ملتان کے ممبر رہے۔ ان کے والد بشمبر ناتھ ریاست بہاولپور میں سیکرٹری اسسٹنٹ کونسل رہے۔ ان کے ایک چچا سکھوں کے عہد میں عدالت کرتے تھے۔ ایک چچا ملتان کے کوتوال تھے۔

پنڈت شودت ترکھانے کلکتہ میں 1908ء تا 1912ء میڈیکل کی تعلیم حاصل کی اور 1912ء میں ملتان میں طبی پریکٹس شروع کی۔ 1912ء میں کمیٹی کیممبر نامزد ہوئے 1922ء سے 1936ء تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ ان کے بھائی لالہ ایشو چند راولپنڈی میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ دوسرے بھائی پنڈت مکیش چندر قادیان میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ تیسرے بھائی پنڈت رمیش چندر ایبٹ آباد میں پنجاب نیشنل بینک کے منیجر تھے جبکہ چوتھے بھائی پنڈت گنپتی کاشتکاری سے متعلق تھے۔

سیٹھ شیونرائن ڈویژنل خزانچی آنریری مجسٹریٹ اور مالک سیٹھ ہر بھگت رائے گوپال سہائے تھے۔ کوڑا لال مدن لال مشہور تاجر تھے۔ جن کی اولاد نے بھی تجارت میں نام کمایا۔ اسی طرح دگمبر جین اوگوانی نے چوک بازار میں تجارت شروع کی اور دکان بھولا رام کھب داس کے نام سے مشہور ہوئی۔ ملک گیلا رام وجھ نے ریشم کا کاروبار شروع کیا۔ اس کے لڑکے کے گردھاری لال نے گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا اور صوبہ بھر میں اول آیا اور بعد میں ایم بی بی ایس کیا اور میو ہسپتال میں مقرر ہوا۔ ملک موہر لعل سب جج کے مقابلے میں صوبہ بھر میں اول رہا جبکہ ملک پر مانند علم الاقتصاد کے پروفیسر تھے۔

تقسیم سے قبل ملتان کے مشہور ڈاکٹروں میں ڈاکٹر ودہا رام، ڈاکٹر کے کے مہتا، ڈاکٹر اتم چند کھنہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر ودھا رام نے اپریل 1888ء میں اسسٹنٹ سرجن کا امتحان پاس کیا اور 1889ء میں میلسی میں تقرری ہوئی 1920ء میں پنشن پانے کے بعد میلسی کمیٹی کے نائب صدر رہے کئی عالیشان مکانات تعمیر کرائے۔ ان کی اولاد میں ڈاکٹر لال چند بھی ایم بی بی ایس تھے۔ ڈاکٹر لال چند نے بھی میلسی میں پرائیویٹ پریکٹس اور میلسی ٹاؤن کمیٹی کے نائب صدر رہے۔

تقسیم سے قبل پنجاب لیجلیسٹو اسمبلی کے وقتاً فوقتاً ہندو ممبران لالہ ہری چند رائے بہادر لالہ شام لعل (مغربی ملتان چوک کچہری) منشی ہاڑی لعل وکیل (جنوب مغربی قصبات) تھے۔ نامزد ممبران ڈسٹرکٹ بورڈ میں چوہدری بھگوان سنگھ پرتاب سنگھ (شجاع آباد) مہتہ چیتن آنند (لودھراں) گھنشام داس (خانیوال) مہتہ ٹھاکر داس (میلسی) رائے زادہ ترتھ رام (ملتان) اور چوہدری رام چند تھے۔ سیاسی میدان میں جماعتی سطح پر لال شیو دیال ایڈووکیٹ پردھان ہندو مہا سبھا جبکہ لال کیول کرشن ضلع کانگرس کے صدر تھے۔

صحافت کے میدان میں اہل ہنود نہایت متحرک تھے اور تیرہ ہندو اخبار مختلف اوقات میں یہاں سے شائع ہوتے رہے۔ جن کا نام اور ایڈریس اس طرح ہیں۔

نام	ایڈیٹر
ڈنڈا	سیوا رام مستانہ
ہنٹر	ہنس راج نانگیہ
بیدار	دیوان ایشور دت
حقیقت	سکھانند چوپرہ
مسافر	لالہ ہمت رائے
شان ہند	ودیا پرکاش سرور
ہندو درد	پنڈت رگھناتھ رائے
گھن چکر	دیوداس گاندھی

ویر کیسری	پنڈت شودت رنگا
دیر پرتاب	سیوارام مستانہ
دیش بھگت	منشی ہاڑی لعل وکیل
PEACE	رگھنا رائے

علم اور کتاب کا بہت گہرا تعلق ہے ملتان کی قدیم پبلک لائبریری لانگے خان کی ملتان کی علمی زندگی میں گراں قدر خدمات ہیں۔اس لائبریری کی کارکردگی بڑھانے میں ہندو معززین نے بھرپور حصہ لیا۔اس سلسلے میں لالہ ہری چند (دور صدارت 1913ء تا 1920ء) مہتہ ٹیک چند (دور صدارت 1921ء تا 1928ء) لالہ چیتن آنند (دور صدارت 1929ء تا 1935) رائے بہادر دیوان کھلندا رام (دور صدارت 21932ء تا 1942ء) لالہ بالکش بترہ (دور صدارت 1942ء تا اکتوبر 1947ء) کی خدمات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بالکش بترہ۔لعل چند فلک ملتانی۔بھیم سین ظفر ادیب، پنڈت جیون لعل شوق، جے چند پریم ملانی کے اسماء شعر و ادب کے میدان میں قابل ذکر ہیں۔ان کا کلام مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا رہا۔

ملتان کے ہندو وکلا میں بگائی خاندان نہایت شہرت کا حامل تھا لالہ پرمانند ملتان بار ایسوسی ایشن کے پہلے صدر تھے ان کے فرزند لالہ کرم نرائن دیوانی کے مشہور وکیل تھے۔ہندو وکلاء میں سے انہوں نے سب سے پہلے کار خریدی۔ان کے بھائی لالہ وشنو بھگوان امرتسر میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔دیوان کھلندا رام سال 1946ء میں صدر بار ایسوسی ایشن تھے۔لالہ ہمت رائے بھگت نرائن، مہتہ گوبند رام، لالہ سیوا رام بالکش بترہ، مہتہ ویژ بھان، رائے زادہ ترتھ رام، گیان چند اور لالہ برج لال دیگر مشہور وکلا تھے۔

(ملتان نامہ-محمد اسلم میتلا)



محمد اسلم میتلا

نواحِ ملتان اور بدلتے مراکز

نواح ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ملتان کے ماضی کی تاریخ کے مطالعے سے مل جانا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ملتان ماضی بعید میں ایک صوبائی دارالحکومت کی حیثیت سے موجود رہا ہے اور وقفوں وقفوں سے ایک خودمختار سلطنت کی حیثیت سے اپنا وجود رکھتا رہے ہے۔ اس کی حدود میں بھی مختلف اوقات میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ ملتان، بہاول پور اور ڈیرہ غازی خان کے سابق ڈویژنوں میں مشمولہ علاقہ انتظامی طور پر ماضی میں ملتان میں قائم حکومت کے ماتحت رہا ہے اور لسانی، تمدنی اشتراک کا حامل بھی رہا ہے۔ اس علاقے میں واقع شہروں اور قصبوں کو بھی اپنے جغرافیائی حالات اور محل وقوع کی وجہ سے اپنی اہمیت میں اضافہ اور کمی کا سامنا رہا ہے جس کے نتیجے کے طور پر انتظامی لحاظ سے تبدیلیا آتی رہی ہیں۔ ذیل میں ہم انہی تبدیلیوں کو موضوع بنا رہے ہیں تاکہ تاریخ کے طالب علموں کے لیے سہولت کی ایک صورت پیدا ہو سکے۔

انگریزوں کی آمد پر ملتان کو ضلع کا درجہ دے گیا گیا جس میں اولاً پانچ تحصیلیں ملتان، شجاع آباد، لودھراں (کچھ عرصہ ہیڈ کوارٹر کوٹ پیر سادات) میلسی اور سرائے سدھو قائم کی گئیں۔ نہر سندھنائی کی احداثی کے نتیجے میں سرائے سدھو سے تحصیل ہیڈ کوارٹر کبیر الا منتقل کیا گیا۔ نہر لوئر باری دوآب کی احداثی کے بعد کبیر والا تحصیل سے خانیوال تحصیل بنائی گیئی۔ میلسی تحصیل سے نئی تحصیل وہاڑی بنائے گئی۔ سابق ضلع ملتان کی تین تحصیلوں وہاڑی (1976) خانیوال (1985) اور لودھراں (1992) کو ضلع کا درجہ دے گیا۔ وہاڑی میں ایک نئی تحصیل بورے والہ، خانیوال میں دو نئی تحصیلیں میاں چنوں، جہانیاں اور لودھراں میں دو نئی تحصیلیں کہروڑ پکا اور دنیا پور قائم کی گئیں۔

مئی 1849ء میں برطانوی قبضہ کے بعد لیہ اور خان گڑھ اضلاع بنائے گئے۔ خان گڑھ ضلع میں موجود تحصیل مظفر گڑھ، تحصیل علی پور، گڑھ مہاراجہ اور احمد پور کے تعلقے (جواب ضلع جھنگ میں شامل ہیں) کے علاقے شامل ہوئے۔ خان گڑھ کو پہلے پہل ضلعی ہیڈ کوارٹر کا درجہ دیا گیا مگر سال 1849ء کے اختتام سے قبل ہیڈ کوارٹر (دفاتر) مظفر گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ (1) خان گڑھ ضلع چار تحصیلوں پر مشتمل تھا۔ رنگ پور کھیڑا (شاہ جمال) سیت پور اور خان گڑھ (جس کا ہیڈ کوارٹر مظفر گڑھ میں تھا) شامل ہوئیں۔ سناواں تحصیل جس کا ہیڈ کوارٹر کوٹ ادو میں تھا۔ (2)

اولاً ضلع لیہ میں شامل کی گئی مگر 1859ء میں مظفر گڑھ میں شامل کی گئی۔ 1861ء میں تحصیل رنگ پور ختم کر دی گئی اور احمد پور اور گڑھ مہاراجہ کا علاقہ ضلع جھنگ میں شامل کر دیا گیا۔ (3) کینجھر تحصیل بھی ختم کر دی گئی اور اس کا علاقہ مظفر گڑھ میں ایزاد کر دیا گیا۔

ضلع لیہ میں برطانوی راج کے آغاز میں جن تحصیلوں کو شامل کیا گیا ان میں میانوالی، بھکر، لیہ اور کوٹ ادو شامل تھیں۔ (4) سال 1861ء میں لیہ کمشنری کو ختم کر دیا گیا اور ڈیرہ اسماعیل خان کو کمشنری بنا دیا گیا۔ ضلعی صدر مقام سے بھی لیہ کو محروم کر دیا گیا اور اسے ڈیرہ اسماعیل خان کی تحصیل بنا دیا گیا۔ نئی تحصیل لیہ میں جو علاقہ شامل کیا گیا اس میں چوبارہ، نواں کوٹ، موج گڑھ شامل تھے (یہ علاقہ منکیرہ جسے (54-1853) میں توڑ دیا گیا اس سے قبل شامل تھے) اس کے علاوہ پہاڑ پور کا علاقہ سال 1861ء میں کوٹ ادو تحصیل سے الگ کر کے لیہ تحصیل میں شامل کر دیا گیا۔ (5) سال 1869ء دریا کے ساتھ ساتھ کے علاقے کو ڈیرہ غازی خان ضلع کی تحصیل سنگھڑ (تونسہ) سے لیہ تحصیل میں شامل کر دیئے گئے۔ سال 1874ء میں سکھانی اور چھ دیگر دیہات مزید سنگھڑ تحصیل سے لیہ تحصیل میں شامل کیئے گئے۔ کرنل راس لیہ کمشنری کے پہلے کمشنر مقرر کیئے گئے جو 1850ء سے 1857ء تک (تا مرگ) رہے۔ کرنل راس کی قبر لیہ شہر کے شمال میں آج بھی موجود ہے۔ میجر پولاک جو ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خان تھا چند ماہ تک قائم مقام کمشنر رہا اور بعد ازاں میجر براؤن نے اس کی جگہ لی سال 1860ء تک تعینات رہا لیہ کے پانچ ڈپٹی کمشنر رہے۔ کیپٹن ہالنگ (1852-1849) پہلا ڈپٹی کمشنر تھا جبکہ آخری ڈپٹی کمشنر لیفٹیننٹ سائکی (1860) تھا۔ جب سال 1901ء میں پنجاب سے شمال مغربی سرحدی صوبہ کا قیام عمل میں لایا گیا تو نیا ضلع میانوالی بنایا گیا جو چار تحصیلوں عیسیٰ خیل میانولی بھکر اور لیہ پر مشتمل تھا اور ضلع میانوالی کو ملتان ڈویژن میں شامل کر دیا گیا۔ اپریل 1909ء میں لیہ تحصیل کو مظفر گڑھ ضلع مین شامل کر دی یا اور اسے سب ڈویژن بنا دیا گیا (6) کوٹ ادو تحصیل اگرچہ پرانا لیہ ضلع میں شامل تھی مگر سال 1859ء میں اسے مظفر گڑھ ضلع میں شامل کر دیا گیا۔ تحصیل کوٹ ادو کا پرانا ہیڈ کوارٹر کوٹ ادو میں تھا مگر سال 1871ء میں ہیڈ کوارٹر تحصیل کو سناواں منتقل کر دیا گیا۔ اور نام بھی تحصیل سناواں کر دیا گیا۔ سال 1919ء میں سیم کی زیادتی کی وجہ سے تحصیل کا ہیڈ کوارٹر کوٹ ادو واپس منتقل کر دیا گیا۔ موجودہ تحصیل علی پور کا علاقہ ہمیشہ سے ضلع مظفر گڑھ کا حصہ رہا ہے۔ تحصیل کا ہیڈ کوارٹر پہلے سیت پر میں تھا جو بعد ازاں علی پور منتقل کر دیا گیا۔

بھکر تحصیل اولاً دریا خان میں واقع تھی۔ اور دریا خان تحصیل کہلاتی تھی۔ انگریزی قبضہ کے وقت یہ علاقہ دریا خان اور منکیرہ تحصیلوں پر مشتمل تھا۔ 54-1853ء میں منکیرہ تحصیل میں شامل کر دیا گیا۔ (7) تحصیل دریا خان کے علاقہ پیلاں اور ہرنولی کو میانوالی تحصیل میں شامل کر دیا گیا۔ جو اس وقت کچھی شمالی کہلاتی تھی۔ بقیہ علاقہ دریا خان تحصیل پر مشتمل تحصیل بھکر قائم کی گوی۔ سال 1861ء میں لیہ ضلع اور کمشنری کو ختم کر دیا گیا اور ڈیرہ جات ڈویژن قائم کر دیا گیا۔ (8) جس کا ہیڈ کوارٹر ڈیرہ اسماعیل خان اور ضلع ڈیرہ غازی خان کی حدود میں ردوبدل سال 1866ء تا 1871ء میں کیا گیا جس کے تحت فیصرانی قبیلہ کا علاقہ ڈیرہ غازی خان میں شامل کیا گیا۔ (9) 1877ء میں ڈیرہ

غازی خان ڈیرہ اسماعیل خان کی حدود پر دونوں طرف واقع دیہات اور ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ کی حدود پر واقع دونوں طرف واقع دیہات اور ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ کی حدود پر واقع دونوں طرف واقع دیہات کا نوٹیفکیشن جاری کیا گیا۔

ڈیرہ غازی خان کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ ضلعی ہیڈ کوارٹر باوجود اس امر کے قائم رہا کہ پرانا ڈیرہ غازی خان شہر دریا برد ہو گیا جو اس جگہ آباد تھا جہاں اس وقت غازی گھاٹ کا پل ہے دریائے سندھ رواں ہے نیا اور موجودہ ڈیرہ غازی خان شہر سال 1910ء میں منصوبہ بندی کے تحت بلاک سسٹم کے تحت آباد کیا گیا۔ پرانا ڈیرہ غازی خان شہر پانچ سو سال قبل غازی خان میرانی نے آباد کیا تھا (10) اس کے درمیان سے کستوری نہر رواں تھی۔ پرانے ڈیرہ غازی خان والی جگہ پر بھی کبھی دریائے سندھ رواں تھا۔ شہر کے مکمل طور پر دریا برد ہونے سے قبل 1856ء چھاؤنی اور سول لائنز کا علاقہ جو شہر کے شرقی جانب واقع تھا۔ (11) سیلاب کی نذر ہو گیا اور 1862ء میں نئی چھاؤنی تعمیر کی گئی اور پرانا ڈیرہ غازی خان موجودہ تھانہ دراہمہ کی عمارت کے قریب تک آباد تھا۔ بعد ازاں موجودہ شہر سے تقریباً نو دس میل جانب غرب آباد کیا گیا۔ انگریزوں نے قبضہ کے بعد ضلع کی چار تحصیلیں ڈیرہ غازی خان سنگھڑ داجل اور کوٹ مٹھن قائم کیں۔ تونسہ کے علاقے کو سنگھڑ کہا جاتا تھا۔ جس کا ہیڈ کوارٹر منگروٹھہ میں تھا۔ مگر بعد ازاں تحصیل کا ہیڈ کوارٹر تونسہ منتقل کر ہو گیا اور نام بھی تونسہ تحصیل کر دیا گیا (12) 1853ء میں تحصیل کوٹ مٹھن قائم کی گئی مگر 1866ء میں راجن پور کو تحصیل ہیڈ کوارٹر مقرر کیا گیا کیونکہ پرانا کوٹ مٹھن سال 1862ء میں سیلاب کی نذر ہو گیا اور موجودہ قصبہ پرانے قصبہ سے جانب غرب پانچ میل کے فاصلے پر موجودہ جگہ آباد کیا گیا۔ اسی طرح سال 1861ء میں داجل کی بجائے جام پور میں تحصیل ہیڈ کوارٹر منتقل کیا گیا کیونکہ داجل ایک گوشہ میں واقع تھا۔ (13)

سابقہ ریاست و ڈویژن بہاول پور کا شہر بہاول پور نواب بہاول خان اول نے 1748ء میں آباد کیا۔ انتظامی تقسیم کے لحاظ سے انیسویں صدی میں ریاست چھ کارداریوں اور بتیس تھانوں پر مشتمل تھی۔ تفصیل کارداری اور تھانہ جات حسب ذیل ہے۔ (1) منچن آباد منگلوٹ گنج منچن آباد جاویکا صادق پور (2) خیر پور شہر فرید، حاصل پور خیر پور مروٹ، سردار گڑھ (3) بہاول پور، بہاول پور شہر، علاقہ بہاول پور، چکلہ لوہرہ، مسافر خانہ، موج گڑھ (4) احمد پور، احمد پور، چار کوٹھی اوچ، کوٹ چنی (5) خان پور، خان پور، خان بیلہ، غوث پور، اسلام گڑھ، پکا لاڑاں، الہ آباد (6) صادق آباد، نوشہرہ، آباد پور، بھونگ، فتح پور، ماچکا، کوٹ سابہ، کوٹ سبزل (14) بعد ازاں انتظامی اکائی کارداری کی بجائے نظامت کا نام دیا گیا۔ اور ایک نظامت میں تحصیلیں شامل کی گئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ریاست بہاول پور انتظامی طور پر نظامتوں میں تقسیم کیا گیا تھا (15) تفصیل نظامت ہائے درج ذیل ہے (1) منچن آباد و نہر صادقیہ (یا چولستان) ہیڈ کوارٹر بہاول نگر، خیر پور ٹامیوالی (5) بہاول پور، بہاول پور، احمد پور شرقیہ، اللہ آباد (3) خان پور، خان پور، نوشہرہ (صادق آباد، رحیم یار خان) احمد پور لمہ۔

یہاں ایک ابہام دور کرنے کی ضرورت نظر آتی ہے جہاں لفظ رحیم یار خان اور صادق آباد استعمال ہوئے

ان سے کیا مراد ہے۔ ان کی وضاحت کی جاتی ہے۔ موجودہ رحیم یار خان کا پہلا نام پھل وڈا تھا جو بعد میں نوشہرہ مشہور ہوا۔ چونکہ نوشہرہ صوبہ سرحد میں بھی ایک شہر ہے اس لیے اس کا نام تبدیل کرنیکے لیے انگریزی حکومت کی طرف سے تحرک ہوا (16) تو نواب صاحب صادق خان رابع نے اپنے پسر مرحوم جو ایک آتشزدگی کے حادثے میں فوت ہو گیا تھا کے نام پر رحیم یار خان رکھ دیا۔ نواب صاحب محمد خان رابع 1898ء میں انتقال کر گئے اور نواب بہاول خان خامس جانشین ہوئے تو انہوں نے اس شہر کا نام صادق آباد رکھ دیا۔ سرکاری کاغذات میں یہ نام استعمال ہونے لگا۔ حتیٰ کہ پرانا ریکارڈ اراضی جو ڈپٹی کمشنر آفس رحیم یار خان میں موجود ہے اس میں یہ نام ہی اس علاقے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ عوام الناس نے یہ نام قبول نہ کیا۔ نواب بہاول خان خامس مختصر عرصہ حکومت کے بعد فوت ہوا تو دوبارہ اس کا نام رحیم یار خان رکھ دیا گیا (17) جہاں تک موجودہ شہر صادق آباد کا تعلق ہے اس کو ریلوے لائن کی آمد سال 1880ء کے وقت یہ نام دیا گیا۔ کیونکہ یہاں ریلوے سٹیشن قائم کیا گیا اور یہاں پہلے ایک چھوٹی سی بستی موجود تھی اور اس کے علاقے کی تحصیل احمد پور لمہ تھی۔ چونکہ آمد و رفت کا اہم ذریعہ اس زمانے میں ریل تھی اس لیے جو شہر اور قصبات ریلوے لائن پر آباد تھے وہ اہمیت اختیار کر گوے اور نسبتاً دور قائم قصبات اور شہر پس منظر میں جانے شروع ہو گئے۔ چنانچہ 39-1938 میں تحصیل ہیڈ کوارٹر احمد پور لمہ سے موجودہ صادق آباد منتقل ہوا اور آبادکار تیزی سے یہاں آباد ہونے لگے۔

سال 1932ء میں ریاست کی انتظامی تقسیم اس طرح کی گئی کہ دو اضلاع بنا دیئے گئے۔ بہاول پور اور رحیم یار خان جبکہ ہر دو اضلاع کے دفاتر بہاول پور میں ہی قائم رکھے گئے۔ اور سال 1945ء میں ضلع رحیم یار خان کے دفاتر رحیم یار خان منتقل کیئے گئے۔ اس وقت ضلع رحیم یار خان پانچ تحصیلوں رحیم یار خان، صادق آباد، خان پور، آلہ آباد اور احمد پور شرقیہ پر مشتمل تھا جبکہ بقیہ علاقہ ریاست ضلع بہاول پور میں شامل تھا۔ سال 1953ء میں ریاست کا تیسرا ضلع بہاول نگر قائم کیا گیا تو احمد پور شرقیہ تحصیل کو ضلع بہاول پور میں شامل کر دیا گیا۔ لیاقت پور موجودہ تحصیل کا ہیڈ کوارٹر پہلے الہ آباد میں پانچ میل کے فاصلے پر جانب غرب واقع تھا سال 1952ء میں تحصیل کا صدر مقام نوابزادہ لیاقت علی خان کے نام پر لیاقت پور رکھا گیا پہلے اس جگہ کا نام چوہدری تھا۔ یہاں سرکاری دفاتر تعمیر کیئے گئے۔ غلہ منڈی قائم کی گئی۔ تحصیل ہیڈ کوارٹر کی اس تبدیلی میں بھی اس جگہ کا ریلوے لائن پر واقع ہونا اہم عنصر نظر آتا ہے۔

اکتوبر 61ء میں وحدت مغربی پاکستان کے پانچ چھ سال بعد ماچکہ قانونگوئی کا علاقہ ضلع رحیم یار خان کی تحصیل صادق آباد سے نکال کر ضلع سکھر میں شامل کر دیا گیا۔ دراصل یہ قانونگوئی اس طرح واقع ہے کہ اس کی حدود اور تحصیل صادق کے درمیان صوبہ سندھ کا علاقہ پڑتا ہے۔ وحدت مغربی پاکستان کے ختم ہونے کے بعد سال 1970ء میں یہ علاقہ جو 63661 ایکڑ رقبہ پر مشتمل ہے واپس ضلع رحیم یار خان کی صادق آباد تحصیل میں شامل کر دیا گیا۔

(ملتان نامہ - محمد اسلم میتلا)

سید اولاد علی گیلانی

منادر و معابد ہنود

مندر پرہلاد بھگت واقع ملتان

قلعہ ملتان کے شمال کی جانب ایک کونے میں پرہلاد بھگت کا مندر واقع ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں ایک راجہ ہرناکشپ نامی اس علاقہ میں حکومت کرتا تھا اس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور دیوتاؤں کی پوجا سے لوگوں کو سختی سے منع کرنا شروع کیا۔ پرہلاد بھگت اس راجہ کا لڑکا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے اس دعوے سے انحراف کیا اور لوگوں کو تلقین کی کہ راجہ کا دعویٰ بالکل باطل ہے ہم سب کا پیدا کرنے والا ایشور پرماتما ہے جس کی عبادت ہم سب پر فرض ہے۔ راجہ کو یہ بات سخت ناگوار گزری بیٹے کو گرفتار کر کے یہ حکم دیا کہ سونے کا ایک ستون آگ سے تپایا جائے اور اس کے ساتھ لڑکے کو چمٹا کر باندھ دیا جائے۔ چنانچہ دن بھر یہ ستون آگ سے گرم ہوتا رہا اور جب شام کے قریب اس راجکمار کو اس کے ساتھ باندھنے لگے تو وہ ستون دو ٹکڑے ہو گیا اور اس میں سے ایک شیر برآمد ہوا جس نے راجہ کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیر اصل میں خود وشنو بھگوان تھے جو نرسنگھ اوتار کی شکل میں نمودار ہوئے اس روز سے پرہلاد کو پرہلاد بھگت مانا گیا اور یہ مندر اس کی یادگار میں قائم ہوا۔

یہ مندر حضرت غوث بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے مزار مقدس کے بالکل سامنے واقع تھا لیکن اس کی تعمیر زمانہ قدیم میں ہوئی۔ افسوس ہے کہ اس عمارت پر کوئی پرانا کتبہ موجود نہیں ورنہ اس سے مزید حالات تاریخی معلوم ہو سکتے۔ سر الیگزینڈر برنز جس زمانے میں یہاں بطور سیاح وارد ہوئے اس وقت اس مندر کی کوئی چھت موجود نہ تھی اور 1848ء میں میگزین کے اڑ جانے کی وجہ سے جو صدمہ عمارت کو پہنچا تھا اس کی وجہ سے یہ عمارت بھی خستہ حالت میں تھی۔ 1853ء میں یہ مندر زیر استعمال بھی نہ تھا لیکن بعد میں چندہ وغیرہ اکٹھا کر کے اس کی مرمت کرائی گئی اور نرسنگھ اوتار کی ایک نئی مورتی اس میں لگائی گئی۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے روزہ مبارک حضرت غوث کی عمارت کے بیچ میں سے ایک دروازہ مندر میں جانے کے لیے تھا لیکن بعد میں اسے بند کر دیا گیا۔ 1810ء میں مندر کا کلس ہندوؤں نے چندہ کر کے بہت اونچا کر دیا جس سے اردگرد کی خانقاہوں کے سجادہ نشینوں نے اظہار ناراضگی کیا اور ہندو مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ ہو جانے کی وجہ سے شہر میں بلوہ بھی ہوا۔

سکھ حکومت کی جانب سے اس مندر کی سرپرستی ہوتی رہی مندر کے مہنت کو ہر دکان سے کچھ رقم بطور وظیفہ ملتی ہے۔ ماہ مئی میں نرسنگھ چودس کے نام سے ایک میلہ یہاں لگتا ہے۔ شام کے قریب لوگ ایک دوسرے پر کھیرے ککڑیاں پھینکتے ہیں ہندو اس میلہ پر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ (بھارت میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد ایک بڑے ہجوم نے یہ مندر مسمار کر دیا تھا، اب یہاں پر مٹی کا ڈھیر باقی ہے)

مندر نرسنگھ پوری

یہ مندر پہلے قلعہ کے اندر واقع تھا۔ لوگوں کو بلا اجازت حاکم وقت اندر جانے کی اجازت نہ تھی اور پوجا پاٹ میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس واسطے مندر پر ہاد پوری کے مہنت باوا رام داس جی نے فتح چند ٹنگسالیہ کے گردوارہ میں ایک نیا مندر بنا کر نرسنگھ اوتار کی مورتی کو اس میں رکھا۔ یہ مندر سبزی منڈی کے قریب واقع ہے۔ بعدۂ 1872ء میں کالورام خزانچی نے تقریباً دس ہزار روپیہ لگا کر پختہ اور شاندار مندر بنوا دیا۔ اب تک یہ مندر پر ہالد پوری کے مندر کے مہنت کے زیر انتظام ہے جیٹھ کے مہینہ میں میلہ لگتا تھا اور ہندو لوگ بہت تعداد میں درشن کرنے کے لیے یہاں جمع ہوتے تھے۔

مندر تو تلا مائی واقعہ حرم دروازہ شہر ملتان

اس مندر کے متعلق ایک ہندی دوہا مشہور ہے

ہنگلاج پچھم شاستری توتل گھر ملتان
نگرکوٹ دُکھ بھنجنی تینوں دیو پردھان

اس سے مراد یہ ہے کہ تین قابل ذکر دیویاں ہیں۔ شاستری، ہنگلاج کے مغرب میں توتلا کا مقام ملتان ہے اور دکھ بھنجنی نگرکوٹ میں مقیم ہے۔ روایت ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ کے زمانے میں اس مندر کو جو اس وقت سورج کنڈ کے قریب ایک بڑے اونچے ٹیلے پر واقع تھا مسجد میں تبدیل کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ دیوی اپنے پاؤں آپ چل کر نزدیک کے ایک کنویں میں کود پڑی جسے آج تک چاہ مورت والا کہتے ہیں۔ اس مندر کا پوجاری کچھ تھوڑی بہت حکمت بھی جانتا تھا۔ اتفاق سے بادشاہ کے لڑکے کو درد قولنج ہوا اور وہ اس پجاری کے علاج سے شفایاب ہوا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اجازت دیدی کہ وہ مورتی کو نکال کر شہر کے کسی مکان میں لے جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور اب یہ مندر حرم دروازہ کے قریب واقع ہے۔ موجودہ عمارت سکھوں کے زمانے میں بدن ہزاری کاردار کے وقت تعمیر ہوئی۔ دیوان ساون مل نے تین چار ہزار روپیہ صرف کر کے عمارت کی توسیع کی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہان مغلیہ کے زمانے میں سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر رہا اور اس کے علاوہ ایک چاہ موسومہ چاہ دیویاں والہ معاف تھا۔ اب معافی وغیرہ کوئی نہیں۔

مندر جوگ مایا

یہ مندر شہر ملتان سے بجانب جنوب بفاصلہ ایک میل واقعہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نرسنگھ اوتار کا غیظ و غضب دور کرنے کے لیے جوگ مایا بھی یہاں آئی۔ پہلے یہاں ایک چبوترہ تھا جس پر بکرے وغیرہ چڑھائے جاتے تھے جب اورنگ زیب کے زمانے میں تو تلا مائی کے مندر کی جگہ مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا گیا تو اس مقام کے سب جوت خود بخود منتقل ہو گئے۔ تب سے اس تھلہ کا جوت استھان ہو گیا۔ رفتہ رفتہ جوگ مایا کے نام سے یہ مندر مشہور ہوا۔ اورنگ زیب کی عملداری سے لے کر پٹھانوں کی عملداری تک ہندو لوگ خفیہ طور پر اس مندر میں جا کر پوجا پاٹ کرتے اور چڑھاوا چڑھاتے تھے جو مسلمان لیتے رہے۔ پھر دیوان ساون مل نے کئی ہزار کی لاگت سے پختہ مندر بنوایا اور عام اجازت درشن کی ہوئی 1876ء میں لالہ نرسنگھ داس صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمہ کمشنر بندوبست کی کوشش سے اس مندر کی مرمت کرائی گئی۔ سال بھر میں دو دفعہ یعنی ماہ چیت اور ماہ اسوج کے نوارترہ میں یہاں میلہ لگتا ہے مندر کے اندر ہر وقت جوت روشن رہتے ہیں۔

مندر رام تیرتھ

یہ مندر شہر ملتان سے جانب شرق بفاصلہ تقریباً ایک میل واقع ہے ایک تالاب پختہ اور ایک دھرم سالہ بھی بنا ہوا ہے۔ اس تالاب کے کنارے پر کیشو پوری فقیر کی سمادھ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رام چند جی مہاراج یہاں بحالت بن باس تشریف لائے۔ جس مقام پر آپ نے ڈیرہ ڈالا وہاں ان کی یادگار میں ایک چکا تالاب یادگار کے طور پر بنایا گیا اور رام چندر جی نے یہ بر دیا کہ جو کوئی اس تالاب میں اشنان کرے گا اس کو تیرتھ اشنان کا پھل ملے گا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بیس ہزار روپے کی لاگت سے پختہ تالاب بنوایا۔ اور ای چاہ کی معافی عطا کر دی۔ علاوہ بریں مبلغ دو روپیہ یومیہ وظیفہ بھی مقرر ہوا۔ اب سرکا عالیہ سے مبلغ ایک سو روپیہ سالانہ ملتا ہے۔ بھادوں کے مہینہ میں پورنماشی کے دن بڑا میلہ لگتا ہے۔ اکثر ہندو عقیدت کے ساتھ اس مندر کی جاترا کے واسطے جاتے ہیں۔ کیشو پوری فقیر کو صاحب کرامت بیان کیا جاتا ہے۔

سورج کنڈ

ریلوے لائن سے جنوب کی طرف تقریباً چار میل کے فاصلہ پر سڑک ملتان شجاع آباد پر یہ تالاب واقع ہے اگرچہ موجودہ عمارتیں دیوان ساون مل اور اس سے بعد کے زمانے میں تعمیر ہوئی ہیں۔ لیکن یہ مقام تاریخی حیثیت سے بے حد قدیم ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب نرسنگھ اوتار نے فرطِ غضب میں آ کر راجہ ہرنا کشپ کو قتل کیا تو ان کے غیظ وغضب کا یہ حال تھا کہ سب دیوتا جمع ہو کر ان کا غصہ فرو کرنے کے لیے یہاں نازل ہوئے۔ اس مقام پر سورج دیوتا کا نزول ہوا۔ انہوں نے یہ بر دیا کہ جو کوئی اس تالاب میں اشنان کرے گا وہ پھل پائے گا۔ قدیم الایام سے یہ جگہ ہندوؤں کی متبرک پرستش گاہ ہے۔ سال بھر میں دو بڑے میلے یہاں لگتے ہیں ایک ماہ بھادوں بدی کبھٹی دوم مانگھ سدی

ستمی۔ ہزار ہا مخلوق جمع ہوتی ہے تہواروں کے موقع پر بھی کافی مجمع اشنان کے لیے جمع ہو جاتا ہے عملداری سکھاں میں پانچ روپیہ یومیہ اور ایک پیسہ فی روپیہ محصول پرمٹ میں سے معاف تھا اور سات چاہات بھی معاف تھے۔

سمادھ بدھلا سنت

یہ مکان شہر ملتان سے بجانب شرق پندرہ میل کے فاصلے پر آباد ہے سمادھ کے گرد چار دیواری پختہ ہے اور تالاب پختہ بھی بنا ہوا ہے۔ دیگر مکانات بھی مسافران کے قیام کے لیے موجود ہیں۔ دیوان ساون مل نے تقریباً پچھتر ہزار روپے کی لاگت سے پختہ تالاب اور چند مکانات بنوائے۔ ایک مہنت اور داسی یہاں کا گدی نشین ہے۔ سال بھر میں ایک بڑا میلہ لگتا ہے جس میں بیس پچیس ہزار آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ ہندو مسلمان ضلع ہذا و دیگر اضلاع ملحق کے اس میلہ میں آتے ہیں۔ اسباب چوبی ہر قسم کا پاک پتن، چنیوٹ اور بہاول پور وغیرہ سے یہاں آ کر بکتا ہے۔ تین چاہ کی ملکیت اس سمادھ کی ہے اور دو چاہ سرکار سے تادوام معاف ہیں۔ بدھلہ سنت کا اصل نام بدھو تھا جو علاقہ مخدوم پور کا رہنے والا تھا اور وزن کشی کا کام کرتا تھا۔ خود فقیر اور فقیر دوست آدمی تھا اکثر فقیر لوگ اس کے پاس آ کر ٹھہرتے تھے اور یہ ان کی خدمت تواضع کیا کرتا تھا ایک روز اناج وزن کر کے شمار کر رہا تھا جب انیسویں بار آیا تو حسب دستور وزن کشاں اُس نے کہا ''اُنوی آ'' یعنی اُنیس ہوئے۔ ایک فقیر بولا ''اِن دی آ'' یعنی ''اس طرف بھی آ'' اس کا مطلب یہ تھا کہ کچھ خدا کا بھی دھیان کر۔ یہ سنتے ہی بدھلہ کے دل پر چوٹ لگی اور وہ اپنا کام چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگا۔ زمینداروں نے پکڑنا چاہا تو اس نے اپنے اعضاء الگ الگ کر کے دکھائے جس سے وہ ڈر گئے اور اس کے تعاقب سے باز آئے جس جگہ اب سمادھ ہے یہاں آ کر قیام کیا اور ایک کنواں لگوایا۔ اور گیان دھیان میں مصروف ہوا۔ یہاں قرب و جوار کے لوگوں نے دق کرنا شروع کیا۔ بدھلہ نے بددعا کی اور موضع نور پور سالم بے چراغ ہو گیا۔ لوگ سب معتقد ہو گئے اور اس کی عزت کرنے لگے ایک روز بیٹھے بیٹھے اُسی جال کے درخت کے نیچے غائب ہو گیا۔ تب سے بدھلا سنت مشہور ہے۔ اور اس کی سمادھ اس جگہ بنائی گئی۔ اس مقام پر ہندو مسلمان گوشت کا استعمال نہیں کرتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ چند معماروں نے یہاں بھیڑ ذبح کر کے کھائی سب کے سب بیمار ہو کر مر گئے۔ میلہ کے موقع پر یہاں گدھوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور اچھی خاصی منڈی لگ جاتی ہے۔

(مُرقع مولتان – سید اولاد علی گیلانی)



مخدوم سید روشن شاہ محمد یوسف سابع

ملتان شہر، اس کی بنا، وجہ تسمیہ اور اس سے متعلق کیفیات کا بیان

ذکر اول

ملتان ہندوستان کے قدیم شہروں میں سے ایک ہے اس شہر کا پہلا بانی راجہ دھلو کا بیٹا راجہ فور ہے۔ راجہ دھلو دہلی کا بانی ہے۔ شروع میں اس شہر کا نام مولتارن تھا جس کے معنی ہندی میں قدیم شہر کے ہیں۔ کثرت استعمال سے ملتان بنا۔ آباد ہونے کے ابتدا میں یہ اسی نام سے مشہور ہوا اور اب بھی اُسی نام سے آباد ہے چونکہ مدت دراز تک دہلی کے راجاؤں کے ماتحت رہا تھا اور اللہ کے حکم سے مکمل طور پر ویران ہو گیا اور مدت دراز تک ویران رہا۔ اس کی عمارتیں مسمار ہو گئیں اور ایک بڑے تودے کی شکل اختیار کر گیا اور پھر مشیت الٰہی کے تحت آباد ہوا۔ راجہ سہرس رائے حاکم سندھ کہ اس کا دارالحکومت الور شہر تھا اس شہر کا حاکم بنا۔ اس نے ہندوستان کے دوسرے علاقے بھی فتح کیے اسی راجہ نے ملتان کو از سرنو آباد کیا۔ یہ شہر قدیمی شہر کے جنوب میں تین میل کے فاصلے پر آباد ہوا کہ جہاں اب موج دریا کا مزار واقع ہے۔ بعد میں راجہ داہر سندھ کا حاکم بنا اور یہ علاقہ بھی اس کے زیر تصرف آیا حتیٰ کہ حکومت سندھ و ملتان راجاؤں کے تصرف سے آزاد ہو کر مسلمان سلاطین کے قبضے میں آ گئی اور سندھ اور ملتان کا سارا علاقہ اہل اسلام کے زیر اقتدار آ گیا اور دین محمدی پھیلا۔ یہ علاقہ شروع میں سندھ کے تابع رہا۔

ذکر دوم

محمد قاسم کی فتح کے بارے میں:

صاحب عقل و دانش مند لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ آیۃ کریمہ کے مطابق قل اللھم مالک الملک تو تی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء ۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مالک الملک ہے۔ جس کسی کو چاہتا ہے ملک عطا فرماتا ہے جس قدر کہ اپنی مشیت کاملہ کے تحت اس کو دینا ہوا اور اسے عطا کرتا ہے اور جب یہ مدت ختم ہو گئی اور ملک کی تبدیلی جیسا کہ ازلی حکم میں قرار پاتی ہے دوسرے کو ملتی ہے اس کے ناپسندیدہ افعال سے کہ جو اس کے ملک کے زوال پر دلالت کرتی ہے ظہور میں آتی ہے اور اس سے اس کا ملک دوسرے کو منتقل ہو جاتا ہے اور خداوند

قدوس ملک پر کسی دوسرے کو مسلط فرماتا ہے اور اُسے ملک کا وارث بناتا ہے کہ انّ الارض للہ یوتھا من یشاء خدا کا فرمان ہے۔ جب ایک مدت تک راجاؤں کی حکمرانی رہی اور انہوں نے ظلم اور بیداد کو اپنے امور میں فراواں کرلیا پس پھر اس قادر مطلق جل جلالہ کی مشیت اس بات پر آمادہ ہوئی کہ اس نے اس قوم کے سلسلہ حکمرانی کو منقطع کر دیا اور یہ ملک اپنے خاص بندوں کے جھنڈوں کے سائے تلے کر دیا اور یہ ملک دین محمدی کے تحت آ گیا اور اہل اسلام کے عدل واحسان نے اس ملک کو رونق بخشی اور پروردگار عالم نے اس ملک کو اس قوم سے خلاصی بخشی اور مسلمان حکام کا جھنڈا یہاں لہرایا۔ اس بات کا مصداق محمد بن قاسم ثقفی کی فتح ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بنی امیہ کے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور خلافت میں حجاج بن یوسف حاکم عراق نے محمد بن قاسم مذکور کو جو کہ اس کا بھتیجا اور داماد تھا اس ملک کو فتح کرنے کے لیے بھیجا۔

اس ملک کی فتح اور اس کے اہل اسلام کے تحت آنے کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان نے اپنی زندگی میں اپنے کچھ ملازمین کو شام کے تاجروں کے ہمراہ کنیزوں کی خریداری اور دوسری اشیا کے خرید کرنے کے لیے سری لنکا بھیجا اور یہ ملازم سامان اور کنیزیں خرید کر سمندر کے راستے واپس ہوئے جب وہ سندھ کی بندرگاہ پر پہنچے تو رہزنوں نے ان پر حملہ کر دیا اور بہت سے لوگوں کو مار ڈالا اور بہت سوں کو قید کرنے کے بعد ان کا مال اسباب لوٹ لیا۔ کچھ لوگ جو بچ رہے تھے بڑی مشکل کے بعد ساحل نجات پر پہنچے اور انہوں نے واپس آ کر سارا ماجرا خلیفہ کی خدمت میں عرض کیا خلیفہ نے ازراہِ غیرت ایک لشکر اس طرف تعین کیا اسی اثنا میں وہ وفات پا گیا اور لشکر کی روانگی موقوف ہوگئی۔ جب اس کے بعد اس کا بیٹا ولید مسند خلافت پر بیٹھا اور اس نے حجاج بن یوسف کو کوفے کا حاکم بنایا تو اس نے عراق اور دوسرے علاقوں کے نظم ونسق کے بعد سندھ کے علاقے کے حالات دریافت کئے اور خلیفہ کے حکم کے تحت اپنے داماد اور بھتیجے محمد بن قاسم کو اسباب فراوان اور سامان بے پایاں اور لشکر گراں کے ساتھ سندھ فتح کرنے کے لیے مامور اور روانہ کیا۔ قصہ مختصر محمد بن قاسم اس علاقے میں آیا اور شدید جنگوں کے بعد جیسا کہ کتابوں میں اس کا ذکر آیا ہے اس نے بتدریج سندھ کے علاقے کو فتح کیا۔ اس کے بعد میں ملتان کے علاقے کو بھی دیپالپور کی سرحد تک فتح کیا اور وہاں اپنا تسلط قائم کیا۔ اس نے داؤد بن نصر بن ولید عثمانی کو ملتان کے علاقے کا حاکم مقرر کیا اور خود اس علاقے کی تسخیر کے بعد واپس چلا گیا۔ یوں اس سال سے ملتان کے علاقے پر اہلِ اسلام کی حکومت قائم ہو گئی اور دین محمدی کی اشاعت عمل میں آئی اس زمانے میں پہلی بار ملتان سندھ سے جدا ہوا اور یہاں مدت کے بعد ایک خودمختار حاکم کا تقرر ہوا اور دیپالپور تک چونکہ یہ علاقہ ہندو تسلط سے آزاد ہوا یہاں مسلمانون کی حکومت قائم ہوئی یوں دیپالپور کا علاقہ ملتان کے زیر اثر آیا اور وہاں پر اس علاقے کے احکام جاری ہوئے پھر مدت کے بعد قرامطہ فرقے کی بیشتر قوم اس علاقے پر قابض ہوگئی اور اس کا عمل دخل جاری ہوا وہ اس علاقے پر کافی عرصہ تک حاکم رہے۔ یہاں اس قوم کا ظلم وستم حد سے بڑھ گیا۔ حق تعالیٰ نے ان کی ناپائیدار بنیاد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور بادشاہ غازی سلطان محمود غزنوی کو ان پر لگا دیا؟

ذکر سوم

سلطان محمود غزنوی کا پنجاب میں آنا اور پھر اسلامی سلطنت کا قائم ہونا:

چونکہ بہت مدت تک ملحدوں کی قوم قرامطہ اس علاقے پر رہی تو سلطان محمود غزنوی بن ناصر الدین سبکتگین نے پروردگار عالم کی توفیق سے اس علاقے کو فتح کرنے اور کشور کشائی کے لیے کمر ہمت و شجاعت باندھی اور اپنے ارادے کے ساتھ لشکر اور سامان وافر کی فراہمی کے بعد وہ ہندوؤں سے جنگ کرنے اور اس علاقے کو فتح کرنے کے لیے 416ھ میں ملتان کے راستے گجرات اور نہر والہ کی طرف روانہ ہوا۔ چونکہ ان دنوں قوم ملاحدہ قرامطہ کا سردار ابو الفتح نامی اس علاقے کا حاکم تھا اس نے اپنی ناپسندیدہ حرکات اور شورش کے تحت سلطان کے لشکر کو پیچھے دھکیلنے کے ناشائستہ امور کا اظہار کیا۔ سلطان گجرات، سومنات، ہندوؤں کے مندروں اور دوسرے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد واپس لوٹا تو اس نے ابوالفتح مذکور تنبیہہ اور تادیب کا ارادہ کیا۔ ابوالفتح نے سلطان کے ارادہ کی خبر پا کر کہ وہ اس طرف لوٹ رہا ہے، اپنے اہل و عیال اور اموال و خزانوں کو جنوب کی طرف بھیج دیا اور خود قلعہ کی حفاظت کے اسباب میں مصروف ہو گیا۔

سلطان اس علاقہ میں ابوالفتح کے سابقہ کردار اور دین مبین کی حمیت و غرت کے پیش نظر ملتان آیا اور قلعہ کا محاصرہ کیا۔ اس عقیدے کے مطابق قرامطہ قوم شرع متین کی مخالف تھی۔ اس نے اس قوم کو قتل کرنے اور برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ قلعہ فتح کرنے کے بعد اس نے ابوالفتح کو قید کیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں اس نے اس کو قلعہ طبرک میں قید کیا کہ وہ وہیں قید میں مر گیا۔ جب یہ ملک سلطان کے قبضے میں آ گیا تو اس نے اپنا حاکم اس علاقے پر مقرر کیا لیکن یہ شہر اور اس کا اکثر علاقہ ویران ہو گیا۔ پھر سلطان کی توجہ سے پھر آباد ہوا۔ اس کی حیات تک اس کا مقرر کردہ حاکم یہاں رہتا تھا جب سلطان محمود نے وفات پائی اور اس کا بیٹا سلطان مسعود تخت نشین ہوا تو اس نے اپنا سکہ اور خطبہ علاقے میں جاری کیا۔ سلطان محمود کی اولاد چند پشتوں تک یہاں حکمرانی کرتی رہی۔ سلطان مسعود ثانی کا بیٹا سلطان مودود جو لاہور پر قابض تھا اپنے بھائی سے جھگڑے کے سبب لاہور سے ملتان پر حملہ آور ہوا، اس نے یہاں غلبہ حاصل کیا اور ملتان کے نواح کے تمام شہروں پر جو لاہور کے راستے کے قریب تھے انہیں غارت کیا۔ اس نے وہاں قتل عام کیا اور آگ لگائی اور انہیں ویران کر دیا۔ اس نے سارے علاقے میں ایسا ہی کیا حتیٰ کہ اس نے ملتان میں بھی قتل و غارت اور لوٹ مار کی کہ آبادی کا نام نشان نہ رہا جو لوگ اس عذاب سے بچ رہے وہ بھاگ نکلے اور اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ یوں شہر کی آبادی اور رونق ختم ہو گئی اور یہ شہر کچھ سال ویران رہا۔ جب مخدوم شاہ یوسفؒ گردیز قصبہ گردیز سے جو غزنی کے نواح میں ہے اس شہر میں آئے تو انہوں نے از سر نو خدا کے حکم کے تحت اس کی بنیاد رکھی اور اسے رونق بخشی۔

ذکر چہارم

مخدوم شاہ یوسف گردیزی کا گردیز سے یہاں آنا اور اسے آباد کرنا:

جب اس شہر اور اس کے نواحی علاقے کی ویرانی کو مدت گزر گئی تو قرآن حکیم کے مطابق ''ان اللہ یحیی الارض بعد موتھا'' یہ زمین جو مردہ ہوگئی تھی پھر آباد اور پُر رونق ہوئی۔ حضرت مخدوم شاہ یوسف گردیزی بن مخدوم ابوبکر بن حضرت مخدوم شاہ علی قسور جو سادات کرام میں سے تھے اور حضرت امام جعفر صادقؓ کی اولاد مبارکہ میں سے تھے اس سرزمین پر وارد ہوئے۔ وہ ایک بزرگ کامل اور کمالات ظاہری و باطنی سے آراستہ تھے۔ وہ مالک الملک کے حکم سے قصبہ گردیز سے کہ جو غزنی کے مضافات میں سے ہے جیسا کہ ان کے احوال پر مبنی کتاب میں مذکور ہے 481ھ/ 1088ء میں 31 سال کی عمر میں کرامات و خوارق عادات کے اظہار کے بعد اپنے جد بزرگوار کی اجازت اور بادشاہ سے سند حاصل کرنے کے بعد یہاں آئے تھے۔ وہ اگرچہ اسباب ظاہری اور باطنی کی فراوانی کے مالک تھے تشریف آوری کے وقت اپنے کشف و کرامت کے سبب ایک شیر کو مطیع کر کے اس پر سوار تھے اور ان کے ہاتھ میں کوڑے کی جگہ ایک سانپ تھا اور یہ شعر اس علاقے کے لوگوں کے زبان زدعام ہے

دانی سوار شیر کہ در دست مار کرد
مخدود شاہ یوسف اینجا قرار کرد

یہاں پہنچنے کے بعد شہر ملتان میں جو دریائے راوی کے کنارے تھا ٹھہرے، یہ وہی جگہ ہے جہاں اب آپ کی خانقاہ مبارک ہے دہلی کے راجاؤں کے زمانے میں جنہوں نے اس شہر کی سب سے پہلے بنیاد رکھی تھی قلعہ ایک بڑے تودے پر قائم تھا۔ انہوں نے شہر کی بنیاد رکھی اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے قلعے کے اندر مکانات بنوائے۔ تب لوگ لاہور، مارواڑ اور سندھ کے علاقوں سے آکر یہاں آباد ہونے لگے پس اس وجہ سے مختلف علاقوں کی زبانیں (یہاں) ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔ اس وقت سے آج تک اس علاقے کی آبادی اسی طرح برقرار ہے۔ حضرت مخدوم شاہ یوسف گردیزی تقریباً 50 سال تک زندہ رہے اور انہوں نے آہستہ آہستہ ملک کو آباد فرمایا اور مقررہ رقم جو سلطان ابراہیم ظہیر الدولہ کو دینی قرار پائی تھی ہر سال سلاطین وقت کو دیتے رہے۔ چنانچہ ان کے اور ان کی اولاد کے بیشتر حالات اس کتاب کے مختلف مقامات پر بیان ہوتے رہیں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔ الغرض ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے مخدوم شیخ احمد کے زمانے میں قوم ملاحدہ قرامطہ مذکور کہ جنہیں پہلے اس ملک سے نکال دیا گیا تھا دوبارہ اس علاقے پر قابض ہوگئی اور انہوں نے فساد برپا کیا۔ مخدوم شیخ احمد کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے مخدوم شیخ عبدالصمد کے زمانے میں قوم مذکور کا مکمل قبضہ ہوگیا اور علاقے کا بیشتر حصہ ان کے زیر تصرف آ گیا۔ اس زمانے میں آل سبکتگین کی سلطنت ختم ہوگئی بعد میں غوری خاندان کا تسلط ہوگیا اور سلطان غیاث الدین غوری نے اپنے بھائی شہاب الدین عرف معزالدین محمد سام کو سندھ اور ہند کے علاقوں کی تسخیر کے لیے بھیجا۔

جب شہاب الدین اس علاقے کے سریب پہنچا تو مخدوم موصوف نے اپنے آدمیوں اور خط و کتاب کے ذریعے اس سے صلح کی اور علاقے اس کے گماشتوں کے حوالے کئے اور سلطان اور مخدوم کے درمیان ملاقات بھی ہوئی اور ایک قرارداد بھی لکھی گئی جو باتیں سلطان کی طرف سے مخدوم کے لیے قرار پائیں انہیں عہد نامہ کی صورت میں لکھا گیا اور مخدوم کے خدام کے حوالے کیا گیا۔

ذکر پنجم

شہاب الدین غوری کے اس علاقے میں آنے اور تصرف کے بیان میں، اس کا ناصر الدین قباچہ کو یہاں حاکم مقرر کرنا اور سلطان کے شہید ہونے کے بارے میں:

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ جب سلطان شہاب الدین غوری مخدوم کے ذریعے اس علاقے پر قابض ہو گیا تو اس نے قوم ملاحدہ قرامطہ کا قلع قمع کرنا شروع کر دیا اس نے اس قوم کے اکثر لوگوں کو قتل کر ڈالا اور باقیوں کو مغلوب کر کے یہاں سے نکال دیا۔ پھر اس قوم میں کوئی صاحب اقتدار نہ ہوا سلطان ممدوح نے معاملات کو انجام دیا اور ملک ناصر الدین قباچہ کو جو اس کے خاص لوگوں میں سے ایک کا بیٹا تھا اس علاقے کی نظامت پر مقرر کیا اور خود سندھ کو فتح کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔ سلطان غیاث الدین غوری کے بعد جب سلطان شہاب الدین تخت سلطنت پر بیٹھا اور اس نے مسلسل آمد و رفت کے بعد دہلی کو جو ہندوستان کا پایہ تخت تھا فتح کر کے اپنے قبضہ میں کیا اور وہاں 15 سال تک حکومت کی اور اس کا سکہ اور خطبہ اس ملک میں رائج رہا۔ پھر سلطان آخری بار گکھڑ قوم کے لوگوں کو سزا دینے اور تنبیہ کے واسطے جس نے لاہور میں شورش برپا کر رکھی تھی وہاں گیا اس نے ان کو سزا دی اور پھر غزنی جانے کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں ایک فدائی گکھڑ نے اسے تیر مار کر شہید کر ڈالا وہ ایک بہت عادل، نیک اور دین دار بادشاہ تھا۔

ذکر ششم

ناصر الدین قباچہ کے بارے میں:

چونکہ سلطان شہاب الدین نے ملتان کے علاقے کی حکومت ناصر الدین قباچہ کو دے رکھی تھی اور وہ سلطان کی زندگی تک راسخ قدم رہا اور اس نے سلطنت کے کاروبار کو اور انتظام کو بڑی ہوشیاری سے چلایا۔ اس نے اس علاقے کے انتظام کو شریعت کے احکامات کے تحت خوب نبھایا۔ اس نے حتی القدور اپنے آپ کو انصاف کی ترویج میں مصروف رکھا لیکن سلطان کی شہادت کے بعد وہ خودسر ہو گیا۔ اس کی حکومت کے واقعات سلطان جلال الدین بن سلطان محمد خوارزم شاہ کی آمد سے متعلق ہیں سلطان چنگیز خان کے لشکر کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان کے راستے لاہور کی طرف چلا گیا۔ ملتان سے جاتے ہوئے اس کے اور ناصر الدین قباچہ حاکم ملتان کے درمیان سخت جنگ ہوئی بالآخر جلال الدین فرار کرتے ہوئے سندھ کے راستے اپنے علاقے میں چلا گیا۔

قباچہ کی حکومت کے آخری زمانے میں دہلی کے بادشاہ سلطان شمس الدین نے ملتان کے علاقے کو فتح کرنے کے لیے لشکر کشی کی۔ ناصر الدین قباچہ اپنے اندر تاب مقاومت نہ پاتے ہوئے اوچ سے بھکر چلا گیا اور سلطان شمس الدین اس علاقے میں ٹھہرا رہا۔ اس نے اپنے وزیر نظام الملک ابو سعید کو ناصر الدین قباچہ کے تعاقب میں روانہ کیا۔ ملک ناصر الدین قباچہ بھکر میں بھی ٹھہرنے کو نامناسب جانتے ہوئے اپنے اہل و عیال کے ساتھ فرار ہونے کے لیے کشتی میں سوار ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ساحل نجات تک جا پہنچے جب اس کی کشتی دریا کے درمیان پہنچی تو فنا کے سمندر میں ڈوب گئی اور نظام الملک کو کامیابی نصیب ہوئی اور قلعہ بھکر بھی اس کے تصرف میں آ گیا۔ وہ وہاں سے ملتان آ گیا یوں ملتان کا علاقہ سلاطین دہلی کے زیر نگین آ گیا۔ جب سلطان شمس الدین نے یہ علاقہ فتح کر لیا تو اس نے ملک عز الدین ایاز کو اس علاقے کا حاکم مقرر کیا اور خود دہلی واپس چلا گیا۔ چونکہ شہر، اس کے نام اور سلاطین دہلی کی حکمرانی اور سلطنت کا کچھ بیان ہو چکا مناسب یہ ٹھہرا کہ سب سے پہلے اس کی کیفیت کا ذکر درمیان میں آئے۔ پھر ان سلاطین اور ان کی طرف سے یہاں پر مقرر شدہ حکام کا ذکر کیا جائے۔ خدا توفیق دے۔

ذکر ہفتم

علاقے کے طول و عرض، حدود، پیداوار اور دوسری کیفیات کے بارے میں:

جاننا چاہیے کہ اس علاقے کے سلاطین دہلی کے زیر نگیں آنے کے وقت جیسا کہ بیان کیا گیا علاقہ بھکر جو سندھ کی حدود میں تھا ملتان کے تابع ہو گیا اس علاقہ ملتان کی مشرقی حد دیپالپور سے مغربی حد بھکر تک کا فاصلہ طور میں تقریباً 607 میل تھا اور عرض میں یہ فاصلہ شمالی حد چنوٹ سندھ سے جنوب میں حد جیسلمیر سے متصل ہے 188 میل ہے۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے زمانے میں ٹھٹھہ بھی اس میں شامل ہوا۔ اس وقت اس کا طول بڑھ کر کیچ مکران تک 90ی میل ہوا۔ اس بادشاہ کے عہد میں اس علاقے کی حد یہ تھی کہ مشرق کی جانب سرہند مغرب میں کیچ مکران شمال میں پرگنہ شورکوٹ جنوب میں صوبہ اجمیر۔ چنانچہ آئین اکبری اور خلاصۃ التواریخ وغیر نامی کتابوں میں جن کا ذکر آیا ہے تین حکومتی علاقے تھے ایک ملتان خاص دوسرا بھکر اور تیسرا دیپالپور اور 88 پرگنے یا تحصیلیں تھیں کہ ان کا ذکر ملتان ہے اور اس علاقے کی زمین کی جو پیمائش اس وقت کی گئی تو وہ 32 لاکھ 73 ہزار 932 بیگھے اور چار بسوہ تھی اور آمدنی 15 کروڑ 14 لاکھ 6 ہزار 619 دام (سکہ رائج الوقت تھی) اور قدیمی زمانے میں 6 دریا ملتان کی حدود میں جاری تھے اب اس وقت کہ بیاس اور ستلج فیروز پور کے نزدیک اکٹھے ہو گئے ہیں اور دریائے گھارہ کے نام سے اس علاقے سے گزرتے ہیں اور دریائے چناب اور بیاس، شورکوٹ کے نزدیک ایک دوسرے سے ملتے سرادر پور کے پاس پہنچ کر دریائے راوی میں شامل ہو جاتے ہیں پس یہ تینوں دریا ملتان سے گزر کر شینی بکری پہنچتے ہیں اور دریائے گھارہ مذکور ان میں مل جاتا ہے۔ اصل میں پانچ دریا اس جگہ جمع ہو جاتے ہیں اس جگہ کو پنج ند کہتے ہیں اور جب وہاں سے چلتے ہیں تو کوٹ مٹھن خان کے پاس دریائے سندھ میں شامل ہو جاتے ہیں اور وہاں سے یہ چھ دریا دوبارہ جاری ہو کر

سندھ کا نام حاصل کرتے ہیں۔ اس صوبہ ملتان کی حدود اس طرح ہیں کہ جن کا ذکر ہوا ہے۔ سلاطین مغول کے زمانہ حکومت میں یہی صورتحال تھی جب نادر شاہ بادشاہ ایران نے 1151ھ/ 1738ء میں سلطنت دہلی پر حملہ کیا اور اس نے محمد شاہ چغتائی پر فتح پائی اور پھر دوبارہ اس نے ہندوستان کا علاقہ محمد شاہ کو بحال کیا تو اس نے ہندوستان اور ایران کی سرحد دریائے اٹک یعنی دریائے سندھ مقرر کی اور صوبہ کابل مع پشاور اور دریائے سندھ کے اس پار کے علاقے، ہندوستان سے جدا کر کے ایرانی علاقے میں شامل کر لیے۔ چنانچہ نادر کے عہد کے حالات کی تفصیل تاریخ نادر شاہی میں موجود ہے۔

اس وقت سے ڈیرہ اسماعیل خان ہو تو فتح خان کرانگ اور ڈیرہ غازی خان، ڈوڈای وغیرہ کے علاقے اور گاؤں جو ملتان کے تابع تھے اور دریائے سندھ کے اس پار تھے ایران کی حکومت کے پاس چلے گئے اور جب گنڈا سنگھ قوم سکھاں کا عمل دخل ملتان پر ہوا تو پرگنہ فتح پور، کروڑ اور دنیا پور وغیرہ جو دریائے گھارہ کے سا طرف تھے ملا علی خان گہرانی خوانین داد پوتروں نے پٹے پر سکھوں سے لے لیے اور قرار کے مطابق انہوں نے رقم ادا کی لیکن سکھوں کا حکم اس زمین پر چلتا رہا اور نواب مظفر خان کی عمل داری میں دوسرے پرگنے یعنی کمالیہ و تلمبہ وغیرہ جو دریائے راوی کے اس پار تھے نواب مذکور کے ہاتھوں سے نکل کر سکھوں کے تصرف میں آ گئے اور نواب موصوف کہ برائے حج بیت اللہ گیا، پرگنہ اوباڑو کہ ملتان کی حد کے قریب ترنڈہ میر سہراب خان تالپور (اب خیر پور کے نام سے موسوم ہے) نامی علاقہ میر سہراب خان نے ٹھیکے پر نواب موصوف سے حاصل کیا۔ نواب موصوف کے صوبیدار ہونے کے آخری دنوں میں ملتان کی حدود اس طرف دریائے راوی تلمبہ کی حدود سے تریموں تک اور اس طرف دریائے چناب کے کنارے تک احمد پور سیالاں سے غضنفر گڑھ تک تھی اور پھر نواب کی حد سلطنت شجاع آباد تک اور دریائے بیاس کے اس طرف خشک راوہ کا علاقہ یعنی بانگڑ کہ سالوں سے ویران تھا اور مشرقی و شمالی علاقے کا اکثر حصہ بارش کے نہ ہونے اور مہاراجہ کے لشکر کی مسلسل آمدورفت کی وجہ سے اور حملوں کے سبب ویران ہو گیا تھا۔ پیداوار کم ہو گئی تھی بلکہ صوبے کی آمدنی شہر اور پرگنوں تک محدود تھی۔ اس وجہ سے کمی پائی جاتی تھی۔ قابل آمدنی علاقوں کو نواب مذکور نے اپنے آٹھ بیٹوں میں تقسیم کر کے ملک ان کے نام کر دی تھی اور مخادیم، سادات، مشائخ اور دیگر خوانین کے سامنے ان کے کاغذات پر اپنی مہر ثبت کر دی تھی اور اس کی مہر زدہ نقول سب بیٹوں کو دے دی تھیں۔ اس نے نواب سرفراز خان جو اس کا بڑا بیٹا تھا اور اس کے بعد ملتان کا صوبہ دار نامزد ہو چکا تھا اُسے کوٹ شجاع آباد، ملتان کے دیہات، پرگنہ تلمبہ، سردار پور اور احمد پور سیالاں کے پرگنہ جات دیئے۔ باقی پرگنہ جات وہ تھے کہ ان کی پیداوار اور اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہ علاقے فتح کر لیے تو اس نے دوبارہ انہیں بتدریج آباد کیا۔ مہاراجہ نے چند سالوں کے بعد یہ علاقہ بتدریج لالہ ساون مل کے حوالے کیا اور اس سے ٹھیکہ وصول کرتا رہا اس نے ساون مل کو دیوان کا خطاب بھی دیا اور آہستہ آہستہ علاقہ جھنگ سیالاں، پنڈی بھٹیاں اور سیدوالہ اور علاقہ کی حد بھنگہ نیں تک ہے جو لاہور کے قریب ہے اور دریائے گھارا کے کنارے حجرہ شاہ مقیم سے کلور کوٹ پیپلاں تک مخدوم غوث شاہ اور عیسیٰ خیل تک ہے

اور ٹھل ونسگڑ ڈیرہ غازی سے روجھان کی حد تک ہے۔اس سارے علاقے کی متاجری 36 لاکھ روپے سالانہ ساون مل رنجیت سنگھ کو دیتا تھا۔اس وقت علاقے کی آبادی کافی ہوئی اور لاقے کی آمدنی ترقی پر ہوئی۔ساون مل کی دانائی اور ہوشیاری انصاف اور عدل کا شہرہ سارے علاقے میں پھیلا۔اس کے زمانے میں رہزنی اور قاتلوں کے راستوں میں لوٹ مار کا طریقہ جو پہلی حکومتوں میں عام تھا ختم ہوگیا اور وہ اپنی نیک نامی میں مشہور ہوا۔اب خدا کے فضل سے یہ علاقہ سرکار دولت مدار انگریز بہادر کی عملداری کی وجہ سے ان کے حکم اور قانون کے تابع ہے اور ملکہ معظّمہ انگلستان کے ملازمین کے اثر ونفوذ میں ہے اور یہ علاقہ جو انگریزی فوج کے یہاں آنے اور دیوان مولراج کے ساتھ جنگوں میں ویران ہوگیا تھا اس کی اصلاح ہوئی اور یہ علاقہ دوبارہ آباد ومعمور ہوا۔خاص طور پر کہ یہ علاقہ جناب کمشنر بہادر کے انصاف اور مہربانی سے بارونق ہوا ہے اور زیادہ سے زیادہ آباد ہوتا جارہا ہے اور یہاں کے لوگ امن میں اور آسودہ حال ہیں اور مصروف ہیں اور اپنے اپنے پیشوں میں مشغول ہیں۔آبادکاروں نے علاقے کو اب آباد کیا ہے اور تاجروں کی تجارت کا عمل محفوظ ہے اور علاقے کے سب لوگ ملکہ معظّمہ کی حکومت کے دوام اور کمشنر بہادر کے مناصب اور مرتبے کی ترقی کے لیے دعاگو ہیں۔سرکار عالی نے رعایا کی تکلیف کو رفع کرتے ہوئے غلہ، گھی، قصابوں کے سلی خانے اور اجناس خوراک وغیرہ اور لباس پر محصول معاف کر دیا ہے جو سالہا سال پہلے مغلوں کی حکومت کے زمانے سے رعایا پر لاگو تھا۔یہ محصول مقامی لوگوں اور باہر سے آنے والے لوگوں پر مکمل معاف ہوا اس کے علاوہ آمدنی پر بہت نرم ہاتھ رکھا گیا اور سارے علاقے پر احسان کرتے ہوئے قانونی بندوبست کا اجرا کیا اور ملک کی آبادی کے لیے لوگوں کے لیے رفاہِ عامہ کے کام کئے ہیں۔اب یہ سارا علاقہ کہ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے سوائے ڈیرہ غازی خان اور ٹھل کے کچھ علاقوں کے سوا سب کا سب جناب کمشنر صاحب بہادر ملتان کے جو صوبہ ملتان کے حاکم ہیں تابع ہے اور چار ضلعوں میں تقسیم ہوگیا ہے اور ہر ضلع کئی تحصیلوں پر منقسم ہے کہ جن کی ضلع وار تفصیل بیان کی جائے گی۔یہ تمام اضلاع اپنی تحصیلوں سمیت پُر رونق، آباد اور معمور ہیں۔خدا کے فضل اور ملکہ معظّمہ انگلستان کے حکم اور جناب صاحب کمشنر بہادر ممدوح کے اقبال سے اور یہ آئندہ بھی ایسی ہی رہیں گے۔انشاءاللہ تعالیٰ۔

ذکر ہشتم

باغات کی تعداد، میوہ جات ہر قسم کے بارے میں:

یہ شہر اور اس کے آس پاس کے علاقے بہت آباد ہیں بڑے پُر رونق ہیں اور اس کے باغوں اور کنوؤں کے سبب جو آبادی شہر میں پائی جاتی ہے وہ دوسرے شہروں میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔جب کنوؤں سے پیداوار ہوتی ہے اور نہری پانی بھی میسر آتا ہے تو فصل ربیع میں گندم، جو، خربوزے، تربوز، کھیرے، بینگن، توری، کریلہ، تمباکو، پوست، بھنگ کی پیداوار ہوتی ہے اور خریف کی فصل کے موقع پر گنا، پونہ، گاجر، شلغم، گندلاں وغیرہ کی پیداوار ہوتی ہے۔ جہاں دریا کا پانی پہنچ جاتا ہے وہاں ان چیزوں کے علاوہ چنا، دال ماش، دال مونگی اور دھان وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔

راوہ کے علاقے یعنی وہ جگہ جہاں دریا کا پانی نہیں پہنچتا وہاں گندم، جو اور کنگنی فصل ربیع میں اور جوار، شلغم، کنگنی اور کپاس فصل خریف میں پیدا ہوتے ہیں اور راوہ میں دھان کی فصل جب بارش فراواں ہو جائے تو ہوتی ہے۔ کنوؤں سے بھی یہ فصل زیادہ وہ جاتی ہے۔ جنگل میں ہر قسم کی گھاس بھی پیدا ہوتی ہے کہ مویشی پالنے والے اپنے سارے مویشیوں کو راوہ میں دریا کے کنارے لے جاتے ہیں اور انہیں وہاں دو تین مہینے چراتے ہیں اور بارشوں والے سالوں میں غلے، گھی اور دودھ و دیگر اجناس کی بہتات ہو جاتی ہے۔ تین چار سالوں میں اس قسم کی بارش خوب ہوتی ہے اور جس سال بارش ہوتی ہے اس سال بخار وغیرہ بیماریاں بھی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ ملتان شہر کے آس پاس باغ بہت ہیں۔ قدیم باغوں میں ایک باغ جیسمل والہ باغ ہے اور یہ اسی نام سے باقی ہے۔ یہ دو سو سال سے آباد ہے اور اب بھی اس کی اولاد کے قبضے میں ہے۔ دوسرا مشہور باغ قصائی والا ہے کہ وہ بھی تقریباً دو سو سال پہلے بنایا گیا تھا اور اس میں موجود آم کے درخت دوسرے باغوں میں موجود نہیں ہیں۔ اب یہ ویران ہو رہا ہے اور اس میں آموں کے کچھ درخت باقی رہ گئے ہیں لیکن اپنی لذت اور مٹھاس میں بے مثال ہیں ایک دوسرا باغ عابد خان سدوزئی والہ ہے کہ جو اپنے بانی کے نام سے مشہور ہے وہ سدوزئی خان خال تھا اور مظفر خان نواب کا جد اعلیٰ تھا اور سابقہ زمانوں میں ماہ ساون یا بھادوں میں ہر ہفتے جمعہ کے دن اور اتوار کے دن وہاں میلہ لگتا تھا۔ یعنی دو دن اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں جمعہ کے دن میلے کہ جن میں مسلمان شریک ہوا کرتے تھے بند کر دیئے گئے تھے اور اتوار کا میلہ ان مہینوں میں جاری رہتا تھا اور اتوار کو تقریباً چھ یا سات دن میلا لگتا تھا جس میں ہندو اور مسلمان جایا کرتے تھے اور لوگ دور دور سے شرکت کے لیے آتے تھے بڑا ہجوم ہوتا تھا اور وہاں کنجریوں کا ناچ گانا اور دوسرے تماشے ہوتے تھے اور اب بھی اس باغ کے آم دوسرے آموں سے عمدہ ہیں اور اس باغ کے نزدیک باغ مخدوم راجو شاہ والا ہے کہ وہ بھی اپنے بانی مخدوم موصوف کے نام مشہور ہے اور یہ بھی دو سو سال پہلے لگایا گیا تھا اور میں یعنی اس کتاب کا مصنف مخدوم ممدوح کی چھٹی پشت سے ہوں اور یہ باغ اب میرے قبضے اور تصرف میں ہے۔ ایک اور باغ شیشہ محل ہے کہ اس کو پہلے نواب شجاع خان نے اور اس کے اس کی عمارت کو نواب مظفر خان نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اب چونکہ یہ باغ جرنل صاحب بہادر کے تصرف میں ہے تو اس میں بہت اضافہ کیا گیا ہے اور وسعت دی گئی ہے اور اس کی عمارتوں کو عمدگی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ ایک اور باغ حضوری باغ ہے کہ اس کا بانی نواب مظفر خان ہے اور اس نے اسے نئے سرے سے لگایا تھا اب جناب کمشنر صاحب بہادر ملتان نے اسے اچھی عمارتوں کے ذریعے سے ترتیب دیا ہے اور بڑی رونق سے مکمل آباد اور شاداب ہے۔ کمشنر بہادر نے اس میں دو عمارتیں ایک کچہری کے لیے اور ایک اپنی رہائش کے لیے بنوائی ہیں۔ پس اس باغ کو دو وجوہات کے سبب بہت زیادہ شرف حاصل ہے ایک عمدہ عمارت، پھلوں والے درخت ہر قسم کے اور ہر رنگ و بُو کے پھول اس میں بہت ہیں اور دوسرے یہ کہ مکان کا شرف مکین سے ہے کہ وہ کمشنر صاحب بہادر کی رہائش گاہ ہے۔ دوسرے باغوں میں سے ایک باغ محمد زمان قریشی والا ہے جو ڈیڑھ سو سال سے آباد کیا گیا ہے اور نواب مظفر خان کے عہد میں محمد خان ملے زئی کے پاس تھا اب انگریزی سرکار کی طرف سے صادق محمد

خان بادوزئی کو عطا ہوا ہے۔ یہ باغ پُر رونق ہے۔ دوسرا باغ محمد غوث والا ہے کہ وہ بھی نواب مذکور کی صوبے داری میں محمد خان موی اللہ کے تصرف میں آ گیا تھا۔ اب سرکار علی نے یہ باغ غلام مصطفیٰ خان خوگانی کو مرحمت کر دیا ہے۔ الغرض اس کے علاوہ اور چھوٹے بڑے باغات بھی ہیں جو سو سال پہلے آباد کئے گئے ہیں اب جب کہ کمشنر صاحب کی طرف سے باغوں کا مالیہ معاف کر دیا گیا ہے تو اکثر رؤسا، نمبردار اور زمیندار اپنی استعداد کے مطابق از سرنو باغ لگا رہے ہیں اور پھلدار درختوں کو وہاں لگوا رہے ہیں اور اس ہر میں پھل کافی ہوتے ہیں جن میں سے ایک پھل آم ہے کہ لذت، شیرینی اور عمدگی میں دوسری جگہ کم پایا جاتا ہے۔ ترش اور میٹھا، انار، شفتالو، جامن، لیموں، توت اور شہتوت، سنگترہ، نارنگی اور کھجور وغیرہ پھل اور ساتھ ہی بیری کے سادے اور پیوندی پھل بہت زیادہ ہیں کہ ان کا شمار محال ہے۔ تاجر لوگ کابل سے انگور، ناشپاتی، کابلی سیب، کابلی خربوزہ، جلال آبادی انار وغیر یہاں لا کر بیچتے ہیں۔ کشمیر سے بھی پھل لا کر یہاں بیچتے ہیں۔ اس علاقے میں جو پھل زیادہ ہوتے ہیں وہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور مارواڑ میں بھیجے جاتے ہیں۔ اب جبکہ سرکار عالی کے حکم کے تحت ولایت اور ہندوستان سے درختوں، پھلوں اور سبزیوں کے بیج لائے جاتے ہیں اور یہاں کاشت ہو رہے ہیں ان کی پیداوار بھی بڑھ رہی ہے۔ اگر میں ان کی صفات بیان کروں تو بات طول پکڑ جائے گی لہٰذا اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس ملک میں سردیوں کا موسم معتدل ہوتا ہے لیکن گرمی بہت زیادہ اور بارش کم ہوتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تاجر لوگ خراسان، ترکی اور عراق سے گھوڑے یہاں لا کر فروخت کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ ہر قسم کی چھینٹ، رنگ برنگے ریشمی کپڑے مثلاً گلبدن اور دارای، قیمتی دوپٹے جن کی قیمت سو سو روپے سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور لنگیاں بہت عمدہ تیار کرتے ہیں اب جبکہ ملتان کے حالات ورطۂ تحریر میں آ چکے تو اب سلاطین کا ذکر آئے گا۔

سلاطین میں سے سلطان شمس الدین التمش نے اس علاقے کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ اس وقت سے سلاطین دہلی کا سکہ و خطبہ اس علاقے میں جاری ہوا اور سلاطین دہلی کی طرف سے ناظمین و حکام یہاں پر مقرر ہوئے۔ پس ربط کلام کے تحت میں ان کے نام اور مدت سلطنت کے ذکر پر اکتفا کروں گا اور جو ضروری ہوا اس کو تحریر کروں گا۔ چونکہ تاریخ کی کتابیں ان کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔ ان کے دوسرے حالات و واقعات کا ذکر طوالت کی وجہ سے نہیں آئے گا۔ واللہ حمید مجید و عنہ الاعانہ والتوفیق۔

(تذکرۃ الملتان – مخدوم سید روشن شاہ محمد یوسف سالع – مترجم: ڈاکٹر محمد بشیر انور ابوہری)



سید محمد لطیف

ابتدائی تاریخ

ملتان کا مشہور شہر، سکندرِ اعظم کی اساطیری لشکر کشی کے دوران، پنجاب میں مالی کا دارالحکومت تھا اور دریائے چناب سے چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس دور کا دریا اپنے ساتھی دریاؤں، راوی اور جہلم، کے پانیوں کو اپنے سینے میں لیے اس قدیم شہر کو سیراب کرتا ہوا آگے نکل جاتا تھا۔ یہ شہر صدیوں کی شکست و ریخت کے انبار پر واقع ایک قلعہ پر کھڑا تھا اور شہر کے اردگرد تباہ شدہ مکانوں کا ملبہ دور دور تک بکھرا ہوا تھا جو اس کی قدامت اور بزرگی کا تاسف انگیز ثبوت فراہم کرتا تھا۔ شروع میں ملتان کا قلعہ، جس کی فصیلوں کے اندر شہر ملفوف تھا، دریائے راوی کے دو ''جزیروں'' پر آباد ہوا۔ اس معمر شہر کا قد اردگرد کے علاقوں سے 150 فٹ بلند تھا اور اس بلندی نے اس کے وقار کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ تاہم مذکورہ دور صدیاں پہلے دریائے راوی اس شہر کو تیاگ کر تیس میل دور مغرب میں بہہ رہا تھا۔ تاہم اس کا پرانا راستہ اس وقت بھی ان دونوں کی دوستی کا پتہ دیتا تھا۔ اس وقت بھی بارشوں کا پانی اس ہرجائی دریا کے پرانے راستوں میں جمع ہو کر اس قدیم رشتے کا سراغ دیتا ہے جو آج صرف قدیم یونانی مؤرخین کی کرم خوردہ تاریخی یاداشتوں میں ''محفوظ'' ہے۔ سکندر کے دور کے مورخین لکھتے ہیں کہ اس تیاگی دریا کا پانی شہر کے قلعے کے گرد سرمست یاتری کی طرح طواف کیا کرتا تھا۔

اس شہر کا پہلا نام، جہاں تک تاریخ کی یاداشت ساتھ دیتی ہے۔ کاسیاپا پورہ تھا۔ کاسیاپا، قدیم ہندو دیو مالا کے مطابق، بارہ سورج دیوتاؤں (Aditays) کا باپ تھا اور اس شہر کا بانی تھا۔ اسی نسبت سے ہندوستان بھر میں یہ شہر مہر پرستی (Solar Worship) کا گہوارہ مانا جاتا رہا ہے اور سکندر کے دور سے لے کر آج تک اس بات کی شہادتیں ملتی ہیں اس شہر کے قدیم باسی، سحابِ حیات، سورج کو اپنا خدا مانتے تھے۔ تاہم قدیم تاریخی دستاویزات کے مطابق، مہر پرستی کی داغ بیل ڈالنے والا پرم پرش کرشنا کا بیٹا سمبا تھا، جو بتا کا بطلِ فعال مانا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ اس کے باقی بھائی بھی شامل تھے۔ یہ روایات مزید بتاتی ہیں کہ دیتیا نے وشنو کی ہمہ جائیت کا انکار کیا تھا اور اس طرح نرا سنہا کی تجسیم (تجسیمِ وصف) عمل میں آئی تھی جو کہ آدھا شیر اور آدھا آدمی تھا۔

اسی کے پیش رو پر بھالادا، جس کی نسبت سے ملتان کا نام بعد میں پر بھالا دا پورہ پڑا، نے مہر پرستی کی مردہ

روایت میں ایک بار پھر حیاتِ نو پھونکی اور مقامی دیوتا کا مرتبہ پایا۔ ویدک دیوتاؤں میں جو چیز سب سے زیادہ جاذب توجہ ہے وہ فطرت اور ویدک دیوتاؤں کی حیرت انگیز قربت ہے اور اسی لیے، ہندو دیو مالا کے مطابق، دیوتاؤں کو خوش کرنے سے فطرت کے قوانین بدل سکتے ہیں۔ ویدک شاستروں کے مطابق مترا اور ورن آسمان کے دیوتا ہیں جن میں سے مترا، خاص طور پر اس دور میں، ایک عظیم سورج دیوتا سمجھا جاتا تھا، جس کی خالص و صادق عبادت کے صلے میں سمبا کو خوردنامیہ سے پیدا ہونے والے مزمن مرض جذام سے نجات ملی تھی۔ سمبا فرطِ تشکر سے اس حد تک مجبور تھا کہ اس نے ملتان میں مترا کا ایک عالیشان مندر تعمیر کرایا اور اس میں مترا کا طلائی مجسمہ سجا دیا۔ اس نے اس مندر کو ادبیاس تھانا کے نذرگزار کر دیا اور اس کا نام بھی یہی رکھ دیا۔ مترا کا یہ طلائی مجسمہ ملتان کا معروف وممدوح دیوتا قرار پا گیا جس کی عقیدت ہندوستان بھر سے لاکھوں یاتریوں کو اس شہر میں لاتی اور یہ شہر، صدیوں تک، ہندوستان کے مقدس ترین شہروں میں سے ایک مانا جاتا رہا۔

ایک اور اسطورہ (روایت) جو اس بات پر زور دیتی ہے کہ سیاپا پورہ ہی اس شہر کا اصل نام تھا، وہ قدیم مؤرخین کی کہنہ یادداشتیں ہی جو دوسرے خطوں سے ہندوستان میں آئے۔ ان قدیم مؤرخین میں پانچویں صدی قبل مسیح کا مشہور یونانی سیاح ہیقاطیس (Hecataeus) اپنے دنیا بھر کے سفر کی روداد Ges periodos of) (Periegesis میں اسے کاسپاپورس کہتا ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں سکندریہ کا معروف ریاضی دان، جغرافیہ دان اور سیاح ٹولمی (Claudius Ptolemaeus) اسے کاسپریا کہتا ہے اور مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس، جو دنیا کے اولین مؤرخین میں سے ایک ہے، ملتان کو کاسپاپوروس کے نام سے یاد کرتا ہے۔ قدیم سنسکرت ادب میں کاسیاپا پورہ کا نام کئی مرتبہ آتا ہے اور اس کے ساتھ، دیگر شہروں میں، بھاگاپورہ، سمباپورہ بھی شامل ہیں۔ انہیں ناموں جنرل کنہنگم دو ناموں؛ پراہلادا پورہ اور ادبیاس تھانا، کا اضافہ کرتا ہے جن کا لفظی ترجمہ ''اولین تبرک خانہ'' قرار پاتا ہے۔ یہ اولین تبرک خانہ، بلاشبہ مترا کا مندر تھا جس میں اس کا طلائی بت رکھا ہوا تھا۔

ٹولمی کہتا کہ کاسپریا عین اس مقام پر موجود تھا جہاں دریائے راوی (Rhuadis) بل کھا کر، مغرب کی طرف اپنے آپ کو چندرہ بھگا (چناب) کے سپرد کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ملتان کا جدید شہر راوی کے کناروں پر موجود نظر آتا ہے اور تیمور (1398-99AD) کے دور تک یہ دریا ملتان کا طواف کر کے آگے بڑھتا ہے، یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ ٹولمی کا کاسپریا دراصل ملتان ہی ہے اور حقیقت عتیقیاتی (Antiquarian) نقطہ نظر سے اس حد تک اہم ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی کے وسط میں موجودہ ملتان سے منصورہ تک پھیلا ہوا تھا اور پنجاب کا اہم ترین شہر تھا۔

سورج دیوتا کے مندر کے شہر (مالاستھانا پورہ) کا اولین ذکر، جس سے جدید شہر ملتان کا نام پڑا، سب سے پہلے مشہور چینی یاتری ہوان ژانگ کے سفر ناموں میں ملتا ہے جس نے 641 عیسوی میں زنگالا (بلوچستان)، پٹالا (حیدرآباد)، الور اور سندھ کا سفر کیا اور ملتان بھی تشریف لایا۔ ہندوستانی تاریخ کا یہ دور راجہ چاچ کا دور تھا جس نے

رائس کے شاہی خاندان سے اقتدار چھین کر ہندوستان کے تخت کو رونق بخشی تھی اور 631 عیسوی میں ملتان کے صوبے پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ رائس کا بھائی، چندا، اس کی موت کے بعد ملتان کا حکمران بنا جو بدھ مت کا پرشوق اور مستعد پیروکار تھا۔

یہ عظیم چینی سیاح ملتان شہر کو پانچ میل کے دائرے کے اندر آباد شہر قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنے اس دورے کے دوران مترا کا طلائی مجسمہ بھی دیکھا جو کہ زرق برق لباس میں ملبوس ایک بلند چبوترے پر کھڑا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ مترا کا مندر ہر وقت زائرین سے بھرا رہتا تھا اور ہندوستان کا ہر راجہ، مہاراجہ اس عظیم بت کے سامنے کھڑا ہو کر منتیں مانگتا تھا اور مراد پوری ہو جانے پر نذرانوں کی بارش کر دیتا تھا۔ وہ اس شہر کو میلو۔سان۔پولو کہتا ہے جو کہ ہندی لفظ مالا ستھانا پورہ کی صوتی نقل ہے۔

اس کے علاوہ اس طلائی مجسمے کا ذکر بھاویشہ پرانہ نامی قدیم سنسکرت شاستر میں بھی ملتا ہے۔ اس شاستر میں مترا کے مندر میں موجود خزانے کا بھی ذکر ہے جس کی وجہ سے عرب فاتحین اسے ''فراج'' (سونے کا گھر) کہا کرتے تھے۔ ملتان میں مسلمان فوج کا پہلا قدم 44 ہجری (664A.D) میں پڑا جب خلیفہ ابوبکر صدیق کے دور میں ایک عرب جرنیل محالب اپنی فوج کے سے کسی طرح الگ ہو کر مالی کے دارالحکومت آن پہنچا۔ محالب جب واپس گیا تو وہ اپنے ساتھ ہزاروں ہندوستانیوں کو جنگی قیدی بنا کر لے گیا۔ تاہم اس کی آمد کا مقصد اس علاقے کو فتح کرنا نہیں تھا بلکہ مستقبل میں وسعت پسندی کے امکانات پیدا کرنے کے لیے نئے علاقوں کی دریافت تھا۔

عرب زبان میں لکھا گیا ''چچ نامہ'' عام طور پر طویل اور اکتا دینے والی تقاریر پر مشتمل کتاب سمجھا جاتا ہے۔ تاہم ایلفن سٹون کہتے ہیں، ''یہ محمد بن قاسم کے حملے کے وقت کی جزئیات کو سامنے لانے والی اور خفیف، موضوعی اور معروضی، تاثرات کو محفوظ کرنے والی مفصل روداد ہے جو غالباً منصورہ کی تعمیر سے پہلے لکھی گئی تھی۔'' دراصل منصورہ کی تعمیر 753 عیسوی میں، خلیفہ منصور کے دور میں ہوئی تھی اور مسلمانوں نے اسے سندھ کا دارالحکومت بنایا تھا۔ اس شہر کو برہمن آباد کے قریب تعمیر کیا گیا تھا جسے دائڈرس (Diodorus Siculus) پہلی صدی قبل مسیح کا عظیم یونانی مؤرخ جسے عالمگیر تاریخ (Biblotheca Historiea) لکھنے کا شرف حاصل ہے، ہرما تالیہ کہتا ہے اور اس کے ساتھ کسی اور قصبے کا ذکر نہیں کرتا۔ تاہم سندھ میں آنے والے عرب مؤرخین اس کے ساتھ باقی قصبوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

چچ نامہ کا مصنف، راج چچ، محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح ہونے والے اس شہر کو ''سِقا ملتان'' کہتا ہے۔ وہ اس کتاب میں کئی خونخوار لڑائیوں کا بھی ذکر کرتا ہے جن میں دونوں طرف سے خون کے دریا بہتے دکھائے جاتے ہیں۔ محمد بن قاسم نے ہزاروں انسانوں کو اپنی تلوار کا نشانہ بنانے کے بعد اس کالاندہ کا مضبوط قلعہ فتح کیا اور اپنی تمام فوج کے ساتھ سِقا ملتان کی طرف چل پڑا۔ ملتان، چچ نامہ کے مطابق، اس وقت دریائے راوی کے جنوبی کنارے پر واقع تھا اور راجہارہ کی فوج میں شامل ملتان کے سپوتوں نے اس کے دفاع کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ محمد بن قاسم اور راجہارہ کی فوج کے درمیان سات دن تک جنگ لڑی گئی اور اس جنگ میں کئی اہم مسلمان جرنیل مارے گئے تھے۔ تاہم جب

محمد بن قاسم کی فوج کا پلڑا بھاری ہوا تو اس نے تمام لڑنے والوں کو بے دردی سے مار دیا؛ مترا کے مندر کے چھ ہزار پروہتوں اور پنڈتوں کو غلام بنا لیا۔ اس کے علاوہ سینکڑوں معصوم عورتوں اور بچوں کو بھی گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس فتح کے بعد اس نے ملتان میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔

جب ملتان فتح ہو چکا تو محمد بن قاسم نے مترا کے مندر کا رخ کیا۔ جب وہ اس مندر کے تہہ خانے میں پہنچا تو خزانوں کے ڈھیر اس کے منتظر تھے اور بعد میں، فاتح کی فرمائش پر مقامی لوگوں نے بھی خزانے کی تکثیر میں محمد بن قاسم سے ہر ممکن تعاون کیا۔ مشہور مؤرخ ابوریحان، جسے یہ واقعہ ابو محمد ہندوی نے سنایا تھا، خزانے کی دریافت کے واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے، ''محمد بن قاسم کھڑا ہوا اور اپنے محافظوں اور فوجی دستوں کے ساتھ مندر میں داخل ہو گیا۔ مندر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اس عظیم بت پر پڑی جسے خالص سونے سے بنایا گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں یاقوت رمّانی (لعل) جڑے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ بت اندھیرے میں کھڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں کے نایاب پتھر چمک رہے تھے، محمد بن قاسم نے اسے ہندوستانی سپاہی سمجھ لیا اور نیام سے تلوار نکال کر آگے بڑھا۔ چند براہمن، جو اس وقت اس مندر میں موجود تھے، اسی وقت اس کی تعظیم میں جھک گئے اور کہا کہ اس بت کو ملتان کے حکمران جباوائی نے بنوایا تھا اور اس کے تہہ خانے کے حوض میں اتنا خزانہ دفن ہے کہ شاید زمین کے سینے میں اتنا بڑا خزانہ دفن نہ ہو۔ اس پر عرب جرنیل نے بت کو اس کی جگہ سے ہٹانے کا حکم دیا۔ جب بت کو ہٹایا جا چکا تو وہ ایک راستے سے وسیع و عریض ایوان کو دیکھ سکتے تھے۔ اس ایوان میں اترنے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اب وہ ایک ایسے ہال میں کھڑے تھے جہاں ان کے سامنے سونے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور ان گنت مرتبانوں میں خالص سونے کا برادہ بھرا ہوا تھا۔ جب بعد میں اس سونے کا وزن کیا گیا تو وہ تیرہ ہزار دو من کے لگ بھگ تھا۔''

محمد بن قاسم کو اتنا بڑا خزانہ دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ اتنا زیادہ خزانہ کہاں سے آتا ہے اور شہر کے لوگوں کی خوشحالی کیا وجہ ہے؟ محمد بن قاسم کو بتایا گیا کہ مندر میں موجود خزانہ یاترا کرنے والے لوگوں کی عقیدت کا اظہار ہے جو ہندوستان کے طول و عرض سے اپنی مرادیں پوری ہونے پر یہاں ڈھیر کر جاتے ہیں۔ محمد بن قاسم چاہتا تھا کہ مترا کا بت اپنی جگہ پر موجود رہے تاکہ وہ وقتاً فوقتاً خزانے پر ہاتھ صاف کر جایا کرے۔ لہٰذا محمد بن قاسم نے اس بت کو مندر میں کھڑا رہنے دیا لیکن برہمی کے اظہار کے طور پر گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا اس بت کے گلے میں لٹکا دیا۔ محمد بن قاسم کے چلے جانے کے بعد سے اُموی خلافت کے اختتام تک یہ بت یاتریوں کی یاترا کا مان رکھتا رہا۔

چچ نامہ میں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سِقا دریائے راوی کے کنارے، ملتان کی مخالف سمت، موجود ایک قلعہ تھا۔ چچ نامہ میں لکھا ہے، ''راجہ چچ نے راجہارہ کو شکست دی، راوی کے کنارے سِقا پر قبضہ کر لیا اور دارالحکومت کو محاصرے میں لے لیا۔'' شکست کے بعد راجہارہ شہر کی دیواروں کے ساتھ بیٹھ گیا؛ تاہم کشمیر کے فرمانروا کے کہنے پر باعزت طریقے سے اقتدار دشمن کو سپرد کرنے پر تیار ہو گیا۔ ابوالقاسم، جو مشرقی علماء میں ابن خرادبہ کے نام سے مشہور

ہے اور بغدادی خلفا کے دور کا عظیم مؤرخ اور جغرافیہ دان ہے، ان ابتدائی عرب جغرافیہ دانوں میں سے ایک تھا جنہوں نے ہندوستان اور مشرقی جغرافیہ کو تحریری شکل دی۔ اس کی ایک کتاب کا نام ''کتاب الممالک و شاہرات'' ہندوستان اور مشرق کے قدیم جغرافیہ پر بیش بہا معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب کی ''اشاعت'' کا سال مستور ہے لیکن اس کام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جغرافیہ دان نے اپنے فراغت کے لمحات میں خوب محنت کی اور اپنی وفات (912 عیسوی) تک کی تحقیق کو اپنی کتاب میں شامل کیا۔ ابو القاسم ملتان کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ شہر بجستان کے دارالحکومت زرانج سے دو ماہ کے فاصلے پر تھا۔ یہ مورخ اور جغرافیہ داں بھی، دیگر عرب مؤرخین اور فاتحین کی طرح، اس شہر کو ''فراج'' کے نام سے یاد کرتا ہے کیونکہ محمد بن قاسم یہاں سے سونے کا پہاڑ لوٹ کے لے گیا تھا اور اسی نسبت سے ملتان ''سونے کا ذخیرہ'' مانا جاتا تھا۔

بغداد کا المسعودی 915 عیسوی میں سندھ آیا اور 330 عیسوی میں اس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''مرغزار طلائی'' (Meadows of Gold) تحریر کی۔ یہ مؤرخ ان علاقوں میں اسلام کے روشن حال کو ضابطہ تحریر میں لاتا ہے اور ایک مقام پر ملتان کے بارے میں لکھتا ہے، ''یہ شہر مسلمانوں کے لیے ایک مظبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اردگرد ایک سو بیس قصبے اور گاؤں موجود ہیں''۔ المسعودی جیسے مستند اور صادق مؤرخ کا یہ بیان اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ اس دور میں اپنی زرخیزی اور خوشحالی کی وجہ سے ملتان مسلم علاقوں میں اہم ترین مقام رکھتا تھا۔ مترا کے بت کے بارے میں مؤرخ لکھتا ہے، ''سندھ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے طول و عرض سے لوگ اس مندر کی یاترا کے لیے آتے ہیں، مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں، سونے اور ہیرے جواہرات کی صورت میں نذرانے پیش کرتے ہیں؛ اور کوار گندل کی خوشبو دار لکڑیوں کی آگ جلاتے ہیں۔ ملتان کے مسلم حکمرانوں کی سرکاری آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی مندر ہے۔ جب آمنک ہندو قطار در قطار اس مندر کی طرف کھچے چلے آتے ہیں تو مقامی مسلمان ان نہ ماننے والے (ہندوؤں) کو دھمکاتے ہیں کہ وہ ان کے بت کو توڑ ڈالیں گے۔ اس کے بعد ہندو بت پر خزانوں کی بارش کر دیتے ہیں اور نہ ماننے والے (مسلمانوں) کے خلاف منتیں مانگتے ہیں۔''

المسعودی کہتا ہے کہ اس دور میں ملتان کا امیر قریش خاندان کا ایک عرب تھا جو دولت منابع بن اصداص سامی کے نام سے مشہور تھا اور اس نے یہاں موروثی بادشاہت کو رواج دیا ہوا تھا۔ المسعودی ملتان کو تمام غیر مسلم مقبوضہ علاقوں میں سے عظیم ترین شہر قرار دیتا ہے اور یہاں تک کہتا ہے کہ قنوج بھی اس صوبے کا شہر ہے۔

تختِ جمشید، شیراز سے اکاون کلومیٹر پر موجودہ ایرانی شہر جو اس دور میں ایران کا دارالحکومت تھا، کا استخاری اور بغداد کا ابن حوقل، جس نے اپنے کام کی بنیاد استخاری کے کام کو بنایا، ملتان کے اس روشن دور کی روشن تاریخ کو قلم بند کیا۔ یہ دونوں اس شہر کو دفاعی لحاظ سے ناقابل تسخیر قرار دیتے ہیں اور اسے منصورہ کے مقابلے میں نصف گردانتے ہیں۔ دونوں مؤرخین مترا کے بت کو زائرین کا قبلہ مقصود قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مندر 300 فٹ اونچا ہے اور یہ ایک مضبوط ترین عمارت ہے۔ اس دور کا مندر بازار کے عین وسط میں موجود تھا اور اس کے گرد

ایک بہت بڑا صرافہ بازار تھا جس میں سونے کے ساتھ ساتھ چاندی اور ہاتھی دانت کے زیورات بنائے جاتے تھے۔ خواتین اس بازار سے ہاتھی دانت کے چوڑے، دیگر آرائشی سامان اور تانبے کے برتن خریدا کرتی تھیں۔

مؤرخین لکھتے ہیں:

''مترا کا بت بیس فٹ بلند تھا اور مندر کے عین وسط میں موجود تھا جس کے اردگرد زائرین اور پروہت آلتی پالتی مار کر مراقبے میں گم نظر آتے تھے۔ اس بت کا چبوترا لکڑی کا بنا ہوا تھا جس پر قرطبہ کے چمڑے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ یہ بت بھی براقبے کی حالت میں بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا، اس کے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر دھرے ہوئے تھے اور تمام انگلیاں بند تھیں۔ اس کی آنکھوں میں دو لعل جڑے ہوئے اور سر پر طلائی تاج جگمگا رہا تھا''۔

شہر سے آدھے میل کے فاصلے پر ایک وسیع و عریض چھاؤنی، چندرواڑ، واقع تھی اور اس چھاؤنی میں ملتان کا گورنر رہا کرتا تھا، گورنر کا تعلق قریش قبیلے سے تھا اور منصورہ کا حکمران اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسے شدید ناپسند کرتا تھا۔ یہ گورنر بغداد کے خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھوایا کرتا تھا اور وہ جمعہ کے دن کے علاوہ شہر کا رخ نہیں کرتا تھا۔ جمعہ کے روز وہ اجتماعی عبادت میں شریک ہونے کے لیے ایک بہت بڑے ہاتھی پر مسجد آیا کرتا تھا۔

ہوان ژونگ اور سنسکرت کتابوں کا طلائی مجسمہ اس دور میں لکڑی کے مجسمے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور تاریخ اس ''انقلاب'' سے بے خبر رہتی ہے۔ چچ نامہ کے مصنف کے مطابق، جو محمد بن قاسم کے حملوں کا عہد ہے، ملتان کے طلائی مجسمے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا تھا اور اسے چند ''بڑے'' مقاصد کے لیے باقی رہنے دیا گیا تھا۔

ان سب کے بعد ابو ریحان البیرونی کے شہرہ آفاق سفرناموں میں ملتان کا تذکرہ موجود ہے۔ ابو ریحان البیرونی نے اپنے مشہور سفر نامے میں اپنے آقا محمود غزنوی کی وفات کے چند ہفتے بعد لکھے تھے۔ وہ محمود کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوتا تھا اور اس نے ہندو فلسفے، مذہب، رسموں، ادب اور جغرافیہ پر گراں قدر کام کیا ہے۔ وہ ملتان کو ملاستھانا کہتا ہے اور محمد بن قاسم کے حملے کے والے سے لکھتا ہے، ''محمد بن قاسم نے سندھ میں بجستان کے راستے سے داخل ہو کر ملاستھانا اور بہمانوا کو فتح کیا۔ ان میں سے پہلے شہر کو وہ المنصورہ کھتا ہے اور دوسرے کو المعمورہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ البیرونی لکھتا ہے، ''محمد بن قاسم کے ہندوستان داخل ہوتے ہی اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور قنوج جا کر یہ طوفان تھم جاتا ہے۔ ان فتوحات کے بعد وہ گندھارا سے ہوتا ہوا کشمیر کے راستے ہندوستان سے باہر نکل جاتا ہے۔''

وہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب کرماتی ملتان کے حکمران بنے تو جلام بن شائبان، جو شیعہ مسلک سے تھا اور اس نے اموی قبیلے سے ملتان کو بزور شمشیر چھینا تھا، نے ہندوؤں کے اس عظیم مندر کو گرا دیا اور بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر

دیئے۔ اس کے بعد اس نے ایک انتہائی قدم اٹھایا اور مندر میں موجد تمام پروہتوں اور براہمنوں کے سر قلم کر دیئے اور مندر کو جامع مسجد میں تبدیل کر دیا۔ اموی خلفاء سے نفرت کے اظہار کے لیے اس نے پرانی مسجد کو بند کر دیا۔

البیرونی لکھتا ہے کہ جب تائیدِ ایزدی پانے والے سُنی سلطان، محمود غزنوی، نے 1005 عیسوی میں کرماتیوں کو شکست دی تو اس نے محمد بن قاسم کی تعمیر کردہ پرانی مسجد کے دروازے کھول دیئے اور پھر اس مسجد میں نمازِ جمعہ کے اجتماعات باقاعدگی سے ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے مندر میں بنائی گئی مسجد کو بند کر کے بالکل نظر انداز کر کے عملِ تحلیل اور شکست و ریخت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ معروف مؤرخ فرشتہ کے مطابق ملتان کا حکمران شیخ حامد لودھی محمود غزنوی کے باپ سبکتگین کو باقاعدہ خراج بھیجا کرتا تھا؛ تاہم اس کے پوتے داؤد نے غزنوی سلطانوں کا ہاتھ جھٹک دیا اور انند پال کے پیش رو اور لاہور کے راجہ جیپال کے ساتھ شامل ہو گیا۔ محمود غزنوی نے بھاتندا کے راستے ملتان میں داخل ہو کر اس شہر کا سات دن تک محاصرہ کیے رکھا۔ تاہم اس سے قبل داؤد کو اپنے حلیف انند پال کی پشاور کے نزدیک شکست کی خبر سن چکا تھا اور اب اسے احساس ہو چلا تھا کہ وہ تنہا غزنوی طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ سات دن کے محاصرے کے بعد داؤد نے ہتھیار ڈال دیئے اور سلطان محمود غزنوی سے معافی مانگ لی۔ محمود غزنوی نے بیس ہزار سالانہ خراج کے بدلے حکومت اس کے حوالے کر دی اور خود غزنی واپس چلا گیا۔

غزنی سلطنت کے زوال کے بعد مقامی ہندو حکومت کو ایک بار پھر عروج نصیب ہوا۔ تاہم یہ عروج عارضی ثابت ہوا اور ملتان ایک بار پھر شیعانِ علی کی گود میں جا گرا اور 1176 عیسوی تک انہی کے قبضے میں رہا۔ اس مرتبہ شیعان علی کے قدموں سے پایہ تخت کھینچنے والا سلطان شہاب الدین غوری تھا۔ محمد غوری نے اس وقت غزنی کی باگ دوڑ سنبھالی اور فوراً اپنی فوج کو ملتان فتح کرنے کے لیے بھیجا جسے اس کی فوج نے آسانی سے فتح کر لیا۔ اس معرکے کے بعد سلطان محمد غوری نے علی کرمانی کو ملتان اور اُچ کا گورنر بنایا۔

یہ وہی سلطان محمد غوری تھا جس نے ہندوستان میں پرتھوی راج کا خاتمہ کیا اور اُم البلاد دہلی کو 1193 عیسوی میں اپنا پایہ تخت بنایا اور اس طرح ہندوستان میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تاریخ کے اس موڑ سے ملتان، جو اس سے قبل عرب خلفاء کے تابع تھا، غزنی کی آغوشِ تابعیت میں آ گیا اور آہستہ آہستہ سلطنتِ دہلی کا ''مشمولہ'' بن گیا۔ ابو ریحان کو ملتان میں نہ مندر ملا اور نہ ہی یہاں مترا کے بت کی کوئی نشانی موجود تھی لیکن جونہی ہندو مسلمانوں کے اثر و نفوذ سے آزاد ہوئے، انہوں نے مندر ایک بار پھر تعمیر کروا لیا اور اس میں مترا کے بت کو ایک بار پھر سجا دیا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے ایک بار پھر زائرین ملتان میں آنے لگے اور ان کی حاجتیں پوری ہونے لگیں۔

مراکش کے الادریس نے 1130 عیسوی میں ''نزہت المشتاق فی افتخار اُلافاق'' لکھی۔ یہ غزنی سلطنت کے انحطاط کا وقت تھا اور ملتان میں مہر پرستی عروج پر تھی۔ الادریس لکھتا ہے کہ مندر ملتان کے عین دل میں واقع تھا اور اس جگہ ہر وقت زائرین کا رش لگا رہتا تھا۔ وہ لکھتا ہے، ''مندر کی عمارت قبہ نما ہے اور دوران طلائی ملمع کاری سے

مزین ہے۔اس مندر کا گنبد اور دروازوں کی تعمیر مقامی معماروں نے اپنی روحانی وابستگی اور خونِ جگر سے کام لیا ہے۔ مندر کے ستون کسی غیور شہزادے کی طرح سینہ تان کر کھڑے ہیں اور دیواریں دلہن کی طرح سجی ہوئی ہیں۔ ہندوستان بھر میں (ہندوسندھ میں) مترا کے بت سے زیادہ کسی اور بت کو واجب التعظیم نہیں سمجھا جاتا اور یہی وجہ ہے کہ یہاں ہندوستان کے ہر علاقے سے آئے ہوئے لوگ سارا سال موجود رہتے ہیں۔لوگ اس بت کا قانون کی طرح احترام کرتے ہیں اور یہ مندر سارا سال یاتریوں کی جنت بنا رہتا ہے۔ مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ مترا ان کا محافظ ہے اور اسی کی وجہ سے وہ قدرتی اور انسانی تباہی سے بچے رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی ہمسایہ بادشاہ ملتان پر چڑھائی کا خیال دل میں لاتا ہے تو پروہت اور براہمن اسے سورج دیوتا کے غیض وغضب سے ڈراتے ہیں اور وہ اپنی تباہی کے ڈر سے تائب ہو جاتا ہے۔''

ادریس مراکشی ملتان کو ایک بہت بڑا شہر قرار دیتا ہے۔اس کے مطابق یہ شہر منصورہ سے بھی بڑا شہر ہے اور اس کے دروازوں سے باہر ایک گہری خندق کھدی ہوئی ہے جو اس شہر کے لیے ہر دم بیدار پہرے دار کا کام کرتی ہے۔''اس شہر کے باسیوں کو حکومت نے بہت سی مراعات سے نوازا ہوا ہے لیکن انہیں بہت کم ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ملتانی لوگ ہندوستان کے بہت سے دوسرے شہروں کے باسیوں کی نسبت فراخ دل اور خوشحال ہیں۔'' ادریسی مراکشی بھی ملتان کو''فراج'' ہی کہتا ہے۔

زکریا الخازونی جو کہ ''آثار البلاد واخبار العباد'' کا مصنف ہے، ہندوستان میں اس وقت آیا (1263) جب یہاں خاندان غلاماں کی حکومت تھی۔ زکریا بھی ملتان کو ایک بہت بڑا اور ناقابلِ تسخیر شہر قرار دیتا ہے۔وہ لکھتا ہے کہ اس شہر کا اولین محافظ ایک عالیشان قلعہ ہے جس پر نظر پڑتے ہیں دشمنوں کے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔وہ مزید لکھتا ہے''یہ شہر ہندوؤں کا روحانی قبلہ ہے اور ہندو اسے اسی طرح واجب التعظیم اور مقدس سمجھتے ہیں جس طرح مسلمان مکہ مکرمہ کو۔ یہاں مسلمان اور ہندو مل جل کر رہتے ہیں مگر عنانِ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔''

1205 عیسوی میں، جس وقت سلطان محمد غوری نے اپنے جسدِ فانی کو الوداع کہا، ملتان اور سندھ کا گورنر نصیر الدین قباچہ تھا۔نصیر الدین قباچہ قطب الدین ایبک کا پسرِ نسبتی اور اسی بنا پر سلطان محمد غوری کی وفات کے فوراً بعد سرکشی پر اتر آیا۔اپنے مربی کی موت کے فوراً بعد اس نے سندھ اور ملتان کی خودانحصاری کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کر دیا۔مرحوم بادشاہ کے لے پالک بیٹے، شمس الدین التمش، نے دہلی کا تخت سنبھالا اور 1217 کو ملتان پر حملہ آور ہوا اور نصیر الدین قباچہ کو شکست دی۔ سلطان التمش اس کی سرکشی سے اس حد تک نادم تھا کہ اس قباچہ کو دریائے سندھ میں پھینک دیا اور وہ ڈوب کر مر گیا۔اس شکست اور موت کے ساتھ مسلمانوں کے زیر اثر ملتان کی آزادی کا دوسرا باب بھی بند ہو گیا اور ملتان ایک بار پھر دہلی کی گود میں جا گرا۔

1396 عیسوی میں ملتان پر ایک بار پھر حملہ ہوا۔اس بار حملہ آور سلطان پیر محمد جہانگیر تھا۔ جہانگیر عالمگیر شہر کے حامل جنگجو تیمور لنگ کا پوتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی کا پایہ تخت محمد تغلق کے قدموں کی خاک چاٹتا تھا اور اس کا

گورنر محمد خضر خان سرنگ خان سے شکست کھا کر ملتان چھوڑ چکا تھا۔ جب محمد تغلق کو یہ خبر ملی کہ مغل شہزادے نے ملتان پر قبضہ کر لیا ہے تو اس نے اپنے نائب محمد تاج الدین کو شاہی فوج کے دستوں کے ساتھ ملتان روانہ کر دیا۔

پیر محمد دہلی کے دستوں کی آمد کا سن کر اپنی فوج کے ساتھ بیاس روانہ ہوا۔ اس کی فوج نے عین اس وقت ملتانی فوج پر حملہ کر دیا جب وہ پہلاڑی نالہ عبور کر رہی تھی اور اس طرح بہت سی ملتانی سپاہ تلوار سے تو بچ گئی لیکن دریا سے نہ بچ سکی۔ جب سرنگ خان نے دیکھا کہ اس کی فوج کے ہزاروں جوان دریا میں ڈوب کر مر گئے ہیں تو اس نے اپنی فوجوں کو قلعے میں محصور ہونے کا حکم دیدیا اور مغل فوج نے کے تعاقب میں دوڑ پڑی۔ ملتان پہنچتے ہی سرنگ خان قلعے میں محصور ہو گیا۔ مغل فوج نے قلعے کا محاصرہ چھ ماہ تک جاری رکھا اور آخرکار خوراک کی عدم دستیابی کی وجہ سے ملتانی افواج کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس طرح مرزا پیر محمد نے ملتان کا اختیار سنبھال لیا۔ (فرشتہ)

تیمور لنگ کی وفات کے بعد کا دو ہندوستانی بادشاہت کی چھتیس سالہ طویل سرما خوابی کا دور ہے۔ اس دوران میں ہندوستانی سلطنت کا نام اور وجود عنقا ہو جاتا ہے۔ اس دوران خضر خان تیمور لنگ کے نام پر مخنث صفت حکمرانی کا تجربہ کرتا ہے لیکن شاہی القابات کو، تاریخ کی طرح، اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتا۔ اسی دور میں ملتان میں ایک سرکشی سر اٹھاتی ہے اور لنگا افغان ملتان پر 1443 عیسوی میں دھاوا بول دیتے ہیں۔

اس کڑے وقت میں دہلی کا سلطان اخلاقی اور حکومتی زنجیروں سے آزاد ہو کر شہوت پرستی کو اپنا دھرم بنا لیتا اور گداز اجسام کی دلدل میں دھنس جاتا ہے۔ نتیجتاً سلطنت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور ہندوستان میں ہر جانب سے بغاوتیں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ کسی بھی والیِ سلطنت اور گورنر کی عدم موجودگی میں سارا ہندوستان مچھلی گھر بن جاتا ہے اور نظم و نسق کا یہ خلا سماجی ہیجان اور افراتفری کو جنم دیتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب سارا ہندوستان اندرونی و بیرونی خون سے جہنم بن چکا تھا۔ دیگر علاقوں کی طرح ملتان بھی اس تاریک دور میں لاقانونیت اور سماجی افراتفری کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

ایسے میں ملتان کے شرفاء کو شیخ یوسف کی صورت میں ایک امید کی کرن نظر آتی ہے۔ شیخ یوسف ملتان کے ایک خانقاہ کے سجادہ نشین تھے اور تقویٰ و پرہیزگاری کے اعلیٰ معیارات کا سانسیں لیتا نمونہ تھے۔ شیخ صاحب کا تعلق قریش کے معتبر گھرانے سے تھا اور ان کے علم کا، طبقاتِ اکبری کے مصنف کے مطابق، ملتان بھر میں طوطی بولتا تھا۔ ملتان کے شرفاء کے متفقہ فیصلے کی روشنی میں ملتان کی حکومت شیخ صاحب کے قدموں میں ڈال دی گئی۔

شیخ یوسف نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی امراء کے مشورے سے اصلاحات کا آغاز کیا اور مختصر عرصے میں ملتان کو ایک بار پھر دفاعی اور سماجی لحاظ سے ایک صحت مند ''ریاست'' بنا دیا۔ شیخ صاحب ہمسایہ حکومتوں میں امن کے سفیر کی حیثیت سے آتے جاتے رہے اور ملتان کی فضائیں ایک بار پھر خوشیوں کے گیتوں سے گونج اٹھیں۔ اسی دوران ایک فتنے کا جنم ہوا۔ شیخ صاحب سے وفاداری کا حلف لینے والوں میں لنگوں کا ایک سردار بھی تھا جو شیخ سے اس قدر محبت کا اظہار کرنے لگا کہ اس کی شہادت میں اس نے شیخ صاحب کو اپنا داماد بنا لیا۔ شیخ صاحب کی شادی کی

تقریب اس قدر شاندار تھی کہ سارا شہر عروسی لباس میں ملبوس نظر آ رہا تھا۔ تاہم شیخ کا پدرِ نسبتی آستین کا سانپ نکلا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد اس نے شیخ کو دہلی بھجوا دیا جہاں سے وہ واپس نہ آ سکا اور شک کا بیج بو کر خود اقتدار پر قابض ہو گیا۔ یہ واقعہ 1445 عیسوی میں پیش آیا۔ غاصب نے اقتدار پر قابض ہوتے ہیں شاہی انداز و اطوار اختیار کر لیے اور اپنے آپ کو سلطان قطب الدین لنگا کہنا شروع کر دیا۔ اس دوران شیخ یوسف سلطان بہلول لودھی کا مہمان رہا اور اس نے اپنی سلطنت واپس لینے کی کوئی کوشش نہ کی۔ قطب الدین لنگا کے بعد اس کا بیٹا حسین لنگا ملتان کا حکمران بنا۔ حسین لنگا ایک صاحب علم اور گہری دانش و بینش رکھنے والا متحرک حکمران ثابت ہوا اور اس کے توسیع پسندانہ معرکوں نے ملتان کو مغرب اور جنوب میں دور دور تک پھیلا دیا۔

ملتان میں لنگا خاندان اسی برس تک برسر اقتدار رہا اور اس دوران ملتان ہندوستان کو قندھار سے ملانے والے پل کا کام کرنے لگا۔ یہا دور ملتان میں خوشحالی کے نئے دور کا نقیب ثابت ہوا اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ یہ شہر بھی زراعت اور تجارت میں بہت آگے نکل گیا۔ اسی دوران چناب اور گھارا کے کناروں پر موجود تمام زمینوں کو ہموار کیا گیا اور ان زمینوں کی کوکھ سونا اگلنے لگی۔ لنگا دور میں کچھ بلوچی اور جین قبائل کو بلوچستان اور کراچی کے سرحدی علاقوں میں آباد کیا گیا جو کہ اس دور کے سب سے بڑے تجارتی مراکز تھے۔

1526 عیسوی میں شاہ حسین ارغن، والیِ سندھ نے بابر کے کہنے پر ملتان پر حملہ اور فتح یاب ہونے کے بعد ملتان کی حکومت اپنے بیٹے مرزا عسکری کے سپرد کر دی۔ مرزا عسکری نے سلطان محمود لنگا کے ایک مضبوط امیر کی مدد سے بابر کے عہد حکومت میں ملتان پر حکومت کی اور اس دوران کسی سازش نے سر نہ اٹھایا اور نہ ہی ملتان کے باسیوں کو بیرونی حملوں کا کوئی ڈر رہا۔ بابر کی موت کے بعد ہمایوں کو اپنے بھائی کامران مرزا کی بالادستی کے آگے ہتھیار اور ملتان ڈالنا پڑا۔ کامران نے لاہور کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اپنے ایک امیر کو ملتان کا گورنر بنا کے لنگر خان کو لاہور طلب کر لیا۔ اس نے لنگر خان کا شاندار استقبال کیا اور اسے شہر کے قریب ایک رہائش گاہ فراہم کر دی جسے گزر لنگر خان کہا جانے لگا۔ (طبقاتِ اکبری)

کچھ عرصہ بعد کے واقعات نیہمایوں کو سلطنت چھوڑ کر ایران جانے پر مجبور کر دیا اور ملتان پر بلوچی سردار فتح خان نے قبضہ کر لیا۔ جب شیر شاہ سوری کا دورِ حکومت شروع ہوا تو فتح خان نے سلطان سے وفاداری کا حلف اٹھایا لیکن شیر شاہ اس زرخیز علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اپنے جرنیل ہیبت خان کی آنکھوں میں ملتان کی فتح کا خواب پرو کر بھیجا۔ فتح خان نے ملتان کا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ مغل فوج کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا اور ملتان پر شیر شاہ سوری کا قبضہ ہو گیا۔ ہیبت خان نے ملتان کا نظم و نسق نہایت دانشمندی اور جوانمردی سے چلایا۔ شیر شاہ سوری اپنے اس جرنیل سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے ہیبت خان کو ''عظیم ہمایوں'' کا لقب دیا۔

1555 عیسوی ہمایوں کے ایک بار پھر برسر اقتدار آنے کا سال تھا تاہم کچھ عرصہ حکمرانی کے بعد اس نے

عنانِ حکومت اپنے بیٹے اکبر کے سپرد کر دیا جسے تاریخ اکبرِ اعظم کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جس وقت برصغیر کا عظیم دانشور اور سیاسی مفکر، ابوالفضل، آئینِ اکبری کی قرطاسِ ابیض پر لا رہا تھا ملتان ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ بن چکا تھا۔ اس دور میں اس عظیم اور قدیم شہر کی سرحدیں ایران تک پھیل چکی تھیں اور اس نے بلوچستان، سندھ، شکار پور، سویستان، ٹاٹا اور لاہور کے دو آبوں کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ ملتان میں شاہی دار الضرب (ٹکسال) بھی قائم کر دیا گیا تھا جہاں، دہلی، آگرہ، الہ باد، کشمیر، اجین، سورات، پٹنہ اور ٹانڈا کے علاوہ تانبے کے سکے ڈھالے جاتے تھے اور جنگی سامان تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ قاضی القضاۃ کا مسکن بھی یہی شہر تھا اور جب ہندوستان کے تمام اہل علم نے اکبر اعظم کو ''امام عدل'' قرار دیا تو اس وقت ملتان میں قیام پذیر قاضی القضاۃ، قاضی جلال الدین ملتانی نے ابھی اس دستاویز پر دستخط کئے۔ خانِ اعظم مرزا عزیز، جو کہ اکبر اعظم کا رضاعی بھائی تھا، نے جب ''دینِ الٰہی'' کو تسلیم کیا تو ملتان کو اس کی جاگیر بنا دیا گیا۔ مرزا عزیز عکبر اعظم کی آیا جی جی انگاہ کا بیٹا تھا اور اکبر اسی کے ساتھ پل کر جوان ہوا تھا اور مدت تک اس کا والی رہا تھا۔ اکبر اعظم اکثر کہا کرتا تھا، ''میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کا دریا حائل ہے جسے میں کبھی عبور نہیں کر سکتا۔''

یورپی سیاحوں میں ملتان کا سب سے پہلا ذکر سینٹ ٹامس ہربرٹ کے سفر ناموں میں شہزادہ خرم (جسے بعد ازاں شاہ جہاں کہا جانے لگا) کی بغاوت کے تناظر میں ملتا ہے۔ یہ دور اکبر اعظم کے بیٹے جہانگیر کی بادشاہت کا دور تھا، جس کے بارے میں مذکورہ سیاح لکھتا ہے، ''کشمیر میں جہانگیر نے اپنے طفلِ سیلانی کے کارناموں کی روداد کے ساتھ ساتھ ابراہیم کی موت اور سماجی افراتفری کی خبر سنی۔ اسے خوف تھا کہ اس کا من موجی بیٹا ہندوستان میں مقبول اور طاقتور ہو جائیگا۔ اسی خوف نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا اور اس نے اپنی جرنیل، چن جہاں، کو حکم دیا کہ وہ ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ گجرات کی طرف پیش قدمی شروع کر دے اور باقی صوبوں، ملتان اور بکر، کی افواج کو بھی اپنے ساتھ لیتا جائے۔''

دوسرا یورپی سیاح فرانسیسی، ٹاوانیا ہے جو کہ ایک سیاح کے ساتھ ساتھ جواہرات کا ایک بہت بڑا تاجر بھی تھا۔ ٹاوانیا 1641 سے 1668 کے درمیانی عرصے میں ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا۔ وہ اصفہان کے راستے سے قندھار، کابل، لاہور اور دہلی سے ہوتا ہوا آگرہ پہنچا تھا۔ ٹاوانیا کی سیاحت اور تجارت کا دور، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی حکومت کا دور تھا۔ قندھار سے آگرہ پہنچنے کے لیے اس کے پاس دو راستوں کا انتخاب تھا، یا تو وہ کابل کے راستے پہنچ سکتا تھا یا پھر ملتان کے راستے سے۔ ملتان کے راستے کو اختیار کرنا اس لحاظ سے موزوں تھا کہ یہ راستہ دس دن پہلے منزل مقصود پر پہنچا دیتا تھا جبکہ دوسرا راستہ مقابلتاً طویل تھا۔ تاہم ٹاوانیا لکھتا ہے، ''ملتان کا راستہ اختیار کرنا خطرات کو، یا پھر موت کو، دعوت دینے کے مترادف تھا کیونکہ اس راستے سے وہی سفر کر سکتے تھے جو چار دن تک پانی پئے بغیر زندہ رہ سکنے کی ناممکن شرط پر پورا اتارتے ہوں؛ جبکہ ہمارے قافلے میں کوئی بھی آدمی اس جناتی صفت سے لیس نہیں تھا''۔ تاہم وہ اور اس کے ساتھ خطرات کے کھلاڑی ثابت ہوئے اور انہوں ملتان کے راستے آگرہ جانے کا

فیصلہ کر لیا۔ ٹاوانیا آگے چل کر ملتان کے بارے میں لکھتا ہے: ''ملتان وہ شہر ہے جو کہ عمدہ چھینٹ (اصلی سوتی کپڑا جو ہندوستان سے درآمد کیا جاتا تھا) کافی بڑی مقدار میں پیدا کرتا ہے۔ اس کپڑے کو ہندوستان سے باہر اس وقت تک بھیجا جا سکتا تھا جب کہ دریاؤں کے منہ ریت سے بند نہ ہو جاتے۔ یہاں بڑے جہازوں کا رواج اس لیے نہیں تھا کہ بحری راستے ان کے لیے موزوں نہیں تھے۔ ملتان وہ شہر ہے جہاں سے تمام بنیے ایران کا رخ کرتے ہیں اور وہاں سود کے کاروبار میں یہودیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک خاص قانون موجود ہے جو انہیں خاص ایام میں مرغ کا گوشت کھانے کی اجازت دیتا ہے اور انہی ایام میں تین بھائی ایک بیوی کے ساتھ ہم بستری کی سہولت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ تاہم ایک بیوی ہونے والا بچہ بڑے بھائی کی ملکیت ہوتا ہے۔''

ٹاوانیا کے بعد 1666 میں ایک اور سیاح، ٹاوینات ہندوستان کا رخ کرتا ہے جسے مؤرخین ''پرمغز مشاہدہ کار'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ٹاوینات کی سیاحت کا دور اورنگزیب کا دور تھا جو ہندوستان کی تاریخ میں خوشحالی اور امن میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس دور میں اورنگزیب معروف مرہٹہ شہزادے سیوا جی کو دام تزویر میں لانے کی کوشش میں مصروف تھا، ملتان میں مہر پرستی ابھی تک جاری تھی اور مندر پر یاتریوں کا میلہ لگا رہتا تھا جو دور دراز سے اپنی آتما کو تسکین دینے کے لیے پیدل سفر کرتے اور قیمتی نذرانے سورج دیوتا کو پیش کرتے۔ ٹاوینات نے سورج دیوتا کو سرخ چمڑے میں ملبوس دیکھا۔ اس وقت اس بت کا رنگ کالا تھا اور آنکھوں میں قیمتی یاقوت جگمگا رہے تھے۔ یہ غالباً اورنگزیب کی جفاکشی سے قبل کا دور تھا۔ بعد میں اورنگزیب نے اپنی ہندو رعایا پر مظالم کی انتہا کر دی اور ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا۔

1738-39 عیسوی میں نادر شاہ کے حملے کے دوران ایک افغان، زاہد خان کو دہلی کے ایک وزیر قمر الدین کے اصرار پر ملتان کا وائسرائے بنا دیا گیا۔ رنجیت سنگھ نے 1818 عیسوی میں ملتان پر حملہ کیا اور زاہد خان کے چھ پوتوں کو میدانِ جنگ میں شکست دی۔ اس کے بعد ملتان کو شیوخ نے اپنے قبضے میں لے لیا اور پھر انگریزوں کے قبضے 1848-49ء تک ملتان پر انہی کی حکمرانی رہی۔ برطانوی ہرکاروں نے آخری شیخ گورنر، مل راج کا کورٹ مارشل کیا اور اسے سزائے موت کی سزا سنائی جس میں تخفیف کر کے جلاوطنی کی سزا میں تبدیل کر دیا گیا۔ مل راج معروف شیخ دیوان ساون مل کا پوتا تھا اور اس پر ایک انگریز سیاسی ایجنٹ، وانس ایگنیو کے قتل کا الزام تھا۔ جلاوطنی کی سزا سنائے جانے کے بعد اسے کلکتہ بھیج دیا گیا اور اس نے باقی زندگی وہیں گزاری۔

جنرل کننگھم نے 1853ء میں ملتان میں سورج دیوتا کے مندر کا دورہ کیا اور اس کا جغرافیہ وہی بتایا جو استخاری، ابن حاؤقل اور ادریس نے بتایا۔ وہ بتاتا ہے کہ مندر اور بت کو اورنگزیب کے دور میں تباہ کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک مسجد تعمیر کی گوی تھی۔ جب شیوخ برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے اسی مسجد کو بارود گھر میں تبدیل کر دیا جو 1849ء کے محاصرے کے دوران ایک دھماکے سے پھٹ پڑا اور مسجد راکھ کے کھنڈر میں تبدیل ہو گئی۔ تاہم اس دور میں بھی کاسیاپا کا مشہور مندر بہاؤالحق کے دربار شمال مشرقی زاویے پر موجود تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کاسیاپا کا اصل مندر

پر ہالدا نے خود تعمیر کروایا اور اس مندر کی چھت بھی 1849ء کے دھماکے میں اڑ گئی تھی۔ تاہم عین اسی مقام پر ہر سال سالانہ میلہ لگا کرتا تھا جس کا مقصد نارسنھ اوتار کی یاد تازہ کرنا ہوتا تھا۔

برنیز اپنے بخارا کے سفر ناموں میں لکھتا ہے کہ ملتان کے نواب مظفر خان نے ایک دیوار منہدم کروائی جس سے اس شہر کے کئی تاریخی پہلوؤں کی عمارت استوار ہوگئی۔ اس کھدائی کے دوارن ساٹھ فٹ کی گہرائی پر ایک طبلِ جنگ پڑا ملا۔ اس کے بعد جنرل کنگھم نے کوئی بوسیدہ دیواریں گرادیں اور اس سے ملتان کی قدامت اور عظیم تاریخ کے کئی مخفی پہلوؤں پر روشنی پڑی۔ پنتالیس سے پچاس فٹ کی گہرائی پر راکھ، جلی ہوئی مٹی اور کئی ایسے شواہد ملے جو مقدونیہ کے عظیم فاتح سکندرِ اعظم کے ''عظیم'' کارناموں کا پتہ دیتے تھے۔ ان آثار سے ظاہر ہوا کہ سکندر کی فوج نے کس قدر خون ریزی کی اور خون کی کتنی ندیاں بہائیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس کی فوج نے مالی کے جوانمردوں، عورتوں اور معصوم بچوں کو بیدردی سے قتل کر دیا۔

آریان اور سترابوؤں کے مطابق سکندر اعظم کو ملتان میں جنگ کے دوران گہرا زخم آیا جو بعد ازاں اس کی موت کا باعث بنا۔ سکندر اعظم کے حملے کے وقت مالی کا قلعہ گردو نواح کے تمام قلعوں کی نسبت مضبوط قلعہ مانا جاتا تھا لہٰذا لوگ قطار اندر قطار اس قلعے میں داخل ہونے لگے۔ جنرل کنگھم اس مضبوط براہمن شہر کو، جس پر سکندر اعظم نے چڑھائی کی، اطاری کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ شہر ملتان کے شمال مشرق میں 34 میل کے فاصلے پر تلمبہ کی شاہراہ پر موجود تھا۔ بلاشبہ اس دور میں ملتان بالائی صوبہ پنجاب کا دارالحکومت تھا اور ان علاقوں کا سب سے مضبوط قلعہ اسی شہر میں واقعہ تھا۔ سکندر اعظم کی لشکر کشی کے وقت اس شہر میں پچاس ہزار سپوتوں نے اس شہر کے دفاع کے لیے جنگ لڑی۔ مشہور یونانی فلفی اور مؤرخ آریان Arrianus (Flavius) اپنی مشہور کتاب (Anabasis) میں لکھتا ہے کہ، ''مالی کے جنگجو باسی دوسرے قصبوں کو چھوڑ کر اپنے شہر کے دفاع کے لیے ایک جگہ جمع ہو گئے۔'' سکندرِ اعظم کے بارے میں یہی مورخ کہتا ہے کہ اس نے براہمن شہر سے مالی پر دو مرتبہ چڑھائی کی۔ وہ مزید بتاتا ہے کہ براہمن شہر، اطاری، ملتان سے چونتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اسی بنیاد پر جنرل کنگھم کہتا ہے، ''میں اپنی اس بات پر پراعتماد ہوں کہ سکندر کے دور کے مالی کا دارالحکومت موجودہ شہر ملتان ہی تھا۔''

میجر رینل کہتا کہ کہ ملتان پایہ تخت ہونے کی وجہ سے نسبتاً بلندی پر واقع تھا جبکہ تلمبہ کے نزدیکی کھنڈرات یہ بتاتے ہیں کہ یہ شہر ''صدر مقام'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ تاہم زیادہ تر سیاح اور جغرافیہ دان جنرل کنگھم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ یہ بات واضح طور پر بیان کی جاتی ہے کہ براہمن شہر اور اُچ کو فتح کرنے کے بعد، سکندر نے مالی کا شہر عبور کیا اور یہ شہر دریا سے 30 میل کے فاصلے پر موجود تھا۔

مشہور برطانوی محقق، سیاح اور سیاست کار (ڈپلومیٹ) سر الیگزینڈر برنز (Sir Alexander Burnes) اپنی مشہور کتاب ''بخارا کے سفر'' (Travels into Bokhara) کی تیسری جلد میں لکھتا ہے، ''میں اس چیز کو ضروری نہیں سمجھتا کہ ہم قدیم دارالحکومت کی تلاش میں جدید شہر ملتان کو نظر انداز کر کے ایسے شہر کی تلاش کریں

جس کا مطالعہ صرف آثارِ قدیمہ کے ماہرین ہی اپنے قیاس کی عینک سے کر سکتے ہوں۔ اگر ہم قدیم شہر کی ہی تلاش میں ہیں تو ملتان پر نظر پڑتے ہی ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ہندوستان کے قدیم تمدن کا گڑھ رہا ہے''۔

جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہندو اساطیر کا کاسیاپا پورہ، کاسیاپا سے مشتق ہے جو کہ ہندو صنمیات میں ایک اہم ترین دیوتا کی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ ان سات دیوتاؤں میں سے ایک تھا جو آکاش پر دبِ اکبر (بڑا ریچھ) کی شکل میں موجود ہیں۔ علم الاصنام کے ماہرین کے مطابق یہ سات دیوتا، یارشی، سات آسمانی دیویوں کرتقاس (Krittikas، جو یونانی دیومالائی دیویوں Pleiades سے ملتی جلتی ہیں۔ Pleiades مشہور یونانی دیومالائی دیوتا Titan Atlas کی سات بیٹیاں تھیں) سے ملاپ کرتے ہیں۔ مقامی ریتوں اور روایات کے مطابق وشنو (اہم ترین ہندو معبود جس کی ایک پالنے والے اور پروانے چڑھانے والی طاقت کے طور پر پوجا کی جاتی ہے) نے ملتان میں نارستھ کی حیثیت سے، کاسیاپا کے دور میں جسمانی ملبوس میں ظہور پایا۔ یہ اسطورہِ عتیق (Anicient Myth) ملتان کی عہدِ عتیق میں اہمیت پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالتا ہے اور اس سے اس شہر کی مذہبی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جنرل کنگھم (Sir Alexander Cunningham)، جو ہندوستان میں آثاراتِ عتیق کی دریافتوں میں پیش پیش رہے اور ان کی 1871ء میں شائع ہونے والی مشہور و معروف کتاب (The Ancient Geography of India) ہندوستانی آثارِ قدیمہ پر اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، کو 73-1872ء میں ملتان کی کھدائی کے دوران کچھ چاندی کے سکے ملے۔ ان کا خیال ہے یہ قدیم سکے ملتان میں مہر پرستی کے عروج کے دور میں ڈھالے گئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ سکے چچ کے دور سے قبل کے ہیں۔ یہ دور ساتویں صدی عیسوی کا دور تھا جب ملتان پر دواہج کی حکومت تھی جس نے اپنے دور میں مہر پرستی کو بامِ عروج پر پہنچایا تھا۔

ایلفن سٹون (ایک برطانوی سرکاری افسر جس نے 1841ء میں ہندوستان کی تاریخ پر کتاب بھی لکھی) نے اس قسم کا پہلا سکہ دریافت کیا اور اس کے اس کام میں جنرل کورٹ اور جنرل وینٹیورا بھی شامل تھے۔ یہ ایک سہ انداز تکونی سکہ تھا جس پر ایک بادشاہ کے جسم کا بالائی حصہ کندہ تھا جس پر ایک شیر کا سر بنا ہوا تھا۔ اس سکے پر لاؤنی (Scythic) حروف میں ایک مختصر تحریر کندہ تھی جسے اس زمانے میں کوئی بھی پڑھنے کے قابل نہیں تھا۔ تاہم اس سکے کناروں پر دیوناگری رسم الخط میں ایک تحریر درج تھی جسے نہ صرف پڑھ لیا گیا بلکہ زبانِ فرنگ میں ترجمہ بھی کر دیا گیا جس کے معانی یہ طے پائے؛ ''شیر دل سمراٹ دیوا جارتا؛ خوش بخت شاہِ فارس و ہند''۔ اس سکے کی پست پر ایک دیوتا کا نقش کندہ ہے جسے جیمز پرنسپ، ہندوستانی نو آبادیوں کا منتظم اور پہلا دانشور جس نے اشوکِ اعظم کے احکامات کی رمز کشائی کی، ایرانی دیوتا مترا قرار دیتا ہے جبکہ کنگھم کے نزدیک یہ نقش ادتیا کا ہے۔

جیمز پرنسپ کے مضامین (Eassys on Indian Antiquitis, Historic, Numismatic and Palaeographic) کے نام سے، دو جلدوں میں 1858ء میں شائع ہوئے جن میں ہندوستانی تاریخ سے وابستہ کئی رموز تحریروں کو اسرار کی تہہ سے پاک کرنے کے بعد شائع کیا گیا۔ اوپر بیان کئے

گئے سکوں کے حوالے سے اگر کنگھم کی بات مان لی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ سکے 500 عیسوی میں ڈھالے گئے تھے۔

دوسرا سکہ پہلے سکے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور یہ مشہور ایرانی حکمران خسرو پرویز کا ہم عصر ہے۔ اس پر ایک بادشاہ کی شبیہہ کندہ ہے جس نے سر پر پروں سے بنا ہوا تاج پہنا ہوا ہے اور اس کے حاشیے پر پہلوی تحریر درج ہے۔ اس سکے کی پشت پر ہندوستانی سورج دیوتا کی تصویر بنی ہوئی ہے اور جمرانی کا 37واں سال درج ہے جو کہ 626 عیسوی بنتا ہے۔ یہ سکہ اس حوالے سے خصوصی دلچسپی کا متقاضی ہے کہ چچ نامہ میں بیان کردہ ایرانی حملے اور راجہ سہارس، جو کہ برہمن چچ کا پیش رو تھا کی شہادت دیتا ہے۔ کنگھم کا خیال ہے یہ سکہ خسرو پرویز نے ہندوستان میں اپنی عارضی فتوحات کے اعزاز میں بنوایا تھا۔

تیسرا سکہ دوسرے سکے سے بہت قریبی تعلق کی روشن شہادت ہے اور ظاہری طور پر دوسرے سکے کی طرح ہی لگتا ہے۔ جناب ٹامس نے اس سکے پر موجود پہلوی تحریر کی رمز کشائی کی تو یہ تحریر سامنے آئی، ''منصفِ منصفاں شووراشو، براہمن شاہِ ملتان''۔ اسی سکے کی پشت پر سورج دیوتا کی وہی شبیہہ موجود ہے جو باقی دوسکوں پر پائی گئی ہے اور حاشیے سے ایک طرف ''سری واشو، واشودیوا'' اور دوسری طرف ''پنچائی زودُلستان'' کے الفاظ موجود ہیں۔

جیسا کہ اوپر کے بیانات سے ظاہر ہے، آخری سکے پر ملتان کا لفظ واضح طور پر موجود ہے اور سکے کی پشت پر موجود سورج دیوتا (ادتیا یا مترا) کی تصویر ہے جو انڈو ایرانی اساطیر میں روشنی کے دیوتا مانے جاتے ہیں۔ کنگھم واس دیوا کو راجہارا قرار دیتا ہے جو چچ سے قبل ملتان کا حکمران تھا اور چچ نے ملتان کو اس سے چھین لیا تھا۔ راجہارا شسی کا رشتہ دار تھا اور ایک صاحب ثروت اور اہل دانش حکمران سمجھا جاتا تھا۔ چچ نامہ کے مطابق اس کا بھتیجا، ساہیوال، ملتان کے بالمقابل سکا کا حکمران تھا۔ ساہیوال نے اپنے چچازاد، اجری، سے مل کر تین ماہ تک بیاس کے کناروں پر چچ سے جنگ کی تھی۔

ملتان میں مہر پرستی کے حوالے سے دوسری اہم جگہ، ''سورج کنڈ'' ہے جو 1848ء کے محاصرے کے دوران لیفٹیننٹ ایڈورڈ اور لیک کی قیادت میں ایک انگریز چھائنی کا کام دیتی رہی ہے۔ یہ جگہ شاہراہ بہاولپور پر ملتان کے جنوب میں واقع ہے اور دورِ قدیم میں ہندوستان کے چند مقدس مقامات میں سے ایک تھی۔ اس مقام پر واقع حوض 132 فٹ کی گولائی میں ہے اور 10 فٹ گہرا ہے۔ شیخ دیوان ساون مال نے اس حوض کے گرد ایک مثمن (ہشت ضلعی) دیوار تعمیر کروائی تھی۔ مہر پرستی کے دور میں یہ جگہ بھی زائرین کے لیے سرچشمہِ فیض و برکات تصور کی جاتی تھی اور یہاں سال میں دو میلوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک میلہ بھادوں کی سات تاریخ کو خصوصاً اس وقت لگتا تھا جب چاند گھٹ رہا ہوتا تھا اور دوسرا اسی تاریخ کو ماگھ کے مہینے میں لگتا تھا۔ ساتویں تاریخ اس ہندو دیو مالا کی تعظیم ہے کہ سورج دیوتا کا رتھ (ارابہ) سات گھوڑے کھینچتے تھے، یا پھر ایک اسطورہ کے مطابق سات تاریخ منوں کے سات بیٹوں (سات رشیوں) کی تعظیم میں ان روحانی اجتماعات کے لیے وقف کر دی گئی تھی جو کہ ملتان کے اولین

مؤسس (بانی) قرار دیے جاتے ہیں۔

جدید ملتان ایک بہت بڑے ٹیلے پر واقع ہے۔ یہ ٹیلہ ماضی کا خاموش لیکن بلیغ استعارہ ہے جس کے اندر صدیاں محوِ خواب ہیں۔ شہر ایک تین میل لمبی فصیل کی چادر میں لپٹا ہوا ہے تاہم اور مشرقی شہروں، شیراز، اصفحان، کابل کی طرح اس کے چاروں جانب مضافاتی قصبوں کا ایک ہجوم موجود ہے۔ مضافاتی آبادیوں کے گرد فصیل موجود نہیں ہے اور اسی لیے چینی سیاح، ہوان ژانگ نے ملتان کو پانچ میل کی فصیل کے اندر موجود شہر قرار دیا تھا اور اسی قسم کا ایک بیان ایلفن سٹون بھی اپنی کتاب (Elphinstone's Kabul) کے 27ویں صفحے پر دیتا ہے۔ جب اس نے ملتان کا دورہ کیا تو اس وقت اس شہر کے گرد حفاظتی خندق موجود نہیں تھی۔ تاہم مہا راجہ رنجیت سنگھ کے فعال گورنر ساون مَل نے اس شہر کے گرد گہری اور کشادہ خندق تعمیر کروائی اور راوی کے پانیوں سے روابط کے ذرائع بھی قائم کیے۔ ملتان کی دیواریں اس وقت تعمیر کی گئیں جس وقت مراد بخش، شاہ جہاں کا چوتھا نوجوان، 1627 عیسوی میں ملتان کا وائسرائے بنا۔ یہ شہزادہ اسلحے کا شوقین تھا اور اپنے فارغ اوقات میں شیروں اور ریچھوں کا شکار کیا کرتا تھا جن کا اس وقت ملتان کے جنگلوں پر راج تھا۔

ملتان کا قلعہ نصف مثمنی (ہشت پہلو) عمارت ہے جس کی گولائی سوا میل (6,600 فٹ) ہے۔ شروع میں اس شہر کی فصیل کے چھیالیس بُرج تھے اور ہر چار دروازوں کے فاصلے پر ایک قلعہ بند مینار موجود تھا۔ الادرسی نے بارہویں صدی کے اوائل میں ملتان کے بارے میں لکھا ''یہ قلعے کے اندر موجود ہے۔'' قلعے کے ابھی تک چار دروازے ہیں؛ شمالی دروازہ کا نام خضری دروازہ ہے اور اسے ملتان کے گورنر، سید خضر خان نے تیمور کے دور میں یہ نام دیا تھا۔ شہر کے مغرب کی جانب ''دی'' اور جنوب میں ''راہری'' دروازہ ہے جبکہ مشرق میں سِقی دروازہ موجود ہے۔ دی دروازہ دیوال کے تبرک خانے، جس میں سورج دیوتا کی مورتی موجود تھی، کی وجہ سے اس نام سے مشہور ہے کنگھم کے نزدیک یہ عین اسی مقام پر موجود ہے جہاں اسے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ دروازہ زائرین کو سیدھا سورج دیوتا کے چرنوں میں لے جاتا تھا اور شہر میں موجود ایک بہت بڑا نالہ بھی اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا جو کہ مندر سے نکل کر شہر کی سڑکوں تک آتا تھا۔

سِقی دروازہ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، قدیم قلعہ بند شہر سقا کی نسبت سے رکھا گیا تھا جس کا ذکر عرب اور سندھ کے مؤرخین کرتے ہیں۔ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ملتان کے قلعے کو عرب مؤرخین ''سقا ملتان'' کہا کرتے تھے۔ ویون ڈی سینٹ مارٹن کا ملاستھانی پوری اور ہوان ژانگ، کشمیرین مؤرخین کی سند کے مطابق، مقامی اسلوبِ کلام کے زیرِ اثر ملتان بن جاتا ہے جو کہ ابوریحان کے ملاثانہ سے بہت قریب ہے۔

سنسکرت زبان میں ''ملا'' کے معانی ''جڑ، مادہ'' کے ہیں اور ''ستھان'' علاقے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ملتان میں مہر پرستی کے ضمن میں دیدہ مہر نور کا سرچشمہ ہے اور ایک مستند شاستر، امراکوشا، میں سورج کو ورادھنا کہا گیا ہے جو کہ سنسکرت کا لفظ ملا کا متبادل ہے۔ اس طرح ملا ثانہ، ملاثانہ کا مطلب سورج کا مندر بنتا ہے۔ یہ پروفیسر

ولسن کا نظریہ ہے جس کی جنرل کننگھم نے بھی اپنی کتاب قدیم جغرافیہ میں توثیق کی ہے۔

منشی حکم چند تواریخِ ملتان کے صفحہ 42 میں لفظ ملتان کی تلاش قدیم ہندو دیو مالا اور سنسکرت زمین میں کرتا ہے۔ حکم چند لکھتا ہے ''ہندوؤں کے مطابق ''ست جگ'' میں ہران کشاب راکشل اور پراہلاد بھگت رہا کرتے تھے۔ اس دور میں لوگ لفظ ملتان کے ماخذ کو یوں بیان کیا کرتے تھے کہ اس علاقے میں سب سے پہلے آباد ہونے والا مُل کہلاتا تھا اور اسی نسبت سے اس شہر کو ملتان کہا جانے لگا۔ دوسرا یہ کہ سنسکرت زبان میں مُل کے معنی ''آغاز'' کے ہیں۔ چونکہ یہ شہر انسانی آبادکاری کے اولین دور میں آباد ہوا تھا اسی لیے سب سے پہلے اسے ''مُل ترنگ'' کہا جانے لگا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ملتان بن گیا۔ تیسرا یہ سنسکرت میں مُل کا مطلب ''مرکز'' لیا جاتا ہے اور ستھان ''جگہ'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ یہ شہر ہندوستان کے وسط میں آباد ہوا، اسی لے اسے ملستھان کہا جانے لگا۔''

فرشتہ ملتان کی جڑیں سامی اساطیر میں ڈھونڈتا ہے۔ اس کے نزدیک ملتان کی بنیاد رکھنے والے حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے تھے اور ان لوگوں نے اس شہر کو آباد کرنے والے سردار کے نام پر اس شہر کا نام ملتان رکھا۔ دوسرے مسلمان مؤرخین کے نزدیک یافث بن نوح سیلِ عظیم (طوفانِ نوحؑ) کے بعد کافر ہو گیا تھا اور اس شہر میں آن بسا تھا۔ حنس کا تعلق یافث کی اولاد سے تھا جو ایک بہت بڑا راجہ بنا اور اس نے اس شہر کی بنیاد رکھی جو اس کے نام کی نسبت سے حنس پور کہلانے لگا۔ یہ شہر پانچ سو سال تک قائم رہا اور اس کے بعد قانونِ تنزل کی لپیٹ میں آ گیا اور وقت میں تحلیل ہو گیا۔ اگلے پانچ سو سال کے دوران یہ شہر وقت کے ہاتھوں پامال خرابے کا منظر پیش کرتا رہا جب تک کہ راجہ بھگت کشن نے اسے ازسرِ نو آباد کیا۔ کچھ عرصے بعد یہ شہر ایک بار پھر انسانی آبادکاری سے محروم ویرانے میں تبدیل ہو گیا اور ایک بار پھر اسے آباد ہونے میں پانچ صدیاں لگیں۔ تاہم یہ شہر ایک مرتبہ پھر آباد ہو گیا۔ اس مرتبہ آباد کرنے والا راجہ شام پرم ناتھ تھا اور اسی نسبت سے اسے شام پور کہا جانے لگا۔ چند ایک صدیاں آباد رہنے کے بعد اس شہر کو دریا بہا لے گیا اور محض ایک چھوٹا سا قلعہ اس کی غرقابی کے سامنے سینہ سپر رہا اور دریا اس کی بہادری کے اعتراف میں قدم بوسی کے بعد واپس چلا گیا۔

اس سیلِ اصغر کی واپسی سے چند ایک صدیاں بعد راجہ مور اس علاقے میں شکار کی غرض سے داخل ہوا۔ راجہ مور کو یہ علاقہ اس حد تک پسند آیا کہ اس نے یہاں شہر آباد اور اس کا نام، اپنے نام کی نسبت سے، ''مورتران'' رکھا۔ مورتران بعد میں ''مولتران'' اور پھر اسلوب بیان کے زیرِ اثر ''مولتانہ'' یا پھر ''مولتان'' بن کر رہ گیا۔ ایڈورڈ ٹامس کے مطابق قدیم سکوں پر محض لفظ ''ملتان'' درج ہے۔ اس لفظ میں موجود علمِ ہجا سے متعلق تفاوت بصری ہے سمعی نہیں ہے۔ تاہم جس وقت شاہ یوسف گردیز نے جب اس شہر کا دورہ کیا تو قلعہ سلاسلِ روز و شب کی نذر ہو چکا تھا اور اس کی تاسف انگیز نشانی کے طور پر مٹی کا ایک بہت بڑا ٹیلہ موجود تھا۔

موجودہ شہر، جزوی طور پر اسی مقام پر موجود تھا جہاں کسی دور میں دریا بہا کرتا تھا اور بعد میں اس کے بائیں کنارے پر بھی آبادکاری ہونے لگی۔ دریا شاہ یوسف کے مقبرے کے ساتھ بہا کرتا تھا۔ جدید شہر کی بنیاد آٹھ سو سال

قبل رکھی گئی تھی جس وقت راوی شہر کی دیواروں کے ساتھ شمال مغرب کی جانب بہا کرتا تھا۔ دریائے راوی کے قمدوں کے نشان آج تک اس شہر سے اس کی پرانی دوستی کی یاد دلاتے ہیں جبکہ دریا اس وقت پانچ سے چھ میل دور دیوانوں کی سی مستی میں، شہر کے مغرب میں محوِ سفر ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قدیم شہر، جدید شہر کے مشرقی پہلو میں واقع تھا اور بعد میں جنوبی ملتان مولا موج کے دربار کے اردگرد آباد ہونے لگا۔ لوگوں کا خیال اس طرف اس لیے جاتا ہے کہ موجودہ شہر کے مشرق اور شمال میں دور دور تک کھنڈرات اور ٹیلے موجود ہیں۔ سکندرِ اعظم کی لشکر کشی کے دوران یہ شہر جنوب میں واقع تھا اور اس نظریے کی حمایت کرنے والوں میں کنگھم جیسے مستند محقق بھی شامل ہیں۔ وہ کہتا کہ سکندر نے لشکر کشی کا آغاز مشرق سے ملتان پر حملہ کر کے کیا۔ ملتان کے علاقے میں موجود کھنڈرات سورج کند کی سمت جاتے ہیں اور پھر دور تک پھیل جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شہر میں قانونِ عروج و زوال نے کئی مرتبہ اپنا کھیل کھیلا اور ملتان کا سفینہ قلزم وقت میں ابھر ابھر کر ڈوبتا اور ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا۔ اس بات کی تصدیق اس زبان زدِ عام شعر میں بھی ملتی ہے:

ہنس پور، بھاگ پور، شام پور چوتھا پور ملتان
پنچوں پور، بھاج کرتھی یا ہری پور سلطان

یہ شعر، جہاں تک فصیل کے اندر موجود شہر کا تعلق ہے ملتان کی تاریخ کے حوالے سے بیان کردہ اس روایت سے ملتا ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ تاہم منشی حکم چند کے ماننے والوں میں سے بعض لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ملتان دریائے راوی کے دنوں کناروں پر موجود تھا۔

ملتان شہر کے حوالے سے بیانات ابتدائی عرب مؤرخین اور جغرافیہ دانوں کے بیانات کے عین مطابق ہیں جنہوں نے ملتان کا دورہ کیا اور اس کے بارے میں اپنے سفر ناموں میں لکھا۔ یہ تمام مؤرخین اور سیاہ سقا ملتان کو ملتان کے مشرق میں دریائے راوی کے کناروں پر موجود پاتے ہیں۔ جنرل کنگھم بھی، کم و بیش اسی نتیجے پر پہنچے ہیں، ''سقا ملتان کا قلعہ تقریباً اسی جگہ موجود ہوگا جسے آج ہم سیتل ماڑی کہتے ہیں۔ اسی مقام پر کسی دور میں ملتان سے دو میل دور دریائے راوی بہتا تھا۔ (Ancient Geography p. 238)

مسلمانوں نے اپنے اگلے بارہ سو سالہ دور کے دوران اصنام پرستی اور ہندو دھرم کے ہر نشان کو ملیا میٹ کر دیا اور جنرل کنگھم کو مسلم دور سے قبل کی باقیات کی تلاش میں کئی کنوئیں کھودنا پڑے۔ 1864ء میں پرہلاد پوری کے مندر کے قریب، ایک چالیس فٹ گہرا کنواں کھودا گیا جس کے دلچسپ نتائج سامنے آئے۔ اس تلاش کا مقصد مٹی کے بہت بڑے ڈھیر کے سینے میں موجود مدفون ماضی کے سربستہ رازوں کو کھوجنا اور اس کی قدامت کا اندازہ لگانا تھا۔ کھدائی کے دوران، دس سے بارہ فٹ کی گہرائی میں معاذ الدین کے کعباد کے دور (89-1286) کے سکے، ایک صیقل شدہ مٹی کا نیلا دیا اور کئی نیلے رنگ کے برتن برآمد ہوئے۔ یہ شہادت اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ برصغیر میں مٹی کے صیقل شدہ برتنوں کا استعمال سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ اس طرح دس فٹ کی

کھدائی جنرل کننگھم کو چھ سو سال ماضی میں لے گئی اور وہ ہر آدھ فٹ کے بعد ایک صدی ماضی بعید میں جانے لگا۔ بارہ فٹ کی گہرائی پر وہ سامنتا دیوا (950-900) کے دور کی باقیات پر اپنی نظریں جمائے کھڑا تھا اور اس طرح بارہ فٹ کھدائی اسے مزید نو سو سال پیچھے لے گئی تھی۔ چودہ فٹ کھدائی پر اسے 13*6/1.5 کی اینٹیں ملیں اور سترہ فٹ اور دو فٹ گہری سرخ راکھ اس کی منتظر نگاہوں کی منتظر تھی۔ اٹھارہ فٹ پر، چھ سے نو انچ گہری کالی راکھ اور 11*6*2 کی اینٹیں جو مزید کھدائی پر بڑی ہوتی گئیں۔ چونکہ مغلوں کے قد چھوٹے تھے، وہ چھوٹی اینٹیں بناتے تھے، پٹھان اس سے بڑی اور بدھ زیادہ طویل القامت ہونے کی وجہ سے زیادہ بڑی اینٹیں بنایا کرتے تھے۔ تیس سے بتیس فٹ کی گہرائی پر راکھ اور جلی ہوئی مٹی کے علاوہ ریشم کا گولا، چمار کی سان اور سکوں سے بھرا ایک برتن موجود پایا گیا جس میں 200 کے قریب سکے موجود تھے۔ چھتیس سے اکتالیس فٹ پر خالص مٹی موجود تھی جس کی بزرگی اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔

اس آثاریاتی کھدائی (حفریات) کے نتیجے میں ماضی کے دو اہم رازوں کے پردے چاک ہوتے ہیں ہم دو مختلف گہرائیوں پر راکھ کے ڈھیر پاتے ہیں۔ پندرہ سے اٹھارہ فٹ کی گہرائی پر سرخ راکھ کے ذخائر پائے گئے جن پر کالی راکھ کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ یہ راکھ اس کنوئیں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ راکھ کی اس گہرائی پر موجودگی محمد بن قاسم کے حملے کے دور کی ہے جس کی رحم دل فوج نے ایک پوری چھاؤنی کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ راکھ اور جلی ہوئی مٹی کا دوسرا ذخیرہ تیس سے بتیس فٹ کی گہرائی پر ملتا ہے یہ سکندرِ اعظم کی فوج کی سیاہ کاریوں کی سیاہ نشانی ہے۔ تاریخ کے مطابق اس علاقے میں سکندر کو جنگ کے دوران مہلک زخم لگا تھا جس پر مقدونیہ کی فوج برافروختہ ہوگئی اور قلعے کے محاصرے کے دوران وسیع اور بے امتیاز خون ریزی کرنے لگی۔ جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ راکھ مقدونیہ کے ''مہذب'' سپاہیوں کی نشانی ہے جب انہوں نے خورشید وار خون ریزی کے بعد شہر کو آگ لگا دی تھی۔

اگر ان پر لکھی تحریر پڑھی جاسکتی تو ایک برتن میں ملنے والے سکے بھی ایک عظیم دریافت کہے جاسکتے تھے۔ یہ سکے چوکور تھے اور جزوی طور پر مٹی کے خوراب بن جانے کی وجہ سے پہچانے نہیں جاسکتے تھے۔ یہ نتائج ملتان کی قدامت اور شاندار تاریخ کے بہت بڑے ثبوتوں میں سے ہیں اور ان کا تعلق تاریخ عالم کے ایک عظیم ڈرامے سے بھی بنتا ہے جس کا ڈراپ سین ملتان میں ہوا۔ ان کنوؤں میں پائے جانے والے ہندو نوادرات میں ان گنت پتھر کی انگوٹھیاں اور موتی شامل ہیں جنہیں مقامی زبان میں منکا یا لعل کہا جاتا ہے۔ ان مالاؤں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلے آنے والے مسلمان، غازیوں اور شہیدوں کے اعزازات تھے جن کے ساتھ انہیں شہر خاموشاں میں سلایا جاتا تھا۔ اسی قسم کے پتھر ہڑپہ میں پائے گئے ہیں جہاں پارہ پارہ ماضی کی کرچیاں پائی گئی ہیں اور اسی قسم کے پتھر حرم گیٹ کے نزدیک کھدائی میں بھی ملتے تھے۔

تاہم ملتان کی سب سے اہم اور حیران کن امتیازی خصوصیت مقابر اور مساجد کے ملبے ہیں جو کہ ملتان کے

طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی تعداد لاہور میں موجود انباروں سے زیادہ ہے۔ ان انباروں کو مقامی اسلوبِ کلام (سرائیکی زبان) میں ''بھڑ'' یا ''ٹھیا'' کہا جاتا ہے۔ یہ بھڑ ملتان کے گردونواح میں چاروں طرف موجود ہیں اور ان میں اینٹوں کے علاوہ ٹوٹے ہوئے برتن اور گھریلو استعمال کی اشیاء عام طور پر نظر آتی ہیں۔ اس قسم کے بھڑوں کا شمار بہت مشکل ہے۔

فصیل کے اندر موجود شہر کے چھ دروازے؛ دہلی دروازہ، دولت دروازہ، لاہوری دروازہ، بوہڑ دروازہ، حرم دروازہ، پاک دروازہ ہیں۔ ان میں بوہڑ دروازہ مغرب کی جانب لے جاتا ہے جبکہ دہلی دروازہ جنوب کی طرف۔ دورِ عتیق میں چار اور دروازے بھی موجود تھے جو کہ مرکزی قلعے کی طرف لے کر جاتے تھے لیکن انہیں بعد میں مسمار کر دیا گیا تھا۔ شہر کی دیواریں نواب علی محمد خان خاکوانی نے 1156ء میں تعمیر کروائی تھیں۔ یہ دیواریں بہت بلند تھیں لیکن انگریز دور میں صحت کاری کی مہم کے دوران انہیں چھوٹا کر دیا گیا۔

ملتان کے ہندو ماضی کے باوجود یہاں ہندو یا عہدِ عتیق کے آثریات میں دلچسپی رکھنے والے کو مایوس ہونا پڑتا ہے۔ ملتان میں کوئی ایسے آثار موجود نہیں جن سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ کسی دور میں ہندو ثقافت نے اس شہر میں عروج دیکھا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ کہ مسلمانوں نے اس شہر کو جامع شکست سے دوچار کیا اور ہر اس نقش باقیہ یا سراغ کو اپنی طاقت کے بل بوتے پر مٹا دیا جو اس شہر کے حقیقی مؤسسین کی ثقافت اور دھرم کی یاد دلاتا تھا۔ تاہم سورج کنداب بھی ایسا مقام ہے جو ہندو جاتریوں کے لیے ایک ایسے مقام کی حیثیت رکھتا ہے جو انہیں ہندوستان کے طول وعرض سے کھینچ لاتی ہے۔

نارسنگ پرانہ کے مطابق راجہ حرن کشاب ست جُگ میں ملتان میں مقیم ہوا۔ حرن کشاب کو ہندو کافر قرار دیتے تھے۔ اس راجہ کے ایک بیٹے کا نام پرہلاد بھگت تھا۔ ایک دن اس کے باپ نے دیکھا کہ وہ پرم وشنو کی پراتھنا کر رہا ہے اور رام نام کی مالا پھیر رہا ہے۔ اس کے باپ راجہ حرن نے اسے مجبور کیا کہ وہ خدا کی عبادت کرنے کی بجائے اس کی عبادت کرے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ہندو اساطیر کے مطابق حرن کشاب کو برہما (براہ مصدق سے مشتق ہے جس کے معنی پانا یا یکا یک نمودار ہونا ہے) وچن دیا تھا کہ وہ امر ہوگا اور اس پر کوئی بددعا، ہتھیار، زہر اور جانور اثر نہیں کریگا۔ برہما نے اسے یہ بھی رعایت دی تھی کہ زمین، پانی اور آگ دن اور رات کے دوارن اس پر کوئی اثر نہیں کریں گے۔ جب حرن کشاب کو امر ہونے کا احساس ہوا تو وہ فخر سے پھول گیا اور اس نے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ اسے خدا مانتے ہوئے سجدہ کیا کریں۔ پرہلاد کو بھی حکم تھا کہ وہ اپنے باپ کی پوجا کرے۔ تاہم اس پر اپنے باپ کی سختی کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے پرم وشنو کی پوجا شروع کر دی جو مسلسل اسے اپنی طرف پکار رہا تھا۔ راجہ نے اپنے بیٹے پر مظالم کی انتہا کر دی لیکن پھر بھی وہ اپنی راہ پر قائم رہا۔ آخری حربے کے طور پر راجہ نے ایک سونے کا ستون تعمیر کروایا اور اسے آگ سے گرم کرنے کا حکم دیا اور پرہلاد کو اس سے باندھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ پرہلاد جل کر راکھ ہو جائے گا اور اسے اس کی نافرمانی کی سزا مل جائے گی۔ جب اس خدا پرست نوجوان کو ستون سے باندھا گیا تو نارسنھ، اوتار،

ایک شیر کی صورت میں اس ستون سے ظاہر ہوا اور فوراً دھات کو ٹھنڈا کر دیا۔ کشاب کے تکبر اور مظالب پر نار سنھ جی کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے کشاب کا پیٹ چاک کر دیا اور اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ سب کرنے کے بعد اوتار غائب ہو گیا۔ پرہلاد کی موت کے بعد اس کے نام کا مندر سونے سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ روایت مزید بتاتی ہے کہ کچھ عرصہ بعد کسی نامعلوم وجہ کے تحت یہ مندر زمین میں دھنس گیا اور اس کی جگہ نیا مندر تعمیر کیا گیا۔ اس نئے مندر میں وہی ستون نصب کیا گیا جس سے نوجوان پرہلاد کو باندھا گیا تھا۔

یہ ہے وہ قدیم روایت جو پرہلاد کے مندر کی تعمیر اور اس کہن سال شہر کی ابتدائی ''تاریخ'' بیان کرتی ہے۔ اس کہانی کا حرن کشاب دراصل حرانیا کاسیاپا ہی ہے جسے سنسکرت شاستر کاسیاپورہ کا مؤسس قرار دیتے ہیں جس کا نام بعد میں ملتان پڑ گیا۔ کاسیاپورہ ملتان کا وہ قدیم ترین نام ہے جو ابوریحان البیرونی، دیوناگری رسم الخط اور سنسکرت میں، اپنے سفرناموں میں بیان کرتا ہے۔

1849ء کے بارودی دھماکے نے اس مندر کی چھت کو اڑا دیا اور پھر یہ مندر کئی سال تک ویران پڑا رہا۔ کئی عرصہ بعد باوا رام داس نے اس مندر کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ اس مندر کی تعمیر کے اخراجات، گیارہ ہزار روپے مخیرّ حضرات نے برداشت کیے۔ ہم سورج کند کے محل وقوع پر پہلے ہی بات کر چکے ہیں۔ سورج کند کا حوض اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ پرہلاد کا مندر۔ ہندو شاستروں کے مطابق، جب اوتار نے حرن کشاب کو مار ڈالا تو اس کا غصہ تمام حدود فراموش کر چکا تھا۔ جب دیوتاؤں نے یہ دیکھا تو اس کے غصے کی آگ کو بجھانے کے لیے اسے سورج کند کے حوض پر لے گئے جہاں تمام دیوتاؤں نے اس عظیم ہستی کے ساتھ اشنان کیا۔ ان دیوتاؤں میں سورج دیوتا بھی شامل تھا جس نے اس شہر اور سورج کند کو بہت پسند کیا۔ جب تمام دیوتا آرام کرنے کے بعد واپس چلے گئے تو لوگوں نے اس عظیم موقع کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس مقام پر ایک کنواں کھودا۔ جب کنواں کھودا جا چکا تو سورج جی مہاراج نے اپنے آپ کو ظاہر کیا اور خوشی کے عالم میں گویا ہوئے، ''جو کوئی بھی اس حوض میں غسل لے گا، اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائینگے اور وہ دنیا اور آخرت میں کامیابی پائے گا۔'' سورج دیوتا کی آواز ماننے والوں کے ایمان کو متحرک کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس واقعے کے بعد ہندوستان بھر سے عقیدت مندوں اور مقلدین کی بہت بڑی تعداد ہر سال مخصوص موسم میں اس حوض پر حاضر ہونے لگی۔ اس حوض کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ اس کے پانی سے نہانے سے نا صرف انسان جنموں کے چکر (آواگون) سے نکل جاتا ہے بلکہ اس کا پانی تمام جسمانی زخموں کے ساتھ ساتھ روحانی زخموں کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ پہلے بیان کیے گئے سالانہ میلوں کے ساتھ ساتھ عورتیں اور مرد اس مقام پر ہر جمعہ اور اتوار کے دن اکٹھے ہوتے تھے۔

(ملتان کی قدیم تاریخ – سید محمد لطیف ترجمہ: جمشید اقبال)



چوہدری کرم الٰہی بدر

قدیم نام اور وجہ تسمیہ

ملتان کی قدیم تاریخ ناپید ہے اس لیے ملتان کے قدیم نام اور وجہ تسمیہ کے بارے میں محققین کی مختلف آرا موجود ہیں اس کی دو بڑی وجوہات ہیں اولاً شمالی ہند کی قدیم تاریخ تسلسل اور ترتیب سے خالی ہے کیونکہ قدیم زمانے میں ہندو تاریخ نویسی کے فن سے آگاہ نہ تھے اور ان کی قدیم کتابوں میں تاریخ نویسی کی بجائے روایت نگاری کا راج نظر آتا ہے ثانیاً ملتان شمالی ہندوستان کا قدیم ترین شہر ہونے کے ساتھ ساتھ زمانہ قبل از تاریخ کا اہم تجارتی مرکز بھی رہا ہے اس لیے یہ عہد قدیم سے ہی بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا رہا اور یہاں کے تاریخی آثار ناپید ہو گئے جن کی شہادت اور مشاہدہ سے قدیم تاریخ کی تدوین میں مدد مل سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک ملتان کی کوئی مستند تاریخ نہیں لکھی گئی اسی لیے ملتان کے قدیم تاریخی ناموں اور موجودہ ملتان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں حتمی طور پر کچھ دستیاب نہیں ہوتا۔

قیام پاکستان کے بعد ملتان نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی ہے اور اب ملتان وحدت مغربی پاکستان کا ایک اہم شہر بن گیا ہے اپنے جغرافیائی محل وقوع اور سوئی گیس سب سٹیشن کی وجہ سے ملتان کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی ہے ملتان کے قدیم ناموں اور موجودہ وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف محققین کے خیالات کا جائزہ لینا باب اول کا تار و پود پیش کرتا ہے۔

ملتان کے قدیم ناموں کے سلسلے میں ہمارا سب سے معتبر ماخذ البیرونی ہے (یہ فاصل مہندس اور ہیئت دان 973ء میں خیوہ میں پیدا ہوئے اور 1048ء میں غزنی میں وفات پائی) اسلام کے اس مایہ ناز فرزند نے سنسکرت زبان میں کمال حاصل کیا اور اس کی بدولت اس نے ہندوستان کے رسم و رواج علوم وفنون اور طرز معاشرت پر اپنی لازوال تحقیق ''کتاب الہند'' لکھی کہتے ہیں کہ محمود غزنوی کے زمانے کا یہ مشہور مورخ ملتان کے علم کا چرچا سن کر یہاں سنسکرت سیکھنے آیا تھا۔

البیرونی کتاب الہند میں ایک کشمیری مصنف ''اوپ ٹالا'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں ملتان مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے اور اوپ ٹالا کی رائے ہے کہ ملتان کا اصل نام ''کشپ پورہ'' تھا چونکہ یہ شہر بار بار

بستا اور اجڑتا رہا ہے اس لیے مختلف زمانوں میں یہ شہر ہنس پور، بھاگ پور، سنب پور، مولستھان پور، پرہلاد پور اور مولتارن وغیرہ کے ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ فاضل کننگھم نے اپنے شاہکار جغرافیہ ہند میں ان ناموں کا ذکر کیا ہے اور موجودہ باب میں ہم ملتان کے ان تمام قدیم ناموں کا تاریخی جائزہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

(1) کشپ پورہ: ہندوؤں میں یہ روایت عام ہے کہ ملتان کا اصل نام کشپ پورہ ہے اور اسے مشہور ہندو رشی کشپ نے آباد کیا تھا سنسکرت کتابوں میں درج ہے کہ جب برہما نے دنیا بسانیکا ارادہ کیا اس نے 9 دیوتاؤں کو جنم دیا جن میں ایک دیوتا نام مریچی تھا اور شہر ملتان کا بانی رشی کشب اسی دیوتا مریچی کا لڑکا تھا قدیم سنسکرت کتابوں میں ملتان کا ذکر اس شہر کی قدامت کے تذکرہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مذہبی لحاظ سے اس شہر کو بڑی عظمت بخشی گئی ہے ہندو یہ کہتے ہیں کہ ملتان وشنو دیوتا کا تیرتھ ہے اور وشنو دیوتا اپنے پانچویں جنم (In the Fifth Incarnation) رشی کشپ کے گھر اسی ملتان میں پیدا ہوئے تھے نیز ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں یہ بھی تحریر ہے کہ ملتان کے راجہ نے مہابھارت جنگ میں حصہ لیا تھا۔

ملتان کا اصل نام کشپ پورہ ہونا اور یہاں وشنو دیوتا کی پیدائش کا ذکر کرنا اسے مذہبی تقدس بخشتا ہے مگر تاریخ کا حسن اتفاق ہے کہ جہاں البیرونی کی یہ تحریر کشپ پورہ کی قدامت کو بہت زیادہ نمایاں کر دیتی ہے وہاں یونانی مورخین نے البیرونی کی پیدائش سے صدیوں پہلے دریائے سندھ کے کنارے آباد ایک شہر کا ذکر بڑی کثرت سے کیا ہے جس کا نام وہ ''کیپے ٹورس'' ۔ کسپا ٹورس۔ کسپی ٹیرس کور کسپیر یا وغیرہ بتاتے ہیں اور کننگھم ان سب ناموں سے مراد ہمارا موجودہ ملتان ثابت کرتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے یہ بحث دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔

(ا) چھٹی صدی ق م میں ہکا ٹائیوس (Hecataesus) 550 تا 475 ق م نے جغرافیہ عالم پر ایک اہم کتاب ''محیط الارض'' لکھی جس کی وجہ سے اسے جغرافیہ کا آدم کہا جاتا ہے یہ کتاب زمین کی آئی اونوی معلومات پر مشتمل تھی اور اس کے دو حصے تھے ایک حصہ میں یورپ کا ذکر تھا اور دوسرے میں ایشیا کا۔ یہ کتاب اب چند اجزا کے سوا نایاب ہے۔ ویلز نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ محیط الارض بلاشبہ ہکا ٹائیوس کی تصنیف ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ اصل کتاب ضائع ہو گئی ہے اور اس اہم تصنیف کا حشر بھی وہی ہوا تھا جو اس کے معاصر اسکائی لیکس کے بحری سفر نامہ ہند کا ہوا۔

''محیط الارض'' میں فاضل مصنف نے یورپ اور ایشیا کا جدا جدا تفصیلی ذکر کیا تھا چنانچہ وہ دریائے سندھ کے کنارے آباد ایک متمول شہر کا ذکر ''کیپے ٹورس'' کے نام سے کرتا ہے۔

(ب) ہرودوطوس (Herodotos) 484 تا 445 ق م نے اپنی لازوال کتاب جغرافیہ میں علم اور فن کا امتزاج بڑی خوبی سے کیا۔ اس کتاب میں یونان اور ایران کی تاریخی جنگوں کا حال بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ اس نے یورپ اور ایشیا کے متعدد علاقوں کا سفر خود کیا تھا۔ ان میں بیشتر معلومات اس کے ذاتی مشاہدے کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے

معلومات کی صحت اور درستی کے لحاظ سے یہ کتاب عہد قدیم کی نسلی اور جغرافیائی معلومات کا بے مثل خزانہ ہے۔ فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں زمانہ ماقبل تاریخ کے ایک غدیری گاؤں (مقدونیہ میں) کا چشم دید حال لکھا ہے۔ اسی طرح مصر کے حالات لکھتے ہوئے اس نے مصر کو دریائے نیل کا عطیہ قرار دیا اپنی کتاب میں جہاں ہرودوطوس نے سلطنت ایران کی ہندی سرتاپی کا ذکر بڑی فراخدلی سے کیا جہاں دریائے سندھ میں مگرمچھ کی کثرت سندھ کی گرمی اور پنجاب کی اون سے ملائم روئی کا ذکر کیا وہاں اس نے دریائے سندھ کے کنارے آباد ایک شہر کسپاٹورس کے بارے میں یوں لکھا۔

> ''ریت کی وجہ سے اس کا کچھ حصہ صحرا ہے یہاں کے بسنے والوں کا طرز رہائش باختریہ کے لوگوں سے ملتا جلتا ہے یہاں وہ کیڑے ملتے ہیں جو کتے سے چھوٹے اور لومڑی سے بڑے ہوتے ہیں اور وہ ریت میں گھر بنا کر رہتے ہیں اس ریت میں سونا پایا جاتا ہے یہاں کے بسنے والے یہ ریت اکٹھی کرنے جاتے ہیں تو تین اونٹ استعمال کرتے ہیں جس میں درمیانی اونٹ کو عورت چلاتی ہے اور تیز رفتاری میں یہ اونٹ گھوڑوں سے کم نہیں ہوتے''۔

یہی وہ مورخ ہے جس نے اسکائی لیکس کے بحری سفر کی داستان بھی لکھی ہے جو اسکائی لیکس نے زیریں سندھ کی معلومات حاصل کرنے کے لیے شہنشاہ ایران دارا اول 531 تا 485 ق م کے حکم سے کیا تھا۔

(ج) ٹولمی (Klaudios Ptolemaios) 150 جو کہ سکندریہ کا مشہور منجم حساب دان اور جغرافیہ دان تھا۔ اس نے جغرافیہ میں نقشہ دنیا تیار کیا ٹولمی نے اپنے جغرافیہ میں ایک شہر کا ذکر کیا ہے جو دریائے راوی اور چناب کے مقام اتصال پر واقع تھا وہ اس کا نام ''کسپرا'' لکھتا ہے جس کا یونانی تلفظ ''کسپیریا'' اور لاطینی تلفظ ''کاسپورا'' ہے اس شہر میں بسنے والے ''کاساپیاس (Kassapias) کہلاتے تھے اور یہ شہر ایرانی سلطنت میں شامل تھا تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں کے باشندے Xerxes کی فوج میں شامل تھے اور اپنے تیز پھلوں والے تیروں اور بڑی بڑی کمانوں کو اٹھائے یہ لوگ ایرانیوں کی حمات میں یونانیوں کے خلاف جنگ لڑتے تھے۔

دریائے سندھ کے کنارے آباد اس شہر کے بارے میں یونانی مورخین کے ذکر نے قدیم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے فاضلوں کی توجہ تاریخی اہمیت کے اس شہر کے محل وقوع پر مرکوز کرائی چنانچہ گزشتہ صدی میں تاریخ دانوں نے اس شہر کو تلاش کرنے کے لیے بڑی کاوش کی۔ لیسر Lesser کی رائے ہے کہ یونانی مورخین کے کسپرا سے مراد ریاست کشمیر ہے مگر وہ اس امر پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں کہ اس شہر کا صحیح محل وقوع کیا تھا۔

لیسر صاحب کی تحقیق کسی مقام کا تعین نہیں کرتی اور ریاست کشمیر ایک سیاسی وحدت کا نام ہے ریاست کشمیر کی سرحدیں پھیلتی اور سکڑتی رہی ہیں دوسری صدی میں ریاست کشمیر پنجاب کے شمال مغربی حصہ پر پھیلی ہوئی تھی

اور محمد بن قاسم نے جب ملتان فتح کیا تھا تو صوبہ ملتان کی حد کے ساتھ ریاست کشمیر شروع ہوتی تھی تاریخ بتاتی ہے کہ محمد بن قاسم اس سرحد تک خود گئے تھے اور سرحد کے تعین کے لیے انہوں نے درخت بھی لگائے تھے لیسر صاحب کی تحقیق چونکہ کسی جگہ کی نشاندہی نہیں کرتی اس لیے یہ ہمارے موضوع زیر بحث کے لیے چنداں مفید نہیں ہے۔

ڈاکٹر ہیرن کا خیال ہے کہ کسپاٹورس سے مراد موجودہ کابل ہے مگر اس کے ثبوت میں وہ کوئی دلیل نہیں دیتے۔

ڈاکٹر سٹین راج ترنگی ایڈیٹ کرتے لکھتے ہیں کہ یونانی مورخین کے اس شہر سے مراد موجودہ جہانگیرہ ہے (جو نوشہرہ سے قریباً دس میل کے فاصلہ پر واقع ہے) ان کی رائے ہے کہ اس شہر کا وسط ایشیاء کابل یا شمالی مغربی سرحدی صوبہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ٹولمی کے جغرافیہ میں محل وقوع کے بے شمار اغلاط موجود ہیں اور اسی طرح ''کسپاٹورس'' بھی غلط دکھایا گیا ہے۔

ایک اور تاریخ دان ولسن اگرچہ اس شہر کے محل وقوع کو دریافت نہیں کر سکے مگر ان کی رائے ہے کہ یہ شہر لازمی طور پر دریائے سندھ کے مشرقی کنازہ پر واقع تھا اور اس کے ثبوت میں وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ دریائے سندھ کا مشرقی علاقہ ہی ایران کے باجگزار صوبہ پکٹالیس میں شامل تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی مورخین کے متذکرہ شہر کسپاٹورس سے عام ہور پر کشمیر مراد لیا جاتا تھا مگر کننگھم کی شبانہ روز محنت نے ثابت کر دیا کہ یونانی تذکروں میں جس شہر کا ذکر ملتان ہے اس سے مراد ملتان اور صرف ملتان ہے جس کی نشاندہی البیرونی نے کشپ پورہ کے نام سے کی ہے۔

کننگھم کہتے ہیں کہ اگر یونانی حوالے جات سے مراد کشمیر ہوتا تو اس کا ذکر سنسکرت کی کتابوں میں ضرور ملتا جو اس زبان کا مرکز رہا ہے وہ کہتے ہیں کہ رشی کسیاپا اور کشمیر کی مناسبت جدید ذہن کی پیداوار ہے ورنہ سنسکرت لٹریچر اس بارے میں ہرگز خاموش نہ ہوتا دوسرے ٹولمی نے اپنے جغرافیہ میں شہر راوی اور چناب کے سنگھم پر آباد دکھایا ہے اور بلاشبہ موجودہ ملتان کو یہ محل وقوع عہد قدیم سے حاصل ہے تیسرے اگر ڈاکٹر سٹین کی رائے درست ہوتی تو سکندر کے یونانی مورخ اس کا ذکر ضرور کرتے کیونکہ کشمیر یا جہانگیرا ہونے کی صورت میں Arrian اسے ہرگز نظر انداز نہ کر سکتا تھا جو سکندر اعظم کے ساتھ یہاں آیا تھا اور جس نے ضلع ہزارہ کے قبیلہ Urasa کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

کننگھم کے بعد فاؤچر (Foucher) صاحب نے بھی اس موضوع پر تحقیق کی ان کا استدلال ہے کہ زبان دانی کے لحاظ سے سنسکرت زبان کے قواعد ایسے ہیں کہ سنسکرت گرامر کی کسی شکل میں بھی کسیاپا سے کشمیر نہیں بنتا نہ اسم نہ فاعل اور نہ ہی حرف بناتے وقت کسیاپا اور کشمیر مشترک ہو سکتے ہیں۔

اپنے دلائل کے ثبوت میں فاؤچر صاحب ایک تاریخی شہادت پیش کرتے ہیں جرنیل اسکائی لیکس نے اپنے بحری سفر دارا اول کے حکم سے شروع کیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ دریائے سندھ کے دہانے اور ایران کے درمیان بحری راستہ تلاش کیا جائے یہ جرنیل کیریا کے قبصہ کرینڈا کا باشندہ تھا اس نے پنجاب میں جہازوں کا ایک بڑا بیڑا تیار

کروایا اور زیریں سندھ سے گزر کر 23 ماہ میں بحیرہ قلزم تک گیا اس نے زیریں سندھ کو جو معلومات دارا کو پہنچائیں اور ان کی بنا پر دارا نے سندھ پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسکائی لیکس کے بحری سفر کی یہ مہم صوبہ پیکٹین کے شہر کس پے ٹائیروس سے شروع کی گئی تھی۔

اس بحث پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے لیے ہمیں ایران کی قدیم تاریخ پر نظر ڈالنی پڑتی ہے تاریخ بتاتی ہے کہ سائرس شہنشاہ ایران نے چھٹی صدی ق م کے نصف میں پنجاب پر حملہ کر کے گندھارا کے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا سائرس ہی وہ ایرانی حکمران ہے جو مقدس کتابوں میں بار بار پکارا گیا ہے۔

جب بخت نصر والئی بابل کی قہارانہ فتح مندیوں نے یہودی قومیت فنا کر دی تھی اور بیت المقدس میں ان کے ہیکل کو منہدم کر دیا تھا تو بابل کی اسیری کے زمانہ میں دانیال نبی علیہ السلام نے بیلش فارشاہ بابل کی سلطنت کے تیسرے سال میں ایک خواب دیکھا تھا خواب میں دو سینگوں والا ایک مینڈھا تھا جو پچھم، اتر اور دکن کی طرف سینگ مارتا تھا اور کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکتا تھا۔ تعبیر میں ان دو سینگوں سے مراد میڈیا اور فارس کی دو سلطنتیں تھیں جو سائرس کے جھنڈے تلے متحد ہو گئی تھیں اور جس نے بابل کی سلطنت پر قبضہ کر کے بیت المقدس کی از سر نو تعمیر کی تھی بیت المقدس میں ہیکل سلمان کی تعمیر کے علاوہ سائرس نے دانیال نبی علیہ السلام کی بہت توقیر کی اور اس طرح سائرس کے ہاتھوں فنا شدہ یہودی قومیت دوبارہ ظہور میں آئی۔ سائرس کا سیاسی اقتدار بنی اسرائیل کے لیے خوشحالی اور عروج کا پیغام تھا اور یہ خوشحالی اس طرح وجود پذیر ہوئی جس طرح یسعیاد نبی علیہ السلام نے سائرس کے فتح بابل سے 160 برس پہلے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کی بشارت دی تھی۔

> ''خداوند ...... تیرا نجات دینے والا ...... یوں فرماتا ہے کہ یروشلم پھر آباد کیا جائے گا۔ یہودا کے شہر پھر بسائے جائیں گے۔ میں اس کے ویران مکانوں کی تعمیر کروں گا۔ میں سائرس کے حق میں کہتا ہوں وہ میرا چرواہا ہے وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا''۔

توریت شاہد ہے کہ سائرس چرواہا تھا اور اس کی ابتدائی زندگی مخدوش تھی وہ محض رحمت حق کی جولانیوں سے اقتدار پذیر ہوا تھا۔ چنانچہ سائرس کی فتح بابل اور دانیال نبی علیہ السلام نے جب یسعیاد نبی کی یہ پیشن گوئی اسے دکھلائی تو بے حد مسرور ہوا اور اسی خوشی میں سائرس نے ہیکل سلیمان کی تعمیر جدید کا فرمان جاری کر دیا۔

یثرب کے یہودی ربیوں کے کہنے پر کفار مکہ نے جب حضور رحمتہ اللعالمین ﷺ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال پوچھا اور ان سوالوں سے ان کا مطلب حضور پاک ﷺ کی رسالت کا امتحان لینا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور پرنور پر سورہ پاک الکھف نازل ہوئی۔ الکھف کے لفظی معنی غار کے ہیں اور یہ سورۃ پاک اصحاب کہف کے واقعہ کی طرف منسوب ہے قرآن حکیم کی اٹھارویں سورۃ ہے اور نزول کے لحاظ سے مکی ہے۔ اس سورۃ پاک کی آیات 83 تا 98 تک ذوالقرنین کا تفصیلی ذکر موجود ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ط قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَیْکُمْ مِّنْهُ ذِکْرًا ۝ اِنَّا مَکَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ وَ اٰتَیْنٰهُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ۝ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۵ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّکْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰی ج وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا یُسْرًا ۝ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ کَذٰلِکَ ط وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَیْهِ خُبْرًا ۝ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا لا لَّا یَکَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَکَ خَرْجًا عَلٰٓی اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَبَیْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَکَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ط حَتّٰٓی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ط حَتّٰٓی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا لا قَالَ اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ۝ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ج فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَکَّآءَ ج وَکَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ۝

ترجمہ: اور تجھ سے پوچھتے ہیں ذوالقرنین کو۔ کہہ اب پڑھتا ہوں تمہارے آگے اس کا کچھ احوال۔ ہم نے اس کو جمایا تھا ملک میں اور دیا تھا جب پہنچا سورج ڈوبنے کی جگہ پایا کہ وہ ڈوبتا ہے ایک دلدل کی ندی میں اور پایا اس کے پاس لوگوں کو۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین یا تو تو لوگوں کو تکلیف دے اور یا رکھ ان میں خوبی۔ بولا جو کوئی ہوگا بے انصاف سو ہم اس کو سزا دیں گے پھر لوٹ جائے گا اپنے رب کے پاس۔ وہ عذاب دے گا اس کو برا عذاب اور جو کوئی یقین لایا اور کیا اس نے بھلا کام سو اس کا بدلہ بھلائی ہے اور ہم حکم دیں گے اس کو اپنے کام میں آسانی پھر لگا ایک سامان کے پیچھے یہاں تک کہ جب پہنچا سورج نکلنے کی جگہ۔ پایا اس کو کہ نکلتا ہے ایک قوم پر کہ نہیں بنا دیا ہم نے ان۔کے لیے آفتاب سے ورے کوئی حجاب یونہی ہے اور ہمارے قابو میں آچکی ہے اس کے پاس کی خبر۔ پھر لگا ایک سامان کے پیچھے۔ یہاں تک کہ جب پہنچا

دو پہاڑوں کے بیچ۔ پائے ان سے دوسرے ایسے لوگ جو لگتے نہیں کہ سمجھیں ایک بات۔ بولے۔اے ذوالقرنین ۔ یہ یاجوج ماجوج دھوم اٹھاتے ہیں ملک میں۔سوتو کہےتو ہم مقرر کر دیں تیرے واسطے کچھ محصول اس شرط پر کہ بنادے تو ہم اوران میں سے ایک آڑ بولا جومقدور دیا مجھ کو میرے رب نے وہ بہتر ہے۔سو مدد کر میری محنت میں بنادوں تمہارے اوران کے درمیان ایک دیوار موٹی۔ لادو مجھ کو تختے لوہے کی۔ یہاں تک کہ جب برابر کر دیا دونوں پھانکوں تک پہاڑ کی۔کہا دھونکو یہاں تک کہ جب کر دیا اس کو آگ۔کہالاؤ میرے پاس کہ ڈالوں اس پر پگھلا ہوا تانبا۔پھر نہ چڑھ سکیں اس پر اور نہ کر سکیں اس میں سوراخ۔ بولا یہ ایک مہربانی ہے میرے رب کی۔ پھر جب آئے وعدہ میرے رب کا گرا دے اس کو ڈھا کر۔اور ہے وعدہ میرے رب کا سچا۔فرقان حمید نے ان آیات پاک میں ذوالقرنین کے تمام اوصاف اوراعمال کی تشریح کر دی۔ جو سائرس ایرانی میں منجملہ پائے جاتے ہیں۔اس کے سوا کوئی دوسرا مشرقی حکمران نہیں گزرا جس کے عہد میں یہودیوں کو امن اور خوشحالی نصیب ہوئی جس نے بیت المقدس کی تعمیر کی ہو یا جو خدا پرست عادل، مفتوح اقوام کے لیے فیاض اور مشرق و مغرب کی فوجی مہموں کا کامیاب قائد ہو۔

1838ء میں اصطخر کے کھنڈروں میں ایک سنگی تمثال دریافت ہوئی تھی جس میں سائرس کے دونوں طرف عقاب کے پر نکلے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ موجود ہیں تمثال میں پروں کا ہونا ان ملکوتی صفات اور فضائل کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر قرآن حکیم نے فرما دیا اور سینگوں کا تخیل میڈیا اور فارس کی سلطنتوں کے اتحاد کی ترجمانی کرتا ہے جو ساورس کے عہد میں وقوع پذیر ہوا قرآن حکیم نے اسی لیے سائرس کو ذوالقرنین (دوسینگوں والا) کہہ کر پکارا ہے حالانکہ دارا کے کتبہ بیستون سے معلوم ہوتا ہے کہ سائرس کا اصل نام گوروش تھا جس کا تلفظ یہودیوں نے خورس کیا جس نے عربی میں خسرو کی شکل اختیار کر لی اور جسے عرب مورخ کخیسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔

سائرس کی اس تمہید سے ہمارا تعلق اس قدر ہے کہ فاؤچر دعویٰ کرتا ہے کہ سائرس نے گندھارا کے صوبہ پر قبضہ کر لیا تھا اور ملتان اس کی سلطنت میں شامل تھا۔سندھ پر دارا نے جب حملہ کیا تو ملتان ایرانی فوجوں کی چھاؤنی تھا جہاں سے انہوں نے زیریں سندھ کی طرف پیش قدمی کی۔ ہم فاؤچر کے اس دعویٰ کو تنقیدی نکتہ نظر سے دوسرے ذرائع سے پرکھتے ہیں۔

کتبہ نقش بیھتوں پر سائرس کے ماتحت 28 صوبوں کا ذکر ہے اس میں گندھارا شامل دکھا گیا گیا ہے اس سے یہ بات تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ ایرانی یلغار مغربی پاکستان میں دارا کے اس حملہ سے شروع نہیں ہوئی جب امیر البحر سکائی لیکس کی معلومات کی بنا پر کیا گیا تھا بلکہ ایرانی دارا کی پیدائش سے بھی صدیوں پیشتر سائرس کے عہد حکومت

میں پنجاب کے بیشتر حصہ پر قابض تھے۔ اب اتنا سوال باقی رہ جاتا ہے کہ امیر البحر اسکائی لیکس نے اپنا سفر جس شہر ''کسپے ٹورس'' سے شروع کیا تھا وہ کہاں تھا؟ اور کیا یہ درست ہے کہ اسکائی لیکس کے آغاز سفر کے وقت (بقول فاؤچر) ملتان ایرانی صوبہ گندھارا کی سرحدی چھاؤنی تھا جس سے آگے سندھ شروع ہو جاتا تھا۔ نقش بیہستون کی جس تحریر کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ 520 ق م کی ہے اور دارا نے سندھ پر قبضہ 517 ق م میں کیا تھا اسکائی لیکس نے اپنی رپورٹ آغاز سفر سے 28 ماہ بعد دی تھی۔ اس لیے ظاہر کہ آغاز سفر اس نے 519 ق م میں کیا ہوگا جو مہم کے آغاز کے شہر کی دریافت محور تحقیق بنتی ہے۔ عام مورخین اسے نوشہرہ بتاتے ہیں۔ فاؤچر کو اصرار ہے کہ یہ بحری سفر ملتان سے شروع کیا گیا تھا ہم قرآن پاک سے ذوالقرنین کی مشرقی مہم کے الفاظ درج کرتے ہیں۔

حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا

ترجمہ: جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو اسے ایک ایسی قوم ملی جو سورج کے لیے کوئی آڑ نہ رکھتی تھی۔

مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد یہ کہ وہ قوم خانہ بدوش ہوگی مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ غالباً جنگلی ہوں گے اور سورج سے بچنے کے لیے کوئی گھر نہ بناتے ہوں گے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ ان الفاظ سے کہیں ذوالقرنین کی فتح ملتان کا ذکر ہی تو نہیں کیا جا رہا۔ جہاں کے باشندے بلا شبہ سورج کے لیے کوئی آڑ نہ رکھتے تھے۔ سورج کی پوجا کرتے تھے اور سورج ان کا دیوتا تھا ہم اس ستدلال کو کسی عالم دین کے لیے چھوڑ کر تاریخی لحاظ سے فاؤچر کے دعویٰ کا جائزہ لیتے ہیں۔

امر واقع یہ ہے کہ سائرس دارا کی پیدائش سے صدیوں پہلے پنجاب کا معتد بہ حصہ فتح کر چکا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے مفتوحہ علاقہ میں کسی دوسری جگہ سورج اور عوام میں وہ چولی دامن کا ساتھ میسر نہ تھا جو ملتان کے باشندوں کو سورج دیوتا کی پرستش سے حاصل تھا۔

فاؤچر جہانگیرہ والی تحقیق پر ایک اور اعتراض کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ملتان دارا کے حملے کے وقت ایرانیوں کے قصبہ میں موجود تھا تو یہ ناممکن ہے کہ اسکائی لیکس جیسا آزمودہ کار جرنیل اپنا آغاز سفر زیریں سندھ کے قریب ترین شہر ملتان کی بجائے منزل مقصود سے سینکڑوں دور جہانگیرہ سے کرے جو کہ دریائے کابل پر واقع ہے اور جہانگیرہ سے دریائے کابل بارہ میل بہہ کر اٹک کے مقام پر دریائے سندھ سے جا ملتا ہے خاص طور پر جبکہ ملتان میں دریا کا بہاؤ پر سکون اور اس کے برعکس جہانگیرہ میں بے حد طلاطم خیز ہو۔

تاریخ شاہد ہے کہ دریائے سندھ میں اٹک تک سمندر کی سمت سے جہاز رانی کبھی بھی نہیں ہوئی اس کے برعکس ملتان عہد قدیم میں ایک محفوظ بندرگاہ رہا ہے یہی وہ پور بندر ہے جہاں آ کر ابن بطوطہ اترا تھا۔

صرف علاقائی قربت اور پانی کا بہاؤ ہی نہیں بلکہ بیڑے کی تعمیر کے لحاظ سے بھی ملتان جہانگیرہ کی نسبت زیادہ موزوں ہے کیونکہ ملتان میں عمارتی لکڑی دو دریا لاتے ہیں جبکہ نوشہرہ میں صرف ایک بیڑے کی تعمیر کے لیے لکڑی کی بہم رسانی ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے ایک وسیع ہموار اور محفوظ علاقہ بھی ہونا چاہیے جہاں اسے بنایا جا

سکے دریا کے کنارے وسیع ذرائع کا حامل ایک شہر آباد ہو جہاں ضروریات زندگی آسانی سے میسر آسکیں ظاہر ہے جہانگیرہ کی نسبت ملتان میں یہ سہولتیں زیادہ عام ہیں اسلامی دور حکومت میں محمود غزنویؒ نے بھی ملتان میں وہ بیڑا تیار کروایا تھا جس میں لوہے کے تیز برچھے لگے ہوئے تھے اور جن کشتیوں سے محمود نے 418ھ میں ایک کارخانہ بنوایا تھا جو موجودہ ملتان سے آٹھ میل دور دریائے چناب کے دوائیں کنارے پر سندھ ساگر ریلے پل کے قریب واقع تھا۔

فاؤچر کی تحقیق اور ان حقائق کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بلاشبہ امیر البحر اسکائی لیکس کے آغاز سفر کا شہر ہمارہ موجود ملتان ہے اور جس زمانے میں یہ سفر شروع کیا گیا تھا تو یہ ''کسپے ٹورس'' کہلاتا تھا اس تحقیق سے کنگھم کے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے کہ قدیم یونانی مورخین نے مذکورہ شہر ''کسپاٹورس'' کیسے ٹورس اور کیسپیر یا وغیرہ سے ہمارا موجودہ ملتان ہی مراد ہے جس کی اس مناسبت کا ذکر سب سے پہلے البیرونی نے کیا تھا۔

ڈاکٹر صوفی نے کشمیر کی تاریخ مرتب کی ہے جہاں وہ کشمیر کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مندرجہ ذیل نظریات پیش کرتے ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ کشمیر KA اور Smira کا مرکب ہے KA سے مراد Wind ہوا اور Samira مراد Water پانی لہٰذا کشمیر کے معنی یہ ہوئے "Land from Which Water ia Drained off by Wind"

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کشمیر KAS بمعنی (Channel) اور MIR بمعنی (Mountains) کا مرکب ہے اس طرح کشمیر کے معنی "Land of Channel Mountain" ہوتے ہیں۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کشمیر کی وجہ تسمیہ Semitic قبیلہ Kish کے نام پر ہے جنہوں نے کاشغر کا مشہور شہر آباد کیا تھا اور کنشک جن کا مشہور بادشاہ گزرا ہے ایک قدیم شہر Kish عراق میں بھی موجود ہے جسے آشور قوم نے بسایا تھا۔

کشمیر کی وجہ تسمیہ میں کہیں بھی رشی کسیاپا کا ذکر نہیں آیا۔ اگر کسیاپا کا کوئی تعلق کشمیر سے ہوتا تو سکندر کا یونانی مورخ ایرین اس کا ذکر ضرور کرتا علاوہ بریں اشوک کے کتبوں میں سے ضرور کوئی ثبوت ملتا کیونکہ کشمیر تیسری صدی ق م میں بدھ مت قبول کر چکا تھا اس طرح بدھ مت کی مشہور کتاب ''سوالات مالندہ'' میں کشمیر کا کوئی ذکر نہیں حالانکہ یہ کتاب لکھی ہی کشمیر پر گئی تھی۔

اس دلچسپ بحث کے لیے ہم ہرودوطوس کی تحریر سے ایک داخلی ثبوت تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ملتان ہی وہ شہر ہے جو ریت کی وجہ سے صحرا ہے۔ کابل نوشہرہ یا کشمیر میں سے کوئی بھی صحرا نہیں ہے اور نہ ہی ان علاقوں میں کہیں اونٹ ملتا ہے حالانکہ اس تحریر میں ذکر ہے کہ کسپیریا کے باشندے سونا ملی ریت لانے کے لیے اونٹ استعمال کرتے تھے۔ کابل نوشہرہ یا کشمیر کے باشندوں کا طرز معاشرت بھی باختریہ والوں سے نہ ملتا تھا حالانکہ ملتان میں آج بھی اس کی جھلک موجود ہے۔ کابل، نوشہرہ یا کشمیر میں کبھی بھی نہ اونٹ پایا جاتا ہے اور نہ ہی سونا ملی ریت

اس کے برعکس آج بھی اونٹ اور ملتان کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور قیام پاکستان میں جب ملتان کے گرد و پیش کے صحرائی علاقوں کی ریت کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں سونے کے ذرات موجود ہیں۔

دور حاضر کی یہ تحقیق ہمیں پانچویں صدی ق م میں لے جاتی ہے جبکہ ہرودوطوس نے ہمارے شہر ملتان کا ذکر اس احتیاط سے کیا کہ اس کی متذکرہ تمام خصوصیات آج بھی ملتان میں موجود ہیں اس ثبوت کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ یونانی مورخین کے متذکرہ شہر سے مراد ملتان اور کننگھم کا کسپیر یا بھی اسی شہر سے دلالت پر کرتا ہے جسے البیرونی کشپ پورہ کے نام سے پکارتا ہے اس لیے موجودہ ملتان کا سب سے قدیم نام کشپ پورہ ثابت ہوتا ہے۔

2۔ پرھلاد پورہ: پوران ہندوؤں کی قدیم مقدس کتابیں ہیں اور ان میں قدیم ہندوستان کی تاریخ کے متعلق کئی افسانے درج ہیں چنانچہ ان میں یہ بھی لکھا ہے کہ ملتان پر ایک راجہ ہرناکش کی حکومت تھی اور راجہ رشی کشپ کی اولاد سے تھا۔ اس راجہ نے دن رات ایک کر کے بڑی ریاضت پائی تھی اور سیوا نے راجہ کو بر دیا تھا کہ راجہ نہ دن کو مرے گا اور نہ رات کو، نہ انسان کے ہاتھوں نہ حیوان کے ہاتھوں، نہ وہ کسی عمارت کے اندر مرے گا اور نہ باہر۔ راجہ سیوا کا یہ عہد الے کر بڑا مغرور ہو گیا۔ اس نے بڑے علاقے فتح کر لیے اور خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ راجہ کا ایک شہزادہ پرہلاد تھا جو وشنو کا پجاری تھا۔ اس نے راجہ کے دعویٰ سے انحراف کیا اور کہا کہ راجہ کا دعویٰ باطل ہے اس پر راجہ نے شہزادہ کو وشنو پوجا سے باز رکھنے کا حکم جاری کر دیا مگر شہزادہ باز نہ آیا راجہ نے اسے عبرت ناک سزا دینے کا تہیہ کر لیا چنانچہ پرہلاد کو پہاڑ کی چوٹی سے زندہ گرا دیا گیا مگر اسے کوئی ضرر نہ پہنچا۔ اسے زہر دیا گیا مگر کوئی اثر نہ ہوا تنگ آ کر راجہ نے اپنے محل کا سونے کا ستون تپاہ کر شہزادے کو مارنے کا ارادہ کیا تو وشنو دیوتا محل کے اس ستون سے پرہلاد کی امداد کے لیے نرسنگھ یونی شیر کی شکل میں نمودار ہوئے اور انہوں نے سرکش راجہ ہرناکش کو محل کے اندر چیر ڈالا۔ اس واقع کا عوام الناس پر بڑا اثر ہوا اور لوگوں نے ملتان کو شہزادہ پرہلاد کے نام پر پرہلاد پورہ پکارنا شروع کر دیا۔

یہ کہانی کہاں تک درست ہے ہم نہیں کہہ سکتے۔ البتہ بھگت پرہلاد کا مندر اب تک قلعہ کے جانب شرق حضرت غوث بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے مزار مبارک کے پاسو موجود ہے۔ نرسنگھ اوتار کی آمد ملتان کی یہ کہانی اگرچہ ہزاروں برس پرانی ہے مگر تہذیب وتمدن کے نگار خانے میں صدیوں بعد تک ہمیں اس کہانی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے اور نرسنگھ اوتار کی شکتی کا تاثر عوام کے دل میں کس خوبی سے بیٹھایا گیا تھا اس کا اندازہ ہمیں حضور فضیلت مآب شاہ یوسف گردیزؒ کے مزار مبارک پر کندہ ایک فارسی شعر سے ہوتا ہے جو درج ذیل ہے:

دانی سوار شیر کہ در دست مار کرد
مخدوم شاہ یوسفؒ ایں جا قرار کرد

فرماتے ہیں کہ زندہ شیر پر سواری کرنے والی عظیم المرتب ہستی جن کے ہاتھ میں اژدھے کا چابت ہوتا تھا وہ مخدوم شاہ

یوسف گردیزیؒ اس شہر ملتان میں قیام پذیر ہیں (اور اس جگہ آرام فرما رہے ہیں) حضورؒ کی ذات گرامی کا تفصیلی تذکرہ مناسب جگہ پر آئے گا۔ یہاں صرف اتنا مقصد ہے کہ شیر اور ملتانی لوک کہانیوں میں گہری وابستگی رہی ہے اور نرسنگھ اوتار (جو شیر کی شکل میں نمودار ہوئے تھے) کی آمد کی وجہ سے ملتان ایک عرصہ تک پرہلاد پورہ کے نام سے مشہور رہا ہے۔

3۔سنب پورہ: بھشوا پوران میں درج ہے کہ ایک جنت میں رانی جنب وطن نے کرشن جی کے ساتھ بڑی وفاداری دکھائی تھی۔ میدان جنگ میں کرشن جی کے رتھ کا لوہا ٹوٹ گیا تھا تو رانی نے اس کی بجائے اپنا بازو اس میں دے دیا تھا جس کی وجہ سے کرشن جی فتح یاب ہو گئے تھے چنانچہ اس وفاداری سے خوش ہو کر انہوں نے ملتان کا شہر رانی جنب وطنی کے بیٹے شہزادہ سنب کو بخش دیا تھا۔ شہزادہ نے اس شہر کو جدید طریقے سے بسایا تھا اور اسے بڑی وسعت دی تھی اس کی رونق اور تزئین کی وجہ سے اس کا نام سنب پورہ پڑ گیا تھا۔

4۔میترون: میترا سورج دیوتا کا نام ہے جسے ایرانی میتھرا یعنی خدائے نور کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس طرح مترون کے معنی "سورج دیوتا کا شہر" ہوتے ہیں سنسکرت کتب میں درج ہے کہ راجہ سنب کو جذام کی بیماری تھی چنانچہ اس بیماری سے شفا حاصل کرنے کے لیے راجہ نے اپنے آپ کو دریائے چناب کے کنارے ایک Sun Grove میں ڈالا اور سورج دیوتا نے راجہ کی بیماری ٹھیک کر دی چنانچہ اس خوشی میں راجہ سنب نے اس شہر میں سورج دیوتا کا ایک عالیشان مندر بنوایا اور یہاں سورج دیوتا کی پوجا شروع کر دی۔

مشہور چینی سیاح ہیون سانگ جب دس اکتوبر 641ء میں ملتان آیا تو اس نے یہاں سورج مندر دیکھا اور اس کے بارے میں دلچسپ معلومات قلم بند کیں اس طرح سکندر کے نام ارسطو کے فاضلانہ خطوط میں بھی ملتان کے سورج مندر کا ذکر ملتا ہے۔ عرب مورخین نے اس مندر کے بارے میں تفصیلی معلومات سپرد قلم کی ہیں۔ مسعودی، ابن ہوقل اور ادریس اپنے سفر ناموں میں لکھتے ہیں کہ ملتان اس بت کا نام تھا جو سورج مندر میں موجود تھا۔ البیرونی بت کا نام ادیتہ بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس بت کو سورج کا مظہر تصور کیا جاتا تھا۔ البیرونی کے اس بیان کی تصدیق بھشوا پوران کی اس کہانی سے بھی ہوتی ہے جس میں ذکر ہے کہ مہابھارت کے زمانے میں شہر کا نام اوستانہ تھا۔

5۔اوستانہ: اوستانہ کے معنی ادیتہ کا شہر کہتے ہیں۔ اسی جگہ راج سنب نے اپنے آپ کو کنڈ میں ڈالا تھا اور آج بھی ملتان میں سورج کنڈ موجود ہے جو ریلوے لائن کے جنوب کی طرف ملتان شجاع آباد روڈ پر شہر سے چار میل کے فاصلے پر واقع ہے آج کل دریائے چناب کی گزرگاہ سورج کنڈ کے پاس نہیں مگر ممکن ہے کہ مہابھارت کے زمانہ میں یہ دریا سورج کنڈ کے پاس بہتا ہو اور بعد میں اس نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا ہو کیونکہ کہ پنجاب کے دریاؤں میں تبدیلیاں عام ہو رہی ہیں اور چناب ملتان کے پاس شہر کے ساتھ بہتا تھا۔ اسی طرح راوی کی قدیم گزرگاہ تو موجود قلعہ ملتان اور شہر کے ساتھ رہی ہے۔

سنسکرت کتب میں سورج کنڈ کا تذکرہ تاریخی لحاظ سے سورج کنڈ کو ایک ممتاز آثار قدیمہ کی حیثیت دیتا ہے قیام پاکستان سے پیشتر یہاں ایک مندر تھا جہاں ہندو کثیر تعداد میں آیا کرتے تھے اب بھی پاکستان میں آثار و باقیات کا تحفظ کرنے والے محکمہ کو سورج کنڈ کی حفاظت کے لیے توجہ کرنی چاہیے کیونکہ تاریخی عظمت کے لحاظ سے یہ جگہ بے حد اہم ہے۔

یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورج دیوتا کے اس شہر کا نام بت کے نام پر تھا یا سورج دیوتا کے مندر کا نام ملتان تھا عرب مورخ بلاذری کا بیان ہے کہ سورج دیوتا کے مندر اور بت دونوں کا نام ''بُد'' تھا سرایلیٹ کی تحقیق ہے کہ دیبل کے قدیم بدھ مندر کا نام بھی ''بُد'' تھا۔

مغربی پاکستان بدھ مت کا گہوارہ رہا ہے یوسف زئی کی تاریخی آثار، شہباز گڑھی کی دھاریں، ٹیکسلا اور شور کوٹ کی باقیات گواہی دیتی ہیں کہ یہ سرزمین بدھ مت کا مرکز رہی ہے۔ خیر آباد کے مینار پر جو تاریخی نشان سنگ یون نے دیکھے تھے وہ دنیا بھر میں بدھ مت کے مسئلہ تناسخ کے واحد آثار ہیں۔ ٹیکسلا میں سرکپ شہر کے بالمقابل شہنشاہ اشوک کا تعمیر کردہ ببر خانہ ہے جہاں گوتم بدھ نے ایک بھوکی شیرنی کو اپنا شر پیش کر دیا تھا۔ اسی طرح ''پوفا ٹالو'' (موجودہ شورکوٹ) ہی وہ شہر ہے جہاں بدھ مت کے فرقہ Sammitiyas کا مطالعہ کرنے ہیون سانگ وہاں گیا تھا اور دو ماہ تک وہاں ٹھہرا تھا۔ کننگھم ایک ایسی جگہ کا ذکر بھی کرتے ہیں جہاں بدھ نے اپنی آنکھوں کی قربانی پیش کی تھی عرب مورخین سورج دیوتا کے مندر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہندو اس مندر میں اپنی آنکھیں نکال کر اپنے ہاتھ پر رکھ لیتے تھے اور پھر دعا مانگتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں سورج مندر کا نام ''بُد'' پڑ گیا ہوگا اور یہاں آنکھیں نکال کر دعا مانگنا بھی بدھ کی آنکھوں کی قربانی کی وجہ سے رواج پا گیا ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ سب بدھ مت کی روایات کا اثر تھا جو عرب مورخوں نے یہاں دیکھا تاریخ کو ماضی کے انکشاف کے لیے کسی بہانہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ فیاضی معلومات کے لیے تاریخ کی زبان پر ملتان کا نام آیا ہے اور ملتان کے قدیم ناموں کی تحقیق و تجسس میں ہمیں قدیم ہندو روایات اور بدھ مت کی قابل قدر معلومات کے خزانوں تک دسترس حاصل ہوئی ہے۔

کننگھم کو مانکیلہ کے سٹوپہ سے چاندی کے دو ٹکونے سکے ملے ہیں جن پر ملتان کے سورج دیوتا کی تصویر تھی اس تاریخی شہادت کی بنا کننگھم کہتے ہیں کہ ملتان کا نام مترون ہونا سورج دیوتا مترہ کی وجہ سے رواج پا گیا تھا۔

البیرونی کا دوسرا اہم انکشاف یہ ہے کہ لوگ ملتان کے سورج مندر کے بت کو حضرت ایوبؑ کا بت سمجھتے تھے عرب مورخین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے ہندوؤں کے نزدیک سورج دیوتا کے اس مندر کی یاترا ایک اہم مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتی تھی لوگ دور دراز سے اس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ اپنے سر منڈواتے تھے داڑھی بنواتے تھے اور صندل کی نرم لکڑی جو بہت قیمتی ہوتی تھی بطور چڑھاوا لاتے تھے ابن الاثیر تو اسے باقاعدہ حج کا نام دیتا ہے مگر ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے لوازمات کیا تھے کیا اس حج کا کوئی وقت مقرر تھا یا ہر زمانہ میں اس کی زیارت حج

کہلاتی تھی۔ کننگھم کا خیال ہے کہ ایوب اور ادیتہ ایک ہی چیز ہے اور ان میں صرف لفظی فرق ہے اس فرق کی وجہ وہ عربی اور سنسکرت زبان کا تلفظ بیان کرتے ہیں ان کی رائے میں حرف وصورت کی یہ تبدیلی ایک معمولی سی بات ہے حضرت ایوبؑ کا ہندوؤں سے پوجا جانا انہیں ایک صاحب نبوت امت بنا دیتا ہے اور ممکن ہے کہ ملتان کے وہ باشندے جنھوں نے ملتان کے سورج مندر کے بت کو حضرت ایوبؑ کا بت تصور کر کے اس کے حج دروع کئے تھے زمانہ جہالت کے عرب بت پرستوں سے ضرور افکار اور خون کا رشتہ رکھتے ہوں گے۔ ملتان کے باشندوں کا عرب بت پرستوں سے تعلق تاریخ کے طالب کے لیے تحقیق و تجسس کی نئی راہیں کھول دیتا ہے جبکہ خود حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: ''مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے'' اور جس حدیث کی طرف علامہ اقبالؒ نے اپنی مشہور نظم ہندوستانی بچوں کا گیت (بانگ درا صفحہ نمبر 87) میں یوں اشارہ کیا ہے۔

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسمان سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے ...... میرا وطن وہی ہے

تجارتی شاہراہ ہونے کی وجہ سے عربی طرز پرستش کا ملتان آنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ کو سندھ میں زمانہ قبل از تاریخ کی چند قبریں ملی تھیں جن کے سر قطب کی طرف تھے جو عربوں کا خاصہ ہے اسی وجہ سے اس انگریز نے زمانہ قبل از تاریخ کی ان قبروں کو قدیم عربوں کی قبریں قرار دیا اور سب سے بڑھ کر دلچسپ یہ امر بھی ہے کہ حضرت ایوبؑ کو جلد کی ایک بیماری تھی اور ہندو روایات بھی ملتان کو جذاب کی شفا کا مقام بتاتی ہیں۔

اس بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ملتان صدیوں تک سورج دیوتا کے شہر کی حیثیت سے مترون کے نام سے مشہور رہا ہے۔

6۔ ہنس پورہ: تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ کے لڑکے یافث ادھر آئے اور ان کے لڑکے ہنس نے اس شہر کو آباد کیا چنانچہ اس نسبت سے یہ شہر ہنس پورہ کہلاتا رہا۔

7۔ بھاگ پورہ: ہندو کتب میں ایک روایت ہے کہ ملتان اجڑ گیا تھا اور اسے راجہ بھاگ کشن نے دوبارہ از سر آباد کیا اور اس کا نام بھاگ پورہ رکھا۔

کننگھم ہنس پورہ اور بھاگ پورہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Bhaga and Hans are well known names of the Sun and therefore Bhagapura and Hansapuro are only the synonyms of the

name of Multan"

8۔شام پورہ: سید اولاد علی گیلانی اپنی تصنیف ''مرقع ملتان'' میں ایک ملتانی بیت نقل کرتے ہیں

ہنس پور، بھاگ پور، شام پور اور چوتھا پور ملتان
پانچواں پور بہاج کرتھی، سی آری پور ملتان

اس بیت سے اس روایت کو تقویت ملتی ہے کہ ملتان کو تیسری بار راجہ شام پریم ناتھ نے آباد کیا تھا اس لیے اس کا نام شام پور مشہور ہو گیا بیت کا دوسرا بند ہمیں واضح نہیں کر سکا اسے ہم کسی ماہر لسانیات کے لیے چھوڑتے ہیں۔ بہر حال یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ملتان شام پور کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔

9۔مالستھان پورہ: ملتان کے قدیم ناموں کے سلسلے میں اب تک ہم قدیم ہندو کتب کے سہارے چلتے رہیں اب پہلی بار ہم تاریخی حوالہ جات کے ساتھ اس موضوع پر اظہار رائے کریں گے۔

سکندر کے حملے کے وقت شمالی ہندوستان میں مختلف خود مختار قبائل حکمران تھے۔سکندر نے جب ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے اوہند کے مقام پر پل تیار کروایا تو وہاں راجہ امبھی والی ٹیکسلا کی سفارت پہنچی۔راجہ پورس کے خلاف سکندر کو جنگ کی ترغیب دلانا اس سفارت کا مدعا تھا۔ ق م 326 میں سکندر ٹیکسلا آیا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ جولائی 326 ق م میں پورس نے سکندر سے شکست کھائی اور سکندر جب مغربی پنجاب کے راستے ایران جانے لے لیے بڑھا تو راستے میں اسے آزاد قبائل کی بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے واسطہ پڑا جن کی جرات اور بہادری نے سکندر کی فوج کے چھکے چھڑا دیئے سکندر نے ہڑپہ، شورکوٹ اور کوٹ کمالیہ کی بستیوں پر بڑے خونریز معرکوں کے بعد قبضہ کر لیا مگر اس شہر میں آباد بہادر ملوئی قوم نے سکندر کے ہاتھوں برباد ہونے کے باوجود ایک ایسے شہر میں پناہ لی جو دریا کے کنارے آباد تھا وہاں پچاس ہزار ملوئیوں نے ڈٹ کر سکندر کا مقابلہ کیا اور سکندر بری طرح زخمی ہوا اس طرح یونانی فوج کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہنے والی اس بہادر قوم نے سکندر کے فاتح عالم بننے کے خواب کو خاک میں ملا دیا اور کئی مورخین تو یہ بھی کہتے ہیں کہ سکندر کا یہ زخم مندمل نہ ہو سکا تھا اور اس کی موت بھی دراصل بعد میں اسی زخم کی وجہ سے ہوئی تھی۔

ایرین اس شہر کا ذکر کرتے لکھتا ہے کہ یہ شہر کافی بڑا تھا اس کا قلعہ مضبوط تھا سکندر نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اس کی دیواروں پر چڑھنے کے لیے رسہ کی بڑی بڑی سیڑھیاں منگوائیں جو لمبائی میں قلعہ کی دیواروں کی بلندی کے برابر تھی۔ان سیڑھیوں کے ذریعے یونانیوں نے قلعہ کی دیواروں پر چڑھنا شروع کر دیا محصورین دیواروں سے بڑے بڑے پتھر لڑھا کر ان سیڑھیوں کو توڑ رہے تھے صرف وہ سیڑھی جس پر سکندر اپنے تین محافظوں پیوکس ٹاس، لیونا ٹوز اور ایبرئیس سمیت چڑھ رہا تھا ٹوٹنے سے بچ گئی سکندر نے یونانیوں کی تمام سیڑھیاں ٹوٹتے دیکھا مگر جرات سے کام لے کر وہ قلعہ کی فصیل پر چڑھ گیا۔اس کے تاج نے اسے محصورین کی نظر میں نمایاں کر دیا۔دشمن کے قلعہ پر کھڑے ہو کر

سکندر نے بلا جھجک چھلانگ لگا دی۔ سکندر کی اس جرات کو دیکھ کر اس کے محافظ بھی پیچھے کود گئے۔ فتح اور موت کا فیصلہ کن کشمکش جس میں تقدیر تدبیر کی راہ تکتی ہے مگر جسے سکندر کی اولوالعزمی نے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ ملوئی قوم، ان کے ویران جلتے ہوئے شہر، خون کی ندیاں اور ان میں تڑپتی لاشیں۔ ملوئی قوم کا بے رحم دشمن خود ان کے نرغے میں کود آیا تھا۔ محصورین ان تینوں یونانیوں پر پل پڑے۔ ابیرٹس جلد ہی زخموا ہو گیا۔ دوسرا محافظ بھی موت کی نیند سو گیا۔ سکندر خود ایک درخت کی آڑ لیے دن بھر تیغ زنی کرتا رہا۔ حاکم قلعہ سکندر کے ہاتھوں قتل ہوا اور جب محصورین کی تلوار سے سکندر کے سامنے پیش نہ گئی تو ایک ملوئی نے تاک کر ایسا تیر مارا جو سکندر کی زرہ توڑ کر اس کی ہڈیوں میں پیوست ہو گیا۔ سکندر چکرا کر گر گیا۔ اس موقعہ پر زخمی پیوکس ٹاس نے بے مثل جان نثاری دکھائی۔ وہ اپنے بہتے خون کے باوجود اس متبرک ڈھال سے جو سکندر الیہان سے ساتھ لایا تھا سکندر کو چھپائے رکھا۔ اس طرح سکندر اردگرد کے حملوں سے محفوظ رہا۔ سکندر کے گرنے کی وجہ سے ملوئی فصیل سے غافل ہو گئے اور یونانیوں کو فصیل پر چڑھ کر اندر کودنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے قلعہ کا دروازہ توڑ دیا اور عین نازک موقع پر فوج نے سکندر کو آ سنبھالا۔ قلعہ فتح کر لیا اور یونانیوں نے تمام بچوں، بوڑھوں، مرد و زن کو تہہ تیغ کر دیا۔

کننگھم کو اصرار ہے کہ موجودہ ملتان ہی وہ شہر ہے جہاں سکندر زخمی ہوا تھا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ موجودہ ملتان دراصل ''مالی استھان پورہ'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو بعد میں ''ملی تھان'' کہلاتا رہا اور اسے البیرونی ملتانہ لکھتے ہیں۔

مورخین کا ایک گروہ کننگھم صاحب کی اس تحقیق سے اختلاف کرتا ہے سمتھ (Smith) صاحب نے اکتوبر 1903ء میں جے آر ایس میں ایک مضمون Position of the Autonomous Tribes of Punjab Conqurred by Allexander میں یہ ثابت کیا ہے کہ ملتان کے موجودہ نام اور قبیلہ ملوئی میں کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ قبیلہ کبھی بھی ضلع ملتان میں آباد نہیں رہا۔ ملوئی کیخلاف جنگ دریائے ہائیڈ ویٹز (راوی) کی وادی میں ہوئی تھی جہاں یہ لوگ اس زرخیز کوہستان کے دامن کے مالک تھے جو آجکل موجودہ ضلع منٹگمری اور جھنگ کا حصہ ہے سمتھ صاحب صاف طور پر لکھتے ہیں کہ ملوئی قوم کا وہ شہر جہاں سکندر زخمی ہوا تھا موجودہ ملتان سے اسی نوے میل شمال مشرق میں ضلع منٹگمری اور جھنگ کے اتصال پر واقع تھا اور کننگھم کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ملتان ملوئی قوم کا شہر تھا۔ سکندر ملتان کے قلعہ میں زخمی ہوا تھا یا نہیں یہ ایک مستقل موضوع ہے یون کیمرج ہسٹری میں سمتھ کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "Being in the Country of the Malinas, North of the Confuence of the akesins and dydroatos, the town can not have been Multan."

مگر یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس موضوع پر فاوچر کننگھم کی تائید کرتے ہیں وہ اپنے دلائل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ سکندر کے زخمی ہونے کا مقام بلاشبہ ملتان ہے۔

پنجاب کے دریا کثرت سے رخت بدلتے ہیں اور آج کل راوی اور چناب ملتان سے 35 میل اوپر ملتے ہیں حالانکہ چند سال پہلے راوی شہر کی دیواروں کے ساتھ بہتا تھا اسی وجہ سے سرکاری کاغذات مال میں ملتان کے جنوب مشرقی حصہ کو ''طرف راوی'' لکھا جاتا ہے یہی حال چناب کا ہے۔ 1245ء میں شہر ملتان دریائے چناب کے مغرب میں واقع تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز تک بھی جہاز ملتان تک آتے رہے تھے اور اس جگہ کا نام بندر گھٹ تھا جغرافیہ دان بتاتے ہیں کہ ایک زمانے میں یہ دریا ملتان سے پندرہ میل دور جنوب میں ملتے تھے۔ اب بھی سیلاب کے زمانے میں پانی پرانی گزرگاہ میں بہنا شروع ہو جاتا ہے اور قدیم نقشے بتاتے ہیں کہ ملتان ان دریاؤں کے درمیان واقع تھا ایک جزیرہ کی شکل میں جو دریائے راوی کی قدیم گزرگاہ کی وجہ سے مشرق زاویہ پر دریائے چناب کے ساتھ مغرب میں جاملتا تھا ملوئی قوم کا وہ شہر جس میں سکندر زخمی ہوا تھا دریا کے بیچ اسی جزیرہ میں واقع تھا۔

یونانی تذکرہ میں درج ہے کہ ملوئی قبیلہ پر حملہ آور ہونے سے پہلے سکندر ان کی بہادری کی شہرت سن چکا تھا چنانچہ اس نے اپنی فوج کو خشکی پر اتارا اور بیڑے کو دریا کے ساتھ ساتھ بڑھنے کا حکم دیا۔ خشکی کی فوج کو حکم تھا کہ وہ دریا کے ساتھ آباد قبائل کو زیر کر کے انہیں ملوئی قبیلہ کے ساتھ اتحاد سے باز رکھے بری فوج اور بحری بیڑے کو راوی اور چناب کے مقام اتصال پر جمع ہونے کی ہدایت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام اتصال ملوئی کے متذکرہ شہر سے جنوب میں واقع ہوگا۔ ملوئی کے شہر پر قبضہ کرتے وقت سکندر کو جو خطرناک تیر لگا وہ کاٹ کر نکالا گیا تھا اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے سکندر کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی چنانچہ یونانی فوج میں سکندر کی موت کی افواہ پھیل گئی تھی سکندر کی فوجی چھاؤنی ملتان سے جانب جنوب راوی اور چناب کے اتصال کے مقام پر واقع تھی سکندر نے صحت مند ہو کر اپنی موت کی افواہ دور کرنے کے لیے کشتی پر سوار ہو کر فوج کا معائنہ کیا تھا اس طرح یونانیوں کو اپنے لیڈر کو دیکھ کر تسلی ہوگئی۔ سکندر کی موت کی افواہ فوجی چھاؤنی تک اسی صورت پہنچ گئی ہوگی جبکہ یہ ہیڈ کوارٹر ملوئی کے شہر کے قبیلہ کے پاس ہی واقع ہو سمتھ کے قول کے مطابق ملوئی کا شہر موجودہ ملتان سے نوے میل شمال میں واقع ہوتا تو سکندر کا کشتی میں بیٹھ کر جانا بے سود تھا کیونکہ یونانی فوج نوے میل تک دریا کے ساتھ ساتھ کیسے موجود ہو سکتی تھی۔

صحت یاب ہو کر کشتی میں بیٹھ کر فوجی ہیڈ کوارٹر کا معائنہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ملوئی قبیل کا متذکرہ شہر راوی اور چناب کے مقام پر اتصال کے بہت قریب واقع تھا اور فاوچر اسی لے کننگھم کے اس دعویٰ کی تائید کرتا ہے کہ ملوئی شہر موجودہ ملتان ہے۔

10۔ مولوسان پولا: مشہور چینی سیاح ہیون سانگ بدھ مت کا مطالعہ کرنے ہندوستان آیا تھا وہ شورکوٹ جاتے ہوئے 10 اکتوبر 641 ق م کو ایک شہر مولوسان پولا سے گزرتا ہے۔ وہ اس شہر کا محل وقوع 900 لی سندھ کے مشرق

میں بتاتا ہے مولوسا پولا کو سنسکرت زبان میں مولستھانہ پکارتے ہیں اور کننگھم اس شہر سے ملتان مراد لیتا ہے۔ فاضل کننگھم کے اس دعویٰ پر اعتراض کرتے ہیں کہ ملتان سندھ سے مشرق میں واقع نہیں ہے سمتھ اس جگہ کننگھم کی وائرز تائید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ چونکہ اس علاقہ میں کوئی دوسرا مولستھانہ موجود نہں ہے اس لیے مولوسان پولا بلاشبہ موجودہ ملتان کا نام ہے۔ ہیون سانگ کے سفر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولوسان پولا میں ٹھہرا تھا اور یہاں سورج مندر کے ایک بت خانے کا وہ ذکر بڑی تفصیل سے کرتا ہے چونکہ مولوسان پولا میں سورج دیوتا کا مندر موجود ہے اس لیے یہ بات ہو جاتی ہے کہ ہیون سانگ کے زمانے میں ملتان کا نام مولوسان پولا تھا جسے سنسکرت زبان میں مولستھانہ کہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ملستھان پورہ بھی سنسکرت زبان کے مولستھانہ ہی سے بنا ہو۔

11۔مولتارن: ایک ہندو مورخ حکم چند اپنی کتاب تواریخ ملتان (جس کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔ ملاحظہ 8112 ,945 حکم) میں لکھتا ہے کہ راجہ مور نے جو راجہ فوزبانی دہلی کا بھائی تھا ملتان کا شہر بسانیا اور اس کا نام مولتارن رکھا۔

پنجاب پبلک لائبریری میں ایک قلمی مخطوط تذکرہ ملتان (ملاحظہ ہو........... 8112 ,945 تذفض 13) کے نام سے موجود ہے جس میں درج ہے:

''نام ایں شہر مولتارن بود۔ معنی اش بزبان ہندی قدیمی شہر است۔

بواسطہ کثرت استعمال ملتان قرار رفت''

ایران کے فاضل پروفیسر سعید نفیسی جب 1956 میں ملتان تشریف لے گئے تو ملتان اکیڈمی کی طرف سے ایک تعارفیہ پڑھا گیا:

''شہر ملتان کہ از کہن شہر ایں برصغیر است فزوں از پنج ہزار سال بہ

مقامے کہ پنج آب ہا یک جاشدہ می روند قائم است۔''

ملتان کو اپنی قدامت پر ناز ہے اور اسی قدامت کی نسبت سے مولتارن کہلاتا رہا۔

12۔ملتان: ملتان کا موجودہ نام ہمیں عرب مورخین کی زبانی ملتا ہے المسعودی ابن حوقل اور الادریسی لکھتے ہیں کہ سورج دیوتا کا مندر کا نام ملتان تھا اور یہ شہر بھی اسی مندر کے نام پر مشہور تھا عرب اسے ''فرج بیت الذہب'' یعنی سنہری سرحد کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ فتح ملتان کے وقت محمد بن قاسم کو ایک مکان سے 330 من بھارا سونا ہاتھ آیا تھا۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ ملتان مترون سے بنا ہے اور بگڑتے بگڑتے عرف عام میں مترون کی بجائے ملتان مشہور ہو گیا۔ البیرونی اسے ملی تھان سے ماخوذ کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ملی تھان بعد میں ملتانہ بنا اور زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ملتان کہلایا۔

ہیون سانگ کے مولوسان پولا سے کئی مورخین نے ملتان بننا قرین قیاس تصور کیا ہے۔ اسی طرح حکم چند موجودہ ملتان کو مولتارن کی ایک شکل قرار دیتا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی چوتھی پشت میں ایک شخص کا نام ملتان تھا۔ اس نے یہ شہر بسایا تھا اور پھر اسی کے نام سے ملتان رواج پا گیا۔

کننگھم Mula سے سورج دیوتا اور Sthana سے جگہ مراد لیتا ہے اس طرح ملتان کے معنی ''سورج دیوتا کے شہر'' کے ہوتے ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب فرماتے ہیں:

''ملتان کے لفظ میں ''تان'' یقیناً ''تھان'' اور ''استھان'' کا مخفف ہے ''مل'' میں ''ل'' اللہ کے لیے ہے۔ تمام قدیم شہروں میں لام مشترک ہے مثلاً ''بابل'' اربیل، لاسہ، لاہور وغیرہ۔ اب سوال رہ گیا ہے ''میم'' کا کیا مطلب ہے ''مہیش یا متھرا کے لیے ہوگا بہرحال ملتان کا مطلب ہے ''بیت اللہ'' یا اللہ کا استھان۔

بابل ...... باب ایلو (ایلو، ایلو بابا اللہ ہے)

اربیل ...... اربعہ ایلو ہے (چار دیوتا)

لاسہ ...... ''سہ'' کے معنی بیت کے ہیں ''لا'' اللہ کے لیے ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ہماری رائے ہے کہ موجودہ ملتان کی وجہ تسمیہ Topographical ہے ملتان دو سنسکرت الفاظ Mula اور Sthana کا مرکب ہے Mula سے مراد جڑ ہوتی ہے یہاں mula کا استعمال مجازی معنوں میں کیا گیا ہے اور اس سے مراد مرکزی جگہ یا وسطی شہر ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ملتان زمانہ قبل از تاریخ سے تجارتی اور سیاسی لحاظ سے کلیدی اور مرکزی شہر رہا ہے اور اس امتیاز کے لحاظ سے ملتان نے اس پورے برصغیر کی تاریخ مرتب کرنے میں گہرا دخل حاصل کیا ہے بلکہ ملتان نے اس پورے برصغیر کی تاریخ کو بار بار متاثر کیا ہے۔

(تاریخ ملتان: پانچ ہزار سال قبل مسیح سے دورِ حاضر تک۔
چوہدری کرم الٰہی بدر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ)



شیخ اکرام الحق ایڈووکیٹ

تعارفِ ملتان

چوں وزی صبحدم نسیمِ سحر
خبرِ من مولتان برساں
(عراقی)

پرانے پنجاب کے پانچ دریاؤں کے سنگم کے قریب 74 طول بلد اور 41 عرض بلد کے انقطاع پر چناب دریا کے موڑ کی گولائی میں ابنائے آدم کا ایک معمورہ ملتان کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے محلِ وقوع کی کیفیت اور آب و ہوا کی خاصیت نے عناصرِ حیات کی تنومندی کی ایسی ضمانت دی کہ اس شہر کو استقرار اور استمرار نصیب ہو گیا۔

ابتداء شہر اور اس کا محافظ قلعہ دریائے راوی کے دو جزیروں پر سطح آب سے ایک سو پچاس فٹ پر واقع تھا۔ مگر کئی سو سال ہوئے دریائے راوی نے اپنا رُخ بدل لیا۔ اور اگرچہ ساڑھے پانچ سو سال پہلے امیر تیمور کے وقت تک شہر کے پاؤں میں بہتا رہا مگر اب شہر سے شمال مغرب کی طرف تیس میل کے فاصلے پر تعجب انگیز سیدھ میں بہتا ہے۔ البتہ آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ پرانے قلعہ کی مشرقی دیوار میں ایک سو فٹ نیچے سطح زمین کے برابر ایک حوض کی دواریں دھنسی ہوئی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شاخِ دریا کے کنارے پانی کا ذخیرہ فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا ہو گا۔ یہی نہیں بلکہ شہر کی مشرقی سمت ''طرف راوی'' کے نام سے اس کی یاد تازہ رکھتی ہے۔

یوں تو فرزندانِ آدم کی سکونت زمین کے ساتھ ساتھ ملتان کا وجود بصورتِ میسان مفروض ہے۔ مگر اس سے قطع نظر اگر اسے دنیا کے قدیم ترین شہروں سے شمار کیا جائے تو بے جا نہیں۔ اتنے لمبے عرصہ میں نہ صرف اس نے کئی نام بدلے بلکہ اس کے اوصاف کا نقشہ مختلف لوگوں نے مختلف پہلوؤں سے کھینچا۔ جہاں ایک صاحب دل کی زبانِ حق بیان نے اسے جنت کے برابر ٹھہرایا۔ افواہِ عوام نے اس کی توصیف کا طغراء چار گاف سے لکھا۔ حضرت بہاء الدین زکریا نے تو یہ فرمایا کہ:

ملتانِ ما بہ جنتِ اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

مگر عوام نے یوں پکارا

چہار چیز است تحفۂ ملتاں
گرد و گرما گدا و گورستاں

بہرحال ملتان کی قدامت سے کسی کو انکار نہیں۔ ابو ریحان محمد البیرونی اپنی مشہور کتاب ''الہند'' کا لندن ایڈیشن ص 155 میں لکھتے ہیں کہ بارھویں صدی ہجری میں ان کے قیامِ ملتان کے دوران یہاں کے متوطن اس کو دو لاکھ سال پرانا شہر سمجھتے تھے۔ علم تاریخ اس شہر کی آغوش میں آنکھیں کھولی ہیں۔ پہلے کے وقائع تو روایات میں مستور ہیں۔ اتنا مسلم ہے کہ جب آرین قوموں نے سطح مرتفع پامیر سے اتر کر پہلے پہل وادئ سندھ میں قدم رکھا تو انہوں نے ملتان کو آباد پایا۔ اور یہ استیلا کا زمانہ آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے مانا جاتا ہے۔

ملتان کی بناء کے متعلق کئی روایات ہیں۔ ہندوؤں کی دیو مالا کے مطابق اسے برہما کے لڑکے کشپ نے آباد کیا اور اس کا نام کشپ پور رکھا۔ کشپ ہندوؤں کے نزدیک بارہ ادیتاؤں یا سورج دیوتاؤں کا باپ تھا۔ جس کی بدولت ہندوستان میں سورج کی پرستش نے رواج پایا۔ کشپ پور کے نام کی تصدیق بطیلموس کے بیان سے ہوتی ہے جو کشپ پورہ کو راوی (رہاوس) کے گولاوی میں آباد بتلاتا ہے۔ کشپ کا سب سے چھوٹا لڑکا پرہلاد خدا کے وجود کا قائل تھا اور اس پاکیزہ عقیدہ کی وجہ سے اس کے عہد میں ملتان نے پرہلاد پورہ نام پایا۔ مگر اس کے بعد اس کے پوتے بنا کے مخالف سنبہ نے اس کا نام سنب پورہ کر دیا اور سورج کی پرستش کو دوبارہ رائج کر کے اسے بہت فروغ دیا۔ اس نے سونے کا ایک نہایت خوبصورت بت سورج دیوتا کی یاد اور عبادت کے لیے بنایا جسے ادیتہ استھان نامی مندر میں رکھا۔ سنسکرت کی پرانی کتابوں میں ملتان کے لیے کشپ پورہ اور سنب پور کے ساتھ ساتھ ہنس پور اور بھاگ پور کا نام بھی آیا ہے۔ مگر ادیتہ دیوتا کے مندر کے اجراء کے بعد یہ شہر مول استھان پورہ کہلایا اور اس کے سند ہیون تسانگ کی تحریر سے ملتی ہے جو اس کا نام ''مولو سان اپولو'' لکھتا ہے۔ جس کا ترجمہ موسو ودین سینٹ مارٹن نے ''مولا استھان پورہ'' کیا ہے۔ سنسکرت میں مولا کے معنی اصل کے ہیں اور استھان جگہ کو کہتے ہین۔ مولا کا ایک متبادل لفظ وردھنا ہے جو سورج کا ایک نام ہے چونکہ تمام روشنی کی جائے ''اصل'' قرصِ آفتاب ہے اس لیے اس نسبت سے مول ستھان نام ہونا اغلب ہے۔ البیرونی بھی اس وجۂ تسمیہ کی تائید کرتا ہے۔ مولا استھان کا مولتان اور ملتان بن جانا عین قرینِ گفتگو ہے۔ عام خیال کہے کہ مولتان کا نام ''مالی استھان'' تھا۔ اور یہ اس لیے کہ سکندر کے وقت میں یہاں ہندوؤں کی ایک شاخ مالی آباد تھی، غلط ہے۔ مالی قوم آج سے دو ہزار سال پہلے سکندر کے حملے کے وقت آباد ضرور تھی، مگر نام کیا دیتی۔ ان کا زمانہ تو ملتان کی قدامت کا عشر عشیر بھی نہیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرح یہاں اُبھرے، بسے اور خاک میں مل گئے۔ البتہ یہ امکانات سے ہے کہ چونکہ ''مولا'' اور ''مالی'' میں صرف اصوات کا ہیر پھیر ہے، اور مالی برسرِ اقتدار بھی تھے۔ اس لیے تعلی کی رو میں مولا استھان کو مالی استھان کہہ دیا کرتے ہوں۔

نام میں ملتان کے گرچہ ہوئیں تبدیلیاں
جتنے صیاد آئے بدلا کیں قفس کی تتلیاں

صیاد بھی ایک نہیں سینکڑوں آئے۔ کسی تواریخی جگہ کی دلآویزی وہاں کی مٹی اور مسالحہ سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ ان تاریخی واقعات سے ہوتی ہے جن کی یاد اس جگہ کو ایک جامہ پہنا کر رنگ دیتی ہے۔ ملتان کی جاذبیت اور انفرادیت اسی یاد سے وابستہ ہے۔

وہور کے دھند لکے میں ان یادوں میں سب سے نمایاں ادیتہ دیوتا کے اس بت کی یاد ہے جس کی وجہ سے مولتان نے نام پایا۔ یہ بت صدیوں تک قائم اور ان طلائی تحائف کی رعایت سے جو اس بت پر چڑھائے جاتے تھے۔ ملتان ''بیت الذہب'' کہلایا ابن الاثیر کا بیان ہے۔

وکان بلد الملتان تهدى اليه الا مورل ويحج من البلاد ويحلقون رؤسهم ولحاهم عندهٗ و يزعمون ان صنمهٗ هو ايوب النبى عليه السلام

یعنی: ملتان کے بت کی طرف مال و متاع ہدیہ کے طور پر لاتے اور لوگ دور دراز سے حج کے لیے اسی جگہ آتے۔ اپنے سر اور داڑھی کے بال منڈواتے اور یہ سمجھتے کہ مندر میں جو بت ہے وہ ایوب نبی کی تمثیل ہے۔

ملتان کے سنہری بت کا ذکر ''بھاوش پران'' نامی سنسکرت کی بہت پرانی کتاب میں ہے۔ مگر سب سے پہلا تاریخ نویس جس نے اسے دیکھا چینی سیاح ہیون تسانگ تھا جو 641ء میں ملتان میں آیا۔ اس نے شہر ملتان کو پانچ میل کے محیط میں پایا اور متھرا (سورج دیوتا) کے سنہری بت کو عمدہ اور قیمتی کپڑوں میں ملبوس دیکھا۔ متعدد عرب سیاحوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ابو زید سیرانی (264ھ/ 886ء) کتاب الہند والصین ابن رستہ (290ھ/ 902ء) نے اعلاق النفسیہ میں اور ابو القاسم ابن خردابہ (300ھ/ 912ء) نے کتاب الاتالیم میں مسعودی (303ھ) نے مروج الذہب میں، ابن مہلل (331ھ)، اصطخری (340ھ)، ابن حوقل (370ھ) نے اپنے سفر ناموں میں اور بشاری مقدسی (375ھ) نے احسن التقاسیم میں، اور ابن ندیم (377ھ) نے فہرست میں اس صنم اور صنم کدہ کے حالات بالتفصیل بیان کئے ہیں۔ اصطخری اور ابن حوقل اور ابن ندیم اس بت کو شکل انسان کا مظہر۔ چرمی لباس، دربر، تاز زریں برسر دیکھا۔ اس بت کی خوبصورتی کی رعایت سے اور اس وجہ سے کہ محمد بن قاسم فاتح ملتان کو یہاں سے ایک پنڈت کے مندر کا خفیہ راستہ کے انکشاف کے نتیجہ پر دوسوتیس من سونا اور ایک ہزار تین سو دو من خاکِ طلاء ملی جس کی بدولت وہ بیت المال خلافت میں حسب وعدہ اس رقم کا دگنا ادا کر سکا جو اس کو اس کے چچا حجاج بن یوسف نے فوج کشی کے لیے دی تھی۔ وہ اس بت کی تخریب سے باز رہا اور خلفائے امیہ کے عہد میں یہ بت جوں کا توں رہا۔ بلکہ ملتان کے مسلمان حکمرانوں کو ایسا یرغمال فراہم کر دیا جس کی بربادی کا خوف دلا کر وہ کفار

حملہ آوروں کو روکا کرتے تھے۔

دوسو اسی سال بعد مسلم بن شیبان اسماعیلی (374ھ) نے اس بت اور ابن قاسم کی جامع مسجد دونوں کو نذر آتش کر دیا۔ اس وقت یہ بت چوبیں تھا۔ خالص سونے کا بت دوسو سال بعد کس طرح لکڑی کا بن گیا یہ ایک معمہ ہے جس کا حل کسی حاکم وقت کے ہوسِ زر میں ہی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ البیرونی کے وقت 1130ء میں یہ بت یا مندر موجود نہیں تھا۔ مگر غزنوی خاندان کے زوال پر ہندوؤں نے تھوڑے عرصے کے لیے ملتان پر پھر غلبہ پا لیا۔ اور بت اور مندر کو اپنی پہلی جگہ پر از سرِ نو قائم کر دیا۔ چنانچہ الادریسی اپنی کتاب نزہت المشتاق فی افتخار الآفاق (1130ء) میں اس بت کا ذکر بھی کرتا ہے۔ زکریا القزوینی بھی جو 1263ء میں ملتان آیا اپنی کتاب آثار البلاد و اخبار العباد میں اس مندر کا ذکر کرتے ہوئے اسے ہندوؤں کے مکہ سے تشبیہہ دیتا ہے۔ آخری بار 1666ء میں فرانسیسی سیاح تھیونیو (Thevinot) نے ادیتہ دیوتا کے مندر کو دیکھا جو اس کے جلد بعد اورنگ زیب کے عہد میں مسمار کر دیا گیا۔

اس آدیتہ دیوتا کا مستقر کہاں تھا؟ اصطخری اور ابن حوقل اور دیگر سیاحوں نے اسے شہر کے گنجان آبادی میں اہل حرفہ کے محلہ کے قریب بتایا ہے۔ جنرل کننگھم نے 1853ء میں اس مندر کے اجڑے ہوئے آثار دیکھے اور اصطخری اور ابن حوقل کی بتائی ہوئی جگہ کی توثیق کی۔ بعدہٗ جنرل کننگھم نے 73-1872ء میں پرانے قلعہ پر بھگت پرہلاد کے مندر کے نزدیک جو اب بھی موجود ہے متعدد جگہ عمیق کھدائی کرائی جہاں سے مختلف سطحوں پر مختلف سکے دستیاب ہوئے جن کا زمانہ 500ء کا پایا گیا۔ جن پر آدیتہ دیوتا کی تصویر نقش تھی۔ جس سے نہ صرف مقام آدیتہ استھان کی تصدیق ہوئی بلکہ اس کی ہمہ گیر پرستش کی بھی توثیق ہو گئی۔

سب سے پہلا حملہ آور جو ملتان پر قابض ہوا وہ مصر کا بادشاہ اسیرس (Osiris) تھا۔ مصر دنیا کی قدیم ترین سلطنت، اور مصر کا اولین بادشاہ Menes نوع انسان کا پہلا حاکم سمجھا جاتا ہے۔ اسیرس نے ہندوستان کے باشندوں کو تہذیب کے راستے پر لگایا۔ انہیں زراعت سے روشناس کیا اور اجتماعی اور مدنی زندگی سکھائی۔ انہیں نیک کاموں کی وجہ سے دیوتا مانا گیا اور ہندوؤں کے ایشور کی شکل میں دوام پا گیا۔

کلیسائی تاریخ کے بانی پامفلی کے کہنے کے مطابق اٹھارویں صدی قبل مسیح میں مصر کے بادشاہ سائیرس (قوروش) نے ہند پر حملہ کیا اور گنگا تک پہنچا اور ملتان میں دوسرے شہروں کی طرح ایک مینار قائم کیا۔ جس پر فتح کے نشانات کھدوائے اور کلدانی علم نجوم کو رائج کیا جب آرین ملتان میں آئے تو اس وقت اسیریا پر بابل کی حکومت تھی۔ بعد میں بابل مغلوب ہو کر اسیریا کا حصہ بن گیا اور نینس (Ninus) جس نے نتویہ کا شہر آباد کیا اسیریا عظمیٰ کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس کی وفات کے بعد نویں صدی قبل مسیح میں سامی رامس (Semi Ramis) اس کی جانشین ہوئی اور اس کے بعد اسیریا کے آثار پر میڈیا کی طاقت ور سلطنت وجود میں آئی جس کے پہلے شہنشاہ قلمرو میں ملتان کا علاقہ شامل تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے وسط میں وحشی تاتاری ہندوکش کی پہاڑیوں سے اترے اور سندھ کی وادی کو برباد کرنا شروع کیا۔ شاہ میڈیا نے سخت لڑائیوں کے بعد انہیں شکست دی اکثر مارے گئے۔ جو باقی بچے وہ خانہ بدوش

حالت میں وادیٔ سندھ میں گزین ہو گئے۔ ان میں سے ایک حصہ مساگت کی اولاد سے تھا جو بعد میں گت یا جٹ کہلایا اور ملتان کے نواح اور پنجاب میں خوب پھلا پھولا۔ تاتاری وحشی سفید ہن کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کی ایک شاخ وادیٔ سندھ پر قابض تھی۔ جس کا دارالخلافہ ملتان تھا۔ ان کا اثر اس علاقہ پر مدتوں رہا حتی کہ ولادتِ مسیح کے چھ سو سال بعد ملتان کے نزدیک کہروڑ کے مقام پر ایک بہت بڑی جنگ میں ان کو شکست ہوئی جس سے ان کا قلع قمع ہو گیا۔

پہلا شاہِ فارس جس نے ہند پر حملہ کیا جمشید کا بیٹا فریدوں تھا۔ جو ساتویں صدی قبل مسیح میں برسرِ اقتدار تھا۔ اس کے بعد سائرس، افراسیاب اور پھر دارا اول ملتان کے حاکم رہے اور اب تک مہا بھارت کے صفحات پر ان کے نام ثبت ہیں۔ مگر ملتان پر وہ حملہ جو اذہانِ عاوم پر سب سے زیادہ مرتسم ہے سکندر اعظم کا ہے۔ قسمت کے اس کھلونے نے محکوم دنیا کا اکثر حصہ فتح کرنے کے بعد ولادتِ مسیح سے تین سو تیس سال قبل جوانی کے عالم میں ہندوستان کا رخ کیا اور کابل اور ٹیکسلا کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا۔ مگر اس کے عساکر اس کے عزائم کا ساتھ نہ دے سکے اور راوی کے کنارے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ بساطِ تمنا کہ مہرے جواب دے چکے تو ناچار سکندر کو واپس ہونا پڑا سکندر نے راوی سے مڑ کر ملتان کا رخ کیا۔ جہاں براہمہ کی ایک قوم مالی نام آباد تھی جو جنگجو اور آزاد تھی۔ ان دنوں دریائے راوی شاخوں میں بٹ کر شہر کے اردگرد بہتا تھا اور شہر کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ شہر کی آغوش میں قلعہ اور چاروں طرف فصیل اس پناہ دہی میں ممد و معاون تھے ان دفاعی انتظامات کی مضبوطی حملہ آور کے آڑے آئی۔ سکندر نے حکم دیا کہ شہر پناہ کی دیوار کو سیڑھی لگا کر سر کیا جائے۔ تیروں کی بارش ہو رہی تھی کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی مگر قدرت اپنا آلۂ کار بے صلاحیت یا بے وجہ افتخار پیدا نہیں کرتی۔ سکندر نے دفعتاً ایک سپاہی سے سیڑھی چھینی اور خود فصیل پر چڑھنے لگا۔ شمشیر زنی کے کمالات دکھاتا نیچے کود گیا نزدیک کے ایک برج سے تیر چلا جو نشانے پر بیٹھا اور سکندر کی ڈھال کو چیرتا ہوا سینے میں پیوست ہو گیا حملہ آور فوج اپنے بادشاہ کی مثالی جرات دیکھ کر بہت متاثر ہوئی اور بادشاہ کو زخمی دیکھ کر ان کا ولولہ جنون کی حد کو پہنچ گیا اور وہ کشت و خون ہوا کہ خدا کی پناہ۔ شہر ملتان کا جنوب مشرقی کونہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا اب بھی طرف راوی کے کنارے ''خونی بُرج'' کے نام سے مشہور ہے۔ سکندر کی فوج نے مالی قوم کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور قلعہ کو آگ لگا دی جنرل کننگھم کی پچاس فٹ کے قریب گہری کھدائی پر دو فٹ موٹی تہہ راکھ کی ملی۔ جس نے اس واقعہ کی تصدیق کر دی۔

سکندر اعظم کے بعد اس کی سلطنت جرنیلوں میں تقسیم ہوئی۔ یہ علاقہ سلوکس کی قلمرو میں شامل تھا۔ یونانی تسلط کی کمزوری پر چندر گپت اور اس کا بیٹا اشوکا برسرِ اقتدار آئے۔ مؤخر الذکر کے وقت میں بدھ مت اور پراکرت زبانیں اس خطہ میں آئیں۔ ولادتِ مسیح سے ڈیڑھ سو سال پہلے باختر اور پراتھیا کے بادشاہوں نے ملتان پر وقتاً فوقتاً تصرف کیا مگر بعد میں اقوام ستھیا جن میں سے سفید ہن بکرماجیت کی فتوحات کے باوجود 550 عیسوی تک یہاں ساہ و سفید کے مالک رہے۔

خسرو پرویز (شیریں اور کوہکن کی شہرت کے حامل) نے بھی ملتان پر عارضی قبضہ کیا اور اس کی سند اس سکہ سے ملی جو جنرل کننگھم کو دستیاب ہوا۔ جس پر بادشاہ کی تصویر مع پرانی تاج بنی ہوئی تھی اور سال جلوس 37=626ء کنندہ تھا۔

ہندوؤں نے جلد اپنی طاقت کو منظم کر کے وادیٔ سندھ اور ملتان پر تسلط قائم کر لیا۔ اور 631ء میں چچ برہمن ملتان پر تصرف تھا۔ جس کے نام پر مشہور اور مستند تاریخ سندھ چچ نامہ لکھی گئی۔ ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب نیر اسلام کی ضیا پاشی عرب اور بیرون عرب کو منور کر رہی تھی۔ راجہ داہر کا خاندان وادیٔ سندھ اور ملتان پر قبضہ کیے ہوئے تھا۔ عرب تاجروں سے سمندری قزاقوں کی چند جھڑپیں ہوئیں اور عرب جرنیل ابن مہلب 44ھ میں ملتان تک گھس آیا مگر مستقل قبضہ نہ کر سکا قدرت اس خطۂ ارض کو اسلام کے نام لکھ چکی تھی اور انقراضِ اقتدارِ ہنود محمد بن قاسم کی قسمت بن چکا تھا۔ چند سال بعد ایک ایسے قزاقانہ حملے کے دوران ایک غریب لڑکی نے حجاج بن یوسف کو امداد کے لیے پکارا اور جب اس کی رپورٹ گورنر کوفہ حجاج کو پہنچی تو اس نے اپنی مسند سے پکارا ''لبیک'' اور خلیفہ ولید بن عبدالمالک سے ایک انتقامی لشکر بھیجنے کی اجازت لے کر اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو کفارِ سندھ کی سرزنش پر مامور کر دیا۔ جو 95ھ حملہ آور ہوا اور سندھ فتح کرتا ہوا ملتان پہنچ گیا۔ اور شہر سے تین میل دور پڑاؤ کیا۔ جو مقام اب بھی اس کے نام کی رعایت سے ''قاسم بیلا'' کہلاتا ہے۔ بلاذری فتوح البلدان میں لکھتا ہے کہ محمد بن قاسم نے اپنی مشہور منجنیق ''عروس'' دریائے راوی کے شمال میں نصب کر کے قلعہ پر گولہ باری کی۔ ان دنوں دریائے راوی شہر کے اردگرد بہتا تھا۔ اور اس کی موجیں لاہوری اور بوہڑ دروازہ کے قدموں میں رقص کرتی تھیں (بَن لوہاراں اب بھی اس کی یاد لیے ہوئے ہے) اس لیے وہ جگہ جہاں ''عروس'' ٹھہری موجودہ ''نواں شہر'' کے قریب تھی۔ حاکم ملتان گوڑسنگھ عم زاد راجہ داہر کشمیر بھاگ گیا اور ملتان فتح ہو گیا۔ پیشتر اس کے محمد بن قاسم ہندوستان کی طرف رجوع کرتا۔ کلک تقدیر جنبش میں آئی اور وہ ناگفتنی وجوہات کے باعث معزول کر دیا گیا اور ایک حاکم سفلی کے بہیمانہ حکم کی تعمیل میں خود اپنی جان حاکمِ ازلی کے سپرد کرتے ہوئے اپنی عالی حوصلگی اور عظمت کا نشان اوراقِ عالم پر ثبت کر گیا:

کس پائمالِ آفتِ افسردگی مباد

دیروز ریگ بادیہ آئینہ خانہ بود

ہندو عہد کا سب سے پرانا نشان پرہلاد مندر کا مندر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پرہلاد نے خود بنایا۔ یہ مندر پرانے قلعہ کی سطح مرتفع پر بنا ہوا ہے اور حضرت شیخ بہاء الحق کی خانقاہ سے ملحق ہے مندر کے نیچے زمین کے پیٹ میں کشادہ روشیں ہیں مندر میں ایک مخروطی شکل کا ستون ہے جس کے پہلو میں نرسنگھ اوتار کی مورتی رکھی جاتی تھی اور ہندو روایت یہ ہے کہ پرہلاد کشپ کا لڑکا تھا جس کے نام سے ملتان شروع میں آباد ہوا۔ کشپ کو برہما نے غیر فانی قرار دیا تھا اور وہ اس زعم میں اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا۔ پرہلاد اس سے منکر اور اصلی خدا کا قائل تھا۔ کشپ نے اپنے لڑکے کو سزا دینے کی خاطر سونے کا کھوکھلا مخروطی ستون بنوایا جو اندر سے آگ سے گرم کیا گیا اور پرہلاد کو اس سے

باندھ دیا گیا۔ پرہلاد کی اذیت سے متاثر ہو کر نرسنگھ اوتار ظاہر ہو گیا اور سونے کے گرم ستون کو مٹی کی طرح ٹھنڈا کر دیا راجہ کشپ کو قتل کر کے بھگت پرہلاد کو تخت پر بٹھا دیا۔

دوسرا آثار ادیتہ دیوتا کی پرستش سے رکھتا ہے۔ سورج کنڈ (تالاب) کے نام سے مشہور شہر ملتان سے تین میل دور ہے۔ یہ تالاب 132 فٹ قطر میں دس فٹ گہرا تھا۔ دیوان ساون مل نے اس کے گرد دیوار بنوا دی ہندو روایت کے مطابق نرسنگھ اوتار نے یہاں پانی پیا۔

تیسرا قدیم آثار مندر تو تلاں مائی ہے جو حرم دروازہ کے اندر واقع ہے جس کو ہندو نرسنگھ اوتار سے منسوب کرتے تھے۔ ایک اور قدیم آثار مندر جوگ مایہ کے نام پر ہے جس کی دوبارہ تعمیر دیوان مول راج کے وقت میں ہوئی۔ اور جس کی تاریخ منشی غلام حسن نے کہی:

زدیوان والا نسب مولراج
کہ باد از او چشم بد خواہ دور
شد ایں نقشۂ جوگ مایہ تمام
بخوبی ازیں جلوہ گاہ ظہور
چو تاریخ سالش بہ جستم زول
زمین دل کشا استان حضور

جنرل کننگھم کی تحقیقات کا نتیجہ یہی ہے کہ موجودہ ملتان اسی جگہ قائم ہے جہاں مالی قوم کے زمانہ میں تھا۔ انہوں نے ایک کنواں مندر پرہلاد کے نزدیک 1864ء میں کھدوایا۔ دس فٹ کی گہرائی پر معز الدین کیقباد (89-1286ء) کا ایک سکہ اور کاشی کاری کے ٹکڑے ملے۔ یعنی ڈیڑھ فٹ کی خاکستر نے تقریباً ایک صدی کی نشاندہی کی۔ بارہ فٹ مزید نیچے سری سمنتا دیوا (زمانہ 900ء، 950ء) کے سکے اور روغنی اینٹیں ملیں۔ پندرہ سے بیس فٹ کے عمق پر سرخ رنگ کی راکھ کی دو فٹ کی تہ اور بڑی اینٹوں کے ٹکڑے پائے گئے جو 750، 700ء کے قریب کا زمانہ تھا۔ اور محمد بن قاسم کے حملہ سے مطابقت کرتا ہے تیس سے پینتیس فٹ کی گہرائی پر پھر دو فٹ موٹی سیاہ راکھ اور جلی ہوئی مٹی، ریشم کاتنے کا گولہ، موچی کی پتھری اور تانبے کے دو سکے ملے۔ یہ گہرائی 300 سال قبل مسیح کا زمانہ بتلاتی ہے جو سکندر اعظم کے شہر سوز پر حملہ سے مطابقت کرتا ہے۔ چالیس فٹ نیچے یعنی آٹھ سو سال قبل مسیح یا تقریباً تین ہزار سال پہلے قدرتی مٹی تھی۔ اینٹوں کی ساخت نے بھی دلچسپ انکشاف کیا کہ مغل وقت کی اینٹیں چھوٹی، پٹھانوں کے عہد کی دگنی اور بدھ مت (اشوکا) کے زمانہ کی اس سے بھی بڑی تھیں۔

تودۂ خاک، جس پر ملتان کا شہر بنا ہوا ہے صدیوں، بلکہ قرنوں کی راکھ اور مٹی اسے نیچے لیے ہوئے ہے۔ شہر کے چاروں طرف فصیل جس کا محیط تین میل کے قریب ہے شہزادہ مراد بخش نے بنوائی شہر کا دائرہ ہیون تسانگ او الفنسٹن دونوں نے پانچ میل کے قریب بتایا ہے جب راوی شہر کے گرد گھومتا تھا تو اس کے پار ماڑی سیتل کے مقام

سکہ کا قلعہ تھا جواب معدوم ہے ملتان کا قلعہ ہشت پہلو تھا اور ڈیڑھ میل کے قریب زمین گھیرے ہوئے تھا۔ اس کے 46 برج اور چار دروازے مشرق میں کی دروازہ، غرب میں دیتہ دروازہ (سورج مندر کے نام پر) شمال میں خضری دروازہ (خضر خان تیموری گورنر کے نام پر) اور درمیان میں ریڑھ دروازہ (نشیب کی وجہ سے) اب یہ قلعہ باغ ابن قاسم ہے جہاں سبزہ زار بنے ہوئے ہیں۔

اسلامی عہد

محمد بن قاسم نے ملتان کی حکومت خلیفہ ولید کے پوتے داؤد بن نصر کے سپرد کر دی۔ جس نے ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی اور یہ خانوادہ بنو منبہ کے لقب سے دو سو سال ملتان پر حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد بنو سامہ نے عروج حاصل کیا اور ایک سو سال مزید ملتان پر فرمانروائی کرتے رہے۔ 372ھ میں العزیز باللہ امام فرقہ اسماعیلیہ اور خلیفہ حکومت فاطمیہ مصریہ نے جلم بن شیبان کو ملتان بھیجا۔ جہاں اسماعیلی داعیوں نے ریشہ دوانیوں سے پہلے ہی زمین ہموار کر رکھی تھی۔ عوامی خروج ہوا اور جلم بن شیبان نے فاطمی خلیفہ کا خطبہ رائج کر دیا۔ ادیتہ کا بندر اور ابن قاسم کی مسجد مسمار کر دیئے گئے۔ عرب میں عبداللہ قرامطی زور پکڑ گیا تھا ان کا اصول یہ تھا کہ نتیجہ اسباب مہیا کرتا ہے جائز و ناجائز کا سوال نہیں۔ اسی قسم کے اصول ملتان میں بھی برتے جانے لگے۔ حتیٰ کہ جلم کے پڑپوتے ابوالفتح داؤد کی خلافِ شرع حرکات نے سلطان محمود غزنوی کو اکسایا اور (1111ء) میں اس نے یورش کر کے ملتان کو برباد کر دیا۔ اسی زمانہ یعنی 1150ء کے قریب شاہ یوسف گردیز ملتان آئے اور ملتان کی آبادی کی بحالی ان کی رہینِ احسان ہے۔

سلطان محمود کے حملہ کے باوجود قرامطہ پورے طور پر مغلوب نہ ہوئے اور سمراء کے سایۂ عاطفت میں دوبارہ استیلا پا گئے۔ اور آخر کار 1202ء میں شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں ختم ہوئے۔ ملتان اب تخت دہلی کے تابع ہوا۔ مگر یہ نسبت درحقیقت برائے نام ثابت ہوئی۔ عملاً یہاں کے حاکم خود مختار رہے۔ 1202ء سے 1227ء تک ناصر الدین قباچہ کی عمل داری تھی جو سلطان محمد غوری کا غلام اور قطب الدین ایبک کا داماد تھا۔ انہیں دنوں منگول سمرقند سے اٹھے اور وسطی ایشیا کو روندتے چلے گئے۔ اس طغیان کفر کے خلاف جلال الدین محمد خوارزم شاہ کی آخری اسلامی نہ ٹھہر سکی۔ خوارزم شاہ بھاگتا ہوا اٹک پہنچا۔ پیچھے منگول لشکر تعاقب میں تھا۔ گھوڑے سمیت دریا میں چھلانگ لگا دی اور پار اُترا۔ مگر والیٔ ملتان قباچہ نے اس کی امیدوں کا ساتھ نہ دیا بلکہ مخالف اور اسے واپس جانا پڑا۔

قباچہ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے التمش کی تلوار کو دعوت پیکار دی۔ فوجیں مقابلے میں آئیں تو ناصر الدین دریائے سندھ پار کرتے ہوئے ڈوب گیا اور ملتان میں التمش کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ نو سال بعد التمش مر گیا۔ اس وقت کے والیٔ ملتان کبیر خاں نے پہلے تو رضیہ سلطانہ کو تخت دلوانے کی سازش کی اور جب وہ کامیاب ہو گئی تو منہ موڑ لیا۔ رضیہ سلطانہ نے چڑھائی کی اور ملتان پر قبضہ کر لیا۔ مگر منگول عساکر پیہم وبالِ ملتان بنے رہے۔

جب زمامِ سلطنت دہلی غیاث الدین بلبن کے ہاتھوں میں آئی تو اس نے اپنے لڑکے محمد سلطان کو

1270ء میں ملتان کا حاکم مقرر کیا اور اس کے ہمرکاب اشہر مشاہیرِ ہند امیر الشعراء امیر خسرو آئے جو پانچ سال یہاں رہے۔ 1284ء میں مغلوں نے دوبارہ ملتان پر حملہ کیا۔ شہزادہ محمد سلطان لڑائی کے دوران اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو گیا اور دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ امیر خسرو بھی پکڑے گئے اور دو سال قید رہے۔ انہوں نے شہزادوں کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے وہ شدتِ تاثیر اور شکوہِ الفاظ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ نمونۃً ایک شعر ہے

بسکہ آبِ چشم خلقے شد رواں دو چار سُو
پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

اپنی اسیری کا ذکر کرتے ہوئے مثنوی قرآن السعدین میں لکھتے ہیں:

من کہ برس تمی نہادم گل
بار برسر نہاد و گفتا ''چُل''

ملتانی میں ''چُل'' کا معنی ہے ''چلو''۔ گلستانِ امیر خرو کے اس پھول سے تمدن ملتان کی بہار کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

ملتان کی حکومت ملک جلال الدین فروز کے سپرد ہوئی جو امنگوں کا مالک تھا۔ دہلی پر چڑھائی کی اور تخت نشین ہو گیا۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد قتل ہو گیا اور اس کے بھتیجے علاؤ الدین خلجی نے اس کے بچوں کو ملتان سے پکڑوا کر اندھا کرا دیا۔ 1305ء کے قریب غازی بیگ تغلق حاکم ملتان ہوا اور مغلوں سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما رہا۔ اس نے بادشاہت کا اعلان کر کے سلطان غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کیا اور ملتان کی جامع مسجد پر کتبہ کندہ کریا جسے ابن بطوطہ نے 1334ء میں پڑھا اور اپنے سفر نامہ میں محفوظ کر لیا۔ کتبہ کی تحریر کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

''میں نے تاتاریوں سے 29 بار قتال کیا اور ان کو مار بھگایا۔ اس لیے میرا نام ملک الغازی ہے۔''

ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق ان دنوں ملتان میں کسٹم ڈیوٹی یا چونگی کا رواج تھا اور تاجر کو اپنے مال کا چوتھائی حصہ دینا پڑتا تھا۔ مگر بعد میں یہ محصول معاف ہو گیا۔ ابن بطوطہ کافی عرصہ یہاں رہا اور اس نے وہ واقعہ بھی دیکھا کہ محمد تغلق کے بھتیجے کی نعش جس کی کھال چچا کے حکم سے اتروا دی گئی تھی ملتان پہنچی تو بہرام ابیہ کشلو خان نے دفن کرا دیا۔ محمد تغلق نے ناراض ہو کر ملتان پر حملہ کر دیا۔ کشلو خان مارا گیا قاضی شہر کی کھال اتروائی گئی اور کشلو کا سر دروازے پر آویزاں کیا گیا۔ اس صدی کے اواخر تک یعنی پچاس ساٹھ سال میں متعدد حاکم ہوئے جو پتلیوں کی طرح سٹیج پر آتے اور جاتے رہے۔ حتیٰ کہ 1397ء میں امیر تیمور نے ملتان پر تاخت و تاراج کی اور خضر خاں کو حاکم مقرر کر کے چلا گیا۔ تیمور کے جانے کے بعد محمود تغلق نے دہلی میں پھر اپنی طاقت کو مجتمع کرنے کی کوشش کی اور خضر خاں پر فوج کشی کی مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور خضر خاں نے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ شاہانِ سادات کی بنا ڈالی۔ ملک محمد حسین عماد الملک امیر ملتان مقرر ہوا اور بعد ازاں بہلول لودھی نے جو ملتان میں پیدا ہوا اس کی جگہ لی۔ خاندان سادات نے 38 سال دہلی اور توابعات پر حکومت کی۔ مگر نظم و نسق میں استحکام پیدا نہ ہوا۔

ملتان نے 1437ء میں باالتفاق رائے شیخ یوسف کو جو حضرت شیخ بہاء الدین کی اولاد میں سے تھے امارت کے لیے منتخب کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا۔ اس زمانے رائے سہرا لنگاہ کا ملتان کے نواح میں اثر و رسوخ تھا اور اس میں مزید اضافہ کی غرض سے اس نے اپنی لڑکی شیخ یوسف کے عقد میں دے دی۔ اس وجہ سے قلعہ میں اس کی آمد و رفت بے روک ٹوک ہونے لگی۔ 1445ء میں ایک روز جبکہ وہ وہاں ٹھہرا تھا خاموشی کے ساتھ ایک بکری کو ذبح کر کے اس کا خون پی گیا اور تھوڑی دیر بعد پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے درد و کرب کا مظاہرہ کرنے لگا اور اسی کر رہا تھا کہ سب لوگ ہراساں ہو گئے۔ حکیم بلائے گئے۔ دوائیاں دی گئیں قے ہوئی تو خون نکلا۔ لگوں نے سمجھا کہ اس کی حالت نازک ہے اس کے دوسرا اور اقربا بلائے گئے کہ آخری دفعہ مل لیں چنانچہ اس کے بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ چونکہ رائے سہرا نے پہلے سے یہ منصوبہ بنایا ہوا تھا اُٹھ کھڑا ہوا پہرہ داروں کو قتل کر دیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ شیخ یوسف بھاگ گیا رائے سہرا نے قطب الدین لنگاہ کا لقب اختیار کیا اور خود مختاری کا اعلان کر دیا اور 1469ء تک حکومت کی اور ملتان میں لنگاہ خاندان کی عملداری کی بنیاد ڈال دی۔

قطب الدین کی وفات کے بعد سلطان حسین لنگاہ ملتان کا حاکم تھا۔ یہ علم دوست اور تدبیر کیش تھا۔ اس نے نہ صرف حدودِ سلطنت کو وسعت دی بلکہ علم کی بہت قدر دانی کی اس کے وقت ملتان میں ایک یونیورسٹی قائم ہوئی جو غالباً موجودہ انگریزی مینار کے عقب میں واقعہ تھی صدیقۃ الاقاسم میں ہے کہ ایک دفعہ اس نے اپنا سفیر گجرات بھیجا تو اس نے واپسی پر وہاں کی تعمیرات کی بہت تعریف کی جس پر شاہ حسین لنگاہ مغموم ہوا تو وزیر نے کہا اگرچہ آپ کے ہاں اس قدر پُر شکوہ عمارات نہیں مگر آپ کے ہاں علوم کی اتنی فراوانی ہے جس کا جواب نہیں۔ سلطان حسین نے تیس سال حکومت کی اور آخری ایام میں اپنے بیٹے سلطان فیروز کو تخت پر بٹھایا۔ مگر وہ وزیر عماد الملک کی سازش سے لقمۂ اجل ہوا تو سلطان حسین لنگاہ نے عماد الملک کو مروا دیا اور اپنے پوتے سلطان محمود کو ولی عہد مقرر کیا۔ اس زمانے میں ظہیر الدین بابر نے بھی ہندوستان کو فتح کرنے کی غرض سے ہنگامہ آرائی شروع کر دی تھی۔ اس سلطان محمود کو چین نصیب نہ ہوا۔ اور 1528ء میں اس کی وفات کے دو سال بعد مرزا ارغون مغل نے ملتان پر قبضہ کر لیا لاہوری دروازہ توڑ دیا گیا۔ اور تاریخ فرشتہ کے مطابق قتل و غارت کی حد کر دی شہر ویران ہو گیا اور ایک نفس بھی زندہ نہ بچا۔ اُدھر شاہ ظہیر الدین بابر نے دہلی فتح کر کے حسنِ انتظام کی بدولت ایک مؤثر حکومت قائم کر لی اور ملتان کو بھی ایک گونہ امن نصیب ہوا۔ مگر جب ہمایوں کا ستارہ گرہن میں آیا تو 1541ء میں ملتان بھی شیر ساہ سوری کی گرفت میں آ گیا۔ اس بادشاہ کو چونکہ رفاہی کاموں کا شوق تھا اس نے اہم مزارات حضرت بہاء الدینؒ، حضرت رکنِ عالمؒ، حضرت یوسف گردیزؒ کے ساتھ ساتھ مسجدیں بنوا دیں۔ ملتان از سرِ نو آباد ہوا۔ مالگزاری کے موجودہ نظام کی بنیاد پڑی اور فتح جنگ خاں گورنر مقرر ہوا۔ دس سال بعد جب سید علی مصنف مراۃ المما لک ملتان سے گزرا تو اس نے مرزا حسین کو یہاں کا فرمانروا پایا۔ اگلے پچاس سالوں میں محمد قاسم خاں، خان جہان لودی، عبدالصمد خاں اور مرزا عبدالرحیم خانِ خاناں جاگیردار ملتان رہے۔ شاہ جہان کے زمانے میں شہزادہ مراد بخش والیٔ ملتان بنا تو اس نے موجودہ فصیل لاہوری دروازہ

کے باہر (اس مقام پر جہاں اب گھنٹہ گھر بنا ہوا ہے) دریا پر گچکاری کا ایک پل بنوایا۔ قلعہ ملتان کی دوبارہ مرمت کرائی اور نواح میں بہت سا بنجر علاقہ آباد کرایا۔ جب وہ دکن تبدیل ہو گیا تو شہزادہ اورنگ زیب کو ملتان کی جاگیر ملی۔ تھوڑے عرصہ بعد اورنگ زیب قندھار کی مہم پر مامور ہوا تو ملتان کی جاگیر دارا شکوہ کے نام ہوئی۔ اور سید فتح علی الملقب بہ نواب شیخ موسیٰ پاک دین 1068ھ میں اس کے نائب مقرر ہوئے۔ جب اورنگ زیب نے اپنے عالمگیری عزائم کی پیش رفت میں اپنے باپ شاہ جہان کو قید کر دیا اور بھائیوں کے درپے ہوا تو دارا شکوہ سے جنگ ہوئی۔ دارا پر نام کی نحوست غالب آئی شکست کھا کر ملتان کے راستہ سندھ کی طرف بھاگ گیا۔ اورنگ زیب تعاقب میں یہاں آیا تو گورنر موسیٰ کو بلا کر پوچھا ''دارا بے شکوہ کجا رفت؟'' شیخ موسیٰ نے جواب دیا۔ ''ایں باشکوہ اینجا آمدہ بود ولیک بے دستوری رفت، رفت!'' اورنگ زیب اس بات پر خفا ہو گیا اور شیخ موسیٰ کو معزول کر کے قید کر دیا مگر بعد میں عمائدین کی منت سماجت پر چھوڑ دیا۔ لشکر خاں، تربیت خاں اور پھر سیف خاں تھوڑے عرصے کے لیے ناظم ملتان ہوئے۔ حتیٰ کہ شہزادہ معظم جاہ جاگیردار مقرر رہا۔ اور پھر اورنگ کا پوتا فخر الدین جو بعد میں جہاندار شاہ کے لقب سے تخت دہلی پر بیٹھا اس صوبہ کا حاکم رہا۔ جہاندار شہ۔ فرخ سیر اور محمد شاہ رنگیلا کی حکومتِ دہلی کے زمانے میں 1700ء سے 1750ء تک مختلف صوبیدار ملتان میں رہے۔ جن میں بجز نواب عبدالصمد خاں دوسرے کسی اختصاد کے مالک نہ تھے۔ عبدالصمد خاں نے اپنے عہد میں عظیم الشان مسجد (عید گاہ) تعمیر کرائی عبدالصمد کے بعد اس کا بیٹا زکریا خاں اور پھر شاہنواز خاں اس علاقہ کے حاکم رہے۔ مگر 1752ء میں معین الدین عرف میر منو گورنر لاہور نے کوڑا مل دیوان کو شاہنواز خاں کے خلاف بھیج دیا۔ لڑائی میں شاہنواز مارا گیا اور کوڑا مل حاکم بن گیا۔ مگر احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور ملتان میں احمد شاہ ابدالی کے نام کا سکہ رواں ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کو ملتان سے نسبت خصوصی حاصل ہے۔ اس کا والد ہرات سے ہجرت کر کے ملتان آ گیا تھا اور احمد شاہ ابدالی یہیں پیدا ہوا۔ اس کی جائے ولادت اس شاہراہ کے کنارے متعین کی گئی ہے جو اب ابدالی روڈ کے نام سے اس کی یاد تازہ کرتی ہے۔

نام کو تو ملتان کا صوبہ قلمرو کابل میں شامل ہو گیا مگر دراصل قسمت آزما پٹھان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر قابض تھے، موجودہ ضلع ملتان کا نصف حصہ سدوزئی پٹھان کے اقتدار میں تھا اور باقی نصف نوابانِ بہاولپور کے ماتحت تھا۔ حکام بہاولپور اجارہ کے طور پر کچھ رقم سکھ سرداروں کو ادا کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے میر منو کی پیش کش صلح قبول کر لی اور میر منو نے علی محمد خان کو والیٔ ملتان مقرر کر دیا۔ علی محمد خاں کو نوابانِ بہاول پور کی تقلید میں علاقہ کی آب پاشی کی طرف توجہ دلائی اور اپنے بھائی کے نام نالہ ولی محمد خاں کرایا جو موجودہ وسیع تر شہر کے وسط سے گزرتا ہے اور عدم انتظام کے باعث متعفن پانی کا ناسور بنا ہوا ہے۔ علی محمد خان نے چوک بازار میں ایک عالی شان مسجد بنوائی۔ جو اب بھی پہلی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ اگرچہ علی محمد خاں کو میر منور نے مقرر کیا تھا مگر احمد خاں ابدالی کی طرف سے ملتان کی صوبہ داری زاہد خاں کے نام تھی۔ چونکہ زاہد خاں پر حکومت دہلی شک کرتی تھی اس لیے میر منو نے کوڑا مل کو اس کے اور شاہنواز خاں کے خلاف بھیجا تھا۔ زاہد خاں مر گیا تو احمد شاہ ابدالی نے اس کے بیٹے شجاع خاں کے

نام پروانہ حکومت بھیج دیا۔ مگر علی محمد خاں نے شجاع خاں کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ احمد شاہ ابدالی کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ شجاع خاں کو آزاد کرایا اور علی محمد خاں کا پیٹ پھڑوایا اور اس کی لاش کو اونٹ پر لاد کر ملتان کی گلیوں میں پھروایا۔

شجاع خاں پھر ناظم ملتان ہو گیا۔ قصبہ شجاع آباد اس کے نام پر آباد ہے۔ تھوڑے عرصہ بعد حاجی شریف سدوزئی دربارِ کابل سے حاکمِ ملتان نامزد ہوا۔ شجاع خاں نے اپنے گماشتہ دھرم داس کو اس کے حکم کے برخلاف چارہ جوئی کے لیے کابل بھیجا۔ مگر دھرم داس نے الٹا اپنی تقرری کا فرمانِ شاہی حاصل کر لیا۔ مگر تقدیر کی نیرنگیاں عجیب ہیں۔ بے وفا بھی بیوفائی کا شکار ہوا۔ دھرم داس کا معاون شریف بیگ تکلہ جس کو حاجی شریف کے پاس فرمانِ شاہی کے ساتھ بھیجا گیا۔ مؤخر الذکر کو نکالنے میں تو کامیاب ہو گیا مگر اپنے آقا دھرم داس سے منکر ہو گیا اس کو غداری کی سزا یہ ملی کہ ایک روز یہ عید گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ سکھوں کا ایک جتھہ عید گاہ میں داخل ہو گیا اور شریف تکلو کو بغیر فرار کے نہ بن آئی اور تلمبہ میں پناہ لی۔ شجاع خاں نے افواجِ بہاول پور کی مدد سے سکھوں پر حملہ کیا اور شہر ملتان دوبارہ فتح کر لیا مگر 1776ء میں مر گیا۔ اور اس کا بیٹا مظفر خاں صوبیدار ملتان بنا۔

مظفر خاں کو پہلے دن سے سکھوں سے واسطہ پڑا۔ اور آخر جون 1818ء تک ان سے برسرِ پیکار رہا۔ اس دوران میں سکھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ہدایت یا قیادت میں آٹھ بار حملے کئے پہلے تین حملوں میں نذرانہ وصول کر کے واپس چلے گئے۔ چوتھے حملے میں اڑھائی لاکھ روپے سالانہ خراج کے وعدہ پر صلح ہو گئی۔ پانچواں اور حملہ خراجِ موعود کی وصولی کے سلسلہ میں وقوع پذیر ہوئے۔ ساتواں حملہ بھوانی داس کی سرکردگی میں ناکام ہو گیا۔ آٹھواں حملہ فیصلہ کن تھا۔ فروری 1818ء میں شروع ہوا نواب مظفر خاں نے جہاد کا اعلان کیا مگر چنداں کامیابی نہ ہوئی۔ شہر فتح ہو گیا اور نواب قلعہ میں محصور ہو گیا چار ماہ گولہ باری ہوتی رہی۔ مشہور توپ زمزمہ (جو لاہور کی مال روڈ پر دعوتِ نظارہ دیتی ہے) منگوائی گئی۔ وہ ایک من کا گولہ پھینکتی تھی۔ اس سے قلعہ کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ مگر محصورین کی ہمت سے بند کر لیے گئے۔ تاہم رسد کی کمی کی وجہ سے ان پر عرصہ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ بہت سے گھبرا کر ساتھ چھوڑ گئے صرف دو تین سو سپاہی رہ گئے۔ 4 جون 1818ء کی صبح کو سادھو سنگھ کی سرکردگی میں ایک جمعیت قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی اور سکھ قلعہ پر قابض ہو گئے۔ ادھر مغربی دروازے کی جانب سے سکھ فوج نے عام حملہ کر دیا نواب مظفر خاں نے اَسی سال کی عمر میں اپنے آٹھوں بیٹوں سمیت بکف مقابلہ کیا مگر قسمت ہار چکی تھی۔ پانچ بیٹوں سمیت مارا گیا۔ چھٹے کو مہلک زخم آیا۔ باقی دو بیٹوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ شہر میں لوٹ مار اور مظالم کی انتہا ہو گئی۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو نقصان یا تکلیف سے محفوظ رہا ہو۔ نواب مرحوم کا مزار حضرت بہاء الحق کے مزار کے احاطہ میں واقع ہے جس پر یہ شعر کندہ ہے:

شجاع ابن شجاع و حاجی
امیر ملتاں زہے مظفر

چوں سرخ رُو شدیہ سوئی جنت
بگفت رضاں بیا مظفر
(1233ھ)

تیس سالہ سکھ عملداری کا سب سے اہم اور سب سے مشہور ناظم دیوان ساون مل ہے۔ اس کی انصاف پروری اور حسنِ انتظام ضرب المثل ہے۔ سرقہ اور خصوصاً سرقہ مویشی بہت حد تک مسدود تھے۔ اس واقعہ سے دیوان کی عدل گستری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ اس کے مشیر اور ندیمِ خاص نے ایک نوجوان سارق کو جو خوبصورت تھا سفارش کی تو دیوان نے اس کو ندیم خاص کے دروازے کے سامنے پھانسی پر لٹکوا دیا۔ دیوان ساون مال نے ملتان شہر میں عمارت کچہری، باغ عام خاص، تالاب سورج کنڈ، شوالہ پل ولی محمد، تالاب بُدھلہ سنت وغیرہ تعمیر کرائے۔ مگر ستمبر 1844ء میں ایک سپاہی کے ہاتھوں جسے اس نے سخت سست کہا تھا، دیوان گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا دیوان مول راج ملتان کی حکومت پر مامور ہوا۔ ان ہی دنوں سکھ سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور انگریز پنجاب پر قابض ہو گئے۔ دیوان مولراج کی تقرری کی توثیق کر دی گئی اور بیس لاکھ روپیہ سالانہ نذرانہ مقرر ہوا۔ مگر مولراج کی ریزیڈنگ سے نہ بنی۔ اور سردار کاہن سنگھ کو ناظم مقرر کیا گیا۔ مسٹر انز ایگنیو اور لیفٹیننٹ اینڈرسن اس کے مشیر مقرر ہوئے۔ پانچ سو سکھ سپاہیوں کی معیت میں یہ افسران 16 اپریل 1848ء کو ملتان پہنچے اور عید گاہ میں قیام پذیر ہوئے۔ 19 اپریل 1848ء کو دیوان مولراج قلعہ کی چابیاں کاہن سنگھ کے حوالے کرنے کی غرض سے انگریز نائبین کے ہمراہ عام خاص کی بارہ دری آیا تو صدر دروازہ کے قریب وانز ایگنیو اور دیوان مولراج کے گھوڑے آپس میں لڑ پڑے جس پر دیوان کے ملازم نے دوسرے گھوڑے کو چابک مارا۔ مسٹر وانز ایگنیو نے اس ملازم پر تلوار کا وار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سواروں نے ایگنیو پر حملہ کر کے اسے گھائل کر دیا۔ مسٹر اینڈرسن نے بھاگنے کی کوشش کی تو مگر وہ بھی بری طرح زخمی ہوا۔ دونوں زخمیوں اور کاہن سنگھ نے عید گاہ میں پناہ لی مگر جانبر نہ ہوئے۔ لیفٹیننٹ ایڈورڈ اور کرنل کورٹ لینڈ جو بہاولپور کی طرف تھے اطلاع ملنے پر امداد کے لیے پہنچے۔ 18 جون 1848ء کو یعنی فتح واٹرلو کے دن یہاں بھی انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی اور مولراج کا بیرونی تحفظ ٹوٹ گیا۔ دیوان نے شہر میں پناہ لی جھڑپیں ہوتی رہیں مگر فیصلہ کن نتیجہ نہ نکلا۔ 30 دسمبر کو ہدف شکن گولہ باری سے بارود کی میگزین اڑ گئی جس سے ایسا دھماکہ ہوا کہ کئی میل تک زلزلہ محسوس ہوا۔ شہر کا بڑا حصہ منہدم ہو گیا۔ یکم جنوری 1849ء کو خونی برج کے مقام پر بہت بڑا شگاف ہو گیا اور عام حملہ شروع ہو گیا۔ سکھ فوج شگاف کی مدافعت نہ کر سکی اور خونی برج پر سے پہلے انگریز یونین جیک نصب ہوا۔ خونی برج ایسے اختصاص نحوست کا حامل ہے کہ ملتان کی دو ہزار سالہ تاریخ میں دونوں مرتبہ یونانیوں اور انگریزوں کی صورت میں جب غیر ملکی افواج نے ملتان پر قبضہ کیا تو خونی برج نے ان کے قدموں کو بوسہ دیا۔ شہر تو سر ہو گیا مگر قلعہ ابھی باقی تھا۔ دیوان مولراج نے 21 جنوری 1849ء تک مقاومت کی مگر لاحاصل آخر 22 جنوری کو اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اسیر لیفٹیننٹ اینڈرسن اور وانز ایگنیو کے قتل کے الزام میں کورٹ مارشل میں مقدمہ چلا جس میں وکیل صفائی (جو ایک

انگریز فوجی افسر تھا) نے دیوان مولراج کے حق میں وہ شہرۂ آفاق تقریر کی جو ادبی شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ دیوان مول راج کو موت کی سزا دی گئی جو حبس دوام میں تبدیل کر دی گئی اور وہ کلکتہ بھجوا دیا گیا۔

انگریزی عملداری میں امن وامان کی وجہ سے شہر نے بہت وسعت پائی۔ مگر ابھی سو سال پورے نہ ہو پائے تھے کہ ملتان کی تقدیر نے پلٹا کھایا اور 14 اگست 1947ء کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں ملک تقسیم ہو جانے پر ملتان پاکستان کے پرچم ستارہ و ہلال کے سایہ میں آ گیا۔

ملتان شہر کے چھ دروازے ہیں۔ دہلی گیٹ، دولت گیٹ، لاہوری گیٹ، بوہڑ گیٹ، حرم گیٹ اور پاک گیٹ۔ پرانے زمانے میں چار گیٹ اور بھی تھے جو قلعہ کی جانب کھلتے تھے۔ دیہہ گیٹ، سکی گیٹ، ہرہری گیٹ اور خضری گیٹ مگر انگریزوں کے وقت مسمار کر دیئے گئے۔ شہزادہ مراد بخش کی تعمیر شدہ شہر کی فصیل 1170ء میں علی محمد خاں نے دوبارہ مرمت کرائی مگر انگریزوں نے اونچائی کو کم کرا دیا۔ انگریز افسروں کی رہائش کے لیے عید گاہ سے لے کر حضوری باغ (جسے دیوان ساون مل نے لگوایا تھا) تک کوٹھیوں کا سلسلہ قائم ہوا۔ مگر وہ نئی چھاؤنی بننے سے اجڑ کر گر گئیں۔ فقط پیلی کوٹھا اور موجوہ کچہری رہ گئی۔

اسلامی عہد کی یادگار عمارات حسب ذیل ہیں:

قبور نوگزہ

ملتان کے مختلف محلوں میں لمبی قبریں ہیں۔ جو جنرل کننگھم نے پندرہ کے قریب شمار کیں اور جن کی لمبائی نو گز سے لے کر اٹھارہ گز تک پائی گئی۔ ان میں چند ایک تو اب بھی موجود ہیں۔ دہلی دروازہ کے بہر پیر غور کی قبر 12 گز لمبی ہے۔ محلہ جال ویڑھا موسیٰ کی قبر نوگز ہے۔ جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ محمد بن قاسم کے ہمراہیوں کی قبریں ہیں جو عقیدتاً لمبی بنا دی گئی ہیں۔

مسجد علی محمد خان

یہ مسجد 1757ء میں نواب علی محمد خان نے بنوائی۔ اس مسجد کے ساتھ وضو کے لیے بہت بڑا تالاب ہے اور آمدنی کے لیے متعدد دکانیں وقف ہیں۔ اس کے دروازے پر یہ اشعار کندہ ہیں۔ جن میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں پہلے قاضی وقت کی عدالت ہوتی تھی۔ جہاں مجرموں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔

بہ فضلِ ایزد و نبی آخر زماں
بہ یمن حضرت جیلاوے غوث ہر دو جہاں
بجائے شحنۂ بازار بہر بزم فساد
کہ بُد چبوترہ در جرم و ظلم عیاں
بنائے مسجد و حمام و چاہ و حوض عجیب

بساخت برسرِ بازار ناظم ملتاں
برائے سال بنائش زغیب ہاتف گفت
نمود مسجد عالی علی محمد خاں

مسجد پھُل ہٹاں والی

یہ مسجد فرخ سیر بادشاہ کو منسوب کی جاتی ہے جو 18-1713ء میں سربراہ ہندوستان تھا۔ کہتے ہیں ایک فقیر کی دعا سے اسے اولاد نصیب ہوئی جسے اس نے اسی ہزار روپیہ انعام کے طور پر دیا فقیر نے یہ مسجد بنوا دی۔ اور گل فروش دکانوں کی رعایت سے یہ نام پڑا۔

باغ عام خاص

شہزادہ مراد بخش نے دیوانِ خاص منعقد کرنے کی غرض سے بنوایا۔ دیوان ساون مل اور مولراج یہاں کچہری کرتے تھے۔ جس مقصد کے لیے ایک بارہ دری تعمیر کرائی گئی۔

شیش محل

آج کل کمشنر ہاؤس ہے۔ نواب مظفر خان نے اسے اپنی رہائش کے لیے بنوایا تھا۔ (نوٹ: اب یہاں پر دل کا ہسپال ہے)

مزار شاہ یوسف گردیزی

یہ اس مقام پر واقع ہے جہاں سید یوسف گردیز سے آکر 1088ء میں کنارۂ دریا پر متمکن ہوئے۔ روغنی اینٹوں کی عمدہ عمارت ہے جس کی چھت میں چھوٹے آئینے بیل بوٹوں کی طرح لگے ہوئے ہیں۔ روضہ پر یہ اشعار کندہ ہیں جو کرامات کی ایک عوامی روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

دانی سوار شہر کہ در دست مار کرد
مخدوم شاہ یوسف اینا قرار کرد
اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغِ مقبلاں ہرگز نمیرد
شاہ "یوسف" تولدش می درن
"شاہ گردیز" را وصال نجواں
557ھ 462ھ

مگر دونوں تواریخ غلط ہیں۔ صحیح تاریخ ولادت 450ھ اور تاریخ وفات 531ھ ہے۔

مزار حضرت بہاء الدین زکریا

یہ مزار اندر سے 51 فٹ مربع ہے اور اوپر ہشت پہلو دیواریں اونچائی سے نصف تک ہیں، جن پر قبہ نما چھت قائم ہے۔ یہ مزار 1848ء کے محاصرہ میں بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ اور مسلمانوں نے اسے پھر بنوایا۔

مزار شاہ رکن عالم

یہ لاثانی عمارت باعثِ افتخار ملتان ہے۔ قلعہ کے دیہہ دروازہ کی جانب اونچی جگہ پر واقعہ ہے۔ اندرون 51 فٹ 9 انچ کے قطر میں ہے۔ دیواریں 40 فٹ 4 انچ اونچی ہیں اور 13 فٹ 3 انچ موٹی ہیں اور زاویہ پر ڈھلوانی ستونوں سے مستحکم ہیں۔ ایک کے اوپر دو مثمن عمارتیں ہیں۔ بالائی مثمن کا قطر 25 فٹ 8 انچ اور اونچائی 26 فٹ 10 انچ ہے۔ تمام عمارت قُبہ سے متصف ہے۔ قطر 58 فٹ ہے۔ سالم عمارت کی اونچائی ایک سو فٹ ہے۔ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ہے جس کے باہر روغنی اینٹوں سے پچی کاری اور بروج سے تزئین ہے۔ روغنی اینٹوں پر پھول پتی کی سطح اُبھری ہوئی ہے۔ جس سے خوبصورتی دوبالا ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عمارت کا ثنیٰ بنایا جا سکتا ہے مگر اس کی ساخت کا تکرار نہیں ہو سکتا۔ اس یہ نادر روزگار ہے۔ یہ روضہ دراصل غیاث الدین تغلق نے اپنے لیے بنوایا مگر وہ ایک حادثہ میں دہلی میں لقمۂ اجل ہوا تو اس کے بیٹے جونا خاں سلطان محمد تغلق نے یہ روضہ شاہ رکن الدین کی تدفین کے لیے دے دیا۔ جن سے اس کو ایک خاص واقعہ کی وجہ سے عقیدت تھی۔

مزار شاہ شمس تبریز

دولت گیٹ کے باہر باغ عام خاص کے شمال مشرق میں یہ مزار مرجع خلائق ہے سبز گنبد کی یہ عمارت نہایت خوبصورت فنِ تعمیر کا نمونہ ہے۔

مزار بی بی پاک دامن

بی بی راستیؒ کا مزار ہے جو ابوالفتح رکن الدین شاہ رکن عالمؒ کی والدہ تھیں۔ اور فرغانہ کی شہزادی تھیں۔ یہ عمارت تیس فٹ اونچی مربع شکل کی عمارت ہے نیلے رنگ کی چمکدار روغنی اینٹوں سے جسے کاشی کہتے ہیں بنی ہوئی ہے۔

ملتان کی آب و ہوا

سرما میں خوشگوار اور معتدل ہے۔ اور گرما میں سخت گرم۔ پھل گرد و نواح میں بکثرت ہوتے ہیں۔ جن میں سے اَنب (آم) لذت اور شیرینی میں مثال نہیں رکھتا۔ اور کھجور بھی خوش ذائقہ اور کافی مقدار میں ہوتی ہے۔

مصنوعات

مصنوعات ملتان نے اوائل زمانہ سے شہرت پائی۔ اصطخری اپنے سفر نامہ میں ہاتھی کے دانت کی اشیاء کا ذکر کرتا ہے۔ جس کے لیے ایک خاص بازار مقرر تھا۔ یہ صنعت اب بھی ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے وقت میں یہاں

کے کجاوے مشہور ہوئے۔ منوچہری دامغانی نے اپنے ایک قصیدے میں کہا۔

تو گوئی یکے عمل مولتانی!

کاشی کی اینٹوں کی صنعت ملتان کے ساتھ مخصوص رہی ہے اور اب بھی موجود ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے وقت میں اس کو فروغ ہوا۔ نقش کاری اور پارچہ بافی بھی یہاں کے مخصوص کاموں میں سے ہیں۔

یہ تھی ملتان کی تاریخ کی ایک جھلک جو دہور کے دھند لکے میں اجاگر ہوئی۔ حکومت تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے جو مشیت ایزدی کی غیر معین شعاعوں میں اُبھرتی بنتی اور مٹتی ہے۔ خاکِ ملتان نے تین بادشاہوں، احمد شاہ، محمد تغلق اور بہلول لودھی کو جنم دیا۔ مگر جس چیز نے ملتان کو ایک مستقل اور معزز مقام عطا کیا وہ روحانی اور عرفانی علومِ تصوف اور الہیات میں اضافہ ہے۔ جن افاضل اور اکابر نے ملتان میں رہ کر اپنے لمحات عرفان سے اقطاع عالم مستنیز کیا اور اس ارض پر اپنے آثار کو چھوڑ گئے۔ وہ چالیس سے اوپر ہیں۔ کہاوت میں ملتان پیروں سے پُر ہے۔ مگر ان سب کے حالات اس خاکہ کی وسعت سے باہر ہیں۔ چند کے اسمائے گرامی تبرکاً گنوائے جاتے ہیں۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا، شاہ رکن الدین عالم، حضرت شاہ یوسف گردیز، حضرت شاہ شمس سبزواری تبریزی، شاہ دانہ شہید، بی بی راستی، شاہ حسین آگاہی، حضرت موسیٰ پاک شہید، حافظ محمد جمال اللہ، منشی غلام حسن، میاں عبدالحکیم۔

انہی کی بدولت ہے

ملتانِ ما بہ جنتِ اعلیٰ برابر است
آہستہ پابنہ کہ ملک سجدہ می کنند



شبیر بخاری

ملتان اور سکندر اعظم

سرزمینِ ملتان (مولی استھان) کو دنیا کے قدیم ترین تاریخی مقامات میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مقام صدیوں سے ایک بین الاقوامی تجارتی مرکز ہے۔ بین الملّی علمی اور ثقافتی زندگی کا محور ہے۔ اور عالمی تہذیبی اور تاریخی روایات کا مرقع ہے۔ اس کے ذرے ذرے میں ممتاز اقوام عالم کی کشور کشائیوں کے تذکرے محفوظ ہیں۔ اس کی ایک ایک خشت تاریخِ ہستی کی سرنوشت ہے۔ اس کا ہر دور تِلکَ الایَّامُ نُدَاوِلُھَا بَینَ النَّاس کی تفسیر ہے۔ اور

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی کتاب اُدھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

سکندر اعظم (پیدائش 356، وفات 323 ق م) 336 قبل مسیح میں اپنے باپ قلب والئے مقدونیہ کے قتل کے بعد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ وہ ایک غیر معمولی عزمِ جہانگیری سے سرشار ہو کر تھبیز اور فارس میں معرکہ آزما ہوا۔ 334 میں گرانی کس کی جنگ جیتی ایشیائے کوچک فتح کیا۔ سلیشیا کو مغلوب کیا۔ ایسس (Issus) ٹرائے اور غازہ کا کامیاب محاصرہ کیا۔ اربیلا (Arbala) بابل، سُوسا (Susa) پیریس پولس کی مہمات سر کیں اور سوگدی آنا (Sogdiana) اور باختریا کو پامال کر کے کوہ ہندوکش کو عبور کیا اور 327 ق م میں پنجاب پر چڑھائی کی۔ پورس مقابلے میں صف آراء ہوا لیکن تاب نہ لا سکا۔ سکندر اعظم برصغیر ہند پر یلغار کے ارادے سے دریائے ستلج تک جسے ان دنوں (Hyphasis) ہائے فے سز پر لشکر کشی کی۔ لیکن اسی کے جفاکش عسکری مسلسل مصروف پیکار زندگی سے اُکتا گئے تھے ان میں بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ سکندر کو وہیں سے مراجعت کرنا پڑی۔ طے پایا کہ لشکری ہائے فیسز کے پہاڑ کے ساتھ ساتھ سندھ کی جانب روانہ ہوں۔ انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہائے فی ایشن اور دوسرا حصہ کرائٹیر س کی قیادت میں ہو۔ بحریہ کی کمان نیئر کس کے ہاتھ میں ہو۔ یہ لشکر نہایت شان و شوکت سے فتح و کامرانی کا پرچم لہراتا ہوا جب ملتان کے مضافات میں پہنچا تو اسے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش کا سامنا ہوا۔ اس علاقہ میں ان دنوں دو قومیں آباد تھیں ایک ملی یا ملوئی اور دوسری آکسی ڈریکائی۔ یہ قومیں بے حد سخت کوش اور مہم جو تھیں۔ اول الذکر سے سخت مڈبھیڑ ہوئی پہلا معرکہ کارزار تلمبہ کے قریب گرم ہوا جس میں ملوئی قبیلہ کے پانچ

ہزار سے زیادہ افراد کام آئے۔ اور ایک بڑی تعداد شہر چھوڑ کر مولتان کی جانب بھاگ کھڑی ہوئی سکندر نے اس کا تعاقب کیا۔ مورخین عالم کا اتفاق ہے کہ مہم کو سر کرنے کے لیے سکندر کو سر دھڑ کی بازی لگانا پڑی۔

''الیگزینڈر دی گریٹ'' کے مولف اے آر برن۔ ''دی سٹوری آف نیشنز'' کے مولف جان پنٹ لینڈ، ''ہسٹری آف گریس'' کے مولف وڈ ہارس'' اور ''گریک ہسٹری'' کے مورخ ایڈمنٹرز کے نزدیک اگر بروقت امداد نہ ملتی تو اس مہم میں سکندر اعظم کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔

اس وقت کا مولتان وقائع نگار کا کہنا ہے کہ...... ایک اہم مرکزی شہر تھا اس کی سرسبزی اور شادابی کا چرچا تھا۔ شہر میں بے شمار باغات تھے۔ تجارت کی گرم بازاری تھی اور شہر کے چاہروں طرف شہر پناہ تھی۔ سکندر کا لشکر اس شہر پناہ کے باہر رکا۔ مالی قبیلے کے لوگ شہر میں محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ سکندر نے پنکسٹس کے ساتھ مل کر شہر پناہ میں راخنہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن پہلے دو روز مطلق کامیابی نہ ہوئی۔ اگلے روز البتہ وہ ایک چھوٹے سے دروازے کے ذریعے شہر پناہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس کا جنرل پنکسٹس پیچھے رہ گیا۔ محصورین میں بھگدڑ مچ گئی اور انہوں نے ایک مندر میں پناہ لی۔ عسکریوں نے زینے سنبھال لیے۔ لیکن دیوار پر چڑھنے میں دشواری ہوئی۔ الیگزینڈر نے جوش میں آ کر ایک زینہ لیا اور اکیلا دیوار پر چڑھ گیا۔

اس کے فوراً بعد پنکسٹس اس ڈھال کے ساتھ دیوار پر پہنچ گیا جو سکندر نے الین کے مندر سے حاصل کی تھی اور بڑے مقدس سمجھی جاتی تھی۔ پنکسٹس کے بعد لیوناٹوس جو باڈی گارڈ کا انچارج تھا اور اس کے متصل ہی ابریاس جو سکندر کا جاں نثار تھا۔ سکندر دیوار سے مندر کے اندر کودا اور نہایت بے جگری سے دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا۔ اس معرکہ میں ابریاس کام آیا اور سکندر سخت زخمی ہوا۔

اس کے بعد گھمسان کا رن پڑا کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ زخمی سکندر کو نرغہ اعداء سے باہر لایا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ کوس (Kos) کا مشہور معالج (Kritodemos) ہمراہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ ہمراہ نہ تھا اور اس کی بجائے پنکسٹس نے سینے میں پیوست تیر باہر نکالا۔ خوان کا فوارہ پھوٹ بہا۔ سکندر پر غشی کا عالم طاری ہو گیا۔ اور یہ کیفیت متواتر گیارہ دن رہی۔ اس دوران جب اسے ہوش آتا تو کبھی اپنے استاد ارسطو کو یاد کرتا جس کے بارے میں وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ

''باپ مجھے آسمان سے زمین پر لایا تھا۔ استاد زمین سے آسمان پر لے گیا!''

خطراتِ حیات سے متنبہ کرنے والے ارسطو کے وہ الفاظ ہمیشہ اس کے کانوں میں گونجتے رہے جو اکثر وہ اسے نصیحت کے طور پر کہا کرتا تھا۔

اس کے رفقاء اسے لطیفوں اور کہانیوں سے بہلانے کی کوشش کرتے کبھی وہ انہیں سن کر ہنستا اور کبھی متاسف ہوتا۔

وہ دیو جانسن کلبی کا ذکر کرتا جس کی علمی اَنا اس کی عسکری اَنا سے ہر وقت متصادم ہوئی ...... اور سب سے زیادہ مضطرب اس لیے ہوتا کہ وہ اپنے فلسفے کو دنیا بھر میں عام نہ کر سکا۔

بالآخر اس کا معالجہ مقامی دواؤں سے ہوا اور وہ شفایاب ہو گیا۔ ملتان میں اسے ایک بہادر قوم کا سامنا کرنا پڑا۔ اس علاقے میں اس نے اپنی قومی زندگی نقوش اُبھارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ قرین قیاس ہے کہ خونی برج کے نزدیک اس کے محبوب جاں باز ابریاس کی قبر تھی۔

خونی برج کے ماحول میں آج بھی ان ہتھیاروں کی جھنکار سنی جا سکتی ہے جو آج سے دو ہزار سال قبل دو متصادم قوموں کی معرکہ آرائی سے پیدا ہوئی اور جو اس حقیقت کی تفسیر تھی۔

ال الملوک اذا دخلوا .... الخ



صادق جعفری

ملتان سبھ صورت ہے عین ظہور

ہوائی جہاز پر کراچی سے ملتان آئیں تو کچھ پہلے فضا میں ایک گڑھا ہے جسے پائلٹ خطرناک ائر پاکٹ کہتے ہیں۔ یہاں ہوا کا دباؤ عام طور پر کم ہوتا ہے جس سے جہاز ہچکولے لینے لگتا ہے۔ ملتان آ گیا۔ کلمہ ورد پڑھ لو۔ مسافر ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔

ریل گاڑی ملتان کی حدود میں داخل ہوتی ہے تو دونوں طرف دھول اڑنے لگتی ہے۔ ضمیر جعفری (مرحوم) نے ایسے ہی ایک سفر کے اختتام پر کہا:

ریت نے ملتان تک اس طرح گردانا مجھے
میری بیوی نے بڑی مشکل سے پہچانا مجھے

جس راستے سے بھی ملتان پہنچیں، فقیر گھیر لیتے ہیں، سڑک پر ایک لمحے کو رک کر دیکھیں، مانگنے والوں کا ہجوم سامنے ہوگا۔ فارسی کے اس شعر کا خالق کون تھا، کوئی نہیں جانتا۔

چہار چیز است تحفہ جات ملتان
گرد، گدا، گرما و گورستان

ہر وقت اڑتی ہوئی دھول، مغز پگھلا دینے والی گرمی (سڑکوں پر تارکول جوتوں سے چپک جاتا ہے) چند ارب پتی، گھر تک پیچھا کرنے والے بھک منگے اور ہر راستے پر سامنے آ جانے والے مزار اور قبرستان، کسی بھی شہر کو 50 صدیوں تک باقی رکھنے میں مدد نہیں کر سکتے۔

شمال اور جنوب میں تاریخ بہت دور جا چکی ہے لیکن ملتان میں لگتا ہے جیسے محمد بن قاسم کی آمد کل کی بات ہو۔

کسی شہر کو پانچ ہزار سال تک ایک ہی مقام پر قائم رہنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑا ہے؟ سکندر اعظم، محمد بن قاسم، محمود غزنوی، چنگیز خان، امیر تیمور، نادر شاہ، احمد شاہ، رنجیت سنگھ اور کمپنی بہادر کی فوجوں نے ملتان کو درجنوں مرتبہ تاراج کیا۔ دنیا بھر میں کتنی تہذیبیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ موہنجو داڑو، ہڑپہ، ٹیکسلا آباد ہوئے اور برباد ہو

گئے۔ آج ملتان کا ایک مزدور اپنے کاہل بیٹے کو ڈانٹ کر کہتا ہے ''تم کوئی تیمور لنگ کی اولاد جو کام نہیں کرنا چاہتے۔''

ملتان کو پیروں کی بددعا لگ گئی۔ 13 ویں صدی میں سبزوار سے پیر شمس یہاں آئے۔ ان سے پہلے خوارزم کے قریشی خاندان کے فرزند شیخ بہاول حق یہاں پہنچ چکے تھے۔ ان کے حکم پر پیر شمس سے سرد مہری کا سلوک کیا گیا۔ ''میری مچھلی تل کر دو'' پیر شمس نے دکانداروں سے کہا سب نے انکار کر دیا۔ غوث بہاول حق کا غصہ...... جلالی بزرگ ہیں......! پیر شمس بھی جلالی نکلے اپنے ہم نام ستارے کو آواز دی ''میری مچھلی تل کر دو''۔ سورج سوا نیزے پر آ کر ٹھہر گیا۔ آج تک وہیں ٹھہرا ہوا ہے مچھلی کے ساتھ انسانوں کو بھی تل رہا ہے......!

لیکن اس سے بہت پہلے ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سانگ نے ملتان کا ذکر ''سورج دیوتا کے شہر'' کے طور پر کیا تھا۔

فارسی کا ایک شعر ہے:

تو که ملتاں ساختی
دوزخ چه را پرواختی......؟

(اے خدا جب تو نے ملتان بنا دیا تھا پھر دوزخ قائم کرنے کی زحمت کیوں کی؟) سرائیکی کی پرانی کہاوت ہے۔ ''آئی ملتان دی واری، ہامینہہ بن گئی اندھاری'' (ملتان کی باری آئے تو بارش یہاں آ کر آندھی میں تبدیل ہو جاتی ہے) کالی آندھی! کوہ سلیمان کی ریت اچانک گھیر لیتی ہے۔ سامنے صرف تیزی سے گردش کرتے ہوئے سیاہ ذرات ہوتے ہیں اور کانوں میں ہوا چنگھاڑتی ہے اور کچھ دکھائی یا سنائی نہیں دیتا۔ اس شہر کو اور اس کی قوت برداشت کو سمجھنے کے لیے اس کی معلوم تاریخ اور نامعلوم تاریخ دونوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

مسلم مورخ ابوریحان البیرونی نے 14 ویں صدی عیسوی میں اس علاقے کا سفر کیا۔ ''ملتان کے لوگ مجھے بتایا کرتے تھے کہ یہاں بارش کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔'' اس نے واپس جا کر لکھا۔ سر الیگزنڈر کننگھم نے اپنی کتاب ''ہندوستان کا قدیم جغرافیہ'' میں ذکر کیا، ''ملتان کے لوگ عام طور پر صحت مند ہوتے ہیں۔ صرف بارش کے دنوں میں بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بارش یہاں کبھی نہیں ہوتی۔'' 1397ء میں امیر تیمور کے حملے کے دوران ملتان کی تاریخ کی تیز ترین بارش ہوئی تھی۔ حملہ آوروں کا اس میں بہت نقصان ہوا۔ اسے ریکارڈ نہیں کیا جا سکا۔ پانچ سو سال بعد (صرف۔!) 1892ء میں پھر تیز بارش ہوئی اس مرتبہ ریکارڈ کر لیا گیا۔ 48 گھنٹے میں کل 8.48 انچ بارش ہوئی۔

نامعلوم تاریخ۔! عام کہاوت ہے۔ ''لکھے موسیٰ پڑھے خدا'' اس قلمی دوستی کا احوال ملتان کے لوگوں کو کب معلوم ہوا؟ (موسیٰ کی تحریر اتنی خراب تھی؟) روایت ہے کہ ولادت مسیح سے 325 سال قبل مقدونیہ کا سکندر اعظم ملتان کی دولت لوٹنے یہاں پہنچا تھا۔ تب کسی بھک منگے نے اس سے روٹی نہیں مانگی تھی۔ قلعہ کے طویل محاصرے کے بعد اس کا لشکر مایوس ہو گیا۔ یونانی فوج واپسی کا مطالبہ کرنے لگی۔ ارسطو کا شاگرد پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔ قلعے کی دیوار پر

سیڑھی لگا کر چڑھا اور اندر کود پڑا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سکندر نے ملتان تو فتح کر لیا لیکن اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ دو بدو جنگ میں زہر آلود نوک دار ہتھیار (تیر یا نیزہ) کا ایسا زخم لگا کہ فوج اپنے بادشاہ کی لاش لے کر ہی واپس جا سکی۔

ہمیشہ سے ہندوستان کی ماوراالنہر، ایران اور افغانستان سے تجارت، ملتان کے راستے ہوتی تھی۔ زمینی راستوں کا جنکشن ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شہر چار آبی شاہراہوں دریائے راوی، چناب، ستلج اور بیاس کے ساحل پر واقع تھا۔ سرجن میجر اولڈ ہام نے جولائی 1874ء میں کلکتہ ریویو میں اپنی تخلیق بعنوان ''ہندوستان کے صحرا کا گمشدہ دریا'' میں لکھا۔ ''دریائے راوی پہلے ملتان شہر سے ہو کر گزرتا تھا۔'' عالمگیر نامہ کے مطابق اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے بھائی داراشکوہ کا پیچھا کرتے ہوئے ملتان سے تین میل جنوب مشرق میں راوی اور چناب کے سنگم پر قیام کیا۔ روایت یہ ہے کہ شکست کے آثار دیکھ کر داراشکوہ نے مغل تاج راوی میں پھینک دیا۔ تخت مل گیا تو تاج ڈھونڈنے کے لیے اورنگ زیب نے راوی کا رخ ہی بدل دیا اور مغرب میں سندھنائی کے مقام پر اسے چناب سے ملا دیا۔

امیر تیمور کے حملے کے وقت اور بعد میں، آئین اکبری کے مطابق، دریائے بیاس ملتان سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہ شہر اس دریا کی زرخیزی کی بدولت مغل حکومت کو لاکھوں روپے کما کر دیتا تھا۔ بیاس سے نکلنے والی نہروں کے اصل ناموں پر اب بھی شیخ واہ، لوڈن واہ، کالو واہ اور گوہر واہ آباد ہیں بیاس کو بھی فقیر کی بددعا ملتان سے دور لے گئی روایت ہے کہ ملاحوں نے ایک فقیر کو پار لے جانے سے انکار کر دیا اور یوں اپنی شامت کو آواز دی 1788ء کے ہندوستان کے نقشہ میں بیاس کی گزرگاہ ملتان میں دکھائی گئی ہے بعد میں یہ دریا ضلع لاہور میں ہاری کا پتن کے مقام پر دریائے ستلج میں گرنے لگا۔

سرجن میجر اولڈ ہام نے اپنی تخلیق میں لکھا کہ دریائے ستلج پہلے ملتان سے ہو کر گزرتا تھا اور یہ بہاولپور میں موجود صحرا چولستان میں گم ہو جانے والے دریا ''ہاکڑا'' میں جا گرتا تھا۔ امریکی خلائی تحقیقاتی ادارے ''ناسا'' نے 1988ء میں حکومت پاکستان کو سیٹلائٹ کے ذریعے کھینچی گئی کچھ تصاویر بھجوائی تھیں جن میں دریائے ہاکڑا کی زیر زمین گزرگاہ دکھائی دیتی ہے جو اب بھی موجود ہے ناسا نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ زیر زمین آبی راستے کے اوپر دریا کا رستا بنا کر اسے پھر سے زندہ کیا جا سکتا ہے۔ حکومت پاکستان نے جواب دیا کہ یہ کام ملک کے تمام مسائل حل کرنے کے بعد کر دیا جائے گا۔ (پاکستان کے مسائل ہی کتنے ہیں۔۔!) یہ ہے مابعد التواریخ!

دریائے چناب اب ملتان کے مغرب میں مظفر گڑھ کے قریب بہتا ہے یہ دریا کم از کم 13ویں صدی کے وسط تک شہر کے مشرق میں فصیل کے ساتھ ساتھ ہو کر گزرتا تھا چناب کے پانی کو راوی سے کم زرخیز مانا گیا ہے کیونکہ اس کے پانی میں بہت سی معدنیات اور دھاتیں موجود ہیں ملتان میں رہنے والے ''نیارے'' (بروزن سنارے) چناب کے پانی سے سونا نکالتے تھے یہ کام ایک بہت طویل عمل کے ذریعے کیا جاتا تھا (آج کل یہ نیارے سنار کی دکانوں کے اندر اور باہر مٹی صاف کر کے اس میں سے سونا برآمد کرنے کا کام کرتے ہیں اور ان میں سے بہت سے دوسرے پیشے اختیار کر چکے ہیں) ملتان میں ''بنایا'' جانے والا یہ سونا اس شہر کی خوشحالی کی دوسری وجہ تھی یعنی عالمی

تجارت سے حاصل ہونے والی آمدنی کے بعد۔ چار دریاؤں کی ہمسائیگی کی بدولت غلے اور دوسری زرعی اجناس کی فراوانی کا کیا عالم ہوگا! کیا یہ خوشحالی ہی ملتان کی طویل العمری کا راز ہے۔

اکبر اعظم کے زمانے میں ملتان میں سونے چاندی اور تانبے کے سکے ڈھالنے کی ٹکسال قائم ہوئی برٹش میوزیم (انڈیا آفس لائبریری) میں ملتان ٹکسال کی مہر والے چند سکے موجود ہیں جن پر بادشاہوں کے نام اور ہجری سال کندہ ہیں اکبر اعظم کا تانبے کا سکہ 1000 ہجری، شاہ جہاں 1068 ہجری سونے کا سکہ، 1043, 1045, 1039, 1040, 1042 اور 1048 ہجری چاندی کے سکے۔ اورنگزیب 1075, 1077 ہجری سونے کے سکے 1070, 1073, 1076 چاندی کے سکے، فرخ سیر 1125, 1126, 1130 ہجری چاندے کے سکے، یہ ٹکسال سکھوں یا انگریزوں کے زمانے میں بند کر دی گئی۔ ہندوستان کو سونے کی چڑیا ایسے ہی تو نہیں کہا جاتا تھا ملتان جیسے اس چڑیا کی چونچ تھا آج بھی ملتان میں سونے کے نرخ دوسرے شہروں کے نرخ سے ایک، دو روپے کم ہوتا ہے۔

چار دریاؤں میں گھرا ملتان دو اونچے ٹیلوں میں بسایا گیا تھا یہاں کے لوگ موہنجوداڑو کا حشر بھی دیکھ چکے تھے جسے دریائے سندھ کی موجوں نے نگل لیا (زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے)

راوی، بیاس، چناب اور ستلج ساتھ چھوڑ گئے۔ ملتان اور دریائے سندھ کا رشتہ طویل گھنے جنگلات کے ذریعے قائم تھا نادر شاہ کے ایک نادر شاہی حکم کے ذریعے یہ تمام جنگلات صاف کرا دیئے۔ اس کی فوجیں جنگل میں بھٹک گئی ہوں گی جس پر غصہ آ گیا ہوگا نادر شاہی فوجیں ملتان میں قیام پذیر رہیں۔ احمد شاہ ابدالی ملتان میں ہی پیدا ہوا۔ ابدالی روڈ پر سابق کمشنر ہاؤس کے سامنے اس مقام پر آج بھی ایک یادگار موجود ہے۔ زرخیز زمین ریتلے صحرا میں تبدیل ہوگئی تو لوگوں نے آبپاشی کے لیے کنویں کھود لیے اللہ کی شان دیکھئے بعد میں تپتے صحرائی علاقے کو کپاس کی دولت عطا کی۔ اس قادر مطلق کے خزانے میں کوئی کمی نہیں۔ 16ویں صدی کے شروع میں حسین خان لنگاہ حاکم ملتان کے ایک سفیر نے احمد آباد سے واپس آ کر بتایا کہ ملتان کی تمام تر آمدنی سے احمد آباد کے محل جیسی ایک عمارت بھی تعمیر نہیں کی جاسکتی یہ سن کر حکمران اداس ہوگیا جس پر وزیر اعظم نے تسلی دی۔ ہندوستان کو صرف اپنے امیر لوگوں پر ناز ہے مگر ملتان کو اپنے تمام انسانوں پر فخر ہے۔

ملتان کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ای ڈی میکلیگن 1897ء نے بزبان افرنگ تحریر کیا۔ ملتان کے لوگوں کی عادتیں وسطی پنجاب کے لوگوں سے مختلف ہیں۔ یہ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں اور صرف اپنے علاقے کے مظاہر فطرت کا ذکر کرتے ہیں اجنبیوں پر اعتماد نہیں کرتے اور یہاں سے دور جانا پسند نہیں کرتے یہاں کے امیر لوگ مفاد عامہ کے کام کر پر رقم خرچ کرنا پسند نہیں کرتے۔ دوستی کے معاملے میں ملتان کے لوگوں کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ فارسی کہاوت ہے۔ دوست ملتان تا بہ عید گاہ۔ یعنی ملتان کے رہنے والے کی دوستی ایک میل دور ختم ہو جاتی ہے۔ مسٹر میکلیگن کو اس بات پر شدید رنج تھا کہ وہ ملتان کی کسی سڑک کا نام اپنے نام پر نہیں رکھ سکے تھے۔ اس دکھ میں کمشنر ہال برانڈ رتھ،

بیڈن، ریواز اور ڈپٹی کمشنر ایجرٹن، فین ہملٹن اور بہت سے دوسرے معزز انگریز افسران شریک تھے جن کے نام نامی ہندوستان بھر کے بڑے بڑے شہروں کی چمکتی دمکتی سڑکوں پر جگمگا رہے تھے مگر ملتان کے باشندے یہ دوستی نبھانے کو تیار نہ تھے بلکہ یہاں وہی دقیانوسی نام یعنی شیر شاہ روڈ، التمش روڈ، قاسم روڈ، معصوم شاہ روڈ، ابدالی روڈ، شیر شاہ روڈ، تولے (تغلق) خان روڈ، شاہ شمس روڈ، حضوری باغ روڈ، حافظ جمال روڈ وغیرہ چل رہے تھے لے دے کر انہوں نے جب قلعہ کی فوجی حیثیت ختم کر کے بلکہ اسے تباہ و برباد کر کے شہر کے مغرب میں نئی چھاؤنی قائم کی تو ٹیپو سلطان روڈ سایہ دار ٹھنڈی روڈ نکالی اور نام اس کا مال روڈ رکھا جس پر انہوں نے کمپنی بہادر کی یاد میں کمپنی گارڈن بسایا اور عام خاص باغ اور باغ لانگے خان کو ویران ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ انگریز بہادر نے ہندوستان پر اپنا قبضہ مکمل کرنے کے بعد جن شہروں پر سرخ روشنائی سے ''حساس ترین'' لکھا ملتان ان میں سر فہرست تھا۔ وجہ اس کی صاف اور سیدھی تھی میسور، حیدر آباد، اودھ، پٹیالہ، کشمیر اور ڈیرہ جات سمیت وہ تمام شہر یا علاقے جنہوں نے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر ملکہ معظمہ کی فرمانبرداری سے مقدور بھر انکار کیا تھا یا انگریزوں کا مقدس خون بہانے کا جرم کیا تھا۔ زیادہ تر ریاستیں یا رجواڑے تھے جن کے حکمران پشتینی نواب یا مہاراجہ تھے اور اپنی اپنی فوجیں رکھتے تھے۔ اورنگ زیب بادشاہ کے انتقال کے بعد سے ہونے والی کامیاب بغاوتوں کے نتیجے میں مکمل خود مختار ہو چکے تھے اور تاج برطانیہ کی سرپرستی کی نعمت سے ان کا انکار انگریز محققین کی نظر میں حب الوطنی کی جنگ سے زیادہ ان کے ذاتی اقتدار کی بقا کا معاملہ تھا لیکن ملتان کوئی ریاست نہیں تھا یہ ایک کھلا میدان تھا جہاں تاریخ کے ہر دور میں باہر سے آنے والوں نے حکومت کی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکار انگلشیہ کے قدم رنجہ فرمانے کے وقت کم از کم 30 سال سے یہاں سکھوں کی حکمرانی قائم تھی جن کا اس زمین سے کوئی رشتہ نہ تھا اور جن کے ظلم و ستم کی داستانیں سن سن کر لارڈ ڈلہوزی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ملتان کے مسلمان وغیرہ اور غیر مسلم زمیندار، سابق حکمران خاندان اور غیر سکھ عوام لاہور کے لوگوں کی طرح گوری پلٹن کا والہانہ استقبال کریں گے۔ اور سکھوں کی حکمرانی کا خاتمہ کرنے پر انہیں اپنا نجات دہندہ تصور کریں گے۔ 1845ء میں پہلی جنگ پنجاب کے نتیجے میں لاہور کا انتظام ریذیڈنٹ بہادر نے سنبھال لیا اور صوبے کے مختلف اضلاع سے حساب وصول کرنے کے لیے جملہ افسران روانہ ہو چکے لیکن ملتان کی حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی اور یہاں اکال گڑھ کے کھتری حاکم دیوان ساون مل کا نالائق بیٹا دیوان مول راج چین کی بنسی بجاتا رہا۔ مگر پھر یوں ہوا کہ معزول سکھ مہاراجہ کے پے در پے خطوط اور کمپنی بہادر کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر دیوان مول راج فٹافٹ استعفیٰ دینے پر تیار ہو گیا تو لاہور ریذیڈنٹ نے مہاراجہ کے نمائندے سردار کاہن سنگھ کے ساتھ دو نوجوان انگریز افسران بنگال سول سروس کے پیٹرک الیگزینڈر ایگنو اور فرسٹ بمبے رجمنٹ کے لیفٹیننٹ ولیم اینڈرسن کو محض دو ہزار سکھ اور گورکھا جوانوں کے ہمراہ شہر کا قبضہ لینے کے لیے بھیجا اور جلد واپس آنے کی تاکید کی۔

18 اپریل 1848ء کو یہ فاتحین عید گاہ ملتان میں آ کر اترے اور دیوان مول راج نے جو ایک میل دور عام خاص باغ میں ان کا منتظر تھا۔ فی الفور حاضر ہو کر قدم بوسی کی اور طے پایا کہ سفر کی تکان اترنے کے بعد اگلے روز

صبح کو شہر بحقدار رسید کر دیا جائے گا۔ اب ہوا یوں کہ اگلے روز صبح کو بے چارے پیٹرک الیگزینڈر اور ولیم اینڈرسن جب قلعہ کی سیر کر چکے اور چابیاں بھی وصول کر چکے گورکھا انفنٹری کو محافظ ٹھہرایا اور اپنے سنتری مقرر کئے تو ان کی نظر قلعہ کے اندر غوث بہاول حق اور شاہ رکن عالم کے مزاروں پر پڑی اور انہوں نے سرسری انداز میں سوال کیا یہ گنبد یہاں کس لیے بنائے گئے ہیں کیونکہ قلعہ اس وقت ایک زبردست جنگی مقام تھا جہاں حکمرانوں کے محلات اور فوجی بیرکوں کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا اس پر دیوان نے کہا کہ ان بزرگوں کی خانقاہیں ہیں۔ جنہوں نے ملتان کو ملتان بنایا۔ جس پر بے خیالی میں کہیں قابل عزت انگریز مہمانوں کے منہ سے نکل گیا۔ کیونکہ چارج تو بہرحال وہ سنبھال چکے تھے کہ ان گنبدوں کی کیا حقیقت ہے یہ تو ہمارے ایک اشارے پر خاک کا ڈھیر بن جائیں گے۔ بس یہ بڑے بول منہ سے نکلنے تھے کہ دنیا ہی بدل گئی ایک قیامت آئی ایک برق چمکی اور نزدیک ترین محافظ (امیر چند) نے برچھی کا وار کر کے غریب پیٹرک الیگزینڈر کو گھائل کر دیا جو بے خبری میں اس وار کا نشانہ بن کر گھوڑے سے نیچے آ گرا۔ دیوان کا غدار محافظ تو جرم کر کے فرار ہو گیا مگر قیامت آ کر گزر چکی تھی۔ پیروں کی بددعا لگ گئی۔ دیوان پیدل عام خاص باغ کی طرف دوڑا اور زخمی افسر کو اس کے ساتھی اٹھا کر عید گاہ لے گئے۔ قلعہ سنبھالنے والے گورکھا وفادار اپنی روایات بھول کر باغوں سے مل گئے دیکھتے ہی دیکھتے شہر اُمڈ آیا اور بغاوت پر مصر ہوا دیوان مول راج نے اپنے وزیروں کی منت سماجت کی اپنے فوجیوں کے سامنے ہاتھ جوڑے عوام کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی شام ہوتے ہوتے میدان جنگ تیار ہو گیا رات کو لیفٹیننٹ اینڈرسن نے اپنے ساتھ لائی گئی چھ توپوں کا رخ شہر کی طرف موڑ دیا جو محض سلامی کے گولے داغنے کے لیے لائی گئی تھیں صبح ہوتے ہیں ہجوم نے عید گاہ پر حملہ کر دیا اور زخمی پیٹرک الیگزینڈر اور لیفٹیننٹ ولیم اینڈرسن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اپریل 1848ء سے جنوری 1849ء تک ایک انتہائی خوفناک "جنگ ملتان" برپا رہی کمپنی کے وفاداروں نے چاروں طرف سے ملتان کو گھیرے میں لے لیا اور انچ انچ بڑھتے ہوئے آخر کار قلعہ کی دیواروں تک آن پہنچے برٹش انڈیا کی حکومت کے فیصلے کے مطابق اس بار ملتان کے خلاف مہم میں کوئی انگریز افسر نہیں بھیجا گیا۔ سکھ دربار، ریاست بہاولپور، بنگال آرٹلری، بنگال انجینئرز 11 ویں رجمنٹ لائٹ کیولری، بمبے آرٹلری اور بمبے انجینئرز کے ہزاروں جوانوں نے اس طویل جنگ میں حصہ لیا چوک شہیداں اور خونی برج انہیں لڑائیوں کی یادگاریں ہیں 22 جنوری تک ملتان کے ان گنت سپاہی مارے جا چکے تھے اور شہر میں کھانے پینے کا سامان ختم ہو چکا تھا اس وقت بھی شہری ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھے لیکن دیوان مول راج نے قلعے کے دروازے کھول کر خود کو انگریزی قانون کے حوالے کر دیا۔

کنہیا لال نے دہلی گزٹ پریس میں چھپنے والی اپنی کتاب "دی ٹرائل آف مول راج" میں لکھا کہ لاہور میں مسٹر منٹگمری سمیت سول سروس کے دو معزز افسران اور ایک فوجی افسر کرنل پینی نے دیوان کی غداری کا مقدمہ سنا جس میں مسٹر ایل باورنگ استغاثہ کی طرف سے اور کیپٹن ہلٹن ملزم کے دفاع میں وکالت کے لیے پیش ہوئے

دیوان کے خلاف جنگی جرائم کا نہیں، بغاوت کا الزام تھا لیکن کمشن نے قرار دیا کہ دیوان صرف اس حد تک اس جرم میں شریک تھا کہ وہ اپنے سپاہیوں اور عوام کو سلطنت برطانیہ کا تاج اچھالنے سے نہ روک سکا لہذا اسے موت کی سزا نہیں دی گئی اور پہلے کلکتہ اور پھر بنارس جیل میں رکھا گیا جہاں وہ جلد ہی چل بسا۔

اس بغاوت کے اصل مجرم، ملتان کو سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ جنگی قلعے کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا فوج کے تمام سپاہیوں کو تہہ و تیغ کر دیا گیا مزاروں کو چھوڑ کر عظمت رفتہ کے تمام آثار کھرچ دیئے گئے یہاں کی ثقافت، روایات، لٹریچر اور خوشحالی کو برباد کر دیا گیا مخدومین، پٹھانوں اور سیدوں کو برسوں تک چلنے والے غدارے کے مقدمات میں بلاکران کی سخت توہین کی گئی۔ متوسط طبقہ ختم کر دیا گیا۔ صرف وہ امیر لوگ باقی رہے جو ''ریڑھ کی ہڈی'' تک گوری حکومت کے وفادار تھے۔ ہر قسم کے ہتھیار بحق سرکار ضبط کر لیے گئے دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی سختی سے روک دی گئی ایران اور افغانستان سے آنے والی تجارتی آمد و رفت کو روک کر اسے چناب سے پار کے علاقوں میں منتقل کر دیا گیا۔ شہر کے باہر ایک بڑی فوجی چھاؤنی قائم کی گئی جہاں ملتان اور گردونواح سے بھرتی ہونے والا کوئی سپاہی یا افسر پوسٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ مقامی فوجیوں اور شہریوں کی کڑی نگرانی کے لیے بڑی تعداد میں خفیہ اہلکار مقرر کیے گئے ہر سال کے دوران اوسطاً 200 سے زائد افراد کو محض پبلک مقامات پر جمع ہو کر گفتگو کرنے کے جرم میں قید بامشقت یا کالا پانی کی سزا دی جاتی تھی اس جرم کو فساد برپا کرنے کی کوشش کا نام دیا جاتا تھا۔ 1885ء میں سنٹرل جیل کے قیدیوں کے بارے میں کچھ پریشان کن اطلاعات ملیں تو تین سال کے لیے جیل بند کر کے قیدیوں کو دوسرے شہریوں کی جیلوں میں بھیج دیا گیا۔

یوں ملتان نے اپنی طویل زندگی میں پہلی بار غلامی کے آداب سیکھے۔ یونین جیک کی سعادت نصیب ہونے کے پچاس سال بعد یہاں صوبائی سطح کے چھ درباری موجود تھے دربار بہاول حق کے مخدوم حسن بخش قریشی، محمد یار خان خاکوانی، مخدوم سید صدر الدین شاہ، عاشق محمد خان بادوزئی، سالار واہن کے سید حیدر شاہ گردیزی اور جلال پور پیروالہ کے دیوان سلطان احمد، ان کے علاوہ مخدوم شیخ راجو گردیزی، خان بہادر حسن بخش گردیزی، خان بہادر رب نواز خان اور کورنگہ کے سید غلام رسول شاہ آنریری مجسٹریٹ ہونے کی حیثیت سے لیفٹیننٹ گورنر کے دربار میں کرسی کے حقدار ٹھہرائے جا چکے تھے۔ ڈویژنل درباریوں اور کمشنر بہادر کے دفتر میں کرسی نشین حضرات کی ایک طویل فہرست تیار ہو چکی تھی خانقاہوں کے نام پر بے شمار زمینیں الاٹ کی گئی ملتان مہم میں ہاتھ بٹانے والوں کو ان گنت انعامات سے نوازا گیا مصطفیٰ خان خاکوانی جو دیوان مول راج کا کاردار تھا مگر اسے چھوڑ کر وفادار فوجوں سے آ ملا تھا اسے میلسی کا تحصیلدار مقرر کر کے زمینیں اور انعامات دیئے گئے اس کے بیٹے غلام قادر خان خاکوانی کو 1886ء میں 60 ہزار ایکڑ زمین مالکانہ حقوق کے ساتھ دی گئی۔

دیوان مول راج کے خلاف مقدمے کی سماعت کرنے والا کمشن، اس بغاوت کی ''اصل وجہ'' کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہا تھا دنیا بھر میں تاریخی تحقیق میں نام کرنے والی حکومت انگلشیہ اپنی بعد کی رپورٹوں میں بھی اس

''وجہ'' کو دریافت نہ کر سکی تھی اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل تھا کہ صرف 30 سال قبل جس صوبے نے نواب مظفر خان شہید کی سربراہی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف آٹھ برسوں پر محیط ایک طویل جنگ آزادی لڑی تھی 1810ء سے 1818 تک ایک ایک دن شہریوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر سکھوں کے اقتدار کا راستہ روکنے کی آخری حد تک جدوجہد کی 2 جون 1818ء کو سفید ریش مظفر خان اپنے آٹھ بیٹوں اور بچی کھچی فوج کے ہمراہ دربار بہاول حق کے باہر قلعے کے خضری دروازے کی طرف تلوار لے کر کھڑا ہو گیا اور شدید گولہ باری کے نتیجے میں دروازے اور دیوار کے منہدم ہونے کے باوجود اس نے للکارا ''مرد ہو تو سامنے آ کر مقابلہ کرو۔'' شہزاد کھڑک سنگھ سمیت کسی سکھ سورما نے اس کی دعوت مبارزت قبول نہ کی بلکہ دور سے بندوقوں کے فائر کر کے نواب اور اس کے پانچ بیٹوں کو شہید کر دیا۔ لیکن انگریزوں کے آنے پر یہی ملتان سکھ اقدار کو بچانے کے لیے سینہ سپر ہو گیا۔ مہارانہ رنجیت سنگھ نے ملتان کی فتح پر لاہور میں آٹھ دن تک جشن عام منایا تھا اور ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کی سڑکوں پر گشت کیا اور صدقے کے طور پر ہزاروں روپے ہجوم پر پھینکے تھے آج اسی مہاراجہ کے مقرر کردہ دیوان ساون مل کے بیٹے کی حکومت کو بچانے کے لیے ملتان کے لوگوں نے انگریزوں کا راستہ کیوں روکا؟

نواب سے عقیدت ایک طرف سکھوں نے ملتان پر قبضہ کرنے کے بعد بے تحاشا ظلم کیے۔ جانی یا مالی نقصان سے ملتان کا ایک باسی بھی نہ بچ سکا۔ سکھوں نے قلعہ کے اندر تمام مکان زمین بوس کر دیئے شہر میں بہت سے مکانوں کو آگ لگا دی۔ لوٹ مار کی سینکڑوں عورتوں نے سکھوں ہاتھ پڑنے کی بجائے کنوؤں میں کود کود کر جان دے دی۔ مسجدوں اور مزاروں میں گھوڑے باندھے گئے کتب خانے جلا دیئے گئے تباہی اور بربادی کا یہ کھیل تین سال تک جاری رہا۔ مہاراجہ کی طرف سے مقرر کردہ صوبیداروں کی بربریت کی داستانیں ایک سو سال بعد بھی محفلوں میں سنائی جاتی رہیں۔

انگریز سرکار کو کسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے مجرم شہر کی قسمت میں محرومی اور بے بسی لکھ دی۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کے ایک سینئر استاد ملتان کے لوگوں کے مزاج پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''یہاں کے لوگ ہر طاقتور سے مفاہمت اور مصالحت کر لیتے ہیں۔ اپنے خیال میں وہ اپنی قسمت پر صابر و شاکر رہتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ منافقت اور ریاکاری ہے۔''

یونیورسٹی کے ایک طالبعلم نے شکایت کی ''فیڈرل پبلک سروس کمشن کی طرف سے مقابلے کے امتحان کے لیے اشتہار ملتان کے اخباروں میں شائع نہیں کیے جاتے ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے راولپنڈی سے اس امتحان کی اطلاع دی اس نے وہاں کے اخبار میں اشتہار دیکھا تھا ہم نے لاہور اور راولپنڈی جا کر ان تاریخوں کے تمام اخبار نکلوائے وہ اشتہار ان اخباروں کے مقامی ایڈیشنوں میں شائع ہوا مگر جو ایڈیشن ملتان بھیجے جاتے ہیں ان میں موجود نہیں تھا۔ ہم نے اسلام آباد میں کمشن کے دفتر جا کر شکایت کی تو انہوں نے اس کی تصدیق کی اور اسے پالیسی قرار دیا۔

تاج برطانیہ نے اپنے زیر نگیں تمام علاقوں کے لیے الگ الگ پالیسی طے کر دی تھی افسران بعد میں اس پالیسی پر قائم رہے اور آج بھی قائم ہیں۔نئی پالیسی کون بنائے؟ اور کیوں بنائے؟

ملتان کے کاریگروں نے دنیا بھر میں نام پیدا کیا۔ کاشی کی ٹائلیں، لکڑی پر بیل بوٹے بنانے کا کام، گنبد و محراب کی تعمیر، وسطی ایشیا کے فاتحین یہاں آئے تو ان کاریگروں کو ساتھ لے گئے سنٹرل ایشیا اور ملتان کی قدیم عمارتوں میں مماثلت ہے۔ ملتان پر پٹھان حکمرانوں کے اقتدار کے دوارن دونوں علاقوں کے کاریگروں کے درمیان براہ راست تعلق پیدا ہوا۔ یہ پٹھان خاندان اورنگزیب عالمگیر کی قندھار پر فوج کشی کے دوران آ کر ملتان میں آباد ہوئے تھے، سدوزئی، بادوزئی، باموزئی، ترین، بابر اور خاکوانی اورنگزیب کے بعد دہلی کی حکومت کمزور پڑ گئی تو ملتانی پٹھانوں نے یہاں خودمختار حکومت قائم کر لی جس کا برائے نام تعلق دہلی کی بجائے کابل کے حکمرانوں سے تھا اب تک یہ پٹھان شہروں میں محنت مزدوری کرتے تھے یا کرائے کے فوجی تھے۔ انہیں سرکاری زمینیں عطا ہوئیں اور وہ بڑے جاگیردار یا زمیندار بن گئے۔

1770ء میں انگریز مورخ ایلفنسٹن کابل جاتے ہوئے ملتان سے گزرا۔ اس نے لکھا، ملتانی پٹھان اتنے طویل عرصے سے یہاں مقیم ہیں کہ ان میں پٹھانوں والی مخصوص خوبیاں تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ ہمارے استقبال کے لیے جو شامیانہ لگایا گیا تھا وہ تقریب کے دوران اکھڑ گیا۔ سپاہی بھگدڑ کے دوران ایک دوسرے کو کچلنے لگے۔ نواب کے ملازم بھاگ نکلے۔ گھوڑے بے قابو ہو گئے یہاں ہم نے حکمرانی کی بدترین صورت دیکھی سرکاری اہلکار عوام پر ظلم ڈھا کر سرکاری واجبات وصول کرتے ہیں۔ نواب کو اپنی بے ہنگم فوج پر قابو نہیں ہے۔ پٹھان حکمرانوں نے کئی نہریں کھدوائی ہیں لیکن سب کو آبپاشی کے لیے پانی نہیں دیا جاتا بہت سے گاؤں اجڑ چکے ہیں ایک زرخیز علاقہ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔

1821ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دیوان ساون مل کو ملتان کا صوبیدار مقرر کیا۔ یہ روس کے انقلاب سے 96 سال پہلے کی بات ہے مارکس اور اینگلز نے بہت بعد میں لکھنا شروع کیا دیوان ساون مل نے صوبہ ملتان میں سوشلزم نافذ کیا۔ اس کے دور میں ملتان پورے ہندوستان کا سب سے خوشحال اور مطمئن علاقہ تھا موروثی جائیداد کا تصور ختم کر دیا گیا۔ تمام زرعی اراضی کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا خود کاشت لازمی قرار دے دی گئی خواص کے لیے دیوان سے ملاقات کرنا تقریباً ناممکن تھا لیکن غریب کسان کنواں کھودنے یا بیل خریدنے کے لیے مدد مانگنے آتا تو دیوان اس کا گرم جوشی سے استقبال کرتا اپنے کارداروں کی زیادتیوں کی کہانیاں سن کر اس نے کاردار رکھنے بند کر دیئے۔ دیوان ساون مل کا دور ''ون مین حکمرانی'' کا بہترین نمونہ تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دیوان کو ایسے کوئی احکامات نہیں دیئے تھے۔ لاہور میں روایتی قانون نافذ العمل تھے دیوان کے سوشلزم کے خلاف بہت سی شکایات لاہور پہنچیں مگر چونکہ دیوان باقاعدگی سے طے شدہ خراج کی رقم لاہور کو ادا کرتا تھا اور پورا حساب دیتا تھا اس لیے مہاراجہ نے اس کے کام میں دخل نہیں دیا۔ ساون مل کے بعد اس کے بیٹے مول راج کے زمانے میں بھی سوشلسٹ نظام جاری

جسے آخر کار انگریزوں نے آ کر ختم کر دیا۔ دیوان ساون مل کے دور میں ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ اور جھنگ بھی صوبہ ملتان میں شامل تھے (دیوان ساون مل انصاف پسند اور دانشمند حکمران تھا مگر وہ اپنی مسلمان دشمنی اور ہندو پروری کے لیے مشہور تھا)۔

اس سوشلسٹ تجربے سے تین سو سال پہلے 1433ء میں جب دنیا بھر میں کسی جمہوریت کا ذکر نہیں سنا تھا۔ ملتان کے لوگوں نے ایک جمہوری تجربہ بھی کیا تھا۔ بیرونی حملہ آوروں سے تنگ آ کر عوام نے غوث بہاول حق کے خاندان کے ایک عالم، عقلمند اور باکردار فرد شیخ یوسف کو اپنا حکمران منتخب کر لیا۔ شیخ یوسف نے ملتان کی حکومت کو از سر نو منظم کیا اور عدل و انصاف کی بنیاد رکھی لیکن یہ عالم حکمران اپنی بیگم کی سازش کا شکار ہو گیا۔ شیخ یوسف کے سسر رائے سہرا لنگاہ نے دو سال بعد ہی داماد کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور خود قطب الدین لنگاہ کا لقب اختیار کر کے 24 سال تک ایک خود مختار حکمران کی حیثیت سے ملتان پر حکومت کی۔ لنگاہ خاندان کی حکومت ظہیر الدین بابر کے آنے تک قائم رہی۔

محمد بن قاسم نے جب ملتان فتح کر لیا تو راجہ داہر کے خاندان کی لڑکی ''لادی'' مقیم ملتان نے خلیفہ سلیمان بن عبدالمالک کو لکھ بھیجا۔ ''آپ کے سپہ سالار آپ کی امانت میں خیانت کا مرتکب ہوا۔ مجھ جیسی کنواری شہزادی پر صرف آپ کا حق تھا مگر محمد بن قاسم مجھے اپنے تصرف میں لایا۔'' لیکن محمد بن قاسم کے جانے کے بعد لوگ اسے یاد کرتے تھے۔ ملتان میں عربوں کی حکومت برقرار رہی اور یہاں عرب خاندان منتقل ہوتے رہے اس طرح محمود غزنوی کے آنے تک ملتان تین سو سال تک مسلم حکومت کے تابع رہ چکا تھا۔ شمال میں گکھڑ قبیلے نے پوٹھار سے دہلی جانے والا راستہ روک رکھا تھا اس لیے تمام مسلم فاتحین ملتان کے راستے دہلی جاتے رہے۔

خوارزم سے قریشی خاندان آ کر کوٹ کہروڑ (لیہ) میں آباد ہوا جہاں شیخ بہاء الدین ولد وجیہہ الدین محمد بہ کمال الدین علی شاہ قریشی پیدا ہوئے۔ (70-1169ء) ملتان آبی شاہراہوں پر واقع ایک شہر تھا۔ شیخ نے معجزاتی طور پر ایک کشتی کو ڈوبنے سے بچایا اور نہ صرف ملتان بلکہ سندھ تک دریاؤں میں سفر کرنے والوں نے انہیں اپنا پیر تسلیم کر لیا آج تک منجدھار میں پھنس جانے والی کشتی کے ملاح پکارتے ہیں۔ ''مدد یا غوث بہاول حق!'' شیخ نے ہزاروں کو مسلمان کیا۔ شہر کو کئی بار بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ مار سے بچایا۔ بعض مواقع پر باہر سے آنے والی فوجوں کا رخ موڑنے کے نقد ادائیگی بھی کی۔ شیخ کے بیٹے صدر الدین عارف کے صاحبزادے شیخ رکن الدین ابوالفتح اس وقت ملتان میں موجود تھے۔

جب 1334ء میں ابن بطوطہ ملتان پہنچا۔ اس نے لکھا ''یہ شہر سندھ کا دارالحکومت ہے یہاں آنے والوں کی تلاشی لی جاتی ہے اور بہت سے سوالات کیے جاتے ہیں۔ ہر تاجر اپنے مال کا چوتھا حصہ اور گھوڑے پر سات دینار حکومت کو ادا کرتا ہے میرا سامان تھوڑا سا تھا مگر میں اسے کھلوانا نہیں چاہتا تھا امیر الامراء قطب الملک کا ایک خبر نویس دہقان سمرقندی مجھے حاکم کے پاس لے گیا جو ایک اونچے چبوترے پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے لوگ تیر اندازی، گھڑ

سواری اور چوگان کی مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے اور امیران کی مہارت کے مطابق انہیں انعام واکرام دیتا تھا۔"

شیخ رکن الدین ابوالفتح کی تعلیمات اور خصوصیت انگریز تذکرہ نویس گریفن نے یہ بتائی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے قیامت کے روز ہر انسان اس جانور کی شکل میں اٹھایا جائے گا جس کی خصلت کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارتا ہے مثلاً دلیر اور پھرتیلا شخص چیتا ہوگا اور بزدل اور کمزور انسان بکری۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن ملتان آنے والے سب سے پہلے بزرگ سید محمد یوسف تھے جو 1058ء میں غزنی کے نزدیک گردیز کے مقام پر پیدا ہوئے اور 1088ء میں غزنوی سلطان علاؤ الدین بہرام شاہ کے زمانے میں یہاں ائے۔ راوی کے کنارے قیام فرمایا کئی برس قبل سلطان مودود کے حملے کے نتیجے میں شہر تباہ ہو چکا تھا جو کہ موجودہ شہر سے دو میل جنوب میں واقع تھا۔ شاہ یوسف گردیز کے کہنے پر لوگوں نے اس مقام پر رہنا شروع کیا جہاں آج کا ملتان آباد ہے۔

تیرہویں صدی کے آخر میں غیاث الدین بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد ملتان کا حاکم تھا۔ اس نے شیراز کے شیخ سعدی کو لکھا "آپ کے لیے خاص طور پر ایک خانقاہ تعمیر کی جائے گی اور اس کے اخراجات کے لیے کئی دیہات دیئے جائیں گے۔" شیخ نے ضعیف العمری کی بنا پر دعوت نامنظور کی مگر اپنے ہاتھ سے تحریر کی ہوئی ایک گلستان اور ایک بوستان شہزادے کو بھجوا دی۔ ان مشہور تصانیف کے یہ پہلے نسخے تھے جو ہندوستان پہنچے۔ ملتان میں شیخ سعدی کی حکایات پر مشتمل ان کتابوں کو شائع کیا گیا اور اس واقعہ سے شیخ ہندوستان بھر میں مشہور ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد ملتان پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ آئینہ ملتان، تاریخ ملتان، نقش ملتان، ارض ملتان، تاریخ اولیاء ملتان، ملتان کا محاصرہ، ملتان کے سدوزئی حکمران لیکن زیادہ تر دستیاب نہیں ہیں۔ عام خیال ہے کہ ملتان کے لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں ہے۔ کتابوں کی دکانیں کم ہوتی جارہی ہیں۔ تصنیف و تالیف، تحقیق و تنقید، ادب، شاعری، ان چیزوں سے لگاؤ نہیں۔

ظہیر الدین بابر کے ہندوستان پر قبضے کے بعد ملتان مغل شہزادوں کی دور دراز کی جاگیر بن گیا تھا۔ اکبر اعظم جب اپنے استاد بیرم خان، خان خاناں سے ناراض ہوا تو اس کی جاگیر ملتان میں منتقل کر دی۔ شاہجہان نے شہزادہ مراد بخش کو جاگیر میں ملتان بخش دیا جس نے شہر کی موجودہ دیوار تعمیر کرائی۔ اس دیوار کے کچھ حصے اب بھی موجود ہیں۔ بعد میں دارا شکوہ اور اورنگزیب ملتان کے صوبیدار رہے۔ دارا شکوہ نے گیلانی خاندان کے شیخ موسیٰ کو ملتان میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود مغل تاج پہننے کے خواب دیکھنے میں مصروف رہا۔ اورنگزیب نے تخت و تاج حاصل کرنے کے بعد شیخ موسیٰ گیلانی کو برطرف کر کے لشکر خان کو صوبیدار ملتان مقرر کیا۔

مغلوں نے ملتان میں تعمیرات نہیں کرائیں۔ ہمایوں کو شکست دے کر شیر شاہ سوری جب 1541ء میں ملتان آیا تو اس نے غوث بہاول حق، شاہ رکن عالم اور یوسف شاہ گردیز کے مزاروں کے احاطوں میں خوبصورت ٹائلوں والی مساجد تعمیر کرائی تھیں۔ انگریزوں نے گنبد مسمار کرنے کی دھمکی دینے والے اپنے افسروں کا حشر دیکھ لیا تھا اس لیے انہوں نے کسی عمارت کو ہاتھ نہیں لگایا مگر وہ پل توڑ ڈالا جو شہر کو قلعہ سے ملاتا تھا اور جس پر کھڑے ہو کر بنگال

سول سروس کے افسر پیٹرک الیگزینڈر اینکونے سپاہی کی برچھی سے زخم کھایا تھا۔ انگریزوں کے بارے میں مشہور ہے کہ غیر جذباتی ہوتے ہیں اور رونا دھونا پسند نہیں کرتے مگر انہوں نے قلعہ کے عین وسط میں اپنے افسروں اینکواور ولیم کی یاد میں غوث بہاول حق کے مزار سے بھی اونچی جولاٹ نصب کی اس پر بزبان انگریزی ان مظلوموں کے قتل کے بارے میں جو عبارت تحریر ہے وہ کسی مرثیے سے کم نہیں۔

انگریز ملتان کے لوگوں کا مزاج سمجھ چکے تھے اور پھر امرتسر میں جلیانوالہ باغ فائرنگ (1919ء) کے بعد حکومت انگلشیہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ آزادی کی جنگ کو براہ راست تصادم کے ذریعے ہوا دینا ان کے لیے مناسب نہیں تھا۔ اس لیے رخ بدلنے کے لیے کئی ہتھکنڈے ایجاد کیے۔ ہندوستان میں تحریک خلافت کا زور تھا اور ملتان کے لوگ پیش پیش تھے۔ 1922ء میں تحریک خلافت کے سلسلے میں ملتان میں ایک کل ہندوستان جلسہ رکھا گیا جس میں تمام رہنمایان قوم کو شریک ہونا تھا۔ اس سے چند روز پہلے عاشورہ محرم کے سلسلے میں تعزیہ کے جلوس پر اینٹ پھینکی گئی۔ انگریزی ڈپٹی کمشنر کے ''ذرائع'' نے فی الفور مصدقہ ذرائع کی خبر مشہور کی کہ یہ اینٹ ہندوؤں نے پھینکی۔ کچھ بدخواہوں کا کہنا ہے کہ نواب مرید حسین قریشی سجادہ نشین مزار بہاول حق نے بھی اس خبر کی تصدیق کی۔ پھر کیا تھا ہندوستان بھر میں سب سے پہلا ہندو مسلم فساد ملتان میں ہوا۔ شہر میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ تحریک خلافت کا جلسہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ وہ دن تھا اور 14 اگست 1947ء کا دن، ملتان میں تحریک آزادی کے نام پر کوئی جلسہ، جلوس، اجلاس نہ ہو سکا۔ ہندو مسلم فساد البتہ جاری رہے۔ تحریک کے کارکنوں کے نام ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں لیکن خصوصیت یہ تھی کہ ان میں کسی بڑے خاندان کا کوئی فرد شریک نہیں تھا وہ سب یونینسٹ تھے۔

ملتان کے بارے میں کوئی بات کی جائے اور اس میں یہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی کا ذکر نہ ہو تو بات ادھوری رہے گی۔ بہت بڑے دل کے لوگ ہیں۔ ایک نواب صاحب کو کھانا کھلانے کا شوق تھا دن بھر اپنے سامنے سینکڑوں غریبوں کے لیے دستر خوان بچھا کر انہیں کھانا کھلاتے تھے۔ کھانا کھانے کے مقابلے منعقد کرائے۔ آج بھی کئی زمیندار ایسے ہیں جو مہمان نوازی کے ہاتھوں اپنی تمام زمینیں فروخت کر کے کنگال ہو چکے ہیں اور اب دوسروں کی زمینداری میں ملازم ہیں لیکن مہمان نوازی اب بھی جاری ہے۔

یہ مہمان نوازی اور محبت سب آنے والوں کا دل موم کر دیتی ہے۔ سرکاری افسروں کا تبادلہ جب ملتان ہوتا ہے تو انہیں ایسا لگتا ہے کہ انہیں سزا دی گئی ہے۔ سال میں آٹھ مہینے سخت گرمی پڑتی ہے۔ مارچ سے لے کر اکتوبر تک، دوپہر سے غروب آفتاب تک شہر میں ہو کا عالم ہوتا ہے۔ سنسان سڑکیں، دور سے دیکھیں تو لگتا ہے تنور کے اوپر کی ہوا کی طرح منظر ہل رہا ہے۔ پانی پڑا دکھائی دیتا ہے جو اصل میں نہیں ہوتا۔ اس گرمی کی وجہ سے ہی ہمیشہ سے شادیاں رات کو ہوتی ہیں رات کے دس بجے نہیں بلکہ رات تین بجے۔ دوستوں عزیزوں سے ملاقاتیں اندھیرا پھیلنے کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ گپ لگانے والے رات کا کھانا کھا کر باہر نکلتے ہیں۔ پہلے شہر کے تمام دروازوں کے باہر چائے والے کی بنچوں پر محفلیں جما کرتی تھیں اب یہ اڈے اور پھیل گئے ہیں۔ ڈیرہ اڈہ، چوک نواں شہر، ریلوے سٹیشن،

''انجمن قاتلان شب'' ہمیشہ سے قائم ہے بہت سے رکن گزر گئے بہت سے نئے آ گئے۔ انجمن کے اجلاس جاری رہتے ہیں لیکن سرکاری افسر جب ملتان میں اپنا قیام پورا کر کے واپس جانے لگتے ہیں تو ان کا دل نہیں چاہتا۔ اس قدر محبت اور مہمان نوازی کرنے والے لوگ اور کہیں نہیں ملتے۔

پاکستان قائم ہوا تو روہتک حصار، پانی پت اور کرنال سے ریل گاڑیوں کی ریل گاڑیاں مسلمانوں کو ملتان لے آئیں اس وقت ان کی تعداد لاکھوں میں ہے اندرون شہر کا تقریباً چوتھائی حصہ ان کے پاس ہے کاروبار، زراعت، صنعت ہر چیز میں وہ موجود ہیں۔ اور اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ کاروبار سے لے کر گھر داری تک سانجھی ہے۔ نوجوانوں کی زبان اردو سے زیادہ سرائیکی میں رواں ہے۔ 1977ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے قومی اتحاد کی تحریک کو کچلنے کے لیے ملک کے بعض شہروں میں جزوی مارشل لاء لگایا تھا تو ملتان میں فوج کی بہت سی نفری، بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک بھجوائے تھے۔ فوج نے شہر کے تمام دروازوں پر مورچے سنبھال لیے تو دروازوں کے اندر لوگوں نے بھی بوریاں رکھ کر مورچے بنا لیے اور 5 جولائی تک ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اندرون بوہڑ گیٹ، حرم گیٹ، پاک گیٹ، دہلی گیٹ، بازاروں میں دیواروں پر نوٹس چسپاں کئے گئے۔ ''فوج یا پولیس کا جو سپاہی یہاں سے وردی میں گزر کر دکھائے گا اسے ایک سو روپے نقد انعام ملیں گے۔'' 5 جولائی کے بعد سیاسی حالات تو تبدیل ہو گئے لیکن اس تحریک نے ایک بار پھر لوگوں کو انگریزی وارننگ یاد دلا دی کہ ملتان کو انتہائی حساس علاقہ سمجھا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فروری 1978ء کو جب کالونی ٹیکسٹائل ملز میں پتہ کھڑکا تو انتظامیہ بھڑک اٹھی۔ مزدوروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کی اور مل انتظامیہ نے مجبور ہو کر ضلعی انتظامیہ کو مدد کے لیے کہا۔ حکم دیا گیا ''کچل ڈالو'' پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کی تین سو مزدوروں کھیت رہے۔ باقی سائیکلیں اور جوتے چھوڑ کر بھاگے۔ ٹرکوں پر لاد کر لاشیں سائیکلیں اور جوتے ٹھکانے لگائے گئے۔

اڑھائی ہزار برس معلوم تاریخ اور اتنے ہی سال نامعلوم تاریخ کے ایک بحر ذخار ہے جس میں ان گنت قومیں، قبیلے اور فوجیں ایسے مل گئے جیسے دریا آ کر سمندر میں مل جاتے ہیں۔ کہروڑ پکا میں ایک سانولی عورت اپنے سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے سفید فام بچے کو گود میں اٹھا کر جا رہی ہے۔ یہ سفید ہن نسل کی نشانی ہے جو ڈیڑھ ہزار سال قبل یہاں آئے اور اسی کہروڑ پکا میں انہوں نے راجہ وکرم جیت کی فوجوں سے شکست کھائی۔

دیہات کے لوگ بیٹی کو اماں بیٹے کو بابا اور بزرگ کو کاکا کہہ کر بلاتے ہیں عورتیں چاندی کے کڑے بازو بھر ''چوڑا'' پہنتی اور اوڑھنی رنگنے کے لیے پھولوں کا کچا رنگ استعمال کرتی ہیں یہاں خوبصورت کڑھائی ہوتی ہے۔ دستکار کیمل ورک اور کاشی گری میں اپنے کمالات کا مظاہر کرتے ہیں۔ دراوڑی نسل کے چوڑی ناک اور تنگ ماتھے والے سیاہ رو بھٹہ قوم کے افراد بور بیضوی سرخ وسفید چہروں اور کھڑی ناک والے پٹھان سب فارسی اور عربی زدہ سرائیکی بولتے ہیں۔ ثریا ملتانیکر اپنی پرانی آواز میں خواجہ فرید کی کافیاں گاتی ہے۔

سمجھ　سیانی،　غیر　نہ　جانی
سبھ　صورت　ہے　عین　ظہور
رکھ　تصدیق　نہ　تھی　آوارہ
ملاں　پٹھڑے　معانی　کڈھدے
آیت　وارث　حدیث　خبر　دے
صرف　صدا　تے　تھئے　مغرور
بھن　گھت　ریت　روش　تقلیدی
راہ　تحقیقی　مسلک　فرید
کر　منظور　تے　تھی　مسرور

(ترجمہ کی کوشش: سمجھ لو کہ غیر نہیں ہے۔ ہر صورت میں خدا کا ہی ظہور ہے۔ تصدیق رکھو۔ آوارہ نہ ہو جاتنا، ملاں قرآنی آیات، رسول کی حدیث اور مذہبی معلومات ـ کے الٹے معنی نکالتے ہیں۔ انہیں صرف اپنی بلند آواز پر غرور ہے۔ تقلید کرنے کی ریت اور روش توڑو۔ فرید کا راستہ تحقیق پر مبنی ہے۔ اسے منظور کرلو اور مسرور رہو)

(صادق جعفری - روزنامہ جنگ ملتان)



طارق مسعود

ملتان اور نواح میں ماضی کی تلاش

دنیا کی تمام قدیم تہذیبیں دریاؤں کی وادیوں میں پیدا ہوئیں اور وہیں پروان چڑھیں چنانچہ نیل، دجلہ و فرات اور دریائے سندھ کی وادیوں کی تہذیبیں دریاؤں کی تہذیبیں تھیں۔ دریائے سندھ کی وسیع و عریض وادی کے علاقے میں ملتان شہر اور اس کا علاقہ بھی شامل ہے۔ ملتان قومی شاہراہ پر واقع ہے اور قدیم تاریخی شہروں میں سے ہے۔ یہ شہر اپنی قدیم تہذیب و تمدن کی وجہ سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کون جانے ماضی میں اس پر کیا گزری اور کتنے انقلاب آئے؟ تاہم تہذیبی آثار کی کھدائیوں اور ان کی تلاش سے ہی اس سلسلے میں روشنی پڑ سکتی ہے۔

ملتان کا علاقہ قدیم تمدنی آثار جیسی نعمت سے مالا مال ہے ضرورت اس بات کی ہوا کرتی ہے کہ ایسے آثار کو تلاش کیا جائے اور پھر وہاں کھدائیاں کی جائیں۔ ماضی کی تلاش کے لیے آثار کاری کی بہت اہمیت ہوتی ہے کیونکہ جہاں اور جن واقعات کے بارے میں تاریخ کے اوراق خاموش ہوتے ہیں اثر پائی کھدائیوں سے وہ انجانے اور پوشیدہ گوشے نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں مختلف اصحاب ملتان کے ہزاروں برس پرانے ماضی کا کھوج لگانے میں مصروف رہے۔ سر الیگزینڈر کننگھم نے ملتان کے قلعہ میں 1853ء میں کھدائی کی۔ 64-1963ء میں ماہر آثاریات ڈاکٹر محمد رفیق مغل نے تلمبہ میں آثار کاری پھر 71-1970ء میں ڈاکٹر مغل ہی دو مرحلوں میں سوا پانچ ہزار برس پرانے مقام جلیل پور میں آثار کنی میں مصروف ہیں۔

ایک صدی قبل سر الیگزینڈر کننگھم نے ملوئی خاندان کے چند پرانے شہر اور دیہات کے آثار دریافت کئے۔ سکندر اعظم نے 326 قبل مسیح میں ان شہروں کو فتح کیا گیا۔ کننگھم نے ملتان کے تاریخی قلعہ کے اندر ایک کنوئیں کی چالیس فٹ کی گہرائی تک کھدائی کی اس سے یہاں کے مختلف ادوار کا پتہ چلتا ہے۔ 1963ء اور 1971ء میں محکمہ آثار قدیمہ کا پتا چلایا جو وادی سندھ کے قدیم تہذیبی دور سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک سے تعلق رکھتے ہیں ان میں جلیل پور، دھنی وال اور مغل والا کے آثار بھی ہیں جو ابتدائی ہڑپائی ہیں۔ ان سے ملتان میں قدیم ترین تہذیبوں کے پانچ ہزار سالہ دور کی نشاندہی ہوتی ہے۔

جلیل پور

جلیل پور کے آثار 1963ء میں دریافت کئے گئے۔ یہ آثار ہڑپہ سے 46 میل جنوب مغرب میں ملتان سے 46 میل شمال مشرق اور عبدالحکیم کے قصبہ سے صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جلیل پوری نامی گاؤں کے قریب ہیں ان کا رقبہ 1400x1200 فٹ ہے۔ ان کی کھدائی کے دوران قبل از ہڑپائی دور اور ابتدائی ہڑپائی دور کے آثار برآمد ہوئے یہاں قبل از ہڑپائی دور کی ظروف سازی اپنی ابتدائی حالت میں ملتی ہے۔ مٹی کے بھدے اور موٹے برتن ہاتھ سے بنے ہوئے ہیں۔ ان کی بیرونی سطح بھی کھردری ہے یہ سطح مٹی اور چھوٹے چھوٹے کنکروں کی ملاوٹ سے بنائی جاتی تھی ایسے ہی برتن عامری (سندھ) کے پہلے دور میں اور سرائے کھولا (ٹیکسلا) سے بھی ملے ہیں۔ پتھر کے اوزار بھی ملے ہیں یوں لگتا ہے کہ بعض اوزار تو دوبارہ بھی استعمال کئے گئے تھے۔ مٹی کے مختلف اشکال کے بنے ہوئے منکے اور ہڈی کے اوزاروں کے استعمال کا بھی پتہ چلتا ہے لیکن تانبے کا وجود نہیں ملتا۔ سرائے کھولا (ٹیکسلا) میں بھی اس ہم عصر دور میں پیتل کے استعمال کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کے دور میں جانوروں کی ہڈیاں کثیر تعداد میں ملی ہیں جو زیادہ تر جلی ہوئی ہیں۔ ہڈیوں کی بڑی تعداد میں ملنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ وہ لوگ جانوروں کا گوشت کھاتے تھے یا پھر جلا کر فاسفورس حاصل کرتے ہوں گے۔ ان ہڈیوں سے نوکدار اوزار بھی بناتے تھے جن سے وہ شاید وہ چمڑا وغیرہ سینے کا کام لیتے ہوں گے۔ مکانوں کے نشانات نہیں ملتے صرف مٹی میں دبے ہوئے فرش ملے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ جھونپڑیوں میں رہتے تھے اگر مکان بنانے کا رواج ہوتا تو کچھ نہ کچھ آثار ضرور ملتے سرائے کھولا (ٹیکسلا) میں بھی جلیل پور کے اس دور کے ہم عصر زمانے کی دیواریں نہیں ملی ہیں۔ جلیل پور کے دوسرے دور یعنی ابتدائی ہڑپائی دور میں ظروف سازی میں نفاست آ گئی۔ غیر دلکش، بھدے اور سادہ برتنوں کی جگہ نقش و نگار اور خوبصورتی نے لے لی۔ برتن ہاتھوں کی بجائے کمہار کے چاک پر بنائے جانے لگے اور ان کا رواج عام ہو گیا۔ یہ برتن ہلکے پھلکے اور مضبوط ہیں۔ بعض برتنوں کے درمیان میں اور بعض کے پیندوں پر کالے رنگ کے سادہ سے نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ جلیل پور کے ان برتنوں سے مشابہ برتن کوٹ ڈیجی (خیر پور) سرائے کھولا (ٹیکسلا) عامری (سندھ) گوملہ (سرحد) اور بلوچستان کے بعض قدیم مقامات سے دریافت ہوئے ہیں ہڑپہ کی فصیل کے آثار کے نیچے سے بھی ایسے ہی برتن ملے برتنوں کی یہ ایک جیسی بناوٹ اور تیکنیک قدیم پاکستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ملتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شہروں کا آپس میں لین دین تھا اور وہ باہم تجارت کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی تجارتی مرکز سے یہ برتن ان تمام شہروں کو سپلائی ہوتے ہوں اس کے باوجود مقامی طور پر وقتی ضرورت پورا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور تیار کرتے ہوں گے۔

جلیل پور میں لاجورد کی موجودگی قابل توجہ ہے۔

ہزاروں برس پہلے جنوبی ایشیا اور دوسرے مشرق و مغرب میں لاجورد کی تمام ضروریات بدخشاں

(افغانستان) سے پوری ہوتی تھی۔ یہاں یہ کیسے اور کن ذرائع سے پہنچا؟ وہ خود تو اتنی دور لانے سے رہے یہی امکان زیادہ نظر آتا ہے کہ افغانستان اور پاکستان میں پانچ ہزار سال پیشتر بھی تجارتی روابط تھے۔ کاروان آتے جاتے تھے۔ افغان باشندے جو سردی سے بچنے کے لیے عارضی ہجرت کر کے گرم علاقوں کی طرف آتے ہیں لاجورد بھی لاتے ہوں گے۔ تجارت ان کا باقاعدہ پیشہ نہیں ہے صرف پیٹ کی خاطر یہاں سے چند اشیاء وہاں لے جاتے ہوں گے اور وہاں سے یہاں لے آتے ہوں گے۔ لاجورد کے بدلے یہاں سے مال خرید کر لے جاتے ہوں گے۔

بچے طرح طرح کے کھلونوں سے دل بہلاتے تھے بیلوں، بیل گاڑیوں اور دوسرے جانوروں کے کھلونے ملے ہیں معلوم ہوتا ہے یہ لوگ مویشی پالتے تھے اور ان سے کھیتی باڑی اور بار برداری کا کام لیتے تھے اور ہڈیوں سے بڑے نوکدار اوزار بھی بناتے تھے جن سے مختلف کام لیے جاتے تھے۔

پتھر کی سلیں اور بٹے بھی ملے ہیں۔ ان سے وہ مصالحہ پیسنے کا کام لیتے تھے۔ جلیل پور کے دوسرے دور میں آ کر مکانوں کی دیواریں ملنے لگتی ہیں جو ایک فٹ سے تین فٹ تک چوڑی ہیں یہ دیواریں کافی لمبی اور مضبوط ہوتی تھیں اور گارے سے بنائی جاتی تھیں۔ دیواروں کے ان آثار سے کمروں کی باقاعدہ بناوٹ کا پتہ چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ کچی دیواروں کے باقاعدہ گھر بنا کر رہتے تھے۔ چھتیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ چھت سے گری ہوئی مٹی کے نمونے بھی ملے ہیں۔

غرض آج سے پانچ ہزار اور ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے بھی یہاں کے لوگ اتنے تہذیب یافتہ تھے کہ وہ ہاتھ اور چاک پر بنائے ہوئے برتنوں، پتھر کے اوزاروں، تانبے، سونے پتھر، مٹی اور سیپ کے زیوروں کا استعمال جانتے تھے۔ مکان بنانا بھی انہیں آتا تھا۔ کاشت کاری کے لحاظ سے بھی وہ بہت ترقی کر گئے تھے اس طرح وہ بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔

مغل والا

یہ قدیم آثار خشک شدہ دریائے بیاس کے دائیں کنارے پر واقع ہیں یہاں پر وادی سندھ کی تہذیب کے ہڑپائی دور کے پرانے آثار دریافت ہوئے ہیں ان کا رقبہ 760x690 فٹ پر مشتمل ہے اور ٹیلے کی بلندی ساڑھے تیرہ فٹ قدیم آثار کے امین ٹیلے کی سطح سے مشاہدے کے لیے اٹھائی ہوئی چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آبادی بڑی ترقی یافتہ تھی۔ ظروف سازی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ برتنوں کے جو ٹکڑے ملے ہیں ان پر طرح طرح کے سیاہ رنگ کے نمونے بنے ہوئے ہیں۔ مٹی اور سیپ کی چوڑیاں ملی ہیں جن پر نقش و نگار بھی بنے ہیں یہاں سے مٹی کے بنے ہوئے مختلف کھلونے، پتھر کے اوزار، پتھر کی سلیں، مصالحہ پیسنے کی بٹے، پتھروں سے تراشے ہوئے مختلف موتی دستیاب ہوئے ہیں۔ یہاں کے برتنوں کی بناوٹ، تیکنیک اور نمونے بھی سبھی موہنجو داڑو اور ہڑپہ سے نکلے ہوئے برتنوں سے کم و بیش مشابہ ہیں۔ کھدائی ابھی تک نہیں ہوئی ہوسکتا ہے کہ یہاں آثار کاری سے متعدد انکشافات ہوں

اور پوشیدہ باقیات کی نشاندہی ہو سکے۔

دھنی وال

ہزاروں برس پرانے یہ آثار بھی دریائے بیاس کے داہنے کنارے پر اور مغل والا سے صرف دو میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہ آثار بھی ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے دور کے ہم عصر ہیں بلکہ ان سے بھی ذرا پہلے کے دور کے ملتے ہیں ان کا رقبہ 1000x800 فٹ ہے اور ٹیلے کی بلندی 28 فٹ ہے اس کا مطلب ہے کہ اس قدیم زمانے میں اس جگہ بہت بڑی آبادی تھی یہاں سے پتھر کے بنے ہوئے چاقو اور سیپ کی چوڑیاں، مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے موتی، کمہار کے چاک پر بنے ہوئے برتن، کھلونے مثلاً بیل گاڑیاں ان کے پہیئے اور جانور وغیرہ ملے ہیں۔ برتن بڑے ہلکے پھلکے اور خوبصورت ہیں۔ ایسے ہی برتن کوٹ ڈیجی (خیر پور) جلیل پور (ملتان) سرائے کھولا (ٹیکسلا) اور حمان ڈھیری (ڈیرہ اسماعیل خان) سے بھی ملے ہیں اس دور میں ظروف سازی کی یہ صنعت پاکستان کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہزاروں سال قبل ان پاکستانیوں کی بستیوں میں اشیاء کا باہمی لین دین تجارتی بنیادوں پر ہوتا ہوگا اور مختلف بستیاں ایک دوسرے کو ضرورت کی چیزیں فراہم کرتی ہوں گی اس مقام پر کھدائی ضرور ہونی چاہیے ہڑپہ کے قریب ہونے اور اتنے وسیع آثار کی وجہ سے دھنی وال کا یہ قدیم مقام بہت اہم ہے۔ گمان غالب ہے کہ کھدائی کے نتیجے میں یہاں سے نے صرف ان گنت اہم اشیاء دستیاب ہوں گی بلکہ اس پورے علاقے کی پرانی تہذیب سے آگہی حاصل ہوگی اور ٹوٹے ہوئے رشتوں پر بخوبی روشنی پڑ سکے گی۔

تلمبہ

ملتان کے علاقے میں تلمبہ بھی پرانا قصبہ ہے اس کی تاریخ دو اڑھائی ہزار سال پرانی ہے اس زمانے میں شہر بلوئی قبیلے کے زیر اثر تھا۔ 326 قبل مسیح میں جب سکندر اعظم یہاں آیا اس نے ملوئی یا ملی قبیلے کو مختلف جگہوں پر شکست دے کر اس شہر کو بھی فتح کیا۔ تلمبہ کا پرانا شہر موجودہ قصبہ کے عین جنوب میں ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ ملتان سے یہ 51 میل کے فاصلے پر شمال مشرق اور دریائے راوی کے جنوب میں چار میل کی دوری پر واقع ہے اس کو مقامی لوگ تلمبہ بھڑ بھی کہتے ہیں۔ لوک کہانیوں میں تلمبہ کا نام راجہ ٹل آیا ہے لیکن تاریخ میں اس کے نام کے بارے میں واضح اشارے موجود نہیں ہیں اسے ٹل ابہ بھی کہا گیا ہے۔ ٹل ابہ کا مطلب ہے شمالی قلعہ، ٹل ابہ، تلمبہ سے مشابہ ہے۔ شاید یہ نام مربع شکل کے برج یا قلعے کی وجہ سے یا پھر سمت کی وجہ سے پڑا ہو شرف الدین علی یزدی نے ظفر نامہ میں جس میں تیمور کے 1398ء کے حملے کا ذکر ہے تلمبہ کو تلمی لکھا ہے مگر یوں لگتا ہے کہ یہ نام 1500ء کے لگ بھگ پڑا تھا۔

تلمبہ شہر کا پرانا برج 74 فٹ بلند ہے یہاں کے قدیم کھنڈر شمالاً جنوباً 1630 فٹ شرقاً غرباً 1200 فٹ تک پھیلے ہوئے ہیں درمیان میں دو برج اب بھی موجود ہیں۔ قلعہ مربع شکل کا ہے اور اس کے گرد فصیل بھی ہے۔

یہاں کھدائی سے پانچ ادوار کی نشاندہی ہوئی ہے جو کہ پانچویں صدی قبل مسیح سے لے کر سولہویں صدی عیسوی کے زمانے کے ہیں پہلا دور ملوئی قبیلے کا ہے۔ یہ لوگ بڑے بہادر اور جفاکش تھے۔ یونانیوں کا انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ سکندر اعظم نے بڑی جدوجہد کے بعد فتوحات حاصل کیں۔ تلمبہ کا شہر اور قلعہ بھی جو اپنی مضبوطی کی وجہ سے مشہور تھا اسی دوران سکندر نے فتح کیا۔ باقی چار ادوار میں یونانی، ساسانی، ہندو و بدھ مت اور اسلامی دور کی نشاندہی ہوتی ہے چنانچہ یہاں پر اپالوڈوٹس سیکنڈ، سوتر میگاس، محمد غوری اور علاؤالدین محمد شاہ کے زمانوں کے سکے دریافت ہوئے ہیں جو دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

کھدائی کے دوران کچے مکانوں کی دیواریں اور فرش ملے ہیں۔ پکی اینٹوں کے استعمال کا بھی پتہ چلا ہے دیواریں کچی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں ان پر پلستر کیا جاتا تھا۔ تعمیر میں مختلف سائز کی اینٹیں استعمال ہوتی تھیں بعض دیواریں تو کافی بڑی اور چوڑی ہیں۔ کچی اینٹوں اور گارے سے بنی ہوئی چودہ پندرہ فٹ بلند ایک دیوار ملی ہے اس پر گارے کا پلستر بھی کیا گیا تھا۔ دیوار سے ملحق کچی اینٹوں کا بنا ہوا فرش بھی ملا ہے اس فرش پر گارے کا پلستر موجود ہے۔ پلستر کرنے کے بعد سفید رنگ سے اس پر نقش و نگار کئے گئے تھے جو دائروں اور دہری لائنوں کی صورت میں ہیں۔ یہ فرش بہت ہی خوبصورت لگتا ہے۔ کچی اینٹوں کا بارڈر بھی لگا کر اس پر پلستر کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوار اور فرش کسی خاص مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔ شاید کوئی تہوار وغیرہ منانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ دوسرے فرش عام اور بالکل سادہ ہیں۔ کسی قلعے کی حفاظت اور مضبوطی کی خاطر پرانے دور میں خندق ناگزیر تصور کی جاتی تھی۔ یہ دہری دفاعی لائن کا کام دیتی تھی ایسی ہی خندق کے آثار یہاں پر بھی ملے ہیں اس کا بیشتر حصہ اب مٹی سے بھر چکا ہے مگر پھر بھی بعض جگہ اس کے واضح نشانات موجود ہیں۔

(طارق مسعود۔ روزنامہ جنگ ملتان)



غلام محی الدین کراچی

میسان سے ملتان تک

دنیا کی تمام قدیم تہذیبیں دریاؤں کی وادیوں میں پیدا ہوئیں اور وہیں انہیں عروج حاصل ہوا، ملتان شہر اور اس کے نواحی علاقے دریائے سندھ کی وسیع وعریض وادی میں آباد ہیں، جنوبی پنجاب کے شہروں میں ملتان سب سے بڑا اور قدیم شہر مانا جاتا ہے۔ ملتان کی قدامت کے بارے میں بے شمار روایتیں موجود ہیں۔ ان روایتوں کو استناد کس حد تک حاصل ہے اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے، مگر بعض روایتیں اتنی معتبر ضرور ہیں کہ ان پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے، نامور مورخ اور سیاح البیرونی نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ گیارہویں صدی میں میرے قیام ملتان کے دوران مقامی باشندوں نے اس خطے کو دو لاکھ سولہ ہزار چار سو تیس سال پرانا بتایا۔ موجودہ دور کے ماہرین آثار قدیمہ مختلف شواہد کی بنا پر اس خطے کی تہذیب کی عمر دو لاکھ سال بتاتے ہیں، جبکہ موجودہ تاریخیں ملتان کی قدامت اس حد تک تسلیم کرتی ہیں کہ دس ہزار سال پہلے جب آریائی نسل کے لوگ یہاں پہنچے تو انہوں نے اس شہر کو آباد کیا۔

سات دریائیں کی سرزمین کے مصنف ابن حنیف نے ملتان کی تاریخ کے بارے میں بیان کیا ہے کہ ''اندرون فصیل ملتان کی گلیوں اور سڑکوں پر گزرتے ہوئے اکثر خیال آیا کرتا ہے کہ ان گلیوں کے نیچے، ان سڑکوں کے نیچے گہرائیوں میں ہزاروں برس پہلے کا وہ ملتان سویا ہوا ہے جو صدیوں تک بار بار اجڑتا اور آباد ہوتا رہا، جو اب سے ساڑھے چار ہزار سال پہلے بھی چند اہم ترین شہروں میں سے تھا۔''

تاریخی حوالے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ملتان کی فصیل اور قلعہ سکندر اعظم کے دور کا ہے، یہ زمانہ چھ ساڑھے چھ سو برس قبل مسیح کا ہے۔ یہاں اڑھائی تین ہزار برس پہلے زراعت عروج پر تھی، اپنے جغرافیائی لحاظ سے بہت اہم تھا، اس کا سب سے پہلا نام میسان تھا۔

ملتان کی جغرافیائی حیثیت پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ چاروں صوبائی دارالحکومتوں کراچی، لاہور، پشاور اور کوئٹہ سے تقریباً یکساں فاصلے پر واقع ہے۔ اس لحاظ سے اسے پاکستان کا دل کہا جا سکتا ہے اپنے محل وقوع کے لحاظ سے یہ تجارت اور آمد و رفت کے حوالے سے بھی بہت نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ چونکہ شہر دو بڑے دریاؤں کے کنارے آباد تھا اس لیے اسے ایک اہم دریائی بندگاہ کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ ملتان کی دریائی بندرگاہ سے نہ صرف

موجودہ پاکستان کے بالائی اور زیریں حصوں کے مابین تجارت ہوتی تھی بلکہ تجارتی جہاز یہاں سے ہوتے ہوئے سمندروں تک جا پہنچتے تھے اور بلوچستان کے ساحلوں کے علاوہ عراق کی بندگاہوں تک سامان تجارت پہنچاتے تھے۔

ممتاز دانش ور اور ملتان کی اہم صاحب علم شخصیت ملک خدا بخش بُچہ کے مطابق ''مغربی پاکستان کی تاریخ اور جغرافیہ میں ملتان کو شروع ہی سے قابل رشک حیثیت حاصل رہی ہے، یہ خطہ مرکز روحانیت اور منبع انوار ہونے کے علاوہ ایک خاص قسم کی مشرقی اور اسلامی ثقافت کا علم بردار ہے، جو سپاکستان کی ثقافت کے رنگا رنگ گل دستے میں ایک منفرد رنگ و بو کا مہکتا ہوا پھول، قدامت کے باوجود اس علاقے کی تہذیبی اور ثقافتی تر و تازگی ہمیشہ کی طرح آج بھی قائم ہے جو

کرشمہ دل می کنند کہ جا ایں جا است

کا مصداق ہے، آج بھی دیدہ و دل کے لیے ملتان کی وہی کشش ہے جو صدیوں سے اس کا طرح امتیاز ہے۔

ملتان کے لوگ سادہ مزاج ہیں، مہمان نوازی میں اپنی مثال ہیں، طبعاً وسیع القلب، خوش گفتار اور غیر متعصب ہیں، قیام پاکستان کے بعد ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بڑی تعداد میں مہاجرین یہاں آ کر آباد ہوئے، یہ لوگ اپنے علاقوں کا کلچر اور تہذیب ساتھ لائے، جس کی وجہ سے ملتان میں ایک رنگا رنگ ثقافت نے جنم لیا۔ ملتان فقط ایک شہر ہی نہیں ہے بلکہ اہم ترین تاریخی، سیاسی، مذہبی، علمی اور ادبی مرکز بھی ہے۔''

چوتھی صدی قبل مسیح سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک یونان، چین، عرب، فرانس اور برطانیہ کے لاتعداد سیاح یہاں آئے اور انہیں نے اپنے سفرناموں میں یہاں کی طرز معاشرت، عام زندگی اور حالات و واقعات کا بڑا دلچسپ پیرایوں میں تذکرہ کیا ہے، یونانی مورخ ایریان نے جو سکندر اعظم کے لشکر میں شامل تھا، یہاں بسنے والی ''ملوئی'' قوم کی شجاعت اور دلیری کی بڑی تعریف کی اور کہا جاتا ہے کہ سکندر اسی قوم کے خلاف لڑائی کے دوران ہی زخموں کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہوا تھا۔

ملتان اور گرد و نواح میں قدیم تہذیب کے آثار بھی ملتے ہیں، محققین کا کہنا ہے کہ پتھر کے زمانے میں بھی ملتان ایک متمدن علاقہ تھا۔ یہاں پر دو ہزار برس آریاؤں نے حکومت کی، ملتان کے قدیم باشندے کوتاہ قد اور چپٹی ناک والے ہوا کرتے تھے، بعد ازاں یہاں ایران، عراق اور وسط ایشیا سے لوگ آ کر آباد ہونے لگے، ان لوگوں اور ملتان کے قدیم لوگوں کے باہمی میل جول سے جو نسل تیار ہوئی وہ خوش شکل اور مناسب قد والی تھی، ملتان میں برہمن کھتری اور اروڑہ قوم کی اکثریت آباد تھی۔ البتہ شہر میں کھتریوں اور نواح میں اروڑوں کی تعداد زیادہ تھی۔ فصیل شہر کے اندر تنگ و تاریک گلیاں تھیں، جن میں چھوٹے، تنگ، دو تین منزلہ مکانات تھے، فصیل شہر سے باہر مکانات تھے، جن میں مستطیل دروازے اور مربع کھڑکیاں ہوتی تھیں، گھروں میں باورچی خانہ اور غسل خانہ نہیں ہوتا تھا۔

اسلامی حکومتوں کے دور میں ملتان کو ہمیشہ ایک صوبہ کی حیثیت دی گئی، لیکن برطانوی دور اقتدار میں اس کی یہ حیثیت ختم کر کے اسے کمشنری کا درجہ دے دیا گیا، قیام پاکستان کے بعد ملتان کو ڈویژن کا درجہ دے دیا گیا۔

وقت ملتان ڈویژن کا رقبہ پانچ سو میل طویل اور اڑھائی سو میل چوڑا تھا مگر اب اس کا طول و عرض ڈیڑھ سو میل اور ستر میل رہ گیا ہے۔ ملتان کے مشرق میں ضلع لودھراں و ضلع خانیوال، مغرب میں دریائے چناب اور ضلع مظفر گڑھ، شمال میں ضلع خانیوال اور جنوب میں دریائے ستلج اور بہاولپور واقع ہے۔ موجودہ مردم شماری سے مطابق ملتان شہر کا رقبہ 634 مربع کلومیٹر، ضلع ملتان کا رقبہ 3721 مربع کلومیٹر جبکہ ملتان شہر کی آبادی 1998ء کی مردم شماری کے مطابق گیارہ لاکھ بیاسی ہزار بیان کی جاتی ہے۔ آزادی سے پہلے یہاں کی آبادی محض ایک لاکھ پینتالیس ہزار تھی، پاکستان بننے کے بعد بڑی تعداد میں لٹے پٹے مہاجرین یہاں آ کر آباد ہو گئے جن کے بعد 1951ء کی مردم شماری کے مطابق ملتان کی شہری آبادی تین لاکھ اٹھاون ہزار سے بڑھ چکی تھی۔ موجودہ مردم شماری کے اعداد و شمار پر ملتان کے سماجی ماہرین بھروسہ نہیں کرتے، اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اس وقت ملتان کی آبادی پندرہ سے بیس لاکھ کے درمیان ہے، اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ مختلف دلائل بھی پیش کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ دیہی علاقوں میں پس ماندگی میں اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں دیہی آبادی شہر منتقل ہو رہی ہے آبادی میں تیز رفتار اضافے کی وجہ سے شہر کی حدود میں توسیع کا عمل ناگزیر تھا لہٰذا نئی آبادیوں کے ساتھ ساتھ کچی آبادیاں بھی تیزی سے بڑھی ہیں، جن کی تعداد تقریباً چالیس ہے۔

قدیم ملتان اونچائی پر واقع ہے یہ اونچائی قدرتی طور پر موجود نہیں تھی بلکہ جس زمانے میں شہر کی فصیل بنائی جا رہی تھی اس علاقے میں مٹی کا بھراؤ کر کے اسے ایک ٹیلے کی شکل دے دی گئی اس بارے میں ملتان کے قدیم باشندوں نے بتایا کہ یہ اقدام آبادی کو سیلاب کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا گیا تھا، کیونکہ ان دنوں راوی اور چناب شہر کے نزدیک سے گزرتے تھے، مٹی کا بھراؤ کرنے کے لیے پرانے علاقے کے شمالی حصے سے مٹی نکالی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ یہ علاقے آج بھی نشیب میں ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ ان نشیبی علاقوں میں بھی آبادیاں قائم ہو گئیں، نشیبی علاقوں میں اب بھی متعدد ایسے مکانات اور دکانیں دکھائی دیتی ہیں جو اگرچہ کسی زمانے میں سطح زمین کے برابر تھیں مگر اب زیر زمین چلی گئی ہیں اور تہہ خانوں کی مانند دکھائی دیتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد ازاں تعمیرات کرنے والوں نے موجودہ سطح زمین کو مد نظر رکھ کر بنیادیں اٹھائی ہیں، قلعے اور فصیل کے اندر آبادی انتہائی گنجان ہے پرانے علاقوں میں صفائی، سیوریج اور ٹرانسپورٹ کے مسائل انتہائی سنگین ہیں پرانے علاقوں میں گلیاں تنگ ہیں، اور بعض مقامات پر صورت حال یہ ہے کہ میت ہو جائے تو مردے کو ایک چادر میں لٹا کر ہاتھوں میں ڈال کر کسی کھلی جگہ پر لانا پڑتا ہے اور وہاں اس کی آخری رسومات ہوتی ہیں، کوئی ناگہانی حادثہ ہو جائے تو ان گلیوں میں ایمبولینس یا فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کا داخل ہونا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن نظر آتا ہے، ملتان بظاہر ترقی کی منزلیں طے کرتا نظر آ رہا ہے، یہاں تعمیراتی شعبے میں نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں، ملتان اب ایک ابھرتا ہوا اور ترقی کرتا ہوا شہر دکھائی دینے لگا ہے مگر ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جدید ترقی کے باوجود اس شہر کی قدامت کے آثار کہیں کہیں اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں یہ الگ بات ہے کہ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے ان میں شکست و ریخت کے آثار نمایاں ہیں

مگر ان کے در و دیوار ملتان کے شان دار ماضی اور عظمت و جلال کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ قدیم علاقوں میں ایک صدی سے زیادہ پرانی رہائشی عمارتیں اور ان کے در و دیوار پر نقش و نگار بھی دیکھنے والوں کو حیران کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ ان قدیم اور تاریخی ورثوں کو نہ صرف محفوظ کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ان کی مناسب مرمت اور دیکھ بھال بھی انتہائی ضروری ہے۔

ملتان کے مسائل کیا ہیں؟ ماضی میں ملتان کیسا تھا؟ آج ملتان کن مسائل میں گھرا ہوا ہے، معاشی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی اور تعلیمی اعتبار سے ملتان تبدیلیوں کے کن مراحل سے گزرتا رہا ہے، یہ جاننے کے لیے ہم نے متعدد اہم شخصیات اور بزرگ شہریوں سے گفتگو کی۔

ملتان کے پرانے علاقوں میں تنگ گلیوں اور بلند رہائشی مکانات کی وجہ ریڈیو پاکستان ملتان کے ملازم اسلم بھٹی نے یہ بیان کی کہ ملتان چونکہ گرم شہر ہے اس لیے لوگوں نے عمارتوں کی تعمیر اس انداز سے کی تھی کہ دھوپ براہ راست مکانات پر نہ پڑے نامور گلوکارہ ثریا ملتانیکر جو ہماری گفتگو کے وقت اسلم بھٹی صاحب کے کمرے میں موجود تھی، شائستہ انداز میں گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا اسلم بھائی میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں، تنگ مکانات بنانے کی وجہ یہ نہ تھی بلکہ میرا خیال ہے کہ ماضی میں شہر کی اونچائی پر بنائے جاتے تھے اور اونچائی پر ایک خاص گنجائش ہوتی ہے ملتان کے قدیم شہر کی اونچائی اطراف سے دریاؤں سے گھری ہوئی تھی اور آبادی زیادہ تھی تمام لوگ حفاظت کے پیش نظر اندرون فصیل رہنا چاہتے تھے لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ چھوٹے اور بلند مکانات تعمیر کیے جائیں۔

ثریا ملتانیکر نے ایک اور تاریخی نکتہ بیان کرتے ہوئے ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ ملتان کے لوگوں کی اکثریت غریب ہے اس کی بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ اس خطے کو بے شمار جنگیں دیکھنا پڑی ہیں بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ مار اور کارروائیوں نے مقامی لوگوں کو کبھی بھی پنپنے کا موقع نہیں دیا۔

''ہمیں یاد ہے کہ 1960ء تک ڈیرہ اڈا کے بعد کھیت ہی کھیت تھے ادھر چونگی نمبر نو کے بعد کوئی آبادی نہ تھی، ریلوے لائن کے پار بھی آبادیوں کا نام و نشان نہ تھا۔'' یہ بات کپڑے کی تھوک مارکیٹ میں کام کرنے والے عمر دراز خان نے بتائی، عمر دراز خان کا بچپن پرانے شہر میں اندرون لوہاری گیٹ، گاندھی گلی میں کھیلتے کودتے گزرا اور اب نیو ملتان میں رہتے ہیں۔ عمر دراز کا کہنا ہے کہ اب سے تیس چالیس برس پہلے شہر کا ماحول بہت پرسکون تھا، ماحول بھی صاف ستھرا تھا، اندرون شہر جو گلیاں آج ہمیں تنگ لگتی ہیں اس وقت کشادہ لگتی تھیں فصیل کے اندر واقع جائیدادوں کی قیمتیں زیادہ تھیں، کیونکہ وہاں تحفظ کا احساس پایا جاتا تھا، اب صورتحال بدل چکی ہے اس وقت اندرون قدیم شہر جائیداد کی قیمتیں کم اور بیرون شہر زیادہ ہو چکی ہیں۔ اندرون شہر تفریح کے مواقع ماضی میں بھی نہیں تھے اور لوگ چھٹی والے دن قاسم باغ میں تفریح کرنے جاتے تھے اس دن وہاں بہت رونق ہوتی تھی پہلے عشاء کے بعد لوگ کام کاج سے فارغ ہو جاتے تھے مگر اب اکثریت رات گئے تک جاگتی ہے اور بازاروں میں کھانے پینے کی دکانوں پر ا...

رونق ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے ملتان والے سوتے ہی نہیں ہیں، شہر کی رونق پہلے اتنی نہ تھی جیسی اب ہے، البتہ چوک بازار کی رونق دیکھنے والی تھی، حرم گیٹ، کالے منڈی، صرافہ بازار، حسین آگاہی، دہلی گیٹ، صرافہ بازار میں بھی رونق رہتی تھی، عیدین کی نماز پڑھنے کے لیے لوگ عیدگاہ یا قاسم باغ میں مزار شاہ رکن عالم کے احاطے میں جمع ہوتے تھے، سواری کے لیے لوگ سائیکلوں کا استعمال کرتے تھے اگر دور جانا ہوتا تو تانگے کو ترجیح دی جاتی تھی، پورے شہر میں صرف چند گھرانے ایسے تھے جس کے پاس موٹر کاریں تھیں، لہٰذا فضائی آلودگی بھی کم تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں خالص ملتی تھیں، گھروں میں فلش سسٹم کا رواج بالکل نہیں تھا۔ لیٹرین چھتوں پر بنے تھے۔ اب تقریباً ہر گھر میں فلش سسٹم موجود ہے، ماضی میں بہشتی بھی آیا کرتے تھے جن گھروں میں کنویں نہیں تھے وہ بہشتیوں سے پانی خریدا کرتے تھے کپڑے کی تھوک مارکیٹ میں جہاں ہمارا کاروبار ہے چالیس برس پہلے صرف سو دکانیں تھیں اب وہاں ایک ہزار سے زیادہ تھوک بیوپاری کاروبار کررہے ہیں، کپڑے کی ایک اور تھوک مارکیٹ چونگی نمبر 14 پر بن گئی ہے۔ غلہ منڈی پہلے بوہڑ گیٹ پر تھی اب ممتاز آباد سے آگے منتقل ہو چکی ہے۔ عمر دراز خان نے بتایا کہ ایک خرابی یہ پیدا ہوئی ہے کہ پہلے گوشت مذبح میں ہوتا تھا اور جانوروں کے ڈاکٹر ذبح ہونے سے پہلے جانوروں کی صحت سے متعلق تصدیق کرتے تھے مگر اب اندرون شہر قصائی اپنے اپنے گھروں کے باہر ذبیحہ کرتے ہیں اور براہ راست دکانوں پر فروخت کرتے ہیں۔'

خواجہ سلیمان صدیقی کپڑے کے تھوک بیوپاری ہیں، انہوں نے بتایا کہ ملتان کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی یہ ہوئی ہے کہ اس شہر کو آج تک ترقی کرنے کے مواقع فراہم نہیں کیے گئے یہاں پر صنعتیں نہیں لگنے دی گئیں، وڈیروں، پیروں اور مخدوم کے خاندانوں نے یہاں تعلیمی ادارے نہیں بننے دیئے، البتہ گیلانی خاندان کے افراد نے یہاں چند تعلیمی ادارے بنوائے تھے، افسوس کی بات یہ ہے کہ یہاں ماضی میں پانچ لاکھ کی آبادی کے لیے جتنے تعلیمی ادارے تھے آج پندرہ لاکھ کی آبادی کے لیے بھی اتنے ہی تعلیمی ادارے کام کررہے ہیں۔

ماضی اور حال کے ملتان پر روشنی ڈالنے کے لیے ہم نے شہر کی معروف ادبی شخصیت ڈاکٹر ارشد ملتانی سے ملاقات کی، ڈاکٹر ارشد ملتانی اور ان کے ساتھ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے ملتان کی بعض قدیم روایتوں کو نہ صرف زندہ رکھا ہوا ہے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے ہیں، انہوں نے ملتان کے ماضی پر نہ صرف تفصیل سے روشنی ڈالی بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اجاگر کیے جو ہمیں تاریخ کی کتابوں میں بھی نہیں ملے، ملتان کے ماضی کے اوراق کھنگالتے ہوئے انہوں نے بتایا ماضی میں ملتان کے لوگوں کا سب سے بڑا پیشہ کپڑا بُننا تھا، کاری گروں کا ایک طبقہ ریشم کے کپڑے تیار کرتا اور دوسرا کھڈیوں پر سوتی کپڑے بُنتا تھا، ریشم کا کپڑا بننے والے خود کو اعلیٰ درجے کا سمجھتے تھے جبکہ سوتی کپڑا بننے والوں کو جولاہے کہا جاتا تھا، ریشم کا کپڑا بننے والوں میں مسلمانوں کو خاص مہارت حاصل تھی اور وہ گل بدن، دریائی اور تسیلا نام کا ریشم کا اعلیٰ ترین کپڑا بناتے تھے، جو افغانستان اور وسط ایشیا کی ریاستوں کو برآمد کیا جاتا تھا، کپڑے کی تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور ہندو تاجر مسلمان کاری گروں کو کپڑے کی قیمت یک مشت ادا نہیں کرتے تھے بلکہ رُلا رُلا کر دیتے تھے، یہی وجہ تھی کہ مسلمان تنگ دست تھے، ملتان میں ترکھان اور گل کار (مکانوں پر نقش و نگار اور بیل

بوٹے بنانے والے) مسلمان کاری گر بھی بہت مشہور تھے، ملتان میں ابتداء ہی سے مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی، مگر زیادہ تر کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا، ہم نے اپنے بچپن میں کسی حجاب، مزدور یا قصائی ہندو نہیں دیکھا، سبزی، دودھ اور تیل بیچنے والے بھی مسلمان ہی زیادہ تھے، ہندوؤں میں حکیم بھی ہوتے تھے، مگر مسلمان حکیم زیادہ تھے، میرے دادا اور والد بھی حکیم تھے، ان کا کاروبار نہایت شاندار تھا، اس زمانے میں ایک اچھی بات یہ تھی کہ روپے پیسے میں برکت تھی، لوگ حلال کی کمائی پر زیادہ انحصار کرتے تھے، 1940ء کے لگ بھگ کی ایک بات بتاتا ہوں، اگر کوئی راج یا مزدور ایک دن کام کر لیتا تھا تو اسے ایک روپیہ ملتا تھا، اس ایک روپے میں دو تین دن آرام سے اپنے گھر چلا لیا کرتا تھا، اور جو لوگ دو تین روپے روزانہ کماتے تھے وہ کھاتے پیتے تصور کئے جاتے تھے، مجھے اچھی طرح وق وقت بھی یاد ہے جب پانچ آنے سیر بکرے کا گوشت اور چھ پیسے اور دو آنے سیر دودھ ملا کرتا تھا، سونا بیس روپے تولہ تھا، سن 45 یا 46 میں ملتان کی آبادی پچیس تیس ہزار بتائی جاتی تھی اس وقت شہر گنجان نظر نہیں آتا۔

جہاں تک سماجی تقریبات کا تعلق ہے ماضی میں بھی یہی رواج اور رسمیں تھیں جو آج ہیں، شادی بیاہ کی تقریبات بھی ہوتی تھیں، مگر چونکہ سستا زمانہ تھا انسان اپنی خواہشات بہ آسانی پوری کر لیتا تھا، 1949ء میں میری شادی ہوئی تھی، مجھ یاد ہے کہ میرے ولیمے پر تین سو روپے خرچ ہوئے تھے، شادی بیاہ کی تقریبات گھروں یا گلیوں میں منعقد کی جاتی تھیں، پاس پڑوس کے چند محلے والے اپنے گھر یا گھروں کے کمرے خالی کر دیا کرتے تھے، جن میں مہمانوں کو بٹھانے یا کھانا کھلانے کا انتظام کر لیا جاتا تھا۔ ساون میں ساونی میلہ یہاں کی بہت بڑی ثقافتی تقریب ہوتی تھی، اس میلے میں گانے بجانے والے، تھیٹر سجانے والے، قوالی، کھانے پینے کی دکانیں لگانے والے اور جھولے، تماشے والے دور دراز سے آ کر جمع ہوتے تھے اور دریا کے کنارے کئی کئی دن پڑے رہتے تھے اس زمانے میں دریا شہر سے قریب تھا، لوگ جوق در جوق اس میلے میں جاتے تھے، مجھے کئی ایسی پکنکیں یاد ہیں جن میں میں اپنے والد کے ساتھ شریک تھا عام طور پر پکنک دریا کے کنارے منائی جاتی تھی، وہیں پر کھانا پکتا تھا اور دن بھر اچھل کود ہوتی تھی، سواری کے لیے ان دنوں تانگہ عام تھا مگر اندرون شہر یا چھوٹے فاصلوں کے لیے لوگ پیدل ہی سفر کو ترجیح دیتے تھے، پیدل چلنا عام سی بات تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں قافلے بہاولپور حتیٰ کہ لاہور پیدل ہی جایا کرتے تھے، موٹر کاریں پورے شہر میں چند رؤسا کے پاس تھیں۔

تاریخ لکھنے کے لیے جستجو اور علم کی ضرورت ہے اور ملتان کی تاریخ کے بارے میں لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس شہر کی تاریخ ہی نہیں ہے، اس لیے درست مانا جاتا ہے کہ ملتان کی قدیم ترین تاریخ حکم چند نے لکھی تھی، یہ تاریخ ضخامت کے لحاظ سے سب سے بڑی ہے مگر اسے اس لیے مستند نہیں مانا جاتا اس میں روایتوں کا بہت زیادہ سہارا لیا گیا ہے، یہ بات ارشد ملتانی نے ہمارے اس سوال کے جواب میں کہی کہ لوگ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ملتان کی تاریخ ہی نہیں ملتی۔

ملتان کے دیہات میں ماضی کیا تھا، یہ جاننے کے لیے ہم نے موضع محمد پور گھوٹہ میں خاندانی طبیب، حکیم

حافظ محمد شریف سے ملاقات کی، وہ نہ صرف حافظ قرآن ہیں بلکہ انہیں حافظ طب بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ حکیم بوعلی سینا کی القانون کے علاوہ طب قدیم کی کئی کتابیں لفظ بہ لفظ یاد ہیں، انہوں نے بتایا کہ ملتان کے دیہات میں دینی تعلیم کا رجحان ہمیشہ سے رہا ہے بچوں کو قرآن کی تعلیم دینا لازمی تصور کیا جاتا تھا اور ماضی میں دیہی علاقوں میں کئی نامور طبیب اور علماء گزرے ہیں، جنہوں نے علم کی روشنی دور دور تک پھیلائی ہے۔ ہمارے موضع میں مولانا غلام احمد گھوٹوی مشہور عالم دین گزرے ہیں انہیں نواب آف بہاولپور یہاں سے لے گئے تھے اور بہاولپور اسلامی یونیورسٹی کا چانسلر مقرر کیا تھا، مولانا غلام احمد کے صاحب زادے مولانا عبدالحئی اب بھی وہاں پروفیسر ہیں، خود ہمارے گھرانے میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا گھر میں خواتین بچیوں کو مذہبی تعلیم دیتی تھیں، اور باہر ہمارے والد حکیم حافظ نجم الدین بچوں اور نوجوانوں کو دینی اور طب کی تعلیم دیتے تھے ہمارے گھرانے میں ہر فرد حافظ قرآن تھا اور ہمارے ہاں اصول، منطق، فلسفہ، صرف ونحو کی تعلیم دی جاتی، دور دور سے لوگ تعلیم کے حصول کے لیے آتے تھے، والد کا مطب بھی خوب چلتا تھا، اور وہ روزانہ تین سے چار سو مریضوں کو دیکھتے تھے۔

حکیم حافظ محمد شریف نے ملتان کے دیہی علاقوں کے لوگوں کے بارے میں بتایا کہ وہ انتہائی سادہ مزاج لوگ تھے، دیہی علاقوں میں جرائم بالکل نہیں تھے، لیکن جب سے دیہی علاقے شہر کی حدود سے مل گئے اور غیر لوگوں کا ان علاقوں میں عمل دخل شروع ہوا، ان علاقوں میں بھی جرائم ہونے لگے ہیں، مگر اب بھی مقامی لوگ جرائم میں کم ہی ملوث ہوتے ہیں۔ دیہی لوگ شہریوں کے مقابلے میں شفقت کا رویہ رکھتے تھے اور خدمت انسانیت کو اپنا شعار سمجھتے تھے، ہمیں یاد ہے کہ ہمارے علاقے کے ایک زمیندار حاجی الٰہی بخش کے ہاں روزانہ لنگر چلتا تھا، چالیس برس پہلے ان کے ہاں آٹھ دس مواضع سے لوگ آتے تھے اور اپنا پیٹ بھر کر جاتے تھے، دیہی علاقوں کے لوگ سادہ لباس پہنتے تھے۔

چوک بازار میں ملتان کی کڑھائی کے لیڈیز سوٹ کی ایک دکان پر ہماری ملاقات شیخ محمد اکرم عرف چاچا اکرم سے ہوئی، آپ 1947ء میں جالندھر سے ہجرت کرنے کے بعد گڑ منڈی کے علاقے میں رہائش پذیر ہوئے تھے ان کا کہنا ہے کہ اس وقت ملتان بہت ہی نفیس اور صاف ستھرا شہر تھا ہر روز دو مرتبہ چوک بازار میں صفائی کرنے والا عملہ مع گاڑی کے آتا تھا۔ جھاڑو لگنے کے بعد پانی کا چھڑکاؤ ہوتا تھا تاکہ گرد وغبار دب جائے، بازار میں کوئی چھابہ یا ریڑھی نہیں ہوتی تھی اب تجاوزات کا عالم یہ ہے کہ پیدل چلنا دشوار ہے، مجھے یاد کہ اس زمانے میں مشہور فلم ایکٹر محمد علی بھی ملتان میں رہتے تھے ان کے والد عالم دین تھے اور جامع مسجد گڑ منڈی کے خطیب تھے، میں کمسن محمد علی کا ہاتھ پکڑ کر نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں لے کر جاتا تھا محمد علی نے سات آٹھ جماعت تک عام خاص باغ سکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر 1953ء میں ملت سکول میں داخل ہوئے اس کے بعد وہ حیدر آباد چلے گئے۔

شادی بیاہ کی تقریبات کے حوالے سے شہر کے متعدد مقامی لوگوں سے بات چیت ہوئی، انہوں نے بتایا کہ ماضی میں شادی کی تقریبات زیادہ لمبی نہیں ہوتی تھیں، دو تین دن کا پروگرام ہوتا تھا مگر اب شادی کی تقریبات سات سات آٹھ دن سے پہلے ختم نہیں ہوتیں، مہندی، گنڈی وغیرہ کی تقریبات پر بھی اب خوب دھوم دھڑکا ہوتا ہے ماضی

میں شادی بیاہ کی تقریبات دن ہی دن میں نمٹ جایا کرتی تھیں مگر اب دیکھا یہ گیا ہے کہ دولہا والے دلہن کے گھر بارات لے کر رات کو ایک ڈیڑھ بجے سے پہلے نہیں پہنچتے، بینڈ باجے اور شہنائی کا رواج ماضی میں زوروں پر تھا، پرانے خیالات کے لوگ اب بھی شہنائی ضرور بجواتے ہیں۔ شہنائی صبح سویرے سے رات گئے تک وقفے وقفے سے بجائی جاتی ہے، جس کے ساتھ بڑا ڈھول یا پاپا (مشک والی بین) بھی ہوتی تھی، دن بھر محلے والوں کا سکون غارت رہتا ہے، وہ رواداری میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ دوسرے علاقوں دوسرے شہروں سے آنے والی باراتیں عموماً صبح سویرے آ جاتی ہیں اور دو پہر کو رخصتی ہو جاتی ہے، تاکہ دولہا والے رات گئے اپنے گھر واپس پہنچ جائیں لیکن ملتان میں عام طور پر باراتیں صبح چار بجے سے پہلے رخصت نہیں کی جاتیں، گاؤں اور دیہات میں طوائفوں کے ناچ کا بھی رواج ہے، ایک دن ہم گھنٹہ گھر کے علاقے کے ایک ہوٹل پر کھانے کھانے کے لیے گئے، کھانے کا آرڈر دیا کافی تاخیر ہوگئی، بیرے کو آواز لگائی تو ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے ساتھی نے جو مقامی باشندہ تھا کہا کہ ''کوئی فائدہ نہیں، یہاں آرڈر دیر ہی سے پورا کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوٹل مالکان کا خیال ہے کہ لوگ ہوٹلوں میں کھانا کھانے نہیں بلکہ گپ شپ لگانے آتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ملتان کے لوگوں کے پاس فالتو وقت بہت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اکثریت بے روزگار ہے یا اپنا کام دھندہ کرتی ہے۔'' کڑھائی گوشت اور بکری کی چانپیں یہاں کی خاص ڈشیں ہیں ہوٹل اور ریستوران یہاں رات گئے کھلے رہتے ہیں، سواری کے لیے لوگ تانگے، بائیسائیکلیں، رکشا اور ویگنیں وغیرہ استعمال کرتے ہیں، اب اندرون شہر بڑی بسیں بھی چلنا شروع ہوگئی ہیں۔ جن کی وجہ سے لوگوں کو آمد و رفت میں بڑی سہولت ملی ہے، پرانا علاقہ زیادہ صاف ستھرا نہیں ہے، اس علاقے میں کچرا کونڈیاں نہیں ہے لہٰذا لوگ کوڑا کرکٹ سڑکوں پر پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ شہری حکومت نے جگہ جگہ کوڑے کے ڈرم نصب کر دیئے ہیں مگر لوگوں نے غالباً ابھی ان کوڑے دانوں کا استعمال کرنا نہیں سیکھا ہے۔ سینما میں فلمیں دیکھنے کا رواج ختم ہو رہا ہے اور بیشتر سینما ہال تھیٹروں میں تبدیل ہو چکے ہیں ایک شہری کے مطابق ان تھیٹروں میں لچر اور بے ہودہ ڈرامے دکھائے جاتے ہیں، معیاری ڈرامے اور تھیٹر کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ مگر انہیں بزنس نہیں ملتا لوگوں کی اکثریت نے یہ شکایت کی کہ ملتان میں سیوریج اور پینے کے پانی کی فراہمی کا انتظام معقول نہیں ہے۔

ملتان میں دوسرے شہروں کی طرح سرکاری تعطیل اتوار ہی کے دن ہوتی ہے، البتہ کاروباری طبقہ جمعہ کے دن چھٹی کرتا ہے، تمام بڑے بازار، تھوک مارکیٹیں جمعہ کے دن بند ہوتی ہیں، اس کی وجہ تاجروں نے یہ بتائی کہ جب سے یہاں ڈائیوو کوچز چلنا شروع ہوئی ہیں تاجروں کے بڑے طبقے نے تجارتی سامان خریدنے کے لیے خود ہی لاہور جانا شروع کر دیا ہے اگر وہ اتوار کے دن چھٹی کریں اور لاہور جائیں تو کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہاں بازار اور تھوک مارکیٹیں اتوار ہی کو بند ہوتی ہیں۔

دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک شہر ملتان روزِ اول سے تعمیر و ترقی کے مختلف مراحل طے کرتا رہا ہے، زندہ معاشروں کی یہی پہچان ہوتی ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ ملتان میں تیز رفتار ترقی کسی دور میں نظر نہیں آئی مگر

آج کا ملتان قدیم و جدید کا حسین ترین امتزاج ہے، اب نئے علاقوں میں جدید ترین عمارتوں کے ساتھ کشادہ اور صاف ستھری سڑکیں اور باغات ابھر رہے ہیں، قدیم دینی درس گاہوں اور تعلیمی اداروں کے ساتھ جدید تعلیمی ادارے بھی پھل پھول رہے ہیں الیکٹرانک میڈیا نے جس طرح دنیا بھر میں تیزی سے ترقی کی راہیں کھول دی ہیں سرزمین ملتان بھی اس تیز رفتار مواصلاتی اور اطلاعاتی نظام کے ثمرات سے بہرہ مند ہو رہا ہے، اور وہ دن دور نہیں جب ملتان کا شمار بھی ترقی یافتہ اور جدید شہروں میں کیا جانے لگے گا۔



طاہر غنی

1857ء کی جنگ آزادی اور ملتان

جنگ آزادی 1857ء کے اہم مراکز اگرچہ میرٹھ، دہلی، جھانسی، روہیل کھنڈ، مظفر نگر، کانپور اور برصغیر پاک و ہند کی کئی دیگر چھاؤنیاں اور شہر تھے اور بلاشبہ وہاں کے لوگوں نے جنگ آزادی میں دل کھول کر حصہ لیا مگر ملتان کے حریت پسند عوام اور ملتان چھاؤنی میں مقیم دیسی فوج بھی آزادی کی اس جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں تھی۔ ان کے مجاہدانہ کارنامے تاریخ آزادی کا ایک روشن باب ہیں مگر ان گمنام مجاہدین کے کارناموں پر ماضی کی گرد جمی ہوئی ہے۔ اس عہد کے وقائع نگاروں اور مؤرخین نے مادر وطن کے ان جیالے سپوتوں کی داستان حریت نہایت اختصار سے رقم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض غیر مسلم اور غیر ملکی مورخین نے یہ غلط تاثر دینے کی کوشش کی کہ مغربی پنجاب بالخصوص ملتان اور اس کے مضافات کے لوگوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیا بلکہ انگریزوں کا ساتھ دیا اور آزادی وطن کی اس عظیم تحریک کو سبوتاژ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

حالانکہ یہ ایک بے بنیاد اور غلط الزام ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ملتان چھاؤنی میں مقیم دیسی فوج نے ملک کے دوسرے حصوں کے مجاہدین کے شانہ بشانہ جہاد آزادی میں حصہ لیا۔ انہوں نے ملتان میں انگریزی افواج کے خلاف جنگیں لڑیں دریائے راوی، چناب اور ستلج کے کناروں پر آباد کسانوں نے علم بغاوت کیا ساندل بار، نیلی بار اور گنجی بار کے وسیع وعریض علاقے میں آباد جانگلی اقوام نے کھلم کھلا انگریزوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا۔ بلکہ انہوں نے عارضی طور پر ایک خود مختار اور آزاد حکومت قائم کر لی تھی البتہ ملتان کے مٹھی بھر وڈیروں، جاگیرداروں، مخادیم، خوانین، ہندو مہاجنوں اور سکھ سرداروں نے ملک کے دوسرے حصوں کے مفاد پرست وڈیروں کی طرح انگریزوں کی امداد کی جب ہم جنگ آزادی 1857ء میں اہل ملتان کے حصے کا تاریخ کے حوالے سے جائزہ لیتے ہیں تو تین باتیں سامنے آتی ہیں۔

1۔ ملتان میں مقیم دیسی افواج کا مجاہدانہ کردار۔

2۔ ملتان کے جاگیرداروں، مخادیم، ہندو مہاجنوں اور ہندوستانی ملازمین کا کردار۔

3۔ ملتان اور اس کے مضافات میں آباد عوام بالخصوص جانگلی کسانوں کا کردار۔

جہاں تک ملتان چھاؤنی میں مقیم دیسی فوج کے کردار کا تعلق ہے۔اس وقت ملتان میں پلٹن نمبر 62 اور پلٹن نمبر 69 مقیم تھی۔ جن میں غالب اکثریت پوربی مسلمانوں کی تھی۔ ملتان کے مقامی لوگ انہیں کالے سپاہی اور کالوں کی فوج کے نام سے پکارتے تھے۔ نہ جانے یہ اصطلاح گورے سپاہیوں کے تضاد کے طور پر مستعمل ہوئی یا فی الواقع ان سپاہیوں کے رنگ کالے تھے۔ بہر حال آج بھی ملتان کے لوگ ان کالے سپاہیوں کا تذکرہ بڑے خلوص سے کرتے ہیں اور ان کے کارناموں کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ملتان چھاؤنی میں مقیم ان کالے سپاہیوں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے جس طرح مردانہ وار اپنی زندگیاں داؤ پر لگائی تھیں وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے۔مگر افسوس کہ ان گمنام مجاہدین کے ساتھ نہ تو ماضی میں انصاف روا رکھا گیا اور نہ آج ان کا صحیح مقام انہیں دیا گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے ملتان کے ان مظلوم کالے سپاہیوں پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے گئے پہلا ظلم یہ ہوا کہ یہ لوگ انگریزوں کی بجائے اپنوں کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے دوسرا ظلم یہ روا رکھا گیا اس عہد کے وقائع نگاروں اور مورخین نے ان کے کارناموں کو نہایت ایجاز و اختصار سے قلم بند کیا شاید اس کی وجہ مرکز سے ملتان کی دوری بھی ہو۔مگر سب سے افسوس ناک بات یہ کہ آزادی کے بعد بھی شمع آزادی کے ان پروانوں کی داستان حریت کے منضبط کرنے کی کوئی مثبت کوشش نہیں کی گئی اور آج بھی ان گمنام سپاہیوں کے بہادرانہ کارناموں پر ماضی کی گرد جمی ہوئی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ آج تک ان ازلی غداروں کے مکروہ چہروں کو بھی بے نقاب نہیں کیا گیا جو جنگ آزادی میں ہماری ناکامی کا باعث بنے حالانکہ ان لوگوں کی وطن دشمنی ملت فروشی اور انگریز دوستی کی داستانیں زبان زد خلائق ہیں۔

مئی 1857ء میں جب پاک و ہند کی مختلف چھاؤنیوں میں ایک جچے تلے منصوبے کے تحت انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع ہوئی تو ملتان میں مقیم دیسی فوج کی دو پلٹنوں کے سپاہیوں میں ہلچل پیدا ہوئی جن کی تعداد پندرہ سو تھی۔ انگریز کمانڈر نے کالے سپاہیوں کے جب تیور بدلتے دیکھے تو فوراً ان سے ہتھیار رکھوا کر انہیں نہتا کر دیا۔

اگرچہ انگریز افسروں نے انہیں ملک کے دوسرے حصوں کے حالات سے بے خبر رکھنے کی پوری کوشش کی تھی اور ملتان شہر اور چھاؤنی کی ناکہ بندی کرا دی تھی۔ پھر بھی مجاہدین کو باہر سے برابر خبریں مل رہی تھیں۔ملتان میں مقیم کالے سپاہیوں کو جب معلوم ہوا کہ گوگرہ اور جھنگ میں ہندوستانی سپاہیوں پر گورا فوج نے مظالم ڈھائے ہیں اور بہت سے سپاہیوں کو بیدردی سے قتل کیا گیا ہے تو انہوں نے بطور احتجاج پریڈ کرنے سے انکار کر دیا جس پر انگریز کمانڈر نے دیسی فوج کے ایک افسر اور دس سپاہیوں کو توپ پر داغ دیا۔انگریز کمانڈر کے اس وحشیانہ اقدام پر حریت پسندوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔انہوں نے جوش میں آ کر فوراً جوابی کارروائی کی اور ایک اعلیٰ انگریز فوجی افسر اور توپ خانے کے کئی گورے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا وہ آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے کیمپوں سے باہر نکل آئے اور ملتان شہر کا رخ کیا کیونکہ انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ حریت پسند شہری ان کی دل کھول کر امداد کریں

گئے۔ مگر سول انتظامیہ کے دیسی افسروں اور ملازمین نے ملتان کے باثر خوانین، مخادیم اور ہندو مہاجنوں کے ساتھ ساز باز کر کے انہیں پل شوالہ پر روک دیا اور شہر میں بدامنی کے خطرے کے پیش نظر ان سے درخواست کی کہ وہ واپس چلے جائیں جب حریت پسند سپاہی واپس لوٹے تو گورا فوج نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور کوئی تین سو مجاہدین اس موقع پر شہید ہوئے اس خونی حادثے کے بعد جب شہریوں کو سازش کا علم ہوا تو شہر میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی چھاؤنی میں مقیم انگریز خاندانوں کی جان خطرے میں پڑ گئی انہیں اس بات کا سخت خطرہ تھا کہ مجاہدین ضرور انتقام لیں گے۔ اس مرحلے پر ملتان کے انگریز کمشنر نے شہر کے باثر خاندانوں کے سربراہوں کو بلایا اور ان سے اپیل کی کہ وہ انگریزوں کے جان و مال کی حفاظت کریں اور مجاہدین کے جذبہ انتقام کی شدت کو حکمت عملی سے کم کریں چنانچہ ملتان کے انگریز دوست خاندان اور ان کے سربراہوں نے حکم سرکار کی بجا آوری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اپنے کارندوں کے ہمراہ ہنگاموں کے دوران بنفس نفیس انگریزوں کی کوٹھیوں پر پہرہ دیتے رہے۔ انگریز کمشنر کی ہدایت پر سادہ لوح حریت پسندوں سے ملاقاتیں کیں اور چکنی چپڑی باتوں سے انہیں اعتماد میں لے کر مشورہ دیا کہ محاذ آرائی کی بجائے بیس بیس کی ٹولیوں میں بٹ کر گھروں کی طرف نکل جائیں اس بات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلح انگریز سپاہی بغیر کسی مقابلے کے انہیں آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکیں لیکن مجاہدین کو فوراً اس سازش کا علم ہو گیا اور وہ ٹولیوں میں تقسیم ہو کر نکلنے کی بجائے کیمپ سے ایک ساتھ نکل کھڑے ہوئے باہر آ کر مختلف اطراف کو نکل گئے کوئی چار سو کے قریب مجاہدین کا ایک گروپ شیر شاہ کی جانب بڑھا راستے میں شیر شاہ کی خانقاہ کے گدی نشین نے انگریزوں کی ایما پر اپنے سینکڑوں ساتھیوں کی مدد سے ان نہتے سپاہیوں کا تعاقب کیا ان میں کچھ بھاگ کر شجاع آباد اور جلال پور پیروالہ کی طرف نکل گئے اور باقی ماندہ مجاہدین کو دریائے چناب میں دھکیل دیا گیا جہاں کچھ ڈوب مرے اور جو پکڑے گئے انہیں نہایت بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا۔ جو مجاہدین جلال پور پیروالہ کی جانب نکل گئے ان کے ساتھ انگریز کمشنر کے حکم پر جلال پور پیروالہ کی ایک معروف خانقاہ کے باثر سجادہ نشین نے وہی خونی عمل دہرایا اور مجاہدین کو دریائے چناب اور ستلج کے مقام اتصال پر دریا میں دھکیل دیا ان میں سے کچھ ڈوب مرے اور باقیوں کو سجادہ نشین کے کارندوں نے شہید کر دیا۔

مجاہدین کا ایک گروہ تلمبہ اور غوث پور کی جانب روانہ ہوا جن کے تعاقب میں کرنل ہملٹن نے لشکر کشی کی اور علاقے کے جاگیرداروں جن میں حیات شاہ، پیر مراد شاہ کے نام قابل ذکر ہیں کی مدد سے مجاہدین کا صفایا کر دیا گیا۔

مجاہدین کے ایک اور دستے نے سرائے سدھو کا رخ کیا یہ تعداد میں زیادہ تھے راستے میں انگریزوں کے مشہور حلیف بہاول لنگڑیال نے مقابلہ کیا وہ مقابلے میں مارا گیا۔ ملک مسو خان وینس نے مجاہدین کا راستہ روکا مگر اسے ناکامی ہوئی مہر سلطان ہراج اور ہوت سرگانہ کے ہمراہ مقابلے کے لیے آئے مگر وہ بھی ان مجاہدین کے سامنے نہ جم سکے آخر کار سرائے سدھو کے قریب حویلی کورنگا اور قتال پور کے مخدوم مہر شاہ بخاری اور لالہ انگنت رائے تحصیلدار

سرائے سدھو کے کارندوں اور ملازمین نے مجاہدین آزادی کا راستہ روکا اس جگہ زبردست لڑائی ہوئی مجاہدین اگرچہ نہتے اور تھکے ہوئے تھے مگر انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا قریب تھا کہ سید مہر شاہ بخاری کے آدمی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے کہ اتنے میں انگریزوں کے حلیف نواب غلام مصطفےٰ خان خاکوانی فوج کا ایک تازہ دم دستہ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ مجاہدین نہتے ہونے کے ساتھ بھوکے پیاسے تھے اور لڑتے لڑتے تھک چکے تھے۔ اگرچہ بڑی بہادری سے لڑے مگر انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مجاہدین کی کثیر تعداد میدان جنگ شہید ہوئی کچھ بھاگ گئے انہیں بھی سید مہر شاہ بخاری کے کارندوں نے پکڑ لیا اور دریائے راوی کے کنارے قتل کر دیا گیا لاشیں دریائے راوی میں پھینکوا دی گئیں۔ جو مجاہدین بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے انہیں نے جانگلی باشندوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا نتیجہ یہ نکلا کہ ان مفرور سپاہیوں کی وجہ سے پھر شورش پیدا ہوگئی یہ دیکھ کر لارڈ لارنس کی طرف سے جاگیرداروں، ذیل داروں اور سفید پوشوں اور نمبرداروں کے نام ایک گشتی مراسلہ جاری ہوا جس میں مفرور سپاہوں کو قتل کرنے یا زندہ پکڑنے کے بدلے ایک مربع زرعی زمین یا بیس روپے نقد انعام کام کا مژدہ سنایا گیا۔ انگریز حکومت کے اس اعلان سے مفاد پرستوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور انہوں نے مفرور حریت پسندوں کو پکڑوا کر ان کے سروں کے بدلے 'سر' کے سرکاری خطابات اور جاگیریں حاصل کیں۔

یہ تو تھا تاریخ آزادی کے حریت پسند مجاہدین کی داستان کا ایک خونچکاں باب۔ وڈیروں کی انگریز دوستی، وطن دشمنی اور ملت فروشی کا سیاہ باب اس تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ اب اس تصویر کے دوسرے رخ یعنی عام لوگوں اور بہادر جانگلی کسانوں کا کردار ملاحظہ فرمائیں جنہوں نے مجاہدین آزادی کی نہ صرف دل کھول کر امداد کی بلکہ سواری کے لیے انہیں گھوڑے دیئے ہتھیار مہیا کئے انہیں کھانا کھلاتے رہے انہیں پناہ دی بلکہ ان کے ساتھ لڑائیوں میں شامل ہوئے مگر قدرت کو یہی منظور تھا کہ مجاہدین آزادی انگریزوں کے ہاتھوں مرنے کی بجائے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں شہید ہوں۔

جب ان مجاہدین آزادی کی شہادت اور انگریزوں کی وحشت و بربریت کے قصے گھر گھر پہنچے تو دریائے ستلج، راوی اور چناب کے کنارے آباد بہادر جانگلی باشندے مجاہدین آزادی کے خون کا بدلہ چکانے کے لیے انگریزوں کے مقابلے میں نکل آئے اور پرچم آزادی بلند کیا بطل حریت احمد خان کھرل، موکھا وہنی وال، نادر شاہ، مہر وکیل ٹھٹھیا فتیانہ اور لال خان بلوچ نے قیادت سنبھال لی۔ اس بغاوت میں جانگلی جانبازوں میں سے خاص طور پر فتیانے، وہنی وال کاٹھیئے جوئیے لک، وٹو ہکھیلے اور کھرل پیش پیش تھے چنانچہ انہوں نے انگریز فوج سے باقاعدہ گوریلا جنگ شروع کر دی ان کے کیمپوں پر چھپ کر حملے کرتے سامان لوٹ لیتے ان کے حلیفوں کو تنگ کرتے یہاں تک کہ ان جانگلی اقوام نے اپنے علاقے میں ایک قسم کی آزاد حکومت قائم کر لی۔ حکومت کو لگان دینا بند کر دیا چنانچہ اس شورش کو فرو کرنے کے لیے برکلے فوج لے کر آیا مگر وکیل فتیانے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ برکلے کی وکیل کے ساتھ لڑائی اور موت پر سرائیکی زبان میں ''ڈھولے'' آج بھی زبان زد خلائق ہیں۔ برکلے کی موت کا بدلہ لینے کے لیے الفنسٹن فوج

لے کر آیا مگر وہ بھی جنگلوں میں چھپے گوریلا مجاہدین کا کچھ نہ بگاڑ سکا پھر کرنل ہملٹن فوج کا ایک تازہ دم دستہ لے کر آگے بڑھا اسے بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا مجاہدین برابر چھپ کر انگریز سپاہیوں کا صفایا کر رہے تھے اور ان کا مال و اسباب لوٹ کر انہیں نقصان پہنچا رہے تھے۔ مجاہدین کی اس گوریلا جنگ سے انگریز حکومت بوکھلا گئی چنانچہ بغاوت کو فرو کرنے اور جانگلی کسانوں کی سرکوبی کے لیے منصوبے بنائے گئے بالآخر وہی پرانا نسخہ آزمایا گیا اور مقامی رؤسا اور امراء کو جنرل کورٹ لین، نے انعام و اکرام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ چنانچہ ملک ماچھیا، لنگڑیال، نواب مصطفٰے خان خاکوانی، مخدوم ولایت شاہ گیلانی، صادق محمد خان کوتوال ملتان، سرفراز خان کھرل، مہر شاہ بخاری اور بعض سکھ سرداروں نے جنرل کورٹ لینڈ کے حکم پر ہزاروں ساتھیوں کی معیت میں جھامرہ پر حملہ کیا اس جنگ میں مجاہد آزادی احمد خان کھرل اور نادر شاہ شہید ہوئے یہ لوگ گھر کے بھیدی تھے مجاہدین کے ٹھکانوں کو جانتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریز فوج قواعد دان، ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اسلحہ سے بھی لیس تھی۔ اس لیے مجاہدین ان کے حملوں کی تاب نہ لا کر تتر بتر ہو گئے۔ اس کے بعد پکڑ دھکڑ کا عمل شروع ہو گیا جو بھی مسلمان ملا اسے قتل کر دیا گیا اس مہم میں ہزاروں مجاہدین شہید ہوئے بغاوت کے فرو ہونے کے بعد انگریزوں نے مجاہدین آزادی کو نہ صرف نشانہ بنایا بلکہ ان کو معاشی مار بھی دی گوی ان کے جانوروں کو انگریز فوج کے سپاہی ہانک کر لے گئے ان کی رہائش گاہوں کو آگ لگا دی گئی ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ سینکڑوں مجاہدین کو کالے پانی کی سزا دی گئی جن میں موکھا ؤنی وال اور لال خان بلوچ قابل ذکر ہیں غرضیکہ انتقامی کارروائیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ طویل عرصہ تک جاری رہا بغاوت کے خاتمے پر انگریز حکومت نے اپنے حلیفوں پر انعامات کی بارش کر دی۔ انگریز کے وفادار کاسئہ لیس جاگیرداروں مخادیم خوانین اور وڈیروں پر انگریز حکومت کی نوازشات کی فہرست کافی طویل ہے۔

(طاہر غنی – روزنامہ جنگ ملتان)



رضی الدین رضی

دائم آباد رہے گا ملتان

کہتے ہیں کہ دریائے راوی کسی زمانے عین اسی جگہ بہتا تھا جہاں اب پرانا شہر آباد ہے۔ بوہڑ گیٹ کے قریب سے اور چوک بازار کے وسط میں اس جگہ سے گزرتا تھا جہاں اب مسجد ولی محمد ہے۔ پھر رفتہ رفتہ دریا نے راستہ تبدیل کیا اور یہاں سے دور ہو گیا۔ دریا کے کنارے ایک بستی آباد تھی نام اس کا میسان تھا جو مول استھان، مالی استھان اور رفتہ رفتہ ملتان ہو گیا۔ 1897ء تک اسے مولتان ہی کہا جاتا تھا کسی دانشور نے صوتی آہنگ بہتر بنانے کے لیے اس کی ''واؤ'' ختم کی اور یہ ملتان ہو گیا۔ ساڑھے پانچ ہزار سال قبل دریا کنارے بسائی جانے والی بستی نے میسان سے مولتان اور پھر ملتان تک کا سفر کیسے طے کیا اس کی روداد ہمیں تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ کیسے کیسے لوگ اس شہر میں آباد تھے جنہوں نے ملتان کو ملتان بنا دیا۔

ملتانِ ماء بہ جنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ مَلک سجدہ می کنند

اولیاء کی سرزمین۔ ساڑھے پانچ ہزار سال کی تاریخ رکھنے والا دنیا کا واحد شہر جو ایک بار آباد ہوا تو پھر کوئی اسے برباد نہ کر سکا، کئی حملہ آور آئے، شہر کی گلیوں میں خون کی ہولی کھیلی گئی، نعشوں کے ڈھیر لگے، آفات آئیں، وبائی امراض پھوٹے مگر ملتان نے اپنا وجود برقرار رکھا۔

دائم آباد رہے گا ملتان
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

ملتان کیسا تھا اور اب کیسا ہو گیا ہے یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ہم نے پرانے ملتان کی باتیں بچپن میں اپنے بزرگوں اور ہمارے بزرگوں نے اپنے بڑوں سے سنی تھیں۔ کچھ باتیں ہم نے کتابوں میں پڑھیں اور چشمِ تصور میں ملتان کو دیکھا کہ وہ کیسا تھا۔ ہم آج جن سڑکوں پر گھومتے ہیں یہاں کیا ہوتا تھا ڈھول، کچے راستے، باغات، دریا یا صحرا۔

کوئی زیادہ پرانی بات تو نہیں یہی ڈیڑھ سو سال پہلے کا واقعہ ہے جب جولائی 1848ء میں انگریز فوج نے

ملتان پر قبضہ کے لیے حملہ کیا۔ مول راج کی فوج کے ساتھ پہلا بڑا معرکہ سدو حسام کے قریب ہوا۔ حملہ آوروں نے ملتان کے ''مضافات'' میں سورج کنڈ کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ سدو حسام کے قریب ایک بڑا نالہ بہتا تھا جو شہر کے لیے دفاعی لائن کی حیثیت رکھتا تھا۔ مول راج کی فوج نے سدو حسام کے مقام پر بھرپور مزاحمت کی اور جب برطانوی فوج نے نالہ پار کرلیا تو ان کے لیے ملتان فتح کرنا آسان ہوگیا۔ دوسرا بڑا معرکہ خونی برج اور دہلی دروازے پر ہوا اور یہیں سے برطانوی فوج فصیل میں شگاف ڈال کر شہر میں داخل ہوگئی۔ اس دور میں فصیل سے باہر ہر طرف کھیت تھے۔ شہر پر ایک حملہ مغرب کی جانب سے کیا گیا اور قلعے پر گولہ باری کے لیے ایک توپ ابدالی روڈ پر اس جگہ نصب کی گئی جہاں کچھ عرصہ قبل تک کمشنر ہاؤس ہوا کرتا تھا اور اب امراض قلب کا ہسپتال بن گیا ہے۔ اس توپ سے قلعے پر گولہ باری ہوئی اور ایک گولہ اس جگہ جا کر گرا جہاں 16 ہزار پاؤنڈ گولہ بارود کا ذخیرہ تھا۔ قلعہ اور پرانے شہر کا بڑا حصہ تباہ ہوگیا ہر طرف آگ لگ گئی۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ دھماکہ اتنا خوفناک تھا کہ اس کی آواز بہاولپور تک سنی گئی۔ شہر سے کئی روز تک آگ اور دھوئیں کے بادل اٹھتے رہے۔

لیکن یہ تو ڈیڑھ سو سال پہلے کی بات ہے اب اس سے پیچھے چلتے ہیں۔ 1334ء میں جب ابن بطوطہ اوچ شریف سے ملتان آیا تو ملتان سندھ کا دارالحکومت تھا۔ دریا شہر سے 10 کوس کے فاصلے پر بہتا تھا۔ شہر میں داخل ہونے کے لیے مسافر کو سامان کا کچھ حصہ اور ایک گھوڑا محصول کے طور پر دینا پڑتا تھا۔

یہ تو صدیوں پرانی باتیں ہیں یہ شہر تو اب ہمارے بچپن کے ملتان سے بھی بہت مختلف ہوگیا ہے۔ آج جہاں آرٹس کونسل کی خوبصورت عمارت ہے عین اس جگہ نہر بہتی تو ہم نے بھی دیکھی اور پل موج دریا اسی نہر پر بنے ہوئے پل کا نام تھا جو پہلے چوراہے کے نام میں تبدیل ہوا اور اس کی جگہ کلمہ چوک نے لے لی (یاد رہے کہ کلمہ چوک ختم کر کے اب یہاں پر دو نئے فلائی اوور بنا دیئے گئے ہیں) ساتھ ہی سٹیٹ بنک کی عالیشان عمارت اور اس کے پہلو میں شہر کا پہلا فلائی اوور ہے۔ یہی نہر یہاں سے پل شوالہ جاتی تھی۔ پل شوالہ سے محلّہ سوتری وٹ جاتے ہوئے اس نہر کی گزرگاہ کو پارک میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ قاسم بیلہ جو اب چھاؤنی کا حصہ بن چکا ہے اسے ملتان کا دور افتادہ علاقہ تصور کیا جاتا تھا کہتے ہیں کہ محمد بن قاسم نے ملتان فتح کرنے سے پہلے یہیں پڑاؤ کیا تھا۔ یہ چھاؤنی بھی تو انگریز نے تعمیر کرائی، اس سے پہلے تو یہاں کھیت تھے، ٹیلے تھے اور کھجوروں کے جھنڈ تھے۔ چھاؤنی کی تعمیر 1858ء میں شروع ہوئی اس دوران فوجی مقاصد کے لیے اس علاقے میں ایک نیا قلعہ تعمیر ہوا جب قلعہ نو کہلاتا ہے۔ 1859 میں امرتسر سے ملتان تک ریلوے لائن بچھائی گئی جو موجودہ فورٹ کالونی کے مغرب تک جاتی تھی۔ وہاں کشتیوں کے پل پر سے ریلوے انجن کو دھکیل کر پار لے جایا جاتا تھا جہاں دوسری گاڑی تیار ہوتی تھی جو مسافر کو منزل پر پہنچاتی تھی۔ دریائے چناب پر پل 1890ء میں تعمیر ہوا۔

جہاں اب نشتر ہسپتال اور میڈیکل کالج ہے یہاں 50 سال پہلے دور دور تک کھیت تھے، بس ایک جیل موجود تھی کہ جسے شہر سے باہر تعمیر کیا گیا تھا۔ چھاؤنی سے ڈیرہ اڈا تک ایک جانب گجر کھڈا کی آبادی تھی اور اس

ساتھ ساتھ جہاں اب شفاعت کالونی اور خالد کالونی ہے یہاں سب کھیت ہوا کرتے تھے۔اور یہ جو بوسن روڈ پر اب تعلیمی اداروں کا ایک بازار بن چکا ہے یہاں بھی کھیت ہی کھت تھے اور یونیورسٹی کا نیا کیمپس جواب شہر کا حصہ بنتا جا رہا ہے جب نیا نیا تعمیر ہوا تو اسے شہر سے کوسوں دور تصور کیا جاتا تھا۔

لیکن یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ ملتان تیزی سے پھیل رہا ہے۔نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں ۔ بلند و بالا عمارتیں اور شاپنگ پلازے تعمیر ہو رہے ہیں۔سڑکوں پر قدیم و جدید عمارتوں کا حسین امتزاج اس شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ملتان کا حسن اس کا ماضی بھی ہے اور حال بھی ۔ یقین نہ آئے تو کبھی فلائی اوور سے قلعہ قاسم باغ یا قلعہ سے فلائی اوور کو دیکھ لیجئے۔

(رضی الدین رضی - روزنامہ جنگ ملتان)



مسعود اشعر

مُونجھ آ رہی ہے

جوملتان آیا وہ روتا آیا اور جب وہ ملتان سے گیا تو روتا گیا، یہ بات اتنی مرتبہ دہرائی جا چکی ہے کہ اب اس میں کوئی ندرت اور کوئی نیا پن نہیں رہ گیا۔ لگتا ہے جیسے چبائے ہوئے بلکہ جگالی کیے ہوئے لقمے چبا رہے ہوں۔ ملتان کے لوگ بھی اتنے بہت سے لوگوں سے اتنی بار یہ جملہ کہہ چکے ہیں کہ شاید اب وہ بھی اسے سن کر زیادہ خوش نہیں ہوں گے۔ لیکن میں کیا کروں؟ میری مجبوری یہ ہے کہ میرے حال پر اگر کوئی بات صادق آتی ہے تو یہی فقرہ ہے۔ میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہوں کہ جب مجھے لاہور سے ملتان بھیجا گیا تو میں رو رہا تھا۔ بھلا لاہور چھوڑ کر کون جانا چاہے گا ملتان۔ مگر جب مجھے ملتان سے نکالا گیا تو اس وقت بھی میں رو رہا تھا۔ یوں لگا تھا جیسے مجھے دیس نکالا دیا جا رہا ہے۔ میرے پہلے رونے کے گواہ تو شاید اب اتنے نہ ہوں (ظہیر بابر جنہوں نے مجھے ملتان بھیجا تھا ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔) البتہ ملتان سے نکالے جانے پر میرے رونے کے گواہ بحمد اللہ ابھی موجود ہیں اور یہ میرے وہ مشفق و مہربان ہیں جنہوں نے مجھے تسلی دی تھی کہ ابھی چلے جاؤ فکر نہ کرو پھر آؤ گے ملتان اور زیادہ عزت کے ساتھ آؤ گے۔ انہیں دوستوں اور خیر خواہوں کی دعا سے میں ایک بار پہلے ملتان آیا اور اب، بالواسطہ ہی سہی پھر ان کے درمیان آ گیا ہوں۔

بیس برس کچھ کم نہیں ہوتے۔ آدھی زندگی ہوتی ہے ہمارے جیسے غریب ملکوں کے عام آدمی کی۔ جب میں ملتان آیا تھا (یا گیا تھا کہ یہ سطریں میں لاہور میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں) تو میرے سر پر بہت گھنے اور بہت کالے بال تھے اور جب مجھے دیس نکالا ملا تو میرا آدھا سر چٹا ہو چکا تھا۔ ان بیس برسوں میں مجھے ملتان نے بہت کچھ دیا اور مجھ سے بہت کچھ لیا بھی۔ ملتان نے مجھے دیا پیار، محبت، شفقت اور عزت (اسی ترتیب سے) اور مجھ سے لیا کیا؟ میرا دل۔ اب اگر کسی کا دل چاہے تو کہہ دے۔ لے بھائی یہ تو شاعری کرنے لگا۔ شاعری کرنے لگا یعنی جھوٹ بولنے لگا؟ (ارشد ملتانی اور اسلم انصاری نے یہ بات سن لی تو مجھے بھی ماریں گے اور کہنے والے کو بھی) میں نہیں جانتا یہ شاعری ہے یا نثر، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ملتان سے بچھڑے مجھے قریب پچیس برس ہونے آئے ہیں مگر آج بھی مجھے جو خواب آتے ہیں اکثر ان کا ماحول اور مقام ملتان ہوتا ہے اور خواب میں آنے والے لوگ بھی ملتان کے۔

کتنی ہی یادیں ہیں۔ یادیں ہی یادیں جن کو سمیٹنا چاہوں تو سمیٹ نہ سکوں۔ 1959ء کا ملتان کیسا تھا۔ لیکن ابھی 1959ء کا ملتان نہیں، اس سے ایک سال پہلے کی بات ہو جائے کہ دودھ اور شہد میں گندھی رسیلی زبان بولنے والے اس علاقہ کی محبت اور مہمان نوازی کا لطف میں ایک سال پہلے ہی لے چکا تھا۔ ان دنوں مصطفٰے زیدی لیہ میں اسٹنٹ کمشنر تھا۔ یہ وہ دن تھے جب پنجاب کے ہر ضلع میں گھوڑوں اور مویشیوں کے میلے کے ساتھ مشاعرے بھی برپا کیے جاتے تھے۔ ملتان میں بھی ہر سال ایسا ہی مشاعرہ ہوتا تھا۔ پاکستان بھر سے شاعر بلائے جاتے تھے۔ مصطفٰے زیدی خود بھی شاعر تھا، سوچا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور لگے ہاتھوں لیہ میں بھی مشاعرہ کرایا جائے، شاعروں کو ملتان تک کا خرچ ملتان والے دیدیں گے وہاں سے لیہ ہم بلالیں گے۔ میں شاعر واعر تو تھا نہیں بس دوستی میں پکڑا گیا۔ حکم ملا (مصطفٰے زیدی اپنے دوستوں کو حکم دیتا تھا) کہ ملتان پہنچو اور وہاں سے فلاں فلاں شاعر کو لے کر لیہ پہنچ جاؤ۔ اب مجھے یاد نہیں وہاں سے کون کون شاعر گیا تھا۔ مگر میرے ساتھ کار میں یوسف ظفر اور سید محمد جعفری گئے تھے یہ دونوں بزرگ راستے بھر یہ گتھی سلجھانے کی کوشش کرتے رہے تھے کہ یہ لیہ ہے کس زبان کا لفظ اور اس کا مطلب کیا ہے؟ اور یہ کہ یہ نام رکھا کس نے؟ آخر طے پایا کہ ہو نہ ہو شہر ضرور بنو امیہ نے بسایا ہوگیا اس کے بعد سید محمد جعفری نے یوسف ظفر کو للکارا۔ استاد اس مصرع پر مصرع لگایئے۔ وہ مصرع تھا۔ ع۔ بنو امیہ نے لیہ کو جب کیا آباد۔ اس مصرعہ پر کوئی مصرع تو نہیں آیا البتہ سفر اچھا کٹ گیا۔

ابھی تیز رفتار ریل گاڑیاں چلنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ لاہور سے ملتان تک سات آٹھ گھنٹوں کا سفر تھا۔ سفر رات کا تھا اور سردیوں کا موسم۔ رات کو آرام سے سونے کے لیے میں نے ایک کمبل ایک چادر اور تکیہ رکھ لیا تھا۔ صبح ریل گاڑی ملتان پہنچی تو منظور ملک سٹیشن پر موجود تھے۔ وہ ملتان میں پاکستان ٹائمز اور امروز کے نمائندہ تھے۔ چونکہ مجھے یہ رات ملتان میں ہی گزارنا تھی اس لیے وہ میرا سامان اپنے گھر لے گئے کہ رات کو وہاں رہ لینا۔ ہم دن بھر اِدھر اُدھر گھومتے اور ملتے ملاتے پھرے اور رات کو مشاعرے میں چلے گئے۔ آدھی رات کو کہیں گھر پہنچے اور سو گئے۔ میں زیادہ تھکا ہوا تھا اس لیے دیر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو منظور ملک نے سب سے پہلی خبر یہ سنائی کہ میری والدہ آپ سے اور مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ میں نے کہا بھئی مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟ کہنے لگا۔ آپ سے اس لیے ناراض ہیں کہ آپ اپنے ساتھ بستر لے کر آئے ہیں۔ ہمارے ہاں مہمان کا اپنے ساتھ بستر لانا بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ یہ میزبان کی توہین ہے۔ یعنی آپ ہمیں اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ ہم آپنے مہمان کو صاف ستھرا بستر ہی مہیا کر دیں۔ اور تم سے کیوں ناراض ہیں؟ میں نے سوال کیا۔ مجھ سے اس لیے ناراض ہیں کہ کل سویرے سے مہمان آیا ہوا ہے اور میں نے اسے ایک وقت کا کھانا بھی گھر میں نہیں کھلایا۔ مجھے تو خیر معافی مل گئی کہ میں نے کہہ دیا کہ میں بستر نہیں لایا ہوں ریل گاڑی میں لیٹنے کے لیے ایک کمبل اور چادر لایا ہوں۔ مگر منظور ملک کو معافی نہیں ملی۔ اب کھانے کا ذکر آیا ہے تو اس علاقے کا ایک اور رواج کا بھی ذکر کر دوں۔ یہاں جب آپ کسی کے گھر کھانے پر جاتے ہیں تو میزبان آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھاتا۔ جب تک آپ کھانا کھاتے ہیں وہ کھڑا رہتا ہے۔

یہ آداب کے خلاف ہے کہ آپ خود بیٹھ کر کھانا شروع کر دیں اور اس بات کا خیال نہ رکھیں کہ مہمان کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ یہ بات ڈاکٹر عبدالستار حامد نے بہت بعد میں بتائی۔ میں نے ان کو بھی اپنے گھر اسی طرح کھڑا دیکھا تھا تو ان سے یہ سوال کر دیا تھا۔ ڈاکٹر حامد بھی مہمان نوازی کی انتہا پر ہیں۔ لوگوں کو کھانا کھلانے کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ظہرانہ اور عشائیہ نہیں تو صبحانہ ہی کھلانے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ صبحانہ صبح کا ناشتہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میزبانی کا پہلا نمونہ میں نے منظور ملک کے گھر ہی دیکھا تھا اس کے بعد تو پھر جیسے عادت ہی پڑ گئی۔

ان دنوں ملتان کی سب سے مشہور سوغات دھنیے کا تیل تھا۔ سر پر دھنیے کا تیل لگاؤ اور سردائی پیو۔ کبھی گرمی قریب نہیں آئے گی۔ یہ سردائی کی بات میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میرے ملتان جانے کے کافی بعد تک النگ پر بھنگ کی کئی دکانیں تھیں۔ وہاں کھلے عام بھنگ کوٹی جاتی تھی، پیسی جاتی تھی اور گھوٹی جاتی تھی اور پھر پی بھی جاتی تھی (ظاہر ہے سب لوگ نہیں پیتے تھے) اس زمانے میں ایک سو بیس اور ایک سو پچیس فارن ہائٹ تک درجہ حرارت پہنچ جاتا تھا۔ اس دہکتی بھٹی سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ تو ہونا چاہیے تھا نا۔ کہتے ہیں بہت سے تانگے والے اپنے گھوڑوں کو بھی بھنگ پلاتے تھے کہ کہیں گھوڑا تپتی سڑک پر چلتے چلتے چکرا کر گر نہ جائے۔ ان دنوں کہا یہ جاتا تھا کہ یہاں آٹھ مہینے گرمی پڑتی ہے اور چار مہینے گرمی نہیں پڑتی۔ میں نہیں جانتا یہ بات صحیح تھی یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ادھر اپریل کا مہینہ شروع ہوا اور ادھر آندھیاں آنے لگیں۔ گھر والیاں جانتی تھیں کہ ٹھیک چار بجے آندھی آئے گی۔ ادھر چار بجے ادھر گھر کے سارے کمرے بند ہو گئے اور باہر پڑا سامان سنبھال لیا گیا لیکن پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ آندھیاں آنا کم ہو گئیں اور بھنگ کی دکانیں بھی بند ہو گئیں۔ شہر کے اردگرد باغ لگ گئے تھے اور شہر میں نئی آبادیاں اور نئی کالونیاں بس گئی تھیں۔ اس کے بعد گرمی کم ہونا ہی تھی۔ اور پھر ڈیزرٹ کولر بھی تو عام ہو گئے تھے۔

آج ملتان میں جو شور ہنگامہ اور بھاگ دوڑ نظر آتی ہے اس وقت اس کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ ایک نہایت پرسکون شہر تھا۔ حسن پروانہ روڈ پر جہاں امروز کا دفتر تھا وہاں صرف تانگے ہی چلتے تھے اور وہ بھی اکا دکا۔ ڈیرہ اڈا چوک سے ریکس سینما تک کھیت ہی کھیت تھے۔ نواں شہر بھی کچھ ایسا گہما گہمی والا علاقہ نہیں تھا۔ شہر کا سارا ہنگامہ اور ساری رونق حسین آگاہی، چوک بازار اور شہر کے قدیم دروازوں کے اندر یا ان کے آس پاس ہی تھی۔ امروز نے جب شہر میں تقریبات کے لیے ایک ہال تعمیر کرنے کا مطالبہ کیا تو مختار مسعود نے جو اس وقت ڈپٹی کمشنر تھے ریکس سینما کے ساتھ ہال بنانے کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ اس کا نام انہوں نے ایوان اورنگ رکھا تھا۔ کہتے تھے اورنگ زیب ملتان میں رہ چکا ہے اس لیے اس کا نام یہی ہونا چاہیے۔ وہ ہال نہیں بنا تو کمشنر حماد رضا اور ڈپٹی کمشنر ڈاکٹر امتیاز کے زمانے میں ایوان ملتان بنانے کا ڈول ڈالا گیا۔ اس کا نقشہ بن گیا بلکہ تعمیر بھی شروع ہوئی مگر پھر نہ ایوب خان رہے، نہ جشن ملتان اور نہ حماد رضا اور نہ ڈاکٹر امتیاز۔ آدھی پونی جو عمارت بنی تھی وہ کھنڈر بنی کھڑی رہی۔ آنے والوں نے چوٹ کی کہ یہ عمارت بنانے والے مغلوں کی اولاد معلوم ہوتے تھے کہ قلعہ تعمیر کر رہے تھے۔

ان دنوں اگرچہ چھاؤنی کی مال روڈ کو ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا لیکن دراصل ٹھنڈی سڑک ابدالی روڈ تھی۔

اس سڑک پر سرکاری افسروں کے بڑے بڑے بنگلے تھے یا پرانے خاندانوں کی کوٹھیاں۔ اس وقت کون سوچ سکتا تھا کہ یہاں بھی تجارتی ادارے اور دفتر بن جائیں گے۔ ہاں۔ سڑک کے آخری سرے پر مس چیلا کا جونیئر سکول تھا (ہمارے بچوں کو اچھا سکول مل گیا تھا) اس سڑک کو کمرشل بنانے کا سلسلہ پی آئی اے نے شروع کیا۔ اور اب تو یہ حال یہ ہے کہ کم سے کم میں تو اس سڑک کو نہیں پہچان سکتا۔

مختار مسعود کا ذکر آیا ہے تو ایک واقعہ اور سن لیجئے۔ اس وقت ادیب شہر کی حیثیت سے تو ان کا نام نہیں ہوا تھا لیکن ان کے شوق ادیبوں والے ہی تھے۔ ان کی دوستی لکھنے پڑھنے والوں کے ساتھ ہی تھی۔ آغا شیر احمد خاموش اور منشی عبدالرحمٰن خان جیسے اصحاب کے ساتھ ان کی نشستیں رہتی تھیں۔ قدرت اللہ شہاب تو خیر ان کے دوست تھے ہیں کہ ان کی دعوت پر ہی قدرت اللہ شہاب ملتان آئے، یہاں رائٹرز گلڈ کی شاخ قائم کی اور منشی عبدالرحمٰن خان کو اس کا سیکریٹری بنایا۔ اب اس پر جو جھگڑے ہوئے وہ الگ قصہ ہے۔ میں نیا نیا ملتان آیا تھا۔ ایک دن مختار مسعود سے ملنے ان کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ نومبر کا مہینہ تھا سردی پڑنے لگی تھی۔ ان کے دفتر والے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا وہ باریک ململ کا سفید کرتا پاجامہ پہنے بیٹھے ہیں۔ مجھ سے رہا نہیں گیا کہہ بیٹھا۔ ملتان کی گرمی منا رہے ہیں۔ کہنے لگے۔ میرا اعتبار نہ کرنا۔ جون جولائی کی گرمیوں میں آؤ گے تو ہو سکتا ہے میں تھری پیس سوٹ پہنے بیٹھا ہوں۔ مختار مسعود کی نفاست اور ان کا نستعلیق پن یاد آیا تو بی اے قریشی بھی یاد آ گئے، کیا نفیس اور کیسے وضع دار انسان تھے۔ ملتان کے کمشنر تھے ایک بار رمضان میں ہم چند لوگ ان سے ملنے چلے گئے۔ جب معمول بہت تپاک سے ملے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، ہم نے رخصت چاہی تو بولے میں نے شک کا فائدہ اٹھا کر آپ سے چائے یا کافی کا نہیں پوچھا شاید آپ کا روزہ ہو۔ یہی بی اے قریشی تھے جنہوں نے گورنر کو لکھا تھا کہ ملتان میں کمشنر کی کوٹھی ایکڑوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ کمشنر کے لیے ایک چھوٹی سی صاف ستھری کوٹھی کافی ہے اسے توڑ کر یہاں بہت سے گھر بنا دیئے جائیں۔

جب امروز ملتان پہنچا تو اس وقت بھی وہاں سے زمیندار سدھار جیسے ہفت روزہ اخبار اور ایک دو مقامی روزنامے نکلتے تھے۔ یہاں ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی ہوتی تھی۔ اسد ملتانی کے بعد کشفی ملتانی، کیفی جام پوری اور پھر ارشد ملتانی اور اسلم انصاری وغیرہ پہلے ہی ملک بھر کے ادبی رسالوں میں چھپتے تھے اور ادبی حلقوں میں جانے جاتے تھے۔ ملتان سے باہر سے جو شاعر اور ادیب یہاں آئے تھے ان میں عرش صدیقی، جابر علی جابر (جو بعد میں جابر علی سید ہو گئے تھے)۔

عاصی کرنالی اور ابن حنیف کی تخلیقات بھی پاکستان بھر میں پڑھی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا ملتانی زبان پر تحقیقی مقالہ پاکستان اور ہندوستان میں اس موضوع پر سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ ملتان میں ایک صاحب ایسے بھی موجود تھے جنہوں نے ہالی وڈ کی فلموں یا کسی ایک فلم میں کام کیا تھا (چاہے وہ ایکسٹرا کا ہی کام ہو) یعنی ایسا نہیں تھا کہ ان علاقوں کے جنہیں اب سرائیکی وسیب کہا جاتا ہے، علماء فضلاء اور ادیب و شاعر اس علاقے سے باہر نہیں جاتے تھے، یا پھر یہ علاقہ ادبی و ثقافتی چہل پہل سے محروم تھا۔ اس لیے اگر میں اپنے منہ میاں مٹھو بنوں اور یہ کہوں کہ ملتان میں

امروز کے آنے سے ہی یہ تمام سرگرمیاں پیدا ہوئیں اور چہل پہل شروع ہوئی تو صحیح نہ ہوگا۔ البتہ میں یہ دعویٰ ضرور کر سکتا ہوں کہ امروز نے ان سب کو ایک پلیٹ فارم اور ایک مرکز مہیا کر دیا اور اس چہل پہل میں تیزی، طراری اور پھرتی پیدا کر دی۔ امروز نے نئے لکھنے والوں کے لیے اپنے صفحات پیش کیے اور تھوڑی بہت ان کی رہنمائی بھی کی۔ یعنی امروز نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ ملتان میں تقریبات کے لیے بڑا ہال تعمیر کرنے، ریڈیو سٹیشن کھلنے اور ملتان کی اپنی یونیورسٹی بنانے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ پھر ان مطالبوں کو عملی شکل دلانے میں بھی امروز کا ہی ہاتھ ہے۔ اب شاید ان شاعروں ادیبوں اور ڈرامہ نگاروں کے نام لینے کی ضرورت نہیں ہے جو امروز کے صفحات سے نکل کر ہی وسیع تر اُفق کی جانب روانہ ہوئے۔ اور آج وہ بڑے ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔

پچھلے دنوں میں نے سرائیکی ویب کے بارے میں کسی صاحب کا مضمون پڑھا۔ ان صاحب نے جنوبی پنجاب کی محرومیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان لوگوں کے نام بھی گنائے ہیں جنہوں نے اس علاقے کے مسائل کو اجاگر کیا اور سرائیکی زبان و ثقافت کو اس کی اپنی پہچان دلانے کے لیے کوشش کی۔ مگر مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ انہوں نے سب کے نام لیے ایک نام نہیں لیا تو وہ ریاض انور کا تھا۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ریاض انور ہی تھا جس نے سرائیکی زبان، اس علاقے کی ثقافت اور یہاں کی موسیقی کو مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) تک پہنچایا۔ کیا سچ مچ لوگ بھول گئے کہ ہر سال جشن فرید کا اہتمام کون کرتا تھا؟ کیا ہم بھول گئے کہ اس جشن میں ہر سال مغربی اور مشرقی پاکستان کے کتنے نامور ادیب، شاعر اور موسیقار حصہ لیتے تھے؟ اگر ریاض انور یہ جشن نہ کرتا تو کیا ہم مشرقی پاکستان کے کوئی جیسم الدین اور فردوسی خانم جیسے شاعروں اور گانے والوں کو سن سکتے تھے، ان سے مل سکتے تھے اور ان تک اس علاقے کا کلچر پہنچا سکتے تھے؟ دس بارہ سال پہلے کی بات ہے لاہور میں کوئی جسیم الدین کی بیٹی ریحانہ (شاید یہی نام ہے ان کا) ملیں کہنے لگیں اپنے بابا کے ساتھ میں نے سب سے پہلے جس غیر ملک کا سفر کیا تھا وہ پاکستان تھا۔ ان کے منہ سے پاکستان کو غیر ملک کہنے سے مجھے جتنا صدمہ ہوا اس کا آپ اندازہ لگا ہی سکتے ہیں لیکن مجھے یاد آگیا کہ آخر جشن فرید میں کوئی جیسم الدین اپنے ساتھ اپنی بیٹی کو بھی لائے تھے۔ اس وقت وہ پندرہ سولہ برس کی تھی۔ یہ وہ صاحب زادی تھیں جو ان دنوں بنگلہ دیش کے ایک وزیر کی بیوی تھیں اور یہ بھول گئی تھیں کہ جب وہ یہاں آئی تھیں یہ ملک ان کا اپنا ملک تھا اور جسیم الدین پاکستان کے شاعر تھے۔ بہر حال جشن فرید کیا ہوتا تھا اس علاقے کی عید ہوتی تھی اور اب میں یہ بھی بتا دوں کہ پٹھانے خاں اور جانباز جتوئی جیسے کافی گانے والوں اور سرائیکی شاعروں کو بھی ان کے گاؤں سے ریاض انور نے ہی باہر نکالا تھا۔ انہوں نے ملک بھر میں شہرا اسی جشن کے ذریعہ پائی۔ ریاض انور کے ساتھ ہوتے تھے رفیق خاور جسکانی، کریم خاں تونسوی اور ارشد ملتانی۔ اور اگر سردار عبدالجبار خاں ان سب کے سرپرست تھے تو اس کی وجہ بھی ریاض انور تھا۔ ریاض انور کی وکالت میں ان کا جونیئر تھا اور سردار صاحب اسے اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔

میں نے یہاں صرف سرائیکی ادب و ثقافت کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے کام کرنے والوں کے نام لیے

ہیں اور وہ بھی چند نام کہ میں فہرست مرتب نہیں کر رہا ہوں۔ اردو ادب کے لیے رائٹرز گلڈ اور اردو اکادمی نے جو کچھ کیا ہے اور اپنے ہفتہ وار اجلاسوں کے ذریعہ ادب کا جو تنقیدی ذوق پیدا کیا ہے اس کے بیان کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس وقت شہر میں ایسے ادیبوں اور نقادوں کی ایک کہکشاں تھی جو ادبی اور ثقافتی افق کو روشن کر رہی تھی۔ عرش صدیقی ان سب کے روح رواں تھے۔ وہ لوگ جو کچھ عرصے ملتان میں رہے پھر آگے نکل گئے ان میں ڈاکٹر سلیم اختر، اکرام اللہ، عبدالرشید، فاروق حسن اور پروفیسر نذیر احمد بھی تھے۔ نذیر احمد تو یہ دنیا ہی چھوڑ گئے باقی جو ہیں وہ اب تک ملتان کو یاد کرتے ہیں۔ لیجیے میں اصغر ندیم سید کو تو بھولے ہی جا رہا ہوں۔ یہ دوسری نسل تھی میرے ہاں جانے کے بعد اصغر ندیم کے ساتھ فیاض تحسین، انوار احمد، شمیم ترمذی، مبارک مجوکہ، عابد عمیق، صلاح الدین حیدر، تنویر اقبال اور دوسرے نوجوان تھے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ لطیف الزمان خاں کو کس جگہ رکھا جائے؟ ان کی اپنی ہی جگہ ہے، ان کے مقام پر اور کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ ہر معاملے اور ہر مسئلے پر اپنی رائے، کوئی مصلحت اور کوئی سمجھوتہ نہیں۔ میرا خیال ہے فرخ درانی کو بھی کسی نسل یا گروہ میں نہیں رکھا جا سکتا وہ بھی اپنی ذات میں واحد ہیں۔ سنا ہے وہ امریکہ چلے گئے ہیں۔

آزادی کے بعد ملتان کی سماجی اور ثقافتی بلکہ سیاسی زندگی میں بھی جس نئے عنصر نے اپنی ایک ممتاز جگہ بنائی وہ روہتک حصار کے علاقے سے ہجرت کر کے آنے والے خاندان تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں میں مشرقی پنجاب کے خاندان بھی تھے اور کچھ دہلی اور یو پی کے بھی مگر رنگوں کے اس موزیک میں روہتک والوں کا اپنا ہی رنگ تھا۔ سب سے الگ۔ آج تو ملتان کے سیاسی افق پر یہ خاندان بڑی حد تک چھائے ہوئے نظر آتے ہیں حتیٰ کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں ان کی نشستوں پر اور کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا لیکن اس وقت بھی ان کا اثر گہرا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ روہتکی زبان نے اس شہر اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں ایک نیا لہجہ روشناس کرایا تھا۔ مجھے ان کی شاعری سننے کا بھی موقع ملا۔ مرحوم حشمت وفا ان کے درمیان کافی عرصے رہے تھے اور ان کی زبان اور ان کے لہجے میں ہی بول بھی لیتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے روہتکی زبان کا مشاعرہ سننا ہے؟ میں نے کہا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ، ابھی چلو۔ کہنے لگے شام کو چلیں گے۔ شام کو ہم ہنوں کے چھجے پہنچے۔ گھروں کے آگے جو گھیر سا تھا اس میں چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ بیٹھے تھے ہماری خوب آؤ بھگت ہوئی۔ حشمت وفا نے جب انہی کے لہجے میں کھڑی بولی بولنا شروع کی تو بے تکلفی کی فضا بھی پیدا ہو گئی۔ پھر شاعری ہوئی۔ اس شاعری میں جو بے ساختگی اور برجستگی تھی اس نے ہمیں اتنا محظوظ کیا کہ ہم بار بار ان سے شعر سنتے رہے۔ مرحوم حسن رضوی نے بھی انتقال سے چند برس پہلے اس زبان میں کچھ نظمیں اور گیت لکھے تھے۔ ان گیتوں کو گانے والیوں نے بھی گایا اور خود حسن رضوی نے بھی۔ یہ گیت کتابی شکل میں بھی چھپ چکے ہیں۔ کیسے صاف، کھلے ڈھلے اور بے دھڑک لوگ ہیں یہ۔ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب ایک گورے چٹے ہٹے کٹے نوجوان نے امروز کی ردی خریدنا شروع کی۔ اب میں بتا نہیں سکتا کہ میرے ساتھ کس زبان میں وہ بات کرتا تھا۔

ملتان میں ریڈیو آیا تو اندازہ ہوا کہ یہاں کیسا کیسا جوہر قابل موجود ہے۔ ریڈیو کو یہاں صرف اچھے لکھنے والے ہی نہیں ملے بہت ہی اچھے صداکار اور گلوکار (ریڈیو والوں کی زبان میں) بھی مل گئے۔ اب میں کس کس کا ذکر کروں۔ اس وقت تو فرح مراد، اکرام اللہ، عفت ذکی اور نشاط پروین ہی یاد آ رہے ہیں۔ مشہور اور مقبول مغنیہ ناہید اختر ملتان ریڈیو کی ہی دریافت ہیں۔ اس وقت یہ ہوں گی پندرہ سولہ سال کی۔ اپنی بہن حمیدہ اختر کے ساتھ برقعہ میں لپٹی لپٹائی ریڈیو سٹیشن آتی تھیں۔ یہ 1971ء تھا اور مشرقی پاکستان میں ہم اپنی بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ان دنوں ناہید اختر نے نوشابہ نرگس اور الطاف قریشی (یہ تیسرے الطاف قریشی تھے، آزاد کشمیر والے) کے لکھے ہوئے جو ترانے گائے وہ بہت مقبول ہوئے۔

اب سیاست کی طرف آیئے۔ قسور گردیزی کو میں پہلے سے جانتا تھا کہ وہ نظریاتی طور پر میاں افتخار الدین کے ساتھ تھے اس لیے لاہور امروز میں ان کا آنا جانا تھا۔ اس علاقہ میں بائیں بازو کی سیاست کا مرکز ومحور وہی تھے ملتان آ کر معلوم ہوا کہ وہ صرف سیاست دان ہی نہیں ہیں ادیب بھی ہیں۔ افسانے لکھتے ہیں۔ کئی ادبی محفلوں میں انہوں نے اپنے افسانے سنائے بھی۔ کتابوں کا شوق اتنا کہ ان کی ذاتی لائبریری بہت سی پبلک لائبریریوں سے بڑی تھی۔ انکے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی ولایت گردیزی اور عطاء اللہ ملک۔ وہ بھی بائیں بازو کی سیاست کے بڑے نام۔ قسور صاحب نے خود ہی یہ دنیا نہیں چھوڑی چند برس بعد ولایت حسین کو اپنے پاس بلا لیا۔ دونوں بھائی ہر معاملے میں یک جان دو قالب تھے۔ عطاء اللہ ملک دوستوں پر بے پناہ محبت اور شفقت نچھاور کرتے رہتے تھے ان سا بھی کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ناصر رضوی ان معنی میں تو عوامی لیڈر نہیں تھے جن معنی میں قسور گردیزی تھے یا عطاء اللہ ملک ہیں لیکن وہ یاروں کے یار تھے اور عوامی لیڈر بننے کے خواہش مند۔ مسلم لیگ جو ایوب خان کے زمانے میں کونشن لیگ بن گئی تھی ملتان کے پرانے گردیزی، گیلانی اور قریشی خاندانوں کے گرد ہی گھومتی تھی۔ وہ بہت ہی بڑے لوگ تھے۔ ہمارا ان سے رابطہ صرف خبروں تک تھا۔ البتہ صاحبزادہ فاروق ہمارے ان مہربانوں میں سے ہیں جو عوامی لیگ میں رہے یا پیپلز پارٹی میں ہمارے قریب ہی رہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ دوسری جماعتوں کے ساتھ ہماری قربت نہیں تھی۔ جمعیۃ العلمائے پاکستان اور جماعت اسلامی سب کے ساتھ ہماری دوستی تھی۔ جماعت اسلامی کے عقیل صدیقی سے تو ہماری خوب بے تکلفی تھی۔ بھٹو حکومت کے زمانے میں کسی خبر پر جماعت اسلامی نے امروز پر مقدمہ کر دیا۔ اس اعتبار سے ان کے ساتھ ہماری لڑائی ہونی چاہیے تھی لیکن ہوتا یوں تھا کہ جب عدالت میں ہماری پیشی ہوتی تھی تو ہم اور جماعت کے امیر اکٹھے بیٹھ کر چائے پیتے اور ہنستے کھل کھلاتے عدالت میں پیش ہوتے۔ حتیٰ کہ ایک بار پولیس نے امروز کے خلاف مقدمہ کیا تو جماعت کے اس وقت کے ممتاز رہنما شیخ خضر حیات نے (جو بعد میں ہائی کورٹ کے جج بنے) ہماری طرف سے مقدمہ لڑا۔ پیپلز پارٹی آئی تو اپنے ساتھ نوجوان سیاسی کارکنوں کی کھیپ کی کھیپ لا دی۔ اشفاق احمد خاں، مختار اعوان، محمود بابر اور بیرسٹر تاج لنگاہ پارٹی کے جوشیلے کارکن، پارٹی کے لیے لڑنے مرنے کو تیار۔ بھٹو کے ایک جلسے عام میں حکومت (ایوب خان کی حکومت) کے کارندوں نے ہنگامہ کرانے کی کی کوشش کی تو ایک

نوجوان نے شور مچانے والے شخص کو کرسیاں مار مار کر لہولہان کر دیا۔ بڑا تماشہ ہوا۔ جلسہ قلعہ پر نیچے سٹیڈیم میں ہو رہا تھا ہم اوپر کھڑے تھے۔ ہمارے ساتھ اسلم سکھیرا صاحب بھی تھے۔ وہ ایس ڈی ایم تھے۔ یعنی سرکار کی طرف سے انتظام کرنے آئے تھے۔ جب ہنگامہ کرنے والے آدمی کی پٹائی شروع ہوئی تو اسلم سکھیرا چیخے۔ دیکھو تو، وہ اس بے چارے کو مار رہے ہیں۔ اس پر اے پی پی کے افضل خان نے ہنس کر کہا۔ یہ کہیں نا کہ ہمارے آدمی کو مارے ڈال رہے ہیں۔ اس پر اسلم سکھیرا ہنس پڑے۔ ہاں ہاں، ہمارے آدمی کو مار رہے ہیں۔

مجھے وہ دوست اور وہ بزرگ یاد آ رہے ہیں جو اب ہم میں نہیں رہے مگر مجھے ہمیشہ یاد آتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ناصر رضوی یاد آ رہے ہیں۔ ملتان میں تو ان سے اتنی قربت نہیں رہی مگر لاہور میں اتنے قریب آ گئے کہ لگتا تھا ایک زمانے کی روشنی ہے۔ کیا شاندار انسان تھا اور کس طرح چلتے پھرتے اس دنیا سے گیا۔ لیجئے یہ عرش صدیقی ہیں۔ ان کے ساتھ تعلق لاہور ہی سے تھا۔ ملتان پہنچا تو سب سے پہلے جس شخص نے سہارا دیا وہ عرش صاحب ہی تھے۔ انہوں نے ہی دوسرے ادیبوں اور شاعروں حتیٰ کہ کالجوں کے استادوں نے سے بھی مجھے ملوایا۔ اور یہ حسن رضا گردیزی ہیں۔ بلا کہ بذلہ سنج۔ سرائیکی میں شاعری کرتے ہیں۔ ہجو اس بلا کی لکھتے ہیں کہ جس پر بھی کوئی دوہڑہ لکھ دیا وہ مہینوں منہ چھپاتا پھرتا۔ میں ملتان بدر ہو کر لاہور پہنچا تو خط لکھا۔ اب تمہاری شرافت کا اعتبار آیا۔ جو انسان زندگی میں کبھی مصیبت سے نے گزرے اس کی شرافت پر شبہ ہونے لگتا ہے اور یہ عتیق فکری ہیں۔ فلسفی ہیں، ماہر موسیقی ہیں، طبیب ہیں اور زردوزی کا کام کرتے ہیں۔ بولتے ہیں تو کسی کی نہیں سنتے۔ کسی زمانے میں بمبئی چلے گئے تھے۔ وہاں آغا حشر کے ڈراموں کے بورڈ پینٹ کرتے رہے۔ ان کے ساتھ ہی بہادر شاہ گردیزی یاد آ رہے ہیں۔ عجب لا ابالی انسان۔ ماں باپ نے انگلستان بھیجا تھا پڑھنے کے لیے لیکن جیسے گئے تھے ویسے ہی آ گئے۔ حسین شہید سہروردی سے دوستی کا دم بھرتے ہیں کہ اردن کے شہزادہ سے ثروت کی شادی ہوئی تو ملتانی کام کا قیمتی جوڑا سلوا کر کراچی لے گئے۔ انہیں دنیا میں کوئی کام نہیں سوائے گھومنے پھرنے کے۔ رات گئے وہ امروز کے دفتر کے باہر بیٹھ جاتے ہیں کہ تازہ تازہ اخبار پڑھ لیں گے۔ پھر یوں ہوا کہ عتیق فکری نے زردوزی چھوڑ کر مطب کھول لیا۔ ایک دن بہادر شاہ بھاگے بھاگے میرے پاس آئے مجھے حسین آگاہی میں دکان دلوا دو۔ آپ دکان کیا کریں گے؟ میں نے پوچھا۔ جی میں دکان کروں گا۔ ہنس کر بولے کاہے کی دکان؟ کفن کی اور اسی جگہ جہاں عتیق فکری نے اپنا مطب کھولا ہے۔ خوب دکان چلے گی۔ یہ تھے بہادر شاہ اور یہ عاشق حسین حسینی ہیں۔ سرائیکی شاعری کرتے ہیں، روشن چراغ کے نام سے رسالہ بھی نکالتے ہیں اور اسی نام سے سرمہ بھی بناتے ہیں۔ مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ پرانی باتیں سناتے ہیں اور اپنی شاعری سے بھی مجھے نوازتے ہیں۔ اور یہ بزرگ ہیں آغا ارسطو جاہی۔ تاریخی شخصیت حکیم رجب علی کے خاندان سے ہیں۔ مشرقی پنجاب کے شہر جگراؤں سے ہجرت کر کے ملتان آئے ہیں۔ ان کے گھر میں بے شمار تاریخی نوادرات اب بھی ہیں۔ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے ہیں۔ اپنا مجموعہ کلام شہنشاہ ایران کے نام منسوب کیا ہے۔ اور ہاں۔ حاجی حمید الدین تو رہ گئے۔ کہیں راجستھان سے آئے تھے پہلے فردوس ہوٹل

چلاتے رہے پھر ایک اور ہوٹل کھولا اور ادیبوں کے نام وقف کر کے اسے رائٹرز گلڈ کو دے دیا۔ خوب آدمی ہیں۔ ہر وقت دوستوں کی بے وفائیوں اور دنیا سے خلوص اٹھ جانے کا رونا روتے رہتے تھے۔ ہوٹل کی دیواروں پر بھی اس قسم کے شعر فریموں میں سجے تھے۔ شبیر حسین اختر کہتے Haji sahib deals in khloos۔ آخر رائٹرز گلڈ والوں نے بھی ان کے ساتھ دغا کی اور انہیں گلڈ ہوٹل بند کر کے عافیہ کھول لیا۔ پھر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جس عمارت میں امروز تھا اس کے اوپر رہتے تھے۔ تانگہ رکھا ہوا تھا جس کا کوچوان ان سے بڑی عمر کا تھا۔ معلوم نہیں ان کے بعد تانگے گھوڑے کا کیا ہوا۔ اور اب یاد آ رہے ہیں دوستوں کے دوست اور سب کے ہمدرد احمد خاں درانی 2002ء میں وہ بھی سئیں چھوڑ گئے۔ شرافت اور سادگی بلکہ سادہ لوحی ان پر آ کر ختم ہو جاتی تھی۔ جماعت اسلامی کے ہمدرد تھے مگر دوستی ہمارے ساتھ تھی۔ کسی زمانے میں ملت کلاتھ ہاؤس کے نام سے کپڑے کی دکان چلاتے تھے۔ ایک پندرہ روزہ رسالہ بھی نکالتے تھے۔ نام تھا سیر و سفر۔ خاصے گھومے پھرے تھے اس لیے سفر نامے بھی لکھے تھے۔ ہم سب ان کی دیانت پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتے تھے۔ پریس کلب کی عمارت بنی تو تعمیر کے لیے جو بھی پیسہ ملتا ان کی تحویل میں دیا جاتا کہ وہاں سے ایک پائی بھی ادھر اُدھر نہیں ہو سکتی۔

لیجئے۔ یہ ساری یادیں جمع کرتے کرتے اب مجھے مونجھ آنے لگی۔ مونجھ آنا سرائیکی زبان میں ایک ایسا فقرہ ہے جس کا مجھے اردو میں کوئی متبادل نہیں ملتا۔ انگریزی میں Home Sick ہونا کہتے ہیں اسے سرائیکی میں مونجھ آنا کہتے ہیں۔ لیکن مونجھ آنے میں آرزو، تمنا اور اشتیاق کے ساتھ کرب اور سوز و گداز کی جو کیفیت ہے وہ انگریزی کے ہوم سک میں نہیں ہے۔ جب میں کہتا ہوں۔ سئیں مونجھ آ رہی ہے تو اس کے ساتھ میرے دل کے اندر ایک عرصے سے پلنے والا جذباتی غبار اپنی پوری شدت کے ساتھ باہر آ جاتا ہے۔ اردو میں ہم اسے کیا کہیں گے؟ گھر یاد آ رہا ہے۔ ہم گھر کے لیے بے چین ہیں؟ نہیں بالکل نہیں۔ اس میں تو صرف خبر یا اطلاع ہے، جذبہ کی ہلکی سی آنچ بھی نہیں ہے۔ تو صاحب، ملتان اور اس کے لوگوں کے بارے میں اتنا لکھنے کے بعد میرے دل سے بھی یہی آواز آ رہی ہے ''سئیں، مونجھ آ رہی ہے''۔

(مسعود اشعر - روزنامہ جنگ ملتان)



کنول منیر بھٹہ

بوہڑ گیٹ

بلند و بالا تاریخی عمارتیں صدیوں تک انسانی زندگی کا حصہ رہتی ہیں۔ وقت کا بہاؤ ان پر اپنے نشانات چھوڑ جاتا ہے لیکن ان عمارتوں کی مضبوطی گزرے وقتوں کی نشانی کے طور پر انہیں محفوظ رکھتی ہے۔ ملتان شہر کی تاریخی باقیات دنیا بھر میں ملتان کی شناخت کا حوالہ ہیں۔ دنیا بھر سے آنے والے سیاح متحیر نظروں سے ان عمارتوں کو دیکھتے ہیں جبکہ اہل ملتان کو ان تاریخی عمارات کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ہیں۔ ملتان کے قدیم دروازے تاریخی باقیات میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تاریخی دروازے آج بھی ملتان کے تاریخی شکوہ کی علامت ہیں۔ ملتان کے ان قدیم دروازوں میں ایک بوہڑ دروازہ ہے۔

بوہڑ دروازہ کا نام تو قدیم عہد سے چلا آ رہا ہے لیکن موجودہ دروازہ قدیم نہیں ہے۔ قدیم دروازہ انگریزوں کے ملتان پر حملہ کے دوران تباہ ہو گیا تھا۔ ملتان پر قبضہ ہو جانے کے بعد انگریزوں نے پھر سے نیا دروازہ تعمیر کرایا جس کی تعمیر میں قدیم زمانے میں استعمال ہونے والی چھوٹی اینٹوں کے ساتھ موجودہ عہد کی موٹی اینٹیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ حرم دروازہ اور اس دروازہ کے میناروں کی تعمیر میں کافی فرق ہے۔ اونچائی میں بھی فرق ہے۔

بوہڑ دروازہ کے دائیں بائیں فصیل کے بیرونی جانب دکانیں جبکہ بالائی حصہ پر رہائشی مکان ہیں۔ دروازہ کے اندر داخل ہوں تو دائیں جانب حرم گیٹ جانے والی سڑک یعنی النگ پر تقریباً سو گز کے فاصلہ پر ایک برج ہے۔ یہ برج ماہ محرم کے دنوں میں بطور امام بارگاہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس جگہ درکھانوں والا تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ برج کے باہر چھوٹا سا تھڑا بنا ہوا ہے جہاں محرم خصوصاً نویں اور دسویں کو تعزیہ رکھا جاتا ہے۔

دروازہ کے اندر بائیں طرف النگ لوہاری دروازہ کو جاتی ہے۔ تھوڑا سا مزید اندرون بازار میں داخل ہوں تو بائیں طرف ایک کشادہ گلی ہے۔ یہ گلی محلہ شاہ گردیز میں جاتی ہے اور اس گلی میں دائیں بائیں اور دور تک ملحقہ گلیوں میں گردیزی خاندان کی رہائش گاہیں ہیں۔ اس بڑی گلی میں حضرت شاہ یوسف گردیزؒ کا مزار واقع ہے۔

قدیم ملتان شہر کی آبادی فصیل کے اندر تھی اور شہر میں داخل ہونے کے لیے مختلف دروازے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بوہڑ دروازہ کے باہر دریا بہتا تھا۔ اسی حوالہ سے دیکھا جائے تو بیرون بوہڑ دروازہ محلے موہانیاں جو ملاحوں کا محلہ

تھا آج بھی اسی نام سے آباد ہے اور بوہڑ دروازہ کے بالکل قریب ''بن لوہاراں'' کا علاقہ ہے۔ ''بن'' سرائیکی میں دریا کے کنارے کو کہا جاتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب حضرت شاہ یوسف گردیزؒ ملتان تشریف لائے اور بوہڑ گیٹ کے اندر آ کر رہائش پذیر ہو گئے۔ شہر کو دریا کی زد سے بچانے کے لیے فصیل بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر تعمیر ہونے والی دیوار کو رات دریا بہا کر لے جاتا تھا۔ اس پر حضرت شاہ یوسف گردیزؒ نے دعا کی تو دریا کا پانی کچھ پیچھے ہٹ گیا جس کے بعد آپؒ کے حکم پر ہی اس جگہ سے فصیل کی تعمیر کی گئی۔ یہ شہزادہ مراد بخش کا عہد گورنری تھا۔ شہزادہ مراد بخش نے حضرت یوسف شاہ گردیزؒ کے مشوروں کے مطابق ہی فصیل کی تعمیر کرائی۔ یہ روایت اس حوالہ سے صائب معلوم نہیں ہوتی کیونکہ مراد بخش 1642ء میں ملتان کا گورنر بن کر آیا جبکہ شاہ یوسف گردیزؒ 1136ء میں وفات پا چکے تھے۔ شاہ یوسف گردیزؒ کے خاندان میں کسی ایک نوجوان کو ''یوسف'' کا لقب دیا جاتا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ شہزادہ مراد بخش کے عہد میں اسی خاندان کے لقب یافتہ ''یوسف'' نے فصیل کی تعمیر میں معاونت کی ہو۔

بوہڑ دروازہ کے اندرون بازار کا نام بوہڑ دروازہ تھا لیکن قیام پاکستان سے قبل اس بازار میں دینی کتب فروشوں کی دکانیں زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے اردو بازار کا نام دیا گیا۔ بوہڑ دروازہ کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب محلہ درکھاناں ہے۔ اس محلہ میں درکھانوں کی اکثریت رہائش رکھتی تھی لہٰذا اس محلے کا نام محلہ درکھاناں رکھ دیا گیا۔ اسی محلے میں بازار کے قریب ہی ایک بڑی لمبی قبر ہے جو نو گزی قبر کہلاتی ہے۔ اندرون بوہڑ دروازہ جونہی اردو بازار ختم ہوتا ہے اس سے مزید آگے والا بازار کوثر بازار کہلاتا ہے۔ کوثر بازار ختم ہوتی ہی آگے بازار کالے منڈی ہے جو پیر کالاؒ کے مزار تک پھیلا ہوا ہے۔ بازار کالے منڈی سے آگے جائیں تو مسجد ولی محمد المعروف مسجد علی محمد واقع ہے۔ اس سے آگے چوک بازار ہے جو بازار حسین آگاہی تک چلا جاتا ہے۔

(کنول منیر بھٹہ - روزنامہ خبریں ملتان)



محمد اسلم میتلا

ملتان میں ریلوے نظام

زمانہ قدیم سے انسانی زندگی کے لیے ذرائع آمد و رفت اور ذرائع رسل و رسائل کی نہایت اہمیت رہی ہے۔ اٹھارویں صدی تک ان مقاصد کے لیے اونٹوں، گھوڑوں، خچروں، ہاتھیوں سے سواری اور بار برداری کا کام لیا جاتا رہا۔ ہاں کہیں کہیں یہ بھی ہوا کہ ان مقاصد کے لیے بیل گاڑیوں، اونٹ گاڑیوں اور رتھوں کا استعمال بھی ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ کشتیوں اور بادبانی جہازوں کو بھی انسان نے اپنی ضرورت کے لیے استعمال کیا لیکن یہ سب کچھ نہایت مشکل اور زیادہ وقت لیتا تھا۔ بالخصوص دور دراز کا سفر تو جان جوکھوں کا کام سمجھا جاتا تھا۔

ریلوے دراصل اس نظام کی ترقی یافتہ شکل ہے جو پہلے پہل سولہویں تا اٹھارویں صدی عیسوی تک انگلستان میں گھوڑوں کے ذریعے ویگنوں کے کھینچنے کے عمل سے شروع ہوا۔ لکڑی کے تختوں پر پہیہ رواں کیا گیا۔ بعد ازاں لکڑی کے تختوں کے بجائے لوہے کی پلیٹیں استعمال کی گئیں۔ جب لوہے کی پلیٹیں استعمال کی جانے لگیں تو پہلی ریلوے لائن دینڈز ورتھ تا کوریڈن شروع کی گئی۔ یہ سال 1804ء میں کیا گیا۔ اس نظام میں ترقی کی صورت سال 1825ء میں ہوئی جب سٹیم ریلوے سٹاکٹن اور ڈارلنگٹن کے درمیان سامان لے جانے کے لیے کھولی گئی۔ یہ ریلوے لائن اڑتیس میل لمبی تھی اور جارج اسٹیفن نے پہلا لوکو موٹو انجن خود چلایا۔

موجودہ پاکستان کے علاقے میں ریلوے کا نظام 13 مئی 1861ء کو متعارف کرایا گیا جب کراچی سے کوٹری تک 105 میل لمبی ریلوے لائن کو کھولی گئی جبکہ ملتان میں ریلوے کی تاریخ دو سال بعد 1863ء میں شروع ہوئی۔ یک چھوٹا سا سیکشن گیارہ میل لمبا تھا کھولا گیا جو شیر شاہ کے نزدیک کشتیوں کے گھاٹ سے شروع ہو کر ملتان شہر تک آتا تھا۔ لاہور سے ملتان سیکشن 1865ء میں کھولا گیا۔ ریلوے کی بھرتی اور تیاری کے لیے لاہور کے کھنڈرات اور ہڑپہ کے کھنڈرات کے مواد کا استعمال کیا گیا۔ ملتان سے کوٹری براستہ لودھراں ریلوے لائن کی تکمیل 1870ء میں ہوئی اور 1870ء تا 1876ء کے درمیان وقفوں وقفوں سے اور مختلف حصوں میں کھولی گئی۔ سکھر کا پل بننے پر 1889ء میں کراچی تک ریل چلنے لگی۔

قیام پاکستان کے وقت جو ریلوے نظام پاکستان کے حصہ میں آیا وہ زوال پذیر تھا۔ بس رینگنے والی بات تھی

کیونکہ سالہا سال سے اور متبادل انتظام نہ ہونے سے بھی صورتحال کو اور خراب کر دیا تھا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ریلوے پر دباؤ نے بھی منفی اثرات دکھایا۔ مہاجرین کی لاکھوں کی تعداد میں آمد نے ریلوے پر اور بھی دباؤ بڑھا۔ مشکلات کے اس وقت مزید بڑھ گئیں جبکہ بھارت نے کوئلے کی ترسیل بند کر دی چونکہ کوئلہ بطور ایندھن لوکوموٹو انجنوں کو چلانے کے لیے استعمال ہوتا تھا اس لیے بھارت کا یہ عمل پاکستان ریلوے کو مفلوج کرنے دینے کے برابر تھا لیکن پاکستانی انجینئروں نے کوئلہ سے چلنے والے ریلوے انجنوں کو تیل سے چلنے والے انجنوں میں تبدیل کر دیا اور یہ سب کچھ اس تیزی کے ساتھ کیا گیا کہ بدترین ناقد بھی اس کامیابی پر حیران رہ گئے۔

ریلوے کے بہتر حالات کے لیے مختلف مرحلوں میں ریلوے لائنوں اور بالخصوص مصروف ریلوے لائنوں کے پرانے مواد کی جگہ نیا مواد ڈالنے کی طرف توجہ دی گئی اور ڈیزل انجن خریدے گئے۔ نئی ریلوے لائنیں بچھائی گئیں۔ مسافروں کی سہولت کے لیے پلیٹ فارم، انتظار گاہیں تعمیر ہوئیں۔ پانی کی سپلائی کے لیے کولر، ٹیلی فون بوتھ کی تنصیب کی گئی۔

ریلوے انجنوں میں تیل کے استعمال سے اخراجات بڑھ گئے کیونکہ تیل کی قیمتیں وقتاً فوقتاً بڑھتے رہنے سے صورتحال مزید سنگین ہوتی گئی۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے بیرونی کمپنیوں سے رابطہ قائم کیا گیا وہ کچھ اس طرح تھیں۔

(1) انگلش الیکٹرک کمپنی اینڈ بی آئی سی سی

(2) ماہرین جاپانی نیشنل ریلوے

(3) ماہرین برطانوی ریلوے ایڈوائزری سروس

ان کمپنیوں کی سفارشات تھی کہ لاہور خانیوال سیکشن بجلی سے ریل چلانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔ واپڈا سے اس وقت 7 پیسے فی یونٹ کے حساب سے بجلی خرید کی گئی۔ بجلی کے ذریعے ٹرین چلانے سے کم خرچ آنے لگا اور زرمبادلہ میں بھی بچت ہوئی۔ بجلی کے ذریعے ٹرین چلانے سے جو فائدے ہوئے ان میں وقت کی بچت جو تیز رفتاری کی وجہ سے ممکن ہوئی اور ریلوے مسافروں میں بھی اضافہ ہوا۔ خانیوال اور لاہور کے درمیان 1969-70ء سے بجلی کی ٹرینیں چل رہی ہیں۔

ملتان میں ریلوے اوور ہیڈ برج خود ریلوے سٹیشن چھاؤنی کے مغرب میں بنایا گیا ہے۔ اس سے ٹریفک کو بے حد سہولت پہنچی کیونکہ ریلوے پھاٹک کے بند ہونے سے گھنٹہ گھنٹہ ٹریفک بند ہو جاتی تھی۔ یہ پل 1969ء میں ٹریفک کے لیے کھول دیا گیا۔ جہاں چوبیس گھنٹے ٹریفک جاری رہتی ہے۔ اس پل کی تعمیر ایک بھرپور عوامی تحریک کے نتیجے میں عمل آئی۔ عوامی اداروں نے بھی تعاون کیا۔ ڈسٹرکٹ کونسل نے دو لاکھ روپے اور بلدیہ ملتان نے چار لاکھ روپے نقد محکمہ ریلوے کو ادا کیے۔ تب کہیں جا کر محکمہ ریلوے نے اس پل کی تعمیر شروع کرائی اور آئے دن کے حادثات سے نجات ملی۔

شیر شاہ کے نزدیک دریائے چناب پر ریلوے پل انیسویں صدی میں قائم کیا گیا تھا لیکن اس کی معیاد ختم ہوگئی تھی چنانچہ اس کے شہتریوں کو ڈبل شہتیروں سے بدلنے کی سکیم بنائی گئی۔ علاوہ ازیں اوپر والے عرشے پر سڑک بنانے اور نیچے والے عرشے پر ریلوے لائن کا منصوبہ بنایا۔ اس سے قبل پل کو جب ریل گاڑی کا وقت ہوتا تھا بند کر دیا جاتا اور سڑک کے راستے ٹریفک بند ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اس منصوبے پر عمل کے نتیجے میں اس پل کی دوبارہ تعمیر شروع کی گئی اور پہلے عرشے سے ریل گاڑی کی آمد و رفت جاری رہتی ہے جبکہ اوپر والے عرشے پر سڑک بنائی گئی جس وجہ سے سڑک کی ٹریفک بغیر کسی رکاوٹ کے ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اس طرح جہاں سڑک کے راستے چناب کے پار آمد و رفت آسان ہوگئی ہے اس طرح سامان کی ترسیل میں آسانی پیدا ہوئی ہے۔

ملتان تا لودھراں ریلوے لائن پر مشہور ریلوے سٹیشن شیر شاہ (جنکشن) شجاع آباد، ظفر شہید ہیں جبکہ ملتان تا لاہور ریلوے لائن پر سابق ضلع کی حدود کے اندر واقع ریلوے سٹیشنوں میں سٹی ریلوے سٹیشن ٹاٹے پور، ریاض آباد، خانیوال (جنکشن) کچا کھوہ اور میاں چنوں ہیں۔

سندھ ساگر ریلوے لائن مظفر گڑھ کی طرف 1887ء میں کھولی گئی جبکہ خانیوال تا لائل پور (فیصل آباد) برانچ لائن 1990ء میں کھولی گئی جبکہ خانیوال اور لودھراں کے درمیان کارڈ (وتر) لائن 1905ء میں کھولی گئی۔ اس لائن پر مشہور سیکشن جنگل مڑیالہ، جہانیاں، دنیا پور اور رکن پور قائم کیے گئے۔

ستلج ویلی ریلوے قصور تا لودھراں قائم کی گئی جو براستہ میلسی قائم کی گئی تھی۔ 1917ء میں جنگ عظیم اول میں میٹریل کی کسی دوسری جگہ ضرورت تھی چنانچہ میلسی سے آگے بطرف قصور واقعہ ریلوے لائن اکھاڑ لی گئی۔ تاہم لودھراں تا میلسی ریل جاری رہی۔ جنگ کے بعد ریلوے لائن دوبارہ تعمیر کی گوی اور اس کا تبدیل شدہ روٹ وہاڑی، بوریوالہ کے راستے قصور تک قائم کیا گیا۔

ڈیرہ غازی خان کو بذریعہ ریل ملانے کے لیے منصوبہ بنایا گیا جس کے تحت کوٹ ادو، ڈیرہ غازی خان، کشمور، ریلوے لائن کی تعمیر شروع ہوئی جس کے ذریعے زرعی پیداوار کی ترسیل اور مسافروں کی مشکلات کو کم کرنا مقصود تھا۔ علاوہ ازیں شمال اور جنوبی علاقہ کے لیے متبادل راستہ بھی دفاعی مقاصد کے لیے فراہم کرنا تھا۔ اس منصوبے کی 1952ء میں منظوری دی گئی۔ مٹی جمع کرنے کا کام شروع کر دیا گیا لیکن بعد ازاں مالی مشکلات کی وجہ سے منصوبہ روک دیا گیا۔ سکیم کی ہر سال 1960ء میں نظر ثانی کی گئی اور ریلوے لائن کو دو مرحلوں میں تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ پہلے مرحلے میں کوٹ ادو تا ڈیرہ غازی خان 38 میل ریلوے لائن بچھائی جانی تھی جبکہ دوسرے مرحلے میں ڈیرہ غازی خان تا کشمور 142 میل لمبی ریلوے لائن بچھائی جانی تھی۔ پہلے مرحلے کا کام دسمبر 1964ء میں شروع کیا گیا اور لوہے کی سلیپ بچھانے شروع ہوئے۔ پلوں کی تعمیر بھی کی گئی۔ کشمور ڈیرہ غازی خان لائن ابتداً چوبیس ریلوے سٹیشن قائم کیے گئے۔ ہر سٹیشن پر دو یا تین لائنیں بچھائی گئیں۔ ڈیرہ غازی خان اور رودھان ریلوے کے ڈبے جوڑنے کی سہولتیں بھی فراہم کی گئیں۔ ڈیرہ غازی خان میں متاثر کن عمارت ریلوے سٹیشن بنائی گئی۔ پلیٹ فارم،

شیڈ، انتظار گاہ اور دیگر سہولیات مہیا کی گئیں۔ جام پور، راجن پور، مٹھن کوٹ، روجھان اور شادن لُنڈ ریلوے سٹیشنوں پر درجہ اول اور دوم کی انتظار گاہیں بنائی گئیں۔ اولاً مسافروں کی تعدا کے پیش نظر دو مسافر گاڑیاں اور ایک درمیانی رفتار کی گاڑی ملتان اور ڈیرہ غازی خان کے درمیان چلائی جانی مناسب سمجھی گئی جبکہ کشمور اور ڈیرہ غازی خان کے درمیان دو مسافر ریل گاڑیاں کافی سمجھی گئیں۔ یہ ریل گاڑیاں تونسہ بیراج کے پل سے دریائے سندھ کو پار کرتی ہیں۔

(روزنامہ خبریں ملتان-محمد اسلم میتلا)



وحید الرحمٰن خان

سرزمینِ صوفیا، تہذیبوں کا سنگم اور ہنرمندوں کا شہر، ملتان

چہار چیز است تحفہ ملتان
گرد و گرما، گدا و گورستان

یہ ''کافیہ'' شعر اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ ''نا اہلیانِ شہر'' کے اذہان میں یہ تاثر بنتا ہے کہ ملتان ایک ایسا خطہ ہے کہ جہاں ہر طرف فقیر دست طمع دراز کیے پھرتے ہوں گے، گرمی کی اتنی شدت ہوگی کہ موسمِ سرما میں لُو چلتی ہوگی، وہ دھول اُڑتی ہوگی کہ راوی ''اردگرد'' کو ''اردگرد'' لکھتا ہوگا اور اسی طرح کوئے یار میں ہر دو گز رقبے پر کوئی نہ کوئی قبرستان ضرور ہوگا!!

صاحب، بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھنا دانشمندی ضرور ہے، لیکن سخن فہمی عالمِ بالا کی طرح ''سخن فہمیِ عالمِ زیریں'' بھی خطرناک نتائج کی حامل ہوسکتی ہے! یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملتان بھی ایک شہر ہے اور وطن عزیز کے دیگر شہروں کی طرح عالم میں انتخاب ہے۔ اوپر جن ''عناصرِ رابعہ'' کا تذکرہ ہوا ہے تو وہ قدرت کی فیاضی کا اظہار ہے جس نے جثہ سے زیادہ حصہ عطا کر کے اس خطہ کے لیے ایک مستقل اختصاص قائم کر دیا ہے۔ ویسے ملتان کا جثہ کوئی اتنا کم بھی نہیں۔ یہ تقریباً بیس مربع کلومیٹر کے دائرے میں پھیلا ہوا ہے اور میونسپل کارپوریشن کی (اندرون و بیرون شہر) حدود میں لگ بھگ چار سو محلے اور کالونیاں آباد ہیں۔

ملتان، پنجاب کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی بارہ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ سطح سمندر سے دو سو پندرہ (215) میٹر بلند ہے۔ مشرق میں ضلع ساہیوال، مغرب میں ضلع مظفر گڑھ، شمال میں ضلع جھنگ اور جنوب میں ضلع بہاولپور واقع ہے۔ دریائے چناب، ملتان کو مظفر گڑھ سے جدا کرتا ہے۔

ملتان کو دو حصوں ...... جدید اور قدیم ...... میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ آیئے، پہلے آپ کو قدیم شہر کی سیر کرواتے ہیں جس کے ''دروازے'' سب پر کھلے ہیں۔۔۔ یہ حرم دروازہ ہے جو سرکلر روڈ کے سامنے شمال کی جانب واقع ہے۔ اس دروازے سے گزر کر شہر میں داخل ہوں تو دائیں بائیں ایک فصیل دکھائی دیتی ہے جسے ''النگ'' کہا جاتا ہے۔ حرم دروازہ کا خاص تحفہ ''تیل دھنیاں'' ہے۔ الگ مشرق کی جانب آگے جا کر ایک اور دروازے ''پاک

دروازہ'' سے جاملتی ہے۔ یہاں آپ دال مونگ، چھولے، فالودہ، سری پائے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

پاک دروازہ کے مشرقی جانب فصیل آگے چل کر ''خونی برج'' سے منسلک ہوتی ہے۔ اسے ''گیٹ وے آف ملتان'' بھی کہا جاتا ہے۔ خونی برج سے النگ شمال کی طرف مڑتے ہوئے ''دہلی دروازہ'' سے ملتی ہے۔ ماضی میں اس راستے سے لوگ دہلی کی طرف آیا جایا کرتے تھے۔ یہاں سے شمال کی طرف مڑتے ہوئے النگ ''دولت دروازہ'' کی طرف آنکلتی ہے۔ دولت دروازہ سے فصیل شہر غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں سے مغرب کی طرف سرکلر روڈ سے حسین آگاہی آتی ہے۔ یہ شہر کا اہم ترین تجارتی مرکز اور بارونق بازار ہے جو تقریباً ایک کلومیٹر طویل ہے۔ حسین آگاہی کو ملتان کی ''انارکلی'' کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس جگہ سے سرکلر روڈ ''لوہاری دروازہ'' کی طرف جاتی ہے۔

چوک میں دائیں جانب میونسپل کارپوریشن کا دفتر یعنی ''گھنٹہ گھر'' ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گھنٹہ گھر کی گھڑیوں نے کبھی اتفاق رائے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ اس عمارت میں شہریوں کا ایوانِ نمائندگان بھی ہے جسے ''جناح ہال'' کہتے ہیں۔ قریب ہی ڈریم لینڈ سینما ہے۔ سرکلر روڈ آگے چل کر ''بوہڑ دروازہ'' سے ہمکنار ہوتی ہے۔

یہ قدیم ملتان کے چند جغرافیائی مناظر تھے۔ مختلف مزارات، قلعہ کہنہ قاسم باغ (دمدمہ) قدیم جغرافیائی حدود میں آتے ہیں۔ ان علاقوں کے طرزِ تعمیر میں جمالی اور اجمالی پہلو نمایاں ہیں۔ بلند و بالا عمارات اور تنگ و تاریک گلیوں کے امتزاج سے پرانی شہر کی تعمیر ہوئی ہے۔ شہر کا بلند ترین مقام دم دمہ ہے جہاں سے قدیم و جدید ملتان کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر۔

جدید اور نئی آبادیوں میں گل گشت کالونی اہم ہے جو بوسن روڈ کے بائیں جانب واقع ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کالونی میں مختلف تعلیمی ادارے اور سرسبز و شاداب میدان موجود ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ رکن عالم کالونی، فورٹ کالونی کا شمار بھی جدید علاقوں میں ہوتا ہے۔ ''ترقی یافتہ'' قسم کے بازاروں میں (کینٹ میں) حسن آرکیڈ اور خان پلازہ اور (کچہری کے قریب) شریف پلازہ اور حلیم اسکوائر اہم ہیں۔ کینٹ کے سرسبز و کشادہ علاقے ہی میں ائر پورٹ کی تعمیر کی گئی ہے۔ چنانچہ کینٹ کی حدود میں طیارے خاصی نیچی پرواز میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ کینٹ کے عقب میں ''ڈیرہ اڈا'' ہے اور اس کے قریب ہی ریلوے سٹیشن ہے۔ روزانہ تقریباً پچاس ریل گاڑیاں اطراف سے سٹیشن کی طرف آتی جاتی ہیں۔

اِدھر سے اُدھر آتیاں جاتیاں
پھریں اپنے ''انجن'' کو دکھلاتیاں

ڈیرہ اڈا کے اردگرد جنرل پوسٹ آفس اور ٹیلی فون و ٹیلی گراف آفس ہے۔ عوام کی تفریح کے لیے آس پاس ریکس، ہٹیہ زن اور کیپری سینما موجود ہیں۔ (نیو) جنرل بس سٹینڈ شہر سے 'محتاط' فاصلے پر قائم کیا گیا ہے۔ مسافر حضرات شہر سے ویگنوں یا رکشوں پر سوار ہو کر یہاں پہنچتے ہیں اور پھر یہاں سے اپنی منزل مقصود کے پیش نظر مختلف سمتوں میں روانہ ہوتے ہیں۔ اندرونِ شہر عوام کی آمد و رفت کے ذرائع یہی ویگنیں، رکشے، بسیں، کاریں، تانگے اور ''ٹانگیں'' ہیں!

قصۂ جدید ملتان ابھی جاری ہے لیکن ایک نظر تاریخِ ملتان پر بھی ڈالتے چلیں کہ کہا گیا ہے...... گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را۔ تاریخی اعتبار سے یہ شہر خاصی ''عمر رسیدہ'' ہے۔ اس کی بزرگی کے حوالے سے مختلف روایتیں ہیں۔ اس کا تذکرہ شاہنامۂ فردوسی میں بھی موجود ہے جس کے مطابق یہ چھ سو سال قبل مسیح ایک صوبہ تھا۔ عہد حاضر کے ایک مورخ ابن حنیف کے مطابق یہ شہر ساڑھے پانچ ہزار سال قبل آباد ہوا تھا اور یہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کا ہم عصر ہے۔ یہاں یہ بات لکھنا ضروری ہے کہ عرب حکمرانوں میں محمد بن قاسم نے پہلی صدی ہجری اور محمود غزنوی نے چوتھی صدی ہجری میں اس شہر کو فتح کیا۔ ان تحقیقات سے یہ بات سامنے آتے ہیں ہے کہ ملتان دنیا کا ایک قدیم ترین شہر ہونے کے باوجود اب تک آباد اور زندہ ہے۔

زندہ ہے، یہی بات بڑی بات ہے پیارے

شیکسپیئر نے کہا تھا کہ گلاب کو جس نام سے پکارو، اس کی خوشبو وہی رہتی ہے۔ ملتان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ماضی میں اسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ سب سے پرانا نام ''میسان'' ہے۔ مشہور مورخ البیرونی نے ''کتاب الہند'' میں تحریر کیا ہے کہ اس کا نام ''مول استھان'' تھا، جو کثرت استعمال سے ''ملتان'' ہو گیا۔ اسے کشپ پورہ، سنب پورہ اور پرہلاد پورہ کے اسمائے گرامی سے بھی پکارا گیا۔ ''اب ملتان کے چاروں طرف ملتان ہی ملتان واقع ہے۔ اور روز واقع تر ہو رہا ہے!''

یاد رہے کہ شہر کا ایک لقب بھی ہے...... ''مدینتہ الاولیاء!'' اس خوبصورت لقب کی وجہ تسمیہ ہے کہ ملتان صوفیاء کرام اور بزرگان دین کے روحانی فیوض و برکات کا مرکز رہا ہے۔ اہلِ تصوف کے تین روحانی سلسلے سہروردیہ، چشتیہ اور قادریہ یہیں سے پورے برصغیر میں پہنچے۔ شاہ یوسف گردیزؒ، شاہ رکن عالمؒ، بہاء الدین زکریاؒ اور شاہ شمسؒ سبزواری وہ محترم ہستیاں ہیں جنہوں نے ایک طویل عرصے تک اس خطے میں دینی خدمات انجام دیں۔ ان بزرگوں کے مزار اور مقابر فن تعمیر کے دلکش نمونے ہیں۔ دین کی تعلیم و تبلیغ میں ملتان ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ بیسیوں دینی مدارس اسلام کی تفہیم و اشاعت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان میں قاسم العلوم، خیر المدارس، انوار العلوم، جامع العلوم اور باب العلوم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دین کے علاوہ دنیاوی طور پر بھی ملتان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ یہ صنعت و حرفت اور دستکاری کا ایک اہم مرکز ہے۔ کاشی کاری ہو یا نقاشی، قالین بافی ہو یا پارچہ بافی، چوب کاری ہو یا معماری...... دستکاروں کے خونِ جگر سے معجزۂ فن کی نمود ہوتی ہے۔ دستکاری میں ظروف سازی، کانچ کی چوڑیاں، کڑھائی بنائی اور ملتانی کھسے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ملک میں کھڈی کی صنعت کا یہ سب سے بڑا گڑھ ہے۔ یہاں کے کھڑے ہوئے دوپٹے، دریاں، چادریں، جاء نمازیں، پردے اور پوشش کے کپڑے دیگر شہروں اور بیرون ملک مقبول ہیں۔ یہ مصنوعات دم دمہ کے قریب زیر زمین ''نگار خانہ'' سے ارزاں نرخوں پر خریدی جا سکتی ہیں۔

ملتان میں کثیر تعداد میں تعلیمی ادارے ہیں جن میں شاہین بچوں کو ''بلند پروازی'' کا سبق دیا جاتا ہے۔ اہم

ترین تدریسی مرکز ''بہاء الدین زکریا یونیورسٹی'' ہے جو ایک ہزار ایکڑ اراضی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اب تک یونیورسٹی میں 20 شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں زرعی کالج اور انجینئرنگ کی کلاسوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مستقبل قریب میں میٹریل سائنس، میکینکل، الیکٹریکل اور ایگری کلچر کے باقاعدہ شعبے تعمیر کئے جائیں گے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی بھی شہر میں تدریسی خدمات انجام دے رہی ہے۔ نشتر میڈیکل کالج کا آغاز یکم اکتوبر 1951ء کو ہوا۔ اس ادارے سے اب تک ہزاروں ڈاکٹر فارغ التحصیل ہو کر ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔

گل گشت کالونی (بوسن روڈ) تعلیمی اداروں کے حوالے سے بھی خاصی ''سرسبز'' ہے۔ اس علاقے میں گورنمنٹ کالج، سائنس کالج، ایجوکیشن کالج، کیمپری ہنسو سکول (بوائز۔ گرلز)، ماڈل ہائی سکول، علی گڑھ سکول وغیرہ چراغِ علم روشن کر رہے یں۔ کچہری کے قریب سول لائنز کالج، گرلز کالج، مسلم سکول (بوائز۔ گرلز) واقع ہیں۔ ایک گرلز کالج ممتاز آباد میں بھی ہے۔ ان کے علاوہ ٹیکنالوجی کالج، ولایت حسین کالج، علمدار کالج، پائلٹ سکول، عام خاص باغ سکول وغیرہ نمایاں ہیں۔

یہ سب مکاتب ہماری نظر سے گزرے لیکن وہ مکتب کہیں دکھائی نہیں دیا جہاں کے دستور نرالے ہوتے ہیں اور اس کو چھٹی نہیں ملتی جس نے سبق یاد کیا ہ۔ سبق یاد کرنے والے طلباء کو چھٹی ضرور ملنی چاہیے تاکہ وہ سیر و تفریح سے لطف اندوز ہو سکیں۔ پڑھائی کے ساتھ کھیل بھی ضروری ہے۔ اور کھیل کے لیے میدان لازمی ہیں۔

شہر میں چھوٹے بڑے میدانوں کے علاوہ چند اعلیٰ درجے کے گراؤنڈز بھی موجود ہیں۔ ان میں قاسم باغ سٹیڈیم (دم دمہ) ایم سی سی گراؤنڈ (نواں شہر) اور سپورٹس گراؤنڈ (بالمقابل مسلم سکول) اہم ہیں۔ قاسم باغ سٹیڈیم کو ٹیسٹ کرکٹ کا درجہ بھی حاصل ہے۔ معروف کرکٹر انضمام الحق انہی میدانوں میں چوکے چھکے مارتے ہوئے قومی کرکٹ کے مقدر کا ستارہ بنے ہیں۔ کرکٹ کے علاوہ ان میدانوں میں ہاکی، فٹ بال، لان ٹینس اور باسکٹ بال وغیرہ بھی کھیلے جاتے ہیں۔ غالب کے نزدیک تو اورنگِ سلیماں بھی اک کھیل تھا۔ معلوم نہیں ان کھیلوں کی ان کے قریب کیا حیثیت ہوگی؟ وہ تو دنیا کو بھی بازیچۂ اطفال خیال کرتے تھے۔

''بازیچۂ اطفال'' سے یاد آیا کہ ملتان میں چند ایسی خوبصورت تفریح گاہیں بھی ہیں جہاں ننھے منے بچے خاندان کے دیگر افراد کے ہمراہ سیر و تفریح اور پکنک کی غرض سے آتے ہیں۔ سب سے بہترین تفریح گاہ کنٹونمنٹ گارڈن (کمپنی باغ) ہے جو کینٹ (چھاؤنی) میں ہے۔ ذرا آگے چمن زار عسکری ہے جس میں ایک مصنوعی جھیل بھی قائم کی گئی ہے۔ جھیل میں کشتی رانی بھی کی جا سکتی ہے۔

ابنِ قاسم پارک، دم دمہ کے قریب واقع ہے۔ قلعہ قاسم باغ پر ایک جدید پارک تعمیر ہوا ہے جو مزار بہاء الدین زکریاؒ کے مین گیٹ کے بائیں جانب سٹیڈیم کے عقب میں ہے۔ اس سے قلعہ کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں ایک مصنوعی آبشار اور اس کے ساتھ ایک ننھی منی جھیل بھی بنائی گئی ہے۔ پارک میں چمن زار عسکری کی طرز پر ایک منی ٹرین بھی چلائی جا رہی ہے جس میں بچے اور بعض اوقات بڑے بھی سیر کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں گول جھولا اور ڈاجنگ کاریں بھی بچوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

فوٹو گرافر حضرات کے لیے یہاں اَن گنت ''مقاماتِ آہ و فغاں'' ہیں جہاں وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس ایسے خودکار کیمرے ہوتے ہیں جو ایک منٹ کے نوٹس پر تصویر بنا دیتے ہیں۔ سیر و تفریح کی غرض سے آئے ہوئے لوگ سائنس کی اس ایجاد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوبصورت لمحات کو مقید کر لیتے ہیں۔

چمن زار عسکری شہر کی سب سے بڑی تفریح گاہ ہے۔ یہاں تفریح کے سب سے زیادہ مواقع میسر ہیں۔ جھیل میں کشتی رانی کی سہولت بھی موجود ہے۔ منی ٹرین اور مختلف قسم کے برقی جھولے ''علاوہ ازیں'' ہیں۔ کمپنی باغ ملتان کینٹ میں واقع ایک خوبصورت چمن زار ہے۔ یہاں جھولے وغیرہ تو موجود نہیں، لیکن چاروں طرف ہریالی، مختلف انواع و اقسام کے سرسبز و شاداب درخت اور ایک پُرسکون خاموشی ہوتی ہے جو ماحول کو شاعرانہ بناتی ہے اور مزاج پر رومانوی اثرات مرتب کرتی ہے۔ شاہ شمس پر پارک ملتان کی تفریح گاہوں میں خوشگوار اضافہ ہے۔ اس پارک میں بھی جدید تفریحات کے عناصر جمع کئے گئے ہیں۔ متی تل جھیل شہر سے دور ایک تفریحی مقام ہے جہاں سب سے پہلے آبی کھیلوں (واٹر سپورٹس) کا آغاز کیا گیا تھا۔ شہر سے دوری کے سبب یہاں ہجوم کم ہوتا ہے۔ ملتان میں ان بڑی اور اہم تفریح گاہوں کے علاوہ چھوٹے پیمانے پر پارک، باغات اور سیر گاہیں بھی موجود ہیں۔

قلعہ کہنہ یعنی دمدمہ تاریخی حیثیت کا حامل مقام ہے۔ اب سے تقریباً 1300 سال قبل اس قلعہ کو ایک سترہ سالہ مجاہد محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ اور یوں ملتان پر مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ اس معرکۂ حق و باطل میں ایک طرف راجہ داہر تھا جس کے پاس دس ہزار سوار، تیس ہزار پیدل فوج، ایک سو ہاتھی سوار اور بے شمار جنگی ساز و سامان تھا اور دوسری جانب ایک کم سن نوجوان صرف بارہ ہزار مجاہدین کے ساتھ صف آرا تھا۔ 10 رمضان المبارک، 712ھ بروز جمعرات کو آسمان کی آنکھ نے وہ نظارہ دیکھا جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ آبِ زر سے درج رہے گا۔ بظاہر دمدمہ خشت و سنگ کے مجموعہ کا نام ہے، لیکن اس کے سینے میں تاریخ کا ایک سنہری باب محفوظ ہے۔

زندہ قومیں اپنی روایات کے ساتھ ساتھ عمارات کی بھی حفاظت کرتی ہیں چنانچہ یہ تاریخی قلعہ ایک یادگار کی صورت میں اب بھی قائم اور محفوظ ہے۔ اور شکست و ریخت کی صورت میں اس کی مناسب تعمیر و مرمت کی جاتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد دمدمہ کی تعمیر کا آغاز بلدیہ ملتان نے 1949ء کو کیا اور اس کی تکمیل جولائی 1953ء میں ہوئی۔ بعد میں بھی تعمیر و تزئین کا عمل جاری رہا اور 1996ء میں یہ سلسلہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

دمدمہ شہر کی بلند ترین جگہ ہے۔ اردگرد کے چھوٹے بڑے سبزہ زاروں نے اسے یک اہم تفریحی مرکز بنا دیا ہے۔ چنانچہ یاں اکثر سیر و تفریح کی غرض سے آئے ہوئے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ شام کے وقت تو خوب چہل پہل ہوتی ہے۔ غروب آفتاب سے ذرا پہلے دمدمہ سے شہر کا نظارہ دیدنی ہوتا ہے۔ جنوب مغرب میں قدیم و کہنہ عمارات کا پُراسرار شکوہ و جلال اور شمال مشرق میں جدید طرز تعمیر کی جلوہ سامانیاں نظر نوازی کا اہتمام کرتی ہیں۔ اس منظرنامے میں مزارات، مساجد، گھنٹہ گھر اور سینما گھروں کی بلند و بالا عمارات بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہوتی ہیں۔ شام کے

وقت گھونسلوں کی جانب محوِ پرواز پرندے، غٹرغوں کرتے کبوتر، رنگ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس لوگ، درختوں کے جھنڈ، سرخی شفق اور مغرب میں ڈوبتا سورج پورے ماحول اور فضا کو رومان پرور اور ارمان انگیز بنا دیتا ہے۔ شاعر نے شاید اہلِ ملتان سے کہا تھا:

تمہارے شہر کا موسم بڑا سہانا لگے
میں ایک شام چُرا لوں اگر برا نہ لگے

دمدمہ کے بالکل قریب ہی ایس ٹی این (شالیمار ٹیلی ویژن نیٹ ورک) نے اپنا مواصلاتی دفتر قائم کیا ہے۔ یوں اب شہر کے عوام ٹی وی پر ایک نئے چینل کی سہولت سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

دمدمہ سے ایک ایسی عمارت بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے جو بظاہر خاصے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سٹیٹ بنک آف پاکستان کی عمارت ہے، جو ربع صدی سے زیرِ تعمیر ہے۔ مختلف امور کے باعث اس کی تعمیر میں طویل وقفے آتے رہے تاہم اب یہ تکمیل کے قریب ہے۔ اس کا محل وقوع چوک پل موج دریا یعنی چوک کچہری سے زرا آگے، سپورٹس گراؤنڈ کے نزدیک ہے۔ سٹیٹ بنک کی اس نئی سفید عمارت کی تزئین میں ملتان کی مخصوص نیلی ٹائلیں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ ان ٹائیلوں نے اس کے وقار اور دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے۔

یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ''ایوانِ صنعت وتجارت'' کا وسیع وعریض نوتعمیر دفتر ہے۔ یہ تعمیراتی صناعی کا ایک حسین نمونہ ہے۔ اس دفتر کے قیام سے ملتان میں بین الاقوامی سطح پر صنعتی وتجارتی نمائشوں کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ اسی (ایم ڈی اے چوک کی طرف جاتی ہوئی) سڑک پر چند قدم آگے بڑھیں تو سرخ رنگ کی ایک بلند و بالا عمارت سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ ''ملتان آرٹس کونسل'' ہے، اس کی تکمیل سے ملتان میں فنونِ لطیفہ کو فروغ ملا ہے اور سماجی وثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ ان تعمیراتی منصوبوں کو دیکھ کر جانے کیوں اقبالؔ کا وہ مصرع یاد آتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

لیکن پیارے قارئین، ذرا ٹھہریئے، بلکہ ٹھہریئے نہیں، ہمارے ساتھ پانچ منٹ پیدل چلئے، ہم آپ کو چوک پل موج دریا سے جنوب کی طرف چوک نواں شہر لیے جاتے ہیں۔ یہاں سے جو سڑک مغرب کی جانب رواں دواں ہے، اسے ابدالی روڈ کہا جاتا ہے۔ ابدالی روڈ پر آپ کو مزید تازہ بستیاں نظر آئیں گی۔ یہ سڑک خوبصورت عمارات کا مرکز بن چکی ہے۔ یہاں ملتان پریس کلب، ایک جدید ہسپتال، شہر کا واحد فائیو سٹار ہوٹل، ایک ماڈرن شاپنگ سنٹر، ایک قومی روزنامے کا نیا دفتر اور پی آئی اے کے بکنگ آفس سمیت مختلف اداروں کے دفاتر کی دلکش عمارات دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔

یہ روڈ احمد شاہ ابدالی امیرِ افغانستان (1747ء-1733ء) کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں اس نامور بادشاہ کی جائے ولادت ایک یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔ وہ سات سال تک ملتان میں رہے اور ابدالی مسجد میں ابتدائی

تعلیم حاصل کی۔ بعد میں نادر خان کی فوج میں بھرتی ہو کر سپہ سالار بنے اور پھر اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث افغانستان کے حکمران منتخب ہوئے۔ یوں ہم ملتان کو ''حکمرانوں کی سرزمین'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

اوپر غالب کا ذکرِ خیر ہوا ہے۔ غالب کی بات کی جائے تو ان کے طرفداروں کا تذکرہ ضروری ہو جاتی ہے۔ غالب کے طرفداروں سے ہماری مراد وہ سخن فہم ہیں جو لمحۂ موجود میں شعر کہہ رہے ہیں اور نثر لکھ رہے ہیں۔ اس شہر میں شعراء اور ادباء کی ایک کثیر تعداد پرورشِ لوح و قلم میں مصروف ہے۔ قلم قبیلے کے بعض افراد اپنی ادبی خدمات کے باوصف ملک گیر شہرت پا چکے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر طاہر تونسوی، عاصی کرنالی، اسلم انصاری، حسین سحر، عرش صدیقی مرحوم، محمد امین، حفیظ الرحمٰن خان، خالد مسعود اور مستحسن خیال کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ ان قلم کاروں کے علاوہ دو نامور تخلیقی خطاط ابنِ کلیم اور غلام فرید بھٹی خوشنویسی کے حوالے سے بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ابنِ کلیم ''خطِ رعنا'' کے موجد بھی ہیں۔

یہ شہرِ عزیز شعر و ادب اور فکر و رن کے علاوہ سنگیت اور ساز و آہنگ کے میدان میں بھی قومی سطح پر نمایاں ہے۔ ملک کے نامور موسیقاروں اور گلوکاروں مثلاً نزاکت علی خاں، سلامت علی خاں، ثریا ملتانیکر، اقبال بانو اور ناہید اختر کا تعلق ملتان سے رہا ہے۔ یہ سب غیرتِ ناہید بھی ہیں اور ان کی ہر تان بھی دیپک ہے۔

اور اب آخر میں ملتان کی چیدہ چیدہ جھلکیاں!

☆ ملتان میں عوام کی سمع نوازی کے لیے ریڈیو سٹیشن 1966ء میں قائم کیا گیا۔

☆ اس شہر کی مشہور سوغاتیں، آم اور سوہن حلوہ ہیں۔ مقامی زبان سرائیکی ہے جو آم اور سوہن حلوے کی طرح لطیف اور شیریں ہے۔

☆ مریضوں کے علاج معالجے اور مسیحائی کے لیے بے شمار پرائیوٹ ہسپتالوں کے علاوہ دو سرکاری معالجاتی مراکز بھی موجود ہیں۔ نشتر ہسپتال اور سول ہسپتال! نشتر ہسپتال (قائم شدہ: 1953ء) ایشیا کے چند بڑے معالجاتی مراکز میں شمار ہوتا ہے۔

☆ بستگانِ علم و ادب کی پیاس بجھانے کے لیے دو بڑے کتب خانے ہیں۔ میونسپل لائبریری قلعہ کہنہ کے دامن میں واقع ہے۔ پبلک لائبریری عام خاص باغ میں ہے۔

☆ صنعتی اور زرعی اعتبار سے بھی یہ شہر ترقی پذیر ہے۔ کھاد فیکٹری اور الیکٹرک پاور سٹیشن کا قیام اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

☆ معاشری زندگی میں اسلامی اور مشرقی اقدار کی روح رچی بسی ہے۔ ملتان کے لوگ مہذب، شائستہ اور منکسر المزاج ہیں۔

تمام شہر ہے، دو چار دس کی بات نہیں

(ماہنامہ رابطہ (اپریل 1998ء) – وحید الرحمٰن خان)



عمر کمال خان ایڈووکیٹ

ملتان کی قدامت

کچھ لوگ خوامخواہ اس غم اور فکر میں دبلے ہوئے جا رہے ہیں کہ ملتان شہر دنیا کا قدیم ترین زندہ شہر نہیں ہے۔ ملتان کی قدامت اس کا بیت الذہب (سونے کا گھر) کہلانے کی وجہ سے بھی نہیں ہے نہ اس وجہ سے ہے کہ کسی نے یہ لکھ دیا کہ لاہور ملتان کے مضافات میں ایک قریہ ہے نہ ہی ملتان اس لیے قدیم ہے کہ اس قلعہ بے حد مضبوط رہا یا اس لیے قدیم نہیں ہے کہ کیونکہ اس وقت ہمیں ملتان کے سابقہ حکمرانوں کے محلات کا ملتان میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اگر قلعہ ملتان پر انگریزوں کے فتح مینار پر کندہ عبارت پڑھ لی جاتی تو پتہ چل جاتا کہ جب انگریز ملتان فتح کرنے کے لیے ہندوستان کی مخالف چھاؤنیوں سے روانہ ہوئے تھے تو انہوں نے قسم اٹھائی تھی کہ ہم اس خونی قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر دم لینگے۔ چنانچہ قلعہ فتح کرنے کے بعد انہوں نے اپنا عہد پورا کر دیا۔ ایسی صورتحال میں راجہ ساہسی سے لے کر دیوان مول راج تک کے تمام حکمرانوں کے محلات کے نشانات کہاں قائم رہ سکتے تھے۔ میں نے ''نواب مظفر خان شہید اور اسکا عہد'' نامی اپنی تصنیف میں ایک فوٹو جو پنجاب سیکرٹریٹ کے ریکارڈ روم میں بھی ہے اور نواب بہاولپور کے میوزیم سلطانی میں بھی تھا شائع کیا ہوا ہے جس میں قلعہ ملتان کی انگریزوں کے ہاتھوں مکمل تباہی سے پہلے کی تمام تعمیرات کو محفوظ کیا ہوا ہے۔ لیکن اس فوٹو سے بھی ملتان کی قدامت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی ادیتا (Aditya) یعنی سورج دیوتا کے مندر کے ملتان میں ہونے سے ملتان کی قدامت کا اندازہ ہو سکتا ہے نہ ہی عرب مؤرخین اور جغرافیہ دانوں کے احوال سے ملتان کی قدامت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان عربوں میں سے اکثر ملتان تشریف نہیں لائے تھے اور عرب تو کل آئے ہیں۔ یہ مجھ جیسے انٹیکل بچو مورخ اور آثاریات کے نام نہاد ماہران عربی سندات کی بنا پر دعویٰ کرتے ہیں جس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ملتان کی قدامت پر مزید مواد جو مسلمہ ہو گا پیش کرنے سے پہلے ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

چند سال پہلے ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں محمود نواز خان بابر نے انڈسٹریل اسٹیٹ ملتان میں گیس کا کارخانہ چینی ٹیکنالوجی کے بنیاد پر قائم کیا تھا۔ اس زمانے میں چند چینی انجینئر کارخانہ لگانے اور اسے چالو کر کے دکھانے کے لیے ملتان آئے تھے۔ صوبہ پنجاب کے ہمارے حصہ میں پہلا چینی کارخانہ تھا اس لیے میں نے بزم ثقافت

ملتان کی طرف سے ایک تقریب پبلک لائبریری باغ لانگے خان ملتان میں منعقد کی تھی۔ جس میں دوست ملک چین کے ان انجینئروں کو خوش آمدید کہا گیا تھا۔ ان دنوں ان چینی انجینئروں سے محمود نواز خان بابر کے توسط سے کئی ملاقاتیں ہوئیں ان میں جو مترجم تھا وہ مسلمان الاصل چینی تھی۔ اس کی معرفت بات چیت کے دوران ہمارے دوست چینی انجینئروں نے یہ سوال کیا کہ ملتان کو آپ کیسے قدیم شہر کہتے ہیں میں نے ان کو کہا میں نہ سند والا مورخ ہوں نہ آثاریات کا ماہر آپ کو شہر کی سیر کرانے لے جاؤں گا۔ آپ شہر اور قلعہ کو ملاحظہ کریں پھر آپ خود فیصلہ کریں کہ شہر دنیا کا قدیم ترین شہر ہے یا نہیں۔

چنانچہ چھٹی کے روز انڈسٹریل اسٹیٹ گیا اور اپنی سوزوکی آلٹو میں تمام چینی انجینئرز کو سوار کر کے خود ڈرائیو کرتا ہوا بوہڑ گیٹ کی طرف فاطمہ جناح ہسپتال کی طرف سے مڑا اور ان کو صاحب علی شاہ گردیزی پارک کے پاس اتار کر قدیم فصیل کا ایک اصلی برج جس پر گردیزی صاحبان نے قبضہ کیا ہوا ہے وہ اور سید مہدی شاہ گردیزی کے گھر کے مقابل شہر کی باقی ماندہ فصیل جو چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی ہے وہ دکھائی اور اس کے بعد ان کو دیوان خانہ کے سامنے سے النگ کے اوپر لیکر بوہڑ گیٹ دکھاتا ہوا النگ پر سے حرم گیٹ روانہ ہو گیا اور ان کو جہاں سے سیڑھیاں تھیں شہر کی اندرونی سطح اور بیرونی سرکلر روڈ دکھاتا ہوا حرم گیٹ سے النگ پر سے ہوتا ہوا پاک دروازہ سے ہو کر النگ پر کار دوڑاتا ہوا اور النگ کے دونوں طرف کے نظارے دکھاتا۔ تھوڑی دیر کے لیے خونی برج کے پاس النگ پر رک گیا اور انہیں اتار کر ان سے سوال کیا کہ آپ کے ملک میں دیوار چین ہے میرے شہر کی دیوار ملتان ہے کیا آپ کے ملک کی دیوار پر گاڑیاں اس طرح بھاگتی ہیں جیسے میں گاڑی پر سوار کر کے آپ کو یہاں لایا ہوں اور یہ سوال بھی کیا کہ آپ کا ملک یقیناً 8 ہزار سال سے تہذیب وتمدن و ثقافت کا مرکز ہے اور تقریباً انسانوں کی تمام ایجادات کی ابتداء آپ کے ملک سے ہوئی ہے آپ کے ملک میں کوئی ایک شہر ایسا ہے جس طرح ملتان کا یہ شہر اور اس طرح کی مفید کارآمد دیوار، انہوں نے اس کا جواب نفی میں دیا پھر میں ان کو النگ کے راستے لے کر دہلی گیٹ سے باہر سرکلر روڈ پر آ گیا اور سیدھا دولت دروازہ کے راستے قلعہ پر لے گیا۔ راستے میں سرکلر روڈ کے بالمقابل جہاں النگ سے ٹریفک جا رہی تھی اور جو راستے سرکلر روڈ سے النگ کی طرف جاتے دکھائی دیئے وہ بھی میں ان کو دکھاتا گیا اور آخر کار قلعہ پر جا کر دمدمہ کے اوپر ان کو لے گیا جہاں وہ شہر کے پھیلاؤ اور پرانا شہر جو کہ دمدمہ کے جنوب میں واقع ہے کی عمارات دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ میں نے ان کو بتایا کہ جو شہر اور فصیل آپ دیکھ کر آئے ہیں یہ ہزار سال سے زیادہ پرانا نہیں ہے یہ دور اسلامی میں تعمیر ہوا النگ بھی اسلامی دور کی نشانی ہے۔ ملتان کا قدیم ترین حصہ یہ قلعہ اور دمدمہ ہے اور اس پر جو نام نہاد نگار خانہ بنا ہوا ہے یہ بدھ دور کا دیہارا ہے۔ یہی قدیم شہر اور قلعہ ہے۔ پھر میں نے ان کو ہڑپہ اور موہنجو داڑو کے خاکے یعنی Outline دکھائے جو City اور Citadal پر مشتمل ہیں جیسے قلعہ پر دمدمہ Citadal اور باقی ماندہ قلعہ City ہے۔ یعنی دمدمہ سے زیریں رقبہ City ہے۔ میں نے ان کو بتلایا کہ میں دنیا کے انیس ممالک کی سیاحت خود کر چکا ہوں۔ کوئی ایک شہر بھی ملتان کی طرح کا مجھے نہیں ملا نہ دیکھا ہے نہ میرے مطالعہ کے مطابق اس کا نقشہ یا خاکہ یا

Outline کا کوئی اور شہر تا حال مجھے معلوم ہوا۔ انہوں نے میری بات کو مانا اور ملتان اور اس کی قدامت کو تسلیم کیا۔

ان چینی دوستوں کے ماننے سے بھی اور میری اس رائے کی بناء پر بھی ملتان کے بارے میں آپ حتمی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ملتان ایک قدیم ترین زندہ جاوید شہر ہے۔ اس بات کو حتمی طور پر ثابت کرنے کے لیے ہمیں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے دوران کننگھم نے 1864ء میں قلعہ ملتان پر جو کھدائیاں کی تھیں ان پر انحصار کرنا پڑے گا۔ کننگھم نے قلعہ ملتان دو اونچی جگہوں جن میں سے ایک غوث صاحب کے مزار کے سامنے آجکل کے کبوتر خانے والی جگہ پر کنواں کھودا اور اس نے پیر دربار مولانا حامد علی خانؒ کے مزار کے قریب کنواں کھودا اور ان کنوؤں کی مٹی نہایت احتیاط سے چھانی اور اس مٹی کے چھاننے سے جو چیزیں برآمد ہوئیں ان کی فہرست گہرائی کو مدنظر رکھ کر مرتب کی اور ایک سو سال ایک فٹ مٹی کے نکاس کے حساب سے کچھ نتائج ملتان کی قدامت کے بارے میں مرتب کیے اور ان کو سروے رپورٹ میں محفوظ کر دیا۔ وہ رپورٹ ملتان کی قدامت کے بارے میں حتمی ماہرانہ رائے ہے۔ جس کی تردید یا نفی آج تک کوئی نہیں کر سکا۔

''جنرل کننگھم نے جو کنویں کھدوائے وہ 45 سے 50 فٹ کی گہرائی تک تھے اور ایک کنواں کافی گہرا اس حد تک کھودا گیا جہاں زمین کی اصل تہہ نہ نکل آئی۔ جہاں پر تمام مٹی خون آلود اور کچھ راکھ بھی برآمد ہوئی۔ جس سے کننگھم نے یہ اندازہ لگایا کہ قتل عام کے بعد شہر کو آگ لگا دی گئی تھی۔ اس کے اندازہ کے مطابق یہ سکندر اعظم کے حملے کا دور تھا جب سکندر ملی قوم سے لڑا ہوا شدید زخمی ہوا اور یونانیوں نے طیش میں آ کر ملتان کے تمام باشندوں کو قتل کر کے پھر شہر کو آگ لگا دی تھی۔ اربن یونانی مورخ کے قول کے مطابق اس وقت ملتان کے دفاع کے لیے پچاس ہزار جوان موجود تھے جو سب قتل کر دیئے گئے تھے۔

کننگھم کو دس اور گیارہ فٹ کی کھدائی کے بعد معزز الدین کیکباد 13 ویں صدی عیسوی کا سکہ ملا اس کے بعد کاشی کا بنا ہوا لیمپ ملا جو ابتدائی اسلامی دور کی نشاندہی کرتا تھا۔ 12 فٹ کی گہرائی کے بعد شری سمنتا دیو کا سکہ ملا جو دسویں صدی کے دور کی نشاندہی کرتا تھا۔ 13 سے 14 فٹ کی گہرائی پر سرخ خون آلود مٹی ملی اور 18 فٹ کی گہرائی پر 6 سے 9 انچ موٹی کالی راکھ کی تہہ ملی۔ ان کھدائیوں کے دوران مغل دور، سلطانی دور اور عرب دور کی مخصوص اینٹوں کے ٹکڑے ملے اور ان کے بعد بدھ دور کی اینٹیں بھی ملیں۔ ان کھدائیوں کے دوران دو اہم انکشاف ہوئے کہ 15 فٹ اور 18 فٹ کے درمیان جو خون آلود مٹی اور راکھ کی تہہ ملی وہ محمد بن قاسم کے ملتان پر حملے کو ظاہر کرتی ہے اور 30 سے 32 فٹ کی گہرائی پر جو خون آلود مٹی اور راکھ کی تہہ پائی گئی وہ سکندر اعظم کے ملتان پر حملے کے بعد فتح ہونے پر ملتان میں جو قتل عام ہوا اور آگ سے شہر کو جو جلایا گیا وہ ثابت ہوتا ہے۔

32 فٹ سے نیچے کھدائی کرنے پر ریشم باف کا مٹی کا گولا جس پر ریشم لپیٹا جاتا ہے اور اوزار تیز کرنے کی پتھر کی وٹی ملی اور ایک تانبے کا برتن ملا جس میں 200 چوکور سکے تھے جو بالکل گل چکے تھے پڑھے نہ جا سکتے تھے۔''

مزید کننگھم نے تحریر کیا کہ ملتان کے مندروں میں پتھروں کے بنے ہوئے بڑے مندرے جن کو منکے اور

نال کہا جاتا ہے پائے جاتے ہیں۔ایسے بڑے پتھروں کے بنے مندرے اور منکے ہڑپہ سے بھی کھدائی میں نکلے ہیں۔ ان تمام دریافتوں کے بعد کنگھم نے تجزیہ کرتے ہوئے انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھا کہ میری تحقیق کے مطابق چار ہزار سال قبل ملتان ایک مہذب اور متمدن شہر تھا۔''

آج تک کنگھم کی اس رائے کی تردید میں کوئی تحقیقی مواد ہماری نظر سے نہیں گزرا نیز پر ہلاد بھگت ، نرسنگھ اوتار اور پر ہلاد بھگت کا والد کسیاپا جن کا ذکر ہندو علم الاصنام میں آتا ہے ہندوؤں کے شاستروں اور پورانوں میں ان سب کا تعلق ملتان سے ظاہر کیا گیا ہے۔اس لیے ہمیں یہ جاننا ہے کہ پر ہلاد بھگت کس دور کا شخص تھا۔ ہندوؤں اور دوسرے ماہرین جو اس بارے وافر علم رکھتے ہیں انکے اندازہ کے مطابق پر ہلاد بھگت کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے ملتان میں ہوا تھا۔اس طرح سے کنگھم کی یہ تحقیق کہ ملتان چار ہزار سال پہلے ایک مہذب متمدن شہر تھا پر ہلاد والے واقعہ کی وجہ سے بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے۔

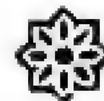
مسلمان علماء وفضلاء میں ہندو علم اور دانش جس کو آجکل Indology کہا جاتا ہے کہ علم کا بڑا اور پہلا عالم ابوریحان البیرونی 1030ء تھا اس نے اپنی معروف تصنیف ''کتاب الہند'' میں ملتان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔اول یہ شہر کسیاپا پورہ کے نام سے معروف ہوا پھر پر ہلاد پورہ پر ہلاد بھگت کی وجہ سے مشہور ہوا پھر بھاگ پورہ نرسنگھ اوتار جو آدھا انسان اور آدھا شیر تھا کی وجہ سے مشہور ہوا پھر رام چندر جی کے بیٹے ہنس کے دور میں ہنس پور کے نام سے پہچانا گیا۔پھر راجہ سنبھا نے اس کا نام سنبھا پور رکھ دیا اور آخر کار یہ مولاستھان ہو گیا۔

سنسکرت میں مولا کے بعد ابتدائی شہر، شہروں کا بانی قدیم شہر بھی ہیں مولانا سنسکرت میں اس طرح لکھا جاتا ہے ہندو مذہبی کتابوں کے مطابق ملتان آخری کرت یگیا کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔البیرونی کے حساب کے مطابق کرت یگیا دو لاکھ سولہ ہزار چار سو بتیس سال 216432 پہلے تھا۔ملتان اس وقت سے قائم و دائم ہے۔

ان سب باتوں کا تعلق محققین سے ہے ایک عام شہری کی حیثیت سے میری رائے سر الیگزینڈر برنس کی رائے جیسی ہے جو 1832ء میں ملتان سے گزرا اور ملتان کو دیکھ کر اس نے کہا کہ کون ہے جو اس شہر کی معیت کو دیکھنے کے بعد یہ کہے کہ ملتان دنیا کا قدیم ترین شہر نہیں ہے۔

جو لوگ ظاہراً منفی دلائل پیش کر کے ملتان کو نیا شہر بنانا چاہتے ہیں وہ میری طرح کھلی آنکھوں سے ملتان کو مکمل طور پر پیدل چل کر دیکھیں اور سر الیگزینڈر برنس جیسے معروف سیاح کی طرح ملتان کا گہرا مطالعہ کریں ان کی رائے یہی ہوگی کہ ملتان یقیناً دنیا کا سب سے قدیم زندہ شہر ہے۔نیز اپنے شہر سے مخلص محبت کریں آپ کو اپنے شہر کی قدامت کے بارے میں کوئی شکوک وشبہات نہ رہیں گے۔

(روزنامہ نوائے وقت ملتان۔عمر کمال خان ایڈووکیٹ)



ولی مظہر ایڈووکیٹ

جنگ آزادی 1857ء اور ملتان

جنگ آزادی 1857ء کو فرنگی نے مسلمانوں کی عظیم جدو جہد آزادی کو بدنام کرنے اور ان کے عزائم و بلند حوصلے پست کرنے کے لیے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ''غدر'' کا ے نام دیا۔ اور اس کا اتنا چرچہ کیا کہ عامتہ الناس اسے ''غدر'' کے نام سے یاد کرنے لگے انگریزی دور کی نصاب و تاریخ کی کتب میں بھی اسے غدر لکھا جاتا رہا۔ یہ جنگ آزادی اہل برصغیر خصوصاً مسلمان غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس مقدس جنگ کی ابتداء مئی کو میرٹھ کی فوجی چھاؤنی میں پہلی گولی چلا کر کی تھی۔ پھر ان حریت پسندوں نے عروس البلاد دہلی پر قبضہ کیا جو اس وقت برصغیر کا پایہ تخت تھا بعد ازاں یہ آتش حریت پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں جس سرزمین نے اپنے بطن سے جنرل بخت خان جیسے اولوالعزم جرنیل پیدا کئے وہاں رجب علی جیسے غداروں کو بھی جنم دیا جن کی بدولت میجر ہڈسن نے معصوم شہزادگان کو قتل کر کے ان کا خون پی کر اپنی آتش انتقام کو سرد کیا۔ پورے ہندوستان میں نفرتوں اور مخاصمتوں کے الاؤ سلگ رہے تھے جو فرنگی استعمار کو بھسم کر دینا چاہتے تھے لیکن میر رجب علی جیسی خصلت کے لوگوں نے حصول زر و مال و منال کے لالچ میں اپنی قوم سے غداری کر کے جاگیریں، خطابات وسیم و زر لے کر اس جنگ آزادی کی بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد کر دیا بلکہ فرنگی اقتدار کے استحکام میں ممد و معاون بنے۔ آزادی کی دھکتی چنگاری 6 مئی 1857ء کو میرٹھ (یو پی) میں بھڑکی اور 10 مئی کو اس چنگاری نے شعلہ کی صورت اختیار کر لی۔ 11 مئی کو صبح یہ شعلہ جوالا دہلی پہنچا۔ دہلی ہندوستان کا دل تھا جب کہ لاہور پنجاب کا دل تھا۔ مجاہدین صف شکن آزادی کا سبز ہلالی پرچم لیے (جنگ آزادی میں مسلمانوں کا پرچم سبز تھا اس پر ستارہ و ہلال بنے تھے۔ بعد میں 30 دسمبر 1906ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام پر مسلمانوں نے شاہی باغ ڈھاکہ میں اس پرچم کو اپنایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس تاریخ ساز پرچم کے سایہ تلے تحریک پاکستان کی پرعزم جدوجہد پروان چڑھی اور مدینتہ الثانی پاکستان مسلمانان برصغیر نے حاصل کیا) اٹھے۔ جب جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی تو انبالہ چھاؤنی سے 11 مئی 1857ء کو ایک برقیہ تمام ماتحت انگریز چھاؤنیوں کے نام جاری ہوا۔ مقام ترسیل انبالہ چھاؤنی تاریخ 11 مئی 1857ء بنام تمام چھاؤنی جات۔ ابھی ابھی دلی سے خبر آئی ہے کہ ہمیں وہاں کا دفتر چھوڑنا ہوگا۔ میرٹھ کے سپاہی تمام بنگلوں کو آگ لگا رہے ہیں۔ وہ آج صبح ہی

سے یہاں پہنچے ہیں ہم یہاں سے جا رہے ہیں آج سے کوئی پیغام نہ بھیجا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ مسٹری ٹوڈ مارا گیا ہے وہ صبح باہر نکلا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا ہمیں اس وقت تک جو اطلاع ملی ہے، نو (9) یورپین مارے جا چکے ہیں ''الوداع اہل دی فریزر''۔

تمام ہندوستان میں واقع انگریز چھاؤنیوں میں اس تار کے پہنچتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ گورا فوج کے انگریز ملازم سہم گئے دیسی سپاہیوں نے بارکوں سے باہر آ کر عوام کو خبر کر دی۔ دہلی میں فرنگی مجاہدین کی تاب نہ لاتے ہوئے یہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ انگریزی طاغوت کے خلاف مسلمانوں کے جذبات پہلے ہی مشتعل تھے۔ اس پر فرنگی استعمار نے تیل اس طرح ڈالا کہ دہلی میں موجود پیروں فقیروں مجذوبوں کو بلا امتیاز گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ یہ احمقانہ اقدام لوگوں کو بھڑکانے کے لیے کافی تھی۔ فرنگی استعمار محسوس کر رہا تھا کہ یہ خاموش آتش فشاں پھٹ کر رہے گا۔ دلی میں بغاوت کی خبر ملتے ہیں پنجاب کے قلب لاہور میں انگریز نے فوج کو حکم دیا کہ خوراک اور دیگر سامان رسد چار ہزار فوج کی نفری کے لیے چھ ماہ کے لیے کافی ہو شاہی قلعہ میں جمع کر لی جائے۔

اس کا علم عوام کو بھی کسی طرح ہو گیا وہ سمجھ گئے کہ دلی میں فرنگی طاغوت کی حالت بڑی دگرگوں ہے۔ جس کی وجہ سے فرنگی لاہور میں قلعہ بند ہو کر اپنا دفاع کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ انگریز استعمار نے لاہور چھاؤنی میں مقیم ہندوستانی فوج کو نہتا Dis Arm کرنے کے ایسا خفیہ منصوبہ بنایا جس کی کامیابی تک اس کا علم کسی کو نہ ہو سکا۔

لاہور میں چونکہ مسلمان فوجیوں کو نہتا کر دیا گیا تھا اس لیے انگریزوں کے خلاف کوئی معرکہ آرائی نہ ہو سکی، البتہ انفرادی طور پر سپاہی (مسلمان) فرنگی فوج سے فرار ہو کر دلی کا رخ کرتے رہے، اس امر کا کوئی ریکارڈ نہ مل سکا کہ پنجاب سے کتنے نوجوان سپاہی دلی تک پہنچنے میں مارے گئے یا درختوں سے لٹکائے گئے۔ ہاں انگریز فوجی افسران کی ڈائریوں سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ جو سپاہی دلی جاتے ہوئے پکڑے جاتے تھے انہیں مسلمان غدار یا ہندو سکھ جاسوس پکڑوا دیتے تھے جن کو توپ دم کر دیا جاتا تھا۔ توپ کے دہانے سے باندھ کر فلیتھ کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ آگ لگانے والا انگریز دوڑ کر سامنے آتا اور اس کے جسم کے پرخچے اُڑتے دیکھ کر محظوظ ہوا کرتا تھا۔ توپ دم کرنے کا مجرمانہ، ظالمانہ اور سفاکانہ فعل فرنگی طاغوت کی اختراع تھی۔ دلی سے مجاہدین کو جو احکامات آتے تھے، وہ اس قسم کے ہوتے تھے، 1۔ فرنگی کا اعتبار نہ کرنا 2۔ کوئی مالیہ اور ٹیکس ادا نہ کرنا 3۔ ہندوستان مسلمانوں کا ہے انگریزوں کا نہیں 4۔ اگر فرنگی کافر کے خلاف لڑتے ہوئے مارے جاؤ گے تو شہادت کا رتبہ پاؤ گے۔ بنگال کے صوبہ سرحد تک مسلمان دلی میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہتھیار لے کر یہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔'' لاہور کے مسلمان شہروں سے 12 جون 1857ء کو تمام ہتھیار لے لئے گئے تھے۔ کسی کے پاس سبزی یا پھل کاٹنے کی چھری بھی تھی وہ بھی رکھوا لی گوی۔ ذرا سے شک پر شہریوں کو گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

ملتان شہر میں بھی انگریزوں کی چھاؤنی تھی۔ قلعہ کہنہ قاسم باغ میں بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ عید گاہ میں عدالت لگتی تھی۔ قلعہ کے شمال کی جانب پانی کی ٹنکی بنی ہوئی تھی۔ جس پر 1835ء کی تختی نصب تھی جو کسی کم ظرف

نے اتار کر چند ٹکوں میں فروخت کر دی ہو گی۔ ملتان میں ایک رسالہ اور دو پلٹنیں رہتی تھیں انہیں جنگ آزادی 1857ء کے آغاز کے ایک ماہ بعد 10 جون 1857ء کو غیر مسلح کر دیا۔ میرٹھ اور دلی کی خبروں سے سپاہیوں کو بے خبر رکھنے کے لیے انہیں بارکوں سے باہر جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ چھاؤنی کا بڑا حصہ موجودہ چھاؤنی میں رکھا گیا تھا۔ یہاں کسی کو داخل ہونے نہیں دیا جاتا۔ چھاؤنی میں داخل ہونے والے آدمی کی خوب جانچ پڑتال ہوتی تھی۔ یہاں بھی شک ہونے کی صورت میں کسی بھی شہری کو گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ فقیروں ملنگوں علماء وغیرہ کو پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا جس روز یہاں یعنی 10 جون کو جب سپاہیوں کو غیر مسلح کیا اس روز یہاں سے پلٹن نمبر 69 کے چار جوان فرار ہو گئے۔ ان میں سے ایک پکڑا گیا۔ اس کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ باقی تین کا کوئی سراغ نہ ملا۔ جس سپاہی کو سزائے موت سنائی گئی اس نے انگریز افسر سے کہا کہ اگر اس کی سزا معاف کر کے عمر قید بھی نہ دی جائے تو وہ چھاؤنی کے مسلمان سپاہیوں کی بغاوت کی سکیم بتا دے گا۔ اس وقت انگریز مطمئن تھے کہ انہوں نے باہر کی خبروں سے ملتان کے مسلمان سپاہیوں کو بے خبر رکھا ہوا ہے۔ ان سے ہتھیار بھی لے لیے گئے ہیں۔ اب ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے اس سپاہی نے اپنی جان بچانے کی خاطر بڑا ہی اہم منصوبہ ایک مضبوط مورچہ تباہ کرا دیا۔ اس نے پیدل پلٹن کے چند سپاہیوں کے نام بتائے جو ملتان کے ایک غیر فوجی گروہ سے مل کر جنگ آزادی کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ ان میں ایک نام پلٹن کے صوبیدار میجر نابر خان کا تھا اس کے ساتھ دس مسلمان سپاہی گرفتار ہوئے۔ ان سب کے سامنے یہ شرط رکھی گوی کہ وہ ساری سکیم اور باہر کے غیر فوجیوں کے نام بے نقاب کر دیں ان کی جان بخشی کر دی جائے گی لیکن انہوں نے کسی کا بھی نام نہ بتایا انہیں 18 جولائی 1857ء کو فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ 24 جولائی کو انہیں پھانسی دے دی گئی۔ ان کی شہادت نے طوفان بلاخیز کے تمام بند توڑ دیئے۔ وہ لاوا ابل پڑا جو زیر زمین کبھی سے سلگ رہا تھا۔ اس آتش فشاں کے پس پردہ، زمین دوز محاذ آزادی کے قافلہ سالار، کھرل قوم کے سردار احمد خان تھے۔ وہ عظیم مجاہد تھے اسلام کے شیدائی اور فدائی تھے صوبیدار میجر نابر خان انہی کے محاذ کے سالار تھے۔ نابر خان نے شہید ہنے تک باوجود ترغیب وتحریص اور ظلم وتعدی کے اپنے کسی ساتھی یا لیڈر کا نام تک نہ ظاہر کیا۔ انہیں 24 جولائی کی صبح پھانسی دے دی گئی 24 اور 25 جولائی کی درمیانی شب کو سردار احمد خان نے جانبازوں کے ایک دستے کے ساتھ گوریہ جیل پر حملہ کیا وہ مجاہد قیدیوں کو فرنگی کی قید سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کے دستے نے جیل کا بڑا دروازہ توڑنے کی کوشش کی اور دیواریں پھلانگنے کی کوشش بھی کی۔ جیل کے محافظ دستے کے ساتھ دست بدست لڑائی بھی ہوئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس جرات مندانہ حملے میں احمد خان کھرل کے 40 جوان زخمی ہوئے اور شہید ہوئے۔ صرف 20 جانباز زندہ واپس گئے، انگریز فوج نے اور پولیس نے انہیں گرفتار کرنے کے لیے جاسوسوں اور مخبروں کے دستے میدان میں اتار دیئے۔ تمام میسر اور ممکنہ ذرائع بروئے کار لائے گئے بہت سے لوگوں کو شک میں گرفتار کیا گیا مگر کسی جانباز کا سراغ تک نہ ملا۔ یہ جانباز اور سردار احمد خان کہیں روپوش ہو گئے تھے بھاگے نہیں تھے۔ یہ اپنی موجودگی کا احساس بڑی شدت سے دلا رہے تھے اور ملتان ہی میں موجود تھے۔

گورا پلٹن، سکھ اور ہندو پلٹنیں دیہات میں جاتیں تو ان پر عقب سے دو چار فائر ہو جاتے یا کوئی تلوار یا برچھے وغیرہ کا وار ہو جاتا۔ اس کام کے کرنے والے غائب ہو جاتے۔ اس طرح فرنگی فوج کے ایک دو سپاہی واصل جہنم کر دیئے جاتے یا زخمی کر دیئے جاتے۔ ملتان شہر کے اندر بھی مسلمانوں نے چھوٹی شکل میں شب خون مار مار کر انگریزوں کو ہراساں کیا۔ ان کا طریقہ گوریلا طرز کی کارروائی سا تھا۔ انگریز نے سردار احمد خان اور ان کے جانبازوں کی گرفتاری کے لیے انعامات کا اعلان بھی کیا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو حکومت کے حوالے کر دیں انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا ان کی جان بخشی کر دی جائے گی۔ جواب میں سردار احمد خان نے اعلان کیا ''ہمارا بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہے ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کی حمایت میں اس کے حکم سے کر رہے ہیں۔ انگریز حکومت کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کے حوالے کر کے یہاں سے نکل جاؤ۔'' سردار احمد خان کھرل انگریزوں، سکھوں اور ہندوؤں کے لیے ایک پراسرار شخصیت بن چکا تھا۔ اس کے نام سے سب خوفزدہ تھے۔ راتوں کو جن بھوت کے علاوہ احمد خان کے نام سے خائف تھے۔ وہ غدار ضمیر فروش مسلمان جو فرنگی کے ہمنوا تھے راتوں کو اپنے گھروں کے باہر پہرا لگوا کر سوتے تھے یہ غدار شکاری کتوں کی طرح احمد خان کی بو سونگھتے پھرتے تھے۔ احمد خان نے کئی غداروں کو ان کی غداری کے سبب قتل کر دیا تھا لیکن غداروں میں کمی نہیں آئی۔ تاریخ شاہد ہے جس قدر مسلمانوں میں غدار ہوئے اتنے کسی قوم میں نہیں ہوئے۔ بغداد کی سلطنت علقمہ نے، سپین کی 8 سو سالہ حکومت ابوداؤد نے، سراج الدولہ کی حکومت میر جعفر نے، سلطان ٹیپو کی حکومت میر صادق میر غلام علی لنگڑے نے، بہادر شاہ ظفر کی حکومت سید رجب علی نے غداری سے ختم کرائی۔ جبکہ سقوط ڈھاکہ کے کرداروں سے کون واقف نہیں۔ انگریز اہل یہود اور ہندو میں ایک غدار بھی نہیں ہوا؟ اگر انگریزوں کو غداروں کی مدد حاصل نہ ہوتی تو وہ یہاں سے بھی دلی کی طرح بھاگ جاتے۔ عوام ہمیشہ حق کے ساتھ رہے جبکہ وڈیرے، جاگیردار، خطاب و مراعات یافتہ ہمیشہ مرغ بادنما کی طرح اپنی وفاداریاں بدلتے رہے۔ احمد خان کھرل مجاہد اعظم نے 17 دسمبر 1847ء کو گوگیرہ پر ایک اور زوردار حملہ کیا۔ گورا فوج بروقت وہاں پہنچ گئی۔ مجاہدین نے گلیوں اور مکانوں سے فائرنگ کے ذریعے اور تلواروں اور برچھیوں سے دست بدست جنگ کی اس دور میں ڈاک گھوڑا سے جاتی تھی۔ چنانچہ مجاہدین نے ڈاک پر قبضہ کر لیا اور آگ لگا دی۔ انگریزوں نے گوگیرہ کو گھیرے میں لے لیا مگر احمد خان اپنے جانبازوں کے ساتھ محاصرے سے نکل گئے۔ جو لاشیں انگریزوں کے ہاتھ آئیں ان سے انہیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ کون تھے؟ اس کے ایک دن بعد ہی انگریزوں نے دلی پر جوابی حملہ کر دیا۔ اور بیشتر حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس سے مسلمانوں کی شکست کی ابتدا ہوئی۔ اس شکست کے پس منظر میں غدار، وطن فروش، فرنگی کے کتے نہلانے والے ان کے جی حضوری، جاگیریں اور انعامات پانے والے وطن اور قوم فروش تھے۔

اس کے بعد دلی پر انگریزوں کا پوری طرح تسلط قائم ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر کو خاندان سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ بہادر شاہ کو سید رجب علی نے گرفتار کرایا۔ اس کے صلے میں اسے جگراؤں (لدھیانہ مشرقی پنجاب) میں جاگیریں خطاب اور انعامات دیئے گئے۔ انگریز نے اپنی فتح کا اعلان کر دیا مگر احمد خان نے ہتھیار نہ ڈالے اور نہ ہی انگریز کی حکومت کو

تسلیم کیا۔ یہ بدستور اپنے مجاہدین کے ساتھ فرنگی جبروت کے لیے مصیبت بنا رہا۔ انگریز کے پنجے برصغیر پر مضبوط ہوتے گئے اس کے ساتھ ساتھ غداروں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ احمد خان کھرل کے لیے خطرات میں اضافہ ہوتا گیا۔ 21 جنوری 1857ء کو مخبروں نے اطلاع دی کہ احمد خان قریبی جنگل میں موجود ہے۔ چنانچہ گورا پلٹن، رسالے اور توپ خانے مجاہدین کو گھیرے میں لینے کے لیے گئے۔ مجاہدین کو بھی اطلاع ہوگئی کہ فوج آ رہی ہے۔ احمد خان نے حکم دیا کہ مردانہ وار مقابلہ کیا جائے۔ فوج قریب آ گئی تو مجاہدین صف شکن نے ایسی حکمت عملی سے مقابلہ کیا کہ وہ محاصرے میں نہ آ سکے۔ انگریزی فوج کا خیال تھا کہ وہ مجاہدین کو بے خبری میں جالیں گے۔ مجاہدین نے مورچہ بندی کی بجائے گورا پلٹن پر حملہ کر کے دست بدست جنگ شروع کر دی۔ اس طرح انگریزی توپ خانہ بے کار ہو گیا۔ اس خونریز معرکے میں احمد اور ان کے دو بھتیجے سارنگ خان اور مراد خان شہید ہو گئے کئی مجاہدین بھی شہید ہوئے اور زخمی بھی ہوئے۔ اس کے باوجود مجاہدین نے میدان نہیں چھوڑا آخر مجاہدین کی تعداد قلیل تھی اس وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریز فوج کے جنرل بریگیڈیر برکلے نے اپنی فوج کی ترتیب بدل کر مجاہدین کا تعاقب کیا۔ مجاہدین نے بالا آخر ایک کاری ضرب لگائی اور دلیرانہ مقابلہ کیا۔ انگریز بریگیڈیر کو واصل جہنم کر کے انگریز فوج کے دم خم ڈھیلے کر دیئے۔ تعاقب سست پڑ گیا۔ مجاہدین دور نکل گئے اور اسی طرح مجاہدین ہڑپہ جا پہنچے۔ وہاں انگریزوں کے اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ اور بہت سا سامان حرب تھا۔ مجاہدین نے اس ذخیرے کو تباہ کر کے لوٹ لیا۔ اس کے بعد مجاہدین کا جذبہ ان کے سالار احمد خان شہید کی وجہ سے ماند پڑنے لگا۔ کوئی ان کی کمان کرنے والا نہ تھا۔ انگریز نے سکھوں اور ہندوؤں کو پوری طرح اپنا اتحادی بنا لیا۔ مسلمانوں پر روزگار، ملازمتوں، تعلیم اور معاش کے تمام وسائل اور ذرائع بند کر دیئے گئے۔ جاگیریں انعامات دے کر وطن فروشوں کو خرید لیا گیا۔ بعد ازاں احمد خان اور ان کے جانبازوں کے کارنامے کہانیاں بن گئے۔ غداری سے لائی گئی طویل سیاہ رات مسلمانان برصغیر پر 14 اگست 1947ء تک طاری رہی۔ اس کے سحر کو بعض کوتاہ اندیش اقتدار کے پجاریوں نے پھر سے تاریک رات کی غلامی میں بدلنے کی سازش کی جو بدستور جاری ہے۔ اللہ کریم ہمیں اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے امان میں رکھے۔

(مسلک (گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن۔ ملتان) - ولی مظہر ایڈووکیٹ)



ڈاکٹر مختار ظفر

تاریخ ملتان کا ایک خونیں ورق

قیام پاکستان کی بنیاد ہندو اور مسلم کا تہذیبی، مذہبی اور سماجی تضاد تھا، یہ تضاد مسلمانوں کے دور حکومت میں ان کی مذہبی رواداری اور احترام انسانیت کے رویوں کی بنا پر باہمی نزاع کے بجائے بھائی چارے کی فضا کا سامان بن گیا۔ لیکن انگریزی دور میں اس تضاد نے مختلف رویوں، حوالوں اور ریشہ دوانیوں کے ذریعے نزاعی شکل اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ کانگریس کے دور حکومت میں اس نے فرقہ وارانہ فسادات کے منظر ترتیب دینے شروع کر دیئے۔ یوں ہندوانہ ذہنیت مسلم دشمنی میں کھل کر سامنے آ گئی۔ 1946ء میں کلکتہ اور پھر نواکھلی اور دیگر شہروں میں خوں ریز ہندو مسلم فسادات، صوبہ بہار میں مسلمانوں کے قتل عام اور بے شمار بستیوں کی تباہی، یو پی کے ایک گڑھ میں لرزہ خیز مسلم کشی کے واقعات اسی دور کی دلخراش تصویریں ہیں۔

ملتان میں بھی ہندوؤں کی مسلمانوں سے نفرت، نزع اور فسادات کی مثالیں تاریخ کا حصہ ہیں اور یہ اس دور کی بات ہے جب مسلمان اور ہندو سیاسی سطح پر اتحاد و اتفاق کے علمبردار تھے...... 10 محرم الحرام 1341ھ بمطابق ستمبر 1922ء کی بات ہے کہ ترکھان والا تعزیہ مچھی ہٹہ سے گزرا اور پاس کے مکان سے ایک اینٹ آئی اور تعزیہ پر لگی جس پر مسلمان جوش میں آ گئے۔ یہ محلّہ چونکہ ہندوؤں کا تھا اس لیے شرارت کا شک بھی ہندوؤں پر ہوا۔ تاہم مسلمانوں کو جوابی کارروائی سے روک لیا گیا۔ وہاں سے کچھ مسلمان دوسرے تعزیہ کی طرف گئے جنہیں راستے میں ہندوؤں نے خوب پیٹا۔ (1) اس مزید زیادتی پر مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے اور ردعمل میں ان سے ایسی کارروائیاں ہوئیں جن سے معاملہ طول پکڑ گیا۔ (2) چوک بازار میں اس فساد کی خبر جب ڈپٹی کمشنر کو پہنچی تو انہوں نے ایک تو پولیس اور فوج کو ہدایت کی کہ تعزیوں کو جلد از جلد شہر سے باہر نکالا جائے اور دوسرے یہ کہ خود بھی جائے واردات پر پہنچ گئے نیز ایک پیغام چھاؤنی کے حکام کو بھجوایا کہ تین سو آدمیوں کی بجائے چھ سو کی نفری بھیجی جائے...... اسی اثناء میں غلط افواہیں اڑیں جس کے نتیجے میں مختلف مقامات فسادات کی زد میں آ گئے۔ ان فسادات کی اجمالی رپورٹ ایک مسلمان راوی الموسوم بہ خاکسار عبدالواحد انصاری ندوی یہ ہے کہ فریقین میں ہاتھا پائی کو دیکھ کر حضرت مخدوم صاحب اور ڈی سی صاحب نے ہجوم کو منتشر کرنے کا حکم دیا۔ لوگ منتشر ہو کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

ان کی واپسی پر شاید اس غلط فہمی کی وجہ سے کہ یہ لوگ لوٹنے یا مارنے کے لیے آ رہے ہیں، مکانات سے اینٹوں کی بارش شروع ہوگئی۔ گزرنے والوں پر بعض اشخاص نے تیزاب بھی پھینک دیا۔ متاثرین بھی جواب پر مجبور ہوئے۔ جس نے ایک فساد کی صورت اختیار کر لی، لیکن اس کی خبریں مختلف شکلوں اور کیفیتوں میں بجلی کی طرح تمام اطراف شہر میں پھیل گئیں۔ مسجدوں کے جلائے جانے کی افواہ بڑے سلیقے سے شائع کرائی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازوں پر فوجی پہرہ لگ گیا جن سے باہر نکلنے والے خون آلود اور مجروح مسلمانوں نے گواہ ناطق کی حیثیت سے اندرون شہر کے فتنہ و فساد کی صورت حال اور واضح کر دیا۔...... 3 ستمبر 1922ء کو فیض محمد خاں جیسے مرنجاں مرنج، المعروف بہ پردہ نشیں، ضعیف سخی انسان کا بزدلانہ قتل، بیرون شہر کے مسلمانوں کا مجبورانہ اضطراب، مسلمان بچوں کے چاہات میں ڈالے جانے کی غلط افواہیں ...... یہ واقعات ایک ایسے بلوہ عام، ایک ایسی لوٹ مار اور ایک ایسی آتش زدگی کا سبب بنے کہ امن و امان کا کاروبار کرنے والی دکانیں گویا بند ہوگئیں۔ (4)

دراصل اندرون شہر میں مسلمانوں کی تعداد، ہندوؤں کے مقابلے میں بہت قلیل تھی، چونکہ سبھی دروازوں پر فوجی پہرہ تھا، اس لیے باہر کے مسلمان اندر جا کر بچشم خود حالات کا نظارہ نہیں کر سکتے تھے۔ تب غائبانہ رابطوں کی یہ جدید سہولتیں بھی موجود نہ تھیں۔ اس لیے افواہیں ہی یقین کا باعث بن گئیں۔ چنانچہ شہر کے مختلف مقامات پر گو بلوائیوں کا قبضہ تھوڑی دیر تک ہی رہا لیکن تشدد کی شدت نے نقصان بہت پہنچایا۔ 3 ستمبر کو ان ہنگاموں کی مجموعی مدت دو گھنٹہ سے زیادہ نہ تھی۔ کیونکہ فوجی پہرہ جلدی لگ گیا تھا۔ بیرون شہر اور اندرون شہر فوجیوں کے گشت اور ضابطہ فوجداری 107 کے تحت زیادہ سے زیادہ فسادیوں کے چالان نے صورتحال کو نارمل کر دیا۔ آٹھ بجے سے تحقیقات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ مگر حالات پھر بگڑ گئے۔ لاٹھیوں سے مسلح ٹولیاں اپنے مخالفین کے گھروں میں سے کسی ایک پر حملہ کر دیتیں اور فوج یا پولیس کی آمد پر منتشر ہو جاتیں ...... تاہم 4 ستمبر تک حالات سدھر گئے اور مطلع اتنا صاف ہو گیا کہ سر برآوردہ اشخاص کا ایک جلسہ منعقد ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے۔ (5) اس فساد کی تحقیقات کے لیے کانگرس نے ایک کمیٹی تشکیل دی جو حکیم اجمل خاں، پنڈت مالویہ جی، لالہ دونی چند، مسٹر شروانی، مسٹر احمد علی اور ملک لعل خاں پر مشتمل تھی (6) ...... مگر بایں ہمہ ہندو اخبارات ''بندے ماترم''، ''پرتاب'' اور ''کیسری'' کا طرز عمل معاندانہ تھا اور انہوں نے یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی منافرت اور ملی عناد پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ''کیسری'' لکھتا رہا کہ ملتان کے واقعہ نے نادر شاہ اور محمود غزنوی کے مظالم کو مات کر دیا ہے۔ ...... ایک اخبار نے لکھا کہ مسلمانوں میں ایک بھاری طبقہ موجود ہے جو موقع پانے پر غیر ذمہ دارانہ عمل کے لیے تیار رہتا ہے اور اس کے نزدیک کسی قوم کی عزت و آبرو کی کوئی حقیقت نہیں رکھی۔ (7) ہندو اخبارات کے اس غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کا نوٹس لیتے ہوئے روزنامہ ''سیاست'' نے اپنے اداریے میں لکھا کہ ہندو اخبارات بالخصوص ''پرتاب'' اور ''کیسری'' تواتر کے ساتھ اس قسم کے مضامین لکھ رہے ہیں جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے خلاف اشتعال پیدا ہو۔ ان کی طرف سے ہندو مستورات کی عصمت دری کے الزامات بالکل جھوٹے اور لغو ہیں۔ سیاست نے یاد دلایا کہ آج کے دور میں تو

ہندوؤں کی طرف سے بہار اور کٹار پور میں مسلمانوں پر وہ شدائد توڑے گئے کہ خدا کی پناہ! یہاں تک کہ زندہ مسلمانوں کو دہکتی ہوئی آگ میں جھونک کر جلایا گیا (8) اس واقعہ کی تحقیق کے لیے پنجاب پراونشل کانگرس کی جانب سے 5 ستمبر کو ایک وفد ملتان پہنچا۔ ڈاکٹر جگن ناتھ، ڈاکٹر نند لال، ڈاکٹر کشب اور 18 خلافت اور کانگرس کے والنٹیر ز کے علاوہ ''بندے ماترم'' ''پرتاب'' اور ''زمیندار'' کے رپورٹرز بھی ہمراہ تھے۔ یہ وفد 6 ستمبر کی صبح کو ساڑھے پانچ بجے ملتان سٹیشن پہنا، جہاں فوجی پہرہ لگا ہوا تھا۔ شہر کے تمام دروازوں پر بھی فوجی پہرہ تھا مگر انتظام سول حکام کا تھا۔ یہ وفد فسادات کے تمام مقامات پر گیا۔ پھر ڈپٹی کمشنر، مسٹر ایمرسن، کمشنر شیخ اصغر علی، ڈپٹی انسپکٹر جنرل ایس مسٹر براڈے اور ایس پی شیخ عبدالرشید سے ملا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تعزیے پر اینٹ کے پھینکے جانے پر تعزیتی ہجوم کا آپے سے باہر ہونا فطری امر تھا۔ لیکن مسجد ولی محمد کے جلائے جانے کی افواہ غلط تھی اور اس پر ہجوم نے بے قابو ہو کر لوٹ مار کی۔ کمیٹی کے حکام نے بے اعتنائی کا سخت نوٹس لیا کیونکہ لوٹ مار کے اقدامات پولیس چوکیوں کے قریب ہوئے تھے۔ کمیٹی کی رائے تھی کہ 3 ستمبر کو مسلمانوں نے جارحیت کی اور 4 ستمبر کو ہندوؤں کی طرف سے۔ 7 ستمبر تک خطرہ دور نہیں ہوا تھا تاہم جانی نقصان برابر کا ہوا۔ ہلاک ہونے والوں کی تعداد دس سے زائد نہ ہو گی۔ کسی عورت یا بچے کی جان ضائع نہیں ہوئی۔ کوئی شخص یا عورت کنویں میں نہیں پھینکی گئی گو اس حوالے سے افواہیں بہت پھیلائی گئی ہیں البتہ بہت سا مال کنوؤں میں پھینکا گیا۔ کوئی گائے نہیں جلائی گئی اگرچہ گھاس کے ڈھیر کو آگ لگائی گئی دس پندرہ عورتوں کے جسموں سے زیور کھسوٹے گئے لیکن ہم نے صرف دو عورتوں کو دیکھا کہ بالیوں کے جھٹکنے سے ان کے کان پھٹ گئے تھے۔

رپورٹ میں بعض روشن پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی گئی۔ کئی ہندوؤں نے مسلمانوں کو بچایا اور بہت سی جگہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو تحفظ دیا۔ ہندو مسلم اور عیسائیوں نے ایک دوسرے سے عموماً اچھا سلوک کیا (9) ...... روزنامہ ''زمیندار'' نے اپنے اداریئے میں ایک شریف او صالحہ عورت کا ذکر کیا جس نے کم و بیش چالیس ہندو مردوں، عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں پناہ دے کر دین کی تعلیمات کی آبرو کو قائم رکھا۔ البتہ اسی اداریئے میں کسی اسلامی جماعت کے اس جاہل و نادان گروہ کی گوشمالی کی گئی جس نے حدود سے تجاوز کیا تھا۔ (10) ...... یوں زمیندار نے تو حق گوئی کا معیار قائم کیا مگر ہندو اخبارات نے جانبداری برتی اور فسادات کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی۔ ان اخبارات نے کانگرس کی رپورٹ پر بھی اعتماد نہ کیا اور اپنے ذاتی نمائندوں کی رپورٹوں کے ذریعے سنسنی خیز واقعات کی تشہیر کی...... جس کا نوٹس لالہ جپت رائے جی کے اخبار ''بندے ماترم'' لاہور جو میلا رام وفا کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، نے بھی لیا۔ اس نے پہلے ''پرتاب'' کے رویے پر رائے زنی کی اور پھر ''کیسری''، ''زمیندار'' اور ''سیاست'' پر۔ اس نے اپنے اداریئے میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ معزز معاصر ''کیسری'' کا رویہ ''پرتاب'' سے بھی زیادہ غیر ذمہ دارانہ رہا۔ جس نے فسادات کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی بلکہ یہاں تک لکھ دیا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں کا ایک دوسرے سے صاف ہو جانا بعض اشخاص کے نزدیک ناممکنات میں سے

ہے (11) .... یہی بات قبل ازیں زمیندار نے اپنے اداریے بعنوان ''فسادات ملتان اور بعض ہندو معاصر'' میں کہی تھی اور تجویز کیا تھا کہ پروانشل کمیٹی ''کیسری'' اور ''پرتاب'' کے رویے پر غور کرے جنہوں نے بے اصل اور بے بنیاد دروغ بافیوں کو کذب سرائیوں کو فروغ دیا اور مذہبی منافرت کے جذبات کو مشتعل کرنے کی سعی کی (12) ......

''بندے ماترم'' کی اشاعت 24 ستمبر 1922ء میں ''ملتان کا بلوہ اور مسلمان لیڈروں کے فرائض'' کے عنوان سے لالہ دونی چند جی سابق وکیل انبالہ کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں پہلے تو فسادات ملتان کے زہریلے اثرات کو ضائع کر کے ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کی گئی اور پھر پراونشل کمیٹی، کانگرس کمیٹی، ''بندے ماترم''، ''ٹربیون''، اور ''ہندوسبھا'' کے نمائندگان کی جائے وردات پر پہنچ کر حاصل کردہ رپورٹوں کے حوالے سے جو نکات بیان کئے گئے ان میں بھی مسلم عناد کا رنگ غالب تھا اور یہ تلقین محل نظر تھی کہ مسلمان لیڈروں کو جناب حکیم اجمل خاں کی تقلید کرتے ہوئے اخبارات اور اعلانات کے ذریعے تسلیم کرنا چاہیے کہ ملتان کے مسلمان بلوائی قصوروار ہیں۔ اور یہ بھی کہ کئی ہندو عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور بعض کے زیورات نوچے گئے۔

اس ضمن میں پنڈت کے سنتانم کا تجزیاتی مضمون بعنوان ''بلوہ ملتان پر کانگرس کی رپورٹ کے متعلق چند غلط فہمیوں کی تردید'' دلچسپی کا حامل تھا۔ ان کے بقول ہندو عورتوں کی بے حرمتی کئے جانے کے متعلق ہم اپنی رپورٹ پر اب بھی قائم ہیں لیکن اس کا مفہوم عصمت دری بالکل نہیں۔ انہوں نے لکھا کہ ملتان میں ہمیں چار ایسے کیس بتائے گئے جن میں سے ایک تو بالکل غلط ثابت ہوا۔ جو ایک جوشیلے دماغ کی ایجاد تھا۔ دو حالتوں میں ہندوؤں نے ہمارے سامنے اپنے پہلی کہانی کو بہت سا بدل ڈالا۔ اس لیے ناقابل اعتبار ٹھہرے۔ چوتھے نے بتایا کہ کوئی شہادت نہ ملے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سنگین الزامات کی کوئی بھی شہادت نہ ملی۔ (13) ....

یہ واقعہ جو قیام پاکستان سے 25 سال اور قرارداد پاکستان سے اٹھارہ سال قبل ملتان میں رونما ہوا، خود اور اس کا بے لاگ تجزیہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی ذہنیت میں عصبیت اور مسلم نفرت کس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ صحافت کسی بھی قوم کے دماغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندو قوم کے اس دماغ میں اس وقت جبکہ ہندو مسلم اتحاد باہم عروج پر کس قسم کی سوچ پل رہی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے اخبارات اور متذکرہ تبصروں اور تجزیوں سے ہوتا ہے۔ ان اخبارات نے کانگرس کمیٹی کی رپورٹ پر بھی اعتماد نہ کیا جو ہندو مسلم نمائندوں پر مشتمل تھی بلکہ اپنی ذہنی عصبیت کے مطابق اپنے نمائندوں کی رپورٹوں پر یک طرفہ اعتماد کر کے ہندو مسلم اتحاد کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی ہندوؤں کی یہی عصبیتیں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی تشکیل اور ایک الگ مملکت کے قیام کا محرک بنیں۔ اپنے نمائندوں کی رپورٹوں پر اعتماد کر کے ہندو مسلم اتحاد کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔

1۔ مطبع: پنڈت میلا رام ملتانی روزنامہ سیاست لاہور (ص 7) 13 ستمبر 1922ء

2۔ ایضاً

3۔ روزنامہ سیاست ایضاً (ص 6) 8 اکتوبر 1922ء

4۔ ایضاً............(ص6)28 اکتوبر 1922ء

5۔ ایضاً............(ص6)8 اکتوبر 1922ء

6۔ ایضاً............(ص6)8 نومبر 1922ء

7۔ روزنامہ زمیندار، لاہور (اداریہ) 13 نومبر 1922ء

8۔ روزنامہ سیاست 13 ستمبر 1922ء

9۔ ایضاً............(ص6)8 اکتوبر 1922ء

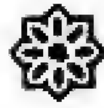
10۔ زمیندار، 19 ستمبر 1922ء

11۔ بندے ماترم لاہور (ص2) 1922ء

12۔ زمیندار 13 ستمبر 1922ء

13۔ بندے ماترم، 28 ستمبر 1922ء

(مسلک (گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن۔ملتان) - ڈاکٹر مختار ظفر)



سید سبط حسن

ملتان: ضمیر کی آواز کا شہر

ملتان کی تاریخی عظمت مسلمہ ہے پاکستان کا یہ مقدس خطہ صدیوں سے تہذیب کا گہوارہ اور فکر وفن کا نہایت اہم کرکز رہا ہے اسی شہر میں سب سے پہلے معتزلہ نے عقل کی شمع روشن کی تھی اسی شہر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے چھ برس تک صوفیائے کرام کی صحبت سے فیض حاصل کیا اسی شہر کی روح پرور فضا میں حضرت امیر خسرو کی شاعری کے نغمے گونجے یہ شہر مدتوں ہماری تہذیب کا ضمیر اور ہمارے ضمیر کی آواز رہا ہے ملتان کے صوفیائے کرام اور شعرا جن میں حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر اور خواجہ فرید کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں وحدت الوجود کے قائل تھے کائنات کا یہ فلسفہ ان کے ذہن میں ان کے جذبات و احساسات ان کے کردار و اعمال غرض ان کی پوری شخصیت پر حاوی تھا اگر تہذیب سے مراد طرز زیست اور مسلکِ حیات کی اقدار ہیں تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان کی تہذیب وحدت الوجود کی تہذیب تھی ان کی نظر میں ریگ زار اور پھل بن نباتات و جمادات حیوان اور انسان ایک ہی ذات کے مختلف روپ تھے ایک ہی حقیقت کے مختلف مظہر تھے ان کے نزدیک ہر گھاٹی وادی ایمن اور ہر پتھر کوہ طور تھا جس نے جہاں بینی اور دروں بینی کی منزلیں طے کر لیں وہ مذہب وقت رنگ و نسل ملک و قوم کے امتیازات سے بے نیاز ہو گیا ان کی نگاہ میں مومن اور کافر شیخ اور برہمن، دیر اور حرم بادشاہ اور گداگر رند اور پارسا، عارف اور عاصی سب یکساں تھے وہ ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ سمجھتے تھے وہ عشق کے بندے تھے مہر و محبت ان کا مسلک تھا اور انسان دوستی ان کا مذہب وہ زندگی کے تضادات کو دردمندی کی آگ پر پگھلاتے تھے اور پیار کے پیغام سے دلوں کو منور کرتے تھے زبان اور تہذیب کا فرق بھی ان کے لیے بے معنی تھا چنانچہ آج اگر ان بزرگوں میں سے کوئی قومی اور علاقائی تہذیبوں یا زبانوں پر ہماری باتیں سنتا تو اسے بڑی حیرت ہوتی کیونکہ جن مسائل کو ان بزرگوں نے صدیوں پیشتر الفت اور آگہی سے حل کر لیا تھا ہم ہنوز ان مسائل کے مبادیات ہی میں الجھے ہوئے ہیں قومی تہذیب اور علاقائی تہذیبوں کے رشتے کا جائزہ اس پس منظر میں لیا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان کو تین چیزوں نے انسان بنایا اس کے ہاتھوں نے اس کے دماغ نے اور اس کی زبان نے فلسفیوں اور سائنسدانوں میں ان عناصر کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں ابھی تک اختلاف پایا جاتا ہے کوئی کہتا ہے کہ پہلے ہاتھوں نے کام کرنے کی طرح ڈالی تب ذہن نے چیزوں کا تصور کیا

اور قوت گویائی نے لسانی علامتیں تراشیں یعنی بقول گوئٹے ابتدا میں عمل تھا کوئی کہتا ہے کہ نہیں پہلے ذہن نے سوچا پھر ہاتھ اور زبان نے ذہن کے ارادے کے مطابق عمل کیا کوئی کہتا ہے کہ نہیں ابتدا میں کلام تھا کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا ارسطو نے اسی بنا پر انسان کو حیوان ناطق سے تعبیر کیا تھا اس اختلاف کے باوجود اس بات پر سب متفق ہیں کہ انسان عبارت ہے انہیں عناصر ثلاثہ کے اتحاد سے غور سے دیکھا جائے تو کسی قوم یا علاقے کی تہذیب بھی انہیں عناصر کے امتزاج سے وجود میں آتی اور فروغ پاتی ہے۔

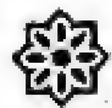
تہذیب معاشرے کے ذہن مادی اور جذباتی تخلیقات کا نچوڑ ہوتی ہے اس کی تشکیل وتعمیر میں معاشرتی ماحول ذرائع رزق، آلات دولت آفرینی عقائد واوہام تاریخ اور روایات، رسوم ورواج، مذہب، زبان قومی مزاج اور کردار سب کو دخل ہوتا ہے انہیں سے ہمارے اقدار حیات متعین ہوتے ہیں جن کا عکس فنون لطیفہ میں کھانے پہننے کے سلیقے میں عمارتوں اور مصنوعات میں ادب اور آداب مجلس میں زبان اور جمالیاتی ذوق میں صاف نظر آتا ہے مگر ان مظاہر تہذیب میں زبان کو سب پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے کیونکہ ہیگل کے بقول زبان تہذیب کی روح اس کا عطر ہے زبان دراصل جام جمشید ہے جس میں ہمیں تہذیب کے تمام پہلو اور سارے خدوخال صاف نظر آتے ہیں زبان انسان کے خیالات و جذبات اور احساسات کو ادا کرنے کا سب سے حسین سب سے لچک دار سب سے آسان سب سے زیادہ ترنم ریز اور سب سے زیادہ پرتاثیر آلہ ہے زبان کے کرشموں کی کوئی انتہا نہیں ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہماری علاقائی تہذیبیں بڑی دولت مند ہیں ان کا کلاسیکی ادب نہ صرف روح عصر کا نمائندہ ہے بلکہ اپنی معنی خیزی بصیرت، نغمگی، گہرائی اور عالی حوصلگی میں دنیا کے بڑے سے بڑے کلاسیکی ادب کی ہمسری کرتا ہے۔

دنیا میں آج کل دو طرح کے ملک ہیں ایک وہ جن کے ریاستی حدود کے اندر قریب قریب ایک ہی تہذیب اور زبان رائج ہے جیسے افغانستان، مصر، فرانس، اٹلی اور جاپان وغیرہ ان میں بعض نہایت ترقی یافتہ ہیں جیسے جاپان کی قومی یک جہتی اور حب الوطنی کے اعتبار سے صف اول میں جگہ پاتا ہے بعض بہت بچھڑے ہوئے ہیں جیسے افغانستان دوسرے وہ ملک ہیں جن میں کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں اور متعدد علاقائی تہذیبیں موجود ہیں مثلاً پاکستان، ہندوستان، برطانیہ، روس، سیلون، میکسیکو، سوئٹزرلینڈ وغیرہ ان ملکوں میں بعض بہت ترقی یافتہ ہیں جیسے برطانیہ، روس اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ ان کی قومی یک جہتی اور حب الوطنی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے ان مثالوں سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ کسی ملک میں ایک زبان اور ایک تہذیب یا کئی علاقائی زبانوں اور کئی علاقائی تہذیبوں کے ہونے سے قومی یک جہتی اور حب الوطنی پر کوئی ضرب نہیں پڑتی بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ علاقائی تہذیبیں قومی تہذیب کی تشکیل و ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ...... درآں حالیکہ واقعہ یہ ہے کہ قومی تہذیب علاقائی تہذیبوں کے حسن امتزاج سے ہی فروغ پاتی ہے چنانچہ سکاٹ لینڈ اور ویلز کی علاقائی تہذیبوں کے بغیر برطانیہ کی قومی تہذیب کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا قومی تہذیب اور علاقائی تہذیبوں کے درمیان وہی رشتہ ہے جو دریائے سندھ اور اسی کے بعض دیگر دریاؤں میں یہ چھوٹے چھوٹے سینکڑوں دریا، ندی اور نالے دریائے سندھ کو سیراب کرتے ہیں اگر یہ خشک ہو

جائیں یا ان کا رخ دوسری سمت پھیر دیا جائے تو دریائے سندھ کی حیثیت ایک جوئے کم آب سے زیادہ نہ رہ جائے گی آج کا اجتماع بھی اس حسنِ امتزاج کی ایک روشن مثال ہے کیونکہ کہنے کوتو خواجہ فرید ایک علاقائی زبان کے شاعر اور ایک علاقائی تہذیب کے نمائندے تھے مگر حقیقت میں ان کا پیغام ہر محبّ وطن پاکستانی کے دل کو گرماتا اور تڑپاتا ہے اپنی تہذیب اپنے وطن سے محبت کرنا سکھاتا ہے چنانچہ علاقائی تہذیبوں اور زبانوں کے فروغ سے قومی اتحاد یکجہتی اور حب الوطنی کے جذبے کو صدمہ نہیں پہنچتا بلکہ اس جذبے کی آبیاری ہوتی ہے اس کو طاقت اور توانائی ملتی ہے اس کے برعکس علاقائی تہذیبوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے سے ملک کے اندر انتشار، نفرت اور بے چینی کی طاقتوں کو فروغ ہوتا ہے علاقائی تہذیبیں رنگ برنگ کے پھول ہیں جن سے گلشن کے حسن اور دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے علاقائی تہذیبوں کی ترقی قومی تہذیب کی ترقی ہے ان کی بقا قومی تہذیب کی بقا ہے۔ بعض لوگ علاقائی تہذیبوں اور علاقائی زبانوں کو بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں ان کی تضحیک کرتے ہیں بلکہ ان کے وجود ہی سے انکار کر دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ قومی تہذیب اور قومی زبان کی عمارت علاقائی تہذیبوں اور علاقائی زبانوں کے کھنڈر ہی پر قائم ہوسکتی ہے مگر یہ ان کی بھول ہے حقیقی تہذیب پیار اور ہمدردی سے فروغ پاتی ہے دشمنی اور عداوت سے فروغ نہیں پاتی۔ تہذیب کا پودا محبت کی آبیاری سے بار آور ہوتا ہے نفرت کی پھنکار اسے جھلسا دیتی ہے اسی طرح بعض لوگوں نے قومی تہذیب اور قومی زبان کی تحقیر و تضحیک کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور اس گمراہی میں مبتلا ہیں کہ ان کے اس طرزِ عمل سے ان کی اپنی علاقائی تہذیب اور علاقائی زبان کو فروغ ملے گا وہ اس قدر مشترک کو نہیں دیکھتے جو پاکستان کے مختلف علاقائی زبانوں اور تہذیبوں کی شیرازہ بندی کرتی ہے ان کو گلدستے کی مانند سجاتی ہے ان میں ربط اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے قومی تہذیب دراصل قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے جس کے بغیر ہمارا جسد قومی مفلوج اور ناکارہ ہو جائے گا اسی لیے علاقائی تہذیبوں کا احیا ملک کی قومی اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنا زیادہ حسین زیادہ حیات بخش اور فعال نہیں بناتا تو یہ احیا مصنوعی، وقتی اور ناپائیدار ہوگا وہ مٹی کے پتلے کی مانند بے جان ہوگا یہ پتلا ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے ہماری نگاہوں کو تفریح کا سامان فراہم کر دے مگر وہ ہمارے اقدارِ حیات کو متحرک اور تابناک بنانے سے قاصر ہوگا۔ تہذیب کے لفظی معنی پودوں کی کانٹ چھانٹ کے ہیں جس طرح پودوں کی قطع و برید سے...... ان کی قوت نمو میں ان کی صحت و افزائش میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح شجر تہذیب میں بھی قطع و بُرید لازمی ہوتی ہے زندہ قومیں مردہ اور فرسودہ اقدار کو مسلسل ترک کرتی جاتی ہیں ورنہ یہ پرانی رسمیں پیر تسمہ پا کی مانند قوموں کو آگے نہیں بڑھنے دیتیں باشعور قومیں ماضی کی ہر چیز کی اندھادھند پرستش یا تقلید نہیں کرتیں اور نہ ماضی کی ہر تہذیبی قدر کو مقدس خیال کرتی ہیں بلکہ وہ ہر پرانی قدر کی صداقت اور افادیت کو عہد حاضر کے تقاضوں سے جانچتی ہیں جن چیزوں کو وہ قوم کے مفراد کے لیے مضر سمجھتی ہیں یا جو قدریں انہیں حیات اور جہد حیات سے گریز و فرار کی تعلیم دیتی ہیں وہ انہیں رد کرتی ہیں رد و قبول کا یہ عمل ہمیشہ سے جاری ہے یہ نہ مشرق کی تخلیق ہے نہ مغرب کی بلکہ ایک آفاقی قانون معاشرہ ہے اور اس میں جذباتیت کو بالکل دخل نیں ہے لہذا ہمیں بھی اپنی قومی اور علاقائی تہذیبوں پر غور کرتے وقت رد و قبول کے آفاقی اصول کو ہمیشہ

نظر کے سامنے رکھنا چاہیے اور اب میں آپ کی توجہ ایک عالمی رجحان کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں یہ عالمی رجحان صنعتی انقلاب کی پیداوار ہے صنعتی انقلاب کی وجہ سے دنیا کہ ہر ملک کی معاشرتی زندگی میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں ان تبدیلیوں کا اثر تہذیبوں پر بھی پڑا ہے کیونکہ تہذیب بہرحال ایک معاشرتی عمل ہے صنعتی انقلاب کے باعث زندگی میں ایک خاص قسم کی مشینی یکسانیت آتی جاتی ہے چنانچہ ساری دنیا میں تہذیبی یکسانیت کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے اب کنوئیں کی جگہ ٹیوب ویل لے رہے ہیں کنواں گاؤں کی عورتوں کی چوپال ہوتا تھا اس کی منڈیر سے گانوں کی لہریں اُٹھتی تھیں ٹیوب ویل مرد چلاتے ہیں لہذا وہ گیت اور رومان جو کنوئیں سے وابستہ تھے آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں چرخے کی جگہ سوت بنانے والے کارخانے لگ رہے ہیں اور ترنجن کی گنگناہٹ خاموش ہوتی جاتی ہے رس بیلنے والے کولہوؤں کی جگہ شکر کے کارخانے قائم ہو رہے ہیں اور رت جگوں کا لطف خواب ہوتا جا رہا ہے اب شادی میں شہنائی نہیں بجتی بلکہ بینڈ والے فلمی ڈھول کی نقال کرتے ہیں اب تیل کے چراغ کی جگہ بجلی کی روشنی ہے گھوڑوں، تانگوں اور ریڑھیوں کی جگہ بائیسکلیں، موٹریں، ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز ہیں تفریح کے لیے ریڈیو سینما گراموں فون اور ٹیپ ریکارڈز ہیں کبڈی اور گلی ڈنڈے کی جگہ کرکٹ ٹینس فٹ بال اور والی بال ہیں غرض سائنس کی نئی نئی ایجادات کے باعث ہمارے ماحول اور معاشرے ہمارے طرز زیست اور طرز فکر ہمارے ذریعے معاش ہمارے اخلاق و اقدار، ہماری خوراک...... اور پوشاک حتیٰ کہ ہماری زبان اور تہذیب میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں فاصلے گھٹ رہے ہیں اور علاقائی حد بندیاں ٹوٹتی جاتی ہیں علاقائی اور قومی تہذیبوں میں آہستہ آہستہ یکسانیت آتی جاتی ہے ان کی انفرادیت کا رنگ ہلکا ہوتا جاتا ہے ایک عالم گیر تہذیب کے خدو خال ابھر رہے ہیں یہ عالمگیر تہذیب ایک تاریخی حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ رہی ہے اس پر خفگی اور برہمی کا اظہار کرنا یا پرانی تہذیب کا ماتم کرنا دراصل اس قانون ارتقا سے انحراف کرنا ہے جو تہذیب اور زبان پر بھی اسی طرح حاوی ہے جس طرح پورے معاشرے پر ہر نظامِ کہن کے بطن سے ایک نظامِ نو طلوع ہوتا ہے اس عالمگیر تہذیب کی چھاپ ہماری قومی اور علاقائی تہذیبوں پر بھی پڑ رہی ہے اس کے امکانات پر غور کرنا اور اس سے اپنے رشتے کی نوعیت کو متعین کرنا نہایت ضروری ہے اگر قومی اور علاقائی تہذیبوں نے عالم گیر تہذیب کے اس نئے دور کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا اور اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے اس عالمگیر تہذیب سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کیا تو ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

(چندر آب — سید سبطِ حسن)



محمد داؤد طاہر

اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہی دنیا کی حقیقت ہے

دیوان ساون مل کے قتل کے بعد اس کا بیٹا مولراج ملتان کا حکمران بنا تاہم اپنے باپ کے برعکس اس کا دور حکومت بہت مختصر رہا اور اس نے انگریزوں کے ساتھ بعض اختلافات کی وجہ سے جلد ہی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ انگریزوں نے اس کی جگہ کاہن سنگھ کو ملتان کا حاکم مقرر کر دیا چنانچہ وہ اپنا عہدہ سنبھالنے کے لیے اپریل 1848ء میں دو انگریز افسران، پیٹرک الیگزینڈر وان ایگنیو اور لیفٹیننٹ ولیم اینڈرسن کے ہمارا لاہور سے ملتان پہنچا۔

ان کی ملتان آمد کے دو تین روز بعد دیوان مولراج، کاہن سنگھ اور یہ دونوں انگریز انتقالِ اقتدار کی کارروائی مکمل کرنے کے لیے قلعہ کی جانب جا رہے تھے کہ لوہاری دروازے پر متعین امیر چند نامی ایک سپاہی نے ایگنیو پر برچھے کا وار کر کے اسے زخمی کر دیا اور خود بھاگ گیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد سکھ فوج نے انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ لاہور سے سکھ سپاہیوں کا جو دستہ ان انگریز افسروں کے ساتھ آیا تھا وہ بھی مقامی فوج سے مل گیا اور یوں ایگنیو اور اینڈرسن دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ انگریزوں نے انتقاماً ملتان پر چڑھائی کر دی اور یکم جولائی 1848ء کو فریقین کے مابین آخری معرکہ ہوا جس میں انگریز قلعے کی فصیل میں شگاف ڈال کر شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ دیوان مولراج جس نے بہت بے جگری کے ساتھ انگریز فوج کا مقابلہ کیا بالآخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی یہ شرط تو مان لی گئی کہ اس کے خاندان کی خواتین کی عزت پر کوئی آنچ نہ آنے دی جائے گی لیکن اسے اپنی جان بخشی کی یقین دہانی کرائے بغیر ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ یوں ملتان باقاعدہ طور پر انگریزوں کی عملداری میں آ گیا۔

فتح کے بعد انگریزوں نے قتل ہونے والے اپنے ان دونوں افسران کی نعشیں نکال کر اس قلعے کے بلند ترین مقام پر دفن کیں اور ان کی قبر پر سرخ پتھر سے ایک بلند لاٹھ تعمیر کی۔ لاٹھ پر سنگ مرمر کا ایک طویل کتبہ لگا ہوا ہے۔ یہ کتبہ انگریزی میں ہے اور اس کا آزاد اردو ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے:

اس لاٹھ کے نیچے
لاہور کے ریذیڈنٹ کے دو نائبین

یعنی

بنگال سول سروس

کے

پیٹرک الیگزینڈر وان ایگنیو

اور

پہلی بنگال فیوزیلیئرز رجمنٹ

کے

لیفٹیننٹ ولیم اینڈرسن

کی باقیات دفن ہیں

انہیں حکومت کی طرف سے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی

کہ وہ ملتان کے حاکم، دیوان مولراج

کی اپنی خواہش کے مطابق

اس سے قلعہ کا قبضہ لے کر

اسے اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کریں

تاہم

19 اپریل 1848ء کو

سکھ فوجیوں نے

عید گاہ میں

ان پر حملہ کر کے انہیں شدید زخمی کر دیا

یہی نہیں، ان کے اپنے سکھ محافظوں نے بھی ان سے غداری کی

اور اگلے دن

مہمان نوازی کی اپنی قومی روایات کو یکسر فراموش کرتے ہوئے

انہیں وحشیانہ طور پر قتل کر ڈالا

یوں

حکومت کے یہ دونوں اہلکار

جن میں سے ایک محض پچیس سال کا اور دوسرا صرف اٹھائیس سال کا تھا

اور جو بے مثال خوبیوں اور جواں امنگ کے مالک تھے

اور جن سے مستقبل میں بڑی توقعات وابستہ کی جا رہی تھیں

راہی ملکِ عدم ہو گئے

انہوں نے

اپنے ملک کی عزت و وقار کے لیے جان دی

باوجودیکہ

وہ یکا و تنہا رہ گئے تھے

زخموں سے چور تھے

اور

مقابلے کی تاب نہ رکھتے تھے

وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے

ممکن حد تک مزاحمت کرتے رہے

انہیں یقین تھا کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے

جب ہزاروں برطانوی فوجی

ان کی موت کا انتقام لینے کے لیے آئیں گے

اور

مولراج، اس کی سپاہ اور اس قلعے کو نیست و نابود کر دیں گے

تاریخ شاہد ہے کہ

ان کی یہ توقع سو فیصد پوری ہوئی

26 جنوری 1849ء کو

ان کے فاتح بردار سپاہیوں اور ہم وطنوں

نے ان کی لاشیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر یہاں پہنچائیں

اور

انہیں

مفتوحہ قلعہ کی چوٹی پر دفن کیا

ان کے قتل کے نتیجے میں چھڑنے والی جنگ

بالآخر

صوبہ پنجاب کے برطانوی سلطنت کے ساتھ الحاق

پر منتج ہوئی

ان دونوں انگریز افسران کی تدفین کا حال جان ڈنلپ کی تصنیف ''مولتان: ڈیورنگ اینڈ آفٹر دی سیج'' کے اردو ترجمہ ''مولتان: دوانِ محاورہ اور مابعد'' از شفیع غوری میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''عید گاہ کے نزدیک مسٹر ایگنیو اور لیفٹیننٹ اینڈرسن کی جائے تدفین دریافت ہونے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ قبر کشائی اور لاشوں کو وہاں سے نکالنے کے بعد بارِ دیگر ان کی تدفین قلعہ ملتان میں عمل میں لائی جائے۔ قبر کو مقتولین کے ایک نہایت قریبی دوست کی نگرانی میں کھولا گیا اور دونوں لاشیں قابل شناخت ہونے کی حد تک محفوظ پائی گئیں۔ رجمنٹ بینڈ کی دھنوں میں تابوت اٹھانے اور تدفین کرنے کا منصب فیوزِ یلیئرز کو سونپا گیا جس سے لیفٹیننٹ اینڈرسن تعلق رکھتا تھا۔ کیمپ میں موجود افسران کی بڑی تعداد اس موقع پر موجود تھی۔ تابوت پانچ بجے عید گاہ سے اٹھائے گئے اور انہیں فصیل میں پڑنے والے شگاف کے راستے ملتان میں داخل کیا گیا۔ تابوتوں کو بڑی احتیاط سے اس قبر میں اتارا گیا جو قلعہ کے بلند ترین مقام پر ان کے لیے تیار کی گئی تھی۔ بعد ازاں پادری نے جو اس موقع پر موجود تھا، ماتمی دعائیں نہایت دلگداز طریقے سے پڑھیں۔''

قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لاٹھ سرکاری خرچ سے تعمیر نہیں ہوئی بلکہ اس کے لیے عطیات ان دونوں افسران کے ساتھیوں اور دوستوں کی کوشش سے جمع ہوئے تھے۔ فاضل مصنف کا یہ بیان اس خیال کی تائید کرتا ہے:

''فیوزیلئرز کے افسران اپنے برادر ساتھی کے لیے محبت اور احترام کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے اس کی یاد میں ایک یادگار قائم کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ لاہور ریذیڈنسی کے نائبین کے جذبات بھی بعینہ یہی ہیں اور انہوں نے اس مقصد کے لیے پہلے ہی عطیات اکٹھے کیے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام ان کی مشترکہ کوشش سے سرانجام پا جائے گا کیونکہ اس کے محرک بچھڑنے والے دونوں افسران اپنے لیے عزت و احترام کے بے پناہ جذبات اپنے ساتھیوں کے دلوں میں چھوڑ گئے ہیں۔''

اس مخروطی لاٹھ کے ساتھ تین یادگاریں اور بھی ہیں لیکن ان کی تفصیل میں جائے بغیر فی الوقت مجھے صرف یہی عرض کرنا ہے کہ اس یادگار کو پبلک پارک کی شکل دے دی گئی ہے جس کا ایک حصہ ملتان کی ضلعی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداران اور دورے پر ملتان آنے والے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں سے لگائے جانے والے پودوں کے لیے وقف ہے۔ چونکہ یہ پارک ملتان کے بلند ترین مقام پر تعمیر ہوا ہے لہذا شام کے وقت شہریوں کی بڑی تعداد یہاں سیر

وتفریح کے لیے آتی ہے۔

حال ہی میں جب مجھے اور اکرم خان کو ایک بار پھر ملتان ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے زیر انتظام اس پبلک پارک میں جانے کا اتفاق ہوا تو میں بہت دیر تک اپنے مرحوم دوست، چوہدری ایوب کا ہاتھ کا لگا ہوا وہ پودا تلاش کرتا رہا جو انہوں نے 1990ء کی دہائی میں بطور چیئر مین ملتان ڈویلپمنٹ اتھارٹی یہاں لگایا تھا اور جس کے ساتھ ان کے نام کی تختی بھی لگی ہوئی تھی۔ پارک میں بہت سے پودوں کے ساتھ ان کے لگانے والوں کے ناموں کی تختیاں تو موجود تھیں لیکن ایوب کا نام ان میں شامل نہ تھا۔ اگرچہ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ اب اس پودے کی تلاش عبث ہے لیکن پھر بھی ہم اتمامِ حجت کے لیے اتھارٹی کے ان کارکنان کے پاس جا کھڑے ہوئے جو نہ معلوم کس سلسلے میں وہاں جمع تھے اور ان سے جا پوچھا کہ کیا وہ ایوب کو جانتے تھے۔

''کون سے ایوب؟'' ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ''میں نے تو یہ نام بھی نہیں سنا۔''

''لگتا ہے یہ نام میرا سنا ہوا ہے۔'' ایک قدرے عمر رسیدہ کارکن نے شاید ہماری دلجوئی کی خاطر کہا ''میرا خیال ہے کئی سال پہلے اس نام کا ایک صاحب یہاں ہوا تو کرتے تھے لیکن میں نے ان کے نام کی تختی کبھی یہاں نہیں دیکھی۔ کہاں ہوتے ہیں وہ آج کل؟''

''وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں'' میں نے جواباً کہا ''میرے دوست تھے، کم وبیش دس سال پہلے میں ایک بار یہاں آیا تو ان کے لگائے ہوئے پودے کے گرد جنگلہ اور اس پر اُن کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے بہت شوق کے ساتھ اس پودے کی تصویر کھینچ کر انہیں پیش کی تھی۔ یوں سمجھ لیں میرا اس پودے کے ساتھ ایک جذباتی سا رشتہ ہے اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب یہ پودا کتنا تن آور ہو چکا ہے۔''

''سر! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں زندہ لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا اور آپ ایک وفات یافتہ افسر کا کئی سال پہلے لگایا ہوا پودا ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اب کس کو اس پودے یا اس پر لگی ہوئی تختی کی پروا ہے۔ بھول جایئے سرکار اس تختی کو اور دیکھنا ہو تو دیکھئے ان نئی تختیوں کو جن میں سے ہر ایک پر آج کا کوئی نہ کوئی اہم نام لکھا ہوا ہے۔''

آپ کو بتاتا چلوں کہ ایوب ڈسٹرکٹ منیجمنٹ گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایم اے میں میرے کلاس فیلو تھے اور ہم دونوں ایک ہی سال سنٹرل سپیریئر سروسز آف پاکستان ایگزامینیشن پاس کر کے ملازمت میں آئے تھے لیکن ان سے زیادہ قربت اس وقت ہوئی جب ہم دونوں پاکستان ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج، لاہور میں تقریباً چار ماہ کے ایک تربیتی کورس کے لیے اکٹھے ہوئے۔ اس عرصے میں ہم کوریا اور جاپان کے سرکاری دورے پر بھی گئے اور دورانِ سفر تھائی لینڈ اور ہانگ کانگ بھی رکے۔ اس سارے سفر کے دوران ہر جگہ ہمیں ایک ہی کمرے میں ٹھہرنے اور ایک دوسرے کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔

وہ پولیس سروس آف پاکستان سے تعلق رکھنے والے اپنے چھوٹے بھائی محمد اشرف مارتھ کے وحشیانہ قتل

صدمہ برداشت نہ کر سکے اور اس حادثہ کے چند ہی دنوں کے بعد دل کے شدید حملہ سے اچانک وفات پا کر جلال پور شریف میں دفن ہوئے۔

''کیا ہوا جو دنیا نے ان کی بے قدری کی'' میں نے اکرم خان سے مخاطب تھا ''خدا نے اگلے جہان میں انہیں نہ جانے کیسی کیسی نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوب ایک سادہ دل اور مخلص انسان تھے۔ میں اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس سروس سے تعلق رکھنے کے باوجود جس کے پاس اختیارات کی کبھی کمی نہیں رہی انہوں نے اپنی ساری زندگی پاکبازی کے ساتھ گزاری تھی اور خود کو ان آلائشوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا تھا جن سے بچنے کی قرآن حکیم نے بہت تاکید کی ہے۔''

میں ایوب کی بلندی درجات کے لیے دعا کرتے ہوئے اس پارک سے قدرے بوجھل دل کے ساتھ رخصت ہوا۔ اب میری منزل ملتان کا گھنٹہ گھر تھا جو قلعے سے چند قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی: گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

''گھنٹہ گھر'' یا ''کلاک ٹاور'' کی اصطلاح ایک ایسی عمارت کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کے سامنے لیکن ترجیحاً چاروں طرف گھڑیال نصب ہوں۔ یوں تو گھنٹہ گھر عمودی شکل کے بھی ہو سکتے ہیں اور محض اس مقصد سے تعمیر کئے جاتے ہیں لیکن بالعموم وہ کسی چرچ یا ٹاؤن ہال کا حصہ ہوتے ہیں۔

ٹرو کلاک ٹاور یعنی حقیقی گھنٹہ گھر کے برعکس فالس کلاک ٹاور یعنی نام نہاد گھنٹہ گھر سے مراد پہلے سے موجود عمارت لی جاتی ہے جس میں گھڑیال کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہو۔ اس اعتبار سے ملتان کا گھنٹہ گھر صحیح معنوں میں اس نام سے پکارا جانے کا اہل ہے کہ یہ عمارت تعمیر ہی خاص طور پر اس مقصد سے ہوئی تھی۔

اب تو زمانہ ترقی کر چکا ہے اور ممکن ہے صورت حال بدل چکی ہو لیکن جس زمانے میں ملتان کا گھنٹہ گھر تعمیر ہوا گھڑیال کی مشینری بے حد وزنی ہوا کرتی تھی۔ ملتان کے گھنٹہ گھر میں کس کمپنی کا گھڑیال نصب تھا اور اس کا وزن کتنے من تھا، اس سوال کا جواب تلاش کرنا آسان نہیں کیونکہ اب یہ گھڑیال موجود نہیں رہا۔ اور کیا جانے وہ پلیٹ جس پر گھڑیال کی سپیسفکیشنز درج ہو سکتی تھیں بھی غائب ہو چکی ہے۔ کم از کم مجھے اس سوال کا کوئی حتمی جواب نہیں مل پایا کہ یہ گھڑیال کب اور کیوں یہاں سے ہٹایا گیا اور اگر اس کی مشینری واقعی خراب ہو چکی تھی تو اسے ٹھیک کرانے کی بجائے اسے کباڑ خانے کے حوالے کیوں کر دیا گیا۔

گھنٹہ گھروں میں نصب بعض گھڑیال ہر گھنٹے بعد بجتے ہیں جب کہ بعض ہر پندرہ منٹ یا آدھے گھنٹے بعد وقت کا بہ آوازِ بلند اعلان کرتے ہیں۔ یہ گھنٹہ گھر مدت سے خاموش ہے لیکن ممکن ہے اس علاقے کا رہنے والا کوئی پرانا باسی بتا سکے کہ یہ گھڑیال ہر گھنٹے بعد ہی بجتا تھا یا ہر پندرہ یا تیس منٹ کے بعد بھی۔

نور احمد خان فریدی نے اپنی کتاب ''تاریخ ملتان'' میں لکھا ہے کہ ٹاؤن ہال کی ''عالی شان عمارت لاہوری

دروازے کے باہر واقع ہے۔ لارڈ نارتھ بروک ، وائسرائے ہند نے اس کا بنیادی پتھر رکھا اور بلدیہ نے اس پر مصارفِ کثیر سے نارتھ بروک کلاک ٹاور اور رپن ہال تعمیر کرایا۔'' تاہم امرِ واقعہ ہے کہ اس عمارت کا سنگِ بنیاد پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر ، سرچارلس ایمفرسٹن ایچی سن نے رکھا تھا۔ ان دنوں لارڈ رپن ہندوستان کے وائسرائے تھے اور گھنٹہ گھر کی عمارت کا نام ان کے نام پر رکھا گیا۔ رہا کلاک ٹاور تو اس کا نام 1872ء سے 1876ء کے دوران ہندوستان کے وائسرائے ، تھامس جارج بارنگ ، فرسٹ آل آف نارتھ بروک کے نام پر رکھا گیا۔ یقین نہ آئے تو سنگِ بنیاد کی یادگاری تختی خود دیکھ لیجیے جو انگریزی زبان میں ہے اور اسی شکل میں نیچے نقل کی جا رہی ہے:

دی کارنرسٹون آف

نارتھ بروک کلاک ٹاور

اینڈ رِپن ہال

واز لیڈ بائی دی آنرایبل

سرچارلس ایمفرسٹن ایچی سن

ایل ایل ڈی ، کے سی ایس آئی ، سی آئی ای

لیفٹیننٹ گورنر آف دی پنجاب

آن دی

12 فیبروری 1884

خالد شریف چوہان آج کل ملتان میں بطور آرکیٹیکٹ کام کر رہے ہیں نیشنل کالج آف آرٹس لاہور سے بیچلر آف آرکیٹیکچر کی ڈگری کے حصول کے لیے ''اَڈپٹوری یوز آف ٹاؤن ہال اِن ٹو آرٹس اینڈ کرافٹس سنٹر، ملتان'' کے عنوان سے 2000ء میں ایک مقالہ لکھا تھا۔ اس مقالے میں جو نیشنل کالج آف آرٹس کی لائبریری میں محفوظ گھڑیال کے حوالے سے خاطر خواہ معلومات موجود نہیں ہیں۔ خالد شریف چوہان میرے دوست اور ماہر آثار قدیمہ، طالب حسین کے حلقہ احباب میں شامل ہیں اور ان ہی کے ذریعے میرا خالد شریف چوہان سے تعارف ہوا تھا۔ جب میں نے ان سے فون پر اس پہلو کی وضاحت چاہی تو انہوں نے بتایا: ''یہ درست ہے کہ اس مقالے میں گھڑیال کے بارے میں مفصل معلومات شامل نہیں ہیں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے گھڑیال اپنی جگہ پر نصب دیکھا ہے۔ میں مقالے کے لیے ضروری مواد کی فراہمی کی خاطر کئی بار اس بلڈنگ میں جاتا رہا ہوں۔ مجھے یاد کہ اُن دنوں کلاک ٹاور کو جانے والے راستے پر تالا لگا ہوتا تھا اور میں ایک سے زیادہ بار چوکیدار سے خاص طور پر تالا کھلوا کر اُوپر گیا ہوں۔ اس زمانے میں تو گھڑیال اپنی جگہ موجود تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اسے کب وہاں سے ہٹا گیا۔''

اگر چہ اس مقالے اور گھنٹہ گھر کی مرمت و تزئین و آرائش کے بعد یہاں عجائب گھر بنائے جانے کے حکوم

فیصلے کے بارے میں کوئی ربط قائم کرنا میرے لیے ممکن نہیں تاہم یہ حقیقت ہے کہ آج کل یعنی اگست 2010ء میں یہ کام زور شور کے ساتھ جاری ہے۔ اس دوران گھنٹہ گھر میں لگی ہوئی اس کے سنگ بنیاد کی تاریخی تختی بھی ٹھیکیدار کی لاپرواہی کا شکار ہو چکی تھی اور سیمنٹ اور مٹی کی دبیز تہ نے اسے اپنے نیچے چھپا رکھا تھا۔ میری درخواست پر وہاں کام کرنے والے مزدوروں نے سیمنٹ اور مٹی کھرچ کر اس تختی کو ممکن حد تک صاف کر دیا اور میں اس کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو سکا۔

بعد میں میری ملاقات اس عمارت کے ٹھیکیدار رانا حیدر سے ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ یہ تختی یہاں سے اُکھاڑنا چاہتے تھے لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ یہ تختی نہیں بلکہ ایک بڑا پتھر ہے جسے نکالنے کے لیے دیوار کی توڑ پھوڑ کرنا پڑے گی۔ یوں یہ تختی اتفاقاً محفوظ رہ گئی ہے البتہ وہ تختی حالیہ مرمت کا شکار ہو چکی ہے جو 1995ء میں اس عمارت کی تزئین نو کے موقع پر یہاں لگائی گئی تھی اور جس کی عبارت یہ تھی۔ یاد رہے کہ میں نے یہ عبارت کچھ عرصہ قبل اپنے ایک دوست کی معرفت محفوظ کر لی تھی۔

بلدیہ اعلیٰ ملتان کے دفاتر کی مکمل تزئین نو کا اعزاز

جناب رانا نصیر احمد خاں

ایڈمنسٹریٹر، میونسپل کارپوریشن، ملتان

و

افتتاح کی سعادت

فیصل تحسین میمن

کمشنر ملتان ڈویژن

کو

مورخہ 14 اگست 1995ء بروز سوموار کو حاصل ہوئی

اس تختی نے مجھے اپنے دو دوستوں کی یاد دلا دی ہے جنہیں مختلف سرکاری حیثیتوں میں ملتان کی کچھ خدمت کی سعادت حاصل ہوئی:

فیصل تحسین میمن ملتان میں میری تعینات کے دوران ملتان ڈویژن کے کمشنر تھے۔ یوں تو میں ان کے ساتھ پہلی ملاقات ہی میں ان کی شرافت و نجابت کا قائل ہو گیا تھا لیکن جب ان کے ساتھ رسمی تعلقات گھریلو مراسم میں بدل گئے تو ان کی منکسر المزاجی کی صفت مزید کھل کر سامنے آئی۔ اس دوران ایک بار جب مجھے ایک پریشان کن صورتِ حال کا سامنا ہوا تو انہوں نے میری ہر ممکن مدد کی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد موصوف پنجاب پبلک سروس کمشن میں ممبر رہے۔ یہ کنٹریکٹ ختم ہونے کے بعد وہ جوہر ٹاؤن لاہور میں ڈاکٹرز ہاسپٹل کے پاس اپنے برلب سڑک مکان میں مقیم رہے۔ میری ان سے آخری ملاقات

2006ء میں وہیں ہوئی تھی۔ اُن دنوں وہ اپنے گھر کا جملہ سامان فروخت کر رہے تھے اور دکان کسی بنک کو کرایہ پر اٹھانے کے بعد امریکہ منتقل ہونے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ جلد ہی ان کا یہ پروگرام حتمی شکل اختیار کر گیا اور وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ امریکہ چلے گئے۔ ایک بار پاکستان میں مقیم ان کی ایک بیٹی سے فون پر بات ہوئی تو وہ امریکہ میں خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے۔

رانا نصیر احمد ان دنوں ملتان میں غالباً اے ڈی سی (جی) تھے اور اگرچہ مجھے ان سے دفتری طور پر کبھی واسطہ نہیں پڑا ان کے ساتھ کسی نہ کسی سرکاری یا نجی تقریب میں ملاقات ہو جاتی تھی اور وہ ہمیشہ بہت ہی محبت و احترام کے ساتھ پیش آتے۔

اوہو! فیما تحسین میمن اور رانا نصیر احمد کے ذکر میں محو ہو کر میں آپ کو یہ بتانا ہی بھول گیا کہ گھنٹہ گھر کی مرمت، تزئین و آرائش کے ٹھیکیدار نے مجھے عمارت کے اندر آزادانہ گھومنے کی اجازت دی تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ کلاک ٹاور کا ایک طرف کا ڈائل بھی غائب ہو چکا ہے۔ دوسرے الفاظ میں فی الوقت صرف تین ڈائل موجود ہیں لیکن ان پر گھڑی ساز کمپنی کا نام درج نہیں ہے۔

(ارمغانِ ملتان – محمد داؤد طاہر)



حفیظ خان

ملتان اور مَیں

میں اس بات پر ہمیشہ حیران ہوتا رہا ہوں کہ یہ ''لاہور'' کیا ہوتا ہے، یہ ''لاہور''، ''لہور'' کیونکر ہو جاتا ہے۔ کنعان کے کانٹوں کو مصر کے گُل و گلاب اور سنبل و ریحان پر ترجیح کیوں دی جاتی رہی ہے۔ وہ کون سی دِلی تھی جو مرزا غالب کے اندر سانس لیتی تھی۔ لکھنؤ کا بانکا پن کہاں سے در آتا تھا۔ خواجہ فرید ملتان کے مضافات کا ہوتے ہوئے بھی روہی کی خوشبو، روہی کا استعارہ کیسے بن گیا۔ کوہ سلیمان کی مٹی سے کشید ہوا حافظ نصیر الدین، کس طرح خرم بہاولپوری بن کر، خطۂ بہاولپور کی رِیت، روایت اور ادب کی شناخت بن جاتا ہے۔ یہ ''چھجو کا چوبارہ'' بلخ بخارہ سے زیادہ خوش کن کیوں ہو جاتا ہے۔ وہ کون سا جذبہ ہے جو وسط ایشیا کے مرغزاروں کے مکین ظہیر الدین بابر کو کشمیر پہنچنے کے بعد یہ مجبور کر دیتا ہے کہ بے اختیار کہہ اُٹھے ''اگر روئے زمیں پر کوئی جنت ہے تو یہی ہے، یہی ہے''۔ جس طرح دودھ میں لگائی جانے والی دہی کی ''جاگ'' کچھ دیر کے بعد پورے کے پورے دودھ کو دہی بنا دیتی ہے، اسی طرح دنیا کے کسی بھی حصے میں پیدا ہونے والے انسان کے خمیر میں، کسی خاص جگہ کی خوشبو کی ''جاگ'' آخرکار نہ صرف کھینچ کھانچ کر اسے وہیں، اسی جگہ لے جاتی ہے، بلکہ پورے کا پورا وہیں کا بنا کے رکھ دیتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہ کیا ہے اور اگر ایسا نہیں، کچھ اور ہے تو پھر بھی کیا ہے!

مجھ پر یہ اسرار آج سے لگ بھگ تیس برس پہلے اس وقت منکشف ہوا جب میں نے احمد پور شرقیہ سے ملتان آ کر یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لیا۔ ملتان سے بچپن کے لا اُبالی اور بے ربط تعلق کو میں نے شعور کی کھلی کھڑکی سے دیکھا تو مجھے یہاں کے در و دیوار، سڑکیں، فصیلیں، دروازے، بازار اور مزار ''الف لیلہ'' کے کسی طلسماتی شہر کی طرح محسوس ہوئے۔ اس شہر کا کلچر، عمارتیں، موسم، مٹی، لوگ، دوست، دشمن، سبھی مجھے میری خوشبو کی طرح لگے۔ میں ملتان میں اور ملتان مجھ میں اس طرح رچ بس گیا کہ میں پورے کا پورا ملتان ہو گیا۔ بعد کی عملی زندگی میں کئی بار مواقع ملے اور مجبور بھی کیا گیا اگر کچھ بہتر بننا اور اپنے آپ کو سنوارنا ہے تو وفاقی یا کم از کم صوبائی دارالحکومت میں ٹھکانہ کر لو، مگر میرا ملتان ہر بار میرا بازو تھام کر مجھے واپس لے آتا رہا ہے۔ میں نے کئی بار کہا کہ جیسے کسی شخص کا ''لاہور'' ہوتا ہے، ''اسلام آباد''، ''پیرس'' یا ''لندن'' ہوتا ہے، اسی طرح میرا لاہور، میرا اسلام آباد، لندن اور پیرس ''ملتان'' ہی

ہے۔ یہ ''ملتان'' کوئی چونے، اینٹ، گارے، سیمنٹ، بجری اور کنکریٹ کا سٹرکچر نہیں ہوتا، یہ زندگی کے احساس، لہو کی تمازت، افکار کی ندرت، دلوں کی وسعت، باتوں کی خوشبو، افراد کے رویے، دوستوں کی محبت بھری محفلوں اور دشمنوں کی بے بسی اور تنہائی سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ ''ملتان'' کسی ریلوے سٹیشن، بسوں کے اڈے یا ائرپورٹ کا نام نہیں ہوتا، نہ ہی یہ کسی ہوٹل، کسی محل سراء یا حکام کے ایوان کا نام ہوتا ہے۔ یہ ''ملتان'' تو ماں کی محبت سے عبارت ہوتا ہے جو رات گئے تک میرے انتظار میں جاگتا ہے اور جب میں سو جاؤں تو پھر ایک گونہ اطمینان سے اپنی مہربان آنکھیں موند لیتا ہے۔ جونہی چناب کا پل عبور کروں یا قادر پور راواں والا موڑ مڑوں، اس کی محبوبیاں اور اپنائیتیں میری سانسوں کو اپنی خوشبو سے معطر کر دیتی ہیں۔

میں نے اس شہر کو 1977ء کی تحریک میں جلتے دیکھا اور خود اپنی آواز میں 1977ء کے مارشل لاء کے نفاذ کی خبر ریڈیو ملتان کی چار جولائی کی صبح کی نشریات میں لوگوں تک پہنچائی۔ میں نے کئی مضبوط حکومتوں کی کایا کلپ اسی سڑکوں پر ہوتی ہوئی دیکھی۔ اس شہر کے عشاق اس سے محبت کے سبب، اس کی فصیلوں اور ان کے دروازوں پر اتری ہوئی کھال اور قلم شدہ سروں کے ساتھ لٹکائے جاتے رہے۔ اس شہر کو زندہ رکھنے کے واسطے، اس کے چاہنے والوں نے حملہ آوروں کو نہ صرف اپنی گردنیں پیش کیں بلکہ تاریخ کے بدترین قتلاموں کے دوران اپنے شہر کی گلیوں کو اپنے لہو سے غسل دیا۔ اس کے فقیر، اس کے غلام اس کے بادشاہ بنے اور اس پر حکمران کے خواہاں بادشاہ، بھیک کو بھی ترستے ہوئے دیکھے گئے۔ دور چاہے حملہ آور آریاؤں اور مقامی دراوڑوں کی آویزش کا رہا ہو یا بدھ مت کا، اس کے دروازوں پر دستک محمد بن قاسم نے دی ہو یا اس کی حدود کے باہر منگولوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجی ہوں، حکمرانی قرامطیوں کی رہی ہو یا سلاطین کی، فرمانروا تغلق رہے ہوں، لودھی یا مغل، لنگاہوں نے سیج سجائی ہو یا پٹھانوں نے اپنے خوں سے اس کی آبیاری کی ہو، ملتان کا تخت سکھوں کے پاس رہا یا انگریزوں کا تختہ ہوا، مگر اس شہر کی وسعتِ قلبی ماں کی آغوش کی صورت جوں کی توں، کسی نایاب ورثے کی شکل میں نسل در نسل اس کے زندہ دل مکینوں کو منتقل ہوتی رہی۔

میں چشمِ تصور سے دیکھتا ہوں تو 15 جون 1831ء کی ڈائری کا ایک ورق میرے سامنے آ جاتا ہے۔ انگریز جاسوس لیفٹیننٹ الیگزینڈر برنس نے ملتان آمد پر اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیے کے بعد تحریر کی جو حضوری باغ میں دیا گیا تھا۔ یہ انگریز آفیسر ملتان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے مکمل قبضے یعنی 1849ء سے تقریباً سترہ اٹھارہ برس قبل یہاں سے گزرا۔ وہ افغانستان اور ڈیرہ جات سے ہوتا ہوا اس غرض سے ملتان پہنچا کہ انگریز علمداری کی صورت میں اس خطے کی متوقع سیاسی مزاحمت اور حاصل ہونے والے معاشی مفادات کا جائزہ لیا جا سکے۔ اس ڈائری کے اقتباسات سے نہ صرف ملتان پر قبضے کے خواہشمند استعماریوں کے عزائم کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان حکمت عملیوں کا اندازہ بھی چاک ہوتا ہے جو انہوں نے مقامی ریاستوں کے خلاف تشکیل دیں۔ اس وقت حضوری باغ ملتان سے ایک میل کی دوری پر واقع تھا۔ ڈائری کے مندرجات کے مطابق، آفیسر مذکور کو اڑھائی ہزار روپے نقد کی تھیلی، مٹھائی سو

لنگریاں اور ڈھیر سارا میوہ پیش کیا گیا۔

میں چشم تصور سے دیکھتا ہوں تو مجھے کل کی بات لگتی ہے کہ وادیٔ سندھ کے اہم تہذیبی مرکز ملتان اور اس کے نواح میں بیسویں صدی عیسوی استعماریت کے بوجھ تلے دبی ہوئی ریلوے انجن کے کھڑکار سے نمودار ہو رہی ہے۔ گاڑی سے اترتے ہوئے عسکریوں کے گھوڑے اور توپیں، جن کے گولے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ مسافر خانے، نئے بھرتی ہوئے قلیوں کا شور، ہر درجے کا چھوٹا بڑا حاکم، مفتوحہ ملکوں میں کہانیاں اکٹھی کرنے والے گورے، اجنبی شہر میں میم کی حیرت، ریلوے انجن کے لیے پانی کے بڑے بڑے نل، مقامی لوگوں کے واسطے الگ الگ ہندو پانی، مسلم پانی ...... کی آوازیں لگاتے واٹر مین، اینگلو انڈین ڈرائیور، سہ رنگا لالٹین اور ٹرین کا دوطرفہ ٹکٹ۔ وہ ٹرین جس نے صرف لوگوں کو لوگوں سے نہیں ملایا، بلکہ گھوڑے، توپیں اور گولے، نو قائم شدہ چھاؤنیوں تک پہنچا کر انگریزوں کی عسکری استعماریت کو مستحکم کیا۔

میں دیکھتا ہوں کہ اس صدی کی آمد سے پہلے ہی اس شہر میں چھاؤنی باندھی جا چکی ہے۔ کنٹونمنٹ مارکیٹ وجود میں آ چکی ہے جہاں کبوتر، خرگوش اور ٹرکی بھی رکھے گئے ہیں۔ وہاں ایک بیکری بھی ہے جہاں بیسویں صدی کے استقبال کے لیے ایسے کیک اور پیسٹریاں تیار ہو رہی تھیں جن پر برطانوی استعمار کی نشانی ''شیر'' نقش کئے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ برطانوی راج کی عمارتوں کے پرنالے بھی شیر کے منہ والے بنائے گئے۔ بارش کے دنوں میں شیر کے منہ سے پانی کی دھار نکلتے دیکھ کر بچے تو کیا بڑے بھی خوش ہوتے ہیں، ہنستے ہیں۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اس سے پہلے 31 دسمبر اور یکم جنوری 1900ء کی شب نئی صدی کے استقبال کے لیے توپیں داغی گئیں اور ملتان چھاؤنی کے ناچ گھر یعنی ''بال روم'' میں دیر تک رقص کیا گیا۔ اب شہر کے مشرق و مغرب میں بازوؤں کی طرح پھیلے ہوئے ریلوے پٹڑیوں پر ریلوے انجن دندناتا پھرتا ہے۔ ڈاک اور مال گاڑیاں ساحلی شہروں سے سامان تجارت، اسلحہ، بارود اور گورے افسروں کو اٹھائے میدانی علاقوں کی نس نس میں پھیل رہی ہیں اور ادھر سے خام مال ہے جو بندرگاہوں پر ڈھیر کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اسی دور میں ملتان میں پہلی بار سڑکوں پر چلنے والی بائیسکل بھی دیکھی گئی۔

یہ بھی بیسویں صدی تھی جو ملتان شہر میں ڈاکیے کے خط کے ذریعے داخل ہوئی۔ مگر نہ جانے اس صدی کو کون سے لفافے میں بند کر کے محکموں تک بھیجا گیا کہ جو اپنے پتے پر پہنچی ہی نہیں۔ ہوائی جہاز کی صورت لکڑی اڑی اور بھونپو کی شکل میں لوہا بولا۔ غیر متکلم فلم منڈوے پر لگی تو انسان نے انسان کو جی بھر دیکھا مگر یہ اور بات کہ دکھانے والوں نے دیکھنے والے کو کیسا انسان دیکھایا۔ ان سب کے پیچھے کوئی اور تھا جو اپنی مرضی کرنا چاہتا تھا۔ اور اس نے لوگوں کا ناٹک کی منڈلی سے نکال کر سینماؤں کی کرسیوں تک پہنچا دیا۔ جس نے نہایت غیر محسوس طریقے سے اس خطے کے ساتھ ساتھ ملتان کا ثقافتی منظر نامہ ہی بدل دیا۔ ملتان کے مضافات میں واقع چھاؤنی جہاں ''منچر جی'' کی شراب خانہ کھلا وہاں ایک چرچ اور ایک برف خانہ بھی قائم ہوا۔ اسی علاقے میں کمسریٹ بی واقع تھی۔ جس کی دیوار ایک فٹ پاتھ کے ساتھ بہت دور تک چلتی رہتی۔ یہ چھاؤنی میں خوراک کی رسد کا فوجی محکمہ تھا جس کے بڑے بڑے گیٹ

ہر وقت بند رہتے۔ اس کمسریٹ میں بہت سے ہاتھی بھی تھے جو رسد کا سامان ڈھونے پر معمور تھے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ملتان کے چوک عزیز ہوٹل میں قریشی آئس کریم اور سوڈا واٹر فیکٹری ''کالونیل ملتان'' کی ایک اہم یادگار تھی۔ یہاں کی ونٹو، سٹرابری اور رس بھری بوتلیں پینے یا آئس کریم کھانے کے لیے شام ڈھلے لوگوں کی قطاریں ہوتیں۔ آج بھی اعلیٰ قسم کی آئس کریم کا تقابل، قریشی آئس کریم کے فلیور سے کیا جائے تو لگتا ہے کہ وہ ذائقہ کہ جسے ذائقہ کہا جا سکے۔ 1970ء کے آس پاس ہی کہیں کھو گیا۔ خونی برج کی تلی ہوئی مچھلی، پاک دروازے کی النگ پر تھومی کے سری پائے اور کوٹلہ تولے خاں کی مٹی کی رکابیوں میں ڈھکی ہوئی ربڑی، تہہ دار ملائی، قیمے کی ٹکیاں اور علی الصبح تلی جانے والا پوریا، قتلمہ اور گرما گرم حلوہ، اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی کہیں ''کے ایف سی'' زینت کاریوں اور طراری کی نذر ہو کر رہ گئے۔

شام ڈھلے اپنی اپنی بیویوں کی خوشنودی کے خواہاں ملازمت پیشہ اور کاروباری شوہر جو مٹی کے گھوگھڑے میں ملائی پیک کرا کر اُس کے گھر موتیے کے پھولوں کا گجرا لپٹوا کر گھر لے جایا کرتے تھے، اب فاسٹ فوڈ کے ریستورانوں کی قطاروں میں انتظار کرتے دیکھے جانے لگے۔ وہ جو اندرون شہر کے گلی کوچوں سے بڑ کے پتوں میں دال مُنگ کے ساتھ تندور کی گرما گرم روٹیاں لے جایا کرتے تھے، اب کسی چکن بروسٹ کی دکان میں پائے جانے لگے۔ ملتان میں کھانے پینے کے کلچر میں تبدیلی کی بنیاد اس وقت ہی شروع ہو گئی تھی جب ایوب خان کے دور میں ''پی آئی اے شیور'' کے نام سے ہونے والی فارمی مرغیوں کی بھرمار نے ڈیرے اڈے کے لنگڑے پہلوان کی دکان کے ''کڑھائی گوشت'' کو سٹیٹس سمبل میں بدل دیا۔ گولی والی بوتل میں دستیاب سرخ رنگ کے سوڈے اور دودھ سے بنائے گئے ''ملک روز'' کو کوکا کولا نے پچھاڑ کر رکھ دیا۔ موتیے کے گجروں کی جگہ پرفیومز نے لے لی اور میٹھی اور نمکین ڈولی کی جگہ برگر نے۔ پاکستان بننے کے بعد کی بننے والی کالونیوں ممتاز آباد گلگشت اور شمس آباد نے جہاں اس شہر کی وسعتوں میں اضافہ کیا وہاں نیو ملتان اور شاہ رکن عالم کالونیوں نے ملتان کے روایتی 'لِونگ اسٹائل' ہمسائیگی کے حقوق اور باہمی دردمندی کو کثیر اللسانیت سے پیدا ہونے والی بے حسی کے شاپر میں لپیٹ کر کہیں کھاد فیکٹری سے بھی پرے پھینک دیا۔

نشتر ہسپتال اور میڈیکل کالج، ایمرسن کالج کی جگہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین اور بوسن روڈ پر پہلے گورنمنٹ کالج اور پھر دیگر کالجوں کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے قیام نے یہاں کے علمی، ادبی اور ثقافتی حدود میں تلاطم برپا کر دیا۔ اب سارے تعلیمی ادارے ملتان شہر کے اس طرف ہونے کے سبب، دریائے چناب تک پھیلا ہوا ملتان شہر صبح سویرے تینوں جانب سے بوسن روڈ پر Migrate کرتا ہے اور دوپہر کے بعد پھر یہاں سے واپس اپنے اپنے گھروگھری۔ تقسیم کے بعد یہاں کی ہندو آبادی کے انخلا نے جہاں تہذیبی خلا پیدا کیا وہاں مہاجروں خاص طور پر ہنوں کے چھجے کے نئے مکینوں نے ایک اور ثقافت کی بنیاد رکھی۔ یہی وہ بنیاد تھی کہ جہاں سے کئی ایک قسم کے معاشرتی، معاشی اور لسانی رویوں نے نہ صرف جنم لیا بلکہ ملتان کے اندر ہی کتنے اور ملتان پیدا کر دیئے۔ آزادی کے بعد جہاں

کاروبار بدلے وہاں کاروباری خاندانوں کی بھی کایا کلپ ہوئی۔ انگریز سرکار کی سرپرستی میں پہنپنے والے فیوڈل ازم کو ٹریڈ کے اژدھوں نے نگلنا شروع کیا تو ان کے نگلنے کے واسطے صنعتکاری کے عفریت سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اور جب ان عفریتوں نے بھی لینڈ مافیا کے دامن میں پناہ لینے میں ہی عافیت سمجھی تو ملتان کا چہرہ دھول سے اَٹ گیا۔

پُل مردہ خانہ، ایم ڈی کی دفاتر کی زد میں آ کر ایم ڈے چوک بنا تو اس ترقیاتی ادارے کی اپنی تجاوزات کے سبب، راہگیر...... رہگزر سے محروم ہوتے چلے گئے۔ نالہ ولی محمد اپنی شناخت کھو کر مختلف نام کی آبادیوں کی پناہ گاہ بنتا بنتا ملتان آرٹس کونسل اور سٹیٹ بینک کی بلند قامت عمارتوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ حسین آ گاہی اور صرافہ بازار جب پیدل چلنے والوں کے لیے بھی سہل نہ رہے تو کھمبیوں کی طرح اُگنے والے شاپنگ سنٹروں، آرکیڈز اور پلازوں نے معروف سڑکوں کو کمرشلائزیشن کے گھاٹ اُتارتے اُتارتے، اُن رہائشی آبادیوں کے گھروں کو بھی تجارت کے نیلام گھر میں لا کر رکھ دیا کہ جن کے سبب شہر کا شہر اپنی شناخت کھو بیٹھا کہ گھر کو گھر رہنے دیا جائے یا اسے دولت بڑھانے کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ ایک روایت کے مطابق محمد بن تغلق کے قلمدان اور قبضے کے بعد حکم شاہی جاری ہوا کہ شب بھر کسی گلی، کوچے یا گھر میں کوئی چراغ نہیں جلے گا۔ مگر ایک چراغ جلا...... جو مشہور نرتکی موہراں نے جلایا، اپنے گھر کی دیوار پر کہ کئی دنوں کے بعد آنے والا اس کا محبوب کہیں راستہ نہ بھٹک جائے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ اس حکم عدولی پر دونوں گرفتار ہوئے اور اگلی صبح ملتان شہر کے باہر وسیع میدان میں سنگسار کر دیئے گئے۔ مگر اب تو اس شہر میں نہ تو کوئی موہراں ہے اور نہ ہی اس کا پابند وفا محبوب۔ اور اگر ہوں بھی تو کیا ہوا کہ اب کسی گھر پر دیئے جلانے کی ضرورت نہیں رہی کہ شہر میں روشنی اس قدر زیادہ ہو گئی ہے کہ آنکھیں دید کا حوصلہ کھو چکی ہیں۔

ملتان کی منفرد معاشرت اور تہذیب کے کسی بھی دور میں اس کی لچکدار شریانوں کی صورت شہر کے بدن میں پھیلی ہوئی شاہراہوں، سڑکوں اور گلیوں میں تجاوزات کا اس قدر کولسٹرول جمع نہ ہوا تھا کہ نوبت ''بائی پاس'' کرانے سے بھی دگرگوں ہو جائے۔ یہ یکایک ہوا کیا ہے، کس کی نظر لگ گئی ملتان کو۔ اندرون شہر کا ذکر نہ بھی کریں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ اس کے گنجلک تعمیراتی کلچر میں بھی ایک فطری توازن عیاں ہے، مگر ابدالی روڈ، اولڈ بہاولپور روڈ، نشتر روڈ اور نشتر چوک کو کیا ہو گیا کہ جو اس شہر خوباں کے ماتھے کا جھومر تھے۔ کچہری روڈ، MDA روڈ، لودھی کالونی روڈ، نواں شہر...... کس کس روڈ پر شتر بے مہار دندناتی اذیتوں کا تقابل کریں۔ ہر طرف ذہنی خلجان میں مبتلا دانت کچکچاتے شہریوں اور بے مہابہ جناتی اشکال کی سرکاری اور غیر سرکاری تعمیرات کا گھمسان ہے۔ تنگ سڑکوں کے بالکل اوپر چڑھی ہوئی کئی کئی منزلہ تعمیرات کو دیکھ کر انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید قیامت تک ان سڑکوں کی چوڑائی اتنی ہی رکھی جائے گی کہ جن پر ابھی سے کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ ہمارے ملتان کے مہربانوں نے کمال تخیلاتی ڈیزائننگ کے شاہکار یہ سوچ کر تخلیق کیے ہیں کہ قسطوں پر بکنے والی گاڑیوں کے اس دور میں بھی ہر شخص وہاں تک پیدل ہی آئے گا۔ دو دو ہزار افراد کے روزانہ استعمال کی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی کر دی گئی ہیں اور پارکنگ ایک گاڑی کی بھی نہیں۔ اگر خوش قسمتی سے کسی عمارت میں محدود تعداد کے واسطے پارکنگ کنجائش ہے بھی سہی تو محض اپنے سٹاف

کے لیے جب کہ باقی گاڑیاں، کسی فلمی ہیروئن کے لباس کی مانند تنگ سڑکوں کے کنارے، جہاں کسی ''ولن'' کی طرح گھات لگائے بیٹھا ایک ''اُٹھائی گیر بھتنا'' فوراً ہی کہیں سے آ نکلتا ہے اور گاڑی کو سَر پر لاد کر نو دو گیارہ۔ اگر کوئی بھی عمارت پارکنگ کے بغیر بنانے کی اجازت نہ ہو تو شہری کیوں دربدر خوار ہو کر اپنی گاڑی کو ڈھونڈتے اور جرمانے ادا کرتے پھریں۔

ایک فاختہ، ایک چڑیا یا کوئی کبوتر بھی اپنے بچوں کے واسطے گھونسلہ بناتا ہے تو ان کی آنے والی زندگی کی سہل رکھنے کی سوچ کے ساتھ۔ ایک مادہ مگرمچھ بھی اپنے انڈوں سے نکلنے والے بچوں کو وہاں تیرنا سکھاتی ہے جہاں کسی چونچ مار کی چونچ انہیں چھو نہ سکے۔ کوئی لومڑی، کوئی گیدڑ، بھیڑیا یا شیر، پرندوں سے درندوں تک، سبھی اپنی آئندہ نسلوں کے محافظ بن کر جیتے ہیں۔ مگر ہم ...... ملتان کے مکیں، خدا جانے کس وضع کی مخلوق ہو کر رہ گئی ہیں کہ اپنا آج سنوارنے کے لیے اپنی آنے والی نسلوں کی Living کو مصائب، آلام، اذیت اور عذاب کی عفریتوں کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ مجھ سے پہلے کی نسلوں نے مجھے کیسا ''ملتان'' دیا اور میں اپنی آئندہ نسلوں کو کیسا ''ملتان'' دے کر جا رہا ہوں۔ کیا آج سے محض دو تین برس بعد اولڈ بہاولپور روڈ، ابدالی روڈ، نشتر چوک، نشتر روڈ، نواں شہر اور لودھی ٹاؤن روڈ پر رات کے وقت بھی پیدل چلنا ممکن رہ جائے گا۔ دونوں اطراف اتنی بڑی عمارتوں کی موجودگی میں کیا سڑکوں کی توسیع یا پارکنگ کی گنجائش ممکن رہے گی۔ کیا ہمارے اندر چڑیا کے دماغ جتنی پلاننگ کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہی کہ جو اپنے انڈوں اور بچوں کا حجم، ان کی سہولت اور ان کی سیکورٹی کی ضروریات کا تصور کر کے اپنا گھونسلہ ڈیزائن کرتی ہے اور یوں اپنی نسل کے فطری تسلسل کی بقا کی فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں صدیوں کے سفر میں میرا ''ملتان'' بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں اپنے شہریوں کے کئی مرتبہ قتلِ عام کے باوجود تو ہر بار اپنی اصل تہذیبی شناخت کے ساتھ بچ نکلتا رہا ہے مگر جب شہر کے تہذیبی ورثے اور شناخت ہی کا قتلِ عام ہو رہا تو ''میرے بچوں کا ملتان'' کیسے بچ پائے گا۔

(مآثر ملتان۔ حفیظ خان)



ملک منیر احمد بھٹہ

شہر ما

ملتان شہر قدیم بھی ہے اور عظیم بھی ہے۔ یہ کب بسا کس نے بسایا کچھ معلوم نہیں، تاریخ میں بھی اس شہر کے بننے، بنانے اور بسانے والے کا نام نہیں ملتا ہے اور نہ تاریخ۔ تاریخ میں اس شہر کی بابت جو بات ملتی ہے وہ یہ ہے کہ موسم سرما 26-325 قبل مسیح میں سکندر اعظم اس شہر سے گزرا۔ یہاں پر ملوئی قوم آباد تھی جو بڑی جنگجو تھی یہ شہر ایک بہت اونچے ٹیلے پر بنایا گیا تھا اس کے گرد بڑی مضبوط اور چوڑی اور بہت اونچی فصیل تھی اور چھ دروازے تھے۔ سکندر اعظم نے اس شہر کو فتح کرنے کے لیے حملہ کیا۔ ملوئی قوم نے ڈٹ کر مقابلہ کیا کئی دنوں کے بعد پاک گیٹ کے قریب ایک برج (خونی برج) کی فصیل پر سکندر اعظم چڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسی جگہ سکندر اعظم کو تیر لگا اور وہ زخمی ہوا۔ سکندر اعظم کی فوج بھی جلد پہنچ گئی۔ سکندر کو بچا لیا گیا شہر فتح ہوگیا۔ سکندر اعظم کے زخمی ہونے کی وجہ سے اس برج کا نام خونی برج رکھ دیا گیا جو آج تک قائم ہے۔

یہ شہر امن کا گہوارہ تھا اس کی فضاؤں میں محبت اور وفا تھی اللہ کی رحمت، خیر اور برکت تھی۔ گلی کوچے اور بازار میں اخوت و بھائی چارہ بہت زیادہ تھا۔ گھل مل کر رہنا، خبر گیری اور دست گیری کرنا ایک دستور اور فرض تھا۔

یہ شہر اولیاء اللہ کا مسکن تھا جو فیوض و برکات بانٹتے تھے دین اسلام کی تعلیم کا بھی مرکز تھا۔ اسلام کی اشاعت و ترویج، فروغ پا رہی تھی ہر لمحہ رحمتوں کا نزول ہو رہا تھا ہر گھر میں خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ غم اور اداسیاں غائب ہو رہی تھیں۔ تجارت پر ہندو غالب تھے فن و ہنر میں مسلمان یکتا تھے۔ دونوں میں دوستیاں بھی تھیں اور دشمنیاں بھی۔ متعصب بھی تھے اور مہربان بھی سچ عام تھا جھوٹ خال خال تھا لوگوں کو بغض و عناد سے سخت نفرت تھی یہاں بڑے بڑے نواب اور رئیس بھی تھے پیر اور فقیر بھی یہ خوب چاہے جاتے تھے مگر ملتان کے باسیوں کی خیر خواہی ضرور چاہتے تھے تعظیم کرتے تھے اور تعظیم کراتے تھے۔ یہ سب شہر کا حسن تھا شہر ان سے حسین تھا شہر عروج کے سفر پر رواں دواں تھا یہ شہر آریوں، عربوں، مغلوں، ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں کی یلغاریں سہتا رہا، اجڑتا رہا اور بستا رہا پھر بھی ہر حال میں ہنستا رہا۔ اولیاؤں نے علم و عرفان کی مشعلیں روشن کیں تو شہر کے امیروں نے اس کی عظمتوں کو بلند کیا جو بھی آیا اس نے اس کی عظمت کو چراغ جلایا شہر کے اردگرد بستیاں بستی رہیں۔ ہندوؤں نے مندر بنائے تو مسلمانوں نے

مسجدیں بنائیں۔ سکھوں نے اپنا گردوارہ بنایا۔ انگریزوں نے گرجے بنا لیے۔ درسگاہیں بھی بنتیں رہیں۔ ان درسگاہوں نے چاند روشن کئے۔ اسلامی فن تعمیر کی طرز پر عمارتیں بنیں۔ ان عمارتوں نے اپنے حسن سے شہر کو نامور بنایا۔ یہاں کی مٹی میں محبت اور وفا ہے۔ جو بھی دوسرے علاقوں اور ملکوں سے یہاں آیا یہیں کا ہو گیا اور اسی مٹی میں مل گیا جو صوفیاء کرام اور اولیائے کرام یہاں آئے اسلام کی فیوض و برکات سے فیض یاب کر کے دار فانی سے کوچ کرتے گئے اور اس شہر میں مدفون ہوتے گئے اور یہ شہر ان کی بدولت امدینتہ الاولیاء کہلایا۔ بادشاہوں اور نوابوں نے باغات بنائے جو ایک مدت کے بعد اجڑتے گئے مگر اپنا نام چھوڑ گئے نوابوں کو اپنی نوابی پر اتنا ناز نہ تھا جتنا اس شہر پر ناز تھا۔ شہر کا نام بھی بڑے ادب سے لیا جاتا تھا شہر کے لوگ ہی نہیں تمام ہندوستان کے لوگ اسے ملتان شریف کہتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ نے بھی یہ فرمایا:

ملتان ما بہ جنگ اعلےٰ برابر است
آہستہ پانبہ کہ ملک سجدہ می کنند

جب کہ اس کے باسیوں نے اس کو اس طرح کہا:

چہار چیز است تحفۂ ملتان
گرد، گرما، گدا و گورستان

ہر دور میں ملتان کا حسن اور عظمت بلند رہے اس شہر نے ہر آنے والے کی پرورش کی اسے اپنی آغوش میں لٹایا، پالا پوسا جوان کیا۔ اس کی آسائشیں اور آرزوئیں پوری کیں۔ اسے ہر موقع پر سہارا دیا۔ روزگار دیا علم دیا دولت دی شہرت دی وہ محبتیں اور عنایتیں پا کر خوش ہوئے اور اس کی مٹی میں ہی چلے گئے اس مٹی نے ان کے ناموں کو مٹی میں نہ ملایا۔ ان کے ناموں کو بلند کر دیا کہ یہ شہر ان کی اور اس شہر کی شناخت بن گئے۔ یہاں کے لوگ بھولے بھالے، سیدھے سادے، نیک نیت، نیک دل اور مہمان نواز تھے انہیں انسانوں اور انسانیت سے بے حد محبت تھی۔ دولت کے پجاری بھی تھے سود خور بھی تھے مگر انسانی ہمدردی ہر ایک کو پیاری اور عزیز تھی۔

بجلی آنے سے پہلے اس شہر میں سرسوں کے تیل کے دیئے جلائے جاتے تھے یہ دیئے، مٹی کے بنے ہوئے ہوتے تھے اس کے بعد لالٹین، لیمپ اور گیس ایجاد ہوئے تو گھروں اور دکانوں میں لالٹین اور لیمپ جلائے جانے لگے۔ بازوں میں گیس جلائے جاتے۔ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں میونسپل کمیٹی نے لوہے کے فریم اور لکڑی کے کھونٹے لگوا کر ان پر بڑے بڑے شیشوں کے فریم لگا دیئے جن میں مٹی کے تیل کے لیمپ جلائے جاتے تھے۔ لیمپ جلانے کے لیے شام کے وقت میونسپل کمیٹی کے ملازمین آٹھ دس فٹ کی سیڑھی اور تیل کا کپا اٹھا لاتے، لیمپ میں تیل ڈالتے اور جلا کر ان شیشوں کے فریموں میں رکھ جاتے جو رات بھر جلتے رہتے تھے یہ قندیلیں گلیوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگی ہوتی تھیں۔ بازاروں میں بھی اونچے لکڑی کے پولوں پر ایسی قندیلیں جلتی تھیں۔ گیس بھی جلائے جاتے تھے۔ مسجدوں میں سرسوں کے تیل کے دیئے جلائے جاتے تھے۔ خانقاہوں میں بھی لوگ ایک مخصوص جگہ پر

سرسوں کے تیل کے دیئے جلاتے تھے۔ جمعرات کے روز عورتیں مرد بڑی تعداد میں خانقاہوں پر دیئے جلانے اور چراغوں میں تیل ڈالنے اور مزار پر پھول چڑھانے آتے تھے۔ نواب اور رئیس خوبصورت قندیلوں میں گیس لیمپ جلاتے تھے۔ مندروں میں روشنی کا انتظام اسی قسم کا تھا۔ مسلمانوں کے مذہبی تہواری، میلاد النبیؐ، معراج شریف، شب برات پر گھروں اور مسجدوں میں مٹی کے چھوٹے چھوٹے دیئے جلا کر چراغاں کیا جاتا تھا۔ جب موم بتی ایجاد ہوئی تو چراغاں کے لیے موم بتیاں جلائے جانے لگیں، ہندو اپنے تہوار دیوالی کے موقع پر خوب چراغاں کیا کرتے تھے۔ ہولی اور دسہرا کے تہواروں پر بڑی رونق ہوتی تھی۔ عیدالفطر کے مقدس تہوار پر بازاروں میں چہل پہل ہوتی تھی خرید زوروں پر ہوتی تھی۔ ان تہواروں کے علاوہ میلے بھی سیر و تفریح کا باعث بنتے تھے۔ ان میلوں میں بھی رونقیں ہوتی تھیں۔ عیسائی اپنا تہوار کرسمس بڑے جوش وخروش سے مناتے تھے۔ گرجوں میں بھی خوب چراغاں کیا جاتا تھا طالب علم دین کے عالم اور مطالعہ کرنے والے لوگ مٹی کے تیل کے چراغ یا سرسوں کے تیل کے چراغ لا کر پڑھا کرتے تھے۔ جب رات کو یہ چراغ جلتے رہتے تو صبح کو کھنکارنے سے گلے اور ناک سے تھوک کے ساتھ سیاہی آتی تھی اس سیاہی سے پہلے پہل تو جوان بچے گھبرا جاتے تھے جب انہیں بتایا جاتا کہ یہ دیئے کی سیاہی کی وجہ سے ہے تو پھر نہیں گھبراتے تھے۔ کچھ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔ ہندو مسلم فسادات بھی ہوا کرتے تھے۔ کچھ ہندو مسلم دوست بنتے تو دوستیاں خوب نبھاتے تھے ایک دوسرے کو تحفے دیتے تھے باشعور ہندو دوست بن کر رہتے تھے۔ چھوت چھات کے قائل ہندو اس چھوت چھات پر بڑی سختی سے کاربند رہتے تھے مگر محبت اور دوستی کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی صرف پتھر اور کافر دل تو موم نہ ہوتے تھے پھر بھی ماحول پرسکون ہوتا تھا۔

عالموں، نوابوں، رئیسوں، پیروں، فقیروں اور مزدوروں کی اپنی اپنی دنیا تھی اپنا اپنا مزاج تھا۔ رہن سہن کا طرز بھی الگ الگ تھا جو بات ان سب میں مشترکہ تھی وہ تھی محبت اور ہمدردی۔ مخیّر لوگ بھی تھے جو پوشیدہ مدد زیادہ پسند کرتے تھے۔ بدمعاش بھی تھے جو بدمعاشیوں کے باعث نام اونچا کیا کرتے تھے مگر یہ نئے لوگوں کی محبت اور ہمدردی سے محروم ہوتے تھے مہربانی و مہمانی ملتانی لوگوں کا خاصا تھا۔ عشق کی داستانیں بھی بنتی رہتی تھیں اس عشق میں اپنی اپنے خاندان اور محبوبہ اور محبوبہ کے خاندان کی عزت کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا پیش کش اور التجا اگر لڑکی والوں نے قبول کر لی تو شادی ہو جاتی ورنہ شادی تو طرفین کی ہو ہی جاتی تھی گھر بس جاتا تھا مگر دل نہ بستا تھا محبت نہ بھولتے حسرتیں رہ جاتیں۔ ہندو مسلمانوں کے رشتے دار تو نہ تھے مگر منہ بولے رشتے بن جاتے تھے جو مسلمان کسی ہندو لڑکی یا عورت کو بہن اور ماں کہتے تو وہ صحیح معنوں میں اس بات کا پاس کیا کرتے تھے زندگی بھر یہ پیت پالتے تھے شادی بیاہ پر بہن کے بھائی بن کر اور ماں کے بیٹے بن کر حق ادا کرتے تھے۔

ہر ایک اپنی پسند کے مشغلوں میں مست رہتا تھا۔ کسی کو ورزش پسند تھی تو کسی کو موسیقی، کسی کو کشتی تو کسی کو کبڈی۔ کسی کو پتنگ بازی تو کسی کو بٹیر بازی اور کبوتر باسی، محنتی اور مشقتی بھی تھے اور نکھٹو بھی تھے، عالم بھی تھے اور جاہل

بھی اور ہنر مند بھی علم کی شمعیں بھی روشن ہو رہی تھیں اور فن کی روشنی بھی ہر سو بکھر رہی تھی۔ پورے شہر میں محبت وفا اور حیاء کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ہر آنے والا اور یہاں آ کر رہنے والا اس خوشبو کا اسیر بن جاتا اور پھر واپس نہ جاتا شہر حسین تھا شہری بھی حسین تھے اس حسن پر مرنے والوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شہر عظیم تھا شہری عظیم تھے شہر کی عظمتوں کے دیپ چل رہے تھے۔

ملتان میں پہلوانی کا شوق عام تھا بڑے بڑے نامور پہلوان تھے صحت مند اور طاقت ور بننے کے لیے نوجوان پہلوانی کے بڑے شوقین تھے۔ پہلوانوں کی خوراک دودھ، دہی کی لسی، باداموں کی سردائی، ملائی اور دوپہر کو گوشت تھی۔ پہلوان خوش خوراک ہوتے تھے۔ بڑے پہلوان خوش لباس اور عبادت گزار ہوتے تھے یہ نماز تہجد کے وقت اٹھتے ہزار دو ہزار ڈنڈ پیلتے، بیٹھک لگاتے، سورج طلوع ہونے سے پہلے ورزش تمام کر لیتے تھے۔ ایک پہلوان کے لیے پاکباز رہنا اور نیک سیرت ہونا لازمی شرط تھی یہ پہلوان صبح و شام اکھاڑے میں زور کیا کرتے استادوں سے سیکھتے اور شاگردوں کو سکھاتے تھے یہ پہلوان خاص مواقع پر کشتی لڑتے، دنگل لگتے، تانگوں پر پہلوانوں کے جلوس نکلتے جو سارے شہر کا خاص چکر کاٹتے، پہلوان نہایت شاندار بھڑکیلے رنگوں والے ریشمی لباس پہنتے سر پر بڑی بڑی سرخ و سبز رنگ کی شاندار پگڑیاں ہوتیں۔ جلوس اکثر خونی برج یا شاہ رسال نزد سٹی ریلوے سٹیشن سے نکلتے۔ حرم گیٹ، بوہڑ گیٹ، لوہاری گیٹ، حسین آگاہی اور پھر حسین آگاہی کے ندر چوک بازار، بازاد دربار پیر صاحب (صرافہ بازار) سے ہوتے ہوئے خونی برج یا شاہ رسال واپس چلے جاتے۔ پہلوان کی تعریف ہر بچے، بوڑھے اور جوان کی زبان پر تھی۔ کشتیاں ہوتیں تو ہار جیت پر کئی دن تک بحث چلتی تھی۔ شہر میں بیسیوں اکھاڑے تھے جو استادوں کے نام سے مشہور تھے۔

شہر کے باہر پھل دار درختوں کے باغ تھے ہرے بھرے کھیت تھے۔ شہر میں ایک نالہ ولی محمد خان والا بہتا تھا اس کے کنارے لوگ بیٹھتے گرمیوں میں اس میں نہاتے عورتیں اس کے کنارے پر بیٹھ کر کپڑے دھوتی تھیں۔ کچھ لوگ چھٹی والے دن اس کے کنارے پر آ کر پکنک مناتے اور تاش کھیلتے اور لطف اندوز ہوتے تھے رات کے وقت محنت کش لوگ محلوں کی گلیوں میں چارپائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ایک شخص ہیر پڑھتا دوسرے خاموشی سے سنتے، خوب محفل جم جاتی کوئی یوسف زلیخا، سیف الملوک یا گل بکاؤلی کا قصہ پڑھتا یا سناتا۔ دوسرے بڑے مزے سے بیٹھ کر سنتے اور باری باری حقہ بھی پیتے جاتے۔ کہیں کوئی دردناک واقعہ آ گیا تو سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ یہ منظر سامعین کو بے حد متاثر کرتا۔

انگریزوں نے اس شہر پر قبضہ کرنے کے لیے زبردست بمباری کی شاہی قلعہ تباہ ہوا۔ کچھ فصیل بھی تباہ ہوئی شہر کے چھ بڑے بڑے مضبوط اور اونچے دروازے تھے تین دروازے پاک گیٹ، دولت گیٹ اور لوہاری گیٹ منہدم ہو گئے اب انکے نشان بھی نہیں ملتے بس نام ملتے ہیں۔ باقی تین دروازے دہلی گیٹ، حرم گیٹ اور بوہڑ گیٹ موجود ہیں مگر یہ بھی خستہ حال ہو چکے ہیں نہ محکمہ آثار قدیمہ اور نہ کارپوریشن ان کی تعمیر نو پر توجہ دے رہی ہے البتہ یہ

دروازے اپنی پہلی اور پرانی آن بان قائم کیے ہوئے ہیں۔

جو حسن اور خوبی شہر کی تھی وہی حسن اور خوبی شہر کے باسیوں میں تھی لوگ بڑے صفائی پسند تھے صاف گو، صاف دل اور صاف ستھرا، سفید لباس زیادہ پہنتے تھے میونسپل کمیٹی کا صفائی کا عملہ صبح شام صفائی کیا کرتا تھا بازاروں میں صبح اور سہ پہر کو ماشی اور میونسپل کمیٹی کی پانی چھڑکانے والی گاڑیاں چھڑکاؤ کیا کرتی تھیں۔ خاک روب نالیاں صاف کرتے ماشکی ان کے ساتھ نالیوں میں صفائی کے لیے پانی ڈالتے جو گندگی نالیوں کی ناک کر باہر رکھی جاتی دوسرا خاک روب فوراً اٹھا کر ہاتھ والی گاڑی میں ڈال دیتا۔ گندگی اٹھانے کا انتظام صفائی کے ساتھ ہوتا تھا۔

ہندو کرتہ اور دھوتی پہنتے تھے مسلمان قمیض کرتہ چادر اور شلوار پہنتے تھے، ہندو عورتیں پاجامہ اور قمیض اور ساڑھیاں پہنتی تھیں۔ دھوبی بھٹیں پر کپڑے دھویا کرتے تھے گھر میں عورتیں صابن کے علاوہ ٹین کے بڑے بڑے ڈبوں میں کھار ڈال کر پانی ابالتیں اور اس ابلتے ہوئے پانی میں کپڑے ڈالتیں کافی دیر تک کپڑے ابلتے رہتے پھر نکال کر دو فٹ لمبے ڈنڈے سے کوٹ کوٹ کر دھوتیں باہر آنے جانے والوں کو آواز سے معلوم ہو جاتا کہ اس گھر میں کپڑے دھوئے جا رہے ہیں۔ نہر کے کنارے پر بھی عورتیں کپڑے دھویا کرتی تھیں۔

1922ء میں شہر میں بجلی آ گئی۔ ملتان الیکٹرک سپلائی کمپنی ہندو مسلم اشتراک سے قائم ہوئی تو شہر بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ کچھ سینما بھی بن گئے لوگوں کو ایک تفریح مل گئی کچھ سینما ہندوؤں کے تھے ایک سینما تاج محل مسلمان کا تھا اور ہے۔ پہلے پہل خاموش فلمیں چلیں۔ پھر باقاعدہ آواز والی فلمیں چلنے لگیں شہر میں تھیٹر اور سرکس بھی لگی رہتی تھی جو شام کو لوگوں کو تفریح مہیا کرتی تھیں۔ اکثر مسجدوں میں غسل خانے اور بیت الخلا بھی بنایا جاتا تھا۔ مسجد کے قرب و جوار میں رہنے والے مسلمان ان غسل خانوں میں نہاتے تھے بعض لوگ نائی کے حمام میں نہاتے نائی تیل صابن اور تولیہ بھی مہیا کرتا تھا سردیوں میں گرم پانی مہیا ہوتا تھا۔ ہندوؤں نے اپنے مندروں میں کنوئیں بنا لیے گھے اور وہ صبح کو ان مندروں میں کنوؤں پر نہاتے تھے۔ دکانیں صبح سویرے کھلتیں اور رات گئے بند ہوتیں۔ سینماؤں کے قریب سگریٹوں، مشروبات اور مٹھائی وغیرہ کی دکانیں رات ایک بجے کے بعد تک کھلی رہتیں۔ جب رات کو تیسرا شو ختم ہو جاتا تو بعد میں یہ دکانیں بند ہو جاتیں اسی طرح شہر رات بھر کھلا رہتا تھا۔

شہر کے باہر تھانہ حرم گیٹ کے عقب میں ہیرا منڈی تھی یہاں گندگی اور گناہ کا کاروبار تھا سرکار نے ان طوائفوں کو گناہ کرنے کی اجازت کے لائسنس جاری کر رکھے تھے۔ ہیرا منڈی میں اوباش، عیاش اور بدمعاش پھرتے رہتے۔ کوٹھوں پر گانے والی طوائفیں ہوتی تھیں۔ نیچے جسم بیچنے والی ہوتی تھیں یہاں بدمعاشوں اور اوباشوں میں لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ رات کو ایک بجے ہیرا منڈی قانوناً بند ہو جاتی تھی۔ سارا گندا دھندہ بند ہو جاتا۔ اگر اس وقت اس علاقہ میں کوئی پایا جاتا تو پولیس اسے پکڑ کر آوارہ گردی میں جیل یاترا کو بھیج دیتی تھی۔ اوباش اور بدمعاش قانون سے ڈرتے تھے اور احترام کرتے تھے ان گانے والی طوائفوں کے عشق میں کئی نواب برباد ہوئے اور کوڑی کوڑی کے محتاج ہوئے۔ طوائفوں نے ان سے پھر بھی وفا نہ کی۔ اس محلے میں جو بھی آیا اجڑ گیا۔ بڑے قد آور ہٹے

کٹے، موٹے تازے بھڑوے شاندار لباس پہنے پھرتے۔ یہاں بڑی بڑی حسین وجمیل اور معصوم صورت والی لڑکیاں لائی جاتیں جو چند سکوں کے عوض خریدی جاتیں اور لا کر اس بازار کی زینت بنا دی جاتیں۔ انہیں جسم فروشی پر مجبور اور مامور کیا جاتا۔ بھڑوے ان کی رکھوالی کرتے رہتے حکم نہ ماننے پر زبردست جسمانی سزا دیتے اور بڑی بے دردی سے مارتے ان کی درد فریاد سننے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے یہ بے چاریاں اس گناہ کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتیں۔ اوباش لوگ دو پانچ روپے میں ان کی عزتوں سے کھیلتے اور اپنے نفس کی ہوس بجھاتے۔ چند سالوں میں ان حسین وجمیل لڑکیوں کا رنگ روپ اڑ جاتا۔ یہ بوڑھی ہو جاتیں تو انہیں پوچھنے والی بھی کوئی نہیں ہوتا تھا۔ دولت والے غربت کا مذاق اڑاتے اور عیاشیاں کرتے یہ بے چاریاں جسم فروشی کرتے کرتے مر جاتیں جو بوڑھی طوائفیں بیمار ہو جاتیں تو علاج اور سہارے کو بھی ترستی رہتیں۔ بھیک مانگنا شروع کر دیتیں ان کے حسن اور جوانی سے فائدہ اٹھانے والے مزہ لینے والے بھی ان کی پرواہ نہ کرتے ان کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ انگریز تو اسلام کا دشمن تھا اس نے گناہ گاری کرنے کے اڈے بنا دیئے۔ بدکاری پھیلا دی کہ آج اسلام کے دشمن اس بدکاری کی افادیت بیان کرتے ہیں۔ کفر بکتے ہیں اور شرم نہیں کرتے۔ نواب امیر محمد خان گورنر مغربی پاکستان نے پاکستان بھر میں چکلے قانوناً بند کرا دیئے۔

صبح کا سماں نہایت ہی سہانا ہوتا تھا۔ مسلمان صبح سویرے جاگتے مسجدوں کو جاتے ہوئے کلمہ طیبہ اور درود پاک کا ورد زور سے کیا کرتے تاکہ ان کی آواز سے گھروں میں سوئے ہوئے مسلمان بھی جاگیں اور نماز پڑھیں۔ ہندو بھی صبح سویرے اندھیرے منہ جاگتے اور مندروں میں اشنان کر کے اپنے پاپ جھاڑتے تھے مسجدوں میں اذانوں کی آوازیں آتیں تو مندروں میں گھنٹیاں بجتیں۔ بعض ہندو گھروں میں نہاتے تھے۔ نہانے میں پانی کم استعمال کرتے مگر رام رام بہت زیادہ کرتے تھے۔

صبح سویرے اٹھنے والوں میں سبزی وفروٹ منڈی میں کام کرنے والے مزدور بھی تھے، آڑھتی اور سبزی فروش بھی تھے اور فقیر بھی تھے۔ مزدور تو منڈی میں جاتے ٹوکروں میں سبزیاں اور فروٹ اٹھا کر دکانداروں کے ساتھ ان کی دکانوں پر پہنچاتے۔ سبزی منڈی شہر کے قریب بوہڑ گیٹ کے باہر تھی دور دراز کے علاقوں میں ہاتھ ریڑھیاں سبزیاں اور فروٹ لے جاتی تھیں۔ فقیر محلوں اور گلیوں میں دعاؤں کی صدائیں لگاتے چلے جاتے۔ جسے خیرات دینا ہوتی وہ فقیروں کو بلا کر خیرات دیتے تھے۔ صبح کے وقت شہر کے کونے کونے میں دعاؤں کی صدائیں گونجتی تھیں۔ ہندو بھکاریوں کی صدائیں الگ قسم کی ہوتی تھیں۔ مندروں کے باہر بھی ہندو بھکاری بیٹھتے تھے پوجا پاٹ کو آنے والے ہندو مرد اور عورتیں انہیں بھیک دیتی تھیں یہ بھکاری شام کو بھی بھیک مانگنے کے لیے گلی محلوں میں پھرتے اور آوازیں دیتے تھے۔ افغانستان سے مزدوری کرنے کے لیے آنے والے پٹھان بھی بھیک مانگتے تھے۔ مزدوری کی کمائی بچا کر وطن لے جاتے تھے اس شہر میں حاجت رواؤں کی بھی کمی نہ تھی ایک سے بڑھ کر ایک حاجت روا ہوتا تھا۔

حضرت موسیٰ پاک شہید کے دربار پر لنگر دن رات چلتا رہتا تھا۔ عقیدت مند مسافر اور غریب اس لنگر سے

پیٹ بھر لیتے تھے۔ ہندوؤں نے بھی اپنے لنگر کھول رکھتے تھے پھر بھی بعض ہندو دربار پیران پیر کے لنگر سے روٹی سالن لیتے اور پیٹ بھرتے تھے۔ متعصب ہندو اگر چہ یہ بات پسند نہ کرتے تھے مگر وہ انہیں روک بھی نہ سکتے تھے اور نہ وہ ان کی بات مانتے تھے محرم کے دنوں میں شیعہ حضرات نذر و نیاز کا سلسلہ چلاتے تھے۔ مشروبات، دال روٹی، اور چاول کی نیاز اب بھی ہوتی ہے۔ اس میں کمی نہیں آئی اگر محرم موسم گرما میں ہوتا تو پانی اور شربت کی سبیلیں لگتی تھیں اگر موسم سرما ہوتا تو پھر چائے کی سبیلیں لگتی تھیں۔ تعزیے، علم اور ذوالجناح بھی نکالے جاتے تھے۔ عزادار زبردست ماتم کرتے تھے۔ زنجیروں سے بھی ماتم کیا جاتا تھا۔ یہ دستور اب بھی قائم ہے استاد اور شاگرد کے تعزیے اندرون پاک گیٹ سے نکالے جاتے تھے۔ پہلے نمبر پر استاد کا تعزیہ ہوتا اور دوسرے نمبر پر شاگرد والا یہ دستور اب تک چلا آ رہا ہے۔ گردیزیوں کا ماتم بھی مشہور تھا اور ہے۔

ملتان میں گیلانی، قریشی، گردیزی، خاکوانی، بابر اور دیگر پٹھان خاندان دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان سب میں سرکردہ گیلانی اور قریشی تھے یہ مذہبی گھرانے تھے۔ مگر انہوں نے سیاست میں بھی اپنی سرکردگی اور برتری قائم کر لی تھی۔ گیلانی خاندان کے پاس دربار پیران پیر دستگیر حضرت پیر موسیٰ پاک شہید رحمتہ اللہ علیہ کی اور قریشی خاندان کے پاس دربار حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی رحمتہ اللہ علیہ کی سجادہ نشینی تھی۔ انگریزوں نے ملتان پر قبضہ جما لینے کے بعد ان خاندانوں کی برتری کو تسلیم کیا۔ مخدوم صدر الدین گیلانی سجادہ نشین دربار موسیٰ پاک شہیدؒ، مخدوم سید راجن شاہ گیلانی اور سجادہ نشین حضرت بہاء الدین زکریاؒ، مخدوم مرید حسین قریشی کو خطابات سے نوازا اور تعاون حاصل کیا۔ گیلانی خاندان نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے پنجہ استبداد سے بچانے کی خاطر مصلحت کوشی سے کام لیا اسلام کی پاسداری کو ملحوظ خاطر رکھا اور وقت آنے پر ملتان کے باسیوں کی اولاد کے لیے علم کا اہتمام بھی کر دیا اور انجمن اسلامیہ قائم کر کے علم کی شمع روشن کی۔ اسلام کی عظمت و سربلندی کے لیے موقع آنے پر یہ خطابات انگریز سرکار کو واپس کر دیئے۔ گیلانی خاندان کے حسین و جمیل جوان مخدوم زادہ سید محمد رضا شاہ گیلانی نے ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمینی کے انتخابات میں انگریز ڈپٹی کمشنر سر۔ ای۔ پی۔ مون کو شکست دی جو انگریزوں کو ہندوستان میں پہلے مسلمان نے دی۔ ان دنوں ملتان میں ہوٹل کم تھے اور ان کی جگہ سرائیں ہوا کرتی تھیں۔ بیرون پاک گیٹ ''حاجی جندے کی سرائے'' تھی اب اس جگہ محکمہ اوقاف نے دکانیں بنا دی ہیں۔ ایک مسجد بھی ہے۔ ملتان سٹی ریلوے سٹیشن کے قریب ''دوارکا داس کی سرائے'' ہوتی تھی اب اس جگہ رہائشی مکانات ہیں۔ حسین آگاہی کے قریب محل نما دو منزلہ نہایت عالی شان عمارت میں ''وکٹوریہ سرائے'' تھی اب اس جگہ ملتان ترقیاتی ادارے نے پلازہ تعمیر کر لیا ہے۔ شہر کی آبادی اتنی زیادہ نہ تھی مہنگائی بھی نہ تھی غریب لوگوں کو مکان کرایہ پر باآسانی مل جاتے تھے کرایہ مکان دو روپے، تین روپے اور پانچ روپے تھا، دکانوں کا کرایہ تین روپے سے چھ روپے تک تھا۔ غریب لوگوں کی زندگی ایک کمرہ والے مکان میں گزر جاتی تھی۔ مکان پچاس روپے سے ایک سو روپے میں مل جاتا تھا۔ مزدور اور غریب محنت کش اپنی مزدوری کی بچت کر کے روکھی سوکھی کھا کر ایک دو سالوں میں اپنا چھوٹا سا کچا پکا مکان بنا سکتا تھا

مگراب ایسا تاحیات ممکن نہیں رہا۔ اب تو موت پر کفن دفن اور قل خوانی کا خرچہ برداشت کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ پہلے ہر بندہ مطمئن تھا اب ایک بندہ بھی مطمئن نہیں صرف امراء، وزراء، اعلیٰ افسران، جاگیردار اور صنعت کار مطمئن ہیں اور عیش ونشاط کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ روزگار معاش سے بے فکر ہیں انہوں نے اتنی جائیدادیں بنالیں ہیں اور اتنی دولت کے انبار لگا لیے ہیں کہ ان کی آنے والی چودہ نسلوں کو بھی ملازمت کی فکر نہیں۔

شہر میں بچوں کی پیدائش کے لیے کوئی زچہ بچہ سنٹر نہ تھا دائیاں ہر محلے، دیہات، گاؤں اور بستیوں میں ہوتی تھیں۔ بڑی بڑی ہستیاں عظیم لوگ، تاجر اور سیاست دان انہی دائیوں کے ہاتھوں پیدا ہوئے۔ یہ ڈلیوری کیس بڑی مہارت سے کرلیا کرتی تھیں۔ یہ دائیاں نسل در نسل آ رہی تھیں۔ نوابوں اور امیروں کی دائیاں بھی نواب زادیاں بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ غریبوں کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ ڈلیوری کے علاج کی بڑی ماہر ہوا کرتی تھیں۔ سنگین صورت میں حکیموں سے حقیقت حال بتا کر دوا لے جاتی تھیں۔ بچے کی پیدائش پر زچہ بچہ دونوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں زچہ کی ٹانگیں دباتیں سر میں تیل ڈالتیں، سر دباتیں، مالش کرتیں، خاص خوراک یخنی وغیرہ بنا کر کھلاتیں جب زچہ پوری طرح صحت مند اور چلنے پھرنے لگ جاتی تب دائی کا کام ختم ہو جاتا۔ غریب لوگ بچے کی پیدائش پر دائی کو پانچ روپے، آٹا گڑ اور کپڑوں کا جوڑا یا دوپٹہ چادر وغیرہ دیتے تھے۔ بڑے لوگ دس بیس روپے کوئی پچاس روپے ایک بکری بچھڑی، گائے، گندم کی بوری، گڑ اور کپڑے کے دو تین جوڑے دیتے تھے۔ بیٹے کی پیدائش پر ذرا زیادہ رقم دی جاتی تھی اسی موقع پر زیادہ خوشی منائی جاتی تھی۔ اس موقع پر زیادہ خوشی منائی جاتی تھی۔ بیٹے کی پیدائش پر ہیجڑے بھی آ جاتے تھے۔ بھانڈ بھی آتے تھے۔ ہیجڑوں کے اپنے اپنے علاقے مختص تھے کوئی ہیجڑا دوسرے ہیجڑے کے علاقے میں نہیں آتا تھا۔ ایک ہیجڑا ''گلاب شاہ'' پورے شہر میں مشہور تھا اس کے شہر والے عزت بھی کرتے تھے۔ یہ بھی بڑا مودب اور مہذب تھا اور شاہ رسال سٹی ریلوے سٹیشن مال گودام کے قریب نواب عاشق حسین قریشی کے بنگلے کے قریب رہتا تھا۔ جب کسی نواب امیر کا بیٹا پیدا ہوتا تو وہ گلاب شاہ ہیجڑے کی آمد کے منتظر ہو جاتے تھے وہ نوابوں کے ہاں جاتا۔ ڈیوڑھی میں ناچتا دعائیں کرتا اور اچھے خاصے پیسے راشن اور کپڑے وغیرہ لے آتا تھا اس کا ایک خاص گانا تھا:

اوے گلاب شاہ — ہا
شالا ہویں ہا — ہا
نواب صحب کوں پتر جایا — ہا
ہووے عمراں والا — ہا
شالا سہریاں والا تھیوے — ہا
ہووے بختاں والا — ہا
شالا پیو جیوے — ہا
شالا ما جیوے — ہا

شالا نانا جیوے ہا
شالا ڈاڈا جیوے ہا
شالا نانی جیوے ہا
شالا ڈاڈی جیوے ہا
شالا سکھی وسے ہا
اے میڈا سوہنڑا لال واہ
اے میڈا بختاں والا واہ
اوے گلاب شاہ ہا
ویل آوے ہا ہا
اے بختاں والا ویڑہ
اے بختاں والا ڈیرہ
شالا بھاگ لگے رہون
اوے گلاب شاہ
ہا۔ دعا منگیں ہا۔ ہا

پھر گلاب شاہ نومولود بچے کو ہاتھوں میں اٹھا کر دعا مانگتا۔ امیر غریب اپنی اپنی بساط کے مطابق اسے رقم، کپڑے اور آٹا گڑ وغیرہ دیتے تھے۔ وہ دعائیں دیتا چلا جاتا تھا۔

انگریزوں نے چھاؤنی صدر کے علاقہ میں ایک زنانہ ہسپتال ''مشن ہسپتال'' قائم کر لیا تھا بعض امیر رئیس اور نواب زچگی کے کیس اس ہسپتال سے کراتے تھے۔ یہاں پر بھی زچہ و بچہ کی دیکھ بھال بڑی اچھی طرح سے کی جاتی تھی کسی قسم کی کوئی دقت یا پریشانی نہ ہوتی تھی بل معقول بن جاتا تھا مگر شکوہ شکایت بالکل نہ تھی۔ یہ ہسپتال اب بھی خدمت کر رہا ہے۔

شہر کے باہر والے علاقوں میں قبرستان تھے۔ پیر عمر، مائی پاک دامن، لکڑی منڈی، ملتان چھاؤنی، کسار منڈی، حسن پروانہ، بابا صفرا مشہور قبرستان تھے۔ اب ان قبرستانوں کے نوے فیصد رقبہ پر لوگوں نے ناجائز قبضہ کر کے اپنے مکان بنا لیے ہیں۔ ہندوؤں کے مرگھٹ، سمادھیاں اور دھرم شالے بھی تھے اب ان جگہوں پر بھی ہجرت کر کے آنے والوں نے اپنے مکان بنا لیے ہیں۔

ان دنوں سیر اور شہر میں سفر کے لیے تانگہ ہوتا تھا تانگہ لاہوری اور پشاوری بڑے خوبصورت اور شاندار ہوتے تھے لوگ گرمیوں میں شام کے وقت تانگوں پر بیٹھ کر شہر کی سیر کیا کرتے تھے تانگہ پر چار سواریاں بٹھانے کی اجازت تھی شام کے وقت تانگہ کے دونوں طرف لیمپ جلانا ضروری تھی۔ خلاف ورزی کی صورت میں چالان ہو جاتا

تھا۔ جرمانہ ایک روپیہ یا دو روپے ہوتا تھا۔ دہاڑی بھی ماری جاتی تھی۔ اس پریشانی سے بچنے کے لیے رشوت سے کام چل پڑا۔ چالان نہ کرنے پر سپاہی کو دو آنے یا چار آنے دے کر جان چھڑائی جاتی تھی تانگوں کے اڈے حرم دروازہ، بوہڑ دروازہ، لوہاری دروازہ، حسین آگاہی اور دہلی دروازہ کے باہر تھے۔ سٹی ریلوے سٹیشن اور ملتان چھاؤنی ریلوے سٹیشن کے باہر بھی اڈے تھے چھاؤنی صدر میں گر اس منڈی کے قریب چھوٹا سا اڈا تھا۔

سائیکل بھی سفر اور سیر کا ذریعہ تھا سائیکل کی گھنٹی لگوانا اور شام کے وقت سائیکل کے آگے لیمپ جلانا ضروری تھا۔ ولایتی سائیکلیں مہنگی ملتی تھی ہندوستان کی بنی ہوئی سائیکلیں پندرہ بیس روپے میں مل جاتی تھیں ان دنوں کلرک اور سپاہی بھائی کی تنخواہ پندرہ روپے تھی۔ خوراک بہت سستی تھی۔

کبھی کبھی ہندو مسلم فساد کھڑے ہو جاتے دونوں طرف سے قیمتی جانیں ضائع ہوتیں۔ گیلانی خاندان کے سجادہ نشین مخدوم سید صدرالدین گیلانی کے حکم سے ہندو مسلم فساد بند ہو جاتا تھا۔ ملتانی لوگ بڑے ملنسار، خوش خوراک، خوش لباس اور خوش گفتار تھے۔

شادی بیاہ پر لڑکے والے اپنی برادری اور دوستوں کی کھانوں سے تواضع کرتے تھے۔ لڑکی والوں کی برادری اور بارات والوں کو کھانا کھلانے کا بندوبست لڑکے والوں کے ذمہ ہوتا تھا امیر لوگ پر تکلف کھانا کھلاتے تھے۔ غریب آدمی زردہ، پلاؤ اور گوشت پکا کر برادری اور باراتیوں کی خاطر تواضع کرتے تھے۔ برادری والوں کو کھانا ان کے گھروں میں بھجوا دیا جاتا تھا۔ نکاح پر چھوہارے تقسیم کئے جاتے تھے۔ ہر باراتی کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے تھے۔ باراتیوں کو کھانا دری پر بٹھا کر کھلایا جاتا تھا۔ دلہن کی رخصتی صبح صادق کے وقت کی جاتی تھی۔ دلہن ڈولی میں بٹھا کر لائی جاتی تھی۔ پردے کی سخت پابندی تھی۔

مسلمانوں کی شادی بیاہ کی رسموں میں ہندوؤں کے رسم و رواج بھی شامل ہوتے تھے۔ کچھ رواج آج بھی وہی ہیں مگر اب انہیں ہندوانہ رسمیں نہیں سمجھا جاتا۔ دولہا گھوڑی پر بٹھا کر بارات کے ساتھ دلہن والوں کے گھر لے جایا جاتا تھا۔ ہر ماں باپ کی یہی خوشی ہوتی تھی کہ ان کے بیٹے کی شادی ہو اور وہ گھوڑی پر چڑھے۔ اس وقع پر نائن اور باجے والے یہ گیت ضرور گاتے ''ویر میرا گھوڑی چڑھیا'' دلہن کو ڈولی میں بٹھانے کے لیے لے جانے پر دلہن کے ماں باپ، بہن بھائی، چچا ماموں اور رشتے دار رو پڑتے تھے۔ آج بھی رو پڑتے ہیں۔ مگر اب ڈولی کی جگہ کار نے لے لی ہے۔ شادی پر ڈھولک بجائی جاتی اور بینڈ باجے بھی ہوتے تھے۔ ڈھول اور شہنائی بجانے والے بھی ہوتے تھے دولہا پر خوب پیسے نچھاور کئے جاتے تھے۔ یہ پیسے بچے اور غریب لوگ اور فقیر وغیرہ لوٹتے تھے۔ یہ ایک قسم کا صدقہ ہوتا جس کا نکالنا بہت ہی ضروری ہوتا تھا۔ بعض شادیوں پر مجرے ہوتے تھے۔ رات دیر تک مجرے کی محفل جمی رہتی تھی

ہر محلہ اور ہمسائے لڑکیوں کی ہر طرح سے حفاظت کرتے اور اسے اپنا فرض سمجھتے تھے لڑکیوں کو اپنی بیٹی بہن سمجھا جاتا تھا سونے چاندی کے زیوروں کا رواج تھا مرد بھی گلے میں کنٹھے پہنا کرتے تھے۔ قمیضوں اور کرتوں کے بٹن بھی سونے اور چاندی کے ہوا کرتے تھے۔ مگر اب نہیں ہیں۔ شادی کے بعد عورت خاوند کی تابعداری، بچوں

پرورش اور امور خانہ داری میں لگی رہتی تھی۔ ایک آدمی کماتا اور پورے خاندان کی کفالت کرتا تھا۔ اب بھی تقریباً ایسا ہی ہے مگر اب عورتیں ملازمت بھی کر رہی ہیں۔ مگر اب مہنگائی نے مجبور کر دیا ہے کہ عورتیں بھی ملازمت کریں اور کمائیں تاکہ گھر کا گزارہ ہو سکے۔ ہماری علاقائی ثقافت اور تہذیب میں تبدیلی انگریزوں نے کی اور ایسا زہر گھولا ہے کہ اب ہمیں اسلام سے زیادہ یہی انگریزی قوانین اور دستور پسند ہیں۔

انگریزوں نے عوام کے علاج معالجہ کے لیے دو ہسپتال بنائے تھے۔ ایک سول ہسپتال مردوں کے لیے دوسرا وکٹوریہ جوبلی ہسپتال خواتین کے لیے یہ ہسپتال 1887ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اب اس ہسپتال کا نام فاطمہ جناح ہسپتال ہے۔ یہ دونوں ہسپتال بوہڑ دروازہ کے باہر ہیں۔ علاج مفت ہوتا تھا اور احتیاط سے ہوتا تھا۔ اگر اب فیسوں سے ہوتا ہے اور احتیاط نہیں کی جاتی۔ اب نشتر ہسپتال بھی قائم ہے۔ جہاں علاج لاعلاج ہوتا ہے۔ یہاں درد سوا ہوتا ہے ڈاکٹر فیس لیکر علاج کرتے ہیں انہوں نے اپنے ہسپتال اور کلینک قائم کر رکھے ہیں ہسپتال سے مریض ذاتی کلینکوں یا پرائیویٹ کلینکوں پر بھجوا دیئے جاتے ہیں ملازمت کے باوجود یہ مسیحا مسیحائی نہیں کرتے دولت ان کا ایمان بن چکی ہے۔

ملتان میں بڑے ماہر اور کاریگر معمار تھے جو نوابوں کی حویلیاں اور ہندوؤں کے محل نما مکان بناتے تھے۔ قالین بافی شیشہ گری، کاشی گری، کمنگری اور مینا کاری کے بھی بڑے کاریگر تھے۔ ریشم کی صنعت میں ملتان اول نمبر تھا۔ پارچہ بافی کی صنعت میں بھی ملتان شہر مشہور تھا۔ ان تمام صنعتوں میں ملتان آج بھی بدستور مشہور ہے۔

(چندر آب۔ ملک منیر احمد بھٹہ)



اخلاق احمد قادری

عرب سیاح، اہل علم اور ملتان

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا سورج صحرائے عرب پر طلوع ہوا۔عرب جو دنیائے قدیم کی ایک نیم بربر قوم تھی جہالت کے اندھیرے اور گمراہی کے تمدن وتہذیب کے اجالے میں آ گئی۔اس قوم کے افراد تمام شعبہ ہائے زندگی میں آگے بڑھے۔جغرافیہ اور سیاحت میں بھی عرب اہل علم نے بڑا نام پیدا کیا۔عرب جغرافیہ دانوں اور سیاحوں نے تقریباً اس عہد کی پوری متمدن دنیا دیکھی اور اپنی کتابوں میں ان مقامات کے جغرافیائی وتمدنی حالات قلمبند کیے۔انہیں عرب سیاحوں میں سے بہت سوں نے برصغیر آ کر ملتان کی بھی سیاحت کی اور اس قدیم شہر کی تمدنی زندگی کے متعلق بہت سی اہم معلومات اپنی کتابوں میں درج کیں۔ملتان آنیوالے ان عرب سیاحوں میں پہلا نام ابو زید سیرانی کا ملتا ہے۔جو 264ھ، 886ء میں ملتان آیا تھا۔ہم اسی سے عرب سیاحوں کی ملتان آمد کا آغاز کرتے ہیں۔

ابوزید سیرانی:۔ نے اپنی کتاب 'الہند والعین' میں ملتان اور ملتان کے مشہور زمانہ بت کا تذکرہ کیا ہے لیکن موزخین نے ابوزید سیرانی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کیں۔اپنی کتاب میں ابوزید نے لکھا ہے کہ ایک مشہور بت ملتان میں ہے جس کی زیارت کے لیے لوگ آتے ہیں۔

البلاذری:۔ 279ھ/ 892ء (ابوالحسن) احمد بن یحییٰ بن جابر بہت بڑا مورخ تھا۔ایک ایک عظیم ماہر انساب اور جغرافیہ نگار بھی تھا۔اس کی زندگی کے متعلق بھی بہت کم معلومات میسر ہیں۔اس نے المدائنی، ابن سعد اور معصب الزبیری جیسے مشہور مورخین سے شرف تلمند حاصل کیا وہ عباسی خلیفہ المتوکل کا ندیم تھا۔اس کی قسمت کا ستارہ خلیفہ المعتمد کے عہد میں بڑی سرعت سے غروب ہونا شروع ہوا۔

البلاذری کی دو عظیم تاریخی تصانیف ہم تک پہنچی ہیں ''انساب الاشراف'' اور ''فتوح البلدان''۔ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ مسلم فتوحات کی تاریخ ہے لیکن تاریخی سوانح بیان کرتے ہوئے البلاذری نے بیچ بیچ میں ثقافتی اور معاشرتی حالات کے متعلق اہم اشارے فراہم کیے ہیں۔ملتان کی فتح کے مضمون میں اس نے اس قدیم شہر اور مشہور بت کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں وہ کچھ یوں ہیں کہ ملتان کا مشہور زمانہ بت یہاں صدیوں سے قا

ہے۔ یہ بت بیس گز لمبا بہ شکل انسان ہے اور بہت بڑے کمرے میں جاگزیں ہے جو دو ہزار سال پرانا خیال کیا جاتا ہے اور اس کے چار رخ ہیں۔ لوگ یہاں حج کے لیے آتے ہیں اور داڑھی اور سر منڈواتے ہیں اور چڑھاوے دیتے ہیں۔ جن میں صندل مخصوص ہے۔ کئی زائرین اپنی زندگی بھینٹ دینے کی اجازت چاہتے ہیں۔ مندر کے ساتھ ایک باورچی خانہ ہے، جہاں بت کے لیے کھانا پکتا ہے جو اعلیٰ قسم کے چاول، مچھلی اور سبزیات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جسے کیلے کے بڑے پتوں میں بت کے سامنے پھیلا کر رکھا جاتا ہے۔ بڑا پجاری گرم خوراک پر پنکھا کرتا، جس سے بخارات اوپر اٹھ کر بت کے منہ تک پہنچتے ہی اور یہ خیال کرلیا جاتا ہے کہ بت نے خوراک کھالی۔ اس رسم کے دوران موسیقی، چنگ و طبلے اور زبور بجائے جاتے ہیں اور کبھی کبھار ناچنے والیاں بت کے اردگرد جچتی ہیں بعد وہ بت کی ''پسماندہ خوراک'' تمام حاضرین حتیٰ کہ جانوروں اور پرندوں میں بانٹ دی جاتی ہے بت کو کبھی گھی و دودھ سے نہلایا جاتا ہے اور پھر وہ چیزیں مریضوں کو نہانے کے لیے دی جاتی ہیں۔

ابن رستہ: 290ھ/ 902ء: ابن رستہ، ابوعلی احمد بن عمر، تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کا ایک ایرانی نژاد عربی عالم اصفہان کا رہنے والا تھا۔ 290ھ/ 902ء میں وہ حج کرنے کے لیے حجاز گیا اور تقریباً اسی زمانے میں اس نے اپنی کتاب ''الاعلاق النفسہ'' لکھی۔ اس کتاب کا صرف ساتواں حصہ ہم تک پہنچا ہے۔ جس میں سپہر فلک اور کرہ ارض پر دیباچہ لکھنے کے بعد اس نے مختلف ملکوں اور شہروں کا بیان شروع کیا ہے۔ اسی حصہ میں وہ ملتان کے اس بت کے بارے میں سب سے تفصیلی طور پر لکھتا ہے:

''ملتان وہ شہر ہے جہاں دریائے سندھ الگ ہوتا ہے۔ یہ دریا، دریائے دجلہ کی مانند ہے اور اس سے بڑا ہے۔ ملتان میں ایک عرب قبیلہ حکمران ہے جو خود کو سامہ بن لوئی کی ایک شاخ بنو منبہ سے بتاتا ہے۔ یہی عرب لوگ ہندوستان میں حکمران ہیں اور خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھاتے ہیں۔ اور سندھ کہ شہر منصورہ کے قریب رہتے ہیں۔ ملتان میں ایک بت ہے جس کی آمدنی بہت زیادہ ہے اور بنو منبہ ہی سرکاری طور پر اس آمدنی کے مالک ہیں۔ بعض دفعہ جب ہندوستان کے دیگر راجے بنو منبہ سے جنگ کرتے کے لیے لشکر جرار کے ساتھ ملتان پر حملہ آور ہوتے ہیں تو بنی منبہ ان کا مقابلہ کرنے کی بجائے انہیں یہ دھمکی دیتے ہیں کہ وہ اس بت کو تباہ کر دیں گے اور غنیم اس ڈر سے واپس چلا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اس بت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان کے مطابق یہ بیس گز سے زیادہ طویل ہے اور آدمی کی شکل وصورت رکھتا ہے۔ ایک ایسے کمرے میں رکھا گیا ہے جس کی چھت بہت بڑی ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے کس نے بنوایا تھا؟ کہا جاتا ہے کہ یہ دو ہزار سال پہلے کی تعمیر ہے۔ ہندوؤں کے مطابق یہ بت آسمان سے اترا تھا۔ اس بت کے کچھ پجاری اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس بت کدے کے مصارف چڑھاوے سے چلتے ہیں۔ سارے ہندوستان سے لوگ اس کی یاترا کے لیے آتے ہیں۔ جب کوئی مالدار ہندو مرنے لگتا ہے تو وہ اس بات سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنا آدھا مال اس بت کے نام وصیت کر جاتا ہے۔ یہاں لوگ حج کی طرح دور دراز

کی مسافتیں طے کر کے آتے ہیں اور اس کی زیارت کرنے کے بعد یہاں اپنی سر منڈواتے ہیں۔ بائیں جانب سات بار طواف کرتے ہیں اور بت کے سامنے بڑے خشوع و خضوع سے گڑگڑاتے اور زمین پر لوٹتے ہیں۔ اس بت کے چار چہرے ہیں۔ اس لیے پجاری جس طرف بھی رخ کرے اس کا چہرہ اس کے سامنے رہتا ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں یہ قابلِ پرستش معبود ہے۔ لوگ اسے طواف کرتے ہوئے ہر رخ سے اسے سجدہ کرتے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو اپنی آنکھیں نکال کر اسکی آستین پر چڑھاوے کے طور پر کھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے بھگوان! میں نے تیری رضا جوئی کے لیے اپنی آنکھیں تیرے حضور پیش کر دیں۔ پس میری عمر دراز کر، مجھے روزی دے...... بعض لوگ اس بت کو اپنی جان بھینٹ کرنے کی اجازت چاہتے ہیں اور ایک نوکیلی لکڑی پر خود کو گرا کر اپنی جان دے دیتے ہیں۔ سمجھتے ہیں جان گئی تو گئی مگر بت کی رضا جوئی اور قربت تو حاصل ہوگئی...... اس بت کے پجاری انسانی فطرت سے اجتناب کرنے کے لیے عورتوں کے پاس نہیں جاتے، گوشت نہیں کھاتے اور نہ گندے اور میلے کپڑے پہنتے ہیں۔ ابن رستہ نے ملتان کی تاریخی عظمت اور اس کے اس قدیم بت کی تاریخی حیثیت متعین کرنے کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ اس بت کی قدامت اور مذہبی حیثیت سے پتہ چلتا ہے کہ ملتان تمدن و ثقافت کے کن کن مراحل سے گزرا ہے اور حملہ آوروں کی یلغاروں سے کتنی تبدیلیوں کا حاصل رہا ہوگا۔

ابو القاسم ابن خرداد بہ 300ھ/ 912ء:۔ ابن خرداد بہ، ابو القاسم عبید اللہ بن عبد اللہ ایرانی نسل سے تعلق رکھنے والا ایک مشہور مسلم جغرافیہ دان ہے جو تیسری صدی ہجری کے آغاز 211ھ/ تقریباً 820ء میں پیدا ہوا۔ اس کے دادا نے اسلام قبول کیا تھا (جو ایک مجوسی تھا) اس کا باپ والی طبرستان کے اعلیٰ منصب پر فائز رہا۔ خود ابن خرداد بہ ڈاک کے محکمے اور خبر رسانی کے محکمے کا ناظم تھا (صاحب البرید والخبر) کہتے ہیں کہ خلیفہ المعتمد نے اسے اپنا گہرا دوست بنا لیا تھا۔ المسعودی نے آلات موسیقی اور رقص کے موضوع پر ایک تقریر نقل کی ہے۔ اس کی دیگر تصانیف بھی عالمانہ نوعیت کی تھیں، ان میں سے صرف ایک کتاب ''المسالک والممالک'' ہم تک پہنچی ہے۔ جو اس نے ایک عباسی شہزادے کی فرمائش پر لکھی تھی۔ ابن خرداد بہ نے یہ کتاب 847ء میں لکھنا شروع کی تھی پھر رفتہ رفتہ وہ اس میں اضافے کرتا رہا۔ یہ کتاب تاریخی جغرافیہ کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس کتاب میں ابن خرداد بہ نے برصغیر اور ملتان کے متعلق بھی لکھا ہے۔ ابن خرداد بہ لکھتا ہے کہ ''ہند و سندھ کے لوگ دور دراز سے ملتان کے بت کے پاس حج کے لیے آتے ہیں اور سونا چاندی، جواہرات و مشک و دیگر اشیاء نذرانے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔''

المسعودی 303ھ/ 915ء:۔ نامور مسلم مورخ، جغرافیہ دان اور فلسفی، المسعودی ابو الحسن علی، ممتاز صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن مسعود کی اولاد تھے۔ تحصیل علم اور سیر و سیاحت کی غرض سے اپنے وطن سے دور دراز تک کے علاقوں میں سفر کیا جن میں شام، فلسطین، مصر، فارس، سری لنکا، چین، آذربائیجان اور برصغیر پاک و ہند شامل ہیں۔ سفر ہندوستان کے دوران جب منصورہ پہنچے تو وہاں عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز کا بیٹا حکمران تھا۔ المسعودی نے یہاں

عرب سادات اور خاندان علوی سے تعلق رکھنے والوں کو بھی آباد پایا۔ منصورہ کے بعد المسعودی ملتان پہنچا۔ پھر یہاں سے وہ حیدر آباد دکن تک گیا۔ اس نے اپنے ان سفری تجربات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں ''مروج الذہب و معاون الجواہر'' سب سے اہم ہے۔ اپنی اس کتاب میں المسعودی ایک روایت نقل کرتا ہے جس کے متعلق مورخین ملتان نے لکھا ہے کہ اس کا اطلاق ماسوائے دنیا کے کسی اور شہر پر نہیں ہوتا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''قدیم زمانے میں اور برہمنوں کے عہد سلطنت میں دانشمند حکماء اور مفکرین کا ''بیت الذہب'' میں اجتماع ہوا، انہوں نے کہا کہ ہم سب کو مل کر غور کرنا چاہیے کہ اس دنیا کی حقیقت اور اس کا راز کیا ہے۔ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانا ہے؟ ہمیں عدم سے وجود میں لانے کی کوئی تو حکمت اور مصلحت ہوگی۔ پھر آخر میں پیدا کرنے والا ہمیں ہلاک کیوں کر دیتا ہے؟ پہلے حکیم اور فلسفی نے جواب دیا کہ آپ کسی ایسے شخص کا نام بتا سکتے ہیں جس نے موجود اور غیر موجود تمام چیزوں کا صحیح ادراک کر لیا ہو اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا ہو اور مطمئن بھی؟ دوسرے حکیم نے جواب دیا اگر کسی کی عقل و فہم میں خدا تعالیٰ کی حکمت آ جائے تو لازم ہے کہ اس کی حکمت میں نقص اور فتور آ جائے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ غرض و غایت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا اور ہماری تقصیر و کوتاہی صحیح ادراک میں رکاوٹ ہے۔ الغرض اس فسلفے کا حاصل کلام چھٹے یا ساتویں حکیم نے یہ پیش کیا کہ تم لوگ کیا کہہ رہے ہو یہ سمجھنا تو میرے لیے دشوار ہے البتہ اتنا جانتا ہوں کہ دنیا میں مجھے مجبور بنا کر لایا گیا۔ اب حیران و پریشان زندگی گزار رہا ہوں اور زبردستی اس حالت میں دنیا سے نکالا جاؤں گا کہ اس کو چھوڑنا مجھے انتہائی ناگوار ہوگا......

مورخین کے مطابق وہ شہر بیت الذہب ملتان ہی تھا جس کو فرج بیت الذہب بھی اکثر عرب سیاحوں اور مورخوں نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس بھی ملتان کے علاقے کے دریا کے ساحل کی ریت میں سونا نکالنے کا ذکر کرتا ہے۔ اس طرح المسعودی کا بیت الذہب ملتان ہی ہے۔ المسعودی اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ ملتان میں ایک مشہور مندر ہے جس میں ایک بت ہے۔ اس کی یاترا کے لیے دور دراز سے لوگ آتے ہیں اور بیش قیمت تحفے اس بت کی نذر کرتے ہیں۔ جن میں جواہرات، عطریات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سے حاکم ملتان کی بڑی آمدنی میسر آتی ہے اور اس کی بدولت اس کے پاس خالص عود ہندی کافی مقدار میں موجود رہتا ہے۔ اس کی قیمت دو سو دینار طلائی فی من ہے۔ یہ عود ایسے نرم ہے کہ اگر اس پر مہر سے دبائیں تو نقش ایسے اٹھتا ہے جیسے موم پر نقش ابھرتا ہے۔

المسعودی نے بھی ملتان کے مسلم حکمرانوں کی اس پالیسی کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے ملتان پر حملہ کرنے والے ہندو حکمرانوں کے خلاف اختیار کر رکھی تھی یعنی حملہ آوروں کو بت توڑنے کی دھمکی دے کر بھگا دینا۔

ابن مہلہل 331ھ/ 942ء:۔ المسعودی کے تقریباً تیس سال بعد ابن مہلہل 331ھ میں برصغیر آتا ہے۔ وہ ملتان اور اس بت کے بارے میں رقمطراز ہے کہ ''ملتان ایک بڑا شہر ہے جس میں فصیل بھی ہے۔ ہندو لوگ

اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ جیسے ہم مکہ حج کے لیے جاتے ہیں۔ وہاں اسلامی حکومت قائم ہے اور غیر مسلم ماتحت کے طور پر رہتے ہیں۔ اس جگہ ایک بہت بڑا قبہ (مندر) ہے جس کے نزدیک مسلمانوں کی جامع مسجد ہے۔ عام طور پر لوگ شریعت کے تابع ہیں اور دینی امور پر عمل کرتے ہیں۔ وہ مندر (قبہ) تین سو ہاتھ بلند اور بیس ہاتھ چوڑا ہے۔ اس قبہ کے اردگرد خدام اور پجاریوں کے مکان ہیں۔ شہر ملتان میں غیر مسلم اس محل کے قریب کے سوا دوسری جگہ نہیں رہتے۔ اس قبہ میں موجود بت رکھا گیا ہے وہ انسانی شکل کا ہے اور کرسی پر یعنی بلندی پر چار زانوں بیٹھا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ زانوں پر ہیں اور سر پر سونے کا تاج ہے۔ آنکھوں میں دو لعل نصب ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ باقی تمام بدن کو سرخ چمڑے جیسا لباس پہنا رکھا ہے۔ اور انگلیاں اس طرح ہیں کہ جیسے حساب کرنے والا ہتھیلی میں جمع کر لیتا ہے۔ ملتان کا بادشاہ اس بت کو لالچ کی وجہ سے نہیں توڑتا۔ کیونکہ جو نذرانہ آتا ہے اس میں خداموں کو تھوڑی سی رقم دی جاتی ہے باقی سب بادشاہ کے حصے میں آتا ہے۔ ہندو راجہ جب ملتان کو فتح کرنے کا قصد کرتے ہیں تو مسلمان اس بت کو باہر نکال کر توڑنے اور جلانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ جس سے حملہ آور ہندو راجہ ڈر کر واپس چلے جاتے ہیں۔

اصطخری 340ھ/ 952ء:۔ دسویں صدی عیسوی کے نصف اول سے تعلق رکھنے والا مشہور مسلم جغرافیہ دان، اصطخری، ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفارس ایران کے مشہور شہر اصطخر یعنی پرسی پولس میں پیدا ہوا۔ اس نے شہر بہ شہر پھر کر اس وقت کی معلوم دنیا کے مختلف مقامات کے حالات جمع کیے۔ بیشتر جغرافیائی کتب کی مدد سے بھی جغرافیائی معلومات جمع کیں اور اپنی ایک کتاب ''مسالک الممالک'' کے نام سے ترتیب دی۔ دوران سیاحت اصطخری ابن مہلہل کے بعد تقریباً 340ھ میں ملتان آیا تو اس نے ملتان کے سورج دیوتا یا آدیتیا کے متعلق لکھا کہ ''ملتان کا شہر منصورہ سے چھوٹا ہے، آدھے میل کے برابر ہے۔ یہاں ایک مورتی ہے جس کی ہندو بڑی تکریم کرتے ہیں اور دور دور کے شہروں سے لوگ یہاں یاترا یا حج کے لیے آتے ہیں۔ ہر سال ثواب کے حصول کے لیے اس بت پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ جن سے مندر اور پجاریوں سے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں۔ اس شہر کا نام ملتان بھی اس بت کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ یہ بت ملتان کے پر رونق بازار میں موجود ہے جو ٹھیٹھروں اور ہاتھی دانت والے بازار کے درمیان واقع ہے۔ یہ مندر بڑے محل کے درمیان میں ہے جس پر ایک قبہ بنا ہوا ہے۔ اس قبہ میں یہ بت رکھا گیا ہے۔ اس کی شکل انسانی صورت کی سی ہے جو پالتی مار کر کرسی پر بیٹھی ہے۔ یہ کرسی اینٹ اور گچ کی ہے۔ اس کا لباس سرخ چمڑے کا ہے جس سے اس کا تمام بدن بجز آنکھوں کے ڈھکا رہتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مورتی لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔ بعض کچھ اور کہتے ہیں کیونکہ اس کا بدن بھی ننگا نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ اس کی آنکھوں میں دو ہیرے یا یاقوت جڑے ہیں اور اس کے سر پر سونے کا تاج ہے۔ ہندو راجوں میں سے کوئی ملتان پر چڑھائی کرتا ہے تو حاکم ملتان اس بت کو مندر سے باہر نکلواتا ہے اور اس کو توڑنے کی دھمکی دی جاتی ہے جو بڑی مؤثر ثابت ہوتی ہے اور ہندو راجہ بت کی بے حرمتی کے ڈرتے ہوئے واپس چلا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ملتان کبھی کا

مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جاتا۔

ابن حوقل 370ھ/ 980ء:۔ابن حوقل، ابوالقاسم (محمد) النصیبی البغدادی دسویں صدی عیسوی کا ایک اور اہم مسلم سیاح ہے اور جغرافیہ نگار بھی۔ وہ اپنے سفرنامے میں خود بتاتا ہے کہ وہ رمضان 331ھ/ 943ء کو بغداد سے اس مقصد کے لیے نکلا کہ دوسرے ملکوں اور لوگوں کے متعلق واقفیت حاصل کرے اور تجارت کے ذریعے دولت کمائے۔ اس نے یہ بات اپنی کتاب ''صورت الارض'' میں لکھی ہے۔ مشرق و مغرب تک تمام دنیائے اسلام کی خوب خوب سیاحت کر کے اس نے اپنے پیشرو سیاحوں اور جغرافیہ دانوں ابن خرداد بہ اور قدامتہ کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ مغربی مفکر ڈوزی کے مطابق وہ فاطمی خلفا مصر کے لیے جاسوسی کا کام بھی کرتا تھا۔ اپنے سفر کے دوران وہ غالباً 340ھ میں اصطخری سے ملا۔ اس کی درخواست پر اس کی کتاب میں اس نے نقشوں کی اصلاح کی اور ترمیم و تبدیلی کی لیکن بعد میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کتاب کو از سرنو خود لکھے۔ چنانچہ اس نے اس کو تکمیل کے مراحل تک پہنچا کر اس کا نام ''المسالک والممالک اوالمغاذز والمھالک'' رکھا اور شائع کیا۔ اپنی اس کتاب میں ابن حوقل نے اپنی سیاحت ملتان کا حال درج کیا ہے۔ ملتان کے بارے میں لکھتا ہے کہ شہر کا نام اس بت کے نام سے ماخوذ ہے اور وہ بت اینٹ اور چونے سے بنے ہوئے چبوترے پر متمکن ہے۔ حاکم شہر کا نام عمر بن عبدالعزیز ہباری قریشی ہے۔ ابن حوقل نے بھی اس بت کو شکل انسان کا مظہر، چرمین لباس میں اور تاج زریں پہنے دیکھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ نذرانہ سے جو رقم وصول ہوتی ہے وہ امیر ملتان اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔ امیر ملتان کی دفاعی پالیسی کو بھی ابن حوقل نے اپنی کتاب میں دہرایا ہے۔ جس کے ذریعے مدتوں حکمران ملتان شہر اور اہل شہر کو حملہ آوروں سے بچاتے رہے۔

البشاری المقدسی 375ھ/ 985ء:۔ملتان آنیوالا اگلا عرب سیاح البشاری المقدسی شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر البقاء ہے۔ اس کے اپنے سفرنامے کے مطابق وہ 356ھ/ 966ء میں مکہ میں تھا اور جس کی عمر 20 برس تھی۔ اس کا دادا فلسطین میں میر عمارات تھا۔ اس نے ابن طولون کی فرمائش پر شہر عکا کے دروازے تعمیر کئے تھے۔ البشاری سیاحت دنیا پر نکلا اور تقریباً 375ھ/ 985ء میں ملتان پہنچا۔ اس وقت ملتان پر قرامطہ کی حکومت قائم تھی۔ البشاری نے لکھا ہے، ملتان والے اہل تشیع ہیں اور اذان میں ''حی اللہ الخیر العمل'' کا اضافہ اور اقامت میں بھی ان کلمات کو دو مرتبہ ادا کرتے ہیں۔ حاکم ملتان مصر کے فاطمی خلفا کا خطبہ پڑھتا ہے اور کوئی کام مصری خلفاء کی اجازت کے بغیر نہیں کرتا اور ہمیشہ دربار مصر کو ہدیئے اور تحفے روانہ کرتا ہے۔ ملتان میں فاطمی خلفا ہی کے حکم سے والی مقرر کئے جاتے ہیں۔

ملتان کے مشہور زمانہ مندر اور بت کے بارے میں البشاری لکھتا ہے، ملتان کے مندر میں ایک مورتی ہے یہ مندر ایک محل میں ہے جو بازار کے آباد حصے میں واقع ہے۔ اس کے بیچ میں ایک بڑا خوبصورت قبہ ہے اور اس کے گرد پجاریوں کے مکانات ہیں۔ بت آدمی کی شکل کا ہے جو اینٹ اور گچ چونے کی بنی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس کو

سرخ کپڑے کا لباس جو سنجاف کے مشابہ ہے پہنایا گیا ہے۔ جس سے سوائے آنکھوں کے کچھ اور نظر نہیں اتا۔ اس کی دونوں آنکھوں میں لعل و گوہر لگے ہوئے ہیں۔ سر پر سونے کا تاج ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ اس انداز میں گھٹنوں پر رکھے ہیں جیسے وہ چار گن رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ملتان میں بہت سے مندر ہیں جو اس مندر سے کم درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ بعض مورخین نے جلم بین شیبان اسماعیلی کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے 374ھ میں اس بت اور مسجد ابن قاسم دونوں کو نذر آتش کر دیا تھا۔ یہ بات بھی ایک معمہ ہے کہ خالص صونے کا بت کیسے مکمل لکڑی کا بن گیا جو نذر آتش کر دیا گیا۔

البیرونی 410ھ/ 1022ء:۔ گیارہویں صدی عیسوی کا مسلم جغرافیہ نگار اور مفکر البیرونی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا ذوق کا یہ عالم تھا کہ نہ کبھی نظریں کتاب سے الگ ہوئیں اور نہ کبھی قلم ہاتھ سے رکھا۔ البیرونی جب برصغیر آیا اس وقت ملتان میں یہ بت اور مندر موجود نہیں تھے۔ مگر البیرونی نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ غزنویوں نے ملتان سے قرامطہ کا زور ختم کر دیا مگر خود غزنویوں کے زوال پر ہندوؤں نے تھوڑے عرصے کے لیے ملتان پر پھر غلبہ پالیا اور اس بت اور مندر کو از سر نو اپنی جگہ پر قائم کر دیا۔ البیرونی نے ملتان کے اس بت کے متعلق جو تفصیلات پیش کی ہیں کم و بیش وہی ہیں جو پہلے آ چکی ہیں۔

الادریسی 1135ء:۔ مشہور عرب جغرافیہ نگار الادریسی (1099-1154ء) نے جو صقلیہ میں نارمن بادشاہ راجر دوم کے دربار سے منسلک تھا۔ اپنی مشہور تصنیف ''نزہت المشتاق فی افتخار الآفاق'' میں ایک بار پھر اس بت کا تذکرہ کیا ہے جسے اس نے وسط شہر میں ایک عالیشان مندر میں براجمان بڑے خشوع و خضوع سے پوجتے دیکھا۔ الادریسی البیرونی کے تقریباً سو سال بعد ملتان آیا۔ اس وقت یہ مندر اور اس کا بت دوبارہ تعمیر کئے جا چکے تھے۔ الادریسی لکھتا ہے کہ مندر کی عمارت قبہ نما ہے (پہلی ہی کی طرح) جو اندر سے طلائی ہے اور قبہ اور دروازے بہت مضبوط بنائے گئے ہیں۔ بت بہ شکل انسان ہے، جس کے چار رخ ہیں۔ اینٹوں اور گچکاری کی مسند پر براجمان ہے۔ کہنی سے نا چے کے بازو چار معلوم دیتے ہیں۔

زکریا القزوینی 1263ء:۔ زکریا القزوینی تیرہویں صدی عیسوی کا عرب نژاد سیاح ہے وہ ایران، عراق، شام اور برصغیر پاک و ہند بھی گھوما پھرا۔ اس نے دو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ایک کا نام ''عجائب المخلوقات وغرائب الوجودات'' ہے۔ دوسری کا نام ''آثار البلاد و اخبار العباد'' ہے۔ اس عجائب البلاد بھی کہتے ہیں اس کی حیثیت تاریخی جغرافیہ کی ہے۔ عموماً قزوینی کو ازمنہ وسطیٰ کا ہیروڈوٹس قرار دیا جاتا ہے۔ قزوینی 1263ء میں ملتان آیا تھا۔ اس نے اپنی مندرجہ بالا کتاب میں ملتان کے مشہور مندر کا ذکر کیا ہے اور ملتان کو اہل ہنود کے مکہ سے تشبیہ دی ہے۔

آخری بار ملتان کے اس مندر کو جس سیاح نے دیکھا وہ فرانسیسی سیاح تھوینو Thevinot ہے۔ وہ 1666ء میں ملتان آیا تھا۔ اس نے بھی اس بت کو سرخ چمڑے ہی میں ملبوس پایا۔ اس کے مطابق اس سیاہ رو بت کی

آنکھیں دو بڑے موتیوں سے بنائی گئی تھیں۔ اس کے بعد اورنگزیب عالمگیر بادشاہ غازی نے اسے مسمار کرا دیا۔ ہندو دیو مالا کے مطابق سنبہ (جو بھگت پرہلاد کا مخالف تھا) جو کرشنا کا بیٹا تھا جب راجہ بانا کی شکست کے بعد وہ حاکم ملتان بنا تو اسے برص کا مرض لاحق ہو گیا۔ اطباء نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اگر سورج کی پرستش کرے تو صحت یاب ہو جائے گا۔ چنانچہ سنبہ درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ کر جسے متردان کہا گیا ہے، سورج کی پرستش کرنے لگا۔ اسے برص کے مرض سے نجات ملی تو اس نے شکرانے کے طور پر ادیتہ (سورج) دیوتا کا مندر ملتان میں تعمیر کروایا تھا۔ جس میں طلائی مورتی رکھی گئی تھی۔ محمد بن قاسم کو ایک برہمن کی اطلاع پر اسی مندر سے ایک بڑا خزانہ ملا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق تیرہ ہزار تین سو بیس (13320) من سونے اور خاک طلا پر مشتمل تھا۔ ابن حوقل، اصطخری اور دیگر عرب سیاحوں نے اس مندر کو شہر کی گنجان آبادی میں اہل حرفہ کے محلے کے قریب بتایا ہے۔ جنرل کنگھم نے 1853ء میں اس مندر کے اجڑے ہوئے آثار دیکھے اور عرب سیاحوں کے بتائے گئے۔ مقام کی توثیق کے بعد میں جنرل کنگھم کے قلعہ ملتان پر جو کھدائی کی اس میں 500ء کے ایسے سکے بھی دریافت ہوئے جن میں آدیتہ دیوتا کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جس سے آدیتہ استھان کی تصدیق ہوئی۔

ابن بطوطہ 1334ء:۔ ابن بطوطہ کو مورخین نے ''سیاحوں کا شہزادہ'' Prince of the Travellers کہا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ملتان کے متعلق مفصل ذکر کیا ہے۔ ابن بطوطہ جب اُچ سے ملتان آیا تو اسے دس کوس کے فاصلے پر ایک دریا عبور کرنا پڑا دریا کے کنارے دریا عبور کرنے والوں کی جامہ تلاشی بھی ہوتی تھی۔ اور ان سے محصول بھی لیا جاتا تھا۔ ابن بطوطہ کو اس طرح تلاشی لیے جانے پر بڑی تشویش ہوئی تھی مگر حاکم ملتان کے خصوصی حکم پر اس کی تلاشی نہ لی گئی۔ ابن بطوطہ نے حاکم ملتان کو ایک غلام اور ایک گھوڑا اور خشک میوہ جات تحفے میں پیش کئے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ چونکہ ملتان میں خشک میوہ جات نہیں ہوتے اس لیے ملتانی لوگ اس تحفے کو بہت پسند کرتے ہیں۔

ابن بطوطہ نے دو ماہ تک ملتان میں قیام کیا۔ اس دوران اس کی رہائش حضرت شاہ رکن عالم کے مہمان خانے میں رہی۔ اس نے ملتان کے آداب و طعام، دستر خوان کی وسعت اور رنگارنگ کھانوں کی بڑی دلچسپ تفصیل پیش کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ملتانی اس ترتیب سے کھانا لاتے کہ پہلے روٹیاں آتیں جو نہایت پتلی چپاتیاں ہوتی ہیں، سالم بکری کو یہ لوگ بھون لیتے اور اس کے پانچ یا چھ ٹکڑے بنا کر ایک ایک آدمی کے آگے رکھتے ہیں۔ پھر گھی میں تلی ہوئی روٹیاں (پراٹھے) آتے جن میں حلوہ صابونی بھرا ہوتا۔ ہر ٹکیہ کے ساتھ ایک میٹھی روٹی بھی رکھی جاتی جو خشتی کہلاتی۔ یہ آٹے شکر اور گھی سے بنائی جاتی ہے۔ سموسوں میں قیمہ بادام، جائفل، پستہ اور پیاز مع گرم مصالحہ ڈال کر پتلی چپاتیوں میں لپیٹ کر گھی میں تلا جاتا ہے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے سنہری اور پیلے برتنوں میں مصری اور شربت گلاب پیا جاتا ہے۔ پھر صاحب بسم اللہ کہتا ہے تو کھانا شروع کر دیا جاتا ہے۔ کھانے کے ختم ہونے پر فقاع

کے پیالے آتے ہیں جنہیں نوش کرنے کے بعد مہمانوں کو پان، چھالیہ پیش کی جاتی ہیں۔ پھر تعظیم کے ساتھ دستر خوان اٹھا جاتا ہے۔

ابن بطوطہ نے ملتان میں گھڑ سواری اور تیر اندازی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کے مطابق اگر کوئی اپنی گھڑ سواری کا کمال دکھانا چاہے تو اپنا گھوڑا دوڑا کر ایک چھوٹے سے نقارے پر ضرب لگاتا ہے پھر ایک چھوٹی سی دیوار پر لٹکی ہوئی انگوٹھی کو نیزے کی انی میں پرو کر انگوٹھی لے جاتا ہے۔ جس قدر کمال کوئی ان کھیلوں میں دکھاتا ہے وہ اس قدر اپنے عہدے میں ترقی پاتا ہے۔

یورپین سیاحوں کی آمد اور ان کے اثرات

ازمنہ قدیم اور ازمنہ وسطیٰ کے چینی اور عرب سیاحوں کے دنیا گھومنے کے بعد یورپی اہل علم نے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا تو وہ زندگی کے ہر شعبہ میں تحقیق کرنے نکلے۔ یورپی سیاح معلوم دنیا کے اکتشافی سفروں پر نکلے۔ مارکو پولو پہلا مغربی سیاح تھا جس نے دنیائے مشرق میں اپنے سفر کی روئیداد اپنے سفر نامے میں قلمبند کی۔ برصغیر پاک و ہند شروع ہی سے مغربی سیاحوں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے اور بہت سے یورپی ہندوستان کی سیاحت پر آئے۔ ان یورپی سیاحوں میں سے برصغیر کے شمالی حصوں کی سیاحت پر نکلے وہ ملتان ضرور آئے۔ ذیل میں ہم چند یورپی سیاحوں کے سفر ناموں میں سے ملتان کے بارے میں ان کے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی سیاحت پر جو اولین سیاح آئے وہ مغل شہنشاہ اکبر کے زمانے میں آئے تھے ان کے نام مورخین نے یہ دیئے ہیں۔

رالف فچ Ralph Fitch 1583-91ء

جان میلڈن ہال John Milden Hall 1599-1606ء

ولیم ہاکنس William Hawkins 1608-1613ء

ولیم فنچ William Finch 1608-1611ء

نکولاس ودانگٹن Nicholas Withington 1612-1616ء

تھامس کوریات Thomas Coryat 1612-1617ء

ایڈورڈ ٹیری Edward Terry 1616-1619ء

ان اولین مغربی سیاحوں میں ولیم ہاکنس، ولیم فنچ، تامس کوریات اور ایڈورڈ ٹیری نے ملتان کا ذکر کیا اگر چہ مفصل نہیں ہے تاہم اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ولیم فنچ نے ملتان کو ایک ترقی یافتہ شہر اور اس کے مقابلے لاہور کو ایک چھوٹی سی بستی لکھا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ اپنی کتاب ''کشف المجوب'' لکھتے ہیں کہ ملتان کے مضافات میں لاہور ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ تھامس کوریات ملتان ''مولتان'' کے نام سے لکھتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد دو روز کے سفر کے بعد ملتان پہنچا۔ ملتان میں

''کافر'' کہا گیا جس پر وہ بے حد برہم ہوا اور اس نے ملتانیوں کے ایک ہجوم کے سامنے اطالوی زبان میں تقریر کی مگر شاید ایک سردار کے سوا اسے کوئی نہ سمجھ سکا۔ اس تقریر پر جوابی حملہ کرتے ہوئے کوریات نے اسلام، بانی اسلام اور قرآن کریم کے بارے میں گستاخانہ انداز اختیار کیا مگر اسے کچھ نہ کہا گیا شاید اس وجہ سے کہ کوئی اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا مگر وہ خود اس کی توضیح یہ پیش کرتا ہے کہ مغل سلطنت میں عیسائیوں کو آزادی سے بولنے کی اجازت تھی۔ ایڈورڈ ٹیری نے بھی ملتان کو اس عہد کا عظیم شہر قرار دیا ہے اور اس کی سرحدیں کابل وقندھار سے ملتی ہوئی بتائی ہیں۔

26 مئی 1614ء کو دو یورپی سیاح مسٹر گروتھ اور مسٹر سٹیل ملتان پہنچے۔ ان دونوں نے لکھا ہے کہ ملتان ایک قدیم شہر ہے اور دریائے سندھ سے کوئی تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ (انہوں نے غلطی سے دریائے چناب کو دریائے سندھ سمجھا) ان کے مطابق برصغیر کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہاں کے لوگ غریب تھے۔ اسی وجہ سے کارواں اس شہر میں کئی کئی روز قیام کرتے جن سے یہاں کے عوام کو مالی فائدہ پہنچتا تھا۔

ٹیورنئیر Tavernier 1641-1668ء

معروف فرانسیسی سیاح جین بیٹائسٹ ٹیورنیئر عہد شاہجہانی عالمگیری میں برصغیر آیا۔ اس نے 1641ء سے 1668ء تک جنوبی ایشیاء کی سیاحت کی۔ وہ قندھار اور آگرہ جاتے ہوئے ملتان پہنچا۔ اس نے قندھار سے کابل کی بجائے ملتان کے راستے دوآبہ گنگا جمنا پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس زمانے میں یہ راستہ انتہائی دشوار گزار تھا اور اس راستے میں کئی کئی روز تک پانی میسر نہیں آتا تھا۔ وہ ملتان کے بارے میں لکھتا ہے کہ ملتان ایسا شہر ہے جو نیلی ٹائیلوں اور کپڑا بننے کی وجہ سے مشہور ہے۔ ملتانی کپڑا دریائے سندھ کا دہانہ پایاب ہونے سے پہلے دریائی رستہ سے ٹھٹھہ لے جایا جاتا تھا۔ اب جبکہ دریائی راستہ بحری جہازوں کے لیے مسدود ہو چکا ہے اب یہ کپڑا لاہور کی بنی ہوئی اشیاء کے ساتھ آگرہ اور سورت بھجوایا جاتا ہے خشکی کے راستے مال کی نقل وحمل مہنگی پڑنے کی وجہ سے بہت کم تاجر ملتان یا لاہور میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ مندے کا شکار ہونے کی وجہ سے بہت سے ہنرمند کپڑا بنانے کا کام چھوڑنے پر مجبور ہو چکے ہیں اس کے لیے ان صوبوں میں شاہی مالیہ بہت کم اکٹھا ہوتا ہے ملتان ایسا شہر ہے جہاں ایران سے تجارت کرنے والے بنئے بڑی تعداد میں آتے ہیں ان کے تجارت کرنے کا انداز یہودیوں سے ملتا جلتا ہے بلکہ یہ سود خوری میں یہودیوں سے بھی بڑھ گئے ہیں ہندو ہونے کے باوجود ان کا دھرم ایک خاص قانون کے تحت انہیں مخصوص ایام میں پرندوں کا گوشت کھانے کی اجازت دیتا ہے اس کے علاوہ ان لوگوں میں دو تین بھائی مل کر ایک عورت کو بحیثیت بیوی رکھتے ہیں اس مشترکہ بیوی سے پیدا ہونے والی اولاد بڑے بھائی سے منسوب کی جاتی ہے۔

تھیونو Thevnot

1666ء میں ایک مشہور فرانسیسی سیاح تھوینو Thevnot ملتان آیا اس کا سفرنامہ 1687ء میں چھپا تھا یہ اورنگزیب کا عہد تھا اور وہ خود ان دنوں دکن میں شیوا جی کے خلاف کارروائیوں میں مصروف تھا ملتان کے بارے

میں تھیونو رقم طراز ہے ....

ملتان کے علاقے کو کئی دریا سیراب کر کے زرخیز بناتے ہیں اس صوبے کا مرکزی شہر ملتان کہلاتا ہے اور تجارت کا اہم مرکز رہا ہے دریائے سندھ کے نزدیک ہے لیکن دریائے سندھ کے نایاب ہو جانے کی وجہ سے آج کل تجارتی سرگرمیاں کم ہوگئی ہیں کیونکہ خشکی کے راستے تجارتی اسباب کی ترسیل مہنگی پڑتی ہے تاہم یہ صوبہ کپاس بکثرت پیدا کرتا ہے جس سے بڑی تعداد میں کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں شکر، افیون، گندھک اور اونٹوں کی بہتات ہے جو غزنی کے راستے ایران بھیجے جاتے ہیں۔ اب تک اسباب تجارت دریائے سندھ کے راستے ٹھٹھ تک جاتا تھا جہاں کئی ملکوں سے آنے والے تاجر اسے خرید کر لے جاتے تھے آج کل اسباب تجارت سورت لے جانا پڑتا ہے۔

ملتان کو کئی جغرافیہ دانوں نے سندھ کا حصہ بتایا ہے اگرچہ یہ خود ایک مکمل صوبہ ہے۔ ملتان کے فوجی آفیسرز مسلّم ہیں یہ شہر پورے ہندوستان میں اپنی نفیس ترین کمانوں کی وجہ سے مشہور ہے اگرچہ آبادی میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہے مگر یہاں بہت سے بنیئے بھی رہتے ہیں جو یہودیوں جیسی تجارت کرتے ہیں یہ بنیئے یہودیوں سے زیادہ چالاک ہیں وہ ایک کھوٹا پیسہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان ملتانی تاجروں کا شمار ہندوستان کے امیر ترین طبقے میں ہوتا ہے میں نے انہیں ہر جگہ ایسا ہی پایا ہے۔ یہ لوگ عام طور پر اپنی بیویوں سے حاسدانہ رویہ رکھتے ہیں یہ خواتین اپنے مردوں کی نسبت کھلی رنگت رکھتی ہیں مگر پھر بھی گندم گوں ہیں۔ یہ روغن وغازہ کی بہت شوقین ہیں ملتان میں اندوؤں کی ایک اور ذات کھتری بھی رہتی ہے یہ شہر ان کا اصلی وطن ہے اور وہ یہیں سے ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پھیلے ہیں۔ یہاں ہندوؤں کا ایک مشہور بت اور ایک قدیم مندر ہے جس کی زیارت کے لیے ہندو دیگر مقامات سے یہاں آتے ہیں مجھے اس بت کا نام معلوم نہیں ہو سکا جس کی اس مندر میں پوجا ہوتی ہے اس کا چہرہ سیاہ ہے اور یہ سرخ رنگ کے چمڑے کے لباس میں ملبوس ہے اس کی آنکھوں میں دو بڑے لعل نصب ہیں ملتان کا گورنر یا امیر اس مندر کے تمام چڑھاوے وصول کرتا ہے مختصراً ملتان ایک چھوٹا سا دارالحکومت ہے مگر مضبوط ترین اور خوبصورت تر بھی مغل اس صوبے سے سالانہ ایک کروڑ چھتر لاکھ زرنقد وصول کرتے ہیں۔

مونسٹیورٹ الفسٹن Mounsttuart Elhphinston

مشہور انگریز سفارت کار الفسٹن 11 دسمبر 1808ء کو کابل کے مشن پر جاتے ہوئے ملتان میں ٹھہرا۔ اس وقت نواب سرفراز خان صاحب نے انگریز سفارت کار سے ملاقات تو کی مگر اسے شہر کے اندر آنے سے روک دیا اور اسے شہر سے باہر ہی ٹھہرایا گیا۔

الفسٹن نے اپنے اس سفر کی روئیداد 1842ء میں لندن سے شائع کی۔ اپنے اس سفرنامے میں الفسٹن ملتان کے بارے میں لکھتا ہے، دریائے چناب کے بائیں کنارے پر تقریباً 4 میل کے فاصلے پر شہر ملتان واقع ہے جو

تقریباً ساڑھے چار مربع میل پر محیط ہے۔ شہر کے گرد چالیس سے پچاس فٹ بلند ایک فصیل بنی ہوئی ہے جس میں مختلف فاصلے پر برج بنے ہوئے ہیں۔ ایک اونچے ٹیلے پر شہر کا ایک قلعہ واقع ہے۔ جس میں کئی عظیم الشان مقابر ہیں۔ ان میں سے دو کے گنبد بڑے شاندار ہیں اور ملتان کی نیلی روغنی (کاشی کاری) ٹائیلوں سے سجائے گئے ہیں۔ یہ مقابر شہر سے کافی فاصلے سے نظر آنے لگتے ہیں۔ ملتان اپنے ریشمی پارچہ جات کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ یہاں ایک قسم کے قالین بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ جو اگرچہ ایرانی قالینوں کے ہم پلہ نہیں ہیں مگر مشہور ہیں۔ شہر مضافات بہت خوش منظر اور زرخیز ہیں۔ آبپاشی عموماً کنوؤں سے کی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ بہاولپور کے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں جو رقبے زیر کاشت ہیں وہ ابھی انحطاط کا شکار ہیں۔ پیداوار میں گندم، جو، کپاس اور سبزیاں شامل ہیں۔ درختوں میں نیم، کھجور اور پیپل اہم ہیں۔ اس علاقے میں ہر قسم کے شکار کی افراط ہے۔ ہمارے قیام کے دوران موسم بہت خوشگوار تھا۔ رات کو اوس پڑتی تھی مگر دن قدرے گرم ہے۔ اوسط درجہ حرارت 28o ہے۔

چارلس میسن Charles Mason

چارلس میسن ایک اور انگریز سیاح ہے۔ جس کا سفرنامہ 1842ء میں لندن سے شائع ہوا۔ Narative of various Journeys in Balochistan, Afghanistan & The Punjab۔ یہ سفرنامہ آکسفورڈ یونیورسٹی پیرس نے 1974ء میں دوبارہ شائع کیا تھا۔ چارلس میسن 1827ء میں اپنی سیاحت کے دوران دو مرتبہ ملتان آیا۔ اس نے شہر اور مضافات کے بارے میں بڑی دلچسپ تفصیلات اپنے سفرنامے میں درج کی ہیں۔ دور سے دیکھنے میں ملتان شہر کافی بڑا شہر معلوم ہوتا ہے مگر قریب سے دیکھنے میں یہ تین میل پر محیط ایک فصیل بند شہر ہے۔ اس کے بازار طوالت میں بڑے بڑے ہیں مگر تکلیف دہ حد تک تنگ ہیں۔ یہاں وہ کاروباری گہما گہمی بھی نہیں جس کی توقع ایک بڑے شہر کے تجارتی مراکز سے ہوتی ہے۔ یہاں کا قلعہ اگرچہ یورپی انجینئروں کی طرز پر تعمیر نہیں کیا گیا مگر مضبوط ہے اور توجہ اور سلیقے سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے ایک خندق بھی کھودی گئی ہے۔ اور دروازے پر قلعہ کے اندر جانے کے لیے ایک حفاظتی کھچاؤ پل بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ 1818ء میں سکھوں کے قبضے کے بعد سے ملتان کی تجارت میں کمی آئی ہے۔ مگر اس کے بازاروں میں ہر قسم کی اشیاء دستیاب ہیں۔ اور روپے کا لین دین کرنے والے ساہوکاروں اور ریشمی سوتی کپڑا بننے والے بے شمار کاریگر موجود ہیں۔ ملتان کی شالیں اور لنگیاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور یہاں کی کڑھائی بھی مشہور ہے۔ افغانستان اور سندھ کے ساتھ تجارتی روابط قائم ہیں۔

میسن نے ملتان کی مساجد اور مقابر کا ذکر بھی خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک روایت کے مطابق ملتان کی سرزمین پر ایک لاکھ ایک سو سے زائد ولی اللہ مدفون ہیں۔ اس لیے وہ ملتان کو ولیوں کا شہر قرار دیتا ہے۔ ملتان کے باغات کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہاں پھلدار باغات کی بہتات ہے جن میں آم، مالٹا، لیموں، انار

اور سنگترے کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ کھجور اور سبزیاں بھی بڑی تعداد میں پیدا ہوتی ہیں۔ دریائے راوی کے راستہ بدلنے سے شہر بڑھا ہے۔ اگرچہ اب دریائے راوی شہر سے تین میل کے فاصلے پر بہتا ہے مگر طغیانی کے موسم میں اس کا پانی شہر تک آ جاتا ہے۔ میسن نے لکھا ہے کہ اندازاً اس شہر میں 8 ہزار سے نو ہزار تک مکانات ہیں اور شہر کی آبادی چالیس سے پینتالیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ آج کل ایک برہمن ''ساون مل'' راجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے ملتان کا گورنر یا صوبیدار ہے۔ وہ بڑا انصاف پرور اور دانشمند ہے۔ صوبہ ملتان دریائے ستجل سے دریائے سندھ تک کے علاقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس صوبے میں سکھوں کی فوج کی کمان گندر سنگھ نامی افسر کے پاس ہے۔ ایک جرمن سیاح بیرن چارلس ہیوگل Baron Charles Hugel (1835-30ء) میں برصغیر کی سیاحت پر آیا اور اس نے پنجاب اور کشمیر کی سیاحت کی۔ اپنے تاثرات کو اس نے ایک کتاب کی شکل میں جرمن زبان میں قلمبند کیا۔ جسے بعد ازاں ایک انگریز میجر ٹی۔ بی جروس T.B Jerivis نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جو 1844ء میں شائع ہوا۔ چارلس ہیوگل نے اپنے اس سفرنامے کو ایک تاریخی جغرافیہ کی شکل دی جس میں نواب مظفر خان اور سکھوں کے درمیان ہونے والی جنگ اور ان کی شہادت کے واقعات کو بڑی تفصیل سے درج کیا ہے۔

ایک انگریز سیاح لیفٹیننٹ الیگزینڈر برن

15 جون 1831ء میں ملتان کی سیاحت پر آیا اور اس نے تقریباً 6 دن یہاں قیام کیا۔ اس کا سفرنامہ Travels in Bokhara کے نام سے مشہور ہے۔ جو 1834ء کی شام کو دور سے دھندلکوں میں لپٹے ہوئے ملتان کے مقابر کے گنبد نظر آنے لگے۔ اسی شام وہ حضوری باغ میں اترا جو اس وقت شہر سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اس باغ کے گرد کچی دیوار تھی اور اس کے راستے کشادہ، برگ دار اور پھل دار درخت ہر طرف سایہ کناں تھے۔ مقامی حکام نے برن کا استقبال بڑے شاندار طریقے سے کیا اور ایک بنگلے میں ٹھہرایا۔ پچیس سو روپوں کی ایک تھیلی اور مٹھائی سے بھرے ٹوکرے اور بے شمار پھل اس کی نذر کیے۔ برن کھلے دل سے ملتان کے لوگوں کی شائستہ اطواری اور مہمان نوازی کا اعتراف کرتا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ: ملتان اس وقت تین میل کے رقبے پر پھیلا وہا ہے۔ شہر کے گرد ایک خستہ حال فصیل ہے اور شمالی سمت میں ایک مضبوط قلعہ۔ شہر کی آبادی تقریبا 60 ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ جس میں ایک تہائی ہندو اور باقی مسلمان ہیں۔ مکانات پختہ اینٹوں سے تعمیر کیے گئے ہیں جن کی چھتیں چوکور ہیں۔ ان میں بعض مکانات چھ منزلہ ہیں جو تنگ گلیوں کو اپنی بلندی سے مزید تاریک بنا رہے ہیں۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر پارچہ بافی اور رنگائی کا کام کرتے ہیں۔ یہاں کے ریشی پارچہ جات میں ''کھیس'' زیادہ مشہور ہیں جو 20 روپے سے 120 روپیہ فی کس کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضے کے بعد اس صنعت میں ترقی ہوئی ہے۔ کیونکہ مہاراجہ نے اپنے دربار میں ان پارچہ جات کے علاوہ کسی اور کپڑے کے استعمال کی اجازت نہیں دی۔ اس طرح ان کے

استعمال میں بے جا اضافہ ہو گیا۔ یہ ملتانی پارچہ جات خراسان سے ہندوستان تک برآمد کئے جاتے ہیں۔ لیفٹیننٹ برن نے ملتان کی تجارت کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ شکار پور کے 20 صراف یہاں روپے کا لین دین کرتے ہیں۔ ملتان کے مقابر کے ساتھ ساتھ اس نے پرہلادمندر اور قلعے کی تفصیلات بطور خاص درج کی ہیں۔ وہ ملتان کو قدیم ترین شہر قرار دیتا ہے اور اس نے ملتان کی قدامت پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ملتان کی آب و ہوا اور موسم کے بارے میں بھی وہ لکھتا ہے کہ ملتان کا موسم سندھ کے علاقوں سے مختلف ہے۔ اگرچہ بوندا باندی اور بارش سال کے ہر حصے میں ہوتی ہے مگر یہاں گرد و غبار کے طوفان ناقابل برداشت ہیں جو کوہ سلیمان کی طرف سے آتے ہیں برن نے مشہور زمانہ شعر

چہار چیز است تحفہ ملتان
گرد و گرما گدا و گورستان

کی حقیقت کو تسلیم کیا اور اس بارے میں اپنے ذاتی تجربات درج کئے ہیں۔

مسٹر ونج

6 اپریل سے 16 اپریل تک ایک اور یورپی سیاح مسٹر ونج Mr. Vinge نے ملتان کی سیاحت کی۔ اسے ملتان کے باغ بیگی میں ٹھہرایا گیا تھا جو آج کے سٹی ریلوے سٹیشن کے بالکل نزدیک تھا۔ وہ لکھتا ہے: میری ملتان آمد کے بعد مجھے یہاں ایک بارہ دری میں ٹھہرایا گیا جو باغ بیگی میں واقع ہے۔ یہ باغ ملتان کے گورنر نواب سرفراز خان سدوزئی نے لگوایا تھا۔ اس باغ میں پھل دار درختوں کے ساتھ ساتھ درختوں کے گھنے سائے ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ باغ میں فوارے بھی لگائے گئے ہیں۔ ملتان کے مضافات میں بھی بہت سے باغات ہیں جو کسی نہ کسی مسلم ولی کے مزار کے گرد لگائے گئے ہیں۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ حضوری باغ ملتان میں اس نے ایک قد آور درخت دیکھا جسے مولسری کا درخت کہا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کی قلم مکہ سے لائی گئی تھی۔ مگر یہ سیاح روایت پر یقین نہیں کرتا۔ ملتان کے مشہور مقابر کے فن تعمیر پر ونج نے تفصیلاً لکھا ہے۔ اس کے علاوہ قعلہ کی دیگر عمارات کی تفصیل بھی درج کی ہے۔ ملتان کے آخری مسلمان حکمران نواب مظفر خان کے بارے میں لکھتا ہے کہ بہادر حکمارن بہاء الحق کی خانقاہ میں محو خواب ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ نواب صاحب کی شہادت کے بعد رنجیت سنگھ ملتان آیا تو اس نے نواب صاحب کی قبر پر کھڑے ہو کر ویسی ہی تقریر کی جیسی نپولین بونا پارٹ نے جرمنی کے بادشاہ فریڈرک کے مقبرے پر کی تھی۔ مسٹر ونج لکھتا ہے کہ اس نے ملتان کے گورنر ساون مل سے بنفس نفیس ملاقات کی تھی اور اس نے ونج صاحب کو خلعت فاخرہ سے نوازا تھا۔ بقول ونج مہاراجہ رنجیت کے افسروں میں ساون مل جیسا کوئی اور قابل شخص نہیں تھا۔ ملتان کے ریشمی پارچہ جات کے بارے میں بھی اس نے لکھا ہے۔

موہن لال کاشمیری

انیسویں صدی کا ایک ہندو سیاح موہن لال کاشمیری: انیسویں صدی کے ایک ہندو سیاح موہن لال کاشمیری نے اپنے دو سالہ قیام کابل اور اس کے سفر کی تفصیل اپنے سفر نامے میں درج کی تھی جسے ہری رام گپتا نے مرتب کر کے 1943ء میں لاہور سے شائع کیا تھا۔ موہن لال ملتان آیا اور اس نے انیسویں صدی کے ملتان کے بارے میں بڑے دلچسپ مشاہدات سپرد قلم کئے۔ 16 دسمبر 1833ء کو وہ ملتان پہنچا۔ شہر سے دو میل باہر اسے روک دیا گیا۔ اس وقت ملتان پر گورنر ساون مل کی حکومت تھی۔ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ دیوان ساون مل ان دنوں دورے پر گیا ہوا تھا۔ اس لیے کہیں جا کر 20 دسمبر کو اسے داخلے کی اجازت ملی۔ وہ بیرون دولت گیٹ ایک مکان میں ٹھہرا جہاں وہ 31 جنوری 1836ء تک رہائش پذیر رہا۔ اس نے لکھا کہ ملتان میں نیل کی کاشت کثرت سے ہوتی ہے۔ ریشمی پارچہ جات کی تیاری کے لیے شہر میں 150 کے قریب کارخانے ہیں جن میں سالانہ چالیس ہزار گز ریشمی کپڑا اور دو لاکھ گز ریشم اور سوت ملا کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔ قیام ملتان کے دوران موہن لال کے تعلقات ملتان کے لوہانی اور شکار پوری تاجروں سے اتنے گہرے ہو گئے کہ انہیں موہن لال کے اعزاز میں 30 جنوری کی رات طعام و رقص کی ایک محفل ترتیب دی جس میں ملتان کی رقصاؤں نے مہمانوں کا دل لبھایا۔ موہن لال کے ملتان کی یہ رقاصائیں دہلی کی رقاصاؤں سے کہیں زیادہ محنت کرتیں ان کو دہلی والیوں کے مقابلے میں معاوضہ صرف تیسرا حصہ ملتا ہے لیکن وہ اپنی ان دارالحکومت والی بہنوں سے حرکات و سکنات، لباس، زیوارت میں بھی کم درجہ کی ہیں۔

(تاریخ وتمدن ملتان - اخلاق احمد قادری)





قلعہ کہنہ کی داستان

ملتان میں کہنے کو تو قلعے ہیں۔ ایک قلعہ نو کہلاتا ہے جس کا صرف ریلوے سٹیشن ہے جو ملتان سے جنوب میں ہے اور اس کا نام بھی ریلوے ٹائم ٹیبل میں موجود ہے۔ دوسرا قلعہ کہنہ ہے اس کا کسی ٹائم ٹیبل میں اندراج نہیں ہے۔ اگر ملتان کے ریلوے سٹیشن یا ائر پورٹ پر آپ اتریں اور کسی سواری میں بیٹھ کر کہیں کہ آپ کو قلعہ پر جانا ہے تو وہ آپ کو قلعہ کہنہ پر لے آئے گا۔ مگر ریل گاڑی کے علاوہ کوئی سواری اتنی آسانی آپ کو قلعہ نو پر نہیں لا سکے گی۔

قلعہ کہنہ جو جگہ کہلاتی ہے وہاں قرنوں پہلے تو ضرور قلعہ ہو گا۔ مگر اب تو خشت و خاک کے ایک تودے کو جو ساٹھ ستر فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ قلعہ کہنہ کہتے ہیں۔ یہ قلعہ مذہبی، روحانی، ثقافتی اور تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس قلعہ کی حالت ایسی تھی کہ دن کے وقت بھی جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ ہر سُو ویرانہ ہوتا تھا۔ اور وحشت برستی تھی۔ صرف بزرگان سلف کے مقابر کے گرد قدرے چہل پہل رہتی تھی۔ اچھے بھلے لوگ یہاں جاتے ہوئے کتراتے تھے۔ راقم الحروف نے یہاں ایسے ایسے کھڈ اور غار دیکھے جہاں جانوروں کے علاوہ انسانی ہڈیاں اور کھوپڑیوں کے ٹکڑے ان کے طرفین میں جھانکتے رہتے تھے۔ جو سیر کرنے والوں کے لیے وحشت، دہشت اور ہیبت کے لیے کافی تھیں۔ قلعہ کے اطراف و جوانب میں چونکہ بازار نہ تھے۔ لہذا ہر جگہ سے تقریباً اوپر چڑھنے کے لیے کچے راستے لوگوں کی آمد و رفت نے بنا دیئے تھے۔

میونسپل کمیٹی خاک اور خس و خاشاک کے علاوہ، مردہ جانور بھی یہیں ڈلواتی تھی۔ جو چیلوں اور کوؤں کے مستقل طعام و قیام کا سبب بنتے تھے۔ اب تو حالت ہی اور ہے۔ بلدیہ ملتان نے اسے گل و گلزار بنا دیا۔ رہی سہی کسر ملتان کے ترقیاتی ادارے نے پوری کر دی۔ قلعہ کو مختلف سطحوں میں تقسیم کر کے ان میں کشادہ کشادہ، گلشن، قطعات، پارک اور درخت، گھاس کے میدان، پھولدار خوشنما تختے بچوں کی تفریح کے سامان نہریں، حوض، فوارے ایستادہ کر کے اس کو پُر بہار بنا دیا سٹیڈیم اور کھیل کے میدانوں نے اور بھی رونقیں دوبالا کر دیں۔ یہ سب کچھ اب قاسم باغ کہلاتا ہے۔ اتنے سارے کام ایک دن میں نہیں ہوئے۔ یہ ایک مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے۔ پہلے پہلے اس کام کی ابتداء 1949ء میں ہوئی جب کہ ناظم بلدیہ ملتان نے ہمت کر کے اس طرف دلچسپی سے توجہ دی اور

ایک پتھر یادگار کے طور پر دروازے پر لگا دیا تا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔

بسم اللہ

فاتح سندھ و ملتان غازی محمد بن قاسم

کی یادگار

قاسم باغ

نومبر 1949ء میں سلسلہ تعمیر شروع ہوا

محمد فاروق۔ ناظم بلدیہ۔ ملتان

قاسم باغ درحقیقت خوبصورت باغ ہونے کے علاوہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ جو سترہ سالہ مجاہد اعظم محمد بن قاسم کی یاد میں رکھا گیا تھا۔ جب آپ لوہاری دروازے کی جانب سے قلعہ پر چڑھیں تو ایک خوبصورت بڑا محرابی داخلی دروازہ آتا ہے جس کے عقب میں انگریزوں کے زمانے کی پانی کی ٹینکی ہے۔ جب دروازہ اور قلعہ پر سڑکیں اور قطعات مکمل ہو گئیں۔ تو محمد فاروق ناظم بلدیہ تبدیل ہو چکے تھے نئے ناظم آ چکے تھے انہوں نے سوچا چونکہ یہ تمام کام ان کے عہد زریں میں اختتام پذیر ہوا تو ان کا نام بھی منظر عام پر آنا چاہیے پس، انہوں نے فوراً ایک پتھر کی تختی پر یہ لکھوا کر لگوا دیا:

باب القاسم ہذا کی تعمیر

دسمبر 1953ء میں تکمیل کو پہنچی

سید منظور حسین۔ ناظم بلدیہ۔ ملتان

اگلے وقتوں کی بات ہے کہ قلعہ کی باقاعدہ فصیل ہوتی تھی۔ اب تو کب کی منہدم ہو چکی۔ لوہاری دروازے سے حسین آگاہی پر سڑک کے کنارے 1947ء میں ہم نے کہیں کہیں اس کے ٹکڑے دیکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہم قلعہ کی پختگی استواری اور بلندی کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ سچی بات ہے صاحب! کسی زمانے میں تو یہ بہت لاجواب مضبوط قلعہ ہوگا۔ اب بھی اگر فیتہ لے کر قلعہ کے گرد اگر ناپیں تو دو اڑھائی کلومیٹر تو بن ہی جائے گا۔ قلعہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اڑھائی ہزار سال پہلے سکندر اعظم نے بھی اس قلعہ پر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔ پھر سینکڑوں ... آور اس قلعہ کی سیڑھیوں میں اترتے چڑھتے رہے۔ یہ پرانی باتیں ہیں۔ مگر آج سے پونے دو سو سال قبل تک بھی قلعہ اپنی حسن و یگانگت میں یکتا تھا۔ اس کے چہار اطراف ایسی فصیل تھی جس پر کئی گھوڑ سوار برابر برابر دوڑ سکتے تھے۔ اور اس قلعہ پر چھبیس برج تھے۔

قلعہ سے دشمن پر گولہ باری تیر اندازی کرنے کے لیے تین دمدمے تھے۔ ایک دمدمہ تو بھی صحیح و سالم کھڑا ہے۔ شاید یہ اس وجہ سے بچ گیا ہو کہ تاریخ میں سب حملہ آوروں نے شمالی، جنوبی سمتوں سے قلعہ پر حملے کئے اور دمدمہ منہدم نہ ہو سکا جبکہ باقی دو دمدموں پر جو ... کے حملہ آوروں نے نہایت شد و مد سے فوجی یلغاریں کیں

ہم آپ کو بتا دیں کہ ان میں سے ایک ایسا ہی دمدمہ حسین آ گاہی کی جانب تھا جہاں اب مثالی مدرسہ ہے۔ دمدمہ اس کی چھت پر تھا اور دوسرا دمدمہ پرہلاد کے مندر اور حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ کے مشرقی جانب تھا جس کے کچھ آثار ابھی تک موجود ہیں۔ انگریز مورخین کی رائے میں ایسا زبردست، مستحکم قلعہ تمام برصغیر پاک و ہند میں نہ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ قلعہ بہت اونچے پشتہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں سے ارد گرد میلوں دور کا علاقہ نظر آتا تھا۔ اس قلعہ کے دو حصار تھے۔ جبکہ عام طور پر ایک ہی حصار کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس قلعہ پر ایک حصار جو اندرونی تھا پختہ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ اور 34 سے 40 فٹ تک بیرونی حصار سے اونچا تھا۔ بیرونی حصار مٹی کا ایک زبردست پشتہ تھا جسے ''دھورکوٹ'' کہتے تھے۔ یہ پشتہ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ چوڑا تھا۔ اور اس طرح یہ پشتہ اندرونی پختہ پشتے کو گولہ باری سے محفوظ رکھنے کے کام آتا تھا۔

قلعہ کی حفاظت کے لیے دھوڑکوٹ پشتے کے بنا بریں ایک گہری خندق بھی تھی جو قلعہ کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لیتی تھی۔ یہ سمجھ لیں کہ قلعہ کو چاروں طرف کی موجودہ سرکلر روڈ ہی اس زمانے میں خندق تھی جس میں ہر وقت پانی بھرا رہتا تھا۔ یہ پانی دریائے راوی سے ایک نہر کے ذریعے لایا جاتا تھا۔ اس قلعہ کا اندرونی محیط چھ ہزار چھ سو فٹ تھا۔ قلعہ کی اندرونی فصیل پر چھیالیس برج تھے۔ جس پر ہر وقت چاق و چوبند فوجی کھڑے پہرہ دیتے تھے۔ ان کے علاوہ چار داخلی دراوزے تھے پہلا دیہہ دروازہ جو مغربی سمت تھا۔ جو اب باب القاسم کہلاتا ہے۔ دوسرا خضری دروازہ تھا جو شمال کی جانب تھا۔ اور حضوری باغ سے یعنی وہ راستہ جو نو نمبر چونگی سے آتا ہے وہ سیدھا خضری دروازے میں آتا تھا۔ تیسرا سکھی یا سکی دروازہ۔ جو مشرق کی جانب تھا جو قلعہ سکہ کی جانب سے آتا تھا۔ جہاں اس وقت سیتل ماڑی کا موضع ہے۔ اور چوتھا دروازہ ریڑی دروازہ کہلاتا تھا جو موجودہ حسین آ گاہی کی طرف کھلتا تھا۔ یہاں غالباً ریڑھ یا ڈھلان تھی جس کی وجہ سے یہ ریڑی دروازہ موجود تھا۔ چاروں دروازے پر بڑے برج تھے۔ دراز ملں کے اندر ڈیوڑھیاں تھیں جن میں ملازمین رہائش رکھتے تھے۔

کچھ مورخین ان دروازوں کا اس طرح حال بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حسین آ گاہی کی جانب قلعہ میں داخل ہونے کے لیے ریڑی دروازہ سے اندرون شہر کا مستقف راستہ تھا جس کے ذریعہ قلعہ اور شہر میں عوام و خواص بحفاظت آ جاسکتے تھے۔ سکی دروازہ قلعہ سے ہٹ کر تھا۔ جو جگہ اب دولت دروازہ کہلاتی ہے۔ قلعہ یہاں تک آباد تھا۔ یہاں ایک راستہ قلعہ سکہ کو جاتا تھا جو دریائے بیاس کے کنارے آباد تھا۔ ہماری تحقیق کے مطابق واقعی دریائے بیاس ملتان سے چند میل پر بہتا تھا۔ موضع سیتل ماڑی کے قریب جو پرانی سڑک ملتان سے دنیا پور کو جاتی ہے اس پر قلعہ سکہ آباد تھا اب دریائے بیاس کی گزرگاہ جہانیاں سے بھی پرلی طرف ہوگئی ہے۔

خضری دروازہ۔ خانقاہ بہاء الدین زکریاؒ کے شمالی جانب تھا۔ محمد یوسف قریشی والی ملتان سے جب لنگاہوں نے دھوکہ دے کر حکومت ملتان چھین لی تو وہ اسی دروازے سے نکل کر فرار ہوئے تھے۔ مغربی سمت وہ دروازہ جو دمدمہ اور خانقاہ حضرت شاہ رکن عالمؒ کے درمیان تھا اسے دیہہ دروازہ یا دیول دروازہ کہتے تھے۔ سکندر اعظم اس ہی

دروازے کے شمالی جانب سے سیڑھی لگا کر قلعہ میں کودا تھا۔ جسے اب باب القاسم کہتے ہیں۔

اے بھائی! اس قلعہ کا تو ایک ایک چپہ اپنے دامن میں یادوں کے خزائن لیے ہوئے پڑا ہے۔ آج ہم آپ کو قلعہ کہنہ کی سیر کراتے ہیں۔ باب القاسم سے اندر داخل ہوں تو بائیں جانب خانقاہ حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ نظر آتی ہے۔ جو ملتان کی نشانی ہے۔ اس کو شہنشاہ غیاث الدین تغلق نے اپنے واسطے تعمیر کرایا تھا۔ پھر 1327ء میں اس کے بیٹے محمد تغلق نے حضرت شاہ رکن عالمؒ کی نذر کر دیا۔ جہاں آپ اب محو خواب ہیں۔ تھوڑی دور چل کر جہاں اب کیفے یا ریستوران بنا ہوا ہے۔ یہاں محمد بن قاسمؒ نے 93ھ میں ایک جامع مسجد کی بنیاد رکھی۔ جو اس کے بعد اس کے گورنر داؤد بن نصر نے 96ھ میں مکمل کرائی۔ قرامطی فرقہ کے لیڈر جلم بن شیبان نے جب ملتان کی حکومت سنبھالی تو 375ھ میں اس نے مسجد کو شہید کرا دیا۔ محمود غزنوی نے جب ملتان کا دورہ کیا اور قرامطیوں کو ختم کر دیا تو 395ھ میں پھر اس مسجد کو نئے سرے سے تعمیر و آباد کیا۔ 1818ء میں سکھوں نے جب ملتان پر اقتدار حاصل کر لیا تو اس مسجد کو بطور سٹور گولہ بارود استعمال کرتے رہے۔ 1848ء میں جب انگریزوں نے قلعہ پر گولہ باری کی تو یہ مسجد بھک سے اڑ گئی چونکہ اندر گولہ بارود ذخیرہ تھا۔ اس کے بعد کسی نے اس پر توجہ نہ دی اب تو بنیادوں کا بھی علم نہیں۔

جہاں قلعہ پر ایک مینار کھڑی اور ملتانیوں کی غیرت کو للکار رہی ہے یہ جگہ انگریزوں کی فتح ملتان کی یادگار ہے۔ یہاں کبھی ہندوؤں کا عظیم مندر تھا جسے قرامطیوں نے زمین بوس کر دیا تھا اور اس پر اپنی مسجد تعمیر کرائے تھی۔ جس کا رخ بجائے مکہ معظمہ کے بیت المقدس کی سمت تھا۔ قلعہ کے مشرقی کنارے پر پرہلاد مندر کے ہم دیوار حضرت غوث العالمین بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ ہے۔ خانقاہ کی اصل تعمیر تو ساتویں صدی ہجری میں ہوئی مگر 1848ء کی فرنگیوں کی گولہ باری سے منہدم ہوگئی تھی جس کے بعد وہ دوبارہ تعمیر کی گئی۔

1818ء تک قلعہ کے اوپر محلات و عمارات کی ترتیب اس طرح تھی کہ حضرت غوث العالمین حضرت بہاء الدین اور حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کے مقبروں کے درمیا محلہ شیخانہ تھا۔ جس میں قریشی خاندان کے اہل ثروت کے مکانات و عمارات تھیں۔ زکریاؒ یونیورسٹی جس میں بہاءیہ مدرسہ شامل تھا۔ غوث العالمین کے مقبرے کے جنوب میں واقع تھی۔ جو ایک مکمل کیمپس کی شکل میں تھا جس میں درسگاہوں کی عمارات، دار الاقامہ، مہمان خانہ، اور عالیشان جامع مسجد موجود تھیں۔ آج کل ان سب کی جگہ ملتان ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے عوام کے لیے ایک وسیع و عریض پارک بنا دیا ہے جس میں داخلے کے لیے عوام کو ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔

قلعہ کی جنوبی سمت یعنی جہاں مثالی مدرسہ اور سٹیٹ بنک حسین آ گاہی موجود ہے اس کے اوپر کے علاقے میں علامہ قاضی قطب الدین کاشانیؒ کے شاندار مزار کے علاوہ، مدرسہ ناصریہ تھا جو ملتان کے ایک حکمران سلطان ناصر الدین قباچہ نے تعمیر کرایا تھا۔ سکھوں نے جب ملتان پر قبضہ کر لیا تو اس تمام مدرسہ میں دیوان مولراج گورنر ملتان نے گولہ بارود بھر دیا تھا۔ جب 1848ء میں انگریزوں نے حملہ کیا تو تمام عمارات تباہ ہو گئیں۔ اب تو نہ حضرت

کاشانی کا مزار ہے نہ مدرسہ ناصریہ کی کوئی شناخت ہے۔ 1952ء ملتان کے قلعہ کہنہ پر جب نمائش لگی تو یہاں موت کا کنواں ایستادہ کیا گیا اور ناچ گانے، تھیٹر کے تمبو نصب کئے گئے۔ آج کل یہاں سٹیڈیم تعمیر ہو گیا ہے۔ جہاں لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا۔

یہاں ایک ٹیلہ پر حضرت کاشانیؒ اور حضرت منہاج الدین سراجؒ کی قبریں اب بھی موجود ہیں ابھی حال ہی میں وہاں ایک تحریر آویزاں کی گئی ہے۔ جس سے ان امور کی نشاندہی کر دی گئی ہے وہاں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہاں محمد بن قاسم نے ایک مسجد 94ھ میں تعمیر کی تھی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اس نے یہاں مسجد نہیں بنائی تھی بلکہ یہاں مسجد ضرور تھی جو کہ مسجد ناصریہ یونیورسٹی کے احاطہ میں تھی یہ قطب الدین قباچہ نے بنائی تھی جس میں آ کر حضرت بہاء الدین زکریا نماز فجر پڑھا کرتے تھے۔

ان تمام عمارات کے اذکار تواریخ میں مل جاتے ہیں۔ یہ دلکش عمارات خاص فن و ثقافت کی آئینہ دار تھیں۔ ایسی مسطح عمارات نے مسلمان مہندسوں و معماروں کی فنی تخلیقات کو جلا بخشی تھی۔ جن میں آڑے ستون، بلند محرابیں، اور مدور گنبد نظر آتے تھے۔ یہ ترقی ایرانی، سلجوقی اثرات کے ماتحت جو وقتاً فوقتاً ملک کے اندر داخل ہوتی رہی تھیں جاری رہی۔ مقامی کاری گروں نے ایران کے معماری انداز اپنائے اور تعمیری اسلوب از قسم ہشت پہلو بنیادیں، مدور محرابیں، پشت پناہی ستون بنانے میں کمال دکھایا تھا۔ یہ سب قلعہ کہنہ کی مٹی میں دفن ہو گئیں۔ خصوصاً سکھوں کے اقتدار کے بعد قلعہ کی سر بفلک عمارات و محلات مدتوں کھنڈر بنے رہے اور پھر مٹی کے انباروں کے تلے دب کر رہ گئے۔

یہ بات تو امر مسلمہ ہے کہ اس قلعہ کہنہ کی مٹی کے نیچے سینکڑوں ہزاروں سال کی تہذیب و ثقافت کے راز دفن ہیں جن کی حقیقت کی تلاش میں سوا سو سال قبل ایک محقق انگریز افسر جنرل کننگھم جو لارڈ بھی تھا قلعہ کہنہ پر کھدائی کرائی تھی۔ یہ کھدائی حضرت بہاء الدینؒ کے مقبرے کے مغرب میں ہوئی تھی۔ جنرل کننگھم چالیس فٹ نیچے تک گیا اور وہاں سے جو اشیاء برآمد ہوئی اس کی تحقیق کے بموجب اس نے اس مقام کو اڑھائی ہزار سال قبل کے زمانے کی چیزیں قرار دے کر اپنی معلومات کو فخریہ انداز میں پیش کیا۔ اس زمانے میں اس کی تحقیق پر داد و تحسین پیش کی گئی مگر ملتان کے ابن حنیف صاحب تو اسے بھی ساٹھ فٹ گہرائی سے وہ در مکنون نکال لائے اور ببانگ دہل کہا یہ کننگھم کی ناسمجھی تھی کہ اگر وہ مزید کھدائی کراتا تو چالیس فٹ گہرائی کو حتمی نہ قرار دیتا۔ ابن حنیف کا فہم رسا ذہن اور آنکھوں کی گہرایاں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ انہوں نے اس دشت کارزار میں بہت سفر کیا ہے۔

بات یوں شروع ہوتی ہے کہ ملتان قلعہ پر پاکستان بننے کے بعد ایک سٹیڈیم تعمیر ہوا جس میں کچھ عرصہ کے بعد دراڑیں آ گئیں۔ تو سمجھداروں نے بتایا کہ آئندہ اس کے ستون زیادہ گہرائی تک بنائے جائیں تاکہ پائیدار رہیں۔ خوب بات ہے پائیداری بھی۔ اس دنیا میں تو کوئی چیز بھی پائیدار نہیں۔ مگر دل بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے سمجھ کر 1987ء میں 212 بور (سوراخ) کئے گئے جن میں سٹیڈیم کے ستون قائم کرنے تھے۔ یہ بور 84 سے 94 فٹ

تک گہرے تھے۔ ہم آپ کو اس امر کا اندازہ لگانے کے لیے ایک بات بتاتے ہیں جو بہت ضروری ہے غور سے سن لیجئے۔ اگر آپ حسین آگاہی کے چوک میں کھڑے ہو جائیں اور اس مقام کو زیرو پوائنٹ تصور کر لیں تو وہاں سے قلعہ کی بلندی پچاس پچپن فٹ بنتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ زیرو پوائنٹ سے نیچے بھی 34 / 35 فٹ گہرے سوراخ کیئے گئے جناب ابن حنیف صاحب چشم دید گواہ ہیں تمام آثار الضادید کے متعلق شرح و بست کے ساتھ بتاتے ہیں۔ اور روزنامچہ بھی لکھتے ہیں:

ایں سطر جادہ ہا کہ بہ صحرا نوشتہ اند

یارانِ رفتہ از قلم پا نوشتہ اند

تو صاحب! ان سوراخوں سے جو چیزیں زمین کی گہرائیوں سے دستیاب ہوئی ان کی فہرست اس طرح ہے۔ دھات کے سکے، منکے، ہڈی کی چوڑیاں اور ٹکڑے، پتھروں کی مختلف اشیاء بشمول چکی کی پاٹ، مٹی کے کھلونے، پکی مٹی کے ظروف، روغنی برتن کے ٹکڑے، مختلف شکل و حجم کی اینٹیں، مٹی کے چراغ، تمباکو کی چلم، علامت زدہ برتن دھات کے برتن، گھونگے، جلی ہوئی لکڑی کے ٹکڑے، کوئلے، راکھ وغیرہ۔

چلو وہ تو دو سال پرانی بات ہے چند ماہ پیشتر روشنی کے کھمبوں کے لیے پھر بور کرنے پڑے ان کی تعداد سولہ تھی۔ ابن حنیف کی معیت میں ہم نے بچشم خود دیکھا اور بہت کچھ پلے باندھ کر واپس آ گئے۔ ان میں کچھ بور ایک سو چار فٹ تک کرنے پڑے۔ جہاں سے مختلف ادوار کی اشیائے صرف نکلتی رہیں جن کے مل جانے سے ہمیں یہ وثوق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ملتان کا قلعہ کہنہ ہڑپہ کا ہم عصر بلکہ اس سے بھی قدیم ہے۔ اس کی قدامت کے پانچ چھ ہزار سال کے تو شواہد دستیاب ہو چکے ہیں۔ ایک دن قلعہ کہنہ پر ہم دونوں کی یہ بحث جاری تھی کہ 28 من وزنی بیلر ایک سو چھ فٹ کی گہرائی سے کوئی چار کلو وزنی جلی ہوئی لکڑی لے کر برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ مٹی لتھڑی ہوئی تھی۔ ریت نہیں تھی۔ جس کو دیکھ کر مجھے یک لخت اندازہ ہو گیا کہ ملتان کی سرزمین دس ہزار سال قدیم ہونے کے ثبوت میرے سامنے موجود ہیں۔

اس طرح یہ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی کہ زیرو پوائنٹ سے پچاس فٹ کی گہرائی میں پانی، ریت، مٹی، پتھر وغیرہ نہ نکلنے اور اس کی بجائے جلی ہوئی لکڑی نکلنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس گہرائی میں کبھی جنگل موجود تھے۔ جو سطح زمین پر تھے۔ آفات ارضی و سماوی سے اس میں آگ لگ گئی جنگل جل کر ختم ہو گیا۔ دریا کے سیلاب سے مٹی کی تہیں جمتی رہیں پھر آبادیاں ہوتی رہیں زمین اونچی ہوتی رہی۔ ایک مدت گزر گئی۔ یہ پچاس فٹ مٹی کس قدر عرصہ میں جمی جو پانچ ہزار سال سے قبل یقیناً ہزاروں سال کا عمل اور ردعمل تھا۔

(تاریخِ سرزمینِ ملتان - سیّد زاہد علی واسطی)



سیّد زاہد علی واسطی

حکومت ملتان کے زوال کی داستان

ملتان کی تاریخ کی ابتداء کب ہوئی یہ تو اللہ میاں کو بہتر معلوم ہے مگر ملتان میں انگریزوں کا اقتدار کب اور کیسے آیا یہ ہمیں خوب معلوم ہے اور ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں۔ ملتان ایمپائر کا جب فال ہوا تو یہاں کا آخری حکمران دیوان مول راج تھا۔ نہ وہ مرتا نہ انگریز حاکم بنتا۔ دیوان ساون مل کے قتل ہونے کے بعد اس کا بیٹے دیوان مول راج نے ملتان کی حکومت سنبھال لی تھی۔ مگر ان دنوں وہ انگریزوں کی فتوحات کے اذکار سن سن کر کافی دبلا ہو گیا تھا کہ انگریز اب آئے اب آئے دیوان صاحب جی اندر سے ڈر رہے تھے۔ مگر باہر سے شیر بنے ہوئے تھے۔

آخر کار انگریزوں سے ایک معاہدے کے تحت 1846ء میں بیس لاکھ روپیہ سالانہ پٹہ پر ملتان کو دیوان صاحب نے لیا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ ہر سال بیس لاکھ دے کر ملتان میں انگریزوں کو قدم رنجہ فرمانے سے روک رکھا تھا۔ مگر ایک دن انگریزوں کی آنکھیں بدل گئیں اور انہوں نے سردار کاہن سنگھ کو ملتان حکومت کا ایگریمنٹ فارم دستخط کر کے دیا اور ساتھ ہی اپنے دو آفیسر مسٹر وانز ایگنیو اور لیفٹیننٹ اینڈرسن بمع پانچ سپاہیوں کے لاہور سے ملتان روانہ کر دیئے۔ یہ قافلہ 16 اپریل 1849ء ملتان آ گیا اور عید گاہ بمقام خانیوال روڈ ملتان میں ڈیرے ڈال دیئے۔

یہ 19 اپریل کی صبح تھی بادلوں سے چھن چھن کر نقرئی دھوپ زمین پر آ رہی تھی۔ ادھر کاہن سنگھ کی سواری بمع انگریز افسروں کے ملتان کا چارج لینے کے لیے دیوان مول راج کے محل بمقام عام خاص باغ جا رہی تھی۔ اچانک مول راج کے سپاہیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور میدان کارزار وہ جگہ بنی۔ جہاں اب اسلامیہ ہائی سکول دولت گیٹ موجود ہے۔ دونوں انگریز آفیسر زخمی ہو کر بھاگے عید گاہ جہاں ان کی چھاؤنی تھی بمشکل پہنچے۔ ایک فوراً اور دوسرا علاج کے بعد مر گیا۔ دونوں کو عید گاہ کے ایک کونے میں دفن کر دیا گیا۔ مگر بلوائیوں نے نعشیں نکال لیں ان کو پھر دفن کیا گیا رات کو پھر قبریں کھود لی گئیں۔ آخر کار پھر دفن کر کے پہرہ لگا دیا گیا ان کی یادگار کے طور پر بعد ازاں عید گاہ کی بنیاد پر ایک پتھر لگا دیا گیا جس پر لکھا تھا۔

اس عید گاہ میں
20 اپریل 1848ء کو مارے گئے
پیٹرک الیگزینڈر وان سیگنیو
بنگال سول سروس۔ اور
لیفٹیننٹ ولیم اینڈرسن
فرسٹ بمبئی رجمنٹ اور
ان کی یادگار اب کھڑی ہے
ملتان کے قلعہ پر

یہ پتھر سو، سوا سو سال تک لگا رہا۔ 1968ء میں مختار مسعود ڈی سی ملتان کے زمانے میں یہ پتھر نکلوایا گیا اور اب عید گاہ کی چھت پر پڑا ہوا ہے۔ اس کے نقوش مٹ چکے ہیں۔ ہم نے ڈھونڈ کر پڑھا اور یہاں لکھ دیا تاکہ عبرت حاصل ہو۔

انگریزوں نے ملتان فتح کرنے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی۔ لیفٹیننٹ ایڈورڈز اس وقت بنوں میں تھا جنرل کورٹ لینڈ نے اس کو طلب کر لیا جو چار ہزار فوجی جوان لے کر ملتان کی جانب لپکا۔ راجہ شیر سنگھ گورنر ہزارہ لگا ہوا تھا اپنے ساتھ تین ہزار جوان لے کر لیفٹیننٹ ایڈورڈز سے کنری کے قریب آ ملا۔ ان سب کو لے کر جنرل واش 4 ستمبر 1848ء کو دریائے سندھ عبور کر کے ملتان پہنچ گیا۔

ادھر دیوان مول راج نے چشم پرنم سے نواب بہاولپور کو پکارا انہوں نے اس کو لفٹ نہ کرائی۔ اور 7 ہزار فوجی جوان انگریزوں کی مدد کے لیے بھیج دیے۔ جنہوں نے 28 جون 1848ء کو اتحادی فوج کے ساتھ شجاع آباد کے قریب ادی باغ کے قریب ڈیرے ڈال دیئے اس باغ کے آثار اب بھی پرانی شجاع آباد روڈ پر ملتان سے شجاع آباد جاتے ہوئے موجود ہیں پہلا معرکہ بہاولپور کی اتحادی فوجوں کے ساتھ مل کر ملتان کے خلاف حکم جولائی 1848ء کو ہوا میدان جنگ وہ جگہ تھی جہاں آج کل ملتان میں سدو حسام عظمت واسطی روڈ، حسن پروانہ کالونی موجود ہے۔ یہ بات مصدقہ ہے کہ نواب بہاولپور کی فوج اتحادیوں کے ساتھ تھی اس کا ثبوت صادق الاخبار بہاولپور گورنمنٹ گزٹ مورخہ 14 جنوری 1947ء ص 7 پر اس طرح درج ہے۔ یہ اقتباس اس تقریر کا ہے جو نواب صادق عباسی والئی بہاولپور نے میجر جنرل بروس کمانڈ انچیف کے دورہ ڈیرہ نواب صاحب کے موقع پر مورخہ 11 جنوری 1947ء کو ارشاد فرمائی تھی۔

''جناب عالی! ہم ہمیشہ آپ کے سپاس گزار رہے ہیں۔ 1837ء میں ہماری افواج آپ کے حکم پر افغانستان جا کر لڑیں۔ 1848ء میں آپ کے حکم کی تعمیل میں محاذ ملتان میں آپ کے دوش بہ دوش

رہیں۔ جبکہ 5 جون 1848ء کو کیپٹن ایڈورڈز کی قیادت میں ملتان
فتح ہوا تو ہم آپ کے ساتھ تھے۔'' وغیرہ وغیرہ

ان تمام فوجیوں کے دوبارہ جمع کر کے جنرل واش 4 ستمبر کو ملتان پہنچ گیا۔ اب تمام برطانوی اتحادیوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔ ان کے علاوہ پینتالیس دور مار توپیں، 4 قلعہ شکن توپیں بھی تھیں۔ ایک بار پھر شہر کا محاصرہ شروع ہوا۔ 7 ستمبر کو سورج کنڈ کی جانب سے یلغار ہوئی۔ اور اس مقام پر زبردست جنگ ہوئی جہاں اب محلّہ رام تیرتھ آباد ہے۔ 21 دسمبر کو بمبئی کیولری کا جنرل ڈنڈاس ملتان پہنچ گیا اور 27 دسمبر کو آخر کار ملتان پر عام خاص باغ کی جانب سے پہلا حملہ کیا گیا۔ آخری فیصلہ کن معرکہ یکم جنوری 1849ء میں سب سے پہلے یونین جیک (برطانیہ کا جھنڈا) نصب کیا گیا۔ اس دوران ملتان قلعہ پر ایک زبردست ہلہ بول دیا گیا۔ 28 دسمبر 1848ء کو ایک قلعہ شکن توپ سے جو گولہ مارا گیا وہ اس جامع مسجد پر گرا جو دراصل محمد بن قاسم نے تعمیر کرائی تھی اس میں سکھوں نے پانچ ہزار من گولہ بارود بھر رکھا تھا۔ مسجد بھک سے اُڑ گئی۔ حضرت غوث العالمین کا مقبرہ شہید ہو گیا۔ شاہ رکن عالمؒ کے مزار کے قریب مسجد اورنگزیب تھی وہ شہید ہو گئی۔ اور بیسیوں مکان، درس گاہیں اور مقابر زمین بوس ہو گئے۔ ہر طرف آہ و بکا چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آگ ہی آگ تھی۔

2 جنوری 1849ء کو دیوان مولراج کے مقربین نے مشورہ دیا کہ ہتھیار ڈال دیئے جائیں یا مل کر زہر کھالیں۔ لہٰذا اس نے ایک درخواست جان بخشی کی جنرل واش کو بھجوائی۔ مگر خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔

22 جنوری کو دیوان مول راج نے ہتھیار ڈال دیئے ملتان سرینڈر ہو گیا۔ اس سرینڈر کی عجیب کیفیت تھی۔ کیا جنرل نیازی نے سرینڈر کیا تھا۔ مول راج نے شایانِ شان سرینڈر کیا۔ آخری حکمران ملتان بہترین سلک کے لباس میں ملبوس اعلیٰ نسل کے عربی گھوڑے پر سوار ہو کر تن تنہا قلعہ کے دروازے سے باہر آیا اور تلوار جنرل واش کے سامنے پھینک دی۔ اس طرح چار ہزار سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

20 فروری کو دیوان مول راج لاہور چلا گیا۔ اس پر لیفٹیننٹ اینڈرسن اور مسٹر ایگنیو کے قتل کا مقدمہ ایک خصوصی عدالت میں داخل کیا گیا۔ 12 مئی 1849ء کو اس مقدمہ کی پیشی شروع ہوئی عدالت کے تین جج تھے۔ جس میں مسٹر مینسل، چیئرمین اور مسٹر منٹگمری اور مسٹر کرنل پینی ممبران تھے۔ ڈیفنس کی جانب سے مسٹر الانک برادران اور کیپٹن ہملٹن اور سٹر گردھاری مل بیرسٹران مقرر کئے گئے تھے اور سیتا رام کوہلی نے مقدمہ کے ترجمان کے فرائض انجام دیئے۔

بھئی انگریز بھی کیا قوم تھی۔ جج بھی انگریز اور ملزم کا وکیل بھی انگریز۔ ملزم کے وکیل نے ایک دن جج صاحب کو برملا کہہ دیا کہ

''جناب آپ کی عدالت میرے موکل کا مقدمہ سننے کی مجاز نہیں
ہے۔ کیونکہ اس وقت یہ واقعہ ہوا تو ملتان، گورنمنٹ برطانیہ کی

عملداری میں نہ تھا۔ یہ دھاندلی ہے کہ ایک شریف شہری کو غدار بنایا
جائے۔ جب کہ وہ ایک آزاد شہری تھا اور گورنمنٹ برطانیہ کا شہری
نہ تھا۔''

فروری سے 22 جون 1849ء تک مقدمہ چلتا رہا۔ مولراج پر تین جرم تھے، مقدمہ کا فیصلہ اس طرح لکھا گیا۔

دیوان مول راج، سابق حکمران ملتان پر تینوں جرم قتل، استعانت قتل، اشتعال انگیزی و خون خرابا، ثابت ہوتا۔ لہٰذا قتل کی سزا دی جاتی ہے۔

31 جولائی 1849ء کو برطانوی قنون کے تحت دیوان کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنی جان بخشی کی درخواست گورنر جنرل کو پیش کر دے۔ لارڈ ڈلہوزی صاحب گورنر جنرل تھے۔ اس نے دیوان مول راج کی درخواست پر لکھا۔

''ہم نے ہمدردانہ غور کر کے قتل کی سزا معاف کر دی۔ اور اب
دریائے شور (کالے پانی) کی سزا تجویز کر دی۔''

انگریز بھی خوب ہمدردی سے درخواستوں پر غور کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں سب قیدیوں کو آزاد نہیں کرتے تھے۔ 17 جنوری 1850ء کو دیوان مول راج ملتانی کو لاہور سے کلکتہ لے جایا گیا اور فورٹ ولیم میں رکھا گیا۔ یہاں وہ شدید بیمار ہو گیا۔ خشک آب و ہوا کا آدمی، معتدل آب و ہوا راس نہ آئی پس اس کو بنارس لے آیا گیا اور آخر کار یہ آخری ملتانی حکمران 11 اگست 1850ء کو مر گیا۔

وہ دو انگریز آفیسرز جو عیدگاہ میں دفن کر دیئے گئے تھے۔ ملتان کے زوال کے بعد نکالے گئے اور قلعہ کہنہ کے سب سے اونچے مقام پر دفن کر دیئے ان کے ساتھ تین اور ساتھی بھی دفن کئے گئے۔ قلعہ کہنہ پر ایک چوکور چبوترے پر پانچ سیڑھیاں چڑھ کر یہ پچاس فٹ بلند چوکور اوپر سے نوکدار ایک مینار کھڑی ہے یہ انگریزوں کی فتح اور ملتان کے شکست کی یادگار ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا خنجر ہے جس کی مُٹھ باہر نکلی ہوئی ہے اور باقی خنجر قلعہ کہنہ میں پیوست ہے۔ شاید جب انگریزوں نے یہ ڈیزائن منظور کیا ہو ان کے پیش نظر یہی ارادہ ہو۔ بہر حال ملتان کی حکومت کے زوال کی داستان یہیں سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ انگریز تاریخ میں لکھا ہے کہ اس یادگار کے نیچے دو انگریز جان نثار دفن ہیں جن کے قتل ہونے پر ملتان میں انگریز قوم کا اقتدار ہوا۔ اس مینار کے نچلے حصے پر ایک بڑے سنگ مرمر پر بزبان انگریزی یہ تحریر ہے جسے ہم اردو میں اس کا ترجمہ سطر بہ سطر کر کے لکھ رہے ہیں اس لیے کہ طویل تحریر وہاں جا کر پڑھنے کی بہت کم لوگ کوشش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

اس یادگار کے نیچے
پڑے ہیں باقیات

پٹرک الیگزینڈر وانس اگینو
بنگال سول سروس کے اور
ولیم اینڈرسن
لیفٹیننٹ فرسٹ بمبئی فسیلیر رجمنٹ
نائب ریذیڈنٹ لاہور کے
جن کو تعینات کیا گیا تھا گورنمنٹ نے فارغ کرنے کے لیے دیوان مول راج کو
قلعہ بند شہر اور اقتدار جو اس کے پاس تھا
ان پر حملہ ہوا۔ اور زخمی ہوئے۔
19 اپریل 1848ء کو
اور بے دردی سے تباہ کر دیا سکھوں کے حفاظتی دستے نے
اور اس کے اگلے دن
قومی اعتماد اور مہمان نوازی کے برملا توہین کی
وحشیانہ قتل ہوا
عیدگاہ کے اندر۔ ملتان کی دیواروں کے نیچے
ایسے گر پڑے
یہ دونوں پبلک سرونٹس
25 اور 28 سال کی عمر میں
جو بھرے ہوئے تھے امیدوں اور صلاحیتوں سے
جنہوں نے وعدے کیے تھے۔ مستقبل کی کامرانیوں سے
اپنی موت تک
اپنے ملک کی غیرت وحمیت کے لیے
زخمی اور بے کس
انہوں نے مزاحمت نہیں کی
لیکن ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ انتظار کیا
حملہ آوروں کی آمد کا
ان کے وقار نیا نہیں جھکنے سے منع کر دیا
اس دن کی پیشین گوئی کی

جب ہزاروں انگریز آئیں گے
ان کی موت کا بدلہ لینے
مولراج تباہ ہو گیا اسکی فوج اور قلعہ بند شہر بھی
تاریخ مدون کرے گی
پیدائش سے موت تک
ان کے فاتح بھائیوں نے، سپاہیوں نے، اور اس
ملک کے لوگوں نے
ان کو دیا فوجی اعزاز کے ساتھ
یہاں
شہر کی حفاظت کرنے والے قلعہ کے اوپر
26 جنوری 1849 کو
یہ الحاق
پنجاب کا اور سلطنت سے
اس جنگ کا نتیجہ تھا، زوال
جس میں قتل ہوئے، اور
اس حکومت کا آغاز ہوا

اس مینار کے ساتھ تین مخروطی قبروں پر اس کے کتبے لگے ہوئے ہیں۔

میجر جارج شیفی منٹی زمبرٹ کی یادگار
جو قتل ہوا کمانڈ کرتے ہوئے ہز مجسٹی کی
دسویں رجمنٹ۔ 12 ستمبر 1848ء کو
34 سال کی عمر میں، اور کیپٹن لوہانگ ورتھ
اسی رجمنٹ کا فوت ہوا
یادگار کے لیے سیکنڈ لیفٹیننٹ جے تھامسن اور
سی ٹی، گرام بنگال آرٹلری۔ جو ملتان میں آئی
فوت ہوا
11 اکتوبر 1848ء کو۔ اس کے فوجی افسر
بھائیوں نے

دفن کر دیا۔ اس کو اعزاز کے ساتھ

یادگاریں! سارجنٹ اور 13 توپچیوں کی

بنگال فسٹ آرٹلری جو ملتان

کے محاصرے میں فوت ہو گئے۔ 1848ء میں

انکے ساتھیوں نے دفن کیا

اب یہ یادگار محکمہ ایم ڈی اے کے پارک کے احاطے میں لے لی گئی ہے۔ ہم نے یہ تمام معلومات آپ کو فراہم کر دیں تا کہ ریکارڈ رہے اور بوقت ضرورت کام آ جائے کیونکہ یہ آپ کو ملنی مشکل ہے۔

(تاریخِ سرزمین ملتان - ڈاکٹر سید زاہد علی واسطی)



ڈاکٹر رفیع الدین احمد کاظمی

ملتان کی وجہ تسمیہ

عموماً یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ ملک، شہر، مملکت یا کسی مقام کی کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ ضرور ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کے نام سے منسوب ہو یا کسی صفت کے باعث یا کوئی اور سبب ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ کچھ مقامات کے نام میں سرعت سے تبدیلی ہوتی ہے۔ اوپل کشمیری نے اپنی تصنیف ''سنگھسٹ'' میں اس بات کا خصوصی اعادہ کیا ہے۔ یہی صورت شہر ملتان اور مملکت ملتان کے اکثر اہم شہروں کے ساتھ پیش آئی۔

اس ملک کا نام آریہ ورت، بھارت ورش، اندوستان، ہندوستان اور انڈیا رہا۔ لاہور تقریباً ایک درجن ناموں کے بدلنے کے بعد جما۔ اجودھن پاک پٹن کہلایا۔ برہمن آباد بدل کر منصورہ ہوا اور پھر بکر اور بھکر کے نام سے مشہور ہوا۔ ملتان بھی وقت اور حالات کے ساتھ اپنے نام کو بدلتا رہا۔ بیرونی نے اپنے تصنیف ''کتاب الہند'' میں ہنس پورہ، سوبیزادر، جھرادر، مول استھان، مولستان، مولتان اور آخر میں ''ملتان'' کہلایا۔

ملتان دراصل مول استھان کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو وقت کے ساتھ خود میں تبدیلی لاتا رہا۔ یہ وجہ تسمیہ کافی حد تک قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ مول اور استھان۔ مول بمعنی اصل یا بنیادی یا قدیم اور استھان بمعنی جگہ، یعنی قدیم جگہ۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جناب کرم الٰہی بدر نے اپنی کتاب ''تاریخ ملتان'' میں ان ناموں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے ملک کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جنہیں پڑھ کر ہنسی آئی۔ مثلاً ملتان دو حروف سے بنا ہے مولی اور استھان یعنی وہ مقام جہاں مولی پیدا ہوتی ہے مولی استھان تھا جو بگڑتے بگڑتے ملتان بن گیا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا حصہ ہو جہاں پر اس نام کا اطلاق ہو مگر پورے علاقہ کے بارے میں یہ نام مضحکہ خیز ہوگا۔

جہاں تک قدامت کا تعلق ہے وہ شک سے بالاتر ہے کیونکہ قدیم کتب کے مطابق آریوں کا اصل مرکز یہی علاقہ رہا۔ کورو پانڈو کی حکومت کا مرکز پنجاب کا علاقہ بتایا جاتا ہے۔ مہا بھارت کی جنگ بھی اسی علاقہ میں ہوئی۔ اصل مقام کے اگر معنی لیے جائیں تو اس کا واحد سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہاں ایک قدیم صنم خانہ

تھا جسے تقریباً چوتھی صدی ہجری کے آخر ربع تک مرکزی حیثیت حاصل تھی جس کی زیارت کے لیے زائرین دور دراز کی مسافت طے کر کے آتے اور حتی المقدور نذرانے پیش کرتے۔ اسی صنم خانہ کے باعث اس مقام کو مذہبی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی کے ساتھ ساتھ علمی اہمیت بھی ہو گئی تھی۔ اس بت خانہ کو عرب سیاحوں نے دیکھا تھا اور تفصیل سے اپنے سفرناموں میں ذکر کیا۔ اس میں بشاری ابن حوقل اصطخری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بیرونی نے بھی اس بت خانہ کو اپنے پہلے سفر میں دیکھا تھا اور ''کتاب الہند'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مگر اس کے دوسرے سفر سے قبل اسمٰعیلیوں نے اسے منہدم کرا دیا تھا اور اس کی جگہ مسجد تعمیر کرا دی تھی۔

ملتان کی قدامت اور وجہ تسمیہ کے بارے میں محمد قاسم ہندو شاہ نے اپنی کتاب ''گلشن ابراہیمی المعروف بہ تاریخ فرشتہ'' کی جلد اول میں دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ لکھتا ہے:

''...... ہندوان می گویند کی صد ہزار سال بمراتف تجاوز زا است محض دروغ است و تحقیق آنست کہ مملکت ہند نیز مانند دیگر ممالک ربع مسکون از وجود فرزندان آدم علیہ السلام صفت معموری پذیرفتہ است و شرح اجمال این است کہ بعد از طوفان نوح علیہ السلام ہر سہ پسر خود سام و یافت و حام را بحکم خالقِ ارض وسا باطراف ربع مسکون فرستادہ بکشت وکار امر فرمود ......

''ذکر فرزندانِ حام و کیفیت معموری مملکت ہند بر سبیل اختصار'' حام بامر پدر عالی مقام متوجہ ارض جنوب گشتہ و در معموری آن ملک سعی نمود از دی شش فرزندان بوجود آمدند۔ یکی ہند و دیگری سند و سومی حبش و چہارمی افرنج ہرمنہ و پنجمی و ششمی بو یہ و ممالک مذکور بنام ایشاں مذکر گشتہ۔ اما پسر ارشد حام کہ ہند نام داشت بملک ہند کہ بد و موسوم است شتافتہ بر معموری او گماشت و برالورش سند در مسند فرد کش کو وہ شہر ٹھٹھ و ملتان بام فرزندان خود بنا کرد۔ و ہندرا چہار پسر بہم رسید کہ یکی از آنہا پورب نام داشت و دوم نبگ و سوم دکن و چہارم نیروال و ہر یکی ملک و دیاری کہ بلفعل بہ نام ایشاں مشہور است آباداں کردانیدند۔''

شہر ملتان کے ہی نام پر مملکت کا نام بھی مملکت ملتان پڑا۔ شہر ملتان کو اپنی خصوصیات کے باعث مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ محمد بن قاسم کے دور میں ''بیت الذہب'' یا ''دار الذہب'' کہا گیا۔ کیونکہ محمد بن قاسم کو فتح ملتان پر وہاں کے قدیم بت خانہ کے تہ خانہ میں سونے کا بڑا ذخیرہ وہاں کے ایک پجاری کی نشاندہی پر ملا تھا

جس کا کچھ حصہ فوج میں تقسیم کیا گیا باقی اموی دارالخلافہ دمشق روانہ کر دیا گیا۔ اس کا ذکر عربوں نے یوں کیا ہے:

''اس خزانہ کی اس عہد میں ایسی دھوم ہوئی کہ لوگ ملتان کو ''فرج بیت الذہب'' کہنے لگے کیونکہ محمد بن قاسم کو ایک مکان میں چالیس بھاڑہ سونا ملا۔ اور بھاڑہ تین سوتینتیس (333) من کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے کل بھاڑے میں تیرہ ہزار تین سوبیس (13320) من سونا ملا۔''

اس کے علاوہ اسے ''دارالامان''۔ ''قبۃ الاسلام'' اور ''مدینۃ العلم'' کے القابات سے بھی پکارا گیا جو کہ اس دور کی مخصوص صفت تھی ان خصوصیات کا ذکر متعلقہ ابواب میں کیا جائے گا۔

(ملتان بحیثیت ادبی مرکز (فارسی) - ڈاکٹر رفیع الدین احمد کاظمی)



ڈاکٹر رفیع الدین احمد کاظمی

ملتان کا جغرافیہ

کسی مخصوص مقام ، قریہ یا شہر کا حدود اربعہ کا تعین کرنا تو کسی حد تک ممکن ہے مگر کسی مملکت کا حدود اربعہ ہمیشہ تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اگر حکمران قوی اور ہوشمند ہے تو اپنی حکومت کے استحکام کی خاطر ملک گیری پسند کرے گا اور اگر نااہل اور کمزور ہے تو اس کی مملکت کی حدود میں دن بدن کمی واقع ہو گی اسی کے ساتھ یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ جو مقامات سیاسی، تجارتی اور جغرافیائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ہمیشہ تغیرات کی زد میں ہوتے ہیں اور اپنے حدود کو رفتار زمانہ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں کبھی وہ عظیم مملکت کا پایہ تخت بن جاتے ہیں اور کبھی سمٹ کر علاقہ میں محدود ہو جاتے ہیں۔

مملکت ملتان کے ساتھ بھی یہی کیفیت رہی۔ مختلف ادوار میں اس کا حدود اربعہ مختلف رہا کبھی محض ایک شہر، کبھی دارالخلافہ اور کبھی عظیم الشان آزاد مملکت اور کبھی باجگزار علاقہ کہلایا، ان حالات میں کب کیا حدود اربعہ رہا۔ تعین ممکن نہیں پھر بھی تاریخی شواہد کی روشنی میں اس کے حدود کے بارے میں مواد ملتا ہے اجمالاً ضبط تحریر ہے۔

شہر ملتان، خود مختار، آزاد یا باجگزار حکومت کا دارالخلافہ دریائے چناب کے بائیں کنارہ پر تقریباً 30 درجہ عرض البلد اور اور 71.5 درجہ طول البدل کے درمیان واقع ہے لاہور سے اس کا فاصلہ تقریباً ایک سو نوے میل یا تین سو کلومیٹر تقسیم اقالیم کی رو سے اس کا شمار اقلیم سوم میں ہوتا ہے۔ مملکت ملتان کے حدود کبھی یکساں نہیں رہے۔ ہر دور میں اس کی حد بندی مختلف رہی۔ قبل اسلام کے حدود کا صحیح ذکر نہیں ملتا۔ اشارتاً ملتا ہے کہ یہ علاقہ عرصہ دراز تک ایران کے تحت رہا اور کبھی آزاد۔ دور آزادی میں بھی حدود مختلف ہی رہے۔ 96ھ میں جب محمد بن قاسم نے اسے فتح کر کے اموی حکومت کا حصہ بنایا تو یہ آزاد حکومت تھی جس کے شمال میں لاہور اور جنوب میں سندھ کی حکومتیں تھیں۔ محمد بن قاسم کی شہادت کے کچھ عرصہ بعد دمشق میں خلافت کی تبدیلی سے یہ علاقہ پھر آزاد ہو گیا۔ سبکتگین اور محمود کے حملہ سے قبل اس پر بنو سامہ اور اسمٰعیلیوں کی حکومتیں رہیں۔ اس عہد میں عرب سیاحوں نے مملکت ملتان کے حدود کا ذکر اپنے سفر ناموں میں کیا ہے۔ ان سیاحوں نے جزوی حالات کو

بھی نظر انداز نہیں کیا، لباس، روزمرہ کی زندگی اور ان کے اطوار کو بھی بیان کیا ہے۔

93ھ سے لے کر 96ھ تک محمد بن قاسم نے ساحل بحرِ عرب، سے لے کر ملتان تک کا علاقہ فتح کر کے اسلامی حکومت کا حصہ بنا دیا۔ حد مشرقی میں کنوج مغرب میں مکران، شمال میں چھوٹا کشمیر (عرب پنجاب کو چھوٹا کشمیر کہتے تھے) اور جنوب میں منصورہ (برہمن آباد) تک تھی۔ اس عہد میں حکومت منصورہ ساحل بحرعرب تک تھی۔ وزیر مہلبی کہتا ہے:

''ملتان کی عملداری لمبی ہے۔ مغرب کی طرف حدود مکران اور جنوب کی طرف منصورہ تک اس کی وسعت ہے۔''

ملتان کے بارے میں مسعودی نے تحریر کیا:

''...... ملتان اور اس سے متعلق جتنے شہر اور آبادیاں ہیں یہ سب علاقہ سندھ میں ہیں۔ ملتان کے اردگرد اور اس کے علاقوں اور دیہاتوں میں ایک لاکھ بیس ہزار گاؤں ایسے تھے جن کا شمار ہو سکا ہے۔ ملتان اور منصورہ (موجودہ بھکر) کے درمیان سندھی فرسخ کے حساب سے پچھتر فرسخ کا فاصلہ ہے یعنی تقریباً پانچ سو ساٹھ میل یا 896 کلومیٹر ...... (ایک سندھی فرسخ آٹھ میل کے برابر ہوتا ہے)۔''

ابوالف مسعر بن مہلبل یبوعی پہلا عرب سیاح تھا جو ایران میں ابونصر سامانی سے ملاقات کرتا ہوا چین کی مسافت ختم کرنے کے بعد تبت اور کشمیر ہوتا ہوا ملتان اور سندھ کے راستے جنوبی ہندوستان نکل گیا اس نے بھی اپنے سفرنامے میں ملتان کا ذکر کیا ہے۔

بشاری مقدسی جو اس ملک کی سیاحت پر تقریباً 375ھ میں آیا۔ ملتان کے بارے میں رقم طراز ہے:

''ملتان دارالسلطنت بھی ہے اور پوری مملکت تھی ...... اس کے بڑے بڑے شہر براز راماذان، دردین ہیں۔''

ان کے علاوہ بزرگ بن شہریار، اصطخری، لابن حوقل وغیرہ نے چوتھی صدی ہجری میں بنو سامہ اور اسمٰعیلی عہد حکومت میں سفر کئے۔ ان کے علاوہ اہم ترین شخصیت بیرونی کی تھی جس نے سبکتگین کے فتح ملتان کے بعد وہاں کا سفر اختیار کیا جہاں اسمٰعیلی حکمرانی تھی مگر سبکتگین کی اطاعت تسلیم کر لی تھی۔ بیرونی نے ملتان کے طویل وعریض میدانوں کی پیائش کر کے اپنے علم کے ذریعے اہم جغرافیائی نتائج سے روشناس کرایا۔

غرض کہ ملتان کے حدود میں وقت کی رفتار کے ساتھ تبدیلی آتی رہی یہ حدود ناصر الدین قباچہ کے عہد 605ھ تا 625ھ میں سب سے زیادہ وسیع رہے۔ لاہور اور کنوج کے علاوہ مکران اور سندھ کے علاقے اس

کے زیر نگیں رہے گویا سرحد کشمیر سے لے کر ساحل عرب تک اس کا سکہ چلتا تھا۔ قباچہ کے بعد شمس الدین التمش کے عہد میں بھی یہی حدود رہے مگر مملکت ملتان کے بجائے صوبہ ملتان ہو گیا جو تخت دہلی کا حصہ تھا۔ یہ حدود دھیرے دھیرے کم ہی ہوتے گئے آخر میں 650ھ تک اس کے حدود میں کافی کمی ہو گئی۔

مملکت ملتان کا موسم گرم و خشک ہوتا ہے۔ سردیوں میں شدت ہوتی ہے بارش کی انتہائی کمی ہوتی ہے۔ ریگستان سے ملحق ہونے کی وجہ سے گرد و غبار بھی بہت ہوتا ہے۔ یہ طبعی حالات تقریباً تمام سال برابر قائم رہتے ہیں۔ مختصراً موسم گرم و خشک رہتا ہے۔

(ملتان بحیثیت ادبی مرکز (فارسی) - ڈاکٹر رفیع الدین احمد کاظمی)



ڈاکٹر رفیع الدین احمد کاظمی

ملتان کی اہمیت

ملتان کی تاریخ ابتدا سے ہی مد و جزر کا شکار رہی جہاں برابر انقلابات آتے رہے جیسا کہ گزشتہ باب میں ذکر آ چکا ہے، رفتار زمانہ کے ساتھ اس کے حدود بدلتے رہے۔ مملکت ملتان کی اہمیت میں حقیقتاً اس کے دارالخلافہ ملتان کا اہم ترین کردار رہا۔ غیر اسلامی دور میں جبکہ ملک میں بت پرستی ہی تھی ملتان بت پرستوں کا مسجود تھا اور جائے مغفرت تھی کیونکہ یہاں عہد قدیم کا بت خانہ تھا جسے مرکزیت حاصل تھی۔ یہ ''سورج دیوتا'' کے مندر کے نام سے مشہور تھا۔

اسلامی دور میں بیت الذہب، دارالامان، دارالسلام، قبتہ الاسلام اور مدینتہ العلم کے القابات سے پکارا گیا۔ رفتہ رفتہ زمانہ کے ہاتھوں مٹنے کے بعد گورستان اور گداگروں کا مسکن بن گیا اور اس شہر کے لیے یہ ضرب المثل بن گیا۔

چہار چیز است تحفہ ملتان
گرد گرما گدا و گورستان

کسی شاعر نے ملتان کی سیر کرنے کے بعد شعوری طور پر اپنے ذاتی تاثرات کو اسی شعر کی شکل میں چھوڑا مگر غیر شعوری طور پر اس نے ملتان کے عروج و زوال کی پوری داستان بیان کر دی۔ ملتان کی مذہبی، سیاسی، تجارتی اور ادبی اہمیت جو رہی ہے اس سے انکار کفر ہوگا مگر افسوس اور حیرت ہے کہ تاریخ کے اوراق میں اسے وہ مقام نصیب نہ ہوا جس کا وہ مستحق تھا۔ مورخین نے ملتان کا ذکر لاہور اس سندھ کے ساتھ ضمناً کیا ہے۔ اگر کچھ مورخین نے آزادانہ طور پر ذکر بھی کیا تو انتہائی اختصار کے ساتھ۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملتان کے بارے میں اس کے عروج کے زمانہ میں جو کچھ قلمبند ہوا اس میں بیشتر حوادثات زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہو گیا جو بچا وہ ایسا بکھرا ہے کہ اسے یکجا کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ پھر بھی جو مختصر حالات محفوظ رہ کر ہمارے سامنے ہیں انہیں سے ملتان کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ حالات کی روشنی میں اس کا اجمالی جائزہ الگ الگ لیا جائے۔

ا۔ مذہبی حیثیت

آریوں کا قدیم مسکن وسط ایشیا بتایا جاتا ہے۔ جہاں علم کا بھی وجود تھا۔ ایک طبقہ جو مختلف علوم پر دسترس رکھتا تھا اسے اہل قبیلہ پنڈت یعنی عالم کہے جاتے اور ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس قبیلہ کا ایک حصہ جب اپنے مسکن سے نکل کر بڑھا تو سب سے پہلے اس ملک کے مغربی حصہ یعنی فارس کو فتح کیا وہاں جمنے کے بعد اس ملک کا نام ایرانار کہا جو اب ایران کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی زبان سنسکرت تھی۔ اپنی فطری جبلت کے باعث عوام سے زیادہ اختلاط نہ رکھا بلکہ اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ بعد کے ادوار میں ایران میں باعظمت بادشاہ ہوئے جنہوں نے نصف دنیا پر بڑی شان سے حکومت کی۔

یہاں اس قبیلہ کے تین حصے ہو گئے۔ ایک وہیں مقیم رہا دوسرا یورپ کی جانب گامزن ہوا اور تیسرے نے ہمارے ملک کا رخ کیا۔ پہاڑی دروں کو پار کر کے وادی سندھ میں وارد ہوئے۔ یہ دور تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ چونکہ علم و ہنر سے بہرہ ور تھے متحد تھے اور حربی صلاحیت رکھتے تھے اس لیے قدیم باشندوں پر فتح حاصل کر لی۔ اور مفتوحہ علاقہ کو آریہ ورت کا نام دیا۔ خود کو برہم یعنی حکمران اور مفتوحہ قوم کو شودر یعنی غلام کا نام دیا۔ ان کے ساتھ فاتح قوم کا رویہ احساس برتری کے باعث ناروا اور ظالمانہ رہا۔ ان حالات میں ان سے اختلاط کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ آریہ پنڈتوں نے اپنی چار کتابیں لکھیں جنہیں وید کا نام دیا۔ جو مختلف مضامین پر مشتمل ہیں۔ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، معاشی سبھی شعبوں کے بارے میں لکھا۔ ابھی تک یہ زیر تحقیق ہے کہ یہ کتابیں واقعی کہاں اور کب ضبط تحریر میں آئیں۔ جب یہ قبیلہ اس وسیع و عریض میں پھیلا اور مختلف صنعتوں کا الگ الگ گروہ بن گیا تو آریہ پنڈتوں نے صنعت کے حساب سے تقسیم کر کے تحریری طور پر وید میں ضمیمہ کا اضافہ کر دیا۔ پنڈت تو پہلے ہی سے موجود تھا باقی کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ جو حکمران طبقہ تھا وہ برہمن یعنی حاکم کہلایا۔ حکومت کے نظم و نسق اور حفاظت کا جو طبقہ تھا اسے چھتری یعنی بہادر کا لقب دیا جو طبقہ تجارت میں مشغول ہو گیا اسے ویش یعنی تاجر کیا گیا۔ اسی طرح شودروں میں جو طبقہ جس کام سے منسلک تھا اس کی وہی ذات قرار پائی۔ یہ سلسلہ آج تک اسی طرح جاری ہے حالانکہ حکمران طبقہ بعد میں بدل گیا مگر لقب وہی رہا۔

جہاں تک مذہب کا سوال ہے اس ملک کے قدیم مذہب کے بارے میں تاریخ کے اوراق خاموش ہیں مورخین اور دیگر اہل علم نے صرف قیاساً یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قدیم دور میں اس ملک والوں کا طریقہ تھا کہ جن چیزوں میں نفع دیکھا اور جن چیزوں سے خوف زدہ ہوئے ان کی پرستش کی۔ لیکن ایک بات پر اتفاق تھا کہ آگ اور سورج کی پرستش ہوتی تھی مگر اس کے لیے نہ تو کوئی خاص مقام معین تھا اور نہ کوئی ہیولا۔ جہاں تک آریوں کے مذہب کا تعلق ہے ان کے یہاں خدا کا تصور تھا کیونکہ بعد کے ادوار سے ظاہر ہوتا ہے کہ رشیوں اور منیوں نے گوشہ تنہائی میں عبادت اور ریاضت کی مگر بت پرستی کا رواج نہیں تھا۔ آریوں کے بعد جب گوتم بدھ کا ظہور ہوا تو ان کی تعلیمات سے ایک بڑے طبقہ نے بدھ مذہب کو اختیار کیا یہاں بھی بت پرستی کا سراغ شروع کے دور میں نہیں ملتا۔

ایک روایت ملتی ہے کہ ایک برہمن ایران سے آیا جو آتش پرستی، آفتاب پرستی کرتا تھا۔ یہاں اس نے

دیکھا کہ لوگ سورج اور آگ کو مقدس مانتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس نے سورج دیوتا کا مجسمہ تیار کرایا جو کافی مقبول ہوا اور لوگ سورج دیوتا کی پرستش کرنے لگے۔

دوسرا واقعہ یہ بتایا جاتا ہے کہ گوتم بدھ کے مرنے کے بعد اس مذہب کے مبلغ جن کو بھکشو کہتے تھے۔تبلیغ کے لیے چلتے تو اپنے ساتھ گوتم بدھ کا مجسمہ ساتھ رکھتے، اور جب عبادت میں مشغول ہوتے تو ذہن کو یکسو رکھنے کے لیے اس مجسمہ کو سامنے رکھ لیتے۔ یہ طریقہ عوام کو پسند آیا اس رجحان کو دیکھ کر ایک برہمن نے جس کا نام شنکر بتایا جاتا ہے سب سے پہلے سورج دیوتا کا مجسمہ تیار کیا اور رواج دیا۔مگر بت خانہ کہیں بھی باقاعدہ طور پر قائم نہیں ہوا۔

سب سے قدیم بت خانہ کی نشاندہی ملتان میں ہوتی ہے جہاں سورج دیوتا کے ایک عظیم الشان مندر تھا۔ اس بت خانہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس بت خانہ کی تعمیر اور بت کے بارے میں عرب سیاحوں نے جزوی ذکر کیا ہے مگر البیرونی اپنی کتاب ''کتاب الہند'' میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے جس کی تصدیق ''چچ نامہ'' سے بھی ہوتی ہے۔البیرونی لکھتا ہے:

''......زمانہ قدیم میں کشمیر کا ایک شاہزادہ یہاں کا حاکم تھا جس کا نام جے پارین تھا۔اپنے آخری زمانہ میں ترک دنیا کر کے عابد ہو گیا تھا۔ شب و روز کی ریاضت سے اس میں زہد و اتقا کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اس کی دینی اور دنیوی طاقت کے باعث کسی راجہ کو اس پر حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔

چند سال بعد اس کے پاس کثیر دولت جمع ہو گئی اور ہمسایہ راجوں میں سے کوئی ہمعصر دولت میں مدمقابل نہ تھا، راجہ نے دولت کی فراوانی دیکھ کر شہر کے شرق جانب ایک حوض تعمیر کرایا جو ایک سو گز کے دور میں تھا اس کے وسط میں ایک خوبصورت مندر بنوایا جس کا دور پچاس گز کا تھا۔ اس میں ایک کمرہ دس گز لمبا اور آٹھ گز چوڑا تھا اس میں سونے کے پچاس مٹکے رکھا دیئے اس کے ساتھ دو سو تیں من سونا رکھ کر اوپر سے پاٹ دیا۔ اس پر ایک بندر بنوا کر سورج کی مورتی (بت) نصب کر دی۔ حوض کے گرد درخت لگوائے جو آج تک موجود ہیں مورتی کی آنکھ یاقوت کی تھیں جو اندھیرے میں چمکتی تھیں۔

یہ مورتی انسانی صورت میں ہے جو اینٹ پر گچ کی ہوئی کرسی پر پالتی مارے بیٹھی ہے، اس کے بدن پر سرخ چمڑے جیسا لباس ہے سوائے دونوں آنکھوں کے اس کا تمام بدن اس سے ڈھکا ہے۔

اسی لیے کوئی کہتا کہ اس کا بدن لکڑی کا ہے۔ کوئی اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بدن کبھی کھلا نہیں رہتا، اس کی آنکھوں میں دو جوہر (لعل) ہیں، اس کے سر پر سونے کا تاج ہے۔ وہ بت کرسی پر بیٹھا ہے اور دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھے ہے ہاتھوں کی انگلیاں اس طرح الگ الگ ہیں گویا چار کا عدد گن رہا ہے۔''

اس بت خانہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ زائرین دور دراز کی مسافت طے کر کے اپنے دیوتا کی زیارت اور پوجا کرنے آتے اور حتی المقدور نذرانے پیش کرتے، یہ سلسلہ تمام سال جاری رہتا۔ نذرانے کی آمدنی اتنی ہوتی کہ مندر کے تمام اخراجات کے علاوہ حکومت کے اکثر خرچ بھی پورے ہوتے۔ بیرونی نے اپنی پہلی سیاحت میں اسے دیکھا تھا۔

ویدک دھرم آریوں کے ذریعے آیا۔ چونکہ وہ فاتح تھے اس لیے وہ بنیادی مذہب بن گیا تھا مگر مذہبی کتب کے پڑھنے پڑھانے کا حق ایک مخصوص طبقہ کے ہاتھوں میں رہا جو پنڈت کہلاتے تھے۔ دین کے ٹھیکیداروں نے ذات پات کی تفریق کی مفتوحہ قوم کو غلام بنا کر ان سے پست سے پست کام لیتے اور ناروا سلوک کرتے۔ اس سے مفتوحہ قوم کے دل میں فاتح قوم کے خلاف نفرت کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ گوتم بدھ نے ایک نئے دین کی بنیاد رکھی جس میں سادگی اور مساوات کا درس تھا۔ انسانوں کے ساتھ ساتھ حیوانوں کے ساتھ بھی بہتر سلوک کی تعلیم دی۔ غلاموں کو اس نئے دین میں کشش ملی۔ اور وہ جوق در جوق اس نئے دین کو اختیار کرنے لگے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں دین کے ماننے والوں میں تصادم کا آغاز ہوا۔ اکثر یہ تصادم خونیں معرکوں میں تبدیل ہو جاتا۔ پھر بھی بودھ دھرم کی تبلیغ میں شدت آتی گئی۔ اہل علم بھی اس میں شامل ہونے لگے جس سے بڑی تقویت ملی اور یہ علاقہ بودھ دھرم کا بھی اہم مرکز بن گیا۔

قبل اسلام عرب تجار کی آمد و رفت ان علاقوں میں تھی۔ ظہور اسلام کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ تجارت ساحلی علاقوں سے زیادہ تھی۔ والی سندھ راجہ داہر کی ناعاقبت اندیشی کے باعث محمد بن قاسم نے ساحل سندھ پر 93ھ میں حملہ کیا اور تین سال کے قلیل عرصہ میں سندھ، مکران، گجرات، ملتان اور سیوستان کے کچھ علاقے فتح کر کے اسلامی حکومت کا حصہ بنا دیا۔ اسلامی تعلیمات کے تحت فاتح ہونے کے باوجود مفتوح قوم کے دین سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ مذہب کے معاملہ میں مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ فاتح حاکم کے اعلان اور اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ دیکھ کر مفتوحہ قوم متاثر ہوئی اور رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنے لگے دینی تعلیم کے لیے ملتان، منصورہ اور اچ میں مراکز قائم ہوئے۔ سب سے بڑا دینی مرکز ملتان رہا۔

عہد بنو سامہ تک اسلام کی تبلیغ میں جبر و کراہ کا دخل نہ تھا۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کو پوری آزادی رہی۔ بنو سامہ کے بعد ملتان پر علویوں نے قبضہ کیا یہ مذہب تو اسلام رکھتے تھے مگر اعتقاداً اسمٰعیلی شیعہ تھے۔ جو بنو

سامہ کے زمانے میں اپنے عقائد کی تبلیغ خفیہ کرتے رہے مگر یہ برسر اقتدار آنے کے بعد تبلیغ اعلانیہ ہونے لگی اسی کے ساتھ دوسرے مذاہب اور مسلک کے ماننے والوں پر تبدیلی مذہب یا عقیدہ کے لیے جبر بھی ہونے لگا۔ یہ لوگ متعصب بھی تھے۔ دو اہم کارنامے انجام دیئے۔ اول تو یہ کہ کسی طرح بت خانہ کو آگ لگوا کر تباہ کر دیا پھر منہدم کرا کے اس پر مسجد تعمیر کرائی۔ دوسرے یہ کہ محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کو جو کہ شہر سے باہر تھی اپنی عصبیت کے باعث بند کر دی کیونکہ یہ بنوامیہ کے عہد کی یادگار بھی تھی جس سے ان کو ازلی بغض تھا۔ عوام حکمران سے پریشان ہو گئے۔ اسی کے ساتھ یہ حکمران ہمسایہ حکمرانوں کو تخت غزنی کے خلاف ورغلاتے رہے جس کے نتیجہ میں محمود غزنوی نے پہلے 396ھ اور اس کے بعد 405ھ میں ملتان پر حملہ کر کے اسے اپنی حکومت کا حصہ بنا دیا جس سے یہ تبلیغ اعلانیہ بند ہو گئی اور آخر کار 633ھ میں دور التمش میں اسمٰعیلیوں کا یہ مرکز ہمیشہ کے لیے یہاں سے منتقل ہو کر گجرات چلا گیا۔

مملکت ملتان اور دارالخلافہ ملتان میں صوفیوں کا داخلہ غزنوی عہد میں شروع ہوا مگر اس کا زبردست مرکز چھٹی صدی ہجری کے اواخر یا ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں ہوا جب شیخ بہاء الدین زکریاؒ یہاں تشریف لائے اور رشد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ وہ عوام کو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے عملاً روشناس کراتے رہے جس سے معتد بہ آبادی نے اسلام قبول کیا۔ انہیں کے باعث ملتان ''دارالامان''، ''قبتہ الاسلام'' اور ''مدینتہ العلم'' کہلایا۔ ملتان شہر کے علاوہ اہم دینی مراکز اجودھن، اچہ، بھکر اور ہانسی تھے جہاں بزرگ صوفیاء قیام پذیر تھے۔ اور ان کی خانقاہیں حقیقی اسلامی تعلیمات کے مرکز تھے۔

(ب)۔ سیاسی اہمیت

ملتان کا محل وقوع ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ غیر ملکی حملہ آوروں کی براہ راست زد سے باہر رہا۔ سمندر کی جانب سے آنے والوں کے لیے درمیان میں سندھ کا وسیع و عریض تھر کا ریگستانی علاقہ کے علاوہ دوسری حکومتیں تھیں۔ ریگستانی علاقوں میں خورد و نوش کے ذرائع تقریباً معدوم ہوتے ہیں۔ اس لیے آنے والوں کو گوناگوں زحمتوں کا سامنا ہوتا۔ مغرب سے آنے والوں کے لیے دشوار گزار پہاڑی راستوں کے ساتھ ساتھ درمیانی خودمختار ریاستیں تھا جو تعداد میں کئی تھیں جنہیں فتح کر کے گزرنا کافی دشوار تھا۔ اسی کے ساتھ ملتان کا موسم گرم و خشک رہتا۔ ریگستان سے ملحق ہونے کے باعث گرد و غبار کی کثرت ہوتی۔ ان حالات میں مملکت ملتان قدرتی حصار تھا۔ ان علاقوں میں دو جنگجو قومیں جاٹ اور میڈ آباد تھیں جو ملتان کی فوج کا اہم جز تھیں۔ ملتان کا قدیم صنم خانہ بھی حکمراں کے لیے سیاسی حربہ تھا۔ بت چونکہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اس لیے اسے کبھی کبھی میدان جنگ میں غنیم فوج کے سامنے کر دیا جا جس سے وہ خوف زدہ ہو کر واپس لوٹ جاتا۔

ان حالات میں ملتان کا حکمران ہمسایہ حکومتوں کا مددگار بنا رہتا تھا۔ بنو سامہ اور اسمٰعیلیوں کے عہد میں بھی یہی حالات قائم رہے۔ فوج کے لیے جاٹ اور میڈ قوموں کے حصول کے لیے بھی حاکم ملتان سے دوستانہ تعلقات

رکھنا ضروری تھے۔ ان کی بہادری اور جاں نثاری ہی تھی کہ یہ لوگ ایرانی فوج کا جز رہے اور جب ایران میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو اس فوج کو اسلامی لشکر کا حصہ بنا کر بصرہ میں تعینات کیا گیا۔

(ج) تجارتی اہمیت

زمانہ قدیم سے ہی ہندوستان کو ''سونے کی چڑیا'' کہا جاتا رہا ہے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اسے قدرت نے گوناگوں نعمتوں سے مالا مال کیا جو زندگی کی ہر ضرورت پوری کرتی ہے۔ یہ نعمت صرف خشک زمین پر ہی نہیں بلکہ پانی کی گہرائیوں میں بھی پہاڑ کی بلندیوں پر اور مسطح سرسبز میدانوں میں بھی۔ اسلحہ کے لیے فولاد، خورد و نوش کے لیے اناج و پھل، آرائش اور خوشبو کا سامان، چنانچہ غیر ملکیوں کی حریص نگاہیں ہمیشہ لگی رہیں اور تاخت کا مرکز بنایا۔ اسی کے ساتھ ایشیا یورپ اور افریقہ کے سوداگر تمام سال آتے اور اپنے ساتھ اپنے ملکوں کی مصنوعات بھی لاتے۔

اس ملک کی تجارتی منڈیوں کا ذکر کرتے ہوئے عرب سیاحوں نے ملتان کی تجارتی منڈی کا ذکر خاص طور پر کیا۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے سوال کے جواب میں ایک عرب سوداگر نے ہندوستان کے بارے میں مختصر مگر انتہائی جامع جواب دیا کہ:

''بحر هادر و جبلها یاقوت و شجر ها عطر''

(سمندر موتیوں سے بھرے، پہاڑ ہیروں کا خزانہ اور درخت خوشبو کی کان ہیں)

قبل اسلام اور چوتھی صدی ہجری کے تیسرے ربع میں تک ہندوستان کی سب سے بڑی منڈی ملتان تھی جس کے قیام اور فروغ میں وہاں کے مرکزی بت خانہ کا کلیدی کردار رہا جہاں زیارت کا سلسلہ تمام سال جاری رہتا اندرون اور بیرون ملکوں کے زائر آتے اس لیے لوازمات زندگی بھی لازمی تھی۔ مسلسل آمد و رفت تاجروں کے لیے انتہائی پرکشش تھا ان کی آمد و رفت بھی ناگزیر تھی۔

زائر نقد و جنس کے علاوہ اپنے علاقوں کی بہترین مصنوعات دیوتا کی نظر کرتے۔ اس نذرانہ میں غیر ملکی تجار کے لیے ''عود'' انتہائی اہم تھا جو زائرین کامروب سے خوشبو دینے کے لیے لاتے۔ یہ نذرانہ اتنا زیادہ ہوتا کہ مندر کے پجاری گراں قیمت پر بازار میں فروخت کر دیتے اس عہد میں بیرونی نے اس کی قیمت دو سو دینار فی من لکھی ہے۔ اس عود کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

''...... اس کی زیارت کے لیے لوگ مہینہ کی راہ سے آتے ہیں اور بکثرت ہود ہسری (کامروپی) چڑھانے کے لیے لاتے ہیں۔ کامرون (کامروب) ایک شہر ہے جہاں کا عود عمدہ ہوتا ہے۔ اس قدر نرم ہوتا ہے کہ لوگ اس پر مہر لگاتے ہیں تو اس کا نقش ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ ایک من کی قیمت دو سو دینار ہوتی ہے۔ لوگ دور

دور سے اس کو لاتے ہیں اور مہنت کو بخور کے لیے دے جاتے ہیں۔

تاجر اسی کے ہاتھ سے خرید کر لے جاتے ہیں۔"

غرض مندر کی وجہ سے تمام سال چہل پہل رہتی۔ ہر مکتب فکر کے لوگ آتے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جہاں آمد و رفت کا سلسلہ جتنا زیادہ ہوگا تجارت کو اتنا ہی فروغ ہوگا۔ غیر ملکی تاجروں کو تجارت کا بیشتر سامان وافر مقدار میں یہیں دستیاب ہو جاتا۔ برآمداتی اشیا میں "عود" کے علاوہ فولاد کا سامان، مسالہ جات، باریک سوتی کپڑا، خوشبویات، زرو جواہر، قیمتی پتھر، ہاتھی دانت وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

ملتان میں تجارت کے فروغ کے اور بھی وجوہات تھے۔ حاکم وقت کی جانب سے ہر ممکن سہولت اور حفاظت ملتی۔ خود ملتان کے تاجر خلیق اور ایماندار تھے۔ عرب سیاحوں نے اس تجارتی منڈی کو نفع بخش لکھا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں جبکہ وہاں اسمٰعیلی حکمرانی تھی مندر کے انہدام اور شیعہ مسلک کی تبلیغ اور اس میں سخت گیری کے باعث تجارتی منڈی کا خاتمہ ہو گیا اور تجارتی رونق رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔

د۔ علمی اور ادبی اہمیت

1۔ سنسکرت

آریوں نے ہندوستان پر حملہ کر کے فتح کیا اور یہاں کے باشندوں کو محکوم بنایا۔ پہلے یہ لوگ وادی سندھ میں پھیل گئے اور یہاں پر جمنے کے بعد سندھ پار کیا اور شمالی ہند میں پھیل گئے۔ یہ لوگ علم سے واقف تھے اور ان کی زبان سنسکرت تھی۔ مہا بھارت کی جنگ اور اس کے بعد اس علاقہ کو اہمیت حاصل تھی وہ محتاج بیان نہیں کیونکہ یہ حصہ حکومت کا اہم ترین حصہ تھا۔ جیسا کہ کہا گیا۔ آریہ علم و ادب سے واقف تھے۔ انہوں نے ویدوں کی تحریر کا کافی حصہ اریانا (ایران) میں لکھا اور اس کی تکمیل یہیں ہوئی۔ یہ تقریباً چھ سو سال قبل مسیح کی بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد مہا بھارت، گیتا، والمیکی کی رامائن اور پُران ضبط تحریر ہوئے۔ مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں تحریر ہونے کے باعث زبان و بیان پر جو اثرات ہوئے اہل زبان اور ماہر لسانیات نے بخوبی اس کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ ادبی اور عمومی زبان میں بھی فرق بتایا جاتا ہے ان کتب کے بعد الگ الگ زبانوں میں مختلف علوم سے متعلق کتابیں لکھی گئیں۔ مثلاً اخلاقیات طب، حکمت، ہندسہ اور نجوم وغیرہ۔

ساتویں صدی ہجری تک بہت سے علماء و فضلاء اپنی تخلیقات سے فیض پہنچاتے رہے۔ دور عباسی میں اسی علاقہ کے ایک زبردست عالم، فلسفی، حکیم اور صاحب زبان ہارون رشید خلیفہ کے دربار کی زینت رہے۔ جہاں ان کی بڑی قدر دانی ہوئی، انہوں نے خلیفہ کی خواہش پر طب کی ایک کتاب کا ترجمہ سنسکرت سے عربی میں کیا۔ سنسکرت کے قدیم مدارس میں سے ملتان کا پاٹھ شالہ اسلامی دور میں بھی قائم رہا کیونکہ شیخ معین الدین چشتی اجمیری نے یہاں پانچ سال قیام کر کے سنسکرت سیکھی۔

عربی

عربی زبان کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ظہور اسلام کے بعد محمد بن قاسم کے حملہ سے یہاں شروع ہوئی۔ حالانکہ یہ نظریہ غلط ہے۔ سنسکرت اور عربی ایشیا میں دنیا کی آٹھ قدیم زبانوں میں شمار ہوتی ہیں جن کی قواعد میں بڑی یکسانی ہے۔ تجارت کے سلسلے میں عرب تاجروں کی مسلسل آمد و رفت رہتی ان کا تعلق خاص طور سے ساحل بحر عرب سے رہا۔ جزوی سوداگر ملک کے اندرونی حصوں میں جاتے۔ تجارتی اہمیت کے سلسلے میں ملتان کی تجارتی منڈی کا ذکر کر چکے ہیں جہاں عرب سوداگر آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے ذریعے عربی زبان بھی اس علاقہ میں نامانوس نہیں رہی۔ ایک تحقیق کے مطابق پانڈو بھی عربی زبان سے واقف تھے اور ایک نازک موقع پر ''یدھسٹر نے ارجن سے عربی میں زبان ہی میں گفتگو کی تھی۔ یہی نہیں کورو کا وزیر ددر ...... بھی عربی سے بخوبی واقف تھا۔ جب دربودھن نے پانڈو کو لاکھ کے محل میں قیام دلا کر انہیں زندہ جلانے کا منصوبہ بنایا تھا تو اسی وزیر نے ان لوگوں کو عربی زبان میں خط لکھ کر آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ لوگ وقت مقررہ سے ایک دن قبل اس محل میں آگ لگا کر سرنگ کے ذریعے فرار ہو گئے۔

اگر ہم اسے تسلیم کر لیں تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس عہد میں عربی زبان کے علماء یہاں تھے اور اسی کے ساتھ اس زبان کی درس و تدریس کا انتظام بھی تھا۔ ایسے مدارس وہیں ہو سکتے ہیں جہاں اس کے قدر دان ہوں اور ضرورت بھی اور اس کا معقول انتظام ہو جس میں حاکم وقت کا ہر تعاون ہو ...... یہ علاقہ ملتان ہی ہو سکتا ہے۔

عربی زبان کے فروغ اور اس سے دلچسپی کا سبب یہ ضرور ہے کہ محمد بن قاسم کی فتح کے بعد علماء و فضلاء بھی آئے۔ دینی کتب کے ساتھ ساتھ قرآن بھی عربی میں تھا۔ اسلام میں اختیار مذہب کے سلسلے میں خدائی حکم کہ تبدیلِ مذہب کے لیے کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے۔ محمد بن قاسم نے ایک حقیقی حکمران اور سچے مسلمان کا کردار پیش کیا۔ اس نے اپنے ذاتی کردار سے عوام اور خواص کو ایسا متاثر اور مسخر کیا کہ اکثر نے اسلام بہ رضا و رغبت قبول کیا اور دن بہ دن یہ تعداد بڑھتی گئی ان حالات میں عربی زبان کا خود بخود فروغ ہوا۔ اس وقت سے لے کر بعد کے ادوار میں عرب سے علماء و فضلاء کی آمد کا سلسلہ رہا اور پھر اسی سرزمین میں ایسے عالم پیدا ہوئے جو کسی حال میں ان سے کم نہ تھے۔ ملتان، منصورہ اور اچ میں اہم دینی اور علمی مرکز بن گئے۔ ساتویں صدی ہجری تک ان میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ لاہور میں مدرسہ نظامیہ بغداد کی طرز پر ابونصر ہبیتہ اللہ الفارسی نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جہاں حصول علم کے لیے طلباء ایران اور عراق تک آنے لگے۔ ملتان میں خانقاہ زکریا اور دائرۃ المعارف اپنی مثال آپ تھے۔

عربی زبان کے ساتھ عربی ادب نے بھی وقت کی رفتار کے ساتھ ترقی کی۔ حکمران ملتان سے وابستہ شعراء عربی اور فارسی دونوں زبان میں اشعار کہتے۔ اہل قلم نے مختلف علوم میں اپنے آثار چھوڑے نیز سنسکرت کی کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے۔ عہد قباچہ یعنی ساتویں صدی ہجری کے ربع اول میں علم و ادب کا ایسا عظیم الشان مرکز ملتان

بنا کہ اسے ''قبتہ الاسلام'' اور ''مدینۃ العلم'' کے نام سے پکارا گیا۔اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ اہل سندھ کو عربی زبان ایسی پسند آئی کہ انہوں نے سندھی زبان کی تحریر کے لیے عربی رسم الخط کو اپنا لیا جو باوجود متعدد متعصب تحریکات کے آج بھی قائم ہے۔

نزہتہ الخواطر میں درج تحریر کے مطابق ہندوستان میں 400ھ تک 77 علماء وفضلاء ومشائخ وارد ہوئے اور 650ھ تک اس علاقہ میں علماء وفضلاء کی کثیر تعداد پیدا ہو چکی تھی۔ان میں اہم ترین ذات منکتہ الہندی کی تھی۔ جسے سنسکرت، عربی اور فارسی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، ہارون رشید کی خواہش پر وہاں گئے اور علاج کیا۔خلیفہ کی ہی ایما پر ''سیسر'' اور ''عشر مقالات'' کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا اور ''شاناق الہند'' کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا۔ یحیٰی برمکی کی ایما پر ''اسماء عفاقیرہ الہند'' کا بھی سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا۔

پہلی صدی ہجری میں حکیم بن جبلتہ العبدی آئے حکیم بھی تھے اور عربی زبان میں شاعری بھی کرتے تھے۔

دوسری صدی ہجری کے علماء وافضاء میں ابوعطا سندھی (شاعر)، جریر (شاعر) ربیع بن صبح العدی (شیخ المحدث اور مصنف) عبداللہ بن محمد اور ابو المعشر بن عبدالرحمٰن (فقیہہ، عالم اور محدث) کا شمار ہوتا ہے۔تیسری صدی ہجری میں ابوعلی سندھی (ماہر علوم عقلیہ) ابن ذہن ہندی (ماہر طب) جن کی نگرانی میں برآمکہ کا شفاخانہ شروع ہوا، یہاں آئے انہوں نے کئی سنسکرت کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ان میں ''خعفـرۃ البنیح'' بھی ہے۔اولاد جعفر بن محمد ملتانی میں عالم، مورخ، ادیب، شاعر اور صاحب نصاب گزرے۔ ہارون ابن عبداللہ ملتانی عربی شاعر تھے، ان کے اشعار تاریخی کتب میں ملتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری میں ابراہیم بن محمد دیبلی (عالم ومحدث)، احمد بن عبداللہ دیبلی (فقراوی زیادا اور عالم)، احمد بن منصوری (عالم اور مصنف) داؤدی فرقہ کے پیرو تھے۔انہوں نے اس مسلک سے متعلق ''الـمـصـبـاح الـکـبـیـر''، ''کـتـاب الـمـنـیـر''، النیری'' اور دوسری کتابیں عربی میں تصنیف کیں۔شعیب ابن محمد دیبلی اور ابومحمد عبداللہ منصوری (صاحب روایت)، علی بن موسیٰ (محدث) ابونصر فتح (فقیہہ وفلسفی) محمد بن ابراہیم (عالم) کے اسماء گرامی ملتے ہیں۔

پانچویں صدی کی اہم ترین شخصیت ابوریحان البیرونی تھی جس کی دیگر تصانیف کے ''کتات الہند'' محتاج تعارف نہیں ۔بختیار بن عبداللہ کے علاوہ شیخ اسمٰعیل نے لاہور میں بساط علم بچھائی اور معتدبہ آبادی نے اسلام قبول کیا۔

چھٹی صدی ہجری میں احمد بن زید ملتانی، احمد بن محمد، ابومحمد بختیار، عبدالصمد علی بن عمر، عمر بن سعد، محمود بن محمد، محمد بن عبدالمالک اور محمد بن عثمان جورجانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ابونصر ہبتہ اللہ انفاری نے لاہور میں مدرسہ نظامیہ بغداد کی طرز پر مدرسہ قائم کیا۔محمود غزنوی ہندوستان میں ایک حملہ آور کی حیثیت سے آتا رہا۔سفر وحضر میں علماء وفضلاء کی وافر تعداد ساتھ رہتی اور علمی محافل برپا ہوتیں۔

محمود بذات خود صاحب علم تھا۔ علم فقہ میں اچھا دخل رکھتا تھا۔ ساٹھ ہزار فقہی مسائل پر ایک کتاب ''تغویہ الفروع'' تالیف کی اور دوستی کتاب ''کتاب الصلات'' بھی لکھی۔ اس کے ساتھ آئے علماء کے لیے ذریعہ اس علاقہ کو دینی علمی اور ادبی فیض پہنچتا رہا۔ اسی صدی میں شیخ عثمان ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش نے لاہور کو اپنا مستقل بنایا اس سے کچھ ہی قبل شیخ حسین زنجانی یہاں سپرد خاک کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ علماء وفضلاء کی طویل فہرست ملتی ہے جو شاعری بھی کرتے تھے جن کے اشعار تاریخ اور تذکروں کی زینت ہیں۔ ان میں فخر الدین مبارک شاہ، فرید کافی، جمال الدین محمد، خطیر الدین، ضیاء الدین اور مجد الدین کا بھی ذکر آتا ہے۔ امام فخر الدین رازی نے طویل عرصہ اس علاقہ میں گزارا۔ جن کی پچاس سے زیادہ گرانقدر تصانیف ہیں اور وہ ''امام المتشکین'' کے لقب سے معروف ہوئے۔

ساتویں صدی ہجری کی فہرست تو اور بھی طویل ہو جاتی ہے کیونکہ چنگیزی دہشت و بربریت سے متاثر ہو کر ہجرت کرنے والوں کے لیے ملتان ''دار الامان'' بن گیا تھا۔ ان مہاجرین میں مولانا قطب الدین کاشانی، محمد عوفی، شرف الدین احمد، بہاء الدین محمد واشی، خطیر الدین محمد، علی بن عمر الحمودی، ضیاء الدین ابوبکر، علی بن احمد، بہاء الدین محمد اوشی، خطیر الدین محمد، علی بن عمر الحمودی، ضیاء الدین ابوبکر، علی بن احمد بجاجی نے یہیں قیام کیا۔ جن کی قدر والی ملتان ناصر الدین قباچہ نے کماحقہٗ کی۔ مولانا قطب الدین کاشانی کی آمد پر قباچہ نے دائرۃ المعارف کی بنیاد رکھی جس نے ملحق مسجد بھی تعمیر کرائی۔ مولانا منہاج کے سپرد قدیم مدرسہ فیروزی کیا گیا۔

ان حضرات کے علاوہ اس عہد کی سب سے نمایاں شخصیت شیخ بہاء الدین زکریا تھی۔ جن کی خانقاہ میں رشد و ہدایت کے سرچشمے جاری تھے۔ ان کے درس میں بقول ملا جامی ستر علماء شریک ہوتے۔ ملتان کے علاوہ اجودھن اور ہانسی بھی اہم مراکز تھے۔

فارسی

اگر ہم اس ملک کے نقشہ کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مغربی سرحد ایران سے ملی ہوئی ہے ایسی حالت میں اگر ملک کے مغربی حصہ میں فارسی بولی اور سمجھی جاتی رہی ہو تو حیرت کی کوئی بات نہیں، یہ زبان عہد قدیم سے ہی ان علاقوں میں رائج تھی۔ جس کی تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی وجوہات ہیں۔ ان تمام کا ذکر تو ممکن نہیں اجمالی طور پر درج ذیل ہیں:

1۔ قرب مکانی کے باعث آپس میں ربط ضبط ناگزیر ہوتا ہے۔

2۔ طویل مدت تک یہ علاقہ ایران کے تحت رہا جس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے باشندوں کے درمیان ربط رہا۔

3۔ ایک وقت میں ہزاروں ایرانی ملک سے بدر کئے گئے تھے جو مکران، سندھ اور ملتان کے علاقوں میں

آباد ہوئے۔

4۔ تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے اس علاقہ میں ایرانی تاجروں کی آمد و رفت مسلسل رہتی۔

5۔ قبل اسلام علوم ہندسہ، نجوم اور طب کی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ یہ بین ثبوت ہے کہ اس علاقہ کے افاضل فارسی زبان سے بخوبی واقف تھے۔

6۔ حیوان کی زبان سے انسانوں کے اخلاق سدھارنے کی پہلی کتاب ''وینکرت مینکرت''، سنسکرت میں تھی جس کا ترجمہ ایک ایرانی حکیم نے فارسی زبان میں ''کلیلہ و منہ'' کے نام سے کیا۔

7۔ محمد بن قاسم کی فوج کی تشکیل خراسان میں ہوئی تھی جس میں بیشتر ایرانی تھے۔ فتح کے بعد بیشتر یہیں مسکون ہوئے جن سے فارسی کو رواج ملا۔

8۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں یہاں کے حاکم کا تقرر بھی خراسان سے ہی ہوتا۔ چونکہ اہل ایران قومیت کے ساتھ ساتھ لسانی اعتبار سے بھی متعصب ہوتے ہیں اس لیے انہوں نے بھی فارسی کو فروغ دیا۔

9۔ دور اسمٰعیلیہ میں اس علاقہ میں ایرانیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ رہا۔

10۔ فارسی زبان کی فطری شیرینی نے اس علاقہ کے اہل علم کے دلوں کو مسخر کیا۔

ان چند حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ علاقہ فارسی زبان سے بخوبی آشنا تھا جس کا ذکر عرب سیاحوں نے بھی اپنے سفرناموں میں کیا ہے جو مختلف ادوار مین یہاں آئے۔ اسی لیے دور غزنویہ کے بعد مملوکیہ میں فارسی ادب کے فروغ مین کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

ایران میں فارسی ادب کے نقوش یوں تو ساسانی عہد سے ملتے ہیں مگر فروغ ساسانی عہد میں ہوا۔ اسے ہم فارسی ادب کا بچپن کہہ سکتے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کے ربع آخر میں سبکتگین نے غزنوی حکومت کا آغاز کیا اور لاہور و ملتان کو بھی فتح کیا۔ یہ سلطان علم پرور تھا۔ اس کے بارے میں یوں ہے کہ اس کے دربار میں وابستہ دو اہم افاضل ابو نصر عتبی اور ابو الفتح بستی تھے۔ ابو نصر نے ''تاریخ یمنی'' لکھی جو محمود کے حالات پر مستند ترین مآخذ ہے۔ ابو الفتح اس عہد کا زبردست فارسی شاعر تھا۔

سبکتگین کے بعد محمود سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ بذات خود عالم و فاضل تھا۔ علماء و فضلاء و ادباء، شعراء کا قدردان اور سرپرست تھا۔ اس کے دربار سے وابستہ ایسی ہستیوں کی فہرست کافی طویل ہے جس میں تقریباً چار سو ہمیشہ سفر حضر میں ہمراہ رہتے۔ شعراء نے اس کے محاربات کا ذکر اپنے عقائد میں بخوبی کیا ان میں عنصری، فرخی، منوچہری، عضاتری، عسجدی اور اسدی جو دربار محمودی کے سبع سیارگان میں تھے۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ملتان کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ ملتان پر محمود غزنوی کی فتح کے بعد 405ھ کے بعد بیرونی دوسری بار ملتان آیا۔

ابراہیم غزنوی کے عہد میں اس علاقہ سے دو عظیم شاعر اٹھے اور دنیائے فارسی پر چھا گئے۔ جن کو بعد کے شاعروں نے بھی مانا۔ یہ تھے ابوالفرح رونی اور مسعود سعد سلمان۔ مسعود کے باپ سعد اور دادا سلمان بھی غزنوی دربار سے وابستہ رہے۔ ابوالفرح رونی کو مسعود کا استاد بھی بتایا جاتا ہے جس کی مدح بعد کے شعراء نے کی۔ ان میں انوری، عرفی اور فیضی خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس طرح بعد کے شعراء نے مسعود کی مدح کی۔ اس کے سب سے بڑے مداح سنائی غزنوی تھے جنہوں نے اس کے دیوان کو مرتب کیا۔ مسعود نے ''جبسیہ قصائد'' لکھ کر فارسی ادب میں نئے باب کا اضافہ کیا۔

اسی زمانہ میں تصوف اور صوفیوں سے متعلق دو نگارشات اسی علاقہ میں تصنیف ہوئیں۔ اول ''سیر الاقطاب'' اور دوئم ''کشف المحجوب'' غزنوی اور اس کے بعد غوری عہد میں علماء و فضلاء کی طویل فہرست ملتی ہے جو فارسی شاعری محض ذوق طبع کی خاطر کرتے۔ مداحی ان کا پیشہ نہ تھا پھر بھی عہد کے سلاطین کی مدح میں فصیح اور بلیغ قصائد لکھے۔ ان سلاطین نے خوب قدر دانی کی۔ کللیہ ومنہ جسے رودکی نے عربی سے فارسی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ نصر اللہ بن عبدالحمید نے اسی عہد میں سلیس فارسی میں لکھا اور کچھ نئے اضافے بھی کئے وہ اس زمانہ میں اسی علاقہ میں تھا۔

عہد مملوکیہ میں جبکہ ملتان کا والی قطب الدین ایبک کا داماد ناصر الدین قباچہ تھا۔ افاضل اور شعراء کا مجمع رہا۔ سلطان کے علاوہ اس کے لائق اور ہوشمند وزیر عین الملک اشعری نے ان کی قدر دانی کی قباچہ کے مرنے کے بعد ان سے وابستہ بیشتر ہستیاں مع عین الملک کے شمس الدین التمش کے ہمراہ دہلی جا کر اس کے دربار سے وابستہ ہو گئیں۔

فارسی گو شعراء جو ان اَدوار میں ہوئے ان میں علماء و فضلاء کے علاوہ پیشہ ور شاعر بھی تھے۔ علماء و فضلاء کا ذکر صریحاً کتابوں میں مع ان کے نمونہ کلام کے ملتا ہے۔ ان میں نظام الدین ابونصر، ابو العلا یعقوب بن عطاء شہاب الدین محمد ابن الرشید، نصر اللہ بن عبدالحمید، اختیار الدین روز بہ یوسف بن محمد دربندی، فخر الدین رازی، شرف الدین احمد، بہاء الدین محمد اوشی، خطیر الدین محمد وغیرہ ہیں جو عربی زبان کے بھی عالم تھے اور ان کا ذکر عربی کے ضمن میں آ چکا ہے۔

شعراء کی فہرست میں ابو عبداللہ نکاتی، ابو الفرح رونی، مسعود بن سعد، مختاری غزنوی، سعد الدین مسعود، شمس الدین مبارک شاہ، محمد بن ابوبکر روحانی، محمد بن علی سراجی، علی بن عمرا لغزنوی، جمال الدین ابوبکر خسروی، ضیاء الدین عبدالرافع ہروی، حمید الدین بن مسعود، احمد بن محمد ہانسوی، شہاب الدین سنجری، نجیب الدین ابوبکر ترمذی، شمس الدین محمد کاتب، فضلی ملتانی، ضیاء الدین سنجری، سراج الدین سراجی، عمید لویکی کا شمار ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ شعراء کی طویل فہرست ہے جو قباچہ کے دربار سے وابستہ رہی جن کا ذکر مجد الدین سید

الکتاب نے اپنی ''تذکرۃ الشعراء'' میں کیا تھا مگر اب وہ ناپید ہے۔ اس کا ذکر محمد عوفی نے اپنے تذکرہ ''لباب الالباب'' میں کیا ہے جو ملتان میں 614ھ میں مکمل ہوا۔ اس کے علاوہ عوفی کی دوسری تصنیف ''جوامع الحکایات ولوامع الروایات'' کی ابتداء یہیں ہو چکی تھی مگر تکمیل دہلی میں ہوئی۔ اسی طرح مولانا منہاج الدین کی ''طبقات ناصری'' کی ابتداء بھی یہیں ہوئی تھی مگر دہلی میں مکمل ہوئی۔

محمد بن قاسم کی فتوحات کا حال جو عربی میں تھا اور اوراق پریشان تھا حامد کوفی کو دستیاب ہوا اور اس نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ''چچ نامہ'' نام دیا۔ شیخ بہاء الدین زکریا کے اشارہ پر ان کے ایک مرید قاسم داؤد نے ''عوارف المعارف'' کی شرح فارسی زبان میں لکھی۔

شعراء کا ذکر دوسرے حصہ میں مع نمونہ کلام کے درج کیا جائیگا۔ صوفیاء کرام کا تفصیلی ذکر ''صوفیاء مملکت ملتان'' میں کیا جا چکا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصہ کے پہلے باب میں ان صوفیاء کا مختصر ذکر ہوگا۔ جنہوں نے فارسی زبان میں اشعار کہے ہیں نمونہ کلام بھی دیا جائے گا۔

اس باب کے آغاز میں میں دارالخلافہ ملتان کے لیے ایک شعر جو ضرب المثل ہو گیا ذکر آیا ہے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند سطور سپرد قلم ہوں شعر ہے

چہار چیز است تحفہ ملتان
گرد گرما گدا و گورستان

دارالخلافہ ملتان خط سرطان سے قریب تھار ریگستان کے کنارے پر واقع ہے۔ بحر عرب سے اٹھنے والی بارش کی مانسونی ہواؤں کو روکنے کے لیے کوئی پہاڑ نہیں۔ دوسری طرف خلیج بنگال کے جانب سے چلنے والی ہواؤں کو وہاں تک پہنچنے میں طویل سفر کرنا پڑتا ہے جس سے بارش کا سارا زور راستے میں ہی ختم ہو جاتا ہے اور یہ علاقہ بارش کی کمی کا شکار رہتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ موسم گرم وخشک رہتا ہے۔ ریگستان کی جانب سے چلنے والی طوفانی ہوائیں اپنے ہمراہ کثرت سے گرد وغبار لاتی ہیں۔ اس طرح گرد اور گرما قطعاً طبعی حالات ہیں جس کا شکوہ صرف قدرت سے ہی ہوسکتا ہے انسانوں سے نہیں۔

جہاں تک تیسرے تحفہ ''گدا'' کا تعلق ہے وہ مذہب، انسانی معاشرہ اور تہذیب سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا۔ مدد کرنا اور ان کی نگہداشت کرنا فطرت انسانی کا اہم جزو ہے۔ معاشرہ میں طبقاتی تفریق بھی ہے۔ امیر غریب، خوشحال پریشان، سخی اور دست سوال دراز کرنے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ مذہب بھی ضرورت مندوں کی حاجت روائی کی ترغیب دیتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اہل خیر ہوں گے تو اس سے فیضیاب ہونے والوں کا ہونا ناگزیر ہے۔ اہل خیر کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ حاجت مندوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا کیونکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ دارالخلافہ ملتان میں گدا کی بہتات کے چند خصوصی وجوہات سمجھ میں آتی ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں۔

1- مذہبی اہمیت کے سلسلے میں ذکر آ چکا ہے وہاں کے قدیم بت خانہ کی زیارت کے لیے زائرین کا سلسلہ تمام سال جاری رہتا جو دور دراز کی مسافت طے کر کے آتے اور حتی المقدور نذرانے پیش کرتے اس کے ساتھ خیرات بھی بانٹتے۔ اس کے علاوہ مندر اور حکمران وقت کی جانب سے داد و دہش کا سلسلہ جاری رہتا جس کی وجہ سے ''گدا'' کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوتا رہتا۔

2- دوسری وجہ یہ ہے کہ ملتان تجارتی مرکز تھا جہاں بیرونی ملک کے بھی تجار آتے۔ چونکہ ملتان کی منڈی کافی نفع بخش تھی اس لیے وہ لوگ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ خیرات کرتے جو کار ثواب جانتے اور آخرت کے لیے ایک حربہ سمجھتے۔

3- تیسری وجہ اسلام اور اس کی تعلیمات کا اثر تھا۔ اسلامی تعلیم میں ایثار اور قربانی کا اہم مقام ہے۔ دوسروں کی مدد کرنا آخرت سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ زکوٰۃ، خیرات اور صدقہ وغیرہ کی شکل میں نقد و جنس کے ذریعہ مدد ہوتی ہے۔ تقریباً ہر مسلمان اس بات کی فکر کرتا ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو سکے شرع پر عمل کرلے اسلام میں اگرچہ سوال کرنے کو معیوب اور ممنوع قرار دیا ہے پھر بھی گداگروں میں ایسی فریق نہیں، ہر مذہب کے ماننے والے ہر جگہ مانگنے پہونچتے۔ عوام کے علاوہ سلاطین اور امراء کی جانب سے لنگر جاری رہتے۔ مخصوص موقعوں اور تقریبات میں داد و دہش کا خصوصی اہتمام ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ان مراعات سے فیض پانے والوں کا وجود بھی ضروری ہوتا ہے۔

4- چوتھی وجہ یہ ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ملتان کو رشد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ علم دین ہونے کے ساتھ ساتھ جلیل القدر صوفی باصفا بھی تھے۔ عقیدت مند حاضر خدمت ہوتے جہاں ایصال ثواب اور آخرت میں بخشش کے لیے خیر و خیرات کرتے۔ خانقاہ زکریا کا لنگر خانہ بلا قید مذہب و ملت ہر فرد کے لیے کھلا تھا۔

شیخ زکریا کے بعد شیخ صدر الدین عارف اور رکن عالم ابو الفتح شیخ رکن الدین یہیں مدفون ہوئے۔ شمس تبریزی کا بھی مزار یہیں تھا۔ ان سب سے قبل شیخ جمال شاہ زدیری یہیں سپرد خاک ہو چکے تھے۔ ان حضرات کے مزارات مرجع خلائق بنے رہے اور عقیدت مندوں کا سلسلہ برابر رہتا ان سے خیرات حاصل کرنے کے لیے گدا بھی موجود رہتے بلکہ برابر اضافہ ہوتا رہا۔

اس کے علاوہ سب سے بڑی وجہ یہ بھی رہی کہ رفتار زمانہ کے ساتھ گداگری نے پیشہ کی شکل اختیار کر لیا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان کا ہر فرد پیدائشی گدا بن کر تعداد میں اضافہ کرتا رہا۔ انجام یہ ہوا کہ قلیل عرصہ میں گداگروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اسی کے ساتھ باہر سے آنے والے گداگروں نے مزید اضافہ کیا۔

ملتان کا چوتھا تحفہ ''گورستان'' بنایا ہے۔ اسلامی شرع کے مطابق مرنے والوں کو دفن کیا جاتا ہے۔ سرزمین ملتان نے یکے بعد دیگرے کئی زبردست معرکے دیکھے۔ پہلا معرکہ محمد بن قاسم کو پیش آیا۔ دوسرا

زبردست معرکہ محمود غزنوی اور اسمٰعیلی حکمران کے درمیان ہوا۔ تیسرا معرکہ بھی محمد غوری اور ملتان کے آزاد حکمراں اور اس کے بعد شمس الدین التمش اور ناصر الدین قباچہ کے مابین ہوئے۔ پہلے محاربہ کے بعد جتنی جنگیں ہوئی ان میں دونوں فریق اسلام کے ہی ماننے والے تھے۔ ان معرکوں میں ہزاروں فوجی مارے گئے جو وہیں دفن ہوئے۔ سلسلہ سہروردیہ کے صوفیاء کے علاوہ شاہ گردیز اور شمس تبریز کے مقابر وہیں ہیں۔ بعد کے ادوار میں اہل خاندان کے علاوہ اکثر مریدین نے بھی وہیں اپنا ٹھکانہ بنانا پسند کیا۔ ان حالات میں ملتان شہر گورستان کا ہونا چنداں تعجب خیز نہیں۔

(ملتان بحیثیت ادبی مرکز (فارسی) - ڈاکٹر رفیع الدین احمد کاظمی)



ڈاکٹر رفیع الدین احمد کاظمی

فرمانروایانِ ملتان

1۔ قبل اسلام

ملک ہندوستان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ اس ربع مسکون کی۔ اہل اسلام کے دعویٰ کے مطابق ان کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کا ملک یہی ہے چنانچہ ظہور اسلام سب سے پہلے یہیں ہوا۔ آزاد بلگرامی نے ''سبحۃ المرجان'' میں کئی صفحات اس ملک کے فضائل میں تحریر کئے ہیں اس میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کے قدم مبارک سب سے پہلے اسی سرزمین پر پڑے .... یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پہلی وحی زمین پر یہیں آئی۔ چونکہ حضرت آدمؑ کی پیشانی میں نور محمدی بطور امانت تھا تو یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا ابتدائی ظہور یہیں ہوا تھا۔ اسی لیے حضرت محمد ﷺ کا یہ قول ہے:

''مجھے ہندوستان کی جانب سے بوئے ربانی آتی ہے۔''

اس ملک میں جس جگہ پر حضرت آدم علیہ السلام کے قدم مبارک پڑے اسے ''سراندیپ'' کہتے ہیں جو اب لنکا کہلاتا ہے۔ وہاں کی پہاڑی پر قدم کا نشان آج بھی موجود ہے جسے ان کے قدم مبارک کا نشان کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک غیر معمولی لمبائی کی قبر بھی ہے جسے اولاد آدم یعنی شیث علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آریائی ویدک مذہب کے ماننے والوں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ وہ نشان سب سے پہلے انسان کا ہے جو زمین پر پڑا۔ یہیں اس کا جوڑا بھی پیدا کیا گیا۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ملک قدیم ترین ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جنوبی ہند کے قدیم حالات دستیاب نہیں جبکہ مغربی حصوں کی تاریخ، مذہب وتمدن کے آثار تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح سے ملنے لگتے ہیں بلکہ اس سے بھی قدیم تاریخ کا سراغ ملتا ہے۔ خصوصاً وہ دور جبکہ آریائی قوم وسط ایشیاء سے اٹھی اور اپنے علم، سیاست، تنظیم اور تدبر کے باعث قلیل عرصہ میں پورے ایشیاء پر قابض ہوگئی۔ جہاں پہنچی وہاں کے باشندوں کو اپنا غلام بنالیا۔ آنے والی نسلوں کے لیے علم وفن کے ساتھ ساتھ آریائی تہذیب کے گہرے نقوش چھوڑے۔

آریوں نے پہلی منظم حکومت ایران میں بنائی اور اس ملک کو ''اریان'' کا نام دیا جو بگڑ کر ''ایران'' بنا۔

یہاں کی پہلی حکومت پیشدادیوں کی بتائی جاتی ہے جس کا پہلا حکمراں کیومرث تھا، دوسرا ہوشنگ، تیسرا طہمورث اور چوتھا جمشید۔ یہ حکومت تقریباً دو سو سال رہی جسے آریوں کے دوسرے قبیلہ الموسوم بہ ''کیانیہ'' نے قبضہ کیا جس کا فرماں روا کیقباد بتایا جاتا ہے۔

ایران پر تسلط کے بعد ایک طبقہ ہندوستان کی جانب بڑھا اور خیبر اور بولن کے دروں سے داخل ہوکر تیزی سے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ رفتہ رفتہ پوری وادی سندھ میں قابض ہوکر پھیل گئے۔ یہاں پہلا حکمران ''کشن'' تھا جو ایرانی بادشاہ ''طہمورث'' کا ہمعصر تھا۔ کیقباد کے عہد میں موجودہ پنجاب سے لے کر سندھ تک ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ جہاں کا راجہ سورج رائے تھا۔

شاہ ایران نے قبضہ کے بعد سورج رائے کے ایک سالار کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور اسے داخلی امور میں کلی اختیارات عطا کئے اور خراج کی سالانہ رقم مقرر کی۔ یہ سالار رفتہ رفتہ طاقت حاصل کرتا گیا۔ حکومت کو وسعت دے کر مشرق میں بنگال اور دکن کے علاقوں پر قابض ہو گیا۔ اس نے رعایا کی بہبود کے لیے نمایاں کام کئے۔ زراعت کو انتہائی فروغ دیا۔ نئی نئی عمارتیں بنوائیں۔

اسی زمانہ میں یہاں بت پرستی کا رواج شروع ہوا۔ ایک برہمن کوہ چہار کندا سے آیا۔ وہ خود کو علوم غیبیہ اور سحر کا ماہر بتاتا۔ رفتہ رفتہ وہ راجہ کے مزاج میں ایسا دخیل ہو گیا کہ ہر معاملہ میں اس کا خصوصی مشیر بن گیا۔ چنانچہ اس نے بت پرستی کو حکومت کی سرپرستی میں فروغ دیا۔ رفتار زمانہ کے ساتھ بت پرستوں کے پچیس فرقے ہو گئے اور ایسا رواج ہوا کہ لوگ اپنے اسلاف کے بت بنوا کر ان کی پرستش کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ ہی سورج چاند اور ستاروں کی بھی پوجا شروع ہوئی۔

سورج رائے کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا بہراج جانشین ہوا۔ کچھ عرصہ بعد نظم ونسق میں کوتاہی اور لاپرواہی کے باعث طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا جسے اس کے درباریوں میں سے ایک نے کہ جس کا نام کیدار رائے تھا نامزد کیا۔ اسی کیدا رائے کی اولاد محمد بن قاسم کے حملہ تک ملتان اور سندھ پر قابض رہی۔ سندھ میں راجہ داہر اور ملتان میں اس کا چچازاد بھائی گورسیہ حکمران تھے۔ محمد بن قاسم نے 93ھ سے لے کر 96ھ تک بحر عرب سے لے کر سرحد کشمیر تک فتح کر کے اسلامی قوانین نافذ کئے اور علاقہ داروں کو ان پر سختی سے عمل درآمد کرنے کی تاقید کی۔

(ب) بعد اسلام

ا۔ دور بنو امیہ

سندھ اور ملتان میں باقاعدہ اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پہلے سے عرب اور ہندوستان کے درمیان مذہبی، تجارتی اور سیاسی تعلقات تھے۔ اس بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی کی ایک مستقل تصنیف ''عرب و ہند کے

تعلقات'' کے نام سے ہے جو اس سلسلے میں بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے۔ قبل اسلام دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات میں استواری کی اہم وجہ بت پرستی تھی۔ کیونکہ عرب میں بھی بہت بڑا صنم خانہ تھا۔ قبول اسلام کے بعد عربوں کی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلی ہوئی، عرب مسلم تجار کے ساتھ ساتھ اسلام کی عملی اشاعت کو بھی اپنا شعار بنایا۔

ان عرب تجار نے اپنے اسلامی کردار سے غیر قوموں کو متاثر کیا اور کافی لوگ ساحلی علاقوں میں مسلمان ہو گئے۔ یہ تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ خلیفہ دوم کے عہد میں ایران فتح ہوا۔ قرب مکانی کے باعث ہندوستان پر بھی ہلکے پھلکے حملے ہوتے رہے۔ اگرچہ کوئی علاقہ فتح نہیں ہوا پھر بھی مسلمانوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

سرزمین عرب میں تبدیلیاں ہوئیں۔ خلیفہ چہارم کی شہادت کے بعد باگ ڈور بنو امیہ کے ہاتھوں میں آئی۔ جنہوں نے اسے جمہوری سے موروثی میں بدل دیا اور دارالخلافہ ملک شام میں دمشق قرار پایا۔ اسلامی حدود میں وسعت ہونے لگی اور اسی کے ساتھ بنو ہاشم اور بنی امیہ کی خاندانی رقابت رنگ لائی۔ بنو امیہ نے غلبہ پاتے ہیں بنو ہاشم کے افراد پر سختیاں شروع کیں جس سے پریشان ہو کر نقل وطن کرنے لگے، ایران اور عراق کو اپنا مسکن بنایا۔ اہل ایران نے سیاسی مصالح کے باعث اہل مساوات کی خوب قدردانی کی اور ان کی آڑ لے کر خلافت کے خلاف خفیہ تحریکوں کا آغاز کیا۔

86ھ میں ولید اموی خلیفہ ہوا۔ اس نے یوسف بن حجاج کو خراسان، ایران، عراق اور مکران کا حاکم مقرر کیا۔ عرب اور ہندوستان کے حالات سے باخبر رکھتے۔ بحر عرب میں قزاق بھی سرگرم تھے، انہوں نے دانستہ اور نادانستہ اسلامی جہاز کو تاراج کیا اور سامان کے ساتھ تمام لوگوں کو قید کر لیا، ان میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ عورتیں راجہ داہر والی سندھ کے سپرد کر دی گئیں۔ اس کی خبر جب اسلامی دارالخلافہ میں پہنچی تو خلیفہ کی جانب سے والی سندھ سے قیدیوں اور ان کے سامان کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا مگر راجہ داہر نے اس درخواست کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ چنانچہ اسیروں کی رہائی کے لیے سندھ پر حملہ کا حکم دیا گیا چنانچہ حجاج نے خراسان سے فوج کی تشکیل کی اور اپنے ہونہار اور کمسن بھتیجے محمد بن قاسم کو اس کا سالار مقرر کیا۔

یہ فوج بحر ہند سے حملہ آور ہوئی اور دوسری فوج خشکی کے راستہ سے۔ چونکہ سندھ کی رعایا در پردہ اپنے حکمران کے سلوک سے ناخوش تھی اس لیے محمد بن قاسم کو سندھ اور قرب و جوار کے علاقوں کو فتح کرنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کے علاوہ بدھ مذہب کے ماننے والوں نے بھی محمد بن قاسم کو اندرونی خامیوں سے باخبر کیا چنانچہ اس نے 93ھ سے لے کر 96ھ تک ساحل بحر عرب سے کشمیر کی سرحد تک کے علاقوں کو زیرنگیں کیا اور اسلامی قوانین نافذ کیے۔ مذہبی آزادی، عدل اور امن کا دور دورہ ہو گیا۔

محمد بن قاسم نے باوجود نوعمری کے جس حسن تدبر سے ان مفتوحہ علاقوں کا انتظام کیا اس کی نظیر کمتر ملتی ہے۔ اس نے صرف علاقوں کو ہی نہیں فتح کیا بلکہ وہاں کے عوام اور خواص کو اپنے حسین کردار سے مسخر کیا۔ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف جو زہر غیر اسلام والوں میں تھا اسے یکسر مٹا دیا۔ کثیر آبادی نے اسلام قبول کیا اور پھر ان نومسلموں

نے بھی مذہب کی اشاعت میں سرگرم حصہ لیا۔ اس عہد میں ملتان، منصورہ اور دہلی کی جو ترقی ہوئی وہ کوفہ اور بصرہ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس دور کی تاریخ و رجال کی کتابوں میں یہاں کے علماء کے تذکرے اس انداز میں ملتے ہیں جس انداز میں بغداد، مصر، شام اور بخارا وغیرہ کے علماء کا ذکر ہوتا ہے۔ اسلامی سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے سندان، مکران، ملتان، منصورہ، دیبل، مکران اور طوران وغیرہ مقامات کا تذکرہ اپنے سفرناموں میں عالم اسلام کے قابل قدر حصہ کی حیثیت سے کیا ہے۔

ولید کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سلیمان خلیفہ بنا جس نے محض اپنے ذاتی عناد کے باعث نہ صرف محمد بن قاسم کو معزول کیا بلکہ دارالخلافہ بلا کر قتل کر دیا۔ یہ موت محمد بن قاسم کی نہ تھی بلکہ اموی خلافت کی تھی۔

محمد بن قاسم کی موت پر مملکتِ اسلامیہ خصوصاً عرب، عراق، سندھ اور ملتان کے لوگوں نے خون کے آنسو بہائے۔ شعراء نے پر درد مرثیے لکھے۔ عربی نژاد شاعر حمزہ بن بیض حنفی کہتا ہے۔

انا السماعة الذی

محمد بن قاسم ابن محمد

باد الجیوش یسمع عشرة حجة

باقرب ذالک سرمداً من مولد

(بہادری، وسعت قلبی اور فیاضی محمد بن قاسم کے حصے میں تھی سترہ سال کی عمر میں نوجوانوں کا سردار بن گیا۔ یہ سرداری زمانہ ولادت سے کتنی قریب ہے۔ یعنی نوعمری میں سرداری ملی)

ایک دوسرے عربی شاعر نے کہا:

ساس الرجال بسمع عشر حجة

والدانه من ذالک فی اشغال

(سترہ برس کی عمر میں یہ سردار بن گیا اور اس کے ہم عمر لڑکے ابھی کھیل ہی میں لگے ہوں گے۔)

سندھیوں نے بھرپور ماتم منایا۔ کیرج (جے پور) کے باشندوں نے محمد بن قاسم کی بہادری، فیاضی، مروت اور احسان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس کا مجسمہ بنا کر اپنے شہر میں نصب کیا اس کا ذکر عرب سیاح بلاذری نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔

محمد بن قاسم کے قتل کے بعد دارالخلافہ میں بھی حالات تیزی سے بدلے حکمران کی نااہلی، عیش کوشی کے نتیجہ میں بنوعباس نے غلبہ حاصل کر کے اموی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور دارالخلافہ دمشق کے بجائے بغداد قرار دیا۔ مرکز کے دور دراز علاقوں میں بھی آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔ چنانچہ 111ھ میں ملتان بھی آزاد ہو گیا۔ اور منصورہ پر جے سنگھ نے قبضہ کر لیا۔

ملتان اور سندھ کی خود مختار حکومتوں کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مقامی افراد یا قبیلوں

خلافت کے مقابلہ میں قدم نہیں اٹھایا بلکہ خود عربوں نے آزاد حکومتیں قائم کیں غزنویہ اور غوریہ یہ سارے قبائل عجمی تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں آزاد حکومتیں قائم کیں مگر سندھ اور ہندوستان میں ان ادوار میں بھی یہاں کا حکمران نہ تھا بلکہ وہ سب عرب قبائل میں سے تھے۔ ہند و سندھ کی ان آزاد حکومتوں میں پانچ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

1۔	سنجان	دولت ہامانیہ
2۔	منصورہ	دولت ہساریہ
3۔	ملتان	دولت سامیہ
4۔	تیز (مکران)	دولت معدانیہ
5۔	قصدار	دولت متغلبیہ

محمود غزنوی نے ان تمام علاقوں کو اپنے قبضہ اقتدار میں لانے کے بعد حاکم ملتان کے تحت کئے۔ اا دور کا علاقہ بھی ملتان کے تحت کیا گیا۔ غزنوی عہد سے قبل یہاں بنو عباس، بنو سامہ اور اسمٰعیلیوں کی حکومت تھی جس کا ذکر الگ الگ کیا جا رہا ہے۔

2۔ دور بنو عباسیہ

سلطنت کے حدود کو وسعت دینا اور پھر مقبوضہ علاقوں میں نظم و نسق کے ذریعے تسلط برقرار رکھنا دارالخلافہ کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ خصوصاً ان علاقوں میں جو دور دراز واقع ہیں۔ بے شک دور بنو امیہ میں سلطنت کے حدود میں کافی وسعت ہوگئی مگر رفتہ رفتہ حکمران کی تساہلی، نااہلی اور عیش پرستی کے باعث مملکت میں خلفشار ہوتا گیا۔ بنو ہاشم پر تشدد اور ظلم و ستم سے عوام بھی پریشان ہو گئے۔ سادات کی موافقت میں سب سے زیادہ منتظم اور طاقتور بنو عباس کا قبیلہ تھا۔

پیغمبر اسلام کے وصال کے بعد اسلام میں اندرونی خلفشار کے آثار شروع ہو گئے کیونکہ رسول کے بعد ایک گروہ ایسا قائم ہوا جو حضرت علیؓ کو جانشین بنانا چاہتے تھے، مگر ایسا نہ ہو سکا اور یکے بعد دیگرے تین خلیفہ حضرت علیؓ سے قبل ہوئے۔ اور حضرت علیؓ کا دور خلافت بھی بنو امیہ کے باعث پرسکون نہ رہا چنانچہ ان کے بعد بنو امیہ برسر اقتدار آ گئے اور بن ہاشم نیز شیعان علی پر تشدد شروع ہوئے۔ نتیجہ میں بنو امیہ کو ختم کرنے کے لیے منظم سازشوں اور بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اپنی تحریک کو وسعت دی چنانچہ بنو امیہ شیعان علی کی خفیہ سازشوں اور بنو عباس کی اعلانیہ بغاوت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ آخر کار عنانِ حکومت بنو عباس کے ہاتھوں میں آئی اور دارالخلافہ دمشق سے بغداد ہو گیا۔ جیسا کہ ذکر گزر چکا ہے۔

اس خاندان کے حکمرانوں میں ہارون رشید اور مامون رشید کے عہد ہر لحاظ سے شاندار ہیں۔ علم و ادب کی

کماحقہٗ خدمت کی اور فروغ ہوا مگر شیعانِ علی اس خلافت سے بھی مطمئن نہ تھے اور خفیہ سازش میں سرگرم رہے۔ کیونکہ وہ صرف اولادِ علی کو ہی حکمران کی حیثیت سے قابل قبول سمجھتے تھے۔

دور بنو امیہ میں مشرق بعید کے اسلامی علاقوں میں حاکم کا تقرر خراسان سے ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ روایت عہد بنو عباس میں قائم رہی۔ 151ھ میں ان علاقوں کا حاکم ہشام بن تغلبی کو مقرر کیا گیا، اس کے زمانہ میں ملتان جو کچھ عرصہ قبل آزاد ہو چکا تھا پھر بنو عباس کے تحت ہو گیا۔ 180ھ سے قبل ملتان پھر آزاد ہو گیا۔ 184ھ میں والی سندھ محمد بن عدی نے حملہ کیا مگر ناکام رہا۔ اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

اول یہ کہ ملتان میں تین آزاد حکومت ہو چکی تھی۔

دوسرے یہ کہ یہاں کا حاکم مسلمان ہی تھا جس کا تعلق سندھ سے نہ تھا۔ اگر غیر مسلم حکومت ہوتی تو ذکر ملتا جس طرح برہمن آباد (منصورہ) اور الور کے بارے میں ملتا ہے۔ جہاں غیر مسلم حکومتیں تھیں۔ اس کے بعد بنو سامہ کی حکومت کا قیام یعنی 280ھ تک کے حالات کے بارے میں تاریخ کے اوراق خاموش ہیں۔

3۔ دور بنو سامہ

بنو امیہ کے بعد ملتان پر بنو عباس کا اقتدار مختصر رہا۔ اس کے بعد 270ھ میں تقریباً 280ھ کی درمیانی مدت میں بنو سامہ کی آزاد حکومت کا ذکر ملتا ہے۔ اس حکومت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ آزاد حکمران ہوتے ہوئے بھی خلیفہ بغداد کی برتری تسلیم کرتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی سیاسی وجہ رہی ہو۔ بن سامہ کی حکومت کا ذکر ان عرب سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے جو ملتان آئے تھے۔

بنو سامہ کون تھے؟ ابن قتیبہ دینوری کی تصنیف ''کتاب المعارف'' کے مطابق یہ قبیلہ قریش میں ایک شخص فہد نامی تھا جس کا لقب ''قریش'' تھا جس کے نام پر پورے قبیلے کا نام ہوا۔ اس کے پوتے ''لوئی'' سے کئی قبیلے قریش کے عالم وجود میں آئے۔ کعب، عامر، خزیمہ اور حارث۔ ان میں کعب بن لوئی سے پیغمبر اسلام کا نسبی تعلق تھا۔ سامہ بن لوئی سے ملتان کے سامی حکمران ہیں۔ سامہ نے مکہ سے نکل کر عمان میں سکونت اختیار کی اور وہیں فوت ہوا۔ اس کی اولاد وہیں مقیم رہیں۔ ''کتاب المجرس'' کے مطابق یہ لوگ عمان میں بنو آذر کے حلیف تھے۔ مصعب بن زبیری نے ''نسب قریش میں'' سامہ بن لوئی ناجیہ بتایا ہے۔ پیغمبر اسلام نے سامہ بن لوئی کے بارے میں فرمایا کہ وہ ہمارے قبیلہ سے ہیں یہ قبیلہ کب اسلام لایا، قطعی طور سے نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ لوگ عہد رسالت میں ہی اسلام قبول کر چکے تھے جس کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔

اسلامی سیاحت اور حکومت میں پہلی بار ان کا اجتماعی ظہور واقعہ تحکیم کے بعد تقریباً 38ھ میں ہوا اور دوسری بار تقریباً 200ھ اور تیسری بار پوری شان و شوکت کے ساتھ خلیفہ معتضد کے دور 290ھ تا 380ھ کے درمیان ہوا جب عمان اور اسی کے ساتھ ملتان میں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ تمام مورخین اور نسابوں کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے

کہ عمان میں بنو سامہ کو خوب عروج ہوا۔ ابتدا ہی سے ان میں آدمیوں کی کثرت اور فہم و فراست کی فراوانی تھی۔ بعد میں ان میں کئی صاحب اقتدار و سیاست اور صاحب فضل ہوئے چنانچہ حکمران بنو سامہ محمد بن قاسم کے ایک آزاد کردہ غلام فضل بن ہارون نے ملتان میں بنو سامہ کی حکومت کے قیام سے قبل سندان میں محض اپنی لیاقت اور فراست کے باعث آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔

خلیفہ معتصم کے دور میں بنو سامہ کے ایک سردار محمد بن قاسم نے خلیفہ کے اشارہ اور کمک سے خوراج کے شورش اور بغاوت کو فرو کر کے عمان میں اپنی حکومت قائم کر لی اور عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری کیا۔ اسی عہد میں خوارج علویوں اور قرامطیوں کی مخالفت شدت پکڑ چکی تھی۔ یہ فرقے تمام عالم اسلام میں خفیہ تحریک کے ذریعے شورش اور بغاوت کی تحریک میں منہمک تھے۔ بنو سامہ کی حکومت عمان میں 375ھ تک قائم رہی جو مسلسل ایسی تحریکوں کے خلاف برسرِ پیکار رہی اور آخر انہیں کے ہاتھوں نوے سال کے بعد ختم ہوگئی۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ بنو سامہ نے عمان میں حکومت قائم کر لی۔ یہ علاقہ سندھ اور مکران سے دور نہیں۔ گمان غالب ہے کہ عمان کے بعد بنو سامہ کے تعلقات سندھ اور مکران سے قدیم تھے۔ جس کی ابتدا ابن راشد نامی ناجی کی مکران آمد سے ہوتا ہے۔

اس کے بعد پہلی صدی ہجری کے نصف ثانی میں سامی خاندان کے ایک فرد حمیم بن سامہ سامی کے ہندوستان میں حاکمانہ غلبہ و اقتدار کا پتہ چلتا ہے جو کشمیر کے نواح میں تھے۔ ان کی اولاد مدتوں وہاں حکمراں رہی۔ تقریباً ایک صدی بعد بنو سامہ کے ایک فرد فضل بن ہارون نے سندھ سے گزر کر سندان میں اپنی حکومت قائم کی 279ھ میں محمد بن قاسم نے عمان کے بعد ملتان پر بھی اپنا اقتدار جما لیا۔ اس دور میں عمان اور ملتان کے حالات میں یکسانی رہی۔

علویوں، قرامطیوں، خوارج اور اسمٰعیلیوں کی ریشہ دوانیاں خلفاء بنو عباس کے خلاف سندھ، بکران، سندان اور ملتان میں بھی جاری رہیں ملتان کی حکومت کافی مستحکم تھی جو شخصی سے زیادہ جمہوری تھی ملتان کی سامی حکومت کا ذکر عرب سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کافی تفصیل سے کیا ہے۔ ابن رستہ نے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا جو 290ھ میں ملتان آیا۔ لکھتا ہے:

> ''ملتان میں ایک قوم رہتی ہے جو دعویٰ کرتی ہے کہ وہ سامہ بن لوئی کے خاندان سے ہے۔''

اس کے دس سال بعد 300ھ میں مسعودی ملتان آیا وہ رقمطراز ہے:

> ''ملتان کا امیر جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہاں کی حکومت سامہ بن لوئی بن غالب کے ہاتھوں میں ہے۔ ملتان اسلامی حکومت کی بڑی سرحدوں میں سے ایک ہے۔ ملتان کے تابع اس کے چاروں طرف ایک لاکھ

بیس ہزار گاؤں ایسے ہیں جو شمار میں آتے ہیں۔ میرا جانا ملتان میں 300ھ کے بعد ہوا اس وقت وہاں کا بادشاہ ابوالدلباب منبہ بن اسد قریشی تھا۔....''

مسعودی کے چالیس سال بعد 340ھ میں اصطخری وارد ملتان ہوا۔ بیان کرتا ہے:

''شہر مولتان منصورہ سے آدھا ہے۔ شہر کے باہر آدھے فرسخ پر عمارتیں ہیں جن کا نام ''چندراون'' ہے۔ یہیں فوجی کیمپ ہے۔ بادشاہ یہیں رہتا ہے وہ نسلاً قریشی ہے اور سامہ بن لوئی کے خاندان سے ہے۔''

اصطخری کے تقریباً ستائیس سال بعد 367ھ ابن حوقل ملتان آیا۔ یہ اس کا دوسرا سفر تھا اس سے قبل وہ 331ھ میں آیا تھا۔ آخری سفر کے دوران بھی یہاں بن سامہ کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں ملتان کے باطنیوں اور اسمٰعیلیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا مگر ابن حوقل کے آٹھ سال بعد بشاری جب ملتان آیا تو وہ بتاتا ہے کہ ملتان والے شیعہ ہیں اور اذان میں حی الاعلیٰ خیر العمل کہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ 350ھ میں ملتان پر اسمٰعیلیوں کی حکومت ہو گئی تھی۔ یہ کیسے قائم ہوئی اور انہوں نے کیونکر غلبہ پایا اس کا ذکر ''دور اسمٰعیلیہ'' میں کیا جائے گا۔ ملتان میں بنو سامہ کی حکومت تقریباً 90 سال رہی۔ حدود میں کافی اضافہ ہوا۔

بقول وزیر مہلبی مغرب میں حدود مکران اور جنوب میں منصورہ تک اس کی وسعت تھی۔ کنوج بھی ملتان میں شامل تھا۔

4۔ دور اسمٰعیلیہ

پیغمبر اسلام کی زندگی ہی میں کلمہ توحید پڑھنے والوں کے دو گروہ ہو گئے تھے ایک وہ جس نے رسول کو سچا اور برحق مان کر بصد رضا و رغبت اسلام قبول کیا اور دوسرا وہ گروہ جس نے وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر زبان سے کلمہ تو پڑھ لیا لیکن دل میں نفرت اور دشمنی کا جذبہ لیے رہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کو ''منافق'' کا نام دیا گیا ہے۔ ان میں دو اہم ترین ہستیاں تھیں۔

ایک ''ابوسفیان'' اور دوسرا ''عبداللہ ابن سبا'' جس نے اسلام قبول نہ کیا مگر ہمیشہ رسول کی زندگی کے درپے رہے۔ فتح کے بعد یہ لوگ بے بس ہو گئے اور مصلحتاً کلمہ پڑھ لیا۔ مگر ان کی ریشہ دوانیاں چلتی رہیں۔

رسولؐ سے ابوسفیان کی دشمنی آبائی تھی جو ان کے جد اعلیٰ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی زندگی سے ہی شروع ہو گئی تھی اور نسلاً بعد نسلاً رنگ لاتی رہی۔ ہاشم کے بعد ان کی اولادوں کو خانہ کعبہ کی تولیت ملی جو اس عہد کا سب سے بڑا بت خانہ تھا۔ اس کی وجہ سے بنو ہاشم کو عوام و خواص میں قدر و منزلت اور مقبولیت تھی۔ اس میں ان کے ذاتی کردار کو

بڑا دخل تھا جو ایام جاہلیت میں قابل رشک تھا۔

بنو امیہ ہر دور میں بنو ہاشم کے درپے رہے اور انہیں زک پہنچانے کے مواقع تلاش کرتے رہے مگر اپنے عزائم میں ہمیشہ ناکام رہے۔ اعلانِ اسلام کے بعد پیغمبر کی مخالفت میں میر کارواں بنے رہے۔ فتح مکہ کے بعد ان کا سارا زور ختم ہو گیا مگر دل میں بغض و عناد کی آگ میں جلتے رہے اور بنو ہاشم سے انتقام لینے کا مناسب موقع تلاش کرتے رہے۔

رسولِ خداؐ کے وصال کے بعد اسلام کی سربراہی کا مسئلہ نزاعی بن گیا۔ ایک گروہ رسولؐ کی حدیث کے مطابق رہنما کا انتخاب جمہوری طرز پر کرنا چاہتا تھا مگر دوسرا اس سے متفق نہ تھا جو بنو ثقیفہ کا تھا۔ رسول خداؐ سے خاندانی قربت، رفاقت اور علمیت کے باعث وہ حضرت علیؓ کو اصل جانشین مصلحتاً قرار دیتا۔

دراصل یہ فتنہ عبداللہ ابن سبا کے ذہن کی پیدا کردہ تھی۔ جو نسلاً یہودی تھا اور جسے مسلمانوں کا اتحاد برداشت نہ تھا۔ اس نے منافقین اور خلافت کے دعویداروں کو آلۂ کار بنایا۔ قبول اسلام کے بعد یہ تحریک خفیہ چلانا شروع کر دی تھی۔ اس نے علی کی جانشینی کے لیے رسول کے، غدیر خم، کے اعلان کو جواز بنایا تھا۔ اگرچہ یہ اعلان دوسری نوعیت کا تھا۔

بہرحال خلافت پہلے فرقہ کو ملی اور خود ساختہ حامیان یا شیعان علی کے دلوں میں نفرت اور حسد کا جذبہ شدت پکڑ گیا۔ حضرت علیؓ بذات خود اس تفریق کے حق میں نہ تھے کیونکہ وہ اسلام کے مفاد کے منافی تھا۔ انہیں یہ قطعاً گوارہ نہ تھا کہ انہیں پشت پناہ بنا کر ایسا عمل کیا جائے جس سے مسلمانوں میں باہم تصادم ہو۔ وہ ولایت کی اعلیٰ ترین منزل پر فائز تھے اور اس تصادم کے ہولناک اور بدترین نتائج سے بخوبی واقف تھے۔

خلفاء اول و دوم اپنی خلافت کے دوران حضرت علیؓ کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہے لیکن خلیفہ دوم کی شہادت کے بعد امویوں کو اپنی سیاست اور ریشہ دوانیوں کے باعث حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کرانے میں کامیابی ملی۔ حضرت عثمانؓ کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔ اس دور میں انہیں ابھرنے کا اچھا موقع ملا اور انہوں نے کافی طاقت حاصل کر لی۔

اس عہد میں بنو ہاشم کے افراد کو اہم عہدوں سے برطرف کیا گیا اور ان کی جگہ بنو امیہ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے بنو ہاشم پر سختیاں شروع کیں۔ شروع میں تو انہوں برداشت کیا مگر کب تک۔ آخر ان لوگوں نے خلافت کے خلاف احتجاج شروع کئے۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ خلیفہ نے وزارت عظمیٰ مروان کے سپرد کی تھی جسے رسولؐ نے اپنی زندگی میں جلاوطن کر دیا تھا اور جو حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد ہی واپس آ سکا تھا۔

حضرت علیؓ کے خلیفہ ہوتے ہی امیوں نے نیا رخ اختیار کیا چونکہ شیعان علی کی تحریک ان کی موافقت سے منسوب تھی اس لیے حضرت عثمانؓ کی شہادت میں انہیں بھی ملوث گردانتے ہوئے قصاص طلب کیا اور رائے عامہ ہموار کی۔ حضرت علیؓ نے ہر چند اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی مگر لا حاصل۔

انہوں نے ایسے لوگوں کا اعلان کیا کہ جو بھی اس عمل میں شریک رہے ہوں الگ ہو جائیں نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گروہ آگے چل کر ''خوارج'' کے نام سے مشہور ہوا۔ انہیں خوارج کی وجہ سے حضرت علیؓ کو مسلسل جنگوں سے سابقہ رہا۔ اپنا صدر مقام مدینہ سے کوفہ منتقل کیا اور بالآخر انہی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ یہ معاملہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ بدترین شکل میں کربلا میں پیش آیا جس میں بنوامیہ کی جانب سے ظلم و بربریت کا ایسا مظاہرہ ہوا جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے حسنؓ جانشین ہوئے جبکہ شیعان علی کے ایک گروہ نے دوسرے بیٹے محمد حنفیہ کو پسند کیا اور ان کی جانشینی کے لیے خفیہ تحریک چلائی اسے پہلی ''باطنی تحریک'' کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کا بانی مختار بن ابوعبید ثقفی تھا جو کیسان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے لوگوں کو یہ باور کرانا شروع کیا حضرت علیؓ نے محمد حنفیہ کو ہی اپنی زندگی میں جانشین نامزد کیا تھا۔ یہ فرقہ ''کیسانیہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ شیعان علی اب چار حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔

1۔ فرقہ سبائیہ:

اس فرقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے وفات نہیں پائی وہی قائم مہدی ہیں اور وقت موعود پر ظاہر ہوں گے۔ اس کا بانی عبداللہ بن سبا تھا۔

2۔ فرقہ نصیریہ:

یہ فرقہ حضرت علیؓ کی الوہیت کا قائل تھا۔

3۔ فرقہ امامیہ:

اس فرقہ کے مطابق اصل جانشین حسنؓ تھے آگے چل کر یہ فرقہ ''اثناء عشریہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

4۔ فرقہ کیسانیہ:

اس فرقہ کے اصل جانشین محمد حنفیہ تھے۔ بانی مختار ثقفی تھا۔

یہ چاروں فرقے اگرچہ اعتقادی طور پر کچھ اختلاف رکھتے تھے مگر سیاسی اعتبار سے باہم اتحاد و اتفاق تھا یعنی خلافت کی مخالفت اور ان کی بھی مخالفت جو ان جیسے عقائد نہ رکھتے ہوں۔ یہ لوگ اپنی سیاسی فراست کے باعث حکومت کے اہم ستون بنے اور نمایاں کام انجام دیئے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر رہ کر خلافت کے خلاف بیخ کنی کرتے رہے۔

چھ اماموں تک یہ چاروں فرقے اپنے اپنے اعتقادات پر گامزن رہے مگر امام ششم حضرت جعفر صادقؒ کی رحلت کے بعد جانشینی کا معاملہ پھر نزاعی بن گیا جس کے نتیجہ میں نو فرقے اور عالم وجود میں آ گئے۔ یہ فرقے وقت کی رفتار کے ساتھ ختم ہو گئے مگر فرقہ اسمٰعیلیہ مستقلاً قائم رہا اور آج بھی موجود ہے۔

حضرت امام جعفر صادق کے کئی فرزند تھے فرزند اکبر اسمٰعیل تھے۔ باپ نے اپنی زندگی میں انہیں جانشین بنایا تھا مگر انتقال باپ کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا ان کے ایک بیٹا محمد تھا۔ چنانچہ اعتقاد کے لحاظ سے مندرجہ ذیل فرقے پیدا ہو گئے۔

1۔فرقہ نارسیہ:

اس فرقہ کے مطابق امامت حضرت صادق پر ختم ہو گئی وہی موعود ہیں۔

2۔فرقہ افطحیہ:

اس فرقہ کے مطابق جانشینی ان کے بیٹے افطحیہ کو ملی۔

3۔فرقہ سبعیہ:

اس فرقہ کی رو سے امام جعفر صادق کے بعد ان کے بیٹے اسمٰعیل کو ملی اور ختم ہو گئی۔ ان کی رحلت نہیں ہوئی بلکہ انسانی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے اور وقت موعود پر ظاہر ہوں گے وہی امام مہدی اور امام منتظر ہیں۔

4۔فرقہ شمطیہ:

اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ امام ششم کے بعد امامت ان کے بیٹے دیباج کو ملی۔ اس کے بعد ان کے اعقاب کو پہنچی۔

5۔فرقہ اسمٰعیلیہ:

اس فرقہ کے مطابق حضرت جعفر کے بعد امامت ان کے بیٹے اسمٰعیل کو ملی وہ قائم مہدی اور خاتم سلسلہ امامت ہیں۔

6۔فرقہ مبارکیہ:

اس فرقہ کے اعتقاد کے مطابق امام ششم کی رحلت کے بعد امامت ان کے پوتے محمد بن اسمٰعیل کو ملی کیونکہ اسمٰعیل کا انتقال باپ کی زندگی میں ہو چکا تھا۔

7۔فرقہ امامیہ:

اس فرقہ کی رو سے چونکہ اسمٰعیل کا انتقال باپ کی زندگی میں ہو چکا تھا اس لیے امامت موسیٰ کاظم کو ملی۔ یہی فرقہ اثناء عشریہ کہلایا۔

8۔فرقہ قرامطیہ:

یہ فرقہ دراصل فرقہ مبارکیہ کی ہی ایک شاخ ہے، البتہ معتقدات میں فرق ہے۔ بنیادی عقیدہ یکساں ہے۔ اس فرقہ کا بانی کرمتیہ یا قرمطہ تھا جو نسلاً ''بنتی'' ہے۔

9۔فرقہ باطنیہ:

یہ فرقہ بالکل الگ عقیدہ رکھتا تھا۔ احکام مذہب میں تاویلات کو روا رکھتا اور بقول خود باطن شریعت کا رمز ہوتا ہے۔ یہ فرقہ ظاہر کے مقابل تھا جو اہل سنت کا عقیدہ تھا۔ اس طریقہ کا موسس سلیمان بن داؤد بن علی اصفہانی تھا۔ کبھی کبھی قرامطی اور اسمٰعیلی فرقہ کو بھی باطنی کہا گیا ہے کیونکہ خلافت اور سنیوں کے خلاف ان کی تحریکات خفیہ طور سے ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ عقائد کی تبلیغ بھی خفیہ کرتے۔ ان کے عقائد میں خود کی پوشیدگی شرط اول تھی کیونکہ انہیں ایک جانب خلافت، دوسری و تیسری جانب حامیان امام موسیٰ کاظم سے خوف رہتا۔ چنانچہ ان لوگوں نے اپنی تبلیغی تحریکات کو پوشیدہ رکھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ خلافت عباسیہ کے خلاف سازش کا جال بھی بچھاتے رہتے۔ اس معاملے میں سارے فرقے ایک اور ان کا نصب العین ایک ہی تھا۔

اموی اور عباسی خلافت کے خلاف تحرکات کو سب سے زیادہ فروغ ایرانیوں کے ذریعے ہوا۔ اس کی وجہ جاننے کے لیے ایران و عرب کے قدیم حالات کا جاننا ضروری ہے۔ ایران متمدن قوم تھی جبکہ عرب جہالت کا شکار تھے اور عرصہ دراز تک ایران کے محکوم رہے۔ ظہور اسلام سے ان میں ذہنی انقلابات آئے۔ کردار میں بے مثال تبدیلی آئی۔

خلیفہ دوم کے عہد میں عرب ایران پر قابض ہو گئے۔ اسلام کی تبلیغ سے کافی آبادی مشرف بہ اسلام ہوئی مگر ایرانیوں کی قومی حمیت کو زبردست دھچکا لگا۔ ذہنی طور پر انہیں یہ گوارہ نہ تھا کہ جو قوم صدیوں ان کی محکوم رہی ہو وہ حاکم بن جائے چنانچہ وہ آزادی کے لیے کوشاں رہے اور موقع کی تلاش کرتے رہے۔ اب جب موقع ملا تو بنو ہاشم کی حمایت کی اور پہلے بنو امیہ اور پھر بنو عباس کی خلافت کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی اعتقادات میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ ایرانیوں نے اسمٰعیلی اور قرامطی تحریکوں میں مکمل تعاون دیا، اور اس مسلک کو ایران میں خوف فروغ ملا۔

اسمٰعیلی تحریک کا آغاز یوں تو دوسری صدی ہجری میں ہو چکا تھا مگر تیسری صدی ہجری میں شدت آئی۔ اس دور میں منظم خفیہ تحریک کا روح رواں عبداللہ ابن میمون تھا جو ''القداح'' کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ اہواز کا باشندہ تھا۔ اس کا باپ اسمٰعیلیہ فرقہ کی خطابیہ شاخ کی میمونیہ جماعت کا بانی تھا۔ یہ انتہائی سخت گیر شیعہ فرقہ تھا۔ میمون خود کو نائب امام بتاتا۔ عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے موقع محل کے مطابق شعبدہ بازی سے بھی کام لیتا جسے وہ معجزہ بتاتا۔

عبداللہ کچھ عرصہ کے بعد اہواز سے عسکر مکارم چلا گیا وہاں سے بصرہ ہوتا ہوا شام کے علاقہ حمس کے مقام پر جم گیا اور کچھ جائیداد بھی خرید لی۔ یہاں اس کا ایک سرگرم رفیق ہمدان ابن منشاۃ عرف قرمط تھا جو نسلاً نبطی تھا۔ اس زبان میں کرمتیہ کے معنی سرخ چشم کے ہیں۔

لفظ کرمتیہ بگڑا تو قرمط ہو گیا۔ چونکہ یہ کوتاہ قد تھا اس لیے اس کا نام جلد زبان زد ہو گیا۔ قرمط نے پورے انہماک سے حصہ لیا اور جلد ہی کافی پیرو بنا لیے۔ چنانچہ جو لوگ اس کے ذریعہ اس فرقہ میں شامل ہوئے وہ قرمطی کہلائے۔ قرمط کا اہم رفیق اس کا بھائی عبدان تھا جو بہت سی کتابوں کا مصنف بھی تھا۔

ایک روایت کے مطابق قرمطی مسلک کی اساس دوسری صدی ہجری میں پڑ چکی تھی لیکن اس کا نام اس وقت قرمطی نہ تھا۔ اس فرقہ کا ظہور اس نام سے تیسری صدی ہجری کے نیمہ دوم میں ہوا۔ اس فرقہ کا بانی خوزستان کا ایک زاہد شخص تھا جو پوشیدہ طور پر اس مسلک کا حامل تھا۔ اور سواد فرقہ کا ایک شخص کمتیہ اس کی نگہداری کرتا تھا۔ یہ شخص نبطی تھا۔ یہ شخص رفتہ رفتہ دعاۃ میں شامل ہو گیا جو بعد میں رئیس مذہب کرمتیہ کے نام سے مشہور ہوا، چنانچہ لفظ قرامطی کرمتیہ سے وجود میں آیا۔ ....

عبداللہ ابن میمون کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا محمد جانشین ہوا اور پھر اس کا پوتا جو اس کے انتقال سے ایک سال قبل پیدا ہوا تھا جانشین ہوا۔ یہ ابوشلالہ کے نام سے مشہور ہوا۔

اس نے صحیح معنوں میں اپنے دادا کے مشن سے فائدہ اٹھایا۔ اس دور میں افریقہ کے بربر قبیلہ والے اسمٰعیلی فرقہ کی جانب میلان رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک لائق اور ہوشیار داعی عبداللہ کو وہاں روانہ کیا۔ یہ لوگ مہدی موعود کے منتظر تھے۔ عبداللہ نے اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مہدیہ کے مقام کو مرکز بناتے ہوئے مہدی موعود کا لقب اختیار کیا اور بیعت لینی شروع کی۔

اس نے جلد ہی موافقین کی بڑی جماعت بنا لی اور ان کی طاقت کے سہارے ایک سال کے اندر مصر کے اقتدار پر اپنا تسلط جما لیا جو اس وقت شورش اور انحطاط کا شکار تھی۔ اس طرح 358ھ میں عبداللہ المہدی نے مصر میں ''فاطمی'' حکومت قائم کی جس کا وہ پہلا حکمران تھا۔

دوسری جانب قرامطہ تقریباً دو سو سال تک عباسی خلفاء کے لیے دردِ سر بنے رہے۔ ان کی روز افزوں ترقی پریشان کن ثابت ہوتی گئی۔ پانچ سال کے اندر تبلیغ کے ساتھ ساتھ اسلحہ بھی سنبھال لیا اور خونیں فساد برپا کرنا شروع کیا۔ میسوپوٹامیہ کے علاوہ بحرین، یمن، خوجستان، شام اور مشرق میں ایران تک پھیل گئے۔ بصرہ، کوفہ اور مکہ کے نواح میں برابر مسلح حملے کرتے رہے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مکہ فتح کر کے حجر اسود اپنے ساتھ اٹھا لے گئے۔ جسے 25 سال بعد فاطمی حکمران کے حکم سے اپنی جگہ واپس پہنچایا گیا کیونکہ منطقی اعتبار سے قرامطہ خود کو مصر کی فاطمی حکومت کے تابع مانتے تھے۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ اسمٰعیلیوں کی پہلی باقاعدہ حکومت مصر میں فاطمی کے نام سے ہوئی اور عبداللہ المہدی اس کا پہلا حکمران تھا۔ اسمٰعیلی عقائد کی تبلیغ جو اب تک پوشیدہ ہوتی تھی عام کر دی گئی مگر خفیہ طریقہ سے اپنے داعی دوسرے علاقوں کے ساتھ ساتھ سندھ اور ملتان کی مسلم حکومتوں میں بھی بھیجے جہاں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ وہاں کی آبادی میں ایرانیوں کی بڑی تعداد تھی۔ یہ داعی ان مقامات پر پہنچ کر خفیہ تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔

مصر میں المہدی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا حکمران ہوا۔ اس نے سندھ اور ملتان کے لیے ایک خصوصی داعی جلم بن شیبان کو مقرر کیا۔ اس نے ملتان پہنچ کر حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں علویوں کی جماعت پہلے ہی سے موجود ہے اور بااثر بھی ہے اسی کے ساتھ در پردہ وہ لوگ خلافت کے مخالف بھی ہیں اور خلفاء عباسیہ کے خلاف سازش میں سرگرم ہیں۔

چنانچہ اس نے تمام حالات کو موافق پایا اور قلیل مدت میں اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر لی۔ ملتان میں بنو سامہ کے قیام کے پس پشت ان علویوں کا بڑا ہاتھ تھا جو عرصہ دراز سے ان علاقوں میں مقیم تھے۔ سنیوں اور عباسی خلیفہ کے خلاف خفیہ طور پر اپنے مقاصد اور عقائد کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس کا اجمالی ذکر یوں ہے کہ 209ھ میں حضرت علی کے بیٹے عمر کی اولادوں میں سے عبدالرحمٰن علوی نے عباسی خلیفہ کے خلاف خروج کیا جسے مامون رشید کے غلام دینار نے فرو کیا۔ مصلحت وقت کے تحت عبدالرحمٰن نے امان طلب کی لیکن مزاج کے مطابق خلیفہ کے خلاف سازش کرتے رہے۔ ان کی اولادوں میں سے کچھ نے سندھ کا رخ کیا۔

منصورہ اور ملتان کو خفیہ تحریک کا مرکز بنایا جہاں سنی حکومتیں تھیں۔ یہاں ان لوگوں نے مستقل سکونت اختیار کی۔ مسعودی نے 283ھ میں منصورہ کی سیاحت کی۔ اس نے لکھا کہ منصورہ میں ان کی بڑی تعداد ہے۔ ملتان میں ان علویوں کے بارے میں سیاح ابو دلف نے لکھا ہے کہ

''ملتان پر مسلمانوں کی حکومت تھی مگر جائیداد کے مالک عمر بن علی کی اولادیں ہیں۔''

ملتان کے سامی حکمرانوں کی رواداری اور وسعت نظری تھی یا ناعاقبت اندیشی کہ انہوں نے دارالخلافہ میں ان علویوں اور شیعوں کو سکونت اختیار کرنے کی اجازت دی اور اسی کے ساتھ ساری مراعات بھی عطا کیں۔ یہاں تک کہ وہ صاحب جائیداد اور بااثر بن گئے۔ ان علوی جاگیرداروں میں ابو جعفر نمایاں حیثیت کا مالک تھا۔

یہ شخص اپنی اولادوں اور خاندان کے ساتھ آیا یہ سب اسماعیلی عقائد رکھتے تھے۔ چنانچہ جب جلم بن شیبان اپنی جماعت کے ساتھ آیا تو اسمٰعیلیوں نے شایانِ شان خیر مقدم کیا گویا وہ لوگ اس کی آمد سے باخبر اور منتظر تھے۔ جلم بن شیبان سے پہلے ابو جعفر ملتان کا مذہبی اور اعزازی حکمران بن چکا تھا اور اسمٰعیلی حکومت کے لیے زمین ہموار کر رکھی تھی اس طرح ملتان پر اسمٰعیلی حکومت کا قیام تقریباً 375ھ میں ہوا۔ ان اسمٰعیلی حکمرانوں کا ذکر سب سے پہلے عرب سیاح بشاری مقدسی نے کیا جو 375ھ میں وارد ملتان ہوا وہ لکھتا ہے:

''ملتان والے شیعہ ہیں۔ اذان میں حی خیر العمل کہتے ہیں اور اقامت میں دو مرتبہ تکبیر کہتے ہیں۔''

وہ آگے چل کر مزید کہتا ہے:

''ملتان میں مصر کے خلیفہ کا خطبہ پڑھتے ہیں اور اسی کے حکم سے یہاں

کا بندوبست ہوتا ہے۔ یہاں سے برابر مصر کو تحائف بھیجے جاتے ہیں
......"

ملتان پر اسمٰعیلی حکومت کے قیام کے بعد جو نمایاں کام ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں:

1۔ اسمٰعیلی عقائد کی تبلیغ اعلانیہ ہونے لگی۔ نیز اس میں تختی ہوئی شدت برتی گئی۔

2۔ ملتان کے نواحی علاقوں میں خفیہ تبلیغ کے مراکز قائم ہوئے۔

3۔ ملتان کے قدیم بت خانے کو منہدم کر کے وہاں مسجد بنوائی۔

4۔ محمد بن قاسم کی تیار کردہ مسجد کو بند کرا دیا گیا کیونکہ وہ اموی دور کی یادگار تھی۔

5۔ بن خانہ کے انہدام سے ملک کا اہم ترین تجارتی مرکز ختم ہو گیا۔ ملک نے کثیر آمدنی سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ اہم سیاسی حربہ بھی گنوا دیا۔

ادھر الپتگین کے آزاد کردہ غلام اور داماد سبکتگین نے غزنی میں آزاد حکومت قائم کی اور قرب و جوار کے علاقے فتح کئے۔ ہندوستان کے مغربی علاقوں کے راجاؤں نے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کرنے کے لیے غزنی پر حملہ کیا مگر شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کے جواب میں سبکتگین نے کشمیر، پنجاب اور لاہور کے علاقے فتح کر لیے والی ملتان شیخ حمید نے ازارہ مصلحت اطاعت قبول کر لی اور سالانہ خراج دینا منظور کر لیا۔ جو اس کے دور میں چلتا رہا مگر اس کے پوتے داؤد نے خودمختاری اختیار کی۔

ادھر غزنی میں سبکتگین کے انتقال کے بعد تخت کے لیے دو بھائیوں محمود اور محمد میں جنگ ہوئی جس میں محمود کو فتح ملی۔ اس انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاہور، پنجاب اور کشمیر کے علاقے خودمختار ہو گئے۔ یہی نہیں والی ملتان نے ان حکمرانوں کو محمود کے خلاف ورغلانا شروع کیا۔ چنانچہ والی ملتان کی سرکوبی کے لیے محمود نے 396ھ میں لاہور کے راستے حملہ کیا اگرچہ والی لاہور نے مزاحمت کی مگر وہ محمود کی طاقت کے آگے ٹھہر نہ سکا۔ ابو داؤد نے فرار اختیار کیا۔

محمود نے اپنا جانشین مقرر کر کے سارے علاقے مع لاہور اس کی نگرانی میں دیئے اور واپس غزنی ہوا۔

محمود کے واپس ہوتے ہی ابو داؤد نے پھر ملتان پر قبضہ کر لیا اور حسب سابق دوسرے راجاؤں کو محمود کے خلاف صف آرا کرنے کے اقدام کئے۔ یہ بات محمود برداشت نہ کر سکا اور ابو داؤد کی سرکوبی کو اولیت دیتے ہوئے لاہور کو دوبارہ اپنے قبضے میں کرتا ہوا 405ھ میں ملتان پر سخت حملہ کیا اور ابو داؤد کے فرار کے راستے بھی مسدود کر

دیئے۔ اسے قید کر کے غزنی لے گیا اور اہل ملتان سے بیس لاکھ درہم تاوان جنگ وصول کیا۔
عہد محمودی میں ملتان تخت غزنی کا حصہ رہا مگر بعد میں اسمٰعیلیوں نے پھر قبضہ کر لیا جسے شہاب الدین غوری نے فتح کیا۔ اس نے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے مرکز دہلی بنایا اور اپنے آزاد کردہ غلام قطب الدین ایبک کو نائب بنایا یہ فرقہ برابر اپنے مشن میں سرگرم رہا۔

قباچہ کے انہدام کے بعد اسمٰعیلیوں نے پھر علم بغاوت بلند کیا اور دہلی میں التمش پر ناکام قاتلانہ حملہ کیا۔ اس لیے برافروختہ ہو کر التمش نے ایسی سرکوبی کی کہ یہ لوگ ہمیشہ کے لیے اپنا مرکز ملتان سے ہٹا کر گجرات لے گئے جو آج بھی ہے۔ اس طرح ملتان سے اسمٰعیلیوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

دور غزنویہ

اسمٰعیلی حکومت کے سلسلے میں ذکر آ چکا ہے کہ سبکتگین نے غزنی سے نکل کر لاہور، کشمیر اور پنجاب کے علاقے فتح کیئے۔

والی ملتان نے مصلحتاً صلح کر لی تھی اگر اس کے واپس ہوتے ہی حالات نے رخ بدلا۔ سبکتگین کے انتقال کے وقت محمود دارالخلافہ میں نہ تھا اس لیے اس کا بھائی سلطان محمد تخت نشین ہوا۔ یہ 387ھ کا واقعہ ہے۔ محمود نے واپس آ کر مطالبہ کیا۔ اسمٰعیل کے انکار پر دونوں بھائیوں میں شدید جنگ ہوئی آخر وہی اپنی جنگی صلاحیت، عقل و دانش، سیاست کے باعث فتحیاب ہوا اور 390ھ میں تخت غزنی پر جلوس کیا۔

ملکی حالات نہ صرف اندرون بلکہ بیرون ممالک میں پر آشوب اور پیچیدہ ہو گئے تھے مگر دارالخلافہ میں محمود نے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا۔ حکومت کے استحکام کے لیے مفتوحہ علاقوں میں بھی نظم و نسق ضروری تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ پنجاب، لاہور اور دوسرے راجا متفق ہو کر غزنی پر حملہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اور اس کی پشت پر والی ملتان فساد کی جڑ ہے جو خود کو آزاد حکمران گردانتا تھا۔ چنانچہ محمود نے ان سب کی گوشمالی ضروری سمجھی کیونکہ اسمٰعیلی حکمران ابوالفتح داؤد اپنی فطرت کے باعث مستقل خطرہ بن سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے ملتان پر حملہ کرنے کے لیے روانگی اختیار کی اور لاہور کے راستہ حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا۔ والی لاہور انند پال سبکتگین کے زمانہ سے باجگزار تھا اور حلیف بھی۔ اس نے بغاوت پر کمر باندھی اور محمود کو لاہور کے سلطنت کے اندر سے ہو کر ملتان جانے کی اجازت نہیں دی چنانچہ محمود نے لاہور پر ہی حملہ کر دیا۔ انند پال مقابلہ نہ کر سکا اور کشمیر کی جانب فرار ہو گیا۔ اگرچہ لاہور کی فتح میں کافی دشواری پیش آئی تھی اور طاقت بھی کم ہو گئی تھی پھر بھی اپنے عزم کے باعث ملتان کی جانب پیش قدمی کی اور ملتان کا ایسا سخت محاصرہ کیا کہ عوام پریشان ہو گئے اور حاکم کو صلح پر مجبور کر دیا۔

ابوالفتح نے صلح کی اور 20 ہزار درہم تاوان جنگ بھی دیا مگر محمود کے واپس ہوتے ہی ابوالفتح داؤد پھر ا

وعدوں سے منحرف ہو گیا جس سے محمود انتہائی جزبز ہوا اور دوبارہ حملہ کر کے حاکم وقت کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ غزنی لے گیا اور قلعہ غور میں قید کر دیا جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔

محمود کا انتقال 421ھ میں ہوا۔ اس سے قبل ایران، عراق، خراسان غور کے علاوہ ہندوستان کے مغربی حصہ کو سومنات تک فتح کیا۔ ان کے بھانجے سالار مسعود کے آگے قدم بڑھا کر اجمیر کے راستہ کہ جسے مسعود کے باپ سالار ساہو فتح کر چکے تھے، متھرا، میرٹھ، دہلی، بدایوں، گوپا مئو، بلگرام، نگرام، کڑا، مانکپور، رددلی اور بہراءَ کے اہم قلعے فتح کیے۔

بعد میں یہ علاقے پھر آزاد ہو گئے مگر ایک اہم فائدہ یہ ہوا کہ اسلام کی روشنی ملک کے قلب تک پہنچی اور رفتہ رفتہ تبلیغ ہونے لگی۔

محمود کے انتقال کے بعد تخت کے سلطان مسعود اور سلطان محمد میں جنگ ہوئی جس میں مسعود کو کامیابی ملی۔ چونکہ سلطنت میں استحکام تھا اس لیے نظم ونسق کی جانب سے لاپرواہی شروع ہوئی اور عیش ونشاط سلطان مسعود کی زندگی کا جز ہو گیا۔

ادھر سلطان محمد نے سلجوقیوں سے ساز باز شروع کر دی جس کی وجہ سے کئی محاربے ہوئے آخر کار 433ھ میں سلطان مسعود قتل کر دیا گیا اور سلطان محمد نے تخت غزنی پر جلوس کیا۔ لیکن یہ حکومت دیرپا ثابت نہ ہوئی اور مسعود کے بیٹے مودود کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بھی چند ہی سال حکومت کر کے 441ھ میں طبعی موت مرا۔

سلطان مودود کے عہد حکومت میں ہی ایران کے مختلف علاقوں میں سلجوقیوں نے مسلح بغاوت شروع کر دی اور غزنوی حکومت کے لیے مستقل خطرہ بن گیا۔ غزنویوں کی آپس کی کشاکش سے بھی مقابلہ تھا اس سے طاقت دن بدن کم ہوتی گئی۔

ہندوستان میں لاہور، پنجاب اور مکران کے علاوہ ملتان اور اس کے مشرق کے سارے علاقے آزاد ہو گئے۔ ملتان میں اسمٰعیلیوں نے پھر اپنی خودمختار حکومت قائم کر لی۔

450ھ میں سلطان ابراہیم غزنی کے تخت پر بیٹھا جو نیک کردار، برگزیدہ اور عادل تھا اس کی حکومت کی مدت تقریباً 40 سال رہی، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے سلجوقی حکمران کی بیٹی سے اپنے بیٹے کا رشتہ کر کے تعلقات نہ صرف استوار کیے بلکہ بہترین حلیف بنا کر تخت غزنہ کو ایک مستقل خطرہ سے پناہ دیا۔ اس نے ہندوستان میں پھر سلطنت کو وسعت دی۔ اجودھن کے علاوہ چند اہم قلعہ فتح کیے۔ دور حکومت کافی پرسکون رہا۔ ابراہیم شاہ غزنوی کا انتقال 492ھ کے قریب ہوا۔

ابراہیم شاہ کے بعد اس کا بیٹا مسعود تخت پر بیٹھا لیکن اس کے دوسرے بھائی ارسلان نے 509ھ میں اسے قتل کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا اور اپنے بھائیوں کو قید کر دیا مگر بہرام شاہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا وہ بھاگ کر اپنے ماموں سنجر سلجوقی کے پاس پہنچا۔ تین سال بعد وہ سلجوقی حکمران کی مدد سے تخت غزنی پر قابض ہو سکا۔ ارسلان شاہ

مارا گیا۔ اس درمیان ارسلان شاہ کا مقرر کردہ حاکم لاہور محمد بدلیم نے بغاوت کر دی مگر بہرام شاہ نے خود آ کر اسے فرو کیا۔ باغی کے اپنے قصور کے اعتراف اور طلب معافی پر اسے معاف کر کے عہدہ بحال رکھا گیا۔

اس عرصہ میں شاہان غور کافی طاقت حاصل کر چکے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے غزنی تک تاخت کیا اور پایہ تخت پر قبضہ کر لیا۔ بہرام شاہ فرار ہو کر لاہور میں پناہ گزیں ہوا۔ بعد ازاں سنجر کی مدد سے دوبارہ غزنی پر قبضہ مل سکا۔ بہرام شاہ کی موت 547ھ میں ہوئی۔

باپ کے مرنے کے بعد اتفاق رائے سے خسرو ملک تخت نشین ہوا مگر غوریوں کے ہاتھوں غزنی میں سکون نہ مل سکا۔ آخر اسے ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر لاہور میں مقیم ہوا۔ یہاں اس کی بڑی تعظیم اور توقیر ہوئی یہاں بھی اسے سکون نہ ملا۔

غوریوں کے حملے برابر ہوتے رہے مگر انہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی پھر بھی نظم و نسق میں کوتاہی ہوتی رہی جس کی وجہ سے ہندوستان کے باجگزار علاقے رفتہ رفتہ آزاد ہو گئے اور غزنوی حکومت صرف لاہور تک محدود رہ گئی۔

خسرو شاہ کا انتقال 555ھ میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو ملک تخت نشین ہوا۔ تدبر اور عدل سے حکومت شروع کی۔ مگر غوریوں کے حملے وقتاً فوقتاً ہوتے رہے جس میں انہیں ناکامی ملی مگر 582ھ میں وہ کامیاب ہوئے۔ خسرو ملک کو قلعہ غرجستان میں قید کر دیا جہاں اس کا 598ھ میں انتقال ہو گیا۔ گویا غزنوی حکومت کا خاتمہ 582ھ میں ہو گیا۔

دور غوریہ

ہندوستان پر غوریوں کے حملے کے منصوبے اس وقت بنے تھے جب ان لوگوں نے غزنوی کے پایہ تخت غزنی پر پورا تسلط جما کر ایران میں اس حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ کیونکہ جب تک ہندوستان میں بھی غزنوی حکومت کا خاتمہ نہیں ہوتا تھا۔ غوریوں کو ہمیشہ خدشہ رہتا۔ چنانچہ غیاث الدین غوری نے حملوں کا آغاز کیا۔

لاہور میں غزنوی حکمران خسرو شاہ اور خسرو ملک رہے۔ وہ برابر ان کا مقابلہ کرتے رہے مگر آخر کار 582ھ میں غوریوں کا مکمل تسلط ہندوستان پر ہو گیا۔ 569ھ میں غیاث الدین کے مرنے کے بعد شہاب الدین غوری نے حدود میں وسعت دیتے ہوئے شمالی ہند کے بیشتر اہم قلعوں کو فتح کیا۔ اس نے اس سے قبل غور اور غزنی کے انتظام میں استحکام پیدا کیا تاکہ دارالحکومت سے دور رہ کر یہاں کے نظم و نسق میں خلل واقع نہ ہو۔ شہاب الدین نے اجمیر، دہلی، قنوج، بدایوں وغیرہ اہم قلعوں کو دوبارہ اپنے تحت کیا۔ 571ھ میں دوبارہ ملتان کو فتح کیا۔ 572ھ میں اچ پر قبضہ کیا پھر اسی راہ سے 574ھ میں گجرات پر حملہ آور ہوا۔ 576ھ، 580ھ، اور اس کے بعد 582ھ میں لاہور پر قبضہ کیا اور اسے حاکم ملتان علی کرماج کی صوبہ داری میں دیا۔ حدود سلطنت بنارس تک فتح کر کے بڑھایا ممالک محروسہ میں قطب الدین ایبک کو نائب حکومت قرار دیتے ہوئے دہلی کو مرکز بنایا اور خود واپس غور ہوا لیکن

دارالخلافہ سے چند منزل پہلے ہی بامیان کے مقام پر ایک اسمٰعیلی فدائی کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ 602ھ میں پیش آیا۔ اس کی لاش لے جا کر غزنی میں دفنائی گئی۔

شہاب الدین کی وفات کے بعد اس کی بھتیجا محمود تخت پر بیٹھا وہ نام نہاد بادشاہ تھا۔ سارا نظم ونسق غلاموں کے ہاتھ میں تھا۔ چھ سال بعد خوارزم شاہ کے ہاتھوں ایران میں غوری حکومت کا خاتمہ گیا اور قطب الدین ایبک ہندوستان کا حکمران ان گیا۔ اس طرح تقریباً 608ھ سے ہندوستان میں غلام دور کا آغاز ہوتا ہے۔

دور غلامان

شہاب الدین غوری کے کوئی اولاد پسری نہ تھی وہ اپنے ترکی غلاموں کو ہی اپنی اولاد سمجھتا۔ ان کی پرورش، تعلیم وتربیت پر ویسے ہی دھیان دیتا جیسا کہ اولاد کے لیے ضروری ہونی چاہیے۔ اس میں کچھ مخصوص بھی تھے۔ ان میں قطب الدین ایبک اس کا سب سے زیادہ قابل اعتماد رفیق تھا جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسے اپنا نائب مقرر کیا۔ اس کے علاوہ تین اور غلام بھی تھے۔

شمش الدین التمش جسے بدایوں کی، تاج الدین یلدوز کو غور اور غزنی کی اور ناصر الدین قباچہ کو ملتان اور اچ اور سندھ کی صوبہ داری تفویض کی تھی مگر یہ سب بنیادی طور پر قطب الدین کے ماتحت تھے۔

قطب الدین ایبک مجمع اوصاف تھا۔ ترکی نژاد ہونے کے باعث شجاعت پامردی اور جوانمردی ماں کے پیٹ سے لے کر آیا۔ بہترین تعلیم اور تربیت نے اس میں نکھار پیدا کیا۔ سخاوت اور صلہ رحمی اس کی فطرت تھی۔ اس کی فیاضی کی وجہ سے اسے "لک بخش" کے لقب سے پکارا جاتا۔ صوفیاء اور بزرگان دین سے عقیدت وافر تھی۔

اجمیر میں حضرت معین الدین چشتی اور دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خصوصی دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔ وہ عوام وخواص دونوں میں یکساں طور پر ہر دلعزیز تھا۔

باہمی تعلقات کو استحکام کے لیے اس نے تاج الدین یلدوز کی بیٹی سے خود نکاح کیا۔ اپنی ایک بیٹی شمش الدین التمش صوبہ دار بداؤں کے حبالہ میں دی اور دوسری ناصر الدین قباچہ والی ملتان سے بیاہی۔ اس کے مرنے پر دوسری بیٹی بھی ناصر الدین کو بیاہ دی۔

قطب الدین ایبک نے اپنی زندگی میں ہی شمش الدین التمش کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ یلدوز اور قباچہ کو اس کی ماتحتی میں غزنی اور ملتان کی عملداری دی تھی۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے آرام شاہ کو تخت دہلی پر بٹھایا گیا مگر نظم ونسق میں کوتاہی کے باعث امراء نے فوراً التمش کو دہلی بلا کر تخت دہلی اس کے سپرد کر دیا گیا۔

التمش بھی قطب الدین ایبک کی طرح کردار کا پختہ، فہم وفراست میں بے مثال تھا۔ زندگی سادگی سے گزارتا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مرید بھی تھا۔ حکومت اور اس کے ذریعے عیش ونشاط جو دستیاب ہو سکتا تھا ہمیشہ دور رہا اور پاکبازوں کی سی زندگی گزاری۔ عبادت وریاضت میں بھی کافی وقت گزارتی۔ اس کی عبادت اور

معنوی بزرگی کے دو واقعات بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

''التمش نے شہر سے باہر ایک مسجد الموسوم بہ ''قبتہ الاسلام'' بنوائی جس سے ملحق مینار آج بھی ''قطب مینار'' کے نام سے مشہور ہے۔ التمش چاہتا تھا کہ نمازیوں کی سہولت کے لیے ایک حوض تعمیر کرائے مگر کسی مناسب جگہ کا تعین نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے ایک رات سرور کائناتﷺ کو خواب میں دیکھا کہ وہ ایک جگہ پر وضو فرما رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ شمش الدین حوض اس جگہ تعمیر کراؤ۔ صبح ہونے پر خواب تو یاد رہا مگر مقام ذہن سے محو ہو گیا۔

چنانچہ اس نے واقعہ کی اطلاع فوراً اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکی کو دی۔ پھر ان کے حکم پر وہ اس مسجد کے قریب پہنچا۔ خواجہ نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں کی زمین پانی سے قدرے ترتھی۔ وہیں تعمیر کرایا گیا۔

دوسرا واقعہ اس کی بزرگی کا بصیرت افروز ہی نہیں سبق آموز بھی ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے اپنی زندگی میں یہ وصیت فرمائی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے گا جس نے

1۔ کبھی حرام کاری نہ کی ہو۔

2۔ نماز عصر کی سنت نہ ترک کی ہو۔

3۔ آسمان کو ہمیشہ باوضو دیکھا ہو۔

چنانچہ جب انتقال کے بعد نماز جنازہ کا وقت آیا تو اس وصیت کا اعلان کیا گیا۔ اس وقت نماز میں شرکت کے لیے علماء وفضلاء وصوفیاء واکابر کا زبردست مجمع تھا مگر سب سرنگوں تھے اس لیے کہ کوئی بھی ان تینوں شرائط کی تکمیل نہیں کر پا رہے تھے۔ جب کافی دیر ہو گئی اور نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کوئی نہ بڑھا تو التمش صفوں کے سامنے آیا اور کہا:

''می خواستم کہ کسی رابر احوال من اطلاع بناشد لیکن چوں خواجہ ہم چنیں حکم داد چارہ ندارم۔''

(''میں تو یہ چاہتا تھا کہ کسی کو میرے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو مگر

جب خواجہ نے ایسا حکم کر دیا ہے تو مجبور ہوں۔'')

کچھ کتابوں میں یہ جملہ بھی ملتا ہے جو التمش نے کہا تھا:

''امروز مرا پیش خلق خدا رسوا کردی''

(آج آپ نے مجھے عوام کے سامنے ذلیل کر دیا یعنی میرا راز جو اب تک پوشیدہ تھا ظاہر کر دیا۔)

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ التمش تخت دہلی پر بیٹھا اور ملک کے تمام صوبے اس کے ماتحت تھے۔ غزنی میں یلدوز، ملتان میں قباچہ، لکھنوتی اور بنگالہ میں خلجی صوبہ دار تھے۔ لاہور بظاہر تخت دہلی کے تھا مگر یہ علاقہ نزاعی بن گیا کبھی یلدوز اور کبھی قباچہ کے قبضہ میں رہتا مگر قرب مکانی کے باعث قباچہ کا تسلط زیادہ رہا۔

اس کے علاوہ اس نے آزاد حکمراں کی طرح اپنی حدود سلطنت میں وسعت دی۔ ساحل بحر عرب سے لے کر سرحد کشمیر تک اس کا تسلط قائم ہو گیا۔ خود کو اتنا طاقت ور سمجھنے لگا کہ تخت دہلی پر قبضہ جمانے کا خیال پیدا ہوا اور بغاوت پر کمر بستہ ہوا۔

اس زمانہ میں ملتان کے روحانی پیشوا شیخ بہاء الدین زکریاؒ تھے جن کا قبضہ باشندوں کے دلوں میں تھا۔ انہیں قباچہ کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ انہوں نے اور قاضی ملتان شرف الدین اصفہانی دونوں نے اس بغاوت کے منصوبہ کی اطلاع التمش کو بھیجی مگر بدقسمتی سے قاصد پکڑا گیا اور خطوط قباچہ کے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ وہ سخت برافروختہ ہوا۔ قاضی شہر کو بلا کر فوراً قتل کر دیا۔ مگر حضرت زکریاؒ کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

اس واقعہ کا ذکر سب سے پہلے حضرت نظام الدین دہلوی نے کیا اور ''فوائد الفواد'' میں محض چند جملوں میں ہے۔ وہ جملے یوں ہیں:

''درآنچہ قباچہ راج ملتان داشت و سلطان شمس الدین در دہلی بود و میان ایشان مخاصمتی پیدا شد شیخ بہاء الدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ و قاضی ملتان ہر دو جانب شمس الدین مکتوب نوشتند و آں ہر دو مکتوب بدست قباچہ افتاد۔ قباچہ متغیر شد۔ قاضی را بکشت و شیخ را بدر سرای طلبید۔ شیخ بدر سرای رفت ہم چنانکہ بار کرفتی بی دہشت در رفت بر آستانی۔ قباچہ بحکم معہود شست قباچہ اور ابدست اوداد۔ شیخ مطالعہ کرد و فرمود۔ این نامہ من نوشتہ ام و خط منست۔ قباچہ گفت چرا بنشتید۔ شیخ گفت من ہر چہ نوشتہ ام از حق بنشستہ ام ہر چہ خواہی بکن تو خود چہ توانی کرد۔ بدست تو چیست۔''

تاریخ فرشتہ میں بغاوت کی نیت کے علاوہ شرح محمدی کی خلاف ورزی بھی لکھی ہے۔ کہتا ہے:

''..... بعد از فوت قطب الدین ایبک بمعنی فرزیدہ شمس الدین التمش

کہ بادشاہ دہلی شدہ بود، اطاعت نہ کرد و در رواج شرع محمدی نیز نکو

شیدہ متعلقانش در فسق و فجور آغاز کردند۔''

سیر العارفین میں اسی واقعہ کو دوسرے انداز سے تجزیہ کیا گیا ہے:

سلطان شمس الدین التمش طاب ثراہ منظور و مقبول این دو بزرگوار یعنی شیخ

الشیوخ و اوحد الدین کرمانی قدس سرہما۔ القصہ چوں قباچہ رونق

سلطنتش یدید و شنید رگ گردنش بحد جنبید۔ حواست کہ بسلطان شمس

الدین درز دو قدم مخالفت در راہ طغیان کشاید۔''

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ لاہور کا علاقہ نزاعی تھا جس کی وجہ سے تخت دہلی کو مسلسل خطرہ بھی لاحق رہتا۔ چنانچہ 612ھ میں یلدوز اور التمش کے درمیان لاہور کے لیے جنگ ہوئی جس میں التمش کو کامیابی ملی اور یلدوز گرفتار کر کے قلعہ بداؤں میں قید کر دیا گیا جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔

التمش اور قباچہ کے درمیان نزاع بڑھتا گیا کیونکہ 614ھ میں جبکہ لاہور التمش کے قبضہ میں تھا۔ قباچہ نے حملہ کر دیا۔ دریا چناب کے کنارے سخت جنگ ہوئی جس میں قباچہ کو شکست کا سامنہ کرنا پڑا اور لاہور پر التمش کا قبضہ مستحکم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ خوارزم شاہ اور چنگیز خاں سے برسرِ پیکر رہا اور اسے ساتھ قباچہ بھی اپنے حدود میں ان سے مقابلہ کرتا رہا۔

چنگیز خاں خوارزم شاہ کا تعاقب کرتا ہوا 621ھ میں وارد ملتان ہوا اور ایک ماہ تک سخت محاصرہ کئے رہا کہ وہاں کے باشندہ پریشان ہو گئے۔ قباچہ ایک جانب دفاع کے انتظامات کرتا دوسری جانب عوام کی پریشانیوں کے سد باب کی کوشش کرتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ زیادہ پریشان ہوا تو شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس واقعہ کا ذکر مختلف کتابوں میں کہیں تفصیل اور کہیں اختصار سے ملتا ہے وہ یوں ہے:

''..... وقتی قطب الاسلام و شیخ بہاء الدین زکریا و شیخ جلال الدین

تبریزی باہم در ملتان بودند کہ لشکر کفار در پاس حصار ملتان رسید۔ قباچہ

بیگ بجہتہ دفع بلاعین جمع ملعون بخدمت ایں بزرگان درخواست نمود۔

خواجہ قطب الاسلام تیری بدست قباچہ داد و فرمود ایں تیر جانب کفار

بینداز او ہم چناں کرد، چوں روز شد ہیچ کس از کفار نماندہ بود......''

قباچہ کو التمش اور چنگیز خان سے الجھا دیکھ کر سندھ کے علاقوں میں بغاوت ہو گئی جسے فرو کرنے قباچہ ادھر متوجہ ہوا اور ملتان خالی ہو گیا۔ التمش نے موقع غنیمت دیکھا اور 624ھ میں ملتان پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے اچ کی جانب بڑھا جہاں قباچہ موجود تھا اسے یہاں بھی شکست ہوئی اور وہ بھکر کی جانب فرار ہو گیا اور دریا۔

سندھ پار کرتا ہوا......غرق ہو گیا۔

اس طرح قباچہ کے تقریباً بائیس سالہ اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور التمش پورے علاقہ پر قابض ہو گیا۔

التمش نے کبیر خاں کو ملتان کا حاکم مقرر کیا۔ 629ھ میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا تاج الدین ابوبکر کو حاکم مقرر کیا گیا۔ 633ھ میں التمش کا انتقال ہوا اور رضیہ سلطانہ تخت پر جلوہ افروز ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد حاکم لاہور نے بغاوت کی جسے رضیہ نے فرو کر کے یہ علاقہ بھی حاکم ملتان کے تحت کر دیا۔

625ھ میں حاکم ملتان تاج الدین نے بغاوت کر دی جو ناکام رہی، کیونکہ اسے اپنی طاقت کے بارے میں سخت غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اس نے معافی مانگ کر خود کو عہدے پر بحال رکھا۔

639ھ میں مغلوں نے ملتان پر حملہ کیا اس وقت حاکم ملتان قراقش تھا۔ اور اس کے بعد شیر خاں ہوا۔ رضیہ کے بعد ناصر الدین کے دور حکومت میں شیر خاں نے بغاوت کر دی۔ ناصر الدین نے بذات خود ملتان پر حملہ کر کے اسے زیر کیا۔ یہ واقعہ 648ھ کا ہے۔

(ملتان بحیثیت ادبی مرکز (فارسی) - ڈاکٹر رفیع الدین احمد کاظمی)



عتیق فکری

ظہور اسلام کے وقت سندھ میں فلسفہ اور مذہب

پورے ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ رگ وید ملتان کی وسیع وادیوں اور آبادیوں میں تصنیف ہوا اور قبل مسیح تیرہ سو سے لے کر قبل مسیح آٹھ سو سال تک رگ وید مکمل ہوا۔ یہ سارا زمانہ آریہ کا مشرقی سندھ کے کنارے سے لے کر آخر دور میں سرسوتی یعنی بٹھنڈا کے علاقہ تک کی تصنیف ہے لیکن اس کا تین چوتھائی سے بھی زیادہ حصہ پنجند، علی پور اور ملتان اور ساہیوال یعنی ہڑپہ کے علاقہ میں تصنیف ہوا ہے۔ اس میں جھنگ، شورکوٹ بھی شامل ہے کیونکہ ایک ہزار قبل مسیح شورکوٹ کے قبیلہ بھارت سے آریا کی ایک زمانہ تک جنگ رہی تھی اور شورکوٹ کی سیلوی حکومت کے بچے کھچے آثار سکندر کے وقت تک بھی موجود تھے جو ختم ہو کر چندر گپت کی حکومت میں شامل ہو گئے۔

آٹھویں صدی قبل مسیح سے ہمیں خالص فلسفے کی کرن دکھائی دیتی ہے اور چھٹی صدی قبل مسیح ہندی فلسفہ اپنے عروج پر دکھائی دینے لگتا ہے اور پاٹلی پتر سے لے کر سندھ تک آزاد مسلک رکھنے والے رشی یا فلسفی بحث مباحثہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جنوبی ہند، راجپوتانہ اور ملتان وغیرہ ان بحثوں کا گڑھ ہوتا تھا۔ ہندی فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنشید چھٹی صدی قبل مسیح میں تصنیف ہونا شروع ہوئے تھے اور یہی دور مہاتما بدھ اور مہاویر (جینی فرقہ کا فلسفی رشی مادہ پرست) کا اس وقت طوطی بول رہا تھا دوسری طرف سانکھیہ فلسفی جس کی داغ بیل 800 قبل مسیح پہلے کپل منی نے ڈالی تھی۔ نمایاں ہو رہی تھی اس کے ساتھ ہی نیا فلسفہ نے جنم لیا بعد میں دشیشک اور پھر چارداک جو کٹر دہریہ تھے وجود میں آئے ان میں سے مہاویر اور مہاتما بدھ تو مذہب کے بانی قرار دیئے گئے اس کے ساتھ بانی مکتبہ فکر بھی مانے گئے اُن میں باہمی مناظرے ہوتے بعض اوقات فساد ہو جاتا ایک دوسرے کو ذلیل بھی کیا جاتا لیکن یہ کبھی کبھار ہوتا اکثر مذہبی لوگ آپس میں تشدد برتتے ورنہ فلسفیانہ فکر رکھنے والے اہلِ ہند تشدد سے گریز کرتے ان کا تعلق فقط مسائل کا حل کرنا اور مناظرہ کرنے سے ہوتا تھا یہ لوگ اکثر دنیا سے بے تعلق رہتے۔

ان سب کا قدیم سانکھیہ فلسفہ تھے جو پہلے تو خدا کے قائل تھے بعد میں اس کے شارحین نے اسے دہریا بنا دیا اس کے بعد یوگیہ نے مادیت کو اور بھی فروغ دیا یوں مہاویر اور یوگیہ فلاسفی نے ایسا گروہ جنم دیا جس نے ویدوں کی تعلیم سے

انحراف کر کے پورے ہندوستان میں ایک آزاد فکر کی بنیاد رکھی۔

میں یہاں ان مکتبہ فکر کے نظریات کو پیش کرنا نہیں چاہتا فقط اسلام سے پہلے برصغیر کی جو علمی اور مذہبی حالت تھی اس کا مختصراً ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں اس لیے ذکر کر دیا۔

البتہ ایک بار پھر میں یہ کہوں گا کہ یونان سے کہیں زیادہ برصغیر میں فلسفے کو فروغ ہوا ہے اور یونان سے پہلے 1100 قبل مسیح رگ وید میں فلسفیانہ سوالات اور فکر کے عناصر پائے جاتے تھے جس کو بعد میں کپل متی نے اور دیگر رشیوں نے فروغ دیا جب یونان کا پہلا فلاسفی تھیلز ملطی صرف چند فلسفیانہ اقوال کا اظہار کر کے فلسفی کہلانے کا تاریخ یورپ میں مستحق ٹھہرا تو پھر سرزمین ملتان کے وسیع علاقے میں فلسفے کی بنیاد پڑی اس کو کیوں فلسفے کی پہلی سرزمین نہ کہا جائے۔

اس کے بعد 560 قبل مسیح میں بدھ فلاسفی کو عروج ہوا اور ایک صدی کے اندر ملتان و سندھ تک اس کی تعلیمات فروغ پانے لگیں ادھر پاٹلی پتر کے نزدیک وشالی میں مہاویر نے اپنے فلسفہ سے لوگوں کو جین مت کی طرف راغب کیا اور 480 قبل مسیح میں مہاویر نے وفات پائی اس طرح کئی فلسفیانہ سکول وجود میں آئے اس میں شک نہیں کہ اہل ہند میں فلسفہ اور مذہب گڈ مڈ بھی ہوا۔ خالص فلسفیانہ تعلیمات بھی جاری رہیں۔ یونان کی طرح دوسری صدی قبل مسیح میں فلسفہ ختم نہیں ہو گیا بلکہ اٹھارویں صدی تک بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے۔ تفصیل تاریخ ہندی فلسفہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حسینی باہمنڑ (برہمن)

ملتان و سندھ وغیرہ میں حسینی برہمن کے نام سے ایک قوم پائی جاتی ہے انہیں بھارے بھی کہتے تھے ان کی داڑھیاں بھی ہوتی تھیں اور منگل اور سنیچر کے دن وہ مسلمانوں کے علاقوں میں مانگتے نظر آتے تھے پاکستان بننے سے پہلے ملتان میں باقاعدہ ان کا دہلی گیٹ کے باہر آغا پورہ کے نام سے محلہ آج بھی موجود ہے۔ جہاں یہ لوگ آباد تھے راقم نے ان کو خود مانگتے ہوئے دیکھا ہے ان کی باتیں بھی سنی ہیں ان حسینی برہمن کے بارے میں تاریخ اسلام میں قدرے مواد مل جاتا ہے۔ مولانا اکبر شاہ خاں اپنی تصنیف آئینہ حقیقت نما کی پہلی جلد میں فتح سندھ و ملتان کے باب میں خلفائے عباسیہ کی حکومت میں علوی سادات کے حالات جو سندھ میں ان پر گزرے ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "142ھ میں خلیفہ منور عباسی نے عمر بن حفص کو سندھ کا گورنر مقرر کیا تھا یہ عمر بن حفص بباطن شیعیت کی جانب زیادہ مائل تھا یعنی اس کو سادات علوی میں زیادہ ہمدردی تھی ابھی تک سادات نے کوئی قابل ذکر جنگی اور اہم کارروائی خلافت عباسیہ کے خلاف نہیں کی تھی۔ وہ اب

تک خفیہ تیاریوں میں مصروف تھے آخر 144ھ میں عبد ابن حسن بن علی بن ابی طالب کے بیٹوں محمد و ابراہیم نے خروج کیا۔ حجاز و عراق میں ان کے ہزاروں طرف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ہنگامہ اس قدر قوی اور خطرناک تھا کہ خود خلیفہ منصور کے دل پر فکر و ناامیدی نے غلبہ پالیا تھا۔ 14 رمضان 145ھ کو محمد بن عبداللہ جو محمد المہدی کے نام سے مشہور ہیں مقتول ہوئے مگر ابراہیم بن عبداللہ ان کے بھائی بھی کئی برس بعد تک منصور کو پریشان کرتے رہے محمد المہدی نے اپنے بھائی عبداللہ بن محمد کو جو عبداللہ اشتر کے نام سے مشہور تھا 144ھ میں ملک سندھ میں روانہ کر دیا تھا کہ وہاں جا کر خلافت عباسیہ کے خلاف ہماری خلافت کی دعوت دو عبداللہ اشتر بصرہ سے ہوتا ہوا 145ھ میں جب عمر بن حفص کے پاس سندھ پہنچا تو عمر بن حفص نے فوراً اس کی دعوت کو قبول کر لیا خود بھی محمد المہدی کی بیعت کی اور اپنے ماتحت ارکان سے بھی بیعت لی عمر بن حفص نے دربار سے تمام عباسی علامات و نشانات دور کر کے محمد المہدی کی خلافت کے نئے جھنڈے بھی تیار کر لئے۔ اسی اثناء میں عمر بن حفص کے پاس محمد المہدی کے مقتول ہونے کی خبر پہنچی عمر نے عبداللہ اشتر کو یہ خبر سنا کر تعزیت کی عبداللہ اشتر نے کہا اب مجھ کو اپنی جان کی فکر ہے مجھے کسی طرح بچاؤ۔ عمر بن حفص نے کہا کہ سندھ کے سرحدی راجاؤں میں ایک راجہ جو سب سے زیادہ طاقتور ہے اور کافی فوج رکھتا ہے وہ آنحضرتؐ سے بڑی محبت رکھتا ہے تم اس سے معاہدہ کر کے اس کے پاس چلے جاؤ عبداللہ اشتر نے اس سے خط و کتابت کی اس نے فوراً اپنے پاس بلا لیا اور شہزادوں کی طرح تعظیم و تکریم کے ساتھ اپنے پاس رکھا اپنی بیٹی کی شادی بھی عبداللہ اشتر سے کر دی رفتہ رفتہ چار سو آدمی اِدھر اُدھر سے آ کر عبداللہ کے پاس جمع ہو گئے یہ سب کے سب عرب مسلمان تھے۔''

منصور کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو اس نے عمر بن حفص کو معزول کر کے اس کی جگہ ہشام بن عمر تغلبی کو 146ھ میں سندھ کی حکومت دے کر روانہ کیا اور روانگی کے وقت تاکیدی طور پر ہدایت کی کہ عبداللہ اشتر کو گرفتار یا قتل کرنے کی ضرور کوشش کرنا اور اگر سندھ کا راجہ اس کو دینے سے انکار کرے تو اس پر حملہ کر کے اس کا ملک چھین لینا۔

ہشام نے سندھ پہنچ کر اس راجہ سے عبداللہ اشتر کو طلب کیا اس نے دینے سے انکار کیا ہشام نے اپنے بھائی سفیح بن عمرو کو فوج دے کر راجہ سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اتفاقاً عبداللہ اشتر مع دس سواروں کے دریا کے کنارے سیر کرتا ہوا سفیح کی نظر پڑی اس نے حملہ کیا عبداللہ اشتر اور اس کے ہمراہی مقتول ہوئے راجہ کے ملک پر بڑا حملہ ہوا لڑائی میں راجہ مارا گیا اور اس کا ملک مقبوضات خلافت میں شامل ہوا۔ عبداللہ اشتر علوی کی بیوی اور اس کا بیٹا جو شیر خوار تھا اس کا نام بھی عبداللہ ہی تھا گرفتار کر کے خلیفہ منصور کے پاس دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھیج دیئے گئے منصور نے اس لڑکے عبداللہ بن عبداللہ اشتر کو اس کی ماں کے ساتھ مدینہ بھیج دیا اور عبداللہ اشتر کے رشتہ داروں کے سپرد کر دیا۔

منصور کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ مہدی خلیفہ بنا مہدی کا 169ھ میں انتقال ہوا تو اس کی جگہ ہادی خلیفہ مقرر ہوا۔

اسی سال حسین بن علی بن حسن بن مثلث بن حسن، مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابی طالب نے بھی خروج کیا اور مکہ آ کر ذیقعد کے مہینہ میں قتل ہوئے۔ مکہ میں جب حسین بن علی کا عباسی لشکر سے مقابلہ ہوا تو وہاں بعض ترکوں اور ہندی غلاموں نے حسین بن علی کا ساتھ دیا۔ سندھ کی گزشتہ لڑائی میں عبداللہ اشتر کے مقتول ہونے پر اس کی بیوی (سندھ کے راجہ کی بیٹی) اور بیٹے کے ساتھ بعض برہمن بھی جو راجہ کے رشتہ دار تھے گرفتار ہو کر بطور جنگی قیدی کے منصور کے پاس پہنچے تھے منصور نے جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے ان کو مدینہ بھیج دیا تھا یہ جنگی قیدی جو ہندی غلام کہلاتے تھے حسین بن علی کے ساتھ ہو گئے تھے اور حسین بن علی بن مثلث مذکور کی کامیابی کو عین اپنی کامیابی سمجھتے تھے حسین بن علی کے ان میں سے بعض مقتول ہوئے اور بعض فرار ہو کر کسی نہ کسی طرح پھر سندھ میں واپس پہنچ گئے تھے انہی لوگوں کی اولاد ہے جو اپنے آپ کو حسینی برہمن کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے کربلا کے میدان میں حضرت امام حسینؓ کا ساتھ دیا تھا کربلا کے میدان میں ان کا موجود ہونا تو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے مگر ہاں حسین بن علی حسن مثلث کو حسین بن علی بن ابو طالب سمجھ لیا گیا ہے یہ لوگ راجہ داہر یا اس کے قریبی رشتہ داروں کی اولاد ہیں اور آج تک سندھ و پنجاب میں پائے جاتے ہیں۔

ملتان کے قدیم بت (سیاحوں کے بیان کی روشنی میں)

ملتان کے جن بتوں کا تذکرہ مورخوں اور سیاحوں نے کیا ہے ہم ان کی کتابوں اور بیان کردہ روایات سے ان بتوں کی تاریخی اور مذہبی عظمت بیان کرتے ہیں۔ تاکہ قدیم اہل ملتان کے مذہبی اعتقادات اور رجحان کا پتہ چل جائے اور مختلف روایات کو سامنے رکھ کر اس بات کی بھی کوشش کی جائے گی کہ یہاں جو بت تھے وہ کس مذہب اور کائنات کی کس قوت کا مظہر سمجھے جاتے تھے۔ اس کا ساتھ ہمیں اس بات کا بھی سراغ لگانا پڑے گا کہ یہ بت کس زمانہ سے یہاں پوجے جانے لگے تھے کیونکہ ملتان زمانہ قدیم سے مختلف قبائل اور مذاہب کی آماجگاہ رہا ہے۔ ذرد او یڈین،

کالڈین، آریا، ہُن وغیرہ اس علاقے پر حکومت کرتے رہے، اس طرح ہمیں صحیح طور پر حالات سے آگاہ ہونے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس سرزمین کے متعلق مستقل طور پر کوئی ایسا تاریخی سرمایہ صفحۂ قرطاس پر نہیں آیا، رہا سوائے چند افسانوی روایات کے جو پرانوں وغیرہ میں پائی جاتی ہیں اور سب سے قدیم جو ماخذ ملتا ہے وہ بھاگوت پران اور وشنو پران ہے اور وہ بھی مورخوں اور محققوں کے نزدیک نیم معتبر ہے، کیونکہ اس میں چند خاندانی حسب و نسب اور سوائے داستان گوئی کے کوئی قابلِ اعتماد بات نہیں اور یہ داستانیں جو ان دونوں پرانوں کے متعلق ہیں بہت کچھ افسانوی طرز کی ہیں ہوسکتا ہے کہ ان میں حقائق کی روشنی بھی قدرے موجود ہو مگر یقینی طور پر صحیح تاریخی حقائق ان سے اخذ کرنا بڑی زبردست کاوش اور بصیرت کا کام ہے البتہ اتنا ضرور ہوسکتا ہے کہ ان داستانوں سے ملتان کی قدامت کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ سکتے ہیں اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہم کچھ شواہد و آثار اور کچھ قیاس کے ذریعہ کسی حد تک صداقت کے قریب پہنچ جائیں۔ البتہ ہمارے پاس ایک اور ذریعہ ہے اور وہ ذریعہ اگر کامیاب طریقہ سے ہاتھ آ جائے تو پھر مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے، جیسا کہ قدیم سوسیرین اور کالڈین وغیرہ کے آثارِ قدیمہ سے ہم نے ان کی قدامت کا سراغ ہی نہیں، بلکہ صحیح تعین کرلیا ہے۔ اسی قسم کی کاوش ملتان کے قلعہ کہنہ کی کھدائی میں بھی کارآمد ہوسکتی ہے۔ کیونکہ چند چیزیں اور کچھ علامتی نقوش برآمد ہو چکے ہیں اور اس پر قیاس آرائی بھی ہو رہی ہے اور مجھ سے پہلے میرے دوست مرحوم وحید اختر نے ان نقوش کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اگر سرکاری طور پر اس طرف توجہ دی جاتی تو یقیناً کچھ نہ کچھ تاریخی حقائق کے حامل نشانات برآمد ہو سکتے تھے، جہاں تک کتابی تحریرات کا تعلق ہے ملتان کے بارے میں ابھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا پھر بھی ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہیے اور اس قدیم سرزمین کے متعلق اہلِ تحقیق کی کاوشوں کو جاری رہنا چاہیے، ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن ہم تاریخ ملتان کی مزید صحیح معلومات حاصل کرلیں گے۔

بتوں کا تذکرہ اور مصنفین و سیاح!

1۔ وہ بت، جس کو محمد بن قاسم نے توڑ کر سونا برآمد کیا۔

2۔ وہ مندر جس کو محمد بن قاسم نے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ ملتان شہر کی رونق اسی سے ہے۔

3۔ وہ مندر جس میں لوہے کا بت معلق تھا جیسا کہ ابن ندیم نے لکھا ہے۔

4۔ وہ مشہور و معروف بت جس کا ذکر سب نے کیا اور یہ سورج دیوتا کا بت کا 264ھ اور ملتان کو اسی سے زیادہ شہرت حاصل تھی۔

5۔ یہ وہ بت ہے جو چوکھی تھا ابنِ رستہ نے اس کا مفصل ذکر کیا ہے۔

6۔ اس بت کے جلاوے جانے کا ذکر زکریا فزوتینی نے کیا ہے 375ھ میں۔

7۔ بشاوری مقدسری نے بھی 375ھ میں سورج دیوتا کے بت کا ذکر کیا ہے، اور خود ملتان آیا ہے۔

مسلمانوں کے ابتدائی دور میں ملتان کے بت خانے

محمد بن قاسم نے جب ملتان کو فتح کر لیا تو اسے اس بات کی فکر ہوئی کہ اس جنگ کا خرچ حجاج بن یوسف کے کہنے کے مطابق خلیفہ کو واپس کرنا ہے، اس کے متعلق محمد بن قاسم نے اپنے مشیروں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے اتنے میں ایک برہمن آ گیا اس نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ اب کافروں کا دور پورا ہو چکا ہے، دنیا اسلام کے نور سے منور ہوئی اور بت خانوں کی جگہ مسجدیں اور شہر تعمیر ہو رہے ہیں تو میں بھی ایک راز بیان کرتا ہوں کہ ملتان کے بزرگوں سے اس طرح سنا گیا ہے کہ:

پرانے زمانے میں کشمیر کے راجہ کی اولادوں میں جوبن نامی راجہ اس شہر پر راج کرتا تھا وہ ایک برہمن اور راہب تھا اور اپنے طریقہ کا پابند تھا، ہمیشہ بتوں کی عبادت میں مشغول رہتا تھا جب اس کا خزانہ شمار و گنتی سے باہر ہو گیا تو اس نے ملتان کے مشرق کی طرف سو مربع گز کا ایک حوض بنوایا اور اس کے درمیان پچاس مربع گز پر ایک مندر تعمیر کرایا اور اس مندر کے اندر ایک حجرہ بنوایا اس حجرے میں ترتیب کے ساتھ چالیس تانبے کے مٹکے رکھوائے اسی دفینے کے اوپر بت خانہ ہے، جس پر سونے کا بت رکھا ہوا ہے، اور اس حوض کے چاروں طرف درخت لگے ہوئے ہیں۔

حکایتوں کے مضمون اور داستانوں کے بیان کرنے والے نے علی بن محمد (مدائنی) سے اس طرح روایت کی ہے کہ اور جس نے کہا ہے کہ میں نے ابو محمد ہندی سے سنا ہے کہ محمد بن قاسم وزیروں اور تابعوں کے ساتھ اس بت خانہ میں آیا یہاں اس نے سونے کا ایک بت دیکھا، جس کی آنکھوں کے مقام میں یاقوت جڑے ہوئے تھے، محمد بن قاسم سمجھا کہ یہ (شاید) کوئی آدمی ہے، چنانچہ اس پر وار کرنے کے لیے اس نے تلوار نکالی اس پر بت خانہ کے مجاور برہمن نے کہا کہ اے عادل امیر! یہ وہی بت ہے جو ملتان کے راجہ جوبن نے بنوایا تھا وہ مال اس میں دفن کر کے فوت ہو گیا تھا، اس کے بعد محمد بن قاسم نے اس بت کو اٹھا لینے کا حکم دیا، اس کے نیچے سے 230 من سونا اور سونے کی کترن سے بھرے ہوئے مٹکے برآمد ہوئے کل تیرہ ہزار تین سو من سونا دفینے سے نکلا وہ سونا اور بت خزانہ میں لایا گیا، اس کے علاوہ موتی اور جواہرات جو کہ ملتان کی لوٹ مار میں ہاتھ آئے تھے اور بہت سے دوسرے خزانے اور دفینے بھی قبضہ میں لیے گئے۔

اسی دوران حجاج کا خط پہنچا، خط کا مضمون یہ تھا:

> ''اے چچا کے لڑکے! تمہیں یاد ہوگا تمہاری روانگی سے پہلے میں نے خلیفہ سے یہ عہد کیا تھا کہ بیت المال سے جس قدر روپیہ اس مہم پر خرچ ہوگا اس کی دونی رقم (خزانہ) داخل کر دی جائے گی۔ اس عہد کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے، اپنی فتوحات کا دائرہ ہمیشہ وسیع کرتے رہو! اشاعت اسلام کا خاص خیال رکھو اور جو بڑا یا قدیم شہر ہو وہاں

مسلمانوں کے لیے مسجد ضرور تعمیر کرایا کرو!''

محمد بن قاسم نے خط ملتے ہی مندر کا سونا، سونے کا بت اور مال غنیمت جو شہر سے حاصل ہوا تھا، کشتیوں کے ذریعے دیبل کے راستے سے عراق روانہ کر دیا، جب حجاج کے پاس یہ مال غنیمت پہنچا تو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور بے اختیار کہہ اٹھا کہ اب ہمارا غصہ ہو گیا، کیونکہ صرف شدہ (یعنی جو رقم اس مہم پر خرچ ہوئی تھی) پورا دوگنا خزانہ داخل ہوا چھ لاکھ درہم اور داہر کا سر (ہمیں) نفع میں ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو رقم اس مہم پر خرچ ہوئی وہ چھ کروڑ درہم تھی اور جو محمد بن قاسم نے خزانہ میں داخل کی تھی وہ بارہ کروڑ درہم تھی موجود دور کی صورت میں تین کروڑ ہوں گے۔

محمد بن قاسم کے بعد ملتان کے بتوں کے متعلق جو وضاحت ہمیں ملتی ہے وہ فہرست ابن ندیم کے حوالہ سے ملتی ہے۔ اس حوالے کے متعلق خود ابن ندیم لکھتا ہے کہ:

''ایک کتاب میری نظر سے گزری ہے جس میں ہندوستان کے مذاہب کا بیان تھا، یہ جمعہ 3 محرم 249ھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کا کاتب ''یعقوب بن اسحاق کندی'' تھا اس میں لکھا تھا کہ یحییٰ بن خالد برمکی نے کچھ لوگوں کو ہندوستان اس لیے بھیجا تھا کہ یہاں کی نباتات کی تحقیق کی جائے، چنانچہ واپسی پر انہوں نے ایک روداد پیش کی، یہ اسی کا خلاصہ ہے۔

اس میں ہندوستان کے مختلف مقامات کے حالات خصوصاً لھب رائے کے پایہ تخت ''مان کھیڑ'' کے مندر کا حال لکھ کر ملتان کی نسبت لکھا ہے کہ ملتان میں ایک گھر ہے یعنی مندر ہے اور کہا جاتا ہے یہ سات گھروں (مندروں) میں سے ایک ہے جو ہندوستان کے دوسرے اطراف میں ہیں۔ اس مندر میں لوہے کا ایک بت ہے جس کا طول ساتھ ہاتھ ہے، یہ قبہ کے بیچ میں معلق ہے، کیونکہ اس کو چاروں طرف سے مقناطیس اپنی کشش میں لیے ہوئے ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک حادثے کے سبب سے اب وہ ایک طرف سے کچھ جھک گیا ہے، یہ مندر پہاڑ کے نیچے ہے۔ اس کی بلندی ایک سو اسی ہاتھ ہے تمام ہندوستانی لوگ خشکی اور تری کے راستے سے اس کی زیارت کو آتے ہیں اور یہاں کا راستہ بلخ سے بڑا سیدھا ہے، کیونکہ ملتان بلخ کے شہروں کے بڑا قریب ہے یہاں پہاڑوں کی چوٹیوں اور سطح پر بے شمار پجاریوں کے مکان ہیں اور اس جگہ ان کی قربانیاں ہوتی ہیں کہا جاتا ہے کہ یہاں کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا کہ لوگ اس کی زیارت کو نہ آتے ہوں یہاں دو بت اور ہیں ایک کا نام جنبکست اور دوسرے کا نام زنبکست ہے ان کو ایک بڑی وادی کے دونوں کناروں پر پہاڑ پر پہاڑ کے پتھر کو گھڑ کر بنایا گیا ہے۔ یہ اسی ہاتھ بلند ہیں جو دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستانی ان کی زیارت کو آتے ہیں تو دور ہی سے جب نظر آنے لگتا ہے تو پیادہ پاؤں ہو جاتے ہیں اور اگر کبھی غفلت یا غلطی ہو جائے تو پھر اسی مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے وہ نظر نہ آئے اور واپسی میں جہاں سے پھر نظر آنے لگے تو پیدل ہو جاتے ہیں یہ محض ان کی بزرگی اور عظمت کے لیے ہے اس کے بعد کندی لکھتا ہے۔

اور ان لوگوں نے جنہوں نے ان کا مشاہدہ کیا ہے مجھ سے بیان کیا ہے کہ اس جگہ جانیں قربان کی جاتی ہیں اور اس کا خیال ہے کہ کبھی کبھی تو پچاس ہزار کی تعداد کو پہنچ جاتی ہے۔ (نوٹ: یعقوب کندی نے ملتان کے بت کی

تصویر بھی دی تھی جو ابن ندیم نے نہیں دی۔ ہم نے اس کے متعلق بہت کوشش کی مگر مجھے اس کتاب کا سراغ نہیں مل سکا اگر کہیں کبھی اسکا پتہ چلا تو پھر ہم ضرور اس کی مزید تفصیل بیان کریں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابو دلف نیبوئی کے بیان سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مندر اور بت کیا واقعی نیبوئی کی روایت کے مطابق نہیں تھا۔ اور تباہ کر دیا گیا تھا، لیکن بشاری کی روایت کے مطابق 375ھ میں یہ بت موجود تھا، اور جلم بن شیبان جو 372ھ کے بعد ملتان پر قابض ہوا تھا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ابن ندیم جب اپنی کتاب مرتب کرتا ہے تو وہ زمانہ 373ھ کا ہے اور ابو دلف نیبوئی کی روایت ہے کہ وہ بت اور بت خانہ ختم ہو چکا تا، اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں یا تو ملتان دو بتوں کی وجہ سے مشہور ہوگا، یا پھر نیبوئی کی روایت غلط ہے یا بشاری مقدسی کی روایت کو غلط قرار دینا پڑے گا۔ اس کے ساتھ یہ بھی مدنظر رہے کہ آدت دیوتا کے بت کو جلانے کی مختلف روایتیں ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ محمد قزدلینی نے لکھا ہے کہ کوئی شخص بت کے لیے تاج اور انگشتیانہ بطور نذرانہ لے کر آ رہا تھا اور اس کے اندر روئی بھری ہوئی تھی اور تیل سے تر کی ہوئی تھی۔ اس شخص نے موقع پا کر آہستہ سے اس میں آگ لگا دی اور خود دور جا کھڑا ہوا اس طرح یہ بت جل گیا۔)

ابن ندیم آگے چل کر لکھا ہے کہ اور کتاب کا حوالہ نقل کرتا ہے۔

بامیان کے مندر کا حال لکھ کر ملتان کی نسبت لکھتا ہے، فرج بیت الذہت (یعنی ملتان) میں ایک مندر ہے، بعضوں کا خیال ہے کہ وہ پتھر کا ہے جس میں گوتم بدھ کی مورتی ہے اور اس کا نام بیت الذہب اس لیے ہوا کہ حجاج بن یوسف ثقفی والئ عراق کے عہد میں یہ شہر فتح ہوا تو یہاں سے ایک سو بھار سونا دستیاب ہوا۔

پھر لکھتا ہے کہ مجھ سے ابو دلف نیبوئی نے بیان کیا ہے، جو بہت بڑا سیاح تھا کہ بیت الذہب ملتان میں جو مندر تھا اس وقت جو مشہور ہے، وہ نہیں ہے جو اس وقت تھا ابن ندیم کے بعد ہمیں ملتان کے بت کا تذکرہ ابو زید حسن سیرانی کے ہاں ملتا ہے۔

ابو زید سیرانی جب ہندوستان آیا تو اس نے ملتان کے بت کے متعلق جو کچھ سنا اور دیکھا وہ یہ ہے۔

وہ مشہور بت مولتان (ملتان) میں ہے اور ملتان منصورہ کے قریب ہے اس کی زیارت کے لیے لوگ کئی ماہ کا سفر طے کر کے آتے ہیں اور بکثرت عود ہنری کامرونی چڑھانے کے لیے لاتے ہیں۔ اور کامرون ایک شہر ہے جہاں کا عود بڑا عمدہ ہوتا ہے اور اس قدر نرم ہوتا ہے لوگ اس پر مہر کرتے ہیں تو اس پر نقش ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا قیمتی ہوتا ہے ایک من کی قیمت دو سو دینا ہوتے ہیں۔ لوگ دور دور سے اس کو لاتے ہیں اور بطور نذرانہ (یعنی بت کے آگے خوشبو کی دھونی دینے) کے لیے دیتے ہیں تاجر لوگ انہی کے ہاتھوں خرید کر باہر لے جاتے ہیں۔

مورخ سعودی........... اپنی کتاب مروج الذہب میں ملتان کے بت کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

یہاں ایک مشہور مندر ہے جس میں ایک بت ہے اس کی یاترا (زیارت) کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں اور بیش قیمت تحفے اس بت کی نظر کرتے ہیں جس میں جواہرات، عطریات اور خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس سے

حاکم ملتان کو بڑی آمدنی ہوتی ہے اور اس کی بدولت اس کے پاس خالص عود ہندی کافی مقدار میں موجود رہتا ہے اس کی قیمت دوسو دینار سونے کا سکہ فی من ہے اور یہ عود اس قدر نرم ہے کہ اگر اس پر مہر سے دبائیں تو نقش ایسے ہی اٹھتا ہے جیسے موم پر نقش ابھرتا ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ملتان پر کوئی غیر مسلم راجہ حملہ آور ہوتا ہے اور مسلمان اپنی کمزوری سے اس کو شکست نہیں دے سکتے تو حاکم ملتان اس راجہ کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر تم نے قدم آگے بڑھایا تو بت خانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اور بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ چنانچہ ایک ہندو راجہ کو یہ کسی طرح پسند نہیں اس لیے وہ اپنا لشکر واپس لے جاتا ہے۔

سعودی کے تقریباً بیس برس گزرنے پر 331ھ کے بعد ابن مہلہل سندھ آتا ہے اور اس کے بت کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ:

ملتان ایک بڑا شہر ہے جس میں فصیل بھی ہے، ہندو لوگ اس طرح یاترا (حج) کرنے جاتے ہیں جیسا کہ ہم مکہ میں۔ وہاں اسلامی حکومت ہے اور غیر مسلم ان کے ماتحت رہتے ہیں۔ اس جگہ ایک بہت بڑا قبہ اور اس کے نزدیک مسلمانوں کی جامع مسجد ہے عام طور پر لوگ شریعت کے تابع ہیں اور دینی امور پر عمل کرتے ہیں وہ قبہ تین سو ہاتھ بلند اور بیس ہاتھ چوڑا ہے، قبہ کے اردگرد خدام پجاریوں کے مکان ہیں شہر ملتان مین غیر مسلم ہندو اس محل کے سوا کسی دوسری جگہ نہیں رہتے اور وہ بت انسانی شکل کا ہے اور کرسی یعنی بلندی پر چار زانو بیٹھا ہے، اس کے دونوں ہاتھ زانوں پر ہیں اور سر پر سونے کا تاج ہے آنکھوں میں دو لعل ہیں، بعضوں کا خیال ہے کہ وہ لکڑی کا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کسی اور چیز کا ہے، سوائے دونوں آنکھوں کے باقی تمام بدن کو سرخ چمڑے جیسا لباس پہنا رکھا ہے اور انگلیاں اس طرح ہیں جیسے حسب کرنے والا ہتھیلی جمع کر لیتا ہے ملتان کا بادشاہ اس بت کو لالچ کی وجہ سے نہیں توڑتا، کیونکہ جو نذرانہ آتا ہے اس میں سے خداموں کو تھوڑی سی رقم دی جاتی ہے، ہندو راجہ جب ملتان فتح کرنے کا قصد کرتا ہے تو مسلمان اس بت کو باہر نکال کر توڑنے کی اور جلانے کی دھمکی دیتے ہیں، ہندو راجہ اس سے ڈر کر واپس چلا جاتا ہے۔

اصطخری ابن مہلہل کے بعد جب 340ھ میں ملتان آیا تو اس نے آدت یعنی سورج دیوتا کے متعلق کچھ لکھا ہے، حسب ذیل ہے۔

ملتان کا شہر منصورہ سے چھوٹا ہے، آدھے میل کے برابر یہاں ایک مورتی ہے جس کی ہندو بڑی عزت کرتے ہیں اور دور دور کے شہروں سے لوگ یہاں یاترا (حج) کی نیت سے آتے ہیں اور ہر سال اس پر ثواب کے خیال سے نذرانے چڑھاتے ہیں جس سے مندر اور پجاریوں کا خرچ پورا کیا جاتا ہے اور اس شہر کا نام ملتان اس بت کی وجہ سے رکھا گیا ہے، یہ بت ملتان کے پُر رونق بازار میں ہے، جو ٹھٹھیروں اور ہاتھی دانت والے بازار کے درمیان واقع ہے مندر بڑے محل کے درمیان میں ہے اس پر ایک قبہ ہے اور اسی قبہ میں بت (مورتی) ہے اور اس کے اردگرد پجاریوں کے مکانات ہیں اس مورتی کی شکل انسانی صورت کی ہے جو پالتی مارے کرسی پر بیٹھی ہے، یہ کرسی اینٹ اور گچ کی ہے،

اس کا لباس سرخ چمڑے کا ہے جس سے اس کا تمام بدن بجز آنکھوں کے ڈھکا ہوا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لکڑی کی مورتی ہے اور بعض کچھ اور کہتے ہیں، کیونکہ کبھی اس کا بدن ننگا نہیں کیا جاتا، اس کی آنکھوں میں دو ہیرے یا یاقوت ہیں اور اس کے سر پر سونے کا تاج ہے، مجسمہ پالتی مارے کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور دونوں ہاتھ گھٹنے کی طرف لمبے کئے ہوئے ہیں انگلیاں اس طرح سے ہیں گویا وہ حساب یعنی گنتی کر رہا ہے، لوگ جو کچھ نذر کے طور پر اس مورتی کے لیے بھیجتے ہیں اس کو ملتان کا حاکم لے لیتا ہے اور ان کے پجاریوں پر اپنے زیر اہتمام خرچ کرتا ہے۔

ہندو راجوں میں جو کوئی ملتان پر چڑھائی کرتا ہے تو حاکم ملتان اس بت کو باہر نکالتا ہے اور اسے توڑ کر جلا دینے کی دھمکی دیتا ہے، وہ راجہ اسی ڈر سے واپس چلا جاتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو ملتان کبھی کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جاتا۔

بشاری مقدسی کے آنے سے پہلے ملتان کی حکومت انقلاب کی نذر ہو چکی تھی اور خاندان بنو سام کی امارت کا دور قرامطہ کی سیاسی سازشوں کا شکار ہو چکا تھا، اور جس وقت ہم مقدسی کو ملتان میں دیکھتے ہیں اس وقت جلم بن شیبان مصر کے خلفاء کی طرف سے ملتان کا حاکم تھا، اس نے ملتان کا سب سے بڑا مندر توڑ کر وہاں مسجد تعمیر کرائی اور بنو امیہ کی مسجد کو بند کروا دیا۔

بقول البیرونی، ملتان میں ایک کنڈ بھی تھا جس کی یاترا کو لوگ آتے تھے، اب بشاری کا بیان ملاحظہ ہو:
بشاری مقدسی 375ھ میں لکھتا ہے کہ:

ملتان کے مندر میں ایک مورتی ہے یہ مندر ایک محل میں ہے جو بازار کے آباد حصہ میں واقع ہے، اس کے بیچ میں بڑا خوبصورت قبہ ہے اور اس کے گرد پجاریوں کے مکانات ہیں، بت آدمی کی شکل کا ہے جو اینٹ اور کچ چونے سے بنی کرسی پر پالتی مارے بیٹھا ہے، اس کو سرخ کپڑے کا لباس جو سنجاف کے مشابہ ہے پہنا دیا گیا ہے، جس سے سوائے آنکھوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا، اور ان دونوں آنکھوں میں لعل لگا دیئے گئے ہیں سر پر سونے کا تاج ہے، اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ہیں اور انگلیاں اس طرح ہیں گویا وہ حساب کر کے چار گن رہا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مندر ہیں جو کم درجہ رکھتے ہیں۔

(نوٹ: بشاری مقدسی جب ملتان پہنچتا ہے تو اس وقت ملتان میں قرامطہ کی حکومت ہوتی ہے، بشاری لکھتا ہے: ملتان والے شیعہ ہیں اذان میں ''حی علی خیر العمل'' اور اقامت میں کلمات کو دو مرتبہ ادا کرتے ہیں۔ ملتان کا بادشاہ مصر کے فاطمی خلفاء کا خطبہ پڑھتا ہے اور کوئی کام مصری فاطمی خلفاء کی اجازت کے بغیر نہیں کیا جاتا اور ہمیشہ ان کو ملتان کا بادشاہ ہدیہ اور تحفے روانہ کرتا ہے، وہ طاقتور اور عادل بادشاہ ہے، ملتان میں فاطمی خلفاء کے حکم سے ہی والی مقرر کئے جاتے ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر کوئی والی نہیں ہو سکتا۔

(نقش ملتان - عتیق فکری)



حنیف چوہدری

ملتان کے نابود قبرستان

(میں نے یہ معلومات ماسٹر شری واستو نا بھوی کی کتاب ''ملتان کے قدیم مندر'' کے باب تین سے اخذ کی ہیں یہ کتاب پُتلی گھر روڈ امرتسر سے رائے کشن داس پریس نے 1892ء میں شائع کی تھی جو گورمکھی رسم الخط میں ہے جس میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار ہے۔ کتاب سے مسلمان دشمنی کی بو آتی ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے ذہن میں یہ بات مدِنظر رکھی جائے کہ یہ کتاب 1892ء میں تحریر کی گئی تھی۔)

قبرستان جیون شاہ

یہ قبرستان ملتان شہر کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس قبرستان سے پرے ایک شمشان گھاٹ (ہندوؤں کے مردے جلانے کی جگہ) ہے جسے ملتان کے مسلمان حاکم نے بند کروا دیا تھا۔ جس پر ہندوؤں نے احتجاج کیا۔ تو ان کے ایک درباری لالہ کھیم چند کی مداخلت سے یہ مسئلہ حل ہوا۔ اس قبرستان میں شیر شاہ سوری کا ایک بیٹا بھی دفن ہے۔ جس پر فارسی زبان میں ایک کتبہ بھی نصب ہے جس پر حرف پہلا لفظ ''آہ'' پڑھا جاتا ہے۔ باقی الفاظ معدوم ہیں اور آخری لفظ ''پسر شیر شاہ سوری'' نمایاں ہے۔ اس قبرستان کے بارے میں روایت ہے کہ یہاں رات کے وقت ایک قبر سے روشنی باہر آتی ہے۔ روشنی دیکھنے والوں کا رات کے وقت تانتا بندھا رہتا ہے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے اس قبرستان کا مجاور رات کو اس قبر کے اندر موم بتی یا دیا جلا دیتا ہے تو روشنی باہر آتی ہے۔

جہانگیری قبرستان

یہ قبرستان ملتان کے قلعہ کے شمال میں واقع ہے بتایا جاتا ہے کہ جہانگیر نامی ایک بزرگ یہاں دفن تھا جب راوی دریا نے اس قبرستان کو دریا برد کرنا شروع کیا تو اس بزرگ کے معتقدین نے ان کی میت کو نکال کر کسی دوسرے قبرستان میں لے جانا چاہا۔ چنانچہ جب قبر کو کشا کیا گیا تو خالی کفن پڑا تھا اور میت غائب تھی۔ لوگ حیران تھے چنانچہ حاکم ملتان کو خبر کی گئی۔ جو ذات کا کھتری تھا۔ اس نے حکم دیا کہ قبر کو دریا برد ہونے دو۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ د

وہاں سے دور جا چکا تھا اور وہاں سے کفن غائب تھا۔

قبرستان ناگ شاہ

یہ قبرستان سورج کنڈ مندر سے ایک فرلانگ دور ہے۔ اس قبرستان میں شیعہ حضرات اپنی میتوں کو دفن کرتے ہیں۔ اس قبرستان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ جہاں بھی کوئی نئی قبر کھودی جاتی ہے تو وہاں سے پرانے مُردوں کی ہڈیاں ملتی ہیں۔ بعض قبریں ایسی بھی ملی ہیں جن میں مردے کے ساتھ مٹی یا چاندی کے برتن جو میت کے سرہانے پڑے ہوتے ملے ہیں۔ جس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے قدیم قبرستان ہے۔ ملتان شہر کے ایک بزرگ کی روایت ہے کہ رات کے وقت کئی قبروں سے آوازیں سنائی دیتی ہیں جس کی وجہ سے لوگ رات کے وقت میتوں کو یہاں نہیں دفناتے۔

بڑا قبرستان

یہ قبرستان خضری دروازے سے جب اندر داخل ہوں تو سامنے ایک فصیل کے اندر بہت پرانا قبرستان نظر آئے گا۔ کہتے ہیں کہ جب سکندر اعظم نے ملتان پر حملہ کیا تو بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ سکندر کے بارہ سو سپاہی مارے گئے چنانچہ کئی دن تک ان کی نعشیں پڑی رہیں۔ پھر شہر کے لوگوں نے ان سب نعشوں کو اٹھا کر اس قبرستان میں دفن کیا۔ اس قبرستان میں نوگزوں کی نو قبریں ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قدیم زمانے میں یہاں شمشان گھاٹ تھا جب عربوں نے ہندوستان فتح کیا تو انہوں نے اس شمشان گھاٹ کو بند کر کے وہاں قبرستان بنا لیا۔

قبرستان بابا فرید

قلعہ ملتان سے تقریباً چار فرلانگ دور بابا فرید کا قبرستان ہے۔ اس قبرستان کے بارے میں روایت ہے کہ بابا فرید کے خاندان کے کئی افراد یہاں دفن ہیں۔ اس وجہ سے یہ ''قبرستان بابا فرید'' کہلایا۔ قبرستان کے ایک کونے میں ایک بہت بڑا پیپل کا درخت ہے جس کے نیچے بیٹھ کر بابا فرید گیان دھیان کیا کرتے تھے۔ یہ پیپل بابا جی کی یادگاری پوتر نشانی ہے۔ گورو رام داس جی نے بھی اسی پیپل کے نیچے بیٹھ کر تپسیا کی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک جوڑے (مرد اور عورت) نے رات یہاں خرابی کی جس سے اگلے روز اتنی بارش ہوئی کہ ہڑ (سیلاب) آ گیا اور سارا قبرستان زمین بوس ہو گیا۔

قبرستان مٹھا پیر

ملتان شہر کی باہری فصیل کے جنوب میں متصل دربار شاہ ولی یہ متعدد پختہ اینٹوں کا قبرستان ہے۔ مٹھا پیر کی قبر پر لوگ چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ اور مرادیں مانگتے ہیں۔ ان لوگوں میں ہندو اور سکھ بھی شامل ہوتے ہیں کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ گورکن کسی ولی اللہ کی قبر کھود رہے تھے کہ اتنے میں مٹھا پیر بھی آ گئے۔ اور قبر کے قریب آ کر بیٹھ گئے جب قبر تیار ہو گئی تو وہ اس کے اندر لیٹ گئے۔ گورکنوں کا خیال تھا کہ وہ قبر کی لمبائی ناپ رہے ہیں۔ مگر وہ کافی دیر

تک جب باہر نہ نکلے تو گورکنوں نے ان سے باہر نکلنے کی درخواست کی تو وہ نہ بولے نہ کوئی جنبش ہوئی پھر پتہ چلا کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔

قبرستان گھوڑے شاہ

اس قبرستان کے بارے میں عجیب کہانی بتائی جاتی ہے جب دریائے راوی نے ملتان شہر کا رخ کیا اور نواحی قصبوں کے مکانات بہا لے گیا تو متاثرہ لوگ راتوں کو جاگ جاگ کر گزارتے۔ کہ پانی تھا کہ سمندر کی طرح دکھائی دیتا تھا اور بڑھتا ہی جاتا۔ اچانک رات کو سفید لباس میں ملبوس ایک گھوڑ سوار پانی پر گھوڑا دوڑاتا دکھائی دیا۔ لوگ ڈر کے مارے سہم گئے۔ کوئی رونے لگا کوئی گیان میں مصروف ہو گیا کسی نے کرامت قرار دیا۔ صبح ہوتی ہی دریا کا پانی اتر گیا اور گھوڑ سوار بمعہ گھوڑا مردہ پائے گئے۔ لوگوں نے اس ولی اللہ کو وہیں دفن کر دیا اس طرح یہ قبرستان آباد ہو گیا۔ مسلمانوں میں اس طرح کے فرضی قصے عام ہیں۔

قبرستان زندہ پیر

ملتان شہر کے عین وسط میں واقع زندہ پیر کا قبرستان بہت قدیم بتایا جاتا ہے لوبھی لوگوں نے ان قبروں کی بے حرمتی کرتے ہوئے مسمار کر کے مکانات تعمیر کرنا شروع کر دیئے۔ جب ملتان کے سربراہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے سارے مکان مسمار کروا کر مالکان مکانات کو جیل کی سزائیں دیں۔ سندھ کے ہندو حاکم نے جب ملتان کو فتح کیا تو اس نے ان قیدیوں کی سزائیں معاف کر دیں۔ اور سارا قبرستان مسمار کروا دیا۔ اور وہاں مکانات تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ جس پر مسلمانوں نے شدید ردِعمل ظاہر کیا۔ اس ردِعمل میں ہندوؤں اور سکھوں نے بھی حصہ لیا۔

ان کے علاوہ ملتان کے نواحی علاقوں میں کئی چھوٹے چھوٹے قبرستان ہیں جن کے نام تو گنوائے جا سکتے ہیں مگر تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ جب بھی ملتان میں مسلمان حاکم آیا اس نے مندروں کو منہدم کیا شمشان گھاٹ بند کروائے اور غیر مسلمانوں سے ناروا سلوک کیا۔

قبرستھانوں (قبرستانوں) کے نام یہ ہیں

1۔	قبرستان جندوڈا	اندرون شہر
2۔	قبرستان حسن دیوانہ	نواح ملتان
3۔	قبرستان مائی سواگ/ سہاگ	محلہ مائی مہربان
4۔	لنگاہ قبرستان	بیرون دولت گیٹ
5۔	خاندانی قبرستان	اندرون پاک گیٹ
6۔	قبرستان جندوڈا	اندرون بوہر گیٹ (مصنف نے اس کو ابوہر گیٹ لکھا ہے)
7۔	آدم خانی قبرستان	اندرون لاہوری گیٹ

8۔ قبرستان شہر خاموشاں بستی بچہ کے باہر سڑک کے ساتھ

9۔ پل والہ قبرستان نزد پل مردہ خانہ

(حیرت کی بات ہے کہ مصنف نے یہ احوال جمع کرتے ہوئے کسی کتاب/شخص/ راوی کا حوالہ نہیں دیا۔ کیا مصنف نے ان قبرستانوں کو دیکھا تھا یا کسی سے سنا تھا۔ محقق اس طرح کی معلومات کو ناقص اور نامعتبر قرار دیتے ہیں۔ بہر حال گردو گرما، گدا و گورستان کو جھٹلایا نہیں جا سکتا)

حنیف چودھری



ایم اے شمشاد

تحریک آزادی اور ملتان

ملتان برصغیر کا وہ واحد شہر ہے جہاں قیام پاکستان سے بہت پہلے عملاً پاکستان قائم ہو چکا تھا۔ انگریز کی رخصتی 1937ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے چیئرمین کے انتخاب میں سید محمد رضا گیلانی کے ہاتھوں انگریز ڈپٹی کمشنر ای پی مون کی شکست کی بنا پر عمل میں آ چکی تھی۔ اس وقت جب برصغیر میں آزادی کی تحریک شروع تھی، ملتانیوں نے اس تحریک کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ تحریکِ خلافت کے بعد جب ملتان میں پاکستان مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تو سید زین العابدین شاہ گیلانی ملتان ڈویژن مسلم لیگ کے صدر بنے۔ انگریز کو برصغیر سے نکالنے اور کانگریس کے مسلمانوں کے خلاف عزائم ناکام بنانے میں ملتان کے لوگوں نے جو تاریخی کردار ادا کیا اس کی مثال برصغیر کے کسی دوسرے علاقے میں نہیں ملتی۔ ان دنوں موجودہ پاکستانی پنجاب صرف تین ڈویژنوں ملتان، لاہور اور راولپنڈی پر مشتمل تھا۔ ملتان کا ضلع لودھراں، وہاڑی اور خانیوال کے موجودہ اضلاع پر مشتمل تھا۔ بہاولپور کو ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت جھنگ بھی ملتان ڈویژن کا حصہ تھا اور موجودہ فیصل آباد ڈویژن جسے لائل پور کہا جاتا تھا، ضلع جھنگ کی تحصیل تھی۔

ملتان ڈویژن میں مسلم لیگ کی تحریک ہندوؤں کی اقتصادی بالادستی کے باوجود اس زور سے ابھری کہ انگریز اور ہندو مل کر بھی اس کا راستہ نہیں روک سکے۔ مسلمانوں میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ قیام پاکستان سے قبل ہر سال عام خاص باغ ملتان میں زین العابدین شاہ گیلانی کی رسم تاجپوشی ادا کی جاتی تھی۔ تاجپوشی کے موقع پر انہیں سیپ کے بٹنوں سے سجایا گیا تاج پہنایا جاتا تھا۔ رسم تاجپوشی کے لیے عام خاص باغ کا انتخاب اس بنا پر کیا گیا تھا کہ یہ تاریخی باغ ہندوؤں کے سناتن دھرم ہائی سکول (موجودہ اسلامیہ ہائی سکول عام خاص باغ) کے بالمقابل واقع تھا۔ عام خاص باغ جنوبی پنجاب میں مسلمانوں کے مذہبی اجتماعات کے حوالے سے خصوصی شہرت رکھتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہاں دینی مدارس کے سالانہ جلسے منعقد ہوتے رہے ہیں۔ لانگے خاں باغ سول ہسپتال ملتان سے ملحق ہے، سیاسی اجتماعات کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا تھا۔

سید زین العابدین شاہ گیلانی عوامی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ گیلانی خاندان کے بزرگوں، اکابرین

زعما کی گراں قدر خدمات کی بنا پر سید زین العابدین شاہ گیلانی کو ملتان میں خصوصی اہمیت حاصل تھی اور وہ ملتان میں مسلم اتحاد کی پہچان بن گئے۔ مصلحت تھی یا غم روزگار کا تقاضا، سید زین العابدین رات کو گرم انڈے کی صدا لگاتے شہر کی گلیوں میں گشت کرتے۔ اندرون شہر ہندوؤں کی اکثریت تھی اور یہ سید زین العابدین ہی کا دل، گردہ تھا کہ وہ انڈے گرم کی صدا لگاتے پورے شہر کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں گھومتے رہتے اور سارے شہر کی خبر براہ راست رکھتے۔ ہندوان کی آمد اور آواز کے ساتھ ہی زینو شاہ آ گیا، زینو شاہ آ گیا کی آواز لگا کر ایک دوسرے کو چوکس کرتے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔ گڑ منڈی میں جواہر لعل نہرو کی ملتان آمد پر جلسے کی تیاریوں کے سلسلے میں تھانہ کپ کے عقب میں واقع کھلے میدان میں رات کو ہندوؤں کا ایک بڑا اجتماع ہوا کسی نے آواز لگا دی زینو شاہ آ گیا یہ سرگوشی اتنا بڑا دھماکہ بن گئی کہ ہندو اپنا جلسہ چھوڑ کر اور جواہر لعل نہرو کے خیر مقدم کی تیاریوں کو نظر انداز کر کے دھوتیاں تھامے بھاگ کھڑے ہوئے۔

سید زین العابدین شاہ گیلانی کے ساتھ فدائین کی ایک خاص جماعت تھی جس میں غلام رسول پاکستان، کپتان محمد بخش اور سید صاحب علی شاہ گردیزی جیسے سرفروش لوگ شامل تھے۔ غلام رسول کے نام کے ساتھ پاکستان کا اضافہ خود زین العابدین نے کیا تھا اور وہ ملتان کی سڑکوں پر چلتا پھرتا، زندہ، متحرک اور فعال پاکستان بن گئے۔ کپتان محمد بخش کا نام سن کر تو انگریز نوکر شاہی اور ہندوؤں پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ کپتان محمد بخش مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے کمانڈر تھے اور انہیں پاکستان مسلم لیگ کے مسلح دستوں کے کمانڈر چیف کی حیثیت حاصل تھی۔ 46-1945ء میں پل شوالہ کی ایک مسجد میں رات کو مسلم لیگ کے جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا گیا تھا۔ انگریز نے اس جلسے کو روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن سید زین العابدین نے ہر قسم کی پابندی کو توڑنے کا اعلان کر دیا اور مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے مسلح دستوں کو شہر میں مارچ کا حکم دیا جس پر انگریز انتظامیہ حواس باختہ ہوگئی۔ انگریزوں نے مسلم لیگ کا جلسہ روکنے کے لیے پل شوالہ پر پولیس متعین کی لیکن مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے مسلح دستوں کو بپھرا دیکھ کر وہ بت بنی کھڑی رہی۔ جلسہ شروع ہوا تو انگریز ایس پی نے با آواز بلند سید زین العابدین شاہ کو جلسے کے غیر قانونی ہونے کے بارے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے مطلع کرنے کی کوشش کی لیکن مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے کپتان محمد بخش نے انگریز ایس پی کے منہ پر ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ وہ چکرا گیا اور اس کی ٹوپی ہوا میں اڑ کر دور جا گری۔ اس تھپڑ کے ساتھ ہی مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے رضا کار حرکت میں آ گئے اور پولیس کو موقعہ کی نزاکت دیکھتے ہوئے وہاں سے فرار ہونا پڑا۔

جلسے کے دوران سید زین العابدین شاہ گیلانی نے مسلم لیگ نیشنل گارڈ کو ملتان میں انگریز فوج کی چھاؤنی پر حملے کا حکم دے دیا جس پر ملتان کی انگریز انتظامیہ میں زلزلہ آ گیا اور انگریز ڈپٹی کمشنر کو مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی کینٹ میں انگریز فوج کے خلاف کارروائی رکوانے کے لیے زین العابدین شاہ کی منت کرنا پڑی تا کہ وہ چھاؤنی کی طرف مارچ کر جانے والے دستوں کو واپس بلائیں۔ سید زین العابدین شاہ گیلانی کی ہدایت پر چھاؤنی

پر یہ حملہ رک سکا ورنہ انگریز کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے اور وہ اس طوفان بلاخیز کے مقابلے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔اس کے نتیجے میں خون خرابا ہوتا، انگریز اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

1946ء میں بلدیہ ملتان کے ایک ضمنی انتخاب میں پنجاب یونینسٹ حکومت نے اپنے وزیر تعلیم نواب عاشق حسین قریشی کو جو پنجاب کے پیپلز پارٹی دور کے گورنر اور وزیر اعلیٰ نواب صادق حسین قریشی کے چچا تھے، مسلم لیگ کے مقابلہ کے لیے اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ حلقہ انتخاب میں چونکہ محلّہ شاہ گردیز، پل شوالہ اور سوتری وٹ کے علاقے بھی شامل تھے جہاں کی بیشتر آبادی کا تعلق شیعہ مسلک سے تھا۔ انگریز اور یونینسٹ حکومت کو خیال تھا کہ نواب عاشق حسین قریشی شیعہ مکتب فکر کے لوگوں کے ووٹ حاصل کرلیں گے اور مسلم لیگ کے غبارے سے ہوا نکالی جاسکے گی لیکن ملتان سے پنجاب مسلم لیگ کے رکن سید صاحب علی شاہ گردیزی، سید علی حسین شاہ گردیزی، سید نذیر حسین شاہ گردیزی نے مسلم لیگ کی طرف سے جھولی پھیلا کر حلقے میں جب ووٹ مانگنا شروع کئے تو صورتحال بالکل بدل گئی۔ مسلم لیگ نے نواب عاشق حسین قریشی کے مقابلے میں پہلے بلدیہ ملتان کے ایک مسلمان خاکروب کو امیدوار نامزد کیا۔ اس پر حکومت پنجاب اور انگریز کو لینے کے دینے پڑ گئے اور ساری سرگرمیاں انتخاب میں ووٹ لینے کے بجائے اس جانب مرکوز ہوگئیں کہ آخر نواب عاشق حسین قریشی کا کچھ تو خیال کیا جانا چاہیے۔ ان کے مقابلے میں کسی خاکروب کو امیدوار بنانا اشرافیہ کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس پر پنجاب کی یونینسٹ حکومت نے مسلم لیگ کی مرکزی قیادت اور قائد اعظم محمد علی جناح کے پاس اپیلیں اور وفود بھیجنے شروع کئے اور بالآخر مرکزی مسلم لیگ کی مداخلت پر پاکستان مسلم لیگ ملتان کو اپنا امیدوار بدلنا پڑا۔ مسلم لیگ نے نواب صاحب کے مقابلے میں سید سعید احمد شاہ ایڈووکیٹ کو اپنا امیدوار نامزد کیا جو 1940ء کے بعد دہلی سے ہجرت کر کے ملتان میں آباد ہوگئے تھے۔

ملتان میں اس وقت جہاں حسن پروانہ قبرستان کے بالمقابل جنرل پوسٹ آفس قائم ہے، یہی جگہ بلدیہ ملتان کے ضمنی انتخاب کے لیے پولنگ سٹیشن کے لیے منتخب کی گئی۔ پولنگ کے خاتمے اور گنتی کے بعد جب نتائج کا اعلان کیا گیا تو غیر منقسم پنجاب کی یونینسٹ حکومت کے وزیر تعلیم نواب عاشق حسین قریشی کو صرف 17 ووٹ ملے۔ نواب عاشق حسین قریشی کی ضمانت ضبط ہوگئی اور پنجاب کی یونینسٹ حکومت کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ ثابت ہوا۔ ملتان کا یہ ضمنی انتخاب پورے برصغیر میں تاریخی حیثیت اختیار کر گیا اور اس انتخاب کے نتیجے کے اعلان پر قائد اعظم محمد علی جناح نے بذریعہ تار پاکستان مسلم لیگ ملتان ڈویژن کے صدر سید زین العابدین شاہ کو مبارکباد دی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کا یہ تاریخی مبارکبادی تار ایوب خان کے دور تک ملتان مسلم لیگ کے ریکارڈ میں موجود تھا۔

سید زین العابدین شاہ گیلانی سادہ لیکن نہایت عجیب و غریب شخصیت تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان سے قبل شہر بھر کے مسلمانوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ شکوہ اسلام کے اظہار کے لیے جمعہ کی نماز محلے کی مساجد کی بجائے باغ لانگے خاں ملتان میں ادا کیا کریں۔ ان کی اپیل پر ملتان کے شہریوں نے جس والہانہ انداز میں لبیک کیا او

جس طرح شہر کے مختلف اطراف سے لوگ جیش در جیش مسلم لیگ کے جھنڈے اٹھائے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے لانگے خاں باغ کی طرف روانہ ہوتے تو پاکستان مخالف خوفزدہ ہو جاتے۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد یہ اجتماع بہت بڑے سیاسی جلسے میں بدل جاتا۔ غلام رسول پاکستان کو سید زین العابدین شاہ کے وزیراعظم کی حیثیت حاصل تھی۔ سٹیج پر صرف ایک کرسی رکھی جاتی تھی جس پر سید زین العابدین گیلانی براجمان ہوتے۔ مسلم لیگ زندہ باد اور لے کے رہیں گے پاکستان کے پرجوش نعروں کی گونج میں غلام رسول پاکستان کی طشتری میں قینچی رکھ کر سید زین العابدین شاہ گیلانی کو پیش کرتے اور اعلان کیا جاتا کہ میاں چنوں، چیچہ وطنی، شاہ جیونا، پاک پتن، اوکاڑہ، لودھراں، میلسی، جام پور، کہروڑ پکا، جلال پور، راجن پور کے دور دراز دیہات سے کئی ہندو اور سکھ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہونے کے لیے موجود ہیں۔ یہ لوگ سٹیج پر آ کر بلا اجبار و اکراہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کریں گے اور انہیں اس عظیم اجتماع کے سامنے کلمہ توحید پڑھایا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد کپتان محمد کچھ لوگوں کو قطار کی شکل میں سٹیج پر لاتے۔ ہر کسی کا نام، ولدیت قوم اور رہائش کا پتہ با آواز بلند لاؤڈ سپیکر پر بتایا جاتا اور اعلان کیا جاتا نتھو رام ولد فتو رام، لہنا سنگھ ولد شمشیر سنگھ سکنہ چک نمبر فلاں نے اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ مذکورہ اشخاص کو سٹیج پر سید زین العابدین شاہ گیلانی کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا۔ شاہ صاحب لاؤڈ سپیکر کے ذریعے پوچھتے کہ آیا وہ کسی جبر یا مجبوری کے تحت تو اسلام قبول نہیں کر رہے اور یہ بھی استفسار کرتے کہ آیا مذکورہ شخص کا نام، ولدیت اور اس کے بارے میں بتائے جانے والے کوائف درست ہیں۔ مذکورہ شخص کی طرف سے لاؤڈ سپیکر پر اعتراف اور تسلیم کے بعد شاہ صاحب طشتری میں پڑی قینچی اٹھاتے اور نتھو رام کی بودی اور لہنا سنگھ کے کیس قینچی سے کاٹ کر اسے کلمہ طیبہ پڑھاتے۔ قطار میں نومسلموں کے ساتھ یہی سب کچھ دہرایا جاتا۔

لانگے خاں باغ ملتان میں ہونے والے اس اجتماع سے کانگریس اور ہندوؤں کو جو تکلیف پہنچی، پورے ہندوستان میں جو ہاہا کار مچی، اس سے برصغیر کے ہندو اور سکھ انتہا درجے پریشان تھے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے اخبارات پرتاب، تیج اور ہندو وغیرہ نے اپنے نمائندے ہر جمعہ کو ملتان بھیجنا شروع کر دیئے جو نماز جمعہ کے اجتماع کے بعد مسلمان ہونے والے ہندوؤں اور سکھوں کے نام، پتے، ذات اور سکونت نوٹ کرتے اور اعلان کردہ پتوں پر جا کر ان کے بارے حقائق معلوم کرتے۔ دو تین ماہ کی تحقیق اور عرق ریزی کے بعد ہندو اور سکھ اخبار چوکھٹوں میں اس بات کی تردید شائع کرتے کہ باغ لانگے خاں ملتان میں زینو شاہ نے جن ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمان ہونے کا اعلان کیا تھا وہ سب فرضی ہیں۔ اس نام کا دیئے گئے پتوں پر کوئی شخص موجود نہیں پایا گیا لیکن باغ لانگے خاں میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف سید زین العابدین شاہ کا یہ سلسلہ ہر جمعہ باقاعدگی کے ساتھ نہ صرف جاری رہتا بلکہ ہر مرتبہ مسلمان ہونے والے ہندوؤں اور سکھوں کی فہرست میں اضافہ بھی ہوتا رہتا۔ اس بنا پر پورے ملتان ڈویژن ہی میں نہیں بلکہ پنجاب میں تمام مسلم اکثریتی علاقوں کے ہندوؤں اور سکھوں

میں زبردست بد دلی پھیلتی رہی۔ کانگریس اور اس کے حامی فکس اپ ہوتے رہے اور مسلم لیگ کا سیاسی پروگرام اور پاکستان کا پروپیگنڈہ زور شور سے آگے بڑھتا رہا۔ سید زین العابدین شاہ گیلانی کی اس حکمت عملی کی بنا پر ملتان ڈویژن ہی نہیں بلکہ جنوبی پنجاب کے ہندو اور سکھ قیام پاکستان کے بعد ہندوستان جانے پر مجبور ہوئے، ورنہ قیام پاکستان کے اعلان کے بعد مشرقی پنجاب میں جو بھارت کا حصہ بن گیا تھا جس طرح مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی، ایسا کوئی واقعہ جنوبی پنجاب میں پیش نہیں آیا۔

پورے ملتان میں صرف دو ہندو مارے گئے اور وہ بھی ہجرت کر کے ملتان پہنچنے والے زخمی اور کٹے اعضا والے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی حالت دیکھ کر مسلمانوں کے فوری ردعمل کا نتیجہ تھے۔ بیس پچیس سال پہلے بھٹو دور تک ملتان میں نازو بھگیلا نامی ایک شخص مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھائے ملتان کی سڑکوں اور ضلع کچہری میں اکثر قائد اعظم زندہ باد، پاکستان زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد کا نعرہ لگا کر لوگوں سے پیسے وصول کرتا پھرتا تھا۔ موجودہ نسل کے بہت سے لوگوں نے بھی اسے دیکھا ہوگا۔ محمد نواز نامی شخص حرم گیٹ کے علاقے میں ایک اکھاڑے کا نامور پہلوان تھا اور شہر میں تانگہ چلاتا تھا۔ مسلم لیگ کا فدائی بانکا ہونے کی بنا پر اس کا تانگہ ملتان شہر کے تمام تانگوں سے کہیں بہتر اور چمک دمک رکھتا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت سے ہر شخص خوف کھاتا تھا اور بڑے بڑے بدمعاش اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ یہی محمد نواز قیام پاکستان کے بعد ایک دن چھاؤنی ریلوے سٹیشن سے سواریاں شہر ڈھونے کے لیے اپنے تانگے کے ساتھ سٹینڈ پر کھڑا تھا اچانک اس نے دیکھا کہ مسلم کی قیادت سٹیشن پر پہنچنا شروع ہوگئی۔ اس نے مسلم لیگیوں سے معاملے کی نوعیت پوچھی تو پتہ چلا کہ مشرقی پنجاب سے لٹے پٹے مہاجروں کو لے کر ایک ٹرین ملتان پہنچنے والی ہے اور مسلم لیگی ان مہاجروں کو خوش آمدین کہنے کے لیے سٹیشن پر جمع ہیں۔ محمد نواز بھی اشتیاق اور وفور جذبات سے مہاجروں کی ٹرین کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جونہی ٹرین چھاؤنی پہنچی ہر طرف چیخ و پکار اور آہ و بکا شروع ہوگئی۔ گاڑی میں زخموں سے چور مسلمان عورتیں، بچے اور بوڑھے مرد نیم جان حالت میں تڑپ رہے تھے۔ ہر شخص پر آنے والوں کی حالت دیکھ کر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ محمد نواز یہ بھیانک منظر برداشت نہ کر سکا۔ اس نے نیفے سے گراری دار چاقو نکالا اور پاگلوں کی طرح چیختا ہوا ہندوؤں، سکھوں کو گالیاں دیتا سٹیشن پر ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ غالباً سکھوں اور ہندوؤں کو ٹرین میں آنے والے مسلمانوں کی حالت زار کے بارے میں پہلے ہی اطلاع تھی وہ سب گھروں میں بند تھے۔ سٹیشن پر کوئی ہندو اور سکھ حتیٰ کہ ریلوے کے ہندو اور سکھ ملازم بھی موجود نہیں تھے۔ جنونی کیفیت میں محمد نواز سٹیشن سے باہر نکلا۔ اسے مال بکنگ کرانے کی جگہ پر شہر کا ایک معروف ہندو تاجر نظر آیا۔ وہ اس پر پل پڑا، اسے گھسیٹ کر سڑک کے درمیان لا اور چاقو کے پے در پے وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ وہ اس کی لاش کو اپنے تانگے کے ساتھ باندھ کر شہر میں گھمانا چاہتا تھا لیکن مسلم لیگی قیادت نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ محمد نواز کا ذہن اسی دن سے پلٹ گیا اور وہ نازو بھگیلا بن گیا جو اپنے حواس کھو چکا تھا اور زندگی بھر مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھا کر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا

ملتان کی سڑکوں پر پاگلوں کی طرح گھومتا رہا۔

ملتان کا دوسرا ہندو بھی چھاؤنی ریلوے سٹیشن کے قریب ہی مارا گیا تھا۔ یہ ملتان کا مشہور وکیل اور ڈسٹرکٹ بار کا عہدیدار تھا۔ ملتان کے معروف پہلوان نواب حیات اللہ خان بابر عرف حاتو خاں اپنے مخصوص تانگے پر دہاڑی روڈ سے چھاؤنی سٹیشن کی طرف آ رہے تھے انہیں کسی نے راستے میں کٹے پھٹے مسلمانوں کی ٹرین کی آمد سے آگاہ کیا۔ حاتو خاں کو جو تفصیلات بتائی گئیں، وہ ان کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوئیں۔ انہوں نے سامنے سے ملتان کے مشہور ہندو وکیل کو آتے دیکھا اسے دیکھ کر وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے چیتے کی سی پھرتی سے چھلانگ لگا کر وہ اپنے تانگے سے اترے ہندو وکیل کو گریبان سے پکڑا اور دھوبی پٹڑا مار کر اسے نیچے سڑک پر گرا دیا اور عین سڑک کے درمیان اس ہندو کو ذبح کر دیا۔ ملتان کے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے ان دو ہندوؤں کا حشر ہی عبرت ناک ثابت ہوا اور انہوں نے زین العابدین شاہ گیلانی اور مسلم لیگی رہنماؤں سے جان کی امان طلب کرنا شروع کر دی جو انہیں مل گئی۔ کپتان محمد بخش، غلام رسول پاکستان، میاں محمد عبداللہ ارائیں اور سید صاحب علی شاہ گردیزی کی نگرانی میں ملتان کے ہندوؤں اور سکھوں کو مسلم لیگ نے اپنی حفاظت میں صحیح و سالم ملتان سے رخصت کیا۔ انہیں اپنا قیمتی سامان بھی ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی۔

قیام پاکستان سے قبل مسلم لیگ جنوبی پنجاب بالخصوص ملتان میں اس حد تک چھا چکی تھی کہ زین العابدین شاہ گیلانی اور مقامی مسلم لیگ کی اپیل پر بازاروں میں مسلم دکانداروں اور تاجروں نے اپنی دکانوں پر چھوٹی چھوٹی صندوقچیاں رکھ کر ان کے تالوں کی چابیاں مسلم لیگ کے حوالے کر رکھی تھیں۔ مسلمان تاجر ہر شام اپنے منافع سے ایک آنہ فی روپیہ مسلم لیگ کی صندوقچی میں ڈال دیتے تھے۔ ہر ہفتے بعد علاقے کا مسلم لیگی کارکن آ کر صندوقچی میں سے پیسے نکال کر گنتا اور متعلقہ دکاندار کو اس رقم کی رسید دے دی جاتی۔ ملتان کے تمام مسلمان اور مسلمان خواتین نے بھی مسلم لیگ کے فنڈ کے لیے اپنے گھروں میں بڑے بڑے گھڑے اور مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ ہر مسلمان گھرانے کی خواتین روٹی پکاتے وقت نہایت دیانتداری اور کھلے دل سے آٹے، دال، چاول کی ایک ایک مٹھی اس گھڑے اور مٹکے میں مسلم لیگ کے فنڈ کے لیے ڈال دیتی تھیں جسے ہفتہ بعد مسلم لیگ کی خواتین گھروں سے بوریوں میں بھر کر لے جاتیں۔ یہی رقم، آٹا اور مسلمان گھرانوں کی جمع کردہ اشیائے خوردنی ہجرت کر کے ملتان پہنچنے والے مسلمان مہاجروں کی مدد اور خوراک کے لیے استعمال ہوتیں۔

ملتان میں چھاؤنی ریلوے سٹیشن سے چاہ بوہڑ والا کی طرف آنے والی سڑک کے بالمقابل جہاں ان دنوں الثناء ہوٹل اور دوسری آبادی ہے، گجر کھڈہ روڈ تک وسیع میدان خالی پڑا تھا۔ بھارت سے آنے والے مسلمان مہاجروں کے لیے اسی میدان میں مہاجر کیمپ قائم کیا گیا تھا جہاں انہیں کھانے پینے کی ضرورتیں مہیا کی جاتیں۔ اسی کیمپ میں انہیں ہندوؤں کے خالی کردہ گھروں میں ہفتے، پندرہ دن کی خوراک کی امداد دے کر منتقل کر دیا جاتا تھا۔ 1950ء کی دہائی میں اسی خالی جگہ پر ملتان میں پہلی مرتبہ صنعتی نمائش لگی تھی جو کئی سال تک لگتی رہی۔

بعد میں یہ صنعتی نمائش قاسم باغ قلعہ پر موجودہ میونسپل لائبریری اور فائر بریگیڈ کے بالمقابل مسلم کمرشل بینک کے عقب میں منتقل ہوگئی جہاں ان دنوں ایک بڑی پکی آبادی ہے۔

ملتان میں مسلم لیگ نے جو خدمات سرانجام دیں، ہندوستان سے آنے والے مسلمانوں کی آبادکاری میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، جس طرح مہاجروں کو اپنے وجود کا حصہ بنایا، اس سے چودہ سو سال پہلے مدینہ منورہ کے لوگوں کا مہاجرین سے حسن سلوک یاد آجاتا ہے۔ شاید ملتان کے مدینۃ الاولیاء کی حیثیت سے مشہور ہونے میں مدینہ منورہ کا یہ روایتی فیض بھی شامل ہے۔

(روزنامہ خبریں ملتان - ایم اے شمشاد)



رضی الدین رضی

اہلِ ملتان نے اعلانِ آزادی کیسے سنا؟

کسی بھی شہر کو اس کے ماضی میں جا کر دیکھنا ہمیشہ سے ایک دلچسپ موضوع رہا ہے۔ کون سا شہر آج سے 50 برس قبل یا 100 برس قبل کیسا تھا۔ اس کے در و دیوار کیسے تھے اور اس شہر کے باسیوں کا مزاج، بود و باش اور طرزِ زندگی 50 یا 100 برس قبل کیسا تھا۔ اسے کھوجنا ہمیشہ سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ 50 یا 100 برس کا حوالہ تو ہم نے برسبیل تذکرہ دیا ہے وگرنہ شہروں کی سیکڑوں اور ہزاروں سال پرانی تاریخ ہمیشہ سے تحقیق کرنے والوں کا محبوب موضوع رہی۔ ہر سال جب بھی ہم پاکستان کا جشن آزادی مناتے ہیں، ایک سوال ذہن میں ضرور ابھرتا ہے کہ 1947ء میں جب پاکستان قائم ہوا اور جب یہ خطہ ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ اس وقت ملتان کیسا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے کیسے اس دن کو منایا۔ وہ دن جب ہمیں غلامی سے نجات ملی، وہ دن جب ہم نے پہلی بار آزاد فضا میں سانس لیا، جب زنجیریں ٹوٹیں تو ہزاروں سال پرانی تہذیب و ثقافت کا امین ملتان کیسا تھا اور آزادی کا اعلان سنتے ہوئے یہاں کے لوگوں نے کیا محسوس کیا؟

ملتان کے بارے یہ کھوجنا اس لیے بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ 5 ہزار سال کی معدوم تاریخ رکھنے والا یہ شہر کوئی پہلی بار تو آزاد نہیں ہوا تھا۔ یہاں کئی حکمران آئے اور یہاں کے لوگوں پر حکمرانی کر کے چلے گئے۔ بادشاہ، راجے، مہاراجے، نواب سب اس شہر پر حکمران رہے۔ ہر تبدیلی خونریزی پر ختم ہوتی۔ یہاں کے لوگوں نے بارہا غلامی کا طوق گلے میں ڈالا اور بارہا اس سے نجات بھی حاصل کی لیکن آخری بار جب انہوں نے انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کی تو ان کے جذبات کیسے تھے، کیا محسوس کیا انہوں نے اور اس آزادی کا جشن کس ڈھب سے منایا۔ یہ ہمارا آج کا موضوع ہے لیکن یہ احوال سنانے سے پہلے ہمیں ایک نظر اس جدوجہد پر ڈالنی ہے جس کے نتیجے میں آزادی کا سورج ہمیں دیکھنا نصیب ہوا۔

1947ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا ملتان شہر کی آبادی جو اب 17 لاکھ سے بھی تجاوز کر چکی ہے صرف 87394 نفوس پر مشتمل تھی جبکہ ضلع ملتان کی آبادی ایک لاکھ 35 ہزار تھی۔ ملتان شہر میں مسلمانوں کی آبادی 56 فیصد اور ہندوؤں سمیت باقی مذاہب کے لوگوں کی 44 فیصد تھی۔ ملتان کی میونسپل کمیٹی کی کل نشستیں 50

تھیں جن میں سے آدھی مسلمانوں اور آدھی ہندوؤں کے پاس تھیں لیکن ہم بات کا آغاز 1936ء کے نومبر کے مہینے سے کرتے ہیں۔ یہ وہ مہینہ ہے جب ملتان میں آل انڈیا مسلم لیگ کی پہلی شاخ قائم ہوئی۔ آغا عزیز احمد مرزا اس کے پہلے ضلعی صدر اور سعید احمد شاہ بخاری ایڈووکیٹ جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ دیگر عہدیداروں میں محمد اکرم خان پراپیگنڈہ سیکرٹری اور ڈاکٹر عبدالستار حامد (جو بعد میں ملتان کے معروف نیوز ایجنٹ رہے) شامل تھے۔ 1939ء مسلم لیگ ملتان کی سرگرمیاں سعید احمد شاہ بخاری کے گھر تک محدود رہیں جو گھنٹہ گھر کے عقب میں واقع تھا۔ 1939ء میں سید زین العابدین شاہ گیلانی مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو اس جماعت میں ایک متحرک پیدا ہوا۔ زین العابدین شاہ گیلانی کو ملتان کا تاج سمجھا جاتا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ایک مقبول لیڈر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور ان کی جماعت انجمن فدایان اسلام مسلمانوں کے حقوق کے لیے سرگرم تھی۔ مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد زین العابدین شاہ گیلانی نے انجمن فدایان اسلام کو بھی مسلم لیگ میں ضم کر دیا۔ اس برس علی حسین شاہ گیلانی، ولایت حسین شاہ گیلانی، رحمت حسین شاہ گیلانی، عبدالکریم قاصف اور مختار حسین شاہ گردیزی بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ یہ سب لوگ بعد ازاں پارٹی کے مختلف عہدوں پر فائز رہے اور تحریک پاکستان کے اس ہراول دستے میں ان کا شمار ہوا جہاں ملتان میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔

23 مارچ 1940ء کے تاریخی اجلاس سے قبل ملتان میں مسلم لیگ کے انتخابات میں سید زین العابدین شاہ گیلانی کو پارٹی کا ضلعی صدر منتخب کر لیا گیا۔ ملتان سے کارکنوں اور رہنماؤں کا جو وفد لاہور کے تاریخی اجلاس میں شرکت کے لیے گیا اس کی قیادت زین العابدین شاہ گیلانی نے ہی کی تھی۔ اس دوران ملتان میں مسلم لیگ سٹی کا قیام عمل میں رہا۔ جلیل شاہ گردیزی اور حافظ محمد اعظم خان خاکوانی اس کے عہدیدار منتخب ہوئے۔ 1942ء میں غلام قاسم خان خاکوانی (جو بعد ازاں ملتان کے میئر بھی بنے) مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ملتان کے ابتدائی عہدیداروں میں علی نواز گردیزی، چوہدری ذوالفقار، غلام قاسم شاہ، علی حسین شاہ گردیزی اور صاحبزادہ فاروق علی خان (جو بھٹو دور میں قومی اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوئے) شامل تھے۔ دوسری جانب خواتین کو متحرک کرنے کے لیے مسلم لیگ ملتان کے پہلے جنرل سیکرٹری سعید احمد شاہ بخاری کی ہمشیرہ زبیدہ جعفری میدان میں آ گئیں۔

ان تمام رہنماؤں کی کوششوں کے نتیجے میں مسلم لیگ ملتان میں ایک مقبول جماعت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ سٹی مسلم لیگ کا دفتر پل شوالہ میں قائم ہو گیا اور پاک گیٹ، کڑی افغاناں، مسجد ولی محمد، سوتری وٹ، قدیر آباد، بوہڑ گیٹ، لوہاری گیٹ کے علاقے مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ وہ مسلم لیگ جو پہلے صرف ایک مکان تک محدود تھی اب اس کے جلسے بھی منعقد ہونے لگے۔ عام خاص باغ، باغ لانگے خان اور عید گاہ گراؤنڈ مسلم لیگ کے جلسوں کا گڑھ بن گئے۔ ان جلسوں میں مختلف شہروں سے بھی رہنما خطاب کے لیے آتے تھے۔ ان رہنماؤں میں ممتاز احمد خان دولتانہ، سردار شوکت حیات خان، عبدالستار خان نیازی، عاشق حسین بٹالوی اور پروفیسر عنایت اللہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایم ایس ایف نے ایمرسن کالج کو (جو چوک کچہری میں اس جگہ قائم تھا جہاں اب گرلز

کالج موجود ہے) سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ جیسے جیسے تحریک زور پکڑتی گئی ملتان میں جلسے جلوس شدت اختیار کر گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھڑپیں ہونے لگیں، کبھی بوہڑ گیٹ اور کبھی چوک بازار میں بلوہ ہو جاتا۔ ایسی ہی ایک لڑائی کے دوران حسن پروانہ قبرستان کے عقب میں واقع سبزی منڈی کو نذر آتش کر دیا گیا۔ آگ کے شعلے شہر میں دور دور تک دکھائی دیتے تھے۔ 25 جنوری 1947ء کو پنجاب کی یونینسٹ حکومت کے خلاف عید گاہ گراؤنڈ میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں مسلم لیگ کے تمام عہدیدار شریک ہوئے۔ جلسے کے بعد دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جلوس نکالا گیا۔ جس کے نتیجے میں مسلم لیگ کی ساری قیادت گرفتار ہوگئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریک میں شدت آتی گئی۔ خواتین، نوجوان اور بچے، بوڑھے سب اس تحریک میں شامل ہو گئے اور پھر وہ تاریخ ساز لمحہ آیا جب پاکستان حقیقت بن گیا۔

14 اگست کی شب جب ریڈیو سے پاکستان کے قیام کا اعلان نشر ہوا تو اس رات ملتان جاگ رہا تھا۔ مختلف بازاروں اور محلوں میں لوگ یہ اعلان سننے کے لیے جمع تھے۔ ایک سناٹا تھا کہ جس میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ 63 برس پہلے کے ملتان میں رات اس طرح نہ جاگتی تھی جیسے اب جاگتی ہے، لوگ آٹھ نو بجے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ بجلی ہر گھر میں موجود نہیں تھی، گلی محلے بہت ویران ہو جاتے تھے لیکن اس رات یہ ویرانی نہیں تھی۔ لوگ گلیوں میں گھوم رہے تھے۔ 12 بجے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس تمام تر چہل پہل کے باوجود ایک خاموشی تھی۔ انتظار کے لمحات تھے کہ جو گزر ہی نہیں رہے تھے اور انتظار کرنے والوں میں عورتیں بھی شامل تھیں اور بچے بھی، عورتیں اپنے گھروں میں ریڈیو کے گرد بیٹھی تھیں اور پھر جیسے ہی آزادی کا لمحہ قریب آیا لوگ مختلف مقامات پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بوہڑ گیٹ، پل شوالہ، سوتری وٹ، پاک گیٹ، لوہاری گیٹ، کڑی افغاناں، گھنٹہ گھر، چوک بازار میں ریڈیو کے گرد ہجوم بڑھنے لگا اور پھر وہ لمحہ آ گیا جب غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ ریڈیو سے پاکستان کا نام سنائی دیا۔ ایک خواب شرمندہ تعبیر ہوگیا۔ سناٹا ختم ہوگیا وہ گلی کوچے جہاں چند لمحے پہلے خاموشی تھی، پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھے۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ خوشی کے آنسو، ان دکھوں سے نجات کے آنسو جنہیں ملتان کے باسی صدیوں سے جھیل رہے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ دھرتی کے بیٹے اب دھرتی کے مالک بھی بن گئے تھے۔ وہ جو سر اٹھا کر جینے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس رات آسمان پر چاند موجود نہیں تھا وہ اماوس کی ایک رات تھی مگر ملتان ہی نہیں برصغیر کے تمام مسلمانوں کے لیے وہ رات اپنے دامن میں بہت سی روشنیاں سمیٹ کر لائی تھی۔ دور کسی محلے میں ایک ڈھول بجا اور پھر اماوس کی اس روشن رات میں زندگی جھومر ڈالنے لگی۔

(جنگ مڈ ویک میگزین - رضی الدین رضی)



مولانا نور احمد خان فریدی

شہر کے باغات

ملتان قدیم سے حاکمانہ اقتدار کا مالک رہا ہے۔ ہر فرمانروا نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق گرد و گرما کے باوجود اس شہر کے گرد و پیش ایسی سرسبز و شاداب فضائیں پیدا کیں کہ سمرقند اور بخارا اس پر رشک کھاتے تھے۔ پرہلاد جی کا زمانہ کتنا قدیم ہے لیکن اس عہد عتیق میں بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ دریا شہر کے ساتھ لگ کر بہتا تھا۔ اور محل سرائے شاہی باغات سے گھرا ہوا تھا۔ مسلمان تو آب رواں اور ہراول کے عاشق زار تھے۔ جہاں جاتے تھے اپنے لیے سرسبز و شاداب فضائیں پیدا کر لیتے تھے۔ چنانچہ المنصورہ (علمد یسورہ) کے باغات اور قاسم بیلا کے نخلستان ان سرباز اور جفاکش مجاہدین کی یادگار ہیں جنہوں نے محمد بن قاسمؒ کی قیادت میں سب سے پہلے اس سرزمین پر اپنے قدم رکھے تھے۔ قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کے جد مادری آئے تو انہوں نے شہر کے جنوب میں قطعہ اراضی خرید کر ایک عالیشان باغ لگوایا اور اس میں اپنی صاحبزادی کے لیے عالیشان محل تعمیر کرایا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے چچا زاد بھائی ملک شیر خان نے بھی اپنی صوبیداری کے زمانہ قلعہ شاہی کے غرب میں دریا کے کنارے باغات اور محلات کا نظر فریب سلسلہ قائم کیا۔ امتداد زمانے ان کوشکوں اور باغوں کا نشان تو نہیں رکھا البتہ ٹبی شیر خان کے نام سے اس بیدار مغز گورنر کا نام اب بھی زندہ ہے۔ مغل سلاطین کابل اور ترکستان میں شالامار اور باغ ورا جیسے فردوس تمثال باغات چھوڑ کر آئے تھے۔ پاک و ہند کی گرمی اور گرد و غبار کو کیونکر برداشت کر سکتے تھے جہاں انہوں نے آگرہ، دہلی اور لاہور کو گل و گلزار کی نعمت سے مالا مال کیا وہاں ملتان میں بھی خوشنما باغات، عالیشان محلات اور آرام گاہوں کا لامتناہی سلسلہ قائم کر دیا۔ حضوری باغ، باغ عام و خاص، باغ بیگی اسی دور کی حسین یادگار تھے۔ جن میں سے صرف عام و خاص سخت جان ہونے کے سبب زندہ موجود ہے۔ باقی شہر میں مدغم ہو گئے۔ سدوزئی خوانین نے بھی اپنے دور اقتدار میں چند نالے احداث کرائے اور ان کے کناروں پر باغات لگوائے تھے۔ 1818ء تک ان فردوسی مقامات کی پر کیف کیفیت سیر جنت کی یاد تازہ کرتی رہی۔ لیکن سکھوں کی یورش سے جب باغبان ہی نہ بچ سکے، باغوں کا ٹھکانہ کہاں۔ اس دستبرد سے نہ قلعہ شاہی بچا اور نہ کوئی برگ و بار۔ عروس البلاد ملتان کی بہار لٹ گئی۔ اس کے چمنستان مٹ گئے۔ وہ متبرک اثر ہستیاں جن کے دم قدم سے بہارستان آباد تھے ان کے کہیں نام اور کہیں دھندلے سے نشان رہ گئے۔ بایں ہمہ اب

بھی ان میں کچھ جاذبیت اور دلکشی باقی ہے کہ ان کی پُر کیف سیر جنت کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ چند مشہور باغات کا اجمالی ذکر درج ذیل ہے۔

باغ عام خاص

یہ باغ دولت دروازہ کے باہر خانقاہ شاہ شمسؒ کے قریب واقع ہے۔ باغ کے شرقی جانب، شاہی محلات، آبشاریں اور آرام گاہیں تھیں۔ ساتھ ہی ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی گئی تھی جو جامع مراد کے نام سے موسوم تھی۔ انگریزوں کے حملے میں اس کا ایک حصہ گر گیا۔ اب مسلمانوں کے ایک فرقہ اہلحدیث کے تصرف میں آ چکی ہے۔ جس میں ان کا مدرسہ قائم ہے صاحب تذکرہ ملتان لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ باغ مغل شہزادوں کی رہائش گاہ کا کام دیتا تھا۔ ان کے علاوہ جو ناظم وقتاً فوقتاً آتے رہے وہ بھی اسی باغ میں سکونت رکھتے اور کچہری لگایا کرتے تھے۔''

درانی سلاطین کی تاخت و تاراج سے یہ باغ ویران ہو گیا تھا۔ نواب مظفر خان نے اسے دوبارہ آباد کیا۔ اس میں ایک حوض تعمیر کرایا اور خوبصورت آبشار بنوائی۔ جس کی تاریخ پر حضرت خواجہ منشی غلام حسنؒ نے یہ قطعات موزوں فرمائے تھے:

مظفر طالعے نواب والا
بنا کرد است ایں باغ دلآرا
زہے گلزار باغ تازہ بنیاد
کہ بادا از بہار بخت آباد
چوں تاریخ از خرد جستم بگفتا
مبارک بوستان رونق افزا

1227ھ

ولہ

نواب موید و مظفر
آراستہ باغ روح پرور
چوں باہمہ زینتش برآر است
تاریخ بنائے فرخش خواست
از مصحف دل برآمدہ ایں فال

بشگفت بہار عزو اقبال

1227ھ

قطعہ تاریخ حوض باغ عام وخواص

چہ فرخ آبگیر است انیکہ آمد
زآبِ زندگی پایندگی بخش
چو از خضرش بجسمم سال تاریخ
بگفتاء آبگیر زندگی بخش

1226ھ

سکھوں کے حملے نے اس باغ کو پھر تباہ کر دیا۔ دیوان ساون مل نے اپنی صوبیداری کے اوائل میں اس اُجڑے گلستان کی دوبارہ مرمت کرائی۔ شاہی محلات کو اپنے خانگی استعمال میں لے آیا۔ اور نواب کی مسند پر بیٹھ کر مہمات ملکی انجام دینے لگا۔ انگریزی دور میں کبھی کبھار پبلک جلسے ہوا کرتے تھے اور زندہ باد و مردہ باد کے نعروں سے اس باغ کی فضا گونج اٹھتی تھی۔ اب گاہے گاہے صرف دینی مدارس کے سالانہ اجلاس اس میں منعقد ہوتے ہیں۔

حضوری باغ

لوہاری دروازے کے باہر شہزادہ مراد کا لگایا ہوا ایک اور باغ ''حضوری باغ'' سے موسوم تھا۔ مسلمان فرمانروا جب عدالتی مصروفیات سے فارغ ہوتے تو یہاں آکر آرام کر لیتے تھے۔ صاحب تذکرہ ملتان لکھتے ہیں کہ یہ باغ بھی درانی یلغاروں سے برباد ہو گیا تھا۔ نواب مظفر خان نے ازسرِ نو اس کی مرمت کرائی۔ انگریزی دور میں ملتان ڈویژن کے کمشنر صاحب اس میں رہتے تھے اور کچہری بھی یہیں کرتے تھے۔ اس باغ میں ہر قسم کے درخت تھے اور پھولوں پھلوں سے رشک فردوس بنا ہوا تھا۔ صاحب تذکرہ ملتان کے الفاظ یہ ہیں۔

''ایں باغ'' پُر رونق تمام آباد و شاداب است، امارات عمدہ
و اشجار میوہ جات ہر قسم و گلہائے ہر رنگ دربسیار است
(تذکرہ ملتان از مخدوم گردیزی ص 19 بقلم بعدالحی نقل نویس)

باغ بیگی

یہ باغ شہزادہ معز الدین جہاندار شاہ نے اپنی گورنری کے زمانے میں ملتان شہر کے جنوب میں لگوایا تھا۔ درمیان میں خوشنما محل، اطراف میں شالا مار کی طرح خوبصورت بارہ دریاں درمیان میں حوض، فوارے اور آبشاریں سبھی کچھ تھے۔ شہزادے نے یہ باغ اپنی منکوحہ لال کنور کو دے دیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو دان کیا۔ درانی حملوں سے یہ باغ بھی ویران ہو گیا تھا۔ نواب سرفراز خان نے اپنی صوبیداری کے زمانے میں اس کی مرمت کرائی۔ اور اس

میں رہائش اختیار کی۔سکھوں کے دور میں یہ باغ بالکل اجڑ گیا۔اب صرف باغ بیگی کا نام رہ گیا ہے اور باغ کی جگہ ایک پورا محلہ آباد ہو گیا ہے۔

باغ مخدوم محمد زمان قریشی

حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کا خاندان ہر زمانے میں روحانی اور سیاسی عظمتوں کا حامل رہا ہے۔ان کے عالیشان محلات شاہی قلعہ میں محلہ شیخانہ کے نام سے مشہور تھے۔اور ضلع کی مختلف اطراف میں ان کی ارضیات پھیلی ہوئی تھیں۔ان کے باغات بھی شہر کے قرب و جوار میں واقع تھے۔جن میں مخدوم محمد زمان صاحب قریشی اور ان کے فرزند ارجمند مخدوم محمد غوث قریشی کے باغات کا ذکر تذکرہ ملتان میں ملتا ہے۔

مخدوم محمد زمان شیخ کبیرؒ کے صاحبزادے اور جانشین تھے جو محمد حسین خان ٹکریہ کے ہمراہ اکبر اعظم کو ملنے کے لیے فتح پور سیکری تشریف لے گئے تھے۔ان کا باغ نواب مظفر خان کے عہد میں سردار محمد خان ملے زئی کے قبضے و تصرف میں تھا۔انگریزوں نے ملے زئی افاغنہ سے چھین کر یہ باغ نواب صادق محمد خان بادوزئی کو ان کی خدمات کے صلہ میں دے دیا۔تاریخ کا یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ یہ باغ اب بادوزئی گھرانے سے نکل کر دوبارہ ملے زئی افغان کے تصرف میں آ چکا ہے۔اس وقت جسٹس عبدالجبار خان صاحب جج ہائی کورٹ لاہور اس باغ کے مالک ہیں یہ باغ بوسن روڈ پر واقع ہے۔اب اس میں ''نسرین کوٹھی'' بن چکی ہے۔آموں کے چند پیڑ کھڑے ہیں جو اس باغ کا پتہ دیتے ہیں جو کبھی اعلیٰ کوالٹی کے آموں کے سبب دور دور تک مشہور تھا۔

باغ مخدوم محمد غوث قریشی

مخدوم محمد غوث قریشی مخدوم محمد زمان قریشی کے فرزند ارجمند اور شہنشاہ شاہ جہاں کے معاصر تھے۔انہوں نے ملتان شہر کے جانب غرب اپنی ارضیات میں ایک عالیشان باغ لگوایا تھا۔تذکرۃ الملتان کی روایت کے بموجب نواب مظفر خان کے زمانے میں یہ باغ بھی سردار محمد خان ملے زئی کی ملکیت تھا۔ملے زئی خاندان جب اپنے آقا پر سے تصدق ہو گیا تو سکھوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔سکھوں سے یہ باغ انگریزوں نے چھین کر حاجی غلام مصطفےٰ خان خوگانی کو ان کی خدمات کے صلہ میں عطا کیا۔اب یہ باغ خاکوانی خواتین کی کوٹھیوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔آموں کے چند درخت سر اٹھائے عظمت رفتہ کا پتہ دیتے ہیں۔

باغ مخدوم گردیزی

دریائے چناب کے کنارے ایک باغ مخدوم راجو مشہور چلا آتا ہے جسے آج سے تین سو برس پیشتر مخدوم راجو نے لگوایا تھا۔اب بھی یہ باغ سادات گردیزی کی ملکیت ہے۔

باغ لانگے خان ترین

یہ مشہور باغ بوہڑ دروازہ کے باہر واقع ہے اب چاروں طرف سے کٹ کٹا کر مختصر سا رہ گیا ہے ورنہ پہلے

نالہ علی محمد خان کے دونوں اطراف میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔نواب علی محمد خان نے اپنے زمانۂ اقتدار میں جامع مسجد تعمیر کرائی اور نالہ احداث کرایا اور نواب لانگے خان نے اس کے دونوں جانب یہ باغ لگوایا۔اس میں بارہ دریاں، فوارے اور مرمریں نشست گاہیں تعمیر کرائیں۔ اور دور دراز سے ناشپاتی، امرود، انگور، انار، انب، زیتون جیسے قیمتی پودے اور یاسمین، سوسن، صد برگ، داؤدی اور ہزاروں ایسے پھول منگوا کر لگوائے جس سے یہ گلکدہ فردوس ارضی نظر آنے لگا۔مگر جونہی ان کے گھرانے پر خزاں کا گزر ہوا یہ نزہت گاہ بھی ویران ہو کر رہ گئی۔اس کا جنوبی نصف حصہ زنانہ ومردانہ گورنمنٹ مدارس نے لے لیا۔مشرقی نصف حصہ سول ہسپتال کے سفید ہاتھی نے دبا لیا۔آرام گاہ پبلک لائبریری کے طور پر استعمال ہونے لگی۔محل خاص لیڈی پارک میں آ گیا۔موجودہ باغ اصل باغ کا آٹھواں حصہ بھی نہیں۔صاحب تذکرۃ الملتان نواب لانگے خان کو ترین پٹھان ظاہر کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ باغ ترین خوانین سے نواب مظفر خان نے خرید لیا تھا۔ان کے بیان کا متن حسب ذیل ہے۔

''باغ لانگے خان ترین والا کہ تخمیناً زیادہ از صد سال است کہ وے
احداث کردہ بود۔ بنامش مشہور است۔نواب مظفر خان کہ بشراء ازو
اولادش گفتہ مرمت شود۔''

مخدوم گردیزی کا یہ بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ ترین پٹھانوں کے مکانات اس باغ کے ملحق واقع ہیں۔

انگریزی دور میں یہ باغ پبلک جلسوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان، حافظ علی بہادر، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان جیسے بے شمار عظیم لیڈر اس تاریخی باغ میں انگریز کے خلاف گرجا برسا کرتے تھے۔

انگریز سامراج کے خلاف ان کے وہ فقرے جو بم اور بارود سے زیادہ خطرناک خیال کئے جاتے تھے۔ان کی شعلہ بیانیاں ان کے تاریخی لطیفے اور لوٹ پوٹ کر دینے والے چٹکلے اور گرفتاریوں کے وقت ان کی غیر متزلزل استقامت کیا یہ بھلا دینے والی باتیں ہیں؟ اگر لاہور کی طرح یہاں مینارہ یادگار تعمیر نہیں ہو سکتا تھا تو کم از کم اس تاریخی پلاٹ میں ٹیوب ویل نصب کر کے اس کی ہئیت کو تو نہ بگاڑتے افسوس

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں کہ جنہیں صورت بنا آتی ہے

باغ شیش محل

یہ باغ نواب محمد شاکر خان صوبیدار ملتان نے لگوایا تھا۔نواب شجاع خان نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔نواب مظفر خان نے اس میں عالیشان محل تعمیر کرایا چونکہ اس میں شیشے کثرت سے جڑے گئے تھے اس لیے شیش محل

موسوم ہوا۔ یہ وہی تاریخی محل ہے جہاں نواب مظفر خان نے سالہا سال تک ایسا بے لاگ انصاف کیا کہ اہل ملتان نوشیرواں کو بھول گئے۔ مگر افسوس! جہاں زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے بوڑھے نواب اور اس کے شیر دل بچوں کا خاتمہ کر دیا اسی طرح اس عمارت کو بھی مسخ کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا آج اس عمارت میں نہ شیشے کا کام ہے اور نہ نقاشی و منبت کاری کا کوئی نشان باقی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا نام بھی بدل چکا ہے۔

اس باغ کی وسعت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ چوک نواں شہر سے کمشنر ہاؤس تک ابدالی روڈ کے دونوں اطراف میں یہ باغ پھیلا ہوا تھا۔ دفتر انسپکٹر صاحب، کھوکھر ہاؤس، کوٹھی عطا محمد خان، نہری دفتر، خیابان فرح پہلوی اور کمشنر ہاؤس یہ سبھی اس باغ کا حصہ تھے۔ ان کوٹھیوں کے چند لان ہیں جن میں آموں کے چند پیڑ نظر آتے ہیں ورنہ وہ خصوصی پیڑ نہیں رہے۔ جن پر نواب مظفر خان اپنی مجلسوں میں فخر کیا کرتے تھے۔ (یاد رہے اب اس باغ پر دل کا ہسپتال بن چکا ہے)

کمپنی باغ

انگریزوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں ملتان چھاؤنی کے مغرب میں ایک باغ لگوایا تھا جو اس زمانے میں بڑی رونق پر تھا۔ ہر قسم کے پھل پھول اس میں موجود تھے۔ اور کئی مالی و بیلدار اس کی دیکھ بھال پر مامور ہیں۔

باغ عابد خان

سردار عابد خان نواب مظفر خان کے جد اعلیٰ تھے۔ انہوں نے دریائے چناب کے کنارے ایک عالیشان باغ لگوایا تھا۔ نوابی دور میں یہ باغ بلا شبہ جنت اراضی بنا ہوا تھا۔ ساون بھادوں میں ہر جمعہ و اتوار یہاں زبردست میلے لگتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ملتان یہاں اُمڈ آیا ہے۔

جمعہ کے دن مسلمانوں اور اتوار کو ہندو زیادہ آتے تھے۔ قسم قسم کے آم بکتے تھے۔ کئی منچلے کشتیوں میں آم لاد کر دریا میں ساونی مناتے تھے۔ اور کئی آموں کے گھنے سائے میں رقاصاؤں کے فنی کمالات سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ شہزادوں سے گداگروں تک سبھی اس باغ کی زینت بنتے تھے۔ اور جگہ جگہ ایسی تفریحات دیکھنے میں آتی تھیں کہ اس باغ پر طلسماتی باغ کا دھوکہ ہوتا تھا سکھوں کے دور میں جمعہ کا میلہ ختم ہو گیا صرف اتوار کا رہ گیا۔

نواب مظفر خان کی شہادت اور سقوطِ ملتان اسلامی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے ایسی حالت میں جبکہ مسلمانوں کے املاک ضبط ہو چکے تھے ان کی آقائی غلامی میں بدل چکی تھی میلوں ٹھیلوں کا خیال کس کو آ سکتا تھا۔ ایسی تقریبات کے بانی مبانی نواب زدگان تھے جب وہ نہ رہے تو میلے کون لگواتا۔ البتہ ہندوؤں کے میلے خوب چمکے اور ساون بھادوں میں مستقل طور پر چھ اتوار عیاشی و فحاشی کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئے۔ آموں کی کوالٹی کے بارہ میں تذکرۃ الملتان کے الفاظ یہ ہیں۔

''میوہ انب ہائے باغ مذکور دریں زماں از ہمہ باغات عمدہ است''

یعنی اس باغ کے آم عمدہ کوالٹی کے باعث زمانہ خال کے تمام باغوں پر تفوق رکھتے ہیں۔

باغ دیوان والا

یہ باغ نالہ علی محمد کے کنارے پر نواب پور کی سمت دیوان ساون مل نے بڑے اہتمام سے لگوایا تھا۔ سرکار انگریزی نے اپنی عملداری کے آغاز میں یہ باغ سردار غلام قاسم خان ملے زئی کو ان کی خدمات کے صلے میں عطا کیا تھا۔ یہ باغ اب تک اچھی حالت میں ہے۔ اس میں صرف آم ہی آم ہیں اور کافی رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

متفرقات

نظام آبپاشی سے تسلی بخش ہو جانے کے سبب اب ملتان میں باغات کا رجحان بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ شہر کے گرد اچھی اچھی نرسریاں اور عمدہ باغات کثرت سے ملتے ہیں گورنمنٹ کے زراعت فارم بھی ہیں اچھے اچھے پیوندی پودے مل جاتے ہیں۔

فیض عام نرسری

یہ نرسری خانیوال روڈ پر واقع ہے اور عمدہ آموں کی نمائش میں بالعموم اول آتی ہے۔

ڈان نرسری

یہ نرسری کمشنر ہاؤس اور حسن کاٹیج کے درمیان واقع ہے۔ پودوں کو خاصی محنت سے پیوند کیا جاتا ہے اور پیکنگ بھی تسلی بخش ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ اللہ وسایا مالی کی نرسری بھی نواں شہر میں واقع ہے۔ بابر نرسری بھی اچھی شہرت رکھتی ہے۔

ضلع ہذا میں مخادیم شیر شاہ، مخادیم گیلانی، مخادیم قریشی، خوانین بوسن، کھوکھر برادران، ڈاہا فیملی، کھگہ خاندان، خوگانی حضرات، ملے زئی، ترین، خدکہ خوانین، علی زئی، سادات گردیزی ان تمام رؤسا اور زمینداروں کے ہاں ترقی یافتہ باغات موجود ہیں۔ جن میں ثمر بہشت، دسہری، مالدہ، لنگڑا، فجری، رٹول آم بکثرت ہیں جو لذت اور شیرینی میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔

مالٹا، ریڈ بلڈ، سنگترہ، کنو، انار ترش و شیریں، شفتالو، جموں، امرود، لیموں، شہتوت، انگور، کیلا، ناشپاتی، سیب وغیرہ کثرت سے لگائے گئے ہیں۔

کھجوریں زیادہ تر سورج میانی، قاسم بیلا اور محمد پور گھوٹہ کی طرف دریائے چناب کے قرب میں ملتی ہیں۔ اور اس کی کئی اقسام ہیں۔ اب بعض زمیندار بصرہ اور قط العمارہ کی کھجوریں اپنے باغات میں لگوا رہے ہیں۔

(سرزمین ملتان – مولانا نور احمد خان)



فاروق انصاری

ملتان ایئر پورٹ

ملتان ایئر پورٹ غالباً انیسویں صدی کے آخری ربع میں تعمیر ہوئی۔ MES کی زیرِ نگرانی تعمیر ہوئی اور MES کے زیرِ تحویل رہی۔ اس سے پہلے یہ علاقہ فوجی چھاؤنی تھا اور اس میں فوج کے لیے کچی بیرکیں تھیں۔ فلائنگ کلب کے قریب جو مسجد ہے، جسے اب شہید کر کے دوبارہ تعمیر کیا جا رہا ہے، اس پر ایک کتبہ تھا جس پر اس رجمنٹ کا نام لکھا ہوا تھا جس نے اسے پہلی مرتبہ تعمیر کیا تھا۔ سنِ تعمیر بھی کندہ تھا۔ غالباً انیسویں صدی کی تیسری ربع کا سن تھا۔ خاصی وسیع مسجد ہے۔ دوبارہ تعمیر میں وہ کتبہ ضائع ہو گیا ہے حالانکہ اسے محفوظ رکھنا چاہیے تھا۔ تاریخ کے معاملے میں ہم بڑی غفلت سے کام لیتے ہیں۔

جب پہلے پہل ملتان ایئر پورٹ کی تعمیر ہوئی تو یہ نہایت مختصر تھی۔ پختہ اینٹوں سے بنی ایک لینڈنگ سٹرپ (Landing Strip) تھی جو شرقاً غرباً تھی۔ اس کی لمبائی زیادہ نہ تھی۔ اب یہ سٹرپ ٹیکسی وے (Taxi Way) کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس پر تارکول وغیرہ ڈال کر پختہ کر دیا گیا ہے۔ اب جہاز رن وے (Runway) پر لینڈ کرتا ہے، ٹیکسی وے پر سے ہوتا ہوا ایپرن (Apron) پر آ کر پارک ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک کچی عمارت تھی جس کے دو کمرے تھے اور چھت ڈھلوان بلیاں ڈال کر سرکنڈوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ عمارت بالکل اس جگہ تھی جہاں اب VIP لاؤنج کے قریب ٹرمینل بلڈنگ شروع ہوتی ہے۔ یہ عمارت ایئر پورٹ منیجر کے دفتر کے طور استعمال ہوتی تھی۔ اس عمارت سے مغرب کی طرف تقریباً سو ڈیڑھ سو گز فاصلے پر ایک کچا کوٹھا تھا جو برما شیل کے پاس تھا۔ پیٹرول بڑے ڈرموں میں سٹور ہوتا اور ہینڈ پمپ سے جہاز میں پیٹرول ڈالا جاتا، اسے Refeuling کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی قابلِ ذکر عمارت نہ تھی۔ البتہ اب ٹرمینل بلڈنگ کے پاس جو ایک خوبصورت مسجد ہے، یہاں ایک مصلّٰی ہوتا تھا۔ مصلّٰی اس مسجد کو کہتے ہیں جس کی کوئی عمارت نہ ہو۔ ایک چھوٹا سا کچا پلیٹ فارم بنا کر اس کے چاروں طرف فٹ ڈیڑھ فٹ اونچی دیوار بنا دی جاتی ہے اور اندر جانے کے لیے مشرقی دیوار میں چھوٹا سا راستہ رکھ دیا جاتا ہے۔ مصلّٰے کے قریب ایک کنواں تھا جسے بعد میں پاٹ دیا گیا۔ کہتے ہیں اگرچہ کنواں پاٹ دیا جائے تو بھی بکری اس کے اوپر سے نہیں گزرتی، ایک طرف سے ہو کر گزرتی ہے۔ مصلّٰے کے مشرقی جانب نہر چلتی تھی جو اب گندے

نالے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ پہلے یہ نہر غالباً سکندری نالے سے نکلتی تھی اور چھاؤنی کے علاقے کو سیراب کرتی تھی۔ اب جمیل آباد کے قریب جو سیوریج ٹینک ہے اس سے پانی پمپ کر کے اس نالے میں بہا دیتے ہیں۔

1914ء میں جنگِ عظیم اوّل شروع ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز ہوتے تھے۔ بمبار جہاز آج کل کے L-19 کے سائز کے ہوتے تھے۔ اس میں صرف دو آدمی بیٹھ سکتے تھے، ایک پائلٹ اور ایک بم گرانے والا۔ چھوٹے چھوٹے لمبوترے بن رسی سے بندھے لٹکے رہتے۔ بم گرانے والے ٹوکہ مار کر رسی کاٹتا اور بم نیچے گر جاتا۔ یہ جہاز لمبی اڑان نہ کر سکتے تھے اور نہ ہیں سمندر کے اوپر اڑانے کا خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔ حکومت انگلشیہ نے منصوبہ بنایا کہ ملتان ایئرپورٹ کو وسعت دے کر Base بنایا جائے اور براستہ کابل تہران مشرق وسطیٰ ہوائی راستہ تشکیل دیا جائے، مگر حکومت افغانستان نے کابل میں ایئرپورٹ بنانے کی اجازت نہ دی اور نہ ہی اپنی فضائی حدود سے جہازوں کو گزرنے کی اجازت دی۔ مجبوراً کراچی ایئرپورٹ سے براستہ جیوانی تہران ہوائی راستہ بنایا گیا اور کراچی ایئرپورٹ بہت اہمیت اختیار کر گیا۔ اگر براستہ کابل والا منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو ملتان ایئرپورٹ پاکستان کا سب سے بڑا اور سب سے اہم ایئرپورٹ ہوتا۔ پتہ نہیں اس خبر میں کتنی صداقت ہے۔

1947ء میں ملتان ایئرپورٹ ملتان ایروڈرم کہلاتا تھا۔ ایئرپورٹ منیجر ایک کلرک کے درجہ کا سکھ تھا جو ایروڈرم انچارج کہلاتا تھا۔ عمارات میں دو رہائشی کوارٹروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ دونوں کوارٹر ملحق دیوار بر دیوار تھے۔ آج کل ایک کوارٹر میں کسٹم کا دفتر ہے جبکہ دوسرے میں سول ایوی ایشن کا سٹور ہے۔ اللہ وسایا چوکیدار تھا اور اللہ ڈوایا برماشیل میں چوکیدار بھی تھا اور پمپ سے ری فیول بھی کرتا تھا۔ فسادات شروع ہوئے تو ایروڈرم انچارج صاحب بھاگ گئے۔ ملتان میں جتنے جہاز اس زمانے میں لینڈ کیے وہ ایک ریکارڈ ہے۔ اللہ وسایا نے ایئرپورٹ منیجر کا عہدہ سنبھال لیا۔ ہندوؤں کا انخلاء ہو رہا تھا۔ روزانہ ایرانڈیا کی کئی فلائٹس آپریٹ ہوتیں۔ اللہ وسایا فلائٹ پلان کا فارم پائلٹ کو پیش کرتا، وہ اُسے پُر کر کے اور دستخط کر کے واپس کر دیتا۔ اللہ وسایا ہی لینڈنگ چارجز وصول کرتا۔ برماشیل میں بھی اللہ وسایا کرتا دھرتا تھا، سارے کام وہی کرتا۔ یہ سلسلہ کئی مہینے جاری رہا۔ اللہ وسایا ورک چارج تھا۔ پاکستان بننے کے مدتوں بعد اسے ریگولر فائر آپریٹر بنا دیا گیا۔ اس کے ریگولر ہونے سے بہت پہلے اس کا بیٹا اللہ ڈتہ ریگولر چوکیدار بھرتی ہو چکا تھا۔ جب اللہ وسایا کو ریگولر کرنے لگے تو سول سرجن سے اس کی عمر کا تعین کرایا گیا۔ اللہ وسایا نے درخواست پر سول سرجن نے اس کی عمر 30 برس لکھ دی۔ تقریباً ایک ماہ بعد جب ہیڈ کلرک شیخ رحمت علی تمام سٹاف کی تفصیل ہیڈ کوارٹر بھیجنے لگا ریکارڈ میں اللہ ڈتہ ولد اللہ وسایا کی عمر تو 32 برس تھی اور اللہ وسایا کی عمر 30 برس درج تھی۔ اللہ وسایا کو دفتر بلوا کر صورت حال بتائی گئی۔ وہ کچھ گھبرا گیا اور کہنے لگا ''صاحب جی یہ تو سارا کھیل خراب ہو گیا۔ آپ ایسا کریں میری عمر 30 سال کی بجائے 40 سال لکھ دیں۔'' الغرض ایک لطیفہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد اللہ ڈتہ فوت ہو گیا، اللہ وسایا جوان بیٹے کی موت کا غم برداشت نہ کر سکا اور چند ہی دنوں بعد انتقال کر گیا۔

1951ء میں ملتان ایروڈرم کا درجہ بڑھا دیا گیا۔ پہلے ایک ایروڈرم آپریٹر انچارج تھا اور دو کلرک تھے،

کچھ فائر آپریٹر تھے۔ اب ایک گزیٹڈ آفیسر کو انچارج ملتان ایروڈرم مقرر کیا گیا۔ سیٹھ محمد اصغر کمیونیکیشن آفیسر کو کراچی سے انچارج بنا کر ملتان بھیجا گیا۔ اس کے ساتھ ریڈیو آپریٹرز اور ریڈیو ٹیکنیشنز کی ٹیم اور مطلوبہ ساز و سامان آیا۔

1951ء میں عمارت کی تفصیل کچھ یوں تھی۔ ایرپورٹ منیجر کے دفتر کے مشرقی جانب تقریباً 20 گز کے فاصلے پر ایک عمارت تھی جس میں ایک کمرہ 15x15 اور ایک کمرہ 9x7 کا تھا۔ چھوٹے کمرے کے عقب میں باتھ روم تھا اور جنوبی جانب برآمدہ۔ پختہ عمارت تھی۔ ایک جنریٹر روم تھا جس میں ایک عدد جنریٹر نصب تھا اور Mesco کی بجلی بند ہونے کی صورت میں چلایا جاتا تھا۔ اس کے قریب ہی چار H-Type کوارٹر تھے۔ خاصے فاصلے پر چار کوارٹر جو دو دو کمروں پر مشتمل تھے اور دس کوارٹر H-Type تھے۔ ایک عمارت Met-Office کی تھی۔ ایرپورٹ منیجر کا دفتر اسی پرانی کچی عمارت میں تھی۔ 15x15 کا جو پختہ کمرہ تھا اس میں پہلے پی اے ایف کی ایک وائرلیس چینل موجود تھی اور پی اے ایف کا ایک ڈائریکشن فائنڈنگ اسٹیشن تھا۔ یہ DF ایک ٹرک نما بند گاڑی میں تھا اور موجودہ فلائنگ کلب کے قریب کھلے میدان میں کھڑا تھا۔ اصغر صاحب جو ساز و سامان لائے اس سے ایک گراؤنڈ ٹو گراؤنڈ وائرلیس چینل نصب ہوئی اور ایک VHF ایرٹو گراؤنڈ چینل۔ کمرے کے قریب ہی ایک بہت بڑی گاڑی میں ٹرانسمٹرز کے ٹیکنشین بھی یہیں بیٹھتے تھے۔ جہازوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ڈیوٹیاں شفٹ میں ہوتی تھیں۔ چھ گھنٹے کی شفٹ ہوتی تھی۔ رات کے گیارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک اسٹیشن بند رہتا تھا۔

سیٹھ اصغر اپنا کام مکمل کر کے واپس کراچی چلے گئے۔ ان کی جگہ ایم وائی خاں تعینات ہوئے۔ اوپر جس پختہ کمرے کا ذکر کیا گیا ہے اس کے قریب ہی زمین میں بانس گاڑ کر 12 فٹ چوڑا اور 20 فٹ لمبا ایک چھپر بنا دیا گیا تھا جس پر بیل چڑھا کر سایہ دار بنا دیا گیا تھا۔ قریب ہی رات کی رانی اور دن کا راجہ کی جھاڑیاں تھیں۔ کثرت سے درخت لگے تھے۔ ایم۔ وائی خاں نے اپنے ایک رشتہ دار کو اس کینٹین کا ٹھیکہ دے دیا۔ اس نے یہ ٹھیکہ آگے ایک بوہری سیٹھ کو دے دیا۔ اس چھپر کے نیچے کینٹین قائم ہوگئی جہاں سٹاف اور دوسرے لوگ بیٹھ کر چائے مشروبات وغیرہ سے لطف اندوز ہوتے۔ ایک سال بعد یہ ٹھیکہ کسی اور کو دے دیا گیا۔

1953ء کے وسط میں کراچی سے میرا تبادلہ ملتان ہوا۔ اس وقت مقبول الرحمٰن ناظمی ایروڈرم انچارج تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ایک H-Type کوارٹر میں ٹرانسمٹنگ اسٹیشن بنا دیا گیا۔ PAF کی چینل ختم ہوگئی۔ ایک 25x25 کا کمرہ تعمیر ہوا جس کے چاروں طرف برآمدہ تھا اور مشرقی جانب برآمدے میں باتھ روم تھے۔ اس کمرے میں اچھا فرنیچر تھا اور یہ ملتان ایروڈرم پر پہلا پسنجر لاونج تھا۔ اس کمرے کے شمالی جانب عارضی لوہے کی سیڑھی چڑھائی گئی اور چھت پر ایک کمرہ بنایا گیا جس کی چاروں دیواریں شیشے کی تھیں۔ یہ کنٹرول ٹاور تھا۔ پسنجر لاونج آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوئی اور بغیر کسی لانگ ٹرم منصوبے کے پھیلنا شروع ہوئی۔ حکام بالا میں پیش بینی کی قطعاً اہلیت نہ تھی کہ مستقبل میں کتنی بڑی اور کس شکل و صورت کی ٹرمینل بلڈنگ بڑھتی ہوئی ایئر ٹریفک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تعمیر کی جائے۔ پاکستان میں ہر منصوبے کی طرح یہ منصوبہ بھی جز وقتی تھا اور وقتاً فوقتاً اس عمارت میں اضافہ

ہوتا رہا اور اب ایک بے ڈھنگی عمارت وجود میں آ چکی ہے کہ جس کی نہ شکل ہے نہ صورت، نہ سر نہ پیر اور نہ ہی مطلوبہ ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ اگر شروع سے ہی اس کا ایک مناسب ڈیزائن تیار کر کے چاہے اس کو رفتہ رفتہ ہی بنایا جاتا تو جتنا روپیہ اب تک اس پر ضائع ہو چکا ہے اس سے کہیں کم بجٹ میں ایک شاندار بلڈنگ بنائی جا سکتی تھی جو کم از کم پچیس تیس برس تقاضوں کو پورا کرتی۔

ہوائی جہاز جب ایک مقام سے دوسرے مقام کے لیے پرواز کرتا ہے تو متعلقہ فلائٹ انفارمیشن سنٹر کو اور راستے میں دوسرے ایئرپورٹس کو جن کے اوپر سے یا قریب سے گزر رہا ہوتا ہے ریڈیو ٹیلیفون پر اپنی پوزیشن مخصوص وقفوں کے بعد بتلاتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک جہاز ماسکو سے دہلی جا رہا تھا۔ جب وہ ملتان کے اوپر سے گزر رہا تھا تو پائلٹ نے ملتان ٹاور سے رابطہ قائم کیا، اپنی پوزیشن بتانے کے بعد اس نے بتایا کہ یہ وی آئی پی فلائٹ ہے اور اس میں وزیراعظم روس خروشیف سفر کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں ہمیں کیا سوجھی کہ ہم نے پائلٹ سے کہا کہ ہم مسٹر خروشیف سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ مسٹر خروشیف خود R/T پر بولے اور کہا "میں خروشیف بول رہا ہوں۔ میں پاکستان اور ملتان کے عوام کو نیک تمناؤں کا پیغام دیتا ہوں۔" ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کا پیغام ڈپٹی کمشنر ملتان کو ٹیلیفون پر بتا دیا۔

ایک دن ایک چھوٹا سا جہاز کراچی سے ملتان آیا، وہ لاہور جا رہا تھا۔ ریفیولنگ کے لیے ملتان اترا۔ حسب دستور پائلٹ کنٹرول ٹاور میں آیا۔ سرکاری کارروائی مکمل ہونے کے بعد اس نے شکایت شروع کی کہ میں ایرفورس میں فائٹر پائلٹ ہوں، میرے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی کہ مجھے یہ چھوٹا جہاز کراچی سے لاہور لے جانے کو کہا گیا۔ کافی دیر شکوہ شکایت کے بعد وہ روانہ ہو گیا۔ جب خانیوال کے اوپر تھا تو اس کا جہاز کریش ہو گیا۔ جہاز تباہ ہو گیا اور پائلٹ بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایک رات کوئی نو بجے کا وقت ہو گا۔ ایک جہاز نے ملتان کنٹرول ٹاور کو کال کیا اور کہا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں، مجھے پتہ نہیں میں کہا ہوں؟ ایک ریلوے اسٹیشن مجھے نظر آ رہا ہے لیکن پتہ نہیں کون سا اسٹیشن ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ملتان چھاؤنی ریلوے اسٹیشن سے ٹیلیفون آیا۔ انہوں نے کہا کہ "کوٹ ادو ریلوے اسٹیشن ماسٹر نے ٹیلیگراف پر بتایا ہے کہ دشمن کا جہاز ریلوے اسٹیشن پر چکر لگا رہا ہے اور پلیٹ فارم کے اوپر آ کر روشنی نیچے پھینکتا ہے، آپ کچھ کریں۔" ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جہاز کو بتایا کہ وہ اس وقت کوٹ ادو ریلوے اسٹیشن کے اوپر ہے۔ جہاز نے اپنی ڈائریکشن سیٹ کی اور کچھ دیر بعد ملتان اتر گیا۔ اس زمانے میں رن وے پر لائٹس کا انتظام نہ تھا۔ مٹی کے تیل کے بڑے بڑے لیمپ جلا کر رن وے کے دونوں کناروں پر رکھ دیے جاتے تھے۔ انہیں کی مدد سے رات کے وقت جہاز اترتا تھا۔ یہ جہاز جب لینڈ ہوا تو اس کے پاس اتنا کم ایندھن رہ گیا تھا کہ اگر اس کو بروقت رہنمائی نہ ملتی تو گر کر تباہ ہو جاتا۔

انہی دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ظہیر صاحب لاہور فلائنگ کلب کے چیف فلائنگ انسٹرکٹر تھے۔ ان کا

شمار قابل ہوابازوں میں ہوتا تھا۔ لاہور فلائنگ کلب نے جب نیا ماڈرن سیسنا طیارہ خریدا تو ظہیر صاحب اسے امریکہ سے پاکستان اضافی فیول ٹینک لگا کر خود اڑا کر لائے تھے۔ بہت خوبصورت طیارہ تھا۔ لاہور فلائنگ کلب کے جہاز اکثر ملتان آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ظہیر صاحب کو گورنر مغربی پاکستان جناب مشتاق احمد گورمانی کو کراچی سے لاہور لے جانا تھا۔ جس طرح جنرل ضیاء الحق کو سازش کے ذریعے ان کا جہاز تباہ کر کے ہلاک کیا گیا تھا، اسی طرح گورمانی صاحب کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی، مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اڑان سے پہلے ظہیر صاحب کو کراچی میں خوب شراب پلائی گئی۔ وہ شراب کے بہت رسیا تھے، شراب میں زہر ملا دیا گیا۔ منصوبہ یہی تھا کہ فضا میں پائلٹ زہر سے ہلاک ہو جائے گا اور جہاز بے قابو ہو کر زمین پر آ گرے گا۔ اس طرح گورمانی صاحب ہلاک ہو جائیں گے۔ جہاز کراچی سے اڑ کر بخیریت لاہور ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ گورمانی صاحب اتر گئے۔ ظہیر صاحب چونکہ کثرت شراب نوشی کے عادی تھے، زہر نے ان پر جلدی اثر نہ کیا۔ لاہور فلائنگ کلب والٹن ایئرپورٹ پر تھا۔ گورمانی صاحب کو اتارنے کے بعد ظہیر صاحب لاہور ایئرپورٹ سے والٹن ایئرپورٹ جہاز اڑا کر لے چلے۔ چند منٹ کی اڑان تھی۔ زہر اب اثر کر چکا تھا۔ والٹن ایئرپورٹ پر کھڑے لوگ جہاز کی دگرگوں اڑان دیکھ رہے تھے۔ جہاز کبھی نیچے کو آتا کبھی اوپر کو جاتا، کبھی دائیں کو قلابازی کھاتا، کبھی بائیں کو۔ آخر کھیتوں میں آ گرا اور تباہ ہو گیا۔ ظہیر صاحب جہاز گرنے سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ جہاز کو آگ نہ لگی۔ جب ظہیر صاحب کی لاش نکالی گئی تو ان کے جسم پر کئی چوٹوں کے نشان تھے مگر خون بالکل نہ نکلا تھا۔ اگر زندہ حالت میں زمین سے ٹکراتے تو خون ضرور نکلتا۔

1956ء میں ملتان میں پی آئی اے کی پروازیں شروع ہوئیں۔ ڈکوٹا جہاز آتا تھا جس میں بائیس سیٹیں ہوتی تھیں۔ پی آئی اے کا ایک افسر اور ایک جونیئر سٹاف ملتان تعینات ہوا۔ دن میں ایک فلائٹ ہوتی تھی اور وہ دونوں فلائٹ کے وقت ایئرپورٹ آتے تھے۔ پی آئی اے کا کوئی دفتر تھا، نہ ایئرپورٹ پر نہ شہر میں۔ تین مہینے پروازیں چلیں۔ پھر شمالاً جنوباً جو رن وے ہے اس پر پختہ تختے (Slabs) بچھانے کا کام شروع ہوا اور ایئرپورٹ کو پروازوں کے لیے بند کر دیا گیا۔ پی آئی اے کی پروازیں بھی بند ہو گئیں۔ تین ماہ کے دوران ملتان سے جانے والے اور ملتان آنے والے مسافروں کی کل تعداد ستائیس تھی۔

رن وے کی کارپیٹنگ جاری تھی۔ اس کا ٹھیکہ گجرات کے ایک ٹھیکیدار کے پاس تھا۔ مالی لحاظ سے مستحکم پارٹی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک بااخلاق انسان تھا۔ ایئرپورٹ بند ہونے کی وجہ سے ہم بالکل فارغ تھے۔ ڈیوٹی کے دوران شطرنج کھیلتے رہتے۔ اکثر وہ ٹھیکیدار شیخ صاحب بھی کچھ دیر کے لیے شطرنج سے جی بہلاتے۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ ایک دن کراچی سے ہمارے ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر جناب اے ایم قریشی صاحب تشریف لائے۔ گجرات کے رہنے والے تھے اور خاصے کم ظرف انسان تھے۔ لوگ انہیں کدہ قریشی کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کی ایک خصوصیت مشہور تھی کہ زندگی میں ان سے کوئی بھلائی کا کام نہیں ہوا۔ بہرحال وہ ملتان دورے پر تشریف لائے اور میرے دفتر سے باہر درخت کے نیچے کھڑے سٹاف کے لوگوں سے باتیں کر رہے تھے، اتنے میں ٹھیکیدار جناب شیخ صاحب اندر

آئے اور پوچھنے لگے "یہ باہر مجید کھڑا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا "جناب کون سے؟" انہوں نے اشارے بتایا "وہ درخت کے نیچے فلاں" میں کہا "جناب! یہ ہمارے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جناب اے ایم قریشی ہیں۔" کہنے لگے "ہاں ہاں، اے ایم عبدالمجید۔" طنز نمایاں تھا۔ پھر انہوں نے ایک گالی دے کر کہا "جب میں ادھر آیا ہوں تو اس نے مجھے سلام نہیں کیا۔" میں بہت حیران ہوا۔ میں نے پوچھا "کیا آپ انہیں پہلے سے جانتے ہیں؟" کہنے لگے "ہاں، گجرات میں میرے مکان کے قریب اس کا مکان ہے۔ اس کا باپ سکول کا ٹیچر تھا۔ بندوق کے شکار کا بہت شوقین تھا۔ ایک دفعہ شکار پر گیا تو لوٹ کر نہ آیا۔ بہت تلاش کیا گیا مگر کچھ سراغ نہ ملا۔ مجید اس وقت سکول میں پڑھتا تھا۔ ہم نے ان لوگوں کو بے آسرا چھوڑ نہ دیا۔ امداد بھی اور مجید کے تعلیمی اخراجات بھی برداشت کیے۔ لڑکا لائق تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد انجینئرنگ کالج میں داخل ہوا اور انجینئر بن کر پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف کے محکمہ میں چلا گیا۔ ہم نے اس کے تمام مصارف برداشت کیے۔ اب سول ایوی ایشن کا ڈائریکٹر ہے۔ میرے ہی ٹکڑوں پہ پلا ہے اور اس حرام زادے نے مجھے سلام نہیں کیا۔"

قریشی صاحب اسی دن ٹرین سے کراچی چلے گئے۔ شیخ صاحب کے بیان کی لاج رکھتے ہوئے انہوں نے کراچی پہنچتے ہی میرے ملتان سے کراچی تبادلہ کے احکام بھیج دیے۔ میں 1957ء کا پورا سال کراچی ایرپورٹ پر رہا، پھر خرابی صحت کی بنا پر مجھے نواب شاہ ٹرانسفر کر دیا گیا، چھ سال نواب شاہ رہا۔ مجھے یاد نہیں اس دوران قریشی صاحب کسی دوسری پوسٹ پر چلے گئے یا فوت ہو گئے۔ ان کی جگہ ایک نیک دل ایم یو خاں صاحب نے سنبھال لی۔ وہ نواب شاہ کے دورے پر آئے۔ میں نے انہیں درخواست کی، انہوں نے مجھے ملتان ٹرانسفر کر دیا اور 1964ء میں میں اپنے ہوم ٹاؤن ملتان آ گیا اور پھر کافی عرصہ یہاں گزارا۔

رن وے مکمل ہو گیا تو ملتان ایروڈرم کا درجہ بڑھا کر ملتان ایئرپورٹ کر دیا گیا۔ ایک سینئر آفیسر جناب یعقوب صاحب ایئرپورٹ منیجر ہو کر ملتان آئے۔ ایئرپورٹ منیجر کا کچا دفتر منہدم کر کے اسی جگہ دو کمروں پر مشتمل پکی عمارت تعمیر کی گئی، بعد میں ایک اور کمرے کا اضافہ ہوا۔ VOR یعنی VHF Omnidirectional Range کی سہولت میسر ہوئی۔ متی تل کی طرف نئی ایئرپورٹ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا جو وقت کے ساتھ ساتھ فائلوں میں دفن ہو گیا۔ ایئرپورٹ کے گرداگرد خاردار تاروں کی باڑھ لگائی گئی۔ ایئرپورٹ کے قریب ہی فوج کی جو کچی بیرکیں تھیں انہیں گرا کر پختہ دو منزلہ بیرکیں تعمیر ہوئیں۔ پی آئی اے کی کئی پروازیں چلنے لگیں اور ستمبر 65ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس وقت ایوب خان پاکستان کے صدر اور ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ تھے۔ جنگ تو صرف سترہ دن جاری رہی لیکن جذبوں، نغموں اور ایثار و قربانی کی تاریخ رقم کر گئی۔ یہ جنگ صدر ایوب کا نقطۂ زوال اور بھٹو کا نقطۂ عروج ثابت ہوئی۔

جنگ کے دوران پی آئی اے کی پروازیں بند ہو گئیں۔ تمام ریڈیو چینلز بند ہو گئے۔ خندقیں کھود لی گئیں۔ سائرن بجتے ہی ہم تمام روشنیاں بجھا کر خندقوں میں کود جاتے اور خطرہ ختم ہونے کے الارم تک خندق میں بیٹھے

رہتے۔ ایئرپورٹ پر پولیس چوکی قائم ہوگئی۔ حوالدار اور سپاہی تعینات ہوئے۔ مَیں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی جنگ دیکھی جو ہمارے علاقے میں لڑی جا رہی تھی۔ جنگ عظیم دوم بھی میری زندگی میں ہی برپا ہوئی لیکن اس کے شعلے ہمارے علاقے میں نہیں پہنچے تھے۔

آخر وہ رات آ ہی گئی جس کا انتظار تھا۔ بھارت کے دو بمبار طیارے ملتان ایئرپورٹ کی فضا میں اپنی کارکردگی دکھانے آ گئے۔ ہم دوڑ کر خندقوں میں دبک گئے۔ دل دھک، دھک کر رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے آیۃ الکرسی کا ورد شروع کر دیا، باقی کلمہ شریف پڑھ رہے تھے کہ موت آئے تو کلمہ ضرور نصیب ہو۔ پولیس کے حوالدار صاحب جو سارا دن اپنی حب الوطنی اور بہادری کے قصے سنایا کرتے تھے بدحواس ہو کر دوڑے اور یوں اندھا دھند خندق میں کودے کہ ان کا تختہ اتر گیا اور بمباری ختم ہونے کے بعد انہیں ہسپتال بھجوانا پڑا۔ طیاروں نے پہلے روشنی کے بم پھینکے، اس سے فضائیں روشن ہوگئی جیسے دن ہو۔ یہ روشنیاں زمین پر گرنے کے بعد بھی کافی دیر روشن رہتیں۔ اس سے ہوا باز کو اپنا ٹارگٹ تلاش کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ دونوں طیارے کافی دیر ایئرپورٹ کے اوپر اور آس پاس چکر لگاتے رہے اور بم پھینکتے رہے، پھر واپس چلے گئے۔ ایئرپورٹ اور خاص طور رن وے پر ایک بم بھی نہ گرا۔ صرف ایک گاؤں میں دو بھینسیں مر گئیں اور ایک آدمی معمولی زخمی ہوا۔ مجھے ایک فائدہ ہوا، میرا خوف ختم ہوگیا۔ اس کے بعد جب بھی خطرے کا سائرن بجتا مَیں آرام سے بتیاں بجھا کر اپنے کمرے میں بیٹھا رہتا اور خندق میں نہ جاتا۔ شنید ہے کہ جس وقت بمباری ہو رہی تھی ڈپٹی کمشنر ملتان نے سرگودھا پی اے ایف بیس کو تین مرتبہ ٹیلیفون کیا اور مدد چاہی۔ تیسرے ٹیلیفون پر جواب ملا We are not fighting for Multan۔

ہمیں ہدایات تھیں کہ ہم ہر چھ گھنٹے کے بعد بی بی سی سے وقت ملاتے تھے۔ لوگوں کو ہماری گھڑی پر اعتماد تھا اور اکثر ٹیلیفون پر صحیح وقت پوچھتے۔ ایک شام ایک صاحب نے وقت پوچھا، مَیں نے کہا ساڑھے سات بجے ہیں۔ اس نے کہا ''مجھے صحیح وقت بتائیں'' مَیں نے کہا ''جی اس وقت ساڑھے سات بجے ہیں۔'' پھر آواز آئی ''دیکھیں جی مَیں تھانہ صدر سے ایس ایچ او بول رہا ہوں آپ مجھے Exact Time بتائیں۔'' مَیں نے کہا ''جناب سات بج کر تیس منٹ ہوئے ہیں۔'' زوردار شکریہ ادا کرنے کے بعد اس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

اسی طرح رات کے دو بجے ایک ٹیلیفون آیا، پوچھا ''آپ میاں فاروق بول رہے ہیں؟'' ہمارے یہاں 'میاں' عزت کا لفظ ہے، جیسے مسٹر۔ مَیں نے کہا ''جی، مَیں فاروق بول رہا ہوں۔'' کہنے لگا ''جی وہ دونوں ٹرک بھجوا دوں، آپ نے کہا تھا رات کی تاریکی میں بھجوانا۔'' مجھے نیند ستا رہی تھی، مَیں نے کہا ''ہاں بھجوا دو'' صبح معلوم ہوا کہ کالونی ٹیکسٹائل مل کے مینجنگ ڈائریکٹر میاں فاروق کا ٹیلیفون نمبر 2421 تھا جبکہ میرا نمبر 2420 تھا۔ اس کا ٹیلیفون پھسل کر میرے پاس آ گیا۔ خدا جانے رات کی تاریکی میں کیا بزنس ہو رہا تھا۔

وقت گزرتا گیا، ایوب خان چلے گئے، یحییٰ خان نے پھر مارشل لا لگا دیا۔ مجید ملک ہمارے ایئرپورٹ منیجر تھے۔ اس نے سب افسروں کو بلا کر کہا مارشل لا کا دور ہے آپ میں سے کوئی شخص سرکاری گاڑی لے کر پرائیویٹ کام

کے لیے ایئرپورٹ سے باہر نہ جائے۔ اگر کوئی گیا اور پکڑا گیا تو مَیں اس کی کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ دو ہی دن بعد مجید ملک، اے آر قیصر صاحب کو ساتھ۔ لے کر سبزی منڈی چلے گئے۔ دام تیار تھا۔ پولیس نے گاڑی پکڑ لی۔ قیصر صاحب تو کھسک گئے۔ ملک صاحب خود ڈرائیو کر رہے تھے، قابو آ گئے۔ ایئرپورٹ کے ایک سابقہ ملازم چوہدری نیاز نے مدد کی اور وہ بڑی مشکل سے ضمانت پر رہا ہو کر ایرپورٹ آئے۔

یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں پاکستان اور بھارت کے درمیان پھر جنگ چھڑ گئی۔ ملتان ایئرپورٹ پر تو کوئی حملہ نہ ہوا البتہ ایک رات بھارتی بمبار طیارے شیر شاہ اسٹیشن کے قریب دیوقامت پٹرول کے ٹینکوں کو آگ لگا کر چلے گئے۔ جنگ کے آخری دنوں میں ریڈیو پاکستان سے خبریں سنیں۔ بڑی حوصلہ افزا تھیں۔ ہماری فوجیں معرکہ پہ معرکہ سر کر رہی تھی۔ فتح قدم چوم رہی تھی۔ ڈیوٹی کے دوران جاگنا تو تھا ہی، مَیں یوں ہی ریڈیو سیٹ کی ناب گھما رہا تھا۔ اچانک ایک فریکوئنسی ٹیون ہو گئی، کوئی کہہ رہا تھا Message for Gen. Niazi, Please Surrender. دوسرے دن جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ محاورہ کتنا صحیح ہے The first casualty of war is 'TRUTH'۔

جنگ ختم ہوگئی پاکستان دولخت ہو گیا، مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ یحییٰ خان کا دور ناخوشگوار یادیں دے کر رخصت ہوا۔ بھٹو کرسی صدارت پر براجمان ہوئے۔ ملتان ایئرپورٹ سے پولیس چلی گئی اور اس کی جگہ FSF نے لے لی۔ کچھ عرصہ بعد ایئرپورٹس سیکورٹی فورس قائم ہوئی اور اس نے FSF کی جگہ لے لی۔ شروع شروع میں ASF ایئرپورٹ منیجر کے ماتحت تھی۔ سول ایوی ایشن سے بہت سے لوگ اے ایس ایف میں چلے گئے۔ فوج اور پولیس کے ریٹائرڈ سزا یافتہ مجرم چور دروازے سے اے ایس ایف میں آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ ملتان ایئرپورٹ پہ کبھی چوری نہ ہوئی تھی۔ اب روزانہ بلب چوری ہونے لگے۔ سائیکل غائب ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ بے نقاب ہو گئے اور سروس سے فارغ ہوتے گئے۔ گند صاف ہونے کے بعد سکون ہو گیا۔

اے ایس ایف میں خواتین بھی بھرتی ہوئی۔ ملتان میں جو خواتین تشریف لائیں ان میں دو بہت خوبصورت تھیں۔

اس دور H-Type کوارٹرز کے قریب ٹرانسمٹنگ اسٹیشن کی عمارت تعمیر ہوئی جو سول ایوی ایشن حکام کی کج بنی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ یہ عمارت ضروریات کے لیئے ناکافی تھی۔ اسے اے ایس ایف کا اسلحہ خانہ بنا دیا گیا۔

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ ملتان فلائنگ کلب کب قائم ہوا، لیکن ہوابازوں کی تربیت میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔ کئی ایک چیف فلائنگ انسٹرکٹر آئے اور چلے گئے۔ آخر سکواڈرن لیڈر (ر) محمد سلیم شیخ نے کلب کی بہت خدمت کی۔ وہ دینی مزاج رکھنے والے نیک انسان تھے۔ پی آئی اے کے جو پرانے پائلٹ ہیں ان میں آدھے سے زیادہ شیخ صاحب کے شاگرد ہیں۔ دوسرے ممالک سے بھی لوگ ٹریننگ کے لیے آتے تھے۔ شیخ صاحب نہایت خلوص اور محنت سے سکھاتے۔ انہوں نے کلب کی عمارت کو بہت وسعت دی۔ انہیں باغبانی کا بہت شوق تھا۔ کلب کے قریب قسم قسم کے پھول لگاتے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ باغبانی کے مقابلے میں اول انعام ملا۔ انہیں دھن سوار ہوئی کہ کلب کا سرمایہ

بڑھایا جائے۔ انہوں نے کلب کے لائف ممبرز بنانے شروع کیے۔ ایک سرمایہ دار نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ اس نے خطیر رقم خرچ کر کے اپنے خاندان کے بہت سے لوگوں کو لائف ممبر بنا دیا۔ اب بہت سے ووٹ اس کے اپنے تھے۔ اس نے کلب کو لوٹنے کی کوشش کی تو شیخ صاحب سینہ سپر ہو گئے، مگر سرمایہ دار اس وقت تک بہت طاقتور ہو چکا تھا، اس نے شیخ صاحب کو وہ ذلیل کیا جس کی حد نہیں۔ آخر شیخ صاحب کو کلب کو خیر باد کہنا پڑا۔ MFC جو پاکستان میں پہلے درجے کا فلائنگ کلب تھا رفتہ رفتہ برباد ہوتا گیا اور اس وقت پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ اور بقول شخصے زاغوں کے تصرف میں ہے عقابوں کا نشیمن۔

1983ء میں سول ایوی ایشن ڈیپارٹمنٹ کو اتھارٹی بنا دیا گیا۔ اب یہ خودمختار اتھارٹی بن گیا۔ جب ڈیپارٹمنٹ تھا تو تمام کمائی اور آمدنی حکومت کے خزانے میں چلی جاتی تھی۔ تنخواہیں حکومت کی طرف سے ملتی تھیں اور ڈیولپمنٹ کے بجٹ بھی حکومت دیتی تھی۔ ایئرپورٹ ڈیولپمنٹ اتھارٹی (ADA) ایک علیحدہ ادارہ تھا جس کے تحت نئے پراجیکٹ مکمل ہوتے تھے اور تعمیر شدہ عمارات اور رن وغیرہ کی دیکھ بھال بھی ہوتی تھی۔ سول ایوی ایشن اتھارٹی (CAA) بننے کے بعد تمام مالی اختیارات اتھارٹی کے پاس آ گئے۔ پانچ سال انکم ٹیکس کی چھوٹ ملی۔ محکمہ مرکزی حکومت کے ماتحت تھا۔ اتھارٹی کا تعلق بھی مرکزی حکومت سے ہے۔ ایر وائس مارشل خورشید مرزا ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ وہ وسیع اختیارات اور ایرفورس افسران کی ایک فوج ساتھ لے آئے جس نے تمام بڑے عہدوں پر قبضہ کر لیا۔ سول ایوی ایشن کے پرانے ملازمین ان کے سامنے بونے نظر آنے لگے۔ ایرفورس کے ریٹائرڈ ملازمین کا ایک سیلاب آ گیا۔ بالکل فاتح اور مفتوح والی صورت نظر آنے لگی۔ لیکن CAA کے حالات کار بہتر ہو گئے۔ پہلے پی۔ آئی۔ اے کے ملازمین کے مقابلے میں ہماری تنخواہیں بہت تھوڑی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ تو یہ بھی کہا گیا کہ کسی ایئرپورٹ پر آپ کو جو مفلوک الحال آدمی نظر آئے گا وہ CAA کا ملازم ہو گا۔ اتھارٹی بننے کے بعد تنخواہوں میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ اب تنخواہوں کے لحاظ سے اس ادارہ کا مقام چوٹی کے اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ کئی ایک نئے ایئرپورٹ کھولے گئے۔ پرانے ایئرپورٹس کی توسیع اور تزئین و آرائش کی گئی۔ پہلے ہماری کوئی یونیفارم نہ تھی، اب ہے۔ وقت کے ساتھ ایرفورس سے آئے ہوئے لوگ کنٹریکٹ ختم ہونے پر یا تو واپس ایئرفورس میں چلے گئے یا فارغ کر دیئے گئے۔ اب اوپر کی منزل میں کچھ لوگ رہ گئے ہیں، باقی سب سویلین ہیں۔ تنخواہوں کے سکیل بڑھنے سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ادھر متوجہ ہوئے۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے بڑے بڑے افسران میٹرک پاس تھے۔ اب اکثریت ایم ایس سی اور بی ایس سی لوگوں کی ہے۔ انجینئرنگ ونگ میں تقریباً سب الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ اتھارٹی بننے کے بعد ملتان میں پانچ منزلہ کنٹرول ٹاور تعمیر ہوا اور اس کے قریب ہی فائر اسٹیشن قائم ہوا۔

ایک بات جس کا میں ذکر کرنا بھول گیا وہ سن 65ء کے فوری بعد کا زمانہ ہے۔ حکومت پاکستان نے محسوس کیا کہ جنگی اور شہری ہوابازی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے موجودہ رن وے ناکافی ہے، لیکن اس کی توسیع بھی دقت طلب تھی۔ اس کے جنوبی سرے کے قریب بری فوج کا ہیڈکوارٹر اور دیگر دفاتر تھے، اور پھر رن وے ختم ہوتے ہی

شہری علاقے کی عمارتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ کئی عمارات دو منزلہ اور تین منزلہ تھیں۔ شمالی جانب سکندری نالہ تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ سکندری نالے کا رُخ موڑ کر اسے اتنا دور لے جایا جائے کہ رن وے کی مطلوبہ توسیع کی جا سکے۔ حکومت نے زرِ کثیر خرچ کر کے اس پروجیکٹ کو مکمل کیا، پھر آس پاس کے گاؤں اور باغات خرید کر ایئر پورٹ میں شامل کیے۔ رن وے کی طوالت دگنی ہو گئی اور اس قابل ہو گیا کہ ہر قسم کے طیارے اس پر اتر سکیں۔ ایئر فورس کا مستقل Base قائم کیا گیا اور ایئر پورٹ کا خاصہ رقبہ اس بیس کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ان کے کچھ دفاتر زیرِ زمین تعمیر کیے گئے۔ اس رقبہ پر بغیر CAA کی مداخلت کے PAF کا عمل دخل ہے۔ جنگی پیش بینی کے طور پر متعدد PENS بنائے گئے جن کی چھتیں نصف دائرے کی شکل میں ہیں اور ان میں طیارے بآسانی کھڑے کیے جا سکتے ہیں۔ متعدد ٹیوب ویل نصب کیے گئے اور شجر کاری مہم شروع ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں مطلوبہ علاقے درختوں سے ڈھک گئے۔ تھوڑی ہی عرصے بعد رن وے کے مغربی جانب قاسم بیلہ کی طرف آرمی ایوی ایشن کے دفاتر اور ہینگرز تعمیر ہوئے اور یہ سب اب تک قائم و دائم ہیں۔

ملتان ایئر پورٹ پر کئی ادارے ہیں، میں ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر کروں گا۔

سول ایوی ایشن اتھارٹی: (CAA)

اس کا سربراہ ایئر پورٹ منیجر ہے۔ اس کا دفتر اور متعلقہ انتظامی دفاتر ٹرمینل بلڈنگ میں ہیں۔ بلڈنگ کا یہ حصہ دو منزلہ ہے۔ ایئر فورس بیس اور آرمی ایوی ایشن بیس کے علاوہ جتنی عمارات ہیں وہ یا تو CAA کی ملکیت ہیں یا دوسرے اداروں نے لیز پر زمین لے کر دفاتر تعمیر کیے ہیں۔ مسافروں کے آنے جانے کے لیے پسنجر لاؤنجز، رن وے، ریسٹورنٹ، کمپنیوں کے دفاتر اور رہائشی مکانات CAA کی ملکیت ہیں اور اس کی تحویل میں ہیں۔ اس ادارے کی کئی شاخیں ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

ایئر ٹریفک کنٹرول (ATC) جس طرح ٹریفک پولیس سڑکوں پر ٹریفک کنٹرول کرتی ہے اسی طرح ATC ہوائی ٹریفک کو کنٹرول کرتی ہے۔ ایئر پورٹ پر آنے اور جانے والے طیاروں کو وائرلیس پر ہدایات دی جاتی ہیں۔ فضائی حدود میں گزرنے والے طیاروں سے رابطہ رکھا جاتا ہے۔ لاہور اور کراچی میں فلائٹ انفارمیشن سنٹر ہیں جو تمام پاکستان میں اڑنے والے طیاروں کو مدد دیتے ہیں اور انہیں مطلوبہ ہدایات فراہم کرتے ہیں۔ راڈار کی تنصیب کے بعد اب یہ شعبہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ فائر سیکشن کا تعلق بھی ATC کے ساتھ ہے۔ ملتان ایئر پورٹ پر آگ بجھانے کے جدید آلات اور ماہر عملہ موجود ہے، یہ اور بات ہے کہ پچھلے پچپن برس میں ملتان ایئر پورٹ پر نہ تو کوئی ہوائی حادثہ ہوا ہے اور نہ ہی کسی طیارے کو آگ لگی ہے۔ لیکن فائر فائٹنگ کے وجود کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

CAA کا دوسرا شعبہ کمیونیکیشن ہے۔ اس کی تین شاخیں ہیں۔ انجینئرنگ، آپریشن اور ٹیلیفون۔ انجینئرنگ

میں الیکٹرانک انجینئرز ایئرپورٹ پر تمام ریڈیائی تنصیبات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ آپریشن میں کراچی ایئرپورٹ سے مسلسل رابطہ رکھا جاتا ہے۔ پہلے یہ رابطہ وائرلیس ٹیلیگرافی کے ذریعہ ہوتا تھا، پھر Telex اور ٹیلی پرنٹرز سے اور اب کمپیوٹر کے ذریعے۔ ملتان ایئرپورٹ کا اپنا خودکار ٹیلیفون ایکسچینج ہے۔

CAA کا تیسرا شعبہ سول اور الیکٹرک انجینئرنگ ہے۔ سول انجینئر تمام عمارات کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہے۔ الیکٹرک انجینئر کے ذمہ بجلی کی تنصیبات، پاور ہاؤس اور ایئرکنڈیشنگ پلانٹس کی دیکھ بھال ہے۔

ایئرپورٹ پر جتنی سہولیات ہیں مثلاً ریسٹورنٹ، سٹاف کینٹین، رینٹ اے کار، پورٹر سروس، پارکنگ وغیرہ ان سب کو مخصوص مدت کے لیے ٹھیکہ پر دینا ایئرپورٹ منیجر کی ذمہ داری ہے۔

ائرپورٹ سیکورٹی فورس: ASF

ملتان ایئرپورٹ پر دوسرا اہم ادارہ ''ایئرپورٹ سیکورٹی فورس'' ہے۔ اس کا سربراہ چیف سیکورٹی آفیسر ہے۔ اس ادارے کا تعلق مرکزی حکومت پاکستان سے ہے۔ تمام اہم تنصیبات کی حفاظت کی ذمہ داری اسی ادارہ کی ہے۔ تخریب کاری کو روکنے کے لیے تمام Entry Points پر ان کا پہرہ ہوتا ہے۔ لاؤنج میں مسافروں اور دوسرے عملہ کی جامہ تلاشی اور سامان کی چیکنگ کے لیے جدید مشینیں نصب ہیں۔ مخصوص وردی ان کی پہچان ہے۔ یہ لوگ نہایت مستعد ہیں اور مسافروں سے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔

:MET Office

تیسرا اہم اور قدیم ادارہ محکمہ موسمیات ہے۔ ان کے پاس موسم معلوم کرنے کے جدید آلات ہیں۔ ہر گھنٹہ کے بعد موجود موسم کی رپورٹ کنٹرول ٹاور کو مہیا کرتے ہیں۔ یہ معلومات طیاروں کی محفوظ اڑان کے لیے ضروری ہیں۔ یہ رپورٹ لاہور اور کراچی کے دفاتر موسمیات کو بھی مہیا کی جاتی ہیں۔ پاکستان میں جہاں جہاں بھی محکمہ موسمیات کی آبزرویٹری ہے وہاں سے موسم کی رپورٹیں مرکزی دفتر کو موصول ہوتی ہیں۔ ہمسایہ ممالک سے بھی یہ رپورٹیں آتی ہیں۔ ان تمام رپورٹوں کو یکجا کر کے مرکزی دفتر موسمیات آنے والے موسم کی پیش گوئی کرتے ہیں اور تمام ایئرپورٹس کو یہ پیش گوئی مہیا کی جاتی ہے۔ موجود موسم اور آنے والے موسم کی پیش گوئی کی رپورٹ کے بغیر کوئی طیارہ فضا میں پرواز کرنے کا خطرہ مول نہیں لیتا۔

:MFC

چوتھا ادارہ ملتان فلائنگ کلب ہے۔ اس کا سربراہ چیف فلائنگ انسٹرکٹر ہے۔ یہ ادارہ مالی معاملات میں خودمختار اور خودکفیل ہے۔ اس کا اپنا ہینگر، اپنی عمارت اور ہوسٹل ہے۔ کسی زمانے میں یہ ادارہ بڑے عروج پر تھا۔ اب سسک سسک کر دن پورے کر رہا ہے۔ اب اسے دوا کی نہیں دُعا کی ضرورت ہے۔

ان کے علاوہ کسٹمز آفس اور پی ایس او وغیرہ کے ادارے ہیں۔

فضائی کمپنیوں میں پی آئی اے سب سے قدیم اور مستحکم ہے۔ اسے حکومتی سرپرستی حاصل ہے۔ اندرونِ ملک کے علاوہ پی آئی اے کے طیارے دبئی بھی آتے جاتے ہیں اور حج کے موسم میں حج پروازیں بھی ملتان ایئرپورٹ سے چلتی ہیں۔ ایک اور ہوائی کمپنی ایرو ایشیا اپنے وجود کو قائم رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً دوسری کمپنیوں کی پروازیں بھی ملتان کو شرف بخشتی رہیں۔ ان میں راجی ایرویز، بھوجا ایرویز اور سیف ایر شامل ہیں۔ مالی مشکلات کی وجہ سے یہ کمپنیاں زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکیں۔ سیف ایر کی عمر تو ایک سال سے بھی کم رہی۔ اگر یہ سب یکجا ہو کر ایک ایرلائن بنا لیتے تو انتظامی اخراجات گھٹ جاتے۔ فلیٹ (Fleet) میں طیاروں کی تعداد زیادہ ہوتی اور پروازوں میں نظم پیدا ہوتا۔ اس طرح پاکستان کو ایک اور باوقار ایرلائن مہیا ہو جاتی۔ آخر جب پی آئی اے وجود میں آئی تھی تو اورینٹ ایرویز اور کریسنٹ ایرویز بھی تو اس میں مدغم ہو گئی تھیں۔

پچھلے دنوں اخبار میں خبر تھی کہ ملتان ایئرپورٹ کی توسیع کا منصوبہ منظور کر لیا گیا ہے اور یہاں سے اندرون و بیرون ملک پروازوں میں بھی اضافہ ہوگا۔ اللہ کرے یہ خبر سچ ہو۔

بیسویں صدی کے نویں عشرے کی بات ہے چوہدری مبارک علی ایئرپورٹ منیجر تھے۔ ان کے ساتھ دقت یہ تھی کہ جب بھی کوئی اجنبی انہیں ٹیلیفون کرتا وہ ریسیور اٹھا کر کہتے "مبارک"۔ ادھر سے آواز آتی "خیر مبارک"۔ مبارک صاحب اپنی دوسری ہونے والی بیوی سے ملنے حیدرآباد گئے، وہاں سے وہ سلام بھرنے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار پر گئے۔ راستے میں کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور مبارک صاحب کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ حیدرآباد ہسپتال میں ان کی ٹانگ پر پلستر چڑھا دیا گیا اور بذریعہ ریل گاڑی وہ ملتان آئے۔ انجینئر حفیظ صاحب ان کے ساتھ چھوڑنے کے لیے آئے۔ انہیں کافی دنوں کے صاحبِ فراش ہونا پڑا۔ جب مصیبت آتی ہے تو تنہائی میں اللہ بہت یاد آتا ہے۔ ایک رات جب مبارک صاحب بستر پر لیٹے اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت کے خواستگار تھے ان کے دل میں خیال آیا کہ ٹرمینل بلڈنگ کے پاس جو چھوٹی سی مسجد ہے اسے شہید کر کے کیوں نہ ایک بڑی اور خوبصورت مسجد بنائی جائے۔ انہوں نے دعا کی کہ "یا اللہ! اگر میری زندگی رہی اور تو نے مجھے صحت عطا فرمائی اور مجھے مسجد کی تعمیر کی توفیق عطا فرمائی تو انشاء اللہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔

مہینہ سوا مہینہ میں مبارک صاحب تندرست ہو گئے اور دفتر آنے لگے۔ ذرا لنگڑا کر چلنے لگے۔ مسجد تعمیر کی دھن سوار تھی۔ اکثر لوگوں سے ان کا ذکر کرتے۔ ایک مشہور صنعت کار مسٹر سہگل ایئرپورٹ پر آئے اور مبارک صاحب کے دفتر میں جا بیٹھے۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے انہوں نے سہگل صاحب سے ذکر کیا اور اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ سہگل صاحب نے مسجد کی جگہ دیکھی اور کہا ہاں، مسافروں کی سہولت کے لیے یہاں مسجد کا ہونا بہت ضروری ہے۔ انہوں نے ایک لاکھ روپیہ عطیہ دینے کا وعدہ کیا اور چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سبب پیدا کر دیا۔ مبارک صاحب کی ہمت بڑھی۔ انہوں نے آرکیٹیکٹ سے مسجد کا ڈیزائن اور نقشہ بنوایا اور سول ایوی ایشن اتھارٹی کے ہیڈکوارٹر کراچی منظوری کے لیے بھیج دیا۔ چند ہی دنوں بعد سہگل صاحب نے ایک لاکھ روپے کا چیک بھیج دیا۔ بنک میں مسجد کے نام پر

اکاؤنٹ کھلوا کر چیک جمع کر دیا گیا۔ لیکن ایک لاکھ ڈیزائن کے مطابق تعمیر کے لیے نا کافی تھا۔ بہر حال تعمیر شروع کر دی گئی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد صدر پاکستان جناب جنرل ضیاء الحق ملتان دورے پر تشریف لائے۔ وہ نماز کے پابند تھے۔ مبارک صاحب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں زیرِ تعمیر مسجد میں نماز کے لیے لے گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد تمام کہانی بیان کی اور مالی امداد کی استدعا کی۔ جنرل صاحب نے بکمال مہربانی ایک لاکھ روپیہ عطیے کا وعدہ فرمایا اور چلے گئے۔ پورے تیس دن انتظار کیا گیا مگر عطیہ موصول نہ ہوا۔ مبارک صاحب نے صدر صاحب کی خدمت میں یاددہانی کے لیے مراسلہ ارسال کیا کوئی جواب نہ ملا۔ مزید ساٹھ دن گزر گئے۔ جنرل صاحب نہ تیس دن میں وعدہ پورا کیا نہ نوے دن میں۔ بہت مصروف انسان تھے۔ انہیں حکومت کے کاموں اور عبادت سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی۔ نوے دن کے بعد مایوس ہو کر دوسرے طریقے اور ذرائع سوچے گئے۔ پی آئی اے سٹاف نے فراخ دلی سے چندہ دیا اور شہر کے مخیر لوگوں نے بھی عطیات دیئے اور مسجد کی تعمیر تکمیل کو پہنچی۔

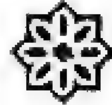
مسجد میں ایک چوکور وسیع ہال ہے اور باہر مناسب صحن ہے۔ ایک کونے میں خوبصورت مینار ہے۔ پھر ہر ایئر پورٹ مینجر نے اس کے حسن میں اضافے کی کوشش کی۔ حال ہی میں ایک نیا وضوخانہ تعمیر کیا گیا ہے اور امام مسجد کے لیے ایک چھوٹا سا حجرہ۔ نئے اعلیٰ قسم کے قالین بچھائے گئے ہیں۔ ہال کو ایئر کنڈیشن کر دیا گیا ہے۔ صحن میں آہنی کھمبے گاڑ کر کپڑے کی عارضی چھت بنائی گئی ہے جسے لپیٹا جا سکتا ہے۔ ایک نہایت ہی خوش الحان قاری صاحب مسجد میں پانچ وقت کی امامت فرماتے ہیں اور جمعتہ المبارک کی نماز بھی پڑھاتے ہیں۔ بظاہر مسجد کافی وسیع ہے لیکن دن بدن نمازیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ خاص طور پر جمعہ کے روز صحن کے باہر کھلی جگہ پر اضافی صفیں بچھانی پڑتی ہیں۔ جن جن لوگوں نے مسجد کی تعمیر اور اس کی تزئین و آرائش کے لیے خدمات انجام دیں اس کا اجر اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرمائے گا۔

مسجد کے قریب ہی 1952ء میں ایک عارضی کینٹین تھی۔ جب ٹرمینل بلڈنگ کے دو کمرے تیار ہو چکے تو اسے بلڈنگ میں منتقل کر دیا گیا۔ پہلا ٹھیکہ چوہدری محمد اشرف کو ملا اور اس کا درجہ ریسٹورنٹ کر دیا گیا۔ پی آئی اے کی پروازیں تو اتنی زیادہ نہ تھیں مگر فلائنگ کلب کے لڑکوں اور سٹاف کے لوگوں کی وجہ سے ریسٹورنٹ میں کافی رونق رہتی۔ چوہدری اشرف بااخلاق آدمی تھا اور لوگ اس کی سروس کے معیار سے بھی مطمئن تھے۔ کچھ عرصہ بعد چوہدری اشرف کی توجہ کنسٹرکشن کی ٹھیکیداری کی طرف مبذول ہو گئی اور ریسٹورنٹ کا ٹھیکہ اس کے بہنوئی چوہدری محمد افضل نے لے لیا۔ ٹرمینل کی بلڈنگ میں توسیع ہوئی تو ریسٹورنٹ وہاں چلا گیا جہاں اب پی آئی اے اور ایرو ایشیا کے بریفنگ کاؤنٹر ہیں۔ پھر بلڈنگ میں مزید توسیع ہوئی تو ریسٹورنٹ کو اس مثلث ہال میں ڈال دیا گیا جہاں اب تک قائم و دائم ہے۔ چوہدری افضل سے ٹھیکہ پھر چوہدری اشرف کے پاس آ گیا اور ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حافظ حامد رضا نے ٹھیکہ لے لیا۔ حافظ حامد رضا ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ کاروبار کے علاوہ روزنامہ ''نیا دن'' اور ہفت روزہ ''راز دار'' سے منسلک ہیں۔ ان کی ذاتی کاوش اور کشش کی وجہ سے جو ادیب اور شعراء ہوائی سفر کر رہے ہوتے ہیں وہ

ریسٹورنٹ کو ضرور رونق بخشتے ہیں۔

ملتان ایئرپورٹ پر جو امراء، وزراء اور حکومتی شخصیات تشریف آور ہوتی ہیں تو وہ VIP لاؤنج استعمال کرتی ہیں اور اخباری نمائندوں کو بیانات عطا کرتے ہیں۔ دیگر سیاسی شخصیات کے لیے کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں وہ پریس کانفرنس کرسکیں اور اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔ چنانچہ وہ ریسٹورنٹ کا رخ کرتے ہیں۔ اخباری نمائندے بھی آ جاتے ہیں اور متعلقہ پارٹی کے کارکن بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ پریس کانفرنس ہوتی ہے، چھوٹی موٹی تقریر ہوتی ہے، نعرے لگتے ہیں، چائے پیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ مذہبی تنظیموں کے علماء کرام بھی یہیں آ کر اخباری نمائندوں کے سامنے اپنے سیاسی اور مذہبی خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔ اس طرح ایرپورٹ ریسٹورنٹ آنے والے اور جانے والے لیڈران کے دم قدم سے مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور ادبی مرکز اور پلیٹ فارم بنا ہوا ہے۔ (یاد رہے اب یہ عمارت ختم کر کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی نئی عمارت بنا دی گئی ہے جو 2014ء تک شروع نہیں ہوئی)

(ایئرپورٹ - فاروق انصاری)



مولانا نور احمد خان فریدی

عہدِ قدیم

آج سے ہزاروں سال پہلے ایک اور قوم پہاڑی درّوں سے گزر کر وادیٔ سندھ میں داخل ہوئی۔ یہ لوگ آرین تھے اور وسط ایشیا سے اپنے جانوروں کے لیے چراگاہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ آرین وادیٔ سندھ کے اصل باشندوں کے مقابلتہً قد آور، بہادر اور جفاکش تھے۔ انہوں نے اصل باشندوں کو لڑ جھگڑ کر جنوبی دکن کی طرف دھکیل دیا اور خود پنجاب اور گنگا جمنا کے زرخیز میدانوں سے گزر کر بنگال تک پھیل گئے۔ افسوس ہے کہ اس عہد کے بارے میں ہمارے پاس کوئی مستند مواد نہیں ہے۔ ہندوؤں نے اپنے ملک کی خاطر سب کچھ کیا مگر وہ اس کی تاریخ مدوّن نہ کر سکے۔ گمنام قوموں کے حالات کا اتہ پتہ بھی مل جاتا ہے، مگر ہندوؤں سے متعلق ہمیں ایسے کتبے بھی کم ملتے ہیں جن پر سے قدامت کا غبار ہٹا کر کوئی تحقیقی بات معلوم کی جا سکے۔ پہلے تو اس قوم نے اپنی تاریخ مدوّن کرانے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ اور اگر تھوڑے بہت واقعات بتانے کی کوشش ہوئی بھی ہے تو ان پر شاعرانہ مبالغوں اور اپنے مذہبی معتقدات کا رنگ روغن چڑھا کر دیو مالا بنا دیا گیا ہے۔ رامائن اور مہابھارت اگرچہ ایک محدود زمانے کی عکاسی کرتی ہیں مگر انہیں حکایت و روایت سے زیادہ درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ بایں ہمہ ہم ان پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ سوائے ان کے ہمارے پاس اس دور کا اور کوئی ماخذ نہیں۔

راجہ اسواپتی

رامائن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جن دنوں اجودھیا پر راجہ دشرتھ راج کرتا تھا، سندھ کی وادی ''کیکیا'' نام ایک سلطنت کے زیرِ نگیں تھی۔ راجہ دشرتھ کی حسین و جمیل رانی، جس کی تریاہٹ نے رام چندر جی کو چودہ سال کے لیے بن باس لینے پر مجبور کر دیا تھا اسی ملک کے راجہ کی بہن تھی اور اسی وجہ سے کیکئی یعنی مُلک کیکیا والی کہلاتی تھی۔ دوسرے معنوں میں یوں سمجھیے کہ اُن دنوں ملتان اور اس کے ملحقات پر راجہ دشرتھ کے نسبتی بھائی کی حکومت تھی۔ اس راجے کا نام اسواپتی بتایا جاتا ہے لیکن یہی نام مہابھارت میں بھی ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ اس مملکت کا ہر راجہ اسواپتی کہلاتا تھا۔ یعنی گھوڑوں کا مالک، لامحالہ یہ ملک گھوڑوں کی کثرت اور عمدگی کی وجہ سے مشہور ہوگا اور اب بھی پنجاب کے گھوڑے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ''نگر'' کے علاقے میں تانبے کی ایک تختی برآمد ہوئی ہے۔ اس کی

عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ اسواپتی کو ہستنا پور کے مہاراجہ جناجیا نے قتل کیا تھا۔ اس تختی میں علمِ نجوم کی رو سے جو زمانہ بتایا گیا ہے اگر اس کا حساب لگایا جائے تو یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے 2990 برس پیشتر کا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں وادیٔ سندھ کا راجہ جس کی مملکت میں ملتان بھی شامل تھا، اتنا زبردست تھا کہ اسے شکست دینے میں پانڈو خاندان بھی فخر محسوس کرتا تھا۔

ملتان اور اس ملحقات کو رانی کیکئی سے جو تقرّب حاصل ہے اس کا ثبوت رام چوترہ اور مندر رام تیرتھ سے ملتا ہے۔ عام طور پر مشہور یہ ہے کہ مہاراجہ رام چندر جی بحالتِ بن باس اس جانب تشریف لائے تھے مگر یہ امر قرینِ قیاس نہیں کیونکہ بن باس کے دوران رام چندر جی کا سارا وقت جنوبی ہند میں گزرا ہے۔ اغلب گمان یہ ہے کہ مہاراجہ رام چندر جی رانی سیتا سے شادی کرنے کے بعد بغرض سیر وتفریح اپنی چھوٹی ماں کے وطن میں تشریف لے آئے ہوں گے۔ رام چوترہ اور بالخصوص مندر رام تیرتھ اس امر کا بڑا ثبوت ہے کہ ملتان ہی رانی کیکئی کے باپ کا دارالسلطنت تھا۔ کیونکہ کشمیر اور شمالی پنجاب میں کوئی مقام ایسا نہیں ملتا جہاں مہاراجہ رام چندر کا جانا ثابت ہو۔ یا کوئی مقام ان سے موسوم ہو۔ یہ شرف صرف ملتان کی پوتر بھومی کو ہی حاصل ہے۔

مندر رام چوترہ

یہ مقام سرائے سدھو سے شمال مشرق کی جانب دریائے راوی کے پار واقع ہے اور اس کے محاذ میں دریا کے اس پار لچھمن چوترہ ہے اور اس مقام سے آٹھ میل مشرق کو سیتا کُنڈ واقع ہے۔ دریا سیتا کُنڈ سے رام چوترہ تک تیر کی طرح سیدھا بہتا ہے۔ ہزاروں سال سے یہ صورتِ حال چلی آتی ہے اور دریا نے کبھی ان دو مقامات کے درمیان بے اعتدالی نہیں کی۔ آج بھی سیتا کُنڈ سے رام چوترہ نظر آتا ہے حالانکہ ان کے مابین آٹھ میلوں کا فاصلہ ہے۔

بیان کرتے ہیں کہ مہاراجہ رام چندر اپنی اہلیہ محترمہ رانی سیتا اور پیارے بھائی لچھمن کے ہمراہ بغرضِ سیر و تفریح تشریف لائے تو ان سب نے سیتا کُنڈ کے مقام پر قیام کیا۔ پھر رام چندر اور لچھمن جی دونوں کپڑے اتار اشنان کی غرض سے دریا کود پڑے اور نہاتے تیرتے سیتا جی سے آٹھ میل دور چلے آئے مگر مہارانی سیتا برابر انہیں دیکھتی رہی اور یہ بھی پیچھے مڑ کر رانی کو دیکھ لیتے تھے۔ جب اس مقام پر پہنچے جو اَب اُن کے نام سے مشہور ہے تو مہاراجہ رام چندر دریا سے نکل کر ایک اونچی جگہ پر عبادت میں مصروف ہو گئے اور لچھمن دریا کے اس پار ان کے عین سامنے ایک چبوترے پر بیٹھ کر پوجا کرنے لگے۔

ہندوؤں کا بیان ہے کہ پہلے دریا سیدھا نہیں بہتا تھا۔ رام چندر جی مہاراج کے اشنان اور سیتا جی کی توجہ سے سیدھا ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ جب رام چندر دس میل مغرب کو نکل آئے اور انہیں سیتا جی کا خیال آیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر سیتا جی کو دیکھا۔ ان کے دیکھنے سے تمام حجابات ہٹ گئے اور دریا تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ ان تینوں مقامات پر مندر بنے ہوئے ہیں اور درمیانی دس میل میں دریا کے دونوں جوانب کھجور، بڑ اور شیشم کے گھنے درخت

ہیں۔ بیساکھی کے موقع پر یہاں پر زبردست میلہ لگتا تھا جس میں ہزاروں ہندو شرکت کرتے تھے۔

مندر رام تیرتھ

یہ مندر ملتان شہر سے بجانبِ مشرق ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اب شہر کی حدود میں آ گیا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ مہاراج رام چندر جب ملتان تشریف لائے تھے تو انہوں نے اس جگہ قیام فرمایا تھا اور انہوں نے یادگار کے طور پر ایک تالاب بنوایا اور اعلان کیا کہ جو شخص اس تالاب میں نہائے گا اسے تیرتھ اشنان کا ثواب ملے گا۔ انتقالِ آبادی سے پہلے بھادوں اور پورنماشی کے موقع پر یہاں ایک زبردست میلہ لگتا تھا جس میں ملتان شہر کے تمام ہندو شرکت کرتے تھے۔

یہ مندر اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مہاراج رام چدر جی اپنی رانی اور بھائی کے ہمراہ دریائے راوی کے راستے ملتان تشریف لائے۔ انہوں نے ملتان شہر کے باہر کھلی جگہ کو اپنی رہائش کے لیے پسند کیا اور راوی کے کنارے ایک سوادِ مقام مین قیام فرمایا۔ ان تاریخی شواہد سے یہ گمان یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ رانی کیکئی کی جنم بھومی ملتان تھا۔

لاہور اور قصور کی وجہ تسمیہ

صرف مہاراج رام ہی نہیں بلکہ ان کے راجکماروں کا بھی اس جانب آنا ثابت ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رانی سیتا کے حادثہ فاجعہ کے بعد نہ صرف یہ کہ مہاراجہ رام چندر کی زندگی تلخ ہوگئی بلکہ ان کے صاحبزادوں نے بھی اس ملک میں رہنا گوارا نہ کیا جہاں ان کی والدہ پر ایسی صبر آزما ساعتیں گزری تھیں۔ وہ پنجاب کی طرف منتقل ہو آئے۔ راج کمار نے تو دریائے راوی کے کنارے اس جگہ قیام کیا جو اب ان کے نام پر لاہور مشہور ہے۔ اس کا اصل نام لوہور تھا۔ پرانے تذکروں میں لوہور ہی ملتا ہے۔

دوسرے راج کمار نے دریائے ستلج کے کنارے استھان بنایا جو ان کے نام پر پہلے ''کش ہور''، پھر 'کشھور' اور بعد میں 'قصور' مشہور ہوا۔

مید اور جاٹ

اسواپتی کے بعد وادئ پنجند میں مید اور جاٹ نام کی دو قوموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ دونوں قومیں بڑی بہادر اور جنگجو تھیں اور دریائے سندھ کے کناروں پر آباد تھیں۔ موجودہ علم فیلالوجی اور انسانی خد و خال کی بصیرت سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دونوں وہی وحشی اور غارت گر قومیں ہیں جنہوں نے آرین کی نقل مکانی سے پہلے مختلف ملکوں میں تباہی مچا رکھی تھی۔ ممکن ہے کہ یہ مید اسی مشہور قوم سے تعلق رکھتے ہوں جنہوں نے اسیریا کی سلطنت سے پہلے وادئ فرات میں میدیا کی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ مید اور جاٹ دونوں ایک دوسرے کے زبردست حریف تھے اور ان میں ہمیشہ خوفناک جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب یہ سلسلہ طول اختیار کر گیا تو آئے دن کی لڑائیوں سے تنگ آ کر انہوں

نے اپنے وکیلوں کو راجہ دریودھن کے پاس دہلی بھیجا اور درخواست کی کہ ہم لوگ آپ کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ آپ اپنی طرف سے کوئی نائب بھیجیں جو ہم پر حکومت کرے۔

رانی دھسلہ کی حکومت

راجہ دریودھن نے اپنی شیر دل بہن رانی دھسلہ کو جو راجہ جیدارتھ کی رانی تھی، اپنا نائب مقرر کر کے وادئ سندھ کی طرف روانہ کیا۔ اس نے اپنا پایۂ تخت اُچ اور ملتان کے درمیان ایک شہر کو مقرر کیا جو بعد میں اسکلندہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس عظیم شہر کے کھنڈرات موضع ٹھٹھہ گھلواں تحصیل شجاع آباد میں ملتے ہیں جو دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ چونکہ ملک میں تعلیم کی کمی تھی اس لیے رانی نے اپنے بھائی کو خط لکھ کر تیس ہزار برہمن مع مال و اسباب درآمد کیے جس سے ملک کے گوشے گوشے میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ بڑی اچھی حکومت تھی جو کم و بیش بیس سال تک رہی، مگر کوروؤں کی شکست سے یہ ملک بھی اثر لیے بغیر نہ رہا اور برہمیں نامی ایک برہمن نہ صرف ملتان اور سندھ بلکہ پورے برصغیر پاک و ہند پر قابض ہو گیا۔ اس نے تمام پانڈوؤں کو نیست و نابود کر دیا اور ایک زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کی اولاد سے تقریباً پندرہ راجوں نے اس برصغیر پر حکومت کی، لیکن انجامِ کار اپنے ظلم و ستم کی پاداش میں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے گئے۔

(تاریخ ملتان - مولانا نور احمد خان فریدی)



حنیف چوہدری

تاریخِ ملتان کے ماخذات میں مشاکلت

(تجزیاتی مطالعہ)

لغت میں تاریخ کے معنی ہیں وقت کی نشان دہی کرنا یعنی کسی چیز کی تاریخ کا سرا تلاش کرنا جبکہ اصطلاحی معنی ہیں وقت بتا کر سارے احوال کو متعین کرنا۔ الغرض یہ وہ فن ہے جس میں سارے زمانے کے واقعات سے بحث کر کے اُن کی تحدید اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ شمس الدین احمد لکھتے ہیں ''تاریخ کا علم ایسا ہے کہ عالم اور جاہل دونوں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ احمق اور عقلمند دونوں کے لیے اس کا اثر دل پذیر ہوتا ہے۔''(1)

تاریخ کے مطالعے کا کام جتنا آسان ہے تاریخ نگاری کا فن اتنا ہی مشکل اور دقیق ہے۔ مؤرخ بیک وقت محقق بھی ہوتا ہے اور نقاد بھی، مؤرخ میں اگر یہ صفات نہ ہوں تو وہ متعصب ہوگا اور اپنے موضوع سے انصاف نہ کر پائے گا۔ مؤرخ کا سارا عمل غیر پوشیدہ اور غیر ذاتی ہوتا ہے۔ تاریخی تحقیق کے طریقے سے حقائق کو جمع کرنا، منتخب کرنا، اُن کی صداقت کا جائزہ لینا اور ماخذات سے تصدیق کرنا جس کا تعلق گزرے زمانے اور گم گشتہ واقعات سے ہوتا ہے بہت کٹھن اور مشکل ہے۔ علامہ سلمان ندوی نے آل انڈیا ہسٹری کانفرنس مدراج دسمبر 1944ء میں کہا تھا ''تاریخ ایک کچی دھات ہے اس کچی دھات کو مختلف مسالوں سے جوڑ کر جیسی شکل آپ بنانا چاہیں بنا سکتے ہیں اور اپنی ہمدردی اور بے دردی سے اُس کو جس طرح چاہیں رنگ کر دکھا سکتے ہیں۔ دو یا تین جزوی باتوں کو ملا کر کلیہ بنا لینا اس فن کا آج کل سب سے آسان چٹکلہ ہے۔''(2)

ندویؒ صاحب کی اس بات میں بہت وزن اور صداقت ہے۔ ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ تواریخ یا تو بادشاہ لکھواتے ہیں یا خوشامد پرست اپنے مفاد کی خاطر حقائق کو مسخ کر کے تواریخ کی شکل میں ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ندوی صاحب اس خطبے میں مزید لکھتے ہیں ''آج کل یہ فن (فن تاریخ نگاری) سب سے زیادہ بدنام ہو گیا ہے اور قوموں کی چرب زبانی، اختلاف بیانی اور واقعات کی توجیہ اور تشکیل کر کے اس کو جدا جدا رنگ دینے کے سبب سے کسی چیز کی تاریخ آج کل ایک ہی طرح بیان نہیں کی جا سکتی۔''

1857ء کی فرنگیوں کے ساتھ جنگ کو انگریزوں نے غدر کے حوالے پانچ جلدوں پر مشتمل Mutiny

Reports شائع کیں۔(3) جبکہ ہندوستانی مؤرخوں نے اس کو جنگِ آزادی قرار دے کر فرنگیوں کے ظلم و ستم کی داستانیں رقم کیں(4)۔ یہ نہ صحیح ستمبر 1965ء کی جنگ ہی کو دیکھ لیجئے جس میں بھارت کو پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بھارت کے نامور مؤرخ بوٹا سنگھ نے لکھا ہے ''1965ء کی پاک بھارت جنگ دو دھرموں کا یدھ تھا۔ مسلمانوں کو جنگِ بدر کی طرح ہار کو سامنے دیکھتے ہوئے ہاتھ کھڑے کرنے پڑے۔''(5) جبکہ پاکستان کا بچہ بچہ حقائق سے واقف ہے کہ بھارت کی توسیع پسندی کو 26 ارب روپے کا بارود اس یدھ میں ضائع کرنا پڑا۔''(6)

اسلامی تاریخ نگاری کو تو قرآنِ کریم کے اس واضح اصولوں پر استوار کیا جاتا ہے کہ ''اے ایمان والو! اگر کوئی آدمی تمہارے پاس خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔ کہیں کسی قوم کو تم نادانی میں کوئی ضرر نہ پہنچا دو کہ پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔''(7) یہ دو اصول روایت اور درایت ہیں۔ ان دونوں اصولوں کو مدِنظر رکھ کر ''خبر مع سند'' کا طریقہ رائج ہوا جس پر فنِ تاریخ نگاری کا عمل ہو رہا ہے۔ ''خبر یا سند'' کے طریقے کے معیار کو بروئے کار لانے کے لیے کئی علوم وجود میں آئے جن میں تاریخ اور اسماء رجال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 'سند' اس وقت بے معنی ہو جاتی ہے اگر رجال سے واقفیت نہ ہو اور رجال سے واقفیت غیر مکمل اور غیر مفید ہو گی تاوقتیکہ اس زمانے کے تمام حالات پر نظر نہ ہو۔ مگر ملتان کے بارے میں لکھی جانے والی تواریخ میں ان دونوں اصولوں پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس مقالے میں ہم صرف منشی عبدالرحمٰن خان کی نوشتہ ''تاریخِ ملتان'' میں ملتان شہر کے قدیم ناموں کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے۔''(8)

منشی عبدالرحمٰن خان اپنی کتاب کے صفحہ 18 پر رقم طراز ہیں کہ ''نیز حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام ہند میں سراندیپ پہاڑ پر اُتارے گئے اور (اماں) حوا جدہ میں اور ابلیس لعین 'میسان' میں اور سانپ 'اصفہان' میں ...... ملتان کا سب سے اولین نام 'میسان' ہی تھا۔''

یہاں پر محترم مؤرخ نے ''خبر اور سند'' کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا۔ انہوں نے جس حدیث سے اس 'خبر' کو اخذ کیا ہے وہ درج نہیں کی اور 'سند' کے طور پر جس کتاب حدیث سے حدیث کا حوالہ دیا ہے اُس کتاب کا نام وغیرہ درج نہیں کیا جس سے مذکورہ 'خبر' کی حیثیت اصولِ تاریخ کے منافی ہے۔ تاریخِ قدیم کی تدوین میں سب سے بڑی دقت زمانوں کے تعین اور ناموں کے اتحاد و اختلاف کی پیش آتی ہے۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے اس سے متعلق چند اصول بیان کیے ہیں۔(9)

1۔ اصولِ تعین زمانہ

2۔ اصولِ تطبیق اسماء

3۔ اصولِ اتحاد و اسماء السنہ

ان اصولوں کی روشنی میں لفظ 'میسان' کو پرکھتے ہیں، تعین زمانہ کے اعتبار سے اس کی واقفیت کے تین ذرائع ہیں اولاً تورات، دوم آثار قدیمہ یا الواحِ منقوشہ اور سوئم معاصر العہد قوم۔ یہ تینوں ذرائع معلومات دینے سے قاصر ہیں کہ یہ لفظ کیا ہے؟

اصول تطبیق اسماء کے تحت مقاماتِ سکونت کے ناموں یا قوم کی زبانوں اور دیوتاؤں کے ناموں کی باہمی مطابقت ہے اس لیے سند یا ماخذ کی ضرورت پڑتی ہے جو نابود ہے۔

اصول اتحاد اسماء والسنہ میں ناموں کی خاص نوعیت اور ترکیب ہوتی ہے ''میسان'' میں کسی گروہ، کسی قوم، کسی قومیت کا امتیاز مضمر نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی کسی کے ساتھ مماثلت اور مشاکلت اتحاد نظر آتی ہے اور نہ ہی اختلاف سنہ کی تبدیلی پائی جاتی ہے۔ جیسے عبرانی میں ''یقطان'' ہے یونانی میں یہ ''جقطان'' کہلاتا جبکہ عربی میں ''قحطان'' ہے۔(10) اب لے دے کر قدیم دستاویز ''رگ وید'' رہ جاتی ہے جو 1200 ق م سے لے کر 1000 ق۔م کے دوران رچائی گئی ہے جس میں اس شہر کا ذکر ہے۔(11)

پھر مؤلف ''تاریخ ملتان'' نے اسی صفحہ 18 پر ایک اور روایت درج کی ہے کہ جس کے الفاظ اس طرح ہیں ''تاج الدین مفتی کی غیر مطبوعہ ''تاریخ پنجاب'' میں جو 1868ء میں لکھی گئی اور جو مسٹر احمد ربانی کے قلمی کتب خانے لاہور میں موجود ہے، یہ روایت درج ہے کہ ''نوح علیہ السلام کے طوفان کے وقت ملتان آباد تھا۔'' یہ روایت بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ لکھ دے کہ حضرت آدمؑ اپنی شریکِ حیات حواؑ کو تلاش کرتے کرتے ملتان کے راستے سرزمین عرب پہنچے۔ کیا یہ بات تاریخ کا حصہ بن سکتی ہے؟

رگ وید کے ادھیائے (باب) 7 اور انواک (جزو) 3 اور منتر (اشلوک) 3 میں اس علاقے کا نام ''مولی اتان'' لکھا ہے اس منتر کا ترجمہ اس طرح ہے ''اگنی دیوتا - مولی اتان سے ہم کو اناج دلا''(14) ہندی میں 'مولی' اونچی جگہ کو کہتے ہیں اس سے یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے باسی پانی کے گرد آباد تھے اور وہاں کاشتکاری کرتے تھے اسی لیے دیوتا سے مولی اتان کے علاقہ سے اناج حاصل کرنے کی دُعا کرتے ہیں۔

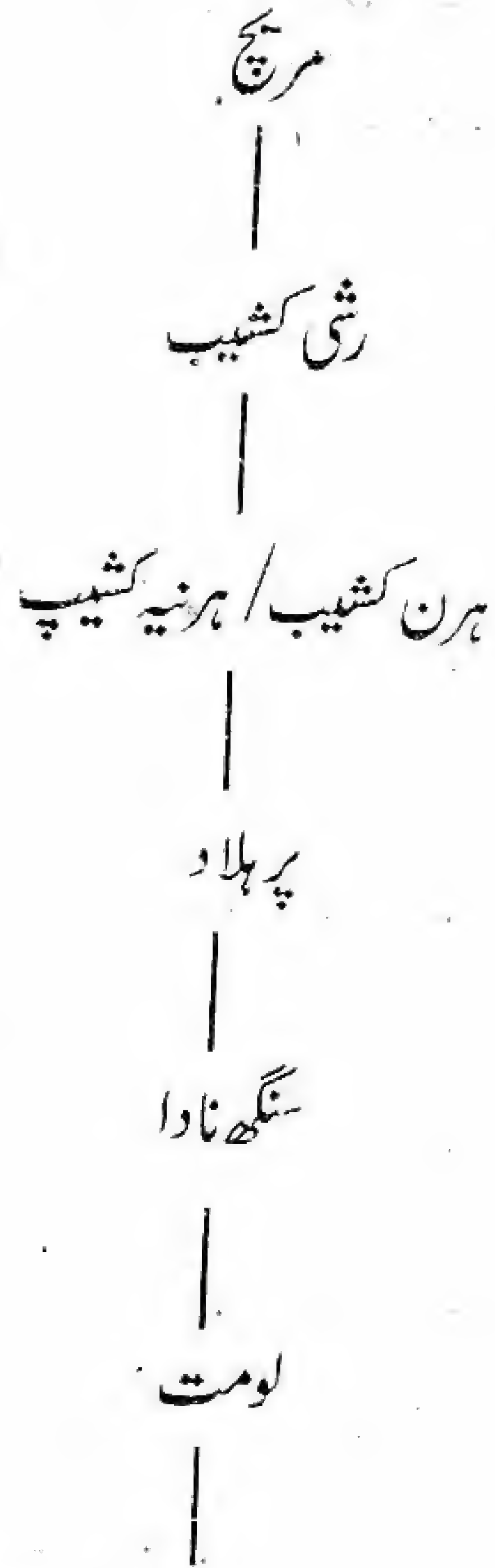
احمد نبی خان، البیرونی کے حوالے سے دلائل دیتے ہیں کہ کشمیری نژاد ات پال اپنی کتاب مسمتھا/مسمیتا میں لکھتے ہیں کہ اس شہر کا نام تبدیل ہوتے ہوتے خصوصاً ''یگ'' کے دوران ہنس پورہ پڑ گیا (13) سچیدہ نندہ اپنی ڈکشنری میں لکھتے ہیں کہ ہندو جغرافیہ کے مطابق بعہدِ اساطیری راجہ پرتھو نے تمام زمان کے ساتھ حصے کیے اور ہر حصے کا علیحدہ نام رکھا جس میں ایک حصے کا نام ''جنبو دیپ'' تھا۔ سنسکرت میں ''جنبو دیپ'' کے معنی بھرت ورش (اقلیمِ بھارت) کے ہیں۔ بھارت ورش میں دریاؤں کے کنارے جہاں آریہ بھرت پرش رہتے تھے ان کے ماول ستھ (مہاراج استھان) ہرے پاپا، والستھا (ویل استھان) اور نرماتی (نرمتی) شامل ہیں۔(14)

مذکرہ حوالے کی وضاحت کرتے ہوئے مرزا ابن حنیف رگ وید کے ایک منتر کا حوالہ دیتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے ''تباہ شدہ شہر 'ویل استھان' میں جادوگرنیوں کے طاقتور گروہوں کو برباد کر (15) اس سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ موجودہ ملتان ویدک دور میں کسی اور نام سے موجود تھا مگر منشی عبدالرحمٰن کا تاریخ ملتان کے صفحہ 18 پر یہ کہنا کہ نوح علیہ السلام کے طوفان کے وقت ملتان آباد تھا درست نہیں ہے۔ کیونکہ نوحؑ کے طوفان کا تعین نہ تو قرآن کریم سے ہوتا ہے اور نہ ہی کسی اور کتاب میں زمانی ثبوت ملتا ہے۔ طوفان تو ضرور آیا تھا جس نے روئے زمین کی ہر شے کو

ڈبو دیا تھا(16) مگر اُس وقت ملتان کے وجود کے بارے میں ثبوت نہیں ملتا۔ تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ جس طرح انسان کی ابتداء کے وقت کا اب تک طے نہیں ہو سکا اسی طرح یہ بھی طے نہیں ہو سکا کہ طوفانِ نوحؑ کب آیا تھا۔ پاک و ہند میں تہذیب کا آغاز تقریباً 5000 ق م میں ہوا لیکن اس سے بیشتر کے آثار نہیں ملتے۔

ابنِ حنیف کا کہنا ہے کہ ''میں ان حضرات کی معصومانہ غلطی دور کرنا چاہتا ہوں جو ملتان کو لاکھوں برس پرانا شہر سمجھتے ہیں۔ یہ سب اساطیری روایتیں ہیں جن کا حقیقی علمی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں، علمی و اثریاتی حقائق کی دنیا میں اس قسم کی مضحکہ خیز اور بے سروپا باتوں اور دعووں کی کوئی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔''(17)

منشی عبدالرحمن خان صفحہ 22 پر لکھتے ہیں کہ ''ہندوؤں کی دیومالا کے مطابق برہما کے لڑکے کشپ نے اس شہر کو آباد کیا اور اس کا نام کشپ پورہ تجویز ہوا۔'' یہاں بھی منشی صاحب کو تسامح ہوا ہے پرانوں کے مطابق برہما جی کا بیٹا رشی کشیپ تھا نہ کہ کشپ رشی کشیپ کا شجرہ نسب اس طرح ہے:



راجہ بالی (18)

بھگت پرہلاد ہرناکشیپ/ ہرنیہ کشیپو کا بیٹا تھا نہ کہ رشی کشیپ کا (ہندی میں ہرنیہ کے معنی نور، روشنی وغیرہ ہیں اور کش/ کیش سورج کو کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں چمکتا سورج۔(19)

بقول منشی عبدالرحمن خان جب ہرنیہ کشیپ کو قتل کر دیا گیا تو پرہلاد کو حاکم بنا دیا گیا۔ اُس کی پاکیزہ سیرت وجہ سے اس شہر کا نام ''پرہلاد پورہ/ پرلہلاد پرہ'' رکھ دیا گیا۔ آگے لکھتے ہیں کہ پرہلاد کے پوتے کے مخالف ''سنبہ'' اس کا نام سنب پورہ رکھ دیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوؤں کے بھگوان کرشن جی کے بڑے بیٹے کا نام ''سا

تھانہ کہ ''سنبہ'' جس نے ہر دو جانب سندھ دریا پر قبضہ کیا تھا جس نے اپنے نام پر شہر کا نام سنب پورہ رکھا۔(20)

منشی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ سنسکرت کی پرانی کتابوں میں اس شہر کا نام ہنس پورہ اور بھاگ پورہ بھی ملتا ہے مگر انہوں نے پرانی کتابوں کے ماخذات نہیں دیئے جو فنِ تاریخ کے منافی ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے پاس تاریخی سند وید ہیں رگ وید میں اس شہر کا نام ''ملی ناتھ'' دیوتا کے نام سے شروع ہوا۔(21) تاریخ راجستھان کے مطابق وید دور میں تین دیوتا ہوئے ملی ناتھ، جالندھ ناتھ اور بال ناتھ۔ ملی ناتھ کا جہاں مندر بنایا گیا اُس کا نام ''ملی اشوتھ'' تھا اشوتھ کے معنی پیپل کا درخت ہے، یہ لفظ بگڑتے بگڑتے اشوتھان، پھر استھان بن گیا(22) اسی طرح اس شہر کا نام ملی استھان جو بعد میں صوتی انحطاط کی وجہ سے ملتان بن گیا۔

جان ڈنلپ نے ''مولتان'' نامی کتاب میں لکھا ہے کہ سر الیگزینڈر برنس کے بیان اور شبہ کے مطابق مقامی باشندے اُسے ''ملی تھان'' قرار دیتے ہیں (23) اب سوال اُٹھتا ہے کہ بیان اور شبہ کو تاریخ کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ روایت کہاں تک تاریخ کا حصہ تسلیم کی جا سکتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سرزمین عرب کو جاتے ہوئے یہاں ٹھہرے تھے۔ قیام کے دوران جو اولاد پیدا ہوئی اُس نے اس شہر کو آباد کیا۔ تاریخ تو سند مانگتی ہے سرا طلب کرتی ہے۔

حوالہ جات:

1۔ تاریخ التاریخ، السخاوی، شمس الدین بن عبدالرحمٰن، ترجمہ ڈاکٹر سیّد محمد یوسف، مرکزی ادبی بورڈ لاہور، 1968ء ص27۔

2۔ خطبۂ صدارت شعبہ تاریخ ہند، از از منہ وسطیٰ تا 1526-1206ء ندوی، سلیمان سیّد، دہلی، 1945ء، ص51

3۔ میونٹی رپورٹ، جلد V، حصہ دوم، پال ای جے، کلکتہ، برٹش گورنمنٹ پریس کلکتہ، 1946ء ص161

4۔ کمپنی بہادر کی حکومت، باری علیگ، محمد بشیر اینڈ سنز لاہور، 1970ء ص172

5۔ وی آرایٹ دی ایج، بوٹا سنگھ، بھارت ورش پرکاشن، دہلی، 1969ء ص199

6۔ بھارت کے دفاعی اخراجات کے نام پر اصراف، تیواڑی جے سی، ترجمہ اور عالم، لکشمی داس پرنٹنگ پریس انبالہ، 1980ء، ص31

7۔ قرآن کریم پارہ 26 سورۃ الحجرات آیت نمبر 6

8۔ تاریخ ملتان، عبدالرحمٰن، منشی، عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ ملتان، 2000ء ص18

9۔ تاریخ ارض القرآن، جلد اوّل، ندوی، سلیمان سیّد، دارالاشاعت کراچی، 1975ء، ص46

10۔ بیان اللسان، قاضی زین العابدین، سجاد میرٹھی، دارالشاعت کراچی، 1989ء، ص143

11۔ تاریخ قدیم ہندوستان، ترپاٹھی، رماشنکر۔ ترجمہ سیّد تخی حسن نقوی، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، 2003ء

ص43
12۔ رگ وید، آدی بھاشہ، ترجمہ لکشمن آریو پد پشک، آریہ ساہتہ پشکالیہ دہلی، 1933ء ص143
13۔ ملتان ہسٹری اینڈ آرکیٹکچر، خان، احمد نبی، اسلامیہ یونیورسٹی، اسلام آباد، 1983ء، ص1
14۔ اے ڈکشنری آف انڈین ہسٹری، سچیدہ نندہ بھٹیا چاریہ، نیویارک، 1967ء، ص132
15۔ سات دریاؤں کی سرزمین، ابنِ حنیف مرزا، کاروانِ ادب ملتان صدر 1980ء ص122
16۔ سات دریاؤں کی سرزمین، ابنِ حنیف مرزا، کاروانِ ادب ملتان صدر 1980ء ص232
17۔ سات دریاؤں کی سرزمین، ابنِ حنیف مرزا، کاروانِ ادب ملتان صدر 1980ء ص232
18۔ مہا بھارت، آر پرب، بھارتیہ ویشو پرکاش سنٹر، کلکتہ 1942ء ص104
19۔ رگ وید، ایک مطالعہ، سرسوتی، سوامی دیانند، ترجمہ نہال سنگھ، نگارشات لاہور، 2002ء، ص51
20۔ راجستھان، حالاتِ مارواڑ، جلد دوم، کپتان جیمس ٹاڈ، انڈس پبلی کیشنز، 1818ء، ص253
21۔ چنبہ گزیٹیئر، جلد III ص313
22۔ راجستھان، حالاتِ مارواڑ، جلد دوم، کپتان جیمس ٹاڈ، انڈس پبلی کیشنز، 1818ء، ص253
23۔ مولتان، (دوارنِ محاصر اور مابعد) جان ڈنلپ، ترجمہ زبیر شفیع غوری، بیکن بکس ملتان، 2002ء، ص13

(اُفتادہ تحریریں - حنیف چوہدری)



حنیف چوہدری

تاریخِ ملتان کے نئے اوراق

ملتان کی قدامت کے بارے میں مفتی غلام سرور قریشی (1828ء) اپنی کتاب ''مخزن پنجاب'' کے صفحہ پر لکھتے ہیں کہ ''ہندوؤں کا کہنا ہے کہ ملتان کا قدیم نام 'ہرناکش نگر' تھا جو اس ملک کا راجہ تھا اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا پرہلا/ پہلاد جب راجہ بنا تو اس شہر کا نام نرسنگھ پور رکھا گیا جو بعد میں پرہلاد پور بنا۔'' جبکہ 'بھگتوں کا شہر پرہلاد پور' مصنف ہردیجیت سنگھ اوترا صفحہ 91 (گورمکھی) میں لکھتے ہیں کہ ملتان کا قلعہ ایک قدیم ٹیلے کے اوپر چھ کونہ شکل کا تھا اور فوجی نوعیت کے اعتبار سے شہر کے بھی چھ دروازے تھے۔

ملتان کے دروازوں کے بارے میں اب تک جو تحقیقی کام ہوا ہے اس کا زیادہ تر انحصار تاریخ مخزن پنجاب، تواریخ ملتان اور ملتان گزیٹیئر سمیت بعض دوسرے سفرناموں پر ہے۔ ملتان کی تاریخ کے کئی مرتبین نے اپنے تحقیقی کام میں فرضی داستانوں سے بھی کام لیا ہے جس طرح تاریخ ملتان میں منشی عبدالرحمن خان نے صفحہ 18 پر ایک حدیث نبویؐ درج کی ہے کہ ''آدمؑ ہند میں سراندیپ پہاڑ پر اتارے گئے، حضرت اماں حواؑ جدہ میں اور ابلیس لعین 'میسان' میں اور سانپ اصفہان میں۔'' منشی عبدالرحمن خان نے اپنی طرف سے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ملتان کا اوّلین نام ''میسان'' تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے میسان کو ملتان کیسے سمجھ لیا۔

سیّد اولاد علی گیلانی ''مرقع ملتان'' میں لکھتے ہیں کہ 325ق م سے پہلے سکندر کی چناب اور جہلم کے اتصال پر ملی/ملھی قوم سے زبردست جنگ ہوئی تھی۔ اندریں حالات اس شہر کا قدیم نام ملھی ستھان ہونا بعد از قیاس نہیں'' گیلانی صاحب نے بھی ''قیاس'' ہی سے بات کہی ہے۔

ڈاکٹر زاہد علی واسطی اپنی کتاب ''دیکھ لیا ملتان'' کے صفحہ 51 پر لکھتے ہیں کہ منشی عبدالرحمن خان نے ملتان کا جو قدیم نام ''میسان'' لکھا ہے وہ فرسودہ روایت ہے اور اس روایت میں کوئی حقیقت نہیں۔ اس طرح ملتان کی قدامت بڑھانے کے لیے کئی من گھڑت باتیں لکھی گئی ہیں دوسرے لفظوں میں ملتان کی قدامت بتانے میں ایک مورخ نے دوسرے بڑھ چڑھ کر مفروضوں سے کام لیا ہے۔

تاریخ مخزن پنجاب، ارض ملتان، تاریخ ملتان اور ملتان ذیشان میں لکھا ہے کہ قدیم شہر کی فصیل کے چھ

بڑے دروازے تھے ان میں تین دروازے جدید شکل میں موجود ہیں۔ ان میں بوہڑ گیٹ، حرم گیٹ اور دہلی گیٹ شامل ہیں۔ باقی دروازوں کے وجود کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا ہوئے اور کیوں مسمار کر دیئے گئے اور ان تعمیرِ نو کیوں نہ ہو سکی۔

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے حوالے سے ان دروازوں کے ناموں کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کچھ نئی معلومات ملتی ہیں جو تاریخ کی دستیاب کتابوں سے یکسر مختلف ہیں۔ اس وقت ہم صرف موجودہ لوہاری گیٹ کے بارے میں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے ملنے والی معلومات درج کرتے ہیں۔

لوہاری گیٹ ذھنی رام پرتاپ گڑھی نے اپنی کتاب ''سورج کنڈ دی یاترا'' (گورمکھی) صفحہ 121 طبع 1890ء میں لکھا ہے کہ قدیم زمانے میں اس دروازے کا نام لوہا دروازہ تھا اس بازار میں بدیشی ملکوں سے لوہے کا سامان لا کر فروخت کیا جاتا تھا۔

ستیہ پال آنند نے اپنے ایک مضمون ''ملتان کے تین بڑے مندر'' (ہندی) صفحہ 67 میں لکھا ہے کہ مرزا شاہ حسین حاکم ٹھٹھہ نے جب ملتان کو اپنی حکمرانی میں شامل کیا تو اس نے لوہا دروازہ کے بازار میں کام کرنے والے کاریگروں سے آلاتِ حرب تیار کروائے تھے۔

ماسٹر شمشیر سنگھ اولک ملتانی نے اپنی کتاب ''یادوں کے بھنور'' (ہندی) کے صفحہ 121 میں لکھا ہے کہ ہجرت سے پہلے جب وہ ملتان کے آریہ سماج سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے تو انہوں نے سکول کی لائبریری میں ایک کتاب ''ملتان کے دروازے'' میں پڑھا تھا کہ قدیم زمانے میں لاہور/لہور کو جانے کے جس دروازے سے سرنگ شروع ہوتی تھی اس کا نام لوہاری دروازہ ہے۔

رام لال نابھوی نے اپنے مضمون ''پرہلاد بھگت کا شہر'' (گورمکھی) کے صفحہ 171 میں لکھا ہے کہ بھگت جی کے زمانے میں اس دروازے کا نام لوراوتی / ایراوتی تھا۔ انہوں نے اس بارے میں کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا۔ مزید لکھتے ہیں کہ رگ وید میں جن دریاؤں کے نام آتے ہیں ان میں لوراوتی / ایراوتی بھی ہے جسے آج کل راوی کہتے ہیں۔

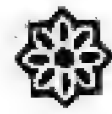
شیام سروپ نے اپنی کتاب ''سورج کنڈ دیوتا کا یوگدان'' (ہندی) میں ایک جگہ لکھا ہے کہ دیوتا کے سارے پجاری لوہا بازار سے ''ترشول'' خرید کر دیوتا کے چرن چھونے جاتے تھے۔ یہ بازار لوہے کا بازار مشہور تھا جو بعد میں لوہاری دروازے کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت کے راجہ نے ملتان کے گرد ایک فصیل بنائی جس کے چھ دروازے بنوائے۔ ہر دروازے کے نیچے ایک ایک سرنگ بنوائی جو سورج دیوتا کے چرنوں میں جا کر نکلتی تھی۔ ان دروازوں کے نام بھی دیوتاؤں کے نام پر رکھے۔ ہری دروازہ، سکی دروازہ، سینہ دروازہ، لونا/لوہا دروازہ اور تری دروازہ وغیرہ۔

سردار بخشیش سنگھ نے اپنی انگریزی کتاب ''The Bed of River Ravi'' میں اس دروازے

نام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شاہ جہاں بادشاہ کے زمانے میں شروع شروع میں قلیچ خان ملتان کا حاکم تھا۔ اس کو قندھار کے صوبے کا حاکم بنا کر شہزادہ مراد بخش کو یہ شہر بطور بخشیش دے دیا گیا۔ اس شہزادے نے شہر کے گرد ایک فصیل بنوائی اور لوہاری دروازے کے شمال کی جانب دریا پر ایک پل بنوایا (اس پل کے آثار تو آج بھی موجود ہیں) گھنٹہ گھر کے مشرقی جانب یہاں دکانیں ہیں وہاں آج کل ایک کپڑے کی دکان ہے اس دکان کے نیچے ایک پل ہے یہاں آج کل ایک موچی بیٹھتا ہے جو جوتوں کی مرمت کرتا ہے۔

اس طرح ملتان کے قدیم دروازوں کے بارے میں تحقیق کی نئی جہت سامنے آئی ہے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ مؤرخین ان مذہبی کتابوں سے استفادہ کریں۔

(اُفتادہ تحریریں- حنیف چوہدری)



حنیف چوہدری

مول استھان یا ملاں استھان

''ماہِ نو'' کے ستمبر 2003ء کے شمارے میں مخدوم الطاف حسین کے شائع ہونے والے مقالے ''ملتان کا پانچ ہزار سالہ قدیم منفرد تمدن'' کی سرخی اتنی جاذبِ نظر اور پرکشش ہے مگر سارے مقالے میں ملتان کے بارے میں مختلف محققین کے آراء کو دہرایا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے آریائی الفاظ کو صوتی جامہ پہنا کر اپنی مرضی کے معنی نکالنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ لکھتے ہیں ''لومہ'' کے معنی بڑا آدمی کے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ ''لو'' بمعنی انسان اور ''مہ'' بمعنی بڑا یا عظیم۔ پتہ نہیں انہوں نے کس ڈکشنری سے ''لو'' کے معنی انسان لیے ہیں۔ اگر ''لو'' کے لفظ کو ہندی مان لیں تو اس کے معنی ہیں پل، حصہ، ٹکڑا، دھیان وغیرہ۔ ''مہ'' جو سنسکرت کا لفظ ہے کہ معنی بڑے یا عظیم لیے جاتے ہیں۔ تو گویا اس کے معنی وقت کا بڑا حصہ یا خیال کی عظمت وغیرہ ہوئے۔ مقالہ نگار نے آگے چل کر اپنی منطق سے ایک عجیب وغریب بات لکھی ہے کہ ''بدھ مت کے رہنما 'دلائی لامہ' کا لفظ سندھ کے قدیم وجدید دور میں 'ملاں' کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔'' حالانکہ ''دلائی'' تبتی زبان کا لفظ ہے اور ''ملا'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ بیشک دونوں کے معنی ایک جیسے ہوں گے۔ مگر تبتی لفظ کو صوتی اعتبار سے مقامی معنی کا رنگ دینا تحقیق کے ضمن میں نہیں آتا۔ آگے لکھتے ہیں کہ ''ہندوؤں کے ہاں دیوتا مقدس لفظ ہے مگر وادیٔ سندھ کی زبانوں بشمول سرائیکی زبان ''دیہہ'' کے معنی جن بھوت اور شیطانی قوت کے ہیں۔'' حیرت کی بات ہے کہ دیوتا کا ''دیہہ'' سے کیا تعلق؟ دیوتا ہندی کا لفظ اور دیہہ فارسی کا، جس کے معنی جسم، بدن کے ہیں جسم یعنی بدن کا دیوتا سے نہ تو صوتی رشتہ بنتا ہے نہ لفظی مناسبت ہے۔

اسی طرح مزید لکھتے ہیں کہ سومیری لفظ 'امیا' کے معنی 'ماہر تعلیم' ہیں اور وادی سندھ میں 'امیں' اَن پڑھ کو کہتے ہیں۔ اگرچہ صاحب مضمون کا 'امیا' اور 'امیاں' کی بحث کا نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں پھر بھی وضاحت کے لیے بات بتانا ضروری ہے کہ جس کتاب کے حوالے سے یہ لفظ یعنی 'امیا' لیا گیا ہے وہ حوالہ نادرست ہے۔ اس کتاب میں اس صفحے پر یہ لفظ موجود نہیں۔ تاہم یہ وضاحت کی جاتی ہے اگر سومیری زبان میں ''امیا'' کے معنی ''معلم'' کے ہیں ہندی میں اس کے معنی آبِ حیات اور امرت دیئے گئے ہیں۔ اس ''امیا'' کا سرائیکی لفظ ''امیان'' سے لغوی، لسا

عمرانی اور علمِ بشریات سے کوئی تعلق نہیں۔

مقالہ نگار نے سومیری لفظ 'امیا' سے 'امیاں' بنایا۔ پھر 'امیاں' سے 'میاں' کے ساتھ رشتہ جوڑ دیا۔ 'اُمی' عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ''اَن پڑھ'' کے ہیں اور ''میاں'' فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی بزرگ، معزز اور عقلمند کے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ''لومہ'' اور ''ملاں'' کے درمیان رشتہ داری گانٹھی ہے۔

اسی طرح انہوں نے سومیری لفظ ''ان سی'' جس کے معنی شہر کا ناظم یا گورنر بتائے ہیں کو وادیٔ سندھ میں ''سائیں'' سے ملا دیا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق لفظ ''سائیں/سیّں'' ہندی لفظ ''ساہ'' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی نیک انسان یا بزرگ آدمی کے ہیں۔

آخر میں انہوں نے بغیر تحقیق اور حوالے سے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ (ان کے الفاظ میں) دراصل ملتان کا قدیم نام ''مول استھان'' کی بجائے ''ملاں استھان'' تھا جو بعد میں صوتی انحطاط کی وجہ سے ''ملتان'' رہ گیا۔

ہماری رائے کے مطابق یہ مقالہ چوں چوں کا مربہ ہے۔ سوائے عنوان کی دلکشی کے اور کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ اگر کسی جگہ ''ویدوں'' کا ذکر آیا ہے تو ''ویدوں'' کی زبان سے لے کر ''ویدوں'' کے زمانے تک بحث کی گئی ہے۔ اگر فلسفہ ویدانت کی بات چلی ہے تو بات کو مذاہبِ عالم تک کھینچ کر لے گئے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملتان کی قدامت کے بارے میں نئی بات/تحقیق سامنے آئے یا اس کو آگے لایا جائے۔ نہ کہ منشی عبدالرحمٰن خان کی طرح ملتان کا ڈانڈا شیطان کے گھر یعنی شیطان کی ملتان میں آمد سے ملایا جائے۔ اس وقت خطہ ملتان کی قدیم تہذیب، ثقافت، روایات، رسومات، عقائد سمیت ماضی کے تمام گوشوں سے مٹی ہٹائی جائے جس کو وقت کی دھول نے چھپا رکھا ہے۔ ابھی تک ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ملتان کے آخری فرمانروا نے جو سکہ رائج کیا تھا اس کی ٹکسال کہاں تھی؟ اس وقت کے اخبارات کون کون سے تھے؟ شہر کے اندر ''نوگزوں'' کی قبروں کے اندر کون دفن ہیں؟ اس طرح ملتان کے اندر کہاں کہاں سرنگیں ہیں؟ اب وہ کہاں گئیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

(اُفتادہ تحریریں - حنیف چوہدری)



پروفیسر ڈاکٹر کریم ملک

چہار چیز است تحفہ ملتان

ملتان قدیم الایام سے جنوبی ایشیا کا منفرد شہر ہے۔ نامور مؤرخوں نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اسے کئی اعتبار سے شہر بے مثال قرار دیا ہے۔ ہربلاد مندر جس راجہ نے قائم کیا اس کا نام ہربلاد جی تھا اور اس کے والد رجہ ہرنا کشپ طوفانِ نوحؑ کے عہد کا حکمران تھا۔ اسی راجہ نے بارہ مولا کے مقام پر ایک پہاڑی کو کاٹ کر کشمیر کی جھیل سے جو پانی نکالا اسی راجہ کے نام سے ''کشپ میر'' جو آج کشمیر کہلاتا ہے۔ اسی راجہ کی سلطنت کشمیر سے ''کشپ مور'' جو اب سندھ کا معروف شہر کشمور کہلاتا ہے پھیلی ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے ملتان، کشمیر، سندھ ایک ہی تہذیب کے پرانے حوالے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے خطے میں جس میں کشمیر بھی شامل ہے ان گنت الفاظ ایسے ہیں جو سرائیکی بیلٹ میں بھی بولے جاتے ہیں اور کشمیر میں بھی۔ مثلاً عورت، خاتون کے لیے سرائیکی بیلٹ میں لفظ ''سنواڑی'' بولا جاتا ہے۔ یہی لفظ کشمیریوں کی زبان سے بھی سنا جاتا ہے۔ اس طرح سندھ میں لفظ ''سائیں'' بڑے احترام کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہی لفظ ملتان اور اس کے مضافات میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

مشہور مؤرخ، سیاح Hiuen Tasng نے اس شہر کے دس دروازے شمار کیے ہیں اور اس شہر کو پانچ میل کے رقبہ پر مشتمل قرار دیا ہے۔ سات دروازوں کا تذکرہ تقریباً ہر کتاب میں ملتا ہے۔ جن میں پاک دروازہ، دہلی دروازہ، دولت دروازہ، لاہوری دروازہ، بوہڑ دروازہ، حرم دروازہ، حسین آگاہی دروازہ (جو اب مٹ چکا ہے) مزید اس کے چار دروازے تھے جو عہد انگریزوں کی آمد پر مسمار ہو گئے۔ ان دروازوں کا نام دیہہ دروازہ، سکی دروازہ، ہری دروازہ اور مصری دروازہ شامل تھے۔ یہ شہر دو دریاؤں کے سنگم پر موجود تھا۔ ایک طرف دریائے راوی جو اب یہاں سے تیس میل دور ہے اور دریائے چناب جو اس کے مغربی حصے میں اب بھی موجود ہے۔ ارض ملتان کے مصنف اکرام الحق نے اپنی کتاب کہ صفحہ 21 پر درج کیا ہے ابوریحان محمد البیرونی اپنی مشہور کتاب ''کتاب الہند'' صفحہ 55 ایڈن ایڈیشن میں لکھتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی میں اس کے قبل (1042ء) کے دوران یہاں کے متوطن اس کو دو لاکھ سولہ ہزار چار سو تیس سالہ پرانا سمجھتے تھے۔

آج بھی ملتان کو ساڑھے پانچ ہزار سال پرانا شہر لکھا جاتا ہے اور اس حوالہ سے مستند کتابوں اور مؤرخوں کے بیانات شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ملتان اَن گنت ناموں کا شہر ہے۔ کسی نے اسے مولانا استھان کہا کسی نے اسے مول استھان، استھان کا مطلب جگہ کا ہے۔

مول استھان کا مولتان اور پھر ملتان بننا عین حقیقت ہے۔ 1938ء میں سیّد اولاد علی گیلانی نے جو تاریخ لکھی اس کا نام انہوں 1938ء میں بھی ''مرقع مولتان'' لکھا گویا ملتان 1938ء تک مولتان کہلاتا تھا۔

ملتان کا بت

ملتان کی ایک وجہ شہرت یہاں کا وہ مشہور بت تھا جسے عربوں نے ''بیت الذہب'' سونے کا گھر کہا۔ الکامل (قاہرہ) صفحہ 112 پر ابن الاثیر لکھتے ہیں ''ملتان کے بت کی طرف مال و متاع لائے جاتے اور لوگ اسے حج کا مقام سمجھتے اور اپنے سر اور داڑھی کے بال منڈواتے اور یہ سمجھتے کہ مندر میں جو بت ہے وہ ایوب نبی کی تمثیل ہے۔''

چینی سیاح ہیون تسانگ اسے سورج دیوتا سے منسوب کرتا ہے۔ غرضیکہ ملتان سورج مندر، پرہلاد پوری کی مندروں کی وجہ سے پورے جنوبی ایشیا میں مشہور تھا اور پوری دنیا سے ہندو اکٹھے ہوتے اور یہاں اپنے من کو پوتر، پاک صاف کرتے اور پھر اپنے شہروں کی طرف چلے جاتے۔ اس شہر کی زبان صدیوں سے ملتانی ہے جو عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی سے عبارت ہے۔ اس زبان میں عربی کے الفاظ میں بصل، فوم، زنبیل، کثیف جو آج بھی ملتان کے قدیم محلوں میں بولے جاتے ہیں اور مضافات میں لفظ مسیت (مسجد)، خمیس (جمعرات) عام بولا جاتا ہے۔ اسی طرح فارسی کے الفاظ میں چاہ یوسف والا، چہل یک (41واں پڑاؤ) یا امیر خسرو کے اشعار میں:

منکہ برسر نہ نہادہ بودم گل
تو برہ بہ سرم نماد و گفتا و جل

توبرہ

جل خالصتاً ملتانی زبان کا لفظ ہے۔ اسی طرح ہندی، سنسکرت کے الفاظ بھی بکثرت ملتے ہیں مثلاً وسواس، چھنا، ادھی کار، درش مثلاً استعار میں ہندی کے الفاظ کا استعمال:

کاہو کے من کچھ بے کاہو کے من کچھ نہ سہائے
آگ پھونک سے جل اٹھی دیا پھونک سے بجھ جائے

اس شعر میں ایک دلچسپ توجیح بیان کی گئی ہے۔ آگ پر پھونک ماریں تو جل اٹھتی ہے لیکن دیا اس عمل سے بجھ جاتا ہے۔

ملتان صدیوں سے فلسفہ، دانش، علم و حکمت کا شہر ہے۔ یہاں ہر وقت گیان دھیان کی باتوں کا تذکرہ رہتا ہے اور جب یہاں اولیائے عظام مشائخ کرام کا وجود ہوا یہاں قال و حال کی مجلسیں برپا ہوگئی۔ وہی ملتان جو صدیوں سے ہندو فلسفہ کی درس گاہ تھا اب یہاں اولیائے عظام کی برکت سے شہر امان بن گیا اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے بڑے اعتماد سے کہا:

ملتان ما بہ جنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

لیکن ملتان کیا ہے اب دنیا کے جس حصے میں جائیں پہلا سوال کچھ یوں ہوتا ہے کہ ملتان کے وہ چار تحفے کیا ہیں اور پھر ملتانیوں کو بتانا پڑتا ہے:

چہار چیز است تحفۂ ملتان
گرد و گرما، گدا و گورستان

لیکن عقیدت مند ملتان کی گرد کو گردِ شفا سمجھتے ہیں۔ گرما یعنی گرمی نہ ہو تو ملتان کے کاشتکار پریشان ہو جاتے ہیں کہ اب کپاس کیسے اگے گی، آم کیسے پکے گا؟ کھجور کیسے کھائیں گے؟ ملتان کی گرمی اس خطے کی بقا کی علامت ہے اور پاکستان کے لیے خود کفالت کا اہتمام ہے۔

جہاں تک گداگروں کا تعلق ہے ان میں کئی لال، گوہر اپنی ذات میں جوہر چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ آپ کے دست سخاوت کا امتحان لیتے ہیں کہ آپ کس قدر سخی ہیں۔ یہ آپ کی پہنچان پر موقوف ہے کہ آپ کسے گداگر سمجھتے ہیں کسے چھپے ہوئے خزانوں کا مالک۔ اس کے لیے پرکھ والی آنکھ چاہیے۔

جہاں تک گورستان کا تعلق ہے وہاں اس زندہ جہان سے کہیں زیادہ آبادی دفن ہے۔ اس کے بارے میں جاننا اور اپنے کردار میں اللہ کو شامل کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ملتان علم و دانش کا گہوار ہے۔ یہاں چپہ چپہ زمین پر اس کے ماحول پر اس کی آب و ہوا پر صوفیوں کے فلسفے اور ان کی دانش بر ہانی کا عکس ملتا ہے۔ ملتان صرف سنگ و خشت کا نام نہیں نہ ہی قلعہ کہنہ قاسم باغ تک محدود تاریخ کا شہر ہے، نہ ہی الگ (Walled City) اور نہ ہی اس کے دروازے اور فنِ تعمیر تک محدود ہے۔ ملتان زندہ سوچوں، اُمنگوں، آرزوؤں کا شہر ہے۔ اس کی فضاؤں میں محبت، اخوت، تصوف اور انسان دوسری اور آخرت کی طرف جانے کا سامان ہے۔ حضرت حافظ محمد جمال ملتانی فرماتے ہیں:

سوداگر لڈ گئے کر کر ونج وپارے
کئی سوداگر لعلاں دے تے لاکھی صد ہزارے
لا تھے رہے بارتھان دے نو سو سٹھ ہزارے
رہے جمال کنگال بیکارہ کوڑے ہتھ سہارے

ملتان ایک مخصوص تہذیب کا شہر ہے۔اس میں رواداری، محبت، خلوص، رکھ رکھاؤ، ڈیرہ داری، وضع داری، مہمان نوازی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔آنے والے کے لیے محفلیں سجانا، تقاریب منانا، انہیں مقام و مرتبہ سے نوازنا ملتانیوں کا وصف ہے یہی وجہ ہے کہ ملتان کے اس طرزِ عمل کو جو بھی باہر سے آتا ہے دیکھتا ہے اور متاثر ہوتا ہے۔

ملتان بزرگوں کا شہر ہے جنہوں نے ساری زندگی رواداری میں گزاری اور اس عمل کے نقوش ملتان میں موجود ہیں۔مگر ان نقوش پہ نازاں ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی نگہداشت بھی ضروری ہے۔

(یادوں کا سفر- پروفیسر ڈاکٹر کریم ملک)



پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان درانی

ملتان کی قدیم تاریخ

ملتان کی قدامت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ملتان کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ یہ دریائے چناب کے بائیں کنارے سے چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دریائے راوی شہر اور قلعہ کی فصیل کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ شہر اور قلعہ آس پاس کی زمینوں سے چالیس فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔ (1) امیر تیمور کے عہد میں منگولوں کے حملہ ملتان 1398ء تک دریائے راوی نے اپنا راستہ نہ بدلا مگر بعد میں آہستہ آہستہ اپنا راستہ بدل لیا۔ چنانچہ دریائے راوی کی گزرگاہ آج ملتان سے 35 میل دور تلمبہ کے قریب ہے۔ ملتان کی قدامت کا ذکر یونانی مؤرخین نے کیا ہے۔ Herodotus (480ق م تا 425 ق م) اور Ptolemy اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ مزید یہ کہ Arrian جو سکندر اعظم کے ساتھ یہاں آیا تھا نے اپنی کتاب Arabasis میں یونانی لشکر کشی کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے سکندر اعظم کے حملہ ملتان فروری 325 قبل مسیح کی تفصیل بیان کی ہے جس میں ملوئی Mallois قوم کے ساتھ لڑائی میں سکندر تیر لگنے سے زخمی ہو گیا تھا۔ بعد میں اسی زخم کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ یہ لڑائی قلعہ کی فصیل کے قریب ہوئی تھی۔ قلعہ پر سیڑھی کے ذریعہ چڑھنے اور ملوہی قوم کا مقابلہ کرتے ہوئے قلعہ کی دیوار پھلانگ کر اس میں داخل ہونے کے دوران تیر لگا تھا (اس کی تفصیل ڈسٹرکٹ سٹیٹ گزیٹیرز آف دی پنجاب (پاکستان) جلد دوم، مئی 1977ء (لاہور) میں صفحات 17 تا 26 دیکھ سکتے ہیں)۔ مزید دیکھیں .Sir H Elliot's History of India Vol.1, P-139۔

ملوہی یا آج کے ملہی ملتان کے اصل باشندے تھے۔ یہ ایک بہادر قوم تھی اور انہوں نے سکندر اعظم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ سکندر اعظم پہلے تلمبہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہاں پر بھی لوکل راجہ نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔ تلمبہ فتح کرنے کے بعد دریائے راوی کے ساتھ ساتھ سیدھا ملتان پہنچا۔ راوی سیدھا بہتا تھا اس لیے یہاں پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ سکندر کو زخمی حالت میں واپس لے جایا گیا۔ اس طرح ملتان کی طاقت، ملہی قوم کی طاقت اور یہاں کے باشندوں کی بہادری تاریخ کا اَن مٹ واقعہ ہے۔ ملتان کی قدامت اور خوش حالی بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ بعد میں حوادث نے ملہی قوم کو یہاں سے نقل مکانی پر مجبور کر دیا۔ اس سلسلہ میں تاریخی اوراق خاموش ہیں۔ البتہ حیران کن

بات یہ ہے کہ آج ملہی قوم کے باشندے ملتان میں نہیں رہتے۔

سر الیگزینڈر کننگھم (Sir Alexander Cunningham) نے 1853ء اور بعد میں 1864ء میں قلعہ کہنہ پر دو مقامات پر کھدائی کروائی اور اس پر یہ راز منکشف ہوا کہ 800 قبل مسیح میں ملتان آبادی کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں ایک مہذب قوم آباد تھی۔ (2) ملتان کی اقتصادیات بڑے دریاؤں کی عطا کردہ زرخیزی کی مرہونِ منت تھی۔ اس میں دریائی آمد و رفت کے ذرائع بھی بہت اہم تھے۔ ملتان اپنی زرعی پیداوار کے لیے مشہور تھا جس نے یہاں کے لوگوں کی تجارتی تبادلے کے ذریعے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مدد دی۔ ان میں دوسرے ملکوں سے دھاتوں کا حصول بھی شامل تھا۔ آثار قدیمہ (3) کے توسط سے ملتان کے پرانے قلعے پر کھدائی نے ایک عظیم اور اہم ثقافتی مواد کو ظاہر کیا جو اپنے اصل باشندوں کی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے۔ (4) ڈاکٹر مہر عبدالحق کے مطابق پرانے قلعہ سے ملنے والے مٹی کے برتنوں نے ملتانی معدنیات کے مواد کی برتری کو ظاہر کیا ہے۔ (5) ڈاکٹر محمد رفیق مغل ڈائریکٹر جنرل پاکستان محکمہ آثار قدیمہ کی زیرِ نگرانی 1971ء میں ملتان کے مختلف حصوں اور بہاولپور کے علاقہ چولستان میں ہونے والی کھدائی سے پیتل کے زمانے کا مواد سامنے آیا جو ملتان کے اصلی باشندوں اور آس پاس کے باشندوں کی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ ابنِ حنیف (6) نے ملتان رگ وید تہذیب میں تلاش کیا ہے۔ وایو پران (Vayu Purana) اور وراہامی ہیر (کشمیری مؤرخ تھا) (Varahamihir) کی سمہتا (Samhita) کی شہادت پر (7) ابو ریحان البیرونی جو 1017ء میں ہندوستان آیا اور اسی سال ملتان بھی آیا وہ لکھتا ہے کہ سوویرا (Sauvira) کو ملتانہ (ملتان) اور جاراور (Jarawar) سے شناخت کرتا ہے۔ پروفیسر (8) ڈاکٹر احمد حسن دانی نے Sauvira سوویرا کی شناخت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کے مطابق Sauvira کا علاقہ ملتان کے قریب واقع تھا۔ اس نواحی علاقہ کے نام کی نسبت سے سرائیکی لفظ نکلا ہے۔ یہ مماثلت ملتان کی تاریخ کو ہندوستانی تاریخی کارناموں سے جا ملاتی ہے۔ جس میں حکمران کو جیادرا Jayadratha ظاہر کیا گیا ہے جو راجہ دریودھنا Duryodhana کا ساتھی تھا اور وہ درویدی کی کہانی (درویدی کا اغوا جو پانڈو کی بیوی تھی) کا ایک مشہور ولن ہے۔

> He is reputed to be the villan in the story
> of Darupadiharama. (addition of darupadi,
> the spuse of pandava)(9)

اگر الیگزینڈر کننگھم (10) (Sir Alexandar Cunningham) کی بات سچ ہے تو پھر ملتان کی تاریخ سکندرِ اعظم کے ملتان پر حملے کے زمانے 325 ق م میں تلاش کی جا سکتا ہے۔ وہ ملتان کو ملی (ملہی) یا ملوئی Malloi (malli) لوگوں کے بڑے یعنی اہم شہر سے ملاتا ہے۔ وہ لوگ یا قوم وہی ہے جسے سنسکرت ادب میں مالوہ Malova (11) کہا گیا ہے۔ اس شناخت سے (12) ڈاکٹر احمد حسن دانی قدیم شہر کے نام کو مالواستھان (Malava-sthana) کہتے ہوئے بحث کرتا ہے یعنی مالوہ قبیلہ کا شہر تبدیل ہوتے ہوئے مولستھان

(Mulasthana) کہلایا جس سے بعد میں مولتان یا ملتان بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانے زمانے میں ملتان کا اصل نام کسیاپاپورہ یا کسیاپورہ تھا۔ یہ نام اس کے اساطیری بانی کسایا Kasyapa کے نام سے منسوب تھا۔ قدیم سنسکرت ادب میں کسیاپاپورہ کے ساتھ ہنسا پورہ Hansapura، بھاگاپورہ Bhagapura اور سامباپورہ Sambapura بھی آتے ہیں۔ (یہ سب نام البیرونی کتاب الہند میں لکھتا ہے) کننگھم ان ناموں کے ساتھ پرہلادپورہ Parhladapur اور ادیاستھانہ(13) Adyasthana کے ناموں کا اضافہ کرتا ہے جس کے معنی اول عبادت گاہ ہے اور یہ نام ہندو دیوتا مترا کے مندر کو دیا گیا تھا۔ (Temple of Mitra (a Hindu god

راجہ سامبادیوا Sambadeva نے ملتان کا مشہور مندر بنوایا جہاں اس نے سورج دیوتا کا سونے کا بنا ہوا بت رکھوایا اور شہر کو اس کے نام سے منسوب کیا۔ یہاں سارے ہندوستان سے لوگ زیارت کے لیے آتے تھے اور بت پر سونا چاندی نچھاور کرتے تھے۔ مزید مذہبی رسومات ادا کرتے ہوئے سر کے بال اور داڑھیاں منڈواتے تھے۔ منتیں مانگتے اور سال کے بعد منتیں اتارتے تھے۔ یہ لوگوں کی مذہبی رسومات تھیں۔

البیرونی (14) سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان 1017ء میں آیا۔ دیگر مقامات کے ساتھ ساتھ ملتان میں بھی قیام کیا۔ البیرونی ایک کشمیری اُتپالا Utpala کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ ملتان کا پہلے نام کشیپ پورہ Kasyapapura تھا۔ یہ سب کچھ اُتپالا نے اپنے کتاب سمیتا Samitha میں لکھا ہے۔ پھر ملتان بھاگاپورہ Bhagapura کہلایا۔ اس کے بعد سامباپورہ Sambapura بنا۔

آخر میں مولستھانہ Mulasthana کہلایا۔ مولا کے معنی اصل یعنی جڑ یا خالص کے ہیں اور ستھانہ کے معنی جگہ کے ہیں۔ اس طرح یہ خالص جگہ کہلائی۔ یونانی مؤرخین (15) Herodotus اور Ptolemy اسے کاسیاپورس Kasapuros کہتا ہے جبکہ پٹمالی اسے کاسپیرا Kaspeira لکھتا ہے۔ اس کا محل وقوع بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دریائے راوی Rhuadis (راوی کا پرانا نام) کی گولائی کے ساتھ ساتھ واقع ہے۔ مزید یہ کہ اس کی حدود کشمیر سے متھرا (16) تک پھیلی ہوئی تھی۔ سندھ کے حاکم چچ کے زمانے میں مشہور چینی سیاح ہیونگ تسانگ (17) اکتوبر 641ء میں سندھ سے ملتان آیا۔ چنانچہ اس نے اپنے سفرنامہ میں مولستھانہ پورہ (سورج دیوتا کا شہر) کا ذکر کیا ہے۔ Mulasthanapura چینی سیاح نے مترا کا سونے کا بت بھی دیکھا جسے بہت قیمتی کپڑے پہنا کر مندر میں رکھا گیا تھا اور ہندوستان کے سارے شہزادے اس کے لیے قیمتی تحائف بھیجا کرتے تھے۔ شہر کو مولوسان پولو Mu-lo-san-pu-lu لکھتا ہے۔ جس کا ترجمہ مولستھانہ پورہ ہے۔ چینی سیاح کے مطابق یہ 4000 لی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا پایہ تخت 30 لی پر محیط ہے۔ یہ بڑا آباد اور خوشحال شہر ہے۔ (18) پنجاب ریاست چیکا (Cheka (Tse-kia کا باجگزار ہے مگر اندرونی طور پر آزاد ہے۔ سونا اگلتی زرخیز زمین ہے دریاؤں کی وجہ سے زراعت وافر ہے۔ راجہ اور لوگ بہت خوشحال ہیں۔ ایماندار اور مہمان نواز ہیں۔ باکردار اور لوگ ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا قابل برداشت ہے۔ لوگ علم دوست ہیں اور اچھائیوں کی قدر کرتے ہیں۔ بہت سے

لوگ ارواح کے لیے قربانیاں دیتے ہیں اور بدھ مت کے لوگ تعداد میں کم ہیں۔لیکن مذہبی رواداری ہے۔ یہاں دس کے قریب دھرم شالہ Sangharamas ہیں جو زیادہ تر ویران ہیں۔ یہاں پر پروہت بہت کم تعلیم حاصل کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے سامنے کوئی علمی مقصد رکھتے ہیں۔ یہاں دیوتاؤں کے آٹھ مندر ہیں جہاں مختلف طبقوں کے لوگ رہتے ہیں۔ یہاں سورج دیوتا کا ایک مندر ہے جسے بہت خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا ہے۔سورج دیوتا کا بت سونے کا ہے اور اس پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔اس کی روحانی نظر رازدارانہ انداز میں ظاہر ہوتی ہے اور اس کی روحانی طاقت سب کے لیے ہے۔عورتیں وہاں ساز بجاتی اور بتیاں روشن کرتی ہیں اور خوشبو بھی عقیدت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ یہ رسومات شروع سے جاری ہیں۔ بادشاہ اور شاہی خاندانوں کی خواتین اور رؤسا کبھی بھی دیوتا کے حضور جواہرات اور قیمتی پتھر پیش کرنا نہیں بھولتے۔ یہاں ایک مہمان خانہ بنایا گیا ہے جہاں ہر وقت مہمانوں اور غریبوں کے لیے طعام و قیام کا خاطر خواہ بندوبست ہوتا ہے۔ بیماروں کے لیے ادویات کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ ساری دنیا سے لوگ یہاں آتے اور دُعائیں مانگتے ہیں۔ یہاں ہر وقت ہزاروں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ مندر کے چاروں اطراف تالاب ہیں اور پھولوں کے باغات ہیں جہاں گھومنے سے سکون ملتا ہے۔چینی سیاح (19) کا یہ بیان ملتان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملتان اندرونی طور پر آزاد تھا۔اس کی مذہبی مرکزیت کی وجہ سے ملتان کو عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ کبھی پنجاب اور کبھی سندھ کو باج ادا کرتا ہوگا کیونکہ اس کی مالی خوشحالی سندھ اور پنجاب کے حکمرانوں کو کھٹکتی ہوگی اس لیے چینی سیاح اسے کسی حد تک آزاد دیکھتا ہے۔(20)

چچ نامہ (21) کے مطابق ملتان سندھ حکومت کے چار صوبوں میں سے ایک ہے۔ راجہ رائے سہرا اور اس کے بیٹے رائے ساسی کے اقتدار میں ان کا باج گذار تھا۔ملتان کا راجہ بھوجا رائے Bhoja Rai رائے سہرا کا رشتہ دار تھا۔ بھوجا رائے ایک طاقتور حکمران تھا اور عملی لحاظ سے آزاد اور خودمختار تھا۔ چچ نے بغاوت کر کے سندھ پر قبضہ کر لیا بعد میں ملتان پر حملہ آور ہوا۔ بھوجا رائے کو شکست دے کر اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ جب عرب مسلم فاتح محمد قاسم نے ملتان پر 14-713ء میں حملہ کیا تو ملتان کا حاکم راجہ کانڈا Raja Kanda تھا۔اس نے بڑی بہادری سے ملتان کا دفاع کیا۔ بالآخر ملتان فتح ہو کر مسلم سلطنت کا حصہ قرار پایا۔ (22) امیر داؤد بن نصر کو یہاں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ملتان ایک کافی بڑا شہر تھا۔شہر کے باہر فصیل تھی، فصیل کے ساتھ ساتھ چاروں اطراف خندقیں بنی ہوئی تھیں جس میں ہر وقت پانی بھرا رہتا تھا جو اس کی حفاظت کی ضامن تھی۔ عاوم الناس شہر کے اندر زمین سے 40 فٹ اونچائی پر رہتے تھے۔اسی طرح قلعہ میں راجہ قیام پذیر ہوا کرتا تھا۔قلعہ کے چاروں اطراف فصیل بنی ہوئی تھی جس کے ساتھ ساتھ خندق تھی جو پانی سے بھری رہتی تھی۔ ان انتظامات کی وجہ سے شہر اور قلعہ ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔شہر اور قلعہ کے اندر مکانات سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ روشنی کا خاطر خواہ انتظام ہوا کرتا تھا۔ شہر اور قلعہ کے چاروں اطراف مختلف دروازے تھے جن کی حفاظت کے لیے فوج مقرر تھی۔ شہر میں گلیاں سیدھی تھیں۔ شہر میں رہائش علیحدہ ہوا کرتی اور دکانیں علیحدہ ہوا کرتیں۔ راوی اور چناب کی زرخیزی کی وجہ سے پیداوار وافر تھی۔ ملتان صنعت و حرفت، تجارت،

ثقافت اور علم و داب کا مرکز تھا۔ شہر صاف ستھرا تھا۔ لوگوں کی عادات عمدہ تھیں۔ کاروبار میں تاجر ایماندار تھے۔ تمام مصنفین نے اپنی اپنی کتابوں میں ملتان کی پرامن زندگی کا ذکر کیا ہے۔

ملتان پر سب سے پہلے حملہ آور مصر کا بادشاہ اوسائرس Osiris بیان کیا جاتا ہے۔ یونانی مؤرخین ہیروڈوٹس، ڈاوڈورس، سائیوڈورس، سیکولس اور سٹرابو نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ان مؤرخین نے مصر کی سیاحت کی۔ انہوں نے پادریوں کے علاوہ پلوٹارخ سے بھی معلومات حاصل کیں۔ ان کی اطلاعات کے مطابق اوسائرس ہندوستان پر ایران کے راستہ سے حملہ آور ہوا۔(23) اور اس نے دریائے گنگا تک کا علاقہ فتح کیا۔ یوں ملتان پر بھی اس نے قبضہ کرلیا۔ اسی طرح مصر کے بادشاہ سی سائرس Sesosiris نے ہندوستان کو اٹھارویں صدی ق م میں فتح کیا۔ اس نے بھی ملتان فتح کر کے اپنا گورنر مقرر کیا جو اسے سالانہ خراج ادا کیا کرتا تھا۔(24)

ہندوستان پر پہلا ایرانی حملہ جس کا ذکر ملتا ہے فریدون بادشاہ کے عہد میں ہوا۔ یہ عظیم بادشاہ جمشید کا بیٹا تھا۔ جمشید ایران کے شہر اسطخر کا بانی تھا۔ اسے ایران کا عظیم کا بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بادشاہ Pashadadian Dynasty کا پانچواں حکمران تھا جس کا عہد 750 قبل مسیح تھا۔ ہمیں فریدون کی سلطنت کی وسعت کا اندازہ نہیں مگر پنجاب اور ملتان اس کی سلطنت میں شامل تھے۔ اسی طرح ملتان پر شاید ایرانی تاجداروں افراسیاب اور دارا اوّل کی حکومت بھی رہی۔(25)

مقدونیہ کے بادشاہ سکندر اعظم نے 326 ق م میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ ریاست امبھی کے دارالحکومت ٹیکسلا پر قبضہ کرنے کے بعد جہلم کی سلطنت کے راجہ پورس کو شکست فاش دے کر ہندوستان پر اپنا سکہ جما لیا۔ یہاں سے تلمبہ پہنچا، قلعہ تلمبہ فتح کرنے کے بعد دریائے راوی کے کنارے کنارے سیدھا ملتان پہنچ گیا۔(26) فروری 325 ق م کو ملتان شہر اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ ملہی قوم نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بہادری کے جوہر دکھائے۔ سکندر قلعہ کی دیوار پھلانگتے ہوئے تیر سے زخمی ہوا۔ یہ زخم اس کی موت کا باعث بنا۔ شہر اور قلعہ فتح کر لیے گئے مگر تاریخ میں ملہی قوم نے اَن مٹ بہادری کے نشان چھوڑے۔ یہاں کے برہمنوں نے ملہی قوم کا ساتھ دیا۔ مگر حیران کن بات یہ ہے کہ ملہی قوم آج ملتان کے کوسوں دور نہیں پائی جاتی۔ وہ یہاں سے کب نقل مکانی کر گئے اس سلسلہ میں تاریخ کے اوراق خاموش ہیں۔ ڈاکٹر آر سی مجومدار (27) (Dr. R.C Majumdar) کے مطابق دارا اور سکندر کے حملے ناکام ثابت نہ ہوئے۔ ایرانیوں کے حملے نے دریائے سندھ کے کنارے آباد صوبوں کو غالباً پہلی بار مغربی دنیا کے سامنے بے نقاب کیا اور انہوں نے یورپ کے علاقہ لیونٹ Levant کے لوگوں اور یہاں کے علاقوں کے درمیان روابط قائم کیے۔ سندھ کے تیر اندازوں نے ایرانیوں کے جھنڈے تلے پورے یورپی علاقے پر پانچ صدی قبل مسیح میں جنگیں لڑیں اور انہوں نے ہیلاس Hellas (یورپ کا علاقہ) کے علاقے کے لوگوں کے قائدوں کو ہند کی سرزمین کے ان عجیب و غریب، دلیر نڈر لوگوں سے روشناس کرایا اور اس علاقہ کی بے شمار دولت والی سرزمین سے بھی آشنا کیا۔ مزید یہ کہ ایرانی اور یونانی ہند کی سرزمین پر آباد ہوئے۔ ملازمتیں کیں اور اپنے وجود کو بہادری، لیاقت کے جوہر کی

سے روشناس کروایا۔ بقول مہاجن (28) V.D.Mahajan دریائے سندھ کے کنارے آباد لوگوں کے ایران کے تعلق سے ایک دوسرے سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ علاقہ سندھ کے عوام پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ ڈاکٹر مکر جی (29) Dr. R.K Mookerji لکھتا ہے کہ سکندر اعظم کے حملہ نے سندھ کے صوبوں میں سیاسی ہم آہنگی پیدا کی۔ پال میسن (30) آورسیل Paul Masson Oursel اپنی کتاب Ancient and Indian Civilization میں لکھتا کہ سکندر کے حملوں سے یورپ کے علاقہ میڈیٹرین Mediterrean (بحیرہ روم کے علاقہ) کی تہذیب کا سندھ صوبوں سے براہ راست تعلق قائم ہو گیا۔

چندر گپت موریہ (31) 304 قم ملتان کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا۔ یہاں یونانی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ سکندر کے ہندوستانی علاقہ کا گورنر سلوکس Seleucus نے چندر گپت سے شکست کھائی، اس نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے اپنی لڑکی کی شادی چندر گپت سے کر دی۔ غالباً یہ واقعہ 304 ق م میں پیش آیا۔ آپان Appain کے مطابق اسی طرح سلوکس اپنی عزت بچا سکتا تھی۔ (32) شیخ اکرام الحق ارض ملتان میں لکھتا ہے کہ یہ شادی ملتان میں ہوئی اور میگا تھینس (Megasthenes) یونانی سفیر جو کہ پاٹلی پتر میں تعینات تھا نے بھی اس شادی میں شرکت کی۔ چندر گپت ایک بہادر سالار تھا اور بڑا منتظم تھا۔ اس کے عہد میں زراعت، تجارت میں ملتان نے بہت ترقی کی۔ اس کے پوتے اشوک کے زمانہ میں بدھ مت ملتان میں پھیلا۔

شیخ اکرام الحق مزید لکھتے ہیں کہ بعض کرنسی سکوں کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ 150 ق م میں یونانی باختری حکومت ملتان میں قائم ہوئی۔ (33) 125 ق م میں ملتان کنشک کی سلطنت کا حصہ قرار پایا۔ اب ہندوستان کو سفید ہن قوم نے تاراج کرنا شروع کیا۔ ان کے یہ حملے 470ء سے 544ء تک جاری رہے۔ ان 74 سالوں میں ملتان پر بے شمار حملے کیے گئے۔ لوٹ مار کی گئی۔ علمی ادبی کتب نذرِ آتش ہوئی، تاریخی مواد جل کر راکھ ہو گیا اس لیے کنشک سے سفید ہن کے درمیان کے عرصہ کے واسعات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ البیرونی (34) کے مطابق بالآخر ہندو باشاہ وکرماجیت نے 544ء میں سفید ہن لشکر کو ملتان کے نواح میں کروڑ کے مقام پر شکست فاش دی۔ ملتان وکرماجیت کی ریاست کا حصہ قرار پایا۔ پھر ملتان راجہ ہرش کی سلطنت کا حصہ بنا۔ راجہ ہرش نے ہندوستان پر 606ء تا 647ء حکومت کی۔ راجہ ہرش کی موت کے بعد ہندو سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور کئی حصوں میں بٹ گئی۔ یہ سارے حصے خودمختار ہو گئے۔ عربوں کی آمد سے پہلے ملتان سندھ کا حصہ تھا۔ اور بڑا مضبوط قلعہ تھا۔ اس کی اہمیت میں فرق نہیں آیا۔

چچ نامہ (35) کے مطابق عربوں کی فتح سندھ سے پہلے سندھ کا حاکم چچ تھا۔ یہ ایک برہمن تھا جس نے سہاسی رائے راجہ سندھ کی وفات پر تخت پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ اس طرح رائے خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ سر ایلیٹ Sir H. Elliot کے مطابق یہ واقعہ 631ء میں پیش آیا۔ سندھ کے دارالحکومت آلور پر قبضہ کرنے کے بعد راجہ چچ نے ملتان کی طرف پیش قدمی کی جہاں راجہ سہاسی رائے کا رشتہ بجرا حکمران تھا۔ معرکہ میں چچ نے بجرا کے بیٹے

کوشکست دی اور ملتان پر قبضہ کرلیا۔ بجرا اپنے بیٹے کے ساتھ قنوج بھاگ گیا۔ چچ 671ء میں وفات پا گیا اس کے بعد اس کا بھائی چندر حکمران بنا۔ بیان کیا جاتا ہے چندر بدھ مت کا پیروکار تھا۔ چندر کی وفات پر 679ء میں چچ کا بیٹا راجا داہر حکمران بنا۔ یہ ہندومت کا پیروکار تھا اور اس نے اپنی بہن کو حرم خانہ میں زبردستی ڈالا ہوا تھا جس کی وجہ سے عوام اس سے نفرت کرتے تھے۔ یہ بڑا ظالم حکمران تھا۔ سمندری ڈاکوؤں کے ساتھ ہمیشہ ساز باز کر کے سمندری جہازوں کو لوٹا کرتا تھا۔ اسی لوٹ مار کے کاروبر میں مسلم عرب جہازوں کو لوٹا جس پر چند نوجوان عرب لڑکیوں نے حجاج بن یوسف کو امداد کے لیے پکارا جس کے جواب میں محمد بن قاسم کو ایک لشکر کے ساتھ سندھ راجہ داہر کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔

کھنڈرات (36) کی کھدائی سے یہ بات سامنے آئے ہے کہ ملتان مسلمانوں کی فتح سے پہلے بھی ایک عظیم تہذیبی شہر تھا۔ اس کی پرانی تہذیب میں شہریت کے آثار نمایاں ہیں۔ جو ملی جلی معاشرت پر مبنی تھی اور باہر کی دنیا سے اپنی تجارت اور کاروبار کے ذریعے خوشحال تھی۔ ملتان ایک سلیقے سے ترتیب دیا ہوا شہر تھا اور کی گلیاں سیدھی اور بہت عمدگی سے بنائی گئی تھیں۔ لوگوں کے ذاتی مکانات چھوٹی اینٹ جو موجودہ دور کی فرشی ٹائل سے مشابہ تھی سے بنے ہوئے تھے۔ اس میں سیوریج کا نظام بہت عمدہ اور صاف ستھرا تھا جو گلیوں کے نیچے سے پائپ لائن کے ذریعے گزرتا تھا اور یہ پانی دریا میں جا کر گرتا تھا۔ وہ لوگ ایک رسم الخط کے مالک بھی تھے۔ انہوں نے شہر کے اردگرد چاروں اطراف دیوار قلعہ نما بنا رکھی تھی اور ایک خندق بھی شہر کے دفاع کے لیے کھود رکھی تھی جس میں ہر وقت پانی بھرا رہتا تھا۔ شہر کی حفاظت کا عمدہ انتظام تھا۔ اسی طرح انتظام قلعہ کا بھی تھا اور وہ ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ ان کا لباس سادہ تھا۔ مرد اور عورتیں دھوتی پہنتے تھے۔ یہ اَن سلا کپڑا ہوتا تھا۔ اسی طرح اوپر کے حصے کے لیے بھی اَن سلی چادر استعمال کرتے تھے۔ سردیوں میں ایک اور اَن سلا لباس جسے بھگل یا لوکار کہتے تھے جسم کو ڈھانپنے کے لیے کام میں لاتے تھے۔ گندم کے آٹے کی روٹی لوگوں کی خوراک تھی۔ دودھ، لسی اور دہی کو بڑی رغبت سے استعمال کرتے تھے۔ لوگ گائے اور بھینس پالتے تھے۔ یہ لوگ گوشت بھی کھاتے تھے اس لیے بھیڑ بکریاں پالنے کا بھی رواج تھا۔ سواری کے لیے گھوڑا اور گدھا استعمال کرتے تھے مگر بدھ مت کی اشاعت کے بعد لوگ سبزیاں کھانے لگے۔ پانی کے حصول کے لیے کنوئیں تھے جو جگہ جگہ حکومت کی طرف سے عوام الناس کے لیے بنائے گئے تھے تاکہ لوگ پانی پی سکیں اور گھروں میں گھڑے بھر کر رکھنے کا رواج عام تھا۔ شادی کا پہلے سے طے شدہ پروگرام بنایا جاتا تھا۔ ویدوں کے زمانے میں عورت مردوں کے ساتھ برابر کی آزادی کی حامل تھی۔ اس وقت ذات پات کا سسٹم نہ تھا۔ اور لوگ برابری کی بنیاد آباد تھے۔ ذات پات کا سسٹم Epic Age میں پروان چڑھا۔ ناچ گانے میں خوشی کے موقع پر ڈھول شہنائی بانسری، تالی بجانا کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ سب تفریح کا حصہ تھے۔ بیوی تمام اُمور میں خاوند کی مدد کرتی تھی۔ گھر سربراہ مرد ہوا کرتا تھا گھر کی خوشحالی کا وہ ذمہ دار تھا۔ ملتان سورج دیوتا کے مندر کا شہر ہونے کے ناطے وادی سندھ مرکز تھا۔ ہر سال ہزاروں لوگ دور دراز کے علاقوں سے زیارت کے لیے آتے اور بت پر چڑھاوے چڑھاتے۔

سے یہاں کے حکمرانوں کو کافی حد تک مالی امداد مل جاتی۔ جنگیں عام تھیں۔ شہر کئی مرتبہ اُجڑا اور کئی مرتبہ آباد ہوا۔ اس طرح آج تک ایک زندہ شہر کی حیثیت سے قائم رہا۔

NOTES

1. Latif, S.M, The Early History of Multan, Lahore, 1963, P.1, Punjab District Gazetteers, Vol. VII, Par-A, Multan District (1923-24), Lahore, 1936, PP.1-5; its antiquity has bee discussed by Sir Alexandar Cunningham in his Anchient Geography of India, Calcutta, 1924, PP.185-188, 194; also see Cunningham, Archaelological Survey of India, Vol. V, Report for the year 1872-73, Calcutta, 1875, PP.126-130.
2. Archaeological Survey of India Vol.V. Report for the year 1872-73, Calcutta 1924. PP.126-130.
3. Ibid, PP. 126-130
4. Abdul Haq, Mahr Dr. "Multani Zaban Aur Uska Urdu Si Tauluq" Urdu Academy Bahawalpur, 1958, P.78.
5. Mughal, Muhammad Rafique, Dr. Early Harappan Cultur From Jalilpur, Archaeology, April 1974, Vol.27, No.2, PP.106-113.
6. Ibn Haneef, Saat Daryaon ki Sarzamin, Multan, October 1980, P.235.
7. Sachau, E., Alberuni's India Vol. 1, Lahore, 1962, PP. 300-302.
8. Dani, A.H., Dr., "Sindu-Sauvira" in the Journal of History and Political Scinec, Vol.II, No. I, Lahore, PP.15-25.
9. Ibid, PP. 15-16.
10. A.G.I, P.200.
11. Ray Chaudhri, H.C., Political History of Ancient India, 6th Ed. Calcutta, 1953, PP.254-255.
12. Dani, A.H., A Short History of Pakistan, Karachi, 1967, P.96.

13. A.G.I., P.196.
14. Sachau, op.cit, Vol.1, P. 298.
15. A.G.I., P.198.
16. The Early History of Multan, P.3, The Imperial Gazetter of India, Vol. XVIII, New Ed. Oxford, 1908, P.24.
17. Samuel Beal, Chinese Accounts of India, Vol.IV, Caclutta, 1958, P.463.
18. Ibid., P.463.
19. Ibid., P.463.
20. Ibid., P.463.
21. Urdu translation by Akhtar Rizvi, Hyderabad, 1963, PP.19-20.
22. Ibid., PP.337-346
23. Latif, S.M, History of the Punjab, New Delhi, 1964, P.51., Ikramul Haq, Sh., Arz-i-Multan, Lahore, 1972, PP.35,36.
24. Arz-i-Multan. P.36.
25. Ibid., PP.38,39; History of the Punjab, P.58.
26. The Imperial Gazetter of India, Vol. XVIII, P.24.
27. Majumdar, R.C. Dr., An Advanced History of India, Second Ed., London, 1961, P.68.
28. Ibid., P.68.
29. Mahajan, V.D., Ancient Indian, Delhi, 1962, P.211.
30. Ibid., P.219
31. Ibid., P.220.
32. Arz-i-Multan, P.43.
33. Ibid., P.44.
34. Yusuf, Muhammad, Brigadier, A Brief History of Multan, Lahore 1971, P.8.

35. Ibid., P.8; Punjab Distric Gazetteer, Vol.VII, Multan District, P.23.

36. Arz-i-Multan, PP.35, 303-315, 320, 322.

(تاریخِ ملتان - زمانہ قدیم سے 1947ء تک - پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان درانی)



رائے زادہ تیرتھ رام بی اے

سیرِ ملتان

المعروف بہ ملتان گائیڈ بک

آ کے دنیا سے ہر اِک شخص گزر جاتا ہے
نہیں معلوم ہمیں مر کے کدھر جاتا ہے
ہے مگر اتنا یقیں جائے گا جنت وہ ضرر
سیرِ ملتان کی اِک بار جو کر جاتا ہے

تواریخی حالات

ملتان ایک بہت مقدس اور متبرک شہر ہے جو دریائے چناب کے کنارہ پر واقع ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے اس شہر کا نام کشب پوری تھا۔ اُن دنوں یہاں راجہ ہرن کشب راج کرتا تھا اور یہ وہ تاجدار تھا جس کی سرنوشت میں کلکِ ازل نے ملتان کو از سرِ نو مقدس و دھارمک سرزمین بنانے کا سہرا لکھ رکھا تھا۔ ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا پہلاد تخت نشین ہوا۔ پرہلاد نہایت ہی دھرماتما اور نیک شخص تھا۔ اُس کا نام تواریخی صفحات میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ہندو قوم کا بچہ بچہ پرہلاد کے نام سے واقف ہے۔ کون ہے جس نے پرہلاد کا نام نہیں سنا۔ راج کاج کا کام اس نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دینا شروع کیا۔ اس کا سب سے پہلا جو کام تھا وہ تعلیم کے متعلق تھا۔ اور وہ تعلیم آج کل کی تعلیم نہ تی بلکہ اُس میں گیان، ویراگ اور بھگتی کے رموز اس طرح پنہاں تھے جیسے تلوں میں تیل۔ سب لوگ اس طرف رجوع ہوئے۔ پرہلاد کی عقل و فراست کا لوگوں کے دلوں میں سکہ بیٹھ گیا۔ اس کی پاکیزگی و بھگتی کی وجہ سے لوگوں میں بڑی عزت ہوگئی۔ اس کے راج میں خیرات خانے، یتیم خانے کثرت سے ہوگئے۔ آج ملتان کا تذکرہ لکھتے ہوئے ہماری آنکھوں میں پرہلاد کی خیالی تصویر پھر رہی ہے۔ اس پاک نفس کے حالات کہاں تک لکھیں۔ آج تک لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ بھگتی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ بعد ازاں اس کا نام نرسنگھ پوری رکھا گیا۔ (مفصل پرہلاد پوری کے ہیڈنگ میں دیا گیا ہے) جنرل سر کننگھم صاحب نے لکھا

کہ 325 قبل مسیح کے موسم سرما میں جب سکندر اعظم اس شہر سے گزرا تو ملوی قوم کے بادشاہ حکمران تھے۔ سکندر کی وفات کے بعد چندر گپت اس شہر پر حکمران ہوا اور وقت آ گیا جبکہ اسی قوم کے لوگ حاکم بن گئے جن کا ذکر ہیون سانگ و دیگر چینی سیاحوں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ وہ اپنے نوشتہ میں اس شہر کا نام ملستھان بتاتے ہیں۔

وقت یکساں نہیں رہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پرہلاد کے بعد پھر ملتان پر کسی نے اُس خوبصورتی کے ساتھ حکومت نہیں کی۔ پہلاد نے جونقشہ ڈالا تھا وہ اپنے ساتھ لیتا گیا۔ حکومت کی بنیاد متزلزل ہوگئی۔ باغ سلطنت خزاں رسیدہ ہوگیا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اور حکمرانوں نے سلطنت نہیں کی، کی اور عرصہ تک کی مگر وہ بات جس کے لیے ملتان دوسرے شہروں میں خاص طور پر ممتاز تھا وہ صرف پرہلاد کے دم تک رہی باقی ......!

پل مارنے کی ہوئی جو دیری
سُبحان اللہ شان تیری

آٹھویں صدی اہلِ عرب نے اس شہر پر حملہ کیا اور فتح پانے کے بعد کچھ عرصہ تک حکمران رہے۔ ان کے بعد لودھی خاندان والوں نے پشاور کے راستہ ملتان پر دھاوا کیا۔ مغلیہ خاندان کی حکومت یہاں چار سو سال تک رہی۔ لیکن جب سکھوں نے زور پکڑا تو انہوں نے اسے فتح کر کے دیوان ساون مَل کے حوالے کر دیا کیونکہ یہ شخص بہت ہی دانا تھا اور اس نے رنجیت سنگھ کو خراج دینا منظور کیا۔ نہایت ہی عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ رعایا خوشحال تھی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا دیوان مول راج یہاں کا گورنر ہوا مگر 1848ء میں سکھوں کی دوسری لڑائی کے وقت یہ علاقہ سرکار انگلشیہ کے ہاتھ آیا اور اہالیان ملتان امن و آسائش کے ساتھ زیرِ سلطنت برطانیہ زندگی بسر کرنے لگے۔

جنرل ریمارکس

صوبہ پنجاب میں ملتان بلحاظ آبادی تیسرے درجہ کا شہر کہا جاتا ہے اور باوجودیکہ انقلاب مجموعی طور پر ایک مشہور تجارتی مرکز ہے۔ ایک وقت تھا جب اس کی تجارت کا ملک میں سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ سندھ، بلوچستان، جنوبی افغانستان و خراسان میں اس کی تجارت کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔

جوں جوں لوگ بے پرواہ ہوتے گئے توں توں تجارت دن بدن معدوم ہوتی گئی۔ لاہور سے کراچی جاتے ہوئے یہ سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن ہے اور اس کی گزشتہ اور حال کی عظمت و شوکت دیکھنے کے لیے یہاں پر سیاحوں کا اترنا نہایت مفید ہوگا۔ اُن کو چاہیے کہ وہ پرہلادنگری کو دیکھیں۔

یہ شہر ایک اونچے مقام پر واقع ہے اور چاروں طرف خندق کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ شہر کی فصیل اب جابجا سے بوسیدہ ہو گئی ہے تاہم اس بات کی شاہد ہے کہ یہ شہر جتنا فصیل کے اندر ہے 4200 فٹ لمبائی اور 2400 فٹ چوڑائی میں ہوگا اور اس کا دائرہ قریباً تین میل ہے اور حدود میونسپلٹی کے اندر 5 میل کا ہے۔ اس کے چھ دروازے ہیں۔ اسٹیشن سے شہر کو آتے ہوئے پہلے حرم دروازہ ملتا ہے اور وہاں سے پچھم کی طرف چلتے ہوئے بوہڑ

دروازہ، لوہاری دروازہ، دولت دروازہ، پاک دروازہ اور دہلی دروازہ ہیں۔

چھاؤنی

شہر کے مغرب کی طرف چھاؤنی ہے جو کہ شہر سے دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ چھاؤنی کا اسٹیشن شہر کے باہر بہت وسیع و کشادہ ہے۔ سوداگروں کی عالیشان دو رُویہ قرینہ سے دکانیں ہے۔ اسٹیشن جدا ہے۔ صدر بازار کی سیر بالخصوص شام کو دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ فوجی افسر اس بازار میں خرید و فروخت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چھاؤنی کے اسٹیشن اور اس بازار کے درمیان پوسٹ آفس، ٹیلیگراف آفس (ڈاکخانہ و تارگھر) اور دو برف خانے ہیں۔ تارگھر کے ساتھ ساتھ ایک سڑک کمپنی باغ کو جاتی ہے۔ یہ باغ قابلِ دید ہے۔ انگریز عموماً شام کو اس باغ میں سیر و تفریح کی غرض سے آتے ہیں۔ چھاؤنی صدر بازار کے نزدیک ہی ایک بڑا بھاری پریڈ گراؤنڈ ہے جہاں فوجی آدمی ورزش کرتے ہیں۔ اس گراؤنڈ کے باہر ایک گرجا بھی بنا ہوا ہے جو نہایت ہی عمدہ ہے۔

عادات و خورد و نوش باشندگان

عموماً یہاں کے لوگ تو نہایت ہی خلیق ہیں۔ شیریں زبان اور ہمدردی کا ورثہ پرہلاد جی کے وقت سے دمساز ہیں اور نسل بہ نسل منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ مہمان نوازی گھٹی میں پڑی ہے۔ یہاں کے لوگ سیر و تماشوں کے عام طور پر شائق ہیں اور جب کبھی کوئی میلہ ہوتا ہے تو ایک جم غفیر نظر آتا ہے۔

یہاں رام تیرتھ، سورج کنڈ، بدھلہ سنت، شیر شاہ، باوا صفرا، مخدوم شیر، رام چوترہ، شمس تبریز پر میلے ہوا کرتے ہیں۔ چند سال گزرے جبکہ ان میلوں پر طوائفوں کے گانے عام ہوا کرتے تھے لیکن اب کسی قدر بند ہیں۔ بعض اشخاص مرغ، بٹیر وغیرہ کو پالنے کے بعد ان کی لڑائی کا تماشہ دیکھتے ہیں جو قابل دید ہوتا ہے۔ نوجوان فٹبال، کرکٹ، کبڈی اور ٹینس کے زیادہ شوقین ہیں۔ چھوٹے بچے عموماً گلی ڈنڈا کھیلتے دکھائی دیتے ہیں اور چھوٹی لڑکیاں گڈیاں بنا کر کھیلتی ہیں۔ اَن پڑھ لوگوں کی کسی مُیلہ یا شادی کے موقع پر جھومر دیکھنے کے قابل ہے۔ شہر کے باہر عموماً کچے مگر ہوادار اور کھلے مکانات بنے ہوئے ہیں جن میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں۔ اور شہر کے اندر کے مکان کئی منزلہ اور تنگ و تاریک ہیں جن میں ہندو صاحبان رہائش رکھتے ہیں۔ بلحاظ پوشاک ہندو اور مسلمانوں میں ایک نمایاں فرق ہے۔ سن رسیدہ پرانے زمانے کے ہندو چُغہ، پگڑی، انگرکھا اور دوپٹا پہنتے ہیں اور مسلمان شلوار، لونگی استعمال کرتے ہیں۔ مسلمان خواہ غریب ہوں یا امیر مٹی کے برتن استعمال کرتے ہیں مگر ہندو دھات کے۔

مسافر خانے و ہوٹل

معمولی مسافروں کے عارضی قیام کے لیے نہایت ہی معقول انتظام ہے۔ اہلِ اسلام کے لیے پھاٹک ریل کے قریب اسٹیشن سے چند قدموں کے فاصلہ پر سیّد خدا بخش کی سرائے ہے اور ہندوؤں کے لیے اسٹیشن کے بالمقابل ایک سرائے لالہ سلامت رائے کی ہے اور ایک پھاٹک کے دوسری طرف بھائی سکھانند پاٹنی کی ہے۔ سندھ ۔

یاتریوں کے لیے بھی ایک مندر بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دولت دروازہ کے پاس ہی ایک سرائے موجود ہے جو ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی یادگار میں بنائی گئی تھی۔ عمارات مثلاً شوالے اور دھرم سالہ وغیرہ شہر کے اندر موجود ہیں جہاں مسافر آ کر ٹھہرتے ہیں۔ دھرم سال بھائی دیال واقع اندرون دہلی دروازہ اور شوالہ دیوان ساون مل صاحب بیرون بوہڑ دروازہ قابلِ ذکر ہیں۔ کھانے پینے کے لیے شہر میں نہایت ہی اچھا انتظام ہے۔ ہر قسم کے کھانے والوں کے لیے شہر میں مکلّف کھانے مل جاتے ہیں۔ قابل استطاعت و معزز اشخاص کے لیے اچھے اچھے ہوٹل بھی موجود ہیں۔ کمرشل ہوٹل سول لائن پر اور ڈاک بنگلہ نزد اسٹیشن ہاسپٹل چھاؤنی ملتان قابلِ ذکر ہیں۔

آب و ہوا

ملتان کی آب و ہوا نہایت ہی اچھی ہے۔ موسم سرما یہاں کا نہایت ہی خوشگوار موسم ہے اور بمقابلہ دیگر اضلاع پنجاب یہاں کی سردی ناگوار نہیں ہوتی اور زیادہ دیر تک رہتی ہے۔ ماہ اپریل سے کسی قدر گرمی شروع ہوتی ہے۔ اپریل اور مئی کو صبح و شام کافی خوشگوار ہوتی ہے۔ اگر چہ دوپہر کو باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ جون، جولائی اور اگست میں گرمی کافی شدت سے پڑتی ہے لیکن راتیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ یہ ضلع بمقابلہ دیگر اضلاع بہت صحت بخش ہے۔ ہیضہ، پلیگ وغیرہ کا 1909ء تک اس شہر میں نام ونشان بھی نہ تھا اور اُس وقت سے اب تک صرف ایک دفعہ ہیضہ اور دو دفعہ پلیگ نمودار ہوئے ہیں۔ موسمی بخار کا کسی قدر زور رہتا ہے۔ اس لیے سیر کرنے والے لوگوں کے لیے نومبر سے اپریل تک بہت ہی اچھا اور خوشگوار موسم ہے۔

متعلقہ سواری

اسٹیشن چھاؤنی پر بند گاڑی، فٹین، ٹانگہ، ٹمٹم عام مل جاتے ہیں۔ مگر شہر کے اسٹیشن پر صرف چہارم درجہ کی گاڑی ملتی ہے اور یہاں کے لوگ چونکہ ٹانگہ اور ٹمٹم میں اکثر سوار ہوتے ہیں اس لیے صرف اُن کے ہی نرخ درج کیے جاتے ہیں۔

ٹمٹم	ایک گھنٹہ یا کسر کے لیے	00/4
	اوّل گھنٹہ کے بعد ہر ایک گھنٹہ کے لیے	00/3
ٹانگہ	ایک گھنٹہ یا کسر گھنٹہ کے لیے	00/6
	اول گھنٹہ کے بعد ہر ایک گھنٹہ کے لیے	00/4
	شہر سے ریلوے اسٹیشن تک	3 پیسہ فی شخص یا 2 سالم ٹمٹم
	شہر سے ضلع کچہری تک	3 پیسہ فی شخص یا 2 سالم ٹمٹم
	شہر سے نواں شہر تک	3 پیسہ فی شخص یا 2 سالم ٹمٹم
	شہر سے باغ عام خاص تک	3 پیسہ فی شخص یا 2 سالم ٹمٹم

ریلوے اسٹیشن چھاؤنی سے دفتر ضلع تک　　1 پیسہ فی آدمی یا 2 سالم ٹمٹم

ریلوے اسٹیشن چھاؤنی سے شہر تک　　1 پیسہ فی آدمی یا 2 سالم ٹمٹم

ریلوے اسٹیشن چھاؤنی سے باغ عام خاص تک　　1 پیسہ فی آدمی یا 2 سالم ٹمٹم

شہر کے ہر ایک دروازہ پر سوائے پاک دروازہ اور دہلی دروازہ کے گاڑیاں وغیرہ ہر جگہ مل جاتی ہیں۔ سواری کے متعلق قابل نوٹ یہ بات ہے کہ دوسرے شہروں کی طرح یہاں گاڑی میں چار آدمی نہیں بیٹھ سکتے۔ بلکہ میونسپلٹی کے قواعد کے مطابق تین آدمی سوار ہو سکتے ہیں۔

بازار وغیرہ

ملتان میں یوں تو بہتیرے بازار ہیں لیکن چوک بازار کا نظارہ قابلِ دید ہے۔ اور بالخصوص ہر روز شام کو اس بازار میں اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ گزرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کے اشیاء بیچنے والے اپنی اپنی اشیاء لا کر بازار میں دکانیں لگا دیتے ہیں اور کئی ہاتھ میں لیے ہوئے چکر لگاتے ہیں۔ کئی خوانچے والے ڈبل روٹی، بسکٹ، نان خطائی کی آوازیں دے رہے ہیں۔ درزی کپڑے اور پارچات کے سینے کا کام کر رہے ہیں۔ موچی جوتیاں ہاتھ میں لے کر گھوم رہے ہیں اور ''لالہ جی''، ''او سائیں''، ''او سائیں'' کہہ کر پکار رہے ہیں۔ پان فروش دکانوں میں آئینہ لگائے اس کی شان کو دوبالا کر رہے ہیں۔ پانی بیچنے والے لیمونیڈ، سوڈا روز، آئس کریم وغیرہ بوتلوں کے پیچھے چراغ رکھ کر عجب لطف دکھا رہے ہیں۔ پھول فروش زبردستی گلے میں دو ہار ڈالتے ہیں۔ میوہ فروش حد سے زیادہ چلا رہے ہیں۔ ان کے الفاظ قابلِ شنید ہیں۔ ''اوے ڈوآنے دا پا تاں میوہ گھدی ونجے ہا'' تھوڑی دور آگے چل کر گول گپے والے اپنے گاہکوں کا مجمع لگائے ہوئے ہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان اپنی چھری جیسی چلتی زبان سے لوگوں کو دوا لینے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔ سرمہ کی سلائی مفت چل رہی ہے، بساطی اپنی بساط لگائے ہوئے ہیں۔ چھولے والا اپنی گاڑی کو چلا رہا ہے اور اس کا شاگرد گاڑی سے چھولے نکال کر خریداروں کو جھٹ پٹ دے رہا ہے۔ غرضیکہ ہر کوئی اپنی دھن میں مست ہے۔ گائیں بازار میں چل پھر رہی ہیں اور لوگ انہیں گھاس وغیرہ کھلا رہے ہیں۔ اس کے نزدیک بازار اندھی کھوئی ہے جہاں لاکھوں روپیوں کا بیوپار ہوتا ہے۔ بازار نرسنگھ پوری، کپ ونگری گراں پیپل ساون کپور، مچھی ہٹ اور دیگر تمام دروازہ کے بازار چوڑے ہیں مگر چوک بازار جیسا کوئی بازار چوڑا نہیں ہے۔ گلی کوچے اکثر تنگ اور میلے ہیں مگر مکانات سب پختہ ہیں۔ روشنی اور صفائی کا انتظام کمیٹی کی جانب سے ہے۔

تجارت

ملتان میں غلہ گندم، نیل، روئی وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ تمام اجناس ولایت کو براستہ کراچی بھیجے جاتے ہیں اور وہاں سے ولایتی مال ہر قسم کا یہاں آتا ہے۔ اگر کراچی کو اس کی بندرگاہ کہا جائے تو کوئی بیجا نہ ہوگا۔ چوک بازار کے نزدیک ہی غلہ منڈی ہے جہاں ہر قسم کے جنسوں کا کاروبار ہوتا ہے اور اس جگہ سے را

برادرس، سنڈے پیٹرک، والٹر اینڈ کو وغیرہ ایجنسیاں جنس خرید کر کے ولایت اور دیگر ملکوں کو روانہ کرتی ہیں۔ سب سے زیادہ تجارت کچا چوڑا اور ہاتھی دانت کے اشیاء کی ہوتی ہے۔ افغانستان اور بلوچستان کے نزدیک ہونے کی وجہ سے پٹھان لوگ ہر قسم کا میوہ فروخت کرنے کو لاتے ہیں لیکن اب کسی قدر یہ تجارت معدوم ہو رہی ہے۔

علاوہ زمین ملتان سے مال قالین دریائی، گلبدن ورنگدار ریشمی کپڑے، صابون، تیل، مصری، مٹی کے برتن اور مینا کاری کا سامان باہر جاتا ہے۔ یہ شہر نقاشی یعنی (کنگری) کے کام کے لیے نہایت مشہور ہے مگر اب اس کو بھی کسی قدر زوال ہو گیا ہے۔ بمقابلہ دیگر اضلاع پنجاب یہاں کھجوریں اور آم بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔

کارخانجات

ملتان میں اکثر کپاس کے کارخانہ جات ہیں جو کہ براستہ سورج کنڈ واقع ہیں۔ آٹا پیسنے کی مشین شہر کے ہر ایک دروازہ کے اندر و باہر موجود ہیں۔ برف کے کارخانے چھاؤنی میں پائے جاتے ہیں۔ کارخانہ مینا کاری اندرون بوہڑ دروازہ اور کالے منڈی میں ہیں اور ان کارخانوں سے مینا کاری کا مال دور دراز ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔

سکول مدرسہ اور ہسپتال

گورنمنٹ سکول: حرم دروازہ کے باہر گورنمنٹ ہائی سکول بنا ہوا ہے جس میں کہ انٹرنس تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں اب تقریباً 600 لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ سکول کی بلڈنگ سرکاری ہے۔ عمارت عمدہ ہے اور قابلِ دید ہے۔

ڈی اے وی سکول: دیانند اینگلو ویدک ہائی سکول حرم دروازہ کے باہر بوہڑ دروازہ والی سڑک پر لالہ پرمانند وکیل کے مکان میں واقع ہے۔ یہ سکول لوگوں کی فیاضی کا نتیجہ ہے۔ اس میں قریباً 900 طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بانی لالہ چیتن آنند مرحوم بی اے ایل ایل بی پلیڈر تھے۔ اگر چہ یہ دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور کا حصہ ہے مگر عملی طور پر اس سے بالکل علیحدہ ہے۔ اس سکول نے پچھلے چند سالوں میں بہت ترقی کی ہے۔ اب اس کی عمارت قریب ٹھنڈی سڑک جو کچہری سے چھاؤنی کو جاتی ہے تیار ہو رہی ہے۔ اس کا بنیادی پتھر شریمان مہاتما ہنس راج جی بی۔ اے نے بتاریخ 6 نومبر 1915ء کو رکھا تھا۔ لالہ موتی رام صاحب پلیڈر سکول منیجر اور لالہ بودھ رام راج ایم۔ اے، ایل ایل بی سیکرٹری ہیں۔ یہ سکول چندہ گرانٹ اور فیس سے گزارہ کرتا ہے۔

مشن سکول: پہلے پہل چرچ مشن ہائی سکول حسین آگاہی میں واقع تھا لیکن اب اس کی نئی عمارت کچہری ضلع کے قریب تیار ہو گئی ہے اور اب یہاں سکول لگتا ہے۔ یہ عمارت ریورنڈ اے بی گیل نے تیار کرائی ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ دید ہے۔ اس سکول میں تقریباً 500 لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ مشنریز اس کی مدد کرتے ہیں اور مشن کالج کھولنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ آمین!

سناتن دھرم هائی سکول: یہ سکول ہٹھار میں واقع ہے۔ سناتن دھرم کے حامی اور تعلیم کے دلدادہ

لوگوں کی مہربانی سے چل رہا ہے۔ ابھی سکول کی اپنی بلڈنگ نہیں ہے۔ اس سکول کے مینجر آنریبل رائے بہادر لالہ ہری چندر صاحب ہیں اور سیکرٹری پنڈت بالکندر تر کھابی۔ اے ایل بی ہیں۔ تعداد طلباء اس سکول میں قریباً 200 ہے۔

گوروکل: یہ گوروکل کانگڑی کی شاخ ہے۔ اوّل ڈیرہ بُدھو میں چوہدری رام کشن صاحب سکندر آبادی کے عطیۂ زمین میں بنایا گیا تھا۔ اب بباعث چند تنازعات کے وہاں سے ہٹ کر منشی پر مانند صاحب پلیڈر کے بنگلہ حضوری باغ میں واقع ہے۔ عملی طور پر گوروکل کانگڑی سے الگ ہے۔ اس کا انتظام ایک انتظامیہ کمیٹی کے ماتحت ہے۔ اس کے مکھ ادھشٹا تا مہاشہ بال کرشن صاحب ایم۔اے ہیں۔ یہ انسٹی ٹیوشن متعلق آریہ سماج گوروکل کانگڑی ہے۔

اسلامیہ ھائی سکول: یہ سکول دولت دروازہ پر ہے۔ اس میں پہلے مڈل تک تعلیم دی جاتی تھی مگر اب ہائی سکول بن گیا ہے۔ یہ سکول زیرِ اہتمام انجمن حمایت اسلام ہے۔ اس کول میں قریباً 303 طلباء ہیں۔

نارمل سکول: یہ سکول بیرون بوہڑ دروازہ براستہ نواں شہر واقع ہے۔ بلڈنگ سکول کی دیکھنے لائق ہے۔ اس سکول میں اُستادی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے متعلق ایک ایک ماڈل سکول ہے جس میں درجہ پنجم تک تعلیم دی جاتی ہے۔

سنسکرت مھا ودیاله واقع ھٹھار: اس سکول میں صرف سنسکرت کی تعلیم دی جاتی ہے اور لڑکوں کو راگ وشار اور شاستری کے امتحانات کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ودیالیہ سناتن دھرم کے ماتحت ہے۔ اس کے مکھ ادھشٹانا پنڈت دیوراج شاستری کادیہ تیرتھی کوی رتن ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی سنسکرت ودیالیہ ہیں۔ مثلاً سداچار آشرم بیرون دہلی دروازہ شنکر آچاریہ آشرم واقع بازار نرسنگھ پوری اور نیریندر پشتیکر پاٹھ شالا۔

ھندی پنچائتی سکول واقع غله منڈی: یہ سکول طلباء کو علاوہ انگریزی، اُردو کے ہندی سنسکرت اور لنڈے میں تعلیم دیتا ہے۔ عموماً اس سکول کے طلباء بعد پڑھنے کے تجارت کرتے ہیں۔ اس کے مینجر لالہ شانداس صاحب ہیں۔ تعلیم صرف پرائمری تک ہے۔

دستکاری سکول: حرم دروازہ اور بوہڑ دروازہ کے درمیان کمیٹی کی طرف سے دستکاری سکول کھلا ہوا ہے جہاں صرف دستکاری کا کام سکھایا جاتا ہے۔

گرل سکول: اس شہر میں صرف چار سکول لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لیے کھولے گئے ہیں۔ دو میونسپلٹی کی طرف سے اور دو آریہ سماج گوروکل سیکشن اور کالج سیکشن کی طرف سے ان سب مدرسوں میں لڑکیوں کو مڈل تک تعلیم دی جاتی ہے۔

جَینی پاٹھ شالا: یہ پاٹھ شالا جَین کے عالیشان مندر واقع چوڑی سراں میں لگتی ہے۔

هسپتال: سب سے بڑا خیراتی ہسپتال مردانہ و زنانہ بیرون بوہڑ دروازہ ہے جس کو سول ہسپتال بھی کہتے ہیں۔ لیڈی ہاسپٹل اس کی پچھلی طرف ہے جس میں لیڈی ڈاکٹر علاج کرتی ہے۔

ایک ہسپتال واقع کپ وگنر یگراں ہے جو زیر چارج ایک سب اسسٹنٹ سرجن کے ہے۔

چرچ مشنری سوسائٹی کی جانب سے ایک ہسپتال چھاؤنی میں واقع ہے۔ یہ صرف عورتوں کے لیے ہے۔ اس میں مشنری لیڈیز کام کرتی ہیں۔

ایک ہسپتال منشی ہیم راج صاحب پنشنز کی جانب سے محلہ راز دگان اندرون لوہاری دروازہ کھلا ہوا ہے جہاں پر دوائی مفت ملتی ہے۔ یہ ہسپتال شریمتی پریم دیوی زوجہ لالہ ہیمراج کی یادگار میں کھولا گیا تھا۔ لوہاری دروازہ حسین آگاہی کے درمیان ایک ہسپتال جانوروں کے لیے بھی بنا ہوا ہے۔ یہ ہسپتال سرکاری ہے۔

میونسپل کمیٹی ملتان

ملتان میونسپل کمیٹی 1867ء میں بنائی گئی تھی اور اب یہ اوّل درجہ کی میونسپلٹی ہے۔ میونسپلٹی کا علاقہ بہت کافی ہے۔ عیدگاہ والی سڑک سے لے کر پُل موج دریا تک، دولت دروازہ اور دہلی دروازہ کے باہر ریلوے لائن تک علاقہ ہے وہ سب میونسپلٹی کی حدود کے اندر ہے۔ ریلوے لائن سے چھاؤنی پتھر نمبر 10 تک اور وہاں سے پل موج دریا تک کا علاقہ اس میں شامل ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں حدود چونگی حدود میونسپلٹی ہے۔

تعداد ممبران میں ہمیشہ فرق ہوتا رہتا ہے۔ آج کل اس کے 8 ممبر سرکاری، 8 ممبر ہندو، 8 ممبر مسلمان مقرر ہوتے ہیں۔ شہر بغرض انتخاب ممبران آٹھ حصوں میں تقسیم ہے۔

پانی: شہر میں پانی کنوؤں کا استعمال ہوتا ہے۔ پچھلے دو سالوں سے واٹر پمپ تیار کیا جا رہا تھا مگر یہ فی الحال لڑائی کی وجہ سے رُک گیا ہے۔

سڑکیں و روشنی وغیرہ: شہر کے بازار و گلی کوچے فرش کے بنے ہوئے ہیں۔ سڑکیں بہت عمدہ ہیں اور ان پر روشنی کا انتظام معقول ہے۔

چونگی: کمیٹی کی آمدنی کا ذریعہ سب سے زیادہ چونگی ہے۔ اس محکمہ میں تین داروغہ، ایک سپرنٹنڈنٹ اور کئی محرر ہیں۔ مختلف چیزوں پر مختلف حصول لگتا ہے اور اب شروع سال سے نیل و دیگر اشیاء جن پر پہلے محصول نہ تھا اب لگا دیا گیا ہے۔

دفتر اور کچہریاں:

ملتان کے کمشنری ہونے کی وجہ سے یہاں دفتر اور کچہریاں بہت ہیں۔

عدالت صاحب کمشنر، ڈپٹی کمشنر، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، افسران، مہتمم خزانہ، ڈسٹرکٹ جج، سینئر و جونیئر سب جج، منصفی وغیرہ ضلع کچہری میں ہیں۔ 60 کے قریب یہاں پلیڈر و بیرسٹر صاحبان ہیں۔

سپرنٹنڈنگ انجینئر صاحب کے دفتر کے علاوہ ستلج اور پنجاب کے دو مہتموں کے دفتر اور صاحب مہتمم بارک ماسٹری کا دفتر بھی ہے۔ دفاتر ریل چھاؤنی کے اسٹیشن کے نزدیک ہیں۔ انسپکٹر مدارس کا دفتر نارمل سکول کے ساتھ ہی

ہے۔ ڈاک خانہ ریلوے میل سروس اور دفتر محکمہ جنگلات بھی پائے جاتے ہیں۔

جیل

یہاں سنٹرل جیل اور ڈسٹرکٹ جیل ہیں۔ جہاں ڈیڑھ ہزار کے قریب قیدی رہتے ہیں۔ ہر دو جیلوں میں دستکاری کا کام سکھلایا جاتا ہے۔ ڈسٹرکٹ جیل کو ضلع کچہری سے سڑک جاتی ہے اور سنٹرل جیل کو جوگ مایا والی۔

بنک

ملتان میں پہلے کئی بنک تھے مگر اب صرف پنجاب نیشنل بنک ہی باقی ہے۔ یہ بنک حسین آگاہی اور دولت دروازہ کے درمیان اپنی عالیشان بلڈنگ میں واقع ہے۔

سوسائٹی وسبھائیں

ہندو سبھا: اس سبھا کا اپنا مکان بیرون بوہڑ دروازہ متصل شوالہ دیوان ساون مل صاحب واقع ہے۔ اس کا سرمایہ کافی ہے اور چندہ بھی اکٹھا کیا جاتا ہے۔ یہ سبھا خوب زور شور سے کام کر رہی ہے۔ تیوہاروں کے کامیاب ہونے میں خاص دلچسپی لیتی ہے۔

سیوا انتی: اس سبھا کے تقریباً سب ممبران نوجوان ہیں جن کا کام قابلِ تعریف ہے۔ اس کے ممبروں نے پلیگ اور ہیضہ کے دنوں میں ہمت اور مردانگی سے کام کیا۔ اس کا اپنا مکان ہندو سبھا کے مکان کے ساتھ ہے۔

ملتان کالجیٹ یونین: یہ سوسائٹی کئی سابقہ اور حال کے کالج کے طالب علموں کی ہے۔ اس کا صدر مقام ملتان ہے۔ مگر اس کے جلسے سوائے گرمیوں میں اکثر لاہور ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد ملتان میں اعلیٰ تعلیم پھیلانے اور ادبی، اخلاقی، معاشرتی حالت کو سدھارنا ہے۔

آریہ سماج کالج پارٹی: اس سبھا کے جلسے دیانند اینگلو ویدک ہائی سکول میں ہوا کرتے ہیں۔ یہ سماج بخو[بی] کام کر رہی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیئے پاٹھ شالائیں کھولی ہوئی ہیں۔

آریہ سماج گوروکل پارٹی: اس سبھا کا اپنا عالیشان مکان اندرون بوہڑ دروازہ ہے۔ اس سبھا [نے] بھی کنیا پاٹھ شالا اور گوروکل کھولا ہوا ہے۔

سناتن دھرم سبھا: اس سبھا کا بھی ملتان میں کافی زور ہے۔ اس سبھا کی طرف سے سناتن دھرم [کی] سکول اور دیگر سنسکرت مہا ودیالہ کھلے ہوئے ہیں۔

گئو رکھشنی سبھا: یہ سبھا گئو شالا کے متعلق ہے۔ گئو شالہ بیرون دہلی دروازہ ہے۔ اس کے پر[یذیڈنٹ] [مل]تان سیٹھ آتما رام صاحب بینکر ملتان ہیں۔

انجمن حمایت اسلام: دولت دروازہ کے نزدیک ہے۔ اس کا اپنا مکان ہے۔ اس کے پریذیڈنٹ خان احمد یار خان صاحب رئیس ملتان ہیں۔ اسلامیہ سکول اس کے ماتحت ہے۔

مقدس وتفریح کے مقامات

ملتان میں بہت سے پرانے مقدس وتفریح کے مقامات ہیں جو کہ قابل دید ہیں اور جن کے دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ دور دراز کے شہروں سے بالخصوص علاقہ سندھ سے آتے ہیں۔ اہلِ ہنود کے لیے نرسنگھ پوری، پرہلاد پوری، سورج کنڈ کے مقام قابل دید ہیں اور یہ مقامات متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے لیے خانقاہ بہاؤالحق وغیرہ ہیں۔ ذیل میں ہر ایک کا مختصر احوال درج کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے لیے دو سمتیں تفریح کے لیے ہیں۔ ایک شرقی جہان باولی، گئو شالہ، گیان تھلہ وغیرہ ہیں۔ اور دوسری غربی جہاں نالہ، باغ، لائبریری، سیوا سمتی و ہندو سبھا ہیں۔

1۔ پرانا قلعہ

یہ قلعہ ایک بڑے ٹیلے پر واقع ہے۔ کسی زمانے میں اس قلعہ کے گرد دریائے راوی بہتا تھا اور قلعہ سے آمد و رفت کے لیے ایک پُل بنا ہوا تھا جس کو کہ انگریزی میں ڈرابرج کہتے ہیں۔ ضرورت کے وقت یہ لگا لی جاتی تھی اور پھر اٹھا لی جاتی تھی تاکہ غنیم فوراً اندر داخل نہ ہو سکے۔ اس قلعہ کا رقبہ قریباً سوا میل تھا۔ اس میں 46 مورچے بنے ہوئے تھے۔ جانوروں کے طویلے، مسلمانوں کی مسجدیں و ہندوؤں کے مندروں کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں اب ایک بڑا بھاری ہال ہے جس میں کہ پولیس رہتی ہے اور یونیورسٹی انٹرس کا امتحان ہوتا ہے۔ ایک سرد خانہ جس کو کہ دیوان ساون مل و مولراج استعمال کرتے تھے اب تک ہال کے پاس موجود ہے۔ بہاؤالحق کی خانقاہ قلعہ میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ کو بنی ہوئی ہے۔ دمدمہ بہت اونچا ہے اور اس پر کھڑے ہو کر سارے ملتان کا نظارہ ہو سکتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں شام کے وقت اس دمدمہ پر خوب رونق ہوتی ہے کیونکہ اونچائی کے سبب اس پر ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ پچھلے زمانہ میں قلعے کے چار دروازے تھے۔ دیہہ دروازہ کے ذریعے تماشائی لوگ اندر داخل ہوتے تھے۔ خضری دروازہ سے گزر کر لوگ دریا کو جاتے تھے اور اس دروازہ کا نام خضر دروازہ اس لیے پڑ گیا تھا کیونکہ خواجہ خضر دریا کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ تیسرا سکھی دروازہ ہے کیونکہ اس سے نکل کر سکھوں کا گاؤں نزدیک تر تھا۔ اور چوتھا بڑھئی دروازہ جو کہ حسین آگاہی کی طرف تھا۔ اسی دروازے سے مال و اسباب، کھانے پینے کی چیزیں وغیرہ اندر لائی جاتی تھیں۔

جب ملتان میں چھاؤنی نہ بھی تھی تو انگریزی سپاہ اس قلعہ میں رہتی تھی۔ لیکن اب یہ قلعہ بالکل ویران پڑا ہے۔ بارکیں وغیرہ مسمار کر دی گئی ہیں۔ چاروں طرف کھنڈرات کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

2۔ سورج مندر

قلعہ میں سب سے پرانی عمارت جس کے کچھ نشانات اب تک باقی ہیں وہ سورج مندر ہے۔ ہیون سانگ نے اس مندر کا ذکر اپنے سفرنامہ ... گیارہویں صدی میں یہ مسمار ہو گیا لیکن یہ پھر بنایا گیا جس کا پتہ

Therenot سے لگتا ہے۔اورنگزیب نے زور پکڑا تو اس نے اس مندر کو گرا دیا اور جامع مسجد بنائی مگر دیوان مولراج کے عہد میں یہ بارود خانہ بنا ہوا تھا اور 1848ء میں انگریزوں نے اسے اڑا دیا۔ کننگھم صاحب اس مندر کے کھنڈرات کا ذکر اپنی ایک کتاب میں کرتے ہیں جو رپورٹ 73-1872ء سے ظاہر ہوتا ہے۔

3۔ برج و مینار

قلعہ کے عین وسط میں مسٹر اگینو اور اینڈرسن کی یاد میں مینار بنے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں صاحبان یہاں 1848ء میں قتل کیے گئے تھے۔ مینار تقریباً پچاس فٹ اونچا ہے اور اس مینار پر مسٹر ہربرٹ ایڈورڈ فاتح ملتان نے ان ہر دو صاحبان کا مختصر طور پر حال درج کیا ہوا ہے۔ اس کے مشرق کی طرف اور بھی چند بُرج ان انگریز افسران کی یادگار بنے ہوئے ہیں جو کہ 1848ء کی لڑائی میں کام آئے تھے۔

4۔ مقبرہ سیّد دربار شاہجہان

سیّد دربار شاہ بخاری کا مقبرہ برجوں کے مغرب میں واقع ہے جس کے انتظام کے لیے ایک سیّد ملازم رکھا ہوا ہے۔

باغ لانگے خان

بوہڑ دروازہ کے باہر لانگے خان کا باغ ہے اس کے ایک طرف ولی محمد خان کا نالہ بہتا ہے جو اس کی رونق کو دوبالا کرتا ہے۔ گرمی کے موسم میں یہاں ہر شام میلہ لگتا ہے۔ خاص کر اتوار کو یہ باغ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس باغ کے اندر ایک لائبریری اور سٹی ریڈنگ روم کی عالیشان عمارت ہے۔ اس لائبریری میں ہر زبان کی کتابیں موجود ہیں۔ شام کے وقت یہاں لوگ اکثر اخبارات پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ باغ کے گول دائرہ کے اندر شہنشاہ ایڈورڈ ہفت[illegible] کا بُت جس کو چوہدری نرائن سنگھ صاحب رئیس شجاع آباد نے بنوایا تھا موجود ہے۔ اس باغ میں شام کے وقت وکلا اور بیرسٹر اور دیگر افسران ٹینس کھیلتے ہیں۔ اس ٹینس کلب کا ایک مکان انگریزی وضع قطع کا بنا ہوا ہے جو قابل د[illegible] ہے۔

باغ عام خاص

دہلی دروازہ کے باہر شمس تبریز کی خانقاہ کے جنوب میں عام خاص کا باغ ہے۔ شاہجہان کے لڑکے مرا[illegible]کے عہد میں عام لوگوں کی کچہری اس جگہ ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد ازاں دیوان ساون مل کی حکومت کا وقت آیا [illegible]س نے یہاں رہائش اختیار کیا۔ دیوان ساون مل یہاں قتل کیا گیا تھا اور دیوان مولراج لڑائی کے وقت یہاں بھا[illegible] آیا تھا۔ پرانی عمارت میں اس جگہ اب تحصیل کا دفتر ہے۔ ماہ مارچ میں ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے گھوڑوں کی [illegible] کا میلہ لگتا ہے اور اس کے جنوب میں زبردست خان کا باغ ہے جس میں ایک پرانا تالاب ہے۔ عام خاص [illegible] کے

مشرق میں دیوان ساون مل کی سمادھ ہے۔

حضوری باغ

لوہاری دروازہ کے باہر حضوری باغ ہے۔ یہ باغ نوابوں اور دیوانوں کے وقت بہت عمدہ تھا۔ اس باغ میں ایک بنگلہ ہے جس کو شاہزادہ مراد بخش نے بنوایا تھا۔ اب اس باغ میں منشی پرمانند صاحب پلیڈر کے بنگلہ ہیں جس میں آج کل گورو کل بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک مندر سوامی ہیمراج کے نام سے مشہور ہے۔ اس جگہ شام کو کتھا ہوتی ہے اور اس جگہ کے کنوئیں پر لوگ نہانے کو آتے ہیں۔

کمپنی باغ

یہ باغ چھاؤنی میں ہے اور اس کا ذکر چھاؤنی کے کالم میں کیا گیا ہے۔

گھنٹہ گھر

لوہاری دروازہ کے باہر گھنٹہ گھر کی عالیشان بلڈنگ بنی ہوئی ہے۔ اس کا بنیادی پتھر لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے رکھا تھا اور میونسپل کمیٹی نے اسے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے ایک برج میں گھڑی لگی ہوئی ہے جس کی آواز بہت دور تک پہنچتی ہے۔ میونسپل کمیٹی و سب رجسٹرار و آنریری مجسٹریٹ کے دفتر و کچہریاں اس بلڈنگ میں ہیں۔ اس کی اوپر والی منزل میں ایک بڑا بھاری ہال ہے جس میں پہلے مڈل یونیورسٹی کے امتحان ہوا کرتے تھے۔ اب ضرورت کے وقت لیکچر ہوتے رہتے ہیں۔

شیش محل

بوہڑ دروازہ سے جو سڑک گرجا گھر کو جاتی ہے اس پر شیش محل کا بنگلہ بنا ہوا ہے۔ اس بنگلہ میں چند سال ہوئے ڈویژنل کورٹ تھا مگر اب کورٹ کی جگہ تبدیل ہو جانے سے کمشنر صاحب بہادر نے اپنی رہائش کے لیے جگہ بنا لی ہے۔ اس بنگلہ کو شاکر خان نے بنوایا تھا۔

جائے ولادت احمد شاہ ابدالی

شیش محل کے سامنے جو بنگلہ بنا ہوا ہے اس جگہ پر احمد شاہ ابدالی پیدا ہوا تھا۔ سڑک پر پتھر لگا ہوا ہے جس پر اس کی تاریخ ولادت وغیرہ درج ہے۔

سول لائن

شہر کے شمال مغرب میں قریباً آدھ میل کے فاصلے پر دفتر ضلع، کمشنری، ڈویژنل وغیرہ واقع ہیں۔

چھوٹی بستیاں

سب سے بڑی بستی یا جسے گاؤں کہنا چاہیے نواں شہر ہے۔ اس کے اندر اب کافی آبادی ہے۔ مکان بھی

پکے بنے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ کوٹلہ تولے خان بیرون لوہاری دروازہ اور دیگر بستیاں موجود ہیں۔

پرہلاد پوری

یہ مندر پرانا قلعہ شمال کی طرف ہے۔ اس کی تواریخ یوں ہے کہ ایک راجہ پچھلے زمانہ میں ہرن کشب ملتان میں راج کرتا تھا۔ یہ شخص بہت ہی مغرور تھا اور اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔ اس کا لڑکا پرہلاد بہت ہی ایشور کا بھگت تھا اور بجائے اس کی پوجا کے ایشور کی پرستش کرتا تھا۔ یہ بات دیکھ کر راجہ ہرن کشب کو سخت غصہ آیا اور اسے قلعہ سے نیچے گرا دیا مگر ایشور کی قدرت سے اسے کچھ چوٹ نہ آئی۔ آخر ایک ستون جو کہ آگ کی تپش سے سرخ کیا گیا تھا اس سے بغلگیر ہونے کے لیے پرہلاد کو حکم دیا گیا۔ پرہلاد کا اس کے ساتھ لگنا ہی تھا کہ ستون دو ٹکڑے ہو گیا اور ویشنو مہاراج نرسنگھ کی شکل میں باہر نکلے اور اس قصور کی سزا میں انہوں نے راجہ ہرن کشب کو اپنے گھٹنوں پر لٹا کے اس کی انتڑیوں کو باہر نکال دیا۔ یہ مندر بہت ہی پرانا ہے اور اس کی تاریخ نرسنگھ پوران میں مہنت کے پاس موجود ہے۔ سکھوں کی دوسری لڑائی کے وقت جبکہ 1848ء میں انگریزوں نے ملتان پر حملہ کیا تو بارود کے گولوں کی وجہ سے اس مندر کی چھت اُڑ گئی لیکن بعد ازاں چندہ اکٹھا کر کے پھر تعمیر کی گئی۔ سکھوں کی عملداری میں اس مندر کے لیے کچھ مدد ملتی تھی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کچھ زمین عطا کی تھی۔ چند سال پیشتر شہر کا ہر ایک دکاندار اپنی آمدنی کا کچھ حصہ بطور نذرانہ دیتا تھا۔

ماہ جیٹھ میں اس جگہ نرسنگھ چودس کا میلہ لگتا ہے اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر ایک دوسرے پر خربوزے اور ککڑیاں پھینکتے ہیں۔ مگر جوں جوں شائستگی پھیلتی جاتی ہے توں توں خربوزہ اور ککڑیاں مارنا بند ہوتا جاتا ہے۔

خانقاہ بہاؤالحق

یہ خانقاہ مندر پرہلاد پوری کے مغرب کی طرف واقع ہے اور بہاؤالحق کی یادگار بنی ہوئی ہے۔ بہاؤالحق بچپن میں ایران گیا اور وہاں تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں ملتان واپس آیا جہاں مکہ اس نے اپنی باقی زندگی بسر کی۔ اس کے معجزوں میں سے ایک معجزہ ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانا ہے۔ دریائے سندھ اور چناب کے ملاح اب بھی مشکل کے وقت جبکہ کشتی بھنور میں ہوتی ہے اس کا نام لیتے ہیں۔ جب سکھوں کی لڑائی ہوئی تو اس خانقاہ کو بہت نقصان پہنچا اس کو پھر تعمیر کرنے کے لیے لوکل گورنمنٹ نے گورنمنٹ عالیہ سے دس ہزار روپیہ کے لیے درخواست کی مگر گورنمنٹ عالیہ نے اسے منظور نہ کیا۔ آخر کار چندہ اکٹھا کر کے مرمت کی گئی ہے۔ اس خانقاہ کے دروازے کے سامنے ایک چھوٹی سی خوبصورت قبر نواب مظفر خان کی بنی ہوئی ہے۔ یہ نواب سکھوں کے حملے کو تلوار سے روکتا ہوا مارا گیا۔ اس کا لڑکا شاہنواز خان بھی اس کے ساتھ مارا گیا تھا اور اس کے پاس دفن کیا گیا۔

خانقاہ رکن عالم

قلعہ کے جنوب مغربی حصہ میں رکن عالم الیاس رکن الدین ابوالفتح کا ایک عالیشان مقبرہ ہے۔ تغلق خاندان کے عہد میں رکن عالم ایک بڑا مذہبی اور زبردست پولیٹیکل آدمی تھا۔ یہ خانقاہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے اور طرح طرح کے رنگوں سے اس کو رنگ کیا گیا ہے۔ مگر اب بہت کچھ نیست و نابود ہو گیا ہے۔ سوائے چھوٹی چھوٹی قبروں کے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ اس مقبرے کی بابت بہت ہی عجیب روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ محمد شاہ تغلق نے اپنی خانقاہ بنوانے کے لیے بہاؤ الحق کے ساتھ والی زمین کو چنا اور وہاں تعمیر کا جب کام شروع ہوا تو فقیر بہاؤالحق کی آواز آئی ''تم میرے جسم کو کچل رہے ہو'' اس آواز کو سن کر اس نے دوسری جگہ چنی مگر پھر آواز آئی کہ تم میرے گھٹنے کو کچل رہے ہو۔ پس اس کے ساتھ خانقاہ بنوائی گئی۔ سندھ سے لوگ اس خانقاہ کو دیکھنے کے لیے ننگے پاؤں آتے ہیں اور دم پر دم بہاؤالحق بہاؤالحق کے نعرے مارتے ہیں۔

خانقاہ شاہ گردیز

خانقاہ جو کہ شہر کے اندر بوہڑ دروازہ کے نزدیک بنی ہوئی ہے۔ یہ خانقاہ شیخ محمد یوسف گردیزی کی ہے۔ اس عمار کی شکل مستطیل کی ہے اور بھی کئی مقبرے ہیں۔ شیخ محمد یوسف صاحب غزنی کے نزدیک گردیز میں پیدا ہوئے تھے اور علاؤالدین بہرام شاہ غزنوی کے عہدِ حکومت میں ملتان آیا اور دریائے راوی کے کنارے اسی موجودہ خانقاہ کے اصلی موقع پر ڈیرہ جمایا۔ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کو بہت معجزے آتے تھے۔ وہ شیر پر سوار ہو سکتے تھے اور سانپ سے کوڑے کا کام لیتے تھے اور ان کے وفات 60 سال بعد تک ان کے ہاتھ کے معجزے پھر نظر آیا کرتے تھے۔

مقبرہ موسیٰ پاک شہید

یہ خانقاہ پاک دروازہ میں واقع ہے۔ شیخ ابوالحسن موسیٰ پاک شہید عبدالقادر گیلانی کا لڑکا تھا۔ یہ شخص ایک لڑائی میں مارا گیا اور اس کا لڑکا اس کے جسم کو ملتان لے آیا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے جسم کو کچھ ہی اثر نہ ہوا اور شہر میں گھوڑے پر بٹھا کر لایا گیا اور یہاں دفن کیا گیا۔ موسیٰ پاک کی مسجد اکثر پٹھانوں سے بھری رہتی ہے اور ہر جمعرات کی شام کو میلہ لگتا ہے۔

عیدگاہ

یہ عمارت بہت ہی نفیس بنی ہوئی ہے اور قابلِ دید ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک کھلا میدان پڑا ہوا ہے جس کے بائیں ہاتھ کو عمارت بنی ہوئی ہے۔ یہ تین منزلہ ہے۔ اس کے اوپر والی منزل میں ٹھہر کر بہت دور کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ 1735ء میں نواب ابومحمد خان نے اسے بنوایا تھا۔ 1848ء میں مسٹر اگینو اور اینڈرسن اسی جگہ پر قتل کیے گئے تھے۔ جب سرکار انگلشیہ کا راج شروع ہوا تو کچہری یہاں لگا کرتی تھی مگر 1863ء میں یہ بلڈنگ مسلمانوں

کی درخواست پر ان کو واپس مل گئی۔ پرہلاد پوری والے مندر کی چھت کی طرح ملتان کی لڑائی میں اس کی چھت بھی اُڑ گئی تھی مگر 1891ء میں مسٹر کوکسن صاحب ڈپٹی کمشنر و نواب محمد حیات خان ڈویژنل جج کی امداد سے سرکار انگریزی سے دس ہزار روپیہ سے اس کی تعمیر کے لیے مل گیا اور دس ہزار روپیہ چندہ جمع کر کے اس کو پھر بنوایا گیا۔

مسجد و خانقاہ

شہر میں بہت سی مسجدیں ہیں لیکن مشہور صرف تین چار ہی ہیں۔ ولی محمد کی مسجد بہت ہی بڑی ہے۔ یہ مسجد گوڑی بازار میں کپ گارڈ کے سامنے واقع ہے۔ اس کو پٹھان گورنر علی محمد خان نے تعمیر کرایا تھا۔ مگر سکھوں نے اپنے عہدِ حکومت میں اس میں ناظم کے رہنے کی جگہ بنا دی اور گرنتھ صاحب اندر رکھ دیا۔ سرکار انگریزی نے یہ مسجد پھر مسلمانوں کو واپس دے دی۔

مسجد گل فروشاں

یہ ٹھیک چوک بازار میں واقع ہے کیونکہ اس کے باہر پھول والے بکثرت بیٹھتے ہیں۔ اس لیے اس کا نام پھول والی مسجد پڑ گیا ہے۔ یہ مسجد مغلیہ خاندان کے بادشاہ فرخ سیر نے تعمیر کرائی تھی۔

نوگزی قبر

یہ قبر 9 گز لمبی ہے اور بوہڑ دروازہ کے اندر واقع ہے۔

پیر دربار

یہ پاک دروازہ کی بڑی خانقاہ ہے جس کو پیر دربار کہتے ہیں۔ اس جگہ فقیر ہر وقت بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ جمعرات کی رات کو یہاں بہت مجمع ہوتا ہے۔

شمس تبریز

باوا سفرا کے جنوب کی طرف خانقاہ شمس تبریز ہے۔ شمس تبریز بڑا بھاری فقیر تھا۔ اس نے غزنوی کے حا[کم] کے مردہ لڑکے کو زندہ کیا تھا۔ ملتان پہلے ہی سے فقیروں کے لیے مشہور تھا اور اس نے یہاں پہنچنا چاہا۔ جب شہر [میں] وارد ہوا تو بہاؤالحق نے اُسے ایک لوٹا دودھ سے بھرا ہوا بھیجا۔ اس کا مطلب شاید یہ تھا کہ ملتان میں فقیر کافی ہیں [اس] لیے آپ واپس تشریف لے جایئے۔ مگر فقیر شمس نے گلاب کے پھول کے پتے ڈال کر واپس بھیج دیا۔ بہاؤالحق سمجھ [گیا] کہ یہ کوئی دانا فقیر ہے اور آپ چپ رہا۔ پھول ڈالنے کا مطلب مطلب یہ تھا کہ جس طرح پھول دودھ میں سما [جا]تے ہیں اور باہر نہیں اچھلتے اسی طرح اس کا بھی وہاں گزارہ ہو جائے گا۔

1276ء میں شمس الدین مر گیا اور اس کے پوتے نے اس خانقاہ کو 1330ء میں تعمیر کرایا۔ اس کی [با]ت بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ فقیر آگ لینے کے لیے سارا شہر پھرا مگر کسی نے اس کی خواہش پوری [نہ] کی۔

آخر کار تنگ ہو کر سورج سے التجا کی کہ تو میرا ہم نام ہے مجھے آگ کی ضرورت ہے مگر کوئی نہیں دیتا۔ اس لیے میری مدد کر۔ سورج نیچے اتر آیا اور ملتان کے لوگوں کو سخت سزا دی یعنی یہاں گرمی سخت پڑنے لگی۔

باوا سفرا

عیدگاہ کے جنوب میں باوا سفرا کی سمادھ ہے۔ سکھوں کے عہد میں اس جگہ چھاؤنی تھی اور انگریزوں کے عہد میں بھی پہلے پہل یہاں چھاؤنی تھی اور اب تک اس جگہ انگریز صاحبان دفن کیے جاتے ہیں۔

باوا سفرا کی سمادھ اب مرمت ہو گئی ہے اور چار دیواری بھی بن گئی ہے۔ اس جگہ بسنت کے دن بڑا بھاری میلہ زیرِ اہتمام ہندو سبھا لگتا ہے اور اس دن یہاں گانا بجانا اور ٹورنامنٹ ہوتا ہے۔

رام تیرتھ

دہلی دروازہ کے باہر جہاں میلسی، بدھلہ سنت و دنیا پور کے لیے سڑکیں علیحدہ ہو جاتی ہیں وہاں بائیں ہاتھ کو رام تیرتھ کی سمادھ اور رام کنڈ واقع ہیں۔ اس کا نام رام تیرتھ اس واسطے رکھا گیا تھا کہ شری رام نے نرسنگھ اوتار کے وقت ملتان میں اس مقام پر قیام کیا تھا۔ موجودہ عمارت مہاراج رنجیت سنگھ کی بنوائی ہوئی ہے۔ ہندو اتوار کو یہاں جمع ہوتے ہیں۔ اس کی عمارت کے نزدیک مہنت کیشو پوری کی سمادھ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس مہنت کا زندگی میں ہی چمڑا اُدھیڑا گیا تھا۔ ملتان کا کیشو پوری نام اسی مہنت کے نام سے مشہور ہے۔ اس عمارت میں اور بھی چند سمادھیں ہیں اور مورتیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہاں ایک سرد خانہ بھی بنا ہوا ہے جہاں فقیر لوگ دوپہر کے وقت آرام کرتے ہیں۔

سورج کنڈ

سورج کنڈ شہر سے جنوب کی طرف چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس بلڈنگ میں ایک تالاب، ایک سمادھ اور چند مکانات بنے ہوئے ہیں۔ تالاب دیوان ساون مل نے پختہ بنوایا تھا اور مکانات بعد میں تعمیر ہوئے۔ یہ بہت ہی متبرک جگہ ہے۔ جب وشنو مہاراج نے ہرن کشب کو نرسنگھ کی شکل میں مارا تو اس کا غصہ اس قدر بڑھ گیا کہ اس کو تمام دیوتا لوگ یعنی سورج چاند وغیرہ سورج کنڈ کے مقام پر اس کو شانتی دینے کے لیے اترے۔ سمادھ کے ساتھ ایک عمدہ باغ ہے۔ شہر کے لوگ سال میں دو دفعہ جب میلہ سورج کنڈ پر آتے ہیں تو اس باغ میں ٹھہر کر وقت گزارتے ہیں۔

چندر کنڈ اور تارا کنڈ

سورج کنڈ کے نزدیک چندر کنڈ اور تارا کنڈ بنے ہوئے ہیں۔ لوگ سورج کنڈ جاتے وقت یہاں ٹھہرتے ہیں۔

باولی

حرم دروازہ کے باہر گورنمنٹ ہائی سکول کے بورڈنگ کے سامنے ایک باولی بنی ہوئی ہے۔ اس میں چھوٹا سا

باغیچہ لگا ہوا ہے۔ نہانے کے لیے بہت عمدہ انتظام ہے۔ لوگ گرمیوں میں یہاں آ کر دوپہر کا وقت گزارتے ہیں۔ مسافر اور سادھو لوگ یہاں بسیرا کرتے ہیں۔ واقعی یہ باولی دیکھنے کے لائق ہے۔ دوسری باولی دہلی دروازہ کے باہر سائیں داس کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ حرم دروازہ والی باولی سے کسی قدر بڑی ہے۔ اس میں بھی کنوئیں اور باغیچہ وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔ پنجاب ہندو کانفرنس کا دوسرا سالانہ جلسہ یہاں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والے میدان میں دسہرہ خوب رونق سے ہوتا ہے۔

گئو شالہ

گیان تھلہ کے نزدیک پنچائت کی طرف سے گئو شالہ بنی ہوئی ہے جس میں گائیں رہتی ہیں اور ان کو خوراک ہندوؤں کی طرف سے ملتی ہے۔ شہر میں جو لنگڑی وغیرہ گائیں ہوں یہاں لائی جاتی ہیں۔

گیان تھلہ

باولی بیرون دلی دروازہ کے جنوب میں گیان تھلہ کا استھان ہے۔ یہاں سادھو، فقیر اور اپدیشک اکثر جمع رہتے ہیں۔ مکان بڑا وسیع ہے اور پنچایت کی ملکیت ہے۔ یہاں پر ہر شام بھجن اور ودیا کھیان ہوتے ہیں۔ شہر کے لوگ ایک بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔

جوگ مایا

شہر کے سٹیشن کے نزدیک ہی جوگ مایا کا مندر ہے۔ جب نرسنگھ جی مہاراج کو شانتی دینے کے لیے دیوی دیوتا ملتان میں آئے تھے تو دیوی نے اس جگہ پر قیام کیا تھا۔ اورنگزیب کے زمانے میں یہاں ایک تھلہ تھا جہاں پر بکریاں بھینٹ کی جاتی تھیں۔ روایت ہے کہ جب طوطلا مائی کا استھان بنایا گیا تو اس کے شعلے اس جگہ تک پہنچے اور چمکے اور اسی جگہ پر پوجا کی جاتی ہے۔

طوطلا مائی

یہ استھان سورج کنڈ والی سڑک پر واقع تھا۔ کئی مؤرخین کے خیال کے مطابق ملتان پہلے یہاں ہی بسا ہوا تھا۔

ہنگلج پچھّم شاستری طوطلا گھر ملتان
نگرکوٹ دُکھ بھنجنی تینوں دیو پردھان

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاستری دیوی کا مقام مغرب میں ہنگلج میں ہے اور طوطلا مائی کا گھر ملتان میں اور دکھ بھنجنی کا نگرکوٹ میں۔

اورنگزیب نے اس استھان کو مسجد بنوانے کی کوشش کی جس پر مائی مندر سے نکل پڑی اور پاس والے کنوئیں

میں کود پڑی مگر استھان کا پجاری علم طب جانتا تھا اور اس نے اورنگزیب کے لڑکے کا علاج کیا۔ جب اس کو آرام ہو گیا اس کے عوض میں اورنگزیب نے اجازت دی کہ طوطلا دیوی کو کنوئیں سے نکال کر شہر میں لے جایا جاوے۔ پس مورتی اب حرم دروازہ کے اندر ایک مکان میں رکھی ہوئی ہے۔

مائی پاکدامن پاک مائی

طوطلا مائی کے پرانے استھان کے جنوب میں مائی پاک دامن کا مقبرہ ہے۔ بہاؤالحق کے لڑکے صدر دین کی بیوی تھی۔ اس مقبرہ میں بہت خوبصورت اینٹیں لگی ہوئی ہیں جو کہ بیرونی احاطہ کی دیواروں کے اونچا ہونے کے سبب باہر سے نظر نہیں آسکتیں اندر صرف عورتیں جاسکتی ہیں۔

سیدی لعل

شہر کے اسٹشین کے شمال میں ایک اونچے ٹیلہ پر ایک مقبرہ بنا ہوا ہے جو کہ سیدی لعل کا مقبرہ کہلاتا ہے۔ 1848ء میں انگریز یہاں اترے تھے۔ اس جگہ پر ہندو مسلمان عبادت کے لیے جاتے ہیں۔ اس کے نزدیک ایک باغ ہے جہاں سکھوں کے عہد میں مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا اور اُن کی دعوت کی جاتی تھی۔

شادنہ شہید

یہ مسجد اندرون دہلی دروازہ واقع ہے۔ شادنہ شہید جب ابھی دس ماہ کا تھا تو اس کی والدہ نے بہاؤالحق پر کچھ الزام لگائے مگر اس ننھے بچے نے ملزم کے حق میں گواہی دی۔ اس کی ماں کو بہت غصہ آیا اور اس نے اسے مار ڈالا مگر بہاؤالحق نے اسے زندہ کر دیا۔

نرسنگھ پوری کا مندر

شہر کی تمام عمارتوں میں سب سے مشہور عمارت نرسنگھ پوری کا مندر ہے جو کہ غلہ منڈی کے پاس واقع ہے۔ پہلے پہل یہ مندر پرانا قلعہ میں تھا مگر اب مسمار ہو گیا ہے۔ قلعہ سے ہٹنے کے بعد ازاں پرہلاد پوری کے مندر کے مہنت نے فتح چند کے ٹھاکر دوارہ میں اس مندر کو ازسرِ نو تعمیر کیا مگر یہ بھی جلد گر پڑا اور اب چندہ اکٹھا کر کے غلہ منڈی میں بنایا گیا ہے اور عمارت قابل دید ہے۔

دھرم سال بھائی دیال

یہ دھرم سال دہلی دروازہ کے اندر واقع ہے۔ سادھوؤں کا یہاں ہر وقت ڈیرہ لگا رہتا ہے اور اس دھرم سال کے اندر گرنتھ صاحب رکھا ہوا ہے۔ یہاں تقریباً ہر روز اپدیش ہوتے ہیں۔ عمارت وسیع ہے۔

دوارہ بنارسی بھگت

حرم دروازہ کے اندر بنارسی بھگت کی یادگار میں تین سو سال گزرے ایک دوارہ یعنی مندر بنایا گیا تھا۔

دیگر مندر

شہر کے ہر ایک دروازہ کے اندر کوئی نہ کوئی مندر بنا ہوا ہے اور بعض جگہوں پر تو ہنومان کی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں اور خصوصاً چوک بازار میں ہنومان کا مندر قابل دید ہے۔

شوالہ دیوان صاحب

یہ شوالہ 1837ء میں بوہڑ دروازہ کے باہر ولی محمد نالے کے قریب تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں پر سادھوؤں کا ہر وقت مجمع رہتا ہے۔

مندر جین سوئمبر

یہ مندر چوک بازار کے قریب چوڑی سرائے میں واقع ہے اور اسے جین سوئمبروں نے ساٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے بنوایا تھا۔ اس مندر میں ایک چھوٹی سی پاٹھ شالا بھی ہے۔

حسوان ناتھ

رام تیرتھ کے جنوب میں ہندوؤں کا شمشان واقع ہے جس کے ساتھ ایک دھرم سال ہے۔ اس مقام پر 12 ستمبر 1848ء کو ملتان میں سخت لڑائی ہوئی تھی۔

(سیر ملتان - رائے زادہ تیرتھ رام بی۔ اے)



طارق محمود

مخدوم صاحب*

دولت گیٹ ملتان!

اب یہاں کوئی در نہیں، محض آبادی اور ہنستے بستے علاقے کا نام رہ گیا ہے۔ اب سڑک کے بیچوں بیچ کسی بزرگ کا مزار ہے۔ سبز گنبد گواہ ہے کہ کوئی روحانی ہستی تھی، راہگیر، آتے جاتے لوگ اس مزار کو اچٹتی نظر سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ کچھ عقیدت مند نذر نیاز بھی چڑھاتے ہیں۔ کاروانِ زندگی تدبیر کے ساتھ ساتھ حاجتوں اور منتوں پر بھی چل رہا ہے۔ دولت گیٹ کی اس گنجان آبادی میں برلب سڑک واقع بیت القریش کے نام سے موسوم حویلی کے وسیع دامن میں وسیع سائبان نصب ہے۔ نرم دھوپ کہیں کہیں سے اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ بدلتی رُت میں کہیں گرمی کا احساس جاتا تو یہاں بیٹھے صاحبان اپنی کرسی کو سرکا کر چھاؤں میں لے آتے۔ سرخ پوشش سے مزین سٹیل کی کرسیاں یقیناً میزبان کے ہاں سے نہیں ہیں۔ شہر کے معروف ٹینٹ اور کیٹرنگ سروس کے مالک کا اثاثہ ہے جنہیں وہ ہر تقریب میں گھماتے پھرتا ہے۔

لوگ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو چکے ہیں۔ دالان کے ایک طرف سیاہ رنگ کی پرشکوہ مرسیڈیز کار پارک ہے۔ اسی نوع کی کچھ گاڑیاں دالان سے باہر برلب سڑک مہمانوں کی منتظر ہیں کہ کہیں سے اشارہ ملے۔ سفید دھلی دھلی وردی میں ملبوس ڈرائیور جنہوں نے ہاتھوں میں اسی رنگ کے دستانے چڑھا رکھتے ہیں، گاڑی سٹارٹ کریں۔ پولیس کی سکارٹ جیپوں میں نصب سائرن کی چیخ و پکار شروع ہو اور قافلہ ائرپورٹ، ریلوے اسٹیشن کنٹونمنٹ کی طرف نکل پڑے۔

حاکمین وقت اس وقت دوپہر کے کھانے میں جُتے ہوئے تھے۔ سائبان تلے بیٹھے افراد جن میں مَیں بھی شامل تھا، اب بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ حویلی گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی کی رہائش گاہ تھی۔ یہ نابغۂ روزگار شخصیت نہ صرف ایک سیاسی اور سماجی حوالہ لیے ہوئی تھی۔ بلکہ قادریہ سلسلے کی معروف روحانی شخصیات

---

* مخدوم سجاد حسین قریشی

حضرت بہاؤالدین زکریا اور حضرت شاہ رکن عالم سے بھی نسبت تھی۔ مخدوم صاحب گدی نشین ٹھہرے اور اُن کے مریدین کا سلسلہ سندھ کے دور دراز علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ملتان میں حضرت بہاؤالدین زکریا کے سالانہ عرس کے موقع پر ایک کانفرنس کے سلسلے میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کی آمد آمد تھی۔ مخدوم سجاد حسین قریشی اس وقت اپنے مہمان خصوصی کے ہمراہ کھانے میں مصروف تھے۔ ان کی معیت میں وزیر اعلیٰ محمد نواز شریف اور وفاقی وزیر ریلوے سیّد یوسف رضا گیلانی بھی تھے۔ ان اہم شخصیات کا متعلقہ سٹاف اس وقت سائبان تلے روانگی کا منتظر گھڑیاں گننے میں مصروف تھا۔ ملتان کی مقامی انتظامیہ کے اراکین ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف تھے۔ مَیں، گورنر کے سیکرٹری، سول سرونٹ علی کاظم کی نرم ملائم لہجے میں باتیں بڑے انہماک سے سن رہے تھا۔

صحن کے ایک جانب سندھی زائرین کی کثیر تعداد زمین پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ چہرے پر خشخشی داڑھیاں تھیں۔ سروں پر تلّے، ستارے اور چھوٹے چھوٹے چمکتے شیشوں سے منڈھی ٹوپیاں اور کندھے پر اجرک کی چادریں حمائل کیے نجانے کتنی دیر سے ''پیر سائیں'' کے انتظار میں تھے، کس وقت وہ سامنے آئیں اور وہ ان پر اپنی عقیدت نچھاور کریں۔ کچھ مریدین 'پیر سائیں' کی آمد سے پہلے ہی ہاتھ باندھے، آنکھیں موندے، کمر خمیدہ کیے لرزاں کھڑے تھے۔

حویلی کے کمرے سے ایک خوبرو صاحب نمودار ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ میں سرخ سیب تھام رکھا تھا۔ ان کے چہرے کی رنگت بھی سرخ و سپید تھی۔ تعارف ہوا تو جانا کہ ڈاکٹر اکبر ایس احمد تھے۔ معروف محقق، آثار شناس، تجزیہ کار۔ ان دنوں کمشنر سبی تھے۔ کانفرنس کے دوران انہوں نے ایک پُر مغز مقالہ پڑھا۔ جنرل ضیاء الحق کو اپنی کتاب پیش کی۔ صاحب علم تو تھے ہی، اس کے ساتھ خبروں میں رہنے کے فن سے بھی آشنا تھے۔

دوپہر کے کھانے سے کچھ دیر قبل مہمانوں نے قریب ہی واقع ایک مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی۔ حویلی سے نکلے اور پیدل ہی مسجد کی طرف چل دیئے۔ سیکورٹی اہلکاروں نے ایک حصار بنالیا جو اتنا ناگوار نہ گزر رہا تھا۔ راہ گیر ایک طرف سمٹے۔ جنرل ضیاء الحق چہرے پر مہین سی مسکراہٹ سجائے لوگوں کی طرف نظر اٹھاتے اور گاہے بگاہے ہاتھ ہلانے لگتے۔ وہ بھی کیا دن تھے، نہ کوئی اندیشہ تھا، نہ خدشہ اور دھڑکا، نہ ملکِ عزیز کے گلی کوچوں میں دہشت تھی نہ وحشت تھی۔ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب ایسی تمام نحوستیں پرورش کے ابتدائی مراحل میں تھیں۔ ناسور پکنے اور ٹپکنے میں ابھی ایک وقت درکار تھا۔

بیت القریش کے صدر دروازے سے نکلے، نظر اٹھائی تو سامنے النگ تھی (سرائیکی زبان میں بلند دیوار یا فصیل) النگ تو اب کئی مقام سے منہدم ہو چکی تھی لیکن اس کی اٹھان شہر کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتی رہی، شہر کے وقوع اور اس میں زندگی کی مہک اور رمق کا پتہ دے رہی تھی۔ یہ فصیلیں ہی تھیں جو ماضی میں شہر کی رفتار کو روک لیتیں۔ بیرونی دنیا کے ساتھ ایک حدِ فاصل قائم کر دیتیں۔ بڑھتے قدم رک جاتے۔ بلند و بالا فصیل جس کے باہر ایک دوسری دنیا آباد تھی۔ شام ہوئی تو شہر کے دروازے بند ہو گئے۔ فصیل کے ساتھ ساتھ پہرے داروں نے جگہ بنائی۔ مسافروں نے شہر سے باہر کسی سرائے میں پڑاؤ کر لیا۔

اہالیان شہر کو کسی تحفظ نے آن لیا۔ انہی فصیلوں کے سائے میں مملکتوں نے جنم لیا۔ آبادیوں کے حصار بنے۔ کہنے کو تو یہ دفاعی حصار تھیں لیکن زمانے نے انہیں تمدنی حوالہ بھی دے دیا۔ شہر کے مکینوں، فصیل اور النگ کے سائے میں بسنے والوں کو ایک سانجھ میں پرو دیا۔ فصیل سے جو باہر تھا وہ اجنبی اور غیر ٹھہرا۔ یہ سلسلہ کہاں نہیں تھا، دلی، لاہور، قاہرہ، بصرہ، دمشق، اسکندریہ اور ٹریپولی اسی حوالے سے جانے گئے۔ اغیار کی یلغار سے محفوظ رہنے کا مداوا تھا۔ ایک رہتل تھی جو صدیوں تک پھولی پھیلی۔ سلجوق، مملوک فاطمی حکمران اپنی قلمرؤں میں انہی فصیلوں اور دیواروں کو مستحکم کرتے رہے۔ دور کی کوڑی کیا لائیں۔ ہمارے ہاں جنگجو راجپوت تو ایسے حصار کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہ کر پائے۔ اودھے پور، جے پور، دیواروں میں گھرے رہے۔ پھر نہ دَر رہے نہ دیواریں۔ سب کچھ منہدم ہو گیا۔ زمانے نے سب کچھ روند ڈالا۔ شہر فصیلوں اور النگوں کو پھلانگ گئے۔ دولت گیٹ اور النگ سے پار اس وقت کندھے سے کندھا کھوا جا رہا تھا۔ مخدوم صاحب کے کاردار بتاتے کہ گئے دنوں میں یہاں سرسبز کھیت ہوا کرتے تھے چاہ اور رہٹ تھے، کولہو کے بیل جُتا کرتے۔

النگ تو نہ رہی لیکن گلی کوچوں کی بساند سے ایک جہان آباد تھا۔ یہ محلے جہاں ہندو کراڑوں کی حویلیاں ہوا کرتی تھیں۔ بھرے بازار جہاں ہندو ساہوکار اپنی معاملہ فہمی کے گُن دکھا کر دم بھر میں بکھر گئے۔ پاکستان قائم ہوا تو النگ کے اندر رہنے والی بیش بہا ہندو آبادی کی نقل مکانی ہوتی چلی گئی۔ اب اس شہر میں روہتک اور حصار سے آبادی کی آمد آمد تھی۔ شہر ایک نئی شناخت سے روشناس ہوتا چلا گیا۔ ہریانوی لہجے کے سحر اور سرائیکی وسیب کے امتزاج سے شہر نے انگڑائی لی اور نت نئی جہتیں دریافت کیں لیکن اس مہک میں سیاست کے رنگ نرالے تھے۔ 70ء کے انتخابات ہوئے تو شہر کی مقامی آبادی کے روحانی پیشوا حامد علی خان، ذوالفقار علی بھٹو کے سحر کے آگے ہار گئے اور شہر ملتان نے اپنا وزن بھٹو مرحوم کے پلڑے ڈال دیا۔

علی کاظم مجھے اپنے کام کی نوعیت سے آگاہ کرتے رہتے۔ مخدوم سجاد حسین قریشی کے ساتھ گزشتہ ایک برس سے منسلک تھے۔ اس سے قبل وہ لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان کے قابل اعتماد سیکرٹری رہ چکے تھے۔ یہی وقت تھا جب علی کاظم کے سسر اور معروف قانون دان رضا کاظم کسی نام نہاد بغاوت کے الزام میں اٹک جیل میں قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ فوجی گورنر کے ساتھ قربت کے باوجود علی کاظم نے کبھی اپنے گھریلو معاملے کو نہ اٹھایا۔ وقت نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ کام کی تفصیل بتاتے بتاتے علی کاظم کو نجانے کب خیال آیا اور مجھ سے کہنے لگے کہ تم اس پوسٹ کے لیے نہایت موزوں رہو گے۔ ملتان میں ڈپٹی کمشنری کی بناء پر مخدوم صاحب کے لیے آسانی رہے گی ان کے دیکھے بھالے ہو۔ مجھے ان کی بات سن کر اچنبھا سا محسوس ہوا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ مَیں نے انہیں مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن مَیں نے محسوس کیا کہ وہ گورنر ہاؤس میں تین برس گزارنے کے بعد اپنے تبادلے کے متمنی تھے۔

حویلی کے اندر ہلچل مچی، ڈرائیور سٹاف کارواں کی طرف لپکے۔ پولیس کے اہلکاروں نے اپنے سر پر ٹوپیاں سیدھی کیں۔ صدر اور دیگر مہمان برآمد ہوئے۔ وزیر اعلیٰ نے ریلوے اسٹیشن کی راہ لیں جہاں سیلون ان کا منتظر تھا۔

صدر جنرل ضیاء الحق نے کنٹونمنٹ کا رُخ کیا۔ ان کا رات بھر کے لیے ملتان میں قیام تھا۔ مخدوم سجاد قریشی مہمانداری سے فراغت پا کر ہلکے پھلکے محسوس کر رہے تھے۔ ہمیں اپنے ہاں ڈرائینگ روم میں بھی لے آئے اور ملازم سے چائے لانے کے لیے کہا۔ گفتگو کے رسیا ہمیں ہلکی پھلکی باتوں سے محظوظ کر رہے تھے۔ کہنے لگے کہ صدر صاحب نے انہیں بھارت میں بتلا کر دیا تھا اور ان سے سوال کیا کہ کیا وہ بتا سکتے ہیں تھے کہ وہ (جنرل ضیاء) ان کے ہاں دولت گیٹ پر پہلی بار کب آئے تھے؟ مخدوم صاحب کا بلا کا حافظہ تھا۔ بولے، جب ان کی بطور کور کمانڈر یہاں پوسٹنگ تھی۔ صدر صاحب مخدوم صاحب سے بولے کہ وہ مات کھا گئے۔ جنرل ضیاء اُن کے ہاں اُس وقت حویلی میں آئے تھے جن دنوں وہ جنرل یعقوب علی کے سٹاف افسر ہوا کرتے تھے۔ جنرل یعقوب نے بیت القریش کے مخدوم صاحب کے ہاں آنا تھا۔ سٹاف افسر ضیاء الحق کے ذمہ روٹ ملاحظہ کرنا تھا۔ لیکن ایک فرض شناس افسر کی طرح ضیاء الحق نے نہ صرف مخدوم صاحب کے گھر کا روٹ دیکھا بلکہ اپنے ہمراہ پیمائشی فیتہ بھی لے آئے اور صدر دروازے کی چوڑائی ماپتے رہے تا کہ ان کے باس کی کار کو حویلی کے اندر لانے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو پائے۔ فرض شناسی کے عجب انداز ٹھہرے، بہت ممکن ہے کہ ان کی یہی عادات اُن کے لیے ترقی کا زینہ ثابت ہوتی گئیں۔ ایسی خوشنودی تو ہماری کمزوری سمجھی جاتی ہے۔

نومبر 1986ء میں میرا تبادلہ ملتان سے لاہور بطور ڈائریکٹر جنرل لوکل گورنمنٹ ہو گیا۔ لاہور آیا تو یہ تعیناتی میرے لیے عارضی ثابت ہوئی۔ ایک شام پیغام ملا کہ گورنر ہاؤس میں یاد کیا جا رہا ہے۔ وہاں پہنچا تو علی کاظم سے ملاقات ہوئی اور پتہ چلا کہ ان کا تبادلہ بطور سیکرٹری صنعت ہو رہا تھا اور ان کی جگہ میری تعیناتی متوقع تھی۔ کاظم کہنے لگے کہ گورنر اس وقت اپنی اسٹڈی میں تھے، چلیے ان سے مل لیں۔ ہم بالائی منزل میں ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ دھیمی روشنی میں ماحول عجب پُراسراریت میں گھرا ہوا تھا۔ مخدوم صاحب اٹھ کر ملے۔ حال احوال دریافت کیے چائے منگوا کر بھیجی اور نظر کے باریک چشمہ سے کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہو گئے۔ انہوں نے سر پر اجرک پگڑی باندھ رکھی تھی۔ میں نے انہیں سنجیدہ کیفیت میں پہلی بار دیکھا۔ رخصت چاہی تو بس اتنا کہا کہ کاظم صاحب سے کام کی نوعیت سمجھ لیں۔ چند روز تک آرڈر متوقع تھے۔ ہم سیکرٹری ٹو گورنر کے کمرے میں لوٹ آئے۔ سٹاف جاب Staff Job میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ اس سے بڑھ کر دیواروں میں گھری اسی وسیع و عریض اسٹیٹ میں کام کرنا، جسے میں بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا، بالکل ہی انوکھا تجربہ تھا۔ مال روڈ سے گزرتے سڑک کے ساتھ ساتھ یہ دیوار مجھے ایسی ہی دکھائی دیا کرتی جیسے اس شہر میں کئی دوسری سرکاری عمارات تھیں۔ جہاں عوام الناس کے لیے داخلے کی رسائی مشکل تھی۔ میں اس عمارت میں پہلی بار اپنے پیشہ ورانہ منصب کے حوالے سے آیا۔ تو یہ 1972ء کی بات تھی جب میں نے پاکستان ٹیلی ویژن میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ میں کیمرہ مین کے ہمراہ شملہ پہاڑی کی طرف گیٹ سے داخل ہوا اور دربار ہال کی بالکونی کی راہ لی۔ جہاں پریس کے بیٹھنے کا اہتمام تھا، دربار ہال کی شکوہ اُٹھان مہاگنی کی لکڑی پر کڑھائی کے خوبصورت کام انگریز کے 'راج' کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔

اس وقت کے وزیر اعلیٰ ملک خادم مصطفیٰ کھر کی حلف برداری تھی۔ بگل بجا، حاضرین کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے، وزیر اعلیٰ اور گورنر ہال میں داخل ہوئے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد حلف وفاداری کی رسم منعقد ہوئی۔ تقریب کے اختتام پر پولیس بینڈ روایتی دھن بکھیر رہا تھا۔ اسی ہال میں برسہابرس قاری صاحب کی زبانی سنتا رہا کہ یہ عہدے اللہ کی طرف سے امانت تھے اور اپنے امینوں سے بہت سی باتوں کا تقاضہ کر رہے تھے۔ پورچ کے سامنے وسیع و عریض سبز لان کو دیکھتے ہی تراوٹ سی اُمڈ آئی۔ کسے معلوم تھا کہ برسوں بعد میرا یہیں کئی برس کا قیام ہوگا۔

میرے تبادلے کے نوٹیفکیشن میں قدرے تاخیر تھی۔ گورنر کی خواہش اپنی جگہ تھی لیکن پنجاب کی روایتی بیوروکریسی کے کچھ تحفظات تھے۔ سب سے اہم نکتہ میری سنیارٹی کے بارے تھا کہ میں ابھی اس پوسٹ کے لیے نسبتاً جونیئر تھا۔ میرے پیش رو مجھ سے چھ برس سینئر تھے۔ یہ بات مخدوم صاحب کے علم میں لائی گئی تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور پھر بڑے دوٹوک انداز میں سرائیکی زبان میں اپنی حتمی رائے کا اظہار کیا۔ ''سائیں ساکوں سیان دا ہے'' جناب ہمیں تو جانتا ہے۔ اس جملے میں وہ بہت کچھ کہہ گئے اور اس کے ساتھ ہی میرے تبادلے کے آرڈر ہو گئے بعد ازاں معلوم ہوا کہ گورنر نے اس انتخاب کے سلسلے میں علی کاظم اور اپنے صاحبزادے شاہ محمود قریشی سے تفصیلی مشاورت بھی کی تھی۔

چارج سنبھالا تو مجھے مخدوم صاحب نے اپنی ترجیحات اور تحفظات سے آگاہ کیا۔ ان کا سب سے اہم حکمنامہ یہ تھا کہ مجھے یقینی بنانا ہوگا کہ ان کے خاندان کا کوئی بھی فرد گورنر ہاؤس سے کسی قسم کی ناجائز مراعات حاصل نہ کر پائے۔ وہ اپنی ذات پر اپنی جیب سے تمام اخراجات برداشت کرنا چاہیں گے۔ اہم بات یہ تھی کہ گورنر تحفے تحائف کے سلسلے میں صوابدیدی فنڈ سے رقوم خرچ کر لیا کرتے تھے۔ گورنر نے کہا کہ ان کے کسی عزیز، احباب جن کے ساتھ ان کے ذاتی دیرینہ تعلقات تھے ان کے لیے تحائف اور دیگر اخراجات سرکاری فنڈ سے قطعی نہیں ہوں گے اور گورنر ایسی ادائیگیاں اپنی جیب سے کیا کریں گے۔ ان ہدایات پر عملی ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے ملٹری سیکرٹری کرنل اعجاز آفندی کے ہمراہ بسا اوقات گورنر کے جوتوں کی پالش کا حساب بھی رکھنا پڑتا۔ کہیں تحفہ بھجوانے کے لیے متعلقہ شخص کے کوائف کی چھان پھٹک بھی کرنا پڑتی۔

گورنر ہاؤس کی ایکسچینج سے مخدوم صاحب کے صاحبزادوں اور دامادوں میں سے کسی نے انٹرنیشنل کال کر دی تو اگلے ماہ ان سے وصولی کر لی۔ گورنر کے عزیز و اقارب اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ مخدوم صاحب مجھ سے اکثر کہا کرتے ابھی تو بہتر تھا۔ یہ عملہ جو میرے آگے پیچھے ہو رہا ہے لیکن جس روز میں یہاں سے رخصت ہوا تو یہی وعدہ معاف گواہ بن جائیں گے اور بہت ممکن ہے میرے خلاف کچھ بھی نہ بن پایا تو کہہ دیں گے کہ مخدوم صاحب جاتے جاتے یہاں سے گملے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میری اچنبھا صورت دیکھ کر کہتے بیٹا میں نے زمانہ دیکھا ہے۔

چارج سنبھالا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اپنے کیریئر کے کئی برس یہاں گزار دوں گا۔ میرا قیام دو مختلف اداروں میں چھ برس تک محیط رہا۔ مجھے چار گورنروں اور دو چیف جسٹس صاحبان کے ساتھ جنھوں نے قائم

مقام گورنر کا منصب سنبھال کر کام کرنے کا موقع ملا۔ ان میں مخدوم سجاد حسین قریشی کے علاوہ جنرل ٹکا خان، مختصر مدت کے لیے میاں اظہر اور جنرل خالد مقبول کے ساتھ کام کا موقع ملا۔ چیف جسٹس صاحبان میں سے جسٹس مرحوم مجدد مرزا اور جسٹس شکورالاسلام کے ساتھ یہ موقع ملا۔ اس عرصہ میں گرتے، سنبھلتے اور بدلتے سیاسی منظرنامے کو بڑے قریب سے دیکھا، بڑے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں ذہن میں کھدبد پیدا کر دیتیں۔ ظاہری بڑھائی کے باوجود وہ مجھے اپنے جیسے ہی چھوٹے دکھائی دیتے اور میں کولہو کے بیل کی طرح خاموشی سے اپنے کام میں لگا رہا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کولہو کے بیل کی آنکھوں پر چمڑے کی پٹی کسی تھی کہ وہ کچھ دیکھ نہ پائے لیکن میری آنکھیں تو کھلی تھیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی بول نہ پاتا، شاید یہی میری تربیت کا خاصہ تھا۔ یہی سول سروس کی تربیت کا المیہ بھی تھا۔ پارلیمانی نظامِ حکومت میں اختیارات کا منبع تو وزیرِاعلیٰ کا منصب تھا لیکن گورنر کی بھی اہم آئینی ذمہ داریاں بھی تھیں۔ قانون سازی کے سلسلہ میں حتمی منظوری، یونیورسٹیوں کے حوالے سے بطور چانسلر اور پنجاب میں اہم خصوصی تعلیمی اداروں ایچی سن، کیڈٹ کالج حسن ابدال، صادق پبلک سکول اور لارنس کالج گھوڑا گلی کے بورڈ آف گورنرز کے چیئرمین کی حیثیت سے مصروفیت رہتی۔ مخدوم صاحب کی طبع کے پیشِ نظر وزیرِاعلیٰ پنجاب نے غیر رسمی طور پر محکمہ اوقاف کے امور بھی گورنر کے سپرد کر دیئے تھے۔ پہلی بار احساس ہوا کہ یہ محکمہ تو ایک ایمپائر تھی۔ اس کی اپنی آمدن اور بجٹ تھا۔ کتنے ہی مزارعات کے ساتھ سینکڑوں ایکٹر زرعی اراضی اور قیمتی جائیداد منسلک تھی۔ یہ صوبے کا واحد ایسا محکمہ تھا جو کئی اعتبار سے محکمہ خزانہ کے عمل دخل سے بھی باہر تھا۔ ایسی آزادی کی بناء پر اس محکمہ میں کرپشن اور اقرباء پروری کی شکایت بھی عام تھی۔ گورنر کی زیادہ تر دلچسپی ملتان کی درگاہوں کے بارے میں رہا کرتی۔ وہ دو اہم درباروں کے گدی نشین بھی ٹھہرے۔ سول سرونٹ کے حوالے سے یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ اندرونِ سندھ سے اُن کے مرید لاہور آتے۔ روحانی فیوض کی برکات تو اپنی جگہ ان کے ہاتھوں میں درخواستوں کا ایک پلندہ رہتا۔ کہیں کسی کی ملازمت کے جھمیلے تھے، کہیں تبادلے کا قضیہ تھا، کہیں بجلی اور سوئی گیس کے کنکشن کے مسائل تھے۔ گورنر کے پرسنل سیکرٹری حاجی نواز نے زائرین اور ان کے مسائل کا شعبہ سنبھال رکھا تھا۔ گورنر کے کمرے میں ان کے معتقدین کی آمد بھی دیدنی تھی۔ ان میں صاحبِ ثروت زمیندار اور سیاستدان بھی تھے۔ منتخب نمائندے بھی تھے۔ کمرے کے باہر جوتیاں اتارتے، سر ٹوپی سیدھی کرتے، خمیدہ کمر اور بندھے ہاتھوں سے اندر داخل ہوتے اور مخدوم صاحب کے گھٹنوں کو سرعت سے ہاتھ لگا کر قالین پر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے۔ حال احوال پوچھنے کے بعد پیر اور مرشد کا مکالمہ شروع ہو جاتا۔ تخلیہ کی ضرورت جانتے ہوئے میں اکثر کمرے سے نکل آتا۔ کہیں دنیاوی کام کی پھانس اٹکتی تو نائب قاصد نذیر مجھے اطلاع دیتا۔ گورنر صاحب یاد کر رہے ہیں۔ درباری کلچر کی زبان ہی جدا تھی۔ یہاں بلانے کا رواج نہ تھا یاد کرنے کا رواج۔ دفتر کا مفہوم صرف اس وقت تھا جس وقت گورنر اپنے آفس میں یا زیریں منزل پر بیٹھے تھے۔ گورنر نے جیسے ہی طے کیا اور رہائشی بلاک میں قدم رکھا، نائب قاصدوں نے ہلچل مچا دی کہ صاحب اٹھ گئے ہیں اور پھر اگلا سوال ہوا کرتا، صاحب آپ کی گاڑی لگوا دیں، گویا آپ بھی چھٹی لیں اور پھر برآمدے میں سٹول پر بیٹھ بیٹھے اونگھتے رہ

مالیاتی معاملات میں احتیاط کے علاوہ مخدوم صاحب کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور فوک وزڈم Folk Wisdom متاثر کن تھی۔ زندگی کے تلخ تجربات کو لطیف، طنزیہ انداز میں بیان کر جاتے اور اپنی ہی ذات کو ہدف بنا کر بات کا مفہوم نکالنا اور سننے والے کو باور کرا دینا انہی کا ملکہ تھا۔ کوئی سفارت کار ملنے کے لیے آتا تو فلسفے، تقابلی مذاہب اور تاریخ کے عروج و زوال پر بے تکان گفتگو کرتے۔ کسی دینی تقریب میں پہنچتے تو بلند ریڈیائی آواز میں آیاتِ کریمہ کا ورد شروع کر دیتے، اپنی ذات میں کئی جہتوں کو سموئے ہوئے تھے۔ معروف ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد نے مجھ سے ایک بار شیئر کیا کہ اس نے اپنے ایک پلے کا ایک کردار مخدوم صاحب کی ذات کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کیا تھا۔

مخدوم صاحب کا دن ملاقاتوں سے شروع ہو جاتا۔ بہت خوش رہتے، گفتگو کے گرویدہ اور بات کرنے اور نبھانے کے ہنر میں یکتا تھے۔ مجھے بسا اوقات ضروری ڈاک نکالنے کے سلسلے میں دشواری بھی پیش آتی۔ کسی چٹھی کو ہاتھ میں تھاما اور پھر بات کا رُخ کسی اور سمت نکل گیا۔ ایک بار مَیں نے ایک ڈرافٹ بنا کر ان کی منظوری کے لیے سامنے رکھ دیا۔ اسے بڑے غور سے دیکھا پھر بولے انگریزی تو بہت اچھی ہے لیکن آپ نے اوپر نیچے بہت جگہ چھوڑ دی ہے۔ مَیں نے اُن کو باور کرایا کہ یہ ایک رسمی مسودہ تھا اور اس کی فارمیٹنگ اسی طرح ممکن تھی، میرا بازو تھاما، اسے دبایا اور بولے مَیں آپ کو ایک بات سناتا ہوں۔ لمحے بھر کے لیے رُکے اور پھر گویا ہوئے، ایوب خان کا زمانہ تھا مَیں ملتان کارپوریشن کا وائس چیئر مین منتخب ہوا۔ ڈپٹی کمشنر بلحاظ عہدہ چیئر مین تھا، میرے لیے کوئی کم اعزاز نہ تھا آپ خود ڈپٹی کمشنر رہ چکے ہیں وہاں آپ نے ڈاکٹر جگر کا نام سن رکھا ہوگا لوہاری گیٹ والے۔ مَیں نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ ڈاکٹر جگر کے نام کے ساتھ ہی میرے ذہن میں مردانہ کمزوری کی کئی بیماریاں اور مقوی ادویات کے نام سرایت کرنے لگے۔ ڈاکٹر جگر کے اشتہارات اخبارات کی زینت بنتے۔ انہیں دعویٰ تھا کہ وہ مردانہ غلط کاریوں کا تیر بہدف علاج کرنے میں ماہر تھے۔ مخدوم صاحب کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ پھیلی بولے جب مَیں چیئر مین منتخب ہوا تو ڈاکٹر جگر نے مجھے مبارک باد کا خط لکھا۔ اس خط میں میری تعریفوں کے قلابے ملا دیئے۔ مَیں ان کے خط سے بہت متاثر ہوا اور پھر کارپوریشن کے لیٹر ہیڈ پر مَیں نے جواباً اُن کو شکریے کا خط لکھ دیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ دنوں بعد ایک صاحب ملنے آئے تو پوچھنے لگے ''مخدوم صاحب اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' ''مَیں ٹھیک ٹھاک ہوں اللہ کا کرم ہے، مخدوم صاحب نے اس شخص کو جواب دیا۔ ''چلیں اللہ کا شکر ہے، بس احتیاط لازم ہے۔'' مخدوم صاحب کہنے لگے مَیں اُن کی یہ بات نہ سمجھ پایا۔ کچھ دیر بعد ایک اور صاحب ملنے آئے، انہوں نے بھی اسی طرح کا سوال کیا اور میرے جواب سے ان کی تسلی نہ ہوئی۔ پھر بڑی رازداری سے پوچھنے لگے تو پھر ڈاکٹر جگر سے ہی علاج کرایا ہے۔ ''ڈاکٹر جگر! کیا بات کر رہے ہیں؟'' مخدوم صاحب نے اچنبھے میں سوال کیا۔ وہ شخص خاموش ہوگیا۔ اس شخص نے پیہم اصرار پر انہیں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کلینک میں آپ کا خط فریم کرا کے دیا ہوا ہے جس میں آپ نے ان کی مبارکباد کا شکریہ ادا کیا تھا اور خط کے اختتام پر اضافی نوٹ تحریر کیے تھے کہ ''ڈاکٹر صاحب آپ نے جو گولیاں دی تھیں انہوں نے خوب اثر کیا

صاحب کی بظاہر اس آئرنی Irony نے بڑا اثر کیا۔ وہ گورنر صاحب کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ مسلسل ہنسے جا رہے تھے۔ پھر کہنے لگے، ایسے اہم خط لکھتے وقت اتنا مارجن نہ چھوڑا کرو آخر کوئی ڈاکٹر جگر جیسا ہی نہ ٹکر جائے۔ مخدوم صاحب کی بظاہر اس آئرنی Irony نے بڑا اثر کیا۔

وہ پرانی وضع کے روایتی سیاست دان تھے۔ رواداری، معاملہ فہمی ان کی طبیعت کا خاصا تھا۔ لوگوں کی رمز کو خوب سمجھتے، کئی اعتبار سے کامیاب بناض تھے۔ سسٹم کی باریکیوں اور سفا کیوں کو اس طرح سمجھتے کہ بسا اوقات مجھ جیسے شہری پس منظر رکھنے والے کو ان کی گفتگو سن کر کپکپی سی ہونے لگتی۔ ایک دفعہ خبر ملی کہ ملتان میں دیرینہ عداوت کی بنا پر ایک زمیندار نے اپنے مخالف کی ٹانگیں تڑوا دیں۔ خبر پر تاسف کا اظہار کیا اور کہنے لگے بھلا اب ٹانگیں تڑوانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ مخالف کو چکروں میں ہی ڈالنا تھا تو اس کی گرداوری تڑوا دینا ہی کافی تھا۔ پٹواری، تحصیلدار اور عدالتوں کی خاک چھاننے کے لیے بھلا یہی کچھ کم تھا۔ روایتی حلقے سے کوئی ووٹر کسی کام کی غرض سے لاہور آ گیا تو سب کی دوڑ لگ جاتی۔ مخدوم شاہ محمود کے حلقے میں معروف قصبے کوٹھے والا ذکر کرتے کہ وہاں سے کوئی درخواست دہندہ سائل لاہور شاہ محمود قریشی کی تلاش میں آ جائے تو اس کی دوڑ لگ جاتی ہے۔ حلقے کے ووٹر کی ناراضگی بھلا کیونکر مول لی جائے۔ لوگ بھی ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ کیے بیٹھے رہتے ہیں لیکن یہ سلسلہ کہیں رکتا نظر نہیں آتا۔ کسی کا کام ہو گیا تو چند دن کے توقف کے بعد وہ کوئی نئی سر دردی لے کر پہنچ گیا۔ ان دنوں ملتان سے ایک صاحب تواتر سے آیا کرتے۔ سفید شلوار قمیص میں ملبوس سر پر قراقلی سجائے مخدوم صاحب کے انتظار میں گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ اس شخص کا صاحبزادہ مخدوم صاحب کی وساطت سے زرعی ترقیاتی بنک میں ملازم ہو گیا۔ گریجوایٹ تھا۔ وہ ہر وقت اس احسان کے لیے ممنون دکھائی دیتا۔ جب بھی حاضری دیتا اسی بات کو دہراتا کہ وہ اس احسان کا بدلہ تو زندگی بھر نہ ادا کر پائے گا۔ ایک روز وہ صاحب رخصت ہونے لگے تو مخدوم صاحب کہنے لگے کہ اس شخص کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اب کوئی اور کام کہنے والا تھا۔ میری اس بات پر کہ مجھے کوئی شائبہ بھی نہیں مل پایا تھا۔ مخدوم صاحب اپنی بات پر مُصر تھے وہ اس سلسلے میں دوبارہ آئے گا۔ گورنر اس بات کے بارے میں باور نہ کرا سکے پھر کہنے لگے شاہ محمود نے ووٹ لینے اب یہ بار تو پانچ برس اٹھانا تھا۔

اس شخص کا بیٹا گریڈ سترہ میں ایگریکلچر آفیسر کے عہدے پر تعینات تھا۔ پھر وہی بات ہوئی جس کا اندیشہ تھا۔ وہ صاحب اس بار بیٹے کے لیے گریڈ اٹھارہ کی فرمائش لے کر آ گئے۔ مخدوم صاحب نے اس شخص کو کمال تحمل سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ابھی اس کے بیٹے کی سروس کے اوئل سال تھے۔ بہت وقت پڑا تھا، ایسی ترقیاں ایک نظام کے تابع تھیں۔ وہ شخص اصرار کرتا رہا، جب انہیں مخدوم صاحب کی طبیعت میں ناگواری کا احساس ہوا تو مزید کچھ کہے بنا وہاں سے منہ دبانہ سلام پیش کر کے رخصت ہو گیا۔ موصوف اپنی دھن کا پکا تھا، مہینے بھر کے بعد چکر لگتے اور ہر بار بیٹے کی ترقی کا قصہ دہراتے۔ ساتھ ہی کچھ اور کام اٹھا کر لے آتے۔ عمومی نوعیت کے کام تو ہو جاتے لیکن بیٹے کی ترقی کا مسئلہ اُسے بے چین کیے رکھتا۔

چند ماہ تک خاموشی رہی، لیکن ایک روز وہ صاحب پھر سے لاہور پہنچ گئے اور اسی تقاضے کا اعادہ کیا۔ مخدوم صاحب سے نہ رہا گیا۔ زچ ہو کر اس شخص کی طرف دیکھا اور سرائیکی میں سوال کیا ''تساں ڈسو، اُتھاں بنک اچ کیکوں گریڈ اٹھارہ ملیا اے۔'' (آپ ہی بتا دیں، بنک میں کس کو گریڈ اٹھارہ ملا ہے) 'ہاسئیں ہاسئیں، ملیا اے، ملیا اے نا۔' وہ شخص اپنی بات تواتر سے دہرانے لگا۔ ''کیکوں؟'' مخدوم صاحب نے اپنی آواز بلند کی۔

''سئیں ایئر مارشل نور خان دے پتر کوں'' (جناب ایئر مارشل نور خان کے صاحبزادے کو) مخدوم صاحب چہل قدمی کرتے ہوئے اس شخص کی طرف بڑھے، اس کی ٹھوڑی تھام کر بلند کی اور بولے ''پتر کوں آکھو او وی نور خان دا پتر بݨ ونجے'' (بیٹے کو بولو کہ وہ بھی نور خان کا بیٹا بن جائے) مخدوم صاحب کے جملے میں بلا کی کاٹ تھی۔ دانش بھی، سسٹم کی کمزوریوں اور شہ زوریوں پر کامنٹ بھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ صاحب منہ لٹکائے گورنر کے پی۔اے کے کمرے کی طرف چلے بنے۔ مخدوم صاحب نے گہرا سانس لیتے ہوئے توقع کا اظہار کیا کہ اس شخص کے حوالے سے اب اگلے چند ماہ آرام سے گزر جائیں گے۔ ''یہ لوگ راستہ پوچھتے ہیں، دکھا دو، تو پھر کہتے ہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے چلو'' انہوں نے خفیف خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

ملتان کی علاقائی سیاست میں قریشی اور گیلانی خانوادے بیسویں صدی کے اوائل ہی سے متحارب گروپ ابھر کر سامنے آئے۔ ہر ممکنہ انتخاب کے موقع پر سیاسی تقسیم گہری اور واضح ہوتی گئی اور کئی سیاسی دھڑوں اور خانوادوں نے ان دو اہم گروپوں کے ساتھ الحاق ضروری سمجھا۔ اس سیاسی تقسیم کے باوجود انہوں نے وضع داری اور رواداری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ 1987ء کی بات ہے ان دنوں معروف ادیب جناب مختار مسعود سٹاف کالج لاہور میں بطور پرنسپل تعینات تھے، غالباً ان کی صاحبزادی کی شادی تھی۔ مَیں مخدوم صاحب کے ہمراہ تھا۔ سٹاف کالج کے لان میں مخدوم صاحب نے مرحوم مخدوم حامد رضا گیلانی کو دیکھا، دونوں ایک دوسرے کی طرف لپکے۔ ان حضرات کی کوشش تھی کہ دوسرے صاحب کے گھٹنوں کو چھونے میں وہ کامیاب ہو جائیں اور پھر اس پیرانہ سالی میں متحارب مخدومین نے ایک دوسرے کے گھٹنوں کو یوں چھوا کہ اپنی تمام باریک بینی کے باوجود مَیں اندازہ نہ کر پایا کہ ان دونوں میں سے اس کارِ خیر میں پہل کس نے کی۔

ایک بار مَیں مخدوم صاحب کے ہمراہ ملتان گیا ہوا تھا۔ گورنر اپنی رہائش گاہ سے نکلے تو کار میں مَیں اور ملٹری سیکرٹری لیفٹیننٹ کرنل اعجاز آفندی ان کے ہمراہ تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک عمر رسیدہ دیہاتی وضع کا شخص سڑک کے کنارے دکھائی دیا۔ مخدوم صاحب کی نظر پڑ گئی اور بولے ''یہ شودہ (سرائیکی میں غریب بیچارہ) یہاں کیا کر رہا ہے۔'' وہ شخص تہبند اور پگڑی پہنے ہوئے تھا۔ گورنر نے فوراً گاڑی روکنے کا کہا۔ ملٹری سیکرٹری سے بولے کہ وہ دوسری گاڑی میں سوار ہو جائے اور مجھے اگلی نشست پر سوار ہونے کے لیے کہا۔ کار کے دروازے کا شیشہ اتار کر اس شخص کو اشارہ کیا اس کی جیسے باچھیں کھل گئیں۔ وہ شخص اچک کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے کار کا گیئر بدلا اور ہم حسین آگاہی کی طرف چل نکلے۔ مخدوم صاحب اور وہ شخص جو بعد میں پتہ چلا ان کا محلے دار تھا زوردار قہقہے لگا رہے

تھے۔ اور بات بات پر ہاتھ مار رہے تھے۔ مَیں سمجھ نہ پا رہا تھا۔ آخر اتنا ہنسنے کی کیا وجہ تھی۔ ایک بات تو طے تھی جس وقت وہ شخص گورنر کے اشارے پر سوار ہوا تو اس منظر کو بھرا بازار دیکھ رہا تھا۔

مرسیڈیز کار نے جونہی دولت گیٹ سے حسین آگاہی کی طرف موڑ کاٹا تو منظر بدل چکا تھا۔ مخدوم صاحب نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی اس شخص کو کار سے اترنے کا کہہ دیا۔ ''لے ونج'' اتر جاؤ کے الفاظ سنتے ہی وہ مخدوم صاحب کے گھٹنوں کو چھو کر کار سے اترا اور ہجوم میں غائب ہو گیا۔ مخدوم صاحب مسکرا رہے تھے، کہنے لگے اب اس شخص کا ہفتہ بہت اچھا گزرے گا۔ علاقے میں دھوم مچ جائے گی کہ گورنر اسے اپنے ساتھ بٹھا کر نہ جانے کہاں لے گئے۔ اسے مجھ سے کوئی غرض و غایت نہیں۔ وہ بولے ''دیکھا اس کی مکاری'' بار بار کہہ رہا تھا کہ مَیں سائیں آپ کی زیارت کے لیے کھڑا تھا۔ ''چلیں ہمارا کیا گیا اتنی سی بات سے اس کے کئی کام ہو جائیں گے۔''

اس تلخ زمینی حقیقت کی کچھ مزید سمجھ مجھے ان دنوں آئی جب مَیں عبوری حکومت میں سیکرٹری ٹو چیف منسٹر تھا۔ میاں افضل حیات نگران وزیراعلیٰ تھے۔ ٹیلی فون کا بزر بجا۔ آپریٹر نے اطلاع دی کہ صاحب یاد کر رہے ہیں۔ وزیراعلیٰ کے آفس میں داخل ہوا تو وہاں گجرات سے تعلق رکھنے والے صوبائی اسمبلی کے الیکشن کے ایک اُمیدوار بیٹھے ہوئے تھے۔ وزیراعلیٰ نے میرا ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ایک کام کیجیے۔ ڈپٹی کمشنر کو ٹیلی فون کریں کہ وزیراعلیٰ ان سے بات کرنا چاہتے تھے۔ رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا، مَیں نے عرض کیا کہ موصوف تو آپ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے 'سیکرٹری صاحب آپ کچھ سمجھیں۔ ڈپٹی کمشنر کو صرف فون چلا جائے۔ نہ مَیں ان سے بات کرنے کا متمنی ہوں اور نہ یہ صاحب مجھ سے گفتگو کے خواہاں ہیں۔ بس شام تک ضلع بھر میں خبر پھیل جائے باقی ان کی قسمت'، دونوں احباب ہنسنے لگے۔

بیوروکریسی اور سول سرونٹس کے بارے میں مخدوم صاحب بڑا عملی نظریہ رکھتے تھے۔ ان کے مخصوص تصورات کے پیچھے نہ صرف زمینی حکمت تھی بلکہ ان کا وسیع تجربہ تھا۔ وہ دس برس کی عمر سے اپنے والد کے ہمراہ سرکاری افسروں سے ملتے رہے۔ وہ سول سرونٹس کی ذہانت اور متانت کے قائل تھے لیکن کئی اعتبار سے شاکی بھی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قبیلہ پھسلن اور کسی گیلی جگہ پر پاؤں رکھنے سے اجتناب کرتا تھا۔

سرائیکی میں کہا کرتے ''انہاں وچ سپ دی پھنکار دی ہے، تے پیراں تھلے زمین دی نئیں'' (ان میں سانپ کی پھنکار بھی ہے اور پاؤں تلے زمین بھی نہیں) ترنگ میں آ جاتے تو بھری محفل میں بھی قصہ سنانے سے نہ چوکتے، ایک تقریب میں اُنہیں وزیراعلیٰ کے ہمراہ کہیں پہنچنا تھا، دونوں ایک ہی کار میں سوار تھے۔ جونہی اپنے مقام پر پہنچے ایک صاحب نے آگے بڑھ کر مخدوم صاحب کا دروازہ کھولا۔ ان صاحب کی جونہی گورنر پر نظر پڑی تو دروازے کو چھوڑ کر کار کی دوسری طرف بھاگ نکلے تا کہ جلدی سے وزیراعلیٰ کا دروازہ کھول دیں۔ وہ اکثر کہا کرتے:

"The one who controls the power shaft ultimately matters."

ایک بار میرے ذمے ایک اُلجھا ہوا کیس کر دیا۔ مَیں نے خاصی عرق ریزی کی اور بتایا کہ قواعد کے مطابق

ایسا ممکن نہ تھا۔ کہنے لگے کہ یہ بات تو وہ خود بھی جانتے تھے۔ اگر ایسی بات تھی تو آپ کو ساتھ رکھنے کا کیا فائدہ تھا۔ مطمع نظر یہی تھا کہ قواعد میں رہتے ہوئے بھی راہیں کھل سکتی تھیں اور ہر بات پر ناں مناسب نہ تھی۔

گورنر گراؤنڈ فلور پر اے ڈی سی کے دفتر سے متعلقہ ملاقاتیں کرتے۔ رسمی ملاقات کے سلسلے میں اپنا دفتر کھلوا لیتے۔ ملاقات کے وقت ان کے کمرے کا دروازہ مکمل طور پر کھلا رہتا اور ملاقاتی دور سے آتا دکھائی دیتا۔ ایک روز جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک مقتدر سیاسی رہنما ملنے آئے۔ مَیں نے بیٹھنا مناسب نہ سمجھا کہنے لگے میرے پاس ہی بیٹھے رہو۔ یہ شخص منافق ہے باہر جا کر نہ جانے کیسی باتیں مجھ سے منسوب کرے۔ وہ صاحب لمبے قدم بھر کر کمرے میں داخل ہوئے۔ مخدوم صاحب نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا اور برجستگی سے بلند آواز ہوئے:

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

گورنر کے ملاقاتیوں میں ملتان، اندرونِ سندھ، کراچی، لاہور سے متعلقہ احباب کے علاوہ غیر ملکی مہمان بھی ہوا کرتے تھے۔ کچھ تو سرکاری منصب کے حوالے سے ملنے چلے آتے جن سے ملاقات کے سلسلے میں متعلقہ اداروں اور محکموں سے بریف لیا جاتا اہم نکات وضع کیے جاتے اور اس بات کا اہتمام کیا جاتا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ملکی نکتہ نظر سے مطابقت نہ رکھتی ہو یا اس کے بارے میں تفصیلی علم نہ ہو۔ ایک موقع پر فوری نوٹس پر معروف بھارتی صحافی بھابانی سین گپتا کو ملاقات کا وقت دے دیا گیا۔ میری پروگرام پر نظر پڑی تو مَیں نے فوری طور پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ میرے نکتہ نظر سے ایسی ملاقات کے بارے میں فارن آفس اور ایکسٹرنل پبلسٹی ونگ (External Publicity Wing) سے چند پالیسی امور کے بارے میں وضاحت اور صراحت ضروری تھی۔ یہ بات گورنر صاحب کے علم میں لائی گئی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ملاقات کا وقت طے ہو چکا تھا اور اسی شام تھی، کہنے لگے اچھا کیا آپ نے باور کرا دیا مَیں اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔ شام ہوئی اور گپتا صاحب ملاقات کے لیے آئے۔ ان کا مقصد ظاہر تھا گورنر سے انٹرویو کے خواہاں تھے۔ مخدوم صاحب بڑے انہماک سے ملے۔ چائے آرڈر کی۔ مہمان کا حال احوال دریافت کرتے رہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل کی یادوں کا حوالہ دیا اور پھر رامائن پر گفتگو کا آغاز کر دیا۔ گفتگو طوالت پکڑ گئی۔ موضوع اختتام کو پہنچا تو مخدوم صاحب نے بھگوت گیتا کے اشلوک سنانے شروع کر دیئے۔ مکسڈ کافی کے گھونٹ نگلتے رہ گئے۔ اسی اثنا میں مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا۔ اے ڈی سی دروازے پر منتظر تھا۔ مہمان کے لیے گفٹ پیک تیار تھا۔ ان کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ انہیں نماز کے بارے میں باور کرایا۔ بھابانی سین گپتا قدرے حیرت میں تھے، کہنے لگے ان کی اس وقت تریسٹھ سال عمر تھی۔ ایسا کبھی نہ ہوا، وہ تو انٹرویو لینے آئے تھے لیکن مخدوم صاحب اس دوران ان کا انٹرویو لیتے رہے۔ گورنر کھلکھلا کر ہنس دیئے، وعدہ کیا جب بھابانی اگلی بار پاکستان آئیں گے تو ان کے ساتھ کھل کر باتیں ہوں گی۔

دوپہر ڈھل چکی تھی موسم میں بھی خنکی تھی، سوچا دفتر سے ہو آؤں۔ چیف منسٹر آفس سے چند ضروری فائلیں

متوقع تھیں۔ صدر ضیاء الحق لاہور آئے ہوئے تھے۔ گورنر ہاؤس میں قیام تھا۔ مارچ کے مہینے میں موسم بہار اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ پنجاب میں ان دنوں ہارس اینڈ کیٹل شو کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ان دنوں ترکی سے ایک معروف بینڈ آیا ہوا تھا۔ اس بینڈ کی بڑی دھوم مچی ہوئی تھی۔ توقع تھی کہ 23 مارچ کے موقع پر اُردن کے شاہ حسین کی آمد کے موقع پر اس بینڈ نے خاص طور پر اپنی پرفارمنس پیش کرنا تھی۔ میں نے پورچ سے خاصے فاصلے پر گاڑی کو روکا۔ ان پر نظر پڑی۔ صدر جنرل ضیاء الحق آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سرمئی رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اکیلے بیٹھے تھے۔ اس وقت ان کے سامنے ترک بینڈ موسیقی کی دھنیں بکھیر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے دفتر کا رُخ کیا جو گورنر ہاؤس کی زیریں منزل میں ہی تھا۔ گورنر، اے ڈی سی کے ملحقہ کمرے میں دروازہ کھول کر اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اشارہ کیا اور اندر بلا لیا۔ پاس بٹھایا اور کہنے لگے صدر صاحب خاصی دیر سے لان میں اکیلے بیٹھے بینڈ کی دھنیں سن رہے ہیں۔ مجھے بھی کہہ رہے تھے۔ میں خاموش رہا تو کہنے لگے مخدوم صاحب میں جانتا ہوں یہ آپ کے آرام کا وقت ہے آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ میں بھلا کب آرام کروں۔ ملک کا صدر اس وقت اتنی اہم ڈیوٹی دے رہا ہے تو میں بھی دروازہ کھول کر یہاں بیٹھا ڈیوٹی دیتا رہوں گا۔ ان کے لہجے میں ہلکی سی کاٹ تھی۔ سلسلہ ختم ہو گا صدر صاحب اپنے کمرے میں جائیں گے تو میں بھی یہاں سے اٹھ جاؤں گا۔ میں نے گورنر سے اجازت چاہی اور اپنے دفتر میں چلا گیا۔ میرے کمرے کی مین کھڑکی برآمدے میں کھلتی تھی۔ میں کھڑکی کی جالی میں سے بیرونی منظر دیکھ سکتا تھا۔ بینڈ کی جیسے ہی کوئی دھن مکمل ہوتی جنرل ضیاء الحق کے چہرے پر فراخدلانہ مسکراہٹ بکھر جاتی اور وہ ہاتھ اٹھا کر زوردار تالیاں بجانے لگتے اور ہاتھ کے اشارے سے مزید ایک دھن کی فرمائش کر دیتے۔ میں نے اپنا کام مکمل کیا مزید بیٹھے رہنا بے مقصد تھا لیکن یہاں سے جانا بھی مناسب نہ تھا۔ گورنر ابھی تک بیٹھے ہوئے تھے۔ بینڈ کی دھنوں کا سلسلہ مغرب کی اذان تک جاری رہا۔ صدر کے علاوہ گورنر ہاؤس کے دربان اور نائب قاصد برآمدے میں سمٹے بڑی سراسیمگی سے اس منظرنامے کو دیکھ رہے تھے۔ مغرب کی اذان ہوئی تو بینڈ کو چھٹی ملی۔ صدر نے لان ہی میں جائے نماز منگوالیا۔ مخدوم صاحب وہاں سے اٹھے اور اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور گھر کی راہ لی۔ اگلے روز ملٹری سیکرٹری سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ بینڈ کی دھنوں کے اختتام سے اس کے کام کی نوعیت میں تو اور بھی اضافہ ہو گیا۔ صدر نے حکم دیا کہ بینڈ کے تمام اراکین کے لیے راتوں رات بڑھیا تحائف کا اہتمام کیا جائے۔ ہفتے کی رات تھی اگلے دن چھٹی تھی بھاگم دوڑ کے بعد شیخوپورہ لاہور روڈ پر ایک فیکٹری کا ویئر ہاؤس Ware House کھلوایا گیا اور سیمسونائٹ (Samsonite) کے غالباً ستر صندوقوں کا اہتمام کیا گیا۔ یہ صندوق گورنر ہاؤس منگوائے گئے اور بینڈ کے اراکین میں تقسیم کر دیئے گئے۔ اس واقعہ کو جب سوچا یہی خیال گزرا کہ ہمارے ارباب اقتدار کی معصومانہ خواہش سرکاری خزانہ پر کس قدر بار کا باعث بن جاتی ہے۔ منہ سے نکلا لفظ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ حکام کل پرزے سب کچھ بھول جاتے ہیں اور پھر مجھ جیسے کئی دوسرے لوگ اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔

ملتان میں میری تعیناتی کے دوران میں خانیوال بطور ایک نئے ضلع کے طور پر وجود میں آ چکا تھا۔ دو ڈھائی برس کی مدت کے بعد اس ضلع کے خدوخال واضح ہونا شروع ہو چکے تھے۔ خانیوال سے مجھے ویسے بھی خاص انس تھا۔ مَیں یہاں اپنے کیریئر کے اوائل میں اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا۔ معروف شاعر جناب مصطفیٰ برلاس بطور ڈپٹی کمشنر آئے تو شہر کی شاموں کو ایک جیتا جاگتا ادبی حوالہ مل گیا۔ آئے دن ادبی محفلوں کا اہتمام ہونے لگا۔ ضلعی انتظامیہ کا تو خاصا تھا۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ معتبرین شہر کا بھی کچھ ایسا ہی طور تھا۔ ضلع کا افسر اعلیٰ اگرچہ برج کا شوقین تھا۔ شام ہوتے ہی مقامی سول کلب میں ہر طرف تاش کے پتے پھینٹے جا رہے تھے۔ اگر افسر ٹینس کا دلدادہ تھا تو کورٹ میں پریکٹس کے لیے بھی جگہ میسر نہ تھی۔ لیہ میں تو مرحوم مصطفیٰ زیدی کی جرمن نژاد بیگم کے نام پر تو ایک کلب کھڑا کر دیا گیا۔ مرتضیٰ برلاس شاعر تھے جہاں گئے شعری نشستیں بچھ گئیں۔ ماہتاب راتیں اترائیں۔ مضافاتی علاقوں کے شعراء بغل میں بیاض دبائے کشاں کشاں چلے آئے۔

خانیوال میں ضلعی انتظامیہ کی سرپرستی میں اُردو کانفرنس کا اہتمام تھا۔ اس کانفرنس کے ایک اجلاس میں گورنر کو مدعو کیا گیا۔ ہم ملتان سے آئے تھے۔ مصروفیات سے فارغ ہوتے ہی خانیوال پہنچ گئے ارادہ تھا کہ کانفرنس سے فراغت پاتے ہی لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ خانیوال میں بڑا مصروف دن گزرا۔ کانفرنس میں شرکت کی، ریسٹ ہاؤس میں لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ یہ سلسلہ اختتام کو پہنچا تو ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ جہاں گورنر کا سیلون ہمارا منتظر تھا۔ مخدوم صاحب کے چہرے پر دن بھر کی تھکن کے آثار بہت نمایاں تھے۔ سفر کا آغاز ہوا تو ان کی طبیعت میں بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ لاہور تک کا سفر کسی طور کٹ گیا۔ گورنر ہاؤس پہنچے تو ڈاکٹر خالد پرویز میڈیکل آفیسر کو بلا بھیجا۔ انہوں نے معائنہ کیا اور فوری طور پر آرام کا مشورہ دیا۔ آخر شک گزرا کہ کہیں دل کی تکلیف نہ ہو۔ معروف کارڈیالوجسٹ پروفیسر ڈاکٹر زبیر اور ڈاکٹر شہریار شیخ کو بلایا، انہوں نے گورنر کی حالت دیکھتے ہی فوری طور پر ہسپتال منتقل ہونے کا مشورہ دیا۔ مخدوم صاحب کو میو ہسپتال میں البرٹ وکٹر وارڈ میں داخل کر لیا گیا۔ ابتدائی ٹیسٹوں سے معلوم ہوا کہ انہیں دورانِ سفر دل کی تکلیف ہو گئی تھی۔ معالجین نے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ مخدوم صاحب کی علالت کی خبر سنتے ہی اہلِ خانہ جن میں بیٹے، بیٹیاں، داماد ہسپتال پہنچ چکے تھے۔ بیگم صاحبہ تو رحلت کر چکی تھیں، گورنر ہاؤس میں اکیلے ہی قیام کرتے۔

اگلی صبح مخدوم صاحب اپنی تکلیف اور نقاہت بھلا کر ہر آنے جانے والے کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ ہلکی پھلکی شگوفے بازی سے بھی کام لے رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود بھی باتھ روم میں جا کر شیو کر آئے۔ ان کی حالت پر ان کی بڑی صاحبزادی مغموم اور پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ مخدوم صاحب نے بھری نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا اور بھاری آواز میں کمزوری کے باوجود اپنے والد مرحوم کا قصہ سنانے لگے۔ کہنے لگے ان کے والد کا آخری وقت تھا، مخدوم صاحب اپنے والد کی حالت سے خاصے مغموم تھے۔ والد نے اپنے صاحبزادے کی اس کیفیت کو بھانپا اور تنبیہ کی کہ موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں تھی۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو بیٹا تم آگے کی تیاری

ابھی سے شروع کر دو۔ دھلے دھلائے لباس کا انتظام کرو، نیا کھسہ پہنو۔ سر پر کلف دار پگڑی پہن لو اور مہمان آئیں گے تو ان کے لیے قیام اور طعام کا بندوبست کرو۔ دنیا سے جانے والے کی قبر اور کفن دفن کے مراحل بھی ضروری تھے اور ہاں پھر دستار بھی تیار حالت میں ہو۔ مخدوم صاحب نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے والد کی یہ باتیں سن کر اپنا غم بھول گئے اور ان کی کہی ہوئی باتوں پر غور سے سوچنے لگے۔ وہ اس وقت وہاں موجود اپنے بچوں کو بھی یہی تلقین کر رہے تھے۔ انہوں نے مختصر سی گفتگو میں زندگی کا تجزیہ کشید کر دیا۔

گورنر چند ہی دنوں میں ہسپتال سے فارغ ہوئے اور چیک اپ کے لیے لندن روانہ ہو گئے۔ مخدوم صاحب کی ملک سے عدم موجودگی کی بناء پر مجھے مختلف اوقات میں قائم مقام گورنر صاحبان کے ساتھ کام کا موقع ملا۔

ملک میں اگرچہ پارلیمانی نظامِ حکومت قائم ہو چکا تھا لیکن صدر نے اپنی ذات میں کئی حتمی اختیارات مذکور کر رکھے تھے۔ ان میں آٹھویں ترمیم کے تحت حکومت کی برخواستگی اور اسمبلیوں کے تحلیل کیے جانے کے اختیارات بھی تھے۔ زیرک حلقے محسوس کر رہے تھے کہ صدر ضیاء الحق اور وزیراعظم محمد خان جونیجو کے مابین ایک سرد جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔ ویسے بھی یہ ایک فطری امر تھا۔ نظام کا تخلیق کار یہ بات کس طرح گوارہ کر سکتا تھا کہ کوئی اور ہستی یا ادارہ اس سے بھی مقتدر ہو سکتا تھا۔ یہ سرد جنگ مختلف حوالوں سے محسوس کی جا سکتی تھی۔ ان دونوں مقدر ہستیوں کے مابین کئی اور دیگر امور کے علاوہ ہر دوسرے ہفتے لاہور دورہ کرنے کا مقابلہ رہتا۔ شاذ ہی کوئی دن تھا جب اسلام آباد سے صدر یا وزیراعظم سیکرٹریٹ سے لاہور یا پنجاب کے کسی کونے کھدرے میں ان شخصیات کے متوقع دورے کا پیغام نہ ملتا۔ گورنر کے ملٹری سیکرٹری کی دوڑ شروع ہو جاتی۔ کاروں کے فلیٹ کا اہتمام، اسٹاف کے قیام و طعام کے انتظامات اپنی جگہ، صوبائی اور ضلعی انتظامیہ کو سیکورٹی اور تقریب سے متعلقہ تفصیلات کی فکر ہو جاتی۔ ادھر ملاقاتیوں کی فہرستیں تیار کی جاتیں۔ اطلاعات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ گورنر کی شرکت بھی ضروری ہوا کرتی۔ ان انتظامات میں ہمارا سیکرٹریٹ بھی اپنا حصہ ڈال دیتا۔ ان دونوں کے درمیان سرکار کا باقی کام ٹھپ ہو جاتا۔ گورنر ایسی صورتحال سے نالاں رہتے۔ بے مقصد دوڑ سے محض وقت کا ضیاع تھا لیکن کون سمجھاتا۔ ان دوروں کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ ان سے اجتناب کیا جا سکتا تھا لیکن وی آئی پی موومنٹ اخبار کی اہم خبر تھی، کون پیچھے رہنا چاہتا تھا۔ ایک روز اطلاع ملی کہ صدر مملکت چیچہ وطنی میں کبڈی میچ کا فائنل دیکھنے جا رہے تھے۔ گورنر اور وزیراعلیٰ کا وہاں پہنچنا لازم امر ٹھہرا۔

گورنر اس وقت کمرے میں بیٹھے منتظر تھے کہ کس وقت موسم بہتر ہو اور وہ چیچہ وطنی کا رُخ کریں۔ لاہور سے سیسنا طیارے پر پرواز تھی۔ لینڈنگ غالباً اوکاڑہ کینٹ میں تھی اور وہاں سے کاروں کا سفر تھا۔ وزیراعلیٰ بھی ان کے ہمراہ جانے والے تھے۔ لاہور موسلا دھار بارش کی زد میں تھا۔ آسمان صبح سے سیاہ بادلوں سے گھرا تھا جو اب ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ گورنر نے اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رکھا ہوا بارش کی تیز پھوار سے سامنے برآمدہ جل تھل کر رہا تھا۔ لان زوردار بارش سے دھندلا سا گیا تھا۔ گورنر شملہ کو یاد کر رہے تھے۔ ایسی ہی برسات ہوا کرتی تھی۔ کہنے لگے چالیس کی دہائی میں وہ اپنے والد مرحوم کے ہمراہ شملہ جایا کرتے تھے۔ ان دنوں قائداعظم بھی شملہ آیا کرتے۔ ان سے

ملاقات ہوتی تو بڑی شفقت سے پیش آتے اور اکثر اخبار بینی کی تلقین بھی کرتے۔ مخدوم صاحب پھر قائد کا ایک جملہ دہرانے لگے:

Sajid have you read the leader today?

لیڈر سے قائداعظم کی مراد اخبار کے اداریہ سے ہوتی، وہ اُن کا نام سجاد نہ ادا کر پاتے اور مخدوم صاحب کو ساجد کے نام سے پکارتے۔ باتوں باتوں میں اپنے صاحبزادے شاہ محمود قریشی کا ذکر چھیڑ لیتے۔ اسے دیکھو سارا دن یہ لوگوں کی فائلیں تھامے سرکاری اہلکاروں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ حلقے کے ووٹر دم ہی نہیں لینے دیتے۔ ہمارے زمانے میں تو یہ حال نہ تھا۔ مَیں نے انہیں باور کرانے کی کوشش کی کہ ان کے زمانے میں تو ڈیرے پر بیٹھتے ہی ووٹوں کے فیصلے ہو جاتے تھے۔ اب تو اُمیدوار کو جیتنے اور پھر اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لیے ووٹر کا دَم بھرتے رہنا پڑتا ہے۔ شاہ محمود قریشی ان دنوں صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ بعد میں صوبائی اور وفاقی وزیر کا منصب بھی سنبھالا۔ محنتی تھے اور اچھی شہرت پائی، لیکن سیاست تو غیر یقینی کھیل تھا۔ ملتان میں سیّد یوسف رضا گیلانی کے ہاں جو اِن دنوں وزیر ریلوے تھے، کچھ لوگ چائے پر مدعو تھے۔ میرے علاوہ مخدوم شاہ محمود قریشی اور ملک سکندر بوسن بھی تھے۔ یوسف رضا گیلانی کہنے لگے کہ گیلانی اور قریشی یہاں کی سیاست کے پرانے حریف تھے لیکن اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم ایک ہی پلیٹ فارم سے سیاست کریں گے۔ اس لیے کچھ عرصہ بعد سیّد یوسف رضا نے پیپلز پارٹی میں اپنا گھر بنا لیا۔ مخدوم شاہ محمود مسلم لیگ کے ساتھ ہی جڑے رہے۔ صوبائی اسمبلی میں جس روز میاں منظور احمد وٹو کی طرف سے اور مرحوم غلام حیدر وائیں کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش ہو رہی تھی تو اسمبلی کے فلور پر مَیں نے دو افراد کو بھرپور مزاحمت کرتے دیکھا تھا۔ ان میں ایک میاں عمران مسعود تھے اور دوسرے شاہ محمود قریشی لیکن بعد ازاں ان کے بھی اپنی مادر جماعت سے راستے جدا ہو گئے۔ مخدوم شاہ محمود قریشی کی جماعتی وابستگی تو مقامی سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی۔ مخدوم جاوید ہاشمی ان کے روایتی حریف ٹھہرے۔ جنہیں پاکستان مسلم لیگ مخدوم شاہ محمود کی نسبت زیادہ پذیرائی دے رہی تھی۔

نتیجتاً انہوں نے اپنی جماعت کو خیرآباد کہنے کا فیصلہ کیا۔ ماڈل ٹاؤن میں جماعتی قیادت سے حتمی ملاقات کے بعد مسلم لیگ سے علیحدگی کا فیصلہ کیا اور پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ برسوں بعد ان کا سیاسی کیریئر ریمنڈ ڈیوس کی مہم جوئی کی نذر ہو گیا۔ تحریکِ انصاف ان کی اگلی منزل تھی جہاں ان کے روایتی حریف مخدوم جاوید ہاشمی بھی آ بسے۔ کسی نے درست کہا تھا کہ Politics is the art of Possibles سیاست ممکنات کا کھیل ہے۔

بارش تھمنے کو نہ آ رہی تھی ملٹری سیکرٹری کا کنٹرول ٹاور اور چیف پائلٹ لیفٹیننٹ کرنل سلیم سے مسلسل رابطہ تھا۔ اندیشہ تھا کہ خراب موسم کی وجہ سے ٹیک آف نہیں کر پائیں گے۔ مخدوم صاحب نے چین کا سانس لیا۔ شیروانی اتار کر ایک طرف رکھ دیا سی دوران خبر ملی کہ صدر کا طیارہ اسلام آباد سے شورکوٹ ایئربیس کے لیے پرواز کر چکا ہے۔ شورکوٹ سے صدر چیچہ وطنی کے لیے ہیلی کاپٹر پر روانہ ہونے والے تھے۔ لاہور میں ابھی موسم بدستور خراب تھا۔ باہر پورچ میں ہلچل مچی۔ وزیراعلیٰ محمد نواز شریف اور مرحوم خاقان عباسی گورنر ہاؤس میں پہنچ گئے۔ مخدوم سے ملے ان کا

اصرار تھا کہ صدر روانہ ہو چکے تھے، ابھی بھی چانس لینا چاہیے تھا۔ ایر پورٹ چلیں اور موسم کھلنے کا انتظار کر لیں۔ گورنر بادل نخواستہ ان کے ہمراہ نکل پڑے۔ مَیں آفس میں تھا کہ خبر ملی کہ گورنر کا طیارہ لاہور ایر پورٹ سے ٹیک آف کر چکا تھا۔ موسم بدستور غیر یقینی تھا۔ مَیں اپنے دفتر ورق گردانی کر رہا تھا کہ کھڑکی کی طرف نظر اٹھی۔ گورنر کی سٹاف کار تھی۔ انہیں اتارنے کے بعد واپس آ گئی تھی۔ کمرے سے نکلا تو برآمدے میں گورنر، وزیر اعلیٰ اور وفاقی وزیر خاقان عباسی کو وہاں کھڑے پایا۔ ملٹری سیکرٹری نے بتایا کہ ٹیک آف تو کر لیا تھا لیکن ایر پاکٹس Air Pockets پر وہ اور خراب موسم کے باعث پرواز مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ وزیر اعلیٰ اور وفاقی وزیر چائے کی پیالی پینے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔

صدر چیچہ وطنی پہنچے تو پتہ چلا کہ ہیلی کاپٹر پر اترتے ہی انہوں نے گورنر اور چیف منسٹر کے بارے استفسار کیا۔ انہیں وہاں نہ پا کر صدر کو یقیناً مایوسی ہوئی ہو گی۔

اس واقعہ کے چند روز بعد جنرل ضیاء الحق کو روایتی انداز میں صدر سے اپنی گفتگو کا حال سنانے لگے۔ صدر نے مسکراتے چہرے سے ہلکا سا گلہ کیا کہ انہیں چیچہ وطنی میں گورنر اور چیف منسٹر کا انتظار رہا۔ آ جاتے تو رونق اور بڑھ جاتی۔ صدر نے ان کا ردِعمل جاننے کی کوشش کی۔ بقول گورنر صاحب وزیر اعلیٰ مسکرائے اور بولے لاہور سے پرواز کر گئے تھے لیکن راستے میں مخدوم صاحب بس ذرا موسم سے ڈر گئے۔ صدر نے زوردار قہقہہ لگایا اور گورنر کا بازو تھام کر پوچھا واقعی آپ ڈر گئے تھے؟ مخدوم صاحب نے قدرے رکتے ہوئے جواب دیا ’سر ڈرا تو نہیں تھا بس خیال آیا کہ اگر راستے میں کوئی حادثہ ہو گیا تو میری مرگ پر لوگ پُرسے کے لیے آئیں گے وہ میرے بچوں سے پوچھیں گے کہ بابا کو کیا ہوا تھا تو وہ کیا جواب دیں گے کہ بابا کبڈی کا میچ دیکھنے گیا تھا اور راستے میں فوت ہو گیا۔‘‘ سب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ مخدوم صاحب نے آخری گرہ لگائی جناب کسی قومی کاز کے لیے تو جان دے سکتا ہوں لیکن کبڈی میچ کے لیے جان دینا مشکل ہے۔ مخدوم صاحب ہنسی مذاق میں صدر صاحب سے بہت کچھ کہہ گئے۔ یہ اس عہد کی کارگزاری اور سربراہ مملکت کی مصروفیت اور ترجیحات پر ایک بے لاگ تبصرہ بھی تھا اور اس بات کا عکاس تھا کہ اس ملک کے ٹیکس دہندگان کی جمع پونجی ہمارے ارباب اختیار کس طرح صرف کرنے پر تلے تھے، ضلعی سطح کے میلے میں کبڈی میچ میں انعامات کی تقسیم سے کوئی مقامی قائد بھی عہدہ برا ہو سکتا تھا لیکن صدر مملکت تمام کروفر سے شمولیت سے نہ چوکتے۔

آئین میں آٹھویں ترمیم کے حوالے سے ملک کے وزیر اعظم کا انتخاب صدر مملکت کی صوابدید تھی، ہما جس کے سر پر بیٹھتی، اگلے مرحلہ میں اسے سبھی کی تائید حاصل کرنا تھا۔ 1985ء میں ملک میں سیاسی نظام بحال ہوا تو وزیر اعظم کے عہدے کے لیے قرعہ فال سندھ سے محمد خان جونیجو کے نام نکلا۔ اس عہدے کے لیے اگرچہ کچھ اور شخصیات بھی اُمیدوار تھیں شنید یہ تھی کہ جونیجو صاحب پیر پگاڑا صاحب کا حسن انتخاب تھے اور یہ صاحب ان دنوں جی ایچ کیو کے قریب سمجھے جاتے تھے۔ جونیجو صاحب وزیر اعظم تو بن گئے لیکن روزِ اوّل سے صدر اور وزیر اعظم کے درمیان کسی قسم کی مطابقت دیکھنے میں نہ آ رہی تھی۔ صدر کو یہ زعم تھا کہ جونیجو صاحب پر عنایات ان کے سر پر صدارتی

ہاتھ رکھنے سے تھیں اور وزیراعظم سمجھ بیٹھے تھے کہ ملک میں پارلیمانی نظام قائم ہو چکا تھا جس میں وزیراعظم ہی اختیارات کا منبع اور سرچشمہ تھا۔ جونیجو مرحوم یہ بھول گئے کہ اس سارے نظام کی کایا کلپ مارشلائی احکامات کی مرہونِ منت تھی۔ فکری غیر یگانگت کے ساتھ ساتھ دونوں صاحبان کی کیمیائی گری ایک دوسرے سے ملاپ نہ کر پائی۔ یہ تضاد تو پہلی ہی ملاقات میں سامنے آ گیا جب جنرل ضیاء الحق کو اپنے وزیراعظم کو سوٹ بوٹ میں دیکھ کر جز بز سی ہونے لگی۔ صدر روایتی شیروانی میں ملبوس وزیراعظم کا ہاتھ تھامے جھٹکتے رہ گئے۔ وزیراعظم کا صدر سے ملتے ہی اگلا سوال تھا کہ ملک سے مارشل لاء کب اٹھایا جائے گا۔ صدر جو اَب تک فوجی وردی میں ملبوس تھے اس سوال نے یقیناً چونکا دیا۔ شروعات بھلی نہ تھیں۔ ایوانِ صدر کو روزمرہ امور کے بارے میں وزیراعظم ہاؤس کی طرف دیکھنا پڑتا۔ لاوا پکتا رہا۔ پھر کچھ اہم واقعات نے جلتی پر تیل ڈال دیا۔ افغانستان کے مسئلے پر سول حکومت کے نقطۂ نظر، جینوا کانفرنس میں شمولیت نے صدر اور ان کے قریبی معتمدین کو یقیناً کم مائیگی کے احساس میں مبتلا کر دیا۔ اوجھری کیمپ کے سانحہ پر وزیراعظم کی طرف سے باضابطہ انکوائری کے اعلان سے صدر کا پیمانہ مبینہ طور پر لبریز ہو چکا تھا۔ اسی دوران راولپنڈی میں چوہڑ ہڑپال میں چند فوجی نوجوانوں اور کچھ سویلین کے مابین افسوسناک واقعہ پیش آیا جو سول حکومت کے لیے یقیناً اچھا شگون نہ تھا۔ ہم منصبوں کے مابین کشمکش کے اثرات ہر سطح پر محسوس کیے جا رہے تھے۔

ہمارا مری میں اکثر جانا رہتا۔ اس کی بنیادی وجہ تو لارنس کالج گھوڑا گلی کے بورڈ آف گورنر کے اجلاس تھے جس کی گورنر کو صدارت کرنا ہوتی۔ کبھی اسلام آباد آتے تو ایک آدھ گھنٹے کے لیے مری نکل جاتے جہاں ہمارا قیام کشمیر پوائنٹ پر واقع گورنر ہاؤس میں ہوا کرتا۔ موسم گرما میں صدر اور وزیراعظم بھی جب مری آتے تو گورنر ہاؤس میں قیام کرتے۔ مخدوم صاحب گورنر کے مخصوص سوٹ Suit میں قیام کرتے اور مَیں ملٹری سیکرٹری کے کمرے میں ٹھہر جاتا۔ شیشے کی کشادہ کھڑکی سے دور تک گھنا سبزہ دکھائی دیتا۔ کبھی کبھار گہری دھند اور تھپیڑے کھاتے بادلوں سے سامنے منظر لحظہ لحظہ بدل جاتا۔ یہیں سے درختوں میں گھری کلڈنہ کنٹونمنٹ کی سڑکیں اور رہائش گاہیں دکھائی دیتیں۔ میرا چھوٹا بھائی میجر عاصم ان دنوں وہاں انٹیلیجنس سکول میں تعینات تھا۔ اکثر اصرار کرتا کہ مَیں اس کے ہاں قیام کروں لیکن گورنر کی موجودگی میں ایسا کرنا مشکل تھا۔ وقت نکال کر مَیں اس سے ملنے چلا جاتا۔ گورنر سوئٹ اس عمارت میں سب سے کشادہ اور فرنشڈ کمرہ تھا۔ صدر ضیاء الحق اور وزیراعظم محمد خان جونیجو اسی سوئٹ میں ٹھہرتے۔ کچھ عرصہ سے اس وی آئی پی سوئٹ میں ناقابلِ فہم تبدیلی دیکھنے میں آ رہی تھی۔ ہمارے ہر پھیرے پر پلنگ بدل جاتا۔ کبھی ایک پلنگ دکھائی دیتا اور کبھی کوئی دوسرا پلنگ رکھ دیا جاتا۔ ہاؤس کے کیئرٹیکر کو کریدا تو عجیب سی بات سامنے آئی۔ صدر یہاں قیام کے دوران جس پلنگ پر سوتے وزیراعظم کے سٹاف کی ہدایت تھی کہ جب وزیراعظم یہاں آئیں تو اس پلنگ کو کمرے سے نکال دیا جائے اور ان کے لیے کوئی دوسرا پلنگ بچھا دیا جائے۔ اسی طرح صدر کا عملہ مُصر رہتا کہ وہ پلنگ جس پر وزیراعظم سوتے تھے صدر کی آمد سے قبل کمرے سے نکال دیا جائے۔ یہ ہم سب کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔ واقعات نے پلٹا کھایا اور جونیجو صاحب کی صدارتی حکمنامے کی بدولت چھٹی ہوگئی۔ حالات اس نہج پر چلتے

رہتے تو بہت ممکن تھا صدر اور وزیر اعظم کے برتن بھی علیحدہ ہو جاتے۔ ایوانوں کی بلند و بالا دیواروں کے اندر نفسا نفسی کے ایسے واقعات سے قوم کس قدر بے خبر تھی۔

مئی 1988ء کے آخری ایام تھے، غالباً 28 مئی کی تاریخ تھی۔ گورنر مخدوم سجاد قریشی ہاؤس کی بالائی منزل سے آئے اور اے ڈی سی کے دفتر سے ملحقہ کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ ضروری میٹنگ بلانے کے لیے کہا۔ اچانک ایک افسوسناک خبر کا سنا۔ سینیٹر اکرم خان بوسن کا ملتان میں انتقال ہو گیا تھا۔ سینیٹر اکرم خان بوسن کا تعلق اگرچہ ایک سیاسی جماعت سے رہا لیکن علاقائی سیاست میں دونوں اصحاب کا تعلق مختلف سیاسی دھڑوں سے تھا۔ بوسن خاندان روایتی اعتبار سے گیلانی خاندان کا سیاسی حلیف جانا جاتا۔ سیاسی رنجشیں، دھڑے بازیاں اپنی جگہ تھیں لیکن وفاداری کا دامن تو کوئی بھی نہ چھوڑ سکتا تھا۔ ان حالات میں اکرم خان بوسن کے جنازے میں شمولیت ضروری تھی۔ طے پایا کہ وزیر اعظم کے سٹاف سے وقت لے کر اگلی صبح جونیجو صاحب سے ملاقات کی جائے۔

ہم لاہور سے گورنر کے خصوصی طیارے میں ملتان کے لیے عازم سفر تھے۔ جہاز چیف پائلٹ کرنل سلیم اور ان کے معاون میجر سعید اُڑا رہے تھے۔ مطلع صاف تھا لیکن ملتان کے نواح میں خراب موسم کی بناء پر جہاز تھپیڑے کھا رہا تھا۔ ایئر کنٹرول ہمیں لینڈنگ کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ دور فضا میں ایک مسافر بردار جہاز دکھائی دیا جسے ملتان میں اترنے کی اجازت نہ ملی۔ وہ جہاز اب لاہور لوٹ رہا تھا۔ کرنل سلیم نے ایئر کنٹرول روم کے تحفظات کے باوجود جہاز کو بڑی مہارت سے اتار لیا۔

ہم ایر پورٹ سے سیدھا قصبہ بوسن کے لیے روانہ تھے۔ خبر ملی کہ اکبر بوسن صاحب کے بڑے صاجزادے والد کی تدفین کی جلدی میں تھے۔ انہیں گورنر کی آمد کی اطلاع تھی اور یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ہم گورنر قصبہ بوسن کے لیے روانہ تھے۔ روایتی سیاست کی کمزوریوں نے کام دکھا دیا اور خان صاحب کے صاجزادے نے گھر سے میت اٹھائی اور تدفین کے لیے چل نکلے۔ ہم قصبہ بوسن پہنچے تو لواحقین تدفین سے فارغ ہو کر لوٹ رہے تھے۔ مخدوم صاحب نے کمال وضعداری سے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار کیا، دُعائے خیر کی اور وہاں سے اپنی رہائش گاہ دولت گیٹ کی طرف لوٹ آئے۔ یہی معلوم ہوا کہ مرحوم کے بڑے صاجزادے اس بات کے حق میں نہ تھے کہ تدفین کے لیے کسی طور بھی گورنر کی آمد کا انتظار کیا جائے۔ کچھ حضرات کے نزدیک سیاسی پوائنٹ سکورنگ کا موقع نہ تھا خراب موسم کی وجہ سے قدرے تاخیر ہو گئی تھی۔ لواحقین کو علم تھا کہ مخدوم صاحب خصوصی طور پر تدفین میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔

ملتان میں چند گھنٹے قیام کے بعد ہم اسلام آباد کے لیے ٹیک آف کر گئے۔ تھوڑی دیر گزری تو جہاز ایئر پاکٹس Air Pockets میں گھر گیا۔ کرنل سلیم سٹیرنگ جہاز کو کنٹرول کرنے کی فکر میں تھے۔ سیسنا جہاز اس وقت ہوا میں کاغذ کے جہاز کی طرح تھپیڑے کھا رہا تھا۔ چیف پائیلٹ جہاز کو مختلف بلندیوں اور زاویوں پر لا کر اس صورتحال سے نکلنے کی تگ و دو میں تھا۔ ہمارا روٹ براستہ میانوالی تھا۔ سارا راستہ ایسی ہی صورتحال سے سامنا رہا۔ ہم خدا خدا کر کے راولپنڈی پہنچ گئے۔ ائر پورٹ سے سیدھا گورنر انیکسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر

دیر آرام کیا۔ وزیر اعظم شام چار بجے ائرپورٹ پہنچ رہے تھے۔ وہاں سے ان کی پریس سے گفتگو بھی تھی۔ گورنر نے اپنے پرسنل سیکرٹری کو ہدایت کی کہ شام ہوتے ہی وزیر اعظم کے سٹاف سے اگلی صبح ملاقات کے لیے وقت مانگ کیا جائے۔ دوپہر ڈھلی تو مخدوم صاحب کو خیال گزرا کہ شام گزارنے کیوں نہ اسلام آباد غضنفر مہدی کے ہاں سے ہو آئیں۔ غضنفر مہدی محفلی آداب کا ماہر، مخدوم صاحب کا محلے دار بھی تھا، اس کی باتوں، کہاوتوں اور قصہ گوئی سے خوب محظوظ ہوا کرتے۔ غضنفر مہدی ان دنوں کسی نیم سرکاری ادارے سے وابستہ تھا۔ زندگی میں اس نے کئی ادارے بدلے۔ محفل سجانے کا ماہر تھا۔ مخدوم صاحب ازراہِ تفنن کہا کرتے کہ غضنفر ڈگڈی بجا کر لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے اور جب مجمع جمع ہو جاتا ہے تو وہاں سے چپکے سے کھسک جاتا ہے۔ ایک بار کسی نے پوچھ لیا کہ مجمع جمتے ہی وہ کیوں کھسک جاتا ہے۔ مخدوم صاحب ہنس دیئے اور کہنے لگے اس کا دراصل مجمع لگانے کا کہیں اور وقت ہو جاتا ہے۔

گورنر انیکسی سے نکلتے ہی ہم نے جونہی چکلالہ ایرپورٹ کا راؤنڈ اباؤٹ عبور کیا سامنے سے آتی سیاہ رنگ کی مرسیڈیز دکھائی دی۔ غور سے دیکھا تو اس میں وزیر اعلیٰ پنجاب نواز شریف تھے جو جاپان سے وزیر اعظم کے ساتھ ہی آئے تھے لیکن وزیر اعلیٰ ائرپورٹ سے نکل آئے۔ مخدوم صاحب اچنبھے میں تھے۔ انہیں کھد بدسی ہو رہی تھی کہنے لگے کہ پروگرام کے مطابق تو جونیجو صاحب کو ائرپورٹ پر پریس سے بات کرنا تھا یہ کیونکر تھا کہ وزیر اعظم تو ابھی ائرپورٹ پر تھے اور وزیر اعلیٰ پنجاب وہاں سے نکل آئے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ دیر میں ہم غضنفر مہدی کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ غضنفر کی بیگم نے چائے کا پُرتکلف اہتمام کر رکھا تھا۔ گپ شپ چلتی رہی۔

شام ڈھل رہی تھی، مخدوم صاحب نے اجازت مانگی اور ہم وہاں سے گورنر انیکسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچتے ہی گورنر بالائی منزل میں اپنی آرام گاہ میں چلے گئے اور مَیں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گورنر کے پی۔ ایس حاجی نواز لان میں تھے کہنے لگے کوئی ضروری بات ہے گورنر صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ مَیں نے نوٹ بک تھامی اور گورنر صاحب کے کمرے کا رُخ کیا۔ وہاں مَیں نے انہیں قدرے مضطرب پایا۔ کہنے لگے پریذیڈنٹ صاحب نے قومی اور صوبائی اسمبلیاں تحلیل (Dissolve) کر دیں ہیں۔ پرائم منسٹر کو کیبنٹ سمیت برطرف کر دیا ہے۔ لیکن سر وزیر اعظم تو کچھ گھنٹے پہلے جاپان سے لوٹے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ مخدوم صاحب بولے کہ صدر کو وزیر اعظم کی آمد کا انتظار تھا، کس وقت وہ زمین پر قدم رکھیں اور یہ حکمنامہ جاری کر دیا جائے۔ مخدوم صاحب کے مطابق صدر کی متوقع کارروائی وزیر اعلیٰ پنجاب کے علم میں تھی۔ اس لیے وہ ائرپورٹ پر رکنے کی بجائے وہاں سے پہلے ہی نکل آئے تھے۔ وہاں سے سیدھا صدر کے ہاں چلے گئے۔

یہ خبر ہم سب کے لیے چونکا دینے والی تھی یہ بات تو عام تھی کہ دونوں سربراہان کے تعلقات درست نہج پر نہ تھے لیکن کوئی بھی ایسے انتہائی اقدام کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ افغانستان کے معاملات پر وزیر اعظم کی کانفرنس اور اوجڑی کیمپ کی سانحہ نے دونوں راہنماؤں کے مابین تعلقات کی خلیج کو وسیع کر دیا تھا۔ جونیجو مرحوم اہم پالیسی امور میں بڑے فیصلہ کن انداز سے آگے بڑھ رہے تھے۔ صدر جنہوں نے مطلق العنان انداز میں حکمرانی کی تھی انہوں نے ان حالات

میں بھی آئین میں شخصی حوالے سے ترمیم کر کے دوام حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جونیجو صاحب کی کابینہ میں ایسے حضرات کی کمی نہ تھی جو کابینہ کے اجلاس سے فارغ ہوتے ہی کسی مخبر کے انداز میں راز و نیاز کی باتیں ایوانِ صدر پہنچا دیتے۔ صدر نے نہ صرف قومی اسمبلی تحلیل کر دی بلکہ جوشِ اختیارات میں مارشل لاء کی چھتری تلے نامزد آٹھویں ترمیم کے تحت خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے تمام صوبائی اسمبلیوں کو بھی برخواست کر دیا۔ اس مطلق العنانی کو نہ کوئی پوچھنے والا، نہ سوال کرنے والا تھا۔ مضحکہ خیز صورتحال تو پنجاب کے حوالے سے تھی جہاں وزیر اعلیٰ کی ہدایت پر گورنر نے صوبائی اسمبلی کو برخواست کیا اور پھر اسی وزیر اعلیٰ نے عنان بھی سنبھال لی۔ وزیر اعلیٰ نے اسمبلی کی برخواستگی کا آرڈر صدارتی فرمان کے تحت کیا۔

صوبائی اسمبلی کی برخواستگی کا زبانی حکم نامہ تو ریڈیو، ٹیلی ویژن پر نشر ہو چکا تھا لیکن کاغذی کارروائی کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ معلوم ہوا چیف سیکرٹری مرحوم انور زاہد لاہور میں فائل تیار کر رہے تھے اور راولپنڈی پہنچ رہے تھے۔ اگلی صبح چیف سیکرٹری، پنجاب ہاؤس راولپنڈی میں سمری لے کر پہنچ گئے۔ وزیر اعلیٰ کی ایڈوائس لے کر فائل میرے حوالے کی جس پر مَیں نے گورنر سے دستخط کروا لیے۔ یہ فائلیں گزشتہ روز کی تاریخ میں مکمل کی گئی تھیں۔

اگلی ہی صبح گورنر اور وزیر اعلیٰ کو ایوان صدر میں بلایا گیا، مَیں بھی گورنر کے ہمراہ تھا۔ ہم ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ چہ مگوئیاں جاری تھیں۔ اسی اثناء میں چیئر مین سینیٹ غلام اسحاق خان بھی پہنچ گئے۔ وہ قانونی موشگافیوں میں الجھے ہوئے تھے۔ مئی اپنے اختتام کو تھا اور چند روز تک بجٹ کا اعلامیہ ضروری تھا۔ آئین میں نوے دن کے اندر انتخابات کرانے کی کڑی شرط بھی تھی لیکن ضیاء الحق کے نزدیک ایسی تاریخ کیا معنی رکھتی تھی؟ جولائی 1977ء میں انہوں نے انتخابات کرانے کو قوم سے وعدہ کیا تھا۔ بقول کسی شاعر کے:

ع...... وہ وعدہ ہی کیا جو ایفا ہو گیا

غلام اسحاق خان بدستور کتابی حوالوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اس پیرانہ سالی اور تجربے کے باوجود وہ بھولے بیٹھے تھے کہ سب کچھ اس شخص کے ہاتھوں سے ہو رہا تھا جس نے اس ملک سے آئین کی بساط سمیٹ دی تھی۔ ایسی ایسی ترامیم لے آئے جس نے پارلیمانی نظام جو اس ملک کے قیام کی اساس اور بقا کا ضامن تھا، کی روح کو مجروح کیا، نظریۂ ضرورت کے تحت عدالت عظمیٰ نے ایک مطلق العنان کے کیئے دھرے پر ایسی مہر لگا دی کہ انہیں کئی برس تک حکمرانی کرنے کا پروانہ مل گیا۔ ان خلافِ فطرت ترامیم کے بل پر اسمبلی بساط سمیٹ دی۔ وہاں اس وقت بلوچستان کے وزیر اعلیٰ جام صاحب آف لسبیلہ بھی آ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد صدر نے گورنر اور وزیر اعلیٰ کو بھی بلا لیا۔ گورنر تو تھوڑی دیر میں صدر سے مل کر لوٹ آئے لیکن وزیر اعلیٰ قدرے توقف کے بعد لوٹے۔ وزیر اعلیٰ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا اور سرگوشی بھرے انداز میں کہنے لگے کہ بریگیڈیر امیر گلستان جنجوعہ کا تو پتہ کرو۔ مناسب ہو تو ان کا ٹیلی فون نمبر ہی مل جائے۔ مَیں نے ان کی ہدایت نوٹ کی اور اسے معمول کی بات سمجھا۔ بریگیڈیئر امیر گلستان جنجوعہ حال ہی میں نیپال میں سفارت کاری سے سبکدوش ہوئے تھے۔ جونیجو صاحب ان کے کنٹریکٹ میں توسیع

دینے کے حق میں نہ تھے۔ امیر گلستان اکثر لاہور آتے جاتے۔ گورنر ہاؤس بھی آ جاتے۔ گورنر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پنجاب حکومت میں گریڈ بیس کی ملازمت کے خواہاں تھے۔ راولپنڈی میں ایجنسی فار بارانی ایریا ڈویلپمنٹ میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے کے لیے کوشاں تھے۔ پنجاب حکومت کی طرف سے ابھی تک کوئی حوصلہ افزا جواب نہ مل پایا تھا۔ مجھے خیال گزرا کہ وزیراعلیٰ امیر گلستان صاحب کو پنجاب میں ملازمت دینے کے لیے کہیں مائل ہو چکے تھے۔ اس بات کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے مَیں نے گورنر سے بھی ذکر نہ کیا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد دلچسپ خبر ملی کہ امیر گلستان جنجوعہ کو صوبہ سرحد کا گورنر تعینات کر دیا گیا ہے۔ مجھے ایوان صدر میں وزیراعلیٰ کی مختصر گفتگو یاد آ گئی۔ کہاں گریڈ بیس کی ملازمت اور کہاں صوبے کی گورنری۔ خبر سنتے ہی مَیں نے گورنر صاحب سے ذکر کیا کہ ایوانِ صدر میں وزیراعلیٰ نے میرے ذمہ لگایا تھا کہ موصوف کا پتہ کراؤں۔ مخدوم صاحب نے قدرے خفگی کا اظہار کیا کہ مَیں نے یہ بات انہیں بروقت کیوں نہ بتائی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وزیراعلیٰ مستقبل کے گورنر کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔ مخدوم صاحب کی دانست میں وزیراعلیٰ پنجاب کو اس تعیناتی کے بارے میں صدر نے اسی روز بتا دیا ہوگا۔ قسمت جنجوعہ صاحب پر یوں نچھاور ہوئی کہ صوبہ سرحد میں حکومتیں آتی جاتی رہیں اور موصوف اس صوبے کے چھ برس تک گورنر رہے۔

اسلام آباد سے راولپنڈی لوٹے تو پنجاب ہاؤس میں غلام حیدر وائیں کو منتظر پایا۔ چیف سیکرٹری نے مطلع کیا کہ میاں محمد نواز شریف نئے سرے سے صوبائی وزیراعلیٰ کا حلف اٹھائیں گے۔ پہلے یہ دو وزراء پر مشتمل کابینہ تشکیل دی جائے گی اس میں غلام حیدر وائیں بھی تھے۔ مرحوم وائیں صاحب کی سیاسی تربیت جمہوری انداز میں ہوئی تھی۔ ان کی بے چینی قابل فہم تھی وہ صدر کے اس اقدام پر انتہائی رنجیدہ تھے۔ جمہوری نظام پر کاری ضرب سمجھ رہے تھے ان کا فوری ردِعمل تو یہی تھا کہ وہ نگران حکومت میں کسی قسم کے قلمدان کے لیے تیار نہ تھے لیکن بعد میں وہ مائل ہو گئے۔

یہ ایک عجیب صورتحال تھی ملک کے سب سے بڑے صوبے کے وزیراعلیٰ اور کابینہ کو فارغ کر دیا گیا اور پھر صدارتی حکم نامے سے انہی افراد پر مشتمل کابینہ تشکیل دی جا رہی تھی۔

اگلے چند روز ضیاء الحق پر خاصے بھاری ثابت ہوئے۔ وہ اپنے اس اقدام کی معقول وجہ بتانے سے قاصر تھے۔ پھر تان اس بات پر ٹوٹی کہ کرپشن اور نااہلی کی بنیاد پر جونیجو حکومت کو ختم کیا گیا تھا۔ اس اعلامیہ کے چند ہی روز بعد اسی کرپٹ حکومت کے وزراء کی اکثریت نے دوبارہ وزارتی حلف لے لیا۔ ان میں ڈاکٹر محبوب الحق، صاحبزادہ یعقوب علی خان، نسیم آہیر، وسیم سجاد اور اسلم خٹک بھی تھے۔ صدر کے اس اقدام کو کسی نے دل سے تسلیم نے کیا لیکن ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے بھی کم نہ تھے۔ میری خام سمجھ کے مطابق جمہوریت کے سفر میں رخنہ پڑ گیا تھا۔ صدر نے جس شق کے استعمال سے ملک میں کسی طور بھی جمہوریت کو استحکام نصیب ہونے کی توقع نہ تھی۔ قوم نے دیکھا کہ آنے والے برسوں میں اعلیٰ آئینی عدالتیں آئینی امور پر اخباری تراشوں کی بنیاد پر فیصلے کرتی رہیں۔ عدالتی مہر کے نتیجے میں حکومتیں رخصت ہو گئیں اور کبھی ایسے ہی اخباری تراشوں کو درخور اعتنا سمجھتے ہوئے تحلیل شدہ اسمبلیاں اور حکومتیں

بحال ہو گئیں۔ سانپ اور سیڑھی کا کھیل نجانے کتنے برس ہمارے نصیب میں تھا۔

مرکز اور صوبوں میں نگران حکومتیں قائم ہو چکی تھی۔ جناب محمد خان جونیجو کی کابینہ وزراء کی اکثریت حلف برداروں اور کاسہ لیسوں میں شامل تھی۔ آئینی اور پارلیمانی ضوابط کی روگردانی کرتے ہوئے صدر مملکت نے مرکز میں وزیر اعظم کا تقرر نہ کیا۔ بعد ازاں ان کی ناگہانی وفات کے بعد ملک کی اعلیٰ عدلیہ سے اس آئینی سقم کو دور کرنے کے لیے عدالتی حکم نامہ لینا پڑا۔ انہی دنوں ہمارا کراچی جانا ہوا۔ گورنر پنجاب بحری راستے سے عازمین حج کے ایک قافلے کو رخصت کرنے کے لیے خصوصی طور پر مدعو تھے۔ کراچی ائرپورٹ پر اس فریضہ سے فارغ ہوئے تو گورنر صاحب نے کار میں دورانِ سفر میری غیر ضروری خاموشی کی وجہ کے بارے میں استفسار کیا۔ مَیں نے موقع جانتے ہوئے اسی رائے کا برملا اظہار کیا اور اسمبلیوں کی تحلیل اور جونیجو صاحب کی حکومت کو ختم کیے جانے کے فیصلے پر کڑی تنقید کی۔ مخدوم صاحب نے میری بات کو کمال تحمل سے سنا اور اپنے طویل تجربے کی بنا پر سمجھانے لگے کہ سیاست میں بہت کچھ ہوتا ہے کسی بات کو بھی انہونی نہ سمجھا جائے، اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اسمبلیاں بنتی ٹوٹتی رہتی ہیں نظام چلتا رہتا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ مَیں نے مثال دی کہ بڑے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے فیصلوں کی چھوٹے لوگوں کو بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ اگر ہم کسی سیارے کو ٹارگٹ بنا کر کوئی راکٹ داغ دیں تو معمولی سا نشانہ چوک جانے سے کئی شمسی سالوں Light Year کا فرق پڑ جاتا ہے اور ہم اپنے ہدف سے لاکھوں میل دور رہ جاتے ہیں۔ میری بات مخدوم صاحب کے دل کو لگی۔ میرا ہاتھ تھام کر ہلکی سی تھپکی دی اور خاموشی اختیار کر لی۔

کراچی میں قیام کے دوران مخدوم صاحب سبکدوش ہونے والے گورنر اشرف تابانی اور نئے گورنر لیفٹیننٹ جنرل رحیم الدین سے ملنے گئے۔ دونوں مقامات پر میری دلچسپی کے لیے خاصا سامان تھا۔ اشرف تابانی کی سادگی کا عالم کہ گورنری سے فارغ ہوئے تو سمندر کنارے اپنے مختصر فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ ہم لفٹ کے ذریعے فلیٹ تک پہنچے۔ تین کمروں کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی تنگی داماں کا احساس ہو رہا تھا۔ تابانی صاحب کا تعلق معروف بزنس گھرانے سے تھا۔ گھر بار کی ظاہری ٹھاٹ باٹ ان کے نزدیک محض فروعی معاملہ تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل رحیم الدین طویل عرصہ تک گورنر بلوچستان رہ چکے تھے۔ صدر ضیاء الحق کے سمدھی تھے۔ مخدوم صاحب کا ملاقات کے بعد وہاں سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو میزبان نے گورنر ہاؤس سندھ میں اپنے آفس سے باہر آنا مناسب نہ سمجھا۔

حالات نے کروٹ لی اور اگست 1988ء میں مسلم لیگ دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک دھڑے کی قیادت محمد خان جونیجو کر رہے تھے اور دوسری مسلم لیگ جناب فدا محمد خان کی سربراہی میں بنانے کا اہتمام ہو رہا تھا جسے صدر ضیاء الحق کی آشیرباد حاصل تھی۔ صوبوں میں قائم حکومتیں اور قیادت اس نئی مسلم لیگ کی ٹڈوائفری Midwifery کر رہی تھیں۔ اسی سلسلے میں اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ایک اجلاس منعقد کرنے کی کوشش کی گئی جو خاصی ہڑبونگ کی نذر ہو گیا۔ انہی دنوں امریکہ میں ایک کورس کے سلسلے میں میری روانگی متوقع تھی مَیں نے کچھ اضافی چھٹیاں بھی لے رکھی تھیں۔ ارادہ تھا کہ کچھ وقت اپنے بڑے بھائی صاحب کے ہاں گزار سکوں گا جو ان دنوں

یوگوسلاویہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔

مَیں تیاریوں میں مصروف تھا۔ ادھر آئے دن اخباروں میں گورنر پنجاب کی تبدیلی کی خبر آ جاتی۔ ہمارے اپنے ذرائع کے مطابق ایوانِ صدر میں ایسی کوئی بات نہیں چل رہی تھی لیکن مخدوم صاحب قدرے سوچ میں پڑ جاتے۔ انہیں اس بات سے غرض نہ تھی کہ وہ کتنا عرصہ مزید گورنر رہ سکتے تھے لیکن بڑے پتے کی بات کیا کرتے کہ اخباروں میں ایسی خبریں آنی شروع ہو جائیں تو منصب شدید دباؤ میں آ جاتا ہے اور بقول ان کے 'Erosion' شروع ہو جاتی ہے۔ ملٹری سیکرٹری کرنل اپنے طور پر پتہ کر چکے تھے کہ ایسی کوئی ممکنہ تجویز نہ تھی۔ مخدوم صاحب نے نکتہ آفرینی کرتے ہوئے کہا کہ ایسی خبروں پر اگر صدر اور ان کے معتمد خاص کی ہر روز نظر پڑتی رہی تو خبر کے سچ بننے میں کتنی دیر لگ سکتی تھی۔ وہ پرانے سیاست دان، معاملہ فہم شخص تھے صدر سے ملاقات کے لیے وقت مانگ رکھا تھا لیکن پیش رفت نہ ہو رہی تھی۔ صدر اپنی مصروفیات میں الجھے ہوئے تھے۔

ایک دن وزارت مذہبی امور کی طرف سے ایک بے ضرر سا دعوت نامہ موصول ہوا جس میں اطلاع تھی کہ صدر ضیاء الحق چکلالہ ائرپورٹ پر عازمین حج کو رخصت کرنے والے تھے۔ ائرپورٹ لاؤنج پر مختصر سی تقریب تھی۔ مخدوم صاحب کی نظر سے کارڈ گزرا۔ ملٹری سیکرٹری کو ہدایت تھی کہ فوری پروگرام بنایا جائے۔ ملٹری سیکرٹری نے اتمام حجت کرتے ہوئے کہا کہ محض پندرہ منٹ کی تقریب تھی۔ وزارت مذہبی امور نے تو اسے کارڈ تمام گورنروں کو ارسال کر رکھے تھے۔ اسلام آباد کوئی بھی نہ جا رہا تھا۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ کل صبح ہمیں وہاں ہونا چاہیے۔ مخدوم صاحب نے قطعی لہجے میں بات کی۔ اگلی صبح ائرپورٹ پہنچتے ہی ہم سیدھے جائے تقریب میں چلے گئے۔ مختصر سے سٹیج پر صدر کے لیے کرسی تھی۔ گورنر کو دیکھتے ہی منتظمین نے سٹیج پر ایک اور کرسی کا انتظام کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد صدر وہاں پہنچ گئے۔ گورنر کو دیکھ کر خوشگوار حیرت کا اظہار بھی کیا، حسب عادت معانقہ کیا اور پھر دونوں اصحاب اسٹیج پر براجمان ہو گئے۔ مختصر سی تقریب اختتام کو پہنچی۔ چائے کی پیالی سے فارغ ہوئے صدر کی اپنی مصروفیات تھیں اور ہم نے ائرپورٹ ہی سے لاہور کی طرف پرواز کر ڈالی۔ اگلی صبح منظر نامہ بدل چکا تھا۔ پاکستان ٹائمز کے پہلے صفحے پر صدر اور گورنر کی مشترکہ تصویر بڑے نمایاں طور پر چھپی تھی۔ تصویر سے یہ تاثر مل رہا تھا کہ گورنر کرسی پر بیٹھے صدر کے کان میں بڑی رازداری سے کوئی بات کہہ رہے تھے اور جنرل ضیاء الحق اپنی گردن کو خم دے کر بڑے انہماک سے ان کی بات کو سن رہے تھے۔ تصویر دیکھتے ہی مَیں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ 'سر آپ کیا خاص بات کر رہے تھے؟' کچھ نہیں، مخدوم صاحب نے جواب دیا۔ 'بس ان کا حال احوال پوچھ رہا تھا اور فوٹوگرافر نے تصویر کھینچ لی۔' اس تصویر کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ مخدوم صاحب کی رخصتی کی خبریں تھم گئیں۔

شام کا وقت تھا مَیں اور میری بیگم نصرت انارکلی بازار میں شاپنگ میں مصروف تھے۔ مجھے سفری اٹیچی کیس خریدنا تھا۔ بانو بازار کے قریب سے گزر ہوا تو لوگوں کو ٹرانزسٹر کے گرد جمع پایا۔ معلوم ہوا کہ لودھراں کے قریب ایک C-130 طیارہ حادثے کا شکار ہو گیا جس میں صدر ضیاء الحق، کئی سینئر حکام اور امریکی سفیر کے ہمراہ سوار تھے۔ یہ خبر

سنتے ہی لوگ سکتے کے عالم میں تھے۔ لمحے بھر کے لیے مَیں بھی دم بخود ہو گیا۔ شاید خبر غلط ہو، بازار میں جگہ جگہ ریڈیو اور اور ٹیلی ویژن سے حادثے کی خبر بار بار نشر ہو رہی تھی۔ صدر جنرل ضیاء الحق کے طیارے کو بہاولپور سے پرواز کرتے ہی لودھراں کے نواح میں بستی لال کمال کے مقام پر حادثہ پیش آیا۔ عینی شاہدین کے مطابق طیارے میں آگ لگ ئی اور وہ گر کر تباہ ہو گیا۔ خبر ملی کہ ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف جنرل اسلم بیگ بھی بہاولپور پہنچے ہوئے تھے لیکن وہ علیحدہ طیارے میں راولپنڈی لوٹ آئے۔ صدر بہاولپور کے نواح میں خیر پور ٹامیوالی میں فوجی مشقیں دیکھنے کے لیے ایک روزہ دورے پر پہنچے تھے۔ افسوسناک خبر سنتے ہی ہم نے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ گورنر صاحب کے بار بار کئی ٹیلیفون آ چکے تھے۔ پیغام تھا کہ دفتر پہنچو۔ ان دنوں ابھی موبائل فون کا رواج نہ تھا۔ مَیں سیدھا گورنر ہاؤس روانہ ہو گیا۔ مخدوم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حادثے کی تفصیلات سے آگہی ہوئی۔ حادثے میں کوئی بھی نہ بچ سکا۔ گورنر ہاؤس میں عوامی امور کے وزیر مصطفیٰ صادق اور ڈپٹی سپیکر وزیر جوگیزئی بھی موجود تھے۔ مَیں کچھ دیر گورنر کے ساتھ وقت گزار کر اپنے دفتر میں آ گیا۔ ڈپٹی کمشنر ملتان شہزاد قیصر سے بات ہوئی۔ وہ جائے وقوعہ سے لوٹا تھا کہنے لگا سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ زندگی اور موت تو خدائے برتر کے ہاتھ میں تھی۔ انسان کے بس میں کچھ بھی نہ تھا۔ اس المناک حادثے نے مجھے ایک اداس صبح کی یاد دلائی۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ بی بی سی پر جنرل ضیاء الحق کا ریڈیو انٹرویو نشر ہو رہا تھا۔ معروف وقائع نگار مارک ٹیلی کے سوال کے جواب پر ضیاء الحق بلند آواز سے کہہ رہے تھے:

The higher you go the harder you fall.

جنرل ضیاء الحق نے سوچ سمجھ کر یہ جملہ ادا کیا ہو گا۔ انہیں کیا معلوم تھا اس جملے کا اصطلاحی مفہوم کسی بستی لال کمال کے نواح میں لغوی مفہوم سامنے آنے والا تھا۔

گورنر گرے روم میں دونوں مہمانوں کے ساتھ چہ مگوئیوں میں مصروف تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی وقفوں سے بج رہی تھی۔ غیر یقینیت کا عالم تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ملک میں کیا ہونے والا تھا۔ رات گئے چیئرمین سینیٹ غلام اسحاق خان نے قائم مقام صدر کا منصب سنبھال لیا۔ ایک بات تو طے تھی کہ فوج کی طرف سے کوئی براہِ راست اقدام نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ غلام اسحاق خان نے اپنے خطاب میں مخصوص انداز میں آخری گرہ لگاتے ہوئے کہا کہ کاروانِ حیات کو رواں دواں رہنا چاہیے۔ یہ جملہ اس بات کا غماز تھا کہ ایوانِ صدر اور جی۔ ایچ۔ کیو کے حکام اس بات پر متفق تھے کہ کاروانِ حیات فی الوقت رواں دواں رہنا چاہیے تھا۔

صدر جنرل ضیاء الحق کے ناگہانی انتقال سے ایک طویل دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ ملک میں انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا کہ سابقہ قومی اسمبلی کے رکن حاجی سیف اللہ نے اسمبلی تحلیل کیے جانے کا صدارتی حکم نامہ عدالت عظمیٰ میں چیلنج کر دیا۔ اس کیس کی باقاعدہ سماعت پر عدالت اس نتیجہ پر پہنچی کہ صدارتی حکم نامہ خلافِ قانون تھا۔ اس کی کوئی حیثیت نہ تھی لیکن عدالت نے اسمبلیاں بحال کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کا ریلیف نہ دیا۔ عدالت کی

رائے میں انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا۔ رائے دہندگان کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کے سلسلے میں اپیل کی جا چکی تھی لہٰذا اس سلسلے کو رواں رکھنا ضروری تھا۔ بعض اصحاب کی رائے میں اس فیصلے کے پیچھے کئی اور محرکات تھے۔ کڑیاں کہیں اور چل رہی تھی۔ معاملے کی بازگشت عدالت میں ایک بار پھر گونجی۔ اس سلسلے میں چند برس بعد سابق آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ کے خلاف عدالت عظمیٰ میں توہینِ عدالت کے سوال کے جواب میں دائر کی گئی۔ اسلم بیگ صاحب نے لاہور میں ایک صحافی کے سوال کے جواب میں ایسا تاثر قائم کرنے کی کوشش کی کہ ان کی مداخلت پر عدلیہ نے تحلیل شدہ اسمبلیوں کو بحال کیا۔ پیام بری کے اس سلسلے میں ایک وفاقی وزیر نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ توہینِ عدالت کے اس کیس میں لاہور کے کئی صحافیوں کے ہمراہ مجھے بھی چیف جسٹس جناب افضل ظلہ کی سربراہی میں قائم بنچ میں بطور گواہ پیش ہونا پڑا۔ مَیں ان دنوں بطور سیکرٹری اطلاعات اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ عدالت کے روبرو جناب فخرالدین جی ابراہیم نے بطور وکیل مجھ سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا۔ عدالت کے ماحول میں خاصا تناؤ تھا۔ اسلام آباد کے ایک صحافی شاہد اورکزئی، عدلیہ کی دانست میں بار بار توہین کے مرتکب ہو رہے تھے۔ عدالت نے ان پر توہین کی دفعہ لگا دی اور پھر انہیں معافی نامہ داخل کرانے کا موقع بھی دیا۔ لیکن موصوف اپنے مؤقف پر اڑے رہے اور انہوں نے کسی قسم کی معافی مانگنے سے انکار کر دیا۔ عدالت انہیں معافی داخل کرنے کے لیے بار بار اصرار کرتی رہی۔ بالآخر بنچ نے اسلام آباد کے صحافی کو توہینِ عدالت کے ارتکاب جرم میں جیل بھجوا دیا۔

ملک میں جماعتی بنیادوں پر انتخابات کا انعقاد ہوا۔ ان انتخابات میں سیاسی جماعتوں نے بھرپور شرکت کی۔ ملک میں اسلامی جمہوری اتحاد قائم ہو چکا تھا۔ قومی سطح پر پاکستان پیپلز پارٹی سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری لیکن اس جماعت کو عددی برتری حاصل نہ ہو سکی۔ ایسی ہی صورتحال پنجاب میں بھی تھی۔ جہاں مسلم لیگ کو نسبتاً برتری تو حاصل تھی لیکن حکومت بنانے کے لیے اسے آزاد امیدواروں کی حمایت کی ضرورت تھی۔

سیاسی میدان دونوں جماعتوں کے لیے کھلا تھا۔ انتخابات سے قبل پنجاب اسمبلی کے رولز آف پروسیجرز Rules of Procedures کو بنظر غائر دیکھا گیا اور ان میں مناسب ترامیم کی گئیں۔ ان میں سے ایک اہم ترمیم وزیر اعلیٰ کے انتخابات کے بارے میں تھی۔ چیف سیکرٹری جناب انور زاہد اس ترمیم کے محرک تھے۔ ان کی نظر میں مرکز اور صوبے میں دو بڑی لیکن متحارب سیاسی جماعتوں کو اقتدار مل رہا تھا۔ ایسی صورت میں ضروری تھا کہ ضابطے کی کارروائی کو تحریری شکل اور قواعد کی صورت میں محفوظ کر لیا جائے۔ وزیر اعلیٰ کا انتخاب آئین کے مطابق کثرت رائے کے ووٹ سے تھا۔ اس کا طریقۂ کار قرارداد پر رائے شماری کی صورت میں تھا۔ یہ رائے شماری کھلے عام تھی اور نئے ترمیم شدہ قواعد کی رو سے خفیہ نہ تھی۔ اس طریقۂ کار کو باضابطہ شکل دے کر گورنر کی منظوری سے اسمبلی کے رولز کا حصہ بنا دیا گیا۔

اس طریقہ کار کے برعکس سپیکر کا انتخاب خفیہ رائے شماری کے ذریعے تھا۔ پنجاب میں وزیر اعلیٰ کے منصب پر پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کی نظر تھی۔ پیپلز پارٹی بھی معقول نشستیں لے کر کامیاب ہوئی تھی۔

مسلم لیگ کے سرکردہ حضرات نے بہتر حکمت عملی اپنا رکھی تھی اور خاصا ہوم ورک کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ اور اس کی قیادت گزشتہ آٹھ نو برس سے حکومتی مشینری کا حصہ چلی آ رہی تھی۔ آزاد امیدواروں پر خاصا کام کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کی طرف سے جناب نواز شریف اور پیپلز پارٹی کی طرف سے مرحوم سردار فاروق لغاری کا نام سامنے آ چکا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے بار بار یہ مطالبہ اٹھایا جا رہا تھا کہ وزیر اعلیٰ کا انتخاب خفیہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے۔ ان کی طرف سے اسمبلی کے رولز آف بزنس کی تبدیلی کا تقاضہ بھی کیا جا رہا تھا۔ پیپلز پارٹی کی لیڈر شپ اس تاثر میں تھی کہ خفیہ رائے شماری کی صورت میں انہیں آزاد امیدواروں کی طرف سے یقین دہانی تھی۔ پیپلز پارٹی کی قیادت اس سلسلے میں بار بار رابطہ کر رہی تھی۔ میں اپنی رہائش گاہ پر تھا۔ گورنر ٹیلی فون پر رابطہ کیے ہوئے تھے۔ کہنے لگے بی بی (محترمہ بینظیر بھٹو) نے پیر شجاعت حسنین اور مخدوم سیّد فیصل حیات کو خصوصی ٹاسک دیا ہے کہ وہ آپ سے ملنے آ رہے ہیں ان کی بات کو سمجھ لیں اور ضابطے کے مطابق ان کی مناسب مدد کر دیں۔ گورنر نے اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔ اس وقت صورتحال کچھ یوں تھی، گورنر کے صاحبزادے مخدوم شاہ محمود قریشی مسلم لیگ سے ایم پی اے منتخب ہو چکے تھے اور داماد پیر شجاعت حسنین قریشی پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر رہے تھے۔ اندازہ تھا کہ مخدوم صاحب کسی طور دباؤ میں تھے۔ کچھ ہی دیر بعد مخدوم فیصل صالح حیات اور پیر شجاعت میری رہائش گاہ پر آئے۔ دونوں اصحاب سے پرانی نیازمندی تھی۔ پیر شجاعت سے یہ سلسلہ اس وقت تھا جب میں خانیوال میں اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ میرے ملتان میں قیام کے دوران بھی ملاقاتوں کا سلسلہ رہا کرتا تھا۔ مخدوم فیصل صالح حیات کے ضلع میں کچھ عرصہ رہ چکا تھا۔ وہ ان دنوں حکومت کے معتوب تھے۔ کسی نہ کسی حیلے بہانے میں ان کی پکڑ دھکڑ رہا کرتی۔ چائے کی پیالی پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو فیصل صالح حیات کہنے لگے کہ انہیں بی بی کی طرف سے ہدایت ملی ہے کہ گورنر سے اسمبلی کے رولز میں ترمیم کرائی جائے کہ وزیر اعلیٰ کا انتخاب خفیہ رائے شماری کے ذریعے کرایا جائے۔ ان کی رائے میں خفیہ رائے شماری میں بہت سے آزاد اراکین پیپلز پارٹی کے نامزد کردہ وزیر اعلیٰ کے حق میں اپنا پلڑا ڈالنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن اوپن ہاؤس میں ان کے لیے ایسی بات ممکن نہ تھی۔ میں نے انہیں باور کرانے کی کوشش کی کہ رولز میں ترمیم ہو چکی تھی جسے اب قانونی درجہ حاصل تھا۔ گورنر اپنی صوابدید میں کچھ کرنے سے قاصر تھے، ممکنہ تبدیلی صرف وزیر اعلیٰ کی ایڈوائس کی روشنی میں ہی ممکن تھی۔ نگران وزیر اعلیٰ کا منصب جناب نواز شریف کے پاس تھا۔ کچھ دیر بحث ہوتی رہی اور نتیجہ یہی نکلا کہ ہم ایک دوسرے کو قائل کرنے میں ناکام رہے۔ اس لاحاصل گفتگو کے بعد مخدوم فیصل حیات اور شجاعت حسنین قریشی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ممکنہ سیاسی کھیل کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔ مسلم لیگ نے ا[ن] حمایتی امیدواروں کو اکٹھا کیا اور پیپلز پارٹی کی دسترس سے دور رکھنے کے لیے ایڈیشنل انسپکٹر جنرل سپیشل برانچ چوہدری سردار کے زیرِ انتظام چھانگا مانگا منتقل کر دیا۔ پلان یہی تھا کہ وزیر اعلیٰ کے انتخاب تک ان صاحبان کو وہیں رکھا جا[ئے] اس انتظام کو تاریخ نے چھانگا مانگا آپریشن کے نام سے بھی یاد رکھا۔ مسلم لیگ اپنے مضبوط اور کمزور ارادہ ساتھیو[ں] کو حریفوں کی دسترس سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو گئی اور یوں میاں محمد نواز شریف کو اکثریت نے قائد ایوان چن لیا

اگلا مرحلہ ایوان سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کا تھا لیکن ابھی بہت کچھ ہونا تھا۔ متحارب جماعتوں کے سرکردہ راہنماؤں کے مابین بیان بازی اور تلخ نوائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ کوئی بھی سیاسی جماعت مرکز اور پنجاب میں فیصلہ کن اکثریت حاصل کرنے سے قاصر تھی۔ معروضی سیاست میں غیر یقینیت اور عدم استحکام کا عنصر در آیا۔ شکستہ مینڈیٹ Fractured Mandate سیاسی عدم پختگی، تسلسل کے فقدان نے میدان گرم کر رکھا تھا۔ پنجاب میں میاں نواز شریف کی عددی اکثریت بڑی واضح ہو چکی تھی۔ لیکن اندیشہ تھا کہ اگر محترمہ بینظیر بھٹو نے عنان حکومت کچھ روز پہلے سنبھال لی تو بہت ممکن تھا وزیر اعلیٰ پنجاب کے لیے حلف اٹھانا ہی مشکل ہو جاتا۔ بداعتمادی اور بدگمانی کی فضا میں یار اندیشہ ہائے دور دراز کی سوچ بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا میں اپنے دفتر میں بیٹھا۔ باہر ہلچل ہوئی معلوم ہوا جناب نواز شریف چند ساتھیوں کے ہمراہ اچانک گورنر ہاؤس آ گئے۔ مخدوم صاحب سے فوری میٹنگ کرنا چاہتے تھے۔ جناب نواز شریف اور ان کے ساتھی گورنر آفس میں بیٹھ گئے۔ مخدوم صاحب بالائی منزل سے اترے تو مجھے برآمدے میں بلا کر کہنے لگے کہ صدر کی طرف سے وزیر اعلیٰ کی حلف برداری کی تاریخ اور وقت کا تعین کیا جا چکا ہے۔ یہ حلف عین اس وقت اٹھایا جائے گا جس وقت اسلام آباد میں محترمہ بے نظیر بھٹو حلف اٹھا رہی ہوں گی۔ وزیر اعلیٰ اور ان کے ساتھی مُصر تھے کہ میں اپنے تئیں اس حلف نامے کا دن اور وقت تبدیل کر دوں اور کارروائی پہلے کر لی جائے۔ میاں نواز شریف نے قانونی ماہرین سے مشورہ کر لیا ہے اور ایسا کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ پھر بولے میں صدر کی اجازت کے بغیر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گا اور جلدی سے اپنے دفتر میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے مجھے بھی اندر بلا لیا۔ جناب نواز شریف کی معاونت چوہدری عبدالغفور، نصر اللہ دریشک اور ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مرحوم اصغر خان المعروف ہلاکو خان کر رہے تھے۔ ان حضرات کا یہ اصرار تھا کہ وزیر اعلیٰ حلف پہلے لے لیں۔ گورنر یہ گفتگو کمال تحمل سے سنتے رہے پھر گرین فون اٹھا کر بولے میں یہ بات صدر کے نوٹس میں لے آؤں۔ اس محفل میں اب کوئی بھی یہ بات کرنے سے قاصر تھا کہ بات صدر کے نوٹس میں نہ لائی جائے۔ گورنر نے صدر کو کال کی۔ صدر غلام اسحاق خان نے گفتگو سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا کہ حلف برداری کی تاریخ اور وقت میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ مہمانوں کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اس فیصلے سے ناخوش تھے۔ گورنر نے مبینہ طور پر اپنے سر سے بوجھ اتار دیا تھا۔

پنجاب اسمبلی نے میاں منظور احمد وٹو کو واضح اکثریت سے سپیکر منتخب کر لیا اور میاں محمد نواز شریف بھی اکثریت رائے سے قائد ایوان منتخب ہو گئے اور بطور وزیر اعلیٰ اعتماد کا ووٹ بھی حاصل کر لیا۔ اگلا مرحلہ ان کی بطور وزیر اعلیٰ حلف برداری کا تھا۔ یہ فریضہ گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی نے ہی سرانجام دینا تھا۔ اس تقریب کے اور وزیر اعظم پاکستان کی حلف برداری کے بعد صوبے میں نئے گورنر کی تقرری متوقع تھی۔ اس سلسلے میں جنرل ریٹائرڈ ٹکا خان کا نام گردش میں تھا۔ مرکز میں محترمہ بینظیر بھٹو اعتماد کا ووٹ حاصل کر چکی تھیں اور اب بھی بطور وزیر اعظم حلف برداری کی منتظر تھیں۔ صدر غلام اسحاق خان کے فرمان کے مطابق ان دونوں اہم حلف برداریوں کا دن اور وقت ایک ہی تھی۔ بدگمانی کی فضا میں مبادا کسی کو کہیں مشکل پیش نہ آئے۔ اسلام آباد اور لاہور میں یہ تصور زیر گردش تھا کہ پیپلز

پارٹی وفاق میں حکومت بنانے کے بعد جناب نواز شریف کی حلف برداری کی تقریب میں مخل ہو سکتی تھی۔ کچھ ایسے حربے استعمال کیے جا سکتے تھے جن سے صوبے میں مسلم لیگ کی حکومت شروع ہی سے مشکلات سے دوچار ہو سکتی تھی۔ دونوں اطراف سے شعلہ بیانی کا سلسلہ جاری تھا۔ مسلم لیگی حلقے، سقوطِ مشرقی پاکستان کے دوران پیپلز پارٹی کی قیادت کے مبینہ کردار، بلوچستان میں فوجی آپریشن اور اس جماعت کے دورِ حکومت کو تواتر سے نشانہ بنا رہے تھے اور دوسری طرف پیپلز پارٹی، مسلم لیگ کی کامیاب کو ضیاء الحق کی باقیات سے تعبیر کر رہی تھی۔ غرضیکہ

دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی تھی

لاہور میں صوبائی اسمبلی کا اجلاس جاری تھا۔ نواز شریف اسمبلی میں اعتماد کا ووٹ لے رہے تھے۔ بعد دوپہر بوقت تین بجے گورنر ہاؤس کے لان میں وزیر اعلیٰ کی حلف برداری منعقد ہونے والی تھی۔ مَیں اپنے دفتر میں تھا۔ گورنر اس وقت گلبرگ میں اپنی نجی قیام گاہ کی طرف نکلے ہوئے تھے گورنر کے پرسنل سیکرٹری مرحوم اے۔ یو انصاری ملحقہ کمرے سے میرے پاس آئے اور کہنے لگے وزیر اعظم ہاؤس سے ٹیلی فون آیا ہے۔ نئے اٹارنی جنرل آپ سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ 'کون صاحب' میرے سوال پر انصاری صاحب بولے کے آپریٹر نے یہی بتایا ہے کہ وہ صاحب سیّد افتخار گیلانی صاحب ہیں۔ ان صاحب کی انصاری صاحب سے بات بھی ہوئی۔ میرے اس سوال پر کہ ابھی تو وزیر اعظم محترمہ بینظیر بھٹو نے حلف بھی نہیں اٹھایا ہے، اٹارنی جنرل کہاں سے آ گئے؟ انصاری صاحب نے اپنی فہم کا استعمال کرتے ہوئے کہا ممکن ہے ان کے نام کا فیصلہ ہو گیا ہو۔ بولے کہ وہ گورنر سے ضروری بات کرنا چاہتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کا اصرار تھا کہ سیکرٹری ٹو گورنر سے بات کروا دی جائے۔ محترمہ کا ضروری پیغام دینا چاہتے تھے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی غیر معمولی نوعیت کا پیغام تھا۔ مَیں نے انصاری صاحب سے کہا کہ اب رابطہ ہو تو انہیں کہہ دیں کہ سیکرٹری ٹو گورنر سے ہی رابطہ نہیں ہو رہا تھا اپنا پیغام ڈکٹیٹ کروا دیں۔ جیسے گورنر سے رابطہ ہوتا ہے اس پیغام سے انہیں مطلع کر دیا جائے گا۔

انصاری صاحب پرانے معاملہ فہم سٹاف افسر تھے کہنے لگے کہ بات کرنے میں حرج کیا تھا۔ مَیں نے اسے پھر سے باور کرایا کہ ابھی تک وزیر اعظم کے عہدے کے لیے حلف نہیں اٹھایا گیا لہٰذا ان کے آفس سے کسی قسم کی پیغام رسانی میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

انصاری صاحب ڈائری تھانے اپنے دفتر میں چلے گئے۔ مَیں نے آپریٹر کو تاکید کی کہ مجھے کوئی ٹیلی فون نہ ملایا جائے۔ انصاری صاحب پھر سے میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے اسلام آباد سے بار بار ٹیلی فون آ رہے ہیں کہ گورنر کے نام نامزد اور نومنتخب وزیر اعظم کا ضروری پیغام ہے، انہوں نے مزید استفسار پر بتایا کہ یہ پیغام وزیر اعلیٰ کی حلف برداری کے بارے میں تھا۔ مجھے کھد بدی سی لگ گئی۔ پس پردہ کوئی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ انصاری صاحب نے مزید تصدیق کی کہ ٹیلیفون سندھ ہاؤس اسلام آباد کی ایکسچینج سے آ رہے تھے۔ اسی اثناء میں انصاری صاحب اپنے ہاتھ سے ایک ٹائپ شدہ پیغام لے کر آئے، کہنے لگے کہ پیغام دینے والے صاحب جناب افتخار حسین گیلانی نے اپنے

آپ کو Would be Attorney General کراتے ہوئے پیغام ڈکٹیٹ کرایا جس میں گورنر پنجاب کو ہدایت کی جا رہی تھی کہ وزیر اعلیٰ پنجاب کی حلف برداری کے سلسلے میں وہ اسلام آباد پرائم منسٹر آفس سے حتمی پیغام کا انتظار کریں گے۔ وزیر اعلیٰ کی حلف برداری کا وقت تو آئینی اعتبار سے طے ہو چکا تھا یہ پیغام یقیناً کسی بحران کا باعث بن سکتا تھا۔ گورنر صاحب واپس لوٹ چکے تھے۔ مَیں نے انصاری صاحب کا نوٹ ہاتھ میں تھاما اور گورنر کے پاس لے گیا۔ انہوں نے پیغام کو بڑے غور سے پڑھا۔ چہرے پر پریشانی عیاں تھی۔ چیف سیکرٹری انور زاہد مرحوم سے فون پر بات کی۔ انہیں فوری طور پر بلا لیا۔ اس دوران میں نواز شریف اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لے کر گورنر ہاؤس پہنچ گئے۔ ان کے چہرے پر مسرت عیاں تھی۔ کریم کلر کے سوٹ اور براؤن واسکٹ میں ملبوس سب سے بڑی خندہ پیشانی سے مل رہے تھے۔ مخدوم صاحب سے گلے ملے تو کہنے لگے کہ اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لے کر وہ سیدھا ان سے ملنے چلے آئے۔ ان کو مل کر ماڈل ٹاؤن جائیں گے اور تقریب حلف برداری کے لیے تیار ہو کر ڈھائی پونے تین بجے گورنر ہاؤس پہنچ جائیں گے۔ مخدوم صاحب نے انصاری صاحب کا ٹائپ شدہ پیغام میاں صاحب کے آگے رکھ دیا۔ عبارت پڑھتے ہی ان کے چہرے پر سنجیدگی کی لکیریں ابھر آئیں۔ دونوں صاحبان طرح طرح کے ممکنات کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس بات کی تصدیق تو ہو گئی تھی کہ پیغام وزیر اعظم ہاؤس کی جانب سے ہی تھا۔ ان کے محرکات کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت تھا۔ چیف سیکرٹری بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے باریک چشمہ لگا کر پیغام کو بار بار پڑھا اور پھر بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہنے لگے، اس کاغذ اور پیغام کو سامنے آتش دان میں پھینک دیں سر! اوتھ ٹیکنگ Oath Taking طے شدہ وقت پر ہی ہو گی جس وقت پرائم منسٹر اسلام آباد میں اوتھ لے رہی ہوں گی۔ انور زاہد مرحوم نے بڑی پُر اعتمادی سے اپنی بات مکمل کی۔ ان کے اس مشورے سے وہاں گومگو کی کیفیت اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ اس بحث و تمحیص میں خاصا وقت صرف ہو چکا تھا۔ ساتھیوں کا مشورہ تھا کہ میاں صاحب اگر تقریب کی تیاری کے سلسلے میں لباس تبدیل کرنے ماڈل ٹاؤن گئے تو دیر ہو جائے۔ گورنر اور صوبائی انتظامیہ کسی قسم کا چانس نہیں لینا چاہتے تھے۔ حلف برداری کے موقع پر باضابطہ لباس، شیروانی کا استعمال بھی ضروری تھا، طے پایا کہ نئے وزیر اعلیٰ کو گورنر کی اور شیروانی پہنا کر حلف برداری کی تقریب کا اہتمام کیا جائے گا۔

حلف برداری کی تقریب کے موقع پر میاں محمد نواز شریف گورنر کی ڈھیلی سیاہ شیروانی میں ملبوس بالائی منزل کی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔ حلف برداری مقررہ وقت پر ہی ہوئی۔ اس کے بعد نہ اٹارنی جنرل اور نہ ہی وزیر اعظم کے کسی نمائندے کی کال موصول ہوئی۔ چائے کے پُر تکلف اہتمام کے ساتھ ہی حلف برداری کی تقریب اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

(طارق محمود کی زیرِ طبع کتاب سے اقتباس – ماہنامہ ادبِ لطیف)



سیّد سبطین گیلانی

عظمت ملتان

ملتانِ ما...... تہذیب و تمدن کے سنہری ادوار کی تاریخ کا درخشندہ و زندہ بلد عظیم جس کی عظمت و قدامت کے بارے میں کہا گیا کہ:

عہدِ آدم قدسیاں دانند
جائے اصل است مولتان نامند

قدرتِ کاملہ کہ ملتان میں ہر عہد میں رشد و ہدایت کے ہزار ہا چشمے پھوٹے جن کے علم و عرفان اور اخوت و محبت سے ایک عالم سیراب ہو گیا جس کی وجہ سے اسے مدینۃ الاولیاء کا استحقاق حاصل ہوا۔ یعنی ''سٹی آف سپر یچول انٹلکچلز'' کیونکہ اس کے خمیر کا تخم اور پھل محبت کا مٹھاس اور اسی مٹھاس کا اثر ہے کہ ملتان ''سٹی آف مینگو'' بھی ہے اور یہاں کی زرخیز مٹی کے آم پوری دنیا میں اپنی شیرینی اور مٹھاس کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہیں۔

یہی مٹھاس یہاں کی زبان و ثقافت میں رچا بسا ہوا ہے اور اسی مٹھاس نے یہاں کے فن کو عشق کی انتہا اور جنون کا کمال بخشا ہے کہ ملتان ''سٹی آف آرٹ'' سے موسوم ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے یہ پاکستان کے نقطہ اتصال کا گلستانِ تمدن ہے کہ جس کی گلکاری کی مہک سے دستکار نے اپنے خونِ جگر سے ایسے رنگ بھرے کہ ملتان قدیم و جدید آرٹ کا پل معلوم ہوتا ہے۔

یہاں کی بکثرت پیدا ہونے والی کپاس کے شعبہ کا پاکستان کے زرِ مبادلہ میں ایک کثیر حصہ ہے اسی لیے ملتان کو ''سٹی آف کاٹن'' بھی کہا جاتا ہے۔ کپاس کی طرح کا نرم و ملائم اور شفاف پن یہاں کے لوگوں کے رویوں اور اقدار میں پایا جاتا ہے گویا ملتان کی مٹی زرخیز ہے اور جس کی زرخیزی کی محبت کے مٹھاس سے علم و فن کے شگوفے کھلتے ہیں بلکہ ثمر و اجناس کے پھول و پھل پیدا ہوتے ہیں اس لیے تو ملتان محبت کی مٹھاس کا شہر ہے اور ملتانیات اس جلوہ گاہِ زیست تمدن میں صوفیا کی محبت کے مٹھاس کی تہذیب جہاں آراء ہے۔ پیر حسام الدین راشدی لکھتے ہیں کہ:

> ''ملتان شہر تاریخی واقعات اور حوادث کا منبع ہے۔ خدا والوں کا شہر ہے اور نیک شریف اور وضعدار انسانوں کا مسکن ہے۔ اس شہر کا تمدنی اور تہذیبی معیار سطحی نہیں

ہے کہ کسی حادثہ یا انقلاب سے الٹ جائے یا ماند پڑ جائے۔اس کے تہذیبی رشتے اور تمدنی عناصر پاتال تک ہیں۔سینکڑوں انقلابات آئے، کئی حوادث گزرے، زمانے نے کئی ورق الٹے اور لیل ونہار نے گوناگوں پلٹے کھائے لیکن اس شہر کی محکم اور مستحکم روایات کی بنیادیں جوں کی توں قائم رہیں کوئی طاقت انہیں ہلا نہ سکی۔"(1)

زہے ملتان زہے شہر سلامت
خدا آباد وارث تا قیامت

(اسلم انصاری)

ملتان کی ابتداء کب ہوئی اور کس نے اس کی بنیاد رکھی اور کن عوامل کے زیر اثر اس سرزمین کو آباد کیا گیا، کیا مزاحمتیں پیش آئیں، اور ان سے کس طرح عہدہ برآ ہونا پڑا۔ یہ ارتقاء قدرتی تھا یا انسانی کاوش کی تحریک تھی؟ یہ وہ چند سوالات ہیں جو ملتان کے ماضی کو تانک جھانک کرنے سے ذہنوں میں ابھرتے ہیں اور ہم تاریخ کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ایک دھندلا سا عکس ابھرتا ہے اور دیو مالائی داستانوں میں ہمیں شریکِ سفر کر لیتا ہے۔پھر جب ہم چونکتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہزار ہا سال پہلے کے نیم تاریخی قصے ہیں یا افسانے ہیں۔

آج تک اس کی نہ تاریخ ملی دنیا کو
جانے کس دن سے آباد جہان ملتان

(عزیز حاصل پوری)

ملتان کی تاریخِ قدامت کی طرح خود شہر ملتان کا نام بھی بھول بھلیوں مین عظمت ملتان کی خوبصورتی پیش کرتا ہے:

There are several views about the historical background to Multan's name. The cith has been known by a numbe of different names during various period and with the passage of time, each has changed its form and pronunciation.

It is said that the city's oldest name was Kashyapapura, followed by Hamsapura, then Baghapur, later on Sambhapura, and finally Mulasthana - 'the original place', for mula means

root / origion and sthana means place. Other think that Mula was the name of race who originally inhabited the city and hence it was called Multasthana - the place of Mula. the word Mula was transformed into the Malloi of Alexender the Great's historians.

The original form of the name is difficult to ascertain. Hiuen Tsan, who visited the city in A.D.641 calls it Mu-lo-san-po-lo, which is said to be translation of Mulasthanapura. When Hiuen Tsang visited the city, twenty years of the Hijra era had already passed. And within twenty years of his departure, the Arabs were knocking at the gates of Sind. Half a century later, a Muslim conqueror stood in the Buddhist pilgrim's footsteps at Multan. The Arabs had further stories regarding the city and its name. Ibn-e-Khurdadbba (d:A.D912) says Multan was called the 'frontier of the house of gold' - Bait-sl-zahab, while Masudi (d:A.D956) writes the word Multan means 'the boundary of gold'.

Nevertheless, there can be no doubt that it is one of the oldes cities of South Asia. Indeed, the city has been described as the omphalos or the 'naval of the world' of the Hindus, the Bait-al-zahab of the Arabs and the dar-ul-aman of the Mughals.

چہار چیز است تحفہ ملتان
گرد، گرما، گدا و گورستان

"With four things rare Multan abounds-
Dust, heat, begars and burial grounds." (2)

جبکہ ملتان کی تاریخ کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ:

The history of Multan prior to the arrival of the Arabs in the 8th century A.D's obscure. Alexander is said to have passed through the district in about 325-326B.C. About 327B.C the macedonians were ousted by Chanderaupt and the Maurya dynasty remained in power till the beginning of the second century A.D. From 30 B.C to 470 A.D, the Kushan dynasty ruled over the area and from 470 to 550 A.D., the White Huns are beleived to have held sway.

Multan was conqured by Arabs under Muhammad Bin Qasim in 712/713 A.D. after defeating Raja Dahir, a descendant of Chach. Thereafter, the city remained for three centuries the outpost of Islam in India, under the Caliph of Damacus and Baghdad. Multan was also under the regime of the Karamatians in A.D.970. From the beginning of 13th century, for the next three centuries, the history of Multan practically the history of the incursions from Western and Central Asia.

Multan was a seperate kingdom, the first

being from 1206 to 1227/1228 by Nasir-ud-Din Qabacha. Secon, in 1437 - 1527, when Langha governed the area independently from the Delhi Sultan.

Multan enjoyed a long period of peace between 1528-1748 under the Mughals. In 1752 Multan became a province owing alegiance of Afghan kings. The Sikh ruled Multan between 1818-1849 and then the city came under the British rule in 1849. A century later Multan was under the independent and peaceful shade of the green flag's crescent and star of Islamic Republic of Pakistan.

ملتان اپنی قدامت کے باوجود یہ بھی تاریخ رکھتا ہے یہاں اوریجنل ماخذ موجود ہی نہیں کیونکہ اہلِ ملتان ابتداء ہی سے اس مٹی کی تاثیر کی وجہ سے ڈھیلے ڈھالے ہیں اور ہر معاملے میں توکل کر لیتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنی تاریخ داستان گویوں کے حوالے کر دی اور کچھ بھی ریکارڈ نہ کیا، کبھی رگ وید کے اشلوکوں کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی نام کی بے جوڑ مماثلت کو اپناتے ہیں۔ کبھی تخیل کی پرواز میں کڑی سے کڑی ملاتے ہیں، دیوتاؤں اور دیویوں کے لیے بیان ان کے زیرِ اثر ایکٹ ہونے والی تاریخی سٹیج پر دیو مالائی سٹوری کو بنیاد بناتے ہیں، پھر تھک ہار کر ملتان کے نیم مسمار شدہ قدیم ترین آثار پر ہلاد مندر جسے قدیم ہندو یونیورسٹی کی اہمیت حاصل تھی کی طرف پلٹتے ہیں۔ تو ہمیں پرہلاد جی کے والد ہرنا کشپ جو سورج دیوتاؤں کا باپ کہلاتا تھا اور جس کی نسبت سے ملتان کا ابتدائی چند ناموں میں سے ایک نام کشپ پورہ ہوا، کا کردار بڑا زوردار نظر آتا ہے جو ملتان کی ہزار ہا سالہ قبل مسیح کی تاریخی سٹیج پر ایکٹ ہونے والے دیو مالائی سٹوری کا کریکٹر معلوم ہوتا ہے اور اس سٹوری پلے میں سب سے زیادہ فوکس ہونے والا ''سورج دیوتا'' ہے جس کے اردگرد تمام کریکٹر ایکٹنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ملتان کی تاریخ کہانی مختلف ایکٹس میں چلتی چلی جاتی ہے جب دیو مالائی داستانیں ختم ہوتی ہیں تو ہم کہہ کتھے ہیں کہ بھلا ہو چینی اور عرب سیاحوں کا جنہوں نے اپنے سفرناموں میں اپنے قیامِ ملتان کو یہاں کی تہذیب و تمدن کے حوالے سے بھی سپردِ قلم کیا۔

آج اگر ایک دانشور ''کشپ پورہ'' یعنی قدیم ملتان کی باقیات موجودہ ملتان کے محلّہ قصاب پورہ میں ڈھونڈتے ہیں کہ یہ قلعہ سے دو کوس کے لگ بھگ فاصلے پر ہے لہٰذا قدیم شہر ملتان یہیں واقع تھا۔ تو دوسری طرف بعض

دانشور بی بی پاک دامن کے قبرستان میں سورج کنڈ روڈ کی طرف قدیم شہر ملتان کو ڈھونڈ تے ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ پر ہلاد جی کے پر پوتے کے زمانے میں ''سورج دیوتا'' کا ادیتہ مندر یا متروں جو پر رونق ہوا، تو ملتان ہندومت کے برہمن پجاریوں کا مرکز ومحور بن گیا اور یہ مندر ملتان کے شہر کے بھرے بازاروں کے درمیان سیاحوں نے دیکھا۔ اسطخری 951ء میں لکھتا ہے۔

''یہ بت خانہ ایک شاندار محل ہے جو ملتان کے بازار میں ایک بڑے آباد اور بارونق مقام ٹھیٹھروں اور ہاتھی دانت والے بازار کے درمیان تعمیر کیا گیا ہے ملتان کا نام اسی وجہ سے پڑا۔''

اگر قصاب پورہ یا چوک شاہ عباس کے علاقہ کی طرف نظر دوڑائیں اور سوچیں کہ یہاں پر کبھی ایک ہنستا بستا پُر رونق بازاروں والا شہر ملتان آباد تھا جو اب ایک شہرِ خموشاں ہو چکا ہے، اور اس شہرِ خموشاں پر نئی نئی عمارات بنتی جا رہی ہیں اور نئے مکین بستے جا رہے ہیں جنھوں نے کم از کم پینے کے پانی کے لیے کئی نلکوں، ڈیپ ویل اور ٹیوب ویل کی بورنگ کرائی ہے لیکن آج تک کسی کو اس کھدائی کی وجہ سے کوئی قدیم آثار یا اشیاء نہیں ملیں، جس سے تصدیق ہوسکتی کہ یہاں پر کبھی ہنستا بستا قدیم شہر ملتان آباد تھا۔

اگر ہم وادی سندھ کی ریکارڈڈ ہسٹری کی طرف آئیں تو سوا تین سو سال قبل مسیح میں سکندر اعظم نے بے جگری سے لڑنے والی ملوئی یا ملی قوم سے سخت مقابلہ کے بعد جو ملتان فتح کیا یہ وہی، رائے اور چچ شاہی کا شہر ملتان تھا جسے چینی اور عرب سیاحوں نے چھٹی صدی عیسوی سے دسویں صدی عیسوی کے درمیان دیکھا تھا۔ جس میں اہم ترین سورج دیوتا کا ادیتہ مندر تھا، جہاں مدھم سُروں کی تھاپ پر سورج دیوتا کی خوشنودی کے لیے دوشیزائیں رقصاں رہتی تھیں اور عطر وگلاب کی مہکار سے ماحول مسرور کن تھا۔ سونے و چاندی کے نذرانوں کا انبار لگ جاتا تھا ہر طرف دور دراز سے آئے ہوئے زائرین محوِ دُعا ہوتے تھے، جہاں چند بدھ مت کے شکستہ سٹوپوں کی زیارت کو چینی سیاح بھی ملتان ساتویں صدی عیسوی میں آئے یا پھر آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں ملتان میں نورِ اسلام پہنچا اور ملتان باب الاسلام بنا اور یہاں پر محمد بن قاسم نے پہلی مسجد تعمیر کرائی۔ بلکہ یہ روایت بھی ہے کہ دو مساجد تعمیر کرائیں۔ ایک قلعہ میں اور دوسری شہر میں، عرب سیاحوں نے دسویں صدی عیسوی تک ادیتہ مندر اور مسجد محمد بن قاسم کو بڑی آن و شان سے دیکھا وہ شہرِ ملتان میں کہاں واقع تھا؟ اب مہلہل 331 ہجری میں یہ شہادت دیتا ہے کہ:

''ملتان میں ایک بڑا قبہ ہے اور اس نے نزدیک مسلمانوں کی مسجد ہے۔''

پھر کیا ہوا اگر قرامطیوں نے ملتان کو علوم عقلیہ کا دبستان بنایا تو سورج دیوتا کے مندر کو توڑ کر اپنی مسجد تعمیر کی، نیز مسجد محمد بن قاسم کو بنی اُمیہ کی یادگار سمجھ کر بند کر دی جسے محمود غزنوی نے ملتان فتح کر دوبارہ کھول دیا۔

اساں سو بدمست قلندر ہوں کڈیں مسجد ہوں کڈ ہیں مندر ہوں

(خواجہ فریدؒ)

(We are the great-enthralled qalandars

At times we are mosque; at time we are temple)

لیکن غضب کیا قرامطیوں نے دوبارہ اپنی سرکشی سے ملتان کی تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی و ثقافتی ورثوں کو بھی روند ڈالا، اسی زمانے میں حضرت شاہ یوسف گردیزؒ ملتان میں تشریف لائے اور حضرت موج دریاؒ کے ہمراہ رُشد و ہدایت کے سلسلہ کو شروع کیا، کیا موجودہ شہر ملتان کی ان بزرگوں کی کاوشوں سے آبادکاری اور بحالی ہوئی تھی؟ حالانکہ قرامطی سرکشی نے تو اس زمانے کے ملتان کے حالات پر پردہ ڈالا ہوا ہے تو پھر سورج دیوتا کا مندر جو بعد میں قرامطیوں کی مسجد بنا بھرے بازاروں میں موجود تھا تو وہ کس شہر ملتان میں واقع تھا؟

ملتان کی علمی عظمت کا یہ عالم تھا کہ اجمیر جانے سے پہلے سلسلہ چشتیہ کے موسس اعلیٰ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے بھی ملتان میں رہ کر مقامی لسانیات کی تعلیم حاصل کی۔ غوریوں نے قرامطیوں کو نیست و نابود کر کے ہندوستان کو اسلامی ہند کی صورت میں نمایاں کیا تو اس کے ساتھ خاندانِ غلاماں کے عہد میں ملتان کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست قباچہ نے پھر بنا کر ملتان کو علم وعرفان کا گہوارہ بنا دیا۔ پھر قلعہ کہنہ پر پرہلاد جی کے مندر کے قریب حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے مدرسہ و مسند ارشاد سے شہر ملتان کو برصغیر میں سلسلہ سہروردیہ کا محور بنا دیا۔ روحانی اعتبار سے ملتان نے اتنی ترقی کی کہ صوفیاء نے اسے سجدہ گاہِ ملائک سے پکارا۔ حضرت خواجہ قطب الدین کاکیؒ بھی یہاں آئے۔ حضرت بابا فریدؒ نے یہاں ہی سے تعلیم حاصل کی اور حضرت عراقیؒ نے بھی ملتان ہی اکتسابِ فیض حاصل کیا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت شاہ شمس سبزواری المعروف تبریزیؒ ملتان تشریف لائے اور انہوں نے لبِ شہر اپنا ڈیرہ آ لگایا، پھر لودھیوں کے عہد میں ملتان کو ایک دفعہ پھر ایک آزاد وخود مختار ریاست لنگاہوں نے بنایا تو حضرت مخدوم سیّد محمد غوث بندگی گیلانیؒ حلب سے ملتان تشریف لائے۔ اور شہر ملتان میں قادریہ سلسلہ کا مؤثر آغاز کر کے اُچ سے شریف میں سکونت پذیر ہو گئے اور پھر مغلیہ عہد میں ملتان دارالامان بنا اور اکبری عہد میں اُچ شریف سے حضرت سیّد موسیٰ پاک شہیدؒ نے ملتان میں مسند ارشاد کو زیب وزینت کر کے شہر ملتان کو برصغیر میں قادریہ سلسلہ کا مرکز ومحور بنا دیا۔ آپ کے مرید حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بھی ملتان آ کر علم الحدیث کا درس دیا اور ملتان کو مدینۃ الصغیر سے تشبیہ دی۔ احمد شاہ ابدالی نے جب ملتان اور لاہور کو افغانستان کے تحت کیا تو افغان عہد میں ملتان نے نیم آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کر لی اور شہر ملتان میں سلسلہ چشتیہ نے حضرف حافظ جمال اللہؒ ملتانی کی وجہ سے جگہ حاصل کر لی۔ آپ کے مرید حضرت عبدالعزیز پرہاروی تو علامہ اجل تھے۔ یوں ملتان سلاسل تصوف کے ذریعے فیوض و برکات کا مرکز انوار وتجلیات بن گیا۔

انیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ملتان کی اہم تاریخی، مذہبی و ثقافتی عمارات سکھی تخریب کی نذر ہو لگ جاتی ہیں۔ پھر انگریزی استعمار کا دور شروع ہوتا ہے اور ہمیں اس زمانہ کا ملتان شہر کا مستند نقشہ ملتا ہے جو یہ ظاہر ہے کہ قدیم ملتان دو آبی جزیروں یا دریائے راوی میں گھرے ہوئے دو قدرتی ٹیلوں پر قائم ہے۔ یعنی ایک قاسم

یعنی قلعہ کہنہ اور دوسرا دولت دروازہ، دہلی دروازہ، پاک دروازہ، حرم دروازہ، بوہڑ دروازہ اور لوہاری دروازہ کے اندر بازاروں سے پُر رونق شہر ملتان ہے۔ جان ڈنلپ لکھتے ہیں کہ:

''مولتان قدیم ترین ادوار سے ہی اہمیت کا حامل ہے۔ شہر ایک بلند و بالا ٹیلے پر تعمیر کیا گیا ہے جو نہایت قدیم شہر کے ملبے اور باقیات سے وجود میں آیا ہے جن کے نام تک محفوظ نہیں رہ سکے۔ وانس ایکینو نے لکھا ہے کہ اس نے ہندوستان کے طول و عرض میں بہت سے قلعے دیکھے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے ملتان کے مقابل لایا جا سکے۔ اس کے دمدموں پر نصب اسی (80) توپیں اس کی قوت و زینت میں بے پناہ اضافے کا باعث بنتی ہیں۔''

شہر میڈے دیاں گلیاں اندر شور وڈا ہئی اریت
گزر گئی کیا لوکاں اتے کہیں اے گالھ نہ جاتی
اوکھیاں راہواں مشکل واٹاں ہک ہک ساہ ہے کاتی
ہاں مسافر ہتھوں خالی وڈا پندھ حیاتی
(طارق جامی)

ملتان کے قدیم شہر اور قلعہ کے بارے لکھا گیا ہے کہ:

The old town is bouned on the north by a depression which seperates it from the Fort, and on all other sides by a brick wall - preserved only in places - and a circular road. Large and irregular subrubs have sprung up outside the walled area and the city is now spread over more than 35sq. kilometers. The remains of the Fort, whose date of contstruction cannot be fixed with certainly, stands on a mound, offering superb panoramic view of the entire city.

When it was intact, the Fort had 45 bastions including two flanking towers at the four gates, each and its circuit measure 2012 meters. Now destroyed, there are not traces of the walled enclosures or gates, while access to the top of the Fort has been restricted to medern gate. A new garden - Qasim Bagh - and a stadium now partially cover the area."

کچھ برس قبل جب ملتان کے قلعہ کہنہ قاسم باغ سٹیڈیم کی تعمیر کے دوران بنیادوں کے لیے گہرائی تک کھدائی کی گئی تو دستیاب ہونے والی اشیاء دوسری طرف اندرون شہر کبوتر منڈی کے قریب سکول کی تعمیر کے دوران گہری بنیادوں کی کھدائی سے ملنے والی اشیاء سے مماثلت رکھتی تھیں، جو یہ شہادت دیتی ہیں کہ قدیم ملتان موجودہ چھ دروازوں کے اندر کا قدیم شہر ہے اور دفاعی قلعہ موجودہ قلعہ کہنہ قاسم باغ ہے اور قدرت کاملہ نے اس ''مردم خیز'' ہی نہیں بلکہ ''ولی خیز'' خطہ کو اپنی اصلی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے اولیاء کرام نے جن کی وجہ سے ملتان پیری پور اور مدینۃ الاولیاء کہلاتا ہے سکالر پریچر، ریفارمر اور انٹلیکچول ہونے کے ناطے بھی قدیم ملتان کے بارے تحقیق و جستجو نہیں کی۔ اگرچہ حالات کے تغیر و تبدل سے نئی نئی اقدار ابھر رہی ہیں لیکن صوفیانہ محبت و اخوت اور امن و آشتی سے لبریز ملتانی یا سرائیکی کلچر اپنی اصل اور مستحکم بنیادوں پر قائم چلا آ رہا ہے۔ کیونکہ ملتان کا خطہ اپنی ابتداء سے اصل جگہ پر برقرار ہے اور محبت کے مٹھاس کی تہذیب کا امین یہ شہر موہنجوں سے دور اور حضوری سے قریب تر ہونے کے ناطے، قناعت کی چادر اوڑھے خیر سے آباد ہے۔ یہی اس قدیم شہر ملتان کی عظمت ہے۔ سیّد سبط حسن لکھتے ہیں ہیں:

''ملتان کی تاریخی عظمت مسلمہ ہے پاکستان کا یہ مقدس خطہ صدیوں سے تہذیب کا گہوارہ اور فکر و فن کا اہم مرکز رہا ہے۔ اس شہر میں سب سے پہلے معتزلہ نے عقل کی شمع روشن کی تھی۔ اس شہر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے چھ برس تک صوفیائے کرام کی محبت حاصل کی۔ اس شہر کی روح پرور فضا میں حضرت امیر خسرو کی شاعری کے نغمے گونجے، یہ شہر مدتوں ہماری تہذیب کا ضمیر اور ہمارے ضمیر کی آواز رہا

ہے۔"

ملتان کی سیاسی اہمیت بھی ہمیشہ مسلمہ رہی ہے۔ اسے مرکزی اقتدار کی جست گاہ کی شہرت صدیوں سے حاصل ہے۔ اس لیے تو کہا گیا ہے:

"جینداملتان مضبوط اوندی دلّی مضبوط"

ملتان میں کئی نامور بادشاہ پیدا ہوئے۔ مثلاً بادشاہِ ہند سلطان محمد تغلق جو کہ ملتان کے محلّہ کوٹلہ تغلق المعروف کوٹلہ تولے خان میں پیدا ہوا جبکہ بادشاہ ہند بہلول لودھی، حسین آگاہی کے قاضیاں والے گھر میں پیدا ہوا۔ احمد شاہ ابدالی، کڑی خورد ابدالی روڈ پر جہاں اب یادگار بھی بنا دی گئی ہے میں پیدا ہوا۔ ہندوستان پر ملتانی سادات کی حکمرانی کے بانی سیّد خضر خان تو ملتان پیدا ہوا، یہیں پہ پڑھا لکھا، جوان ہوا، ملتان کا حاکم بنا پھر تختِ دہلی پر امیر تیمور کی حمایت سے بیٹھا۔ طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے کہ یہ دور خوش حالی اور قبولیت عامہ کا تھا۔

جسٹس پیر کرم شاہ الازہری نے کیا خوب لکھا ہے:

> "ملتان جنتِ نشان - جس کی تاریخ تاسیس کا تعین ابھی تک مؤرخین کے لیے ایک معمہ ہے، جس کا یہ طویل عہد عروج و زوال، اقبال و ادبار کا ایک ختم نہ ہونے والا تسلسل ہے جس کی زندگی کا ہر دور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ جس کا ہر ذرہ اپنے سینے میں غم و مسرت کی ایسی یادیں سمیٹے ہوئے ہے جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، جس کے ہر گوشے میں بڑے بڑے فاتح، سلاطین اور فضلاء آسودہ ہیں۔ جس کا ہر گلی کوچہ ان مردانِ پاک باز کا مسکن ہے جن کے آستانوں سے نور و عرفان کے میٹھے چشمے اب بھی اُبل رہے ہیں۔" (3)

اسی لیے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ملتان کے چپے چپے میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی صدیاں آباد ہیں، اور یہی ملتان کی عظمت ہے۔

اے گھر میرا سکھ مندر　　　معمور خفی دے اندر
جتھ بحر محیط دا بندر　　　اتھ ہر جنسوں ملن سوغاتاں
(خواجہ فریدؒ)

(The house of mine is temple of peace, it
is raised in the inmost centre (of heart). It
is harbour of the encompassing see
wherein are found rare gifts of each

category).

(ملتانیات-سیّد سبطین گیلانی)



حوالہ جات

1- تاریخ ملتان فریدی II
2- کرافٹس آ پنجاب II- ملتان اشاعت کنندہ پنجاب سال انڈسٹریز کارپوریشن P.S.I.C
3- تاریخ ملتان فریدی I



سیّد سبطین گیلانی

تعمیراتِ ملتان

ملتانیات وادی سندھ کی قدیم ترین زندہ تہذیب ہے لہٰذا وادی سندھ میں رونما ہونے والے تمام تر تعمیر و تخریب کے انقلابات کی جھلک تعمیراتِ ملتان میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو مستحکم بنیادوں کی وجہ سے عملِ انجذاب سے قوسِ قزح کی طرح نمایاں صوفیانہ شناخت رکھتی ہے کہ:

تینوں مسجد، مندر، دیر کہوں　　تینوں پوتھی تے قرآن کہوں
تسبیح کہوں، زنار کہوں　　تینوں کفر کہوں ایمان کہوں
(خواجہ فریدؒ)

جان ڈنلپ ایم۔ڈی لکھتے ہیں کہ:

''مولتان قدیم تاریخی ادوار سے ہی اہمیت کا حامل رہا ہے ......نقشہ میں ملتان کا محل وقول پنجاب کے غربی حصہ کا احاطہ کرتا ہے جو بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ دریائے چناب کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ جو پنجاب کے پانچ دریاؤں میں وسطی دریا ہے۔ دریائے سندھ کی جانب بڑھتے ہوئے ملتان کو (مختلف نقشوں میں) دریا کی گزرگاہ کے دائیں یا بائیں جانب تین چار میل کے فاصلہ پر دکھایا گیا ہے۔ ملتان شہر ایک بلند و بالا ٹیلے پر تعمیر کیا گیا ہے جو نہایت قدیم شہر کے ملبے اور باقیات سے وجود میں آیا ہے جن کے نام تک محفوظ نہیں رہ سکے۔ تین میل سے زیادہ محیط پر مشتمل یہ شہر، شہر پناہ کے اندر واقع ہے جو چالیس سے پچاس فٹ تک بلند ہے۔ اندرونِ شہر مکانات پختہ اینٹوں سے تعمیر کیے گئے ہیں اور ان پر مسطح چھتیں ڈالی گئی ہیں۔ بعض اوقات ان کی بلندی چھ یا سات منزلہ تک جا پہنچی ہے۔ یہ باہمی طور پر بالکل قریب قریب

گلیوں میں واقع ہے اور ان کی یہ ترتیب روشنی اور حدت دونوں کو یکساں طور پر ان تک آنے سے روکتی ہے۔ یہ اہتمام بنیادی طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ ملتان کو گرمیوں میں ہندوستان کا گرم ترین مقام ہونے کی شہرت حاصل ہے۔ اس مخصوص طرزِ تعمیر کے باوصف یہ گلیاں ان متعدد مزین اور انتہائی مقدس مقابر کے برعکس زیادہ یاسیت کا منظر پیش کرتی ہیں جن پر حاضری دینے کے لیے زائرین کی بڑی تعداد کشاں کشاں آتی ہے...... فصیل سے باہر کا منظر دیہات کی بہتات سے مالا مال ہے اور اس تناظر میں مساجد و باغات جان ڈالتے ہیں۔ پورے علاقے بالخصوص جنوبی اور مشرقی سمتوں میں دریائے چناب سے نکلنے والی نہروں کا جال بچھا ہے...... ملتان تجارتی سرگرمی کا ایک بڑا مرکز ہے۔ بازار وسیع وعریض اور اشیائے صرف سے بھرے ہوئے ہیں۔ نمایاں مصنوعات میں ریشم، سوت، شالیں، لنگیاں، کمخواب جن پر زربفت اور سونے کی تاروں کا کام کیا جاتا ہے شامل ہیں اور ان کی غالب تعداد ملحقہ ممالک کو برآمد کر دی جاتی ہے...... شمال کی جانب بلندی پر ایستادہ قلعہ شہر کا نگران ہے۔ اس کی ہشت پہلو فصیل چالیس سے ستر فٹ تک بلند ہے۔ دیوار کی سب سے طویل شمال مغربی سمت کی لمبائی چھ سو گز کے قریب ہے جو اسے شہر سے جدا کرتی ہے۔ پچیس فٹ گہری اور چالیس فٹ چوڑی ایک خندق قلعے کی سمت کھودی گئی ہے۔ اس کے عقب میں اٹھارہ فٹ اونچا ایک ڈھلوان پشتہ ہے۔ جس کی بے پناہ چوڑھائی اسے ایک چٹانی ٹیلے کی مانند ناقابل تسخیر بنا دیتی ہے۔ قلعہ کے اندر ایک بہت ہی قابل لحاظ بلندی پر گڑھی واقع ہے جو بذاتِ خود انتہائی مضبوط عمارت پر مشتمل ہے۔ شہر پناہ کے پہلوؤں میں تیس برج واقع ہیں۔ اس کے اندر بے شمار مکانات، مساجد، خاصی قدامت کے حامل مندر اور خان کا محل واقع ہے۔ جس کی خوبصورتی کو 1818ء میں رنجیت سنگھ کے حملے کے دوران توپوں کی مسلسل باڑھ نے شدید نقصان پہنچایا۔ گمان کیا جاتا ہے کہ تعمیراتی حسن ترتیب کے لحاظ سے مقامی ماہرینِ فنِ تعمیر نے قلعہ بندی کی اس سے بہتر مثال اثر

کہیں نہیں دیکھی۔''(1)

رات پرانے قلعے تے ہک عارف مست قلندر
میلے کپڑے، حال پریشان، کاسہ ہگل دے اندر
نچے ٹپے وجد دے وچ عرفان دے گیت سناوے
ہک مٹی دا بھر کے چاوے پھوکیاں نال اڈاوے
آکھے ایں مٹی وچ ڈیکھو کئی سلطان سکندر
بادشاہاں دیاں ہڈیاں رل گیاں ڈیکھو خاک دے اندر

(حسن رضا گردیزی)

ملتان کے قلعہ کی ایک مستحکم تاریخی حیثیت ہے۔ پیر حسام الدین راشدی لکھتے ہیں:

''قلعہ قدیم ملتان برصغیر کے تمام قلعوں سے قدیم تر ہے کیونکہ اس میں پرہلاد جی کا مندر ہے جس کا زمانہ طوفانِ نوحؑ سے قریب تر بتایا جاتا ہے۔ یہ قلعہ اس وجہ سے بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کی چار دیواری کے اندر ایک راجہ نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا، اس قلعے کو فتح کرنے میں سکندر نے اتنے کاری زخم کھائے کہ ان سے ہی بمقام بابل فوت ہو گیا۔ غازی محمد بن قاسم نے اسے فتح کرنے کے بعد اس پر اسلامی پرچم لہرایا اور جامع مسجد تعمیر کرائی۔''(2)

ارضِ ملتان تیرے لاڈلے جانبازوں نے
اپنی شمشیر سے روکے سکندر کے قدم
ان قبائل کے مقدر میں تھی ہر چند شکست
تیغ یونان کی یہیں اب ہوئی تھی مدھم
تیرے محلوں تیری سنگین فصیلوں نے کبھی
اہلِ غزنی سے افسانہ شمشیر سنا
کبھی نادر کبھی غور کبھی بن قاسم سے
نعرۂ وحدت حق کبھی نعرۂ تکبیر سنا

(شباب قلب)

ملتان کی قدیم ترین تعمیر کے حوالے سے اگرچہ قطع نظر اس کے کہ پرہلاد مندر کی بجائے سیاحوں نے ملتان کے ماضی کی تعمیرات کو سورج دیوتا کے ادیتہ مندر کے حوالے سے اپنے اپنے سفرناموں میں بھرپور طریقے سے بیان کیا

ہے۔ اس بحث کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے عرب سیاحوں نے ادیتہ مندر قدیم کو بیان کیا ہے یا اس وقت کے جدید
مندر کو۔ 951ء میں اصطخری بیان کرتا ہے کہ:

''ملتان کا نام جس بت خانہ کی جوہ سے پڑا یہ بت خانہ ایک شاندار محل
ہے...... جو ملتان کے بازار میں ایک بڑے آباد اور بارونق مقام پر
ٹھٹھیروں اور ہاتھی دانت والے بازیر کے درمیان تعمیر کیا گیا ہے۔''

اس کی تفصیلات بشاری مقدسی یوں بیان کرتا ہے کہ:

''ملتان کا بت خانہ ایک قصر تھا۔ نہایت گنجان آبادی کے درمیان واقع
تھا اور اس کا بلند گنبد آسمان سے باتیں کرتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ گنبد
درمیان میں تھا اور اس کے اردگرد پجاریوں کے مکانات تھے۔''

اس میں ایک اور خوبصورت اضافہ چینی سیاح ہیون تسانگ کے مطابق یہ تھا کہ:

''یہاں پھولوں کے حصار میں تالاب تھا۔''

تالاب کی تعمیر میں نہایت ہی سڈول پتھروں سے نوکدار میخوں سے باہم جڑے درجہ دار چبوترے تھے۔ ان
میں سیڑھیاں بکثرت تھیں تاکہ یاتریوں کی کئی کئی جماعتیں نیچے اترتی اوپر چڑھتی آپس میں مڈبھیڑ نہ ہوں۔ اسلامی
ہندی کے مؤلف نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ:

''اشوک نے سورج مندر سے سورج دیوتا کی مورتی ہٹا کر اس کی جگہ
مہاتما بدھ کی مورتی رکھ دی تھی اور اس کی پوجا ہوتی تھی۔''

یہی وجہ ہے کہ ہیون تسانگ ملتان میں بدھ مت کے سٹوپوں کی زیارت کے لیے آیا اور اس نے ادیتہ مندر سمیت
ملتان کے آٹھ مندروں کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں ملتان کے دس شکستہ بدھ مت کے سٹوپوں کے حالات بھی بیان کیے
ہیں۔

روایت یہ ہے بھی ہے کہ اجودھن (پاک پتن شریف) میں رام پیدا ہوئے اور یہیں رام مندر تعمیر ہوا نہ کہ
اجودھیہ میں جس کے شبہ میں بابری مسجد کو شہید کیا گیا۔ رام اور سیتا کی خوبصورت منقش شکستہ مصور داستان آج بھی
ملتان شہر کے قلب میں واقع چوک بازار کے قریبی مندر میں دیکھی جاسکتی ہے جس کے نزدیک ہی ایک مسجد ہے جو محمد
بن قاسم کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔

713ء میں مسلمانوں کی ملتان میں آمد ہوتی ہے۔ اگر ہندو طرزِ تعمیر میں جنگل کی گھٹن تھی تو مسلم طرزِ تعمیر
اور سبزہ زار میں صحرائی پن تھا۔ اس کے اثرات یہ ہوئے کہ ملتان میں باہم مختلف الجہتی طرزِ تعمیر کا انجذاب ہوا اور
تعمیرات ملتان قوس قزح کی صورت میں جلوہ نما ہوئے۔ جس نے تعمیرات ملتان کو صوفیانہ جمال دے دیا۔ جس کی
ابتداء مسجد محمد بن قاسم سے ہوئی۔ اس بحث کو چھوڑتے ہوئے کہ یہ مسجد کہاں بنی 231ھ میں ابن مہلہل کی یہ شہادت

ہے کہ:

''ملتان میں ایک بڑا قبہ ہے۔اس کے نزدیک مسلمانوں کی جامع مسجد ہے یہ قبہ تین سو ہاتھ بلند اور تیس ہاتھ چوڑا ہے۔''

غالباً یہ اشارہ ہندوستانی طرزِ تعمیر کے ادیتہ مندر اور مسلم طرزِ تعمیر کی مسجد محمد بن قاسم کی طرف ہو سکتا ہے۔ 915ء میں مسعودی لکھتا ہے کہ:

''عرب حکمرانوں نے ملتان کو بہت خوشحالی دی۔ انہوں نے شاندار عمارتیں بنوائیں اور فن معماری کو بہت ترقی دی۔ انہوں نے فنِ تعمیر کے ذریعے میناروں، محرابوں اور گنبدوں کے ڈیزائن متعارف کرائے۔''

ملتان کی تعمیر و ترقیات کے حوالے سے الادریسی کا بیان ہے کہ:

''ملتان بڑا وسیع، شاندار اور آباد شہر ہے۔ یہاں ایک نا قابلِ تسخیر قلعہ ہے۔ جس کے چار دروازے ہیں اس کے چاروں اطراف گہری خندقیں ہیں۔ یہاں ہر طرح کی ضروریاتِ زندگی کی کثرت ہے۔ ملتان میں ایک نہر ہے اس کے اوپر بہت سی پن چکیاں لگی ہوئی ہیں اس کے کنارے بہت زرخیز ہیں۔ یہ دریائے سندھ میں گرتی ہے۔''

951ہجری میں اصطخری نے یہاں یہ منظر دیکھا کہ:

''ملتان کا امیر ملتان شہر سے ڈیڑھ میل پر ایک اور شہر میں رہتا ہے جس کو جندرور کہتے ہیں، حقیقت میں یہ امیر ملتان کی چھاؤنی ہے۔ جمعہ کی نماز پڑھنے ہاتھی پر سوار ہو کر ملتان جاتا ہے۔''

پھر کیا ہوا؟ قرامطی مسلط ہو گئے۔ انجام جو ہوا وہ البیرونی سے سنیئے:

''محمد بن قاسم نے جب ملتان فتح کیا تو اس نے مندر کے قریب ایک مسجد بنوائی تھی لیکن جب قرامطیوں نے ملتان پر قبضہ کیا انہوں نے اس بت (ادیتہ مندر) کے ٹکڑے کر دیئے۔ قرامطیوں نے ایک علیحدہ مسجد بنوائی اور محمد بن قاسم کی مسجد کو بند کر دیا۔''

اساں سو مست قلندر ہوں
کڈیں مسجد ہوں کڈیں مندر ہوں
(خواجہ فریدؒ)

(We are the great-enthralled qalandars
At times we are mosque, at time we are temples).

مسجد محمد بن قاسم کی تعمیر سے ملتانی طرزِ تعمیر کو ایک نئی جہت ملی جس نے آگے چل کر نہ صرف مساجد و مقابر کے تعمیراتی حسن کو دوبالا کیا بلکہ درس گاہوں، باغات اور مکانات میں بھی ملتانی صوفیانہ طرزِ تعمیر نمایاں ہوا۔ محمود غزنوی کی آمد سے قرامطی تخریب کاری سے بند مسجد محمد بن قاسم اللہ اکبر کی اذان سے دوبارہ پُر رونق ہوگئی۔

غزنوی کی آمد سے اصلاح احوال جہاں شروع ہوا وہاں جنوبی ایشیاء کی اولین مسلم صوفی حضرت دیوان مشائخ چاولیؒ ملتانی المتوفی 131 ھ کی خانقاہ بورے والہ کے قریب ملتانی طرزِ تعمیر میں بنوائی گئی۔ جس کی دیوار میں سلامی جو تقریباً دس فٹ اونچائی پر ایک انچ ہے، یہ انداز ملتانی فنِ تعمیر کی خصوصیت ہے۔ موجودہ مقبرہ کی آرائش سفید سنگ مرمر اور چاینا ٹائلز سے کی گئی ہے۔ یہاں پر بڑے بڑے صوفیاء کرام نے چلہ کشی کی ہے اور فیض پایا ہے جن میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ، حضرت بابا فریدؒ، حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ اور حضرت شہباز قلندرؒ شامل ہیں۔ بابا گورونانک نے بھی یہاں پر حاضری دی۔ تواریخ ملتان میں لکھا ہے کہ:

''بوقت انتقال عمر دیوان چاولی مشائخ 41 برس کی تھی۔ وفات ان کی
اخیر 131 ہجری میں ہوئی اور ان کی اولیائی کا شہرہ گرد ونواح مشہور ہوا
اور اکثر لوگ مرید ہونے لگے۔''

ملتان شہر کے اولین بزرگ تو حضرت موج دریاؒ ہیں جنہوں نے قرامطی تخریب کاری میں اصلاحِ احوال کا آغاز فرمایا۔ جبکہ ملتان شہر میں باہر سے آنے والے پہلے بزرگ حضرت شاہ یوسف گردیزیؒ ہیں جنہوں نے حضرت موج دریاؒ کے ہاں آ کر قیام فرمایا اور ان کی تحریک کو مزید مؤثر کر دیا۔ ملتان شہر میں حضرت شاہ یوسف گردیزؒ المتوفی 531 ہجری کا مستطیل نما کاشی کی اینٹوں سے مزین مقبرہ سے ایرانی تعمیری اثرات ملتانی طرزِ تعمیر میں انجذاب پاتے ہیں۔ موجودہ مقبرہ مکمل طور پر کاشی ٹائلز سے ڈھکا ہوا ہے جس پر لاتعداد پھولوں کے مربع اور ہشت پہلو ڈیزائن کے امتزاج سے ایک دلکش نظارہ تخلیق کیا گیا ہے۔ یہاں نیلا اور سفید رنگ نمایاں ہے۔ خانقاہ کی مسجد کی اولاً تعمیر شیر شاہ نے کروائی۔ اسی احاطہ میں عزاداری کے لیے خوبصورت مجلس خانہ بھی ہے۔ نزہتہ الخوائز میں لکھا ہے کہ:

''حضرت یوسف بن ابوبکر الگردیزیؒ تکمیل علوم کے بعد ملتان چلے
آئے۔ یہاں تدریس و تبلیغ شروع کی اور بے شمار افراد نے فیض
حاصل کیا۔''

قباچہ دور آتا ہے تو افغانستان، ترکمانستان اور وسط ایشیا کے ممالک سے صاحبانِ علم وفن سے اہلِ ملتان کے روابط شروع ہونے سے وہاں کے اثرات ملتانی طرزِ تعمیر میں جذب ہو کر تعمیرات ملتان میں قوسِ قزح بن کر ایک ممتاز اور منفرد، ملتانی صوفیانہ طرزِ تعمیر کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

ایک طرف اگر قباچہ علم وفنون کے لیے قلعہ پر جامعہ الناصریہ تعمیر کراتا ہے تو اس کے ساتھ جامع مسجد بھی بنائی جاتی ہے۔ جس کی خطابت و امامت سیّد السادات ابراہیم الضمر بن سیّد حسن مثنیٰ بن سیّد نا امام حسنؓ کے خانوادہ کے شیخ الجامعہ حضرت علامہ سیّد قطب الدین کاشانیؒ کرتے ہیں۔ جہاں سیر العارفین کے مطابق حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ بھی نماز فجر میں مقتدیوں میں شامل ہوتے۔ فوائد الفوئد میں لکھا ہے کہ:

''حضرت قاضی قطب الدین کاشانیؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپ درویشوں پر اعتقاد نہیں رکھتے؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے جن درویشوں کو دیکھا ہے ان جیسے مجھے نہیں ملے۔''

اُچ شریف میں بھی قباچہ نے بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا جہاں منہاج سراج 622 ہجری میں صدر الہام مقرر ہوئے۔

دوسری طرف پرہلاد مندر کے قریب علم و عرفان کے فروغ کے لیے برصغیر میں سلسلہ سہروردیہ کے موسس اعلیٰ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ مدرسہ و خانقاہ سہروردیہ بھی تعمیر کرتے ہیں۔ مزید براں خود حضرت شیخ الاسلام زکریاؒ المتوفی 661 ہجری کا سہ منزلہ مقبرہ جس میں پہلی منزل چوکور مربع، دوسری منزل ہشت پہلو ڈھل اور بالائی منزل نصف کرہ گول سفید گنبد، ملتانی طرزِ تعمیر کا نمائندہ صوفیانہ رنگ پیش کرتا ہے۔ موجودہ مقبرہ پر اصل ڈیزائن اور فنی تفصیلات کا بہت تھوڑا حصہ محفوظ ہے، یہاں پُر ربط جیومیٹریکل ڈیزائن ہے جو کہ ابھری ہوئی اینٹوں اور اندر دبی ہوئی روغنی ٹائلز کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔ مرکزی ہال کا دروازہ ملتانی چوب کاری کا شاہکار ہے۔ اسی احاطہ میں ملتان کے آخری مسلم حکمران نواب مظفر خان بھی مدفون ہیں۔ سلسلتہ الذہب میں لکھا ہے کہ:

''حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی قدس سرہ ہندوستان میں رئیس الاولیاء تھے۔ علومِ ظاہری کے عالم اور مکاشفات و مشاہدات کے مقامات واحوال میں کامل تھے۔''

مقبرہ حضرت بہاؤ الحق کے کچھ فاصلہ پہ مشرق کی عظمت کی علامت ہشت پہلو حضرت شاہ رکن عالمؒ المتوفی 735 ہجری کا مقبرہ بھی ہے جنہیں نوری حضوری بھی کہتے ہیں۔ مقبرہ کی گولائی 58 فٹ اور اونچائی سطح زمین سے 152 فٹ ہے۔ کامل قوس میں قبہ کمال ہنرمندی سے ترچھی دیواروں پر سہ منزلہ کھڑا کیا گیا ہے۔ جس کو خوش نما کاشی ٹائلوں سے مزین کر کے اس کا حسن دوبالا کیا گیا ہے۔ موجودہ مقبرہ کی مرمت و تزئینِ نو چند برس پہلے کی گئی ہے۔ یہاں بہت سے نقوش جیومیٹریکل ہیں جو کہ روغنی ٹائلز کو ترتیب دے کر تخلیق کیے گئے ہیں۔ مقبرہ کو گلکاری و خطاطی سے مزید سجا دیا ہے۔ مقبرے کے احاطے میں شمالی جانب نوتعمیر شدہ مسجد ہے جسے اولاً اورنگزیب نے تعمیر کرایا تھا جو سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی میں بارود سے منہدم ہوگئی۔ حضرت شاہ رکن عالمؒ کے والد حضرت مخدوم صدر الدین عارفؒ تو اپنے والد ماجد حضرت شیخ الاسلام زکریاؒ کے پہلو میں مدفون ہیں جبکہ آپ والدہ ماجدہ ملتان سٹی ریلوے

اسٹیشن سے جنوبی طرف اُن سے منسوب قبرستان بی بی پاک دامن میں ایک خوبصورت کاشی کے مقبرہ میں مدفون ہیں جہاں خواتین زائرین کا رش رہتا ہے۔ قریب ہی اسی سلسلے کا ایک اور خوبصورت مقبرہ حضرت خواجہ اولیس کھگہ کا ہے۔ تاریخِ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ:

''حضرت شاہ رکن الدینؒ نے طریقت اور مشیخیت کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا تھا اور مریدوں کی تربیت کا حق ادا کر دیا تھا۔''

ملتان فنِ تعمیر کی صوفیانہ جہت سے پورا برصغیر متاثر ہوا جس کی وجہ سے ملتانی معماروں کے دہلی اور دیگر علاقوں میں محلے آباد ہوئے اور ملتانی صوفیانہ طرزِ تعمیر جنوبی ایشیا میں فروغ پذیر ہوا۔

اُچ شریف میں تو سادات نے اس سلسلے کو خوب فروغ دیا ہے۔ اُچ بخاری میں حضرت سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ سہروردیہ مسند ارشاد اور خانقاہ کے بانی مبانی ہیں جبکہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاریؒ روحِ رواں ہیں۔ ان کا مقبرہ اور اس سے ملحقہ مسجد نیز حضرت بہاول کلیمؒ اور حضرت بی بی جندوڈی کے مقابر کی باقیات بھی ملتانی فنِ تعمیر کے شاہکار ہیں۔

قلعہ کہنہ ملتان کے مشرقی جانب ایک اور ملتانی صوفیانہ طرزِ تعمیر کا نمائندہ دو سہ منزلہ سبز مونگیہ گنبد کا حضرت سیّد السادات اسماعیل بن امام جعفر صادق کے خانوادہ کے چشم و چراغ حضرت سیّد شاہ شمس سبزواری المعروف تبریزیؒ المتوفی 675 ہجری کا مقبرہ ہے۔ موجودہ مقبرہ اصل پر دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے جسے کاشی کاری اور نقاشی سے سجایا گیا ہے۔ بنیادی نقوش کی اصل مثال محرابوں میں نظر آتی ہے۔ یہاں روغنی ٹائلز کے عام رنگوں کے علاوہ سرخ اور سفید رنگوں کو نمایاں کر کے خوبصورت نظارہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہاں عزاداری کے لیے کربلا و مجلس خانہ بھی ہے۔ مقبرہ شاہ شمسؒ کے قریب ہلاکو خان کا پوتا اور سلطان احمد نکودر کا بیٹا شہزادہ محمد مدفون ہیں، یہاں کا قبرستان حاجی بغدادی کے نام سے مشہور ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی اُچ شریف میں حضرت سیّد حسن کبیر الدینؒ المعروف کفر شکن کا مقبرہ ہے جبکہ آخری کڑی سورج میانی ملتان میں حضرت سیّد علی اکبر شمسیؒ کا ملتانی طرزِ تعمیر کا مقبرہ ہے۔ تذکرۃ الملتان میں لکھا ہے کہ:

''حضرت شاہ شمسؒ ملتان کے اولیاء کبار میں سے ہیں۔ آپ بڑے عابد، زاہد اور عارف کامل تھے۔''

تغلق دور میں ابن بطوطہ کے مطابق سلطان غیاث الدین تغلق نے جامع مسجد پر کتبہ لکھوایا کہ:

''اس نے 29 بار تاتاریوں کو شکست دی اور غازی الملک کا لقب پایا۔''

پھر لنگاہ دور آتا ہے حسین لنگاہ بھی ملتان میں یونیورسٹی قائم کرتا ہے اور ملتان کی تعمیر و ترقیات کی طرف بھی توجہ دیتا ہے۔ اسی دور میں برصغیر میں باہر سے آنے والے پہلے صاحب نسبت صوفی حضرت سیّد صفی الدین گازرونی

کے اُچ شریف کو گیلانی سادات نے پھر سے مرکزِ رُشد و ہدایت بنا دیا اور یہاں پر ملتانی صوفیانہ طرزِ تعمیر کی مساجد، مدارس اور خانقاہیں بنتی ہیں۔ برصغیر میں سلسلہ قادریہ کے مورثِ اعلیٰ حضرت مخدوم سیّد محمد غوث بندگی گیلانیؒ یہاں کی مسندِ ارشادِ قادریہ اور خانقاہ محبوب سجانی کے بانی مبانی ہیں جبکہ حضرت مخدوم سیّد عبدالقادر ثانیؒ اس کے روحِ رواں ہیں۔ یہاں کی مسجد اور خانقاہ بھی ملتانی صوفیانہ فنِ تعمیر کی نمائندہ عمارات ہیں۔ حضرت مخدوم ثانیؒ کے فرزند حضرت مخدوم سیّد عبدالرزاق گیلانیؒ اور اُن کے صاحبزادے حضرت سیّد مخدوم حامد گنج بخش و جہاں بخشؒ جو کہ شیخ زمانہ و وحید عصر تھے بھی یہیں مدفون ہیں جبکہ ان کے جانشین اور اس سلسلے کے شیخ الکل حضرت سیّد موسیٰ پاک شہیدؒ گیلانی کا حجرہ یہاں کی قدیم ترین عمارت ہے جو ملتانی فنِ تعمیر کی نمائندہ اور قومی اثاثہ ہے۔ اور یہاں پر محکمہ آثارِ قدیمہ کا بورڈ نصب ہے۔ یہ عمارت اولاً حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کی اُچ شریف گیلانیہ میں مدفن گاہ تھی بعدۂ یہ عمارت مدرسہ بنی۔ اب یہاں شکستگی عروج پر پہنچ گئی ہے اور یہ عمارت کسی وقت بھی منہدم ہو سکتی ہے۔ اسی سلسلہ قادریہ کے دیگر مقابر میں ست گھرہ میں حضرت سیّد محمد غوث بالا پیر گیلانیؒ کا اور قریب ہی ان کے ارادتمند میر چاکر اعظم رند بلوچ کا شکستہ قلعہ و مقبرہ، شیر گڑھ میں حضرت سیّد داد بندگی کرمانیؒ، شیر شاہ ملتان میں حضرت سیّد شیر شاہ مشہدیؒ کے مقابر ملتانی طرزِ تعمیر کے نمائندہ مقابر ہیں۔ نیز اسی طرح مخدوم رشید ملتان میں حضرت مخدوم عبدالرشید حقانیؒ کی قادریہ خانقاہ میں بھی ملتانی طرزِ تعمیر نمایاں ہے۔ اسی طرح گڑھ مہاراجہ جھنگ میں حضرت باہو سلطان قادریؒ، خیر پور سندھ میں حضرت سچل سرمت قادریؒ اور ڈیرہ غازی خان میں حضرت سخی سرورؒ اور غازی کے خوبصورت ملتانی صوفیانہ طرزِ تعمیر کے مقابر ہیں۔ خزینۃ الاصفیاء میں لکھا ہے کہ:

> ''حضرت سیّد محمد غوث گیلانیؒ حلبی اوچی کے وجودِ مسعود سے سلسلہ قادریہ ہندوستان میں پھیلا۔''

مغلوں کا دور آیا تو ملتان کے آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر میں ایک واضح تبدیلی قلبِ شہر میں واقع دربار عالیہ قادریہ حضرت پیر پیراں کے کمپلیکس میں نمایاں ہوتی ہے کہ یہاں سہ منزلہ جامع مسجد کو مرکزی حیثیت دی گئی جبکہ اس کے پہلو میں دو منزلہ سلسلہ عالیہ قادریہ کے شیخ الکل سید موسیٰ پاک شہید گیلانیؒ قدس سرہ العزیز المتوفی 1010 ہجری کا روضہ ہے جس کی اونچائی مسجد سے کم ہے۔ یہ اندازِ تعمیر ملتان میں شاید نہ ہونے برابر ہے۔ یہ ملتان کی غالباً واحد مسجد ہے جو تمام تر حوادثات سے محفوظ رہی اور اپنے اصل آثارِ قدیمہ پر قائم اللہ اکبر کی اذان اور اسے کھڑی ہونے والی نماز سے بارونق سوا چار سو سال سے چلی آ رہی ہے۔ اگر یہاں خستہ روضہ کا کاشی و چاندی کے دروازے قدیم ملتانی فن کے شاہکار ہیں تو یہاں کی خستہ جامع مسجد کا دروازہ جدید طرزِ تعمیر کا نمائندہ ہے۔ موجودہ مقبرہ کی کاشی و نقاشی سے مزین محرابی دروازے کی تمام کی تمام سطح روغنی ٹائلز سے ڈھکی ہوئی ہے جو کہ مل کر جیومیٹریکل ڈیزائن، دادورہ، مسدس، مستطیل اور مربع نقوش بناتے ہیں۔ پھولوں اور خطاطی سے یہاں دلکش نظارہ تخلیق کیا گیا ہے۔ مقبرہ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے مغربی جانب آپ کے صاحبزادے و صوبہ دار ملتان نواب سیّد یحییٰ گیلانی المعروف نواب سخی کا بغیر گنبد

کے چھوٹی اینٹوں کا مقبرہ ہے جسے نفیس اور خوبصورت کاشی ٹائلز سے مزید کیا گیا ہے، یہاں تحریکِ آزادی پاکستان کے ملتان کے بے تاج بادشاہ سیّد زین العابدین گیلانیؒ بھی مدفون ہیں۔ قریب ہی حضرت سیّد حامد گیلانی کا مقبرہ بھی ہے۔ جبکہ اس سے کچھ آگے حرم دروازہ پر حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے ایک اور صاحبزادے حضرت سیّد عیسیٰ گیلانیؒ کا اُن کے بیٹوں سے منسوب دربار پیر عنایتؒ ولایت کا سبز گنبد کہ سہ منزلہ مقبرہ ہے۔ مقبرہ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ میں اُن کے ایک اور پوتے ملتان کے شاہجہانی دور کے گورنر حضرت نواب سیّد موسیٰ پاک دین گیلانی بھی بہشتی دروازے کے سامنے مدفون ہیں۔ جبکہ اُن کے والد اور حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے جانشین فرزند حضرت مخدوم سیّد حامد گنج بخشؒ اپنے والد کے مشرقی پہلو میں مدفون ہیں۔ اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ:

''حضرت شیخ موسیٰ گیلانیؒ خلقت اور خلق میں حضرت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث تھے اور اپنے زمانہ میں صاحبِ سجادہ راستین سلسلہ عالیہ قادریہ کے ہیں۔''

ادیتہ مندر کے خاتمے کے بعد بھی ملتان ہندو یاتریوں کا مرکز بنا رہا جیسا کہ مغلیہ عہد میں 1666ء میں ایم ڈی تھیونیو نے ملتان آ کر دیکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''ہندو بنیوں اور کھتریوں کا مشہور مندر ملتان میں ہے ہندو دیگر شہروں کی نسبت ملتان یاترا کے لیے زیادہ آتے ہیں۔''

شاہجہاں نے جب شہزادہ مراد کو ملتان کا صوبہ دیا تو اس نے قلعہ اور شہر کی فصیلوں کی تعمیر و مرمت کرائی لوہاری دروازہ کے باہر جو پل شہر کو قلعہ سے ملاتا تھا کو پختہ کرایا ساتھ ہی حمام و مسجد بنوائی نیز عام خاص باغ بنوایا اور اس کی مشرقی جانب محلات، آبشاریں، آرام گاہیں، بارہ دری اور عظیم الشان مسجد بھی بنوائی۔

افغانوں کے عہد میں بھی مساجد، مقابر اور باغات بنوائے گئے۔ ملتان شہر میں اصلاح احوال کے لیے چشتیہ سلسلہ متحرک ہوا۔ قدیم شہر ملتان سے مشرقی سمت چشتیہ سلسلہ کے ملتان میں شیخ المشائخ حضرت حافظ جمال اللہ ملتانی المتوفی 1226 ہجری کا سفید گنبد ملتانی طرزِ تعمیر کا ایک اور نمائندہ مقبرہ ہے۔ مقبرہ پچی کاری کا خوبصورت نمونہ ہے۔ بنیادی نقوش اور ڈیزائن پھولوں سے متاثر ہیں۔ نمایاں رنگ سفید، سنہری، سرخ اور نیلا ہے جبکہ دیواروں خطاطی کے نمونوں نے ایک دلکش منظر پیدا کیا ہوا ہے۔ مقبرہ سے ملحق سماع کے لیے خوبصورت ہال ہے۔ مناقب فخر میں لکھا ہے:

''حضرت حافظ محمد جمالؒ ملتانی علیٰ ہذا القیاس کمال باطن و تہذیب اخلاق و بکمالاتِ آراستہ بود۔''

ملتانی صوفیانہ فن تعمیر کے چشتیہ مقابر میں قدامت پاکپتن میں اس سلسلہ کے برصغیر میں موسس ثانی حضرت بابا فریدؒ المتوفی 664 ہجری کے دربار کو ہے۔ اس کے احاطہ میں ان کی اولاد سے حضرت موج دریاؒ کا مقبرہ ملتانی

تعمیر کا شاہکار ہے۔ قریب ہی مسجد اولیاء ہے۔ یہاں کا بہشتی دروازہ بھی بہت مشہور ہے۔ آبِ کوثر میں لکھا ہے:

''حضرت شیخ کبیر بابا فرید گنج شکرؒ نے چشتیہ سلسلے کو بڑے وسعت اور رونق دی۔ خطہ ہندوستان میں انہیں اس سلسلے کا موسس ثانی سمجھنا چاہیے۔''

اسی طرح چشتیاں میں حضرت قبلہ نور عالم مہارویؒ، تونسہ شریف میں حضرت خواجہ سلیمانؒ، خیر پور میں حضرت خواجہ خدا بخشؒ، کوٹ مٹھن میں حضرت خواجہ فریدؒ اور ملتان میں حضرت منشی غلام حسن شہیدؒ اور حضرت خواجہ عبید اللہ ملتانی کے مقابر بھی ملتانی فنِ تعمیر کے شاہکار ہیں۔

سیرانی اویسی بزرگان کے مقابر بھی ملتانی فنِ تعمیر کے نمائندہ مقابر ہیں۔ سمہ سٹہ خانقاہ شریف میں حضرت محکم الدینؒ سیرانی جو کہ اس سلسلہ کے نقیب ہیں کا مقبرہ اور ملتان میں حضرت مولانا محمد مراد اویسیؒ، حضرت اللہ داد خان سیرانیؒ اور حضرت علی مردان اویسیؒ کے دربار صوفیانہ طرزِ تعمیر کے مظہر ہیں۔

قصبہ ابراہیم پور متی تل ملتان میں حضرت محمود مجددیؒ کا نقشبندی اولین دربار ہے جن کے بارے میں روایت یہ بھی ہے کہ آپ حضرت مجدد الف ثانی نقشبندیؒ کے خلفاء میں سے ہیں اور ان کے نام چند مکتوبات بھی ہیں جبکہ حضرت مولانا حامد علی خانؒ رئیس جامعہ مدرسہ خیر المعاد کا قلعہ پر اور حضرت پیر ولی محمد چادر والی سرکار کا ڈیرہ اڈا کے قریب جدید ملتانی طرزِ تعمیر کے نقشبندیہ مقابر ہیں۔

اسی طرح ملتان کی عیدگاہ میں حضرت علامہ سیّد احمد سعید کاظمیؒ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا جدید ملتانی صوفیانہ طرزِ تعمیر کا صابریہ چشتیہ قادریہ مقبرہ ہے جو رئیس جامعہ مدرسہ انوار العلوم تھے جس کی سرپرستی حضرت موسیٰ پاک شہید گیلانی قادریؒ کا خانوادہ کرتا ہے۔ اسی طرح ملتان میں انجمن اسلامیہ کے کالجوں اور سکولوں کی کہکشاں بھی گیلانی خانوادہ کی سرپرستی میں پُر رونق ہے۔

ایک اور صابریہ چشتیہ دربار بیرون دہلی دروازے میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ کا ہے بھی ہے جو رئیس الجامعہ مدرسہ خیر المدارس تھے۔ یہاں کی مسجد میں بھی ملتانی فنِ تعمیر عیاں ہے۔

جبکہ ملتان کی یونیورسٹی تو حضرت بہاء الدین زکریا سہروردیؒ سے منسوب ہے جس میں ملتانی فنِ تعمیر پایا جاتا ہے۔

بہاولپور کے عباسیہ عہد میں قلعہ دراوڑ کی تزئین نو، یہاں کی جامع مسجد اور بہاولپور شہر کی جامع مسجد الصادق، نیز صادق پبلک سکول کی جامع مسجد میں بھی ملتانی فنِ تعمیر نمایاں ہے۔ جامعہ اسلامیہ بہاولپور بھی اسی عہد میں بنی، جس کے شیخ التفسیر حضرت مولانا عبداللہ درخواستی اپنے مرشد کے قبرستان قادریہ دین پور شریف خان پور میں دیگر اکابرین کے ساتھ مدفون ہیں، جن میں ریشمی رومال تحریک کے سرخیل حضرت مولانا عبید اللہ سندھی قادریؒ بھی ہیں۔ یہاں مدرسہ بھی ہے جس کی مسجد میں ملتانی فنِ تعمیر نمایاں ہے۔ اس سلسلۂ قادریہ کی ایک اور درس گاہ اور جامع

مسجد شیرانوالہ دروازہ لاہور میں ہے جس کے بانی حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ رئیس خدام الدین تھے۔ رحیم یار خان میں مسجد بھونگ تو ملتانی صوفیانہ فنِ تعمیر کا شاہکار ہے جسے بین الاقوامی تعمیراتی ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔

ملتان کے گلی کوچوں میں جگہ جگہ مساجد بنائی گئی تھیں جہاں پر تعلیم و تربیت کے لیے مسجد مکتب مدارس قائم تھے۔ تاریخ فریدی میں لکھا ہے کہ:

''ملتان شہر کو قدیم سے باب الہند کی حیثیت رہی ہے۔ مشائخ اور علماء جو بھی اس ملک میں داخل ہوئے ملتان کو سب سے پہلے ان کا پابوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اس شہر میں جگہ جگہ بڑی قبور نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک دو نہیں سینکڑوں شہداء مدفن ہیں گویا ہر قبر اپنی جگہ پر گنجِ شہیداں ہے۔ اسی طرح ہر مسجد کے پہلو میں جو قبور ملتی ہیں یہ ان علماء کی آخری آرام گاہیں ہیں جنہوں نے ان مساجد کے در و دیوار کو قال اللہ و قال الرسول سے گرمایا تھا۔ آج کوئی نہیں جانتا کہ ان گمنام قبور میں کس پایا کے مفسر، محدث، فقیہہ اور رزم آزما جوان کل من علیھا فان کی چادر تانے محوِ خواب ہیں۔''

ملتان کی مساجد و مقابر جو کہ ملتان ایریا کی شناخت ہیں اگرچہ وقتاً فوقتاً تخریب کاری کی نظر بھی ہوئے لیکن یہ صوفیانہ جمال ہے کہ ان کا تشخص برقرار ہے جیسا کہ 1818ء میں سکھ برچھا گری کا دور آتا ہے۔ جن کی غارت گری سے مسلمانوں کے متبرک مقام بھی نہ بچ سکے۔ جس کی دل خراش داستانِ غم مسجد علی محمد خان المعروف ولی محمد خان پہ کندہ ہے:

بماند در کف سنگھاں بسال سی وقار
اسیر و بند کہ می کردہ ماہ و سال فغاں

ملتان کے باغات بڑے خوبصورت تھے جیسا کہ الیگزینڈر برنس 1831ء میں لکھتا ہے کہ:

''ہم شام کو حضوری باغ میں پہنچے جو شہر سے ایک میل دور تھا۔ اس کے گرد مٹی کی دیوار تھا۔ باغ کے اندر کشادہ راستے ہیں جن کے دونوں اطراف گھنے پھل دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ ہمیں مقامی مہمان نوازی کے مطابق بڑی تواضع سے خوش آمدید کہا گیا۔''

1836ء میں جی ٹی دو گنے ملتان پہنچا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ:

''ملتان آنے کے بعد مجھے بیگھی باغ کی بارہ دری میں ٹھہرایا گیا۔ جو نواب سرفراز خان نے تیس برس پہلے بنوائی تھی۔ یہ باغ سنگترے کے

درختوں کی وجہ سے سایہ دار اور ٹھنڈا تھا۔ باغ بڑی ترتیب کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ اس میں فوارے اور تالاب تھے۔ باغ کے اندر راستے پھولوں کے قطعوں سے ذرا اونچے بنائے گئے تھے...... ملتان کے نواح میں کثیر تعداد میں باغات ہیں جو عام طور پر کسی مسلمان بزرگ کے مزار کے گرد بنائے گئے ہیں۔''

دیوان ساون مل نے تالاب سورج کنڈ، پل شوالہ، تالاب بدھلہ سنت اور دیوان باغ کی تعمیر و مرمت کرائی۔ سکھوں کے دور میں خالصہ طرزِ تعمیر نے بھی ملتانی فنِ تعمیر میں انجذاب پایا جس کی جھلک حضرت شاہ دلبرؒ کے مقبرہ میں دکھائی دیتی ہے۔

1848ء میں انگریز یلغار ہوتی ہے۔ قلعہ کے میگزین میں قیامت خیز دھماکہ ہوتا ہے۔ تذکرۃ الملتان میں لکھا ہے:

''عمارت مسجد جامع دیوار ہائے آں سائر عمارت نواب مظفر خان و سرفراز خان کہ قریب بودند دیگر مکانات ملحقہ مسجد مذکور مثل قبہ علامہ قطب کاشانی (4) قبہ حسین خان وغیرہ مکانات از اساس آں برکندیدہ ہوائے شدند کہ اثر از آثار آنہا باقی نماند۔''

اس عہد میں انگریزی طرزِ تعمیر بھی ملتانی تعمیرات میں انجذاب پاتا ہے۔ اس کی واضح مثال ملتان کا مرکزی چرچ، گھنٹہ گھر اور قلعہ پر انگریز فوجیوں کی یادگار ہیں۔

1881ء میں موجود مشہور تاریخی مقامات کی اہمیت کی ترتیب لالہ حکم چند نے یوں دی ہے:

''مکانات مشہور اس شہر میں اندر اور باہر حسب ذیل ہیں۔ خانقاہ موسیٰ پاک شہید، خانقاہ بہاول حق، خانقاہ رکن عالم، خانقاہ شاہ گردیز، مزار بی بی پاک دامن، شمس تبریز، میاں صاحب شادن شہید، حافظ جمال صاحب، روزہ نواب شاہ حسین صاحب مع مسجد مار جریاں واقع باغ لانگے خان، مندر نرشکہ جی، مندر بہلا دیوی، جوگ مایا، طوطلاں مائی، رام تر تھہ، دھرم سال بہائی کورد ھندرس، عیدگاہ، مسجد علی محمد خان، مسجد باقر آباد، مسجد پھول ہٹاں والے، قلعہ، عام خاص باغ، لولو واہن، شیش محل۔ اس شہر کے گرد و نواح میں قبرستان کی بڑی کثرت ہے۔ فقیر بھی بہت ہیں۔ گرد و گرمی تو عام مشہور ہے۔''(5)

اب جبکہ آزادی کی نعمت میسر آ چکی ہے اور تعمیر و ترقیات کے ذریعے اس شہر کی مونچھوں کو چھٹنا چاہیے لہٰذا

ملتان کی سٹی گورنمنٹ کم از کم درج بالا مقامات کی نشاندہی کر کے ان کی خصوصی مرمت وتعمیر پر توجہ دے۔ نیز ملتان کی قدیم فصیل اور دروازے یعنی حضرت شیخ الکل سیّد موسیٰ پاک شہیدؒ گیلانی سے منسوب پاک دروازہ، ان کے اہلِ خانہ سے نسبت کی وجہ سے حرم دروازہ، بڑ کے درختوں کے حوالے سے بوہڑ دروازہ۔ لاہور جانے کا راستہ یعنی لوہاری دروازہ، حضرت دولت شاہؒ سے منسوب دولت دروازہ اور اور دہلی جانے کا راستہ دہلی دروازہ نیز قلعہ کہنہ کی تعمیر نو بھی کرائی جائے تاکہ پانچ ہزار سال سے زائد ریکارڈڈ ہسٹری کے اس قدیم وعظیم شہر کو طلباء، مؤرخوں اور سیاحوں کے لیے پُرکشش بنا دیا جائے۔ واقعی ملتان کو ایک شاہجہاں کی ضرورت ہے جو بقول دوگنے اس گرد آلود اور افلاس زدہ شہر کو ترقی کے وصل کا غسل دے تاکہ شفاف اور پاک حضوری کے راستے کھل سکیں۔

مَیں ہک لفظ نی کھسکیا اچ تیئں
اوچ شہر دے مقبرے سارے
بی بی جندوڈی دا روضہ
ساہ ساہ تھی تے ڈھاندے ویندن
پتن منارا جینکوں صدیاں
نونو سلامیاں ڈیون کرداویندے

(جیویں بیت الذہب دا ادیتہ مندر
باب الاسلام دی مسجد بن قاسم
خاک دی تہیاں وچ گم تھی ون)

میکوں فکر، میڈے بالیں
مَیں توں میڈا شجرا پچھیا
تاں مَیں کیا اکھیساں..........!

(نصر اللہ خان ناصر)

اگرچہ دورِ حاضرہ کی آنکھ اس قدیم وجدید شہر ملتان کو دیکھتا ہے تو ایک فارمولا ذہن میں بنتا ہے کہ اس کے چھ دروازوں، چوالیس چوکوں، پانچ باغوں، چار پارکوں، چار بڑے ہسپتالوں، پانچ پلوں، چوبیس چونگیوں، ایک برج، ایک گھنٹہ گھر، ایک انگریزی یادگار، آٹھ بڑی مالی وتجارتی عمارتوں، ایک آرٹس کونس، دو بڑے گرجا گھر، تین اہم مندروں اور سب سے زیادہ اہم اکسٹھ تاریخی مساجد، اڑسٹھ اہم مقابر، 9 قدیم خاندانوں، ایک سو اکہتر گلیوں اور 129 مارکیٹوں اور 93 بازاروں کو یونیورسٹی، کالجوں، سکولوں اور مدرسوں کے جھرمٹ سے ملایا جائے تو ملتان کا نقشہ بن جاتا ہے۔

تعمیرات ملتان کا تشخص صوفیانہ ہے۔ جس کی جھلک آج بھی ہمیں مساجد اور مقابر میں دکھائی دیتی ہے۔

ساوی مسجد ہو یا مسجد خدکہ یا پھر مسجد بھونگ۔ خالق ولید کا مقبرہ ہو یا آدم واہن کے شاہ گردیزؒ کا یا پھر بی بی جیوندیؒ اور حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے اوچ شریف کے مقابر ہو یاں پھر بہاول پور کے حضرت صالح کا مقبرہ ہو یا سیت پور کے طاہر خان کا مقبرہ ہو یا ڈیرہ اسماعیل خیان کے چار مقابر کا اوپرا، سب میں ملتانی تعمیر کی وحدت الشہودی قوس قزح کا وحدت الوجودی صوفیانہ جمال ہے، جس میں عظمت بھی ہے اور محبت بھی، جن کے نظارہ جمال سے موتجھیں چھٹتی ہیں اور حضوری کے لیے راہیں کھلتی ہیں۔ آج بھی ملتانی معمار اپنے فنِ تعمیر کے قدیم ورثہ کے نگہبان ہیں یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ رکن عالمؒ کے مقبرہ کی مرمت وتزئین نو پر بین الاقوامی ایوارڈ دیا گیا ہے۔

قبلہ کعبہ مسجد مندر دیر گنیش سب تجھ میں ہے
صوم صلوٰۃ کے خود ہو والی کیوں پابند گماں کے ہو
(خواجہ فریدؒ)

(Qibla (proper direction), Kaabah (House of God), Mosque, Temple, Monastery, Synagogue all are in you. You are the custodian of Fasting, Prayer, then why you are the captiv of delusi).

......☆......☆......☆......☆......☆......

حوالہ جات:

1۔ ملتان دورانِ محاصرہ اور مابعد
2۔ تاریخ ملتان فریدی II
3۔ مختلف سفرنامے
4۔ سیر العارفین کے مطابق حضرت کا شانیؒ دہلی میں مدفون ہیں؟
5۔ تواریخ ملتان

(ملتانیات-سیّد سبطین گیلانی)



عمر کمال خان

تحریک آزادی کے ابتدائی ایام اور ملتان کے وکلاء

سال 1919ء تا سال 1939ء

جنگ عظیم 1914ء کو یورپ میں شروع ہوئی اور جرمنوں نے جنگ کے شروع ہوتے ہی برطانیہ کا ٹینٹوا دب لیا اور انگریزوں نے اس جنگ میں اپنی کامیابی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی جرمنوں کی بے پناہ صنعتی بالادستی کے مقابلے کے لیے انگریزوں نے پوری دنیا کی حمایت کرنے کی ٹھانی جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہوا ہے اس سلسلہ میں اپنی سلطنت کے سب سے بڑے ملک یعنی ہندوستان کے لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں کو کہا کہ اگر وہ جرمنی جیسے استعمار کیخلاف جنگ میں برطانیہ کی بھرپور مدد کریں اور جرمنوں کو شکست فاش دینے میں ممد و معاون ثابت ہوں تو برطانیہ برصغیر کے لوگوں کو فتح کے بعد حق خود اختیاری دے کر آزادی کامل سے ہمکنار کردے گا یہ ایک دل پذیر وعدہ تھا جس پر ہندوستان کے جملہ ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اور وکلاء نے بھی ماسوائے علمائے دیوبند اور چند دوسری پارٹیوں نے جنگ میں امداد کے سلسلے میں انگریزوں سے بھرپور تعاون کیا اور اہل ہندوستان نے کروڑوں پونڈ قرضہ دیا، چندہ دیا۔ مال سے امداد کی اور برطانوی فوج میں تقریباً پچاس لاکھ جوانوں کی بھرتی دی جس میں سے صرف تیس لاکھ جوان پاکستان کے موجودہ حدود میں رہنے والے مسلمان نوجوان تھے اور جنگ کے خاتمے پر ان میں سے بے حد کم واپس آئے اور آخرکار جرمنی کو شکست فاش ہوئی جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے اور قیصر ولیم بادشاہ جرمنی تخت سے دستبردار ہو گیا۔ پوری دنیا نے خوشیاں منائیں جن میں ہندوستان کے لوگوں کی خوشیاں بھی شامل تھیں۔ جو چار سال سے آزادی کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے لیکن انگریزوں نے کامل آزادی دینے کے بارے میں ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ جو وعدہ کئے تھے وہ پورے نہ کئے اور جنگ کے بعد اس مسئلہ پر ٹال مٹول شروع کر دی جس پر پورے برصغیر کے خرمن امن میں آگ لگ گئی اور لوگ برطانیہ کے خلاف غم و غصہ سے بھر گئے اس پر ترکی میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ اور ترکی پر غیر ملکیوں کے تسلط نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

1919ء میں مانٹیگو چیلمفورڈ اصلاحات ہوئیں جس میں ہندوستان کو کامل آزادی نہ دی گئی صرف قانون ساز اسمبلیاں بنائی گئیں اور ان کے ممبران بذریعہ انتخابات چنے جاتے تھے آزادی پسند لوگوں نے ان اصلاحات

وعدہ خلافی گردانا اور پسند نہ کیا انگریزوں کی کامل آزادی کے وعدہ سے انحراف نے ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو تحریک آزادی کے سلسلہ میں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا اور مسلم لیگ اور کانگریس نے متحد ہو کر ہندوستان میں خود مختار حکومت قائم کرنے کے لیے پر زور جدوجہد کرنا طے کیا اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک سرگرمی سے جاری ہو گئی۔

اس زمانے میں برطانیہ کے رویہ کے خلاف اور ترکی کی حمایت میں تمام عالم اسلام میں رنج وغصہ کی لہر دوڑ چکی تھی اور ہندوستان میں خلافت کانفرنس کے زیر اہتمام ہر شہر میں جلسے جلوس منعقد ہوئے اور یہ طے کیا گیا کہ

1۔ انگریزوں کے ترکی کیخلاف جبر وتشدد پر مقاطعہ کیا جائے۔

2۔ برطانیہ اور اس کے اتحادیوں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ ترکی کو جابرانہ تسلط سے آزاد کریں۔

3۔ برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔

اس تحریک میں قوم پرست ہندو مسلمان سب برابر کے شریک تھے ہندو ان دنوں مسلمانوں کے ساتھ میثاق لکھنؤ کے تحت متحد ہو چکے تھے پورے ملک میں ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ خلافت کمیٹیاں قائم کی گئیں چنانچہ اس تحریک کو دبانے کے لیے انگریزوں نے رولٹ ایکٹ کا بل منظور کیا جس کی زد تمام آزادی کے متوالے لوگوں پر پڑی۔

مہاتما گاندھی نے بھی جنوبی افریقہ سے آ کر اس تحریک آزادی میں شرکت کی اور انہوں نے ترک موالات اور سیتہ گرہ کی تحریک شروع کر دی انگریزوں نے رولٹ ایکٹ کے تحت ہندو اور مسلمانوں کے بڑے لیڈروں کو اور اضلاع میں جو لوگ انگریزوں کے خلاف بے حد متحرک تھے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا اور پر امن تحریک پر بے پناہ تشدد کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پر امن سیتہ گرہ اور ترک موالات کی تحریک شورش اور ہنگاموں میں بدل گئی۔

ملتان میں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ممبر وکلاء نے بھرپور حصہ لیا تحریک خلافت کے لیڈر مخدوم صدر الدین شاہ گیلانی تھے۔ شیخ محمد صدیق بابر بیرسٹر ایٹ لاء نائب صدر تھے بیرسٹر شیخ عبدالرزاق سیکرٹری تھے تحریک خلافت کے صوبہ پنجاب کے بڑے لیڈران مولانا ظفر علی خان، مولانا اسماعیل غزنوی اور مولانا داؤد غزنوی کا نام مشہور تھا بیرسٹر شیخ عبدالرزاق نے سال 1920ء میں پنجاب کی تحریک خلافت کے بڑے لیڈروں کو ملتان بلایا اور ملتان میں اسلامیہ ہائی سکول کے میدان میں خلافتی لیڈروں کے جلسے کا اہتمام کیا اس وقت اسلامیہ ہائی سکول ملتان کے ہیڈ ماسٹر آغا عزیز مرزا تھے انہوں نے اسی جلسہ کی کامیابی کے لیے بہت تعاون کیا بعد ازاں آغا عزیز مرزا قانون کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد پیشہ وکالت سے منسلک ہو گئے اور ایک طویل عرصہ وکالت کرنے کے بعد سال 1969ء میں وفات پا گئے ظاہراً تو ہندو اور مسلمان انگریزوں کے خلاف متحد تھے اور خلافت اور کانگریس کی مشترکہ کمیٹیاں ہر جگہ پر بنی ہوئی تھیں لیکن کانگریس کے مقامی لیڈران تحریک خلافت

سے کھچے کھچے رہتے تھے اور شوق سے جلسوں میں شریک نہ ہوتے تھے ان دنوں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ملتان میں صدر لالہ کیول کرشن ایڈووکیٹ تھے جبکہ لالہ بودھ راج وکیل سیکرٹری تھے ملک ملک ہاڑی لال ایڈووکیٹ ملتان کی کانگریس کے معتبر بارسوخ ممبر تھے۔ مسلم لیگ ان دنوں زیادہ مقبول اور بااثر جماعت نہ تھی اور عوام میں اس کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے مسلم لیگ کے کرتا دھرتا مخدوم راجن بخش صاحب تھے جبکہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بیرسٹر محمد صدیق بابر تھے۔

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعاون اور اتحاد انگریزوں کو بالکل نہ بھایا تھا۔ یہ اتحاد ان کے استعماری عزائم کے راستے میں سنگ گراں تھا۔ چنانچہ انہوں نے پورے ہندوستان میں ہندو مہا سبھا کی سرپرستی کر کے انہیں مسلمانوں کی مخالفت کے لیے اکسایا۔ جس نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریک زور شور سے شروع کر دی اور ہندی زبان کو سرکاری زبان بنانے کے لیے اردو اور ہندی کا جھگڑا شروع کر دیا۔ انگریز ہندو مسلمان کے اتحاد سے بے حد برافروختہ تھے۔ وہ اپنی پرانی چال پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر گامزن ہو گئے اور انہوں نے ہر طرف ہندو اور مسلمانوں میں فسادات کے بیج بوئے۔ ملتان میں بھی مہا سبھائیوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت کے شعلے ہر طرف بھڑکا دیئے۔

1921ء میں تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ ملتان میں ہر دوسرے روز جلوس نکلتے تھے۔ جو سارے شہر میں گشت لگانے کے بعد اسلامیہ ہائی سکول دولت گیٹ کے میدان میں اختتام پذیر ہوتے تھے۔ جہاں ایک بڑا جلسہ منعقد کیا جاتا تھا۔ جس میں انگریزوں کی ملازمت حرام، انگریزی تعلیم حرام اور انگریزوں کو عالم اسلام کا دشمن قرار دینے کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ کافی پڑھے لکھے لوگ ہجرت کر کے افغانستان جانے لگے۔ 1921ء میں تحریک خلافت جب زوروں پر تھی۔ بیرسٹر شیخ عبدالرزاق گرفتار ہو کر قید کر دیئے گئے اور کانگریس جب تحریک خلافت میں شامل ہو گئی تو لالہ کیول کرشن ایڈووکیٹ، لالہ پرشوتم داس ایڈووکیٹ اور لالہ بودھ راج ایڈووکیٹ جو تحریک ترک موالات اور سیتہ گرہ میں پیش پیش تھے اور تحریک خلافت کے ساتھ بھی تعاون کیا کرتے تھے۔ گرفتار کر لیے گئے۔ انہی دنوں بیرسٹر محمد صدیق بابر بھی گرفتار ہوئے لیکن ان کو جلد رہائی مل گئی۔

انگریزوں کو ہندو مسلم دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ چنانچہ ہندو اور مسلمانوں کو آپس میں بڑھتے ہوئے تعلقات کے خاتمہ کے لیے انگریزوں نے جو ڈرامہ تیار کیا اس کی ابتداء ملتان میں سے ہوئی۔ جو ہندو مسلم اتحاد پر کاری ضرب ثابت ہوا۔ محرم، (ستمبر 1922ء) میں اندرون شہر ملتان سے ایک تعزیہ (کپڑیاں والا تعزیہ) جسے درکھانوں والا تعزیہ بھی کہتے تھے۔ کالے منڈی سے ہوتا ہوا صرافہ بازار کی طرف مڑا۔ تعزیہ تھوڑی دور ہی گیا تھا۔ صرافہ بازار کی طرف سے مڑنے کے بعد اس پر ایک مکان سے اینٹ آ گرگی۔ جس نے تعزیہ کا گنبد اور کلس ٹوٹ کر گر پڑا۔ تعزیہ دار مسلمانوں نے سمجھا کہ اینٹ ہندوؤں نے اپنے نزدیکی مکانوں سے تعزیہ پر پھینک کر اسے نقصان پہنچایا ہے۔ مسلمان مشتعل ہو کر ہندوؤں کی دکانوں اور مکانات کو آگ لگانے لگے۔ کپڑیانوالہ تعزیہ کے پیچھے ان

کے باقی تعزیے تھے۔ عاشورہ کے جلوسوں میں شیعہ سنی سب شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے غم وغصہ میں تمام تعزیہ جس جگہ تھے وہیں رکھ دیئے اور تمام مسلمان ہندوؤں سے ٹکرا گئے۔ کافی مکانات اور دکانیں جلا دی گئیں۔ کافی کشت وخون ہوا۔ ہندوؤں کو کچھ بھنک تھی۔ اس لیے وہ تیار تھے۔ انہوں نے اپنے محلوں میں جو بھی مسلمان ان کے ہتھے لگا قتل کر دیا۔ دیہاتی مسلمان جو تعزیہ دیکھنے آئے ہوئے تھے وہ واپسی پر ہندوؤں کے محلوں سے گزرنے پر قتل کر دیئے گئے۔ اس طرح سے مسلمانوں کا جانی نقصان زیادہ ہوا۔ ہندوؤں کے مکانات اور دکانوں کو کافی تعداد میں جلا دیا گیا اور لوٹ کھسوٹ بھی ہوئی۔ پولیس کی ناکامی پر فوج کو بلا لیا گیا۔ اس سانحہ کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد جو کافی عرصہ سے قائم تھا اس فساد کی نذر ہو گیا اور ملتان میں ہندو مسلم کشیدگی قیام پاکستان تک قائم رہی۔ نیز ہندوستان میں عموماً اور جنوبی پنجاب میں ملتان سمیت تحریک خلافت بے حد کمزور ہوتی چلی گئی اور ہندو مسلم اتحاد کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے بہت کوششیں ہوئیں لیکن ناکام رہیں۔ ایسے اچھے تعلقات جو دو قوموں میں اس فساد سے پہلے تھے ویسے تعلقات پھر کبھی قائم نہ ہو سکے۔

(ملتان بار ایسوسی ایشن کے سو سال - عمر کمال خان ایڈووکیٹ)



عمر کمال خان ایڈووکیٹ

ہندو مسلم فساد کی تحقیق کے سلسلہ میں قومی کمیٹی کی آمد اور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ملتان کے اراکین کی خدمات

ملتان کے ستمبر 1922ء کے ہندو مسلم فساد نے پورے ہندوستان کی فضا مسموم کر دی اور دونوں مذاہب کے مابین خلیج روز بروز بڑھنے لگی۔ جب یہ مسئلہ ہندوستان گیر ہو گیا تو ہندوستان کے بڑے لیڈروں کو فکر لاحق ہوئی۔ اس تنافر اور کھچاؤ کو کم کرنے کے لیے منبع فساد یعنی ملتان شہر میں ہونے والے ہندو مسلم فساد کے بارے میں ایک آل انڈیا کمیٹی قائم کر کے ملتان کے ہندو مسلم فسادات کی وجوہات کے بارے میں تحقیقات کرائی جائے۔

سب سے پہلے مہاتما گاندھی ملتان میں تشریف لائے۔ انہوں نے ملتان شہر کا دورہ کیا اور شام چار بجے لانگے خان باغ میں ان کے اعزاز میں جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت ملتان کے نامور وکیل اور کانگریس ضلع ملتان کے صدر لالہ کیول کرشن ایڈووکیٹ نے کی۔ گاندھی جی نے گھنٹہ سوا گھنٹہ تقریر کی اور لوگوں پر زور دیا کہ ہندو مسلم اتحاد سے ہی ہندوستان کو جلد آزادی ملے گی۔ اگر ان دو قوموں کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا تو ہندوستان کو آزادی جلد نہ مل سکے گی اور برطانوی استعمار اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ مہاتما گاندھی رات کو گاڑی کے ذریعے ملتان سے چلے گئے۔ اس کے بعد قومی کمیٹی برائے تحقیق ہندو مسلم فسادات کے اراکین پنڈت موتی لال نہرو، مس سروجنی نائیڈو مولانا ابوالکلام آزاد۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ حکیم اجمل۔ تصدق احمد خان شیروانی اور ملک لال خان ملتان تشریف لائے۔ اس کمیٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ ان دنوں ترکوں نے سمرنا فتح کیا تھا۔ اس فتح کی خوشی میں باغ لانگے خان میں عصر کے بعد ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت پنڈت موتی لال نہرو نے کی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ دوسری مقرر مس سروجنی نائیڈو تھیں۔ جنہوں نے ترکوں کی جدوجہد آزادی اور مصطفیٰ کمال کی زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ اس کمیٹی نے ملتان شہر کا دورہ کیا۔ فساد زدہ علاقے کو ملاحظہ کیا۔ نقصانات کا جائزہ لیا۔ زخمیوں کی مزاج پرسی کی۔ لوگوں سے انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں کیں۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ملتان نے اپنے ممبران میں سے حسب ذیل لوگوں کو ایک کمیٹی کی صورت میں اس قومی

کے استقبال اور دیکھ بھال اور تعاون کے لیے مقرر کیا۔ لالہ کیول کرشن ایڈووکیٹ، لالہ بودھ راج ایڈووکیٹ، بیرسٹر عبدالرزاق، بیرسٹر بی ڈی بہل، شیخ نیاز علی ایڈووکیٹ، بیرسٹر شیخ محمد صدیق بابر ایڈووکیٹ، لالہ چیتن آنند ایڈووکیٹ، اس کمیٹی کے اراکین قومی کمیٹی کے ساتھ رہے اور جہاں جہاں یہ کمیٹی گئی وہاں اس کمیٹی نے ان کی آمد و رفت اور حفاظت اور مناسب تواضع کا بندوبست کیا۔ گواہان کے بیانات قومی کمیٹی نے ٹاؤن ہال میں ان وکلاء کے سامنے قلمبند کیے اور بعض محلوں میں جا کر لوگوں کے بیانات قلمبند کیے۔ جہاں اس ملتانی وکلاء کی کمیٹی کے اراکین ان کے ساتھ رہے۔ یہ قومی کمیٹی ہر جگہ قومی اتحاد کا درس دیتی رہی۔ آخر میں اس قومی کمیٹی نے پبلک لائبریری باغ لانگے خان ملتان کے ہال میں ملتان کے عمائدین سے بند ہال میں خصوصی ملاقات کی۔ اس میں حسب ذیل عمائدین شہر شیخ محمد راجو گردیزی صاحب، نواب مخدوم مرید حسین قریشی صاحب، نواب احمد یار خان خاکوانی، رائے بہادر سیٹھ پربھ دیال، سردار تیجا سنگھ، لالہ کیول کرشن ایڈووکیٹ، ڈاکٹر پرشوتم داس، لالہ بودھ راج ایڈووکیٹ، بیرسٹر عبدالرزاق، شیخ نیاز علی ایڈووکیٹ، شیخ محمد بخش ایڈووکیٹ، شیخ محمد صدیق بابر بیرسٹر، مولانا قاضی عبدالعزیز، فطرت ندوی انصاری، نواب عبدالقادر خان بادوزئی، نواب شیر محمد خان بادوزئی، حفیظ اللہ خان خدکہ سدوزئی، عبدالشکور خان خدکہ سدوزئی، مولانا غلام محمد گھوٹوی صاحب، لالہ چیتن آنند وکیل، لالہ پرمانند، منیجر پنجاب نیشنل بنک، لالہ بال کشن بترہ ایڈووکیٹ، مہتہ ٹیک چند ایڈووکیٹ اور مسٹر بی ڈی بہل بیرسٹر شامل ہوئے۔

فسادات کے بارے میں تفصیلی تبادلہ خیال کرنے کے بعد اس قومی کمیٹی نے ملتان میں آئندہ فسادات کے سدباب کے لیے دو تین کمیٹیاں تشکیل دیں۔ جس میں ملتان بار ایسوسی ایشن کے ممبر وکلاء کو مناسب نمائندگی دی گئی تھی۔ تفصیلی تبادلہ خیالات کرنے کے بعد اس قومی کمیٹی نے ملتان کے لوگوں پر واضح کر دیا کہ دونوں مذاہب کے اتحاد ہی سے انگریزوں کو ملک سے نکالا جا سکتا ہے اور اگر دونوں مذاہب کے لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے تو تحریک آزادی جلد کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے گی۔

ملتان میں پہلی پنجاب سرحد کسان کانفرنس اور ملتان کے وکلاء

جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے جنگ سے پہلے ہندوستان کے لوگوں کو کامل خود اختیاری کے جو سنہرے خواب دکھائے تھے اور ہندوستان کے لوگوں کو کامل حقوق دینے کے جو وعدے کیے تھے وہ وفا نہ کیے تو ہندوستان میں انگریزوں کی وعدہ خلافی کے خلاف سخت ردعمل پیدا ہوا۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور ہندو مسلم ہندوستان کی کامل آزادی کے حصول کی جدوجہد کے لیے متحد ہو گئے اور تحریک خلافت اسی اتحاد کے جذبہ کے ساتھ بڑی زوروں سے جنگ کے بعد شروع ہوئی۔ جیسے پہلے ذکر ہوا کہ ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد پر انگریز سخت برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے اتحاد کی اس فضا کو مسموم کرنے کے لیے پورے ہندوستانی معاشرے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا پروگرام طے کیا۔ اس سلسلہ میں پہلے پہل ہندو مسلم فسادات کرائے گئے۔ پھر ہندوؤں کے باہمی اتحاد کو نقصان

پہنچانے اور کانگریس کی ہندو قیادت کی اجارہ داری کو ختم کرانے کے لیے کانگریس اور ہندومہا سبھا کے مابین سخت اختلافات پیدا کر کے ہندومہا سبھا کے اثرات کو ہندو سوسائٹی میں خوب پروان چڑھایا اور کانگریس کے رسوخ کو ہندو سوسائٹی میں سخت دھچکا پہنچایا اور کانگریس کے لیڈروں کو مجبور کر دیا کہ وہ بھی ہندومہا سبھا کی مسلم دشمنی پالیسی کو اپنا کر اپنے ہم مذہبوں میں اپنا رسوخ قائم رکھیں۔ اس طرح سے ہندوؤں کے تمام طبقوں کا رویہ ہر لحاظ سے انٹی مسلم ہو گیا اور ہندو مسلم اتحاد کی کامیابی کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ دوسری طرف انگریزوں کی شہہ پر اور کچھ روسی سوشلسٹ انقلاب کی وجہ سے اور کچھ معروضی حالات کی وجہ سے مزدور اور کسان تحریکوں کو خفیہ شہ دے کر متحرک کر دیا گیا۔ کانگریس کا ایک بغل بچہ جماعت جسے پنڈت جواہر لال نہرو کی حمایت حاصل تھی۔ نوجوان بھارت سبھا نامی تھی۔ یہ سبھا ترقی پسندی کی دعوئی دار تھی۔ اس سبھی نے ایک طرف ہندومہا سبھا کے خلاف محاذ بنا کر ہندوؤں میں گروہ پیدا کیے اور دوسری طرف سوشلزم کے نام پر مزدور کسان تحریکوں کی سرپرستی شروع کر دی۔ موجودہ پاکستان کی حدود میں چونکہ کارخانے نہ ہونے کے برابر تھے اور معاشرت پر مسلمان زمینداروں کی سخت گرفت تھی۔ اس لیے یہاں انہوں نے کسانوں کی حمایت میں تحریک شروع کر دی۔ تاکہ مسلمان زمیندار طبقہ پر دباؤ بڑھا کر یا انہیں اپنے ساتھ شمولیت پر مجبور کیا جائے۔ یا ان کو اس وقت کی انتظامیہ کی جھولی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا جائے۔ چنانچہ ملتان میں ہندو مسلمان فسادات سال 1922ء کے بعد پنجاب سرحد کسان کانفرنس باغ عام خاص ملتان میں منعقد کرائی گئی۔ اس کسان کانفرنس کا اہتمام نوجوان بھارت سبھا نے کیا۔ یہ کانفرنس دو دن جاری رہی۔ جس میں پنجاب اور سرحد سے کافی تعداد میں کسان کارکن شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے روح رواں ملتان کے دو کانگریسی وکیل دیوان ایشوردت اور پربودھ چندر وکیل نامی تھے۔ یہ کانفرنس مسلکاً سوشلزم کے بے حد قریب تھی۔ اس کانفرنس کی صدارت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی خطیب جامعہ مسجد قاسم علی خان پشاور نے کی۔ مولانا پوپلزئی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور معرکتہ الآرا خطیب اور مقرر تھے۔ وہ عبدالغفار خان کی خدائی خدمتگار تحریک کے حریف تھے اور صوبہ سرحد کے قوانین کے خلاف سرحد کے کسانوں کی زبردست تائید کرتے تھے اور سوشلزم کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تشریح کیا کرتے تھے۔

بیسویں صدی عیسوی کی دہائی میں کچہری کی حالت

منشی عبدالرحمن خان 1929ء میں ضلع کچہری ملتان میں وکلاء اور کچہری کے ماحول پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

''میرا کچہری میں جانے کا دوسرا موقع تھا۔ اس زمانے میں زیادہ تر وکلاء ہندو تھے۔ مسلمان وکلاء اقلیت میں تھے۔ ماتحت عدالتوں سے لے کر عدالت عالیہ تک ہندوؤں کا راج تھا۔ رشوت نام کا دیو ابھی اس دنیا میں نط

نہ ہوا تھا۔ سستا زمانہ تھا جو کام اس وقت کوڑیوں اور پیسوں میں نکلتا تھا آج پانچ دس روپے سے بھی نکلنا مشکل ہے۔ (ساٹھ کی دہائی کا ذکر کر رہے)۔ اس وقت کے چیمبر موجود نہ تھے۔ وکلاء 1929ء میں خانہ بدوشوں کی طرح بدنما چھپروں کے نیچے بیٹھتے تھے نہ ہی منشیوں کے لیے آج کل کی طرح کوئی تخت پوش نظر آتے تھے۔ وہ نیچے چٹائیوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ اہل مقدمات کے لیے بیٹھنے یا پانی پینے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نہ کہیں ٹاؤٹ نظر آتے تھے اور نہ وہاں آج کل کی طرح رش ہوتا تھا۔

اس زمانے میں پیشوں کی بڑی قدر و منزلت تھے۔ اور بڑے بڑے قابل اور قانون دان منشی پائے جاتے تھے۔ اہل غرض اکثر انہیں سے مشورہ کرتے تھے۔ وکالت پاس کر کے آنے والے نوجوان وکلاء بھی اکثر ان سے عملی تربیت حاصل کرتے تھے۔ منشیوں میں بھی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ فی الحقیقت اس زمانے میں جو منشیوں کا عروج اقبال دیکھا۔ اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ ان ایام میں چونکہ منشیوں کا بڑا شہرہ تھا۔ اس لیے میری نانی صاحبہ مجھے کسی اچھے وکیل کا منشی بنانا چاہتی تھیں۔ کیونکہ میں نے انگریز دشمنی کی وجہ سے سرکاری ملازمت ٹھکرا دی تھی۔ اس لیے میں نے منشی کے آزاد پیشہ میں شامل رہنے کو ترجیح دی۔

اس وقت ملتان کے چوٹی کے فوجداری وکیل شیخ محمد بخش تھے۔ جن کے گھر میری نانی کا آنا جانا تھا۔ ان کا داماد شیخ خدا بخش ایڈووکیٹ بھی وکالت کر کے آیا ہوا تھا جو بے حد تند و تیز طبع کا مالک تھا۔ شیخ محمد بخش صاحب حلیم الطبع تھے لیکن وہ میرے گھر سے دور ابدالی روڈ پر کوٹھی بنوا کر رہائش پذیر تھے۔ جبکہ شیخ خدا بخش ایڈووکیٹ چوک چھلیک کے قریب میرے گھر کے ساتھ رہائش رکھتے تھے۔ میں نے شیخ خدا بخش ایڈووکیٹ کے ہاں جانا پسند کیا۔ اور ان کی تندی و تیزی کو خاطر میں نہ لایا۔''

انجمن اسلامیہ ملتان کی ایک معروف قدیم سماجی علمی انجمن ہے جس نے مسلمانوں میں علم عام کرنے اور سماجی شعور بیدار کرنے میں گزشتہ ایک صدی سے بھی زائد عرصہ کار ہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ جو کہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ 1972ء کے پیپلز پارٹی کے دور سے پہلے اس انجمن کے زیر اہتمام درجن بھر تعلیمی ادارے پرائمری اور ہائی سکول اور کالج ملتان میں قائم تھے جو گزشتہ ستر سال سے مسلمانان ملتان کی تعلیمی ضروریات پوری کرتے آ رہے ہیں۔ بیسویں صدی کی (20) بیس کی دہائی میں ملتان کے وکلاء نے بھی گیلانی مخادیم کے زیر اقتداء مسلمانوں کے لیے انجمن کی تعلیمی سرگرمیوں میں دست تعاون بڑھایا اور غریب مسلمانوں کو زیور تعلیم سے سنوارنے کے لیے مقدور بھر کام کیا۔ اس دور کی مطبوعات میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ملتان کے جن وکلاء کے نام انجمن اسلامیہ کی تعلیمی سرگرمیوں کے تناظر میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان میں حکیم غلام مجتبیٰ قریشی ایڈووکیٹ کے نام نامی کو سب پر سبقت حاصل ہے۔ وہ اس انجمن اسلامیہ کے سالہا سال سیکرٹری رہے اور گراں قدر تعلیمی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد بیرسٹر محمد صدیق بابر اور بیرسٹر شیخ عبدالرزاق، بیرسٹر عبداللہ خان بھی انجمن کی علمی سرگرمیوں میں اس دور پیش پیش ہوتے تھے۔ یہ وکلاء مسلمان ہونہار طلباء جن کے پاس ان کے داخل کرانے، ان کی

فیس معاف کرانے یا ان کے تعلیمی اخراجات کا بندوبست کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ملتان کے ان مسلمان وکلاء کی کوششوں سے سینکڑوں مسلمان طالبان زیور علم سے آراستہ ہو کر بے حد کارآمد انسان بنے۔ اور انہوں نے زندگی میں نام پیدا کیا۔ سال 1920ء سے پاکستان بننے تک ملتان کے جن مسلمان وکلاء نے مسلمان طالب علموں کو تحصیل علمی کے سلسلہ میں امدادیں دیں وہی طلباء تحریک پاکستان کے پیش رو ثابت ہوئے اور انہوں نے قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں نظام حکومت چلایا۔

(ملتان بار ایسوسی ایشن کے سو سال - عمر کمال خان ایڈووکیٹ)



عمر کمال خان ایڈووکیٹ

ملتان کی بار ایسوسی ایشن کے سو سال اور عالی مرتبت جج ہائی کورٹ صاحبان

ملتان ڈسٹرکٹ بار ایسوی ایشن برصغیر ہندو پاکستان کی قدیم ترین وکلاء کی انجمن ہے۔ بار ایسوسی ایشن کا ادارہ برصغیر میں انگریزی حکومت کے قیام کے ساتھ معرض وجود میں آیا۔ اس کی ابتداء ہندوستان کے بڑے پریذیڈنسی ٹاؤنز (Presidency Towns) یعنی مدارس، بمبئی، کلکتہ (جسے آج کل کول کتا کہتے ہیں) سے ہوئی۔ بعد ازاں جیسے جیسے سلطنت برطانیہ کی ہندوستان میں حدود میں اضافہ ہوتا گیا ساتھ ساتھ لیگل پریکٹیشنرز ایکٹ بھی منظور ہونے لگے اور ساتھ ساتھ وکلاء کے پیشے میں بھی توسیع ہوتی گئی اور ہندوستان کے مختلف صوبوں اور اضلاع میں بار ایسوسی ایشن قائم ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ 1850ء میں ملتان بمعہ تمام جنوبی پنجاب سلطنت برطانیہ کا حصہ بن گیا۔

انگریزوں نے ابتداء میں سکھوں کے دور کے عدالتی نظام کو قائم رکھا لیکن جیسے ہی پہلا کچا بندوبست مال مکمل ہو گیا تو کچھ دنوں بعد افسران مال، تحصیلدار، ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کے عہدہ دار تعینات ہو گئے اور ان کو مال کے کام کے ساتھ عدالتی کام بھی سپرد کر دیا گیا۔ اب عوام کو تحریری درخواستیں لکھنے والے لوگوں کی ضرورت محسوس ہوئی جو انگریزی نظام سے واقف ہوں جس پر انتظامی افسران نے لوگوں کی سہولت کے لیے بعض تجربہ کار لوگوں کو عرائض نویسی کا اختیار دے دیا۔

ابتداء میں عرائض نویسیوں کا رویہ درست تھا لیکن لوگوں کی قانون سے عدم واقفیت کو دیکھتے ہوئے کچھ غلط قسم کے عرائض نویسوں نے بھولے بھالے لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیا اور لوگوں کو غلط مشورے دے کر افسران مال کے کام میں رکاوٹ کا سبب بن گئے۔ جس پر پنجاب میں سب سے پہلے ملتان کے کمشنر برانڈرتھ نے جو بعد ازاں پنجاب کے جوڈیشل کمشنر ہو گئے حکومت پنجاب کی توجہ غیر ذمہ دار عرائض نویسوں کی فتنہ انگیزی کی طرف دلائی جس کی وجہ سے عدالت کا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ''کافی نئے نئے قانون وضع ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے نظام عدل کافی پیچیدہ ہو گیا ہے اور عرائض نویسوں کے بس کی بات نہیں رہی اب لوگوں کو وکلاء کی ضرورت ہے اور ایک

مقامی بار ایسوسی ایشن عدل و انصاف کے لیے بے حد ممد و معاون ہو سکتی ہے۔'' انہوں نے حکومت پنجاب کو مشورہ دیا کہ مختلف کمشنروں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے حدود اختیار میں قانونی فہم رکھنے والے شستہ لوگوں کو مختیار مقرر کریں۔ جن کی تعداد محدود ہوتا کہ وہ لوگوں کی محدود قانونی امداد کر سکیں۔ چنانچہ مختیار کار معرض وجود میں آئے۔ جو پیروی کر سکتے تھے۔ لیکن بحث نہیں کر سکتے تھے۔ جب مقدمہ بازوں نے یہ دیکھا کہ وقت کے عدل و انصاف کے افسران عرائض نویسوں کی مداخلت پسند نہیں کرتے تو صاحب حیثیت مقدمہ بازوں نے حسب حیثیت کلکتہ، بمبئی اور پنجاب کے باہر کے بڑے شہروں جہاں وکلاء موجود تھے ان کو انہوں نے ملتان میں اپنے مقدموں کے سلسلے میں بلانا شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں کلکتہ سے ایک بنگالی وکیل مسٹر چکرورتی ملتان کی عدالتوں میں اکثر پیش ہوا کرتے تھے۔ لاہور میں بھی کچھ انگریز اور ہندو مسلمان وکیل تھے جو ملتان میں عدالتوں میں پیش ہوتے رہے تھے۔ سال 1866ء میں لاہور چیف کورٹ کا قیام عمل میں آیا تو مختلف درجات کے منصفوں کے عہدہ جات اضلاع میں قائم کئے گئے۔ اس وقت ابتداً ڈپٹی کمشنر کو ڈسٹرکٹ جج کے اختیار دیئے گئے۔ جن کی ڈگری اور حکم کی اپیل عدالتی کمشنروں یعنی ڈویژنل جج کے پاس دائر ہوتی تھیں۔ ان کے فیصلوں کی نگرانی چیف کورٹ پنجاب میں ہوتی تھی۔

پنجاب چیف کورٹ کے قیام کے ساتھ ہی وکلاء کی ضرورت بے حد بڑھ گئی تو کچھ انگریز بیرسٹروں نے برصغیر کے مختلف شہروں میں سے لاہور کا رخ کیا۔ انہی دنوں دیسی پڑھے لکھے لوگ بھی لندن سے بیرسٹر بن کر پنجاب میں پریکٹس کرنے لگ گئے۔ بعد میں مختلف اضلاع میں دیسی لوگوں کو مختار کاری کے لائسنس مل گئے اور وکلاء کے پیشے کی کچھ صورت پیدا ہوگئی۔ ملتان میں بھی کچھ مختیار کار اور کچھ وکلاء وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو کر لوگوں کو مقدمات کے سلسلہ میں قانونی امداد فراہم کرنے لگ گئے۔ لیکن تا حال با قاعدہ وکلاء کی کسی انجمن یعنی بار ایسوسی ایشن کا ملتان میں قیام عمل میں نہ آیا تھا۔

سال 1901ء اس لحاظ سے بے حد خوش آئند اور مبارک سال تھا جبکہ اس سال ملتان کے پہلے ملتانی نژاد وکیل لالہ پرمانند بگائی ایڈووکیٹ نے جو ملتان میں کافی عرصہ سے پریکٹس کر رہے تھے پہلی مرتبہ ملتان میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے قیام کا آغاز کیا۔ چنانچہ سال 1901ء میں سردیوں کے موسم میں ملتان میں پریکٹس کرنے والے وکلاء اور مختار کاروں کی ایک نشست میں جو موجودہ بار ہال کے جنوب کی طرف واقعہ ایک بڑ کے درخت کے نیچے (اس درخت کو میں نے دیکھا ہے) بھائی چارہ کی فضا میں ملتان ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا گیا اور ملتان کے قانون دان طبقہ نے متفقہ طور پر پرمانند بگائی ایڈووکیٹ کو اس کا پہلا صدر اور شیخ عبدالحق ایڈووکیٹ کو اس کا پہلا جنرل سیکرٹری چنا۔ شیخ عبدالحق ایڈووکیٹ شیخ قانونگو، خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ضلع قصور کے باشندے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے بانی اراکین میں شمار ہوتے تھے اور اپنے وقت کے نامور فوجداری وکیل تھے۔ چنانچہ گزشتہ ایک سو سال سے ملتان ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے قیام سے لے کر آج تک ملتان بار کا عدلیہ کے چھوٹے بڑے افسران کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ چلا آتا ہے۔ جس کی ایک منفرد تاریخ ہے۔

گزشتہ ایک صدی عدلیہ کے افسران اور ملتان بار ایسوسی ایشن کے باہمی تعلقات کے ایک طویل سلسلہ کو محیط کئے ہوئے ہے اور اس طویل عرصہ میں کافی افسران عدلیہ چھوٹے اور بڑے عدلیہ کے عہدوں پر ملتان میں تعینات رہے اور آخر کار جج ہائی کورٹ نامزد ہوئے۔ کچھ انتظامیہ کے نیک نام افسران انتظامیہ کو چھوڑ کر عدلیہ میں شامل ہو کر جج ہائی کورٹ بن گئے۔ وہ بھی ملتان میں تعینات رہے۔ کچھ وکلاء حضرات بھی اپنی قابلیت کی وجہ سے بطور جج ہائی کورٹ نامزد ہوئے اور انہوں نے قانون کی دنیا میں نیک نام پایا۔ ایسے حضرات میں سے کافی وکلاء کا تعلق کسی نہ کسی طرح ہماری ملتان بار ایسوسی ایشن سے بھی رہا چنانچہ گزشتہ ایک صدی میں جج ہائی کورٹ صاحبان کا جن کا تعلق ملتان ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سے رہا ان باہمی تعلقات و روابط کی کہانی مختصراً اس طرح بیان کی جاتی ہے۔

لاہور چیف کورٹ کے قیام سے پہلے پنجاب میں جوڈیشل کمشنری کا ادارہ تھا۔ جو آخری عدالت اپیل تھی اور اس کے عہدہ دار جوڈیشل کمشنر کہلاتے تھے۔ جو صرف سارے پنجاب میں دو یا تین ہی ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ 1850ء سے 1866ء تک رہا۔ پنجاب کے ابتدائی جوڈیشل کمشنروں میں ایک نام مسٹر برانڈرتھ کا آتا ہے۔ جو ملتان کے ابتدائی کمشنروں میں سے تھے۔ ملتان سے متعلق جوڈیشل آفیسر جو سب سے پہلے پنجاب چیف کورٹ کے جج نامزد تھے۔ ملتان سے متعلق جوڈیشل آفیسر جو سے پہلے پنجاب چیف کورٹ کے جج نامزد ہوئے۔ وہ مسٹر رو (Roe) تھے۔ وہ سب سے پہلے ملتان میں مہتمم بندوبست کے طور پر تعینات ہوئے اور پہلا پختہ بندوبست (First Regular Settlement) ان کی نگرانی میں ہوا اس دوران وہ ایک مسلمان دوست آفیسر کے طور پر مشہور ہوئے۔ بعد ازاں وہ ملتان کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ اس وقت ان کے عرصہ تعیناتی میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔ اور وہ پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ پر فائز رہے۔ سال 1907ء میں وہ ڈسٹرکٹ جج ملتان کے عہدہ پر تعینات تھے۔ بعد ازاں وہ چیف کورٹ لاہور کے جج کے عہدہ پر ترقی کر گئے۔ اور کچھ سالوں بعد وہ لاہور چیف کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کا نام بے حد قابل اور انصاف پسند جج کے طور پر سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں تین اصحاب ایسے گزرے ہیں جن کا ملتان اور اس کی بار سے کافی تعلق رہا اور وہ بعد ازاں لاہور ہائی کورٹ کے جج کے عہدہ پر فائز ہوئے اور نیک نام پایا۔ سال 1919ء میں مسٹر کولڈ سٹریم (Cold Stream) ملتان کے ڈسٹرکٹ جج تھے وہ بہت اچھی شہرت کے مالک جوڈیشل آفیسر تھے۔ وہ بعد ازاں پنجاب ہائی کورٹ کے جج بنا دیئے گئے۔ ان کے کچھ عرصہ بعد مسٹر کری (Curry) جو سیشن جج ملتان رہے تھے اور بہت ہی صاف ستھری پنجابی بولتے تھے اور عدالت میں سر پر لنگی پٹکہ باندھ کر عدالت کرتے تھے اور انصاف پروری کی اچھی شہرت رکھتے تھے لاہور ہائی کورٹ کے جج نامزد ہو گئے اور ملتان کے لوگوں کو ان کی سابقہ شہرت کی وجہ سے بے حد خوشی ہوئی۔ ٹی پی ایلس Ellis قانون کی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے طور پر بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں تعینات ہوئے وہ بھی بعد ازاں جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے۔

جسٹس ایس ایس دولت آئی سی ایس (I.C.S) انڈر ٹریننگ کے طور پر ملتان میں تعینات رہے تھے۔ وہ بھی بعد ازاں لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے خان بہادر ظفر علی جنگ عظیم اول سے پہلے بھی ملتان میں سینئر سول جج کے طور پر تعینات رہے تھے۔ 1911ء میں وہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے عہدہ پر بھی تعینات رہے۔ بعد ازاں وہ لاہور ہائی کورٹ کے جج ہو گئے ان کو ملتان کے پرانے لوگ بہت یاد کرتے تھے۔

پاکستان بننے سے پہلے تیس کی دہائی میں ایک نوجوان ڈی پی بھنڈاری آئی سی ایس (ICS) کا امتحان پاس کر کے ملتان میں بطور انڈر ٹریننگ تعینات ہوا۔ وہ ایک شاندار نوجوان تھا اور انگریز میموں میں بہت مقبول ہو گیا۔ جسے دوسرے انگریز افسروں نے پسند نہ کیا۔ جس پر کچھ لوگوں نے سازش کر کے ایک استغاثہ ان کے عدالت میں دائر کرایا۔ بھنڈاری صاحب کو ان کے ریٹائرنگ روم میں باتوں میں لگا کر ریڈر عدالت سے گواہان استغاثہ کے بیان قلمبند کرائے گئے۔ کہ اسی اثنا میں انگریز ڈپٹی کمشنر نے عدالت میں داخل ہو کر ریڈر کو گواہان کا بیان لکھتے اور افسر جلیس کو ریٹائرنگ روم میں خوش گپیاں کرتے ہوئے خود دیکھا اور مرکزی حکومت کو اس امر کی شکایت کی جس پر انکوائری ہوئی اور مسٹر بھنڈاری (ICS) آئی سی ایس انڈر ٹریننگ کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ مسٹر بھنڈاری ایک قوم پرست نوجوان تھا جو برملا اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ اصل وجہ اس کی برطرفی اس کی قوم پرستی تھی۔ جسے اس وقت اسٹیبلشمنٹ (Establishment) نے ناپسند کر کے اسے نوکری سے نکلوا دیا۔ استغاثہ والی کہانی تو ایک عذر لنگ تھا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ مسٹر بھنڈاری نے نوکری سے برطرفی کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا اور خوب نام کمایا۔ پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر کے لاہور سے مشرقی پنجاب چلے گئے تو وہاں وہ جج ہائی کورٹ ہو گئے اور غیر ثقہ بند روایت کے مطابق بعد ازاں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی ہو گئے تھے۔

پاکستان کے سب سے پہلے چیف جسٹس جناب شیخ عبدالرشید جو لاہور ہائی کورٹ کے جج اور چیف جسٹس بھی رہے تھے نے اپنی پریکٹس کی ابتداء ملتان سے کی اور بہ روایت بیرسٹر شیخ عبدالرزاق مرحوم وہ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ملتان کے سال 14-1913ء میں ممبر رہے تھے۔ یہاں سے وہ لاہور چلے گئے جہاں انہوں نے وکالت میں خوب نام کمایا اور جج لاہور ہائی کورٹ ہو گئے اور وہ پاکستان بننے پر پہلے چیف جسٹس آف پاکستان نامزد ہوئے۔
جسٹس ایم آر کیانی اور جسٹس ایس اے رحمان دونوں آئی سی ایس تھے۔ انہوں نے اپنا ٹریننگ کا عرصہ بطور سول جج ملتان میں گزارا۔ وہ ڈپٹی کمشنر ملتان کے کورٹ کے مشرقی بغلی کمروں میں عدالت کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی جسٹس ایم آر کیانی اپنی طبعی تنک مزاجی کی وجہ سے دوسروں سے منفرد تھے۔ بعد ازاں جسٹس ایم آر کیانی ملتان او مظفر گڑھ کے کچھ عرصے کے لیے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج بھی رہے۔ اس وقت مظفر گڑھ کا ضلع ملتان کے سیشن ڈویژن کا حصہ ہوتا تھا۔ یہ دونوں نوجوان آئی سی ایس (I.C.S) بعد ازاں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بن گئے جسٹس ایس اے رحمان تو چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان بھی رہے۔
حسب روایت بیرسٹر شیخ عبدالرزاق مرحوم جسٹس ٹیک چند بھی کچھ عرصہ ملتان میں سول جج کے طور

تعینات رہے تھے۔ وہ بھی لاہور ہائی کورٹ کے جج اور بعد ازاں چیف جسٹس تعینات رہے۔ ملک کرم ایز د مرحوم جو ملتان بار کے نامور فوجداری کے وکیل تھے اور ہماری بار کے رکن تھے۔ جہاں سے وہ بہاولپور میں بطور لیگل ایڈوائزر ملازم ہو کر چلے گئے اور جب وہ سیشن جج کے عہدہ پر فائز تھے کہ ون یونٹ بننے پر وہ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج تعینات ہو گئے اور ریٹائر ہونے کے بعد وہ کافی عرصہ لیبر ٹریبونل کے چیف اور دیگر اعلیٰ عدالتی عہدوں پر فائز رہے بعد ازاں وہ ناگہانی ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ وہ ملتان کے قابل فرزند تھے وہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کے ماموں تھے اور ملک ممتاز اختر ایڈووکیٹ کے والد بزرگوار تھے۔

پاکستان بننے کے بعد ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحبان میں سے سب سے پہلے جج لاہور ہائی کورٹ نامزد ہوئے وہ جسٹس نذیر احمد محمود تھے۔ جو پاکستان کے ابتدائی سالوں میں ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ پر فائز رہ چکے تھے۔ وہ وکیل سے عدلیہ میں شامل ہوئے اور اپنی نرم مزاجی، انصاف پروری اور شرافت کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جاتے رہے۔ ان کے بعد ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج جو جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے ان میں جناب جسٹس مشتاق حسین منیر اور جسٹس مظہر الحق کے نام نامی لوگوں کو آج تک یاد ہیں۔

سردار عبدالغفور خان لودھی بہاولپور جوڈیشل سروس سے متعلق تھے۔ ون یونٹ بننے کے بعد مغربی پاکستان پی سی ایس (P.C.S) جوڈیشن میں شامل ہو گئے۔ وہ بہاولپور کے محلّہ عام و خاص کے معروف لودھی خاندان کے فرزند تھے۔ ملتان میں بیاہے ہوئے تھے۔ کہروڑ پکا کے زمیندار تھے۔ وہ 1959ء میں ملتان میں سینئر سول جج کے طور پر تعینات رہے۔ بعد ازاں وہ پنجاب کے مختلف اضلاع میں عدالتی عہدوں پر فائز رہنے کے بعد 1967ء میں ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مقرر ہوئے۔ وہ بے حد مقبول انصاف پرور شخص تھے۔ انہوں نے اپنے عرصہ ملازمت میں بعض اہم سیاسی اور سماجی مقدمات کو سماعت کیا اور شاندار فیصلے دیئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن بانی بنگلہ دیش کے مقدمہ کی سماعت میانوالی جیل میں انہوں نے ملٹری ٹریبونل کے سویلین جوڈیشل ممبر کے طور پر کی تھی۔ وہ بعد ازاں لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے وہ بہاولپور کے بے حد قابل اور مایہ ناز فرزند تھے۔ بطور جج ہائی کورٹ ریٹائر ہونے کے بعد وہ کافی عرصہ دیگر اعلیٰ عدالتی عہدوں پر فائز رہے۔ جس دنوں سردار عبدالغفور خان لودھی سیشن جج تھے ان دنوں ملتان میں ملک اختر حسین ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج ملتان تعینات تھے۔ بعد ازاں وہ بھی جج ہائی کورٹ بنے اور ملتان بنچ لاہور ہائی کورٹ پر بھی خدمات سرانجام دیتے رہے وہ بھی خوش اطوار قانونی سمجھ کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

شیخ عبدالوحید صاحب جو پی سی ایس جوڈیشل کے کیڈر سے تھے۔ جب وہ ملتان میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مقرر ہوئے تو وہ اپنے پسندیدہ اطوار کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔ وہ ہمیشہ جونیئر وکلاء کی کھلے دل سے سرپرستی کرتے تھے وہ گیارہ بجے دن تک ماسوائے قتل کے مقدموں کے اپنا باقی کام ختم کر لیتے تھے وہ وقت کے بے حد پابند تھے۔ بعد ازاں محکمہ قانون پنجاب کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور جب وہ جج لاہور ہائی کورٹ مقرر ہوئے تو انہوں نے

کافی عرصہ ملتان بنچ پر بطور جج اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔ ہائی کورٹ میں بھی وہ نوجوان وکلاء کی خوب سرپرستی کرتے تھے۔

چوہدری محمد الیاس کم عمری میں پی سی ایس جوڈیشنل منتخب ہونے کی وجہ سے (Guinness Book) گینیز بک کے ریکارڈ ہولڈر تھے۔ وہ سال 1959ء میں خانیوال میں سول جج تعینات ہوئے تو ملتان میں بطور رینٹ کنٹرولر تشریف لایا کرتے تھے اور ہماری بار کی علمی و ادبی تقریبات میں خوش دلی سے شریک ہوتے تھے۔ وہاں وہ اچھے شاعر کے طور پر متعارف ہوئے اس زمانے میں آغا شیر احمد خاموش اور مرزا تصدق رسول ایڈووکیٹ المعروف نفیس چغتائی مرحوم بڑی اچھی ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ جن میں جناب چوہدری محمد الیاس اپنا کلام خصوصاً نعتیں بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ بعد ازاں وہ مظفر گڑھ سے بھی بطور سول جج ملتان دورہ پر آتے تھے۔ جج ہائی کورٹ بننے سے پہلے وہ ملتان میں جج انٹی کرپشن کے طور پر تعینات رہے وہ بعد ازاں نہ صرف جج ہائی کورٹ نامزد ہوئے بلکہ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج بھی رہے۔ جہاں سے وہ ریٹائر ہوئے۔ وہ ایک سیدھے سادے انصاف پرور مسلمان ذہن کے انسان تھے۔ وکلاء میں بے حد مقبول تھے اور عدالت میں ان کا رویہ خوش دلی سے معمور تھا مرضی اپنی کرتے تھے۔

ون یونٹ کا قیام ایوب خان کے دور میں عالم وجود میں آیا۔ جب جنوبی پاکستان کے تمام صوبوں کا ایک صوبہ بن گیا تو عدلیہ بھی ایک ہوگئی۔ چنانچہ ملتان میں سندھ اور صوبہ سرحد کے عدلیہ افسران مختلف اوقات میں تعینات ہوتے رہے۔ سندھ سے دو سول جج صاحبان احمد یار خان اور مرزا صلاح الدین ملتان میں آ کر تعینات ہوئے دونوں بے حد مقبول جوڈیشل آفیسر تھے۔ بعد ازاں یہ دونوں حضرات سندھ ہائی کورٹ کے جج نامزد ہوئے۔ دونوں سادہ مزاج کھلے دل کے انسان تھے۔ مرزا صلاح الدین تو جب بھی ملتان آتے ہیں ہماری بار میں ضرور تشریف لاتے ہیں اور سید شفاعت علی نقوی ایڈووکیٹ کی سیٹ پر ان سے گاہے بگاہے ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ صوبہ سرحد سے شاہنواز خان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر ملتان میں تعینات ہوئے وہ بہت ہی انصاف پرور افسر تھے بعد ازاں وہ جج ہائی کورٹ ہو گئے اور جب ون یونٹ ختم ہوا اور صوبہ سرحد بحال ہوا تو وہ صوبہ سرحد کے چیف جسٹس مقرر ہوئے اور وہاں سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج مقرر ہوئے انہیں دنوں ان کا اچانک انتقال ہو گیا ورنہ وہ چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان بھی ہو جاتے۔ وہ بے حد پسندیدہ شخصیت شمار ہوتے تھے۔

جب میں سال 1957ء میں وکیل کے طور پر ملتان ڈسٹرکٹ بار کا رکن تھا ان دنوں ملتان کے سینئر سول کی عدالت کے شمال میں گلی کے بعد والے کمرے میں جناب لہراسپ خان بطور سول جج عدالتی خدمات سرانجام دیتے تھے وہ نہایت ہی متین سنجیدہ اور بے حد زیرک انسان تھے ان کی عدالت کا ماحول بے حد پرسکون ہوتا تھا وہ بعد ازاں نیک نامی سے ترقی کرتے کرتے جج ہائیکورٹ ہو گئے اور کچھ عرصہ لاہور ہائیکورٹ ملتان بنچ پر بھی انہوں نے خدمات سرانجام دیں ان کا رویہ حسب سابق بے حد دل آویز تھا اور وکلاء ان سے بے حد خوش تھے جناب لہراسپ

خان کی بطور سول جج تعیناتی کے چند سال بعد جناب شیخ امجد علی بطور سول جج ملتان میں خدمات سرانجام دیتے رہے وہ بے حد دھیمے خوش اخلاق اور قانون کی پیروی کرنے والے سول جج تھے بعد ازاں وہ سول جج کے عہدہ سے ترقی کر کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ پر تعینات رہے اور انہوں نے پنجاب کے کئی اضلاع میں اعلیٰ عدالتی خدمات سرانجام دیں اور ترقی کر کے جج لاہور ہائیکورٹ ہو گئے انہوں نے کچھ عرصہ ملتان بنچ پر بطور جج ہائیکورٹ بھی خدمات سرانجام دیں وہ ایک نیک نام جج ہائیکورٹ ثابت ہوئے۔

چوہدری محمد شریف پی سی ایس جوڈیشل نے کافی عرصہ ملتان میں عدالتی خدمات سرانجام دیں وہ سب سے پہلے ملتان میں سینئر سول جج کے طور پر تعینات رہے وہ سخت ڈسپلن کے قائل تھے ان کی عدالت میں مکمل خاموشی چھائی رہتی تھی وہ بے حد آہستہ کلام کرتے تھے ان کی عدالت میں اگر سائل یا گواہ مقدمہ کی کارروائی کے دوران وکیل مخالف کی ذرا بھر توہین کر دیتا تھا تو چوہدری صاحب چپکے سے کارروائی لکھتے لکھتے قصور کرنے والے پر پانچ صد روپے تک جرمانہ یا بصورت عدم ادائیگی پندرہ دن قید محض کی سزا سنا دیتے تھے جس سے ان کی عدالت کا بے حد رعب ہوتا تھا چوہدری محمد شریف بعد ازاں ملتان میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر تشریف فرما ہوئے اور نیک نامی سے وقت گزارا جب وہ جج ہائیکورٹ کے عہدہ پر ترقی کر کے فائز ہوئے تو انہوں نے کافی عرصہ ملتان بنچ پر بھی خدمات سرانجام دیں ان کا رویہ جونیئر و سینئر کے ساتھ ایک جیسا ہوتا تھا جج ہائیکورٹ کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ کافی عرصہ دیگر اعلیٰ عدالتی فرائض سرانجام دیتے رہے ان دنوں بھی وہ ملتان میں کچھ عرصہ تعینات رہے آج کل وہ بہاولپور میں رہائش پذیر ہیں جسٹس چوہدری محمد نسیم کا بھی ملتان سے کافی طویل تعلق رہا ہے وہ بہاولنگر کے ایک معروف وکیل کے بیٹے تھے ان کے دو بھائی وہاڑی اور ساہیوال کے معروف وکیل ہیں انہوں نے عدالتی زندگی کا آغاز وکالت سے کیا اور وہ جلد ہی پنجاب کے جوڈیشل سروس کے رکن چن لیے گئے وہ بے حد چھوٹی عمر میں سال 1976ء میں قصور کے سیشن جج کے عہدہ پر فائز ہو گئے لیکن جب مارشل لاء لگا تو ان کو ملتان میں تبدیل کر کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ پر دوبارہ ترقی کر گئے۔ انہوں نے ملتان میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر خدمات سرانجام دیں ملتان میں بینکنگ جج بھی تعینات رہے اور آخر کار وہ لاہور ہائیکورٹ کے جج کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے بطور جج ہائیکورٹ انہوں نے فوجداری قانون کی تشریح کے سلسلہ میں کافی اعلیٰ نظائر پیش کیں جو ان کی اعلیٰ قانونی استعداد کا منہ بولتا ثبوت ہیں بطور جج ہائیکورٹ انہوں نے ملتان بنچ پر بھی خدمات سرانجام دیں اس دوران ملتان سے اپنے دیرینہ تعلق کی وجہ سے ان کی عدالت بے حد پسندیدہ عدالت قرار دی جاتی تھی۔

جسٹس چوہدری محمد ظفر اللہ سی ایس پی کا بھی ملتان سے خاصا پرانا تعلق تھا ان کے والد نے بطور ڈاکٹر ملتان کے پرانے ضلع میں مختلف مقامات پر ملازمت کے سلسلہ میں اعلیٰ خدمات سرانجام دیں چوہدری محمد ظفر اللہ صاحب نے پرانے ضلع ملتان کے طول و عرض میں والد کی ملازمت کے دوران مختلف سکولوں میں تعلیم حاصل کی وہ میرے لاء کالج لاہور کے ہم عصر طالب علم اور سال 1957ء کے لاء گریجوایٹ تھے۔ ہماری بار کے کئی دیگر اراکین بھی ان کے

کلاس فیلو ہیں۔ انہوں نے قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد سی ایس پی کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کر کے انتظامیہ سے اپنی نوکری کا آغاز کیا بعد ازاں وہ ملتان میں بطور ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے اور اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں اور نیک نفسی کی وجہ سے اعلیٰ شہرت حاصل کی انہوں نے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ملتان کے موجودہ بار ہال کا افتتاح کیا تھا۔ ان کے نام کی یادگاری تختی بار ہال پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے وہ اپنی آزادی فکر وطبع کی وجہ سے انتظامیہ کی نوکری میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکے اور عدلیہ میں اپنی درخواست پر لے لئے گئے وہ پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ پر تعینات رہنے کے بعد آخر جج ہائیکورٹ کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے اور بطور جج لاہور ہائیکورٹ انہوں نے کافی مرتبہ اپنی باری پر ملتان بنچ پر بھی اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔ بعد ازاں وہ ٹریفک کے حادثہ میں نوجوان شہید ہو گئے۔ جس کا قلق پورے پنجاب کی بنچ اور بار کو کافی عرصہ رہا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے۔

جسٹس محمد خلیل رمدے کے والد چوہدری محمد صدیق صاحب پاکستان بننے کے بعد ملتان میں ایڈمنسٹریٹو سول جج کے طور پر تعینات رہے اور کچھ عرصے کے بعد وہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج بن کر ملتان کی عدلیہ کے رکن رہے اس دور میں وہ پبلک لائبریری باغ لانگے خان ملتان کی مجلس عاملہ کے رکن کے طور پر عملی خدمات سرانجام دیتے رہے اس کا ذکر میں نے پبلک لائبریری باغ لانگے خان کی سوسالہ تاریخ میں بھی کیا ہے۔ وہ اس زمانے میں معاشرتی زندگی میں بے حد فعال تھے جب چوہدری محمد صدیق صاحب جج ہائیکورٹ بن گئے تو وہ گاہے بگاہے اپنی سابقہ یادوں اور تعلقات کو تازہ کرنے کے لیے ملتان تشریف لاتے رہے اور سلسلہ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جاری رہا مجھے ریٹائرمنٹ کے زمانے میں ملتان کی خانقاہوں پر ان سے ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ میرے خیال میں ان کی اولاد بھی ملتان کے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرتی رہی ہے اس سارے خاندان کا ملتان سے تعلیمی تعلق صاف واضح ہے۔

جسٹس عبدالحفیظ چیمہ اور جسٹس غلام احمد جو پی سی ایس جوڈیشل کے رکن تھے ملتان میں بے حد قلیل عرصہ سول جج کے طور پر تعینات رہے یہ دونوں جج صاحبان یونیورسٹی لاء کالج لاہور کے 1957ء کے گریجوایٹ تھے اور میرے کلاس فیلو تھے اور بھی ملتان کے کافی وکلاء ان کے ہم درس ہوں گے۔ جو آج کل ملتان کے سینئر وکلاء ہیں جسٹس افتخار چیمہ بیرسٹری کرنے کے بعد انگلستان سے واپس آئے تو وکلاء میں سے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کے کیڈر میں پنجاب کی عدلیے میں شامل ہوئے اور ملتان میں تعینات ہوئے وہ ان دنوں ملتان کی معاشرتی زندگی میں بے حد متحرک تھے اور اعزازی طور پر یونیورسٹی لاء کالج میں قانون شہادت بھی پڑھاتے رہے اور جب وہ جج ہائیکورٹ بنے تو انہوں نے ملتان بنچ پر بھی کچھ عرصہ خدمات سرانجام دیں۔

جسٹس نواب اوصاف علی خان جن کا تعلق پی سی ایس جوڈیشل سے تھا وہ بھی ملتان میں پہلی مرتبہ سینئر سول جج ملتان کے عہدہ پر تعینات ہوئے اپنے عرصہ تعیناتی کے دوران انہوں نے ملتان کی مختلف لائبریریوں میں تحقیق کے

بعد قرآن کریم کی روشنی میں ایک معرکتہ الارا کتاب حقوق العباد تصنیف کی بعد ازاں وہ ملتان میں بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تعینات رہے اور کچھ عرصہ رجسٹرار ہائی کورٹ تعینات رہنے کے بعد وہ جج ہائیکورٹ مقرر ہوئے جس پر ملتان کے کافی لوگوں کو خوشی ہوئی وہ ایک لحاظ سے ملتانی ہیں اور ملتان کے لوگوں کے ساتھ ان کے قدیمی انسانی تعلقاتی چلے آتے ہیں۔

جسٹس غلام سرور پی سی ایس جوڈیشل کی ایسوسی ایشن کے ہردلعزیز صدر تھے۔ پہلی مرتبہ اس وقت تعینات ہوئے جب ملتان میں لاہور ہائیکورٹ ملتان بنچ قائم ہوا۔ ان دنوں وہ ایڈیشنل رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوئے تھے ملتان بنچ کے قیام کے سلسلہ میں جو ابتدائی مشکلات تھیں ان پر قابو پانے میں ملتان کے بنچ کے جج صاحبان اور وکلاء کے ساتھ ان کی خدمات بھی ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہیں بعد ازاں وہ ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مقرر ہوئے ان کے عرصہ تعیناتی میں ڈسٹرکٹ کورٹس میں عدلیہ کے لیے بہت سی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور عدلیہ کی عمارتوں کی بے حد کایا کلپ ہوئی جس میں شیخ صاحب کا اپنی ذوق و آرائش بھی شامل تھا بعد ازاں وہ جج ہائی کورٹ نامزد ہوئے تو وہ ملتان بنچ پر بھی قلیل عرصہ خدمات انجام دیتے رہے۔ وکلاء میں ان کی مقبولیت ان کے باعزت ریٹائر ہونے کے بعد آج تک قائم ہے۔

جسٹس راؤ محمد اقبال خان مارشل لاء سے پہلے ملتان میں سینئر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر تعینات رہے بعد ازاں وہ پنجاب کے مختلف اضلاء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے اور ترقی کر کے لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے کچھ عرصہ انہوں نے ملتان بنچ پر بھی خدمات سرانجام دیں اور نیک نام رہے۔

ملتان میں وکلاء کی تاریخ تو سو سال سے بھی زیادہ طویل ہے لیکن بہت سے قابل وکلاء ملتان کے عدالتی افق پر روشن ستارہ کے طور پر نمودار ہو کر ضوفشانی کر کے چلے گئے لیکن پاکستان سے پہلے ملتان کی وکلاء برادری سے کسی وکیل کو بھی جج ہائیکورٹ مقرر نہ کیا گیا انگریزی حکومت میں جج ہائی کورٹ کے طور پر نامزدگی کے اصول خفیہ تھے اور کارروائی تقرری جج ہائیکورٹ بے حد شفاف نہ ہوتی تھی ملتان کے وکلا میں سب سے پہلے جو وکیل پاکستان بننے کے بعد جج ہائیکورٹ بنے وہ جسٹس شبیر احمد تھے وہ شیخ قدیر احمد ایڈووکیٹ کے بڑے بھائی تھے انہوں شاید سال 1936ء میں اپنی پریکٹس کا آغاز ملتان سے کیا اور ملک فیض رسول ایڈووکیٹ کے گہرے دوست تھے ملتان کی چھوٹی عدالتوں میں ان کا دل نہ لگا وہ شروع سے محنتی تھے جزورسی اور نقطہ بینی کے اوصاف ان میں بدرجہ اتم پائے جاتے تھے نیز ان میں بال کی کھال اتارنے کا وصف بھی پایا جاتا تھا چنانچہ یہاں کی عدالتوں میں جس طرح وہ بحث کرتے تھے وہ زیادہ مقبول نہ ہو سکے اور آخر کار وہ ملتان سے پریکٹس ترک کر کے لاہور چلے گئے جہاں وہ پاکستان بننے سے پہلے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کے طور پر نامزد ہو گئے پاکستان بننے کے بعد کچھ عرصہ وہ ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل بھی رہے اور آخر کار وہ جج لاہور ہائیکورٹ مقرر ہو گئے جہاں انہوں نے پاکستان کی عدلیہ کی تاریخ میں کافی نام کمایا وہ ملتان کے قدیم حکیم

قریشی خاندان کے معزز فرد شاہ محمد قریشی کے فرزند تھے۔

جسٹس شبیر احمد صاحب کے جج مقرر ہونے کے بعد ملتان بار سے کافی عرصہ تک کسی کو جج ہائی کورٹ مقرر نہ کیا گیا البتہ ملک عبدالحمید صاحب ایڈووکیٹ جو ملتانی کمبوہ تھے اور ملک کریم ایزد صاحب ایڈووکیٹ کے قریبی عزیز تھے جنہوں نے پریکٹس کا آغاز ملتان بار سے کیا تھا اور بعد ازاں بہاولپور چلے گئے جہاں سے وہ بہاولپور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے اور جب بہاولپور ہائی کورٹ لاہور ہائیکورٹ میں مدغم ہو گئی اور ون یونٹ بن گیا تو ملک عبدالحمید صاحب مغربی پاکستان ہائیکورٹ، کے جج مقرر ہوئے اور ریٹائر ہونے کے بعد ہو کافی عرصہ دیگر اعلیٰ عدالتی عہدوں پر فائز رہے وہ ہمارے دوست ملک ممتاز اختر ایڈووکیٹ کے والد تھے بعد ازاں وہ حج سے واپس آتے ہوئے طائف میں ہوائی حادثہ کا شکار ہو کر شہید ہو گئے۔ جس کا ہماری بار کو بے حد قلق ہوا۔ ملتان کی جسٹس حمید کالونی ان کے نام نامی سے معنون ہے۔

شیخ منظور قادر ایڈووکیٹ خلف سر عبدالقادر ایڈووکیٹ جو بعد ازاں ملک کے نامور قانون دان ثابت ہوئے اور کچھ عرصہ چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ بھی رہے۔ نے اپنی پریکٹس کی ابتداء ملتان سے شروع کی دو سال ملتان میں پریکٹس کرنے کے بعد وہ دو سال فیصل آباد میں پریکٹس کرتے رہے اور پنجاب کے قانون دان طبقہ میں اس طرح متعارف ہونے کے بعد آخرکار انہوں نے لاہور سے اپنی پریکٹس کا آغاز کیا اور بے حد کامیاب وکیل ثابت ہوئے۔ چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ کے عہدہ پر تقرری سے پہلے وہ پاکستان کے وزیر خارجہ بھی رہے سندھ طاس معاہدہ ان کا کارنامہ ہے انہوں نے جلد چیف جسٹس کے اعلیٰ عہدے سے استعفیٰ دے کر بھی ایک اعلیٰ مثال قائم کی اور یہ ثابت کیا کہ قانون کی پریکٹس کو دوبارہ شروع کر دیا اور وہ باقی ماندہ زندگی وکالت کے پیشے سے منسلک رہے۔

جسٹس شبیر احمد کے بعد ملتان کے پہلے وکیل جو جج ہائیکورٹ بنے اور جسٹس سردار عبدالجبار خان تھے وہ فوجداری اور مال کے ملتان کے ممتاز وکیل تھے۔ انہوں نے دس سال ملتان میں پریکٹس کرنے کے بعد لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس کا آغاز کیا اور جلد ہی پنجاب کے چوٹی کے وکلاء میں شمار ہونے لگے اور چند سالوں کے بعد لاہور ہائیکورٹ کے جج بنا دیئے گئے جہاں وہ کافی عرصہ تعینات رہے بعد ازاں وہ پنجاب سروس ٹریبونل کے چیئرمین کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے اور نیک نام رہے جسٹس سردار عبدالجبار خان ملتان کے ملے زئی پٹھان تھے وہ ایک معروف زمیندار خانان کے معزز فرد تھے جتنا عرصہ وہ ملتان میں رہے انہوں نے اپنی قدر آور شخصیت کو فعال کردار کی وجہ سے ملتان کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں اعلیٰ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور وہ ملتان کی زندگی کے ہر شعبہ میں پیش پیش تھے انہوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک بے حد فعال معاشرتی زندگی بسر کی اور ان خدمات کے سلسلہ میں ان کو ملک کے تمام پٹھانوں نے ایک بڑے اجتماع میں بابائے پٹھان کا خطاب عطا کیا وہ اس سال سے رخصت ہو گئے ہیں۔

جسٹس سردار عبدالجبار صاحب مرحوم کے ہم عصر ملتان کے ایک اور وکیل سید کمال مصطفیٰ بخاری بھی

عبدالجبار خان کے قریب کے دور میں لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ وہ ملتان کے ایک نامور بخاری خاندان کے فرد تھے۔ وہ سید بہاء الدین شاہ بخاری ایڈووکیٹ کے چھوٹے بھائی تھے شمس الدین محمود ایڈووکیٹ کے چچا تھے سید اختر حسین بخاری ایڈووکیٹ اور سید مظہر حسین بخاری ایڈووکیٹ صاحبان کے ماموں تھے اور ملتان کے معروف دیوانی کے مرحوم وکیل سید گل جہانیاں شاہ ایڈووکیٹ کے خاندان کے فرد تھے انہوں نے وکالت کی ابتداء ملتان سے کی کچھ عرصہ کسٹم کے محکمہ میں ملازم بھی رہے بعد ازاں ملازمت سے استعفیٰ دے کر انہوں دوبارہ پریکٹس کی ابتداء لاہور سے کی اور چند سالوں کے بعد اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کے عہدہ پر تعینات ہوئے اور ترقی کر کے ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کے عہدہ پر فائز رہے تا آنکہ وہ جج لاہور ہائیکورٹ مقرر کر دیئے گئے ریٹائر ہونے کے بعد وہ چند سال فیڈرل شریعت کورٹ کے جج بھی رہے ان کی قانونی قابلیت مسلمہ تھی۔

ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران مولوی مشتاق حسین کی چیف جسٹس شپ کے دوران ڈسٹرکٹ بار ایسوی ایشن ملتان کے ایک جید اور مستند دیوانی وکیل سید کرار حسین زیدی ایڈووکیٹ کو لاہور ہائیکورٹ کا جج مقرر کیا گیا وہ تقریباً سال بھر ہائی کورٹ میں اعلیٰ قانونی خدمات سرانجام دے سکے تھے کہ انہیں کنفرم نہ کیا گیا اور وہ واپس ملتان بار میں آ کر دوبارہ دیوانی پریکٹس میں مصروف ہو گئے انہوں نے بطور جج ہائیکورٹ بعض اہم دیوانی امور پر نہایت اعلیٰ فیصلے صادر کئے جو آج تک سند کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں وہ ہائیکورٹ سے واپسی کے بعد زیادہ دن نہ جیئے اور جوان ہی فوت ہو گئے۔ وہ قانون کی کتابوں پر مشتمل ایک بڑی لائبریری کے مالک تھے جو کہ قابل دید تھی۔

بیرسٹر سعید الرحمٰن نے اپنی پریکٹس کی ابتداء ملتان سے کی اور وہ کچھ عرصہ ہماری بار کے سرکردہ رکن رہے وہ ان دنوں فوجداری پریکٹس کیا کرتے تھے لیکن وہ جلد ملتان سے نقل مکانی کر کے لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے کے لیے چلے گئے چند سال بعد وہ جج ہائیکورٹ مقرر ہوئے جنوری 1981ء میں ملتان میں لاہور ہائیکورٹ کے بنچ کا قیام عمل میں آیا اور لاہور ہائیکورٹ کے جو تین جج صاحبان اس نئے ملتان بنچ پر پہلی مرتبہ خدمات سرانجام دینے کے لیے تشریف لائے ان میں جسٹس سعید الرحمٰن بھی شامل تھے ان ایام میں ملتان بنچ کے قیام کے سلسلہ میں جو ابتدائی مشکلات پیدا ہوئیں ان کے نپٹانے میں جسٹس سعید الرحمٰن صاحب کی خدمات یاد رکھنے کے قابل ہیں اور ان ابتدائی جج صاحبان کی کوششوں سے ملتان بنچ ابتداء ہی میں اپنے قیام کے مقاصد میں کامیاب ہو گیا۔

ملتان بنچ کے قیام کے کچھ عرصہ بعد ہماری بار کے سابق صدر اور فوجداری کے نامور وکیل شیخ خضر حیات صاحب کو لاہور ہائیکورٹ کا جج مقرر کیا گیا یہ تقرری کافی عرصہ کے بعد ہوئی تھی اس لیے ملتان بار کے ممبران نے بے حد خوشی کا اظہار کیا جسٹس شیخ خضر حیات نے اپنی عدالتی زندگی کا آغاز پراسیکوٹنگ برانچ سے کیا لیکن وہ جلد ملازمت چھوڑ کر ملتان بار کے رکن بن کر وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے اور چند سالوں میں ہمارے علاقے کے نامور فوجداری وکلاء میں شمار ہونے لگے وہ ابتداء سے ہی جماعت اسلامی سے منسلک تھے اور جماعت اسلامی کی تنظیم کے ذریعے معاشرتی کاموں میں بھی کافی وقت دیتے رہے چنانچہ 1977ء کی تحریک نظام مصطفیٰ میں وہ عوامی اتحاد کی

طرف سے انتخابات میں نیشنل اسمبلی کی ملتان شہر کی سیٹ سے مشترکہ امیدوار نامزد ہو کر انتخاب لڑے اور کامیاب ہو گئے تحریک کے دوران انہوں نے تین ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں چنانچہ جب ان کو لاہور ہائیکورٹ کا جج مقرر کیا گیا تو انہوں نے کافی عرصہ ملتان بنچ پر خدمات سرانجام دیں جہاں انہوں نے جسٹس محمد منیر خان کے ساتھ مل کر ملتان بنچ کی کامیابی کے لیے اعلیٰ خدمات سرانجام دیں ان کی بطور جج خدمات کو ملتان کے وکلاء اور لوگ کافی عرصہ یاد رکھیں گے۔

شیخ خضر حیات کے جج مقرر ہونے کے کئی سال بعد سید تصدق حسین جیلانی جو ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری اور پنجاب بار کونسل کے رکن بھی رہے تھے جج ہائیکورٹ کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے اس طرح وہ سال 1901 سے لے کر اپنی تقرری کے سال تک ملتان بار کے پانچویں رکن تھے جو لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے وہ موسس خاندان گیلانی حضرت بندگی محمد غوث اچوی کی اولاد میں سے ہیں اور ملتان کے سربر آوردہ گیلانی خاندان کے رکن ہیں وکیل بننے سے پہلے ہی وہ آئین پر ایک کتاب کے مصنف تھے انہوں نے چھ سات سال ہی پریکٹس کی ہوگی کہ وہ اسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے اور بعد ازاں انہوں نے ترقی کر کے ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل پنجاب کے طور پر سالہا سال قانونی خدمات سرانجام دیں اور بے حد پیچیدہ مقدمات میں حکومت کا دفاع کرنے میں کامیاب رہے انہوں نے لاہور ملتان، بہاولپور اور راولپنڈی بنچوں پر خدمات میں حکومت کا دفاع کرنے میں کامیاب رہے انہوں نے لاہور، ملتان، بہاولپور اور راولپنڈی بنچوں پر خدمات سرانجام دے کر پورے پنجاب کے طول و عرض میں قانونی بصیرت کا سکہ بٹھایا اور حکومت کی طرف سے سپریم کورٹ میں بھی مقدمات کی پیروی کرتے رہے بعد ازاں وہ بھی لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے آج کل وہ ملتان بنچ پر بطور سینئر جج خدمات سرانجام دے رہے ہیں ان کی قانونی اہلیت مسلمہ ہے۔ (جسٹس تصدق حسین جیلانی بطور چیف جسٹس آف پاکستان 2014ء میں ریٹائر ہوئے)

مسز فخر النساء کھوکھر جنوبی پنجاب کی پہلی خاتون وکیل ہیں جنہوں نے مشکل دور میں ملتان سے وکالت کا آغاز کیا وہ اس وادی خارزار میں بے حد فعال رکن کے طور پر قانونی کارہائے نمایاں سرانجام دیتی رہیں وکالت کے دوران تحصیلداری کی عدالت سے لے کر سپریم کورٹ تک پیش ہوتی رہیں وہ جنوبی پنجاب میں مزدوروں اور خواتین کے حقوق کی جدوجہد میں پیش پیش تھیں۔ بھٹہ مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں وہ سپریم کورٹ تک لڑتی رہیں اور ہمیشہ ملک کی ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں رہیں۔ وہ ہماری بار ایسوسی ایشن کی بے حد معتبر وکیل تھیں اور پنجاب بار کونسل کی رکن تھیں جب ان کو لاہور ہائیکورٹ کے جج کے طور پر مقرر کیا گیا جہاں وہ سالہا سال سے اعلیٰ خدمات سرانجام دیتی رہیں۔ (بعد میں پی پی کی طرف سے ان کو خواتین کی نشستوں پر ایم این اے بھی بنوایا گیا)

جسٹس سید جمشید علی بھی ہماری بار کے بے حد پسندیدہ رکن رہے ہیں ان کے والد بزرگوار سید مشتاق علی ایڈووکیٹ ہماری بار ایسوسی ایشن کے سینئر دیوانی کے وکیل تھے۔ سید مشتاق علی گڑگاؤں میں تقسیم ملک سے پہلے

دیوانی کے میدان میں معتبر نام بن چکے تھے اور لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس، جسٹس ٹیک چند اپنی جائیداد کے مقدمے ان کے سپرد کیا کرتے تھا سید مشتاق علی پاکستان بننے کے بعد ملتان تشریف لائے اور محنت شاقہ سے انہوں نے دیوانی کے میدان میں دوبارہ اپنا اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ سید جمشید علی ایڈووکیٹ نے تقریباً دس سال والد کے ساتھ دیوانی پریکٹس کی تھی کہ وہ بطور وکیل پی سی ایس ایگزیکٹو میں منتخب ہو گئے لیکن آزادی طبع کی وجہ سے وہ زیادہ دیر ملازمت سے منسلک نہ رہ سکے انہوں نے جلد ہی ملازمت سے استعفیٰ دے کر لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس کا آغاز کیا اور چند سالوں میں لاہور کے وکلاء میں نیک نام حاصل کر لیا۔ جہاں سے وہ لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہو گئے وہ اپنی قانونی اہلیت کی وجہ سے قانون کی دنیا میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور وکیلوں میں بے حد پسندیدہ کردار شمار ہوتے ہیں۔

جناب جسٹس محمد نذیر احمد صدیقی ملتان کے معروف و مقبول میونسپل ہیلتھ آفیسر جناب ڈاکٹر توقیر احمد مرحوم کے قابل فرزند تھے ان کے والد بزرگوار پاکستان بننے کے چند سالوں کے بعد جوان فوت ہو گئے تھے وہ ایک پسندیدہ کردار کے مالک شخص تھے ان کی جوانمرگی پر سارے شہر کو بے حد افسوس ہوا تھا محمد نذیر احمد صدیقی نے ملتان میں مشکل حالات میں تعلیم حاصل کی ان کے بزرگوار نانا جو بڑے معروف وکیل تھے۔ اپنے دوہتوں کی خاطر وکالت کو چھوڑ کر ملتان میں ان کے ساتھ رہائش پذیر ہو گئے ان کے ماموں محمد سلطان صدیقی بھی معروف وکیل تھے اور شاعر اور غالب شناسی میں بھی معروف تھے۔ ان کے ولی بنے ہوئے تھے۔ ان بزرگوں کی نگرانی میں محمد نذیر احمد صدیقی نے ملتان میں ہی تعلیم مکمل کر کے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ملتان سے ہی وکالت کا آغاز کیا۔ جب 1981ء میں لاہور ہائیکورٹ کا ملتان میں بنچ قائم ہوا تو محمد نذیر احمد صدیقی نے اپنی تمام تر توجہ ہائیکورٹ پریکٹس پر منعطف اور جلد ہی لاء آف رٹ اور دیوانی امور میں انہوں نے کافی شہرت حاصل کر لی جہاں سے اپنی قانونی استعداد کی وجہ سے وہ لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہو گئے وہ اپنی پسندیدہ عادات اور اعلیٰ قانونی استعداد کی وجہ سے وکلاء اور عوام کی آنکھ کا تارا ہیں۔ جسٹس محمد نذیر احمد صدیقی وکالت کے دوران لاہور ہائیکورٹ ملتان بنچ کی بار ایسوسی ایشن کے منتخب سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ (جسٹس نذیر احمد صدیقی فوکر طیارے کے حادثہ میں جاں بحق ہوئے)

جناب جسٹس میاں ظفر یسین صاحب جنوبی پنجاب کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہی۔ انہوں نے لاہور لاء کالج سے قانون کے امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد ملتان ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ممبر کے طور پر قانونی پریکٹس شروع کا آغاز کیا اور چند سالوں کے بعد اعلیٰ قانونی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان تشریف لے گئے جہاں سے ایل ایل ایم کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد وہ ملتان تشریف لائے اور دوبارہ پریکٹس کا آغاز کیا۔ ملتان میں وہ کچھ عرصہ گیلانی لاء کالج کے پرنسپل کے طور پر بھی اعلیٰ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ بعد ازاں وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ جہاں وہ جلد ہی دیوانی پریکٹس میں نام پیدا کر گئے۔ وہاں وہ یونیورسٹی لاء کالج میں بھی پڑھاتے رہے۔ سال 1981ء میں جب لاہور ہائیکورٹ کا ملتان بنچ قائم ہوا تو یہ بھی لاہور سے نقل

مکانی کر کے ملتان بنچ میں پریکٹس کرنے لگے اور جلد ہی جنوبی پنجاب کے چوٹی کے دیوانی وکیلوں میں شمار ہونے لگے۔ ان کی اعلیٰ قانونی بصیرت کو دیکھتے ہوئے انہیں جلد ہی لاہور ہائیکورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ جس پر جنوبی پنجاب کے قانون سے واقف لوگوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ آج کل وہ ملتان بنچ پر اعلیٰ خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

جسٹس محمد خالد علوی جو اس سال جج ہائیکورٹ مقرر ہوئے ہیں۔ لیہ کے ایک سربرآوردہ علوی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے پریکٹس کی ابتداء لاہور میں شروع کی اور جب ملتان بنچ 1981ء میں قائم ہوا تو وہ بھی ملتان تشریف لائے اور ہماری بار کے رکن بن کر انہوں نے پریکٹس کا آغاز دوبارہ ملتان سے شروع کیا۔ اور جلد ہی دیوانی اور کمپنی لاز کے کیسز میں خصوصی شہرت حاصل کر گئے۔ اپنی شرافت سلیم الطبعی اور صداقت کی وجہ سے وہ وکلاء میں بے حد پسندیدہ شخصیت سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے کئی سال مرکزی حکومت کی بھی قانونی پیروی کی ہے اور بعض معروف کیسز میں وفاق کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ ان سے وکلاء اور قانون سے واقف لوگوں کو نیک امیدیں وابستہ ہیں اللہ تعالیٰ کامیاب و کامران کرے۔ اس سال پی سی ایس جوڈیشنل کے کیڈر سے جن حضرات کو لاہور ہائیکورٹ کا جج نامزد کیا گیا ہے ان میں جسٹس میاں محمد جہانگیر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے عہدہ پر فائز رہے ہیں۔ میں اور جناب جسٹس فرخ لطیف سینئر سول جج ملتان کے عہدہ پر خدمات سرانجام دے چکے ہیں اور جناب جسٹس رسم علی ملتان میں سول جج کے طور پر تعینات رہ چکے ہیں اور جناب جسٹس چوہدری افتخار حسین ملتان میں ایڈیشنل سیشن جج کے عہدہ پر فائز رہے ہیں ان کی سابقہ اہلیت اور کردار کے پیش نظر ہماری ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشان کو ان جج صاحبان سے اعلیٰ عدالتی روایات قائم رکھنے کی امیدیں وابستہ ہیں۔

(ملتان بار ایسوسی ایشن کے سو سال - عمر کمال خان ایڈووکیٹ



عمر کمال خان ایڈووکیٹ۔

ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان

1901ء سے 2001ء تک

موجودہ نظام عدل انگریزوں کا قائم کردہ ہے جس کی ابتداء سال 1849ء میں برطانوی سلطنت میں پنجاب کی شمولیت سے شروع ہوئی۔ سکھوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے پنجاب کے نظام کے لیے ایک بورڈ آف ایڈمنسٹریشن قائم کیا اور صوبہ کو کمشنریوں میں تقسیم کیا اور صوبہ کے نظام کے لیے کمشنر، ڈپٹی کمشنر، اسسٹنٹ کمشنر، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور کاردار کے عہدے قائم کئے اور ان عہدہ داروں کے حیطہ اختیار میں عہدہ کی اہمیت کے مطابق علاقے سپرد کئے۔ یہی انتظامی افسران جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ہی دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ درجہ بدرجہ کرتے تھے بعد ازاں 1853ء میں بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کی بجائے صوبہ کا انتظام چیف کمشنر پنجاب کے سپرد کیا گیا اس کی امداد کے لیے ایک جوڈیشل کمشنر اور ایک فنانشل کمشنر مقرر کیا گیا ان دنوں دیوانی اور فوجداری مقدموں کی اپیل کمشنر کے پاس ہوتی تھی یہی صورتحال پنجاب لاءز ایکٹ مجریہ 1872ء تک قائم رہی۔ ان دنوں تحصیلدار کی عدالت -/300 روپے مالیت کے دیوانی مقدمات کی سماعت کرتی تھی جبکہ اسسٹنٹ کمشنر جن کے تین درجہ تھے درجہ وار علی الترتیب -/100 روپے، -/500 روپے اور -/10,000 روپے تک کے دیوانی مقدمات سماعت کرتے تھے ڈپٹی کمشنر کی عدالت کو آج کل کے سینئر سول جج والے اختیارات حاصل تھے نیز ڈپٹی کمشنر اپنے ماتحت عدالتوں کے دیوانی فیصلوں کی اپیلیں بھی سماعت کرتے تھے۔ کمشنر کے پاس دیوانی مقدموں کی سماعت کے لامحدود اختیارات تھے نیز کمشنر دیوانی کے دس ہزار روپے مالیت سے زائد مقدمہ جات کے فیصلوں کی اپیل سماعت کر سکنے کے مجاز تھے۔ جوڈیشل کمشنر کی عدالت صوبہ کی آخری عدالت اپیل اور نگرانی تھی۔

سال 1866ء میں پنجاب چیف کورٹ کا قیام عمل میں آیا اور پنجاب میں انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے نیا نظام عدل مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا گیا مختلف درجوں کی منصف مقرر کئے گئے جو ڈپٹی کمشنر کے ماتحت تھے۔ ڈپٹی کمشنروں کو اپنے ضلع کے آج کل کے ڈسٹرکٹ جج کے اختیارات حاصل تھے کمشنر حسب سابق عدالت اپیل کے طور پر فرائض سرانجام دیتے رہے۔ 1884ء میں نظام عدل کی از سر نو تنظیم ہوئی۔ اب دیوانی کا کام

کافی بڑھ گیا جس کی وجہ سے عدالتی نظام کی حسب ذیل تنظیم جدید ہوئی۔

۱۔ دی چیف کورٹ آف پنجاب
۲۔ عدالت تنازعات خفیفہ
۳۔ عدالت ڈویژنل جج
۴۔ عدالت ڈسٹرکٹ جج
۵۔ عدالت سول جج
۶۔ عدالت منصف

اس نئے نظام کے مطابق ڈویژنل کورٹ اور ڈسٹرکٹ کورٹ کو لامحدود مالیت کے مقدمہ جات کی سماعت کا اختیار دیا گیا کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں سے دیوانی مقدمات کی سماعت کا اختیار واپس لے لیا گیا ڈسٹرکٹ جج کی حیثیت آج کے سینئر سول جج کی طرح تھی۔ البتہ وہ منصفوں اور عدالت خفیفہ کے علی الترتیب -/500 روپے اور -/100 روپے مالیت کے مقدموں کی اپیل کی سماعت کا اختیار رکھتے تھے ڈسٹرکٹ جج اور سول ججوں کے فیصلوں کی اپیل دی چیف کورٹ آف پنجاب کے پاس ہوسکتی تھی اور باقی تمام اپیلیں ڈویژنل کورٹس سماعت کرتے تھی۔ ڈویژنل کورٹ جو ابتدائی فیصلہ کرتی تھی اس کی اپیل دی چیف کورٹ آف پنجاب کے پاس ہوتی تھی۔ سال 1919ء میں لاہور ہائیکورٹ کا قیام عمل میں آیا جس کی رو سے پنجاب میں عدالتوں کو ازسرنو منظم کیا گیا اس سے پنجاب کورٹس ایکٹ 1914ء کی رو سے ڈویژنل جج کی عدالت کو ختم کر دیا گیا اور حسب ذیل عدالتیں قائم کی گئیں۔

۱۔ ڈسٹرکٹ جج
۲۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج
۳۔ سول جج
۴۔ منصف

یہ نظام اپریل 1919ء میں مکمل طور پر سارے صوبے میں پھیلا دیا گیا جو سول کورٹ آرڈیننس 1962ء کے نفاذ کے بعد آج تک معمولی ترامیم کے ساتھ نافذ العمل چلا آرہا ہے ملتان کا سیشن ڈویژن شروع دن سے قائم ہے لیکن مقام افسوس ہے کہ ہم نے سیشن جج صاحبان جو پاکستان سے پہلے اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوتے رہے اس کی کوئی فہرست محفوظ نہیں کی۔ میں نے جب اس کام کا بیڑہ اٹھایا تو 1901ء سے لے کر 1947ء تک ڈویژنل ججوں اور ڈسٹرکٹ ججوں کے بارے میں ریکارڈ ناپید تھا۔ چنانچہ 1901ء سے لے کر 1947ء تک ڈویژنل اینڈ ڈسٹرکٹ ججوں کی فہرست مرتب کرنے کے لیے مجھے پنجاب ریکارڈ اور دوسرے پرانے عدلیہ کے فیصلوں کے ریکارڈ کو کھنگالنا اور بہت محنت شاقہ کے بعد ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے لائبریری کے عملہ کے پرخلوص تعاون کی وجہ سے ایسی فہرست مرتب کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوگیا ہوں اس فہرست کی بنیاد پر میں اپنے مضمون کا آغاز کر رہا ہوں اس دور

مجھے پہلے مسلمان ڈویژنل جج خان بہادر نواب محمد حیات خان کھڑ کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوئیں ان کے انیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی میں ملتان میں ڈویژنل جج کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہونے کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ جنرل نکلسن کے ساتھ بطور اے ڈی سی 1857ء میں محاصرہ دہلی میں خدمات سرانجام دے رہے تھے کہ دوران جنگ جنرل نکلسن بری طرح زخمی ہو کر گر پڑا۔ نوجوان محمد حیات خان نے جان جوکھوں میں ڈال کر نکلسن کو جنگ سے زخمی حالت میں نکالا اور محفوظ مقام پر لے آیا جنرل نکلسن نے اس کی بہادری اور وفاداری کی یاد میں اپنے خون سے یہ تحریر لکھ کر دی Hayat did well جس کی بناء پر نوجوان محمد حیات خان کو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر تعینات کیا گیا جہاں سے ترقی کرتے کرتے وہ ڈویژنل جج بن گئے اور انہوں نے پنجاب کے مختلف اضلاع میں اعلیٰ عدالتی خدمات سرانجام دیں وہ سر سکندر حیات کے والد تھے۔

بزرگ وکلاء ملک فیض رسول اور بیرسٹر شیخ عبدالرزاق کی روایت کے مطابق ملتان کے پہلے مسلمان ڈویژنل جج جو انیسویں صدی عیسوی کے آخری دنوں میں ملتان میں ڈویژنل جج ملتان مقرر ہوئے تھے وہ حسن ابدال کے معروف کھڑ خاندان کے بانی تھے اور ''حیات افغانی'' نامی پٹھانوں کی تاریخ کے مصنف بھی تھے۔

1901ء میں خان بہادر عبدالغفور خان ڈویژنل جج ملتان کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے یہ کافی عرصہ ملتان کے اردگرد عدلیہ کے مختلف چھوٹے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے تھے عبدالغفور خان اٹک کے قریب واقعہ زیدہ کے خان تھے ان کی ملتان کے گردونواح میں رشتہ داریاں بھی تھیں۔ امیر آف بہاولپور سر صادق محمد خان خامس کی ہمشیرہ بھی ان کے خاندان میں بیاہی ہوئی تھی۔ اور ان کی دختر نیک اختر نواب محمد خان لغاری کی زوجہ محترمہ اور سابق صدر پاکستان فاروق احمد خان لغاری کی اغلباً والدہ محترمہ تھیں۔ عبدالغفور خان 3 جون 1902ء کو شاہ پور کے ڈویژنل جج بنائے گئے اور ملتان سے تشریف لے گئے ان سے پہلے ملتان کے ڈویژنل جج بنائے گئے اور ملتان سے تشریف لے گئے ان سے پہلے ملتان کے ڈویژنل جج رائے بہادر سوڈھی حکم سنگھ جولائی 1899ء میں تعینات ہوئے تھے بابا گرونانک کی اولاد سوڈھی کہلاتی ہے اور سردار حکم سنگھ کی تعیناتی سے پہلے جولائی 1899ء سے فروری 1899ء تک جے جی ایم رینی (Rennie) ملتان کے ڈویژنل جج تھے خان بہادر خان کے تبادلہ کے بعد اگست 1902ء کو خان بہادر مولوی انعام علی ڈویژنل جج ملتان کے طور پر تعینات ہوئے ان کے ساتھ رائے بہادر بوٹا مل ایڈیشنل ڈویژنل جج ملتان بھی فرائض سرانجام دیتے رہے جون 1903ء میں ڈبلیو اے ہیرس (Harris) ڈویژنل جج ملتان کے عہدہ پر تعینات ہوئے جو جون 1906ء تک متواتر ملتان کے ڈویژنل جج رہے۔ ان کے جانشین جے ڈکسن بطور ڈویژنل جج ملتان تعینات ہوئے۔ ڈبلیو اے ہیرس (Harris) ڈویژنل جج ملتان نے مورخہ 11-04-1906 کو ایک فیصلہ وکلاء کے بارے میں صادر کیا جس کی دھوم پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ اس فیصلہ میں انہوں نے قرار دیا کہ شخص قانون پیشہ مقدمہ کی کامیابی پر اپنی فیس مشروط نہیں کر سکتا اس فیصلہ کی اپیل دیوانی نمبر 1021 پنجاب چیف کورٹ کے نو جج صاحبان کے روبرو سماعت کے لیے پیش ہوئی۔ اس مسئلہ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی فل کورٹ

نے اس طرح پہلی مرتبہ کی تھی۔ اکثریتی فیصلہ پر سات جج صاحبان کی تائید تھی جنہوں نے قرار دیا کہ ایسے اقرار ہائے مابین اشخاص قانون پیشہ وموکلان جس کی رو سے شخص قانون پیشہ کا محنتانہ کسی مقدمہ کے فیصلہ کے نتیجہ پر موقوف ہو، خلاف قانون ہے کیونکہ ایسا مصلحت عامہ کے خلاف ہوتا ہے چنانچہ اگر اشخاص قانون پیشہ ایسے قرار ہائے موکلوں سے کریں تو وہ بداطواری کے مرتکب ہوں گے ایسی صورت میں عدالت کارروائی کر کے تادیبی سزا دے سکتی ہے۔ پنجاب چیف کورٹ کے دو جج صاحبان جسٹس لال چند اور جسٹس چیٹر جی نے سات ججوں کے اس فیصلہ پر مختلف رائے دیتے ہوئے قرار دیا کہ شخص قانون پیشہ کا فیصلہ کے بعد محنتانہ وصول کرنے کا فعل خلاف مصلحت عامہ نہیں ہے اور نہ ہی غیر واجب ہے البتہ انگلش بار کے ممبران پر ایسی پابندی لاگو ہو سکتی ہے جبکہ بروئے ایکٹ اشخاص قانون پیشہ سال 1879ء کی رو سے ایسی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ جے ڈکسن (Dixon) کے بعد لالہ مولراج مارچ 1906ء میں ڈویژنل جج ملتان مقرر ہوئے۔ ان کے جانشین ایچ اے روز (Rose) جولائی 1907ء میں ڈویژنل جج ملتان تعینات ہوئے اور مارچ 1908ء تک ملتان کے ڈویژنل جج رہے۔ ایچ اے روز (Rose) قبل ازیں بھی ملتان میں عدالتی فرائض سرانجام دیتے رہے تھے۔ مسٹر روز (Rose) کے جانشین مسٹر رو (Roe) ڈویژنل جج مقرر ہوئے جو قبل ازیں ملتان کے مہتمم سیٹلمنٹ یعنی افسر بندوبست کے طور پر تعینات رہے تھے اور ان کے زیر نگرانی ملتان کا پہلے پختہ بندوبست اراضی ہوا تھا وہ بعد ازاں ڈپٹی کمشنر ملتان کے طور پر بھی تعینات ہوئے تو ان دنوں ان کا کمشنر ملتان سے تنازعہ ہو گیا۔ یہ شروع دن سے مسلمانوں کے حامی افسر شمار ہوتے تھے کمشنر ملتان نے ایک آریا سماجی وکیل کی فسادی درخواست پر شہر میں جھٹکے کے گوشت کی دکانیں کھلوانے کا اجازت نامہ دے دیا جس پر ملتان کے مسلمانوں میں سخت کہرام مچ گیا اور انہوں نے ڈپٹی کمشنر رو (Roe) کو سخت شکایت کی جس پر ڈپٹی کمشنر رو (Roe) نے مسلمان قصابوں کو چوک بازار میں بڑے گوشت کی دکانیں کھولنے کی اجازت دے دی جس پر شہر میں فساد برپا ہو گیا لیکن ڈپٹی کمشنر نے اس پر قابو پا لیا۔ آخر کار راضی نامہ کی صورت میں جھٹکے کی دکانوں کے کھولنے کا حکم بھی واپس ہوا اور چوک بازار میں بڑے گوشت کی دکانوں کے کھولنے کا حکم بھی واپس لے لیا گیا لیکن ڈپٹی کمشنر کے اس اقدام کو مرکزی حکومت نے پسند نہ کیا جس پر مسٹر رو (Roe) دو مرتبہ تعینات رہے۔ جن دنوں مسٹر رو (Roe) ملتان میں تعینات تھے ان کے ساتھ ٹی پی ایلس (Ellis) ایڈیشنل ڈویژنل جج تھے جو قانون کی کئی کتابوں کے مصنف تھے بعد ازاں مسٹر رو (Roe) صاحب ترقی کر کے جج ہائی کورٹ ہوئے اور آخر کار چیف کورٹ پنجاب کے چیف جسٹس بنائے گئے۔ ٹی پی پلس (Ellis) بھی بعد ازاں جج ہائیکورٹ بنے۔

سال 1909ء میں کچھ دنوں کے لیے ایچ ایچ برڈ (Bird) بھی ڈویژنل جج کے طور پر تعینات رہے۔ 1909ء میں رو (Roe) صاحب پانچ مہینوں کے لیے دوبارہ ڈویژنل سیشن جج کے طور پر ملتان میں فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ان کے بعد ایس ایس ہیرس (Harris) اکتوبر سال 1909ء میں دوسری مرتبہ ملتان کے ڈویژنل جج کے طور پر خدمات سرانجام دینے کے لیے تشریف فرما ہوئے ڈویژنل ججوں کے بعض سالوں میں جج بھی مقرر کے

جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے فہرست ڈویژنل جج صاحبان مرتب کرتے ہوئے (Confusion) پیدا ہوا۔ اور یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ملتان میں ایک سال کے دوران کتنے ڈویژنل جج مقرر ہوئے تھے اور ایک ڈویژنل جج کتنے عرصہ ملتان میں تعینات رہا ایسے ہی حالات میں ڈویژنل جج بلڈ (Blood) کا ذکر دو تین مرتبہ فہرست ڈویژنل ججوں میں آتا ہے اور اس دوران میں اور جج صاحبان کا ذکر بھی آتا ہے جس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ پہلے کون ڈویژنل جج مقرر ہوا تھا بعد میں کون آیا اور کون سے ڈویژنل جج کے بنچ کے طور پر ملتان میں خدمات سرانجام دے رہے تھے یہ کنفیوژن 1919ء چلا گیا تا آنکہ ڈویژنل جج کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کا عہدہ اضلاع میں ضلع کی عدلیہ کا سب سے بڑا عہدہ قرار پایا۔ برڈ (Bird) کے بعد مسٹر ایف بی سپنسر (Spencer) ڈویژنل جج ملتان مقرر ہوئے جن کے جانشین 1911ء میں اے ایچ پارکر (Parker) ڈویژنل جج ملتان مقرر ہوئے اس زمانے میں ڈسٹرکٹ جج (آج کل سینئر سول جج کا عہدہ) پر مرزا ظفر علی تعینات تھے اور ایڈیشنل ڈویژنل جج کے عہدہ پر ایچ سکاٹ سمتھ فائز تھے۔

ظفر علی بعد ازاں ترقی کرتے کرتے ہائی کورٹ کے جج بن گئے۔ 1912ء میں سی ایل ڈینڈاس (Dundas) ڈویژنل جج ملتان تھے ان کے ساتھ ایف بی آر سپنسر (Spencer) ایڈیشنل ڈویژنل جج تھے جن کے پاس مظفر گڑھ کا سیشن ڈویژن بھی تھا ان کے دور میں ڈسٹرکٹ جج ملتان کے عہدہ پر ایچ ایف فاربس (Forbse) ڈسٹرکٹ جج ملتان کے طور پر تعینات تھے۔ ملتان کے آخری ڈویژنل جج مسٹر ایس ولبر فورس (Wilberforce) تھے جن کے بعد پنجاب کورٹس ایکٹ 1914ء کے نفاذ کی وجہ سے ڈویژنل جج کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور اضلاع میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ کو عدلیہ کا بڑا عہدہ قرار دیا گیا اور ڈویژنل جج کے تمام اختیارات ڈسٹرکٹ جج کے سپرد کر دیئے گئے اور سابقہ عہدہ ڈسٹرکٹ جج کے اختیارات سینئر سول جج کو سونپ دیئے گئے پنجاب کورٹس ایکٹ 1914ء کے نفاذ کے بعد پہلا ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لالہ دامودر داس تھے جو فروری 1914ء میں بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان فرائض سرانجام دے رہے تھے وہ ایک سال سے کم عرصہ اس عہدہ پر فائز رہنے کے بعد ملتان سے کسی دیگر ضلع میں چلے گئے اور ان کے جانشین خان صاحب شیخ امیر علی 28-05-1915 کو ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تعینات ہوئے شیخ امیر علی قبل ازیں انتظامی سروس میں ملازمت کرتے تھے اور ملتان کے پہلے مسلمان ڈپٹی کمشنر اور پہلے مسلمان کمشنر کے طور پر خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ یہ شیخ قانونگو تھے اور ملتان کے ایک معروف وکیل بیرسٹر شیخ عبدالرزاق مرحوم کے رشتہ دار تھے اور بقول ان کے قصور کے رہنے والے تھے جن دنوں شیخ امیر علی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تھے ان کے ساتھ جے اے راس (Ross) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے طور خدمات سرانجام دیتے رہے ان کے پاس ڈیرہ غازی خان کا سیشن ڈویژن بھی تھا۔ شیخ امیر علی پہلے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تھے۔ جنہوں نے موجودہ سیشن جج کی عمارت میں اس کی تعمیر کے بعد عدالت لگائی۔

28-03-1913 کو مسٹر جے کولڈ ہٹریم (Coldsteam) ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے طور پر

خدمات سرانجام دے رہے تھے ان کے دور میں مرزا انور علی سول جج ملتان کے طور خدمات سرانجام دے رہے تھے جے کولڈ سٹریم نے تین سال کے قریب ملتان میں عدالتی خدمات سرانجام دیں اور وہ لوگوں میں مقبول ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج سمجھے جاتے تھے ان کے دور میں لالہ ہری چند سینئر سول جج ملتان تھے۔ اس دور میں مظفر گڑھ کا سیشن جج ڈویژنل بھی ملتان کے ساتھ ملحق تھا۔ اور وہاں لالہ اچھرو رام بطور سول جج ملتان بمقام مظفر گڑھ خدمات سرانجام دے رہے تھے لالہ اچھرو رام بعد ازاں ترقی کرتے کرتے ہائیکورٹ کے جج بن گئے مسٹر کولڈ سٹریم کے جانشین ڈی جانسٹن (Johnston) 1922ء میں سیشن جج ملتان مقرر ہوئے ان کے دور میں سونی گنگا رام سینئر سول جج کے عہدہ پر فائز تھے جو متعصب آریا سماجی ہونے کی وجہ سے اچھی نگاہ سے نہ دیکھے جاتے تھے۔

اپریل 1924ء میں ایف آر اینڈرسن ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تعینات ہوئے ان کے ماتحت لالہ دیوی دیال سینئر سول جج اور شیخ لائق علی بطور جج سمال کاز کورٹ ملتان میں تعینات تھے شیخ لائق علی کی عدالت ملتان میں چھاؤنی میں ہوتی تھی 1924ء میں ای آر اینڈرسن ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان مقرر ہوئے اس زمانہ میں لیفٹیننٹ کرنل ایف سی نکولاز (Nicolas) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے عہدہ پر فائز تھے جن دنوں مسٹر اینڈرسن ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تعینات تھے ملک احمد یار سینئر سول جج ملتان کے عہدہ پر فرائض سرانجام دے رہے تھے ان کے جانشین دیوی ودیا دھاون (Devi Vidya Dhawan) بطور سینئر سول جج تعینات ہوئے۔ مسٹر اینڈرس 1927ء سے سال 1935ء تک بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تعینات رہے ان کا ریکارڈ پوری تحقیق کے باوجود نہیں مل سکا جس کی وجہ سے اس نو سال کے عرصہ کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج صاحبان کے نام نہیں مل سکے۔ ان نو سالوں کے سیشن جج صاحبان کے کچھ بے ترتیب نام کاغذات سے ملے ہیں جن کو درج کیا جا رہا ہے۔ آئی سی لال، احمد خان، ای آر اینڈرسن، براڈ بنٹ، پرشوتم لال، چھکن لال، لیکن تاریخ ہائے تعیناتی کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ 1936ء میں سردار دیجا سنگھ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تعینات ہوئے وہ ملتان کی تاریخ کے پانچویں سکھ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تھے ان کے جانشین مرزا عبدالرب صاحب سال 1938ء میں ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مقرر ہوئے مرزا عبد الرب پکے مسلمان اور اعلیٰ کردار کے جوڈیشل آفیسر تھے وہ ملتان میں قبل ازیں سینئر سول جج بھی رہ چکے تھے۔ ان کے فرزند غلام مجدد مرزا بعد میں ہائیکورٹ کے معروف وکیل ہوئے صدر لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن بھی رہے ہائیکورٹ کے جج بھی ہوئے اور چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ کے عہدہ پر بھی فائز رہے اور بعد میں وفاقی محتسب بھی رہے یہ بھی اپنے والد کی طرح بے حد مقبول شخصیت تھے مرزا عبدالرب کے جانشین عطاء اللہ قریشی بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان سال 1941ء سے 1943ء تک رہے آخری انگریز ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج پی آر بی مئے (P.R.B.May) تھے جو پاکستان بننے تک ملتان میں تعینات رہے ان کے جانشین جناب فیروز الدین قریشی بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان مقرر ہوئے جو سال 1949ء تک اس عہدہ جلیلہ پر تعینات رہے ان کے جانشین مسٹر نذیر احمد محمود جون 1949ء میں بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تعینات ہوئے۔ وہ اپنی شرافت سادگی اور اعلیٰ مزاج

کی وجہ سے آج تک یاد کیے جاتے ہیں۔ بعد ازاں وہ جج ہائیکورٹ کے منصب جلیلہ پر فائز رہے اور اغلباً 1960ء تک ہائیکورٹ میں خدمات سرانجام دیتے رہے ان کے جانشین مسٹر اے لزارس (A.Lazarus) ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان قرر ہوئے جو پاکستان کرسچن تھے پاکستان بننے کے بعد سے لے کر آج تک مسٹر لزارس اکلوتے عیسائی سیشن جج ہیں اس کے بعد تاحال عیسائی سیشن جج ملتان میں تعینات نہیں ہوا صرف درمیان میں مسٹر جیکب آئزک (Jacob Issac) دو سال کے لیے ملتان میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تعینات رہے۔ مسٹر لزراس کے جانشین اے ناصر جون 1952ء سے جنوری 1954ء تک ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے عہدہ پر تعینات رہے ان کے جانشین چوہدری اعظم علی تھے جو دسمبر 1956ء تک ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج رہے اور ملتان ہی سے ریٹائر ہو گئے بعد ازاں جب سال 1957ء میں، میں نے پریکٹس شروع کی تو انہوں نے معاہدہ کی بنیاد پر دوبارہ ملازمت اختیار کی اور ملتان میں وہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر کام کرتے رہے وہ عدالت میں مذہبی بحث مباحثہ کرنے سے نہ چوکتے تھے لیکن ان کی عدالت کا ماحول خوشگوار ہوتا تھا وہ ہماری بار میں مقبول تھے چوہدری اعظم علی کے جانشین شیخ عطاء اللہ قریشی دسمبر 1956ء میں ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مقرر ہوئے وہ ملتان میں تیسرے قریشی تھے جو کہ اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے مئی 1958ء میں جب شیخ عطاء اللہ قریشی تبدیل ہوئے تو ان کے جانشین شیخ عبدالحمید ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان مقرر ہوئے جن سے ملتان کے لوگ کافی مانوس تھے انہوں نے اپنی ملازمت کی ابتداء بطور سول جج ملتان سے ہی کی تھی اور بعد ازاں وہ سینئر سول جج ملتان بھی رہے اور ملتان کے تمام وکلاء سے ان کے معاشرتی تعلقات تھے بطور جوڈیشل آفیسر بدمزاجی کے باوجود اعلیٰ درجہ کی شہرت رکھتے تھے اور آخر کار ملتان سے ہی ریٹائر ہو گئے ان کے جانشین مشتاق منیر نے مارچ 1961ء میں ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر چارج سنبھالا وہ وکلاء میں جوڈیشل سروس میں نامزد ہوئے تھے بعد ازاں وہ ملتان سے جانے کے بعد کئی سال لاہور کے جج کے طور پر تعینات رہے ان کے بعد چوہدری محمد شفقت چند ماہ کے لیے ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مقرر ہوئے۔ ان کے خاندان کے ملتان اور بہاولپور والوں کے ساتھ مذہبی تعلقات تھے۔ ان کے والد چوہدری نبی احمد ملتان میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے تھے۔ نیز صاحبزادہ نصرت علی خان ایڈووکیٹ کے برادر نسبتی اور صاحبزادہ فاروق علی خان ایڈووکیٹ اور صاحبزادہ محبوب علی خان ایڈووکیٹ کے حقیقی ماموں تھے چوہدری محمد شفقت کے جانے کے بعد حاجی محمد سرفراز خان ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان مقرر ہوئے جو ہماری جوڈیشری کے نامور ستارے تھے وہ اکتوبر 1963ء تا جون 1966ء ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج رہے۔ حاجی سرفراز خان نے ضمانت قبل از گرفتاری کا پہلی مرتبہ دروازہ کھولا۔ نیز جلسہ جلوسوں میں جہاں طلباء اور دوسرے سینکڑوں کی تعداد میں گرفتار ہو کر جیلوں میں چلے جاتے تھے ان کی ضمانتیں ذاتی مچلکہ پر خود جیل میں جا کر لینے کا رواج بھی انہوں نے ڈالا وہ صحیح معنوں میں خاکسار تھے۔ ان کے زمانے میں پورے ملتان کا عدالتی نظام اسلامی رنگ میں رنگا گیا۔ 1965ء کی جنگ کے دنوں میں وہ ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تھے۔ انہوں نے اس جنگ کی وجہ سے بدحال لوگوں کی بحالی

اور امداد کے سلسلہ میں ملتان میں زبردست تحریک چلائی اور کثیر تعداد سامان ٹرکوں میں لے کر ملتان کے وکلاء کے ساتھ لے کر جنگ سے تباہ حال علاقہ میں خود تشریف لے گئے اور اپنی نگرانی میں جنگ سے نقصان زدہ علاقے کے لوگوں میں امدادی سامان تقسیم کیا حاجی سرفراز سیشن جج ملتان کے بارے میں یہی خیال تھا کہ وہ شاید جج ہائی کورٹ بن جائیں لیکن وہ خاکسار تحریک سے سیاسی وابستگی رکھتے تھے اور دلیرانہ فیصلے کرتے تھے اس لیے جج ہائیکورٹ نہ بن سکے جس کا سب کو بہت افسوس ہوا حاجی سرفراز خان کے جانشین شیخ مظہر الحق جون 1966ء میں ملتان کے سیشن جج مقرر ہوئے۔ وہ جسٹس سردار محمد اقبال کے ساتھ بطور وکیل کام کرتے تھے۔ جہاں سے وہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ پر نامزد ہو گئے وہ بے حد نفیس طبع اور فنو لطیفہ کے دلدادہ شخص تھے فوجداری مقدمات میں سخت تھے لیکن ان کی فوجداری مقدمات کی مہارت قابل تعریف تھی شیخ مظہر الحق بعد ازاں جج ہائیکورٹ مقرر ہوئے اور ملتان سے اپنے تعلق کی وجہ سے ملتان والوں سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے۔ شیخ مظہر الحق کے جانشین سردار عبدالغفور خان لودھی جون 1968ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان مقرر ہو کر آئے وہ ایک جید انصاف پرور قانون جاننے والے عادل افسر تھے۔ بہاولپور کے محلے عام خاص کے معروف لودھی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے خاندان کے بزرگ ریاست بہاولپور کی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز چلے آ رہے تھے انہوں نے ایم اے ایل ایل بی علی گڑھ سے کی اور پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پہلے بہاولپور میں بطور منصف تعینات ہوئے۔ ون یونٹ بننے پر مغربی پاکستان جوڈیشل سروس کے رکن بن گئے اور 1959ء تک ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج رہے انہوں نے بطور سیشن جج بہت سارے اہم مقدمات کے فیصلے کئے شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف جو فوجی ٹریبونل بنا تھا اس میں وہ بطور سول ممبر شامل تھے اور انہوں نے اس مقدمہ کی میانوالی جیل میں سماعت کی تھی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدہ سے ترقی کر کے بعد ازاں وہ جج ہائیکورٹ بن گئے اور ریٹائر ہونے کے بعد لیبر ٹریبونل کی کورٹ آف اپیل کے طور پر اعلیٰ خدمات سرانجام دیتے رہے ان کے جانشین ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان میاں محمد قریشی تھے۔ جو ہمارے ملتان کے قدیم قریشی خاندان کے رکن تھے جس خاندان کے کئی افراد بہاولپور میں بہت سالوں سے ملازمت کے سلسلہ میں آباد ہیں میاں محمد قریشی بھی بہاولپور جوڈیشل سروس کے رکن تھے۔ نہایت سادہ طبیعت کے شریف، بردبار شخص تھے۔ سائیکل پر کچہری آتے تھے اور بہت سی نیکیوں سے متصف تھے۔ وہ اگست 1972ء میں سات ماہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج رہنے کے بعد تشریف لے گئے ہماری بار کے سابقہ صدر مظہر جمیل قریشی ان کے داماد ہیں میاں محمد قریشی کے جانشین چوہدری بشیر احمد ڈسٹرکٹ جج ملتان تعینات ہوئے۔ اگست 1972ء میں تشریف لائے۔ وہ اس سے پہلے ملتان کے سینئر سول جج بھی رہ چکے تھے ان کا ملتان میں عرصہ تعیناتی ایک سال سے کم تھا ان کے جانشین شیخ عبدالوحید جون 1973ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے عہدہ پر فائز ہوئے وہ اعلیٰ پایہ کے جوڈیشل آفیسر تھے شیخ عبدالوحید جونیئر وکلاء کی بے حد سرپرستی کرتے تھے اپنا کام وقت سے پہلے ختم کر دیتے تھے اور اہل ملتان ان کو پسند کرتے تھے شیخ عبدالوحید صاحب بعد ازاں حکومت پنجاب کے لاء سیکرٹری مقرر ہوئے اور جج ہائیکورٹ بن گئے اور انہوں نے طویل عرصہ

لاہور ہائیکورٹ ملتان بنچ میں خدمات سرانجام دیں ملتان بنچ میں بھی وہ جونیئر وکلاء کی بے حد سرپرستی کیا کرتے تھے جن دنوں شیخ عبدالوحید جاپان ٹریننگ کے سلسلہ میں تشریف لے گئے تو اس دوران قائم مقام سیشن جج کے طور پر میاں غلام احمد صاحب سیشن جج ملتان تعینات ہوئے وہ قبل ازیں اپنی ابتدائی سروس کے دوران ملتان میں سول جج کے طور پر تعینات رہ چکے تھے بعد ازاں وہ جج ہائیکورٹ بن گئے شیخ عبدالوحید کے بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج جانشین اکتوبر 1976ء میں چوہدری محمد شریف تعینات ہوئے جو قبل ازیں ملتان میں سینئر سول جج کے عہدہ پر فائز رہ چکے تھے۔ چوہدری محمد شریف احمد پور شرقیہ کے نزدیک ایک چک کے رہنے والے تھے بے حد خاموش شخصیت کے مالک تھے عدالت میں کم بولتے تھے اور عدالت میں سخت ڈسپلن کے قائل تھے بعد ازاں چوہدری محمد شریف صاحب جج ہائیکورٹ کے عہدہ جلیلہ پر ترقی کر گئے اور ملتان بنچ پر انہوں نے کافی عرصہ خدمات سرانجام دیں ریٹائر ہونے کے بعد وہ عدلیہ کے کئی اور اعلیٰ عہدوں پر فرائض سرانجام دیتے رہے آج کل ریٹائر ہونے کے بعد بہاولپور میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ چوہدری محمد شریف کے جانشین نواب اوصاف علی خان اپریل 1977ء میں بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تعینات ہوئے یہ بھی قبل ازیں سینئر سول جج ملتان کے عہدہ پر تعینات رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے حقوق العباد کے موضوع پر اپنی معرکتہ آراء تصنیف طبع کرائی۔ بعد ازاں وہ جج ہائیکورٹ ہو گئے اور کچھ عرصہ ملتان بنچ پر بھی انہوں نے خدمات سرانجام دیں نواب اوصاف علی شجاع آباد کے رہنے والے تھے اور رشتہ داریوں کی وجہ سے ملتان ڈویژن کے بہت سارے خاندانوں سے ان کے معاشرتی تعلقات تھے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ عرصہ پنجاب پبلک سروس کمشن کے ممبر بھی رہے۔ اوصاف علی خان کے جانشین مسٹر صلاح الدین ظفر اکتوبر 1979ء میں ملتان میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر تعینات ہوئے وہ سیدھے سادے روایتی پنجابی کردار کے مالک تھے جن کی عدالت کا ماحول بے حد گھریلو ہوتا تھا۔ جناب صلاح الدین ظفر بعد ازاں ملتان میں بینکنگ جج بھی رہے۔ ان کے جانشین چوہدری محمد نسیم مقرر ہوئے۔ جو بہاولنگر کے ایک معروف وکیل کے بیٹے تھے اور ان کے دو بھائی ساہیوال اور وہاڑی میں فوجداری کے معروف وکیل تھے اور ان کا ایک بھائی لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس بھی کرتا تھا۔ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان بننے سے پہلے وہ ملتان میں کچھ عرصہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج بھی رہ چکے تھے۔ بعد ازاں وہ جج ہائیکورٹ کے عہدہ پر بھی ترقی کر کے تعینات ہوئے۔ اور ملتان بنچ لاہور ہائیکورٹ پر کافی عرصہ خدمات سرانجام دیں۔ ان کے جانشین جون 1982ء میں ملک محمد امیر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے طور پر تعینات ہوئے وہ ایک اعلیٰ درجہ کے جوڈیشل افسر تھے۔ ملک محمد امیر بعد ازاں جج لاہور ہائیکورٹ مقرر ہو گئے۔ ان کی قانونی قابلیت مسلمہ تھی۔ وہ مقدمات کے بارے میں صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور بڑے سے بڑا فیصلہ منٹوں میں عدالت میں لکھوا دیتے تھے۔ مارچ 1985ء میں ملک محمد امیر کے جانے کے بعد غلام سرور شیخ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے طور پر تعینات ہوئے۔ یہ اس سے پہلے ملتان بنچ لاہور ہائیکورٹ میں ایڈیشنل رجسٹرار کے عہدہ پر تعینات رہ چکے تھے۔ وہ ملتان بنچ کے ابتدائی دنوں میں انتظامی مشکلات پر قابو پانے میں کارہائے نمایاں سرانجام دے چکے تھے۔ یہ تقریباً سال کے

قریب جج ہائیکورٹ کے عہدہ جلیلہ پر بھی فائز رہے۔ ان کے جانشین خضر حیات خان ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مئی 1990ء میں تعینات ہوئے۔ یہ ایک سادے سادھے قانون جاننے والے مرنجان مرنج شخص تھے اور ان کی نیکی کی شہرت کی وجہ سے ان کی بے حد تعریف کی جاتی تھی۔ مئی 1992ء میں راجہ محمد خورشید ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے طور پر خضر حیات خان کے جانشین مقرر ہو کر ملتان تشریف لائے۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور عاشق رسولؐ تھے۔ ان کے ملتان والوں کے ساتھ گہرے انسانی تعلقات تھے۔ انہوں نے ملتان میں تقریب 1/2-1 سال خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں وہ بھی جج ہائیکورٹ کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے جہاں اچھی خدمات سرانجام دے کر وہ ریٹائر ہوئے۔ اکتوبر 1993ء میں ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج میاں محمد جہانگیر تعینات ہو کر تشریف لائے انہوں نے گیارہ ماہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان خدمات سرانجام دیں بعد ازاں وہ سال 2001ء میں جج ہائیکورٹ کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے اختر محمود خان ریاست بہاولپور کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی ملازمت کی ابتداء بطور پبلک پراسیکیوٹر شروع کی۔ ملتان ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ساتھ ان کے قدیمی تعلقات تھے۔ بار ایسوسی ایشن کی کرکٹ ٹیم جب بھی کسی ٹورنامنٹ میں شریک ہونے کے لیے جاتی تو اختر محمود خان اعزازی رکن کے طور پر شامل ہوتے تھے اور ملتان ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کی طرف سے کھیلتے تھے۔ یہ پہلے پہل ملتان میں بطور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تعینات ہوئے بعد ازاں ستمبر 1994ء میں یہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے عہدہ پر فائز ہوئے اور گیارہ ماہ اس عہدہ پر فائز رہ کر ملتان ہی سے ریٹائر ہو گئے ریٹائر ہونے سے پہلے ان کی ڈپٹی کمشنر ملتان کی ناجائز حمایت بار ایسوسی ایسن سے تنازعہ کا باعث ہوئی اور بار ایسوسی ایشن ان کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئی۔ آج کل وہ ملتان ہائیکورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے تعیناتی کے عرصہ میں بعض اہم فیصلے کئے ان کے جانشین شیخ اظہر حفیظ صاحب نو ماہ کے لیے بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان تعینات رہے۔ یہ وکلاء کے کوٹہ سے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج تعینات ہوئے تھے اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان کے عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان بھی تعینات رہ چکے تھے۔ ان کے جانشین یار محمد نظامی اگست 1997ء سے لے کر ستمبر 1999ء تک ملتان کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج رہے۔ وہ ایک نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی کو ہر موضوع پر نظامی صاحب جیسا انگریزی میں فصیح اور پرجوش تقریر کرنے والا شخص نہیں دیکھا۔ فوجداری اور دیوانی قوانین پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کے جانشین عبدالغفار خان ایک درویش خصلت انسان تھے ستمبر 1999ء تا فروری 2000ء ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ملتان رہے وہ مرنجان مرنج ملنسار نیک سیرت انسان تھے۔ ان کے جانشین موجودہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج اشرف بھٹی صاحب ہیں جن کے بار ایسوسی ایشن کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں اور امید ہے کہ ان کا دور بھی قابل تعریف ہو گا۔

(ملتان بار ایسوسی ایشن کے سو سال۔ عمر کمال خان ایڈووکیٹ)



عمر کمال خان ایڈووکیٹ

ملتان ڈویژن کے کمشنروں کے سو سال

سال 1901ء سے 2001ء تک

ملتان ڈویژن کا قیام برطانوی عملداری میں صوبہ پنجاب کی شمولیت کے بعد عمل میں آیا۔ اس سے پہلے سکھ دور حکومت تک ملتان اپنی جغرافیائی سیاسی اہمیت اور انتظامی ضرورتوں کے تابع ہمیشہ صوبہ کا صدر مقام چلا آ رہا تھا۔ سکھ دور میں آخری گورنر دیوان ساون مل اور بعد ازاں اس کا بیٹا دیوان مول راج تھے۔ سکھوں کی حکومت میں یہ صوبہ تمام جنوبی پنجاب پر مشتمل تھا۔

انگریزوں نے ملتان کو 1849ء میں فتح کیا اور مکمل طور پر ملتان اور پنجاب کو اپنی عملداری میں شامل کر کے پہلے ملتان اور پنجاب کے انتظام کے لیے ایک بورڈ قائم کر دیا۔ جس میں سکھ دور حکومت کے نیک نام اہلکاروں اور چند انگریزوں کو شامل کیا گیا اور اس بورڈ کے صدر کو چیف کمشنر کا خطاب دے کر اس عہدہ پر ہنری لارنس کو تعینات کر دیا جو اپنی اعلیٰ انتظامی قابلیت کی وجہ سے کافی معروف انگریز تھا۔ جس نے صوبہ پنجاب کے انتظام کے لیے 56 قابل افسروں کا برصغیر کی برطانوی انتظامیہ سے انتخاب کیا۔ نیز ہنری لارنس نے پنجاب کو ستائیس اضلاع میں تقسیم کر کے سات قسموں (کمشنریوں) میں بانٹ کر ان میں کمشنروں کو تعینات کر دیا۔ کمشنر کے چناؤ کے سلسلہ میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ کمشنر کے عہدہ پر ایسے آفیسر کو تعینات کیا جائے جو اپنے ماتحت اضلاع کے افسروں کا سربراہ بننے کی صلاحت رکھتا ہو۔ اعلیٰ سوجھ بوجھ کا مالک ہو۔ امپریل مفادات کی نگرانی کر سکے اور چیف کمشنر کے احکامات بجا لائے اور اس کا معتمد ہو۔ کمشنروں کے اختیار میں ڈپٹی کمشنر یعنی کلکٹر ضلع کے احکامات کی خلاف اپیلوں کی سماعت کا بھی فرض تھا۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے اس قسم کے عہدے کا وجود نہ تھا۔ کمشنر چیف کمشنر کی صوابدید پر مقرر کئے جاتے تھے اور چیف کمشنر پنجاب کے نائب سمجھے جاتے تھے۔

انگریزوں نے ابتدائی دنوں میں محکمہ مال کے انتظام کے لیے جو قانون سازی کی وہ فی الحقیقت صوبہ جات متحدہ آگرہ اودھ کے قانون مالگزاری کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی اور کچھ افسران محکمہ مال کو اس صوبہ سے پنجاب میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاکہ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ صوبہ جات متحدہ آگرہ اودھ سے جو افسران پنجاب

آئے انہوں نے پنجاب کے انتظام کو اعلیٰ پیمانے پر لے جانے میں کافی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

سال 1887ء میں پنجاب ایکٹ مالگواری کے ذریعہ گزشتہ چالیس سال کی مالگزاری کے بارے میں تمام قانون سازی کو مربوط کر دیا گیا۔ اس قانون کو بعد ازاں ترامیم کے ذریعے بہتر بنا کر سال 1967ء میں مغربی پاکستان ایکٹ مالگواری کی صورت میں پاکستان کے موجودہ چاروں صوبے اور شمالی علاقہ جات میں نافذ کر دیا گیا۔ اس قانون کی دفعہ 8 کی رو سے ہر قسمت یا کمشنری یا ڈویژن کے سربراہ کو کمشنر قرار دیا گیا۔ جس کے ماتحت ڈسٹرکٹ کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر، ایڈیشنل کمشنر یا ایڈیشنل کلکٹر اور اسسٹنٹ کلکٹر کے عہدہ دار تعینات کئے گئے اور اس طرح سے مالگواری کے لیے اور صوبہ کے اعلیٰ انتظام کے لیئے عہدوں کا ایک جال بنا دیا گیا۔ اس پورے نظام کا ڈویژن میں سربراہ کمشنر کو مقرر کیا گیا۔ کمشنر کو اپنے ڈویژن میں تقسیم کار کا اختیار سونپا گیا۔ نیز اسے اپنے ڈویژن میں مال کی تمام عدالتوں اور افسروں کا کنٹرول بھی سونپ دیا گیا۔ اس طرح کمشنر اپنے ڈویژن کے مال کے نظام کا سربراہ اعلیٰ قرار دیا گیا۔

انگریزوں کی سلطنت کے قیام کے موقع پر ملتان کا ابتدائی ڈویژن ضلع ملتان، ضلع جھنگ، ضلع گوگیرہ یعنی ساہیوال کے اضلاع پر مشتمل تھا۔ بعد ازاں اس ڈویژن کی حدود میں اضلاع لیہ، مظفرگڑھ اور ڈیرہ غازی خان کو شامل کر کے اس ڈویژن کا رقبہ ہزار مربع میل تعین کر دیا گیا جب سال 1957ء میں میں نے ملتان میں وکالت کا آغاز کیا تو ملتان ڈویژن میں جھنگ اور فیصل آباد کے اضلاع بھی شامل تھے اور یہ پنجاب کا سب سے بڑا ڈویژن شمار ہوتا تھا اور چونکہ اس ڈویژن کی حدود ریاست بہاولپور، سندھ اور بلوچستان اور صوبہ سرحد کے ساتھ ملتی تھیں اس لیے اس ڈویژن پر ہمیشہ جید اور بے حد تجربہ کار آفیسر کو کمشنر کے طور پر مقرر کیا جاتا تھا۔

انگریزوں کی انتظامی مصلحتوں کے مطابق کمشنر ہمیشہ امپیریل گورنمنٹ یعنی مرکزی حکومت کے مفادات کی نگرانی کرتا تھا۔ جبکہ ڈپٹی کمشنر صوبائی حکومت کی پالیسیوں پر عملدرامد کرتا تھا اور لوگوں کے روزمرہ مسائل حل کرنے میں پیش پیش تھا۔ کمشنر کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے ماتحت تمام ڈپٹی کمشنروں اور دوسرے محکموں کے ضلعی سربراہوں کی کارکردگی کی نگرانی کرے اور ان کو اپنے حدود میں رکھے۔ ایک اعلیٰ عہدہ دار نے برطانوی دور میں کمشنر کے بارے میں یہ کہا کہ وہ مرغی کی طرح ہے جس کا کام اپنے چوزوں کو کنٹرول میں رکھنا اور ان کی پرورش اور نگرانی کرنا ہے۔ چیلوں اور دوسرے نقصان پہنچانے والے پرندوں اور جانوروں سے اپنے چوزوں کو بچانا ہے۔

برطانوی دور کی ابتداء میں ملتان میں جب سے نئے پہلے کمشنر کے تقرر کا سوال پیدا ہوا تو انگریز انتظامیہ میں ایک سنگین بحران پیدا ہو گیا۔ ملتان سکھ سلطنت کا ایک اہم صوبہ تھا جس کا آخری ناظم دیوان مول راج تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی میں اس کا باپ دیوان ساون مل صوبہ ملتان کا ناظم تھا۔ جس کا جانشین اس کا بیٹا ہوا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سلطنت میں ایشیاء کی سلطنتوں کی روایتی طوائف الملوکی کا آغاز ہوا۔ یکے بعد دیگرے سکھ حکمرانوں کو تخت سے محروم ہونا پڑا اور آخر کار نابالغ کنور دلیپ سنگھ حکمران بنا دیا گیا۔ سکھ فوج بے حد زور آور ہو گئی

سکھ وزراء نے سکھ فوج کے زور توڑنے کے لیے اسے انگریزوں سے لڑا دیا۔ جس کا نتیجہ سکھ فوج کی شکست کی صورت میں ہوا اور آخر کار ایک معاہدے کے ذریعے سکھوں کی حکومت کا انتظام ایک بورڈ آف گورنرز کے سپرد ہوا جس میں انگریز اور سکھوں کے نمائندے شامل تھے۔ اس بورڈ کا چیف کمشنر جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے ہنری لارنس کو مقرر کیا گیا۔ جس نے سکھوں کی حکومت کا انتظام بہتر بنانے کے لیے کچھ انگریزوں کو مختلف اضلاع میں تعینات کیا۔ ان میں ہربرٹ ایڈورڈ بھی شامل تھا۔ جسے بنوں کے ضلع کے انتظام کے لیے بھیجا گیا۔ ہربرٹ ایڈورڈ فوجی آفیسر تھا۔ زباندانی پر ملکہ حاصل کرنے کی وجہ سے اسے پولیٹیکل سروس میں لے لیا گیا۔ اس نے راجپوتانہ میں اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔ پولیٹیکل محکمہ کے ملازم کافی بے باک اور اپنے حلقہ اثر میں طاقتور ہوتے ہیں۔ دیگر انتظامی افسران ان کے بے پناہ اختیارات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور وہ باقاعدہ شروع سے بھرتی شدہ انتظامی افسروں میں پاپولر نہیں ہوتے تھے۔ جب ہربرٹ ایڈورڈ بنوں میں تعینات تھا تو ملتان کے انتظام کے لیے جو دو انگریز آفیسر بھیجے گئے وہ قتل کر دیئے گئے اور دیوان مول راج کو بہ امر مجبوری اس وقت کی حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کرنا پڑا۔ مرنے سے پہلے ملتان کے انگریز افسروں نے بنوں میں ہربرٹ ایڈورڈ کو جو کچھ ان پر بیتی تھی اس کی روئیداد لکھ کر بھیج دی۔ جس پر ہربرٹ ایڈورڈ نے سرحد کے لوگوں خصوصاً ملتانی پٹھانوں اور ریاست بہاولپور کی امداد سے ایک لشکر ترتیب دے کر انگریزی فوج کی سندھ اور بمبئی سے آمد سے پہلے دیوان مول راج کے علاقے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور بڑھتے بڑھتے لیہ، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ کے اضلاع پر قبضہ کر لیا اور آگے بڑھ کر ملتان کا محاصرہ کر لیا جو کئی مہینے جاری رہا اس ساری جدوجہد کے دوران ہربرٹ ایڈورڈ مختار کل تھا پورا جنوبی پنجاب کا نظم ونسق اس کے حکم پر چل رہا تھا اسی اثناء میں انگریزی فوج بمبئی اور ہندوستان کی طرف سے آ گئی اور انہوں نے طویل محاصرہ کے بعد ملتان کو فتح کر لیا اور دیوان مول راج نے ہتھیار ڈال دیئے اس دوران بھی تمام سول نظام کا انچارج ہربرٹ ایڈورڈ تھا۔ امن و امان قائم ہو گیا تو ہربرٹ ایڈورڈ کی خواہش تھی کہ اس کی حصول ملتان کے سلسلہ میں طویل اعلیٰ خدمات کے صلے میں اسے ملتان کا کمشنر مقرر کیا جائے اس کی کمشنر ملتان تقرری کا حکم نامہ چیف کمشنر پنجاب ہنری لارنس نے انگریز گورنر جنرل کو بھیجا اور پرزور سفارش کی لیکن گورنر جنرل کے دفتر کے انتظامی افسران نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ ہربرٹ ایڈورڈ اس سے پہلے کبھی کسی ضلع کا ڈپٹی کمشنر مقرر نہیں ہوا اس لیے اس کو ملتان کا پہلا کمشنر مقرر نہیں کیا جا سکتا اس دوران ہنری لارنس کی سرپرستی کی وجہ سے ہربرٹ ایڈورڈ پورے جنوبی پنجاب کا ناظم چلا آ رہا تھا ہنری لارنس نے اپنے اس پروردہ پولیٹیکل آفیسر کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ملتان کا کچھ عرصہ کے لیے ڈپٹی کمشنر بننا قبول کر لے تاکہ اس پر اعتراض رفع ہو جائے لیکن ہربرٹ ایڈورڈ کو اپنی اعلیٰ خدمات پر بے حد ناز تھا اس نے کہا کہ میں سرحد میں تو ڈپٹی کمشنر کے چھوٹے عہدہ یا پولیٹیکل آفیسر کا عہدہ قبول کر لوں گا لیکن صوبہ پنجاب میں کمشنر سے کم کسی عہدہ پر کام نہیں کروں گا چنانچہ اس کو کمشنر ملتان مقرر نہ کیا گیا اور وہ دلبرداشتہ ہو کر مارچ 1849ء میں ملتان چھوڑ کر سرحد چلا گیا۔ اور ملتان کا پہلا کمشنر ایم پی ایچ ایچ ورتھ کو مقرر کیا گیا جو شروع سے انتظامی سروس سے منسلک چلا آ رہا تھا اور انگریزوں کی

ہندوستانی سروس میں ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر فائز رہ چکا تھا۔

ایم پی ایج ایج ورتھ (M.P. Edge Worth) ایک روشن خیال شخص تھا وہ شروع دن سے سود خور بنیوں کا دل سے مخالف تھا اور اس کی ہمدردی ہمیشہ مقروض زمینداروں جن کی اکثریت مسلمان تھی کی طرف تھی۔ وہ ہمیشہ صوبائی اور مرکزی حکومت کی توجہ مقروض زمینداروں کی طرف دلاتا رہتا تھا وہ بانگ دہل کہتا تھا کہ انگریزی نظام عدل کے اور ضابطہ دیوانی کے نفاذ کے بعد ہندو بنیئے مقروض زمینداروں کے خلاف رقوم وصولی کی ڈگری حاصل کر کے ان مقروض زمینداروں کی زرعی جائیدادیں عدالتوں کے ذریعے نیلام کرا کے خود حاصل کر رہے ہیں جس کا نتیجہ آخر کار یہ ہوگا کہ وفادار زمیندار طبقہ جو ہر حکومت کا طرفدار ہوتا ہے ختم ہو جائے گا حکومتوں کے پشت پناہ اس طبقے کو سود خور بنیوں کے حرص و آز سے بچانا ہمارا فرض ہے اس کے اس بارے میں متواتر واویلے پر اثر ہوا کہ حکومت پنجاب کو زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ کی تخصیص کرنی پڑی اور سود خور بنیوں کو غیر زراعت پیشہ قرار دے کر ان کی زمینوں کی خریداری کے حق پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن تحریک کو کامیاب کرانے میں چالیس سال لگے اور اس دوران مسلمان زمینداروں کی ہزاروں ایکڑ اراضی ہندو بنیوں نے عدالتی کارروائی کے ذریعے ہتھیا لی۔ ایم پی ایج ایج ورتھ (Edge Worth) کمشنر ملتان پبلک لائبریری باغ لانگے خان کے پیشرو ادارہ ملتان بک سوسائٹی قائم شدہ 1850ء کا بانی رکن تھا۔

مارچ 1849ء سے لے کر دسمبر سال 1900ء تک ملتان میں تعینات ہونے والے کمشنروں میں سب سے زیادہ مشہور شخصیت کا مالک میجر ہملٹن ہوگزرے ہیں جب انگریزوں نے ملتان فتح کر لیا اور دیوان مول راج گرفتار ہو گیا تو انگریزوں نے اس پر بغاوت کا مقدمہ چلایا اس مقدمہ میں میجر ہملٹن کو اس کے زبانوں پر غیر معمولی عبور کی بنا پر دیوان مول راج کے دفاع کے لیے وکیل کے طور پر مقرر کیا گیا جہاں میجر ہملٹن نے فوجی ٹربیونل کے روبرو بے حد قابلیت سے دیوان مول راج کا دفاع کیا۔ دیوان مول راج بھی اپنے وکیل سے بے حد خوش تھا اس کے وکیل نے فوجی عدالت کے روبرو دیوان مول راج کا دفاع کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ ملٹری عدالت کے پاس مقدمہ کی سماعت کا اختیار نہیں ہے کیونکہ دیوان مول راج انگریزوں کا ملازم نہیں تھا نہ ہی انگریزوں کی رعایا کا فرد تھا نیز میجر ہملٹن نے فن جرح کے ہنر کا اعلیٰ مظاہرہ کرتے ہوئے گواہان استغاثہ جو دیوان مول راج کیخلاف پیش ہوئے کو محض بے حیثیت اشخاص اور پولیس اور انتظامیہ کے چٹے بٹے ثابت کر دیا لیکن چونکہ یہ سیاسی مقدمہ تھا انگریز دیسی لوگوں پر رعب بٹھانا چاہتے تھے اس لیے اس مقدمہ کا فیصلہ سیاسی بنیادوں پر ہوا اور انگریز تو بہرحال اپنے مقبوضات میں سیاسی طور پر ہمیشہ قبیح افعال کے مرتکب ہوتے رہے ہیں چنانچہ دیوان مول راج کے دفاعی وکیل کی تمام کے باوجود اس کے خلاف سزائے موت کا فیصلہ فوجی ٹربیونل نے صادر کر دیا جو سزا بعد ازاں دریائے عبور شور میں بدل دی گئی میجر ہملٹن کو اس مقدمہ کے اختتام پر سول سروس میں لے لیا گیا وہ سال 1853ء میں صرف تین ماہ کے لیے ڈپٹی کمشنر ملتان مقرر ہوا اور اس طرح وہ کمشنر کے عہدہ پر فائز ہونے کا حقدار بن گیا وہ سال 1855ء سے لے کر

1861ء تک ملتان کا کمشنر رہا۔ اس کے دور میں برصغیر پاک و ہند میں تحریک آزادی جسے انگریز غدر کہتے ہیں کا اہم واقع رونما ہوا چونکہ اعلیٰ انتظامی کارکردگی کا حامل شخص تھا اس نے جنگ آزادی کے اثرات کو ملتان میں پیدا ہونے نہ دیا اور جو کچھ تھوڑے سے ہندوستانی فوجی ملتان کی چھاؤنی میں تعینات تھے ان کو بغاوت سے پہلے اسلحہ سے محروم کر دیا اور ان میں سے جو چند بھاگ گئے ان کو تحصیل داروں کے ذریعے گرفتار کرا لیا اور اپنے تحت کمشنری میں بدامنی پھیلنے نہ دی۔

میجر ہملٹن عالم آدمی تھا وہ مشرقی ادب اور کلاسیک کے مطالعہ کا بے حد شوقین تھا اس کے ملتان کے لوگوں کے ساتھ گہرے مراسم تھے اور وہ انسانی معاشرت تعلقات قائم رکھنے کا بے حد دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے قیام ملتان کے دوران اپنی تنخواہ کا معتد بہ حصہ قلمی کتابوں کی خرید پر خرچ کیا اور ایک شاندار قلمی کتب کے ذخیرہ کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے مخدوم یوسف شاہ گردیزی کو ملتان کی تاریخ لکھنے کی ترغیب دی۔ جس پر مخدوم نے تذکرہ الملتان کے نام نامی سے سال 1860ء میں ایک مکمل اور مبسوط ملتان کی تاریخ فارسی زبان میں قلمبند کر کے میجر ہملٹن کے نام نامی معنون کی۔ یہ ملتان کی پہلی تاریخ ہے جسے چند سال پہلے سید عباس حسین گردیزی نے اردو ترجمہ کرا کے تاریخ ملتان کے نام سے شائع کر دیا ہے میجر ہملٹن کا یہ کارنامہ اہل ملتان کی طرف سے ہمیشہ باعث خراج تحسین رہے گا۔

انیسویں صدی میں ہملٹن صاحب کے بعد جنرل فان کورٹ لینڈ کمشنر ملتان کا نام نامی قابل ذکر ہے اس کا ذکر ڈپٹی کمشنر ملتان کے سلسلہ میں قبل ازیں ہو چکا ہے اس نے 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران بطور ڈپٹی کمشنر فیروز پور اور ماجھے کے علاقے میں بدامنی پھیلنے نہ دی اور فیروز پور جیسی اہم فوجی چھاؤنی میں امن و امان قائم رکھا۔ اس لیے جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اسے ترقی دے کر کمشنر ملتان کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ وہ 1868ء سے لے کر 1870ء تک تقریباً دو سال ملتان کا کمشنر رہا اور یہاں سے ہی وہ باعزت ریٹائر ہو کر یورپ چلا گیا۔ اس کی اعلیٰ خدمات کے صلے میں انگریزوں نے اسے سر کا خطاب عطا کیا یہ پہلا اور آخری کمشنر ملتان ہے جس کو سر کا خطاب ملا۔

جنرل فان کورٹ لینڈ کا جانشین کمشنر ملتان اے اے منرو (A.A.Munro) تعینات ہوا وہ بھی سود خور ہندوؤں کا جانی دشمن تھا۔ وہ ایسی قانون سازی کا حامل تھا جس سے پنجاب کے زمیندار جن کی اکثریت مسلمان تھی سود خور ہندوؤں سے قرضہ لینے کی پاداش میں اپنی زرعی زمینوں سے محروم نہ ہوں کیں اس نے بڑی تحقیق سے چارٹ بنا کر حکومت پنجاب کو بتایا کہ ہر سال ہندو بنیئے زمینداروں کی کس قدر اراضی عدالتی کارروائی سے قرقی اور نیلامی کرا کے ہتھیا رہے ہیں۔ اس نے لکھا کہ یہ مذموم سلسلہ بند کیا جائے۔

کمشنر برکلے ایک بے حد متنازعہ شخصیت کا حامل تھا اس کی ڈپٹی کمشنر ملتان رو (Roe) سے نہ بنی جس کی وجہ سے ملتان میں ہندو مسلم فساد ہو گیا برکلے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا۔ رو (Roe) صاحب ڈپٹی کمشنر کے

بارے میں ہندوؤں کو یہ شکایت تھی کہ وہ مسلمان پسند افسر ہے آزادی سے پہلے اس قسم کے رویے عموماً انگریزی افسروں میں پائے جاتے تھے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا ان افسروں کے طبعی رجحانات کی وجہ سے ہوتا تھا یا وہ حکومتی مصلحتوں کی وجہ سے ایسے رویے اختیار کرتے تھے رو ضلع ملتان کے فرسٹ ریگولر سیٹلمنٹ میں مہتمم بندوبست ضلع ملتان کے اہم عہدہ پر تعینات رہ چکا تھا اور اس کی مسلم پروری انہی دنوں سے آشکارا ہو چکی تھی۔ چنانچہ جن دنوں وہ ملتان کا ڈپٹی کمشنر تھا کمشنر ملتان برکلے نے ستمبر سال 1881ء میں ملتان کے ہندوؤں کی درخواست پر ملتان شہر میں جھٹکے کے گوشت کی چھ دکانیں کھولنے کی اجازت دے دی۔ ملتان شروع دن سے مسلمان اکثریتی شہر تھا اس میں جھٹکے کے گوشت کی دکھانیں کبھی بھی نہ کھلی تھیں۔ ملتان کے مسلمانوں نے اس حکم پر سخت رنج و غم کا اظہار کیا اور اس سلسلہ میں ملتان کے مسلمانوں کا ایک وفد ڈپٹی کمشنر (Roe) صاحب سے ملا اور انہوں نے کمشنر برکلے کے حکم کے خلاف سخت احتجاج کیا کچھ دنوں کے بعد جب ملتان کے مسلمان قصابوں نے ملتان شہر کے اندر بڑے گوشت کی دکانیں کھولنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے ڈپٹی کمشنر کو درخواست دی تو رو صاحب نے مسلمان قصابوں کی یہ درخواست منظور کر لی۔ یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ڈپٹی کمشنر رو برکلے کمشنر کی جھٹکا کی دکانیں کھولنے کی اجازت نامہ پر برافروختہ ہوا تھا اور اسے ضلع کے امن و امان کے امور میں کمشنر کی مداخلت گردانتا تھا جب ملتان کے مسلمان قصائی 20 ستمبر 1881ء کو بڑا گوشت لے کر شہر میں اپنی دکانوں پر لے جانے کے لیے چوک بازار سے گزرے تو ہندوؤں نے مسلمان قصائیوں پر حملہ کر دیا جس پر ہندو مسلم فساد پورے شہر میں پھیل گیا اندرون شہر ہندوؤں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا اور بیرون شہر مسلمانوں نے ہندوؤں کو نقصان پہنچایا۔ جس پر ڈپٹی کمشنر رو صاحب نے ہندوؤں کے جھٹکے کی دکانوں پر اور اندرون شہر مسلمانوں کی بڑے گوشت کی دکانوں پر پابندی لگا دی اور سارے شہر میں زبردست پٹرولنگ اور گشت کرا کے فساد پر قابو پا لیا۔ بڑا گوشت چونکہ انگریز فوج کو مسلمان قصائی سپلائی کرتے تھے جو بند ہونے پر ملتان کے انگریز کمانڈنگ آفیسر نے حکومت پنجاب سے سخت شکایت کی گوشت تو ہمیشہ ملتان میں فروخت ہوتا آیا ہے اس لیے اس کی فروخت پر پابندی نہ لگائی جائے جس پر ڈپٹی کمشنر رو نے بڑے گوشت کی فروخت پر پابندی کا حکم واپس لے لیا اور صرف بڑے گوشت کو شہر میں لانے کے لیے مخصوص راستے مقرر کر دیئے اور کمشنر نے بھی جھٹکے کے گوشت کی فروخت کا حکم نامہ واپس لے لیا لیکن مرکزی حکومت ڈپٹی کمشنر سے ناراض ہو گئی کہ ڈپٹی کمشنر نے ہندوؤں کی مخالفت میں کمشنر ملتان کو ترغیب دینے کے لیے سوچے سمجھے بغیر احکامات صادر کر کے فساد پھیلایا ہے لیکن چونکہ ڈپٹی کمشنر کی کوششوں سے فساد پر قابو پا لیا گیا تھا اس لیے ڈپٹی کمشنر پر عتاب نازل ہوا لیکن مرکزی حکومت نے ڈپٹی کمشنر کی کارروائی کیخلاف مذمت والا حکم نامہ واپس لے لیا۔

سال 1901ء سے قبل جن کمشنروں کے نام ہماری نظر سے گزرتے ہیں ان میں ایچ ورتھ (Edgeworth) جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ملتان میں چھ سال کمشنر کے طور پر تعینات رہا کرنل ہملٹن سات سال چار ماہ کمشنر ملتان کے عہدہ پر متعین رہا کرنل کرپس پانچ سال پانچ ماہ کمشنر ملتان رہا۔ 1849 سے 1901ء

چوبیس کمشنر ملتان تعینات ہوئے اس طرح سے انیسویں صدی کے آخری پچاس سالوں میں ملتان کے کمشنروں کا فی کمشنر عرصہ تعیناتی دو سال سے کچھ زیادہ بنتا ہے انیسویں صدی عیسوی میں ملتان کے معروف کمشنروں کے نام اس طرح ہیں۔ لانگ (Lang)، اومانی (Ommany)، آرتھر برانڈرتھ (Arthur Brandreth)، یہ کمشنر ہندو بنیوں کا سخت مخالف تھا۔ برچ (Birch)، ہیرس (Harris)، کارڈ رائے (Cordroy)، ڈبلیوفورڈ (W. Ford)، کرنل گراہم (Col. Graham)، کرنل حال (Col. Hall)، کرنل ینگ (Col. Young)، کرنل کاکس (Col. Cox)، ای او برائن (E. O. Brain)، یہ کمشنر سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا، سرائیکی زبان کا عالم تھا سرائیکی محاوروں پر ایک کتاب کا مصنف تھا بعض بزرگوں کے خیال کے مطابق سرائیکی لوگوں سے بہتر سرائیکی بولتا تھا۔ ہر وقت سکاٹش کلٹ (Kilt) گھگھرا پہنتا تھا۔ اس لیے لوگ اس کو گھگھری والا صاحب کہتے تھے۔ جانور کے چوروں کا دشمن تھا۔ رات کو ناکہ بندی میں خود شامل ہوتا تھا۔ بہت منحنی قد تھا اس لیے برقعہ پہن کر لوگوں کے حالات معلوم کرتا تھا۔ بعد ازاں ریاست بہاولپور میں وزیر مال بنا۔ یاد رہے کہ 1901ء سے پہلے ملتان کے کمشنروں میں سے نصف کا تعلق فوج سے تھا۔

گزشتہ بیسویں صدی کا پہلا کمشنر ایک سابقہ فوجی افسر کرنل ایچ پی پی لیھ (H.P.P. Leigh) تھا۔ وہ فوج سے انڈین سول سروس میں سے لیا گیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ جولائی 1901ء سے اکتوبر 1902ء تک تقریباً سولہ ماہ کمشنر ملتان رہا۔ اس طرح وہ اکتیس ماہ ملتان کا کمشنر رہا۔ ملتان کا آخری انگریز کمشنر مسٹر کنگ (C.S. King) آئی سی ایس تھا۔ جو 11-11-41 سے 02-08-43 تک ملتان کا کمشنر رہا۔ King کے نام کا ایک اور کمشنر (I.W.King) آئی ڈبلو کنگ بیسویں صدی کی ابتداء میں 18-10-1902 سے 02-10-1903 تک تقریباً ایک سال کمشنر رہا۔ یہ معلوم نہیں کہ دونوں King باپ بیٹا تھے یا رشتہ دار تھے۔ پاکستان بننے تک کسی صوبائی سول سروس (PCS) کے ممبر کو کمشنر ملتان تعینات نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ پاکستان بننے کے بعد کئی PCS افسران کو کمشنر ملتان تعینات کیا گیا۔ سب سے پہلا دیسی کمشنر شیخ اصغر علی آئی سی ایس تھا۔ وہ پہلے مسلمان ڈپٹی کمشنر ملتان بھی رہے تھے اور ڈویژنل جج کے طور پر بھی ملتان میں خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ 26-04-1922 تا 12-02-1925 کمشنر ملتان رہے دوسری مرتبہ 20-04-1926 تا 15-06-1928 کمشنر ملتان رہے۔ یہ ایک مایہ ناز انتظامی افسر تھے۔ ملتان کا پہلا ہندو کمشنر رام چندر آئی سی ایس تھا۔ وہ 12-03-1938 تا 20-02-1939 تک کمشنر ملتان رہا وہ ممبر برٹش ایمپائر کا خطاب یافتہ تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ موضع سکندر آباد تحصیل شجاع آباد کا ہندو تھا۔ بعد ازاں اس کا بیٹا پاکستان بننے کے بعد ہندوستان کا ہائی کمشنر بن کر آیا اور اس نے اپنے آبائی گاؤں سکندر آباد کو بھی آ کر دیکھا۔ حسب ذیل کمشنر ملتان، قبل ازیں ڈپٹی کمشنر ملتان رہ چکے تھے۔

ہملٹن (Hamilton)، فان کورٹ لینڈ (Van Cort Land) برکلے (Barclay)، لانگ (Lang)، برچ (Birch)، رینی (Rennie)، اوبرائن (Obrein)، لینگلے (Langley)، مے نارڈ

(Maynard)، کنگ (King) شیپ شینک (Sheep Shank)، پونی ٹامسن (Poney Tomson)، ایبٹ (Abbot)، صرف ایک دن کمشنر ملتان رہا۔ شیخ اصغر علی برائنی ہندوؤں میں ہردیال بھنوٹ آئی سی ایس بہت مقبول کمشنر ملتان تھا۔ وہ 03-08-1942 سے 24-02-1946 تک ساڑھے تین سال ملتان کا کمشنر رہا۔ وہ انگریزوں کا بے حد چہیتا تھا۔ پورے جنگ کا دور وہ کمشنر رہا۔ تحریک آزادی بھی زوروں پر تھی۔ اس نے حالات قابو میں رکھے۔ وہ ملتان کے بڑے خاندانوں میں مقبول تھا۔

پاکستان بننے سے پہلے حسب ذیل کمشنر ملتان بعد ازاں ترقی کر کے فنانشل کمشنر (موجودہ MBR) بنے اوران کے قانونی فیصلے آج تک اہم نظائر کی طور پر عدالتوں میں بطور سند پیش ہوتے ہیں اور مانے جاتے ہیں۔

مے نارڈ (Maynord)، پونی ٹامسن (Pony Tomson)، شیپ شینگ (Sheep Shank)، سی سی گاربٹ (Garbet)، کنگ، سالسبری، مارسڈن، برائنی۔

گزشتہ بیسویں صدی میں کل اکسٹھ کمشنروں میں سات کا تعلق فوج سے تھا۔ جس میں پاکستان بننے سے پہلے چار فوجی افسر برطانوی نژاد تھے جو کمشنر ملتان رہے۔ ان میں دو نے بہادری کے تمغے حاصل کئے ہوئے تھے۔ جن کا نام ایف ایل برین (Brayan) اور مسٹر مچل (A.A.Mitchel) تھے یہ دونوں آئی سی ایس بھی تھے اور ملٹری کراس بھی تھے۔ یہ دونوں بیسویں صدی کی تیس کی دہائی میں ملتان میں یکے بعد دیگرے تعینات ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد صرف پاکستان کے ابتدائی دنوں میں میجر ابن الحسن سب سے پہلے تعینات ہوئے۔ اس کے بعد رفعت پاشا شیخ ملتان کے مقبول کمشنر تھے۔ وہ فوج میں کپتان رہے تھے۔ ان کے کئی سالوں کے بعد ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں کرنل نثار احمد خان کمشنر ملتان بنے اور بعد ازاں میجر محمد ضیاء الرحمٰن جو صرف دو ماہ کے لیے کمشنر ملتان کے عہدہ پر تعینات رہے وہ اس سے پہلے 9 ماہ کے لیے ڈپٹی کمشنر ملتان بھی رہ چکے تھے۔ میجر محمد ضیاء الرحمٰن اعلیٰ منتظم تھے۔ لیکن چونکہ سیاسی دور تھا اس لیے وقت کے حکمرانوں کے ساتھ اپنی طبیعت کی آزادی اور سلامتی کی وجہ سے ان کی نہ بن سکی اور دونوں مرتبہ ڈپٹی کمشنر ملتان کے عہدہ سے اور کمشنر ملتان کے عہدہ سے جلد تبدیل کر دیئے جاتے رہے بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کمشنر کا عہدہ خالی ہوا لیکن حکومت نے کچھ عرصہ اس سوچ بچار میں لگا دیا کہ کس کو اس ا[ہم] عہدہ پر تعینات کیا جائے تو اس دوران ڈپٹی کمشنروں کو کمشنر ملتان کے عہدہ کا دوہرا چارج عارضی طور پر عطا ہو گیا۔ ایسے ہی ای پی مون ڈپٹی کمشنر ملتان تھا کہ اسے دوہرا چارج کمشنر ملتان دیا گیا۔ اس طرح کمشنر ملتان کے دفتر ریکارڈ میں ظفر الاحسن کمشنر ملتان کے بعد رائے شیر محمد پی سی ایس کا ذکر نہیں ہے جو 21-02-56 تا 2[4]-02-56 کمشنر ملتان رہے۔ کمشنر ملتان کے دفتر کے ریکارڈ میں سردار غلام فرید خاں اور ملک کرم داد خاں کا بطور کمشنر [ملتان] اندراج نہیں ہے حالانکہ یہ دونوں علی الترتیب پندرہ یوم اور سات یوم کمشنر ملتان رہ کر ریٹائرڈ ہو گئے۔ پاکستان [کے] پہلا مسلمان کمشنر حادی حسین آئی سی ایس تھے۔ وہ بالکل صاحب لوگ تھے بعد میں انہوں نے پاکستان کی افسر[شا]ہی میں کافی بلند مقام حاصل کیا۔ ان کی تعریف میں پرانے وکلاء آج تک رطب اللسان چلے آتے ہیں۔ حادی حسین کے

جانشین آئی یو خان بطور کمشنر ملتان تعینات ہوئے وہ 47-02-20 تا 53-04-24 چار سال دو ماہ متواتر ملتان کے کمشنر تعینات رہے۔ یہ بہت ہی مشکل دور تھا۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ مہاجرین کی آبادکاری کی ابتداء ہو رہی تھی۔ قائد اعظم فوت ہو چکے تھے لیاقت علی خان بھی انہی دنوں شہید ہو گئے۔ ملک میں مکمل افراتفری تھی۔ مرکز اور صوبہ پنجاب کی حکومت میں تصادم زوروں پر تھا۔ اس دور میں آئی یو خان کی قیادت میں ملتان کے نظم و نسق کی بنیاد مضبوط رکھی گئی ماحول پر امن رہا۔ آئی یو خان کی مضبوط شخصیت کے زیر اثر انتظامی مشینری چاک و چوبند ہو کر کام کرتی رہی۔ آئی یو خان نے ملتان کے لوگوں کے ساتھ مضبوط انسانی تعلقات بھی استوار کئے۔ اور لوگوں سے تیس لاکھ روپے چندہ اکٹھا کر کے حکومت پنجاب کو مجبور کر دیا کہ صوبہ میں دوسرا میڈیکل کالج ملتان میں قائم ہو اور میڈیکل کالج کی سکیم کو جلدی کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے آئی یو خان نے شہر کے بے حد قریب بیش قیمت اراضی کا ٹکڑا نشتر کالج کے لیے اپنی ذاتی کوششوں سے حاصل کر لیا اور ان لوگوں کو قیمت ادا کرنے کی بجائے اس قیمتی اراضی کے بدلہ میں حکومت کی قیمتی اراضی تبادلہ میں دے کر ان کی مکمل تالیف قلب کر دی۔ اور اس طرح سے صوبہ پنجاب کا دوسرا میڈیکل کالج ملتان میں قائم ہو گیا۔ آئی یو خان کی نشتر کالج کے قیام کے سلسلہ میں خدمات اور اس کی انصاف پروری رہتی دنیا تک یادگار رہے گی۔

آئی یو خان کے تبادلہ خیال کے پہلے میجر ابن الحسن ایک سال 8 ماہ کے لیے کمشنر ملتان تعینات رہے۔ وہ پاکستان بننے کے بعد پہلے سابق فوجی کمشنر تھے۔ پھر ایک سال کے لیے ملتان تعینات رہے۔ وہ پاکستان بننے کے بعد پہلے سابق فوجی کمشنر تھے۔ پھر ایک سال کے لیے ایم زیڈ خان کمشنر ملتان مقرر ہوئے۔ درمیان میں ظفر الاحسن کی کمشنری کے بعد پھر ایم زیڈ خان سوا دو سال کمشنر ملتان رہے۔ میجر ابن الحسن و ایم زیڈ خان نیک نام آئی سی ایس افسران میں شمار ہوتے ہیں۔ ظفر الاحسن 55-02-25 تا 56-02-28 تقریباً ایک سال ملتان کے کمشنر تعینات رہے۔ اور ملتان اس نامور آفیسر کی اعلیٰ انتظامی قابلیت کا زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ کیونکہ اس دوران ان کے پاس لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ اور تھل کے ترقیاتی ادارہ کا تہرا چارج بھی تھا۔ وہ بگولے کی طرح آتے تھے اور ملتان کی کمشنری کا کام پلک جھپکتے میں خوش اسلوبی سے طے کر کے لاہور واپس چلے جاتے تھے اور ملتان کی کمشنری کا کام پلک جھپکتے میں خوش اسلوبی سے طے کر کے لاہور واپس چلے جاتے تھے یا تھل روانہ ہو جاتے تھے۔ ان کی انتظامی قابلیت کی وجہ سے لاہور میں گلبرگ کا عظیم الشان رہائشی منصوبہ بھی کامیاب ہوا اور تھل بھی جلد ہی آباد ہو گیا۔ ان کے بعد بہت قلیل عرصہ کے لیے رائے شیر محمد بھی کمشنر ملتان ہوئے وہ پی سی ایس آفیسر تھے۔ بعد ازاں اے کے ملک سی ایس پی بھی دو ماہ چھ دن کے لیے کمشنر ملتان مقرر ہوئے ان کے جانشین سردار عطا محمد خان لغاری بطور کمشنر ملتان تعینات ہوئے۔ جو سی ایس پی تھے۔ ڈیرہ غازی کے رہنے والے تھے۔ لغاری قبیلہ کے چیف سردار نواب محمد جمال خان لغاری کے منجھلے بیٹے تھے۔ محمد خان لغاری سابق وزیر پنجاب کے چھوٹے بھائی اور فاروق احمد لغاری سابق صدر اسلامی جمہوری پاکستان کے حقیقی چچا تھے۔ وہ پہلے سرائیکی مسلمان کمشنر تھے۔ وہ ایک دبنگ آفیسر تھے۔ اور نظم و نسق پر پورا اختیار

رکھتے سیشن جج ملتان مشتاق حسین منیر کی سرپرستی میں ایک عالی شان جلسہ ایک تقریب کے سلسلہ میں منایا گیا۔ جس میں، میں نے عدلیہ اور بار ایسوسی ایشن کی سو سالہ تاریخ پر ایک مختصر مقالہ پڑھا۔ بعد ازاں اس مقالہ کی بنیاد پر میں نے History of Judiciary And Administration of Multan نامی کتاب تصنیف کی۔ جو ملتان کی عدلیہ اور انتظامیہ کی تاریخ کے سلسلہ میں ایک اعلیٰ تحقیقی کاوش ہے۔

سید حماد رضا کے جانشین ایس ایم عثمان کمشنر ملتان کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ وہ 11-04-1968 تا 01-05-1969 ملتان کے کمشنر رہے۔ یہ ایوب خان کا آخری دور تھا۔ اور ملک میں عوامی رجحان ایجی ٹیشن کی طرف تھا۔ ملتان میں بھی ہلکا پھلکا ایجی ٹیشن ہوا۔ ایس ایم عثمان طبعاً ثقافتی سرگرمیوں کے دلدادہ تھے۔ لہٰذا ان کے دور میں کوئی یادگار انتظامی واقعہ نہ ہوا۔ ایس ایم عثمان کے جانشین سید محمد قاسم رضوی ملتان کے کمشنر تعینات ہوئے وہ تحریک پاکستان کی سٹوڈنٹ تحریک کے بے حد فعال کارکن تھے۔ وہ اعلیٰ انتظامی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ ملتان ڈویژن میں وہ قبل ازیں کالونی آفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ ان کے دور میں یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالا اور پاکستان گیر الیکشن منعقد کیے گئے۔ سید محمد قاسم رضوی کی اسی الیکشن کے دوران پیپلز پارٹی کے قائدین سے ساتھ چشمک ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی تو انہوں نے سید محمد قاسم رضوی جیسے لائق افسر اور قابل فرزند پاکستان کو نوکری سے نکال دیا۔ وہ چند سال کے بعد دلبرداشتہ ہو کر بے وقت فوت ہو گئے اور پاکستان اپنے ایک اعلیٰ انتظامی قابلیت کے مالک فرزند سے محروم ہوگیا۔ سید محمد قاسم رضوی کے جانشین اسد علی شاہ نے مورخہ 20-05-71 کو بطور کمشنر ملتان چارج لیا۔ ان کا دور کمشنری بے حد ہیجان انگیز دور تھا۔ اس زمانہ میں مشرقی پاکستان میں بدامنی پھیلی اور ہندوستان سے جنگ ہوئی وہ مشرقی تھے۔ اپنی بعض خامیوں کے باوجود قابل تعریف تھے۔ آج کل ایسے افسران کا نام ونشان بھی کہیں نہیں ملتا۔ ملتان میں وہ تقریباً تین سال ایک ماہ کمشنر رہے۔ لغاری صاحب کے تبادلہ کے بعد خان شاہ زمان سی ایس پی صرف 3 ماہ کے لیے کمشنر ملتان رہے۔ وہ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ ان کے جانشین مسٹر بی اے قریشی مورخہ 09-11-60 تا 01-10-62 تک کمشنر ملتان رہے۔ وہ بے حد باذوق اور فنون لطیفہ میں گہری دلچسپی لینے والے اعلیٰ پایہ کے آفیسر تھے۔ ان کے دور میں طلباء کا ایجی ٹیشن زوروں پر رہا لیکن صورتحال خراب نہ ہوئی۔ کمشنر کی خصوصی توجہ سے معاملات سدھر گئے۔ بی اے قریشی کے جانشین مسٹر رفعت پاشا کمشنر ملتان ہوئے۔ وہ فوج سے آئی سی ایس میں منتخب ہوئے تھے۔ اس طرح سے پاکستان بننے کے بعد وہ دوسرے سابق فوجی تھے جو کمشنر ملتان کے عہدہ پر فائز ہوئے تھے۔ بعد ازاں وہ ممبر بورڈ آف ریونیو پنجاب کے عہدہ پر فائز رہے اور مرکزی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد باعزت ریٹائر ہوئے وہ تین سال پانچ ماہ ملتان کے کمشنر رہے۔ ان کے دور میں ثقافتی سرگرمیاں خاص طور پر جشن فرید کی تقریبات نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منعقد رہیں۔ بزم ثقافت ملتان سال 1961ء مسٹر بی اے قریشی کی سرپرستی اور سردار عبدالجبار خان اور ریاض انور کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ لیکن اس بزم نے اعلیٰ پیمانے پر ثقافتی سرگرمیاں جناب رفعت پاشا کے دور میں شروع کیں جو آج تک با

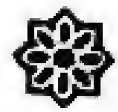
کی جاتی ہیں۔ رفعت پاشا شیخ ایک اعلیٰ انتظامی آفیسر تھے جن کے پبلک سے روابط بھی بے حد گہرے تھے۔ رفعت پاشا شیخ کے جانے کے بعد چند دنوں کے لیے سردار غلام فرید خان کمشنر ملتان رہے وہ تحصیلدار سے اعلیٰ عہدوں پر ترقی کر کے پہنچے تھے۔ اور پی سی ایس آفیسر تھے۔ ان کے بعد سید حماد رضا کمشنر ملتان تعینات ہوئے۔ وہ ایک اعلیٰ انتظامی آفیسر تھے۔ ان کے دور میں لاہور ہائی کورٹ کی سو سالہ سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ سید اسد علی شاہ بے حد ٹھنڈے مزاج کے بردبار شخص تھے۔ انہوں نے مشکل وقت میں ملتان میں انتظامی حالات پر کنٹرول رکھا اور جب 1972ء میں پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی پیپلز پارٹی کے ابتدائی دور میں بھی وہ نئے حکمرانوں کے کام آئے۔ اسد علی شاہ صاحب کے خاندانی روابط پنجاب کے بڑے بڑے سادات خاندانوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ان کو ہر طرف سے تعاون حاصل ہوتا تھا۔ بعد ازاں وہ پنجاب اور پاکستان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور آخر کار سینئر ممبر بورڈ آف ریونیو ہو گئے۔ وہ جس عہدہ پر بھی ہوتے تھے اہل ملتان سے ہمیشہ خصوصی توجہ اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اسد علی شاہ کے جانشین مسٹر محمد محسن نے مورخہ 03-06-1972 کو بطور کمشنر ملتان چارج سنبھالا ان کے دور میں پیپلز پارٹی منہ زور گھوڑے کی طرح پاکستان میں اقتدار کے میدان میں بگٹٹ دوڑ رہی تھی لیکن مسٹر محمد محسن نے تقریباً دو سال بڑے حوصلہ سے بطور کمشنر ملتان گزارے۔ ان کے تعلقات صاحب اقتدار لوگوں اور عوام سے اچھے رہے۔ ان کے چند ماہ بعد مسٹر محمد صدیقی چوہدری کمشنر ملتان تعینات ہوئے۔ یہ خاموش طبع مضبوط کردار کے اعلیٰ انتظامی افسر تھے۔ اپنی مرضی کرتے تھے۔ اس لیے ان کو تبدیل کر کے مسٹر ہمایوں فیض رسول کو 28-08-1974 کو کمشنر ملتان تعینات کیا گیا۔ انہوں نے ملتان میں چند سال تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ ہمایوں فیض رسول قبل ازیں ملتان میں ڈپٹی کمشنر کے طور پر تعینات رہ چکے تھے اور بطور ڈپٹی کمشنر ملتان وہ بے حد کامیاب رہے تھے۔ ملتان سے ہی وہ تبدیل ہو کر مشرقی پاکستان تعینات ہوئے تھے۔ جہاں سقوط مشرقی پاکستان کے ساتھ ہی وہ جنگی قیدی بنا دیئے گئے۔ بعد دو سال جنگی قیدی کے طور پر صبر آزما مشکلات سے دو چار ہونے کے بعد وہ قید سے رہائی کے بعد کمشنر ملتان تعینات ہوئے۔ ان کی گزشتہ انتظامی شہرت اور ان کے ملتان میں وسیع انسانی تعلقات نے ان کے لیے عہدہ کمشنری ملتان آسان کر دیا۔ ہمایوں فیض رسول نرم خو منرنجاں مرنج شریف الطبع انسان تھے جو کام ان سے نہ ہو سکتا تھا وہ اس کے کرنے سے بہت محبت سے انکار کر دیتے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کے طلوع کا دور تھا لیکن ہمایوں فیض رسول نے تقریباً پورا پیپلز پارٹی کا دور بطور کمشنر ملتان گزارا۔ لیکن کسی طرف سے شکر رنجی اور مخالفت نہ ہوئی۔ مورخہ 11-04-1977 کو جب تحریک نظام مصطفیٰ زوروں پر تھی اور پیپلز پارٹی کے اقتدار کی نیا بھنور میں پھنسی ہوئی تھی ان کو تبدیل کر کے مسٹر سعید اختر کو کمشنر ملتان مقرر کر دیا گیا۔ مسٹر سعید اختر خاموش طبع اعلیٰ انتظامی قابلیت کے غیر جانبدار مزاج کی شخصیت کے مالک افسر تھے۔ ان کے دور میں ہی پاکستان میں ضیاء الحق کا مارشل لاء لگا۔ اور انہیں اگست 1978ء میں تبدیل کر دیا گیا۔ مسٹر سعید اختر نے بعد ازاں سول سروس میں کافی ترقی کی وہ ممبر بورڈ آف ریونیو ہو گئے۔ اور آج کل پنجاب کے وزیر تعلیم ہیں۔ مسٹر سعید اختر کے جانشین جناب غلام مرتضیٰ پراچہ کمشنر ملتان تعینات ہوئے وہ پی سی ایس

آفیسر تھے۔ وہ پاکستان بننے کے بعد تیسرے پی سی ایس آفیسر تھے جو کمشنر ملتان کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ اگر دیکھا جائے تو ان کو پاکستان کے بعد پہلا پی سی ایس افسر بطور کمشنر ملتان کہنا چاہیے کیونکہ ان سے پہلے دو پی سی ایس آفیسر یعنی ملک کرم داد خان اور سردار امام بخش خان علی الترتیب صرف پندرہ دن اور سات دن کے لیے عارضی طور پر کمشنر ملتان تعینات ہوئے تھے۔ غلام مرتضیٰ پراچہ عام پی سی ایس افسران کے مقابلہ میں کافی بلند بالا شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ملتان میں سٹی مجسٹریٹ بھی رہے تھے۔ اور اے ڈی ایم کے طور پر بھی خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ اہل ملتان کے ساتھ ان کے انسانی روابط کافی مضبوط تھے۔ اس لیے کمشنر ملتان کے طور پر وہ کافی کامیاب رہے۔ غلام مرتضیٰ پراچہ کے جانشین لیفٹیننٹ کرنل نثار احمد خان نے مورخہ 19-05-79 کو بطور کمشنر ملتان چارج لیا۔ وہ پاکستان بننے کے بعد تیسرے سابق فوجی افسر تھے جو کمشنر ملتان کے عہدہ پر فائز ہوئے تھے۔ وہ فوجی افسروں کی اس کھیپ سے تعلق رکھتے تھے جنہیں ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے دور اقتدار میں سول سروس میں شامل کیا گیا تھا وہ بہت تیز طرار صحیح فوجی مزاج کے آفیسر تھے۔ اپنی کمشنری میں دورے کرنے اور اپیلوں کو نمٹانے کے ماہر تھے۔ ایک ایک دن میں اسی (80) اپیلوں کو سن کر اسی وقت فیصلے سنا دیتے تھے۔ وہ عدالت بھی شوق سے لگاتے اور آج کا کام کل پر نہ چھوڑتے تھے۔ وہ تقریباً 1-1/2 سال ملتان کے کمشنر رہے ان کے جانشین حسن رضا پاشا نے 06-12-81 کو بطور کمشنر ملتان چارج سنبھالا۔ وہ ایک نیک نام سی ایس پی آفیسر تھے۔ وہ پونے تین سال ملتان کے کمشنر رہے اور مارشل لاء کے مشکل نظام میں انہوں نے اپنی کمشنری کے نظم و نسق میں معمولی سی آنچ بھی نہ آنے دی اور لوگوں کا اعتماد بحال رکھا۔ ان کے جانشین مسٹر فریدالدین احمد مورخہ 12-09-84 کو کمشنر ملتان تعینات ہوئے۔ ان کا ملتان سے تین پشتی تعلق تھا۔ ان کے دادا ملتان میں افسر مال رہے تھے۔ ان کے والد ملتان میں مجسٹریٹ اور بعد ازاں مظفر گڑھ میں ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر فائز رہے تھے۔ وہ خود قبل ازیں ملتان کے ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر نیک نامی کے ساتھ فائز رہ چکے تھے۔ وہ پورے تین سال کمشنر ملتان رہے اس دور میں انہوں نے ملتان پبلک سکول جیسے اعلیٰ تعلیمی ادارے کو قائم کرایا۔ وہ ایک صاف ستھرے کردار کے ناک اعلیٰ انتظامی افسر تھے۔ لوگ انہیں تا حال یاد کرتے ہیں۔ فریدالدین احمد کے جانشین سید سرفراز حسین سی ایس پی صوبائی سروس کے کیڈر سے تھے وہ 05-06-87 سے 16-05-88 تک کمشنر ملتان رہے وہ اس سے پہلے ملتان کے سٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر بھی رہ چکے تھے وہ بھی ملتان کے لوگوں سے خوب واقف تھے۔ ان میں انتظامی قابلیت بھی تھی۔ وہ یہاں اچھا وقت گزار گئے۔ ان کے بعد سید فضل حسین شاہ 16-05-88 سے 16-01-89 تک تقریباً آٹھ ماہ کمشنر ملتان رہے۔ یہ بہت ہی صاف ستھرے کردار کے مالک تھے ملتان میں قبل ازیں نیک شہرت کے ساتھ ایڈیشنل کمشنر ریونیو کے عہدہ پر فائز رہے تھے۔ عدالتی کام بڑی تندہی اور انصاف کے ساتھ اور شوق سے کرتے تھے۔ بعد ازاں سید سرفراز حسین اور سید فضل حسین شاہ ممبر بورڈ آف ریونیو کے عہدہ جلیلہ پر بھی فائز رہے۔ سید فضل حسین شاہ کے جانشین چوہدری عبدالوحید تقریباً سوا سال سے کچھ عرصہ زائد کمشنر ملتان رہے وہ وہاڑی کے ارائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ملتان میں اپنی ابتدائی سروس میں

مجسٹریٹ بھی رہے تھے۔ خاموش طبع، کم آزار شخصیت کے مالک تھے۔ کمشنر ملتان کے طور پر ان کا دور اچھا گزر گیا اس طرح سے ملتان کے یکے بعد دیگرے تین کمشنر صوبائی سروس (PCS) کے رکن تھے۔ یکے بعد دیگرے تین پی سی افسران کی کمشنر ملتان کے طور پر تعینات ملتان کے کمشنروں کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ چوہدری عبدالوحید بھی بعد ازاں ممبر بورڈ آف ریونیو مقرر ہوئے۔ ان کا جانشین جناب طارق فاروق سی ایس پی 90-04-04 سے 91-05-16 تک تقریباً ایک سال ایک ماہ کمشنر ملتان رہے تھے۔ ان کے اوصاف حمیدہ کا اظہار شروع ہی ہوا تھا۔ ان کے جانشین مسٹر سلیم اختر رانا 91-05-17 تا 93-07-31 کمشنر ملتان رہے۔ سلیم اختر رانا ساہیوال کے رہنے والے تھے میرے سمیت ملتان کے کافی وکلاء لاء کالج میں ان کے ہم جماعت تھے۔ طالب علمی کے دور میں ان کا کیریئر بہت اچھا تھا۔ امریکہ سے قانون کی اعلیٰ ڈگری ایک سال کر کے آئے تھے۔ ملتان میں شادی شدہ تھے۔ اپنے کیریئر کے آغاز میں ملتان میں مجسٹریٹ بھی رہ چکے تھے۔ ملتان اور اس کے لوگوں سے وہ اچھی طرح سے واقف تھے۔ دور سیاسی تھا اور مشکل دور تھا لیکن وہ بطور کمشنر ملتان اچھا وقت گزار گئے اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد ملتان میں انہوں نے اپنا گھر بنا لیا۔ ان کے بعد میجر ضیاء الرحمٰن صاحب کمشنر ملتان کے طور پر تعینات ہوئے۔ ان کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔ یہ جلد تبدیل کر دیئے گئے ان کے جانشین فیصل تحسین میمن 93-08-01 تا 95-11-06 ملتان رہے۔ یہ قانون کی راہ پر چلنے والے سی ایس پی آفیسر تھے۔ ان کا والد ملتان کے لوگوں سے رابطہ کم رہا۔ لیکن انتظام اچھا رہا۔ میمن صاحب کے بعد محمد عامر خان پی سی ایس کمشنر ملتان کے طور پر 95-11-23 سے 97-10-28 کمشنر ملتان رہے۔ وہ بہاولپور کے رہنے والے تھے۔ ملتان میں بطور اے سی خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ ملتان کے اے ڈی سی بھی رہے تھے۔ مظفر گڑھ میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے۔ انہوں نے کمشنر ملتان کا عہدہ سنبھالتے ہی بار ایسوسی ایشن کے ساتھ بے حد مضبوط تعلقات استوار کر لیے۔ دو سال کمشنر ملتان رہے تھے اس دور میں مذہبی تفرقہ کی وجہ سے انتظامیہ اور مولوی صاحبان کے آئے دن ہوتے تھے۔ لیکن محمد عامر خان نے اس تمام فسادات کے دور کو خوش اسلوبی سے بھگتا دیا۔ لیکن وقت کے حکمرانوں کو یہ بات معلوم نہیں کیوں نہ بھائی اور ایک تصادم میں ایک بچہ کی موت کے شاخشانہ میں ان کو اور ڈپٹی کمشنر دونوں کو تبدیل کر دیا گیا۔ لوگوں کا ردعمل اس تبادلہ کے خلاف تھا۔ محمد عامر خان کے جانشین سید شفیق حسین بخاری سی ایس پی کمشنر ملتان کے طور پر تعینات ہوئے۔ وہ میلسی کے معروف بخاری خاندان کے فرد تھے۔ ان کے چچا اور سسر مبارک علی شاہ مرحوم ملتان کے معروف وکیل تھے۔ سید شفیق حسین بخاری کی تعلیم بھی ملتان میں ہوئی تھی۔ وہ جب ملتان کے کمشنر بن کر آئے تو لوگوں نے بے حد اپنائیت محسوس کی۔ وہ اعلیٰ کردار کے دلیر آفیسر تھے۔ اس زمانے میں ڈیرہ غازی خان کے حالات دگرگوں ہونے پر بخاری صاحب کو پہلے ڈیرہ غازی خان اور ملتان کا دوہرہ چارج دے دیا گیا اور وہ 97-01-29 سے 98-01-15 تک ملتان کے کمشنر رہے۔ پھر ان کو ملتان سے تبدیل کر کے ڈیرہ غازی خان کا کمشنر بنا دیا گیا۔ اس طرح ملتان کے لوگ ایک قابل کمشنر کی خدمات سے محروم ہو گئے۔ بخاری صاحب کے جانشین جناب طارق یوسف کمشنر ملتان کے عہدہ پر 98-01-19 تا 99-04-14 تقریباً

سوا سال کمشنر تعینات رہے وہ بے حد سنجیدہ کام سے کام رکھنے والے خاموش اعلیٰ معیار کے کمشنر تھے۔حکومت سیاسی تھی جلد ہی ان کو تبدیل کر کے ان کی جگہ مسٹر ناصر محمود کھوسہ کو کمشنر ملتان تعینات کر دیا گیا۔ ناصر محمود کھوسہ صاحب ڈیرہ غازی خان کے معروف کھوسہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی جسٹس آصف سعید کھوسہ پہلے ملتان میں وکالت کرتے رہے تھے۔ان کے والد جناب فیض محمد کھوسہ صاحب ملتان ڈیرہ غازی خان ڈویژن کے سب سے سینئر معروف ومقبول وکیل تھے۔اس لحاظ سے پورا خاندان ہمہ خانہ آفتاب ہے۔ناصر محمود کھوسہ پاکستان کی سپیریئر سروس سے تعلق رکھتے تھے۔ان کو اعلیٰ انتظامی تجربہ حاصل تھا وہ بے حد فعال حاضر باش چوبیس گھنٹے مستعد اور چاک و چوبند رہتے تھے۔سیاسی دور تھا بعد ازاں ان کے دور کمشنری میں فوجی دور شروع ہو گیا اور وہ دونوں ادوار میں اعلیٰ معیار کی انتظامی قابلیت کی وجہ سے کمشنری کے اعلیٰ معیار پر پورے اترے۔ان کے دور میں ملتان شہر میں اوور ہیڈ برج جیسا بڑا منصوبہ تکمیل ہوا جس کی کامیاب تکمیل میں ان کی کاوشیں بدرجہ اتم تھیں۔انہوں نے پبلک لائبریری باغ لانگے خان جیسے قدیم ادارہ کی تزئین جدید میں نمایاں کردار ادا کیا۔وہ پرانے کمشنروں کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ان کے جانشین کمشنر ملتان نجیب اللہ ملک مقرر ہوئے۔وہ بھی پاکستان کی سپیریئر سول سروس کے رکن تھے۔وہ بے حد سنجیدہ خوش اخلاق قابل اعلیٰ منتظم کمشنر تھے۔وہ بھی خاندانی طور پر ملتانی تھے۔ جہاں انہوں نے کافی ترقی کی۔کاروبار تھا، زمیندارہ تھا اور بہاولپور میں ایک اعلیٰ درجہ کا ہوٹل بھی تھا۔کمشنر صاحب کے والد ملک حبیب اللہ بہاولپور کی معروف شخصیت میں زراعت پر ان کے مضامین نوائے وقت اور دوسرے قومی اخبارات میں کافی عرصے سے شائع ہوتے رہے ہیں۔میری بہاولپور میں رشتہ داری اور ملک حبیب اللہ کی ملتان میں رشتہ داری کی وجہ سے بہت سال پہلے سے میری ان سے گاہے بگاہے ملاقات رہی ہے۔ملک نجیب اللہ کے دور میں پاکستان میں انتظامی اصلاحات کے سلسلہ میں نظامات ضلع کا نظام شروع کیا گیا۔کمشنریاں ختم کر دی گئیں۔اس کے ساتھ ہی کمشنر کا عہدہ بھی نابود ہو گیا۔نظام میں کمشنر ملتان کو ڈسٹرکٹ کوارڈی نیشن آفیسر DCO ضلعی رابطہ افسر بنا دیا گیا۔لیکن دو تین ماہ کے اندر ملک نجیب اللہ صاحب کی نئے نظام کے ساتھ نہ بن پائی اور حکومت نے ان کو ڈی سی او ملتان کے عہدہ سے تبدیل کر دیا جو میرے خیال میں ان کے کیریئر کے سلسلہ میں یقیناً فائدہ مند ہوگا۔

(ملتان بار ایسوسی ایشن کے سو سال-عمر کمال خان ایڈووکیٹ)



عمر کمال خان ایڈووکیٹ

ملتان کے ڈپٹی کمشنروں کے سو سال

سال 1900ء سے 2000ء تک

ڈپٹی کمشنر کا عہدہ موجودہ نظام حکومت میں بے حد اہم عہدہ ہے۔ ملتان میں ڈپٹی کمشنر کے عہدہ کی ابتداء سال 1849ء میں شروع ہوئی۔ انگریزوں نے ملتان پر قبضہ کرنے کے بعد جب انہوں نے اپنا نظام حکومت یہاں نافذ کیا تو انہوں نے ہندوستان میں گزشتہ سو سال جو انتظامی تجربے کئے تھے اور برصغیر کے معروضی حالات کو مدنظر رکھ کر جو حکومتی نظام وضع کیا تھا اس میں ڈپٹی کمشنر بطور افسر ضلع پر کافی ذمہ داریاں ڈالی گئی تھیں۔ ڈپٹی کمشنر کا تعلق ضلع کے روزمرہ کے کاروبار سے تھا جبکہ کمشنر کو ان کی نگرانی اور امپریل گورنمنٹ کی طرف سے حالات پر نظر رکھنے کا کام سپرد کیا گیا تھا۔ جو کہ زیادہ دفتری نوعیت کا ہوتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کو انگریزی نظام حکومت میں قانونی تائید حاصل نہ تھی۔ قانون میں صوبہ کو صرف کمشنریوں میں ہی تقسیم کیا گیا تھا کسی قانون میں صوبہ کی اندرونی حد بندی میں ڈپٹی کمشنر کا ذکر نہ تھا۔ لیکن چونکہ ڈپٹی کمشنر کو ڈسٹرکٹ کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل تھے اس لیے اس عہدہ کا لوگوں سے زیادہ تعلق تھا اور ان دو اہم اختیارات کی وجہ سے روزمرہ کے نظام حکومت کی تمام تر ذمہ داری ڈپٹی کمشنر پر عائد ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے اس عہدہ کی اہمیت بے حد زیادہ تھی۔ سال 1900ء برطانوی حکومت کے عروج کے نصف النہار کا سال تھا۔ کمپنی کی حکومت ختم ہوئے بیالیس سال ہو چکے تھے اور ملکہ وکٹوریہ بیالیس سال سے ہندوستان کی حکمران تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کا دور حکومت برطانوی تاریخ میں سنہری دور کے طور پر مشہور ہے۔ برطانوی سامراج پوری قوت سے دنیا کے نقشہ پر جلوہ فگن تھی۔ اس وقت برطانیہ کے ہم پلہ دنیا میں اور کوئی طاقت نہ تھی۔ چنانچہ برطانیہ کی عظیم طاقت کے قائم کردہ نظام حکومت کے کل پرزوں میں سے سے اہم پرزہ ڈپٹی کمشنر کا عہدہ تھا۔

قبل ازیں ملتان کا پہلا ڈپٹی کمشنر لیفٹیننٹ جیمز تقریباً پانچ ماہ بطور ڈپٹی کمشنر ملتان تعینات رہا۔ مارچ 1849ء سے فروری 1900ء تک ملتان میں باون ڈپٹی کمشنر خدمات سرانجام دے چکے تھے ان میں کوئی بھی ڈپٹی کمشنر برصغیر کا باشندہ نہ تھا۔ اکاون سالوں میں 52 ڈپٹی کمشنروں کا اوسط عرصہ تعیناتی فی ڈپٹی کمشنر تقریباً کچھ دن کم ایک سال سے زیادہ نہیں بنتا تھا۔ ان ڈپٹی کمشنروں میں ایک ڈپٹی کمشنر جرمن قوم کا باشندہ تھا اس کا نام فان کورٹ لینڈ

میں ہندوستان میں مہم جوئی کے شوق تھا۔ وہ ایک قسمت کا دھنی یورپین قسمت آزماء مہم جو فوجی تھا۔ جو انیسویں صدی میں ہندوستان میں مہم جوئی کے شوق میں چلا آیا اور مختلف دیسی ریاستوں میں نوکری کرتا آخر کار مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں شامل ہو گیا اور جب سکھوں اور انگریزوں کے مابین لڑائی شروع ہوئی تو وہ ڈیرہ غازی خان کا ناظم تھا۔ مول راج کی بغاوت کے موقع پر اس نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور ملتان کے محاصرہ میں پیش پیش تھا۔ ملتان کی فتح کے بعد جب پنجاب انگریزی سلطنت میں شامل ہو گیا تو اسے ملازمت پر بحال رکھا گیا۔ اور وہ انگریزوں کے ابتدائی دور میں کئی اضلاع کا ناظم یا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا اس کی قابلیت اور خوش انتظامی کا اندازہ اس طرح لگائیں کہ وہ ملتان کا دو مرتبہ ڈپٹی کمشنر رہا۔ اس کا کل عرصہ تعیناتی بطور ڈپٹی کمشنر ملتان پانچ سال سات ماہ بنتا ہے آخر میں وہ فیروز پور کا کمشنر مقرر ہوا جہاں سے وہ ریٹائر ہو کر یورپ چلا گیا۔ پبلک لائبریری باغ لانگے خان ملتان کے پیشرو ادارہ ملتان بک سوسائٹی کے وہ بانی اراکین میں سے تھا۔ اس کا نام فہرست ممبران میں آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

گزشتہ صدی یعنی بیسویں صدی عیسوی کا ملتان کا پہلا ڈپٹی کمشنر کیپٹن سی ایجرٹن تھا۔ انگریزی دور میں بھی سول سروس میں فوجوں کا کوٹہ مقرر تھا۔ اور اس وقت کے سویلین افسران فوجی افسران کے سول اعلیٰ انتظامی عہدوں پر تعیناتی پر بہت ہی خار کھاتے تھے لیکن برطانوی حکومت توازن پیدا کرنے کے لیے فوجی افسران کو گاہے بگاہے سول سروس میں شامل کرتی رہتی تھی کیپٹن سی ایجرٹن پہلی مرتبہ 26-09-1899 سے 13-02-1900 تک صرف پانچ ماہ ڈپٹی کمشنر ملتان رہا۔ انیسویں صدی عیسوی میں وہ قبل ازیں دو مرتبہ 05-04-1898 سے 23-06-1898 تک اور 25-06-1898 سے 27-06-1899 تک ڈپٹی کمشنر ملتان کے عہدہ پر تعینات رہا تھا۔ درمیان میں صرف ایک روز کے لیے یعنی 24-06-1998 کے دن کے لیے ای۔ آر۔ ایبٹ بطور ڈپٹی کمشنر ملتان تعینات رہا۔ اس سے کم عرصہ کے لیے شاید ہی برصغیر میں کوئی ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر تعینات رہا تھا۔ درمیان میں صرف ایک روز کے لیے یعنی 24-06-1898 کے دن کے لیے ای۔ آر۔ ایبٹ بطور ڈپٹی کمشنر ملتان تعینات رہا۔ اس سے کم عرصہ کے لیے شاید ہی برصغیر میں کوئی ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر تعینات رہا ہو۔ اس طرح سے کیپٹن ایجرٹن تقریباً چار سال 18 دن ملتان کا ڈپٹی کمشنر رہا۔ مشجر کولڈ سٹریم نامی ایک ڈپٹی کمشنر چار مرتبہ ڈپٹی کمشنر ملتان کے عہدہ پر تعینات رہا۔ سال 1905ء میں وہ تقریباً 8 ماہ کا عرصہ ملتان کا ڈپٹی کمشنر رہا پھر جنگ عظیم اول (1914ء تا 1919ء) کے سالوں میں وہ مختلف مواقع پر تین مرتبہ ملتان کا ڈپٹی کمشنر رہا اس طرح سے اس کا کل عرصہ تعیناتی بطور ڈپٹی بطور ڈپٹی کمشنر ملتان تقریباً 30 مہینے بنتا ہے۔

گزشتہ 100 سو سال پہلا ہندوستان جو اس اہم عہدے پر بطور ڈپٹی کمشنر ملتان مقرر ہوا۔ وہ دیوان بہادر نریندر ناتھ تھا وہ لاہور کے معروف کشمیری برہمن خاندان سے تعلق رکھتا تھا وہ ان ابتدائی آئی۔ سی۔ ایس ہندوستانی افسران میں سے تھا جنہیں سال 1900ء کے بعد سول سروس میں لارڈ کرزن کے دور میں لیا گیا تھا۔ یہ ہندوستانی آفیسر ملتان کا چار مرتبہ ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا۔ پہلی مرتبہ 03-05-1909 سے 07-06-1910

تقریباً ایک سال وہ ملتان کا ڈپٹی کمشنر تعینات رہا دوسری مرتبہ وہ 1910-09-08 سے 1911-05-12 تک 8 ماہ اس عہدہ پر تعینات رہا تیسری مرتبہ 1911-11-01 سے 1913-08-08 تک وہ 9 ماہ کے لیے تعینات رہا آخری مرتبہ وہ 1912-09-20 سے 1913-05-20 کے مابین چار سال کے عرصہ میں صرف 9 ماہ کا عرصہ ملتان کا ڈپٹی کمشنر رہا۔ اب آہستہ آہستہ برصغیر کے لوگ بھی سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دیوان نریندر ناتھ کے بعد مصر جوالا سہائے اور لالہ ہری چند کے نام بطور ڈپٹی کمشنر ملتان نظر سے گزرتے ہیں۔ لیکن مصر جوالا سہائے صرف ایک ماہ کے لیے اور لالہ ہری چند صرف تین ماہ کے لیے ڈپٹی کمشنر ملتان مقرر ہوئے۔

ملتان کے لوگوں نے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کا نام بہت سال یاد رکھا وہ ایک خود ساختہ فرد تھا۔ جو برطانیہ کے کمزور طبقوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نام مسٹر جی۔ بی۔ بیری تھا وہ انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستان چلا آیا اور یہاں کئی پبلک سکولوں میں پڑھاتا رہا وہ ایچی سن چیفس کالج کا بہت مقبول استاد تھا۔ اس نے ہندوستان میں آ کر آئی سی ایس کا امتحان دیا اور کامیاب ہو گیا۔ وہ تین مرتبہ ملتان کا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا۔ ملتان میں کافی بڑے خاندانوں کے نوجوان اس کے شاگرد تھے۔ اس لیے وہ اپنے دور تعینات میں ملتان کے جوانوں میں کافی مقبول تھا۔ اس نے بیس سال سے کم عمر نوجوانوں کی دو فٹبال ٹیمیں بنائیں اور ان کو وہ خود تربیت دیتا تھا اور خود ریفری بن کر سردیوں میں نوجوانوں کی ٹیموں کو فٹ بال کھلواتا تھا۔ اس کی کوششوں سے جنگ عظیم اول کے بعد ملتان میں فٹ بال کافی مقبول کھیل ہو گیا اور فٹ بال کے کھلاڑیوں کا معیار کافی بڑھ گیا اور بعد ازاں ملتان کے کافی کھلاڑی برصغیر گیر شہرت کے مالک ہوئے۔ مسٹر بیری سرائیکی زبان میں بہت صاف اور بامحاورہ بولتا تھا۔

جنگ عظیم اول کی ابتداء میں مسٹر ایف۔ ایل۔ برائن ملتان کے ڈپٹی کمشنر کے طور پر تعینات ہوئے۔ وہ پنجاب میں بہت ہی معروف سول سرونٹ تھے۔ جنہوں نے اپنی تمام زندگی پنجاب کے دیہات سدھار پر صرف کر دی اور بعد کے سالوں میں وہ خاص طور پر دیہات سدھار کی تحریک کے بانی ہوئے اور ان کی اس موضوع پر تصنیفات اور کوششوں کو بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔

سال 1921ء میں ملتان میں پہلا مسلمان ڈپٹی کمشنر شیخ اصغر علی 1921-12-16 کو تعینات ہوا وہ شیخ قانونگو خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے رشتہ دار قصور اور امرتسر وغیرہ اضلاع میں پھیلے ہوئے تھے اس وقت ہندو مسلم تضادات پیدا ہو چکے تھے۔ شیخ اصغر علی کو مسلمانوں کا حامی افسر شمار کیا جاتا تھا۔ اس کی ملتانی تعیناتی کے دوران کافی مسلمان وکلاء اور پڑھے لکھے لوگ اپر پنجاب سے ملتان میں آئے۔ شیخ اصغر علی بعد ازاں ملتان کے کمشنر اور ڈویژنل جج کے عہدہ پر بھی تعینات رہے۔ جناب بیرسٹر شیخ عبدالرزاق مرحوم ان کے ان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ اصغر علی کے بعد دوسرا مسلمان ڈپٹی کمشنر ملتان خان صاحب زمان مہدی خان تھے۔ وہ پنجاب کے ایک معروف خاندان کے فرد تھے۔

ان دو مسلمان ڈپٹی کمشنروں کو تعیناتی کے بعد ایچ ڈبلیو ایمرسن ملتان کا ڈپٹی کمشنر مقرر ہو کر آیا اس کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ سال 1922ء کے محرم کے موقع پر ملتان میں ہندو مسلم فساد تھا۔ سال 1919ء میں تحریک خلافت کے دوران مہاتما گاندھی نے تحریک خلافت کی حمایت کر کے جو ہندو مسلم اتحاد کی فضا قائم کی تھی اس کے اثرات جنوبی پنجاب میں نمایاں تھے۔ اس فضا کو ملتان کے ہندو مسلم فساد نے نیست و نابود کر دیا۔ مسٹر ایمرسن اپنے دور کا نامی گرامی انگریز افسر تھا اس نے اپنے عرصہ تعیناتی میں ملتان کے بڑے خاندانوں کے ساتھ بڑی گہری دوستیاں قائم کر لیں اور بعد ازاں جب اس کی اعلیٰ امپریل خدمات کے صلے میں اس کو گورنر پنجاب مقرر کیا گیا تو اس نے ان ملتانی روساء کے ساتھ اپنی دوستی بڑی خوش اسلوبی سے نبھائی اور ملتان ڈویژن کے کئی روساء کے نوجوان بیٹوں کو ڈائریکٹ صوبائی سول سروس میں بھرتی کر لیا جو بعد ازاں پاکستان بننے کے بعد تک صوبائی انتظامیہ میں اعلیٰ خدمات سرانجام دیتے رہے میرے خیال میں ملتان کے ڈپٹی کمشنروں میں واحد مسٹر ایمرسن ہی گورنر پنجاب کے عہدہ پر ترقی کر کے متمکن ہوئے۔ کسی اور ڈپٹی کمشنر کو یہ اعزاز نصیب نہیں ہوا۔

مسٹر ایمرسن کے بعد ایچ فائی سن بھی ایک معروف اور قابل ڈپٹی کمشنر ملتان تھا۔ اس کے ملتان کے وکلاء کے ساتھ انسانی تعلقات بہت اعلیٰ تھے۔ مجھے ملک کرم ایزد صاحب مرحوم ایڈووکیٹ جو ملتان کے اپنے دور کے نامور فوجداری کے وکیل تھے نے اپنی کلاسیکل کوٹھی کی طرف اشارہ کر کے ایک دن فرمایا کہ یہ کوٹھی فائی سن ڈپٹی کمشنر نے ڈیزائن کی اور خود کھڑے ہو کر بنوائی۔ جب میں نے مزید دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں فائی سن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہوتا تھا وہ میری عزت کرتا تھا۔ جب میں نے موجودہ کوٹھی کا پلاٹ خرید کیا تو وہ اتفاقاً وہاں سے اتوار کے روز گھوڑے پر سوار گزرا میں دیوار کا احاطہ بنوا رہا تھا۔ وہ رک گیا اور اس نے مجھے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ ٹکڑا اراضی ملک صاحب آپ نے کس کام کے لیے خرید کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اس پر اپنا مکان بنوانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا ملک صاحب میں اس مکان کا ڈیزائن بناؤں گا میرا باپ انگلستان میں فن تعمیر کا ماہر تھا۔ میں نوجوانی میں اپنے باپ کے ساتھ اس کے دفتر میں کام کرتا رہا ہوں۔ پھر ایک روز فائی سن صاحب پٹواری جریبیں اور کاغذات لے کر پلاٹ کی پیمائش کرنے آ گیا اور پیمائش کر کے چلا گیا۔ چند روز بعد اس نے مجھے ایک خوبصورت کوٹھی ڈیزائن کر دی اور اس کے نقشہ جات میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے تعمیر کا آغاز کیا تو فائی سن گاہے بگاہے موقع پر آ کر راج اور مزدوروں کو ہدایت بھی دیتا رہا۔ میرے پاس پہلے بھی کیس کافی تھے جب لوگوں نے سنا کہ ملک ایزد کی کوٹھی ڈپٹی کمشنر بنوا رہا ہے تو میرے پاس زیادہ کیس آنے لگے۔ ان سالوں میں آبادی کاری کے چکوک کے نمبرداری کے مقدمے بہت زیادہ تھے۔ میں زیادہ فیس نہ لیتا تھا صرف دو سو روپے فیس لیتا تھا۔ فائی سن بالکل میرٹ پر فیصلہ کرتا تھا بعض کیس میرے حق میں اور جو میرے حق میں نہ ہو سکتے تھے وہ میرے خلاف اس طرح سے چھ ماہ میں جو آمدنی ہوئی وہ میں نے اپنی کوٹھی کی تعمیر پر خرچ کر دی اور خوبصورت جدید کوٹھی بن گئی۔ لیکن افسوس ہے کہ ملک کرم ایزد کی وفات کے بعد ملک صاحب کے بیٹوں نے اس خوبصورت کوٹھی کے ٹکڑے کر دیئے ہیں ورنہ اس کا ڈیزائن آج بھی کلاسیکل ہے۔

اب بھی اصل عمارت محفوظ ہے۔ اگر آپ آج بھی مسٹر فائی سن کی قابلیت اور محنت کو دیکھنا چاہیں تو اس عمارت کو جا کر دیکھیں۔ ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی۔''

فائی سن اور ای پی مون وغیرہ ایوب خان کے دور حکومت میں پرانے آئی سی ایس انگریز افسروں کے وفد کے ساتھ اپنے سابقہ ضلعوں کو دیکھنے کے سلسلے میں ملتان بھی آئے۔ عدالتوں کا چکر بھی اس وفد نے لگایا۔ رات کو جناب مخدوم سجاد حسین قریشی نے القریش میں ان کے کھانے کا اہتمام کیا۔ جہاں ملک کرم ایزد اور بعض پرانے وکلاء کے ساتھ ان کی گپ شپ ہوئی وہ سب پرانی باتیں یاد کر کے بے حد محظوظ ہوتے رہے۔

جن پرانے ڈپٹی کمشنروں کو یاد رکھنا چاہیے ان میں ای پی مون کا نام یادگیری کے قابل ہے۔ جنگ عظیم کے بعد لیبر پارٹی کی کامیابی کے سیاسی اثرات کے زیر اثر انگلستان کے محروم طبقوں کے بیٹوں نے بھی تعلیمی جوہر دکھانے شروع کئے چنانچہ ان مرحوم طبقات کے نوجوان بھی آئی سی ایس کے امتحانات میں کامیاب ہونے شروع ہو گئے۔ وہ کامیاب ہو کر جب ہندوستان میں انتظامیہ کے افسران کے طور پر تعینات ہوتے تھے تو ان کا رویہ سابقہ انگریز آئی سی ایس افسروں سے مختلف ہوتا تھا وہ سوشلسٹ خیالات سے متاثر تھے۔ انگریز قوم میں انفرادیت اور پسند ناپسند کا جذبہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں زیادہ شدید ہے چنانچہ یہ نئے انگریز آفیسر جنگ عظیم میں انگریزوں کے ترکوں، عربوں اور فلسطینیوں کے ساتھ تضادات کی وجہ سے مسلمانوں کے حامی نہ تھے۔ نیز ہندوؤں کے اعلیٰ تعلیم سرمایہ اور مغربی زندگی کے اثرات کی وجہ سے یہ نئے انگریز افسر ہندوؤں کے اعلیٰ طبقوں میں جلد گھل مل جاتے تھے جس کی وجہ سے ان کی اکثریت ہندوؤں اور کانگریس کی حامی ہو جاتی تھی۔ انہی قسم کے انگریز افسروں میں ای پی مون بھی تھا۔ اس کے طریقے قبل ازیں کے ڈپٹی کمشنروں سے مختلف تھے۔ اس کے دروازے سب کے لیے کھلے رہتے تھے۔ وہ ہندوؤں کی اپر کلاس کے گھروں میں چلا جاتا تھا کیونکہ وہاں پردہ نہ تھا اور Mixed سوسائٹی ہوتی تھی جس کی وجہ سے اس کے مسلمان اعلیٰ طبقوں کے لوگوں کے ساتھ گہرے انسانی تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ وہ امیر غریب کا سوال بھی پیدا کرتا تھا اور ہر جگہ بے دریغ چلا جاتا تھا۔ بعض اوقات اکیلا اور بعض اوقات ڈرائیور کے ساتھ ایسی جگہوں پر چلا جاتا جہاں اس سے پہلے انگریز ڈپٹی کمشنر کو کسی نے نہ دیکھا تھا۔ چنانچہ ملتان کے بڑے لوگ اس سے اندرونی طور پر خار کھاتے تھے۔ وہ 20-03-1934 سے 02-04-1937 تک ملتان کا ڈپٹی کمشنر رہا۔ اس کو ملتان کے مسلمان حکمران طبقے نے بڑی زک پہنچائی۔ اس نے سابقہ ڈپٹی کمشنروں کی طرح ملتان کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے امتحانات میں اپنا نام صدر کے عہدہ کے انتخاب کے لیے پیش کیا تو مخدوم سید محمد رضا گیلانی مرحوم خم ٹھونک کر مقابل آراء ہو گئے۔ برصغیر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخابات میں انگریز ڈپٹی کمشنر کے مقابلے میں ایک دیسی آدمی مقابل آراء ہو رہا تھا۔ یہ بہت ہی کانٹے دار الیکشن ہوا۔ ہر دو امیدواروں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کے منتخب اور نامزد ممبران کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ڈپٹی کمشنر لوگوں کے گھروں میں کار لے کر بھاگا پھرتا تھا اور ممبران کو اکٹھے کر کے انتخاب سے پہلے ضلع کے ڈاک بنگلوں میں محفوظ کرتا پھرتا تھا۔ اور ان کی خاطر خوشامد میں لگا ہوا تھا جبکہ

مخدوم رضا شاہ گیلانی ممبران کو قابو کر کے الجیلان اور دوسرے اپنے خاص دوستوں کی کوٹھیوں میں محفوظ کر رہے تھے۔
اس زمانے میں بعض ضلع کے افسران بوجہ عہدہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر ہوتے تھے۔ جن میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز، سول سرجن، ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر اور ویٹرنری کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی ممبران ہوتے تھے ای پی مون کا خیال تھا کہ تمام سرکاری ملازم جو ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر ہیں وہ اسے ضرور ووٹ دیں گے۔ اس سے ان ممبران کو قابو کرنے میں کچھ غفلت ہو گئی جب مخدوم صاحب نے دیکھا کہ غیر سرکاری منتخب ممبران میں دونوں فریقین کا پلہ برابر ہو رہا ہے تو انہوں نے دو سرکاری ممبران یعنی شوق صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ویٹرنری کو چھپا لیا جو آخر وقت تک مخدوم صاحب کی حمایت میں ثابت قدم رہے۔ انہوں نے الیکشن کے روز مخدوم صاحب کو علی الاعلان ووٹ دے کر دو ووٹوں کی برتری دلا کر کامیاب کرا دیا اور انگریز ڈپٹی کمشنر ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کی صدارت کا انتخاب ہرا گیا۔ اس شکست کی وجہ سے پوری برطانوی سامراج میں کہرام مچ گیا۔ اور پہلی مرتبہ انگریزوں کو احساس ہوا کہ سرکاری ملازم بھی اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کر کے ان کے خلاف ووٹ دینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ اس شکست کے بعد ای پی مون کو جلد ہی حکومت نے ملتان سے تبدیل کر دیا۔

ای پی مون بعد ازاں بہاولپور میں وزیر کے عہدہ پر بھی تعینات رہا اس کی تصانیف میں مسلمانوں کے بارے میں اور پاکستان کی تحریک کی مخالفت میں کافی مواد پایا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد وہ ریاست پٹیالہ کا بھی وزیر رہا۔ اس کے ملتان کے قیام کے دوران مسلمانوں کے جذبات تھوڑے سے مشتعل ہو گئے تھے۔ اس لیے انگریزوں نے اس کے بعد معروف مسلمان آئی سی ایس آفیسر میاں نصیر احمد کو ڈپٹی کمشنر ملتان مقرر کر دیا اور مسلمانوں کو برانگیخت جذبات کو سکون پہنچایا۔ میاں نصیر احمد نے اپنے عرصہ تعیناتی کے دوران سید اولاد علی گیلانی کو مرقع ملتان کی تصنیف و ترتیب کا مشورہ دیا اور مالی تعاون اور سرپرستی کر کے اس کتاب کو طبع کرا دیا۔ یہ تصنیف ملتان کی تاریخ اور معاشرت کا انمول ریکارڈ ہے جس میں اس دور کے معروف اشخاص کے بارے میں کافی سوانحی مواد پایا جاتا ہے میاں نصیر احمد نے بعد ازاں قانون مال گزاری میں اعلیٰ فیصلے کر کے بہت نام کمایا اور وہ پنجاب کے فنانشل کمشنر اور شاید چیف سیکرٹری بھی رہے۔ ان کے قانون مالگزاری کے فیصلہ جات آج تک قانونی حلقوں میں بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

پاکستان بننے سے پہلے اور میاں نصیر احمد کے ملتان سے بطور ڈپٹی کمشنر تبدیل ہونے کے بعد صرف دو مسلمان ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے ان دو میں سے طویل عرصہ سید فدا حسین آئی سی ایس ڈپٹی کمشنر ملتان رہے اور دوسرے مسلمان ڈپٹی کمشنر ملتان خان بہادر میاں افضل پی سی ایس تھے جو کچھ دن کم سات ماہ ڈپٹی کمشنر ملتان تعینات رہے۔ سید فدا حسین لاہور شہر کے معروف بخاری خاندان کے فرد تھے ان کا ملتان سے گہرا تعلق تھا۔ ان کے والد بزرگوار اور دوسرے کئی بزرگ ملتانیوں کے ہم جماعت اور ہم مکتب تھے۔ ان کے والد بابر چوک محلہ کڑی افغاناں نز خدکہ مسجد رہائش پذیر رہے تھے۔ سید فدا حسین پہلی مرتبہ سال 1940ء میں صرف ایک ماہ کے لیے ڈپٹی کمشنر ملتا رہے۔ دوسری مرتبہ سال 1941ء میں وہ چار ماہ ڈپٹی کمشنر ملتان رہے اور تیسری مرتبہ وہ سال 1945ء میں مز

چار ماہ ملتان کے ڈپٹی کمشنر تعینات رہے۔ اس طرح سے ان کا بطور ڈپٹی کمشنر ملتان عرصہ تعینات نو ماہ کے قریب بنتا تھا۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انگریزی دور میں مسلمانوں کو بلکہ تمام دیسی حضرات کو طویل عرصہ ڈپٹی کمشنر ملتان کے عہدہ پر تعینات نہ رکھا جاتا تھا۔ چند ماہ کے بعد تبدیل کر کے پھر انگریز افسر کو لگا دیتے تھے اگر کسی نے دو سال سے زیادہ عرصہ گزارا ہے تو وہ بھی کئی اقساط میں متواتر کسی کو موقع نہیں دیا گیا چونکہ انگریزی دور میں آزادی کی تحریکیں زوروں پر تھیں ملتان جیسے اہم فوجی اور سول مرکز پر کسی دیسی آفیسر کو زیادہ عرصہ بطور ڈپٹی کمشنر ملتان تعینات نہ کیا جا سکتا تھا۔ سید فدا حسین بعد ازاں پاکستان میں چیف سیکرٹری پنجاب، پاکستان کے ڈیفنس سیکرٹری اور پرنسپل سیکرٹری اور ایوب خان کے مشیر اور وزیر بھی رہے انہوں نے بہت عروج دیکھا اور نیک نام رہے۔

پاکستان بننے سے دس سال پہلے برطانوی دور کی آخری دہائی میں امپریل گورنمنٹ کے بے حد چہیتے تین انگریز ڈپٹی کمشنر ملتان قابل ذکر رہے۔ ایک مسٹر ہینڈرسن، دوسرے مسٹر بریندڑ اور تیسرے مسٹر سائکس، مسٹر ہینڈرسن جنگ کے دوران دو مرتبہ ڈپٹی کمشنر ملتان رہے اور انہوں نے آزادی کی تحریکوں کے باوجود ملتان میں امن و امان رکھا۔ ان میں سب سے طویل عرصہ لالہ عزت رائے پی سی ایس ڈپٹی کمشنر ملتان رہا۔ وہ انگریزوں کا اس قدر چہیتا تھا کہ تحریک آزادی اور جنگ عالمگیر کے دوران پونے دو سال متواتر ملتان کا ڈپٹی کمشنر رہا جبکہ اس کے مقابلے میں مسٹر ٹنڈن آئی سی ایس تھا اور ہندو تھا وہ صرف پونے تین ماہ ملتان کا ڈپٹی کمشنر تعینات رہا۔

آخری انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر اے جی وی ارتھر ایک نامی گرامی امپریلسٹ تھا مارچ 1937ء میں ملتان میں ہندو مسلم فسادات ہوئے جس کے تمام تر خارجی عوامل تھے لیکن اس ڈپٹی کمشنر نے ملتان شہر کے مسلمانوں کو مجرم گردانتے ہوئے ان پر چار لاکھ روپے اجتماعی جرمانہ عائد کر دیا جس پر مسلمانوں نے بے حد غم و غصہ کا اظہار کیا۔ مسلمان نوجوانوں اور زعماء کا ایک وفد نواب عاشق حسین قریشی مرحوم کی زیر قیادت جب ڈپٹی کمشنر ملتان سے اس حکم کی واپسی کے سلسلہ میں ملنے گیا تو بے حد تلخی پیدا ہو گئی اور سکہ بند راویوں کے مطابق ڈپٹی کمشنر نے مسلمانوں اور تحریک پاکستان کے بارے میں ایسے نامناسب کلمات کہے جس پر نواب عاشق حسین قریشی نے انگریز ڈپٹی کمشنر کو تھپڑ رسید کر دیا۔ جس پر پوری امپریل حکومت لرز گئی اور بعض معتبر لوگوں کے خیال کے مطابق جب انہی دنوں نواب عاشق حسین قریشی لاہور گئے تو وہاں پنجاب پولیس کے ایک سپاہی نے ان کو بلاوجہ گولی مار کر شہید کر دیا۔ وجہ دشمنی آج تک ظاہر نہ ہوئی۔ راویوں کے مطابق نواب صاحب کو شہید کر کے انگریزوں نے جاتے جاتے ایک انگریز کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا اور پاکستان کی مستقبل کی سیاست میں ایک معروف عوامی لیڈر کو پنپنے کے موقع سے محروم کر دیا اور نواب عاشق حسین قریشی کے شاندار مستقبل کو ناپاک ہاتھوں نے ختم کر دیا۔

پاکستان بننے سے قبل 5 اگست 1947ء کو اے جی وی آرتھر کو ملتان سے تبدیل کر کے اس کی جگہ مسٹر اے جی رضا آئی سی ایس کو ڈپٹی کمشنر ملتان مقرر کر دیا گیا۔ وہ صرف پینتالیس روز کے لیے ڈپٹی کمشنر ملتان رہے تھے۔ 14 اگست 1947ء کی تقریبات مسٹر اے جی رضا کی نگرانی میں سرانجام پائیں۔ ان کے جانشین مسٹر ایم اے ایس بیگ

پورے دو سال تک ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے وہ بے حد فرض شناس اور قابل افسر تھے مہاجرین کی آمد آمد تھی اور نئے نظام پاکستان کے بہت ہی کٹھن مسائل تھے۔ انہوں نے ملتان میں نظام بالکل صحیح رکھا اور مہاجرین کی آبادکاری اور روزمرہ کے مسائل کے حل میں کافی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

پاکستان بننے کے بعد جب پنجاب میں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوئی تو مسلم لیگیوں کے مابین جوتوں میں دال بٹنے لگی۔ پہلے نواب افتخار حسین ممدوٹ کی وزارت عظمٰی تھی پھر میاں ممتاز دولتانہ کا دور آ گیا تو اس کے ساتھ ہی پی سی ایس افسروں کا دور بھی شروع ہو گیا چنانچہ میاں ممتاز دولتانہ کے دور میں شیخ محمد رشید پی سی ایس 12-08-50 سے 30-06-53 تک کم و بیش تین سال ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے ان کے سیاست دانوں کے ساتھ بہت ہی گہرے مراسم تھے وہ اس وقت کی مسلم لیگی حکومت کے بے حد چہیتے آفیسر تھے میری عمر چھوٹی تھی لیکن میں شعور کی منزلیں طے کر چکا تھا میری یادداشت کے مطابق وہ مجھے کئی مرتبہ علی حسین شاہ گردیزی جو میاں ممتاز دولتانہ کے ملتان میں نائب تھے کے دیوان خانہ میں ملے وہ ملتان کی معاشرتی زندگی میں بے حد متحرک رہتے تھے اور ہر جگہ اپنی عوامیت کی وجہ سے موجود ہوتے تھے رشید آباد خانیوال روڈ کی بستی انہی کے نام پر قائم کی گئی جس میں ریواڑی اور سونی پت کے پارچہ بافوں کو آباد کیا گیا تھا ممتاز آباد میاں ممتاز دولتانہ کے نام پر اس دور میں آباد ہوا۔

پاکستان بننے کے بعد شیخ محمد رشید دوسرے پی سی ایس ڈپٹی کمشنر ملتان تھے ان سے پہلے ممدوٹ کی وزارت اعلیٰ کے دور میں چوہدری اورنگ زیب خان صرف ایک ماہ کے لیے ڈپٹی کمشنر ملتان رہے اس کے بعد آئندہ چھ سال متواتر ملتان کے تمام ڈپٹی کمشنر سی ایس پی حضرات تعینات ہوتے رہے جن میں شیخ منظور الٰہی، عزیز اصغر انصاری، نصرت حسن، مختار مسعود پاکستان کی سول سروس کے مایہ ناز افسران تھے جو ملتان کے ضلع کے سربراہ مقرر ہوئے۔

عزیز اصغر انصاری لاہور کے مایہ ناز انصاری خاندان کے فرد تھے ان کے خاندان کے بانی نے مسجد وزیر خان بنوائی تھی ان کے والد جسٹس ظفر علی جج ہائیکورٹ رہے تھے جن کے نام پر لاہور کی ایک سڑک آج بھی موجود ہے ان کی ہمشیرگان ان کی ڈپٹی کمشنر ملتان کے عہدہ پر تعیناتی سے بہت پہلے جنوبی پنجاب کے معروف خاندانوں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ وہ محمود نواز بابر ایڈووکیٹ اور پیپلز پارٹی کے ملک الطاف علی کھوکھر کے حقیقی ماموں تھے ان کی ایک ہمشیرہ ٹھٹھہ قریشیاں ضلع مظفر گڑھ کے قریشیوں میں بھی بیاہی ہوئی تھی وہ نہایت اعلیٰ منتظم اور قابل شخصیت کے مالک تھے لیکن ان رشتہ داریوں کی وجہ سے خواہ مخواہ متنازع شخصیت بنا دیئے گئے۔ نصرت حسن سی ایس پی نہایت باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی شاندار رہی وہ فنون لطیفہ اور ادب کے بے حد دلدادہ تھے بعد ازاں وہ پاکستان کے بہت سے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہے اور گاہے بگاہے ملتان آتے رہے اور ان عہدوں پر تعیناتی کے دوران اہل ملتان کی سرپرستی کرتے رہے۔

نصرت حسن کے جانشین ایک اور شاندار انسان ڈپٹی کمشنر ہوئے ان کا نام نامی مختار مسعود تھا۔ ان کے دو[ر] ڈپٹی کمشنر میں ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ ملتان کے لوگوں کے لیے یہ بے حد سخت دور تھا۔ مارشل لاء ا[...]

پوری حشر سامانیوں کے ساتھ نافذ ہوا۔ مارشل لاء کے نت نئے اوٹ پٹانگ احکامات سے ملتان کے شہریوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی اگر اس وقت مسٹر مختار مسعود ڈپٹی کمشنر ملتان نہ ہوتے۔ انہوں نے اپنی جرأت ہوشمندی اور مارشل لاء حکام کے تعاون اور اعلیٰ سوجھ بوجھ سے ضلع ملتان کے لوگوں کو مارشل لاء کے احکامات کی سختی سے بچالیا۔ انہوں نے اپنے دور میں ضلع ملتان (چھ تحصیلوں پر مشتمل) کی گھوڑے پر سوار ہو کر گرداوری کی اور ضلع ملتان کے دور افتادہ دیہات میں گھوڑے پر دورے کیے وہ دیہات کے امور میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے ملتان کی ادبی زندگی میں نئی روح پھونک دی۔ ان کے جانے کا ملتان کے لوگوں کو بے حد ملال ہوا۔ بعد ازاں وہ بہت ہی اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز ہوئے اور آر سی ڈی کے سیکرٹری جنرل بھی مقرر ہوئے۔ ان کی یادداشتوں پر مشتمل تین چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جنہیں ادب شناس ادبیات عالیہ کا درجہ دیتے ہیں۔

مختار مسعود کے جانشین ملک کرم داد خان پی سی ایس آفیسر تھے۔ یہ دور نواب آف کالا باغ کی گورنری کا تھا اور ملک کرم داد خان ان کے بے حد چہیتے افسر تھے۔ ان کے دور میں اعوانوں کو سرکاری زرعی زمینوں کی الاٹمنٹ کے سلسلہ میں کافی مراعات دی گئی۔ ملک کرم داد خان کے دور میں ڈپٹی کمشنر ملتان کے کورٹ روم کی پشت پر ضلع کچہری کی حدود میں پہلی مسجد تعمیر ہوئی جس میں ملک صاحب روزانہ ظہر کی نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ نیز انہوں نے مدرسہ قاسم العلوم کو گلگشت ملتان کے وسط میں ایک بڑا پلاٹ الاٹ کیا جہاں بعد ازاں بڑی مسجد اور مدرسہ تعمیر ہوا۔ جو آج کل بڑا دینی مرکز ہے۔ ملک کرم داد خان پندرہ دن کے لیے ملتان کے کمشنر بھی رہے وہ ایک مستعد نظم و ضبط قائم رکھنے والے افسر شمار ہوتے تھے۔

ملک کرم داد خان کے جانشین معروف سی ایس پی آفیسر ایس ایم نسیم ڈپٹی کمشنر ملتان ہوئے ان کا عرصہ تعیناتی بطور ڈپٹی کمشنر ملتان کم و بیش تیرہ ماہ تھا۔ بعد ازاں ایس ایم نسیم ترقی کر کے سینئر ممبر بورڈ آف ریونیو بن گئے اور چیف لینڈ کمشنر کے عہدہ پر بھی تعینات رہے اور وہ ملتان دوروں پر تشریف لاتے تھے اور ضلع ملتان کے کافی لوگوں پر مہربانیاں کرتے تھے۔

پاکستان بننے سے لے کر آج تک صرف نو (9) پی سی ایس افسران ملتان کے ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر تعینات رہے ہیں۔ جن کا عرصہ تعیناتی گیارہ سال چار ماہ بنتا ہے ان پی سی ایس افسران میں سب سے طویل عرصہ دو افسران کا بنتا ہے۔ شیخ محمد رشید جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور دوسرے میاں فیض کریم قریشی یہ دونوں حضرات لگ بھگ اکتیس ماہ ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے دونوں حضرات کی شخصیت اور کردار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میاں فیض کریم قریشی، ٹھٹھہ قریشی ضلع مظفر گڑھ کے معروف قریشی خاندان کے فرد تھے۔ ضلع ملتان میں پہلے بھی وہ تحصیل وہاڑی میں مجسٹریٹ اور ایس ڈی ایم کے عہدہ پر تعینات رہ چکے تھے۔ وہ پی سی ایس افسران میں بے حد جید آفیسر شمار ہوتے تھے۔ ملتان میں وہ مارشل لاء کے دور میں اچھا وقت گزار گئے۔ سرکاری جائیداد کی حفاظت اپنی ذاتی جائیداد سے زیادہ کرتے تھے۔ نزدیکی ضلع کے رہائشی ہونے اور ملتان کے ضلع میں بے شمار رشتہ داریوں کے باوجود متنازعہ شخصیت نہ

بے اور طبیعت میں سختی کے باوجود لوگ ان کو ان کی ایمانداری کی وجہ سے برداشت کر گئے۔

پی سی ایس افسران جو ملتان کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے ان میں ملک کرم داد خان، سید سرفراز حسین، میاں فیض کریم قریشی کے نام نامی بے حد مشہور ہوئے۔ سب سے کم عرصہ پی سی ایس ڈپٹی کمشنر چوہدری اورنگ زیب خان رہے۔ ان کا عرصہ تعیناتی صرف ایک ماہ رہا۔ ان کے بعد چوہدری رشید احمد فروری 1984ء میں ڈپٹی کمشنر ملتان تعینات ہوئے۔ ان کا عرصہ تعیناتی صف چار ماہ تھا۔ بعد ازاں وہ ایڈیشنل کمشنر ریونیو ملتان کے طور پر کچھ عرصہ تعینات رہے اور ملتان سے ہی ریٹائر ہو کر ملتان میں ہی رہائش پذیر ہو گئے۔ چوہدری رشید احمد سال 1968/1969ء میں ملتان کے سٹی مجسٹریٹ تھے جبکہ جودت کامران کی شہادت کا سانحہ وقوع پذیر ہوا اور پولیس کی فائرنگ سے ملتان کے معروف سرجن نشتر میڈیکل کالج کے پروفیسر وائن کا قابل اکلوتا فرزند شہید ہو گیا۔ اس وقت چوہدری رشید احمد کی ڈیوٹی تھی۔ جس کا ان کو ساری زندگی افسوس رہا۔ چوہدری رشید احمد طبعاً صلح کل شریف آدمی تھے۔

سید سرفراز حسین پی سی ایس کا بھی ملتان سے ملازمت کے سلسلہ میں کافی طویل تعلق رہا وہ سب سے پہلے ملتان میں سٹی مجسٹریٹ کے طور پر تعینات ہوئے۔ بعد ازاں اپریل 1973ء میں ملتان کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ بطور ڈپٹی کمشنر ملتان ان کا عرصہ تعیناتی گیارہ ماہ رہا بعد ازاں وہ ملتان کے کمشنر بھی تعینات رہے۔ ان کے ملتان کے بعض لوگوں سے کافی گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ دو پی سی ایس ایسے بھی تھے جو کچھ متنازعہ شخصیات سمجھی جاتی رہیں۔ میرا مطمع نظر سردار غلام فرید خان اور مسٹر بشیر طاہر سے ہے۔ سردار غلام فرید خان خود ساختہ شخصیت تھے وہ محکمہ مال کے چھوٹے عہدہ سے ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کمشنر ملتان کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ نواب آف کالا باغ کا دور تھا ایسا پاکستان کی برکت کی وجہ سے ہوا ورنہ وہ تحصیلدار یا زیادہ سے زیادہ مجسٹریٹ کے عہدہ سے ہی ریٹائر ہو جاتے۔ ان کا بطور ڈپٹی کمشنر ملتان عرصہ تعیناتی گیارہ ماہ تھا۔ وہ بعد ازاں سات دن کے لیے کمشنر ملتان کے عہدہ پر بھی تعینات رہے اور ملتان سے ہی ریٹائر ہو گئے۔

بشیر طاہر صرف نو ماہ کے لیے سال 1989/1990ء میں ڈپٹی کمشنر رہے وہ شاعر، ادیب، کالم نویس، نجومی، دست شناس، قیافہ شناس یعنی ہر فن مولا تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی ڈپٹی کمشنری ملتان کی تاریخ میں ایک بھی ڈپٹی کمشنر ان جیسا ماہر فن نہیں گزرا۔ ان کی ملتان سے تبدیلی کے بعد آج تک دس سال گزرنے والے ہیں تا حال کسی پی سی ایس آفیسر کو ملتان کا ڈپٹی کمشنر مقرر نہیں کیا گیا۔ بشیر طاہر نے بعد ازاں مزید عروج حاصل اور شمالی علاقہ جات کے مدیر المہام مقرر ہو گئے۔

عظمت اللہ خان پی سی ایس ملتان کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہونے سے پہلے ملتان کے اے ڈی ایم کے عہدہ پر تعینات رہ چکے تھے۔ وہ تحریک مصطفیٰ کے دوران ملتان کے ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر فائز رہے اور اس دوران بے حد مشکلات سے مقابل آراء ہوتے رہے نہ ان سے پیپلز پارٹی خوش ہوئی اور نہ ہی لوگ لیکن آدمی طبعاً ایماندار اور مہذب تھے اور قانون کا بہت لحاظ کرتے تھے۔

سال 1977ء میں ضیاء الحق کے مارشل لاء سے پہلے جو بی ایس پی حضرات ڈپٹی کمشنر ملتان مقرر ہوئے ان میں علی الترتیب اظہار الحق، ہمایوں فیض رسول، محمد ظفر اللہ، محمد حفیظ اللہ اور فرید الدین احمد کے نام قابل ذکر اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

شیخ اظہار الحق مثالی ڈپٹی کمشنر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان کی غیر جانبداری اور ایمانداری مسلم تھی۔ انہوں نے کافی ترقی کی اور بعد ازاں وہ پنجاب کے وزیر بھی رہے وہ ادبی لحاظ سے چھپے رستم نکلے اور اردو نثر نگاری میں بعد ازاں صاحب طرز انشاء پرداز ثابت ہوئے۔

ہمایوں فیض رسول کے والد ملتان میں سول سرجن رہ چکے تھے۔ ان کے کچھ تعلیمی سال ملتان کے سکولوں میں صرف ہو چکے تھے۔ وہ تقریباً دو سال ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے یہاں سے ہی وہ مشرقی پاکستان تعینات ہو کر چلے گئے اور بعد ازاں جنگی قیدی ہو گئے۔ قید سے رہائی کے چند سال بعد وہ کمشنر ملتان کے عہدہ پر بھی تعینات رہے۔ ان کی شخصیت مرنجان مرنج اور دوست دار تھی ملتان میں وہ کافی مقبول تھے۔

چوہدری محمد ظفر اللہ کے والد بھی ضلع ملتان میں ملازمت کے سلسلہ میں تعینات رہ چکے تھے۔ محمد ظفر اللہ کے چند تعلیمی سال ضلع ملتان کے بعض سکولوں میں صرف ہوئے تھے۔ سال 1957ء میں انہوں نے میرے ساتھ یونیورسٹی لاء کالج لاہور سے ایل ایل بی میں کامیابی حاصل کی۔ وہ ہماری کلاس کے رول نمبر 1 تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ جلد سی ایس ایس ہو گئے اور ملتان میں 1-1/2 سال ڈپٹی کمشنر رہے۔ بعد ازاں انہوں نے جوڈیشل سروس میں شمولیت اختیار کر لی اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں سیشن جج تعینات رہنے کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج نامزد کر دیئے گئے اور جب ملتان میں لاہور ہائی کورٹ کا بنچ قائم ہوا تو وہ کافی عرصہ ملتان بنچ پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے موجودہ ڈسٹرکٹ بار ہال کا افتتاح کیا۔ وہ بہت ہی اعلیٰ کردار اور قانونی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یقیناً بے حد ترقی کرتے اور شاید لاہور ہائی کورٹ اور پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ہو جاتے لیکن موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کے کیریئر کو فنا کر دیا اور وہ جھنگ کے قریب ایک ٹریفک کے حادثے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جس کا ہماری بار کو بے حد افسوس ہوا۔

شیخ فرید الدین احمد کا بھی ملتان سے تین پشتی تعلق تھا۔ ان کے دادا ملتان میں افسر مال رہے تھے اور ان کے والد ملتان کے تعلیم یافتہ تھے ان کے والد ملتان میں مجسٹریٹ تعینات رہے اور بعد ازاں ترقی کرتے کرتے ضلع مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنر رہے وہ بھی اچھی شہرت کے مالک تھے۔ ملتان میں ان کے خاندان کی رشتہ داریاں تھیں اور بورے والا کے قریب ان کے خاندان کے گریجوایٹ بزرگوں کو گریجوایٹ چک میں ارضیات بھی ہوئی تھیں۔ جہاں ان کے باغات کی کافی شہرت تھی۔ فرید الدین احمد بے حد پبلک سپرٹ کے مالک بہت اچھے آفیسر تھے۔ ان کی سفارش پر گورنر پنجاب نے لائبریری باغ لانگے خان ملتان کو جنوب کی طرف واقع 3 کنال پلاٹ جدید عمارت کی تعمیر کے لیے عطا کیا۔ بعد ازاں وہ ملتان کے کمشنر کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ ان کی یادگار ملتان پبلک سکول فار بوائز آج

بھی اعلیٰ تعلیمی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ موجود کمشنر ناصر محمود کھوسہ نے بھی ملتان پبلک سکول فار گرلز قائم کر کے شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ جو تا دمِ دوام ان کے نام نامی کو روشن رکھے گا۔ فرید الدین احمد بعد ازاں پاکستان کے اہم عہدوں پر فائز رہے اور ہر جگہ نیک نام رہے۔

ملتان کے ڈپٹی کمشنروں میں چوہدری حفیظ اللہ کا نام نامی آج تک یاد ہے وہ بہت ہی اچھے آفیسر تھے۔ ملتان کے عرصہ تعیناتی میں انہیں ایک جانکاہ صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ جس پر اہل ملتان کو آج تک بہت ہی دکھ رہا ہے ان کا لڑکا جو ابھی دس بارہ سالہ تھا ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے نزدیک واقع ایک کوٹھی میں اپنی گیند کی تلاش میں دیوار پھلانگ گیا جہاں کوئی حیوان چوکیدار تھا جس نے اس معصوم بچے کو بے تحاشا پیٹا جس کے صدمہ سے وہ لڑکا فوت ہو گیا۔ یہ صدمہ چوہدری حفیظ اللہ اور ملتان کے لوگوں کے لیے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ پورے ضلع کی ہمدردیاں چوہدری صاحب کے ساتھ تھیں لیکن چوہدری صاحب نے ملتان سے اپنا تبادلہ جلدی کرا لیا۔ بعد میں وہ بورڈ آف ریونیو کے ممبر کے طور پر ملتان میں کافی مرتبہ تشریف لائے لیکن ملتان کے لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ غیر جانبدارانہ اور انصاف پرور تھا۔

مہر جیون خان جھنگ کے دور افتادہ دیہات کے قابل فرزند پاکستان تھے اور اپنے تمام دورہ ملازمت میں ایک جید اعلیٰ درجہ کے منتظم آفیسر شمار ہوئے۔ وہ اپنے دبنگ فیصلوں کی وجہ سے یاد کیے جاتے ہیں۔ وہ ملتان کے تقریباً پونے تین سال ڈپٹی کمشنر رہے۔ یہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے ابتدائی سال تھے۔ حالات بے حد گھمبیر تھے۔ انہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس صبر آزما دور میں حالات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی اور اس میں خاصے کامیاب رہے۔ یقیناً کچھ لوگوں کے بارے میں انہوں نے نظر بندی کے احکامات صادر کیے جن کی تلخی آج ان لوگوں میں موجود ہو گی۔ لیکن وہ امن و امان قائم کرنے کی اپنی بنیادی ذمہ داری کو بطریق احسن نبھانے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد ازاں اپنی اس شہرت کی وجہ سے پنجاب اور وفاق کے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے میری تصنیف ہسٹری آف جوڈیشری اینڈ ایڈمنسٹریشن آف ملتان کا تعارف کرتے ہوئے اہل ملتان کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔ اس تعارف میں انہوں نے ان ڈپٹی کمشنروں کا ذکر کیا جن کا ملتان میں عرصہ تعیناتی دو سال یا دو سال سے زائد رہا۔

ان کی مرتب کردہ فہرست اس طرح ہے۔

میجر وائل	29-01-1856 سے 13-12-1861 تک
جنرل فان کورٹ لینڈ	15-11-1863 سے 23-03-1868 تک
کرنل فیرس	15-11-1870 سے 13-04-1873 تک
کیپٹن لانگ	21-12-1877 سے 02-06-1882 تک
مسٹر اوای او برائن	02-06-1882 سے 27-02-1885 تک

مسٹر اوبرائن سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ سرائیکی زبان کا عالم تھا ہر وقت سکاٹش کلٹ پہنتا تھا عوام میں پھرتا رہتا تھا۔ ملتان کے لوگ اسے گھگھری والا صاحب کے نام سے یاد رکھتے ہیں۔ سرائیکی زبان اور اس کے محاورہ پر ایک کتاب کا منصف تھا۔ بعد ازاں ملتان کا کمشنر بھی رہا اور بہاولپور میں وزیر مال بھی رہا۔

میجر جے پی جی سن	01-04-1885 سے 14-07-1887 تک
مسٹر ایچ فائی سن	27-03-1923 سے 24-06-1925 تک
مسٹر ای پی مون	20-03-1934 سے 21-03-1937 تک
مسٹر ایس ایم رشید	12-08-1950 سے 22-02-1953 تک
مسٹر عزیز اصغر انصاری	10-09-1954 سے 16-11-1956 تک
ڈاکٹر امتیاز احمد خان	20-06-1966 سے 04-11-1969 تک

مہر جیون خان کے خیال کے مطابق ایک ڈپٹی کمشنر کی صحیح کارکردگی کے جائزہ کے لیے کم از کم دو سال کا عرصہ تعیناتی نہایت ضروری ہے۔

ڈاکٹر امتیاز احمد خان کے دور میں ملتان میں جشن امیر خسرو شان شایان طریقہ سے منایا گیا ان کو ایوان خسرو کی تعمیر کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اس افتتاح کے بعد جلدی سے اس کی تعمیر کی طرف توجہ دی۔ عمارت چھت تک پہنچ گئی تھی کہ ان کا تبادلہ ہو گیا۔ اس کے بعد کسی نے عمارت کی تکمیل کے لیے کوئی کوشش نہ کی اور آخر کار موسمی حالات اور امتداد زمانہ سے عمارت بے حد خستہ ہو گوی اور اس عمارت کو گرا دیا گیا۔ آج اس جگہ پر سٹیٹ بنک کی عالی شان عمارت جلوہ افروز ہے۔ لیکن ڈاکٹر امتیاز احمد خان کا ملتان کے لیے ایک عوامی ہال کی تعمیر کا خواب آج تک پورا نہیں ہو سکا۔

ڈاکٹر امتیاز احمد خان کے دو سال سے زائد دورہ ڈپٹی کمشنر کے بعد آج تک صرف دو اور ڈپٹی کمشنر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ملتان کے اس اہم عہدہ پر دو سال مکمل کوے ہیں۔ ان کے نام شہزاد قیصر اور سید شوکت علی شاہ ہیں۔ دونوں صاحب تصنیف ادیب ہیں۔ شہزاد قیصر کا تعلق ملتان سے کافی عرصہ رہا وہ پہلے شجاع آباد میں بطور پراجیکٹ آفیسر تعینات رہے پھر ملتان کے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں 09-11-1986 سے 02-01-1989 تک ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ انہوں نے ملتان کے عرصہ تعیناتی میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے خواجہ فرید علیہ رحمت کے فلسفہ اور تعلیمات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ان کا مقالہ شائع ہو چکا ہے وہ میراں تخلص کے تحت بہت اعلیٰ کافیاں کہتے ہیں۔ ان اوصاف کے علاوہ وہ اعلیٰ انتظامی قابلیت کے مالک ہیں۔ ملتان کے لوگ ان کے لیے ہر وقت رطب اللسان رہتے ہیں۔ سید شوکت علی شاہ کے دور کا اہم واقعہ ملتان میں بین الاقوامی اردو معاشرہ کا انعقاد تھا۔ سید شوکت علی شاہ 09-07-1990 سے 05-10-1992 تک ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ اعلیٰ انتظامی اوصاف سے متصف تھے۔

محمد سعید مہدی جو گزشتہ سالوں میں 1999ء میں وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کے پرنسپل سیکرٹری تھے مورخہ 01-04-1980 سے 23-07-1981 تک ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ وہ بہت ہی شوق سے عدالت لگاتے اور اپیلیں سماعت کرتے تھے اور بروقت فیصلے سناتے تھے۔

حسب ذیل ڈپٹی کمشنر ملتان میں ایک سال سے کم عرصہ تک تعینات رہے۔ طارق سلطان، محمد ضیاء الرحمٰن، اخلاق احمد تارڑ، سجاد وسیم ہوتیانہ لیکن اس کے باوجود ان حضرات نے قلیل عرصہ تعیناتی میں اپنی شخصیت کے گہرے اثرات چھوڑے۔

طارق محمود سی ایس پی ملتان میں 11-04-1985 سے 09-11-1986 تک بطور ڈپٹی کمشنر تعینات رہے وہ ملتان میں اپنی سلامت روی سادگی اور نیک نیتی کی وجہ سے مقبول تھے۔ ان کی ملتان میں رشتہ داریاں بھی تھیں لیکن وہ متنازعہ شخصیت نہ بنے وہ ڈپٹی کمشنر ملتان بننے سے پہلے بھی بطور ادیب انشاء پرداز اور سماجی شخصیت کے طور پر پورے پنجاب میں معروف تھے۔ بعد ازاں وہ کافی عرصہ وزارت اطلاعات ثقافت اور امور نوجوانان حکومت پنجاب کے سیکرٹری کے طور پر تعینات رہے اور وہ صوبہ پنجاب میں ثقافت کے میدان میں کافی اعلیٰ خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ سیکرٹری ثقافت کے طور پر ملازمت ان کے مزاج کے عین مطابق تھی۔

کیپٹن خالد سلطان ایک دبنگ آفیسر تھے جو مورخہ 01-04-1983 سے 16-01-1985 تک ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ انہوں نے اپنے دور میں شیش محل کلب ملتان کی عمارت کی تعمیر جدید کا اہتمام کیا اور اس پراجیکٹ کو کامیاب بنایا لیکن افسوس ہے کہ ایک معمولی سی بات پر کیپٹن خالد سلطان ڈپٹی کمشنر ملتان اور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن ملتان کے مابین جھگڑا ہو گیا۔ جس پر وہ دو سال کا عرصہ بطور ڈپٹی کمشنر ملتان پورا نہ کر سکے اور ہم اہل ملتان ان کی کارکردگی کے جوہر کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ میری یادداشت کے مطابق ملتان کی ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کا کسی دیگر ڈپٹی کمشنر کے ساتھ نہ پہلے نہ بعد ایسا شدید تصادم ہوا۔ حالانکہ افسران کی رائے میں ملتان ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن طبعاً شریف بار ہے۔

کیپٹن خالد سلطان کے جانشین سجاد سلیم ہوتیانہ ڈپٹی کمشنر ملتان بن کر آئے وہ ملتان ڈویژن کے پاکپتن ضلع کے معروف ہوتیانہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک علم دوست خاموش طبع آفیسر تھے۔ انہوں نے اپنے کورٹ روم کی پشت پر واقع مسجد جسے ملک کرم داد خان ڈپٹی کمشنر نے تعمیر کرایا تھا کی از سر نو تعمیر کا آغاز کیا۔ نئی مسجد کا ڈیزائن ڈپٹی کمشنر کے کورٹ روم کی بلڈنگ سے ملتا جلتا بنایا گیا اور کافی وسیع جگہ مسجد کے لیے مختص کر دی گئی ان کے جانے کے بعد اس نئی مسجد کی تعمیر میں ان کے جانشین ڈپٹی کمشنروں جنید اقبال اور ظفر سلیم نے کافی دلچسپی لی جس کا نتیجہ آج کی ایک نہایت ہی شاندار مسجد کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہر وقت جلوہ فگن ہے اور اہل ایمان کے لیے جائے اعلاء کلمتہ الحق ہے۔ چوہدری ظفر سلیم کا بھی ملتان سے تعلق تھا۔ ان کے رشتہ دار جناح آباد جیل روڈ پر رہائش پذیر تھے۔ وہ ملتان میں بطور ڈپٹی کمشنر اندازاً ایک سال دو ماہ تعینات رہے وہ طبعاً جوڈیشل آفیسر تھے عدالت

لگانے کا پورا اہتمام کرتے تھے۔ مسٹر جنید اقبال ملتان ڈویژن کے ضلع خانیوال کی تحصیل چیچہ وطنی کے ایک معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے چچا محمد خان کافی عرصہ محکمہ پولیس کے اہم عہدوں پر ہمارے ضلع میں تعینات رہے اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد ملتان میں ہی آباد ہوئے اپنے وسیع انسانی تعلقات کی وجہ سے عموماً وہ ملتان کی تقریبات میں دیکھے جاتے تھے۔ مسٹر جنید اقبال ائرفورس کے آفیسر تھے۔ سابق ضلع ملتان کی تحصیل لودھراں میں اسسٹنٹ کمشنر تعینات رہے اور ضلع کچہری کی تزئین خصوصاً گرین پلاٹ بنانے میں انہوں نے کافی دلچسپی لی۔ طبعاً وہ ترقی والے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے وہ مورخہ 1995-09-04 سے 1996-14-14 تک ڈپٹی کمشنر ملتان تعینات رہے۔ بطور ڈسٹرکٹ کلکٹر ملتان انہوں نے کافی اعلیٰ فیصلے کیے۔ محکمہ مال کے عملے پر ان کی گرفت سخت رہی۔ وہ بطور ڈپٹی کمشنر ملتان اچھے لفظوں میں یاد کیے جاتے ہیں۔

سیف اللہ چٹھہ مورخہ 1998-02-04 سے 1996-11-16 تک ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ ان کے دور میں کچہری ملتان کے قریب اوور ہیڈ برج کی تعمیر کا منصوبہ روبہ عمل ہوا۔ انہوں نے اور کمشنر ملتان ناصر محمود کھوسہ نے اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اور اس کے راستے میں گوناگوں مشکلات کو رفع کرنے میں اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔ نیز مسٹر سیف اللہ چٹھہ نے ضلع کچہری میں وکلاء کی سیٹوں کی تعمیر جدید اور ان میں اضافہ کے سلسلہ میں دامے درمے سخنے کافی امداد دے کر اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ جس سے وکلاء کی نشستوں کے مسائل کافی حد تک حل ہو گئے ہیں۔ اکتوبر 99ء میں جیسے ہی ملک میں نیا نظام نافذ ہوا، مسٹر سیف اللہ چٹھہ کو تبدیل کر کے موجودہ ڈپٹی کمشنر میجر شکیل احمد کو تعینات کر دیا گیا۔ وہ ملتان کے 156ویں ڈپٹی کمشنر ہیں اور گزشتہ سو سال میں وہ 104 (ایک سو چارویں) ڈپٹی کمشنر ہیں اور پاکستان بننے کے بعد وہ چالیسویں (40) ڈپٹی کمشنر ہیں وہ سیاچین محاذ کے ہیرو ہیں۔ جہاں وہ جنگ میں زخمی ہوئے۔ ان کا بھی ملتان سے تعلق رہا ہے۔ ان کے والد بزرگوار راؤ جلیل احمد ملتان میں بطور پولیس آفیسر تعینات رہے اور میجر شکیل احمد نے اپنے چند تعلیمی سال ملتان کے ایک سکول میں زیر تعلیم رہ کر گزارے ہوئے ہیں۔ وہ سول اور ملٹری میں بہت اعلیٰ تعلقات رکھتے ہیں۔ بقول مہر جیون خان کسی ڈپٹی کمشنر کی کارکردگی کا صحیح جائزہ کے لیے اس کا اپنے ضلع میں دو سال تعینات رہنا نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا اگر میجر شکیل احمد موجودہ ڈپٹی کمشنر جو بے حد فعال متحرک اور باہوش آفیسر ہیں دو سال تک ملتان میں ڈپٹی کمشنر تعینات رہے تو وہ نامور ڈپٹی کمشنروں کی صف میں جگہ پائیں گے۔ میجر شکیل احمد آخری ڈپٹی کمشنر ملتان تھے ان کے بعد یہ عہدہ ختم کر دیا گیا اور ان کے جاتے ہی ان کے خلاف الزامات کا طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ شاید قدرت کو آخری ڈپٹی کمشنر ملتان کو بدنام کر کے اس نظام کو ختم کرنا مقصود تھا۔ ایسا ہونا تو چاہیے تھا۔

(ملتان بار ایسوسی ایشن کے سو سال - عمر کمال خان ایڈووکیٹ)



ڈاکٹر اسلم انصاری

فنِ تعمیر پر ایک نظر

اسلامی فن تعمیر کے قابل ذکر نمونے اولاً شام اور مصر میں وجود میں آئے، بعد ازاں شمالی افریقہ، اسپین، ایران، وسطی ایشیا، ترکی اور برصغیر پاک و ہند میں صورت پذیر ہوئے۔ فن تعمیر کے یہ نمونے زیادہ تر مساجد، محلات، اور مقابر کی حیثیت سے متمدن دُنیا کے ایک بڑے حصے میں نمودار ہوئے اور اپنی شان و شوکت اور جلال و جمال کے اعتبار سے دُنیا کے گراں قدر تہذیبی اثاثوں میں شمار ہوئے۔ محمد بن قاسم نے فتح سندھ اور ملتان کے بعد دیبل اور ملتان میں شاندار مساجد تعمیر کیں۔ جو افسوس ہے کہ انقلاباتِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ محمود غزنوی کی فتح لاہور کے بعد ملتان اور لاہور میں اسلامی فن تعمیر کے بہت سے نمونے وجود میں آئے ہوں گے لیکن عہد سلاطین سے پہلے کے فن تعمیر کے بہت کم نمونے باقی رہ سکے۔ دہلی کے مرکزی حکمرانوں کے علاوہ برصغیر کے دوسرے حصوں کے مسلمان حکمرانوں نے فن تعمیر کے بہت خوبصورت نمونے تخلیق کئے، جن کے نتیجے میں فن تعمیر کے کئی طرز یا دبستان وجود میں آئے۔ ان دبستانوں کو درج ذیل عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ مغربی پنجاب کا طرز (جو دراصل ملتان کے طرز کی توسیع ہے)

۲۔ بنگال کا طرز

۳۔ جون پوری طرز

۴۔ گجرات کا طرز

۵۔ مانڈو اور مالوہ (دکن) کا طرز

۶۔ بیجاپور اور خاندیش کا طرز

۷۔ ملتان کا طرز

برصغیر کے باقی تمام دبستانوں کے مقابلے میں ملتان کا طرز تعمیر زیادہ قدیم شمار ہوتا ہے۔ ملتان میں مسلمانوں کے آمد سے قبل ملتان کے فن تعمیر کی کیا صورت حال تھی، اس کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی، لیکن قلعہ ملتان کی قدامت اور ملتان کے سورج مندر کی تاریخی حیثیت کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ملتان

قدیم فن تعمیر بھی خاصا ترقی یافتہ تھا۔عرب فاتحین کے آنے پر جو طرز تعمیر وجود میں آیا بعد کے حملہ آوروں نے اُس کو بھی نیست ونابود کردیا۔اس لئے ملتان میں عربوں کے دور کے فن تعمیر کے آثار نہ ہونے کے برابر ہیں۔البتہ کچھ باقیات ضرور موجود ہیں۔

خالد ولید نامی کسی بزرگ کا مقبرہ اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔یہ مقبرہ سادگی اور صلابت کا نمونہ ہے،اس کی تعمیر میں چھوٹی پختہ اینٹ استعمال کی گئی ہے،لیکن یہ اینٹ بعد کی چھوٹی اینٹ کے مقابلے میں خاصی بڑی ہے۔اس مقبرے میں کاشی کاری کے نمونے نہ ہونے کے برابر ہیں،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقبرہ عہد سلاطین سے کافی پہلے تعمیر ہوا ہوگا۔ملتان کے قدیم فن تعمیر کا ایک اور اہم نمونہ ''ساوی میت'' (سبز مسجد) ہے جو محلّہ کوٹلہ تولے خاں کے جنوبی حصے میں واقع ہے،عرفِ عام میں تو یہ مسجد کہلاتی ہے لیکن اس میں اچھی خاصی تعداد میں قبریں موجود ہیں اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ بنیادی طور پر یہ کوئی مقبرہ تھا یا مسجد تھی جس کے صحن کو گورستان بنا دیا گیا۔یہ مسجد اچھی خاصی بلندی پر واقع ہے اور ایک تنگ سا زینہ اس کے چبوترے کی طرف لے جاتا ہے،چونکہ اس کی تعمیر میں کاشی گری کو خاص طور پر استعمال کیا گیا،اس لئے مقامی محاورے کے مطابق اسے ''ساوی میت'' قرار دیا گیا۔قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہاں بعض حکمران حتیٰ کہ بادشاہ بھی دفن ہوں گے،لیکن کسی مؤرخ یا ماہر فن تعمیر نے اس عمارت کے بارے میں مصدقہ معلومات فراہم نہیں کیں۔گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں اس مسجد یا مقبرے کے بہت سے حصے دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گئے،راقم الحروف نے اپنے بچپن میں اس مسجد کو جس حالت میں دیکھا تھا اب اُس کا نصف بھی موجود نہیں ہے،لیکن اپنی ہیئت اور اندازِ تعمیر کے اعتبار سے یہ ملتان کے قدیم طرزِ تعمیر کا ایک بہت قیمتی نمونہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا تعلق عہد سلاطین کے پہلے دور سے ہے۔

ملتان کے اہم ترین تعمیراتی نمونوں میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اور اُنکے پوتے ابوالفتح رکن الدین رکن عالم کے مقبروں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔یہی دو اہم تعمیرات ہیں جن میں قبلِ مغل فنِ تعمیر کی بنیادی خصوصیات نمودار ہوئی ہیں۔ان میں بالخصوص شاہ رکن عالم کا مقبرہ غیر معمولی فنی خصائص رکھتا ہے۔یہ دونوں متذکرہ بالا مقابر قلعۂ کہنہ پر واقع ہیں۔شاہ رکن عالمؒ کا مقبرہ بلندی کے اعتبار سے دُنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔یہ ایک ہشت پہلو عمارت ہے جس کے بارے میں عمومی روایات یہ ہیں کہ اِسے غیاث الدین محمد تغلق نے اُس زمانے میں تعمیر کرایا تھا جب وہ دیپال پور کا حاکم تھا اور ابھی شہنشاہِ ہند نہیں بنا تھا۔یہ مقبرہ اُس نے اپنی تدفین کے لئے تعمیر کرایا تھا لیکن وہ ملتان سے بہت دور دہلی میں فوت ہوا جب وہ شہنشاہِ ہند تھا،اس لئے اُس کی تدفین یہاں نہ ہوسکی اور بالآخر اِسے حضرت رکن عالمؒ کے وارثوں کے سپرد کیا گیا،کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مقبرہ محمد تغلقؒ نے اپنے عہد میں اپنے لئے تعمیر کرایا تھا لیکن اس کی تدفین بھی یہاں نہ ہوسکی۔قبل از مغلیہ دور کی یہ ہشت پہلو عمارت تین منزلہ ہے،اس کے ہر پہلو پر ایک مخروطی بُرج عمارت میں مدغم نظر آتا ہے،اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس عمارت کا بنیادی تصور یعنی اس کا lait motfi ایک قلعے کا ہے یہ مقبرہ اپنی بلندی اور طرزِ تعمیر میں بے مثال ہے،اس کا گنبد پاکستان کی موجودہ تاریخی

عمارتوں میں سب سے بڑا ہے۔اس مقبرے میں کاشی گری کے اجزا یعنی نیلگوں اور فیروزی گلکاری کی حامل چھوٹی اینٹیں بکثرت استعمال کی گئی ہیں۔کاشی کے ان نمونوں میں خطِ ثلث اور کہیں کہیں خطِ کوفی میں اسلامی خطاطی کے اعلیٰ پائے کے نمونے بھی سموئے گئے ہیں غرض بلندی، وسعت اور شان وشکوہ کے اعتبار سے یہ مقبرہ اپنی مثال آپ ہے اسے پاکستان میں قدیم ترین اسلامی فن تعمیر کا پہلا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔اس مقبرے نے اس خطے میں ایک بنیادی نمونے کی صورت اختیار کرلی، کم از کم دو مقبرے ایسے ضرور موجود ہیں جن میں اس نمونے کی تقلید واضح طور پر دکھائی دیتی ہے، ایک اوچ میں مائی جیوندی کا مقبرہ جو اپنا نصف وجود کھو چکا ہے، اور ایک ملتان ہی میں سخی اکبر سلطان کا مقبرہ جو ہشت پہلوئی تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت شاہ شمس سبزواریؒ کے مقابر مکعب نما عمارت پر گنبد کے اضافے پر مشتمل ہے۔اور اپنی وجاہت کے اعتبار سے دونوں مقابر میں وہ عنصر موجود ہے جس کو انگریزی میں Elegance کہتے ہیں۔مساجد میں مسجد پھول ہٹ کافی قدیم معلوم ہوتی ہے اور قدیم طرز پر بنائی گئی ہے جس میں کم اونچائی میں سامنے کے سہ درے خاص طور پر نمایاں ہیں۔لیکن قدیم مساجد میں فن تعمیر کے اعتبار سے مسجد ولی محمد کا ڈیوڑھا جو تقریباً بارہ دری کی شکل میں ہے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ اس قدیم مسجد کا جدید اضافی حصہ ہے جو قدیم سے یہاں موجود تھی، بلکہ بعض روایات کی رو سے یہ کوتوالی تھی اور اس کے جنوب میں اس کوتوالی کو چبوترہ تھا جس پر مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔اگرچہ تاریخ میں اس کا کوئی بیان موجود نہیں لیکن یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ نسبتہً کے ماضی میں کوتوالی کو شہر سے باہر منتقل کیا گیا! (جو شاید وہی ہے جسے اب ''پرانی کوتوالی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اگرچہ کسی تاریخی ماخذ میں اس کا ذکر موجود نہیں لیکن اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ ملتان جو تنگ اور خمیدہ گلیوں اور بازاروں کا شہر تھا، اس میں چوک کا اضافہ شاید اسی مسجد کی وجہ سے کیا گیا ہوتا کہ حاکم وقت یہاں نمازِ جمعہ ادا کر سکے، اور اس سلسلے میں شہر ملتان نواب علی محمد خاں خاکوانی کا رہین منت ہو جو عوام الناس کی زبانوں پر ولی محمد کے نام سے مشہور ہیں۔اب تک جن تعمیرات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کوئی بھی مغلیہ طرزِ تعمیر کی نمائندگی نہیں کرتی ،۔اصل بات یہ ہے کہ سلاطین دہلی کے عہد میں ملتان کو اس کے مشائخ اور بزرگانِ دین کی وجہ سے جو اہمیت حاصل تھی، وہ مغلوں کے عہد میں باقی نہ رہی، اور اگر کچھ عمارات ہوں گی بھی سہی تو قلعے میں ہوں گی، جو ۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کے حملے میں تباہ کر دی گئیں۔متاخر عہدِ مغلیہ کی صرف ایک عمارت باقی ہے جس کے بارے میں اندیشہ ہے کہ دست بردِ زمانہ کی نذر ہو جائے، یہ عید گاہِ ملتان ہے جسے ملتان کے مغلیہ عہد کے گورنر نواب عبدالصمد خاں نے تعمیر کرایا تھا، انگریزوں اور سکھوں کے عہد میں عید گاہ اور مسجد ولی محمد خاں دونوں بارود خانے اور اصطبل کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔مسجد ولی محمد خاں پر تو بیسویں صدی کے آغاز تک تالے لگے رہے، چنانچہ یہ تاریخی مسجد ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں مسلمانوں کی ان تھک کوششوں سے کسی وقت واگذار ہوئی۔

اندرون شہر کے عمومی طرزِ تعمیر میں چھوٹی اینٹ کا استعمال بکثرت دکھائی دیتا ہے بلکہ اب تو یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دکھائی دیتا تھا، اندرون شہر کے مکانات ہر حال میں دومنزلہ ضرور ہوتے تھے۔جن میں لکڑی کی بالکنیاں

ضرور شامل ہوتی تھیں ۔آبی گذرگاہ کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے یہاں عمارتی لکڑی بہ آسانی دستیاب ہوتی تھی ،اس لئے چوبی بالکنیاں ملتان کے عمومی طرزِ تعمیر کا حصہ تھیں ۔نئی تعمیرات کی وجہ سے اندرونِ شہر میں تو یہ بالکنیاں اپنے انجام کو پہنچ چکیں ،البتہ ایک دو مقامات پر یہ اپنی پرانی وضع کے ساتھ موجود ہیں ،ان مقامات میں سب سے اہم بیرون بوہڑ گیٹ کے ساتھ ہی جنوب مغربی حصے کے بالائی حصے میں موجود ہیں ،اگر میرا بس چلتا تو میں ان بالکنیوں کو قومی ثقافتی ورثے میں شامل کرواتا ۔تاہم خواہش کرنے میں ۔اور ذکر کرنے میں کیا حرج ہے۔

اب آخر میں میں ایک بہت ہی مختصر موازنہ مغلیہ طرزِ تعمیر اور ملتانی طرزِ التعمیر میں کرنا چاہتا ہوں جس کا مقصد ایک جمالیاتی اور کسی حد تک فنی تجزیہ ہے ۔مغلیہ طرزِ تعمیر کی ساری عظمت سنگِ مرمر یا سنگِ سرخ کی رہینِ منت ہے ،اس سے تعمیراتی حسن یا فنی خوبیوں کی نفی مقصود نہیں ۔عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر سنگِ مرمر بطور میڈیم موجود دستیاب نہ ہوتا تو شاید تاج محل اتنا خوبصورت نہ بن پاتا ۔اسی طرح اگر سنگِ سرخ میسر نہ ہوتا تو لال قلعہ کا نام کچھ اور ہوتا ۔ملتان میں جو میڈیم دستیاب تھا وہ پختہ خشت پر کاشی کاری کی صورت میں تھا ۔اسی طرح ملتان کے فنِ تعمیر کا ایک جزو چوبی کندہ کاری بھی تھا جس کے کچھ نمونے آج بھی کہیں نہ کہیں دیکھی جا سکتی ہے۔

روحِ زیباشناسیِ هنر و فرهنگِ اسلامی

حرفی چند در تحسین ہنرِ کاشیکاری و نقاشی ملتان و ایران زمین کہ
نمایانِ گر روحِ معماری و بناہای فرہنگ اسلامی ہست و از زیبائی
و رعنائی ذہنِ بشر را رو بروی یک فردوسِ نظر می آرد

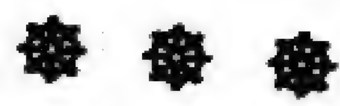


خوش بیار ای نگارِ یکتائی — مئی گلگون بجامِ مینائی!
رخ چون اژرنگِ کاشیان بنمود — حرفی دارم زنیلگون و کبود
هنرِ کاشیکاریٔ ملتان — سایۂ سروِ گل به تابستان
کاشیکاران که نقشها بنتند — به قفس طائرِ صدا بستند
از خطِ سبز و نیلگون و سپید — شد جهانِ خیال و نغمه پدید
چون که صورت به نقش یکجاشد — عالمی در هنر هویدا شد
حسنِ تجرید راعیان کرداست — این هنر نقش را بیان کرداست
گل چو پیرایۂ هنر پوشید — صد چمن از سفالِ خشك دمید

رنگی آبی و نیلگون دارد　　زین همه سادگی فسون دارد
نیلگونی چو نقش پیرا شد　　حسنِ معماری و بناها شد
شاخ تا شاخ بی گمان چمن است　　برگ در برگ صد جهان چمن است
نقشِ بهزاد اگر رسید اینجا　　جامۂ کاغذی درید اینجا
رقصِ طاؤس، نقشِ حیرت شد　　کلکِ مانی شکست و عبرت شد
عکس جنت چو بر زمین افتاد　　نقشِ کاشی به سنگ وخشت نهاد
دشت و گلزار باغ و بستانها　　قطعه ها از شکار گاه و سرا
دسته دسته گل و فراوان گل　　همه جا صد چمن بدامان گل
کاشیکاران که رنگها بستند　　در و دیوار را حنا بستند
رنگ تا بسته شد رها شده است　　صورتِ موجۂ صبا شده است
همچو مشاطگئ سیمبران　　تازه کاری ست کارِ نقشگران
سروِ آراسته بصحنِ چمن　　گلِ نوخاسته بشاخِ سمن
موجِ گل فارغ از غمِ رفتار　　همه جا تازگی باین تکرار
چهره افروخته نگارِ خیال　　سرو بالیده چون بهارِ خیال

نقش باید نشاطِ جان گردید
نسبِ انبساطِ جان گردید

من تصنیف ڈاکٹر اسلم انصاری



اسلامی تہذیب وثقافت کی روحِ جمالیات

ملتان اور ایران کے فن کاشی کاری اور نقاشی کی مختصر تحسین، جو اسلامی فن تعمیر کے اُصول جمالیات کے ترجمان ہیں۔ اور اپنی رعنائی اور زیبائی کے ذریعے ذہن انسانی کو فردوسِ نظر سے آشنا کرتے ہیں۔



۱۔ اے حُسن وزیبائی میں یکتا محبوب! نیلگوں جام میں بادۂ گلرنگ لے آ!

۲۔ چونکہ کاشیکاروں کا مُرقعِ رنگ سامنے آیا ہے، اس لئے میں ''نیلے'' اور ''نیلگوں'' الفاظ سے کام لے رہا ہوں۔

۳۔ ملتان کے کاشی گروں کا ہنر ایسا ہے جیسے موسم گرما میں سرو اور پھولوں کا سایہ ہو!

۴۔ کاشی کاروں نے ایسے نقوش آراستہ کئے ہیں، گویا طائرِ آواز کو قفسِ رنگ میں قید کرلیا ہے۔

۵۔ ان کے سبز، نیلگوں اور سفیدی آمیز خطوط سے خیال و نغمہ کی ایک دنیا وجود میں آ گئی ہے۔

۶۔ چونکہ صورتِ محض اور نقش (تصویر) ایک ہو گئے ہیں، اس لئے فن کی دنیا میں ایک نئی دنیا پیدا ہوگئی ہے۔

۷۔ اس ہنر نے تجرید کے حسن کو نمایاں کیا ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ نقش کو 'بیان' بنا دیا ہے۔

۸۔ پھول نے جب ہنر کا زیور پہن لیا تو گویا خشک مٹی سے سوچمن پیدا ہو گئے۔

۹۔ یہ ہنر آبی اور نیلگوں رنگوں کا ہنر ہے، اس کی سادگی میں ہزاروں جادو ہیں۔

۱۰۔ جب نیلگوں رنگ نے نقش کی صورت اختیار کی تو وہ (اسلامی) فن تعمیر اور ہنر کا حُسن بن گیا۔

۱۱۔ دیکھا جائے تو یہ شاخ در شاخ ایک چمن ہے، اس کا پتہ پتہ بذات خود ایک جہانِ گل ہے۔

۱۲۔ اگر (ایران کے مشہور مصور) بہزاد کی تصویر جہاں پہنچتی تو یہاں پہنچ کر اپنا کاغذی لباس پھاڑ دیتی۔

۱۳۔ (نقاشی کے فن میں کہیں) مور کا رقص ہے، جو حیرت کی تصویر ہے (ایک اور مصور) مانی کا قلم اس کو دیکھ کر ٹوٹ

۱۴۔ جب فردوس کا عکس زمین پر پڑا، تو سنگ و خشت کے دامن میں کاشی اور نقاشی کے پھول کھل اُٹھے۔

۱۵۔ (نقاشی اور کاشی گری میں) صحرا اور گلزار ہیں، باغ و بُوستان ہیں، محلات ہیں اور شکار گاہیں ہیں۔

۱۶۔ پھولوں کے گلدستے ہیں، بلکہ پھول تو فراواں ہیں، ہر جگہ پھول ہیں اور خود اُن کے دامن میں چمن ہیں۔

۱۷۔ کاشی کاروں نے رنگ کیا لگائے ہیں، درودیوار کو رنگِ حنا عطا کر دیا ہے۔

۱۸۔ رنگ یہاں پابند ہو کر آزاد ہو گیا ہے، بلکہ موجِ صبا بن گیا ہے۔

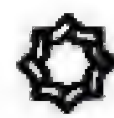
۱۹۔ سیم بروں کے مشاطگی کی طرح نقاشوں نے بھی حُسن و جمال کو تازگی اور شگفتگی عطا کر دی ہے۔

۲۰۔ صحنِ چمن میں سَرو آراستہ ہیں اور شاخوں پر پھول شگفتہ ہیں۔

۲۱۔ (اس دُنیائے رنگ میں) موجِ گُل کو رفتار کا غم نہیں، اور تکرار کے باوجود ہر جگہ تازہ کاری اور شگفتگی ہے۔

۲۲۔ (یہاں) نگارِ خیال نے اپنا چہرہ آراستہ کرلیا ہے، اور سَرو، بہارِ خیال کی طرح بالیدہ ہے۔

۲۳۔ نقش وہی نقش ہے جو روح افزا اور نشاط انگیز ہو۔



حفیظ الرحمٰن خان

ملتانِ ذی شان

شہرِ بے مثال ملتان کا خاص شرف و امتیاز اللہ کے ان نیک بندوں کے حوالے سے ہے جنہوں نے صدیوں پہلے اس خطے میں معرفت اور علم و حکمت کے چراغ روشن کیے۔ عظیم و قدیم ملتان، ہمارے تاریخی، تہذیبی اور روحانی ورثے کا امانت دار ہے۔ اولیاء کرام اور بزرگانِ دین کے مزارات یہاں صدیوں سے مرجع الخلائق بنے ہوئے ہیں۔ جب سکندر اعظم یہاں آیا تھا تو دریائے چناب ملتان کے تاریخی قلعے کے دائیں پہلو کو چھوتا ہوا گزرتا تھا۔ اور جب اولیائے کرام نے یہاں بسیرا کیا تو چناب فرطِ ادب سے قدم بوس ہو کر چند کوس دور ہٹ گیا۔ اب قلعے کے چاروں طرف ملتان ہی ملتان اور فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کی طرح ابنِ قاسم باغ کو بھی ملتان میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ مرکز مہر و وفا اور مقامِ اتصال عاشقاں ہے۔ یہاں زائرین و مشتاقانِ دید کے علاوہ شہر کے پیر و جواں بڑی تعداد میں آتے ہیں یوں کہیے کہ قلعہ سب کا مونس و ہمدرد ہے، سبھی یہاں مراد پاتے ہیں۔

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے ہے گھر دیر و حرم کا

ملتان کی قدامت اور تاریخی حیثیت کا تعین علمائے تاریخ و آثار کا کام ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ملتان دنیا کے ان چند چہروں میں سے ہے جو کسی بھی ملک کی تاریخ و تہذیب کی زندہ علامت بن گئے ہیں۔ آج جتنی قدیم تہذیبوں کے نقوش و آثار ملے ہیں وہ سب ماضی کے مزار بن چکے ہیں۔ مصری تہذیب، عراق کی سمیری و فنقی تہذیب، یونان روما کی تہذیبیں خود اپنے ہاں گندھارا تہذیب کے آثار، موئن جوڈیرو، ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سب کھنڈروں کی صورت میں ہیں اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں لیکن یہ کرشمۂ قدرت ہے کہ ان تہذیبوں کا ہم عصر ملتان آج بھی زندہ انسانوں کا شہر ہے۔ یہ امر اہلِ ملتان کے لیے باعثِ فخر ہے کہ ان کے جنم بھوم کو پوری دنیا میں زندہ تہذیبی علامت کا درجہ حاصل ہے جو آج بھی شاد و آباد ہے۔

ملتان کی عظمت و قدامت ماضی قدیم سے آج تک مُسلّم ہے۔ جس کے ذکر کے لیے دفتر درکار ہیں۔ لیکن اس شہرِ ذی شان کو ایک اور شرف و امتیاز بھی حاصل ہے کہ زمانہ قدیم سے آج تک تاریخ کے ہر دور میں یہ تہذیبی

کے درجے پر فائز رہا۔ اسے وسط ایشیا، افغانستان، ایران آنے والوں کے لیے Gate Way کی حیثیت حاصل رہی ہے اور آج بھی یہ جدید قدیم کے موڑ پر کھڑا ہے۔ ایک طرف قدیم تہذیبی آثار ہیں تو دوسری جانب جدید طرز کی فلک بوس عمارات، پلازے استادہ ہیں۔ ایک جانب گرد و گرما گدا و گورستان کی عبرتیں خوابیدہ ہیں اور دوسری طرف نظر کو خیرہ کرنے والی چکاچوند روشنیاں ہیں۔ ملتان میں بسنے والے لوگ بھی جدت و قدامت کے رنگ اور آہنگ میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ یہاں قدیم تہذیبی سانچوں کے پیکر بھی ہیں اور جدید رنگ و روغن اور ماڈرن چمک دمک اور نئے طرزِ فکر و احساس کے حامل صاحبانِ عالی شان بھی ہیں۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک محسوس تعداد میانہ رَو لوگوں کی بھی ہے جو ملتان کے روایتی دھیمے مزاج کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

گرد و گرما گدا و گورستان کا ذکر آیا تو مناسب ہوگا کہ ان کے تذکرے سے پہلے ملتان شہر اور اس کے باسیوں کی معاشرت اور شہر کی ہیئت کذائی پر ثبت ہونے والے اثرات و تغیرات کا بیان ہو جائے۔ لیکن ذرا ٹھہرئیے پہلے ایک ضروری بات کہتا چلوں کے صدیوں تک ملتان کے شہریوں اور ان کے رہن سہن کے طور پر طریقوں پر قدامت کا رنگ غالب رہا۔ جدید برقی اور میکانکی وسائل نے شہری زندگی میں سہولیات اور آسائش ضرور فراہم کیں۔ لیکن شہریوں کی معمول کی زندگی بے پناہ مسائل کی آماجگاہ بنی رہی۔ صحت و صفائی کے مسائل، ہر قسم کی آلودگی، پانی کے مسائل، ذرائع آمد و رفت کی خستگی نے عام آدمی کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ انسان، بھیڑ، بکریاں، گائیں، بھینسیں باہمی تعاون اور ''جیو اور جینے دو'' کے زریں اصول کی روشنی میں مل جل کر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن ڈھائی سال پہلے خدا کا کرنا یہ ہوا کہ نسیم صادق نامی ایک افسرِ اعلیٰ ملتان آ نکلا۔ مسائل کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس اللہ کے بندے نے کمر کس لی اور سوا سال کی قلیل مدت میں ملتان کا نقشہ تبدیل کر دیا۔ ہر قسم کی آلودگیاں صاف، تجاوزات ختم۔ چوپائیوں کے بھانے شہر سے باہر، ناجائز قبضے واگزار۔

نسیم صادق صاحب کے اقدامات کی بدولت ملتان کو نیا تشخص، نیا چہرہ ملا۔ سوا سال بعد وہ اہلِ ملتان کی ڈھیروں دعائیں لے کر رخصت ہو گئے لیکن ابھی قدرت کو ملتان کی مشاطگی منظور تھی۔ چھ ماہ پہلے آنے والے نئے امیر شہر نے محسوس کیا کہ ابھی بہت سی بدصورتیاں باقی ہیں اور نئے اور پرانے عارضے پھر سے سر اُٹھا رہے ہیں۔ سب دیکھ رہے ہیں کہ جناب زاہد سلیم گوندل نے جملہ مسائل کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ چنانچہ شہر کی شاہراہیں اور دَر و دیوار اس امر کے گواہ ہیں کہ وہ رنگ و روپ، چہرہ مہرہ نکھارنے اور اُجالنے میں اپنا ذوقِ جمال نہایت سلیقے سے بروئے کار لا رہے ہیں۔ اس کام میں ایک مربوط حکمتِ عملی کے ساتھ اپنی انتظامی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہیں۔

اب ذرا ان مشہور چار تحائف کا ذکر جو صدیوں سے ملتان کی شناخت بنے ہوئے ہیں۔ ملتان کی گرمی ضرب المثل کا درجہ پا چکی ہے۔ کرۂ ارض کے جس مقام پر ملتان واقع ہے وہاں سورج کچھ زیادہ ہی آنکھیں دکھاتا ہے۔ سورج جسے غالب نے ''نگارِ آتش'' کہا تھا، کی شوخ نگاہی کی شکایت ملتان کے اصل مکینوں سے زیادہ باہر سے آنے والے کرتے ہیں۔ دوسری چیز جو ملتان میں بکثرت دستیاب ہے، گرد و غبار ہے۔ علم جغرافیہ کے ماہرین گرد و گرما

کے رشتے کو علت و معلول کا تعلق گردانتے ہیں۔ یعنی گرمی اور تپش کی صورت میں اور ہوا کے دباؤ میں کمی بیشی کے نتیجے میں خاکی ذرات آندھی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آج ملتان اور نواحِ ملتان میں سرسبزی اور ہریالی بہت زیادہ ہے لیکن نصف صدی قبل یہ خطہ ریگزاروں کا ٹھکانہ تھا۔ اس لیے آندھیاں بہت آتی تھیں۔ انتظار حسین کی ایک کہانی کے بموجب:

"کبھی دن ڈھلنے سے پہلے اندھیرا ہو جاتا ہے اور کبھی رات کے اندھیرے میں اندھیاری چلنے لگی"

ملتان میں آندھی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ بیٹھے بٹھائے گھر بھر ریگستان بن جاتا تھا۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ملتان کے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

"ملتان میں بس ایک ہی آندھی چلتی ہے جو اپریل کے اوائل سے اکتوبر کے اواخر تک رہتی ہے۔"

جیسا کہ ذکر ہوا چند عشروں سے درختوں کی کثرت، سبزے کی فراوانی کے طفیل گرمائی آندھیوں کا زور اب پہلے کا سا نہیں رہا لیکن انسانی چیرہ دستیوں کی بدولت گرد و غبار کے اسباب سال کے بارہ مہینے مہیا رہتے ہیں۔ اہلِ ملتان کو جدید شہری سہولیات مہیا کرنے کے لیے پانی، گیس، ٹیلی فون اور بجلی کے محکموں نے شاہراہوں اور گلیوں میں کھدائی کا ایک مستقل اور مربوط لائحہ عمل وضع کر رکھا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ نیا مالی سال شروع ہوتے ہی یہ ادارے خلقِ خدا پر عذاب بن کر نازل ہوتے ہیں۔ ان کے کارندے شہر کے مختلف مقامات سے کھدائی شروع کرتے ہیں۔ جب ایک ادارے کے کارندے اپنا کام مکمل کر لیتے ہیں تو دوسرے محکمے کے تازہ دم کارکن پھاوڑے اور کدالیں لے کر آ جاتے ہیں اور سڑک کے دوسرے کنارے کھدائی شروع کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات سڑک کے دونوں جانب مٹی کے توڑے اور ریت کے ٹیلے کوہستانی علاقے کا منظر پیش کرتے ہیں۔ غرض ملتان کی عظمت و قدامت کو جوں توں برقرار رکھنے میں قدیم تاریخی عوامل کے علاوہ ترقیاتی اداروں اور صحت و صفائی کے شعبوں کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن ملتان کے لوگ ناموافق حالات میں زندہ رہنے کے فن سے آشنا ہو گئے ہیں۔ شکست و ریخت کا عمل معمولاتِ حیات کا حصہ بن چکا ہے۔ شادی بیاہ کی تقاریب اور سماجی مجالس میں یہاں مرد و زن کو لباس یا چہرے مہرے کی زیب و زینت کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا، یہ کام گرد و غبار کے وسیلے سے بخوبی انجام پاتا ہے۔ کیونکہ:

ع ..... "مٹی" خود بخود کرتی ہے "چہروں" کی "حنا بندی"

اور میزبان آنے والے مہمانوں کا استقبال اقبال کے مصرعے سے کرتے ہیں:

ع ..... خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

لیکن، ناظرین باتمکین! ملتان اور اہلِ ملتان کا یہ صوری نقشہ دو تین سال پہلے کا ہے۔ آج کی صورتِ حال کا تذکرہ دیر پہلے تفصیل سے ہو چکا ہے۔

ملتان ذی شان کے حوالے سے قدیم روایات کے مطابق گدا و گورستان کا ذکر بھی آتا ہے۔ جس طرح گرد وگرما لازم وملزوم ہیں اسی طرح یہاں گدا و گورستان کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہے۔ گداگری یوں ایشیائی ممالک کے تشخص کا جزو بن چکی ہے۔ خاص طور پر جن ملکوں میں انگریز بہادر کی عملداری رہی ہے وہاں بے شمار معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کے علاوہ گداگری کو بھی فروغ ملا، جو غلامی کی باقیات کی صورت میں اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے اور ہمارا جاگیردارانہ سماجی نظام اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ انفرادی سطح پر بھی اور قومی و اجتماعی سطح پر بھی۔ انفرادی سطح پر ''ہر ایک سے مانگنا، ہر چیز مانگنا، ہر وقت مانگنا'' ہمارے ہاں اصولِ حیات کا درجہ پا چکا ہے اور من حیث القوم ہماری قیادت و سیادت کا مرکزی نقطہ بھی اہلِ مغرب کی دریوزہ گری ہے۔ ''بیرونی امداد'' ہماری قومی بصیرت کا بنیادی حصہ بن چکی ہے۔

اور معاف فرمائیے۔ ہمارے صاحبانِ علم و ادب کا کمالِ فن بھی اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی میں مضمر ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی نقالی کو ہمارے اہلِ فن معیارِ عزت و وقار سمجھتے ہیں۔ ملتان میں فقراء و مساکین کا بڑا ٹھکانہ قلعہ کہنہ یعنی ابنِ قاسم باغ ہے۔ قلعے کی ارتقائی منازل طے کرتے ہی فقیروں، ملنگوں، قلندروں کے جتھے، دامن پھیلائے، کاسۂ گدائی لیے نہایت شانِ استغناء کے ساتھ خیرات وصول کرتے ہیں یہ درویش قلندر کوچہ و بازار یا دَر دَر بھیک مانگنا کسرِ شان سمجھتے ہیں اور دَر دَر، گلی گلی بھیک مانگنے والوں کی یہ مجال نہیں کہ وہ فقیروں کی سلطنت میں قدم رکھ سکیں۔ گدا و گورستان کی رعایت سے ملتان کے اصل فقیر یہی ہیں۔ جہاں تک عام گداگروں اور بھک منگوں کا تعلق ہے اس معاملے میں سارے شہر اب ایک سے ہیں۔ گورستانوں کی کثرت ملتان کی ایک پہچان کا حوالہ ہے۔ اندرونِ شہر تو یہ صورت ہے کہ گھروں کے اندر قبروں کی باقیات ملتی ہیں۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ گھر کے ایک کونے میں ہانڈی چولہے کا اہتمام ہو رہا ہے اور دوسرے کونے میں ''بر مزارِ ما غریباں نے چراغ نے گلے'' کا سماں ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ فلک بوس عمارات اور اونچے پلازوں کی بنیادوں میں اجداد کی ہڈیاں دفن ہیں۔ ساحر لدھیانوی نے جوبات تاج محل کے لیے کہی تھی وہی بات یہاں بھی کہی جا سکتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر:

ع ...... دفن ہیں ان میں ترے اور مرے اجداد کے جسم

مَیں یہاں تک لکھ پایا تھا کہ گلی سے گزرنے والے دو آدمی کہ چہرے مہرے اور لباس سے ٹھیٹ ملتانی آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:

''یار سچ آہدن، ملتان آیاں دا ہے، جائیاں دا نئیں''

یعنی ملتان باہر سے آنے والوں کا ہے، یہاں پیدا ہونے والوں کا نہیں۔ مجھے اس جملے میں ملتان کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی زندگی کی صدیاں آباد نظر آئیں۔



حفیظ خان

کیا ملتان بچ پائے گا؟

میں اِس بات پر ہمیشہ حیران ہوتا رہا ہوں کہ یہ ''لاہور'' کیا ہوتا ہے' یہ لاہور ''لہور'' کیونکر ہو جاتا ہے۔ کنعان کے کانٹوں کو مصر کے گُل و گلاب اور سنبل و ریحان پر ترجیح کیوں دی جاتی رہی ہے۔ وہ کون سی دِلّی تھی جو مرزا غالب کے اندر سانس لیتی تھی۔ لکھنؤ کا بانکا پن کہاں سے در آتا تھا۔ خواجہ فریدؒ ملتان کے مضافات کا ہوتے ہوئے بھی روہی کی خوشبو' روہی کا استعارہ کیسے بن گیا۔ کوہِ سلیمان کی مٹی سے کشید ہوا حافظ نصیر الدین' کس طرح خُرم بہاولپوری بن کر' خطہ بہاولپور کی ریت روایت اور ادب کی شناخت بن جاتا ہے۔ یہ ''چھجو کا چوبارہ'' بلخ بخارہ سے زیادہ خوش کُن کیوں ہو جاتا ہے۔ وہ کون سا جذبہ ہے جو وسط ایشیا کے مرغزاروں کے مکین ظہیر الدین بابر کو کشمیر پہنچنے کے بعد پر مجبور کر دیتا ہے کہ بے اختیار کہہ اُٹھے ''اگر روئے زمیں پر کوئی جنت ہے تو یہی ہے' یہی ہے''۔ جس طرح دودھ میں لگائی جانے والی دہی کی ''جاگ'' کچھ دیر کے بعد پورے کے پورے دودھ کو دہی بنا دیتی ہے' اِسی طرح دنیا کے کسی بھی حصے میں پیدا ہونے والے انسان کے خمیر میں' کسی خاص جگہ کی خوشبو کی ''جاگ'' آخر کار نہ صرف کھینچ کھانچ کر اُسے وہیں' اُسی جگہ لے جاتی ہے' بلکہ پورے کا پورا وہیں کا بنا کے رکھ دیتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہ کیا ہے اور اگر ایسا نہیں' کچھ اور ہے تو پھر بھی کیا ہے!

مجھ پر یہ اسرار آج سے لگ بھگ تیس برس پہلے اُس وقت منکشف ہوا جب میں نے احمد پور شرقیہ سے ملتان آکر یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لیا۔ ملتان سے بچپن کے لا اُبالی اور بے ربط تعلق کو میں نے شعور کی کھلی کھڑکی سے دیکھا تو مجھے یہاں کے در و دیوار' سڑکیں' فصیلیں' دروازے' بازار اور مزار ''الف لیلہ'' کے کسی طلسماتی شہر کی طرح محسوس ہوئے۔ اِس شہر کا کلچر' عمارتیں' موسم' مٹی' لوگ' دوست' دشمن' سبھی مجھے میری خوشبو کی طرح لگے۔ میں ملتان میں اور ملتان مجھ میں اِس طرح رچ بس گیا کہ میں پورے کا پورا ملتان ہو گیا۔ بعد کی عملی زندگی میں کئی بار مواقع ملے اور مجبور بھی کیا گیا کہ اگر کچھ بہتر بننا اور اپنے آپ کو سنوارنا ہے تو وفاقی یا کم از کم صوبائی دارالحکومت میں ٹھکانہ کر لو' مگر میرا ملتان ہر بار میرا بازو تھام کر مجھے واپس لے آتا رہا ہے۔ میں نے کئی بار کہا کہ جیسے کسی شخص کا ''لاہور'' ہوتا ہے'' اسلام آباد'' ''پیرس'' یا ''لندن'' ہوتا ہے' اُسی طرح میرا لاہور' میرا اسلام آباد' لندن اور پیرس ''ملتان'' ہی ہے۔ یہ

''ملتان'' کوئی چونے' اینٹ' گارے' سیمنٹ' بجری اور کنکریٹ کا سٹرکچر نہیں ہوتا' یہ زندگی کے احساس' لہو کی تمازت' افکار کی ندرت' دِلوں کی وسعت' باتوں کی خوشبو' افراد کے رویے' دوستوں کی محبت بھری محفلوں اور دشمنوں کی بے بسی اور تنہائی سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ ''ملتان'' کسی ریلوے اسٹیشن' بسوں کے اڈے یا ایئرپورٹ کا نام نہیں ہوتا' نہ ہی یہ کسی ہوٹل' کسی محل سراء یا حکام کے ایوان کا نام ہوتا ہے۔ یہ ''ملتان'' تو ماں کی محبت سے عبارت ہوتا ہے جو رات گئے تک میرے انتظار میں جاگتا ہے اور جب میں سو جاؤں تو پھر ایک گونہ اطمینان سے اپنی مہربان آنکھیں موند لیتا ہے۔ جونہی میں چناب کا پُل عبور کروں یا قادر پور راواں والا موڑ مڑوں' اِس کی محبوبیاں اور اپنائیتیں میری سانسوں کو اپنی خوشبو سے معطر کر دیتی ہیں۔

میں نے اِس شہر کو 1977ء کی تحریک میں جلتے ہوئے دیکھا اور خود اپنی آواز میں 1977ء کے مارشل لاء کے نفاذ کی خبر ریڈیو ملتان کی چار جولائی کی صبح کی نشریات میں لوگوں تک پہنچائی۔ میں نے کئی مضبوط حکومتوں کی کایا کلپ اِسی کی سڑکوں پر ہوتی ہوئی دیکھی۔ اِس شہر کے عشاق اِس سے محبت کے سبب' اِس کی فصیلوں اور اُن کے دروازوں پر اُتری ہوئی کھال اور قلم شدہ سَروں کے ساتھ لٹکائے جاتے رہے۔ اِس شہر کو زندہ رکھنے کے واسطے' اِس کے چاہنے والوں نے حملہ آوروں کو نہ صرف اپنی گردنیں پیش کیں بلکہ تاریخ کے بدترین قتلاموں کے دوران اپنے شہر کی گلیوں کو اپنے لہو سے غسل دیا۔ اِن کے فقیر' اِس کے غلام اِس کے بادشاہ بنے اور اِس پر حکمرانی کے خواہاں بادشاہ 'بھیک کو بھی ترستے ہوئے دیکھے گئے۔ دور چاہے حملہ آور آریاؤں اور مقامی دراوڑوں کی آویزش کا رہا ہو یا بُدھ مت کا' اِس کے دروازوں پر دستک محمد بن قاسم نے دی ہو یا اِس کی حدود کے باہر منگولوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجی ہوں' حکمرانی قرامطیوں کی رہی ہو یا سلاطین کی' فرمانروا تغلق رہے ہوں' لودھی یا مغل' لنگاہوں نے سیج سجائی ہو یا پٹھانوں نے اپنے خوں سے اِس کی آبیاری کی ہو' ملتان کا تخت سکھوں کے پاس رہا یا انگریزوں کا تختہ ہوا' مگر اِس شہر کی وسعتِ قلبی' ماں کی آغوش کی صورت جوں کی توں' کسی نایاب ورثے کی شکل میں نسل در نسل' اِس کے زندہ دل مکینوں کو منتقل ہوتی رہی۔

میں چشمِ تصور سے دیکھتا ہوں تو 15 جون 1831ء کی ڈائری کا ایک ورق میرے سامنے آجاتا ہے جو انگریز جاسوس لیفٹیننٹ الیگزینڈر برنس نے ملتان آمد پر اپنے اعزاز میں دیے گئے استقبالئے کے بعد تحریر کی جو حضوری باغ میں دیا گیا تھا۔ یہ انگریز آفیسر ملتان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے مکمل قبضے یعنی 1849ء سے تقریباً سترہ اٹھارہ برس قبل یہاں سے گزرا۔ وہ افغانستان اور ڈیرہ جات سے ہوتا ہوا اِس غرض سے ملتان پہنچا کہ انگریز عملداری کی صورت میں اِس خطے کی متوقع سیاسی مزاحمت اور حاصل ہونے والے معاشی مفادات کا جائزہ لیا جا سکے۔ اِس ڈائری کے اقتباسات سے نہ صرف ملتان پر قبضے کے خواہشمند استعماریوں کے عزائم کا پتہ چلتا ہے بلکہ اُن حکمت عملیوں کا پردہ بھی چاک ہوتا ہے جو انہوں نے مقامی ریاستوں کے خلاف تشکیل دیں۔ اُس وقت حضوری باغ ملتان سے ایک میل کی دوری پر واقع تھا۔ ڈائری کے اِس پنے کے مندرجات کے مطابق' آفیسر مذکور کو اڑھائی ہزار روپے نقد کی تھیلی'

مٹھائی کی سولنگریاں اور ڈھیر سارا میوہ پیش کیا گیا۔

میں چشمِ تصور سے دیکھتا ہوں تو مجھے کل کی بات لگتی ہے کہ وادیٔ سندھ کے اہم تہذیبی مرکز ملتان اور اُس کے نواح میں بیسویں صدی عیسوی استعماریت کے بوجھ تلے دبی ہوئی ریلوے انجن کے کھڑکار سے نمودار ہو رہی ہے۔ گاڑی سے اترتے ہوئے عسکریوں کے گھوڑے اور توپیں' جن کے گولے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ مسافر خانے' نئے بھرتی ہوئے قلیوں کا شور' ہر درجے کا چھوٹا بڑا حاکم' مفتوحہ ملکوں میں کہانیاں اکٹھی کرنے والے گورے' اجنبی شہر میں میم کی حیرت' ریلوے انجن کے لئے پانی کے بڑے بڑے نل' مقامی لوگوں کے واسطے الگ الگ ہندو پانی' مسلم پانی..... کی آوازیں لگاتے واٹر مین' اینگلو انڈین ڈرائیور' سہ رنگا لالٹین اور ٹرین کا دو طرفہ ٹکٹ۔ وہ ٹرین جس نے صرف لوگوں کو لوگوں سے نہیں ملایا' بلکہ گھوڑے' توپیں اور گولے' نو قائم شدہ چھاونیوں تک پہنچا کر انگریزوں کی عسکری استعماریت کو مستحکم کیا۔

میں دیکھتا ہوں کہ اِس صدی کی آمد سے پہلے ہی اِس شہر میں چھاونی باندھی جا چکی ہے۔ کنٹونمنٹ مارکیٹ وجود میں آ چکی ہے جہاں کبوتر' خرگوش اور ٹرکی بھی رکھے گئے ہیں۔ وہاں ایک بیکری بھی ہے۔ جہاں بیسویں صدی کے استقبال کے لئے ایسے کیک اور پیسٹریاں تیار ہو رہی تھیں جن پر برطانوی استعمار کی نشانی ''شیر'' نقش کئے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ برطانوی راج کی عمارتوں کے پرنالے بھی شیر کے منہ والے بنائے گئے۔ بارش کے دنوں میں شیر کے منہ سے پانی کی دھار نکلتے دیکھ کر بچے تو کیا بڑے بھی خوش ہوتے ہیں' ہنستے ہیں۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اس سے پہلے 31 دسمبر اور یکم جنوری 1900ء کی شب نئی صدی کے استقبال کے لئے توپیں داغی گئیں اور ملتان چھاونی کے ناچ گھر یعنی ''بال روم'' میں دیر تک رقص کیا گیا۔ اب اِس شہر کے مشرق اور مغرب میں بازوؤں کی طرح پھیلی ہوئی ریلوے پٹڑیوں پر ریلوے انجن دندناتا پھرتا ہے۔ ڈاک اور مال گاڑیاں ساحلی شہروں سے سامان تجارت' اسلحہ' بارود اور گورے افسروں کو اُٹھائے میدانی علاقوں کی نس نس میں پھیل رہی ہیں اور اِدھر سے خام مال ہے جو بندرگاہوں پر ڈھیر کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اسی دور میں ملتان میں پہلی بار سڑکوں پر چلنے والی بائیسکل بھی دیکھی گئی۔

یہ بھی بیسویں صدی تھی جو ملتان شہر میں ڈاکیے کے خط کے ذریعے داخل ہوئی۔ مگر نہ جانے اِس صدی کو کون سے لفافے میں بند کر کے محکوموں تک بھیجا گیا کہ جو اپنے پتے پر پہنچی ہی نہیں۔ ہوائی جہاز کی صورت لکڑی اُڑی اور بھونپو کی شکل میں لوہا بولا۔ غیر متکلم فلم منڈوے پر لگی تو انسان نے انسان کو جی بھر دیکھا مگر یہ اور بات کہ دکھانے والوں نے دیکھنے والوں کو کیسا انسان دکھایا۔ ان سب کے پیچھے کوئی اور تھا جو اپنی مرضی کرنا چاہتا تھا۔ اور اُس نے لوگوں کو ناٹک کی منڈلی سے نکال کر سینماؤں کی کرسیوں تک پہنچا دیا۔ جس نے نہایت غیر محسوس طریقے سے اس خطے کے ساتھ ساتھ' ملتان کا ثقافتی منظر نامہ ہی بدل دیا۔ ملتان کے مضافات میں واقع چھاونی میں جہاں ''منچر جی'' کا شراب خانہ کھلا وہاں ایک چرچ اور ایک برف خانہ بھی قائم ہوا۔ اسی علاقے میں کمسریٹ بھی واقع تھی۔ جس کی دیوار ایک فٹ پاتھ کے ساتھ بہت دور تک چلتی رہتی۔ یہ چھاونی میں خوراک کی رسد کا فوجی محکمہ تھا جس کے بڑے بڑے

گیٹ ہر وقت بند رہتے۔ اِس کمسریٹ میں بہت سے ہاتھی بھی تھے جو رسد کا سامان ڈھونے پر معمور تھے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ملتان کے چوک عزیز ہوٹل میں قریشی آئس کریم اور سوڈا واٹر فیکٹری ''کالونیل ملتان'' کی ایک اہم یادگار تھی۔ یہاں کی ونٹو' سٹرابری اور رس بھری کی بوتلیں پینے یا آئس کریم کھانے کے لئے شام ڈھلے لوگوں کی قطاریں ہوتیں۔ آج بھی اعلیٰ سے اعلیٰ آئس کریم کا تقابل' قریشی آئس کریم کے فلیور سے کیا جائے تو لگتا ہے کہ وہ ذائقہ کہ جسے ذائقہ کہا جا سکے' 1970ء کے آس پاس ہی کہیں کھو گیا۔ خونی برج کی تلی ہوئی مچھلی پاک دروازے کی النگ پر تھومی کے سری پائے اور کوٹلہ تولے خاں کی مٹی کی رکابیوں میں ڈھکی ہوئی ربڑی' تہہ دار ملائی قیمے کی ٹکیاں اور علی الصبح تلی جانے والی پوریاں' قتلمہ اور گرما گرم حلوہ' اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی کہیں ''کے ایف سی'' کی زینت کاریوں اور طراری کی نذر ہو کر رہ گئے۔

شام ڈھلے اپنی اپنی بیویوں کی خوشنودی کے خواہاں ملازمت پیشہ اور کاروباری شوہر جومٹی کے گھوگھرے میں ملائی پیک کرا کر اُس کے گرد موتیے کے پھولوں کا گجرا لپٹوا کر گھر لے جایا کرتے تھے' اب فاسٹ فوڈ کے ریستورانوں کی قطاروں میں انتظار کرتے دیکھے جانے لگے۔ وہ جو اندرون شہر کے گلی کوچوں سے بڑ کے پتوں میں دال مُنگ کے ساتھ تندور کی گرما گرم روٹیاں لے جایا کرتے تھے' اب کسی چکن بروسٹ کی دکان میں پائے جانے لگے۔ ملتان میں کھانے پینے کے کلچر میں تبدیلی کی بنیاد اُس وقت ہی شروع ہو گئی تھی جب ایوب خان کے دور میں ''پی آئی اے شیور'' کے نام سے ہونے والی فارمی مرغیوں کی بھرمار نے ڈیرے اڈے کے لنگڑے پہلوان کی دکان کے ''کڑھائی گوشت'' کو سٹیٹس سمبل میں بدل دیا۔ گولی والی بوتل میں دستیاب سُرخ رنگ کے سوڈے اور دودھ سے بنائے گئے ''ملک روز'' کو کوکا کولا نے پچھاڑ کر رکھ دیا۔ موتیے کے گجروں کی جگہ پرفیومز نے لے لی اور میٹھی اور نمکین ڈولی کی جگہ برگر نے۔ پاکستان بننے کے بعد کی بننے والی کالونیوں ممتاز آباد' گلگشت اور شمس آباد نے جہاں اِس شہر کی وسعتوں میں اضافہ کیا وہاں نیو ملتان اور شاہ رکنِ عالم کالونیوں نے ملتان کے روایتی ''لونگ اسٹائل'' ، ہمسائیگی کے حقوق اور باہمی دردمندی کو کثیر اللسانیت سے پیدا ہونے والی بے حسی کے شاپر میں لپیٹ کر کہیں کھاد فیکٹری سے بھی پرے پھینک دیا۔

نشتر ہسپتال اور میڈیکل کالج ، ایمرسن کالج کی جگہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین اور بوسن روڈ پر پہلے گورنمنٹ کالج اور پھر دیگر کالجوں کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے قیام نے یہاں کے علمی' ادبی اور ثقافتی حدود میں تلاطم برپا کر دیا۔ اب سارے تعلیمی ادارے ملتان شہر کے اِس طرف ہونے کے سبب' دریائے چناب تک پھیلا ہوا ملتان شہر صبح سویرے تینوں جانب سے بوسن روڈ پر Migrate کرتا ہے اور دوپہر کے بعد پھر یہاں سے واپس اپنے اپنے گھر گھری۔ تقسیم کے بعد یہاں کی ہندو آبادی کے انخلا نے جہاں تہذیبی خلا پیدا کیا وہاں مہاجروں خاص طور پر ہنوں کے چھجے کے نئے مکینوں نے ایک اور ثقافت کی بنیاد رکھی۔ یہی وہ بنیاد تھی کہ جہاں سے کئی ایک قسم کے معاشرتی' معاشی اور لسانی رویوں نے نہ صرف جنم لیا بلکہ ملتان کے اندر ہی کتنے اور ملتان پیدا کر دیے۔ آزادی کے بعد جہاں

کاروبار بدلے وہاں کاروباری خاندانوں کی بھی کایا کلپ ہوئی۔ انگریز سرکار کی سرپرستی میں پنپنے والے فیوڈل ازم کو ٹریڈ کے اژدھوں نے نگلنا شروع کیا تو اُن کے نگلنے کے واسطے صنعتکاری کے عفریت سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اور جب اِن عفریتوں نے بھی لینڈ مافیا کے دامن میں پناہ لینے میں ہی عافیت سمجھی تو ملتان کا چہرہ دھول سے اَٹ گیا۔

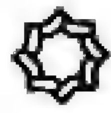
پُل مردہ خانہ' ایم ڈی اے کی دفاتر کی زد میں آ کر ایم ڈی اے چوک بنا تو اِس ترقیاتی ادارے کی اپنی تجاوزات کے سبب' راہگیر...... رہگزر سے محروم ہوتے چلے گئے۔ نالہ ولی محمد اپنی شناخت کھو کر مختلف نام کی آبادیوں کی پناہ گاہ بنتا بنتا ملتان آرٹس کونسل اور اسٹیٹ بینک کی بلند قامت عمارتوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ حسین آگاہی اور صرافہ بازار جب پیدل چلنے والوں کے لئے بھی سہل نہ رہے تو کھمبیوں کی طرح اُگنے والے شاپنگ سنٹروں' آرکیڈز اور پلازوں نے معروف سڑکوں کو کمرشلائزیشن کے گھاٹ اُتارتے اُتارتے' اُن رہائشی آبادیوں کے گھروں کو بھی تجارت کے نیلام گھر میں لا کر رکھ دیا کہ جن کے سبب شہر کا شہر اپنی شناخت کھو بیٹھا کہ گھر کو گھر رہنے دیا جائے یا اُسے دولت بڑھانے کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ ایک روایت کے مطابق محمد بن تغلق کے قتلام اور قبضے کے بعد حکمِ شاہی جاری ہوا کہ شب بھر کسی گلی' کوچے یا گھر میں کوئی چراغ نہیں جلے گا۔ مگر ایک چراغ جلا...... جو مشہور نرتکی موہراں نے جلایا' اپنے گھر کی دیوار پر کہ کئی دنوں کے بعد آنے والا اُس کا محبوب کہیں راستہ نہ بھٹک جائے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ اِس حکم عدولی پر دونوں گرفتار ہوئے اور اگلی صبح ملتان شہر کے باہر وسیع میدان میں سنگسار کر دیے گئے۔ مگر اب تو اِس شہر میں نہ تو کوئی موہراں ہے اور نہ ہی اُس کا پابندِ وفا محبوب۔ اور اگر ہوں بھی تو کیا ہوا کہ اب کسی گھر پر دیے جلانے کی ضرورت نہیں رہی کہ شہر میں روشنی اسقدر زیادہ ہو گئی ہے کہ آنکھیں دید کا حوصلہ کھو چکی ہیں۔

ملتان کی منفرد معاشرت اور تہذیب کے کسی بھی دور میں اِس کی لچکدار شریانوں کی صورت شہر کے بدن میں پھیلی ہوئی شاہراہوں' سڑکوں اور گلیوں میں تجاوزات کا اِس قدر کولیسٹرول جمع نہ ہوا تھا کہ نوبت ''بائی پاس'' کرانے سے بھی دگرگوں ہو جائے۔ یہ یکایک ہوا کیا ہے' کس کی نظر لگ گئی ملتان کو۔ اندرون شہر کا ذکر نہ بھی کریں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ اُس کے گنجلک تعمیراتی کلچر میں بھی ایک فطری توازن عیاں ہے' مگر ابدالی روڈ' اولڈ بہاولپور روڈ' نشتر روڈ اور نشتر چوک کو کیا ہو گیا کہ جو اِس شہرِ خوباں کے ماتھے کا جھومر تھے۔ کچہری روڈ' MDA روڈ، لودھی کالونی روڈ' نواں شہر...... کس کس روڈ پر شتر بے مہار دندناتی اذیتوں کا تقابل کریں۔ ہر طرف ذہنی خلجان میں مبتلا دانت کچکچاتے شہریوں اور بے مہابہ جناتی اشکال کی سرکاری اور غیر سرکاری تعمیرات کا گھمسان ہے۔ تنگ سڑکوں کے بالکل اوپر چڑھی ہوئی کئی کئی منزلہ تعمیرات کو دیکھ کر انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید قیامت تک اِن سڑکوں کی چوڑائی اتنی ہی رکھی جائے گی کہ جن پر ابھی سے کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ ہمارے ملتان کے مہربانوں نے کمال کی تخیلاتی ڈیزائننگ کے شاہکار یہ سوچ کر تخلیق کیے ہیں کہ قسطوں پر بکنے والی گاڑیوں کے اِس دور میں بھی ہر شخص وہاں تک پیدل ہی آئے گا۔ دو دو ہزار افراد کے روزانہ استعمال کی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی کر دی گئی ہیں اور پارکنگ ایک گاڑی کی بھی نہیں۔ اگر خوش قسمتی سے کسی عمارت میں محدود تعداد کے واسطے پارکنگ کی گنجائش ہے بھی سہی تو محض اپنے

اسٹاف کے لئے جب کہ باقی گاڑیاں، کسی فلمی ہیروئن کے لباس کی مانند تنگ سڑکوں کے کنارے، جہاں کسی ''ولن'' کی طرح گھات لگائے بیٹھا ایک ''اُٹھائی گیر بھتا'' فوراً ہی کہیں سے آنکلتا ہے اور گاڑی کو سر پر لاد کر نو دو گیارہ۔ اگر کوئی بھی عمارت پارکنگ کے بغیر بنانے کی اجازت نہ ہو تو شہری کیوں دربدر خوار ہو کر اپنی گاڑی کو ڈھونڈتے اور جرمانے ادا کرتے پھریں۔

ایک فاختہ، ایک چڑیا یا کوئی کبوتر بھی اپنے بچوں کے واسطے گھونسلہ بناتا ہے تو اُن کی آنے والی زندگی کو سہل رکھنے کی سوچ کے ساتھ۔ ایک مادہ مگرمچھ بھی اپنے انڈوں سے نکلنے والے بچوں کو وہاں تیرنا سکھاتی ہے جہاں کسی پوچنچ مار کی چونچ اُنہیں چھو نہ سکے۔ کوئی لومڑی، کوئی گیدڑ، بھیڑیا یا شیر، پرندوں سے درندوں تک، سبھی اپنی آئندہ نسلوں کے محافظ بن کر جیتے ہیں۔ مگر ہم...... ملتان کے مکیں، خدا جانے کس وضع کی مخلوق ہو کر رہ گئے ہیں کہ اپنا آج سنوارنے کے لئے اپنی آنے والی نسلوں کی Living کو مصائب، آلام، اذیت اور عذاب کے عفریتوں کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ مجھ سے پہلے کی نسلوں نے مجھے کیسا ''ملتان'' دیا اور میں اپنی آئندہ نسلوں کو کیسا ''ملتان'' دے کر جا رہا ہوں۔ کیا آج سے محض دو تین برس بعد اولڈ بہاولپور روڈ، ابدالی روڈ، نشتر چوک، نشتر روڈ، نواں شہر اور لودھی ٹاؤن روڈ پر رات کے وقت بھی پیدل چلنا ممکن رہ جائے گا۔ دونوں اطراف اتنی بڑی عمارتوں کی موجودگی میں کیا سڑکوں کی توسیع یا پارکنگ کی گنجائش ممکن رہے گی۔ کیا ہمارے اندر چڑیا کے دماغ جتنی پلاننگ کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہی کہ جو اپنے انڈوں اور بچوں کا حجم، اُن کی سہولت اور اُن کی سیکورٹی کی ضروریات کا تصور کر کے اپنا گھونسلہ ڈیزائن کرتی ہے اور یوں اپنی نسل کے فطری تسلسل کی بقا کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں صدیوں ... میں میرا ''ملتان'' بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں اپنے شہریوں کے کئی مرتبہ کے قتلِ عام کے باوجود تو ہر بار ... تہذیبی شناخت کے ساتھ بچ نکلتا رہا ہے مگر جب شہر کے تہذیبی ورثے اور شناخت ہی کا قتلِ عام ہو رہا ہو تو ... بچوں کا ملتان'' کیسے بچ پائے گا۔



خالد مسعود خان

فراموش کردہ تاریخ کے چند صفحات

گلاسگو کی طویل ہائی اسٹریٹ کو پیدل پار کر کے اس کے آخری سرے پر پہنچا تو سڑک انگریزی کے حرف ''ٹی'' کی مانند بن گئی۔ سامنے نکڑ پر رومن طرز پتھوں سے بنی ہوئی عمارت تھی اور اس کے ماتھے پر لکھا تھا ''گیلری آف ماڈرن آرٹ'' مَیں ایک لمحہ سوچے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ نچلی منزل کا ایک بڑا کمرہ گلاسگوں کی مشہور زمانہ فٹ بال ٹیموں ''رینجرز'' اور ''سیلٹک'' کی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک دیوار پر ایک ترچھی پگڑی پہنے برصغیر کی شکل و شباہت والے چہرے کو دیکھ کر مَیں ٹھہر گیا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا کہ یہ رینجرز فٹ بال ٹیم کے مداحوں پر مشتمل رینجرز سپورٹرز کلب کے تصوراتی قائد کی تصویر ہے۔ تصویر کے نیچے نام بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ 1857ء کی جنگِ آزادی کا ایک ہیرو منگل پانڈے تھا۔

آج 1857ء کی جنگِ آزادی کو ایک سو پچاس برس سے زائد ہو چکے ہیں۔ جنگِ آزادی کی بنیادی وجہ تو احساسِ غلامی تھا تاہم اس کی فوری وجہ جانوروں کی چربی لگے وہ کارتوس تھے جو برطانوی ساختہ لی انفیلڈ کی مسکٹ رائفلوں میں استعمال کی غرض سے ہندوستانی سپاہیوں کو دیے گئے۔ ان کارتوسوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ گائے اور سور کی حیوانی چربی ملے ہوئے کاغذ سے بنے ہوئے ہیں اور استعمال سے پہلے ان کو دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ گائے ہندوؤں کے لیے مقدس اور سور مسلمانوں میں حرام ہونے کی وجہ سے یہ کارتوس ہر دو مذاہب کے پیروکار سپاہیوں میں بے چینی کا موجب بن رہے تھے جو آخرکار بغاوت میں تبدیل ہو گئی۔ 29 مارچ 1857ء کی صبح بارک پور کی فوجی چھاؤنی میں انیسویں بنگال رجمنٹ کے ایک سپاہی منگل پانڈے نے اپنی رجمنٹ سے باہر نکل کر پہلے اپنی فوجی ٹوپی اتار کر زمین پر دے ماری پھر اپنا کوٹ اتار کر پرے پھینکا اور دھوتی میں ملبوس اپنی رجمنٹ کو آگے آنے کا کہا۔ صرف ایک شخص نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔ اس پر منگل پانڈے نے ساری رجمنٹ کو بہن کی گالی دے کر آگے آنے کے لیے کہا اور انہیں یاد دلایا کہ انہوں نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی اثناء میں انگریز افسر نے اسے واپس جانے کے لیے کہا مگر منگل پانڈے نے اس کا حکم ماننے کی

بجائے اس پر اپنی رائفل سے فائر کر کے زخمی کر دیا۔ ساری رجمنٹ اس جھگڑے سے لاتعلق کھڑی رہی۔ اسی اثناء میں برطانوی جنرل نے آ کر اسے ہتھیار پھینکنے کے لیے کہا مگر اس نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے اپنی رائفل دوبارہ لوڈ کی اس کی نالی کو اپنی چھاتی سے جوڑا اور پاؤں کی انگلی سے رائفل کی لبلبی دبا دی۔ رائفل کے ہلنے کی وجہ سے گولی اس کے سینے میں لگنے کی بجائے کندھے پر لگی۔ منگل پانڈے زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ 6 اپریل کو اس کا کورٹ مارشل ہوا 8 اپریل 1857ء کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد چھاؤنی میں بغاوت ہو گئی جو بعد ازاں تقریباً پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ چھوٹی موٹی بغاوت سے قطع نظر جنگِ آزادی کے مراکز دہلی، میرٹھ، جھانسی، روہیل کھنڈ، مظفرنگر اور کانپور وغیرہ تھے۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے جہاں مجھے پنجاب میں کسی قابلِ ذکر جنگ یا معرکے کے بارے میں تاریخ کی خاموشی پر حیرت ہوتی تھی وہیں اس پر شدید افسوس بلکہ شرم بھی محسوس ہوتی تھی۔ یہ ایک قدرتی امر تھا۔ ہندوستان میں جنگِ آزادی کے چار ہیروز کی تصویر والی ٹکٹیں بھی چھاپی گئیں۔ منگل پانڈے کی پچاس پیسے والی ٹکٹ کے علاوہ نانا صاحب، تانتیا ٹوپ اور حضرت محل پر بھی ٹکٹیں چھاپی گئی۔

کیا ملتان جنگِ آزادی سے یکسر لاتعلق رہا تھا؟ یہ سوال میرے ذہن میں بار بار اٹھتا رہا۔ تاریخ کے طالب علم کے لیے یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ میں نے واپسی پر 1857ء میں ملتان کے کردار کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ یہ خطہ اس جدوجہد آزادی میں مقدور بھر شامل بھی رہا اور قربانیوں کی داستان بھی رقم کی مگر تاریخ کے صفحات پر محض اس لیے کوئی نمایاں مقام نہ پا سکا کہ اس علاقے کی جدوجہد کو دبانے میں حریت پسندوں کے قتل عام میں، انگریز بہادر کی کاسہ لیسی میں اور مجاہدین کی سرکوبی میں یہاں کے مخادیم، جاگیرداروں اور گدی نشینوں نے مرکزی کردار سرانجام دیا۔

ملتان میں پندرہ سو پوربی مسلمانوں پر مشتمل پلٹن نمبر تریسٹھ اور انہتر تعینات تھی۔ جسے فوجیوں میں بے چینی دیکھتے ہوئے غیر مسلح کر دیا گیا اور بعد ازاں انہیں دس اور بیس کی ٹولیوں کی صورت میں واپس گھروں کو بھجوانا شروع کر دیا۔ ایک افسر اور دس سپاہیوں کو مزاحمت پر توپ سے اُڑا دیا اور واپس بھیجے جانے والے سپاہیوں کو جو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تھے قتل کرنا شروع کر دیا۔ مئی 1857ء میں سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور شہر کی جانب چل پڑے۔ پل شوالہ (شہر کا آغاز) پر انتظامیہ نے حضرت بہاء الدین زکریا کے گدی نشین اور ان کے مریدوں سے مل کر باغیوں کو روکا اور ان پر حملہ کر دیا۔ تقریباً تین سو حریت پسند پل شوالہ پر شہید ہوئے۔ چار سو کے لگ بھگ حریت پسند شیر شاہ (ملتان کی نواحی بستی) کی جانب نکل گئے۔ شیر شاہ کے گدی نشین نے اپنے سینکڑوں مریدوں سمیت ان کا تعاقب کیا، کچھ حریت پسند بچ کر شجاع آباد اور جلال پور پیروالہ کی جانب نکل گئے بقیہ کو شیر شاہ کے گدی نشین نے اپنے مریدوں سمیت دریائے چناب کے کنارے پر گھیر لیا۔ کچھ حریت پسند ایک ٹاپو پر گھیر کر مار دیئے گئے تاہم اکثر حریت پسندوں کو دریا میں دھکیل دیا گیا اور وہ دریا میں ڈوب گئے، باقی گرفتار ہو گئے

اور پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔

شجاع آباد اور جلال پور پیروالہ کی جانب جانے والے حریت پسندوں کو جلال پور پیروالہ کے گدی نشین نے اپنے مریدوں سے مل کر گھیر لیا اور ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شیر شاہ کے گدی نشین نے کیا تھا۔ دریائے چناب اور ستلج کے سنگم پر لڑائی ہوئی، کچھ حریت پسند ڈوب گئے بقیہ کو جلال پور پیروالہ کے گدی نشین نے اپنے مریدوں کی مدد سے مار ڈالا۔ حریت پسندوں کا ایک گروہ غوث پور اور تلمبہ کی جانب نکل گیا اس گروہ کا جاگیردار حیات شاہ اور پیر مراد شاہ کے لوگوں نے صفایا کر دیا۔ دوسرا اگروہ سرائے سدھو کی جانب گیا، اسے جاگیردار بہاول لنگڑیال نے روکنے کی کوشش کی مگر مارا گیا۔ اس گروہ کو مہر سلطان ہراج اور ہوت سرگانہ نے روکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ صورت حال کو خراب دیکھ کر حویلی کورنگا کے مخدوم اور قتال پور کے مخدوم اپنے مریدوں سمیت مدد کو آن پہنچے۔ حریت پسندوں نے جم کر مقابلہ کیا اور انگریزوں کے حواریوں اور ٹوڈیوں کو شکست دینے کے قریب تھے کہ نواب مصطفیٰ خان خاکوانی تازہ دم دستہ لے کر پہنچ گیا۔ مجاہدین کی کثیر تعداد میدانِ جنگ میں شہید ہوئی بقیہ کو مخدوم آف قتال پور کے کارندوں نے پکڑ کر دریائے راوی کے کنارے قتل کیا اور لاشیں دریا میں پھنکوا دیں۔ کرم پور کے قریب نالہ دیوان واہ کے محاذ پر مجاہدین نے بہادری اور قربانی کا ایک لازوال باب رقم کیا۔

ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریا کے گدی نشین نے 1857ء کی جنگ آزادی کچلنے کے لئے خود بھی پچیس سواروں کے ہمراہ کرنل ہملٹن کی سربراہی میں مجاہدین سے برسرپیکار رہے۔ کیمپ کی حفاظت اور فوج کے ساز و سامان کی نگہداشت کی۔ پل شوالہ کی لڑائی میں جہاں تین سو مجاہدین شہید ہوئے وہاں ان کے مریدین نے مرکزی کردار سرانجام دیا۔ پل کی حفاظت گدی نشین کے مریدین کے ذمے تھی جس میں وہ کامیاب رہے۔ ان خدمات کے عوض مخدوم صاحب کو تین ہزار روپے انعام عطا کیا گیا۔ بعد ازاں ''غدر'' (انگریزوں اور ان کے حواریوں کے نزدیک) میں انگلش کی خدمات کے عوض گدی نشین مخدوم کو مبلغ ایک ہزار سات سو اسی روپے سالانہ کی جاگیر عطا کی گئی اور آٹھ چاہات جن کی سالانہ جمع پانچ سو پچاس روپے (یہ 1857ء کا ذکر ہے جب ایک مربع اراضی کی قیمت تقریباً بیس روپے تھی) بطور معافی دوام عطا ہوئی۔ 1860ء میں وائسرائے ہند لاہور آیا تو اس نے شاہ محمود قریشی کو بیگی والا باغ بھی عطا کیا۔

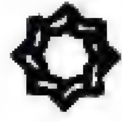
ملتان شہر، شجاع آباد، شیر شاہ اور جلال پور پیروالہ وغیرہ میں حریت پسندوں کی بغاوت کچل دی گئی مگر حویلی کورنگا، قتال پور اور سرائے سدھو کی جانب نکل جانے والے مجاہدین کافی عرصہ تک انگریزوں اور ان کے حواریوں سے پوری طرح قابو نہ آسکے اور ان کی بہادری نے علاقے کے لوگوں کو (جن کو جانگلی کہا جاتا تھا) خاصا متاثر کیا اور یہ جانگلی اس جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ معاملہ حویلی کورنگا خونریز معرکے کے باوجود ختم نہ ہوا اور اس معرکے میں مجاہدین کی شہادتوں اور قتل عام کے بعد دیہاتوں میں حریت پسندوں کی بہادری کے قصے پہنچے تو جانگلی

اس جدو جہد میں شامل ہو گئے۔ احمد خان کھرل، موکھا وہنی وال، نادر شاہ، مہر دلیل فتیانہ اور لال خان بلوچ وغیرہ وہ چند مقامی سردار تھے جو اس جدو جہد میں نمایاں تھے۔ جانگلی خاندانوں میں وہنی وال، کاٹھیے، جویئے، لک، وٹو، بگھیلے، فتیانے اور کھرل پیش پیش تھے۔ اسی اثناء میں لارڈ لارنس نے ایک مراسلہ جاری کیا کہ ہر مفرور سپاہی کو قتل کرنے یا گرفتار کروانے کے عوض ایک مربع اراضی یا بیس روپے نقد انعام دیا جائے گا (تب ایک مربع اراضی کی قیمت بیس روپے تھی)۔ اس اعلان نے علاقے کے جاگیرداروں اور مخدوموں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہوں نے اپنے مریدوں مخبروں اور حواریوں کے ذریعے مجاہدین پر زمین تنگ کر دی۔ اسی اثناء میں برکلے فوج لے کر آیا تا کہ جانگلی بغاوت کو کچل سکے۔ مگر مہر دلیل فتیانے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس دوران مقامی سرداروں نے اپنی حکومت تشکیل دی۔ انگریز حکومت کو لگان دینا بند کر دیا۔ اس صورتحال میں الفنسٹن فوج لے کر آیا مگر ناکام رہا اور گوریلوں پر قابو نہ پا سکا۔ کرنل ہملٹن بھی تازہ دم دستوں کے ہمراہ علاقہ میں آیا مگر بغاوت کو کچلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

فوجی تدبیروں میں ناکامی کے بعد جنرل کورٹ لینڈ نے لالچ دے کر جاگیرداروں کی مکمل حمایت حاصل کر لی۔ جھامرہ میں مزاحمت کاروں کا سب سے بڑا لیڈر احمد خان کھرل مورچہ بند تھا۔ اس لڑائی میں احمد خان کھرل اور نادر شاہ شہید ہو گئے۔ بعد ازاں موکھا وہنی وال اور لال خان بلوچ گرفتار ہوئے اور بہ عبور دریائے شور یعنی کالے پانی بھجوا دیئے گئے۔ مقامی مخدوموں اور جاگیرداروں کی مخبری پر ''باغیوں'' اور ان کے حمایتیوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ حریت پسندوں اور ان کے حمایتیوں یا ان کے بارے میں اچھے کلمات کہنے والوں تک کی زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ جانور ہانک لئے گئے۔ ان کے مکانات اور رہائش گاہیں جلا دی گئیں۔ درجنوں لوگوں کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ احمد خان کھرل کی ساری جائیداد بحق سرکار انگلشیہ ضبط کر لی گئی۔ اس کی گوگیرہ میں ضبط شدہ حویلی میں آج بھی گورنمنٹ ہائی سکول گوگیرہ قائم و دائم ہے۔ احمد خان کھرل گوگیرہ سے چند میل کے فاصلے پر تھانہ باہلک کے قریب جھامرہ میں مدفون ہے۔ میں سب کچھ پڑھنے کے بعد مطمئن ہوں کہ ڈیڑھ سو سال قبل میرے علاقے کے لوگوں نے اس جنگ آزادی میں اپنی استطاعت کے مطابق بھرپور حصہ لیا اور قربانیوں کی وہ داستان رقم کی جسے بااثر مخدوموں، گدی نشینوں اور جاگیرداروں نے تاریخ کے صفحات کا حصہ بننے سے حتی الامکان روکنے کی کوشش کی اور وہ اس میں جزوی طور پر کامیاب بھی رہے کہ آج اس علاقے کے لوگ بھی اپنے آباؤ اجداد کی قربانیوں اور جدو جہد سے لاعلم ہیں۔

جب میں احمد خان کھرل، موکھا وہنی وال، نادر شاہ، مہر دلیل فتیانہ اور لال خان بلوچ کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور سینہ خوشی سے پھول جاتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب میں ملتان کے معروف خاندانوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو خوشی سے پھولا ہوا سینہ پچک جاتا ہے اور فخر سے بلند سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ایسے میں مجھ سے پل شوالہ، شیر شاہ، جلال پور پیر والہ، چناب کے کنارے، چناب اور ستلج

کے سنگم پر، نالہ دیوان واہ کے کنارے، قتال پور کے قریب، سرائے سدھو کے بیلے میں، حویلی کورنگا کے ساتھ دریائے راوی کے کنارے اگے نرسلوں میں اور جھامرہ کے میدانوں میں شہید ہونے والے حریت پسندوں کے ان دیکھے چہرے سوال کرتے محسوس ہوتے ہیں کہ ہماری قربانیاں کہاں گئیں اور ہمارے وارث کہاں گئے؟ حریت پسندوں کو قتل کر کے دریا میں ڈبو کر، گرفتار کر کے انگریز بہادر کے حوالے کر کے فی حریت پسند بیس روپے یا ایک مربع اراضی حاصل کرنے والے ''عزت دار'' تب بھی دربار سرکار میں پہلی قطار کی کرسی پر بیٹھنے کی سند رکھتے تھے اور آج بھی ایوان اقتدار میں براجمان ہیں۔ مجھے تاریخ کی آگاہی نے خوشی سے زیادہ ملال دیا ہے۔ کاش میں نے یہ تاریخ نہ پڑھی ہوتی۔ میں اس ڈیڑھ سو سالہ پرانی حقیقت سے مکمل آشنا نہ ہوتا تو بہتر تھا۔



رضی الدین رضی

کل اور آج...... چند تاریخی مغالطے

چہار چیز است تحفۂ ملتان
گرد، گرما، گدا و گورستان

1986ء میں جب محترم رفیق ڈوگر نے لاہور سے ہفت روزہ ''دید شنید'' کا آغاز کیا اور مجھے اس میں ملتان کی ہفتہ وار ادبی ڈائری تحریر کرنے کی دعوت دی تو میں ان دنوں لاہور میں ہی مقیم تھا۔لاہور میں بیٹھ کر ملتان کی ادبی سرگرمیوں کی روداد قلمبند کرنا کوئی آسان نہ تھا۔حل اس کا یہ نکالا کہ میں ادبی ڈائری نہیں کالم تحریر کروں گا اور اس کالم میں ادبی سرگرمیوں کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی مسائل، تنازعات، گروہ بندیوں اور نئی کتب کا تذکرہ بھی کیا جائے گا۔رفیق ڈوگر کی خواہش تھی کہ یہ کالم کسی لگی لپٹی کے بغیر تحریر کیا جانا چاہئے اور اس میں ''سب اچھا ہے'' والا وہ منافقانہ انداز نہیں ہونا چاہئے جو اس وقت کتابوں کی تعارفی تقریبات کے ذریعے ادبی حلقوں میں رائج ہو رہا تھا۔ڈاکٹر انور سدید نے اس کالم کے لئے میرا قلمی نام ''ہوٹل بابا'' تجویز کیا جو بابا ہوٹل سے مشتق تھا کہ بابا ہوٹل ان دنوں ملتان کی ادبی سیاست اور سرگرمیوں کا محور ومرکز ہوا کرتا تھا اور شہر کی ادبی سرگرمیوں اور تنازعات کے سوتے یہیں سے پھوٹتے تھے۔کالم کا نام میں نے ''تحفۂ ملتان'' رکھا۔شاکر حسین شاکر ان دنوں سعودی عرب کی ریت چھان رہا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ سعودی عرب کی ریت سے سونا تلاش کرنے کی سعی کر رہا تھا۔شاکر مقیم تو حجازِ مقدس میں تھا وہ مدینہ منورہ کی زیارت کو بھی جاتا لیکن دل اس کا بدستور مدینۃ الاولیاء میں اٹکا تھا۔ وہ ملتان اور ملتان والوں کے ہجر میں ہر دوسرے تیسرے روز میرے نام ایک طویل خط تحریر کرتا اور جوابی خط میں مجھے اس کے تمام سوالات کے جواب دینا ہوتے تھے۔کون کیا کر رہا ہے؟ ملتان میں کون سی تقریب ہوئی؟ کس کی کتاب اشاعت کے مراحل میں ہے اور کس کی شائع ہوگئی؟ کس کا کس کے ساتھ جھگڑا ہوا اور کس کی صلح ہوگئی؟ یہ سب احوال میں شاکر کو پہلے اپنے خطوط کے ذریعے بیان کرتا تھا اب اس کالم کے ذریعے مجھے یہ سہولت میسر آگئی کہ میں شاکر کے سوالات کی بنیاد پر کالم تحریر کرتا اور اشاعت کے بعد اس کی ایک کاپی شاکر کو بھی ارسال کر دیتا۔1986ء میں اس کالم کو جب میں نے ''تحفۂ ملتان'' کا نام دیا تو خود مجھے بھی اندازہ نہ تھا کہ اس کے ذریعے ملتان کے ساتھ میرے اور

شاکر کے ایک نہ ختم ہونے والے رومانس کا آغاز ہو رہا ہے۔میرے ذہن میں یہ سوال بھی نہ ابھرا کہ نامعلوم شاعر سے منسوب ''گرد و گرما'' والا یہ شعر جسے ظہیر الدین بابر کا شعر بھی کہا جاتا ہے کس زمانے میں کہا گیا تھا اور یہ کہ ''ملتان ما بہ جنتِ اعلیٰ برابر است'' سمیت ملتان کے حوالے سے شہرت پانے والے بہت سے اشعار کیا واقعی اتنے قدیم ہیں جتنا قدیم انہیں کتابوں میں بتایا گیا ہے۔مجھے بہت بعد میں احساس ہوا کہ جس شعر سے میں نے اپنے کالم کا نام اخذ کیا وہ شاید صدیوں پرانا شعر نہیں ۔یہ احساس اس وقت ہوا جب میں نے 19ویں صدی کے اواخر کا وہ ڈاک ٹکٹ دیکھا جس پر ملتان کی بجائے ''مولتان'' درج تھا۔پھر محاصرۂ ملتان کے بارے میں تحریر کی گئی JOHN JONES COLE کی کتاب THE SIEGE OF MOOLTAN میری نظر سے گزری اس میں بھی ملتان کو مولتان لکھا گیا تھا۔برطانوی دور میں تحریر کیے گئے ملتان کے گزیٹیر میں بھی یہ نام مولتان ہی تھا۔میں نے ملتان ریلوے سٹیشن کی 1911ء کی تصویر بھی دیکھی جس میں یہ نام ''مولتان'' درج تھا۔1986ء میں تو یہ سوال میرے ذہن میں نہیں آیا لیکن اب اس پر غور کر رہا ہوں اور اس کی کھوج میں بھی ہوں کہ اگر 20ویں صدی کے اوائل تک بھی ملتان ''مولتان'' تھا (اور ظاہر ہے اس سے قبل یہ مولی تان، مولی استھان یا مالی اِستھان کے نام سے بھی جانا جاتا تھا) تو پھر صدیوں پہلے ملتان کے بارے میں یہ اور ایسے دوسرے اشعار کہنے والوں نے اسے ملتان کیوں کہا ؟ اگر یہ اشعار اسی زمانے کے ہیں جس زمانے کا انہیں تاریخ کی کتابوں میں بتایا گیا ہے تو پھر شعرا کو ان اشعار میں ملتان کا وہی نام استعمال کرنا چاہیے تھا جو اس زمانے میں رائج تھا۔اور اگر اشعار میں ملتان کا رائج نام استعمال ہوتا تو پھر ان کی صورت کچھ اور ہوتی ۔شاعری کو سمجھنے والے میری بات کو زیادہ بہتر سمجھ پائیں گے کہ مذکورہ اشعار میں اگر ملتان کی جگہ لفظ ''مولتان'' استعمال کیا جائے تو شعر وزن سے خارج ہو جاتا ہے ۔تو کیا کسی ملتانی نے محض شہر سے جوشِ محبت میں یہ اشعار کہہ کر قدیم شعرا سے منسوب کر دیئے اور اس کے نتیجے میں ایک تاریخی مغالطے نے جنم لیا ؟ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ زمانۂ قدیم میں دیگر ناموں کے ساتھ ساتھ ملتان کا موجودہ نام بھی رائج رہا ہو۔ایک اور امکان کو بھی مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ کہاوتیں اور ضرب الامثال جب زمانی اور جغرافیائی حدیں عبور کرتی ہیں تو ان میں نئے زمان و مکان کے تناظر میں تبدیلیاں بھی ہو جاتی ہیں، تو کیا ان اشعار کو بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ضرورتِ شعری کی بجائے ضرورتِ زمانی یا ضرورتِ مکانی کے تحت تبدیل کر دیا گیا ؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالات ہیں جن کا تحقیق کے لوگوں کو جواب تلاش کرنا چاہیے اور ان مغالطوں کو درست کرنا چاہیے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ میں مستقل جگہ بنا گئے۔

ملتان کی تاریخ پر ماضی میں بہت سا کام ہوا اور یہ کام جاری بھی ہے لیکن ان تاریخی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ جیسے ہر کتاب دیگر بہت سی کتب کو سامنے رکھ کر تحریر کی گئی۔سو یہ کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ ہوگا کہ جس طرح ملکی سلامتی کو قومی سلامتی کے اداروں ،آئینِ پاکستان کو آئینی ماہروں اور نظامِ عدل کو منصفوں نے نقصان پہنچایا اسی طرح ملتان کی تاریخ کو یہاں کے نام نہاد مؤرخین اور محققین نے مسخ کیا (استثنیات کی گنجائش تو خیر ہر جگہ ہوتی ہے)۔ہزاروں سال پرانے دنیا کے واحد زندہ شہر کی تاریخ ،تہذیب اور ثقافت کے بارے میں تحقیقی کام بہت

پہلے ہونا چاہئے تھا۔خوشی کی بات یہ ہے کہ آج کی نسل اب تاریخ کے اوراق سے گرد جھاڑ رہی ہے۔گزشتہ دنوں حفیظ خان کی کتاب ''مآثر ملتان'' کو میں اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھتا ہوں۔ایک طویل عرصہ کے بعد ایک ایسی کتاب سامنے آئی جس میں بہت سے مغالطوں اور مفروضوں کو جرأت مندی کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔

پانچ ہزار سال قدیم شہر میں سانس لینا بلا شبہ ایک منفرد اور خوشگوار تجربہ ہے۔اس تجربے سے گزرتے تو سبھی ہیں لیکن اسے محسوس کرنے کے لئے اس شہر کے ساتھ والہانہ محبت بلکہ عشق ضروری ہے۔بہت کم شہر ایسے ہیں کہ جن کی گلیوں اور بازاروں میں گھومیں تو صدیاں آپ کے ساتھ سفر کرتی ہیں۔ملتان بھی ایسا ہی ایک شہر ہے جہاں ہر گلی اور ہر محلے میں تاریخ آپ کے قدم تھامتی ہے۔سوچنے،سمجھنے اور ادراک رکھنے والوں کو یہ شہر بار بار اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔کبھی کسی النگ سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی ہیں تو کبھی قلعہ کی بلندی سے دور افق پر دھول کے بادل دکھائی دیتے ہیں۔بوہڑ گیٹ کے قریب بن لوہاراں میں کسی مچھیرے کی آواز سنائی دیتی ہے کہ کبھی کسی زمانے میں جب شاہ یوسف گردیز نے یہاں راوی کنارے اپنا حجرہ بنایا تو دریا کی ایک شاخ اس زمانے میں اسی مقام سے گزرتی تھی جسے اب بن لوہاراں کہا جاتا ہے۔پھر خونی برج کے مقام پر سکندر اعظم خون میں لت پت پسپائی ہوتا دکھائی دیتا ہے۔بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سکندر دنیا سے ہی نہیں ملتان سے بھی خالی ہاتھ گیا تھا۔اور پھر ایک منظر سورج کنڈ اور دوسرا پرہلا جی کے مندر کا نظر میں سماتا ہے۔ایک بہت بڑا اجتماع سورج دیوتا کے پجاریوں کا نظر آتا ہے جو دنیا بھر سے اس اجتماع میں شرکت کیلئے ملتان آیا کرتے تھے۔ایک گرج دار آواز اس توپ کے گولے کی سنائی دیتی ہے جو انگریز حملہ آوروں نے قلعہ ملتان پر داغا تھا اور پھر اس کے نتیجے میں کئی دھماکے ہوئے،کئی روز تک شہر جلتا رہا اور ان دھماکوں کی آواز میں لوگوں کی چیخ و پکار دب گئی۔شہر کا بڑا علاقہ خاکستر ہو گیا اور ظاہر ہے صرف مکان ہی راکھ نہیں ہوئے مکانوں کے ساتھ مکین بھی اس راکھ کا حصہ بن گئے۔تاریخ نامور لوگوں کو تو ہمیشہ یاد رکھتی ہے لیکن تاریخی عمل کے دوران رزقِ خاک ہونے والوں کو کون یاد رکھے۔یہ تو وہ کام ہے جو مؤرخین بھی نہیں کر سکتے۔گمنام شہیدوں کی تو بس کبھی کہیں یادگار بنتی ہے یا کوئی اجتماعی قبر اور پھر اس قبر پر لوگ پھول چڑھاتے ہیں،دیے اور اگر بتیاں جلا کر منتیں مرادیں پاتے ہیں اور اس اجتماعی قبر کو ''نو گزے پیر'' کی قبر قرار دے دیا جاتا ہے۔میں جب بھی ملتان میں کسی نو گزے پیر کی قبر پر دیا جلتا دیکھتا ہوں تو گم نام شہیدوں کے احترام میں چند لمحوں کے وہاں ٹھہر جاتا ہوں۔شہر کی کسی بھی گلی اور کسی بھی کوچے سے گزرتے ہوئے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اس گلی یا اس کوچے میں مجھ سے پہلے کون کون آیا ہوگا؟کسی امید اور یقین کے ساتھ آیا ہوگا یا بے یقینی اور شکست خوردگی کے عالم میں؟اور یہ سوال کہ ہم جس راستے سے دن میں کئی بار گزرتے ہیں یہ راستہ پہلی بار کس نے بنایا ہوگا؟اور جہاں یہ گلیاں اور یہ کالونیاں ہیں اور جہاں یہ جدید پلازے تعمیر ہو رہے ہیں،جہاں آج مارکیٹیں اور بازار ہیں یہاں کبھی ویرانہ ہوگا اور جب یہاں ویرانہ تھا تو وہ کون تھا جو پہلی بار ہر خوف کو بالائے طاق رکھ کر یہاں سے گزرا تھا؟کسی مخدوش مکان کے دریچے یا بالکونی کو دیکھ کر یہ سوال ذہن میں ضرور آتا ہے کہ اس دریچے سے جب پردہ سرکتا ہوگا تو کس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی

ہوں گی ؟ کون منتظر آنکھوں کی ویرانی میں اچھے دنوں کے خواب سجائے ان دریچوں اور بالکونیوں سے جھانکتا ہوگا اور جانے اس کے خواب پورے بھی ہوئے ہوں گے یا وہ منتظر آنکھیں پتھرا گئی ہوں گی؟اور پھر یہاں کی ادبی اور ثقافتی زندگی کیسی ہوگی ؟ پہلی بار اس شہر میں کس نے کس کے لئے کوئی شعر کہا ہوگا ؟ کب کہا ہوگا ؟اور جب کسی نے لکھنا بھی نہ سیکھا تھا کیا اس وقت بھی کبھی نے کسی کا نام لکھنے کی کوشش کی ہوگی ؟اور یہاں کے بت تراش کیسے تھے؟ کیا ان کے فن کی بھی ناقدری ہوتی تھی اور وہ بھی صادق علی شہزاد کی طرح کہتے تھے کہ میں جب مر جاؤں تو ان مجسموں کو میرے ساتھ ہی دفن کر دینا؟ کون تھا جس نے ملتان میں پہلی تصویر بنائی تھی اور کون وہ خوش قسمت تھا جس کی اس شہر میں پہلی بار تصویر بنائی گئی ؟ کینوس اور رنگ تو ابھی ایجاد بھی نہ ہوئے ہوں گے تو کیا وہ تصویر کسی دیوار پر کسی پتھر سے کندہ کی گئی تھی یا کسی نے اپنی مخروطی انگلیوں سے راوی یا چناب کنارے ریت پر وہ تصویر بنائی تھی۔کون تھا جس نے شہر کے لوگوں کو کسی روز آ کر پہلی بار یہ بتایا تھا کہ درندے فلاں کو کھا گئے یا فلاں کو قتل کر دیا گیا یا حملہ آور شہر کے باہر فلاں مقام تک پہنچ چکے ہیں۔کون تھا جس نے پہلی بار شہر والوں کو حملہ آوروں کی لوٹ مار کا آنکھوں دیکھا حال سنایا تو کیا یہ حال سنانے والا ہی ملتان کا پہلا صحافی تھا۔پانچ ہزار سال پرانی تاریخ ،تہذیب اور تمدن کے وارث کسی شہر میں سانس لینا، اس شہر کے ماضی کو پورے شعور کے ساتھ چشمِ تصور میں دیکھنا اور خود کو اس منظر میں محسوس کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ۔اور جب آپ تاریخ کے کسی منظر کا حصہ بنیں ،اور جب آپ مدینۃ الاولیاء کے کسی منظر کا حصہ بنیں تو ڈھول کی تھاپ کانوں میں گونجتی ہے، کیفیت وجد کی طاری ہوتی ہے اور دھمال شروع ہو جاتا ہے۔وہی دھمال جو بابا بلھے شاہ کے مزار پر جاری ہے ،وہی دھمال جو لعل شہباز کے مزار سے منسوب ہے ،جو مادھو لعل کے ہاں ہوتا ہے اور جو ملتان میں شاہ شمس کے قدموں میں جاری ہے ۔یہ دھمال ایک جست میں ہمیں صدیوں کا سفر طے کرا دیتا ہے ۔ہمیں اس لمحے میں پہنچا دیتا ہے جہاں سورج سوا نیزے پر آنے کی روایت بیان کی گئی اور جہاں دودھ کے لبالب پیالے پر گلاب رکھا گیا۔اس گلاب کی مہک آج بھی ملتان کی فضاؤں میں محسوس ہوتی ہے۔

ملتان نے اسی گلاب کی مہک کے ساتھ صدیوں کا سفر طے کیا۔پانچ ہزار سال کے دوران شہر کیسے تبدیل ہوا یہ سب کچھ چند صفحات میں بیان کرنا ممکن تو نہیں لیکن اسے بیان کرنے کی کوشش تو کرنی چاہئے۔ہزاروں سال پہلے کا ذکر چھوڑئیے آپ گزشتہ چند عشروں کے دوران رونما ہونے والی تبدیلیوں پر ہی ایک نظر ڈال لیجئے ۔پل موج دریا پر جس جگہ آج فلائی اوور کا جال ہے اسی جگہ ایک نہر بہتی تھی۔یہ نالہ علی محمد تھا لیکن اسے نالہ ولی محمد کے نام سے جانا جاتا تھا۔جس جگہ آج ملتان آرٹس کونسل کی عمارت ہے عین اسی جگہ وہ نالہ یا نہر بہتی تھی۔آرٹس کونسل کے عقب میں جو پارک ہے اور اس سے آگے ایم ڈی اے کے جو دفاتر ہیں یہ سب اسی نالہ علی محمد کی گزرگاہ تھی۔جنوب کی سمت یہ نالہ محکمہ انہار کی کالونی سے گزرتا ہوا لانگے خان کے باغ کے قریب سے سول ہسپتال والی سڑک عبور کرتا ہوا حسن پروانہ روڈ کو اس جگہ سے عبور کرتا تھا جسے پل شوالہ (پلِ شِو والا) کہا جاتا ہے۔اس سے آگے محلہ سوتری وٹ کی جانب پارک کے نام پر جو ایک چار دیواری تعمیر کی گئی ہے یہ اسی نالے کی گزرگاہ تھی۔ ضلعی حکومت کے نقشوں میں یہ نالہ اب

بھی موجود ہے لیکن اس کی گزرگاہ پر اب کچی آبادیاں ہیں۔ یہ موجودہ ملتان کی سب سے بڑی کچی آبادی ہے اور اس میں سے بیشتر پر شہر کے معززین قابض ہیں۔ اسی طرح جس جگہ چند برس قبل کارڈیالوجی سینٹر تعمیر ہوا یہ نواب مظفر خان شہید کا محل تھا۔ اسے شیش محل کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ وہی نواب مظفر خان شہید تھے جنہوں نے اپنے جوان بیٹوں کے ہمراہ ملتان کی آن پر اپنی جان نچھاور کی۔ یقیناً نواب کے ساتھ عوام نے بھی شہر کی آن پر جان نچھاور کی ہو گی لیکن تاریخ عوام کے بارے میں تو خاموش ہی رہتی ہے۔ صرف تاریخ ہی خاموش نہیں رہتی خود عوام بھی تو خاموش رہتے ہیں۔ تاریخ تو بتاتی ہے کہ کس طرح یہاں کے مخادیم نے درباروں کے ساتھ روابط رکھے اور کس طرح یہاں کے مخدوموں اور وڈیروں نے برطانوی راج کو مستحکم کرنے کے لئے ملتان میں سیکڑوں ہزاروں افراد کا قتلِ عام کرایا اور اس کے عوض انعام واکرام اور جاگیریں حاصل کیں لیکن عوام اس پر خاموش رہتے ہیں۔ وہ آج بھی انہی مخدوموں اور گدی نشینوں کو محترم اور معتبر سمجھتے ہیں۔

تاریخ تو بہت کچھ بتاتی ہے لیکن ہم میں سننے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پھر ہم تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی سرکاری سطح پر اور کبھی درباری سطح پر۔ یہ بھی تاریخ کا ایک جبر ہے کہ ہم بہت سے نامعتبر لوگوں کو معتبر سمجھتے ہیں۔ کبھی عقیدت میں، کبھی کسی لالچ میں اور کبھی کسی خوف کی بنا پر۔ غلط لوگوں کو معتبر بنانے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جیسے جیسے وقت کی گرد پڑتی ہے ان کے اعتبار اور تقدس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ 1990ء کے عام انتخابات میں ایک مذہبی جماعت کے ٹکٹ پر ملتان سے رکن قومی اسمبلی بننے والے ایک صاحبزادہ سے مکالمہ کرتے ہوئے ملتان کے ثقافتی شہزادے حسن رضا گردیزی نے کہا تھا کہ ''صاحبزادہ صاحب آپ نے ہماری ذات پر بڑا احسان کیا۔ آپ کے والد بزرگوار نے وصال فرمایا تو آپ نے ان کا بڑا سا مقبرہ تعمیر کرا دیا۔ ہم پر احسان یہ ہوا کہ ہمارے دل سے حضرت یوسف شاہ گردیز اور دیگر ہستیوں کا خوف بھی جاتا رہا''۔ مزارات کے نام پر ایسے بہت سے مقابر گزشتہ چند عشروں کے دوران ہم نے بھی تعمیر ہوتے دیکھے۔ یہاں مزارات کی جگہ مقبروں کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ مزارات تو درویشوں کے ہوتے ہیں مذہب اور تصوف کے نام پر خوف کی بنیاد پر لوگوں کو غلام یا مرید بنانے والے مزارات میں آسودۂ خاک نہیں مقبروں میں دفن ہوتے ہیں۔ دلوں سے ان ہستیوں کا خوف ختم ہوا یا نہیں لیکن کچھ سوال ذہنوں میں ضرور ابھرے اور یہ ایسے سوالات ہیں کہ جنہیں خلقِ خدا کے خوف سے زبان پر لانا بھی ممکن نہیں۔ یقیناً آنے والے برسوں اور صدیوں میں ان مقابر اور ان شخصیات کے حوالے سے بہت سے معجزے رقم ہوں گے، بہت سی روایات اور بہت سی ماورائی کہانیاں مشہور ہوں گی۔ لیکن ہم جنہوں نے ان شخصیات کو دیکھا اور ان کے اعمال و افعال سے بخوبی واقف ہیں ہمیں تو معلوم ہے کہ ان کے تقدس میں کتنی سچائی ہے۔ لیکن آنے والی نسلیں تو انہیں برگزیدہ ہی سمجھیں گی۔ توہمات مزید مستحکم ہوں گے۔ ضعیف الاعتقادی میں مزید اضافہ ہو گا۔ دکھوں کی ماری خلقِ خدا اپنے مسائل کے حل کے لئے ان کی چوکھٹوں پر سجدہ ریز ہی رہے گی اور اس کے نتیجے میں جہالت، غربت، پسماندگی اور مفلوک الحالی میں اور اضافہ ہو گا۔ تاریخ کا جبر یہ بھی ہے کہ ایسے بہت سے مقامات پر وہ خاموش رہی ہے۔

المیہ یہ ہے تاریخ کے صفحات میں ہمیں کئی مقامات پر تضادات دکھائی دیتے ہیں۔مزاحمت کرنے والوں کو باغی اور حملہ آوروں کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔ملتان میں آج بھی حملہ آوروں کی یادگاریں موجود ہیں۔لوٹ مار کے لئے اپنے اپنے علاقوں سے ملتان کی جانب آنے والوں نے یہاں طویل حکمرانی کی۔وہ محمد بن قاسم ہو، احمد شاہ ابدالی ہو، رنجیت سنگھ ہو یا کوئی اور حملہ آور۔ان میں سے کوئی اسلام کے نام پر آیا اور کوئی کسی اور بہانے، مقصد سب کا ایک ہی تھا۔انہوں نے عوام کو لوٹا، ان کا قتلِ عام کیا، عزتوں سے کھیلا اور تاریخ میں اپنا نام لکھوا کر چلے گئے۔ملتان کی تاریخ پر کام کرنے والے زکریا یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عاشق محمد خاں درانی ایک تقریب میں بتا رہے تھے کہ یہ جو اندرون ملتان کے بہت سے گھروں کے آج بھی دروازے نہیں صرف چوکھٹیں ہیں اور ان چوکھٹوں پر کپڑے کا پردہ ڈالا جاتا ہے یہ روایت انہی حملہ آوروں کے احکامات پر عمل درآمد کے نتیجے میں مستحکم ہوئی اور پھر اتنی مستحکم ہوئی کہ یہاں کے طرزِ تعمیر کا حصہ بن گئی۔ہر حملہ آور اپنی تہذیب، ثقافت، زبان اور مذہب اپنے ساتھ لایا۔ہر دور میں اور کچھ ہوا یا نہیں ملتان میں نئی عبادت گاہیں ضرور تعمیر ہوئیں۔پرانی عبادت گاہیں یا تو مسمار کر دی گئیں یا پھر ''رواداری'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں رہائش گاہوں یا اصطبلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔

آخری حملہ اس شہر پر برطانیہ نے کیا تھا۔اس حملے کے نتیجے میں بھی یہاں ایک نیا کلچر پروان چڑھا۔پورے برِصغیر کی طرح ملتان میں ایک طرف تو مغربی تہذیب رائج ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے نظام بھی متعارف کرا دیئے گئے۔نئے محکمے اور ادارے قائم کئے گئے۔پھر ان اداروں کے لئے دفاتر کی تعمیر ہوئی تو اہلِ ملتان کو ایک نیا فنِ تعمیر بھی دیکھنے کو ملا۔نئے کھانے اور نئے پہناوے متعارف ہوئے۔دال مونگ اور دیگر روایتی کھانوں کے ساتھ ساتھ ڈبل روٹی، بسکٹ اور کیک پیسٹریاں بھی مارکیٹ میں آئیں۔حلوائیوں کی بہت سی دوکانیں بیکریوں مین تبدیل ہو گئیں۔پگڑی کی جگہ کیپ، دھوتی اور کرتے کی جگہ پینٹ شرٹ اور کوٹ، دنداسے کی جگہ لپ سٹک اور ابٹن کی جگہ کریم متعارف ہوئی۔شاید اسی زمانے میں اس شہر کے لوگوں نے پہلی بار ایک اور بدیسی زبان انگریزی سنی۔تعلیم عام ہوئی تو نوجوان پڑھ لکھ کر دفاتر میں ملازم ہوئے اور بابو کہلائے۔حتیٰ کہ شہر کے ایک علاقے کا نام ہی بابو محلہ رکھ دیا گیا۔ماضی کے حملہ آور ملتان پر قبضے کے بعد اپنی فوج سمیت قلعے میں رہتے تھے۔انگریز آئے تو انہوں نے پہلے قلعہ تباہ کیا اور پھر شہر کے باہر مغرب کی سمت کم و بیش اسی مقام کے قریب چھاؤنی ڈال لی جہاں کبھی صدیوں پہلے محمد بن قاسم نے اپنی فوج کے ساتھ پڑاؤ کیا تھا اور وہ جگہ پھر اسی کے نام سے موسوم ہو کر قاسم بیلہ کہلائی تھی۔چھاؤنی بنی تو پھر گورکھوں کے لئے کالونی بھی بنائی گئی، بازار بنا، مارکیٹ بنی، ایک نیا قلعہ تعمیر ہوا۔گورکھوں کی آسائش کے لئے ہر چھاؤنی کے ساتھ لال کرتی والیوں کا ایک محلہ آباد کیا جاتا تھا جو ''لال کرتی'' ہی کہلاتا تھا۔یہ محلہ ملتان میں بھی آباد ہوا۔پھر ایک روز اس شہر میں چیختی چنگھاڑتی شور مچاتی چھک چھک کرتی ٹرین آ گئی۔اور ٹرین کے ساتھ بابوؤں کی ایک نئی کھیپ بھی آئی۔شہر کا مرکزی ریلوے سٹیشن چھاؤنی کے قریب ہی تعمیر ہوا شاید اس لئے کہ ٹرین ابتدائی طور پر چلائی ہی اس لئے گئی تھی کہ گورکھوں تک رسد پہنچانے میں آسانی ہو۔ویسے بھی حکمرانوں کا ہمیشہ سے یہ

شیوہ رہا ہے کہ وہ عوام کے نام پر جو بھی سہولت فراہم کریں اس بات کو ضرور مدِ نظر رکھتے ہیں کہ عوام سے زیادہ اس سہولت کا خود انہیں فائدہ پہنچے۔ اسی چھاؤنی میں کمپنی حکومت کے نام پر ایک باغ لگایا گیا۔ یہ باغ تھا تو گورکھوں کے لئے لیکن عام ملتانیوں کو بھی اس میں داخلے کی اجازت تھی۔ باغ ہی نہیں ملتان کے لوگ چھاؤنی کی سڑکوں پر بھی گھوم سکتے تھے۔ انگریز حکمرانوں نے اگرچہ چھاؤنی عوام سے فاصلہ رکھنے کے لئے ہی شہر سے دور بنائی تھی لیکن چھاؤنی اس زمانے میں لوگوں کے لئے نو گو ایریا نہیں تھی۔ ہاں کچھ دفاتر یا فوجی گوداموں کے باہر ''خبردار یہ ممنوعہ علاقہ ہے'' کا بورڈ ضرور نصب ہوتا تھا اور لوگ اس بورڈ کا بھی احترام کرتے تھے۔ اور کمپنی باغ (جسے اب کنٹونمنٹ گارڈن کا نام دیا جا چکا ہے) کے ذکر پر میں اپنے سکول کا ذکر کیوں نہ کروں جو اس باغ کے قریب ہی سروسز کلب (اسے اب ایم جی ایم یعنی ملتان گیریژن میس کے نام سے پکارا جاتا ہے) کے سامنے واقع تھا۔ نویں جماعت میں بیالوجی کے پریکٹیکل کے لئے جب ہمیں مینڈک کا آپریشن (DISSECTION) کرنا تھا تو اس کے لئے مینڈک ہم اسی کمپنی باغ سے پکڑ کر لائے تھے۔ اس زمانے میں یہاں سے مینڈک پکڑنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ پابندی تو مینڈک پکڑنے پر شاید اب بھی نہ ہو لیکن ایک تو اب وہ مینڈک ہی نہیں رہے اور دوسرا بہت سی اور پابندیاں بھی لگ چکی ہیں۔ جس سروسز کلب میں جا کر ہم صبح سویرے پہلے یا دوسرے پیریڈ کے دوران کبھی کبھار جو فریزر یا کین نارٹن کے ساتھ محمد علی کلے کی باکسنگ دیکھا کرتے تھے برا ہو اسلام کے نام پر پوری دنیا کی فتح کا خواب دیکھنے والے دہشت گردوں کا کہ ان کی وجہ سے اب اسی کلب اور کمپنی باغ کے سامنے فوج کے جوان گشت کرتے ہیں کسی چڑیا کو بھی پر مارنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

لیکن کمپنی باغ اور سروسز کلب کا ذکر چھوڑیں۔ بات ملتان کے ساتھ اس رومان کی کرتے ہیں جو شاکر حسین شاکر کے طفیل پروان چڑھا۔ شاکر ایک سچا اور سُچا ملتانی ہے۔ ایک ایسا ملتانی جو اس شہر کے فنکاروں سے پیار کرتا ہے، یہاں کے مصوروں، خطاطوں اور ہنروروں کی فلاح کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ پرانے ملتان کی تاریخی النگ کے باہر خونی برج کے قریب ایک محلے میں پیدا ہوا۔ مجھے یاد ہے مارچ 1981ء میں جن دنوں پی آئی اے کی ہائی جیکنگ کا ڈرامہ جاری تھا اور اس وقت کے ڈکٹیٹر نے اس واقعے کو الذوالفقار سے منسوب کر رکھا تھا انہی دنوں ایک صبح میں اس سے ملنے کے لئے پہلی بار اس کے گھر گیا تھا۔ شاکر نے چوک خونی برج میں گنے کے جوس سے میری تواضع کی تھی۔ شہر میں بہت سی تبدیلیاں آئیں، کئی دوکانیں ختم ہوئیں، کئی عمارتیں مسمار ہو گئیں لیکن وہ گنے کی ریہڑی آج بھی اسی چوک میں موجود ہے۔ اور شاید وہ اب تک امتدادِ زمانہ کا اسی لئے شکار نہیں ہوئی کہ وہاں شاکر نے پہلی بار میری تواضع کی تھی۔ محبت کے کئی رنگ ہیں اور ان رنگوں کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ زمانے کے نشیب و فراز ان پر اثر انداز نہیں ہوتے، محبت سلامت رہے تو محبت کی ہر نشانی بھی سلامت رہتی ہے۔ جیسے چھاؤنی والی جھیل پر ایک درخت بہت دیر تک سلامت رہا جس کے تنے پر دو ناموں کے پہلے حروف کھرچے گئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ درخت کے پھیلاؤ میں اضافہ ہوا تو وہ نام بھی بڑے اور مدھم ہونے لگے اور پھر رفتہ رفتہ وہ اسی درخت کی وسعت میں کہیں گم

ہو گئے۔پھر ایک روز اس جھیل کو وسعت دی گئی تو وہاں کا سارا نقشہ بھی تبدیل ہوا اور اس ردو بدل میں وہ درخت بھی گم ہو گیا۔محبت کی نشانی کھو گئی اور نشانی بھلا کیسے رہتی محبت بھی تو کہیں کھو چکی تھی۔لیکن شاکر سلامت رہے اس کی محبت سلامت رہے اور اس محبت کی تمام نشانیاں بھی سلامت رہیں جیسے ملتان سلامت ہے اور ملتان کا چوک خونی برج سلامت ہے اور اس چوک میں گنے کی وہ ریڑھی سلامت ہے۔میں جب بھی خونی برج چوک سے گزرتا ہوں گنے کی اس ریڑھی کو ضرور مڑ کر دیکھتا ہوں اور اگر کوئی میرے ساتھ ہو تو اسے بتاتا ہوں یہ وہ جگہ ہے جہاں شاکر نے مجھے پہلی بار گنے کا جوس پلایا تھا۔جیسے میں گلگشت کالونی جاتے ہوئے ڈاکخانے کے سامنے والے موڑ سے گزرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ یہاں میری پہلی بار قمر رضا شہزاد سے ملاقات ہوئی تھی۔آج مضمون لکھنے بیٹھا اور خونی برج کا اس مضمون میں سکندر اعظم کے بعد شاکر حسین شاکر کے حوالے سے دوبارہ ذکر آیا تو مجھے یہ بھی یاد آیا کہ جب میں 1981ء میں پہلی بار خونی برج گیا تو مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس مقام کی کیا تاریخی اہمیت ہے۔اور مجھے ہی نہیں شاکر جو اس علاقے میں مقیم تھا اسے بھی تو علم نہیں تھا کہ جس جگہ وہ میٹھے جوس سے میری تواضع کر رہا ہے اسی جگہ پر یا اس کے آس پاس ہی کہیں سکندرِ اعظم کو زہر بھرا تیر لگا تھا جو بعد ازاں اس کی موت کا باعث بنا۔اس کے لئے تو خونی برج کے بس دو ہی حوالے معتبر تھے اور وہی اس نے مجھے بتائے تھے کہ یہاں النگ سے ہر سال استاد شاگرد کے تعزیے نکلتے ہیں جو حرم گیٹ پر اختتام پذیر ہوتے ہیں اور اس ساتھ والی گلی سے روزانہ صبح ایک لڑکی نکلتی ہے جو فلاں سکول تک جاتی ہے۔اور کتنی خوبصورت بات ہے کہ جس مقام سے فاتح عالم خالی ہاتھ پسپا ہوا وہیں سے یہ فقیر شاکر کی محبتیں سمیٹ لایا اور پھر انہی محبتوں کے طفیل ہم دونوں نے دنیا کو نہ سہی ملتان کو تو فتح کر ہی لیا کہ ہماری دنیا تو ملتان ہی ہے۔اقبال نے ''محبت فاتحِ عالم'' یونہی تو نہیں کہا تھا۔

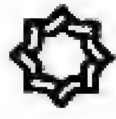
شاکر کا بچپن اور لڑکپن کا کچھ حصہ اندرونِ شہر کی گلیوں میں گزرا۔وہ اسلامیہ ہائی سکول حرم گیٹ میں پڑھتا تھا۔روزانہ پیدل سکول جاتا راستے میں آتا جاتا چوک حرم گیٹ پر واقع عزیز بک سٹال پر رک کر بچوں کی کہانیاں اور رسالے دیکھتا۔اس کے والد صاحب حاجی جعفر حسین زرگر ہیں ان کی کالے منڈی میں دکان تھی۔شاکر حرم گیٹ میں صابن والی گلی کے راستے اس دوکان پر بھی جاتا۔255 کالے منڈی ملتان کا ایڈریس تو خود مجھے ابھی تک یاد ہے کہ جب ہم نے کالج کے زمانے میں ''مجلسِ فکرِ نو'' قائم کی تو اس کی خط و کتابت کے لئے لیٹر پیڈ پر یہی ایڈریس شائع کیا تھا۔پھر ایک طویل عرصہ تک میری اپنی ڈاک بھی اسی پتے پر آتی رہی۔مجالسِ عزا میں شرکت لئے شاکر کو بچپن ہی سے امام باگاہ شاہ گردیز، امام بارگاہ مہاجرین، یا حویلی مرید شاہ جانا ہوتا تھا۔اسی طرح عاشورہ کے جلوسوں میں شرکت کے لئے بھی وہ اندرون ملتان کے گلی محلوں سے گزرتا تھا۔میرا معاملہ مختلف تھا میرا بچپن چھاؤنی کے قریب صدر بازار کے بابو محلے میں گزرا۔اس علاقے میں رہنے والے بوہڑ گیٹ، گھنٹہ گھر اور اس سے آگے کے علاقے کو شہر کہتے تھے۔اور شہر کا سب سے معروف حوالہ یہ تھا کہ وہاں سے چیزیں سستی ملتی تھیں۔عید پر کپڑوں جوتوں کی خریداری کے لئے میں اپنی والدہ کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر شہر جاتا تھا۔مہینے کے شروع میں میرے چچا کچن کا سامان لینے کے لئے

گڑمنڈی جاتے تھے تو کبھی کبھار میں بھی ان کے ساتھ سائیکل پر سوار ہو جاتا۔واپسی پر قلعے کے نیچے حسین آگاہی والی سڑک پر ایک دوکان سے ہم سموسے کھاتے ،ان سموسوں کا ذائقہ ہمارے علاقے میں تیار ہونے والے سموسوں سے مختلف ہوتا تھا۔شہر کا ایک اور حوالہ حسین آگاہی کے باہر اماں جی کا گھر تھا۔یہ اماں جی رشتے میں میری والدہ کی دادی اور اداکار خالد بٹ اور زاہد سلیم مرحوم کی والدہ تھیں۔ہم اماں جی کے گھر سال میں ایک دو بار جاتے تھے اور عید میلادالنبیؐ کے موقع پر تو ضرور جاتے تھے کہ ان کے گھر کے باہر سے عید میلاد کے روایتی جلوس گزرتے تھے۔عربی لباس میں اونٹوں پر سوار بچے ،ساتھ میں نعت خواں پارٹیاں ،اس زمانے میں ان جلوسوں میں بچوں کو فوجی وردیاں نہیں پہنائی جاتی تھیں۔مذہبی اجتماعات اور تقریبات میں جنگی ماحول ضیاء دور میں پیدا کیا گیا۔سو ہم وہ جلوس دیکھنے کے لئے بھی شہر جاتے تھے۔عاشورہ کے جلوس دیکھنے کے لئے ہمیں شہر نہیں جانا پڑتا تھا کہ وہ جلوس صدر بازار سے ہی گزرتا تھا۔صدر بازار میں ڈاکٹر محمد حسین کے کلینک کے سامنے ڈینٹل ڈاکٹر محمد اسلم کا گھر تھا ڈینٹل ڈاکٹر تو میں نے آج کی زبان میں لکھ دیا ورنہ ان کی دوکان کے باہر تو دندان ساز کا بورڈ لگا تھا۔وہاں جا کر ہم ماں جی سے حلیم بھی کھاتے اور بالکونی سے ماتمی جلوس بھی دیکھتے۔مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں پر عورتوں اور بچوں کا ہجوم ہوتا سڑکیں ہر عمر کے مردوں سے بھری ہوتیں۔اتنا ہجوم کہ تاحدِ نظر سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔نہ کوئی رکاوٹ ،نہ کوئی تلاشی ،نہ کسی خودکش کا خطرہ ،نہ بم دھماکے کا ڈر ،اور تو اور یہ جلوس دیکھنا کفر ،یا بدعت کے زمرے میں بھی نہ آتا تھا۔جلوس کے آگے ایک گتکہ پارٹی ہوتی تھی۔اس گتکے کا اہتمام اہلِ سنت کرتے تھے اور اس میں ڈنڈوں ،تلواروں ،نیزوں ،بھالوں اور دوسرے سامانِ حرب کے ذریعے میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کیا جاتا تھا۔نوجوان آپس میں مقابلہ کرتے ،ایک دوسرے کے وار روکتے ،ساتھ میں نوبت بجتی تھی۔یہ گتکہ سات محرم کی رات شروع ہوتا ،شبِ عاشور یہ گتکہ پارٹی ہمارے گھر کے سامنے میدان لگاتی تھی۔مجھے یاد ہے کہ اس رات ہم سب گھر والے گیارہ ،بارہ بجے تک جاگتے تھے اور گتکہ دیکھ کر سوتے تھے۔گتکے کا اہتمام حفیظ صاحب کرتے تھے۔وہ اسی محلے میں پلے بڑھے اور پھر روزگار کے لئے کراچی منتقل ہو گئے۔کراچی سے وہ سال میں ایک مرتبہ عاشورہ کے موقع پر ہی ملتان آتے اور گتکہ کھیل کر واپس چلے جاتے۔سنا ہے انہوں نے محرم کے موقع پر گتکہ کھیلنے کی منت مان رکھی تھی۔پھر جب اس ملک میں اسلام کے نام پر کفر کے فتوے عام ہوئے اور بدعتیں رائج ہوئیں تو حفیظ صاحب بھی گتکے سے تائب ہو گئے۔انہوں نے نہ صرف گتکہ ختم کیا بلکہ کفارہ بھی ادا کیا۔معلوم نہیں وہ کفارہ توبہ کا تھا یا منت توڑنے کا۔بہر حال اس روز کے بعد وہ محرم کی بجائے کبھی کبھار عید پر ملتان آتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ انہیں قتل کی دھمکیاں ہرگز نہیں دی گئیں۔

ذکر یہ ہو رہا تھا کہ شہر میرے لئے صرف گھنٹہ گھر ،حسین آگاہی اور چوک بازار تھا۔شاکر نے ملتان کی جو قدامت بچپن میں ہی دیکھ لی تھی وہ مجھ پر بہت بعد میں آشکار ہوئی۔میں تو بابو محلے کے شیراں والے مکان اور جین مندر کو ہی قدیم ملتان سمجھتا تھا۔شاکر نے کالج کے زمانے میں مجھے قدیم ملتان دکھایا۔اندرون شہر کے جن گلی کوچوں سے وہ واقف ہے اور جن احاطوں اور محلوں کے نام اور راستے وہ جانتا ہے ان میں سے بہت سوں سے آج بھی میں نا

واقف ہوں۔اسی نے مجھے بتایا کہ روایتی دال مونگ کہاں سے ملتی ہے، ربڑی کہاں سے کھانی ہے، کلچے اور پوریاں کہاں کی مشہور ہیں، روایتی سوہن حلوہ کس دوکان سے ملتا ہے اور فالودہ کہاں سے کھایا جائے۔یہ شاکر ہی ہے جس نے مجھے قدیم وجدید ملتان کے ذائقوں سے آشنا کیا۔

یہ سب منظر، یہ سب رنگ، یہ سب ذائقے اسی شہر ملتان کے ہیں جس میں ہم اور آپ سانس لیتے ہیں۔آپ اس کے گلی کوچوں میں جائیں ملتان آپ پر اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ آشکار ہوتا جائے گا۔ملتان آپ سے مکالمہ کرے گا۔یہ اپنے دکھ بھی بتائے گا اور اپنی خوشیوں میں بھی آپ کو شریک کرے گا۔شہر خود بتائے گا کہ کون اس کا محسن تھا اور کون غدار۔شہر بتائے گا کہ پانچ ہزار سال کے دوران کس نے اس کے خدوخال نکھارے اور کس نے اسے زخم دیئے۔شہر بتائے گا کہ کس ہز میجسٹی، کس بلند اقبال اور کس خان بہادر کے حکم پر اس کی پرشکوہ تاریخ کو مسخ اور شاندار روایات کو مجروح کیا گیا۔اور جہاں شہر خاموش ہوگا اور جہاں شہر کی آواز بھرا جائے گی وہاں شاکر بتائے گا کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس شہر کے زخموں پر مرہم رکھا اور وہ کون تھے جو نمک پاشی کرتے رہے۔اور جب شاکر کی آواز ساتھ چھوڑ جائے گی تو پھر داتا صاحب گواہی دیں گے کہ یہ جولاہور اب تختِ لاہور کے نام سے جانا جاتا ہے یہ تو کبھی یکے از مضافاتِ ملتان تھا۔وہ شعر پرانا ہے یا نہیں، وہ شعر کسی نے جوشِ محبت میں کہہ کر تاریخی مغالطے کو جنم دیا یا نہیں اور اس شعر میں ضرورتِ زمانی یا ضرورتِ مکانی کے تحت ردوبدل ہوا یا نہیں لیکن یہ تو ایک حقیقت ہے کہ ملتان ما بہ جنتِ اعلیٰ برابر است۔صرف میرے اور شاکر کے لئے ہی نہیں آپ کے لئے بھی۔۔۔



منشی عبدالرحمٰن خان

والیان ملتان

ناصر الدین قباچہ

سلطان محمد غوری کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس نے اپنے غلاموں کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا تھا۔ اس لئے اس کی شہادت کے بعد اس کے غلام تاج الدین یلدوز کو غزنی کی، ناصر الدین قباچہ کو سندھ اور ملتان کی اور قطب الدین ایبک کو لاہور اور دہلی کی حکومت ملی۔

خاندان غلاماں کے نامور بادشاہ قطب الدین ایبک کی لڑکی سلطان محمد غوری کے اسی غلام ناصر الدین قباچہ سے بیاہی ہوئی تھی جو نہایت ہی بہادر، ذہین اور فہیم تھا۔ اور ایک عرصہ تک سلطان محمد غوری کی خدمت میں رہ کر امور سلطنت اور کشور کشائی کا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ وہ قطب الدین ایبک کے وقت، اسی کی منشاء کے مطابق حکومت چلاتا رہا مگر ایبک کی وفات کے بعد ۱۲۱۰-۱۱ء میں ناصر الدین قباچہ نے ملتان اور سندھ کے بقیہ حصے اور قلعے فتح کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اس طرح اس نے سندھ اور ملتان کی حکومت کو شاہانِ دہلی سے علیحدہ کر کے ایک مستقل سلطنت قائم کی اور اپنے نام کا سکہ اور خطبہ کیا۔ یہ سکہ ملتانی زبان میں تھا۔

رضیہ سلطانہ

۱۲۲۸ء میں ترکش ایمپائر کے عظیم فرمانروا، اعلیٰ انسان اور موزوں حکمران سلطان شمس الدین التمش نے قباچہ کو اطاعت گزار بنانے اور ملتان و سندھ کو سلطنت دہلی کے زیر نگیں لانے کے لئے اس پر حملہ کیا۔ قباچہ اُچ سے بھاگ کر بھکر کے ناقابل تسخیر قلعہ میں پناہ گزیں ہوا۔ التمش نے تین ماہ کے بعد اُچ پر قبضہ کر لیا اور قباچہ فراری کے دوران سندھ میں ڈوب کر مر گیا۔ اس طرح سندھ اور ملتان کا سلطنت دہلی سے الحاق ہو گیا۔

سلطان التمش کی وفات کے بعد عنان حکومت اس کی بیٹی رضیہ نے سنبھالی وہ نہایت ہوشیار، عقلمند اور مردانہ اوصاف کی مالک تھی اور رموز مملکت سے اچھی طرح واقف تھی۔ کیونکہ التمش کا لائق لڑکا ناصر الدین محمود

فوت ہو چکا تھا اور اس کے دوسرے لڑکے نااہل اور تن آسان تھے، اس لئے سلطان کی غیر حاضری میں جملہ کاروبار سلطنت رضیہ سلطانہ انجام دیا کرتی تھی۔ رضیہ سلطانہ پہلی مسلمان خاتون تھی جس نے نومبر ۱۲۳۶ء میں تاج شاہی پہنا۔

رضیہ سلطانہ کے زمانے میں ملک عزالدین ایاز حاکم ملتان نے سرکشی کی۔ جس کی بنا پر رضیہ سلطانہ کو ملتان کا رخ کرنا پڑا۔ اس نے بغاوت کو فرو کر کے یہاں اپنا تسلط قائم کیا۔ کچھ دن ملتان میں مقیم رہی، عدل و انصاف سے رعایا کو گرویدہ بنایا اور جودوکرم سے مساکین وفقراء کو مالا مال کیا۔ رضیہ سلطانہ نے اپنے قیام ملتان کے دوران اندرون شہر حضرت شاہ یوسف گردیز کے مزار پر حاضری دی اور حسب شان نذر پیش کی، انعامات عطا کیئے اور خانقاہ کی امداد کے لئے ایک آباد موضع وقف کیا۔ ملتان میں اپنا انتظام و انصرام مکمل کرنے کے بعد دہلی واپس گئی اور ۱۳ اکتوبر ۱۲۴۰ء کو ماری گئی۔

ترک اور مغل حکمران

اس کی وفات کے بعد سیف الدین حسن قرلوغ ترک نے غزنی سے نکل کر ملتان پر قبضہ کرلیا اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ ۱۲۴۵ء میں مغلوں نے نوئین منگوتہ کی زیر کمان ملتان اور اوچ پر حملہ کیا۔ سیف الدین حسن سندھ بھاگ گیا اور حملہ آور مغل شاہ دہلی کی آمد کی خبر سن کر واپس لوٹ گئے۔ غیاث الدین بلبن شاہ دہلی کی طرف سے اس کا چچازاد بھائی ملک شیر خان ملتان اور سرحدی علاقہ کا حاکم مقرر ہوا جس نے ۱۲۴۹ء میں ناصرالدین محمد قرلوغ ترک کے اور ۱۲۵۰ء میں ملک معزالدین حاکم اوچ و ناگور کے حملہ کو پسپا کیا۔ ۱۲۵۴ء میں ملک عزالدین بلبن حاکم ملتان بنا۔ اس نے مغلوں سے ساز باز کی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ۱۲۵۷ء میں مغل پھر نوئین صالح کی زیر کمان ملتان پر حملہ کی غرض سے نمودار ہوئے۔ وہ برج اور مورچے گرا کر شہر میں قتل و غارت کرنے کو تھے کہ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ایک لاکھ درہم نقد لے کر پہنچے اور مغلوں کو یہ رقم ادا کر کے شہر کو ان کی تباہی سے بچایا۔

جلال الدین خلجی

خاندان غلاماں کے شاہان، بلبن، التمش اور ایبک کی اولاد میں کوئی ایسا لائق شخص پیدا نہ ہوا جو انتظام سلطنت سنبھالتا۔ اس لئے خلجی خاندان کے ایک امیر ملک جلال الدین فیروز شاہ کو جو زندگی کی ستر منزلیں طے کر چکا تھا، تخت دہلی پر بٹھا دیا گیا۔ جلال الدین چنگیز خان کے داماد تاج خان کا پوتا تھا۔

۱۲۹۶-۹۷ء میں سلطان جلال الدین نے لاہور پہنچ کر اپنے منجھلے لڑکے ارکلی خان کو جو نہایت ہی خوش اخلاق، مدبر اور بہادر انسان تھا۔ ملتان اور اوچ کا گورنر مقرر کیا اور سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک چھجو عرف کشلی خان کو کڑہ (اللہ آباد) کا گورنر بنایا جہاں ترک امراء نے جو خلجیوں سے خود کو فروتر سمجھتے تھے، ملک چھجو

جلال الدین کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا اور اس نے سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ سلطان نے اس کی گوشمالی کے لئے لشکر کشی کی۔ چھجو کو گرفتار کر کے سلطان کے روبرو پیش کیا گیا تو بادشاہ نے اسے معاف کر دیا اور معہ اہل و عیال اسے ملتان بھیج دیا کہ اسے وہاں عیش و آرام سے رکھا جائے۔ امراء نے اس کی مخالفت کی۔ سلطان نے کہا کہ میں بلبن کا نوکر تھا۔ اس کے مجھ پر بڑے احسان اور حقوق ہیں۔ آج میں اس کے تخت پر بیٹھا ہوں۔ اگر میں اس کے عزیزوں کو تہ تیغ کروں تو یہ بڑی بے مروتی اور بے انصافی ہوگی۔ جلال الدین کی یہ رحم دلی اسے سخت مہنگی پڑی۔ کیونکہ چھجو خان کے جن ہمراہیان کو سلطان نے آزاد کیا تھا وہ سلطان کے بھتیجے اور داماد علاؤالدین خلجی گورنر کڑہ کے ہاں ملازم ہو گئے اور اسے اپنے چچا و خسر کے خلاف بہکایا۔ جو پہلے ہی ساس اور بیوی کے جھگڑوں سے تنگ آچکا تھا۔ علاؤالدین نے بڑے مکروفن سے اپنے چچا سلطان جلال الدین کو اپنے ہاں بلوا کر قتل کرا دیا۔ سلطان کی بیوہ ملکہ نے سلطان کے چھوٹے لڑکے قدر خان کو تخت پر بٹھا دیا، سلطان مرحوم کا فرزند اکبر ارکلی خان جو شجاعت اور عسکری قابلیت میں مشہور تھا۔ منگولوں کے استیصال کے لئے ملتان میں مامور تھا۔ وہ باپ کے قتل کی خبر سن کر دہلی کو روانہ ہوا۔ لیکن جب اسے چھوٹے بھائی کے سریرآرائے تخت ہونے کی خبر ملی تو وہ مایوس ہو کر ملتان لوٹ گیا۔ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علاؤالدین خلجی نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور سلطان مرحوم کی بیوہ ملکہ جہاں اپنے لڑکے قدر خان کو لے کر ملتان آ گئی۔

علاؤالدین خلجی نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے بھائی الغ خان کو ملتان روانہ کیا جس کی آمد پر ارکلی خان اور قدر خان دونوں بھائیوں نے بغاوت کی بجائے اطاعت کی۔ الغ خان دونوں شہزادوں اور دیگر امراء کو لے کر دہلی روانہ ہوا۔ راستہ میں اس نے ارکلی خان، قدر خان اور سلطان جلال الدین کے داماد الغ خان کو اندھا کر کے قلعہ ہانسی میں قید کر دیا۔ دہلی میں ملکہ جہاں اور ملکہ چپ کو بھی قید کر دیا گیا۔ ارکلی خان کے دونوں بیٹوں کو بھی قتل کر کے علاؤالدین بے فکری سے حکومت کرنے لگا۔

سلطان محمد تغلق

سلطان غیاث الدین بلبن کے غلام ملک تغلق کا بیٹا اور خاندان تغلق کا بانی غازی الملک ۱۳۰۵ء میں ملتان کا گورنر تھا۔ وہ اپنی طاقت بڑھا کر پہلے لاہور اور پھر دہلی پر قبضہ کر کے سلطان غیاث الدین تغلق کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ تعمیر کا شوقین تھا۔ اس نے اپنے وقت میں محلہ کوٹلہ تغلق خان عرف کوٹلہ تولے خان آباد کیا اور دنیا کا وہ بے نظیر مقبرہ تیار کرایا، جس میں حضرت شاہ رکنِ عالم آرام فرما ہیں۔ یہ بڑا شجاع تھا۔ اس نے ۲۹ بار تاتاریوں کے حملوں سے ملک کو بچایا اور غازی الملک کا لقب پایا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جونا خان سلطان محمد تغلق کے لقب سے اوائل ۱۳۲۵ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں ملتان چناب کی دریائی بندرگاہ تھا۔ کسٹم ڈیوٹی کا رواج اس کے عہد کی یادگار ہے، اس کے

عہد میں منگولوں نے ۱۳۲۹ء میں حملہ کیا۔ ملتان اور لاہور کو روندتے ہوئے دہلی پہنچے اور بے شمار زر و مال بطور تحفہ حاصل کر کے واپس ہوئے۔

سلطان محمد تغلق تبلیغ اسلام کا بڑا شیدائی تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ محض تلوار کے بل بوتے پر برعظیم ہند مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں رہ سکتا۔ اس لئے علماء مشائخ دارالسلطنت یا بڑے بڑے شہروں میں رہ کر سرکاری وظائف پر عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کی بجائے دور دراز علاقوں میں جا کر غیر مسلموں کو تبلیغ کریں، وہ حضرت شیخ رکن عالم کا بڑا عقیدت مند تھا۔ اس نے اپنے بھتیجہ کی کھال اتروا کر بغرض تذلیل ملتان بھجوائی جسے کتلو خان حاکم ملتان نے سبز مسجد کے باہر تھلہ بنوا کر اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ جو سلطان کو ناگوار گزرا۔ وہ ملتان کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتا تھا کہ حضرت شاہ رکن عالم نے ننگے پاؤں اور ننگے سر حاضر ہو کر سفارش کی اور ملتان کو تباہی و بربادی سے بچایا۔ سلطان نے اپنے والد کی وفات کے بعد اس کا تعمیر کردہ مقبرہ حضرت شاہ رکن عالم کے حوالے کر دیا۔ جس میں آپ دفن ہیں۔

سلطان محمد تغلق نہایت فاضل آدمی تھا۔ اہل علم و دانش کا بڑا قدر دان تھا، علم ادبیات منطق، فلکیات اور ریاضیات کے علوم پر عبور رکھتا تھا۔ فلسفہ یونان کا بڑا ماہر تھا۔ قرآن اور فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ کا حافظ تھا۔ برنی کے بیان کے مطابق اپنی شاہزادگی کے زمانہ میں جب یہ گورنر ملتان تھا اس کی مجلس فضلاء و شعراء سے ہمیشہ بھری رہتی تھی۔ اس میں برابر شاہنامہ فردوسی، دیوان سنائی، دیوان خاقانی اور خمسہ نظامی پڑھے جاتے تھے۔ پھر ان پر بحث وتمحیص ہوتی تھی۔ اگر پند و نصائح کا کوئی شعر سن لیتا تھا تو اسی وقت رو دیتا تھا۔ اس کی تہذیب و شائستگی کا یہ عالم تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو دن کا دن رات کی رات گزر جاتی لیکن اپنا زانو تک نہ بدلتا۔ اس نے دو مرتبہ حضرت سعدی کو ملتان آنے اور مدرسہ بنوا دینے کی پیشکش کی مگر وہ اپنی پیری و ضعیفی کی وجہ سے خود تو نہ آسکے لیکن اپنی دو قلمی کتابیں گلستان و بوستان بھیج دیں۔

امیر تیمور

ہلاکو اور چنگیز خان کا جانشین، خداداد صلاحیتوں کا مالک، دلیر اور نڈر چغتائی ترک امیر تیمور نے سلطنت دہلی کے سیاسی انتشار اور برعظیم کی بے انداز دولت کی شہرت کی بنا پر ہندوستان کا رخ کیا۔ تیمور کے ہوا خواہ اس کی مذہبی عصبیت کو حملہ ہند کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ مگر جگہ بہ جگہ بدنصیب مسلمان مقتولین کے کٹے ہوئے سروں سے بنائے گئے مینار اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔

اس کی اپنی لکھی ہوئی تزک تیموری میں تحریر ہے کہ ہندوستان کو فتح کرنے کے لئے میں نے اپنے امیران لشکر اور فرزندان دلبند سے مشورہ لیا۔ فرزندان والا قدر نے تو تسخیر ہند کو ضروری قرار دیا۔ مگر امیران لشکر نے تذبذب کا اظہار کیا۔ میں نے قرآن سے دریافت کیا تو یہ آیت کریمہ برآمد ہوئی۔

(یا ایھا النبی جاھِد الکفار والمنفقین)

یہ سن کر سب نے سر جھکا لیا اور چپ ہو گئے۔ جس پر امیر تیمور نے ہند پر حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا اور اس کے تحت اپنے پوتے پیر محمد خان کو ہراول دستہ کے طور پر ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ جس نے دریائے سندھ عبور کر کے اوائل ۱۳۹۸ء میں ملتان اور اوچ پر قبضہ کر لیا۔

ستمبر ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ایک بھاری لشکر جرار کے ساتھ دریائے سندھ، دریائے جہلم، دریائے چناب اور راوی کو عبور کر کے لاہور کے حاکم مبارک خان کو شکست دی، جس نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ اکتوبر ۱۳۹۸ء میں اس نے ملتان کے تیسرے تاریخی قلعہ تلمبہ پر حملہ کیا اسے فتح کرنے کے بعد اس نے وہاں دربار لگایا۔ اہل سادات آل رسول اللہؐ اور علماء وفضلاء کو زرفدیہ معاف کیا اور تحائف مختلفہ واسپ ہائے عربی عطا کر کے سرفراز کیا۔ تلمبہ سے فارغ ہو کر دیپالپور سے ہوتا ہوا پاکپتن پہنچا۔ حضرت بابا فرید شکر گنج کے مزار مبارک پر فاتحہ خوانی کے بعد سرسہ، فتح آباد، کیتھل اور پانی پت کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرتا ہوا ۱۸ دسمبر ۱۳۹۸ء کو فاتحانہ حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے اس نے ایک لاکھ ہندو قیدی بنائے مگر انہیں دہلی پر قبضہ کرنے سے قبل ٹھکانے لگا دیا۔ ہردوار کے مندروں کو مسمار کرنے کے بعد امیر تیمور ۱۹ مارچ ۱۳۹۹ء کو سمرقند روانہ ہوا اور لاہور، ملتان اور دیپالپور کا خضر خان ملتانی کو گورنر مقرر کر گیا۔ تیمور کی واپسی کے بعد ملتان خود مختیار ہو گیا۔

تیمور نے دہلی پر قبضہ کرتے وقت راستہ میں آنے والے جن جن شہروں کو تباہ و برباد کیا ان کو اپنے تسلط جمانے کے بعد دوبارہ تعمیر کرا دیا۔ اپنے حملوں کے دوران اس نے مساجد اور دینی مدارس کو نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ اہل علم کا بھی پاس کرتا تھا۔ اس کے دربار میں اہل علم بے تکلفی سے بحث مباحثہ کرتے تھے جو چنگیز خان یا ہلاکو خان کسی صورت میں گوارا نہ کرتے تھے، وہ ہلاکو خان اور چنگیز خان سے کہیں بہتر تھا اور مسلمان اولیاء کی سفارشات پر رحم کا مظاہرہ بھی کرتا تھا، دہلی کے جن شہریوں کو اس نے ماوراءالنہر لے جانے کا حکم دیا تھا۔ انہیں شیخ احمد کھتوؒ کی سفارش پر رہا کر دیا تھا۔

خضر خان ملتانی

خاندان تغلق کے آخری بادشاہ ناصر الدین محمود نے انتظامی سہولت کے لئے اپنی مملکت کو چار حصوں میں تقسیم کر کے نظامت ملتان سید خضر خان کے سپرد کی۔ یہ شریف النسب، حلیم الطبع اور نیک و پارسا ملتان میں ہی ملک سلیمان والئی ملتان کے گھر پیدا ہوا تھا اسے بعد ازاں ملک مردان والئی ملتان نے اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد یہ ملتان کا گورنر بنا دیا گیا۔ ۱۳۹۸ء میں سارنگ خان نے ملتان پر حملہ کیا۔ مگر شکست کھائی۔ امیر تیمور نے دہلی سے واپسی پر خضر خان کو پنجاب میں اپنا نائب السلطنت مقرر کیا۔ ۱۴۱۴ء میں سلطان محمود تغلق کی

وفات پر اس نے لاہور سے آگے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کر کے خاندان سادات کی بنیاد رکھی۔ تیمور کی واپسی کے ۳۶ سال تک فی الحقیقت ہندوستان میں کوئی حکومت نہ تھی۔ تخت دہلی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد خضر خان نے وفا اور شرافت کا پورا پورا ثبوت دیا۔ اس نے برسراقتدار آنے کے بعد اپنے لئے کوئی شاہانہ لقب اختیار نہ کیا۔ وہ تازیست خود کو امیر تیمور کا نائب ہی سمجھتا رہا۔ اسی کے نام کا خطبہ پڑھتا رہا۔ اسی کے نام کا سکہ جاری رکھا اور امیر کو تحائف بھیجتا رہا۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد بھی اس نے اس کے جانشین شاہ رخ کے ساتھ سلسلہ وفا جاری رکھا اور خطبہ وسکہ اسی کے نام منسوب کر دیا۔ تیمور کے حملے میں جو لوگ بے خانماں اور تہی دامن ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے دور حکومت میں انہیں آباد اور خوش حال کر دیا۔ یہ سید خاندان کا قابل ترین حکمران تھا مگر یہ ایسے وقت برسراقتدار آیا جب کہ تخت دہلی کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ ہندو اور راجپوت راجے تخریبی کاروائیوں میں مصروف تھے۔ جس سے خضر خان کو بار بار نپٹنا پڑا اور دہلی کے چاروں طرف فوج کشی کرنی پڑی۔ میوات اور گوالیار کی چڑھائی کے دوران بیمار ہو کر دہلی واپس آیا اور ۲۰ مئی ۱۴۲۱ء میں وفات پائی۔ اس کی بدولت ملتانی زبان نے دہلی میں فروغ پایا۔ جس کی کوکھ سے اردو نے جنم لیا۔ اس کا خاندان قریباً چالیس سال تک ہندوستان کا حکمران رہا۔ خضر خان ملتانی مثالی کردار کا مالک تھا۔ وہ وعدے کا سچا، فرض شناس اور مقبول عام فرمانروا تھا۔ عہد اکبری کا مشہور مورخ نظام الدین اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ:۔

''خضر خان کی ذات سے متعدد نیک کام پایہ تکمیل کو پہنچے وہ لوگ جو تیمور کے حملے میں بے خانماں اور تہی دامن ہو گئے تھے اس کے دور حکومت میں آباد اور خوشحال ہو گئے وہ اپنی رعایا میں اتنا مقبول تھا کہ اس کی وفات پر عوام نے تین روز تک متواتر سوگ منایا۔'' (طبقات اکبری صفحہ ۲۷۰)

خضر خان نے دہلی چلے جانے کے بعد اپنے لڑکے مبارک شاہ کو ملتان کا گورنر بنایا۔ وہ اپنے باپ کی طرح فہم وفراست اور ہمت وجرات کا مالک تھا اس نے اپنے وقت میں قلعہ ملتان کی وسیع پیمانہ پر مرمت کرائی جو آئے دن کے حملوں سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

سلطان حسین لنگاہ

خاندان سادات کی اگرچہ ملتان پر ۳۸ سال حکومت رہی۔ مگر اس کا نظم ونسق تسلی بخش ثابت نہ ہوا۔ اس لئے اہل ملتان نے ذائقہ حکومت بدلنے کا فیصلہ کیا اور سب کی نظر انتخاب شیخ یوسف قریشی پر پڑی جو حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کی اولاد میں سے تھے، ملتان میں یہ پہلا انتخاب تھا۔ شیخ یوسف قریشی نے اپنے حسن انتظام سے خود کو اس کا اہل بھی ثابت کیا اس زمانہ میں رائے سہرہ لنگاہ سندھی کا ملتان میں بڑا اثر ورسوخ تھا اس نے اپنی لڑکی شیخ یوسف قریشی کے عقد میں دے کر قلعہ میں آمد ورفت شروع کر دی اور ایک دن موقعہ پا کر بڑی عیاری سے پہرہ داروں کو قتل کرا کر قلعہ پر قبضہ کر لیا اور شیخ یوسف کو بھاگ جانا پڑا۔ رائے سہرہ نے قطب الدین لنگاہ کے

لقب سے ملتان میں لنگاہ عملداری کی بنیاد رکھی اور چنیوٹ، شور کوٹ، کو فتح کر کے ولایت ملتان کو وسعت دی اور ۱۴۶۹ء تک کامیاب حکومت کی۔

۱۴۷۰ء میں اس کے لڑکے سلطان حسین لنگاہ نے مملکت ملتان کی عنان اقتدار سنبھالی۔ شاہان ملتان میں سلطان حسین لنگاہ بڑا ذی علم بادشاہ تھا۔ وہ صرف علم دوست ہی نہ تھا، مدبر اور علم پرور بھی تھا۔ اس نے ترویج علم کے لئے ملتان میں جگہ جگہ مدرسے کھلوائے، نامور علماء کو بڑے بڑے وظائف پر درس و تدریس کے لئے مقرر کیا۔ اس کے وقت میں ملتان میں پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی جو تاریخ فرشتہ کی رو سے قلعہ کہنہ پر اس جگہ موجود تھی جہاں انگریزوں نے اپنی فتح کا مینار بنایا۔ ملتان کے علمی دور کی تاریخ میں سلطان حسین سرفہرست ہے۔ اس نے ملتان پر تیس سال حکومت کی۔ ویسے اس کے خاندان کی ملتان پر ستر سال حکومت رہی۔ سندھ کے علاقہ میں بلوچ قبائل کو اس نے آباد کیا تھا۔

مرزا حسین ارغون

سلطان محمد تغلق کے عہد کے اختتام پر سندھ، سلطنت دہلی کی سیادت سے آزاد ہو کر خود مختار ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں سندھ پر سومروؤں کی حکومت تھی، سندھ میں سومروؤں کی سلطنت ۱۰۵۲ء میں قائم ہو کر ۱۴۳۱ء تک یعنی تین سو آٹھ سال تک رہی۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق سومرو قوم کے حکمران سلاطین دہلی کے ماتحت حکمرانی کرتے تھے اور سلاطین دہلی کی طرف سے ایک امیر یا ریذیڈنٹ سندھ میں رہتا تھا سومروؤں کا آخری حاکم ہمیر بن دودہ تھا۔ جیسا کہ عین الملک ماہرو گورنر ملتان کے خطوط سے ظاہر ہے۔

سومروؤں کے بعد سمہ خاندان سندھ میں برسر اقتدار آیا۔ تاریخ فرشتہ میں ہے کہ سلطان محمد تغلق کے آخر عہد میں مسلمانوں کی کوشش اور مدد سے حکومت سومروؤں کے ہاتھوں سے نکل کر ۱۳۵۱ء میں سمہ خاندان کی ہاتھ آئی اور ۱۵۱۹ء تک ان کے پاس رہی۔ اس کے بعد شاہ بیگ کا بیٹا مرزا حسین ارغون برسر اقتدار آیا۔

مرزا حسین نے ملتان کو دوبارہ سندھ میں شامل کرنے کے لئے ۱۵۲۴ء میں ملتان پر حملہ کیا۔ اس نے ڈیڑھ سال تک قلعہ کا محاصرہ کئے رکھا اس عرصہ میں نہ کوئی آدمی قلعہ سے باہر آ سکتا تھا اور نہ کئی چیز قلعہ میں جا سکتی تھی، سامان خورد و نوش کی کمی کی وجہ سے لوگ کتے اور بلی کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ شجاع الملک وزیر نے خود اپنی رعایا کو ظلم و تشدد کا ہدف بنانا شروع کر دیا۔ اسے جہاں بھی شبہ ہوتا وہ اس گھر کی تلاشی لے کر غلہ وغیرہ پر قبضہ کر لیتا۔

بعد از خرابی بسیار ارغون کی کچھ فوج قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ کچھ فوج لوہاری دروازہ توڑ کر شہر میں گھس گئی اور قتل عام شروع کر دیا۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا۔ بچے، بوڑھے، عورتیں اور جوان سب اس کے ظلم عظیم کا شکار بنے جس کے پاس بھی دولت کا گمان ہوتا وہ بڑی ذلت اور اذیت کے ساتھ اس سے

چھین لی جاتی۔

مولانا سعد اللہ ملتانی اور ان کے نابینا والد مولانا ابراہیم جارح کو بھی دولت مند ہونے کے شبہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ کیونکہ ان کے گھر کی عمارت بڑی خوبصورت اور صاف ستھری تھی۔ جس سے ان کے صاحب ثروت ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔

اس ترک حملہ آور نے ملتان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ قلعہ کے کئی مزارات جلا دیئے جو نہ جل سکے وہ گرا دیئے گئے۔ شہر میں ایک متنفس بھی زندہ نہ چھوڑا۔ ملتان کو کھنڈرات میں تبدیل کرنے کے بعد مرزا حسین ارغون نے ملتان کو سندھ میں شامل کر کے ہی دم لیا۔ سندھ اور ملتان میں ارغون خاندان کا اقتدار انتہائی عروج پر تھا کہ بابر نے حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔

شیر شاہ سوری

اس کا اصل نام فرید خان تھا۔ سلطان محمد حاکم بہار کی ملازمت کے دوران اس نے تلوار سے ایک شیر کو ہلاک کیا۔ جس پر سلطان محمد نے اسے شیر خان کا خطاب دیا۔ لیکن جب یہ مغل شہنشاہ ہمایوں کو شکست دے کر برعظیم پاک و ہند کا شہنشاہ بنا تو شیر شاہ کے لقب سے تخت دہلی و آگرہ پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ بڑی منفرد اور دلچسپ شخصیت کا مالک تھا جو ایک سپاہی سے شہنشاہ بنا اور پانچ سال تک ہندوستان پر حکومت کی، یہ گو سنی تھا مگر اس نے ہر فرقہ کے ساتھ رواداری برتی۔ یہ اپنی سخاوت دریا دلی اور محتاج نوازی میں مشہور تھا۔ اس نے اپنے وقت میں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بڑا کام کیا۔ اس نے زندگی کے ہر شعبہ پر نگاہ رکھی اور جہاں بھی خلا محسوس کیا اسے فوراً پُر کیا۔

۱۵۴۲ء میں شیر شاہ نے پنجاب کے گورنر ہیبت خان نیازی کو نواحی علاقوں کی فتح اور باغی سرداروں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ اس نے ملتان کے حاکم بخشو لنگاہ اور اس کے بیٹے کی جان بخشی کرتے ہوئے ان کی جاگیر بحال رکھی۔ ہیبت خان کو انعامات سے نوازا اور فتح جنگ خان کو ملتان کا گورنر مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ ملتان کو آباد کرنے کی کوشش کرے۔

شیر شاہ سوری نے ملتان تا لاہور سڑک بنوائی۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ، شاہ رکن عالمؒ اور شاہ یوسف گردیزؒ کے مزارات پر روغنی اینٹوں کی بڑی خوبصورت مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کے بیٹے اسلام شاہ نے شاہ یوسف گردیزؒ کے مزار کا دروازہ از سر نو بنوایا۔

شاہزادہ مراد بخش

شاہ جہاں نے ابتداً قلیچ خان کو صوبہ دار ملتان مقرر کیا تھا۔ کچھ عرصہ [illegible] ل کر کے قندھار بھیج دیا

اور ملتان کو اپنے سب سے چھوٹے لڑکے شاہزادہ مراد بخش کی جاگیر قرار دیا۔ اس نے اپنے عہد امارت میں اچھے کام کئے، قلعہ کہنہ کو از سر نو پختہ کرایا۔ اس کے اندر ایک جامع مسجد تعمیر کرائی، شہر پناہ کی مرمت کرائی اور بستی میں جہاں اب محلہ حمام ہے، ایک مسجد، ایک حمام اور کنواں احداث کرایا۔ لوہاری دروازہ کا پختہ پل بھی اسی نے تعمیر کرایا۔ جو استحکام کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ تمام کام پانچ چھ سالوں میں مکمل ہوا۔ شہزادہ نے موضع علیم پور اور لنگانہ جو زمانہ قدیم سے خانقاہ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کی چراغ بتی کے لئے اور موضع گڑھ برابر دسانھل خانقاہ شاہ یوسف گردیزؒ کے لنگر و روشنی کے لئے وقف تھے اور سابق ناظموں نے ضبط کر لئے تھے واگزار کر دیئے شہزادہ کی سند اب تک سید عباس حسین گردیزی کے پاس موجود ہے۔

شاہزادہ کی حسن کارکردگی شاہ جہاں کی نظر میں خار کی طرح کھٹکنے لگی۔ اس لئے اسے ملتان سے بدل کر دکن بھیج دیا گیا اور نجابت خان کو ملتان کا گورنر مقرر کیا۔ جو بڑا نیک نام اور خدا ترس والی تھا۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ صوبہ ملتان شہزادہ محمد اورنگزیب کی جاگیر قرار پایا اور وہ کچھ عرصہ ملتان رہا۔

نعمت خان میراثی

مغلیہ خاندان کے اواخر میں شاہزادہ محمد معظم ملتان کا جاگیردار مقرر رہا جو بڑا نیک خصال اور رعایا پرور تھا۔ محمد معظم کے تبادلہ کے بعد شاہزادہ محمد اکبر نے یہ جاگیر سنبھالی۔ اس کے بعد اللہ یار خان، مکرم خان، زمان خان ملتان کے ناظم رہے۔ ان کے بعد اورنگ زیب کے پوتے معزالدین نے جہاندار شاہ کے لقب سے تخت دہلی کو رونق بخشی اور صوبہ ملتان اس کی زیر حکمرانی رہا۔

جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ رنگیلا کے عہد حکومت میں نعمت خان، علی مراد، خان زمان، شیر افگن خان، عقیدت خان، سید حسین خان، باقر خان اور عبدالصمد خان یکے بعد دیگرے ملتان کے ناظم مقرر ہوتے رہے۔ باقر خان اور عبدالصمد خان کے سوا کسی کا عہد نظامت کسی خصوصی اہمیت کا حامل نہ تھا۔

جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ رنگیلا کا دور خوشامد پسندی اور عیش پرستی کا دور تھا۔ جس سے نچلے طبقہ نے بڑا مفاد اٹھایا۔ بھانڈوں، بھڑووں اور نچنیوں کا ستارہ اس زمانہ میں عروج پر رہا۔ ان کی چشم و ابرو کو نظام حکومت میں بڑا دخل تھا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ۱۷۱۲ء میں جہاندار شاہ نے نعمت خاں میراثی کو جو ملتان کا مشہور رقاص و موسیقار اور موجودہ اصطلاح میں فنکار تھا ملتان کا گورنر بنا دیا۔ اس نے بھی بچہ سقہ کی طرح ایک قلیل عرصہ ملتان کی گورنری کی۔ مگر جلد علیحدہ کر دیا گیا۔

نواب عبدالصمد خان دلیر جنگ

نواب عبدالصمد خان جو تورانی سردار تھا ۱۷۱۳ء سے ۱۷۲۶ء تک لاہور کا اور ۱۷۲۶ء سے ۱۷۳۷ء تک

صوبہ ملتان کا گورنر رہا۔ اس دور میں صوبجات کے گورنروں کو اپنے اپنے علاقوں کی اندرونی حکومت کے سلسلے میں مکمل اختیار تھا۔ نظامتیں اور صوبیداریاں موروثی بن گئی تھیں۔ اس کے باوجود یہ شہنشاہ دہلی کے وفادار تھے۔ سکہ اور خطبہ ان کے ہی کے نام کا جاری رکھتے تھے۔ مگر حکومت اپنی مرضی اور قابلیت سے چلاتے تھے۔

عبدالصمد خان کی وفات کے بعد اس کا چہیتا فرزند نواب زکریا خان صوبہ ملتان کا گورنر بنا۔ عبدالصمد خان اور زکریا خان بیدار مغز حکمران تھے۔ انہوں نے صوبجات لاہور اور ملتان کا انتظام اس قابلیت سے کیا کہ اس کی مثال اس صدی کی تاریخ پاک و ہند میں ملنی مشکل ہے۔ عبدالصمد خان ۲۲ فروری ۱۷۱۳ء کو صوبہ لاہور کا گورنر بن کر پنجاب آیا تو اس وقت بندہ بیراگی مضبوط اور خونخوار ہو چکا تھا۔ ساڈھورے کے قریب ایک مضبوط قلعہ بنا کر مقیم تھا اور میدانی علاقہ کو تاخت و تاراج کر کے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ عبدالصمد خان نے اسے بالآخر آٹھ ماہ کی جنگ کے بعد گرفتار کر کے اور ایک آہنی پنجرہ میں بند کر کے بمعہ ۷۴۰ اسیروں کے اپنے پسر زکریا خان کے ذریعہ دہلی بھجوا دیا۔ جس طرح بندہ بیراگی نے ہزاروں بے گناہ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا خون بہایا تھا۔ اسے اسی طرح اپنے ہمراہیوں کے سمیت کیفر کردار کو پہنچایا گیا۔ بندہ بیراگی کا خاتمہ عبدالصمد خان کا بہت بڑا تاریخی کارنامہ ہے۔

عبدالصمد خان زاہد، متقی اور عابد شب زندہ دار تھا۔ دن اس کا گھوڑے کی پشت پر دشمنان اسلام سے شمشیر زنی میں بسر ہوتا اور رات مصلے عبادت پر، خدا اس کی دعاؤں کو شرف قابلیت بخشا اور اسلامی آبادیوں کو نذر آتش کر دینے والے بندہ سنگھ بہادر کا خاتمہ اس درویش شمشیر زن کے ہاتھوں کرایا جس کی بدولت پنجاب میں امن و امان، خوشحالی و فارغ البالی کا دور شروع ہوا۔

عبدالصمد خان کی کاشی کار مسجد لاہور اور عید گاہ ملتان اور محلہ بیگم پورہ اس کی بیوی بیگم جان کی دائمی یادگاریں ہیں۔ نواب زکریا کی معدلت گستری اور رعایا پروری کے سامنے بقول غلام علی نقوی صاحب "عماد السعادت" نوشیرواں کا عدل و انصاف فسانہ بے اصل معلوم ہوتا ہے، دہلی کی تباہی کے بعد نادر شاہ وطن واپس جاتے ہوئے نواب زکریا خان کو ملا اور اس دل بستگی کی بنا پر جو نادر شاہ کو نواب زکریا سے تھی کہا کہ اس وقت جو فرمائش کرو وہی پوری کروں۔ نواب زکریاؒ نے ازراہ خدا ترسی و نیک دلی کہا کہ وہ ہزارہا ہندوستانی امیر اور فنکار جو آپ ایران لئے جا رہے ہیں، رہا کر دیں۔ نادر شاہ نے ان کی سفارش پر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ جس سے نواب زکریا خان کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا۔

احمد شاہ ابدالی

وسط ایشیاء کی طوائف الملوکی کا شکار ہو کر ملتان میں پناہ گزین ہونے والوں میں ابدالیوں کا ایک قبیلہ سدوزئی بھی تھا۔ سدو خان امیر خراسان کا پوتا شاہ حسین اپنے چچا زاد بھائی خداداد خان (مورث خدکہ خاندان

سے شکست کھا کر ۱۶۵۲ء میں دارالامان ملتان پہنچا یہاں اس نے اپنی رہائش کے لئے شیش محل تیار کرایا جو آجکل کمشنر ہاؤس ہے، اس کے پہلو میں مسجد بنوائی جو ابدالی مسجد کے نام سے مشہور ہے اور شیش محل کے سامنے کڑی خورد آباد کی، اسے شکست دینے والے خداداد خان کے لڑکے سلطان حیات خان نے بھی شاہ ایران سے شکست کھا کر ملتان میں پناہ لی اور بنگلہ ڈپٹی کمشنر کے عقب میں کڑی خدکہ آباد کی۔ شاہ حسین خان اور سلطان حیات خان دونوں ملتان میں فوت ہوئے۔ شاہ حسین کا مزار ابدالی مسجد کے متصل بجانب جنوب موجود ہے۔ اور سلطان حیات خان گورستان سدوزئی نزد بنگلہ سپرنٹنڈنٹ پولیس میں دفن ہے۔

شاہ حسین خان لاولد تھا اس نے احمد شاہ ابدالی کے ماموں جلال خان کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ احمد شاہ ابدالی زمان خان گورنر ہرات کا بیٹا تھا۔ زمان خان کے قتل کے بعد اس کی چھوٹی بیوی جو حاملہ تھی اپنے سوتیلے بیٹوں کے پاس رہنے کی بجائے ...... اپنے بھائی جلال خان کے پاس ملتان آ گئی یہاں اس کے بطن سے ۱۷۲۲ء میں احمد شاہ ابدالی پیدا ہوا جو سات سال تک ملتان رہا اور ابدالی مسجد میں ابتدائی تعلیم پائی۔ اس کے بعد وہ نادر خان کی فوج میں بھرتی ہو کر سپہ سالار بن گیا اور اس کے قتل کے بعد اپنی خداداد صلاحیتوں کی بناء پر افغانستان کا بادشاہ منتخب ہوا۔

احمد شاہ ابدالی کو پہلی دفعہ شاہنواز خان حاکم پنجاب کے بلانے پر دوسری مرتبہ میر منو ناظم لاہور کی بدعہدی کا مزہ چکھانے کے لئے تیسری بار مغلانی بیگم ناظم لاہور کی استدعا پر اور چوتھی مرتبہ نواب نجیب الدولہ کی درخواست پر ان کی دستگیری کے لئے پنجاب آنا پڑا۔ اس نے سکھوں کی سرکوبی کر کے پنجاب کے مرہٹوں کو کچل کر ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کی چیرہ دستیوں سے نجات دلا کر احسان عظیم کیا اور جب ان لاثانی خدمات کے عوض اسے دہلی کا تخت و تاج پیش کیا گیا تو وہ مرد مجاہد یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ مدد کو آنا اور تخت پر قبضہ جمانا شرافت سے بعید ہے۔ اس کے بعد شہنشاہ دہلی احمد شاہ تیموری نے از خود ایک فرمان کے ذریعے ملتان اور لاہور کے صوبجات احمد شاہ ابدالی کے حوالے کر دیئے۔ جس پر ۱۷۵۲ء میں اس نے ملتان میں اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔

اس کے عہد میں شجاع خان، پسر زاہد خان سدوزئی میر منو کے زمانہ میں ملتان کا گورنر تھا۔ سلطان حیات خان کا لڑکا عبدالعزیز خان اور شجاع خان کے بعد اس کا لڑکا مظفر خان ملتان کا حاکم رہا۔ ملتان پر سدوزئی خاندان کے سات افراد حکمران رہے شجاع خان نے شجاع آباد اور خان گڑھ (ضلع مظفر گڑھ) کے قصبات آباد کئے۔

نواب علی محمد خان خوگانی

نواب علی محمد خان خوگانی دو مرتبہ ملتان کے گورنر بنے۔

پہلی مرتبہ ۱۷۵۲ء سے ۱۷۵۸ء تک

دوسری مرتبہ ۱۷۶۱ء سے ۱۷۶۷ء تک

اپنے دور حکومت میں انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کام کئے۔ نواب صاحب نے فصیل شہر مرمت کرائی۔

ملتان شہر کے وسط میں ایک جامع مسجد بنوائی جسے لوگ غلطی سے مسجد ولی محمد کہتے ہیں۔

نواب علی محمد خان نے زراعت کو ترقی دینے کے لئے ملتان میں ایک نہر کھدوائی اور اس کا نام اپنے بھائی کے نام پر نالہ ولی محمد رکھا۔

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے مقبرے کی مرمت کرائی اس طرح اس نے بہت تعمیری کام کئے۔

۱۷۶۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے ناراض ہو کر سرِ دربار علی محمد خان خوگانی کو قتل کرا دیا۔

نواب مظفر خان سدوزئی

۱۷۷۹ء سے ۱۸۱۸ء تک نواب مظفر خان سدوزئی ملتان میں حکمران رہا۔ جسے زیادہ تر سکھوں نے پریشان کیا۔ سکھوں کا پہلا حملہ ۱۸۰۲ء میں، دوسرا حملہ ۱۸۰۴ء میں، تیسرا حملہ ۱۸۰۷ء میں خود مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سرکردگی میں کیا گیا، چوتھا حملہ ۱۸۱۰ء میں، پانچواں حملہ ۱۸۱۲ء میں، چھٹا حملہ ۱۸۱۶ء میں اور ساتواں حملہ ۱۸۱۷ء میں کیا گیا مگر ہر حملے میں نواب مظفر خان مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا۔

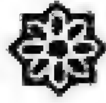
۱۸۱۸ء میں سکھوں نے ملتان پر آخری اور فیصلہ کن حملہ کیا۔ اس میں لاہور کی مال روڈ والی مشہور توپ زمزمہ استعمال کی گئی جو چار ماہ تک قلعہ پر ایک من کے گولے برساتی رہی۔ رسد کی کمی نے اہل قلعہ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۴ جون ۱۸۱۸ء کی صبح کو سکھوں کا ایک جتھہ قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ نواب مظفر خان جو اس وقت عمر کی اسی بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اپنے آٹھوں بیٹوں سمیت مردانہ وار سربکف ہو کر مقابلہ کے لئے نکلا اور پانچ بیٹوں سمیت شہید ہوا۔

سکھوں نے شہر اور قلعہ میں ناقابل بیان مظالم توڑے۔ قلعہ میں قریباً پانچ سو مکانات ہموار کر دیئے۔ جن میں قریشی خاندان کے بھی مکانات تھے جو بے خانماں ہو کر شہر میں آ گئے۔ مخدوم شاہ محمود قریشی نے ہمت کر کے نواب مظفر خان اور اس کے دو بیٹوں کی لاشیں تلاش کر کے حضرت بہاؤالحقؒ کی خانقاہ میں دفن کیں جن کی سکھ تذلیل کرنا چاہتے تھے۔ سکھوں نے فتح کے نشہ میں نواب کے جواہرات، بیش قیمت شالیں اور تحائف پر قبضہ کر لیا۔ اسلحہ لوٹ لیا گیا۔ شہر میں مکانات کو آگ لگا دی۔ شہریوں کے پاس کوئی قابل ذکر چیز نہ چھوڑی۔ اکثر لوگوں کے کپڑے تک اتار لئے۔ عورتوں کی عصمت دری کی۔ بہت سی عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگ لگا کر یا خودکشی کر کے اپنی عصمت بچائی، شہر کا کوئی متنفس ایسا نہ تھا جسے تکلیف یا نقصان نہ پہنچا ہو۔ اس کے بعد انہوں نے شجاع

آباد کے قلعہ پر قبضہ کر کے ملتان کے پٹھانوں کی حکومت کا خاتمہ کیا۔

نواب مظفر خان بڑا پاکباز انسان تھا۔ یہ جب قلعہ مظفر گڑھ کا سنگ بنیاد رکھنے لگا تو اس نے کہا کہ اس کا سنگ بنیاد وہ شخص رکھے جس نے نماز پنجگانہ اور تہجد قضا نہ کی ہو اور زِنا نہ کیا ہو۔ جب ایسا کوئی مرد میدان میں نہ نکلا تو نواب نے خود بنیادی پتھر رکھا کیونکہ موصوف ان خصوصیات کا حامل تھا۔

(تاریخ ملتان - منشی عبدالرحمٰن خان)



منشی عبدالرحمٰن خان

تاریخی یادگاریں، قدیم وجدید عمارات

ہندو آثار

بُت ملتان

ملتان کی شہرت میں قدیم عہد کے آدینۂ دیوتا کے اس طلائی بت کا بہت بڑا حصہ ہے جس کی بدولت ملتان ''بیت الذہب'' یعنی سونے کا گھر کہلاتا تھا کیونکہ ابوالقاسم خرداذبہ کے بیان کے مطابق محمد بن قاسم کو یہاں صرف ایک گھر سے چالیس بھار سونا ملا تھا۔ ایک بھار سونا ۳۳۳ من کا ہوتا تھا۔ اس لئے محمد بن قاسم کے حاصل کردہ سونے کا وزن ۶۰۰، ۹۷، ۲۳ مثقال کے برابر تھا۔

اصطخری لکھتا ہے کہ اس بُت کا نام ''ملتان'' تھا۔ یہ ملتان کے ایک شاندار محل میں موجود تھا جو ملتان کے ایک بہت بارونق مقام پر ٹھٹھیروں اور ہاتھی دانت والے دکانداروں کے درمیان بڑے بازار میں واقع ہے۔ یہ مقام پرہلاد مندر کے قریب تھا۔

ابوزید سرانی لکھتا ہے کہ اس بُت کی زیارت کے لئے لوگ کئی کئی ماہ کا سفر طے کر کے آتے ہیں اور اپنے ساتھ مشہور عود ہندی (صندل) قامرونی لاتے ہیں اور مہنتوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بعض اقسام کی ایک من عود قیمت اس وقت (۸۸۶ء میں) دوسو دینار ہوتی ہے۔ ان مہنتوں سے تاجر عود خرید لیتے ہیں۔

ابن رستہ (۹۰۶ء) کا بیان ہے کہ ملتان میں ایک بُت ہے جو دو ہزار سال پہلے کا ہے یہاں سامہ بن لوی کی شاخ ابن منبہ کے خاندان سے ایک قوم اس پر حکمران ہے۔ ہندوستان کے راجے جب اس سے لڑنے آتے ہیں تو یہ بھی ملتان سے اپنی فوج لے کر لڑنے کے لئے تیار ہو کر باہر نکلتے ہیں اور اپنی قوت و دولت کے سبب اُن پر غالب آ جاتے ہیں۔

مسعودی (۹۱۵ء) لکھتا ہے کہ ملتان کی سرحدی اسلامی ریاست کے امیر کے پاس فوج اور دولت ہے، ملتان کے تابع اس کے چاروں طرف ایک لاکھ بیس ہزار گاؤں شمار میں آتے ہیں۔ یہیں مشہور بُت خانہ ہے۔ امیر ملتان کی زیادہ آمدنی ان خوشبودار (صندل کی) لکڑیوں سے ہے جو دور دراز سے اس بُت کے لئے بھیجی جاتی

ہیں۔ جب کبھی ہندو راجے ملتان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور مسلمان ان کے مقابلہ سے عاجز آ جاتے ہیں تو دھمکی دیتے ہیں کہ ہم اس بُت کو توڑ دیں گے۔ اس پر ہندو فوجیں واپس چلی جاتی ہیں۔ قنوج اس وقت اسلامی سلطنت کے ماتحت ہے اور ملتان میں شامل ہے اور ابو اللباب منبہ ابن اسد قریشی ملتان کا حاکم ہے۔

ہندو سندھ کے لوگ اس بُت کو ایوب نبی کی تمثیل سمجھتے تھے اور بزعم خود یہاں حج کے لئے آتے تھے اور یہاں سر و داڑھی منڈواتے تھے۔ یہ بت بشکل انسان بنا ہوا تھا۔ اسی لئے محمد بن قاسم نے اسے انسان سمجھ کر اس کا سر اُڑانے کے لئے تلوار نکال لی تھی۔ یہ بُت سراپا سونے کا بنا ہوا تھا۔ نایاب جواہرات سے مرصع اور قیمتی لباس میں ملبوس تھا۔ اس مندر کے چاروں طرف سایہ دار درخت پھیلے ہوئے تھے جن کے نیچے پُجاری آرام کرتے تھے۔

مندر پرہلاد

یہ مندر قلعہ کہنہ کی سطح مرتفع پر بنا ہوا تھا اسے خود پرہلاد بھگت نے بنوایا تھا۔ یہ ملتان میں ہندو عہد کی سب سے پرانی یادگار ہے جو خانقاہ حضرت بہاؤالحق زکریاؒ کے بالکل سامنے ہے۔ مندر کے نیچے زیر زمین کشادہ روشیں ہیں۔ مندر کے اندر ایک مخروطی شکل کا ستون ہے جس کے پہلو میں نرسنگھ اوتار کی مورتی رکھی جاتی تھی۔ ماہِ جیٹھ میں یہاں نرسنگھ چودس کا بہت بڑا میلہ لگتا تھا جو ہندوؤں کا ایک تہوار تھا۔

پرہلاد بھگت کشپ کا بیٹا تھا۔ کشپ خود کو خدا اور غیر فانی سمجھتا تھا مگر بمصداق ہر فرعونے را موسیٰ، کشپ کے بیٹے پرہلاد نے اپنے باپ کا یہ دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے توحید کی جوت جلانی شروع کر دی اور لوگوں کو خدائے واحد کا قائل بنانے لگا۔ لڑکے کا یہ فعل باپ کو ناگوار گزرا۔ اس نے پرہلاد کو سزا دینے کے لئے اس مندر کے اندر سونے کا مخروطی ستون بنوایا اور اس کو اندر سے خوب گرم کر کے پرہلاد کو خدا پرستی کی سزا دینے کے لئے اس ستون کے اندر باندھ دیا۔ ہندو عقیدہ کے مطابق نرسنگھ اوتار ظاہر ہوا جس نے پرہلاد کو اس اذیت سے نجات دلانے کے لئے اس ستون کو مٹی کے ستون میں بدل کر ٹھنڈا کر دیا اور کشپ کو قتل کر کے تخت و تاج پر پرہلاد کو بٹھا دیا۔ اس زمانہ میں کشپ کی نسبت ملتان کشپ پورہ کہلاتا تھا۔ لیکن پرہلاد بھگت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد یہ پرہلاد پورہ کہلانے لگا۔

سر الیگزینڈر برنز جس زمانہ میں بطور سیاح ملتان آیا اس زمانے میں مندر پر کوئی چھت وغیرہ نہ تھی۔ ۱۸۱۰ء میں مندر کا کلس ہندوؤں نے چندہ کر کے اس طرح تعمیر کرایا کہ مندر کا کلس حضرت زکریاؒ کے مزار کے گنبد سے بھی اونچا کر دیا۔ جسے ارد گرد کی خانقاہوں کے جانشینوں نے برا منایا۔ ہندو مسلم تعلقات کشیدہ ہو گئے نوبت ہندو مسلم بلوہ تک پہنچی۔ یہ ملتان کا پہلا فرقہ وارانہ فساد تھا۔ بالآخر ہندوؤں کو بعد از خرابی بسیار مسلمانوں کے مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا اور کلس خانقاہ کے قبہ سے نیچے کر دیا گیا۔

۱۸۴۸ء میں انگریزوں کی قلعہ پر بمباری اور قلعہ کے میگزین اڑ جانے کی وجہ سے مندر کی عمارت کو جو صدمہ پہنچا اُس نے عمارت کی حالت خستہ کر دی۔ ۱۸۵۳ء میں یہ مندر زیر استعمال نہیں تھا۔ بعد میں چندہ وغیرہ اکھٹا کر کے اس کی مرمت کرائی گئی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ہندوستان میں بابری مسجد کو انتہا پسند ہندوؤں نے شہید کر دیا جس کا پاکستان کے مسلمانوں میں شدید ردعمل ہوا اور ملتان کے لوگوں نے اس ہندو یادگار کو گرا دیا۔ اب صرف اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔

سورج کنڈ مندر

یہ ہندوؤں کے اشنان (نہانے) کا متبرک تالاب شہر سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کا قطر ۱۳۲ فٹ اور گہرائی ۱۰ فٹ ہے۔ اس کی چار دیواری سکھوں کے عہد میں دیوان ساون مل نے بنوائی تھی۔ ہندو عقیدہ کے مطابق پرہلاد کو نجات دلانے کے لئے جب نرسنگھ اوتار اترا تو اس نے اس تالاب سے پانی پیا تھا۔ یہاں آدیتہ دیوتا کی پرستش ہوتی تھی۔ یہ ہندوؤں کا دوسرا قدیمی آثار تھا۔

مندر طوطلاں مائی

ہندوؤں کا تیسرا قدیمی آثار حرم دروازہ کے اندر مندر طوطلاں مائی ہے جو طوطل دیوی کے نام سے منسوب ہے۔ اورنگزیب نے اس کی مورتی کنویں میں پھنکوا دی تھی۔ اس مندر کا پجاری ماہر حکیم بھی تھا اُس نے اورنگزیب کے لڑکے کی بیماری کے دوران اس کا علاج کیا جو صحت یاب ہو گیا اور انعام میں یہی مورتی واپس مانگی جو واپس ملنے کے بعد دوبارہ مندر میں رکھ دی گئی۔ اس مندر کی مرمت دیوان ساون مل نے کرائی۔

مندر جوگ مایا

ہندوؤں کا یہ چوتھا آثار ہے۔ یہ ملتان کے ریلوے اسٹیشن کے قریب ابتداً چبوترہ شکل میں تھا۔ دیوان ساون مل نے اس پر مندر کی تعمیر شروع کرائی اور مولراج نے اس کی تکمیل کی۔ ہندو عقیدے کے مطابق نرسنگھ اوتار کے ہمراہ جو دیوتا اور دیویاں ملتان پہنچی تھیں ان میں سے جوگ مایا نے یہاں پر قیام کیا تھا۔ یہاں ماہ چیت واسوج میں نوراترہ کے میلے لگتے تھے۔

رام تیرتھ

یہ ہندو دیوتا شری رام چندر کا استھان (تالاب) ہے جو بیرون دہلی دروازہ میلسی اور دنیا پور کی سڑکوں

کے مقام اتصال پر واقع ہے۔ اس خام یادگار پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں تالاب اور مندر بنا۔ بھادوں کے مہینہ میں یہاں پورنماشی کا میلہ لگتا تھا۔

مندر نرسنگھ پوری

یہ مندر قلعہ کے اندر واقع تھا۔ اس لئے پجاریوں کو حاکم وقت کی اجازت کے بغیر اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ ان کی یہ تکلیف رفع کرنے کے لئے پرہلاد پوری کے پجاری نے سبزی منڈی کے قریب ایک نیا مندر بنوا کر نرسنگھ اوتار کی مورتی اس میں رکھ دی جسے ایک خزانچی نے دس ہزار کی لاگت سے ایک پختہ اور شاندار مندر میں بدل دیا۔

دیگر آثار

متذکرہ بالا ہندو آثار کے علاوہ بیرون دولت دروازہ سمادھی ساون مل، بیرون دہلی دروازہ گیان تھلہ (جس میں اب مدرسہ خیرالمدارس ہے) بازار چوڑی سرائے میں جین مندر، بیرون بوہڑ گیٹ شوالہ مندر اور چوک بازار میں مندر ہنومان جی تھا۔

یہ مندر ہندو مسلم فسادات کے زمانہ میں ہندوؤں کے دفاعی قلعوں میں بدل دیئے جاتے تھے۔ حسب ضرورت ان میں ناجائز اسلحہ جمع رہتا تھا جس سے مسلمانوں کے خون سے بوقت ضرورت ہولی کھیلی جاتی تھی ان میں سرفہرست گیان تھلہ تھا۔

فرودگاہ محمد بن قاسم

جس زمین کے ٹکڑے سے مجاہدین اسلام گزر جائیں وہ بلحاظ اثر و تاثیر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوسری زمین سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ اس پر قدم رکھتے ہی پاک طینت لوگ اس کے انوار او رنا قابل فراموش سکینت و طمانیت محسوس کرنے لگتے ہیں اور طبیعت کا قبض، بسط میں بدل جاتا ہے۔

سرزمین ملتان میں بھی شہر کے مغرب میں قاسم بیلہ کی تاریخی بستی سے کچھ فاصلہ پر وہ مبارک و خوش نصیب ٹکڑا موجود ہے جس کو ۹۵ھ بمطابق ۷۱۳ء میں اسلام کے سالار اعظم حضرت غازی محمد بن قاسمؒ اور ان کے رفقاء مجاہدین کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا تھا اور جس پر قدم رکھنے کے بعد وہاں سے ہلنے کو دل نہیں چاہتا۔ حضرت اسد ملتانی نے اس کے متعلق خوب کہا ہے۔

مایہ ناز است بہر ایں زمیں
نقش پائے ابن قاسم بر جبیں

یہ ایک زرخیز خطہ زمین تھا جہاں ایک دائرہ کی شکل میں مجاہدین نے خیمے لگائے۔ کھجوریں ان کی خوراک کا جزو اعظم تھیں۔ انہوں نے اپنے خیموں میں جہاں جہاں گٹھلیاں پھینکیں، وہاں کھجوروں کے درخت اگ آئے اور ایک ایسا نخلستان تیار ہو گیا جس پر شبہ کسی عرب خطہ نخلستان کا ہوتا تھا۔

۱۹۴۳ء میں راقم کے مصلح و قائد اعظم کے روحانی مربی جو درجہ میں ابدال تھے، ملتان پہنچنے کے بعد سیدھے فرودگاہِ محمد بن قاسم پر تشریف لے گئے، اس پاکیزہ خطہ پر پہنچتے ہی اس کے انوار سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور جوتے اتار کر کھجوروں کے ایک کنول نما جھنڈ میں آیات جہاد سنتے سنتے چند لمحات کے لئے آبدیدہ حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

۱۹۴۸ء میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور سکواڈرن لیڈر سرفراز رفیقی شہید کے والد بشیر احمد رفیقی راقم کے ہمراہ وہاں تشریف لے گئے۔ اس سرزمین کے اثر و تاثیر سے حضرت علامہ اتنے متاثر ہوئے کہ واپس جانے سے انکار کر دیا اور وہیں قیام کرنے اور بعد از مرگ یہیں دفن ہونے پر اصرار کیا۔ اس روز ان کا دوپہر کا کھانا نواب مخدوم مرید حسین قریشی کے ہاں تھا۔ جہاں علامہ علاؤالدین صدیقی (وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) بھی مدعو تھے۔ یہ سب حضرات مدرسہ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ کے سلسلہ میں تشریف لائے ہوئے تھے اور وہیں آپ کا شدید انتظار ہو رہا تھا۔ راقم بمشکل آپ کو وہاں سے واپس لایا۔ اس کے بعد جب علامہ سید سلیمان ندوی ملتان تشریف لائے تو وہ بھی وہاں راقم کے ہمراہ تشریف لے گئے اور کافی دیر اس زمین پر بیٹھے رہے اور اس سرزمین کے اثرات کو بشدت محسوس فرماتے رہے۔

یہ نخلستان سن ستر تک موجود تھا۔ سن اکہتر کی پاک و ہند جنگ سے قبل اس جگہ کے قریب جیٹ طیاروں کے اترنے کے لئے رن وے تیار ہونے لگا۔ کھجوروں کے کچھ اونچے درخت دفاعی ضرورت کے لئے کاٹ دیئے گئے کیونکہ طیاروں کے اترتے وقت ان درختوں سے رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ اگرچہ یہ نخلستان اب ویسا نہیں رہا لیکن اس زمین کے اثرات آج بھی ویسے موجود ہیں اور کھجوروں کے چند درخت بھی۔

نوگزی قبریں

مدینۃ الاولیاء ملتان میں یوں تو قدم قدم پر بزرگان دین کے مزار و مقابر ملتے ہیں لیکن بعض مقامات پر خلافِ معمول بڑی لمبی لمبی قبریں نظر آتی ہیں جو نوگزی قبریں کہلاتی ہیں۔

مورخین نے ان قبروں کی لمبائی کی ضمن میں کئی وجوہات دی ہیں مثلاً

۱۔ یہ قبریں محمد بن قاسم کے وقت ۹۵ھ بمطابق ۷۱۳ء کے زمانہ کی ہیں۔ اس زمانہ میں مجاہدوں اور اللہ والوں کی قبریں عقیدتاً و احتراماً دوسری عوامی قبروں سے ممیز و ممتاز کرنے کے لئے بطور نشانی لمبی لمبی بنائی جاتی تھی کیونکہ اس زمانہ مقبروں یا خانقاہوں کا رواج نہیں تھا اس لئے ان

قبروں کی غیر معمولی لمبائی ہی ان کی شان امتیازی کی نشان دہی کرتی تھی۔

۲۔ عربی دستور کے مطابق ایک ایک قبر میں کئی کئی شہید اور مجاہد اکٹھے دفن کئے جاتے تھے اس لئے اس دور کے دستور کے مطابق بعض مقامات پر کئی کئی شہیدوں کو اکٹھے دفن کر دیا جاتا تھا اور ان کی قبریں لمبی بنا دی جاتی تھیں۔

لیکن بعض قبروں والوں کے نام بھی موجود ہیں اس لئے قرین قیاس دلیل اول ہے کہ ایسی قبریں صاحبِ منزلت بزرگوں کی ہیں۔ ملتان کے اسلامی تاریخی آثار میں اولیت ان نوگزی قبروں کو حاصل ہے۔ جنرل کننگھم نے ملتان میں ۱۸۵۳ء میں اپنی تحقیق و تفتیش کے دوران ایسی قریباً پندرہ قبروں کا سراغ لگایا تھا جو نوگز سے اٹھارہ گز تک لمبی تھیں۔ ان میں چند قبریں تا دمِ تحریر موجود ہیں۔ مثلاً

۱۔ دہلی دروازہ کے باہر پیر گوہر سلطان کی بارہ گز لمبی قبر۔

۲۔ پاک دروازہ کے محلہ جال ویڑھا میں شیخ موسیٰ کی نوگز لمبی قبر۔

۳۔ بوہڑ دروازہ کے اندر محلہ درکھاناں میں پیر ادھم کی گیارہ گز لمبی قبر۔

۴۔ بوہڑ دروازہ کے باہر بجانب غرب مین بازار میں مگر دو دکانوں کے پیچھے بابا برہان الدین کی ۱۸ گز لمبی قبر۔

۵۔ حسین آگاہی کے ایک محلہ میں پیر رمضان غازی کی سات گز لمبی قبر۔

۶۔ محلہ حمام میں شیخ موسیٰ دادا پیر کی نوگزی قبر۔

۷۔ مائی پاک دامن کے گورستان کے عین وسط میں ایک تیرہ گز لمبی قبر ہے۔ لیکن افسوس اس شہر خموشاں میں صاحبِ قبر کا نام کوئی نہ بتا سکا۔

خونی بُرج

یہ پاک دروازہ اور دہلی دروازہ کے درمیان عین موڑ پر واقع تھا۔ اب بُرج موجود نہیں۔ یہ علاقہ اسی نسبت سے موسوم ہے۔ گزشتہ دو ہزار سالہ تاریخ میں جب بھی غیر ملکی افواج ملتان پر حملہ آور ہوئیں تو سب سے پہلے یہی خونی بُرج ان کی راہ میں سدِ سکندری ثابت ہوا اور اسی نے فاتحین کا خیر مقدم بھی کیا۔ سکندر اعظم کے حملہ کا نقطہ ماسکہ یہی خونی برج تھا۔ اسی پر وہ اکیلا سیڑھی لگا کر چڑھا اور شمشیر زنی کے کمالات دکھاتا ہوا نیچے کود گیا۔

خونی برج پر سے تیروں کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اس لئے سکندری سپاہ کو فصیل پر چڑھنے کی جرات نہ ہوئی۔ لیکن جب انہوں نے سکندر اعظم کو نتائج کی پرواہ کئے بغیر ہمت کر کے فصیل پر چڑھتے اور نیچے کودتے دیکھا تو سکندر اعظم کے اس جرأت مندانہ اقدام نے اس بددل فوجیوں میں ایک نئی روح پھونک دی، ان کے حوصلہ بڑھ گئے جس کی وجہ سے چند فوجی فصیل پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔

فصیل پر چڑھنے والے فوجیوں نے جب سکندر اعظم کو اکیلے لڑتے اور ایک زہر آلود تیر سے زخمی ہوتے دیکھا جو ابھی اس کے سینہ میں پیوست تھا، تو یہ نظارہ دیکھ کر ان کے سینہ میں بھی آتش انتقام فروزاں ہوگئی۔ ان کا خون کھولنے لگا بلکہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ انہوں نے غضبناک حالت میں فصیل کو محافظوں سے پاک کر کے اپنے فوجیوں کے اوپر چڑھنے کے لئے راستہ کو صاف کیا اور پروانہ وار نیچے کود گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پشتے لگا دیئے خون کی ندیاں رواں دواں ہوگئیں۔ یہاں تاریخ کا پہلا عظیم، مہیب اور ہولناک خون خرابہ ہوا کہ خود خونی برج کے درو دیوار الامان والحفیظ پکارنے لگے۔

اس تاریخی واقعہ کی وجہ سے شہر کے اس بُرج کا نام خونی برج پڑ گیا۔

اس کے بعد دوسرا بڑا خونی معرکہ بروز نو روز یکم جنوری ۱۸۴۹ء کو شروع ہوا، اس وقت تک انگریزی افواج دہلی دروازہ اور خونی برج کے موقعے پر دو بڑے شگاف کر چکی تھیں اور حملہ کرنے کے لئے راستہ صاف ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس حملہ کے لئے بنگال کی پلٹن نمبر ۳۲، یورپین رجمنٹ نمبر ۴۹، ۲، ۷ اور ہندوستانی پلٹنوں سے چیدہ چیدہ جوان منتخب کر کے خونی برج پر حملہ کے لئے خصوصی دستہ تیار کیا گیا اور تین بجے بعد دوپہر حملہ کا حکم دے دیا گیا۔ جونہی منڈی آوا کی بلندیوں اور نشیب سے حملہ آور فوج نکلی فصیل سے شدید آتشباری شروع ہوگئی۔ جس کا جواب پلٹن نمبر ۶۰ کی بندوقوں سے بڑی قادر اندازی سے دیا گیا۔ اسی اثناء بڑے مقابلے کے بعد افواجِ بمبئی خونی برج کے سامنے فصیل کے قریب آ پہنچیں، توپوں کی گولہ باری سے اس کی مدافعتی فوج کا انتظام درہم برہم ہوگیا۔ فصیل کے اندر ایک ہزار سکھ جوان موجود تھا۔ انگریزی فوج فصیل پر ٹوٹ پڑی۔ بڑے خونریز معرکہ کے بعد انگریزوں نے اس پر قبضہ کر کے خونی برج پر یونین جیک لہرا دیا۔ شہر کھنڈروں میں بدل گیا اور لاشوں سے بھر گیا۔

قلعہ کہنہ

ملتان کی قدامت کی ایک اہم نشانی قلعہ کُہنہ ہے۔ جسے اب قاسم باغ کہا جاتا ہے۔ یہ قلعہ تاریخی، مذہبی، روحانی اور ثقافتی حوالوں سے اپنے اندر وہ خزینے لئے ہوئے ہے جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ یہ قلعہ کب اور کس نے تعمیر کرایا۔ البتہ اس کا پیٹ چاک کر کے اندر جھانکنے والے سر الیگزینڈر کننگھم نے اس کی تہہ سے ۸۰۰ سال قبل مسیح تک کے انقلابات کے آثار پائے ہیں۔ انہوں نے ۴۰ فٹ کی گہرائی تک کھدائی کی تھی جبکہ ملتان کے ابن حنیف نے ۶۰ فٹ گہرائی سے ایسی بے شمار چیزیں دریافت کیں جن کو دیکھتے ہوئے یہ وثوق سے کہنا پڑتا ہے کہ ملتان کا قلعہ ہڑپہ کا ہم عصر بلکہ اس سے بھی قدیم ہے۔ اس کی قدامت کے ۶،۵ ہزار سال کے شواہد دستیاب ہو چکے ہیں۔ مثلاً قلعہ پر جو سٹیڈیم قیام پاکستان کے بعد تعمیر ہوا تھا اس میں دراڑیں آنی شروع ہوگئیں تو فیصلہ ہوا کہ اس کے ستون زیادہ گہرائی تک بنائے جائیں

اس مقصد کے لئے ۸۴ سے ۹۴ فٹ تک گہرے بور کیئے گئے۔ حسین آ گاہی چوک سے قلعہ کی بلندی ۵۰، ۵۵ فٹ ہے اس طرح مذکورہ بور سطح زمین سے ۳۵/۳۴ فٹ گہرے تھے ان سوراخوں سے مندرجہ ذیل اشیاء برآمد ہوئیں۔

دھات کے سکے، منکے، ہڈی کی چوڑیاں، پتھروں کی مختلف اشیاء، مٹی کے کھلونے، پکی مٹی کے ظروف، مختلف شکل وحجم کی اینٹیں، مٹی کے چراغ، تمباکو کی چلم، دھات کے برتن، گھونگھے، جلی ہوئی لکڑی کے ٹکڑے وغیرہ۔

اس کے بعد اسی سٹیڈیم میں روشنی کے کھمبوں کے لئے پھر بور کرنے پڑے ان کی تعداد سولہ تھی اور ان میں چند ایک بور ۱۰۴ فٹ تک گہرے تھے۔ دوران کھدائی ان میں سے کوئی ۴ کلو وزنی جلی ہوئی لکڑی برآمد ہوئی جس کے ساتھ مٹی لتھڑی ہوئی تھی ریت نہیں تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ سطح زمین سے ۵۰ فٹ گہرائی میں سے پانی، ریت مٹی وغیرہ کی بجائے جلی ہوئی لکڑی نکلنے کا مطلب ہے کہ وہاں کبھی جنگل ہوں گے جو سطح زمین پر تھے آفات ارضی وسماوی سے اس میں آگ لگ گئی سیلابوں سے مٹی کی تہیں جمتی رہیں پھر آبادیاں ہوتی رہیں اور پچاس فٹ کی مٹی کتنے عرصہ میں جمع ہوئی یقیناً یہ ہزاروں سال کا عمل اور ردعمل تھا۔

ابتداء میں قلعہ ڈیڑھ میل کے گھیرے میں ہشت پہلو بنا ہوا تھا۔ جس کی باقاعدہ فصیل تھی جو اب منہدم ہو چکی ہے ۱۹۴۷ء تک اس کے آثار باقی تھے۔ فصیل اتنی چوڑی تھی جس پر کئی گھڑسوار برابر دوڑ سکتے تھے۔ اور اس پر ۲۶ برج تھے۔

قلعہ سے دشمن پر گولہ باری یا تیراندازی کے لئے ۳ دمدمے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک تو اب بھی موجود ہے مگر اس کی اونچائی اصل سے آدھی رہ گئی ہے۔ دوسرا دمدمہ حسین آ گاہی کی جانب تھا اور تیسرا دمدمہ پرہلادمندر اور حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے مزار کے مشرقی سمت تھا۔ بیرونی لشکر ہمیشہ مشرق وجنوب سے حملہ آور ہوتے رہے اس لئے مغربی دمدمہ ان کی یلغار سے محفوظ رہا۔

قلعہ ملتان کے ۴ دروازے تھے اور ہر دروازے پر علیحدہ علیحدہ بھی ایک برج بنا ہوا تھا۔

دیہہ دروازہ: یہ مغربی سمت واقعہ تھا اب یہ باب القاسم کہلاتا ہے دیہہ دروازہ آدیتہ دیوتا کے مندر سے منسوب تھا۔ اور لوہاری دروازہ کی طرف کھلتا تھا۔

خضری دروازہ: یہ شمال مشرق کی سمت عیدگاہ کی طرف کھلتا تھا یہ سید خضر خان ملتانی کے نام سے منسوب تھا جو تیمور کے حملہ کے وقت ملتان کا گورنر تھا۔

سکی دروازہ: یہ جنوب مشرق کی جانب قلعہ سکہ کی طرف کھلتا تھا جو سیتل ماڑی کے قریب ملتان سے دنیا پور جانے والی پرانی سڑک پر واقع تھا۔

ریڑی دروازہ: یہ حسین آ گاہی کی طرف کھلتا تھا یہاں غالباً ریڑ (ڈھلان) تھی جس کی وجہ سے یہ ریڑی دروازہ مشہور تھا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ قلعہ میں داخل ہونے کے لئے ریڑی دروازے سے اندرون شہر راستہ

مسقف تھا جس کے ذریعہ قلعہ اور شہر میں عوام و خواص بحفاظت آ جا سکتے تھے۔ غربی دروازہ، اس کا پھاٹک اور فوجیوں کی بارکیں ۱۹۲۵ء تک قلعہ پر موجود تھیں قلعہ پر سے ایک سرنگ چوک شاہ مجید سے ہوتے ہوئے دربار پیر صاحب تک جاتی تھی سکھوں کے حملے کے وقت اسی سرنگ کے راستہ بعض خواتین نے روپ بدل کر اپنی جانیں اور عصمتیں بچائیں۔

انگریز مورخین کے رائے میں ایسا زبردست، مستحکم قلعہ تمام برصغیر پاک و ہند میں نہ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ قلعہ بہت اونچے پشتے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں سے اردگرد میلوں دور کا علاقہ نظر آتا تھا۔ اس قلعہ کے دو حصار تھے۔ جبکہ عام طور پر ایک ہی حصار کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس قلعہ پر ایک حصار جو کہ اندرونی تھا پختہ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اور ۳۵ سے ۴۰ فٹ تک بیرونی حصار سے اونچا تھا۔ بیرونی حصار مٹی کا ایک زبردست پشتہ تھا، جسے ''دھور کوٹ'' کہتے تھے۔ یہ پشتہ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ چوڑا تھا۔ اور اس طرح یہ پشتہ اندرونی پشتے کو گولہ باری سے محفوظ رکھنے کے کام آتا تھا۔

قلعہ کی حفاظت کے لئے دھور کوٹ پشتہ کے بنا بریں ایک گہری خندق بھی تھی جو قلعہ کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لیتی تھی۔ جس میں ہر وقت پانی بھرا رہتا تھا۔ یہ پانی دریائی راوی سے ایک نہر کے ذریعے لایا جاتا تھا۔ اس قلعہ کا اندرونی محیط چھ ہزار چھ سو فٹ تھا۔ قلعہ کی اندرونی فصیل پر چھیالیس برج تھے۔ جس پر ہر وقت چاق و بند فوجی کھڑے پہرہ دیتے تھے۔

اس قلعہ کا چپہ چپہ اپنے اندر یادوں کے خزینے لئے ہوئے ہے۔ باب القاسم سے اندر داخل ہوں تو بائیں جانب خانقاہ حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ نظر آتی ہے جو ملتان کی نشانی ہے۔ تھوڑی دور چل کر جہاں اب کیفے یا ریستوران بنا ہوا ہے۔ یہاں محمد بن قاسمؒ نے ۹۳ھ میں ایک جامع مسجد کی بنیاد رکھی۔ جو اس کے بعد اس کے گورنر داؤد بن نصر نے ۹۶ھ میں مکمل کرائی۔ قرامطی فرقہ کے لیڈر جلم بن شیبان نے جب ملتان کی حکومت سنبھالی تو ۳۷۵ھ میں اس نے اس مسجد کو شہید کرا دیا۔ محمود غزنوی نے جب ملتان کا دورہ کیا اور قرامطیوں کو ختم کر دیا تو ۳۹۵ھ میں اس مسجد کو نئے سرے سے تعمیر و آباد کیا۔ ۱۸۱۸ء میں سکھوں نے جب ملتان پر اقتدار حاصل کیا تو اس مسجد کو بطور سٹور گولہ بارود استعمال کرتے رہے ۱۸۴۸ء میں جب انگریزوں نے قلعہ پر گولہ باری کی تو یہ مسجد بھک سے اڑ گئی۔ کیونکہ اس کے اندر گولہ بارود ذخیرہ تھا اس کے بعد کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔ اب تو بنیادوں کا بھی علم نہیں۔

جہاں اس وقت انگریزوں کا مینارہ یادگار ہے جو انگریزوں کی فتح کی یادگار ہے یہاں کبھی ہندوؤں کا عظیم مندر تھا جسے قرامطیوں نے زمین بوس کر دیا تھا۔ اور اس پر اپنی مسجد تعمیر کرائی تھی۔ جس کا رخ بجائے مکہ معظمہ کے بیت المقدس کی سمت تھا۔ قلعہ کے مشرقی کنارے پر پرہلاد مندر کے ہم دیوار حضرت غوث العالمین بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ ہے۔ خانقاہ کی اصل تعمیر تو ساتویں صدی ہجری میں ہوئی تھی مگر ۱۸۴۸ء کی فرنگیوں کی گو

باری سے منہدم ہو گئی تھی اس کے بعد وہ دوبارہ تعمیر کی گئی۔

۱۸۱۸ء تک قلعہ کے اوپر محلات و عمارات کی ترتیب اس طرح تھی کہ حضرت غوث العالمین حضرت بہاؤالدینؒ اور حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کے مقبروں کے درمیان محلہ شیخانہ تھا۔ جس میں قریشی خاندان کے اہل ثروت کے مکانات و عمارات تھیں۔ زکریاؒ یونیورسٹی جس میں بہا یہ مدرسہ شامل تھا۔ غوث العالمین کے مقبرے کے جنوب میں واقع تھی۔ جو ایک مکمل کیمپس کی شکل میں تھا جس میں درس گاہوں کی عمارات، دارالاقامہ، مہمان خانہ، اور عالیشان جامع مسجد موجود تھیں۔ آج کل ان سب کی جگہ ملتان ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے عوام کے لئے ایک وسیع وعریض پارک بنا دیا ہے جس میں داخلے کے لئے عوام کو ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔

قلعہ کی جنوبی سمت یعنی جہاں مثالی مدرسہ اور نیشنل بنک حسین آگاہی موجود ہے۔ اس کے اوپر کے حصہ میں علامہ قاضی قطب الدین کاشانیؒ کے شاندار مزار کے علاوہ مدرسہ ناصریہ تھا جو ملتان کے ایک حکمران ناصر الدین قباچہ نے تعمیر کرایا تھا۔ سکھوں نے جب ملتان پر قبضہ کر لیا تو اس مدرسہ میں بھی دیوان مولراج نے گولہ بارود بھر دیا۔ جب ۱۸۴۸ء میں انگریزوں نے حملہ کیا تو تمام عمارات تباہ ہو گئیں۔ اب تو نہ حضرت علامہ کاشانیؒ کا مزار ہے، نہ مدرسہ ناصریہ کی کوئی شناخت ہے۔

یہاں ایک ٹیلہ پر حضرت کاشانیؒ اور حضرت منہاج الدین سراجؒ کی قبریں اب بھی موجود ہیں ابھی حال ہی میں وہاں ایک تحریر آویزاں کی گئی ہے جس سے ان امور کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ وہاں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہاں محمد بن قاسمؒ نے ایک مسجد ۹۴ھ میں تعمیر کی تھی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اس نے یہاں مسجد نہیں بنائی تھی بلکہ یہاں مسجد ضرور تھی جو کہ مسجد ناصریہ یونیورسٹی کے احاطہ میں تھی یہ قطب الدین قباچہ نے بنائی تھی جس میں آ کر حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نماز فجر پڑھا کرتے تھے۔

ان تمام عمارات کے اذکار کتب تواریخ میں مل جاتے ہیں۔ یہ دلکش عمارات خاص فن و ثقافت کی آئینہ دار تھیں۔ ایسی مسطح عمارات نے مسلمان مہندسوں و معماروں کی فنی تخلیقات کو جلا بخشی تھی۔ جن میں آڑے ستون، بلند محرابیں، اور مدوّر گنبد نظر آتے تھے۔ یہ ترقی ایرانی، سلجوقی اثرات کے تحت جاری رہی۔ مقامی کاریگروں نے ایران کے معماری انداز اپنائے اور تعمیری اسلوب از قسم ہشت پہلو بنیادیں، مدوّر محرابیں، پشت پناہی ستون بنانے میں کمال دکھایا تھا۔ یہ سب قلعہ کہنہ کی مٹی میں دفن ہو گئیں۔ خصوصاً سکھوں کے اقتدار کے بعد قلعہ کی سربفلک عمارات و محلات مدتوں کھنڈر بنے رہے اور پھر مٹی کے انباروں تلے دب کر رہ گئے۔

اسی قلعہ پر پیر در بر وردی والے، حضرت مولانا حامد علی خان کے مزارات ہیں جہاں سے لوگ روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔ آخری گورنر نواب مظفر خان شہید بھی یہیں آسودہ خاک ہیں۔

دمدمہ کے نزدیک ایک زمین دوز نگار خانہ بنایا گیا تھا جس میں ملتان اور نواحی علاقوں کی دستکاریوں کی نمائش اور فروخت کا انتظام تھا۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ قلعہ کی ثقافت کو محفوظ کیا جاتا مگر پاکستانیوں نے بھی سکھ دور حکومت والے کام ہی کئے۔ مثلاً قلعہ پر سٹیڈیم تعمیر کیا گیا جہاں لاکھوں روپیہ خرچ ہونے کے باوجود کبھی کوئی ٹیسٹ میچ نہ ہو سکا مگر قلعہ کی ثقافت مسخ ہو گئی۔

میونسپل کارپوریشن نے اس پر میونسپل ڈسپنسری اور فائر بریگیڈ اسٹیشن بنا دیئے ہیں۔ اسٹیڈیم کے نیچے حسین آگاہی کی طرف دکانیں تعمیر کی گئی ہیں۔ دمدمہ کے قریب اور مولانا حامد علی خان کے مزار کے قریب پلاٹ ٹی وی نشریات والوں کو دیدیئے گئے ہیں ایک پلاٹ میں پولیس سروس کاؤنٹر تعمیر کیا گیا ہے۔

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے مزار مبارک کے ایک طرف حاجی کیمپ ہے اور مزار کے عقب میں نیچے سڑک تک کے علاقے پر رہائشی کالونی بن گئی ہے۔

اگر تعمیرات اسی طرح جاری رہیں تو قلعہ ایک دن تجارتی مارکیٹ اور رہائشی کالونی بن جائے گا۔

مینارہ یادگار

قلعہ کے عین وسط میں انگریزوں نے اپنی فتح اور عید گاہ میں قتل ہونے والے مسٹر ایگینو اور مسٹر اینڈرسن کی یاد میں یہ مینار تعمیر کرایا۔ یہ مینارِ گاؤدُم سُرخ پتھر سے بنا ہوا ہے اور پچاس فٹ اونچا ہے۔ چبوترہ کے غربی جانب سنگ مرمر کے ایک بہت بڑے پتھر پر ایک کتبہ کندہ ہے۔ جس پر یہ عبارت لکھی ہے۔

''پیٹرک الیگزینڈر وانزایگینو بنگال سول سروس اور ولیم اینڈرسن لیفٹیننٹ نمبرا بمبئی فسلیر رجمنٹ جو ریذیڈنٹ لاہور کے نائب تھے، گورنمنٹ کی طرف سے بدیں غرض ملتان بھیجے گئے کہ دیوان مولراج کی خواہش کے مطابق اس کو حکومت ملتان کے فرائض سے سبکدوش کیا جائے، قلعہ کی فوج نے ۱۹ اپریل ۱۸۴۸ء کو دونوں افسروں پر حملہ کر کے ان کو زخمی کر دیا۔ دوسرے دن ان کی سکھ فوج نے غداری کر کے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور قومی اعتماد اور مہمان نوازی کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے ان دونوں افسروں کو شہر ملتان کی دیواروں کے نیچے عید گاہ میں نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا اس طرح یہ بہادر نوجوان سردار ۲۵ اور ۲۸ سال کی نواجوانی میں جو قابلِ فخر امیدوں سے پُر اور آئندہ کے لئے یقینی طور پر مفید ثابت ہوتی۔ اپنے آخری وقت تک اپنے ملک کی عزت و آبرو بچاتے ہوئے زخمی، بے یارو مددگار، ہاتھ میں ہاتھ لئے حملہ آوروں کے ہاتھوں قتل ہوئے، انہوں نے انتہائی وقار سے اطاعت کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح قبل از وقت یہ ثابت کر دیا کہ ہزارہا انگریز ان کی موت کا انتقام لینے کے لئے عنقریب آجائیں گے، مولراج کو اس کے قلعہ اور لشکر سمیت نیست و نابود کر دیں گے۔''

تاریخ شاہد ہے کہ یہ پیشین گوئی کیسی سچ ثابت ہوئی۔ ان کے فاتح بھائیوں نے ان کی لاش کو اپنے کندھوں پہ اٹھا کر اس جگہ مفتوحہ قلعہ کی چوٹی پر ۲۶ جنوری ۱۸۴۹ء کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ پنجاب ممالکِ محروسہ سلطنت برطانیہ میں شامل کرلیا گیا۔ جس کی ابتداء ان افسروں کے قتل سے ہوئی۔

مینارہ یادگار کے مشرقی جانب تین اور انگریزی یادگاریں بھی ہیں جن پر درج ذیل کے کتبے درج ہیں۔

۱۔ ''میجر جارج شیف مونٹیز ہمبرٹ کی مقدس یاد میں جو ہز مجسٹی کی دسویں پلٹن کی کمان کرتے ہوئے ۱۲ دسمبر ۱۸۴۸ء کو ۳۴ برس کی عمر میں قتل ہوئے اور کپتان لنگزورتھ جو ۳۰ برس کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۸۴۸ء زخمی ہو کر فوت ہوئے۔''

۲۔ ''سیکنڈ لیفٹیننٹ جے تھامسن اور سی۔ ٹی گریہم افسران توپ خانہ بنگال کی یاد میں جو محاصرہ ملتان ۴۹-۱۸۴۸ء میں مارے گئے تھے۔ ان کے بھائی افسروں نے تعمیر کرایا۔''

۳۔ ''بنگال پیادہ توپ خانہ کے ایک سارجنٹ اور ۱۳ توپچیوں کی یاد میں جو محاصرہ ملتان ۴۹-۱۸۴۸ء میں ہلاک ہوئے، ان کے ساتھیوں نے یہ یادگار تعمیر کرائی۔''

چوک شہیداں

ملتان کا یہ مشہور و معروف چوک سڑک رونده از پرانی سبز منڈی تا ریلوے مال گودام ملتان شہر کے درمیان اکبر روڈ پر واقع ہے۔

اس چوک کے قریب بجانب شمال مغرب ایک خوبصورت سی مسجد ہے جو مسجد چوک شہیداں کے نام سے مشہور ہے، اس مسجد کے شمال مشرقی کونہ میں دو قبروں کے نشان موجود ہیں جن پر باقاعدہ چوبی چھت بنی ہوئی ہے اور ان کے سرہانے دیا بتی جلائی جاتی ہے۔

• اس چوک کے متعلق تاریخ مخطوطہ ملتان میں یہ روایت ہے کہ لنگاہوں کے آخری دور میں دو سید خواہر زادے بدورانِ لڑائی شہید ہوئے۔ انہیں سبزی منڈی کے قریب دفن کیا گیا۔ لیکن جب سبزی منڈی روڈ بننے لگی تو اس وقت ان شہیدوں کی نعشیں حضرت موسیٰ پاک شہید کی خانقاہ پر لے جا کر وہاں دفن کر دی گئیں اور تب سے اس چوک کا نام چوک شہیداں پڑ گیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ مذکورہ بالا مسجد کے بانی اور متولی حاجی الٰہی بخش کھوکھر گورنمنٹ ٹھیکیدار کی سکنی جائیداد اس چوک کے جنوب اور مشرق میں واقع تھی، یہ اپنے وقت کی ایک بااثر اور صاحب ثروت شخصیت تھی۔ اس نے ۱۹۰۱ء میں جب یہ مسجد تعمیر کرائی تو تعمیر مسجد کے وقت یہ قبریں موجود تھیں اور انہوں نے ہی ان قبروں پر باقاعدہ چھت وغیرہ بنوا کر انہیں محفوظ کر دیا۔ کیونکہ یہ دونوں قبریں محمد بن قاسم کے وقت کے دو شہیدوں کی تھیں،

جو سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے، یہ چھ بھائی تھے، باقیوں کی قبریں اس کے گردونواح میں موجود ہیں۔
حاجی الٰہی بخش کھوکھر چونکہ بہت بڑا ٹھیکیدار تھا۔ جس کے پاس چھاؤنی کے بڑے گرجا گھر، ایڈورڈ بیرکس اور پرانی تحصیل ملتان واقعہ جمال پورہ کالونی کی تعمیر کے سرکاری ٹھیکے تھے اور اچھی شہرت کے مالک تھے، اس لئے چوک کو ان کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء کے سروے ملتان کے دوران میونسپل کمیٹی نے ملتان کا جو نقشہ تیار کیا تھا۔ اس میں بھی اس چوک کا نام چوک الٰہی بخش درج ہے اور اسی پتہ سے لوگ خط و کتابت کرتے تھے۔

مگر الٰہی بخش مرحوم آج کل کی طرح شہرت کے دلدادہ نہ تھے۔ انہیں ناموری سے سخت نفرت تھی، اسی لئے انہوں نے ازراہِ انکسار اس نسبت کو ناپسند کیا اور کہنے لگے کہ چونکہ یہاں دو شہیدوں کی قبریں موجود ہیں، اس چوک کو ان کے نام سے موسوم ہونا چاہیے، چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی میں اسے چوک شہیداں مشہور کیا۔ اپنی تعمیر کردہ مسجد کا نام بھی مسجد چوک شہیداں رکھا۔ تب سے یہ چوک شہیداں کہلاتا ہے۔ جن قبروں کا ذکر مخطوطہ ملتان میں آیا ہے وہ عین سڑک کے درمیان تھیں، جو وہاں سے ہٹائی گئیں ۔ یہ سڑک سے قدرے دور مغربی جانب موجود ہیں اور شروع سے چلی آتی ہیں۔

بَدرو شیر خان

۱۲۴۶ء سے ۱۲۶۶ء تک سلطان التمش کا چھوٹا صاحبزادہ سلطان ناصر الدین محمود تختِ دہلی پر جلوہ افروز رہا۔ یہ فیاض، نیک طینت اور خدا پرست بادشاہ تھا۔ علم و ادب کا مربّی، غریبوں اور ناداروں کا سرپرست، درویشانہ زندگی کا خوگر اور عیش ونشاط کی شاہانہ زندگی سے متنفر تھا۔ خود اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھ لکھ کر اپنا روزگار کماتا تھا۔ بقول فرشتہ وہ شاہی خزانہ سے پھوٹی کوڑی کا بھی روادار نہ تھا وہ اپنے آپ کو بیت المال کا امین سمجھتا تھا۔ اس کی بیوی کو خادمہ تک میسر نہ تھی۔ اس کی بیگم خود اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی تھی۔ کھانا پکاتے ایک دفعہ اس کے ہاتھ جل گئے لیکن اسے خادمہ کی سہولت میسر نہ ہو سکی۔

اس وقت کے دگرگوں حالات کی وجہ سے رحم دل بادشاہ کی ضرورت نہ تھی، بلکہ ایسے جابر بادشاہ کی ضرورت تھی، جو مخالف قوتوں کو کچل کر ملک میں امن و امان قائم رکھ سکے، اس لحاظ سے ناصر الدین محمود کا بطور بادشاہ انتخاب موزوں نہ تھا۔ لیکن اس کی اس خامی کو دور کرنے کے لئے اسے الغ خان غیاث الدین بلبن ایسا قابل اور منتظم وزیر مل گیا۔ جس نے بہت جلد ملک میں امن و امان قائم کر کے سکون کی فضا پیدا کر دی۔

سلطان نے بلبن کے چچا زاد ملک شیر خان کو خانِ معظم بنا کر پنجاب اور ملتان کا گورنر مقرر کر دیا۔ مغلوں کے حملوں کی روک تھام کے لئے اس وقت یہ جدید صوبہ بنایا گیا اور شیر خان کو حملہ آور منگولوں کی سرگرمیوں کے انسداد کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ ملک شیر خان بھی بلبن کی طرح بڑا منتظم طبع انسان تھا، اس نے ملتان کا گورنر بننے کے بعد شہر کو

صفائی طرف بڑی توجہ دی۔ شہر کی فصیل کی مرمت کرائی اور شہر کے گندے پانی کی نکاسی کے لئے دہلی دروازہ کے قریب ایک بہت بڑی بدرو تعمیر کرائی۔ وہ ملک شیر خان کے نام سے موسوم ہو کر "بدرو شیر خان" کہلائی جو سوا سات سو سال گزر جانے کے باوجود آج تک برابر کام دے رہی ہے اور رائی و رعایا کی نیک نیتی کی شہادت بہم پہنچا رہی ہے۔ کیونکہ جس ملک کا رائی نیک نیت ہوتا ہے اس کی رعایا کے اموال میں برکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے کارناموں کو دوام حاصل ہو جاتا ہے۔ بدنیت رائی کی رعایا بھی بدنیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے رعایا کے اموال سے برکت اٹھ جاتی ہے اور اس کے کارنامے دوام کا تمغہ حاصل نہیں کر سکتے۔

ٹبی شیر خان

ملک شیر خان نے پرانی روایت کے خلاف اپنے محلات قلعہ سے باہر تعمیر کرائے اور ان کے ساتھ باغات کا ایک جدید سلسلہ قائم کر کے اس نئی آبادی کو باغ و بہار بنا دیا جو اس کے نام سے موسوم ٹبی شیر خان کہلائی۔ اگرچہ انقلاباتِ زمانہ نے ان محلات و باغات کا نام و نشان مٹا دیا ہے مگر اس کے بانی کا نام آج تک محلہ ٹبی شیر خان کی بدولت زندہ ہے۔ علامہ اقبال نے سچ کہا تھا۔

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

رسالہ نمبر ۱۵

انگریزی فوج میں پٹھانوں کا ایک رسالہ نمبر ۱۵ بھی فوجی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اس میں زیادہ تر ملتان اور کچھ ڈیرہ اسماعیل خان، میانوالی اور بہاولپور کے پٹھان شامل تھے۔ پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء میں رسالہ نمبر ۱۵ کو فرانس کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جو وہاں ڈیڑھ سال تک کارہائے نمایاں انجام دیتا رہا۔ مگر وہاں کی آب و ہوا اُسے راس نہ آئی۔ جس پر اُسے فرانس سے مشرقِ وسطی میں بمقام بصرہ بھیج دیا گیا۔ جہاں اس کو مقاماتِ مقدسہ پر مسلمانوں اور خصوصاً ترکوں کے خلاف لڑانے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس امر کی خبر جب کیمپ میں پہنچی تو اس رسالہ میں موجود چھ سو فوجیوں نے بذریعہ تحریری درخواست اپنے مسلمان بھائیوں کے سینے اپنی گولیوں سے چھلنی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس انکار کی بناء پر اس رسالہ کا فوراً کورٹ مارشل کیا گیا۔ اور حسبِ منصب و مرتبہ ان غیور فوجیوں کو سات سال سے عمر قید تک کی سزا دے کر کالا پانی یعنی جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا۔ ان کی سزا معاف کرانے کے لئے کافی تگ و دو ہوئی تب جا کر ۱۴ ماہ بعد ان کو رہائی ملی۔

اس کے بعد انگریزوں نے ملتان کے پٹھانوں کو حتی الوسع فوج میں بھرتی کرنے سے احتراز کیا۔ اور ریکروٹنگ آفیسرز کی رہنمائی کے لئے جو کتاب Pathan in the British Army کے نام سے شائع کی۔ اس میں ملتانی پٹھانوں کا الگ باب باندھا۔

جائے ولادت احمد شاہ ابدالی

ملتان شہر کو ملتان چھاؤنی سے ملانے والی سڑک 'ابدالی روڈ' پر کمشنر ہاؤس کے بالمقابل محکمہ انہار کے دفاتر کے ساتھ ملحقہ فن کاشی گری سے مزین ایک یادگار موجود ہے۔

یہ یادگار فن کاشی گری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ نیلگوں کاشی کاری پر سفید رنگ میں قرآنی آیات خطِ کوفی و عربی میں تحریر ہیں۔ وسط میں سنگِ مرمر کے پتھر پر مندرجہ ذیل عبارت انگریزی میں تحریر ہے۔

جائے ولادت احمد شاہ ابدالی، امیر افغانستان ۱۷۷۳-۱۷۴۷ء

جس جگہ پر یہ یادگار تعمیر کی گئی ہے ماضی میں اس کے اطراف میں سدوزئی خاندان کی بستی موسومہ کڑی خورد آباد قائم تھی جسے شاہ حسین نے آباد کیا تھا۔ اسی بستی میں شاہ حسین کے منہ بولتے بیٹے جلال خان کی بہن کے ہاں احمد شاہ ۱۷۲۲ء پیدا ہوا۔ جو بڑا ہو کر احمد شاہ ابدالی کے نام سے افغانستان کے بادشاہ بنا۔

خاکستری آثار

سر الیگزینڈر کننگھم نے آثارِ قدیمہ کی تلاش و تحقیق کے سلسلہ میں مندر پرہلاد پوری کے بالمقابل قلعہ کہنہ پر ایک کنواں کھدوایا تھا۔ اس کھدائی کے دوران اس کنویں کی مختلف سطحوں سے مختلف قسم کی اشیاء برآمد ہوئی تھیں۔ کننگھم نے ان برآمدہ اشیاء سے استنباط کر کے ان کے زمانے کا اندازہ لگایا ہے کہ وہ کس دور کے آثار تھے اس کنویں سے برآمد ہونے والی خاکستر نے اوسطاً ڈیڑھ فٹ میں تقریباً ایک صدی کی نشاندھی کی ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۰-۱۱ فٹ کی گہرائی پر
معز الدین کیقباد کے زمانہ (۱۲۸۶-۸۹ء) کے روغنی چراغ اور کاشی کے ٹکڑے دستیاب ہوئے۔

۱۲ فٹ کی گہرائی پر
سری سمنتا دیوا کے زمانہ (۹۰۰-۹۵۰ء) کے سکے اور روغنی اینٹیں ملیں،

۱۳-۱۴ فٹ کی گہرائی پر
۱۱x۶.۵x۲ حجم کی اینٹیں برآمد ہوئیں۔ مگر روغنی اینٹیں وغیرہ نکلنی بند ہو گئیں۔

۱۵-۲۰ فٹ کی گہرائی پر
محمد بن قاسم کے حملہ (۷۰۰-۷۵۰) کے وقت کی سرخ راکھ ملی جو دو فٹ کی تہہ کی تھی اور خشت بلا یہ حجم ۱۴x۱۱x۲.۵ ملیں۔

۳۰-۳۲ فٹ کی گہرائی پر

۳۰۰ سال قبل مسیح کے وقت کے سکندرِ اعظم کے شہر سوز حملہ کی دو فٹ گہری راکھ اور جلی ہوئی مٹی۔ ریشم کاتنے کا گولہ، موچی کی پتھری اور تانبے کے دو سکے ملے۔

۴۰ فٹ کی گہرائی پر

۸۰۰ قبل مسیح یعنی تین ہزار سال پہلے کے زمانہ کی قدرتی مٹی ملی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آریہ استیلا کے زمانے سے پہلے ملتان کا محلِ وقوع قلعہ کہنہ سے ذرا ہٹ کے تھا۔

چوک شاہ مجید

محمد بن قاسم نے پہلی دفعہ ہندوؤں کو اسلامی مروت، رواداری اور حسنِ سلوک سے آشنا کیا اور ذات پات کے شکار ہندو اسلامی روایات سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ فاتح ملتان محمد بن قاسم کو دیوتا سمجھنے لگے، اور اس کے چلے جانے کے بعد از راہِ محبت و عقیدت اس کا بُت بنا کر مدتوں اسے پوجتے رہے۔

ہندو، مسلم مجاذیب وفقرا کے بھی بڑے عقیدت مند تھے، اور ان کی خدمت کو عبادت تصور کرتے تھے۔ ابتدائی دور میں یہ خانقاہوں اور تعزیوں پر چڑھاوے چڑھانے کے بھی عادی تھی۔

حسین آ گاہی سے مسجد علی محمد خان تک چوک بازار کے عین وسط میں ایک چوک آتا ہے، اس کے مغرب میں گپ بازار کو اور مشرق میں چوڑی سرائے بازار کو سڑک جاتی ہے، اس چوک کے شمال مشرقی کونے پر جہاں سے بازار چوڑی سرائے شروع ہوتا ہے ایک بزرگ شاہ مجید تھلہ پر چٹائی بچھا کر بیٹھا کرتے تھے۔ ہندو اس کا بڑا احترام اور اس کی بڑی سیوا یعنی خدمت کرتے تھے۔ جب وہ فوت ہوئے تو انہیں اس چوک کے مذکورہ بالا چبوترہ پر ہی دفن کر دیا گیا اور اس پر ان کی قبر بنا دی گئی۔ نیز اس چوک کو اُن کے نام سے موسوم کر کے اسی چوک کا نام ان کی یادگار کے طور پر "چوک شاہ مجید" رکھ دیا گیا۔ یہ چوک مدتوں چوک شاہ مجید کے نام سے معروف و مشہور رہا۔ پرانے میونسپل ریکارڈ اور کمنگراں والے تعزیہ کے لائسنس میں بھی چوک شاہ مجید کا اندارج موجود ہے۔

چوک بازار میں پہلے مسلمانوں کی جائیدادیں تھیں جن کو ہندو آہستہ آہستہ خریدتے چلے گئے۔ جب چوک بازار میں ہندوؤں کا غلبہ ہو گیا تو انہوں نے اس چبوترہ کے گرد چار دیواری بنا کر اس قبر کو محصور و محفوظ کر دیا۔ لیکن انہوں نے اس کی پوجا پاٹ جاری رکھی اور رفتہ رفتہ اسے اندر ہی اندر مندر میں تبدیل کر دیا جس کا کسی نے نوٹس نہ لیا کیونکہ یہ چوک اس وقت بھی چوک شاہ مجید ہی کہلاتا تھا۔

۱۸۸۰ء میں جب ملتان میں دوسرا ہندو مسلم فساد ہوا تو اس زمانہ میں شاہ مجید کی قبر مسمار کر کے اس کی چار دیواری کے اوپر باقاعدہ مندر کا کلس بنا دیا گیا۔ جب کسی مسلمان نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا تو پاکستان بننے سے کچھ عرصہ قبل اس جگہ باقاعدہ ایک خوبصورت مندر کی عمارت تعمیر کی گئی جو اس وقت تک موجود ہے مگر چوک شاہ مجید کا نام ذہنوں میں محفوظ نہیں رہا بلکہ زینت طاقِ نسیان بن چکا ہے۔

سرائے چہلیک

اسلامی دور میں رفاہ عامہ کے جن کاموں کو اہمیت و فوقیت دی جاتی تھی ان میں سے ایک اہم ترین کام جا بجا خود کفیل سراؤں کا قیام تھا تا کہ ہر مسافر قیام و آرام کر سکے۔

شیر شاہ سوری ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے پوری مملکت میں سڑکوں کا جال بچھوایا۔ ہر سڑک پر دو، دو کوس کے فاصلے پر سرائیں بنوائیں جو دو حصوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایک حصہ ہندوؤں کے لئے اور دوسرا حصہ مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ ہر حصہ کے لئے الگ الگ باورچی مقرر تھے۔ ان سراؤں میں ہر مسافر ٹھہر سکتا تھا اور اسے سرکاری طور پر حسب حیثیت مفت کھانا اور بستر وغیرہ ملتا تھا۔ ہر سرائے کے درمیان کھلا میدان ہوتا تھا جس میں مسافر اپنے مویشی وغیرہ باندھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان سراؤں میں ایک مسجد اور ایک کنواں ہوتا تھا۔ امام مسجد، مؤذن اور پانی کھینچنے والے سب کو سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملا کرتی تھی اسی لئے پہلے زمانہ میں ہوٹلوں کا رواج نہ تھا۔ ہوٹلوں کی تجارت نے خدمتِ خلق کا یہ تصور ختم کر دیا ہے۔

سرائے چہلیک (چہل یک) اسی دور کی سرائے نمبر ۴۱ تھی۔ یہ اپنے عدد کی وجہ سے سرائے چہلیک مشہور ہو گئی۔ یہ سڑک رونده از کچہری تا لوہاری دروازہ کے قریباً وسط میں بجانب شمال واقع ہے۔ یہ سرائے بڑی وسیع اور کشادہ تھی۔ اس کے اندر چاروں طرف بڑے وسیع مکانات بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں کھلا میدان، کنواں اور مسجد تھی۔ مسجد کے ملحق کافی زمین وقف تھی۔ راقم جب ۱۹۳۵ء میں یہاں آ کر آباد ہوا تو اس زمانہ میں اس مسجد اور اس ملحقہ اراضی پر گھوڑے باندھے جاتے تھے۔

راقم نے اس مسجد کا قبضہ حاصل کر کے اسے قابل استعمال بنایا۔ اس کے دونوں اطراف مکان تعمیر کرائے اور یہ مسجد بمعہ جملہ جائیداد مدرسہ قاسم العلوم کے حوالے کر دی تا کہ اس کی صحیح نگرانی ہو سکے اور جائیداد مسجد صحیح مصرف میں آئے۔ اس وقت یہ سرائے سابقہ شاہان کی متروکہ جائیداد کی وجہ سے سرکار انگریز کے محکمہ نزول کے قبضہ میں آ چکی تھی۔ انگریزوں کے آنے کے بعد ہندوؤں نے اس کے مکانات محکمہ نزول سے خرید لئے کیونکہ ان مکانات میں شروع سے ان کے کابلی بیوپاری آ کر ٹھہرتے تھے اور یہاں سے مال تجارت افغانستان وغیرہ لے جاتے تھے۔

بعد ازاں ہندوؤں نے یہ مکانات مسلمانوں کے پاس بیچ دیئے اور سرکاری میدان محکمہ نزول نے نیلام عام میں فروخت کر دیا۔ یہ محلّہ اب تک سرائے نمبر ۴۱ کی وجہ سے چہل یک کہلاتا ہے اور یہ اکٹھا لکھا جاتا ہے کیونکہ چہلیک اکٹھا لکھنے سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ چہلیک کی پرانی مسجد ۱۲۸۱ھ میں یعنی ایک سو چالیس سال قبل سمند خان زکوری نے از سرِ نو تعمیر کرائی جس پر یہ کتبہ تا دم تحریر موجود ہے۔

چوں سمند خان زکوری بہر استرضائے حق

کرد مسجد خو دبنا آراستہ در چہل یک
سال تاریخش در آوردم بہ ذی الحج در شمار
بعد ہجرت یکہزار دو صد وہشتاد ویک

وکٹوریہ سرائے

عہد انگریزی میں ملتان میں پہلی سرائے قائم کرنے کا سہرا سیٹھ سید خدا بخش بخاری کے سر رہا۔ جنہوں نے ملتان شہر کے سٹیشن کے قریب مسافروں کے لئے ایک سرائے بنوائی تھی۔ دوسری سرائے ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان نے ملکہ وکٹوریہ کے جشن کی یاد میں ۱۹۰۴ء میں سڑک رونده از حسین آگاہی تا دولت گیٹ بجانب جنوب عوامی چندہ سے تعمیر کرائی۔ اس کے لئے اراضی تخمانیہ مواری ۱۱۰۰ مربع گز بروئے چٹھی نمبر ۱۶۵۹-۳۴۸-۲ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۰۳ء منجانب سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا بنام فنانشل سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب وکٹوریہ میموریل کمیٹی ملتان کو تحفتہً مفت عطا کی گئی۔ اس پر دومنزلہ عمارت تعمیر کی گئی۔ اوپر نیچے بہت سے کمرے تھے۔ سڑک کی بجانب دکانیں تھیں جن میں مسافروں کی ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ مسافروں یا باہر سے آنے والوں کے لئے بڑی آرام دہ جگہ تھی۔ یہ سرائے ۵۷ سال تک ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے قبضہ میں رہی اور باہر سے آنے والے لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے۔ ۱۹۵۹ء کے اوائل میں صحیح نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے یہ گرگئی جس کے ملبہ کو مئی ۱۹۵۹ء میں -/۱۶۰۰۰ روپے میں نیلام کر دیا گیا۔

کوٹلہ تولے خان

خاندان غلاماں کے بادشاہوں میں غیاث الدین تغلق ۱۳۰۵ء میں ملتان کا گورنر بنا۔ اس نے شہر سے دور موجودہ گھنٹہ گھر کے عقبی علاقہ میں ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی جس کے ساتھ ساتھ ملازمین شاہی کے لئے مکانات بنوائے۔ ان تمام تعمیرات کے علاقے کا نام اس نے کوٹلی تغلق خان رکھا جو بگڑتے بگڑتے کوٹلہ تولے خان بن گیا۔

ملتان میں یہ جگہ اب محلّہ کوٹلہ تولے خان کے نام سے مشہور ہے جہاں کی وسیع وعریض حویلیاں، باغات وغیرہ تو گردش زمانہ میں نابود ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ تنگ و تاریک گلیوں، گندی نالیوں، خستہ حال مکانوں، ابلتے ہوئے گٹروں اور کوڑے کے ڈھیروں نے لے لی ہے۔

النگ

ملتان شہر کی حفاظتی فصیل النگ کہلاتی ہے۔ شہر کے چاروں طرف فصیل کا محیط ۳ میل کے قریب ہے۔

لنگ دولت گیٹ سے شروع ہو کر دہلی گیٹ، خونی برج، پاک گیٹ، حرم گیٹ، بوہڑ گیٹ سے ہوتی ہوئی لوہاری گیٹ پر آ کر ختم ہوتی ہے۔

قدیم ہونے کے باوجود یہ راستہ ملتان کی کئی جدید سڑکوں سے بہت بہتر ہے۔ شہر اور قلعہ کی طرح اس کی تعمیر اور سن تعمیر کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں ہے۔ لیکن قیاس یہی ہے کہ اسے شہزادہ مراد بخش نے اپنے دور گورنری میں تعمیر کرایا یا اس کی تعمیر نو کرائی یہ ۱۶۴۲ء کی بات ہے۔

نواب علی محمد خوگانی نے اس کی ۱۷۵۷ء میں مرمت کرائی۔ فصیل شہر کی دیوار اب صرف دہلی گیٹ تا خونی برج ہی نظر آتی ہے۔

شاہی عید گاہ

یہ عظیم عید گاہ محمد شاہ کے زمانہ میں ملتان کے گورنر نواب عبدالصمد خان نے ۱۷۳۵ء میں تعمیر کرائی۔

یہ لاہور ملتان کوئٹہ روڈ پر شمالی جانب اس سڑک کے عین سامنے واقع ہے جو عید گاہ سے دولت دروازہ کی طرف جاتی ہے۔ مسجد کا محراب دار مسقف دالان ۲۵۰ فٹ لمبا اور ۵۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے سات گنبد ہیں۔ درمیانی گنبد سب سے اونچا اور نمایاں ہے جو دور سے اس عظیم مسجد کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے دونوں طرف تین تین سیپ نما پست گنبد ہیں جو باہر سے نظر نہیں آتے۔ مگر برآمدہ میں صاف اور نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ مسجد کے اگلے حصہ میں دائیں بائیں دو بڑے بلند مینار ہیں۔ مسجد کا زیر فرش صحن اس کے مسقف دالان سے دوگنا ہے۔

سکھوں کے زمانہ میں اس پر بھی دور ابتلا آیا۔ انہوں نے اس قدیم مسجد کو اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر بنا دیا۔ دیوان مولراج گورنر ملتان کے مستعفی ہونے کے بعد جب بنگال سول سروس کے پیٹرک وانز ایگینیو اور لیفٹیننٹ ولیم اینڈرسن قلعہ کا قبضہ نئے گورنر ملتان کاہن سنگھ کو دلانے کے لئے ملتان آئے تو یہ دونوں انگریز آفیسر ۱۹ اپریل ۱۸۴۸ء کو اسی عید گاہ میں مارے گئے اور عید گاہ پر ان کے قتل کے متعلق یادگار ایک کتبہ نصب کر دیا گیا۔ انگریزوں نے ملتان پر تسلط قائم کرنے کے بعد عید گاہ میں دیوانی عدالتیں قائم کر دیں اور ناظم ملتان یعنی ڈپٹی کمشنر کی کچہری بھی اسی عید گاہ میں بنا دی گئی۔

۱۸۶۳ء میں یہ عید گاہ اس شرط پر مسلمانوں کو واپس کی گئی کہ یہاں سے مذکورہ بالا دو انگریزوں کے قتل کے متعلق یادگاری پتھر نہ ہٹایا جائے جو اب تک ٹیوب ویل کے کمرہ کی جنوبی دیوار میں نصب ہے۔

۱۸۹۱ء میں عید گاہ کی حالت بہت خستہ ہو گئی تھی جس پر نواب صاحب محمد حیات خان ڈویژنل جج اور مسٹر گلسن ڈپٹی کمشنر کی کوششوں سے مبلغ دس ہزار روپیہ چندہ جمع ہوا اور اسی قدر گورنمنٹ انگلشیہ نے دیا جس سے ۱۸۹۴ء میں زیر نگرانی شیخ ریاض حسین قریشی اس کی مرمت مکمل ہوئی جس کا یادگاری کتبہ آج بھی شمالی دیوار پر موجود ہے۔

۱۹۶۰ء میں مسٹر مختار مسعود ڈپٹی کمشنر اور مسٹر بی۔اے قریشی کمشنر ملتان کی مساعی جمیلہ سے اس عید گاہ کا رقبہ دوگنا سے بھی زیادہ بڑھا کر اسے وسیع تر کر دیا گیا۔اس میں ایک لاکھ نمازیوں کی گنجائش ہو گئی۔اس کے گنبد کو جدید قسم کی کیمیاوی پچکاری سے مرمریں بنا کر اس پر فلش لائٹس لگائی گئی ہیں۔

راقم کی منتخب کردہ آیات سے کاشی کی بڑی بڑی اینٹیں تیار کروا کر برآمدہ کی جنوبی دیوار کو مزین کیا گیا۔میاں مظفر الدین چیئرمین بلدیہ نے مرکری ٹیوب لائٹس لگوا کر عید گاہ کو بقعہ نور بنا دیا۔

گھنٹہ گھر

ملتان شہر کے قلب میں گھنٹہ گھر کی عظیم الشان عمارت واقع ہے۔گھنٹہ گھر نے شہر کے ماتھے پر جھومر کا کام کیا اور اس کے عمارتی حسن کو دوبالا کر دیا۔

گھنٹہ گھر کی موجودہ عمارت علی محمد خان سدوزئی کی حویلی کے کھنڈرات پر تعمیر کی گئی ہے کیونکہ جس وقت انگریزوں نے ملتان پر قبضہ کیا تو اس علاقے میں صرف حویلی کے کھنڈرات موجود تھے۔

۱۸۸۴ء میں اُس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر ایمرسٹن ایچی سن نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور ۱۸۸۸ء میں یہ خوبصورت عمارت مکمل ہوئی تو ملتان میونسپل کمیٹی کے دفاتر یہاں منتقل ہو گئے۔

گھنٹہ گھر کی گھڑیوں کی سوئیاں تو عرصہ ہوا کسی نامعلوم صدمہ کے تحت ایک ہی جگہ ٹھہر گئی ہیں مگر وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔بلدیہ ملتان میونسپل کمیٹی سے کارپوریشن تک کا سفر طے کر چکی ہے۔لیکن گھڑی کی سوئیاں نہ صرف ٹھہری ہوئی ہیں بلکہ کارپوریشن کے دفاتر بھی یہاں سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں اور ہنوز اسی عمارت میں قائم ہیں جو کہ ان کی ضروریات کے لئے نہایت ناکافی ہے۔

جدید عمارات

حالیہ برسوں میں ملتان میں جدید اور خوبصورت عمارات کا اضافہ ہوا ہے۔یہ عمارات ابدالی روڈ اور ایم۔ڈی۔اے روڈ پر واقع ہیں۔

ہائیکورٹ بلڈنگ

لاہور ہائیکورٹ ملتان بنچ پچھلے ۲۱ سال سے کام کر رہا ہے۔

چھاؤنی کے علاقے میں پرانا بہاولپور روڈ کے اختتام پر واقع ہائیکورٹ کی عمارت ملتان کے روایتی فن تعمیر کا نمونہ ہے۔

اس کے علاوہ ابدالی روڈ پر پی۔آئی۔اے بکنگ آفس اور روزنامہ نوائے وقت کی جدید عمارات بھی ملتان کی عمارات میں ایک خوبصورت اضافہ ہیں۔

سٹیٹ بنک بلڈنگ

ملتان میں حال ہی میں ایک جدید ترین عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی ہے جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں حیرت زدہ کر دیتی ہے یہ ہے سٹیٹ بنک بلڈنگ جو چوک موج دریا کے ایک کونے میں ڈویژنل سپورٹس گراؤنڈ کے ساتھ بنائی گئی ہے۔

یہ آٹھ منزلہ خوبصورت اور جدید عمارت ہے۔ جو کہ ملتان کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی ہے۔ گراؤنڈ فلور پر وسیع و عریض بنکنگ ہال ہے جس کے اردگرد خوبصورت برآمدے بنائے گئے ہیں۔ برآمدوں کے باہر ڈھلوان چار دیواری ہے جس میں بڑے بڑے محرابی دروازے ہیں اوپر کی منزلوں کی دیوار بالکل سیدھی ہیں جن میں دوسری منزل سے لے کر آٹھویں منزل تک چاروں طرف شیشے اور نیلی روغنی ٹائل کا استعمال کیا گیا ہے ایک طرح سے قدیم و جدید فن آرائش کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ عمارت دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے۔

ملتان آرٹس کونسل

سٹیٹ بنک بلڈنگ سے چوک ایم ڈی اے کی طرف جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر ملتان آرٹس کونسل کی نئی عمارت مکمل ہو چکی ہے۔ اس کا ہال 620 نشستوں پر مشتمل ہے۔ سٹیج کافی کشادہ بنایا گیا ہے اور اس میں ایسی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اسے ریوالونگ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ خواتین اور مرد فنکاروں کے لئے علیحدہ علیحدہ گرین روم بنائے گئے ہیں۔ مرکزی دروازے کے سامنے نمائشوں کے لئے دو پوڈیم اور آرٹ گیلری بنائی گئی ہے جہاں بیک وقت ۳۰۰ سو سے زائد تصاویر کی نمائش کی جا سکتی ہے۔ فائن آرٹ اور موسیقی کی تعلیم و تربیت کے لئے کلاس روم بنائے گئے ہیں۔

آرٹس کونسل کی عمارت کی تعمیر میں ملتان کی قدیم اور جدید ثقافت کو خصوصی طور پر مدنظر رکھا گیا ہے۔ بیرونی دیواروں پر سرخ گٹکا استعمال کیا گیا ہے جس میں نیلی اور فیروزی ٹائلوں سے خوبصورت بارڈر بنائے گئے ہیں۔ صدر دروازہ بھی بہت خوبصورت بنایا گیا ہے۔ یہ عمارت ملتان کی پُرشکوہ عمارات میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

ایوانِ صنعت و تجارت

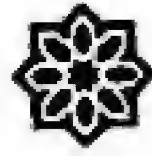
ملتان آرٹس کونسل کے سامنے ہی ایوان صنعت و تجارت کی خوبصورت عمارت ہے جس کی دیواروں

بھی سرخ گٹکا استعمال کیا گیا ہے۔

صدر دروازے کے اوپر پوری دیوار پر فیروزی ٹائلیں لگائی گئی ہیں اور پوری عمارت کے گرد بھی فیروزی ٹائلوں کا خوبصورت نفیس بارڈر بنایا گیا ہے۔صدر دروازہ بھی فیروزی رنگ کے ایلومینیم سے بنایا گیا ہے جس میں براؤن رنگ کا شیشہ استعمال کیا گیا ہے۔

ہوٹل ھالیڈے ان

ابدالی روڈ پر واقع ہوٹل ھالیڈے ان کی خوبصورت عمارت واقع ہے۔اس کی خوبصورتی کے لئے ہلکے بھورے رنگ کا گٹکا اور رنگین شیشہ استعمال کیا گیا ہے۔



ملتانی سائنسدان

انسان وقت کا حساب رکھے بغیر منظم زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس لئے اجرام فلکی کا مشاہدہ تہذیب کی بنیادی ضرورتوں میں سے تھا۔ آریوں کی مذہبی رسمیں جتنی زیادہ تھیں اتنی انہیں وقت مقررہ پر ادا کرنے کی ضرورت تھی جن کا زیادہ تر تعلق موسموں، چاند کے گھٹنے اور بڑھنے، سورج کے مختلف منطقوں اور برجوں سے تھا۔ اسی لئے انہوں نے اولین توجہ علم ہیت و نجوم پر دی۔ ملتان کے ہندو علم ہیئت، نجوم، طب، موسیقی، تعبیر خواب اور قیافہ شناسی کے ماہر تھے اور ان کی تعلیم کا ملتان میں باقاعدہ انتظام تھا ان ماہرین میں مندرجہ ذیل سائنسدانوں کو بقائے دوام کا تحفہ ملا۔

پنڈت برہم گوپت

یہ علم ہیئت کا ماہر تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے کتاب ''سدھانت'' لکھی یہ پچیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں زمین و آسمان کی ہیئت، ستاروں کے دور، طول بلد، حدود قوسین، تقویم کواکب، نظرات و اقرانِ سیارگان، سورج گرہن، چاند گرہن ایسے اہم مضامین پر روشنی ڈالی گئی۔ یہ ملتان کی پہلی کتاب ہے جس کا عربی میں ''السند ہند'' کے نام سے ترجمہ ہوا۔ ۷۷۱ء میں ریاضی اور ہیئت کا ایک ماہر پنڈت یہ کتاب لے کر بغداد پہنچا۔ خلیفہ منصور نے اسے بڑی قدر سے دیکھا اور اپنے دربار کے ایک ریاضی دان ابراہیم قراری سے اس کا ترجمہ کرایا۔ عرب پہلے عدد لفظوں میں لکھا کرتے تھے، اس ملتانی ریاضی دان سے عربوں نے ہندسے لکھنے سیکھے جنہیں وہ ارقام ہندیہ کہتے تھے۔

ایک عرصہ تک بغداد سے لے کر اسپین تک، عرب ہیئت دان اس کتاب کے پیچھے لگے رہے اور اپنی اپنی طرز میں اس کا ترجمہ کرتے رہے اور اس کی شرحیں اور خلاصے لکھتے رہے، آٹھویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی تک اس کتاب کو بنیادی حیثیت حاصل رہی، اب تک اس کی بعض اصطلاحوں کا اثر لیا جا رہا ہے۔

درلب ملتانی

یہ بھی علم ہیئت کا مشہور و معروف ماہر تھا۔ اس نے اس سلسلہ کی دوسری کتاب زیچ یعنی جنتری تیار کی تھی جس میں آفتاب و ماہتاب کے اوقات طلوع اور غروب بھی درج تھے، اس کتاب کی البیرونی نے بہت تعریف لکھی ہے۔

اوگر برت

یہ راجہ جے پال کے بیٹے آنند پال کا اتالیق تھا اور علم نجوم کا بہت ماہر تھا۔ اس نے علم النجوم پر ''شکھت برت'' نامی کتاب لکھی۔ جس نے آنے والے ماہرین کے لئے نشان راہ کا کام دیا۔

براماہر

ملتان قدیم میں یہ فن تعمیر کا ماہر گزرا ہے۔ اس نے فن تعمیر پر ''کتاب عمارات'' لکھی، تالاب بنانا ہندوؤں کا مخصوص ہنر تھا، وہ نہایت سڈول پتھروں سے نوکدار میخوں سے باہم جڑے ہوئے درجہ وار چبوترے بنانے کے بڑے ماہر تھے۔ ان میں اس انداز سے بکثرت سیڑھیاں بنائی جاتی کہ اگر ایک جماعت نیچے اترتی اور دوسری اوپر چڑھتی تو آپس میں مڈبھیڑ نہ ہوتی۔ ایسا تالاب ملتان کے مشہور سورج کنڈ مندر میں موجود تھا۔

پیر محمد ابراہیم قریشی

برصغیر پاک و ہند میں آب پاشی کے نظام کو مربوط کرنے اور زرعی انقلاب لانے میں ملتان کے ایک اور مایہ ناز فرزند پیر محمد ابراہیم قریشی کی خدمات تاریخ کا سنہرا باب ہیں۔

۷ جون ۱۸۹۹ء کو کٹرہ سادات ملتان میں پیدا ہوئے۔

۱۹۲۳ء میں انڈین سروس آف انجینئرز میں شامل ہوئے۔

بیکانیر کینال (جو اپنے وقت کی سب سے بڑی نہر تھی) ڈیزائننگ اور تعمیر اور متعدد چھوٹے چھوٹے ڈیم بھی آپ نے تعمیر کرائے۔

ان خدمات کے اعتراف میں آپ کو ۱۹۴۲ء میں ''خان بہادر'' کا خطاب ملا۔

انہوں نے Law of Liquid Flow دریافت کیا اور اس کی تصدیق کے لئے امپیریل کالج لندن یونیورسٹی میں کام کرتے رہے۔

تقسیم ہند کے بعد آپ پنجاب کے چیف انجینئر اور حکومت پنجاب کے سیکرٹری رہے۔ اس کے علاوہ

متعدد عہدوں پر فائز رہے جن میں چیئرمین سمال ڈیمز آرگنائزیشن، کمشنر برائے سندھ طاس اور ایڈوائزر برائے وزارت خارجہ وامور دولت مشترکہ جیسے اہم مناصب شامل ہیں۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو ''ستارہ قائداعظم'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔

انہوں نے نامور سائنسدان آئین سٹائن کے ساتھ آب پاشی کے نظام کے موضوع پر مفید مذاکرات کئے اور کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔

بلاشبہ وہ اپنے عہد کے عظیم مسلمان موجد اور مدبر تھے۔ ۱۸ اور ۱۹ مئی ۱۹۹۱ء کی درمیانی شب یہ عظیم انسان خالق حقیقی سے جاملا۔

ڈاکٹر محبوب علی

۱۹۲۳ء میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر محبوب علی نے ۱۹۴۲ء میں بی ایس سی اگریکلچر، ۱۹۵۱ء میں ایم ایس سی اگریکلچر فیصل آباد سے اور ۱۹۵۵ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ایگریکلچر اینڈ مکینکل کالج آف ٹیکساس سے حاصل کی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پی ایچ ڈی کی امتحانی کمیٹی نے ان کو درج ذیل الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

''یہ کمیٹی متفقہ طور پر مسٹر علی کی ہنرمندی، قابلیت، پیداواری صلاحیت، تجسس اور کام میں تنوع کی خصوصیات کا اعتراف کرتی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ یہ اپنے ملک کے لیے قیمتی اثاثہ ثابت ہوں گے۔''

۱۹۵۸ء میں انہیں ملتان میں نیا کاٹن ریسرچ سنٹر قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جو انہوں نے بڑی محنت، لگن اور دلجمعی سے نبھائی اور بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ اپنی تحقیق اور کوششوں سے وہ کپاس کے ریشے کی لمبائی 1-1/16 سے 1-1/4 تک بڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ان کی بڑی نمایاں کامیابی تھی جس پر حکومت پاکستان نے ان کو ۱۹۷۱ء میں ''صدارتی ایوارڈ برائے حُسنِ کارکردگی'' سے نوازا۔ مزید برآں اُن کی پیداواری عوامل کی تحقیق سے علاقہ میں کپاس کی پیداوار 9/10 مَن سے 25/26 مَن فی ایکڑ تک چلی گئی۔

کاٹن لیف کرل وائرس کا علاج غیر ملکی ماہرین کے نزدیک پانچ سال کیلئے کپاس کی فصل کو ترک کرنا تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے اُن ماہرین سے مرعوب ہونے کی بجائے اس کا علاج دریافت کیا اور ایسی مدافعتی اقسام متعارف کرائیں جو اس بیماری سے متاثر نہیں ہوتیں۔ وائرس کے جینیاتی کنٹرول کے اصول کی دریافت اُن کا سنہری کارنامہ ہے جو دنیا میں پہلی دفعہ متعارف کرایا گیا۔

آپ نے پنجاب سیڈ کارپوریشن میں بھی بطور سربراہ ادارہ خدمات سرانجام دی ہیں جہاں انہوں نے گندم، کپاس، چاول اور مکئی کے بیجوں کی افزائش کے پروگرام متعارف کرائے اور ایسا طریقہ کار وضع کیا جس سے

ان بیجوں کی نجابت قائم رہ سکے۔

ان کا ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے آلو کے بیج کے معاملے میں ورلڈ بنک کے ماہرین کی رائے سے اختلاف کیا اور اپنے مؤقف کو درست ثابت کیا۔

بحثیت مینجنگ ڈائریکٹر پنجاب سیڈ کارپوریشن یہ آپ کی ذمہ داری تھی کہ صوبے کی بیج کی ضروریات کو مقامی طور پر پورا کریں۔ ماہرین کا اصرار تھا کہ یہ بیج ہالینڈ سے ہی درآمد کیا جائے جیسا کہ اب تک ہوتا آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مؤقف تھا کہ آلو کا بنیادی بیج مقامی طور پر پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن ماہرین اس سے اختلاف کرتے تھے کہ یہ ممکن نہیں ہے مگر ڈاکٹر صاحب اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے جس پر انہیں اپنی رائے کو ثابت کرنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے اس وقت کے گورنر پنجاب جنرل جیلانی مرحوم اور دوسرے حکام کے سامنے اپنا مؤقف ثابت کرنے کے بعد سوالات کیلئے پیش کیا تو ماہرین نے ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ اصولوں کو تسلیم کر لیا۔

آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ریٹائرمنٹ کے بعد محکمہ زراعت پنجاب میں ''اعزازی سائنسدان'' بمعہ تمام مراعات کا عہدہ پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ آپ نے ساری عمر تحقیق و جستجو میں گزاری ہے اس لیے قومی مفاد میں آپ نے یہ عہدہ قبول کیا ہوا ہے۔ بعد میں مرکزی حکومت نے بھی ڈاکٹر صاحب کو اُن کی سائنس کی تحقیق میں عمدہ کام کی وجہ سے اس اعزاز سے نوازا۔

ڈاکٹر ظہور احمد

ڈاکٹر ظہور احمد یکم اکتوبر ۱۹۴۲ء کو کپورتھلہ (انڈیا) میں پیدا ہوئے آپ نے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے ۱۹۶۲ء میں بی ایس سی زراعت (حشریات) اور ۱۹۶۴ء میں ایم ایس سی (حشریات) کی ڈگریاں امتیازی درجوں میں حاصل کیں۔ اور اسی یونیورسٹی میں دو سال تک تحقیقی کام کیا۔ پھر ستمبر ۱۹۶۶ء میں پانچ سال تک واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی (Washington State University) پل مین (Pullman) ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بحثیت ریسرچ اسسٹنٹ حشریات کے موضوع پر اہم تحقیقات میں مصروف رہے اور اگست ۱۹۷۱ء میں اپنی ریسرچ کی کامیاب تکمیل پر پی ایچ ڈی (Ph.D) کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس آ کر ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۹ء تک تقریباً آٹھ سال مرکزی ادارہ تحقیقات کپاس کے شعبہ حشریات کے سربراہ کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر صاحب کے شاندار ریکارڈ اور انتظامی صلاحیتوں کی بنیاد پر آپ کو ترقی دے کر اسی ادارہ کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ جنوری ۱۹۸۲ء میں عالمی ادارہ خوراک و زراعت (FAO) اقوام متحدہ ترقیاتی پروجیکٹ (UNDP) میں آپ کا انتخاب بہ حیثیت ٹیم لیڈر/ پلانٹ پروٹیکشن آفیسر، انڈسٹریل کراپس، ڈیویلپمنٹ پروجیکٹ میکٹیلا (Mektila) برما (Burma) ہو گیا جہاں پانچ سال تک آپ خدمات انجام دیتے

رہے۔ آپ کی ذمہ داریوں میں کپاس کے کیڑوں کے کنٹرول کی منصوبہ بندی، کنٹرول کے مختلف طریقوں بشمول بیالوجی/ اکالوجی پر تحقیق، تحفظ نباتات کی مختلف مہمات (Campaigns) کی رہنمائی اچھے زمینداروں کے ہاں نمائشی پلاٹ لگوانا، تحفظ نباتات میں ملکی عملہ کو تربیت دینا اور ٹیم لیڈر کی حیثیت سے ملکی عملہ کے کام کی نگرانی، تجارتی بنیادوں پر تصدیق شدہ بیج، کاشتکاروں کو بہتر کاشت کے متعلق پیغام رسانی میں زرعی توسیعی عملہ کی مدد، ایف اے او اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروجیکٹ کے منصوبوں کی دیکھ بھال اور ترقیاتی اور تکنیکی کاموں کی رپورٹیں تیار کرنا شامل تھا۔ اپریل ۱۹۸۶ء میں ایک سال کے لئے آپ کا انتخاب بہ حیثیت چیف ٹیکنیکل ایڈوائزر و مشیر برائے تحفظ نباتات فری ٹاؤن (Free Town) سیرالون (Sierra leone) ہو گیا۔ اپریل ۱۹۸۷ء میں واپس آ کر آپ نے ادارہ کے ڈائریکٹر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ڈاکٹر ظہور احمد نے اندرون ملک اور بیرون ملک عالمی ادارہ خوراک و زراعت و دیگر بین الاقوامی تنظیموں کی کئی ایک کانفرنسوں، ورکشاپس، سیمینارز اور میٹنگز میں شرکت کی اور مقالے پڑھے۔ آپ کے ۵۴ سے زائد سائنٹیفک مضامین اور تحقیقی مقالے اندرون اور بیرون ملک مختلف علمی جرائد اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ انٹومالوجیکل سوسائٹی آف پاکستان، انٹومالوجیکل سوسائٹی آف امریکہ، واشنگٹن سٹیٹ انٹومالوجیکل سوسائٹی اور انٹرنیشنل کانگریس آف انٹومالوجی کے ممبر ہیں۔ کپاس کے میدان میں بہترین تحقیق کرنے پر ۱۹۹۵ء میں آپ کو ایف اے او گولڈ میڈل، ۱۹۹۶ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور چوہدری محمد افضل ایوارڈ اور ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر بورلاگ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

(تاریخ ملتان - منشی عبدالرحمٰن خان)



تصوف

حفیظ خان

خطۂ ملتان: سرائیکی مرثیہ گوئی تاریخ کے آئینے میں

خطۂ ملتان کی مٹی کا خمیر جہاں عاجزی، انکساری، برداشت، رواداری اور عدم تشدد سے عبارت ہے، وہیں اس کا ذرہ ذرہ رنج والم، حزن و یاس، سوز و گداز اور ہجر و فراق کی کیفیات میں گندھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تاریخ کے ہر دور کا خوشحال ترین خطہ اپنی اسی خوشحالی کے سبب غاصبوں، لٹیروں، حملہ آوروں اور بدنیت مہم جوؤں کی غاصبیت اور مہم جوئی کا نشانہ بنا رہا ہے۔ زمانہ چاہے قبل مسیح کے آریاؤں کا ہو یا پانچویں صدی عیسوی کے سفید ہُن کا، آٹھویں صدی عیسوی کے عرب ہوں یا گیارھویں صدی کی ابتداء کے غزنوی، حملہ آور غوری رہے ہوں یا تیرھویں صدی کا خوارزم شاہ، لشکر کشی منگولوں کی ہو، ترکوں کی یا افغانوں کی، ہر بار مختلف حیلوں بہانوں سے ملتان کی دھرتی کو اس کے بیٹے بیٹیوں کے خون سے سیراب کرنے کا جواز تلاش کیا جاتا رہا اور یوں ملتان بار بار قتل ہوتا رہا۔

یہاں کے علم و فضل کے ذخائر کا ہر بار جلا کر راکھ کر دیا جانا، لائبریریوں اور درسگاہوں کا ملیا میٹ ہونا، درس و تدریس اور علوم و دانش سے وابستہ افراد کی بلاتمیز ہلاکتیں، فنونِ لطیفہ میں مہارت رکھنے والے ہنرمندوں کے ہنر کی پامالی اور محنت کشوں کی محنت کا استحصال بھی یہاں کے باسیوں کا ہمیشہ مقدر رہا۔ یہ خطہ جب بھی حملہ آوری کی زد میں آتا تو زبان، تہذیب، ثقافت، ہنرمندی، علم و ادب سب کچھ زوال پذیر ہو جاتا۔ نہ کہیں علم و ادب محفوظ رہ پاتا اور نہ کوئی اقدار۔ اس سے بھی سوا سب سے بڑا قہر جو اس خطے کے بدنصیبوں پر روا رکھا گیا، وہ ان سے اُن کی زبان، ثقافت، شناخت اور حقِ حکومت کا بزورِ شمشیر چھین لیا جانا ہے۔ غاصبیت کی صدیوں پر محیط سیاہ راتوں میں گر کبھی کبھی مقامی حکمرانی کے روشن پیوند لگے بھی تو کیا کہ پھر سے آنے والی تاریکی میں نے صرف ان چھوٹے چھوٹے ادوار کے اثرات اور نشانات کو کھرچ کھرچ کر مٹانے کی سعی کی گئی بلکہ انہیں تاریخ کی کتابوں سے بھی نکال کر باہر پھینک دیا گیا۔ اگر کہیں کوئی ضمنی ذکر ہوا بھی تو دشنان پر مبنی افسانوں کے سے انداز میں۔ یہی سبب ہے کہ آج جب ہم اس خطے کی تاریخ اور اس کے ماخذ تلاشنے بیٹھتے ہیں تو کوئی بھی مقامی کتاب دستیاب نہیں ہو پاتی۔ لہٰذا ملتان کی تاریخ کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اکٹھا کرنے کی جستجو میں اُن سیاحوں یا حملہ آوروں کے حواریوں کی تحریروں کا سہارا لینا پڑتا ہے جو ان کے اپنے ملکوں میں لکھے جانے کے سبب محفوظ رہ گئیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات کے خیالات کس طور

مقامی جذبات کے نمائندہ ہو سکتے تھے۔ لہذا یہ تحریریں خطۂ ملتان کے باسیوں سے زیادہ حملہ آوروں کی خواہشات کی عکاس نظر آتی ہیں۔

اگر خطے کے اس تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھا جائے تو یہاں مرثیہ نگاری اور عزاداری کا پنپنا کچھ ایسا بھی پیچیدہ معاملہ نہیں رہتا۔ یہی تاریخی پس منظر ہی وہ سبب ہے کہ وادئ سندھ کے اس مرکز کے لوگوں نے کبھی کسی حملہ آور کی شان میں قصیدہ نہیں کہا بلکہ ہمیشہ ان اقوام کے دکھ پر بھی مائل بہ گریہ رہے ہیں کہ جن کی صورت سے بھی آشنائی نہیں رہی تھی۔ جس طرح استعماری قوتیں ایک دوسرے کی رقیب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی بقا کا اہتمام کیے رہتی ہیں اُسی طرحِ غاصبیت کا شکار اقوام بھی نہ صرف ایک دوسرے کا درد بہتر طور پر جان پاتی ہیں بلکہ اس کے کیتھارسس میں بھی ڈھارس کا سبب ہوتی ہیں۔ واقعہ کربلا اگرچہ سرزمینِ عرب میں ہوا مگر اہلِ بیت پہ ڈھائے جانے والے مظالم اور اُن کے دکھوں کی شدت کو خطۂ ملتان میں دنیا بھر سے کہیں زیادہ محسوس کیا گیا۔ کبھی بھی حملہ آوری کی تاریخ نہ رکھنے والے اہلیانِ ملتان، تمام تر غاصبیت، حملوں، محاصروں، آتش زدگی اور قتلاموں کے باوجود کبھی بھی حملہ آوروں کے ہاتھوں ذہنی یا فکری طرح پر مفتوح یا مغلوب نہیں کیے جا سکے۔ منتقمانہ رویوں سے ناآشنا باشندگانِ ملتان صدیوں کی الم نصیبی پر بھی کبھی فریاد کناں نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے انہیں صدمات کو اپنی توانائی میں منقلب کر کے اپنے اظہاریے کو مرثیہ خوانی، عزاداری اور ''وین ورلاپ'' ایسی مہذب جہتوں کے ذریعے موثر ابلاغ کا وسیلہ بنایا۔

مولانا نور احمد خان فریدی کے مطابق نواب مظفر خان کے دور (1818ء) تک شہر میں تعزیہ نکالنے کا دستور نہ تھا۔ لہذا سید لعل شاہ پہلے بزرگ تھے جو دیوان ساون مل کے زمانے (1821ء) میں ملتان آئے اور لوہاری دروازہ کے باہر عالی شان آستانہ تعمیر کر کے عشرۂ محرم میں مجالس عزا منعقد کرائیں۔ مولانا فریدی کی تحقیق کی رو سے شاہ صاحب کو امام باڑے تعمیر کرانے اور تعزیے نکالنے کا بڑا شوق تھا۔ ریاست خیر پور میرس میں بھی انہوں نے کافی امام باڑے تعمیر کرائے۔ 1305ھ میں جب ان کا انتقال ہوا تو ملتان کے گوشے گوشے میں امام باڑے بن چکے تھے۔ محرم کے دنوں میں محلے محلے سے تعزیے اٹھائے جاتے اور پورا شہر سوگوار نظر آتا۔ اس بنا پر ملتان میں سید لعل شاہ کو تعزیہ داری کا بانی کہا جاتا ہے۔ (تاریخ ملتان۔ صفحہ 260) جبکہ ''ارض ملتان'' کے مولف شیخ اکرام الحق نے ملتان میں عزاداری کے آغاز کے زمانے کو تیقن سے بیان نہیں کیا البتہ اُن کی رائے میں عزاداری کا طریقہ معزالدولہ ویلمی حاکم بلدیہ بغداد نے 334ھ (945ء) میں رائج کیا۔ جس نے بعد میں تعزیہ داری کی شکل اس لیے اختیار کر لی کہ شاہانِ ایران اور سلاطینِ عثمانی کی جنگوں میں چونکہ مقام کربلا ترکوں کے قبضے میں تھا اور ایرانی وہاں نہیں جا سکتے تھے لہذا اُس روضہ کا نقشہ زیارت کے لیے وضع کیا گیا۔ اس طرح ملتان میں محرم منانے اور تعزیہ نکالنے کی رسم شیعہ تو طن گزینوں کے ساتھ آئی۔ (صفحہ 348)۔ ان سے قطع نظر کیفی جامپوری نے اپنی کتاب ''سرائیکی شاعری'' میں بیان کیا ہے کہ ''جب ہمایوں ایران سے (سولہویں صدی عیسوی میں) ہندوستان واپس آیا تو ملتان اُس کی پہلی منزل تھی

لشکر کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ اُس کے ساتھ چلے آئے۔ ان میں بہت کچھ یہاں رہ گئے۔ اسی زمانے میں یہاں عزاداری شروع ہوئی۔ آج بھی جس کثرت سے تعزیے ملتان میں نکلتے ہیں، مغربی پاکستان کے کسی شہر میں نہیں نکلتے۔ ان شواہد سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مرثیہ گوئی برصغیر میں سب سے پہلے ملتان میں شروع ہوئی۔'' (صفحہ 90)

ان حضرات کی آراء اپنی جگہ، مگر ان سے کُلی اتفاق ممکن نہیں۔ کیونکہ عزاداری صرف ماتم کرنے، تعزیہ نکالنے، مرثیہ خوانی یا ''وین ورلاپ'' کی محافل سے انفرادی طور پر متشق نہیں۔ بلکہ یہ تو اس اجتماعی رویے سے نسبت رکھتی ہے جو ایک مظلوم دوسرے مظلوم کی دلی کیفیت کو اپنی زبان، تہذیب اور رویوں سے بیان کرتے ہوئے اپناتا ہے اور یوں انسانی سطح پر اظہار یکجہتی کا سبب بنتا ہے۔ گو کہ مرثیہ کسی نہ کسی شکل میں دنیا کی تمام زبانوں میں لکھا گیا ہے، مگر ہمارے ہاں مرثیہ کو ایک شعری صنف سے بڑھ کر مذہبی حیثیت کی تقدیس کے ساتھ قبول کیا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام میں مرثیہ گوئی شہدائے کربلا کے مصائب کے موثر بیان کا واحد اظہاریہ رہی ہے۔ اگر تاریخ اسلام میں عزاداری کے ان رویوں میں مرثیہ گوئی ہی کو لیں تو اس کا آغاز سانحہ کربلا (61ھ) کے فوری بعد حضرت امام زین العابدینؑ کے مرثیہ سے ہوگیا تھا جو انہوں نے قافلہ حسینؑ کے فرد کی حیثیت سے تحریر کیا تھا۔ گو کہ بنوامیہ کے طویل دورِ اقتدار میں غمِ حسینؑ کے اظہار پر کئی دیدہ و نادیدہ پابندیاں رہیں مگر انفرادی طور پر کئی عرب شعراء نے سانحہ کربلا کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جن میں فرزدق، ابو دیبل، ابو لاسود دوئلی، سلمان بن قبہ، دعبل اور کمیت شامل ہیں۔ اسی طرح ایران میں بھی مصائبِ اہلِ بیت پر ردعمل، اس وقت کی اسلامی سلطنت کے کسی بھی خطے سے بڑھ کر تھا۔ کیونکہ حاکموں کی گرفت کم ہونے کے سبب لوگوں کو نواسۂ حسینؑ کی المناک شہادت پر گریہ کرنے پر قدغنیں اتنی شدت سے نہ تھیں، جتنی کہ دیگر علاقوں میں۔ لہٰذا جو شاعر سب سے پہلے مرثیہ گو کے طور پر سامنے آیا وہ محتشم کاکی تھا جس کے لکھے ہوئے مرثیے ''ہفتِ ہند'' نے پورے فارس کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔

میں مورخین کی اس رائے سے بھی متفق نہیں کہ ملتان میں مرثیہ خوانی یا عزاداری کا آغاز تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اُس وقت ہوا جب فاطمین مصر کے داعی سندھ سے ہوئے ہوئے ملتان پہنچے اور اس شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ سی طرح اس رائے کو بھی تسلیم کرنے کی کوئی عقلی وجہ نہیں ہے کہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں بغداد پر منگولوں کی ہلاکت خیز یلغار کے بعد کچھ سادات خاندان ملتان آ کر پناہ گزیں ہوئے اور مرثیہ گوئی اور عزاداری کی بنیاد رکھی۔ کیونکہ تاریخی حوالون کے تعین کے لیے جہاں برسوں کا فاصلہ بھی توجیہہ طلب ہوتا ہے وہاں صدیوں کے فاصلوں کو ''تیسری اور چوتھی صدی'' یا ''چھٹی اور ساتویں صدی'' کے طور پر لینا کسی طور بھی تاریخ نویسی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اس امر واقع سے اختلاف کئے بغیر کہ حملہ آوروں کے متعین تعصبات، تاریخ کو اپنی خواہشات کے اعتبار سے مسخ کرنے کے عمل میں ''حقائق'' کی بجائے ''قیاس'' زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں، مگر تاریخ کے معاملات میں قیاس آرائی کے لیے بھی تاریخی واقعات کے اسباب وعلل، بہاؤ اور اثرات کا پیش نظر رکھا جانا ازبس ضروری ہوتا ہے۔

اب اگر اس پیمانے پر ملتان میں عزاداری اور مرثیہ خوانی کے آغاز کا جائزہ لیا جائے تو یہ اُس وقت ہی شروع ہوگئی تھی کہ جب واقعہ کربلا (61ھ) کے سال سوا سال بعد دت قوم کے کچھ افراد امام حسینؓ سے عقیدت رکھنے کے باعث یزیدی مظالم کا شکار ہوئے اور 681ء کے لگ بھگ ایران کے راستے ملتان اور ڈیرہ اسماعیل خان میں آ کر سکونت اختیار کی۔ چونکہ اس وقت عرب اور ایران شعراء کی جانب سے مرثیہ گوئی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی اس لیے ملتان میں انہیں دت لوگوں نے مخلوط زبان میں گلی گلی عزاداری کی اس منظوم صنف کو عام کیا جو کبت کہلائی اور کبت خوانی کرنے والے یہ اصحاب ''حسینی بانبھڑ'' کے نام سے جانے گئے۔ اس رائے کی تائید میر حسان الحیدری ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' (صفحہ 264)، اختر وحید نے ''دُرِ گہر'' (صفحہ 9) اور علامہ عتیق فکری نے ''العتیق العتیق'' (صفحہ 120) نے بھی کی ہے۔ یوں علامہ عتیق فکری کی اس رائے سے اختلاف کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ ان حسینی بانبھڑوں کے کہے ہوئے یہ کبت ہی خطۂ ملتان اور سرائیکی زبان میں مرثیہ کی ابتدائی شکل ہیں۔ مرثیہ گوئی کو مزید فروغ اس وقت حاصل ہوا جب 712ء (95ھ) محمد بن قاسم کی سندھ اور ملتان کی فتح کے بعد 715ء میں بنئے اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے حکم سے عرب سپاہیوں کو سندھ میں زرعی زمینیں دے کر آباد کیا گیا تاکہ وہ خوشحال ہوسکیں۔ خلافت کے مرکز سے دوری اور مقامی لوگوں سے اختلاط کے باعث اموی افواج کے ان سپاہیوں پر حکومتی بندشیں ڈھیلی پڑیں تو کربلا کے واقعات اور عرب میں کی جانے والی مرثیہ گوئی بھی وادئ سندھ کے اس خطے کے لیے اجنبی نہ رہی۔ اس لیے یہ رائے قائم کرنا قطعی نامناسب ہے کہ مرثیہ گوئی کا آغاز ملتان کے اسماعیلی دور حکومت (چوتھی صدی ہجری) میں شیعت کے فروغ کے بعد ہوا۔ اگر مرثیہ گوئی کا تعلق صرف شیعت سے ہوتا تو ہر زمانے میں شاعری کی یہ صنف صرف شیعہ مسلمانوں تک ہی محدود رہتی۔ جبکہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوا، حتیٰ کہ غیر مسلم شاعروں نے بھی اس صنف میں اعلیٰ پائے کی شاعری کی ہے۔ ہاں مگر یہ اور بات ہے کہ محمد بن قاسم کے حملے سے پہلے کی مرثیہ گوئی کا ذخیرہ اس وقت کے حاکموں کی تنگ نظری کی نذر ہوگیا اور محمد بن قاسم کے عہد کے بعد تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری تک خطۂ ملتان میں تخلیق کی جانے والی رزیہ شاعری اور مرثیہ گوئی اس وقت خاکستر کر دی گئی جب محمود غزنوی نے مذہب کی آڑ میں اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کی خاطر قرامطیوں کی سرکوبی کے بہانے 396ھ (1006ء) میں پورے ملتان شہر کو اس طرح تہ تیغ کیا کہ لوہاری دروازے سے خون کی ندی بہہ نکلی۔ اس پر بھی جب تسکین نہ ہوئی تو 401ھ (1010ء) میں محمود غزنوی نے ملتان میں دوسرا قتلام کرنے کے بعد شہر میں لوٹ مار کا حکم دیا تو بچے کھچے شرفاء بھی اُچ کی طرف بھاگ گئے اور شہر اس طرح ویران ہوا کہ جب 402ھ میں محمود غزنوی نے اپنے بیٹے محمد کو ملتان کا حاکم بنا کر بھیجا تو وہ یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ شہر تو ویران ہو چکا، میں کس پر حکمرانی کروں۔ اور یوں اگلے انیس برس یعنی 1011ء سے 1030ء (402ھ-422ھ) تک ملتان معلوم تاریخ میں پہلی بار عوام اور حکمران کے بغیر محض کھنڈرات کی صورت رہا۔ اب ایسے میں اس زمانہ سے قبل کی جانے والی شاعری کیسے محفوظ رہ سکتی۔

ملتان کے مضافات اور چند برس بعد ملتان شہر میں وادیٔ سندھ کے مقامی سومرا خاندان کی حکومت کا عرصہ 1025ء سے 1175ء تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر بعد کے حملہ آوروں نے مقامی حکمرانی کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ملتان کی تاریک کے اس ذریں عہد کو تاریخ کے صفحات سے کھرچ کر اس طرح پھینک دیا کہ زمانۂ قریب کے مورخین مولانا نور احمد خان فریدی اور شیخ اکرام الحق نے مقامی حکمرانی کے اس دور کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اُسے اپنی کتب بالا ترتیب ''تاریخ ملتان'' اور ''ارض ملتان'' میں چند سطروں کی ہی جگہ عطا کر دیتے۔ اس عہد میں جہاں علم و ادب نے بے پایاں ترقی کی وہیں مرثیہ گوئی کو بھی انتہائی فروغ ملا۔ مرثیہ گوئی کے فروغ میں سید نور الدین (462ھ/ 1079ء) سید نور الدین شمس سبزواری (560ھ-675ھ/ 1065ء-1176ء) نے گنان کی صورت میں دینی شاعری بالخصوص مرثیہ کو اس کی ابتدائی شکل میں زندہ رکھا۔ مگر پانچویں صدی سے چھٹی صدی ہجری میں تخلیق پانے والا ملتان یہ خزینۂ علم و ادب مشمول مرثیہ کے، اس وقت بلا تخصیص نذرِ آتش کر دیا گیا جب 571ھ/ 1175ء میں افغانستان سے آنے والے شہاب الدین غوری نے ملتان سے سومرا خاندان کی حکومت ختم کرنے کے بہانے قتل و غارت گری، لوٹ مار اور علم و ادب کو نیست و نابود کرنے کی نئی جہتوں کی بنیاد رکھی اور چلتا بنا۔

689ھ -808ھ/ 1290ء -1409ء کے درمیانی عرصے میں پیر شہاب الدین، اُن کے صاحبزاردے پیر صدر الدین اور اُن کے صاحبزادے پری سید حسن دریا نے مرثیہ گوئی کے زمرے میں گنان کی ارتقائی شکل کو متعارف کرایا جو زیادہ تر سی حرفیوں کی صورت میں نظم کیے جاتے۔ لیکن ان کا وجود اب پورے تیقن سے کہیں بھی دستیاب نہیں۔ اگر کچھ ہے تو محض قیاس۔ ملتان پر منگولوں کے حملے کے خوف کے زمانے میں بھی جب پورا خطہ طوائف الملوکی کا منظر پیش کر رہا تھا تو ملتان سے بہت سے شعراء اور ذاکرین نے جنوبی ہند کی طرف مراجعت کی جہاں بہمنی سلاطین نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یوں ملتان میں پھلنے پھولنے والا مرثیہ کا پودا حیدر آباد دکن، لکھنؤ اور ممبئی تک جا پہنچا مگر وہاں کی زبانوں میں مخلوط ہونے کے باوجود سرائیکی زبان کی حلاوت اور شیرینی کو باقی رکھا۔

ملتان میں سرائیکی مرثیہ گوئی کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اگر ہم اسے وادیٔ سندھ کے اس مرکز کے طور پر لیں جو اس زمانے میں ایک علیحدہ صوبے کی حیثیت میں تھا تو شیخ فرید الدین ابراہیم فرید ثانی (1950ء) کے دینی شاعری کی اہم دستاویز ''نصیحت نامے'' کا تذکرہ بھی ضرور کریں گے کہ جس کے اٹھارہ میں سے نصف اشعار مظلومین کربلا کے ذکر کے واسطے مختص ہوئے۔

اسی طرح حضرت سلطان باہو (1039ھ۔ 1102ھ/ 1629ء -1691ء) نے ڈوہڑے لکھتے ہوئے شہدائے کربلا کے مصائب کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور پانچ پانچ مصرعوں کے ایک ڈوہڑے میں مکمل مرثیہ لکھنے کی روش اختیار کی۔ گیارہویں صدی ہجری کے آخری عشرے یعنی 1097ھ کی تصنیف شدہ مرثیوں کی قلمی

بیاض کا ذکر خلش پیر صحابی نے اپنے کتاب ''سرائیکی مرثیہ گوئی کے چار سو سال'' میں کیا ہے۔ سی حرفی کے انداز میں تین ہزار اشعار پر مشتمل ڈیڑھ سو صفحات کی اس بیاض کو ڈیرہ اسماعیل خان کے شاعر سید زمان شیرازی نے تخلیق کیا تھا۔ اسی عہد کے ایک اور مرثیہ گو شاعر سید غلام حیدر شاہ ذکر بھی عمومی طور پر سامنے آتا رہا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری تک سرائیکی مرثیہ میں مسدس کی ہیت متعارف نہیں ہوئی تھی اور مرثیہ زیادہ تر سی حرفی، ڈوہڑے، کلیوں اور ابیات کی صورت میں لکھے جاتے تھے۔ جہاں ہر بند کے بعد ایک ڈوہڑے کا لکھا جانا معیاری تخلیق کا عنصر جانا جاتا تھا۔

اس کے بعد کے عہد میں مولوی لطف علی (1129ھ - 1207ھ/ 1716ء-1794ء) نے اپنی شعری شاہکار ''سیف الملوک'' میں اہل بیت کی توصیف کے ساتھ ساتھ شہادت امام حسینؑ کو بھی بطورِ خاص اپنے اشعار کا موضوع بنایا اور سرائیکی مرثیہ گوئی کے فن کو اعتبار عطا کیا۔ مولوی لطف علی کے عہد یعنی بارہویں صدی ہجری میں خطۂ ملتان سے آغاز ہونے والا مرثیہ پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آیا۔ ان مرثیہ گو شعراء میں لکھنؤ جا کر شہرت کے آسمان پر جگمگانے والے میاں مسکین ملتانی اور سکندر (بقول کیفی جاموری ''سکندر خان لشاری بلوچ'') خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو میر اور سودا کے زمانے میں ملتان اور سرائیکی زبان کی منفرد شناخت کا باعث بنے اور یوں جہاں جان گلکرائسٹ، میر تقی میر، میر حسن اور رام بابو سکسینہ بھی اپنے تذکروں میں ان کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکے، وہیں سودا جیسے شاعر کو بھی سرائیکی میں مرثیہ لکھنا پڑا جو اُن کے کلیات میں موجود ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سودا کے سرائیکی مرثیے سے ہی سرائیکی میں مسدس کی ہیت کو برتا جانے لگا۔ منظوم مرثیوں میں نثر پاروں کی موزوں جُوت بھی اسی دور سے آغاز ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح ملتان کے دیگر مرثیہ گو شعراء میں قادر بخش (مصنف ''شہادت نامہ حضرت امام حسینؑ۔ تصنیف 1118ھ)، بردہ کمترین، عاجز اور غلام حسین کا نام بھی اُن کی قلمی بیاضوں کے سبب زندہ چلا آتا ہے۔ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے کچھ اور سرائیکی مرثیہ گو شعراء کے سرائیکی مرثیے ہمیں سید عنایت حسین نانوتوی کی قلمی بیاض محررہ 1279ھ میں دکھائی دیتے ہیں جن میں دیگر نامعلوم شعراء کے علاوہ سکندر خان لشاری بلوچ کے مرثیے بھی شامل ہیں۔

سرائیکی مرثیہ کا ابلاغ پوری توانائی کے ساتھ اُس وقت سامنے آیا جب اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ ہی ملتان میں چھاپہ خانے لگنا شروع ہوئے۔ اندرون و بیرون بوہڑ گیٹ کے تاجران کتب نے اسے اپنی تجارتی ضروریات کے ساتھ ساتھ مذہبی عقیدت کے اظہار کے لیے مقامی و غیر مقامی شعراء کے علاوہ برصغیر کے طول و عرض میں پھیلا دیا۔ سرائیکی مرثیہ کے اس طور فروغ میں ملتان کے ایک مرثیہ گو شاعر اور تاجر کتب محمد خیر الدین صابر کی کاوشیوں کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی زمانے میں محمد فخر الدین کے چھاپہ خانہ کا شہرہ بھی رہا جن کے طبع کئے ہوئے مرثیے سرائیکی زبان کی جامعیت کی بنیاد بنے۔ مرثیہ گوئی کے عروج کے اس دور میں جن شعراء نے اپنی خاص پہچان بنائی اُن میں موضع سیال بھکر کے سلطان الشعراء غلام سکندر غلام (1802ء

-1903ء)، ڈیرہ اسماعیل خان کے مولوی اللہ بخش فدوی (وفات 1883ء)، بھکر کے مولوی فیروز الدین (وفات 1889ء)، سید ذوالفقار شیرازی (1815ء -1925ء)، سید علی شاہ چھینوی (وفات 1906ء) نواب شاہنواز خادم، سید غلام حسین شیرازی، سید اکبر شاہ، سید علی ملتانی، کمال خان مگسی، ماہر بہاولپوری، تہور ملتانی، منشی کمال خان ساول، سید محمد شاہ اور سید غلام محمد شاہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لیے جاتے ہیں۔ سید غلام محمد شاہ کا ایک اور کارنامہ فارسی میں ذکر اہل بیت کی کتاب ''روضتہ الشہداء'' کا 1815ء میں ''فردوس الشہدا'' کے نام سے کیا جانے والا منظوم سرائیکی ترجمہ ہے۔

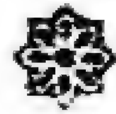
سرائیکی مرثیہ گوشعراء کی اس کی بعد کی صف میں اہم ترین نام منشی نبی بخش مضطر ملتانی (1878ء -1940ء) کا ہے۔ مضطر ملتانی نے مرثیہ گوئی کے فن کو اس کی تمام تر شعری لطافتں اور موضوعاتی تنوع کے ساتھ بام عروج پر پہنچایا۔ اُن کے ابتدائی کلام میں اپنے استاد سید علی شاہ چھینوی کا رنگ نظر آتا ہے مگر بعد کے کلام میں ان کا اپنا ڈکشن اور شعری مزاج پوری توانائی کے ساتھ آیا اور چھا گیا۔ مضطر کے شاگردوں میں مولوی گل محمد عاشق ملتانی (1858ء -1933ء) نے بہت نام پیدا کیا۔ مضطر اور عاشق ملتانی کے ادوار سے سرائیکی مرثیہ گوئی کا بھرپور رزمیہ پہلو بھی پہلے سے کہیں زیادہ تاثر کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا۔ ان شعراء کے بعد یا یوں کہہ لیں کہ ان کے شاگردوں کی صف میں جو نام سرائیکی مرثیہ کی عظیم روایت کی توقیر کا باعث ہوئے ان میں مولوی گل محمد عاشق ملتانی کے شاگرد منشی محمد رمضان ملتانی اور حاجی نبی بخش شوق کربلائی، کروڑ لعل عیسن کے غلام حیدر فدا، مظفر گڑھ کے سید امام علی شفیق، احمد پور شرقیہ کے خواجہ عبداللہ اختر، حسرت، نقوی احمد پوری، لیاقت پور کے منشی نور محمد گدائی، مخدوم رشید کے مخدوم نوبہار سیری اور محسن نقوی انتہائی اہم ہیں۔

سرائیکی مرثیہ گوئی خطۂ ملتان یا سندھ وادی میں صرف مسلمان شعراء کا خاصہ نہیں رہی بلکہ ان گنت غیر مسلم شعراء نے بھی عقیدتاً مرثیہ گوئی میں اپنا حصہ ڈالا جن میں اٹھارویں صدی عیسوی کے چوہدری نعمت رام نعمتی جام پوری کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسی طرح ملتان یا خطۂ ملتان کے سرائیکی مرثیہ گوشعراء کی شعری ولسانی لطافتوں سے متاثر ہو کر برصغیر کے دوسرے حصوں میں بھی سرائیکی مرثیہ تواتر سے لکھا گیا۔ ان میں وہ شعراء کرام بھی شامل ہیں جن کا تعلق تو ملتان سے تھا مگر بعد ازاں وہ دوسرے علاقوں میں منتقل ہوئے۔ ایسے شعراء حضرات میں اٹھارویں صدی عیسوی کے سید ثابت علی شاہ ثابت ملتانی کا نام بہت اہم جو ملتان کے بعد سیہون شریف سندھ میں قیام پذیر ہوئے۔ اُس دور کے دیگر شعراء میں بیدل فقیر سندھی، ہادی بخش شاہ مسکین، ہمت علی رضوی، قائم فقیر اور مرزا قربان بیگ کے نام بھی سرائیکی ادب کی تاریخ میں احترام کے ساتھ رقم ہوئے جنہوں نے خطۂ ملتان کے سرائیکی مرثیہ کی روایات کو اندرون سندھ میں فروغ دیا۔

سرائیکی مرثیہ گوئی کی تاریخ کے اس اجمالی جائزے سے عیاں ہے کہ اس کی ابتدائی تاریخ پر لاعلمی کی پھیلا دی گئی تاریکی کے باوجود، سرائیکی شاعری کی یہ صنف، بعد کی صدیوں میں جس تب و تاب کے ساتھ سامنے

آئی اور اپنا آپ منوایا، وہی اس حقیقت کا ثبوت بھی ہے کہ خطہ ملتان اپنی ملی و مذہبی حساسیت کے سبب کبھی بھی غمِ حسینؑ سے غافل نہیں رہا اور اسے فارس و عرب سے بڑھ کر مذہبی تقدیس اور ملی توقیر کا باعث جانا۔ یہ وادیٔ سندھ ہی کا خاصہ ہے کہ اس نے مظلومین کربلا پر ڈھائے گئے مظالم سمیت دنیا کے کسی بھی خطے اور کسی بھی زمانے میں روا رکھے جانے والے جور و ستم، بربریت اور غاصبیت کو نہ صرف عملی و عقلی طور پر رد کیا ہے بلکہ ہر مظلوم کی ڈھارس، یکجہتی اور اس کے ردِعمل کو شعر و ادب سا مہذب اور شائستہ ذریعہ اظہار عطا کیا ہے۔ یہی اس دھرتی اور خطے کا زندہ وصف ہے کہ جسے صدیوں کی لوٹ کھسوٹ، حملہ آوری، قتلام، کالونی گیری اور غاصبیت کے باوجود نہ تو کوئی غاصب، حملہ آور اور سامراجی لٹیرا چھین سکا ہے اور نہ ہی چھین پائے گا۔

(سرائیکی ادب، افکار و جہات – حفیظ خان)



سید اولاد علی گیلانی

ملتان کی مساجد و مقابر اہلِ اسلام

روضہ حضرت غوث بہاؤ الحق زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا المعروف بہ بہاؤ الحق ملتانیؒ وجیہ الدین محمد بن کمال الدین علی شاہ قریشی کے فرزند تھے۔ 565ھ مطابق 70-1169ء میں آپ کی ولادت بمقام کوٹ کہروڑ ضلع مظفر گڑھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے سیہ پدری سر سے اُٹھ گیا۔ حضور نے جب ہوش سنبھالا تو تحصیل علم کی غرض سے ایران و توران تشریف لے گئے۔ وہاں تعلیم و تعلم اور ریاضت و مجاہدات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے فیضان روحانی حاصل کر کے جبہ خلافت پایا۔ آپ حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کے ہمعصر اور دوست تھے۔ شیخ فخر الدین عراقیؒ اور میر حسینیؒ آپ کے مریدین خاص میں سے تھے آپ کے فیضان روحانی، کشف و کرامات، تقدس، زہد و تقویٰ کا شہرہ دور دور تک پہنچا۔ آپ کے ہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا بڑے بڑے جید علماء یہاں آتے اور علوم شرعی کی گتھیاں سلجھا کر لے جاتے۔ مدرسہ کے علاوہ حضرت کے ہاں عظیم القدر لنگر خانہ بھی تھا جس میں خورد و نوش کی اشیا بکثرت مہیا رہتیں اور حضرت غوث کی دریا دلی مشہور عام تھی اور لاکھوں آپ کے فیض باطنی سے بہرہ یاب ہو کر سرفراز و کامران ہوئے۔ شیخ فخر الدین عراقیؒ صاحب تصانیف کثیرہ نے بھی مولتان حاضر ہو کر زانوئے ادب تہ کیا۔ علاوہ علوم ظاہری و شرعی عراقیؒ نے اپنے آپ کو اس چشمۂ روحانی و باطنی فیوض سے بھی مالا مال کیا۔ حضرت بہاؤ الحقؒ نے بھی اس جوہر قابل کی قدر کی اور اپنی لخت جگر کو ان کے حبالۂ عقد میں دے دیا۔ یہ مصدقہ اور دلاویز روایت ہے کہ عراقیؒ ملتان میں حاضر خدمت رہ کر مجاہدات دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چند دیگر مریدان نے حضرت غوثؒ سے عرض کیا کہ عراقی اکثر عشقیہ اشعار گنگنایا کرتے ہیں اور اوراد و وظائف کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ شیخ نے فرمایا ذرا مجھ کو بھی ان اشعار سے آگاہ کرو جو عراقیؒ کے وردِ زبان ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مریدین نے عراقیؒ کے اشعار جو وہ ترنم سے پڑھا کرتے تھے حضرت غوثؒ کو سنائے تو حضرت پر وجد طاری ہو گیا اور فرمایا عراقیؒ عارف باللہ ہے۔ "کارش بہ اتمام رسید" اشعار یہ ہیں۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
زچشمِ مستِ ساقی دام کردند

بگیتی ہر کجا دکرد و دمے لود
بہم کردند و عشقش نام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش
عراقی را چرا بدنام کردند

آج تک یہ شعر ارباب باطن کی مجلس سماع میں وجد کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ بعد ازاں حضرت غوثؒ نے عراقیؒ کو خرقہ خلافت اور جبہ و دستار عنایت کیا اور بیش از پیش انعامات روحانی سے مفتخر فرمایا۔

حضرت کی ایک مشہور کرامت زبان زد خلائق ہے کہ ''آپ نے اپنے تصرف روحانی سے دریائے چناب میں سے ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا دیا۔'' ملاح لوگ آج تک کشتی کھیتے وقت دم بہاؤ الحق کے نعرے لگاتے اور مصیبت کے وقت ان کی روحانی امداد طلب کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ 7 صفر 665ھ مطابق 7 نومبر 1266ء کو ایک ضعیف العمر نورانی شخص وارد ہوا اور اس نے ایک خط آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت شیخ صدر الدین صاحبؒ کے ہاتھ آپ کے پاس بھیجا۔ اس خط کو پڑھتے ہی آپ واصل بحق ہوئے اور چاروں کونوں سے یہ آواز آئی کہ ''دوست بہ دوست رسید''۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اپنا مقبرہ حضور نے خود تعمیر کرایا تھا۔ اس قسم کی عمارت کا صرف ایک اور نمونہ ہندوستان میں بمقام سونی پت موجود ہے۔ 1848ء کی جنگ کی وجہ سے یہ عمارت بھی بے حد خستہ ہو گئی تھی۔ 1850ء میں سرکار عالیہ سے درخواست کی گئی کہ مبلغ دس ہزار روپیہ اس روضہ کی مرمت کے واسطے منظور کیا جائے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر مخدوم شاہ علی محمود صاحب کی کوشش سے چندہ جمع ہوا اور ضروری مرمت کرائی گئی۔

اس روضہ میں حضرت غوثؒ کے مزار کے علاوہ حضور کی اولاد کی بہت سی قبریں بھی ہیں۔ آپ کے فرزند حضرت شیخ صدر الدین صاحب بھی اسی گنبد میں دفن ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت غوثؒ کثیر تعداد میں زر و نقد چھوڑ گئے تھے لیکن حضرت شیخ صدر الدینؒ نے یہ سب کا سب غربا میں تقسیم کر دیا اور فرمانے لگے کہ حضرت غوثؒ کی یہ شان تھی کہ وہ اس قدر دولت رکھتے ہوئے اس کا غلط استعمال نہ کرتے تھے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کسی وقت حرص و ہوا کے جال میں نہ پھنس جاؤں۔ حضرت شیخ صدر الدینؒ کا وصال 709ھ مطابق 1309ء میں ہوا۔

خانقاہ کے احاطہ میں نواب مظفر خان شہید طاب ثراہ اور ان کے صاحبزادہ شہنواز خان شہید کے مزار بھی ہیں۔ مخدوم شاہ محمود اور مخدوم بہاول بخش مرحوم و مغفور اور خاندان قریش کے دیگر معزز اراکین بھی یہیں دفن ہیں مقبرہ کی شرقی دیوار پر ایک کتبہ کندہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیر محمد سکنہ تھانیسر نے روضہ کی مرمت کرائی اور غربی دروازہ پر ایک اور دلچسپ کتبہ موجود ہے جس سے نواب علی محمد خان خاکوانی کے زمانے میں 63-1762ء کے قریب مال گزاری کی معافی کا ثبوت ملتا ہے۔ ڈیوڑھی کے باہر دروازے کی محراب پر بھی ایک کتبہ ہے۔

روضہ حضرت شاہ رکن عالم رحمتہ اللہ علیہ

قلعہ کے جنوب مغرب میں حضرت شاہ رکن عالمؒ کا عظیم الشان روضہ واقع ہے۔ آپ کا اصلی نام رکن الدین ابوالفتح ہے اور آپ حضرت غوث بہاؤالحقؒ کے پوتے ہیں۔ شاہان تعلق کے زمانے میں مذہبی و سیاسی لحاظ سے آپ بہت بڑی شخصیت کے مالک اور بڑے پایہ کے بزرگ تھے آپ کے زمانہ میں ابن بطوطہ مشہور سیاح ملتان سے گزرا۔ سلطان مبارک شاہ خلجی 1317ء میں حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ سے ناراض ہوگیا اور اس نے حضرت شاہ رکن عالمؒ کو دہلی میں طلب کیا کہ ان کی وجہ سے حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کا اثر و رسوخ کم ہو جائے۔ دہلی کے قریب پہنچ کر آپ نے حضرت شیخ سے ملاقات کی۔ پھر جب بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے دریافت کیا کہ دہلی میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلا شخص کون تھا جو آپ کی ملاقات کے لیے آیا۔ آپ نے جواب دیا کہ وہ شخص جو اس زمانے میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور اس کی ناراضی دور ہوگئی۔ آپ اپنے مریدوں کو ہمیشہ نیکی اور تقویٰ کی تعلیم دیا کرتے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے روز بدکار لوگ اپنے اعمال کی سزا میں مختلف شکلیں اختیار کر کے اٹھیں گے۔ یعنی دنیا دار چیتے کی شکل میں، شہوت پرست بکری کی شکل میں اور پیٹو سؤر کی شکل میں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر شخص کے اعمال زندگی مجسم بن کر سامنے آ جائیں گے۔ محمد تغلق کے زمانے میں جب قتل عام کا حکم ہوا تو آپ سر برہنہ دربار میں حاضر ہوئے اور آپ ہی کی برکت سے شہر والوں کی جان بخشی ہوئی۔

آپ کے روضۂ مبارک کی عمارت ہندوستان کی بہترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے یہ عظیم الشان عمارت مثمن شکل کی ہے۔ اس کا مرکزی قطر 51 فٹ 9 انچ لمبا ہے۔ ہر ایک زاویہ پر عمودی ستون کھڑے ہیں۔ اس سے اوپر کا حصہ میں ایک اور مثمن شکل کی عمارت استادہ ہے جس کا باہر کی طرف کا گھیر تقریباً 25 فٹ کا ہے اور اونچائی میں 26 فٹ ہے۔ اوپر کے گنبد کی بیرونی گولائی 58 فٹ ہے اور کل مقبرہ کی بلندی سو فٹ اور دو انچ ہے۔ چونکہ مقبرہ بہت بلندی پر واقع ہے اس لیے ارد گرد کی آبادی سے یہ کوئی ڈیڑھ سو فٹ کے قریب بلند ہے ملتان سے 12 یا 15 میل کے فاصلے سے یہ عمارت نظر آتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اصل میں یہ مقبرہ شاہ تغلق نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا بعد میں اس کے لڑکے محمد تغلق نے آپ کی نذر کر دیا۔ مقبرہ میں حضور کی اولاد کی سینکڑوں قبریں ہیں جو بعد میں یہاں دفن ہوتے رہے۔

حضرت غوث بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ و حضرت شاہ رکن عالم قدس سرۃ العزیزؒ کے مقبروں پر عقیدت مندان علاقہ اور زائرین سندھ کا اکثر ہجوم رہتا ہے زائرین سندھ ہمیشہ بڑی بڑی ٹولیوں میں پا پیادہ سارا سفر طے کر کے یہاں آتے ہیں اور دم بہاؤالحق کے فلک شگاف نعروں سے فضا کو معمور کرتے ہیں۔

روضہ حضرت شاہ گردیز قدہ سرہ

روضہ حضرت شاہ گردیز قدسرہ اندرن ہر کی بہترین عمارات میں سے ہے جو بوہڑ دروازہ کے اندر واقع ہے

اس عمارت میں روغنی اور چینی کاری کی اینٹوں کو نہایت خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ صحن میں سادات گردیز کی بے شمار قبریں ہیں۔ ایک امام باڑہ اور ایک مسجد زمانہ حال کی تعمیر ہے اور ایک جگہ حضرت امیر علیہ السلام کا نشان قدم بھی موجود ہے۔

آپ کا اصل نام محمد یوسف گردیزی ہے۔ اور آپ حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں آپ 450ھ مطابق 1058ء غزنی کے قریب موضع گردیز میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے دادا بغداد سے ہجرت کر کے تشریف لائے تھے۔ سلطان علاؤالدین بہرام شاہ غزنوی کے عہد میں آپ ہندوستان تشریف لائے اس وقت کے تاریخی حالات مفصل طور پر نہیں مل سکتے لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ سلطان مودود غزنوی نے 1042ء میں حملہ کیا تھا اس وقت ملتان شہر موجودہ شہر کے جنوب میں مائی پاک دامن کے مزار کے قریب آباد تھا اور حضرت یوسف گردیز نے جب راوی کنارے (موجودہ مقام مزار) پر آ کر اقامت اختیار کی تو شہر کے لوگوں نے ان کی دیکھا دیکھی ایک نئی آبادی یہاں بھی قائم کر لی۔ اس وقت دریائے راوی اس جگہ بہتا تھا اور اس بات کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ سادات گردیز کی ملکیت زیادہ تر محال راوی ہی میں واقع ہے۔

حضرت شیخ سید محمد یوسف کے زہد و اتقا اور کشف و کرامات سے متعلق بے حد روایات آج تک مشہور چلی آتی ہیں آپ نے خورد سالی ہی میں ریاضت و مجاہدہ اس کثرت سے کیا کہ عارف کامل ہو گئے۔ ذکر ہے کہ آپ کے دادا کے پاس ایک دفعہ چند مریدین نے حاضر ہو کر التماس کی کہ ان کا ایک لڑکا بیمار ہے اس کے لیے دعائے صحت فرمائیں آپ نے انکار کیا اور راضی برضائے الٰہی رہنے کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ وہ لڑکا مر گیا۔ ورثاء نے شور و شغب سے قیامت برپا کر دی۔ حضرت شیخ یوسفؒ کو رحم آیا۔ دعا فرمائی اور وہ لڑکا زندہ ہو گیا آپ کے دادا صاحب جن کا اسم گرامی شاہ علی تھا اس بات سے ناراض ہوئے اور آپ کو رخصت کر دیا۔ چنانچہ آپ وہاں سے ملتان تشریف لے آئے اور یہاں اقامت پذیر ہوئے۔ شیر کی سواری اور سانپ کا تازیانہ آپ کی ادنٰی کرامت تھی۔ چنانچہ پشت روضہ پر یہ بیت آج تک درج ہے۔

دانی سوار شیرہ در دست مار کرد

مخدوم شاہ یوسفؒ ایں جا قرار کرد

حضور کا وصال 12 ربیع الاول 531ھ میں ہوا ہے جس جگہ آپ عبادت کیا کرتے تھے اسی جگہ آپ کو دفن کیا گیا۔ روایت ہے کہ ایک شخص کسی دور دراز ملک سے حضور کا شہرہ سن کر بیعت کی نیت سے حاضر ہوا ملتان پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ حضرت وصال فرما گئے ہیں۔ بے حد غمگین اور مایوس ہو کر گریہ وزاری کرنے لگا۔ اُسی وقت قبر سے حضرت کا ہاتھ باہر نکلا اس شخص نے خوش ہو کر بیعت کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سلسلہ چالیس برس تک جاری رہا اور اب تک قبر میں اسی جگہ سوراخ موجود ہیں جہاں سے ہاتھ نکلا کرتا تھا۔ سجادہ نشینی کا سلسلہ نو پشت تک برابر جاری رہا۔ مخدوم محمد یوسف جو حضرت کی اولاد صلبی میں سے نویں پشت میں تھے اولاد نرینہ نہ رکھتے تھے اس لیے ان کی دختر کی

اولاد سے سلسلہ جانشینی شروع ہوا۔ موجودہ سجادہ نشین شیخ راجو صاحب ہیں جو نہایت منکسر المزاج اور نیک و بزرگ ہیں۔ خاندان گردیز میں بڑی بڑی قابل ہستیاں پیدا ہوئی جنہوں نے سرکار کی نمایاں خدمات ادا کیں ہیں۔ ان میں سے سید مراد شاہ گردیزی مرحوم۔ سید حامد شاہ گردیزی مرحوم قابل ذکر ہیں۔

کرامویل روڈ لندن کے نزدیک ایک عالیشان عمارت کے اندر آثار قدیمہ ہندوستان کے بہترین نمونے انڈین کارنر ہیں بالترتیب آراستہ ہیں۔ ان نمونوں میں حضرت شاہ گردیز علیہ الرحمتہ کے مقبرہ مبارک کے نمونے کو سب سے پہلی جگہ دی گئی ہے۔ اس نمونے میں روضۂ مبارک کی بیرونی دیواروں کے علاوہ سید مراد شاہ صاحب مرحوم گردیزی کی قبر معہ اشعار لوح بھی نمایاں طریق پر دکھائی گئی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملتان کی مشہور عمارات میں صرف اسی عمارت کا نمونہ وہاں موجود ہے۔

روضہ حضرت موسےٰ پاک شہید طاب ثراہ

حضرت موسےٰ پاک شہید قدس سرہ العزیز کا روضہ اقدس پاک دروازے کے اندر واقع ہے۔ آپ میراں محی الدین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی غوث اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں۔ گیارہویں پشت میں آپ کا شجرہ نسب حضرت پیران پیر سے ملتا ہے۔ آپ کے مورث اعلیٰ حضرت شیخ محمد غوث جیلانی والیت روم سے براستہ خراسان بمقام اوچ تشریف لائے اور یہاں قیام پذیر ہو گئے۔ آپ ولی کامل اور صاحب کرامت تھے چنانچہ دور دور تک شہرہ ہو گیا۔ سلطان قطب الدین لنگاہ بھی آپ کا مرید تھا۔ حضرت شیخ سید ابوالحسن موسےٰ پاک شہید رحمتہ اللہ علیہ 952ھ میں بمقام اوچ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور تدریس شرعی کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں جملہ علوم متداولہ میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ علم باطنی سے بھی بدرجہ کمال بہرہ اندوز ہوئے حضور کے والد ماجد آپ سے بے حد محبت کرتے چنانچہ اپنی زندگی ہی میں آپ نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا بعد میں بڑے بھائی سے گدی نشینی کے متعلق کچھ تنازعہ بھی ہوا۔ اور نوبت بادشاہ وقت تک جا پہنچی لیکن گدی نشینی آپ ہی کے حق میں برقرار رہی۔ حضور کے فیضان سے بڑے بڑے مشہور و معروف لوگ مستفیض ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کو بھی آپ ہی سے بیعت تھی۔ حضور 58 برس کی عمر میں قزاقوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ ملک میں طوائف الملو کی برپا ہونے کی وجہ سے عام طور پر بدامنی تھی۔ ایک دفعہ قزاقوں نے آپ کے مریدوں کی بستی پر حملہ کیا آپ نے یہ خبر پاتے ہیں فرمایا کہ میرا وقت قریب آ گیا اور فوراً ایک ہاتھی پر سوار ہو کر رہزنوں کا تعاقب کیا۔ رہزن فرار ہو گئے لیکن ایک شخص سلطان لنگاہ نامی نے حضور کے پہلو میں تیر مارا جس کے صدمہ سے آپ شہید ہو گئے۔ پہلے آپ کو اپنے والد کے قدموں میں دفن کیا گیا لیکن حضور کی اولاد کو عالم خواب میں ایما ہوا کہ تم نے قطب الاقطب کو میرے قدموں دفن کر دیا ہے جس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے چنانچہ آپ کے صاحبزادے نعش مبارک وہاں سے نکلوا کر ملتان کے قریب موضع منگے ہٹی میں دفن کی اور خود ملتان میں سکونت اختیار کی۔ پندرہ برس بعد

صاحبزادہ صاحب یعنی حضرت مخدوم حامد گنج کو خیال پیدا ہوا کہ نعش مبارک کو ملتان منتقل کر دیا جائے۔ نعش کو وہاں سے نکال کر ملتان لانے کا ارادہ کیا دیکھا تو صحیح سالم تھی۔ کسی قسم کا کوئی نقصان واقع نہ ہوا تھا صندوق دستیاب نہ ہو سکا اس لیے نعش مبارک کو گھوڑے پر سوار کر کے ملتان لائے۔ لوگ دیکھ کر بے حد متعجب اور معتقد ہوئے۔ القصہ حضور کے جسد اطہر کو اس روضۂ پاک میں دفن کیا گیا۔ سچ ہے

اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغِ مقبلاں ہرگز نمیرد

حضرت کے چار بیٹے تھے۔ اول سید حامد گنج بخش سجادہ نشین جو متصل روضہ مدفون ہیں۔ دوم سید یحییٰ نواب ملتان جن کا روضہ مابین پاک دروازہ و حرم دروازہ واقع ہے۔ سوم سید عیسےٰ جن کا روزہ حرم دروازہ پر ہے اور عوام الناس انہیں پیر عنایت ولایت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چہارم سید جان محمد ان کا مزار دہلی میں ہے۔ حضرت کے مریدین بلخ بخارا ایران توران افغانستان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلے خانقاہ کے ساتھ جاگیر بھی تھی۔ لیکن سکھوں کے زمانے میں ضبط ہو گئی۔ صرف موضع حافظ والہ تحصیل شجاع آباد میں کچھ معافی ہے۔

خانقاہ حضرت شہ دانا شہید المعروف بہ شاہد شہید رحمتہ اللہ علیہ

یہ خانقاہ عمارت پختہ شہر ملتان میں اندرون دہلی دروازہ واقع ہے۔ یہ عمارت کسی شہزادہ نے بنوائی تھی لیکن یہ تحقیق نہیں کہ اس کا نام کیا تھا۔ روایت ہے کہ ان کی والدہ نے حضرت غوث شاہ بہاؤ الحق زکریا ملتانیؒ کی ذات مبارک پر وہی بہتان لگایا جو زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر لگایا تھا۔ قاضی وقت نے صفائی طلب کی تو آپ نے فرمایا میرا گواہ تو کوئی نہیں ہے۔ البتہ اس عورت کا دس مہینے کا بچہ پنگوڑے میں کھیل رہا ہے اس سے دریافت کیا جائے تو شاید اللہ تعالیٰ ایک بے گناہ کی یاوری کرے۔ اور بچہ چشم دید بیان دے سکے۔ بچہ حاضر کیا گیا اور حضرت شاہ دانا نے اعلی الاعلان کہا کہ میری والدہ جھوٹی ہے اور ناحق بہتان لگا رہی ہے۔ والدہ نے غصہ میں آ کر آپ کو زمین پر دے مارا اور آپ شہید ہو گئے لیکن بعد میں حضرت غوث کی دعا سے زندہ ہوئے اور دم آخر تک حضور ہی کی صحبت میں رہے۔ آپ صاحب کرامت ولی ہیں چنانچہ عام مثل مشہور ہے کہ ''اندر غوث بہاؤ الحق باہر قطب فرید۔ جے توں بہت اُتاولی منگ شاہد شہید''

یعنی اندر غوث بہاؤ الحق کارفرما ہیں اور باہر حضرت بابا فرید۔ اگر تجھے جلدی کا کام پڑ جائے تو حضرت شاہد شہید کی روح پاک سے فیض مانگ۔

روضہ حضرت شمس تبریز صاحب رحمتہ اللہ علیہ

آپ کا نام شمس الدین ہے۔ اصل میں سادات سبزوار سے ہیں۔ غلطی سے تبریزی مشہور ہو گئے۔ عوام ان کو حضرت شمس تبریزیؒ کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو حضرت مولانا جلال الدین رومی صاحب مثنوی شریف کے پیر

تھے۔ یہ بالکل غلط ہے ان کا تعلق تو فرقہ باطنیہ سے تھا۔ آپ کے والد ماجد حضرت شاہ صلاح بن شاہ مومن سادات حسینی میں سے ہیں اور حضرت اسماعیل فرزند حضرت جعفر صادق علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ حضرت عبدالہادی غزنوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ریاضت و مجاہدہ کر کے ولی کامل بنے۔ آپ کی دعا سے خاندان غزنوی کا ایک شہزادہ دوبارہ زندہ ہوا۔ ملتان کی گرمی اور شدت تپش آپ کو آپ کی بددعا سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی بابت کئی روایتیں مشہور ہیں جو زبان زد خلائق ہیں۔ موجودہ روزہ کی تعمیر تین سو برس سے زیادہ کی معلوم نہیں ہوتی پہلی عمارت غالباً حوادث زمانہ سے گر گئی ہوگی۔ اس مزار پر بموقع عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، آخری چہار شنبہ و شب برات کے بعد پہلے جمعہ کو بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ آپ کی اولاد میں بڑے بڑے ولی گزرے ہیں۔ آپ حضرت غوث بہاؤ الحق زکریا ملتانیؒ کے ہمعصر بتائے جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ جب آپ ملتان تشریف لائے تو حضرت غوثؒ نے ایک پیالہ دودھ سے بھرا ہوا آپ کی خدمت میں بھیجا جس سے مراد یہ تھی کہ یہ شہر تو پہلے ہی سے اہل اللہ سے پُر ہے اس میں کسی صاحب باطن کے لیے مزید گنجائش کہاں؟ آپ نے اس پیالے میں گلاب کے پھول کی پتی ڈال دی جس سے مراد یہ تھی کہ گنجائش تو ہو سکتی ہے۔ حضرت غوثؒ اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور ان کی شان کے مطابق اُن کی خاطر و مدارات کی۔

روضہ مخدوم شاہ علی محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ

یہ مقبرہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں دریائے چناب کے کنارے بمقام شیر شاہ نہایت بلند اور بعمارت پختہ تعمیر ہوا۔ دریا میں طوفان آنے کی وجہ سے اب گر چکا ہے اور حضرت کا تابوت مبارک چاہ شریفاں والا نزد شیر شاہ دوبارہ دفن کیا گیا۔ جن لوگوں نے دوبارہ زیارت کی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ نعش مبارک حضرت کی بالکل صحیح و سالم موجود تھی۔ حضرت شاہ علی محمد صاحب الملقب بہ شیر شاہ رحمتہ اللہ علیہ 950ھ میں مشہد مقدس سے یہاں تشریف لائے۔ حضرت مخدوم سید محمد غوث بندگی گیلانی اوچویؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مرشد کی اجازت سے بارہ سال متواتر چاہ شیر شاہ پر لب دریا ریاضت و مجاہدہ کیا۔ اس چاہ کا نام اب تک چاہ چلہ والا مشہور ہے۔ آپ سے بے شمار کرامتیں ظہور میں آئیں چنانچہ آپ کے مریدین کی تعداد لاکھوں تک پہنچی۔ روایت ہے کہ آپ کی عادت تھی کہ ہر روز بعد مغرب چالیس فقرا کے پاؤں دبایا کرتے تھے۔ ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ کل 39 فقیر آپ کو ملے۔ اپنی عادت کو پورا کرنے کے واسطے ایک کتے کے پاؤں دبانے شروع کر دیئے اور فارغ ہونے کے بعد آپ اپنی جائے قیام پر واپس تشریف لے آئے اس شب ایک مرد غیب سے نمودار ہوا اس کے ایک ہاتھ میں چاولوں کی رکابی اور دوسرے میں پانی کی تھیلیاں تھی۔ دونوں چیزیں پیش کر کے اس نے کہا کہ آپ کا چلہ بارگاہ ایزدی میں مقبول و منظور ہو چکا ہے اور یہ طعام بہشت سے بھیجا گیا ہے آپ تناول فرمائیں۔ آپ نے کچھ کھا کر دوگانہ شکرانہ ادا کیا۔ اس مرد خدا نے مٹھی بھر روپے پیش کر کے کہا کہ اس میں سے جس قدر آپ کا دل چاہے اٹھا لیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے مال دنیا سے غرض نہیں۔ مجھے اس کی کیا ضرورت ہے باصرار تمام آپ نے پندرہ روپے اٹھائے۔ اس شخص نے کہا کہ جب تک آپ

کی نسل قائم رہے گی یہ روزانہ ان کو ملتا رہے گا۔ پھر وہ شخص غائب ہو گیا۔

حضرت کے چھ فرزند تھے حاجی محمد شریف، شاہ شیر محمد، شاہ سلطان، شاہ محمود، شاہ عبدالرسول شاہ۔ ان میں سے صرف شاہ شیر محمد صاحبِ اولاد ہوئے۔ ماہ چیت میں یہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے اس موقع پر ہزارہا مخلوق جمع ہوتی ہے۔ خانقاہ شریف کی جگیر کے علاوہ جائیداد زرعی زرخرید تقریباً 28 ہزار بیگھ ہے جو حضرت کی اولاد کی ملکیت ہے۔

خانقاہ حضرت سخی شاہ حبیب رحمۃ اللہ علیہ

یہ خانقاہ بیرون دولت دروازہ ملتان واقع ہے۔ عمارت نہایت پختہ اور خوش نما ہے۔ بیان کیا جاتا ہے اصل میں یہ شاہ جہان بادشاہ کے بیٹے سلطان شجاع نامی کا مزار ہے جو تارک دنیا ہو کر شاہ حبیب کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کا فیضان عام تھا اور بہت لوگوں نے جبۂ خلافت حضور سے پایا۔ شاہ چراغ صاحب پنڈی والے۔ شوق الٰہی والہ بہاولپور اور فقیران رسول شاہی جو لاہور میں مقیم ہیں آپ کے مریدوں میں سے ہیں۔ چاروں عیدوں کے موقع پر جمعہ کے روز یہاں خوب میلہ لگتا تھا۔ ایک باغ جو خانقاہ میں موجود ہے اور دو چاہات سرکار سے معاف ہیں اور مبلغ 12 روپیہ سالانہ سرکار سے بطور تیل چراغ ملتا ہے۔

خانقاہ حضرت حافظ محمد جمال صاحب رحمۃ اللہ علیہ

یہ خانقاہ بیرون شہر متصل عام خاص باغ واقعہ ہے۔ عمارت پختہ اور نہایت خوشنما ہے۔ نواب احمد یار خان صاحب خاکوانی نے بصرف کثیر اس خانقاہ کی مرمت و توسیع کرائی ہے۔ حافظ صاحبؒ باشندہ ملتان اور حضرت خواجہ نور محمد صاحب چشتی نظامی کے خلیفہ اعظم تھے۔ آپ صاحب رش و کرامت ہیں۔ آپ کے خلفا میں سے بڑی بڑی پاکیزہ ہستیاں ہوئیں۔ جن میں حضرت خواجہ خدا بخش ملتانی، حضرت قاضی عیسےٰ صاحب خانپوری، منشی غلام حسن خان صاحب شہید جن کا مزار محلہ آغا پورہ میں ہے۔ میاں محمد حسین صاحب اور مولوی موسےٰ پاک صاحب رحمۃ اللہ علیہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ باطنی حاکم ملتان حضرت حافظ صاحب مریدان خاص میں سے ہوا کرتا ہے۔ تغیر و تبدل حکومت اس وقت تک نہ ہوتا تھا جب تک وہ حاکم وصال نہ پائے۔ چنانچہ جب سرکار انگریزی نے ملتان فتح کیا منشی غلام حسن زندہ تھے شہر فتح نہ ہوتا تھا ایک انگریز سپاہی نے منشی صاحب موصوف کو بندوق سے شہید کر دیا دوسرے روز شہر فتح ہو گیا۔ شہادت کے وقت حضرت منشی صاحب شہید کی زبان مبارک پر یہ شعر تھا۔

سرور قدمِ یار فدا شد چہ بجا شد
ایں بار گراں بود ادا شد چہ بجا شد

سال میں ایک دفعہ حضرت کا عرس ہوتا ہے اور مریدان صادق کا کافی مجمع ہو جاتا ہے۔

روضہ حضرت عبدالرشید حقانی رحمۃ اللہ علیہ واقعہ موضع مخدوم رشید تحصیل ملتان

حضرت مخدوم رشید حقانیؒ قادری سلسلہ کے زبردست بزرگ ہیں آپ حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کے عم

زاد بھائی ہیں۔ تاریخ پیدائش تصدیق نہیں ہو سکی۔ البتہ وصال کی تاریخ 669ھ معلوم ہوئی ہے آپ میراں سید علی کے خلیفہ ہیں تین سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ اور انہی کے حکم سے ملتان سے جانب شرق آ کر قیام کیا۔ اور اس مقام کا نام آپ کے نام سے مشہور ہوا۔ آپ نے چار شادیاں کیں۔ اول ہمشیرہ غوث بہاؤالحق سے دوم شاہ تغلق کی لڑکی سے۔ اس کے متعلق روایت ہیکہ بادشاہ کو کھانے میں رکرم نظر آتے تھے حضور کی دعا سے عارضہ دور ہوا۔ بادشاہ نے ازراہِ عقیدت اپنی لڑکی عقد میں دی تیسری شادی رائے لُونا کی دختر سے ہوئی۔ چوتھی شادی قوم مڑل میں ہوئی۔ آپ کے چار بیٹے صاحب ولایت ہوئے۔ مخدوم ابوبکر، مخدوم محمد، مخدوم حسن، مخدوم ایوب شاہ صدر قتال۔ حضرت ایوب قتالؒ کی خانقاہ دنیا پور سے جانب شرق تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے اور وہاں بھی بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ مخدوم حسنؒ کی خانقاہ کہروڑ میں ہے۔ حضرت مخدوم رشیدؒ نے ایک چاہ لگوایا تھا۔ اس کے متعلق آپ کی دعا ہے کہ جو شخص اس کا پانی پیئے گا وہ شفایاب ہوگا۔ چنانچہ یہ کنواں سال بھر بند پڑا رہتا ہے۔ ایام عرس میں جاری کیا جاتا ہے ہزارہا لوگ اس پر آ کر نہاتے ہیں اور شفا پاتے ہیں۔ ماہ اساڑھ میں میلہ ہوتا ہے۔ اور زائرین کا سلسلہ آمد و رفت جاری رہتا ہے۔ عرس کے موقع پر چڑھاوا بہت زیادہ چڑھتا ہے اس آمد سے سرکاری انتظام کے تحت ایک فنڈ قائم ہے جو تعمیر روضہ و دیگر عمارات متعلقہ پر خرچ ہوتا ہے۔ پہلے حضور کا مزار خام تھا اب آپ کے اپنے تصرف ہی سے ایک نہایت عالیشان قابل دید روضہ تعمیر ہو چکا ہے۔ روضہ مبارک کے ساتھ ایک عالیشان مسجد بھی زیر تعمیر ہے۔ حضور کی اولاد کثیر تعداد میں موضع مخدوم رشید میں آباد ہے۔

روضہ سرور شکوٹؒ تحصیل ملتان

یہ روضہ ملتان بستی ملوک کی سڑک پر موضع لاڑ کے قریب موضع شکوٹ میں واقع ہے۔ اصل میں لفظ شہ کوٹ ہے۔ غلطی سے شکوٹ مشہور ہو گیا۔ صاحب مزار کا نام سید زید العابدین ہے جو حضرت سخی سرور سلطان کے والد ہیں روضہ کے جانب شمال ان کی اہلیہ حضرت بی بی عائشہ کا مزار ہے۔ اور شمال مشرق میں آپ کے فرزند کلاں سید محمود مدفون ہیں۔ تمام عمارت پختہ اور خوشنما ہے۔ ایک کھتری درگاہ نامی سکنہ لاہور نے یہ روزہ ایک لاکھ روپے کی لاگت سے بنوایا تھا۔ چھت میں صندل کے شہتیر لگے ہوئے ہیں۔ ماہ ہاڑ میں میلہ لگتا ہے اور "دوابے سے سنگ" یعنی جماعت مریدان آتی ہے۔

آپ حسینی سید ہیں۔ اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہیں لیکن فیض روحانی آپ کو حضرت پیرانِ پیر سے ہوا۔ اپنے پیر کے حکم سے اس جگہ آ کر آباد ہوئے۔ آپ کے دولڑکے اپنی دوسری بیوی بی بی عائشہ کے بطن سے ہوئے۔ یہ پاکدامنہ میر لاڑ حاکم علاقہ کی دختر تھیں۔ دونوں لڑکے یعنی حضرت سید احمد سخی سرورؒ اور سید عبدالغنی ولی کامل ہوئے۔

آپ کی خانقاہ پر تیل اور چھوٹے چھوٹے تکیوں کا چڑھاوا چڑھتا ہے کئی من تیل ہر وقت موجود رہتا ہے اور

چھوٹے چھوٹے تکیئے زربفت بادلہ گوٹہ کناری سے منقش آپ کے مزار پر لٹک رہے ہیں۔ مزار پر حاضر ہونے سے خاص کیفیت اور لذتِ روحانی حاصل ہوتی ہے۔ مزار شریف پر مجاورین موجود ہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی اولاد میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔

مزار شریف کے نواح میں تین قدیم آبادیوں کا پتہ چلتا ہے۔ غالباً انہی آبادیوں کو سہ کوٹ کہتے تھے جو بعد میں تباہ ہوئے۔ ان کھنڈرات میں سے اب بھی (بارش وغیرہ ہو جانے کے بعد) پرانے سکے ملتے ہیں اور دیگر اشیا بھی برآمد ہوتی ہیں۔

خانقاہ حضرت پیر سلطان احمد قتالؒ واقعہ جلالپور پیروالہ تحصیل شجاعباد ضلع ملتان

آپ حضرت پیر سید جلال حسنی اوچوی قدس سرۃ العزیز کی اولاد میں سے ہیں آپ مقام اوچ 929ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی حضرت سید علم الدین شاہ تھا۔ آپ ولی مادر زاد تھے۔ ابتداء ہی سے صاحب کرامت تھے۔ بچپن کے زمانہ کا ذکر ہے کہ خادم خانقاہ نے تادیباً آپ کو تھپٹر مارا اس کا ہاتھ خشک ہو گیا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد آپ گھر سے نکلے اور فقرا کی صحبت میں رہ کر ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے 970ھ میں بمقام کہروڑ آپ نے حضرت پیر علی سرور کے ہاتھ پر بیعت کی اور خدمت مرشد میں کچھ عرصہ حاضر رہے ایک دفعہ آپ کے پیر سو رہے تھے کہ چڑیوں نے جمع ہو کر غل مچانا شروع کر دیا آپ نے یہ سمجھا کہ چڑیوں کے چوں چوں آپ کے مرشد کے آرام میں مخل ہے حکم دیا کہ چڑیو! مر جاؤ۔ اس ارشاد سے سب چڑیاں مر گئیں۔ جب حضرت پیر صاحب بیدار ہوئے تو آپ نے یہ ماجرا دیکھ کر فرمایا کہ تم قتال ہو۔ اس دن سے آپ کا لقب قتال مشہور ہوا۔ زیارت بغداد شریف، کربلا معلیٰ و بخارا شریف اور حجاز مقدس واپس ملتان تشریف لائے یہاں پہنچ کر حضرت شاہ رکن عالم کے مزار پر چلہ کشی کی پھر اطراف نیلی بار میں جا کر جنگلی اقوام لکھویرہ اور سلدیرہ کو مسلمان کیا۔ 990ھ میں بمقام جلال پور اقامت پذیر ہوئے یہاں آپ کے زہد و تقویٰ کا شہرہ دور دور تک پہنچا اور لاکھوں آدمیوں نے آپ کی بیعت اختیار کی۔ آپ کی کئی کرامتیں مشہور ہیں۔ ایک دفعہ ایک بنیا مر گیا۔ اس سے آپ کا کچھ حساب کتاب تھا جب لاش سامنے سے گزری تو فرمانے لگے کہ لالہ ہمارا حساب تو کرتے جاؤ۔ وہ بنیا فوراً زندہ ہو گیا اور حساب سمجھا کر پھر مر گیا۔ 1041ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ پہلے مزار مبارک کچا تھا بعد میں حضرت کی اولاد نے بصرف کثیر پختہ بنوایا۔ ماہ چیت کے ہر جمعہ کو یہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ ہزار ہا معتقدین اور مریدین جمع ہو جاتے ہیں۔ اس خاندان کے مرید اضلاع ملتان، شاہ پور اور مظفر گڑھ میں بہت ہیں۔

روضہ حضرت شاہ ابوبکر وراقؒ واقعہ موضع دہلو تحصیل میلسی ضلع ملتان

آپ کا لقب تاج العارفین ہے اور آپ سلسلہ چشتیہ کے زبردست بزرگ ہیں بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ آپ سلطان الہند غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری ثم اجمیری قدس سرہ العزیز کے پیر بھائی اور

حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کے خلیفہ ہیں۔ ابتدا اول آپ کا قیام اجمیر شریف کے قریب موضع تارا گڑھ کے قریب تھا۔ وہاں ایک مرید کی امداد کے لیے آپ نے نیلے گھوڑے پر سوار ہو کر کفار کے مقابلہ کے لیے جہاد کے لیے نکلے لڑائی میں آپ شہید ہو گئے۔ سر آپ کا وہیں رہا اور آپ میدان جنگ سے نکل کھڑے ہوئے موضع دہلو میں ایک شخص ضعیف العمر امام الدین مہتمم رہتا تھا اس کے مکان کے سامنے گھوڑا آ کر کھڑا ہو گیا اور امام دین کا نام پکار کر آپ نے اسے باہر بلایا۔ اس نے باہر آ کر جو دیکھا تو صرف دھڑ کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر ڈر گیا۔ آواز آئی کہ ڈرومت تم فوراً فلاں جگہ جا کر ہمارا سر اٹھا لاؤ۔ میدان میں ہر ایک سر کے اوپر ایک ایک چراغ جل رہا ہوگا۔ لیکن جس سر پر چار چراغ جل رہے ہوں وہ ہمارا ہے۔ اسے اٹھا لاؤ۔ تم بے اولاد ہو تمہارے گھر میں بے حد اولاد ہوگی۔ چنانچہ امام دین تعمیل ارشاد میں روانہ ہوا اور حضور ہی کے تصرت سے بہت جلد سر مبارک لے کر واپس آ گیا۔ اور اس جگہ آپ کو دفن کیا۔ امام الدین مذکور باوجود ضعیف العمری کے کثیر الاولاد ہوا۔ اُسی کی اولاد روضۂ مبارک پر مجاوری کے فرائض ادا کرتی ہے۔ شروع ماہ ماگھ سے ہر شنبہ کو یہاں میلہ لگتا ہے اور ماہ چیت کے آخری شنبہ کو سالانہ عرس ہوتا ہے جس میں دس بارہ ہزار آدمیوں کا مجمع ہو جاتا ہے۔ روضہ مبارک شہنشاہ عالمگیر نے 1106ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ پہلی منزل کی چھت کار چوبی کی ہے اور دوسری منزل گلی ہے۔

حضرت کے لقب وراق کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ کے پیر صحبت ہر زائر کو ایک ورق آپ کو لکھ کر دیا کرتے تھے کہ اسے دریا میں ڈال آؤ اور جو ورق وہاں سے ملا کرے اوہ لے آیا کرو۔ چنانچہ آپ روز جاتے اور ورق ڈالتے۔ دریا سے ہاتھ نکلتا جو ورق لے لیتا اور دوسرا دے دیتا۔ اس ورق کو پڑھنے کی آپ کو اجازت نہ تھی اور نہ آپ پڑھتے۔ ابتداء میں جب آپ ریاضت مجاہدہ کیا کرتے تھے تو آپ کو حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت کا بہت شوق تھا۔ بعد میں اپنے پیر کی صحبت کی وجہ سے یہ خیال دور ہو گیا اور عالم محویت میں شوق نہ رہا۔ کئی سال بعد اپنے حجرے میں عبادت کر رہے تھے کہ ایک سفید ریش بزرگ آپ سے ملنے آئے انہوں نے دریافت کیا کہ تمہیں کوئی ہوس ہے آپ نے فرمایا کہ مجھے سوائے شوقِ خدا کے اور کوئی ہوس نہیں پہلے شوق حضرت خضر سے ملنے کا تھا لیکن اس کا صرف دھندلا سا خیال باقی ہے۔ مرد سفید ریش نے فرمایا کہ خضر میں ہوں۔ میں تمہاری یہ ہوس پورا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ لیکن یاد رکھو اللہ بس باقی ہوس۔ اس روز سے آپ پورے طور پر عزلت گزیں ہو کر درجہ کمال پر پہنچے۔

خانقاہ حضرت دیوان چاولی مشائخ واقع موضع وچالی مشائخ تحصیل میلسی

مقابر اہل اسلام میں سے یہ عمارت نہایت قدیم زمانے کی ہے۔ ایک مسجد کہنہ شکستہ جانب شمال ہے جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ محمود غزنوی نے تعمیر کرائی تھی۔ دوسری مسجد جانب مشرق ہے جو عہد جہانگیر میں بادشاہ کے حکم سے تعمیر ہوئی۔ روضہ میں حضرت دیوان صاحب اور ان کی ہمشیرہ کنگن برس کے مزار ہیں۔ روضہ کے باہر بھی چند مقامات ہیں جو قابل ذکر ہیں یعنی روضہ سید شکور شاہ وزیر دیوان صاحب۔ درخت جال جس پر دیوان صاحب نے

شکل شیر میں ظاہر ہو کر پنجے مارے۔ دھرم سالہ گورونانک صاحب جو اُن کی چلہ کشی کی یادگار میں یہاں تعمیر ہوا۔ چاہ باوا فرید جس میں حضرت باوا فرید شکر گنج علیہ الرحمتہ نے بارہ برس تک ریاضت وعبادت کی۔ مزارات پسران حضرت بابا صاحب۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آپ راجہ ہسپال کے سب سے چھوٹے لڑکے ہیں۔ آپ کا نام رائے چاولہ تھا۔ راجہ ہسپال کا مورث اعلیٰ رائے لکھمن قوم راجپوت ڈھوڈہی کا سردار تھا اور اس نواح میں اس کی حکومت تھی۔ چنانچہ موضع کنگن پور رائے چاولہ کی ہمشیرہ کے نام سے آباد ہوا۔ رائے چاولہ کا ابتدائے طفولیت ہی سے اسلام کی طرف رجحان تھا۔ اور بعالم باطن فیضان پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فیضیاب ہو کر درجۂ ولایت تک پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ آپ نے اسلام قبول کرلیا اور آپ کی ہمشیرہ بھی اس نعمت سے متمتع ہوئیں۔ دیوان صاحب کے دوسرے بھائیوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری انہوں نے موقع پا کر حضور کو شہید کر ڈالا۔ لیکن بعد میں پشیمان ہو کر سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ روضہ مبارک محمود غزنوی نے تصرف پچاس ہزار روپیہ سے تعمیر کیا اور چند گاؤں جاگیریں بھی دیئے جہانگیر بادشاہ نے اپنے عہد میں روضہ کی مرمت کرائی۔ پھر دیوان مولراج نے مبلغ ایک ہزار روپیہ دیا اور مریدین نے باقی روپیہ جمع کر کے بائیس ہزار روپے کی لاگت سے موجودہ عمارت از سرنو بنوائی۔ ایک گاؤں معافی سرکار میں ہے اور آپ کے مرید میاں چھتہ نامی کی اولاد مجاوری کرتی ہے اواخر رمضان میں یہاں عرس ہوتا ہے اس وقت ہزارہا آدمیوں کا مجمع ہو جاتا ہے۔

آپ کے مزار پُرانوار پر بڑے بڑے صاحب کمال بزرگ یعنی حضرت باوا فرید شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ حضرت شیر شاہ سید جلال بخاری رحمتہ اللہ علیہ، حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت جتی لال شہباز قلندر رحمتہ اللہ علیہ حاضر ہو کر کسب فیضان کرتے رہے ہیں اور اب تک یہ مقام مرجع خاص وعام ہے۔

خانقاہ حضرت پیر برہان صاحب رحمتہ اللہ علیہ واقعہ کہروڑ

یہ خانقاہ قصبہ کہروڑ سے جانب مشرق بفاصلہ نیم میل ہے۔ مغلیہ خاندان کے زمانے میں آپ کہروڑ کے حاکم تھے آپ فقیر دوست تھے۔ جمع سرکار وصول کر کے برابر خرچ کرتے رہے۔ آخر جب دربار دہلی سے مطالبہ ادائیگی کا ہوا تو ٹھیکریاں بھروا کر بھیج دیں۔ وہاں کھولنے پر اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ ہندو مسلمان بچوں کے بال اس خانقاہ پر اتروائے جاتے ہیں۔ عیدین کے موقع پر میلہ بھی لگتا ہے۔

خانقاہ علی سرور صاحب رحمتہ اللہ علیہ واقعہ کہروڑ

یہ روضہ بہت اونچا ہے اور دو تین میل کے فاصلے سے نظر آتا ہے۔ 600ھ میں آپ دہلی سے کہروڑ تشریف لائے آپ سید ہیں لیکن خاندان افغانان میں شادی ہوئی اس لیے سجادہ نشینی پٹھانوں کو ملی۔ آپ نے چھ حج کئے ہیں حضرت لعل فریدؒ خلیفہ حضرت غوث الاعظم محبوب سبحانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی آپ ولی کامل تھے۔ ابتدا میں کچھ

عرصہ ملتان میں قیام فرمایا۔ بعد میں کہروڑ میں اقامت اختیار کی اور یہیں وصال ہوا۔ آپ نے تین نکاح کئے۔ پہلی زوجہ سے جو اولاد ہوئی وہ موضع سکندر پور تحصیل لودھراں میں آباد ہے۔ دوسری زوجہ کی اولاد کا سلسلہ آگے نہ چلا۔ تیسری زوجہ قوم پٹھان سے تھی اس کی اولاد اب تک قصبہ کہروڑ میں موجود ہے۔

خانقاہ حضرت پیر جیون سلطانؒ واقعہ موضع ریڑ تحصیل لودھراں

آپ قوم مہار سے ہیں اور حضرت پیر شیر شاہ مخدوم سید علی محمد صاحب شیر شاہیؒ کے خلیفہ ہیں کہروڑ کی جانب لودھراں کوئی چھ میل کے فاصلہ پر آپ کا مزار ہے جہاں ہر سال ماہ اپریل میں بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ آپ کو اپنے پیر کی عنایت سے لقب سلطان عطا ہوا۔ آپ صاحب کرامت ولی تھے۔ شاہجہان بادشاہ آپ کا بے حد معتقد تھا۔ آپ کے نام پر بادشاہ نے نالہ سلطان واہ کھدوایا۔

خانقاہ حضرت سلطان ایوب قتالؒ

آپ کا مزار مبارک دنیا پور کے نزدیک جنگل سرکار میں واقعہ ہے آپ حضرت مخدوم رشید حقانیؒ کے پوتے ہیں اپنے دادا صاحب کے حکم سے دریا کے کنارے مویشی چرایا کرتے تھے۔ وہاں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور کشف روحانی حاصل ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کی بددعا سے ایک گاؤں جس کا نام منوری تھا غرق ہوا۔ آپ منوری سے یہاں تشریف لے آئے اور یہیں 766ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ 22 چیت کو ہر سال میلہ لگتا ہے اور سات آٹھ روز رہتا ہے۔ پانی کی یہاں قلت تھی۔ اب نہر کی وجہ سے آرام ہو گیا ہے۔ پہلے عرس کے موقع پر پانی دنیا پور سے جایا کرتا تھا عرس کے موقع پر آٹھ دس ہزار آدمیوں کا مجمع ہو جاتا ہے۔

خانقاہ حضرت شاہ حبیب رحمتہ اللہ علیہ واقعہ بغداد تحصیل خانیوال

حضرت پیر شاہ حبیب صاحبؒ گیلانی سید ہیں اور حضرت پیر عبدالرزاق صاحب رحمتہ اللہ علیہ خلف الصدق حضرت پیرانِ غوث الاعظم محبوب سبحانی شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی اولاد میں سے ہیں آپ کے والد ماجد سید فتح اللہ شاہ صاحب بغداد شریف میں بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کی پیدائش بھی بغداد شریف میں ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں تحصیل علوم متداولہ سے فارغ ہو کر چلہ کشی میں مصروف و مشغول ہوئے۔ اس کے بعد حضرت پیرانِ پیر کی جانب سے ارشاد ہوا کہ تم ملک پنجاب میں سدہ نے کے قریب جا کر سکونت اختیار کرو اور وہاں موضع بغداد آباد کرو۔ آپ نے یہاں پہنچ کر پھر بارہ برس تک عبادت اور چلہ کشی میں گزارے۔ آپ کی بے انداز کرامتیں مشہور ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ شاہجہان بادشاہ کو چارپائی سمیت عالم خواب میں بلوا منگوایا اور ایک غریب سوداگر کی دادرسی کرائی جس کا کچھ روپیہ بادشاہ پر واجب تھا اور افسر خزانہ کی شرارت کی وجہ سے ادا نہ ہوا تھا۔ موضع بغداد دربار مغلیہ سے بطور جاگیر عطا ہوا اور معافیاں بھی تھیں۔ جو سب نوابوں کے عہد میں ضبط ہو گئیں۔ ماہ ساون میں یہاں بہت بڑا بھاری میلہ لگتا ہے جس میں ہزارہا نفوس کا مجمع ہو جاتا ہے۔ یہ میلہ برابر آٹھ روز تک جاری رہتا ہے۔

خانقاہ حضرت میاں عبدالحکیم صاحبؒ واقع عبدالحکیم تحصیل کبیر والہ

آپ مادرزاد ولی باکرامت تھے۔ آپ کے والد غلام علی پارچہ شوئی کا کام کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں حاجی رحمت اللہ صاحب اپنے زمانے کے ولی تھے۔ اُن کے پارچات شیخ غلام علی دھویا کرتے تھے۔ جب یہ کپڑے دھو کر لے جاتے تو حاجی صاحب اٹھ کر تعظیم دیتے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اس شخص کی پشت سے ایک قطب پیدا ہوگا۔ اس لیے تعظیم بجالاتا ہوں۔ آپ کی ولادت کے وقت چند حاجی وگ مکان پر آئے اور انہوں نے ایک لوٹا، ایک جائے نماز اور ایک تسبیح پیش کی کہ بموجب بشارت یہ چیزیں وہ آپ کے واسطے مکہ سے بطور تحفہ لائے تھے۔ جب آپ نے ہوش سنبھالا عبادت اور ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ سوائے عبادت کے اور کچھ کام نہ تھا۔ لوگ غلام علی بچارے کو تنگ کرتے کہ تم کپڑے وقت پر نہیں دیتے۔ ایک دفعہ زیادہ دق ہونے پر اس نے لوگوں کے سامنے معذرت کی کہ کیا کروں مجبور ہوں، اکیلا آدمی ہوں اور ضعیف ہو گیا ہوں۔ ایک لڑکا تھا سو وہ بھی کام کا نہ نکلا۔ تب آپ نے پوچھا کتنا کام باقی ہے اور کیا تکلیف ہے۔ ضعیف باپ نے کہا کہ پانچ سو کپڑا مختلف رنگوں کا رنگنا ہے۔ آپ نے سب پارچات لے کر پانی میں ڈال دیئے اور جو کپڑا جس جس رنگ کا رنگنا مطلوب تھا رنگا رنگایا نکال کر دیتے رہے۔ پہلے آپ کی رہائش لب دریا بیاس تھی پھر موضع ملکا میں آ گئے۔ وہاں سے اٹھ کر دریائے راوی کے کنارے آئے اور پھر چک سراجہ میں آ کر آباد ہوئے۔ بعد میں اپنے نام سے موضع عبدالحکیم آباد کیا۔ جہاں آپ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ اساڑھ کے مہینے میں بڑا میلہ یہاں لگتا ہے اور ایک لاکھ آدمی کے قریب جمع ہو جاتے ہیں۔ مزار مبارک پر اب تک درس قرآن قائم ہے۔ اور دور دور سے لوگ زیارت خانقاہ شریف کے لیے آتے رہتے ہیں۔

خانقاہ حضرت خالد بن ولیدؒ واقع موضع خطی چور تحصیل کبیر والہ

آپ قریشی النسل ہیں۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ آپ 1015ء میں بزمانہ محمود غزنوی یہاں تشریف لائے موجودہ روضہ اب بالکل خستہ ہو چکا ہے اس عمارت کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں تیار ہوئی۔ اورنگ زیب بادشاہ نے اس کی مرمت کرائی اور ایک سرائے بھی بنوائی۔ اس زمانے میں ملتان لاہور کی سڑک پر یہ مقام ایک بارونق پڑاؤ تھا۔ آپ کے حالاتِ زندگی تحقیق نہیں ہو سکے۔ مقامی روایت ہے کہ ایک دفعہ شتر بانوں نے آپ سے کچھ گستاخی کی آپ کی بددعا سے علاقہ کے سب اونٹنیوں کے دودھ میں سے مکھن نکلنا بند ہو گیا۔ مزار مبارک کے گنبد میں ایک سفید پتھر لگا ہوا ہے جس سے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اونٹنیوں کا مکھن تھا جو پتھر ہو گیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس میں سے وقتاً فوقتاً مکھن کا قطرہ ٹپکتا ہے اور جس روز آخری قطرہ گرے گا اس روز قیامت آ جائے گی۔ گو عمارت بالکل شکستہ ہے لیکن اب تک یہاں آپ کی شان جلالی قائم ہے اور زائرین پر خاص قسم کی ہیبت طاری ہوتی ہے۔

خانقاہ ارجن شیر بخاری رحمتہ اللہ علیہ واقعہ سرائے سدھو تحصیل کبیر والہ

بیان کیا جاتا ہے کہ عرصہ تقریباً ساڑھے آٹھ سو برس کا ہوا جب چار بزرگ از قوم سادات حضرت ارجن شیر، حضرت ازانی شیر، حضرت شاہ صالح و حضرت شاہ دادا اطراف بخارا سے بطور سیاحت اس طرف تشریف لائے۔ اور سرائے سدھو کے متصل ایک جنگل میں قیام پذیر ہوئے۔ ان دنوں میں یہ مشہور تھا کہ ایک جن قصبہ سرائے سدھو کے باشندگان کو بے حد تکلیف دیتا تھا اور ان کے بچے اٹھا لے جاتا ہے۔ ایک دن ایک بیوہ کا لڑکا اسی طرح غائب ہو گیا اس عورت کی گریہ وزاری سے متاثر ہو کر حضرت ارجن شیر صاحبؒ بسواری شیر ہاتھ میں سانپ کا چابک لے کر روانہ ہوئے اور جا کر اس جن سے برسر پیکار ہو گئے۔ روایت ہے کہ ایک رات اور ایک دن برابر کشتی جاری رہی اور آپ کشتی کرتے ہوئے برج شہر میں داخل ہو گئے سخت لڑائی کے بعد آخر یہ نتیجہ نکلا کہ برج شق ہو گیا اور حضرت ارجن شیر معہ سواری و سانپ و جن اس میں غائب ہو گئے۔ باشندگان شہر نے وہاں مزار پختہ بنوا دیا۔ کوئی 300 برس ہوئے سدھو کی درخواست پر بادشاہ نے اُس کے قریب ایک سرائے بھی بنوا دی۔ اس کے بعد مزار حضرت موصوف برج کے گرنے سے دب گیا۔ 1852ء بکرمی میں عبدالرشید جمعدار تحصیل سرائے سدھو کو رات کے وقت گشت کی حالت میں بشارت ہوئی کہ مزار کو مرمت کرا کر چراغ جلایا کرے اور ہفتہ وار میلہ ہوا کرے۔ جمعدار مذکور نے خانقاہ بنوائی اور نوکری چھوڑ کر مجاور بن گیا۔ اب یہاں ہر سال 27 ماہ جیٹھ کو میلہ ہوتا ہے۔ کئی ہزار آدمی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

(مرقع ملتان۔ سید اولاد علی گیلانی)



رؤوف ظفر

ملتان کے مزارات اور آستانے

ملتان .... پاکستان کا قدیم ترین اور ملک کا پانچواں بڑا شہر، دو بڑے صحراؤں چولستان اور تھل کے درمیان دو بڑے ٹیلوں پر واقع 5 ہزار سالہ پرانا یہ شہر، پنجاب کے 5 دریاؤں کے قریب دریائے چناب کے موڑ کی گولائی میں آباد ہے۔ آج کا ملتان 15 میل کے قطر پر محیط ہے۔ مگر مرکزی شہر ایک ٹیلے پر واقع ہے جس کے نیچے صدیوں کی راکھ دبی ہے۔ ملتان اگرچہ کئی اعتبار سے تاریخ کے صفحات پر جگمگاتا نظر آتا ہے لیکن اس کی شہرت ان اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے دم سے بھی ہے جو جوق در جوق اس خطے میں تشریف لائے اور ملتان کو مرکز بنا کر برصغیر کو اسلام کی حنا پاشیوں سے منور کیا۔ سلاطین اسلام کے زمانے میں ملتان دین و دانش کا گہوارہ رہا اس لیے ہر طرف سے ارباب علم و فضل ملتان میں کھنچے چلے آتے تھے۔ یہاں سلسلہ سہروردیہ اور چشتیہ کے صوفیا و مشائخ نے علم و فضل کی جو شمع روشن کر رکھی تھی وہ اہل علم و دانش کے قدم روک دیتی تھی۔ بلکہ جو اہل علم تاتاریوں اور منگولوں کی قتل و غارت کے زمانے میں ہندوستان کا رخ کرتے تھے وہ بھی ملتان کی علمی فضا کو سازگار پا کر یہاں رک جاتے تھے۔ نامور تذکرہ نگار علامہ محمد عرفی کے الفاظ میں ''ملتان ایک ایسا آسمان ہے جس میں ارباب کمال چمکتے ہیں۔''

ملتان میں تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز محمد بن قاسم کے دور سے ہوا۔ اسی نسبت سے یہ باب الاسلام کہلایا، علویوں اور اسماعیلیوں کا تبلیغی مرکز بھی ملتان رہا۔ ان کے بعد 481ھ میں حضرت شاہ یوسف گردیزؒ نے شمع ہدایت جلائی۔ سلسلہ سہروردیہ کے فیوض و برکات کا سرچشمہ بھی ملتان سے پھوٹا، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی دانش گاہ سے ستر ہزار طالبان علم ظاہری و باطنی فیوض حاصل کر کے اطراف عالم میں پھیلے۔ حضرت لعل شہباز قلندرؒ بھی بہاء الدین زکریا کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے بعد سبزوار سے حضرت شاہ شمس سبزواریؒ تشریف لائے۔ حضرت سلطان سخی سرورؒ کے والد حضرت زین العابدینؒ بخارا سے ہجرت کر کے بستی لاڑ علاقہ ملتان میں آ بسے، ترکستان کے شہر روش سے حضرت قطب الدینؒ، حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے مہمان رہ کر دلی گئے۔ حضرت بابا فرید الدینؒ نے بھی ملتان سے تعلیم حاصل کی۔ ملتان میں حضرت امیر خسرو 5 سال تک شہزادہ محمد کے دربار سے وابستہ رہے۔ ملتان میں ایسی کتنی برگزیدہ ہستیاں دفن ہیں ان کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، ملتان کو عرف عام میں "City of

"Saints" کہا جاتا ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ ملتان کی ہر گلی اور ہر بازار کا راستہ، کسی نہ کسی مزار اور آستانہ کی طرف جاتا ہے "تذکرہ اولیائے ملتان" میں 165 ایسے اولیائے کرام کا ذکر ہے جو اس شہر میں آسودہ خاک ہیں اور نہ جانے ایسے کتنے ہوں گے جن کا ہمیں علم نہیں۔

ملتان میں مدفون ان بزرگان دین اور اولیائے عظام کو گلہائے عقیدت پیش کرنے کے لیے پاکستان کے کونے کونے سے زائرین یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ ملتان، پاکستان کے عین وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے پاکستان کا دل کہلاتا ہے۔ جغرافیائی حیثیت سے پاکستان کے چاروں صوبوں کے صدر مقام کراچی، کوئٹہ، پشاور اور لاہور سے یہ یکساں فاصلے پر واقع ہے۔ روحانی اعتبار سے ملتان کو جو عظمت و مرکزیت حاصل ہے وہ پاکستان کے کسی اور شہر کو حاصل نہیں۔ یہ اللہ والوں کے لیے اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا ہے جو سندھ کے راگزاروں، بلوچستان کے چٹیل میدانوں، سرحد کے پر فضا مقامات اور پنجاب کے دور و نزدیک سے یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔

لیکن کیا، ملتان دور و نزدیک سے آنے والے مہمانوں کی میزبانی کا صحیح فریضہ انجام دے رہا ہے؟ عقیدت مندوں کو کن مسائل کا سامنا ہے؟ وہ کون کون سی مرادیں لے کر یہاں آتے ہیں۔ ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں کون سی آرزوئیں تڑپ رہی ہوتی ہیں اور کون کون سی تشنہ تکمیل خواہشات سر اٹھاتی ہیں؟ یہ چند ایسے سوالات ہیں جن کے جواب نہ صرف ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی کے بعض دلچسپ گوشوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں بلکہ اس بات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرتی رویوں میں کیا کیا تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کا نفسیاتی طرز عمل کن رجحانات کی عکاسی کرتا ہے؟ اور موجودہ مسائل نے زائرین کی خواہشات کو کن کن سانچوں میں ڈھالا ہے؟

ملتان میں نشتر میڈیکل کالج کے ایک ریٹائرڈ پروفیسر نفسیات کے بقول، آستانوں اور مزاروں پر حاضری دینے والے زائرین اپنی جن خواہشات کو لے کر آتے ہیں ان میں ہمیں اپنا عہد سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے ان آستانوں پر مانگی جانے والی دعاؤں میں کئی تلخ و شیریں کہانیاں پڑھی جا سکتی ہیں۔ جہالت ہو یا بیماری، بے روزگاری ہو یا مقدمہ بازی، اولاد کا حصول ہو یا بیٹی کی شادی، الیکشن کا مقابلہ ہو یا بیرون ملک سفر کی خواہش ...... اس بات سے قطع نظر کہ ان کے ارمان پورے ہوتے ہیں یا نہیں ہمیں ان کی تمناؤں اور ارمانوں میں معاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات نظر آتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب یہ لوگ امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ مزاروں پر پہنچتے ہیں تو وہاں ان کی کس طرح پذیرائی ہوتی ہے یہ بات درست ہے کہ جب حضرت شاہ رکن عالمؒ کے مزار پر کوئی عقیدت مند، کنڈی کھٹکھٹاتا ہے کہ سرکار میں آ گیا ہوں، تو وہ جذبات میں اتنا سرشار ہوتا ہے کہ دعا مانگتے وقت اسے اپنی بھی خبر نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اسے یہاں پینے اور وضو کرنے کو بھی پانی نہ ملے مزار کے صحن کے فرش پر چلے تو پاؤں جلنے لگیں، لیٹرینوں میں بدبو سے دم گھٹنے لگے، مزاروں کے نگرانوں کی کوشش ہو کہ زیادہ سے زیادہ رقم بٹوری جائے، اسے قدم قدم پر بھکاریوں اور نشئیوں سے واسطہ پڑے اور لنگر کا سرے سے کوئی انتظام نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس قسم کے سلوک سے ہرگز خوش نہیں ہو گا اور ایک خوشگوار تاثر لے کر نہیں جائے گا۔"

ملتان کے مزاروں کی حالت کا جائزہ لینے اور یہاں آنے والے زائرین کے دلوں میں جھانکنے کے لیے ہم سب سے پہلے حضرت شاہ رکن الدین عالمؒ کے مزار پر گئے۔ آپ کا دور حیات 1249ء سے 1355ء تک ہے۔ دہلی کے حکمران سلطان غیاث الدین کے حکم پر 115 فٹ بلند عمارت تعمیر کی گئی۔ شاہ رکن عالمؒ کا مزار ایشیا کے خوبصورت ترین مزاروں میں شمار ہوتا ہے اور اسے 1983ء میں آغا خان انٹرنیشنل ایوارڈ بھی مل چکا ہے لیکن یہ مزار جس بلند ٹیلے پر واقع ہے بارشوں سے اس کی مٹی گھلتی جا رہی ہے۔

شاہ رکن عالمؒ کا مزار صبح 4 بجے کھلتا ہے اور رات 12 بجے بند کر دیا جاتا ہے یہاں بعض لوگ تہجد پڑھنے بھی آتے ہیں۔ مزار کے اندر اور باہر کافی قبریں ہیں کہا جاتا ہے کہ پہلے یہ جگہ ایک وسیع و عریض قبرستان تھی۔ مزار کے قرب و جوار کی جگہ ہموار ہے، لیکن قبروں کی نشانیاں برقرار ہیں۔ مزار اور اس کی چار دیواری کی مرمت کا کام اکتوبر 71ء سے مارچ 78ء تک 24 لاکھ 41 ہزار روپے کی لاگت سے محکمہ اوقاف نے مکمل کیا تھا۔ یہاں روزانہ 5 سے 8 ہزار تک زائرین آتے ہیں۔

ایسے ہی زائرین میں سے ہمیں ضلع مظفر گڑھ کی 55 سالہ خاتون بخت مائی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اس مزار پر گزشتہ 6 سال سے رہ رہی ہے اس کے بچے جوان ہیں۔ اس نے بتایا کہ کئی سال پہلے ایک منت مانی تھی جو پوری ہو گئی۔ لیکن اس نے یہاں نیاز نہیں بانٹی، جس کے بعد اس کا کام بگڑنا شروع ہو گیا۔ اس نے معافی مانگی تو اسے "باوا" کی آواز آئی کہ یہاں مزار پر رہو۔ اس نے یہاں کرایہ پر ایک کمرہ لے رکھا ہے اب ہر سال اس کی ایک ایک منت پوری ہو رہی ہے جب اس کی تمام منتیں پوری ہوں گی تو وہ حج پر چلی جائے گی۔ اس نے بتایا کہ جب وہ یہاں سے اپنے گھر چلی جاتی ہے تو اسے بخار ہو جاتا ہے اور جب وہ واپس آتی ہے تو ٹھیک ہو جاتی ہے۔ یہاں ہمیں ایک اور خاتون بھی دکھائی دی جس کے چہرے سے خوف ٹپک رہا تھا وہ کوٹ ادو سے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے ایک بیٹا محنت مزدوری کرنے لاہور گیا جس کے بعد اس کا کوئی پتہ نہیں۔ اب اس کے دو چھوٹے بچے ہیں اس کی زمین کا ایک حصہ زمینداروں سے ملتا ہے۔ چند ہفتے قبل اس کے مخالفین نے اسے قبرستان میں دوڑا کر اس پر کتے چھوڑ دیئے اور اسے ڈرایا دھمکایا، اس پر مقدمہ دائر کر دیا۔ وہاں کے لوگوں نے اس کی کوئی نہ سنی تو وہ اب "بابا جی" سے مدد مانگنے آئی ہے اور اسے یقین ہے کہ اس کے دشمن ذلیل و خوار ہوں گے۔ یہاں قبروں کے بالکل درمیان ایک نوجوان جس کی دونوں ٹانگیں بیکار تھیں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بہت علاج معالجہ کے باوجود اس کی ٹانگیں ٹھیک نہ ہو سکیں تو وہ اس مزار پر آ گئی۔ اسے یقین ہے کہ اس کا بیٹا چلنے لگے گا کیونکہ اب اسے ٹانگوں میں جان محسوس ہوتی ہے۔ ایک اور 40 سالہ عورت منت پوری ہونے پر شیرینی تقسیم کرنے آئی تھی منت سے اس کا تیسرا بیٹا پیدا ہوا تھا اور وہ چاہتی ہے کہ اس کے اور بھی بیٹے پیدا ہوں۔ یہاں رحیم یار خان کے ایک خوش شکل نوجوان سے بھی ملاقات ہوئی یہ پڑھا لکھا نوجوان تھا اور اس نے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر رکھا تھا۔ وہ چار سال سے بے روزگار تھا وہ ملتان میں اپنے پرانے کلاس فیلو سے ملنے آیا تو اس نے سوچا بزرگوں کے مزار پر بھی حاضری دیتا جائے۔ اس سوال کے

جواب میں کہ اس نے کیا دعا مانگی اس نے کہا کہ وہ چاہتا کہ اس کی جلد نوکری لگ جائے یہاں ادھیڑ عمر کا ایک شخص بھی نظر آیا جس نے کلف والے کپڑے پہن رکھے تھے اس نے بتایا کہ مزارات پر حاضری دینا اس کی زندگی کا معمول ہے اور اس کی جتنی مرادیں پوری ہوتی ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے بعد ان ہستیوں کا فیض شامل ہے۔ یہاں ایک ماں اپنے 16، 17 سالہ بیٹے کے ساتھ مٹھائی بانٹ رہی تھی اس نے بتایا کہ اس کا بیٹا میٹرک میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہے اور اس نے منت مانی تھی جو پوری ہو گئی ہے۔

حضرت بہاء الدین زکریاؒ سہروردی کا عرصہ حیات 1170ء سے 1262ء تک ہے۔ آپ سرزمین ہندوستان میں سلسلہ عالیہ سہروردیہ کے بانی ہیں اور آپ کا فیض حضرت صدر الدین عارفؒ اور حضرت شاہ رکن الدین عالمؒ کی صورت میں چمکا، جس سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا۔ یہ مزار ملتان کے مخصوص فن تعمیر کا نمائندہ عمارت کہلاتی ہے۔ 1948ء میں انگریزوں کے حملے کے دوران اس عمارت کو نقصان پہنچا تھا۔ اگر آپ یہاں بھی زائرین کے دلوں میں جھانکیں تو آپ کو معاشرے کے تلخ و شیریں رنگ، قوس و قزح کی صورت میں نظر آئیں گے۔ یہاں بھی روزانہ آنے والوں کی تعداد پانچ سے سات، آٹھ ہزار ہے لیکن عرس کے موقع پر اس میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک ایسے پڑھے لکھے ملنگ سے ملاقات ہوئی جو مقدمہ بازی کے دوران اپنا پورا خاندان قتل کروانے کے بعد یہاں کا ہو کر رہ گیا۔ اب اس نے اللہ سے لو لگا لی ہے یہاں ایک عورت 5 روپے کی دانوں کی پلیٹ خرید کر پرندوں کو ڈال رہی تھی اس نے بتایا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے روز ایسا کرتا ہے کیونکہ اللہ نے اسے دو لڑکیوں کے بعد بیٹا دیا ہے۔ ایک اور عورت اولاد کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگ رہی تھی شادی کے بعد وہ اولاد سے محروم تھی۔ ایک جوڑا یہاں چوکھٹ سے ٹکریں مار رہا تھا۔ اوقاف کے ملازم نے ہمیں بتایا کہ اس کا کمسن لڑکا لاپتہ ہو گیا ہے اور وہ ایک ماہ سے "بابا جی" سے کہہ رہے ہیں کہ ہمیں بیٹے سے ملوا دو۔ نشے میں جھومتا ایک نوجوان ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا تھا قریب ہی کپڑوں پر ٹھپہ لگانے والے شخص نے بتایا کہ اس نوجوان کو نشے کی حالت میں اس کے خاندان والے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ اب وہ خود اسے گاہے بگاہے منشیات دے جاتے ہیں اسے سمجھ نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہے۔ بظاہر یہیں لگتا ہے کہ اہل خانہ خود اس نوجوان سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس مزار پر ہر جمعرات کو ایک شخص بھی آتا ہے جس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوتا ہے وہ علی الصبح ہر فقیر کو 10 روپے دیتا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے وہ ایسا کر رہا ہے حضرت شاہ شمس سبزواریؒ کے مزار پر کئی ایسے ملنگوں سے ملاقات ہوئی جو ہنستی بستی دنیا کو چھوڑ کر یہاں کے ہو کر رہ گئے ہیں کئی نشہ کرتے ہیں لیکن کئی ایسے بھی ہیں جنہیں ان کے خاندان والوں نے نکال دیا ہے۔

اگر آپ یہاں کے پرانے خاکروبوں، خادموں اور مقبرے کے نگرانوں سے ملیں تو آپ کو کئی ان کہی کہانیاں سنائیں گے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو زائرین کی سرگوشیاں ان کی سسکیوں اور دعاؤں کے وقت ان کے سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں محکمہ اوقاف کا ایک نسبتاً پڑھا لکھا ملازم جسے بہت سے مزاروں پر رہنے کا موقع ملا ہے اس کا کہنا ہے کہ ان مزاروں پر یوں تو درجہ چہارم کے ملازمین سے لیکر 21ویں گریڈ بلکہ اعلیٰ ترین حکام تک حاضری

دیتے ہیں تاہم سب سے زیادہ تعداد غریب اور متوسط طبقے کی ہوتی ہے جن کی آرزوئیں، تمنائیں اور خواہشات ادھوری رہ جاتی ہیں۔ یہاں خواتین کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے اور اکثر خواتین اولاد یا بیٹا ہونے کی منت مانتی ہیں اس کے بعد ایسی خواتین کی باری آتی ہے جو مختلف قسم کے امراض میں مبتلا ہوتی ہیں لیکن علاج کرانے کی سکت نہیں رکھتیں ان بیمار لوگوں میں مرد بھی شامل ہوتے ہیں بے شمار ایسے لوگ آتے ہیں جن کی مقدمہ بازی چل رہی ہوتی ہے اور وہ فیصلہ اپنے حق میں کروانا چاہتے ہیں۔ اس ملازم نے کہا کہ اب زائرین کی دعاؤں میں ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا کہ زیادہ تر لوگ کاروبار کا مندا دور کرنے یا ملازمت ملنے کی دعا کرتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔ یہاں کئی شادی شدہ جوڑے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ کئی لوگ الیکشن میں ''دشمن'' کو شکست دینے کے لیے منت مانتے ہیں۔ غرض ان مزاروں کے اندر داخل ہوتے ہی 'مرد ہو یا عورت' اپنے دل کے بھید کھل دیتے ہیں۔ کئی یہاں تلاوت کلام پاک میں مصروف رہتے ہیں اور شکرانے کے نفل ادا کرتے ہیں جب ان کی مرادیں پوری ہوتی ہیں تو وہ نذرانے دیتے ہیں۔ جس سے غریبوں اور مستحقین کی دال روٹی چلتی ہے۔

شاہ شمس سبزواریؒ کے مزار پر پہنچے تو یہاں اس وقت سیف کھل چکا تھا۔ آپ کا مزار 1300ء میں پہلی بار تعمیر ہوا۔ چوکور عمارت پر سبز روغنی اینٹوں سے تیار شدہ گنبد بھی ملتانی معماروں کا شاہکار ہے۔ سیف سے برآمد ہونے والی نذرانوں کی رقم کے بارے میں ایک اہلکار نے بتایا کہ ملتان کے بڑے بڑے دو مزاروں سے ہر ہفتے 35 سے 40 ہزار تک رقم نکلتی ہے۔ مارچ اور اپریل کے دنوں میں جبکہ زائرین کے قافلہ حضرت سخی سرورؒ کے مزار پر جاتے ہوئے یہاں سے گزر کر جاتے ہیں تو یہ رقم 60، 70 ہزار تک چلی جاتی ہے اور دعوت اسلامی کے اجتماعات کے دنوں میں یہ ایک لاکھ فی ہفتہ سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ نذرانوں کے سیف پر خصوصی تالہ لگا ہوتا ہے جس کی ایک چابی خطیب دوسری نیشنل بنک کے نمائندے اور تیسری محکمہ اوقاف کے سپروائزر کے پاس ہوتی ہے۔ یہ دونوں چابیاں بیک وقت لگتی ہیں تو سیف کھلتا ہے۔ نوٹوں کی گنتی سب کے سامنے ہوتی ہے سیف سے زیادہ تر دس روپے کے نوٹ نکلتے ہیں لیکن اس روز ایک ہزار روپے کا نوٹ بھی نکلا جو محکمہ اوقاف کے نمائندے کے مطابق اس نے کافی عرصے کے بعد کسی سے سیف سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ یہ رقم اسی وقت بنک میں جمع ہو جاتی ہے اور رجسٹر پر باقاعدہ اندراج ہوتا ہے۔

یہاں جن اہلکاروں نے سیف کھولا ان کا کہنا تھا کہ گزشتہ برسوں کے مقابلے میں مزاروں سے اکٹھی ہونے والی آمدنی میں 20 فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ اعداد و شمار بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ لیکن مزاروں پر ڈبے میں نذرانے اکٹھے کرنے والے بعض ملازمین اس کے پس پردہ کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اوپر سے یہ آرڈر ہے کہ ڈبے کو ہر صورت زائرین کے سامنے زور زور سے بجائیں تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ انہیں نذرانہ دینا ہے جو اہلکار گزشتہ مہینوں کے مقابلے میں 20 فیصد انکم پوری کرنے میں ناکام رہتے ہیں انہیں نوکری سے نکالنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اکثر ملازمین نوکریاں بچانے کے لیے 20 فیصد اضافے پر راضی ہو گئے ہیں۔ جو ملازم یہ اضافہ پورا نہیں کر سکتے وہ کھڈے لائن لگا دیئے گئے ہیں۔

یوں تو مزار کے چاروں اطراف اور سڑک کے فٹ پاتھوں پر نگینہ فروشوں، جوتشیوں، پامسٹوں، نجومیوں اور عاملوں نے اپنے ڈیرے جما رکھے ہیں جہاں وہ زائرین کو طفل تسلیاں دے کر یا سبز باغ دکھا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ لیکن مزار موسیٰ پاک شہید جو کہ پاک دروازہ کے اندر بازار کے غربی جانب واقع ہے، نجومیوں اور گنڈے تعویز دینے والوں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں یہ باقاعدہ کاروبار کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ مزار کے اردگرد متولیوں کے مکانات ہیں جن میں گدی نشینی کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اختلافات کے باوجود یہ ساتھ ساتھ چارپائیاں بچھائے بیٹھے ہیں اور ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زائرین کی جیب سے کچھ نکلوانے میں پہل کرے۔ اس مزار پر تعویز گنڈے کا کام سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

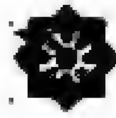
ایک اندازے کے مطابق ملتان کے تمام چھوٹے بڑے مزاروں پر روزانہ نصف لاکھ کے قریب عقیدت مند، حاضری دیتے ہیں ہزاروں کی تعداد میں مستحق اور حاجت مند لوگ مالی طور پر مستفید ہوتے ہیں یہاں آ کر لوگ جھولی پھیلاتے ہیں تو دوسروں کی جھولی میں بھی کچھ ڈالتے ہیں لیکن اگر آپ تمام بڑے بڑے مزاروں کا جائزہ لیں تو زائرین کی سہولتوں اور ان کے انتظام وانصرام کے حوالے سے قابل رشک صورتحال نظر نہیں آتی۔ اکثر بڑے مزاروں پر پینے کے پانی کی شدید کمی ہے۔ حتیٰ کہ وضو کے لیے بھی پانی دستیاب نہیں ہوتا اور شاہ رکن الدین عالمؒ کے مزار پر لگی ہوئی دو موٹریں اکثر خراب رہتی ہیں۔ اگر ٹھیک کام بھی کریں تو پانی کی ٹینکی بھرتے گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ گرمیوں میں سائے کا کوئی انتظام نہیں مزار کا فرش تانبے کی طرح تپنے لگتا ہے اور زائرین چل پھر نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ مزار کے داخلے کے گیٹ سے مزار کے فرش کا ٹاٹ کافی عرصہ سے پھٹا رہا جس سے مزار تک پہنچتے پہنچتے زائرین کے پیروں کے تلوے جل جاتے۔ اب کسی نے خود یہاں ایک صف بچھا دی ہے صحن پر سائے کے لیے ایک صاحب نے سائبان لگانے کی پیشکش کی تھی اور اس مقصد کے لیے دیواروں میں سوراخ بھی کروائے تھے لیکن محکمہ آثار قدیمہ نے یہ کام بند کرا دیا اور کہا کہ 800 برس سے تو یہاں سایہ نہیں ہے اب اس کی کیا ضرورت ہے اصل میں محکمہ کو خدشہ ہے کہ کیلیں وغیرہ لگانے سے عمارت خراب ہو جائے گی۔ اکثر مزاروں پر لیٹرینوں کی حالت بھی ٹھیک نہیں اور دور دراز سے آنے والے زائرین کو پریشانی ہوتی ہے۔

جب ہم نے محکمہ اوقاف کے ملتان زون کے ایڈمنسٹریٹر اکبر علی بھٹی سے ان شکایات کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ اس وقت ملتان کے 6 بڑے مزار محکمہ کے زیر انتظام چل رہے ہیں۔ ان میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ، حضرت شاہ رکن عالمؒ، حضرت شاہ شمس سبزواریؒ، حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ، حضرت بی بی پاک دامنؒ (شاہ رکن الدینؒ کی والدہ) اور بابا تلوار شاہ شامل ہیں۔ دوسرے سینکڑوں مزاروں کا انتظام ان کے گدی نشین خاندان چلا رہے ہیں ان مزاروں سے اکٹھے ہونے والے نذرانوں سے محکمے کو اس سال 79 لاکھ 47 ہزار کی آمدنی ہوئی، جبکہ جوتوں اور گل فروشوں کے ٹھیکوں سے 19 لاکھ کے قریب وصول ہوئے۔ دکانوں کے کرایوں اور پٹوں پر دی گئی اراضی کی رقم کو شامل کیا جائے تو محکمے کو کل ایک کروڑ 76 لاکھ کی انکم ہوئی۔ جبکہ ہمارے اخراجات ایک کروڑ 48 لاکھ 95 ہزار ہیں۔

اکبر علی بھٹی نے کہا کہ گزشتہ سال کی نسبت اس سال مزاروں سے ہونے والی ہماری انکم میں 20 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ہم نے کسی ورکر پر دباؤ نہیں ڈالا کہ وہ زائرین سے زبردستی چندہ وصول کرے۔ البتہ ہم نے ورکرز کی چوری بند کروا دی ہے۔ پہلے وہ زائرین کے نذرانے اپنی جیبوں میں ڈال لیتے تھے اب مخصوص نگرانی کی وجہ سے انہیں یہ سیف میں ڈالنے پڑتے ہیں۔ جہاں تک پانی کی قلت کا تعلق ہے حضرت بہاء الدین زکریاؒ اور شاہ رکن عالمؒ کے مزاروں پر 80, 80 گیلن کے ٹھنڈے پانی کے دو کولر لگائے جا رہے ہیں ٹیوب ویل لگانے کی تجویز ہم نے واسا کو بھیج دی ہی۔ ہم نے سب سے اہم قدم یہ اٹھایا ہے کہ منگل کا دن عصر سے عشاء تک صرف عورتوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے اس دوران لڑکوں اور مردوں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔

مزاروں اور آستانے پر حاضری ہمارے کلچر کا صدیوں پرانا حصہ ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کی تشنہ تکمیل آرزوئیں اور خواہشات پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ یہ آستانے تالیف قلب، ذہنی سکون اور بزرگان دین کے فیوض و برکات کا سرچشمہ ہیں۔ دل شکستگی اور مسائل میں گھرے ہوئے لوگوں کو یہ اظہار جذبات کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہاں آ کر لوگوں کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ وہ بزرگان دین اور اللہ کی برگزیدہ ہستیوں کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں۔ یہ آستانے غریبوں اور حاجت مندوں کی تسکین قلب کا وسیلہ بھی ہیں جن کے پاس دوا کے پیسے نہیں ہوتے لیکن وہ سمجھتے ہیں یہاں کا پانی پی کر صحت یاب اور منت کے چراغ کی روشنی سے ان کے زخم مندمل ہو جائیں گے۔ ملتان کے مزار، لاکھوں افراد کے لیے امید کے دیئے کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان مزاروں پر انتظامات کی مجموعی حالت ایسی نہیں کہ اسے تسلی بخش قرار دیا جا سکے۔ اگر ہم پاکستان بھر سے آنے والے لاکھوں عقیدت مندوں کے لیے اچھا اور خوشگوار ماحول پیدا کر سکیں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ زائرین، اپنی دعاؤں میں اپنے ''میزبانوں'' کو یاد نہ رکھیں۔

(رؤف ظفر - روزنامہ جنگ ملتان)



ڈاکٹر محمد امین

تصوف اور ملتان

اسلام برصغیر میں صوفیاء کے توسط سے آیا اور صوفیاء کے واسطے سے پروان چڑھا۔ پاکستان اور بھارت کی تاریخ تصوف میں ملتان کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اس خطے نے بڑے صوفیاء پیدا کئے۔ ملتان کو پیروں فقیروں کا شہر کہا جاتا ہے۔ سرزمین ملتان میں تصوف کو بہت فروغ حاصل ہوا اور یہاں کے عوام میں تصوف بہت مقبول رہا۔ اس کے اسباب معلوم کرنا تو ایک مشکل کام ہے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصوف یہاں کے لوگوں کے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔

برصغیر میں سب سے پہلے صوفی حضرت دیوان چاولی مشائخ ملتانی ہیں۔ تحقیق سے انکشاف ہوا ہے حضرت دیوان چاولی مشائخ اسلامی تصوف کی تاریخ میں سب سے پہلے صوفی ہیں جنہوں نے باقاعدہ تصوف کا سلسلہ رائج کیا۔ تذکرہ نگار حضرت اویس قرنی سے اپنے تذکرے کا آغاز کرتے ہیں اور انہیں پہلا صوفی سمجھتے ہیں لیکن تاریخ تصوف میں جنہیں سب سے پہلے صوفی کے لقب سے پکارا گیا وہ حضرت ابو ہاشم ہیں جنہوں نے 150ھ، 776ء میں وفات پائی۔ حضرت ابراہیم بن ادھم ابو ہاشم کے معاصر تھے۔ حضرت دیوان چاولی مشائخ حضرت ابو ہاشم اور حضرت ابو بن ادھم کے ہم عصر تھے اور حضرت ابو ہاشم سے 31 سال پہلے وفات پائی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ ابو تراب کو جو حاجی ترابی کے نام سے مشہور ہوئے پاک و بھارت کا پہلا صوفی قرار دیا ہے۔ حاجی ترابی کا مزار سندھ میں ہے اور اسے برصغیر کی قدیم ترین زیارت گاہ قرار دیا گیا ہے۔ تحفۃ الکرام، تذکرہ صوفیائے سندھ اور آب کوثر میں یہی لکھا ہے۔ موخر الذکر دونوں کتابوں نے تحفۃ الکرام کو بنیاد بنایا ہے ''آب کوثر'' میں حاجی ترابی کی تاریخ وفات 171ھ درج ہے اب سنوں کے موازنے سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت دیوان چاولی مشائخ برصغیر کے سب سے پہلے صوفی ہیں اور اسلامی تصوف کی تاریخ میں انہیں اس طرح اولیت حاصل ہے کہ وہ حضرت ابراہیم بن ادھم اور حضرت ابو ہاشم کے معاصر تھے اور حضرت ابو ہاشم اور حضرت ابراہیم بن ادھم کا تعلق تصوف کے ابتدائی دور سے ہے۔

حضرت دیوان چاولی مشائخ کے حالات زندگی تفصیل سے معلوم نہیں۔ تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں بڑے مختصر حالات درج ہیں آپ کا نام رائے چاولا تھا اور مسلمان ہونے کے بعد حضرت دیوان چاولی مشائخ کے

لقب سے مشہور ہوئے۔ تاریخ ملتان از لالہ حکم چند اور اولیائے ملتان از بشیر حسین ناظم میں آپ کو راجہ ہسپال کا چھوٹا بیٹا لکھا ہے۔ راجہ ہسپال رائے لکھن کی اولاد سے تھا جس کا تعلق راجپوت قوم ڈھوڈی سے تھا۔ آپ کو عالم باطن میں حضرت رسول اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ نے اسلام قبول کر لیا۔ آپ کے ساتھ آپ کی ہمشیرہ کنگن برس بھی مسلمان ہو گئیں۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے آپ کے بھائیوں نے آپ کو شہید کر دیا۔ آپ کی ہمشیرہ کنگن برس محل سے یہ منظر دیکھ رہی تھی اس نے بھی محل سے چھلانگ لگا کر جان دے دی چنانچہ مزار میں دو قبریں ہیں ایک حضرت دیوان چاولی مشائخ کی اور دوسری قبر آپ کی ہمشیرہ کی ہے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر 22 سال تھی اور سن 131ھ تھا آپ کو حاجی شیر کے لقب سے بھی پکارا جاتا ہے۔ بابا فرید گنج شکرؒ، بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور عثمان مروندی لال شہباز قلندرؒ نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ بابا نانک نے بھی آپ کے روضہ پر چلہ کشی کی۔ آپ کا روضہ تحصیل میلسی موضع کہوتے وال میں واقع ہے جسے محمود غزنوی نے تعمیر کرایا اور بعد میں جہانگیر نے مرمت کرائی۔ پنجاب اور سندھ میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں آپ کے خاندان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اتباع شریعت، عشق الٰہی اور عشق رسول ﷺ ان کے صوفیانہ مذہب کی خصوصیات ہیں۔

برصغیر میں اسلام کے یہ ابتدائی دن تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک آویزش تھی لیکن آہستہ آہستہ اسلام پھیلتا چلا گیا۔ صوفیاء ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے یہاں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اس دوران تاریخ ملتان میں کسی نمایاں صوفی کا نام نہیں ملتا۔ حضرت دیوان چاولی مشائخ کی وفات سے تین سو سال بعد ملتان میں تصوف کو عروج حاصل ہوتا ہے اس عروج فروغ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پہلے تصوف کی روایت ضرور موجود تھی۔

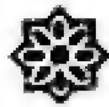
حضرت محمد یوسف گردیزؒ کی ملتان میں آمد کے ساتھ ملتان میں تصوف کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے پورے عالم اسلام اور خاص طور پر ایران میں یہ زمانہ تصوف کے عروج کا زمانہ تھا۔ شاہ گردیزؒ نے 1152ء میں وفات پائی ان کے بعد دوسری بڑی شخصیت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی ہے۔ آپ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے اور برصغیر میں سلسلہ سہروردیہ کے بانی ہیں۔ آپ جید عالم اور جید صوفی تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے بیٹے صدر الدین عارف اور ان کے بیٹے شیخ رکن الدین ابوالفتح نے تصوف کی شمع کو روشن رکھا۔ شاہ شمس سبزواری 1269ء میں ملتان تشریف لائے۔ آپ اسماعیلی تھے اور اسماعیلی تصوف کو یہاں رائج کیا۔ ان کے متاثرین میں سید موسیٰ پاک شہید اور حافظ محمد جمال ملتانی قابل ذکر ہیں۔ ملتان کے نواح میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور متاثرین میں سے خواجہ فرید کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے صوفیاء بھی ہیں جو تبلیغ کے سلسلے میں ملتان آئے اور کافی عرصہ یہاں مقیم رہے اور تصوف کا درس دیتے رہے۔ ان میں مشہور فارسی شاعر عراقی کا نام قابل ذکر ہے۔

ملتان میں تصوف کے تمام سلسلے موجود ہیں اور ہر سلسلے کے سینکڑوں مقلدین اور مریدین ہیں۔ بڑے بڑے سلسلے یہ ہیں قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور چشتیہ اور ان کی دیگر شاخیں تصوف کو اب بھی عوام میں مقبولیت حاصل

ہے۔ قادریہ سلسلہ زیادہ مقبول نظر آتا ہے۔

یہ تصوف کا عملی پہلو ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملتان کے صوفیاء کی فکری تصوف میں کیا کیا خدمات ہیں۔ ملتانی صوفیاء کے یہاں ہمیں ایرانی تصوف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ملتان کے صوفیا کے یہاں اہل بیت سے محبت کو روحانی ترقی کا پہلا زینہ سمجھتے ہیں بعض صوفیاء کے یہاں ریاضت کا ایک خاص انداز اور طریقہ ملتا ہے۔ مثلاً حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے ریاضت اور چلے کشی کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا۔ یہ طریقہ ہمیں بدھ اور ہندو تصوف میں بھی ملتا ہے۔ بہت سے صوفیاء نے بابا فرید کی تقلید میں ان کے طریق ریاضت کو اپنایا۔

(ڈاکٹر محمد امین - روزنامہ جنگ ملتان)



شاکر حسین شاکر

حضرت شاہ شمسؒ (سرائیکی دھرتی کا گم گشتہ صوفی شاعر)

ملتان جس کو مدینۃ الاولیاء بھی کہا جاتا ہے اس کی بظاہر دو وجوہات ہیں یہاں کے اولیائے کرام نے اس شہر کو مدینۃ الاولیاء کا درجہ دلیا اس کے علاوہ ان اولیائے کرام کی صوفیانہ شاعری نے بھی ملتان کو مدینۃ الاولیاء کے مقام تک پہنچایا۔ یہاں کے صوفی دانشوروں نے ہمیشہ انسان دوستی کو اولیت دی ان کے افکار و خیالات، ثقافتی جبر کے عہد میں ہمیشہ روشنی بن کر راستہ دکھاتے رہے ہیں ان کی شاعری میں جہاں مسلم تخلیقی فکر کی روایت ملتی ہے وہاں پر تصوف کے رنگ میں رچی ہوئی شاعری بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ ملتان کے ایسے اولیائے کرام میں حضرت شاہ شمس سبزواریؒ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ حضرت سلطان باہوؒ حضرت مولوی لطف علیؒ حضرت حافظ جمال اللہ ملتانیؒ حضرت منشی غلام حسین شہیدؒ اور حضرت خواجہ غلام فریدؒ نمایاں ہیں۔ حضرت شاہ شمس سبزواریؒ کی شاعری کو جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اس بات کا تعین کرنا ہے کہ کیا حضرت شاہ شمسؒ سرائیکی کے پہلے شاعر تھے؟ اس سوال کا جواب ہمیں ڈاکٹر روبینہ ترین اور شبیر حسین اختر کی کتاب شاہ شمس سبزواریؒ کے صفحہ نمبر 74 میں ملتا ہے۔

''چودھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک پانچ سو سالہ طویل عرصہ کے دوران شاہ شمس سبزواریؒ اور دوسرے اسماعیلی صوفیاء کا سرائیکی کلام خوجوں کے خفیہ رسم الخط میں رہ کر نایاب ہو چکا تھا جس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم ترین لسانی اور عربی ورثہ سرائیکی زبان اور ادب کی تاریخ مرتب کرنے والے مورخین اور محققین کی نگاہ سے اوجھل رہا۔ یہ دفینہ موجودہ عہد میں آ کر اسماعیلی طریقہ بورڈ کے توسط سے منظر عام پر آیا ہے۔ جنہوں نے اپنے صوفیاء کے عارفانہ کلام کا مجموعہ گمنان شریعت کے عنوان سے شائع کر دیا، یہ غیر معمولی واقعہ ہے جس سے سرائیکی شاعروں کی قدامت کا تعین کرنے والے دانشوروں کو اپنی قبلہ از سر نو درست کونے کی ضرورت پیش آ چکی ہے تا کہ یہ طے کیا جا سکے کہ پیر شمس سبزواریؒ 1175ء سے 1328ء تک سرائیکی کے اولین شاعر تھے یا نہیں؟ اس سے قبل بابا گرونانک کے گرنتھ میں شامل سرائیکی اشعار جنہیں ''اشلوک'' کہا جاتا ہے سرائیکی کا قدیم ترین شعری ورثہ ہیں لیکن یہاں آ کر یہ تنازع کھڑا ہو گیا ہے کہ آیا یہ ''اشلوک'' بابا فرید گنج شکرؒ 1173ء سے 1265ء میں لکھے تھے یا یہ اشعار شیخ ابراہیم کی تخلیق تھے۔ جنہیں فرید ثانی کہا جاتا ہے جو بابا گرونانک 1469ء تا 1539ء کے ہم عصر تھے۔

اس کتاب کے صفحہ نمبر 76 پر مزید تحقیق کے در کھلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے حضرت شاہ شمسؒ بابا فرید گنج سے 82 برس بڑے ہیں اس لیے حضرت شاہ شمسؒ کو بابا فریدؒ پر سبقت حاصل ہے۔ اس لیے حضرت شاہ شمسؒ کے گنانوں کو قدیم ترین شاعری کا درجہ مل سکتا ہے۔ یہی سبقت حضرت شاہ شمسؒ کو سرائیکی پہلا شاعر ہونے کا اعزاز بھی دلاتا ہے۔ یہاں پر ایک سوال اور ذہن میں آتا ہے کہ اس زمانے کی سرائیکی شاعری اور آج کی سرائیکی شاعری میں کیا فرق ہے؟ حضرت شاہ شمسؒ کے گنان جو آغا خانی (یعنی اسماعیلی) کے جماعت خانوں مناجات کی شکل میں پڑھے جاتے ہیں اس کا متن اس طرح کا ہے کہ ملتان میں آغا خانی خواتین و حضرات آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں ان کے ہاں الفاظ اور لہجہ مختلف ملتا ہے ان کی بول چال میں وہ الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو حضرت شاہ شمسؒ نے گنانوں میں استعمال کئے اگرچہ آج ملتانی آغا خانی حضرت شاہ شمسؒ کو پیر شمس کہتے ہیں لیکن اب وہ بہت کم کم ہی ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ اب وہاں پر زیادہ تر اثنا عشری خواتین و حضرات کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ البتہ حضرت شاہ شمسؒ کے گنان آغا خانیوں میں متبرک آیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں پر ایک بات اور بھی واضح کرتا ہوں کہ ماضی میں اسماعیلی صوفیاء کرام نے یہ گنان ایک مخصوص تبلیغی حکمت عملی کے تحت وضع کئے تھے تاکہ ملتان اور نواح میں رہنے والوں میں مقامی زبان میں گیتوں اور نغموں کی صورت میں قرانی تعلیمات کو پھیلایا جائے یہی وجہ ہے قرون وسطیٰ کے مختلف اسماعیلی پیروں نے مختلف ادوار میں مختلف مقامی زبانوں کے الفاظ کا سہارا لیا اور آخر کار پوربی، سرائیکی، ہندی، گجراتی اور سندھی میں یہ تخلیقی گیت لکھے گئے جب یہ گنان نچلے طبقہ کے غلام لوگوں کو سنائے گئے تو وہ لوگ حیران ہوگئے کہ اگر غریب لوگوں کی زبان میں تبلیغی لکھے جاسکتے ہیں تو وہ بہت جلد اسلام کی طرف راغب ہو جائیں گے۔

حضرت شاہ شمسؒ کے یہ گنان چند سال قبل جی الانے نے مرتب کئے ان کے بقول یہ گنان دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ تصوف اور وحدانیت کی بنا پر مختلف موضویات اور مضامین سے بھرپور وہ منظوم علمی و ادبی، اخلاقی خزانہ ہیں جن کو ناصحانہ شاعری میں خاص مقام حاصل ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے مطابق گنان شاید اصل میں لفظ گیان کی بدلی ہوئی صورت ہے جبکہ ڈاکٹر جی الانہ گنانوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ گنانکا مصرعہ گنانا ہے جس کا مطلب سُر کے ساتھ گانا ہے۔ اسماعیلی نظریات کی تبلیغ کا آغاز منظوم مناجات کی صورت میں 1079ء/ 462ھ میں ہوتا ہے خاص طور پر حضرت شاہ شمسؒ کی شاعری یا گنانوں کو "سلوک" بھی کہا گیا۔ حضرت شاہ شمسؒ کے گنانوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنان مقامی زبان یعنی ملتانی زبان میں کہے گئے ہیں ان گنانوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کو جماعت خانوں میں گا کر پڑھا جاتا تھا اس لیے ان میں خاص قسم کا صوفی آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ گنانوں کے موضوعات وہی ہیں جو ہر صوفیاء کرام کی شاعری میں ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماضی میں تمام اولیاء کرام اپنے ملفوظات میں نیکی کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں یہی موضوع ہمیں حضرت شاہ شمسؒ کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے ان کا کلام اگرچہ اسماعیلی فکر کی تشریح کرتا نظر آتا ہے لیکن اب ان کے مزار پر اسماعیلی حضرات کم کم ہی جاتے یں ان کے وہاں نہ جانے کی وجہ سمجھ نہیں آتی البتہ ان کی شاعری اب اسماعیلی جماعت خانوں سے نکل تصوف کے چاہنے والوں

کے علاوہ اس طبقۂ فکر کو متاثر کر رہی ہے جو سرائیکی تصوف کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا ایک گنان ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ حضرت شاہ شمسؒ نے اس زمانے میں اپنی زبان میں ماں بولی کو مختلف الفاظ میں کس طرح استعمال کیا ہے اگرچہ ان کی شاعری میں استعمال کئے گئے بہت سے الفاظ آج مستعمل نہیں رہے لیکن اس کے باوجود صرافہ بازار میں کاروبار کرنے والے آغا خانی جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو وہ نوے فیصد وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو حضرت شاہ شمسؒ کے کلام میں ملتے ہیں:

اے سبھاگا چارے کہ ڈھو چارے چکلا
مولا چوک ملتان سبھاگا
سبھاگا اے سبھاگا گنان مہار میں
پیر بخش بولیا ساچا لنگھی یار بھاگا

(اے بھاگا (ارادتمند) چاروں کونوں اور چاروں چوکوں (چوراہوں)
سے ہوتے ہوئے مولا ملتان کے مرکزی چوک (پتانا چوک) میں
تشریف لائیں گے۔ اے بھاگا پیر شاہ شمسؒ پرحکمت گنان فرماتے ہیں
کہ مسیحا مومن میں یار اترے گا)

حضرت شاہ شمسؒ کے گنان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب زیادہ شدت سے منظر عام پر آنے لگے ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال قبل ان کی شاعری کا ذکر کوئی کوئی کرتا تھا لیکن حضرت شاہ شمسؒ کی شاعری کا حوالہ ہر جگہ ملتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ملتان کے رثائی ادب میں مرثیہ اور نوحہ پہلے سے موجود تھا لیکن اس کے ساتھ ہر بزرگ نے تصوف کے رنگ میں ہم آہنگ ہوکر اپنی بات کی، وہ الفاظ چاہے شاعری کے ذریعے سامنے آئے یا فرمودات، ارشادات یا ملفوظات کی شکل میں محفوظ ہیں ان سب کے ہاں علاقائی زبانکا عکس ملتا ہے۔

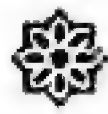
حضرت شاہ شمسؒ کی شاعری کا پیغام کیا ہے؟ کیا ان کی شاعری سے ہم تبدیلی کا راستہ دکھا سکتے ہیں، حضرت شاہ شمسؒ کی شاعری نے جہاں زبان و ادب (اردو و سرائیکی) کو نئے معنی دیئے ہیں وہاں پر ان کی شاعری نے عوام اور صوفیاء کے رشتے کو مزید مضبوط کیا ہے چونکہ حضرت شاہ شمس سبزواریؒ کا عاوم سے تعلق محبت اور احترام کا تھا اس لیے ان کے افکار میں ہی یہ چیز نمایاں مقام تو حاصل نہ کرسکی البتہ ان کی شاعری کئی سال گزرنے کے باوجود آج بھی نسل درنسل ناصرف محفوظ ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے نئے مفاہیم سامنے آرہے ہیں۔

حضرت شاہ شمس سبزواریؒ کی شاعری ہمیں اس لیے بھی اصل حالت میں لگتی ہے کہ کن کی حفاظت کرنے والے زیادہ تر لوگ مذہب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس لیے حفاظت کرتے وقت وہ مذہبی احترام کو سامنے رکھتے ہیں۔ اس وقت حضرت شاہ شمس سبزواریؒ کے 25 گنان شیعہ امامی اسماعیلی طریقہ لینڈ ریلیجس ایجوکیشن بورڈ برائے پاکستان کراچی نے شائع کئے ہیں۔ ان گنان کی خوبی یہ ہے کہ ان کے مشکل الفاظ یا غیر مستعمل الفاظ کے معنی بھی آخر

میں دیئے گئے ہیں جس سے سرائیکی زبان کے قدیم ہونے کے علاوہ اس کی وسعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

جہاں تک حضرت شاہ شمس سبزواری کے کلام میں ہمیں تبدیلی کا جو پیغام ملتا ہے وہ بڑا واضح ہے کہ انہوں نے اخلاقیات، نیکی، انسانوں سے محبت اور برائی سے بچنے کی تاکید کی ہے تو ایسے میں اگر ہم تبدیلی چاہتے ہیں کہ جہاں ہم دوسرے صوفیاء کرام کی شاعری اور افکار سے روشنی پاتے ہیں وہاں حضرت شاہ شمس سبزواریؒ کی شاعری سے بہت سے انقلابی پیغام حاصل کرتے ہیں۔ حضرت شاہ شمسؒ نے جہاں اپنے افکار سے بہت سے لوگوں کو نئی زندگی سے آشنا کیا وہاں ان کی شاعری بھی ہمیں نئے آہنگ سے راستہ دکھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے صوفیاء کرام اور خانوادوں سے وابستہ افراد نے ملتان کو ہمیشہ امن کا گہوارہ بنائے رکھا کہ ان کے قول وفعل میں تضاد نظر نہیں آتا۔

(شاکر حسین شاکر- روزنامہ خبریں ملتان)



محمد اسلم مبتلا

ملتان کی روحانی شناخت

ملتان کی قدامت مسلمہ ہے۔ مختلف نسلوں کے لوگ وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے اور سکونت پذیر ہو گئے۔ نجانے کتنی ہی تہذیبیں پروان چڑھیں اور زوال پذیر ہوئیں۔ مذاہب کا بھی یہی حال ہے۔ ہندومت، بدھ مت، اسلام اور پھر اسلام کے مختلف فرقوں کے افراد یہاں حکمران نظر آتے ہیں۔

تمام قدیم مذاہب جن میں بت پرستی رائج تھی ان میں سورج کو ایک خاص اہمیت ہی نہ تھی بلکہ تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ اسے زمین کو روشنی اور قوت بخشنے والا سمجھتے تھے۔ سورج مندر ملتان میں زمانہ قبل از تاریخ سے قائم تھا۔ راجہ ہرنا کشپ نے اپنے آپ کو سورج دیوتا کہلوایا اور دعویٰ کیا کہ میں ہی سورج دیوتا ہوں اور اس نے اپنی ہی شکل کا طلائی بت تیار کر کے سورج مندر میں رکھوا دیا اور لوگوں سے جبراً پوجا کرائی۔ راجکمار پرہلاد جو راجہ ہرنا کشپ کا بیٹا تھا وہ اپنے باپ کے خدائی دعویٰ کا منکر ہوا تو راجہ ہرنا کشپ نے اسے قلعہ کی بلند و بالا فصیل سے گرایا اور تیل گرم کڑھاؤ میں پھینکوا دیا۔ دریا میں غرق کرنے کی کوشش کی مگر ہرنا کشپ اپنے ارادے میں ناکام رہا۔ پرہلاد کو گرم ستون سے باندھنے لگے تو وہ شق ہوا اور اس میں وشنو جی شیر کی صورت نمودار ہوئے اور راجہ ہرنا کشپ کو مار ڈالا۔

پرہلاد مندر بھگت کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا جو بعد ازاں تعمیر در تعمیر کے بعد قلعہ کہنہ پر آج منہدم صورت میں موجود ہے۔ پرہلاد کے بعد اس کے پوتے بانا کے حریف راجہ سنب نے بانا کو شکست دی اور ملتان کا سنب پورہ رکھا۔ اس طرح پوجا پرہلاد کے وقت میں ختم ہوگئی تھی، کو دوبارہ رائج کیا، سورج دیوتا کا بت بنوایا اور آدینہ استھان میں رکھوا دیا۔ یہی بت بعد میں مول استھان کے نام سے مشہور ہوا۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب ''رگ وید'' کا زمانہ مورخین نے دو ہزار سال سے تین ہزار سال قبل مسیح کا لکھا ہے۔

سکندر اعظم کی واپسی کے بعد اس خطے کے مقبوضہ علاقوں میں پھوٹ پڑی تو چندر گپت موریہ نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پنجاب اور سندھ پر قبضہ کر لیا۔ چندر گپت کا پوتا اشوک 272 ق م میں تخت نشین ہوا۔ اس نے بدھ مذہب اختیار کر لیا جس نے اس کی کایا پلٹ دی۔ اشوک نے سرکاری طور پر بدھ مت کی تبلیغ

کی اور مختلف ممالک میں مبلغ بھیجے۔ اشوک کی حکومت چار حصوں پر مشتمل تھی اور اس کے ایک حصہ میں کشمیر، پنجاب، ملتان، بلوچستان اور افغانستان کا ایک صوبہ تھا جس کا صدر مقام ٹیکسلا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں مشہور چینی سیاح ہیون سانگ جو بدھ مت کا پجاری تھا، چین سے چلا اور بدھ مت کے تمام اسٹوپوں کی زیارت کرنے کے بعد 641ء میں ملتان پہنچا اور ملتان کا نام موستھان پورہ لکھا۔ اس کے مطابق ملتان تیس ''لی'' یعنی پانچ میل کے علاقے پر محیط ہے اور بدھ مت کی دس خانقاہیں ہیں مگر زیادہ تر خستہ حالت میں ہیں۔ نیاز فتح پوری ''اسلامی ہند'' میں لکھتے ہیں کہ اشوک نے سورج مندر سے سورج دیوتا کی مورتی ہٹا کر اس کی جگہ مہاتما بدھ کی مورتی رکھوا دی تھی اور اس کی پوجا ہوتی تھی۔

قدیم زمانے میں خزائن کی حفاظت کے لیے رواج تھا کہ مندر کی مورتیوں اور اس کے زیر زمین تہہ خانوں کو استعمال کرتے تھے۔ سومنات میں بھی حفاظتی فوج بتوں کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ ان خزائن کے لیے بھی تھی جو بتوں کی صورت میں موجود تھے۔

بلاذری کا بیان ہے کہ حجاج بن یوسف نے خلفیہ ولید بن عبدالمالک سے اقرار کیا تھا کہ سندھ کی مہم پر جو رقم خرچ ہوگی اس کا دوگنا خزانہ میں داخل کروں گا۔ فتح ملتان کے بعد محمد بن قاسم کو ایک برہمن نے بتایا کہ قدیم زمانے میں راجہ جے بادین کو اپنا آخری عمر میں دنیا سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس نے ایک حوض بنوایا اور اس میں مندر بنوایا۔ اس مندر میں ایک کمرہ بنوایا اس میں خزانہ رکھوایا اس خزانہ پر مندر ہے اور اس میں مورتی رکھی ہے۔ محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ مورتی ہٹائی جائے جس کے نتیجے میں دوسوتیس من سونا اور طلائی خاک تانبے کے مٹکوں سے برآمد ہوئی جو تیرہ ہزار دوسومن نکلی۔

محمد بن قاسم نے ملتان پر 95ھ میں قبضے کے بعد ایک مسجد تعمیر کرائی اور مسلم راج کا آغاز ہوا اور مختلف اوقات میں گورنر تبدیل ہوتے رہے۔ دیوان چاولی مشائخ کی تبلیغ کے نتیجے میں ہندو آبادی مسلمان ہوئی۔ یہ دور 700ء سے 970ء تک کا تھا۔ سورج مندر سے ملتان کی عظمت وابستہ تھی اس لیے ابتدائی عرب حاکموں نے اس کو قائم رکھا۔ ویسے بھی اس کو قائم رکھنے میں سیاسی اور مالی مفادات وابستہ تھے۔ ابن رستہ 290ھ میں ملتان آیا اور لکھا کہ ملتان میں ایک بت ہے جس کی بڑی آمدنی ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ آسمان سے اترا ہے۔ اس بت کی زیارت کے لیے سالوں کی مسافت طے کر کے ہندو آتے تھے۔ سر کو منڈوا دیتے اور بائیں طرف سات دفعہ طواف کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بت کی خوشنودی کے لیے جان کی قربانی بھی دیتے تھے۔ اس مندر کی آمدنی بنو امیہ (عرب مسلمان حکمران) کی ملکیت تھی۔ معروف مورخ مسعودی 303ھ (915ء) میں لکھتا ہے کہ ملتان میں ابن اسد قریشی کی حکومت ہے اور مندر کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی غیر مسلم راجہ حملہ آور ہوتا ہے تو حاکم ملتان بت توڑنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اس طرح ہندو راجہ لشکر واپس لے کر چلا جاتا ہے۔

اس مذہبی ماحول میں ایسی تبدیلی آئی جس کے دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ 373ھ (980ء) میں جلم بن شیبان قرامطی نے ملتان پر قبضہ کرلیا۔ جلم بن شیبان نے محمد بن قاسم کی تعمیر کردہ مسجد گرادی اور نئی مسجد تعمیر کرائی۔ سورج مندر کو بھی گرایا گیا۔ بشاری مقدسی 375ھ میں ملتان آیا تو مندر موجود تھا جبکہ 377ھ میں تخت ملتان پر شیخ حمید نظر آتا ہے۔ اس طرح قیاس یہی ہے کہ جلم بن شیبان 376ھ میں فوت ہوا۔

ملتان میں اہل اللہ کی دیگر ممالک سے آمد کا سلسلہ 1115-1118ء کے درمیان شاہ یوسف گردیزؒ کی آمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کا کام شروع کیا۔ شیخ بہاء الدین زکریاؒ 1169ء میں پیدا ہوئے اور ملتان میں قیام اختیار کیا۔ آپؒ نے علم کی شمعیں روشن کیں اور مدرسہ بہائیہ قائم کیا جس میں دور دراز سے طالب علم پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ آپؒ کے دور میں قطب الدین کاشانیؒ بھی ایک مدرسہ کے مہتمم تھے۔ آپؒ ان کی اقتدا میں صبح کی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ آپؒ کے بعد آپؒ کے فرزند صدر الدین عارفؒ اور شاہ رکن عالمؒ نے بھی ان تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ جن دیگر اولیاء اللہ اور بزرگوں نے لوگوں کو نیکی اپنانے اور شعائرِ اسلام کی پابندی کے درس اپنے اپنے عہد کو معمول بنائے رکھا ان میں شاہ شمس سبزواریؒ، عبدالرشید حقانیؒ اور سید موسیٰ پاک شہید کے اسمائے گرامی بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

حافظ جمال اللہ ملتانیؒ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے مرید تھے۔ خواجہ مہارویؒ کے مرشد مولانا شاہ فخر دہلوی نے فرمایا ''میاں نور محمد! اب تک ملتان حضرت بہاء الحق کی ولایت تھی لیکن اب ملتان ہمارے حوالے ہوگیا۔ لازم ہے کہ اپنے مریدوں میں سے کسی کو وہاں بھیجو''۔ چنانچہ نور محمد مہارویؒ نے حافظ محمد جمال اللہ ملتانیؒ کو ملتان روانہ کیا جنہوں نے حضرت خدا بخش ملتانی کو خانقاہ بہاء الحق ملتانی میں مرید کیا۔ حافظ جمال اللہؒ نے یہاں اپنا ایک مدرسہ قائم کیا جو علم وفضل کا ایک اعلیٰ مرکز رہا۔

اسلامی علوم کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں مختلف ادوار میں مدارس کا قیام عمل میں آتا رہا۔ محمد بن قاسم نے مسجد کی تعمیر کرائی۔ اس میں دینی مدرسہ قائم کیا۔ ان کے ہمارہ جو علماء اور حفاظ تشریف لائے تھے انہوں نے یہیں پر ہی تعلیم وتبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ نے مدرسہ بہائیہ قائم کیا جس میں وہ خود بھی تعلیم دیتے تھے۔ علامہ قطب الدین کاشانیؒ نے ناصر الدین قباچہ کی دعوت پر ملتان میں مدرسہ قائم کیا جس میں منطق، علم الکلام اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کے مطابق ملتان پورے ہند میں دہلی کے بعد سب سے بڑا علم وادب کا مرکز رہا۔

مساجد کا قیام بھی مسلمانوں کے ملتان پر قبضہ کے وقت سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ مختلف حکمران اور امراء مساجد تعمیر کراتے رہے۔ 1514ء میں ملتان جب شیر شاہ سوری کے قبضہ میں تھا تو اس نے حضرت بہاء الدین زکریاؒ، شاہ رکن عالمؒ اور شاہ یوسف گردیزؒ کے مزارات کے ساتھ روغنی اینٹوں کی مساجد تعمیر کرائیں۔ مسجد عیدگاہ 1735ء میں نواب عبدالصمد خان نے تعمیر کرائی۔ مسجد شاہ شمس سبزواری 1751ء میں تعمیر ہوئی۔ آج

بھی ملتان کی سرزمین پر موجود سینکڑوں مساجد اس شہر کے مذہبی اور اسلامی تشخص کو نمایاں کرتی نظر آتی ہیں۔

ملتان اپنے مقابر، مساجد، علماء، فضلاء اور مشائخ کی وجہ سے مذہبی اعتبار سے زمانہ قدیم سے مقدس اور متبرک خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اسے پیری پور ملتان بھی کہا گیا ہے اور ملتان شریف کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی نے فرمایا تھا۔

ملتان ما بہ جنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پابنہ کہ ملک سجدہ می کنند

(روزنامہ خبریں ملتان - محمد اسلم میتلا)



ڈاکٹر عبدالغنی شکیل

امیر خسروؒ کا قیام ملتان

ایسے افراد کی تعداد بہت کم ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کا ادراک اور ان کا حسب تقاضا استعمال کر کے اپنا لوہا منواتے ہیں۔ ایک عالم کو اپنا گرویدہ کر لیتے ہیں۔ ان کا نام تاریخ کے اوراق میں زریں حروف میں جگمگات ہے۔ ایسی ہی ایک عظیم ہستی امیر خسروؒ کی ہے۔ تقریباً 8 صدیاں گزرنے کے بعد بھی امیر خسروؒ کے علم، فن، شعر و ادب میں مہارت کا اعتراف سب کرتے ہیں۔

امیر خسروؒ 1253ء میں ریاست قنوج کے ایک چھوٹے سے قصبے پٹیالی (مومن آباد) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام ابوالحسن خسرو رکھا گیا۔ بعض مؤرخین نے آپ کا پورا نام ابوالحسن یمین الدین خسرو تحریر کیا ہے۔

8 سال کی عمر میں یتیم ہو جانے والے امیر خسرو نے زمانے کے سرد و گرم کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور طبیعات، علم نجوم، قواعد و بلاغت، الٰہیات، فقہ کے میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا سکہ منوایا۔ شاعری تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

اس دور میں اہل کمال لوگوں کی بڑی قدر و منزلت تھی اس لیے آپ کو پہلے ملک علاؤالدین کشلی خان اور پھر ناصر الدین بغرا خان کے دربار میں اہم مقام حاصل رہا۔ آپ 29 برس کی عمر میں دہلی تشریف لے آئے تو ان کی ملاقات ملتان کے شہزادے محمد قاآن سے ہوئی۔ شہزادا محمد قاآن آپؒ کے علم و فضل سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے آپؒ کو ملتان آنے کی دعوت دی اور آپؒ ملتان تشریف لے آئے 1282ء میں ملتان سلطنت کا ایک نہایت اہم حصہ تھا۔ یہ شہر بے مثال اس وقت بھی علم و ادب کا ایک بہت مشہور اور اہم مرکز تھا۔ آپؒ کی ملتان آمد سے ان علمی، ادبی محفلوں کی آب و تاب میں بہت اضافہ ہو گیا۔ آپؒ ہر مجلس کی جان، ہر محفل کی شان بن گئے۔ کبھی علمی محفل جمتی تو کبھی شاعری کی مجلس کا انعقاد ہوتا۔ مدینۃ الاولیاء ان دنوں سلسلہ عالیہ سہروردیہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ حضرت بہاء الدین ملتانیؒ کا ہر طرف طوطی بول رہا تھا۔ ایسے وقت میں امیر خسروؒ جو طوطی ہند بھی کہلاتے تھے نے بھی ملتان کے دینی حلقوں میں اپنے وجود کا اثبات کرایا۔ آپؒ نے تصوف و معرفت کے کئی مراحل اور سلوک کی کئی منازل سے لوگو کو متعارف کرایا۔ لوگوں میں ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ دین حنیف سے محبت کی لگن اور تڑپ بھی پیدا کی۔ آپؒ کا صوفیانہ مسلک

نہایت منفرد وممتاز تھا اس لیے ہر خاص و عام آپ کی جانب متوجہ ہوا اور آپؒ کا گرویدہ ہو کر رہ گیا۔ سلطنت ملتان جب زوال کا شکار ہوئی اور منگولیوں کی یلغار کے نتیجہ میں اس کا شیرزاہ بکھر گیا۔ شہزادہ قاآن منگولوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں مارا گیا اور منگول ملتان پر قابض ہو گئے۔ ہر طرف ظلم و جبر کا بازار گرم ہو گیا۔ امیر خسروؒ کو ایک منگول سپاہی نے اپنا قیدی بنالیا اور دوسرے کئی قیدیوں کی طرح ان کے گلے میں پھندا ڈال کر خود گھوڑے پر سوال ہو کر ان کو پیدل اپنے ساتھ لے چلا۔ امیر خسروؒ اپنی شہرآفاق کتاب ''غرۃ الکمال'' کے دیباچہ میں اس سارے معاملے کا کچھ یوں ذکر کرتے ہیں۔ ''کسے خبر ہے کہ اس برس ملتان جو اہل اسلام کا دست راست ہے کافروں کے حملے سے کیسے تاخت و تاراج ہوا۔ میں اس ابتلاء کو ایسے بیان کروں جس کے آگے موت کا فرشتہ بھی دم بخود ہے۔ میرے قلم میں طاقت نہیں کہ میں مسلمان غازوں کی شجاعت کا نقشہ کھینچ سکوں جو انہوں نے میدان جنگ میں دکھائی۔

شہیدوں کے لہو سے زمین سرخ ہو گئی اور پانی کے مانند ان کا خون زمین میں جذب ہوتا رہا اور قیدیوں کے چہرے ایسے رسوں سے باندھے گئے جیسے گلدستے میں پھول سجائے جاتے ہیں۔ منگولوں نے رسی کے سرے اپنی زینوں سے باندھ دیئے اور خود سوار ہوئے جبکہ قیدی غول در غول یا پیادہ ان کے گھوڑوں کے پیچھے کھنچے ہوئے بھاگتے تھے اور ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور ان کا سانس گھٹ گھٹ جاتا تھا۔

ہر چند کہ اس ابتلاء سے میں بچ رہا تھا تاہم مجھے قیدی بنا کر انہوں نے پکڑ لیا۔ موت کے خوف سے میری جان ناتواں کا سارا خون خشک ہو گیا۔ مجھے منگول کے گھوڑے کے پیچھے ایسے بھاگنا پڑا تھا جیسے بلندی سے ندی کا پانی تیزی سے گرتا ہے۔ پا پیادہ مسلسل بھاگنے سے میرے پاؤں زخمی ہو گئے اور چھالے پڑ گئے۔ میرے پاؤں کنکر اور کانٹوں کے سبب ایسے زخمی ہوئے کہ جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ مجھے اپنی زندگی یوں نظر آنے لگی جیسے تلوار کی دھار سے کٹ رہی ہو۔

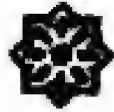
ایسی صعوبت کے باعث میرا جسم اس طرح سوکھ گیا جیسے لکڑا کا خشک دستہ ہو۔ خزاں کے کسی درخت کی مانند میرا بدن ننگا ہو گیا اور جو کچھ میں نے پہنا ہوا تھا وہ خاردار جھاڑیوں میں الجھنے سے پھٹتا رہا اور چیتھڑے بن گیا۔ وہ ملعون جس نے مجھے اپنی قید میں اپنی زین کے ساتھ باندھ رکھا تھا اپنے گھوڑے پر ایسے بیٹھا تھا جیسے چیتا کسی چٹان پر جست لگانے کو بیٹھا ہو۔ اس کے چوڑے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھتے تھے اور اس کی مونچھیں زیر ناف بالوں کی طرح اس کی تھوڑی پر لٹکتی تھیں۔ اگر تھکن کے سبب میرے قدم سست پڑ جاتے تو وہ کبھی خنجر نکال لیتا اور کبھی تلوار سے مجھے ڈرانے لگتا اور میں سوائے ٹھنڈی آہوں کے کچھ اور نہ کر سکتا ھا اور دل میں سوچتا تھا کہ کیا معلوم کب اس قید سے چھٹکارا ہو گا تاہم خدا کا سو سو شکر ہے کہ اس نے مجھے رہائی دلائی اور نہ تو میرا بدن کسی تیر سے چھلنی ہوا اور نہ تلوار ہی کا کوئی زخم آیا۔

اس وقت جب میں بدبخت منگولوں کے ہاتھوں قید ہوا (خدا اس منحوس گھڑی کو ہمیشہ دور رکھے) ہمارا گزر ایک ریگستان سے ہوا جہاں ہر طرف ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے تھے۔ پا پیادہ اور زخمی پیروں کے ساتھ دھوپ کی شدت

نے مجھے جھلس دیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں کسی تپتی ہوئی بھٹی میں پھینکا گیا ہوں۔

راستے میں جب میں اور وہ ملعون منگول جو گھوڑے پر سوار تھا پیاس سے بے حال ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں ایک ندی بہتی تھی ہر چند کہ میرا پیاس کے مارے برا حال تھا اور گرمی سے بدن پھنک رہا تھا میں نے پانی پینے سے احتراز کیا۔ میں نے صرف اپنے ہونٹ پانی سے تر کیئے اور بدن پر پانی ڈالا جس سے قدر سکون ملا لیکن منگول اور اس کے گھوڑے نے پانی پینے میں کوئی دیر نہ کی اور سیر ہو کر پانی پیا یہاں تک کہ ان کا جی پوری طرح بھر گیا مگر تھوڑی دیر بعد منگول اور اس کا گھوڑا دونوں مر گئے۔ یہ منحوس واقعہ جب میں منگولوں کے ہاتھ قید ہوا ہجری کے سن 684 میں ہوا۔ اس وقت میری عمر 34 سال تھی۔'' امیر خسرو منگول کی قید سے نجات پا کر ملتان واپس تشریف لے آئے تاہم شہزادہ محمد قاآن کی شہادت کے سبب وہ واپس دہلی چلے گئے۔

(روزنامہ خبریں ملتان - ڈاکٹر عبدالغنی شکیل)



پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان درّانی

ملتان اور اولیاء کرام

ملتان کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اسلام سے پہلے ملتان ہندو تہذیب کا مرکز تھا۔ چچ نامہ کے مطابق ملتان سندھ کا حصہ تھا۔ ہیون تسانگ چینی سیاح اکتوبر 641ء میں آیا اور اس نے ملتان کو بدھ مت کی تہذیب کا مرکز قرار دیا۔ بدھ مت کے زوال کے بعد ملتان دوبارہ ہندو مت کی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ شہروں سے افضل قرار دیا ہے۔ سکندر اعظم کے وقت 325 قبل مسیح میں یہ ملہی قوم کا مرکزی شہر تھا ملہی قوم بڑی جنگجو اور بہادر قوم تھی۔ اس نے سکندر اعظم کے حملہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سکندر اعظم اس حملہ کے دوران زخمی ہوا بعد میں یہی زخم اس کی موت کا سبب بنا۔

سکندر اعظم کے ملتان پر قبضے کے وقت لوگ آہستہ آہستہ ہجرت کر کے سینکڑوں برس کے دوران نارووال اور سیالکوٹ کی طرف چلے گئے۔ آج بھی یہ قبیلہ اس علاقہ میں بڑا با اثر ہے اور سیاست میں ان کا بڑا عمل دخل ہے۔ 1853ء اور 1864ء میں قلعہ کہنہ پر حکومت برطانیہ کے زیرنگرانی کننگھم نے کھدائی کرائی اور 800 عیسوی کے آثار دریافت ہوئے۔ عربوں کی آمد کے بعد یہ مسلم تہذیب کا مرکز بن گیا۔ مقامی لوگوں نے بزرگان دین کے خطبات اور ان کی عملی زندگی سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ مسلم حکومت کے قیام کے بعد غیر مسلموں سے عمدہ سلوک نے اسے شہرت بخشی۔ اولیاء کرام کی آمد اور دین کی اشاعت کے سلسلہ میں ملتان کی دینی درسگاہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ عربوں کے بعد یہاں گیارہویں صدی عیسوی میں سنٹرل ایشیاء سے مسلم حملہ آوروں کے ساتھ اولیاء کرام بھی تشریف لائے۔ ملتان کو اس کی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اولیاء کرام نے ملتان کو اپنا مسکن بنایا اور اسلام کی اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ پٹریسیا (Patricia) لکھتا ہے کہ برصغیر میں (جغرافیائی) محل وقوع کی بنیاد ہمیشہ بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ چنانچہ ملتان زراعت وتجارت کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کا بھی ہمیشہ مرکز رہا ہے۔ معاشی خوشحالی کی وجہ سے بیرونی حملہ آوروں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ ملتان کو مرکزی شہر ہونے کے ناطے یہاں کے لوگوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ یہاں کے لوگ ایماندار مہمان نواز اور لین دین میں سچے ہوا کرتے تھے۔ ان کی اچھائی کی شہرت دور دور تک تھی۔ یہاں کے حکمرانوں نے علماء اور سکالرز کی سرپرستی

کی۔علی بن حامد بن ابوبکر اشرفی نے ملتان میں بیٹھ کر ناصر الدین قباچہ کے عدہ میں چچ نامہ کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ برزگان دین میں سے پہلے ملتان میں سید ابوالفضل جمال الدین محمدؒ شاہ یوسف گردیز ابن سید شاہ علی ابوبکر افغانستان کے علاقہ گردیز سے 1088ء 481ھ میں تشریف لائے۔آپ حضرت امام حسین بن علیؓ کی نسل سے تھے۔ملتان شہر کے مغرب کی طرف بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ دریائے راوی بہتا تھا آپ نے راوی کے مشرقی بنک النگ پر اپنا مستقل قیام فرمایا۔ مقامی لوگوں نے بڑی پذیرائی کی۔ بوہڑ دروازہ کا النگ والا حصہ ہر وقت لوگوں کے اجتماع سے بھرا رہتا۔آپ نے اسلام کی تبلیغ کی۔ چنانچہ بے شمار لوگ دو دراز سے آ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔تذکرہ ملتان کے مطابق حضرت سید محمد یوسف شاہ گردیز کی پیدائش 450ھ 1057ء میں ہوئی اور 31 سال کی عمر میں دینی علوم مکمل طور پر حاصل کرنے کے بعد ملتان تشریف لائے۔سب سے پہلے شہر سے باہر حضرت موج دریا کے پاس آ کر سکونت اختیار کی بعد میں النگ پر اپنا حجرہ اور مسجد تعمیر کروا کر اندرون شہر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کا وصال 80 سال کی عمر میں 531ھ 1136ء میں ہوا۔آپ کو ان کے حجرہ میں ہی دفن کر دیا گیا۔مرقد پر کمرہ نما مقبرہ 1150ء میں بنایا گیا۔تذکرہ ملتان فارسی زبان میں ملتان سے متعلق واقعات پر لکھی گئی بڑی اہمیت کا قلمی نسخہ ہے۔ یہ نسخہ مخدوم سید محمد یوسف شاہ گردیزی نے 1861ء، 1278ھ میں مکمل کیا۔اس کا مصنف سید محمد یوسف گردیز اول کے خانوادہ سے براہ راست تعلق رکھنے والا عالم شخص تھا۔ یہ کتاب ملتان کی مکمل تاریخ ہے۔ ہندو عہد سے عہد برطانیہ تک کے تمام واقعات بیان کر دیئے گئے ہیں۔اگرچہ حضرت سید محمد یوسف گردیز اول سے پہلے عرب اولیاء کرام بھی یہاں سکونت اختیار کر چکے تھے اور لوکل لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی مگر سنٹرل ایشیاء سے آنے والے اولیاء کرام کے عہد کو مورخین سنہری دور قرار دیتے ہیں۔سنٹرل ایشیاء سے تعلق رکھنے والے ملتان کے حکمرانوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی۔ ان کی سرپرستی کی وجہ سے ملتان دارالامان بن گیا۔ حضرت سید یوسف گردیز کے بعد ملتان میں علاقہ خراسان سے حضرت حسام الدین ترمذی ہجرت کر کے تشریف لائے۔مگر جلد ہی کوٹ کروڑ میں اپنی مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اپنے عہد میں سنٹرل ایشیاء کے علاقہ خوارزم سے تاتاریوں کے حملوں کے دوران حضرت کمال الدین علی شاہ قریشی بھی تشریف لائے اور وہ بھی کوٹ کروڑ میں رہائش پذیر ہو گئے۔کوٹ کروڑ مظفر گڑھ میں واقع ہے اور لیہ بطرف شمال سے 16 میل دور ہے جبکہ لیہ ملتان سے 100 میل پر واقع ہے۔اس طرح کوٹ کروڑ مظفر گڑھ اور لیہ کے درمیان ہے۔ان دونوں بزرگوں کے درمیان بڑی دوستی تھی چنانچہ حضرت حسام الدین ترمذی نے اپنی بیٹی فاطمہ کی شادی حضرت کمال الدین علی شاہ قریشی کے بیٹے حضرت وجیہ الدین سے کر دی۔ سیر العارفین کے مطابق اور مورخ محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریا بی بی فاطمہ کے بطن سے کوٹ کروڑ میں 27 رمضان المبارک بروز جمعۃ المبارک 566ھ 3 جون 1171ء کو پیدا ہوئے۔ آپ 12 سال کے تھے کہ والد رحلت فرما گئے۔ چند سال کے لیے حصول تعلیم کی غرض سے آپ بخارا تشریف لے گئے اس کے بعد بغداد شریف چلے گئے اور پھر مکہ معظمہ حج کیا اور مدینہ منورہ زیارت روضہ مبارک حضرت محمد ﷺ

تشریف لے گئے۔ اس طرح چند سال مکہ اور مدینہ میں قیام فرمایا۔ علم کے زیور سے آراستہ ہوئے۔ آپ نے 12 سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ مدینہ سے علم حدیث شریف شیخ کمال الدین محمد یمنی سے حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد پھر بغداد تشریف لے گئے اور وہاں سید شہاب الدین سہروردی علیہ رحمتہ سے مزید اسلامی تعلیم میں فیضیاب ہوئے۔ پھر آپ کی اجازت سے واپس ملتان تشریف لائے۔ آپ نے حضرت بہاء الدین زکریا کو ملتان کی ولایت دی۔ چنانچہ یہاں آ کر آپ نے حاکم وقت کی اجازت سے قلعہ کہنہ پر مسجد تعمیر کرائی۔ مسجد سے ملحقہ حجرہ میں سکونت اختیار کی اور مدرسہ کی بنیاد رکھی جہاں اسلام کی تعلیم دی جاتی تھی قرآن وفقہ وحدیث کے ساتھ ساتھ طلبا کو مساوات عدل وانصاف، پاکیزگی، امن وسلامتی اور قول وفعل میں مطابقت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا درس دیا جاتا تھا۔ رنگ ونسل کی کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ جلد ہی یہ درس گاہ ایک اقامتی درس گاہ میں تبدیل ہو گئی۔ لوگ حصول علم کے لیے دور دراز سے آنا شروع ہو گئے۔ علم کی شمع نے ملتان کو شہرت بخشی سنٹرل ایشیاء میں تاتاریوں کے حملوں کی وجہ سے ملتان ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اس درسگاہ میں سب سے زیادہ توجہ لین دین میں ایمانداری پر دی گئی کاروباری لوگوں میں رول اور بات چیت کی بنیاد سچائی پر رکھی گئی۔ درس دیا جاتا کہ غلط کام نہ کیا جائے جھوٹ اور ملاوٹ سے نفرت کے درس نے سلسلہ سہروردیہ کو شہرت بخشی۔ ملتان تجارت اور حصول علم کا مرکز بن گیا۔ حکمرانوں نے علماء کی سرپرستی کی۔ زکوٰۃ عشر کی ادائیگی کے درس نے عوام الناس میں غربت ختم کر دی۔ امیری کا تصور جاتا رہا۔ ہر شخص دوسرے کی خبر گیری کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ لوگوں نے مہمان نوازی کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ چنانچہ کاروبار نے بڑی ترقی کی۔ خوشحالی کا دور شروع ہو گیا۔ سلطان شمس الدین التمش نے حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی بڑی عزت کی اور ان کے مدرسہ کی سرپرستی کی۔ ہزاروں اشرفیاں سالانہ ملتان منصبدار سلطان کی طرف سے پیش کرتا۔ جو اقامتی درسگاہ کی ضروریات کو پورا کرتی۔ اس دوران ملتان میں سنٹرل ایشیاء سے حضرت سید جلال الدین سرخ بخاری 1237ء میں تشریف لائے۔ چند ماہ قیام کے بعد اوچ تشریف لے گئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ نے وہاں مسجد بنوائی۔ حجرہ بنوا کر قیام فرمایا اور مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ اس طرح اوچ کو شہرت بخشی۔ ان علماء کی محنت سے لوکل غیر مسلم لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ آپ کے پوتا حضرت جہانیاں جہان گشت نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کے بعد بخارا سے حضرت سید ارجن شیر بخاری ملتان تشریف لائے اور سرائے سدھو میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اس طرح سنٹرل ایشیاء سے حضرت سید زین العابدین المعروف سید سرور شاہ ملتان تشریف لائے اور ملتان سے 16 میل دور جنوبی طرف قیام فرمایا۔ علاقہ آج تک آپ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ علاقہ سرور شاہ کوٹ لاڑ کے قریب کہلاتا ہے۔ آپ کا مزار وہاں پر خاص وعام کی توجہ کا مرکز ہے۔ ان سب علماء نے اسلام پھیلایا۔ الغرض اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ ان علماء کے نیک عمل سے متاثر ہو کر مقامی عوام نے اسلام قبول کیا۔ پندرہویں صدی میں حضرت سید محمد غوث گیلانی جو کہ سید عبدالقادر شاہ گیلانی کے نسب سے تھے علاقہ گیلان سے تشریف لائے اور ملتان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انہوں نے اندرون شہر مسجد بنوائی۔ حجرہ میں قیام فرمایا۔ مدرسہ بنوا کر اسلام کا درس دینا شروع

کیا۔ یہ جگہ ہندوؤں کے درمیان واقع تھی۔ ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ ہندوؤں سے تصادم نہ ہو مگر آپ کی محبت نے ہندوؤں کو ان کا مرید بنا دیا اور ہندو مسلم سب اکٹھے پیار محبت سے اندرون شہر رہنے لگے۔ کبھی آپس میں فساد نہ ہوا۔ یہ سب اسلام کی سچائی کا درس تھا۔ اور ان بزرگان دین کی سادہ زندگی کی وجہ سے تھا ان سب کی زندگی قول وفعل کے مطابق تھی۔ جھوٹ اور عیاری سے ان کو نفرت تھی لالچ کے قریب نہ جاتے۔ انسانیت سے محبت کا درس دیتے سب سے برابری کا سلوک ان کا اصول تھا چنانچہ ان باتوں نے اسلام اور ان بزرگوں کو زندہ رکھا۔

(ماہنامہ آستانہ زکریا ملتان - پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان درانی)



ڈاکٹر روبینہ ترین

ملتان کے صوفیاء (تہذیب اور زبان و ادب پر ان کے اثرات)

گفتگو کے عمومی رنگ سے ہٹ کر محض خصوصیت کے ساتھ کسی علاقے یا ایک خطے میں تہذیب و زبان کے ارتقا کی بات کی جائے تب بھی صوریا کی خدمات اور ان کے کردار کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ملتان کی معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی و ادبی زندگی میں صوفیاء کرام کو جو دخل رہا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ یوسف گردیزؒ نے اب ایک طرف تو لوگوں میں کھوئے ہوئے انسانی وقار کو بحال کیا، ان سے ان کی زبان میں گفتگو کر کے ان کی مقامی زبان (ہندی) کو تقویت بخشی تو دوسری طرف ملتان کے کتب خانے کی بنیاد رکھی کر پہلی مرتبہ ملتان کو علمی خزانے کی اہمیت سے آشنا کیا۔ ان کے مقبرے کی تعمیر سے ملتان میں فن تعمیر کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ خواجہ معین الدین اجمیری نے 5 سال ملتان میں رہ کر تصوف کو عوامی تحریک کی صورت دی لوگوں میں ایک فکری انقلاب پیدا کیا۔ ذات پات اور طبقاتی تقسیم کے خلاف جہاد کر کے تمدنی زندگی کو ایک نیا رخ عطا کیا اور اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنا کر زبان کو قومی وحدت کا ذریعہ بنایا۔ قطب الدین بختیار کاکی نے موسیقی اور سماع کو جائز قرار دے کر اور خود اس میں شغف کا اظہار کر کے فنون لطیفہ کی ترویج کا سامان کیا۔ بہاء الدین زکریا ملتانی نے ملتان میں ایک عظیم درسگاہ کی بنیاد ڈالی لوگوں کی ذہنی، فکری اور جسمانی تربیت کا عملی انتظام کیا۔ حضرت فرید الدین گنج شکر نے وسیع انسانی بنیادی پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر کی۔

انسان دوستی کے آدرش کے ساتھ ساتھ علم او ادب اور فنون لطیفہ کی ترویج ان کی زندگی کا مطمع نظر رہا۔ اردو، سرائیکی اور پنجابی شاعری کے ارتقاء اور اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما کے سلسلے میں ان کو تاریخی تقدم حاصل ہے۔ حضرت شاہ شمس سبزواری فارسی، کشمیری، ہندی اور سرائیکی زبان کے شاعر تھے شیخ صدر الدین عارف بھی شعر و شاعری میں شغف رکھتے تھے۔ خود بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ عراقی جیسے شاعر نے ان کی شاعری کی تعریف کی۔ اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے سید جلال الدین سرخ بخاری نے اُچ میں خانقاہ "بخاریہ" کی بنیاد رکھی۔ اس خانقاہ میں علمی اور روحانی طور پر استفادہ کرنے والوں کی تعداد بے شمار تھی۔ خانقاہ جلالیہ بھی انہی کی یادگار ہے۔ شاہ رکن عالم نے اپنے دادا بہاء الدین زکریا کی طرح سیاست اور مذہب کا امتزاج قائم رکھا۔ سماع میں بھی دلچسپی لی۔ شیخ حسام

الدین ملتانی نے درویشی و قلندری کا درس علمی طور پر دیا مخدوم جہانیاں جہاں گشت ملتانی، پنجابی، سندھی اور ہندی زبانوں میں نہ صرف گفتگو فرماتے تھے بلکہ درس و تدریس بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اُچ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قائم کیا فنون لطیفہ، ادب و شعر اور زبان و بیان کے لحاظ سے امیر خسرو کی خدمات تو اظہر من شمس ہیں۔

حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کی کتاب ''تیسیر الشاغلین'' علم و معارف کا خزانہ ہے۔ پُرلطف اور ادبی اسلوب میں لکھی ہوئی فارسی کی یہ کتاب علم و اخلاق اور رُشد و ہدایت کی باتوں سے پُر ہے۔ یہ سب باتیں ایک نیک اور باکردار زندگی کے لیے بہترین ضابطے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جابجا ایسے اقوال درج ہیں جن سے انسانی اعمال کی تہذیب ہوتی ہے۔

حافظ محمد جمال ملتانی نے نہ صرف اپنی علمی، اخلاقی، روحانی اور تدریسی سرگرمیوں سے خلق خدا کو فیض یاب کیا بلکہ انہیں باطل کے خلاف علمی جہاد کے لیے بھی تیار کیا اور خود بھی میدان جنگ میں اترے۔ علم و عمل اور دین و دنیا کا بہترین امتزاج ان کی زندگی کا آدرش رہا۔ ان کی ''سی حرفی'' مقصدی اور اخلاقی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اگرچہ اس نظم کی زبان سرائیکی ہے لیکن اُس کا ڈکشن یہ ثابت کرتا ہے کہ اس دور میں بھی سرائیکی اردو کے روابط بڑے مستحکم تھے اور دونوں زبانیں ایک دوسرے سے نامانوس نہ تھیں۔

خواجہ خدا بخش کی شخصیت مرنجاں مرنج، بامروت، تہذیبی اور ادبی سطح پر بڑی قدآور تھی آپ کی گفتگو بڑی دلچسپ اور ادبی حسن کی حامل ہوتی تھی، اشاروں اور کنایوں میں بات کر کے عوام و خواص کے دل موہ لیتے تھے۔ توفیقیہ، توحیدیہ، زوقیہ کے حوالے سے ان کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ وحدت الوجود کی تشریح و تعبیر انہوں نے اس انداز پر کی ہے کہ اس نظریہ کی اشاعت سے محبت اور یگانگی کے جذبات لوگوں میں پیدا ہوئے۔ موقع محل کے مطابق فارسی، اردو اور سرائیکی اشعار، اقوال الامثال کے استعمال میں انہوں نے زبانوں کو مخلوط کیا اور ظاہر ہے یہ بہت بڑی ادبی و علمی خدمت ہے۔

حضرت سلیمان تونسوی نے تہذیبی سطح پر تو تونسے کی پوری آبادی کو متاثر کیا۔ ان کے مشاغل پیشہ ورانہ مہارت، رہن سہن، اخلاق و آداب سوچ کے انداز اور طعام و کلام سب پر ان کے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کی تفصیل ان کے احوال میں درج کی جا چکی ہے علمیٰ اور فکری سطح پر بھی انہوں نے ایک خاص نقطہ نظر کو پھیلایا اور وہ تھا انسان دوستی، فیاضی، مذہبی ترفع اور فنون لطیفہ و مفیدہ کی ترقی اور ترویج ان کے ملفوظات سے ہم نے ہندی بول، اشعار اور اقوال سابقہ صفحات پر نقل کئے ہیں۔ ان سے زبان و ادب کے سلسلے میں ان کی کاوشوں کا پتہ چلتا ہے۔

غلام حسن شہید ملتان کے صوفی شعراء میں وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے سب سے پہلے باقاعدہ طور پر اردو میں شاعری کی۔ اگرچہ ان کا کوئی مطبوعہ دیوان اردو موجود ہیں جس میں اردو غزلیں، مرثیے، نعت وغیرہ شامل ہیں جن کی تفصیل حضرت غلام حسن شہید کے احوال میں درج کی جا چکی ہے۔ حضرت غلام حسن شہید نے اردو، ہندی، سرائیکی اور پنجابی زبان کو مخلوط کرنے کا تجربہ بڑی کامیابی کے ساتھ کیا اور اس طرح اردو زبان کو مقامی رنگ میں

ڈھالنے اور اس میں دیگر علاقائی زبانوں کے ذخیرہ الفاظ کو شامل کرنے کا فریضہ ادا کیا ان کا یہ کارنامہ یقیناً اردو زبان وادب کی تاریخ میں یاد رکھنے کے قابل ہے۔

خواجہ غلام فرید دوسرے بہت سے عظیم صوفیاء کی نسبت ادب و شعر کے میدان میں زیادہ معروف اور مشہور ہوئے۔ وہ بلاشبہ ایک صوفی صافی تھے لیکن ان کی شہرت وعظمت کا زیادہ تر دار و مدار ان کے عارفانہ کلام پر ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی سرائیکی اور اردو شاعری میں معرفت کے مضامین بھی باندھے اپنے کلچر اور تہذیبی تناظر کو بھی پیش کیا۔ ادب و شعر کے لحاظ سے وہ سرزمین ملتان کی آبرو ہیں وہ ملتان کے خوشحال خاں، شاہ حسین، شاہ عبداللطیف اور سچل سرمست ہیں۔ ان کی کافیاں لوک ورثے کے انمول خزانہ ہیں۔ موسیقی کی دنیا میں خواجہ فرید کی کافیاں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا دعویٰ ہے کہ

''دیوان (دیوان فرید) کی ہر کافی گائی جا چکی ہے اور اصول موسیقی کے تحت کہی گئی ہے۔''

ان صوفیاء کی بدولت ملتان کے شعر وادب میں تصوف کی ایک ایسی مستقل، دیرپا اور مستحکم روایت قائم ہوئی کہ جس کے اثرات آج تک محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ادبی لحاظ سے زیادہ تر ان صوفیاء کی توجہ شاعری جیسے فن لطیف کی طرف رہی۔ نثر میں سوائے ملفوظات کے یا تصوف کے فلسفیانہ مسائل پر تصنیفات کے کوئی ادبی رنگ کی چیز دکھائی نہیں دیتی لیکن شعر کی ایک مضبوط روایت البتہ ضرور ملتی ہے۔ دراصل شاعری جذبات کی زبان ہے اس لیے صوفیانہ کیفیات اور عاشقانہ واردات کے اظہار کے لیے شعری زبان ہی بہترین وسیلہ تھی اور یہی اصول صوفیاء نے اختیار کیا۔ یوں بھی تصوف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''برائے شعر گفتن خواب است'' یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تصوف ہماری فکری اور شعری روایت کا حصہ رہا ہے۔ حضرت رابعہ بصری، ابن عربی، اور تسیری وغیرہ نے عربی میں صوفیانہ شاعری کی۔ فارسی میں ابوسعید ابوالخیر، فرید الدین عطار، سنائی ...... مولانا روم، محمود شبستری، سعدی، عراقی، بیدل اور حافظ جیسے شعراء نے تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اردو میں میر، درد، غالب، ذوق اور اقبال نے صوفیانہ مضامین ادا کیے اور علاقائی زبانوں میں تو صوفیانہ شاعری کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے پشتو میں رحمان بابا، خوشحال خان خٹک، سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، پنجابی میں شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث شاہ اور سلطان باہو اور سرائیکی میں بابا فرید، حافظ جمال، سچل سرمست، علی متقی، خواجہ فرید، غلام حسن شہید، علی حیدر وغیرہ کے نام صوفیانہ شاعری میں اہم ہیں۔

(چندر آب - ڈاکٹر روبینہ ترین)



ڈاکٹر روبینہ ترین

ملتان کے فنونِ لطیفہ و مفیدہ پر صوفیاء کے اثرات کا جائزہ

سرزمین ملاتن کو قرن با قرن سے انسانی تہذیب و معاشرت کے حامل قدیم ترین شہروں اور خطوں پر جو فضیلت حاصل رہی ہے اس کا سبب محض اس کی قدامت یا بابل، نینوا اور موہنجوڈارو کی ہم عصری یا ہمسری نہیں بلکہ اس کا یہ شرف ان صوفیاء اور اولیائے کرام کی بدولت قائم ہوا جنھوں نے اس سرزمین کو اپنا مستقل مستقر بنایا اور یہاں رشد و ہدایت، علم و عرفان، تعلیم و تعلم اور فلسفہ و تصوف کے بیج بوئے بلکہ تہذیب و ثقافت اور ادب و شعر میں مثبت اور تعمیری رویوں کو بھی عام کیا۔ ارض ملتان کے کاخ و کو، قلعہ کہنہ (موجودہ قاسم باغ) اور قدیم اسلوب تعمیر کی حامل عمارتوں، خانقاہوں اور مسجدوں کے نیچے صدیوں اور قرنوں کی تہذیبی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ جملہ فنونِ لطیفہ و مفیدہ کی نشوونما ارض ملتان میں ازمۂ قدیم سے تہذیب و ثقافت کے ارتقاء کا حصہ رہی ہے۔ فن تعمیر، شاعری، موسیقی، ادب مصوری، سنگ تراشی، کاشی گری، خطاطی، جلد سازی، طب و حکمت، قالین بافی، ظروف سازی، نقاشی اور دیگر فنون کے لحاظ سے ملتان دنیا کے کسی بھی شہر سے پیچھے نہیں رہا۔ ارتقاء کا عمل کسی اتفاقی یا لمحاتی حادثے کا مرہون منت نہیں ہوتا بلکہ اس میں صدیوں کے انسانی تجربات شامل ہوتے ہیں۔ انسانی سوچ، انسانی محنت اور انسانی مساعی کا ثمرہ جہاں روایات کو جنم دیتا ہے وہاں امکانات کو بھی منکشف کرتا ہے۔ ابتدائی انسانوں نے جو ورثہ آئندہ نسل کو منتقل کیا آنے والوں نے اس سے استفادے کے بعد اس میں اضافہ کیا نئے آفاق تلاش کئے اور پھر اس روایت میں نئی روایت کو تخلیق کر کے عظیم مستقبل کی طرح ڈالی۔

فنون لطیفہ ہوں یا مفیدہ ...... ان کی ابتداء انفرادی سطح پر ہوئی کسی ایک انسان نے ایک چیز ایجاد کی لیکن اس کی اختراع نے انسانی زندگی کو نئے امکانات سے روشناس کرایا اور پھر اجتماعی سطح کی محنت و ریاضت نے اسے ایک ایسے ورثے میں تبدیل کر دیا جس نے اجتماعی زندگی کی برکتوں میں اضافہ کیا۔ ملتان میں تہذیب و ثقافت اور ادب و فن کی ترویج کا سہرا زیادہ تر صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے سر جاتا ہے کیونکہ صوفیائے کرام نے شائستہ اور شستہ اعمال کی جو بنیاد ڈالی وہ ان کے ادراک جمال اور تشکیل جمال کے سلسلے کی کاوشوں کا ثمرہ تھا۔ ان فنون کے پیچھے صوفیاء کے عقائد، تصورات اور اظہارات کی توانائی بھی موجود تھی اور ان کے تہذیبی مزاج اور داخلی واردات کی قوت بھی۔

فنون لطیفہ ہوں یا مفیدہ ...... ان میں افراد اور اقوام کے تہذیبی رویوں، مذہبی تصورات، ذہنی و قلبی واردات اور نسلی خصائص کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ ملتان میں فنونِ لطیفہ و مفیدہ کے ارتقاء پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فنون کو تہذیبی اور ثقافتی ورثہ بنانے میں ان بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہے جن کے لمحات عرفان سے لوگوں کے قلب و نظر مستیز ہوئے اور پھر انہوں نے بھی عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرنے کے لیے اظہار کے نئے نئے وسیلے اختیار کیے۔ کبھی شعر و ادب کو وسیلہ بنایا کبھی عمارتوں کی تعمیر میں عقیدت کا اظہار کیا کبھی نقاشی اور کاشی گری کے ذریعے ان کی تزئین و آرائش کی کبھی صوفیاء کے ملفوظات کو محفوظ رکھنے کی خاطر خطاطی کے جوہر دکھائے، پھر ان مقدس صفحات کو منقش و مصور کیا۔ کبھی سماع کی وجد آور محفلیں سجائیں کبھی ان صوفیاء کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے مدرسے اور مکتب قائم کیے ...... اور یوں ہمارے بیشتر ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ورثے کا محرک صوفیائے کرام کا وجود مسعود ہی بنا۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے سب سے پہلے ہم فن تعمیر کا تاریخی جائزہ لیتے ہیں۔

1۔ فن تعمیر

کسی بھی قوم کا فن تعمیر اس کی معاشری، ثقافتی اور مذہبی ضرورتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے، مذہب نے فن تعمیر کو بہت متاثر کیا ہے۔ مذہب نے عبادت کا تصور دیا جس سے عبادت خانے وجود میں آئے جو اس مذہب کے عقائد کے مطابق تعمیر کیے گئے۔ فن تعمیر پر اسلام کی گہری چھاپ ہے۔ مساجد اور خانقاہیں مسلم فن تعمیر کے عظیم مظاہر ہیں۔ مسلم فن تعمیر کے بارے میں ڈاکٹر سید اسد علی لکھتے ہیں:

> ''روحانی اعتبار سے اسلامی تہذیب و تمدن کی نشو و نما ایسے علاقوں میں ہوئی تھی جہاں بڑے اور گھنے جنگل نام کو بھی نہ تھے وہاں وسیع و عریض ریگستانی اور نصف بنجر زمین ہوتے ہوئے بھی ہر چیز بڑی صاف اور واضح دکھائی پڑتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم فن تعمیر میں صفائی ستھرائی، ہمہ گیریت، اخلاق کی عمدگی اور ساخت کی عظمت صاف دکھائی پڑتی ہے۔ اسلامی ممالک میں بہت مضبوط عمارتی لکڑی بھی زیادہ حاصل نہیں ہو پاتی تھی اور کئی علاقوں میں تو بڑے بڑے پتھر بھی حاصل نہیں ہو پاتے تھے ان تمام خامیوں کے باوجود اسلام کی اجتماعی عبادت، مساوات جیسی صفات کی وجہ سے معمار کافی وسیع رقبوں کو تعمیرات کے لیے منتخب کرتے تھے جن میں بڑے بڑے صحن، محراب، دالان، گول گنبد وغیرہ بنانے پڑتے ہیں۔
> عرب کے مسلمان ہو جانے کے بعد وہاں کی تمام ثقافتی چیزوں کو قرآن

کی روشنی میں اسلامی رنگ میں رنگ لیا گیا۔ اس کے بعد اسلام کی اشاعت جہاں جہاں ہوئی، وہاں وہاں رسوم کو اسلامی آدرشوں کے مطابق ڈھال کر مسلم ثقافت کو ترقی دی گئی مسلم فن تعمیر نے کہیں تو غرناطہ کے قصرۃ الزہراء اور قصر احمر، کہیں بغداد کے قصر امین اور قصر زبیدہ کے طرز تعمیر کو اسلامی آدرشوں میں ڈھال کر اختیار کیا، کہیں ایرانا ہشت پہلو طرز تعمیر کو اپنایا، کہیں سارنگ، سریانی اثرات کو قبول کیا۔ اس طرح اسیریا بابلونیا، مصر، یونان، روم، بازنطین، بغداد، ایران وغیرہ جہاں جہاں بھی اسلامی قوت روحانیت کی اشاعت ہوئی، مسلمانوں نے اسلام کی روشنی میں ڈھال کر وہاں کی ثقافت اور فنون کو اختیار کر لیا۔"

محولہ بالا اقتباس میں مسلم فن تعمیر کی چند مجموعی اور امتیازی خصوصیات کا تذکرہ ہے جن میں صفائی، ہمہ گیریت، ساخت کی عظمت، وسعت، صحن کی فراخی، دالان، گول گنبد وغیرہ نمایاں ہیں۔ اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم فن تعمیر نے دیگر تہذیبوں کے فن تعمیر سے بھی اثر قبول کیا ہے۔

جب مسلمان برصغیر ہند و پاک میں آئے تو اپنا فن تعمیر ساتھ لائے۔ انہوں نے مقامی فن تعمیر سے بھی استفادہ کیا لیکن اسلامی خصوصیات کو برقرار رکھا۔ دونوں طرز ہائے تعمیر میں واضح فرق موجود ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں:

"اسلامی اور ہندوانی فن تعمیر میں نہ صرف صوری اعتبار سے فرق ہے بلکہ معنوی اعتبار سے بھی اختلاف ہے اور دونوں میں تعمیر کے علیحدہ علیحدہ طریقے بھی برتے تئے ہیں...... مسلمانوں اور ہندوؤں کی مختلف مذہبی و معاشرتی رسوم، نیز ان حالات کے مطالعہ سے جن کے ماتحت وہ زندگی بسر کرتے تھے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کے طرز تعمیر ایک دوسرے سے مختلف ہونا لازمی تھا۔ مسلمان جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے ان کا طریق عبادت بالکل سادہ تھا وہ خدا کو بتوں کے مجازی پیکر میں دیکھنے کے قائل نہ تھے۔ پادریوں اور پنڈتوں کی طرح ان کے کوئی پیشہ ور مذہبی پیشوا نہ تھے۔ اور نہ وہ پُراسرار فضا تھی جو ایسے مذہبی لوگوں کے گرد پیدا ہو جاتی ہے مسلمان مُردوں کو دفن کرنے کے معتقد تھے ان میں قبروں پر پائیدار مقبرے بطور یادگار تعمیر کرنے کا

رواج قائم ہو چکا تھا...... طریقہ تعمیر میں ایک اور فرق یہ تھا کہ ہندو عمارت کو جوڑنے والے مسالے مثلاً چونے کا استعمال نہیں کرتے تھے اس کے برخلاف مسلمانوں کی عمارتوں میں چونا بکثرت استعمال ہوتا ...... مسلمانوں کی مسجد کھلی اور وسیع اور نماز باجماعت کے لیے بڑے بڑے دالانوں پر مشتمل ہوتی تھی اس کے برعکس ہندوؤں کے مندر میں صرف دیوتا کی مورت کے لیے ایک چھوٹا کمرہ ہوتا تھا جس تک پہنچنے کے لیے ایک طویل تنگ و تاریک گزرگاہ ہوتی تھی ...... ہندو اپنی عمارتوں کو سانچوں میں ڈھلی ہوئی مورتوں وغیرہ سے آراستہ کیا کرتے تھے اور مسلمانوں کی عمارتیں رنگ، خطوط، ابھرواتی نقاشی اور خطاطی سے آرائش زیادہ طبیعاتی اور پرکار ہوتی تھیں لیکن مسلمان اپنی آرائشوں میں بہت اعتدال سے کام لیتے تھے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں نے بعض نئی نئی چیزیں بھی داخل کیں مثلاً مینار اور منارے گنبد کا کروی مثلث، ڈاٹ دار محرابیں، آویزے، مقرنس، نصف گنبد والے دوہرے پھاٹک وغیرہ بعض اوقات وہ اپنی عمارتوں پر نقاشی اور طلا کاری بھی کرتے تھے اور کبھی بوقلموں اور رنگوں سے پیدا کرنے اور تعمیری خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے مختلف رنگوں کے پتھر بھی کام میں لاتے تھے۔ بعد میں انہوں نے پچی کاری کا استعمال کیا جس نے ترقی کر کے نگینہ کاری کی شکل اختیار کی۔ مسلمان کاشی کار اینٹیں بنانے اور بنت کاری کی صنعتیں بھی اپنے ساتھ لائے تھے لیکن انہوں نے خاکہ کی شان وشوکت، ہئیت کی دلآویزی اور خط فلکی پر زور دیا۔ جو ان تمام لوازمات سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ انہوں نے خطاطی کے پیچ وخم کھاتے مرغولوں کی مسحور کن خوبصورتی سے فن تعمیر کو چار چاند لگائے۔“

متذکرہ اقتباسات میں ہندو اور اسلامی طرز تعمیر میں واضح فرق بیان کیا گیا ہے۔ یہ فرق اس لیے بھی ناگزیر تھا کہ دونوں قوموں کی طرز معاشرت اور عقائد ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ البتہ مسلمانوں نے جہاں مقامی طرز تعمیر سے فائدہ اٹھایا وہاں برصغیر کے فن پر گہرا اثر بھی چھوڑا۔ فن تعمیر کے بیشتر مروجہ اصطلاحات کا عربی اور فارسی سے تعلق ہے جو یہاں کی زبانوں میں کھپ گئی ہیں مثلاً راج، قلعی، مستری، بارہ دری، دالان، غسل خانہ، بالا

خانہ، دیوان خانہ، قلعہ، مقبرہ، محل وغیرہ مسجد اور خانقاہ مسلم فن تعمیر کے دو بڑے مظاہر ہیں۔ ملتان کی سرزمین میں ان دونوں فن تعمیر کے نادر نمونے موجود ہیں۔ ملتان میں فن تعمیر میں جدت اور اختراع کا آغاز بھی صوفیاء کی آمد کے بعد ہوا۔ لوگوں نے ازراہِ عقیدت مقبروں اور مزاروں کی تعمیر میں خون جگر کی نمود پیدا کی۔ خانقاہوں اور مساجد و مدارس کی تعمیر کے سلسلے میں کاشی گری کا فن چمکا دلکش اور دلفریب نقش و نگار سے مزین کاشی سلیں مغل دور میں خصوصاً مقبول ہوئیں۔ کاشی گروں کے خاندان ملتان میں اب بھی موجود ہیں۔ اور انہیں یہ فن ورثے میں ملا ہے اب ہم ذیل میں فن تعمیر کے کچھ نمونوں کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

مساجد

مسجد مسلم فن تعمیر کی آئینہ دار ہے۔ یہ گنبد، محراب، دالان اور میناروں پر مشتمل ہوتی ہے جسے آیات کی خطاطی، نقاشی، کاشی گری سے مزین کیا جاتا ہے۔ قدیم مساجد میں چھوٹی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ جنہیں مسالے سے جوڑا گیا ہے۔ پتھر کی سلیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ مسجد کا طرز تعمیر پرشکوہ اور مقدس ہوتا ہے۔

1۔ ملتان میں سب سے پہلے محمد بن قاسم نے دو مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ایک قلعہ کہنہ پر جسے علم بن شیبان نے جو اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا بنوامیہ کی یادگار سمجھ کر بند کروا ڈالا۔ بعد میں محمود غزنوی نے جلم بن شیبان کی بنوائی ہوئی مسجد کو بند کروا کے محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کو دوبارہ آباد کیا۔ آخر کار سکھوں نے اسے منہدم کرا دیا۔ دوسری مسجد اندرون ملتان شہر بنوائی جو آج بھی چوڑی سرائے میں خستہ حالت میں موجود ہے۔

2۔ مسجد ولی محمد خان ...... یہ مسجد شہر کے وسط میں یعنی چوک بازار میں واقع ہے اسے 1758ء میں ملتان کی والی علی محمد خان نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ ایک اونچے چبوترے پر واقع ہے اور اس کے پیچھے چاروں طرف دکانیں ہیں جن کا معقول کرایہ وصول ہوتا ہے۔ اس کی دیواروں پر نقش و نگار بنائے گئے ہیں اور قرآنی آیات اور اسمائے اللہ تعالیٰ لکھے گئے ہیں چھت لکڑی کی ہے جس پر نقاشی کا کام کیا گیا ہے۔ منبر و محراب سنگ مرمر کے ہیں۔ صحن کے وسط میں بڑا سا تالاب ہے جو وضو کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس کا دالان اور عمارت اندر سے 17 فٹ چوڑا اور چوالیس (44) فٹ لمبا ہے۔ یہ عمارت بقول سید اولاد علی گیلانی اس علاقہ کی صنعت کاشی گری کا بہترین نمونہ ہے۔ مسجد کے دروازے پر یہ اشعار درج ہیں۔

بفضل ایزد و لطف نبی آخر زماں
"بہ یمن حضرت جیلانی غوث مہر دوجہاں
بہ جائے شخینۂ بازار، بہر بزم و فساد
کہ ید چبوترۂ دار جرم و ظلم عیاں
بنائے مسجد و حمام چاہ حوض عجیب

بساخت برسر بازار ناظم ملتان
برائے بنائش زغیب ہاتف گفت
نمود مسجد عالی علی محمد خان

مندرجہ ذیل اشعار بھی مسجد میں درج ہیں۔

زہے عمارت عالی مسجد ملتان
کہ کردہ بود بنائش علی محمد خاں
کشید برسر بازار دو صد اقبال
لواء دین نبی ہم چو آفتاب عیاں
بماند درکف سنگھاں بہ سال سی وچہار
اسیر و بند کہ می کرد ماہ وصال فغاں
ظہور نور جیسی رہانداز بندش
کہ گشتہ است ظہورش زنور کون و مکاں
پس از شکستن سنگھاں تیار شد ازنو
بہ زینہ ہادستوں بار نقشہ دالاں
چوکرد نور محمد کشادہ از بندش
تبافت ہمچو ستارہ زظلمت سنگھاں

ان اشعار میں مسجد کی تاریخ تعمیر بھی درج ہے سکھوں کی شکست کے بعد اسے دوبارہ آراستہ کیا گیا تھا۔

3۔ ساوی/ سبز مسجد ...... روغنی اینٹوں سے تعمیر کردہ یہ عمارت کوٹلہ تولے خان (تغلق خان) میں واقع ہے عمارت خاصی بلند ہے اندر دیواروں پر یہ اشعار لکھے گئے ہیں۔

جگر خواری ازمے گساری بہ است
کہ غم دیدہ را آہ و زاری بہ است
بیامطر با از طرب بگزویم
زچنگ طرب تار باید گیخیت
زچنگ اجل چوں شاید گریخت
زچنگ طرب نارہا بر قدیم
شنیدی چو احوال گیتی تمام
بجز حق منہ دل بکس والسلام

4۔ مسجد پھل ہٹاں والی...... مسجد ولی محمد خان سے شمال حسین آگاہی کی طرف ذرا آگے بڑھیں تو بائیں جانب ایک اونچی مسجد ہے جو مسجد پھل ہٹاں والی کہلاتی ہے کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر کے لیے فرخ سیر تاجدار ہندوستان (14-1713ء) نے اسی ہزار روپیہ دیا تھا۔ روایت ہے کہ ایک ملتانی فقیر کی دعا سے اسے (فرخ سیر کو) اولاد نصیب ہوئی۔ اس خوشی میں اس نے اسی ہزار روپے بطور انعام فقیر کو دیئے۔ فقیر نے اس روپے سے یہ مسجد بنوا دی۔ اس کی سیڑھیوں پر اور آس پاس گل فروش دکانوں کی رعایت سے یہ نام پڑ گیا۔

5۔ عید گاہ ملتان سے خانیوال کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے عید گاہ واقع ہے یہ مسجد خاصی وسیع و عریض ہے اسے 1735ء میں ملتان اور لاہور کے صوبیدار نواب عبدالصمد خان نے تعمیر کرایا۔ شیخ اکرام الحق کے مطابق "یہ وہی عبدالصمد ہے جس کی لڑکی اپنے زہد و ورع کی وجہ سے علامہ اقبال کی ممدوح بنی۔"

"مسجد کا محراب دار مسقف دالان دو سو چالیس فٹ لمبا ہے اور چون فٹ چوڑا ہے درمیان میں خوبصورت گنبد سے کلاہ پوش ہے کونوں پر بلند مینار ہیں۔ باہر صحن میں اینٹوں کا فرش ہے۔"

اس مسجد کو بھی سکھوں نے تاراج کیا لیکن بعد میں اس کو دوبارہ مرمت کیا گیا اور اس کی شان وشوکت دوبارہ بحال ہو گئی۔ عیدین کے موقع پر یہاں بڑا ہجوم ہوتا ہے۔

6۔ مسجد غوثیہ...... یہ مسجد اندرون شہر حضرت موسیٰ پاک شہید کے مزار کے ساتھ واقع ہے اس کی لمبائی ساٹھ فٹ اور چوڑائی تیس فٹ ہے۔ فرش مرمر کا ہے اور مصلّی سنگ موسی کا بنا ہوا ہے اس کے تین گنبد ہیں اس کی تعمیر کا زمانہ دسویں صدی ہجری ہے۔

7۔ مسجد شاکر خان...... نواب شاکر خان 1753ء میں ملتان کے صوبیدار تھے۔ انہوں نے ابدالی روڈ پر اپنی اقامت گاہ شیش محل کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی۔ مسجد صاف ستھری اور دیدہ زیب ہے۔

8۔ مسجد خدکہ...... قدیر آباد میں خدکوں کے محلے میں واقع ہے۔ اس میں کاشی گری کا کام نہایت نفاست سے کیا گیا ہے۔

ان مساجد کی تزئین نقاشی قرآنی آیات کی خطاطی اور اشعار سے کی گئی ہے۔ اکثر مساجد میں فارسی کے اشعار درج ہیں جن میں مسجد کی تاریخ اور اس کے بنوانے والے کے نام منظوم ہوتے ہیں یہ مساجد ملتان کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

خانقاہیں

ملتان کی خانقاہیں اپنے انوکھے اور منفرد طرز تعمیر کی بدولت پورے برصغیر میں مشہور ہیں۔ ان خانقاہوں کی تعمیر زیادہ تر صوفیاء کے وجود مسعود کی مرہون منت رہی ہے۔ ہر خانقاہ کسی نہ کسی صوفی اور ولی کے ساتھ منسوب ہے۔

اسلامی تصوف میں ان خانقاہوں کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ یہ نہ صرف روحانی فیوض کا مرکز رہیں بلکہ درس و تدریس اور عملی تربیت کے بہترین ادارے بھی تھیں۔ ملتان کی بعض خانقاہیں مسلم فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان خانقاہوں میں چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

خانقاہ دیوان چاول مشائخ

حضرت دیوان چاول مشائخ برصغیر پاک و ہند کے پہلے صوفی ہیں اور اس اعتبار سے ان کا روضہ بھی قدیم ترین ہے۔ مقبرے کو موجودہ شکل میں محمود غزنوی نے تعمیر کرایا اور جہانگیر نے اس کی مرمت کرائی اس مزار کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہاں بڑے بڑے صوفیاء نے چلہ کشی کی اور روحانی طور پر اکتساب فیض کیا۔ پروفیسر محمد امین لکھتے ہیں کہ

> ''آپ کے مزار پر بڑے بڑے صوفیاء نے چلہ کشی کی اور فیض پایا جن میں بابا فرید گنج شکر، جلال الدین سلمان، بہاء الدین زکریا ملتانی، عثمان مروندی، لال شہباز قلندر جیسے صوفیاء کے اسماء شامل ہیں ...... ہندوؤں نے بھی آپ کے مزار پر چلہ کشی کی جن میں بابا گورو نانک بھی شامل ہیں۔''

موجودہ عمارت دیوان مولراج کے زمانے میں نئے سرے سے تعمیر ہوئی روضے کی تعمیر کے بارے میں لالہ حکم چند لکھتے ہیں۔

> ''یہ خانقاہ اندر موضع چاولی مشائخ پرگنہ میلسی متصل موضع ساہو کے حد شرقی پر واقع ہے یہ خانقاہ و مسجد پختہ اور دروازہ و چار دیواری ہر ایک پختہ ہے ایک مسجد کہنہ شکستہ جانب شمال روضہ سے ہے جو تعمیر کردہ محمود غزنوی بیان کردہ ہیں۔ دوسری مسجد جانب شرق روضہ کے تعمیر کردہ جہانگیر بادشاہ کی ہے اور اندر روضہ کے ایک تربیت دیوان صاحب دوسری مزار کنگن برس ہمشیرہ دیوان صاحب کی ہے اور روضہ کے باہر اندر احاطہ ایک عصا دیوان صاحب کا پڑا ہوا ہے اور احاطہ روضہ سے باہر مکانات ذیل ہیں۔''

خانقاہ کا یہ قدیم ترین نمونہ بڑی شکستہ حالت میں ہے پھر بھی مساجد اور روضہ کا فن تعمیر دیدہ زیب ہے اور اس دور کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

خانقاہ شاہ یوسف گردیز

حضرت شاہ یوسف گردیز کا مزارفن تعمیر کا ایک انوکھا اور عمدہ شاہکار ہے۔ یہ قدیم ترین مزاروں میں سے ایک ہے اسے 1150ء میں شاہ یوسف گردیز کی وفات کے بعد تعمیر کیا گیا۔ یہ اندرون بوہڑ گیٹ محلّہ شاہ گردیز میں واقع ہے اس کا ایک نمونہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ فنی لحاظ سے یہ مقبرہ سادہ اور چوکور ہے۔ اس کی لمبائی 37 فٹ اور چوڑائی 32 فٹ ہے۔ اس میں جو اینٹیں استعمال ہوئی ہیں ان کی لمبائی آٹھ انچ اور موٹائی دو انچ ہے۔ دروازے کے اوپر چھت کے سہارے کے لیے اینٹوں کا قوس نما محراب ہے جو اسلامی طرز کا مظہر ہے۔ چھت میں آئینے جڑے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر نیلے رنگ کی روغنی اینٹیں لگائی گئی ہیں۔ شیخ اکرام الحق نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔

> ''سقف میں چھوٹے چھوٹے آئینے اور دیواروں کے اندر اور باہر نیلے رنگ کی روغنی اینٹوں کو بیل بوٹوں کی طرح جڑا گیا ہے جس میں منظر دیدنی ہو گیا ہے۔ مربع جسامت کے لکڑی کے لمبے ٹکڑے کونوں میں مضبوطی پر تشدید کے لیے نصب ہیں۔ چوبیں نقش کاری کا اولین نمونہ شاہ دروازہ پر کتبہ تاریخ ہے جو اب لاہور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔''

پرسی براؤن کے مطابق شاہ یوسف گردیز کا مزار اپنی طرز تعمیر کے اعتبار سے ملتان کے دوسرے مقابر اور مزارات سے مختلف اور منفرد ہے۔ اس کی صرف ایک منزل بنائی گئی ہے۔ ریاض احمد ملک اس مزار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''اس قسم کی عمارتیں صرف ایران میں نظر آتی ہیں جبکہ طرز تعمیر میں ان کا اثر صرف اور بیرونی آرائش میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جہاں مختلف رنگوں کے امتزاج اور اینٹوں کی بناوٹ سے زیبائش و تزئین کا کام لیا گیا ہے...... اگرچہ زیادہ تر اینٹوں پر رنگوں سے آرائش کی گئی ہے لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جن پر نمونے ڈھلائی سے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ گہرائی کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ گوناگوں رنگوں کی یہ آرائش فن کی ابتدائی حالت نمایاں کرتی ہے جس سے مجموعی طور پر ایک لطیف احساس زیبائش اور ایرانی طرز تعمیر کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔''

روضہ غوث بہاء الحق

یہ روضہ قلعہ کہنہ (موجودہ قاسم باغ) پر بھگت پر ہلاد مندر سے متصل ہے۔ شروع سے لے کر آج تک مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔ اس مزار میں حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی کے ساتھ ان کے فرزند اور خلیفہ شیخ صدر الدین عارف بھی مدفون ہیں۔ یہ مقبرہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے اپنی زندگی میں خود تعمیر کرایا تھا اور اس میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تھی۔ یہ مزار 1848ء کے محاصرے میں تبدیل ہو گیا تھا اور مسلمانوں نے اسے دوبارہ بنوایا۔ اس کی تفصیل ہم شیخ اکرام کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

> "مقبرہ ساڑھے نو فٹ کے آثار پر چوکور اساس پر تعمیر ہوا ہے مقبرہ اندر 53 فٹ مربع ہے اس کا طرز کا دوسرا مزار ہندو پاکستان میں فقط ایک اور ہے جو سیونی پت میں ہے ...... شہتیر نما چوبی ٹکڑے مختلف کونوں میں مضبوطی پیدا کرنے کے لیے لگائے گئے ہیں دروازوں اور ان کے اوپر دریچوں پر اسی قسم کے چوبے ٹکڑے تہ بہ تہ مختلف اونچائیوں میں نصب کئے گئے ہیں جن سے سطح سطور کا دلآویز نقشہ پیدا ہو گیا ہے۔ مقبرہ کے اندرونی کمرے کے صدر دروازہ کی لکڑی پر آیۃ الکرسی خط نسخ میں نمایاں طور پر لکھوائی گوی ہے۔ چوب کاری میں کاری گروں نے صرف اسلامی یا ایرانی روایات کو ہی مدنظر نہیں رکھا بلکہ اپنی فنی صلاحیت اور تخیل سے بھی کام لیا ہے مثلاً دروازہ کی چوکھٹ کے بازوؤں پر جہاں لکڑی میں اس کا نمونہ ابھارا گیا ہے جس کے مجموعی اثر سے خیمہ کی بنیادی اسلامی تصوف کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔
> تربت کے گرد چوبی منقش کٹہرہ بعد میں لگایا گیا۔"

یہ مقبرہ ملتان کے مخصوص فن تعمیر کا ایک نہایت عمدہ نمونہ ہے جو تناسب اور ہم آہنگی کا شاہکار ہے اس کا منقش محرابی دروازہ لکڑی کا بنا ہوا ہے چالیس فٹ اونچی بنیادی منزل میں کسی قسم کی آرائش نہیں کی گئی۔ لیکن ریاض احمد ملک کے الفاظ میں۔

> "اگر چہ عمارت کا طرز تعمیر سادہ ہے لیکن پہلی نظر میں اس کی مقصدیت سے بھرپور اثر آفرینی اور عظمت اپنی پوری سادگی اور وقار کے ساتھ نظر آجاتی ہے۔"

موسیٰ پاک شہید

موسیٰ پاک شہید کا مزار اندرون پاک دروازہ واقع ہے۔ پاک دروازے کی طرف بازار صرافہ کے طرف جائیں تو بائیں ہاتھ پر ایک بلند دروازہ آتا ہے جس پر یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

سگ درگاہ میراں شو چو خواہی قرب یانی

کہ بر شیراں شرف دارد سگ دربار جیلانی

دروازے کے اندر داخل ہوں تو سارا راستہ چھت سے ڈھکا ہوا ہے پھر ایک بڑا احاطہ آتا ہے جس کے بائیں جانب مزارات اور سامنے سبز رنگ کا روضہ واقع ہے خانقاہ کے اندر کے دروازہ پر پیتل منڈھی ہوئی ہے اور لکڑی پر چاندی کے ٹکڑے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ قبہ کے نیچے 22 فٹ مربع عمارت ہے۔ جس کے اندر 8 فٹ مربع مرمریں چبوترہ ہے۔ اس میں تین قبریں ہیں۔ درمیانی قبر حضرت موسیٰ پاک شہید کی ہے۔ قبر میں پتھر کی جالی کے جھروکے ہیں رات کو جب بجلی کے قمقمے روشن ہوتے ہیں تو بڑا حسن پیدا ہوتا ہے۔

روضہ شیخ رکن الدین عالم

اگر کوئی شخص ملتان میں داخل ہونے سے پہلے اس کے کسی منظر کا نظارہ کرنا چاہے تو ملتان کے مضافات میں میلوں دور سے ایک حسین وجمیل اور پرشکوہ گنبد دکھائی دیتا ہے یہ گنبد حضرت شیخ رکن الدین عالم کے مقبرے کا ہے جو قلعہ کہنہ پر واقع ہے حضرت رکن الدین عالم حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے تھے اور وفات کے بعد اپنے دادا کے مزار میں دفن کئے گئے۔ انکا موجودہ مزار سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے تعمیر کرایا تھا کیونکہ وہ زیادہ تر ملتان میں قیام پذیر رہتا تھا۔ 1325ء میں وہ دہلی گیا اور وفات پائی تو اسے دہلی میں دفن کر دیا گیا تھا اور اس کے بیٹے محمد تغلق نے جو حضرت رکن الدین عالم سے گہری عقیدت رکھتا تھا، یہ مقبرہ ان کے لیے وقف کر دیا۔ چنانچہ شیخ رکن الدین کو بعد میں اسی مقبرے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ عمارت اپنے مخصوص طرز تعمیر میں تین ثقافتوں کے امتزاج کی حامل ہے یعنی یہ عربی، ایرانی اور ہندوستانی فن تعمیر کا مرکب ہے۔ ریاض احمد ملک کے مطابق

> ”طرزِ تعمیر میں یہ عمارت تین مختلف ثقافتوں کا اثر ظاہر کرتی ہے یعنی عربی، ایرانی اور ہندستانی۔ ان میں سے ہر ثقافت کے بہترین شواہد ہمیں اس عمارت کے فن تعمیر میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس میں ماہرین تعمیر کا ایک خصوصی نقطہ نظر کارفرما تھا جو یقیناً یہ تھا کہ ایک ایسے عظیم فن پارۂ تعمیر کی تخلیق کی جائے جو اس علاقے کے فن تعمیر کی روشن مثال ہو اور جس سے اس کی تخلیق کی مقصدیت، اہمیت اور علاقے کے لوگوں کے ثقافتی ماحول، ان کی سوچ کے انداز اور بزرگوں کے لیے عزت و

محبت کا احساس صدیوں تک قائم رہے۔"

یہ مقبرہ ہشت پہلو عمارت ہے یہ جو ایرانی طرز تعمیر کا نمونہ ہے لیکن اس کی ترچھی دیواریں ملتانی معماروں کی اختراع ہے اس مقبرے کے ہشت پہلو بنیادیں نوے بانوے فٹ گھیر تک پھیلی ہوئی ہیں مزار کی کل بلندی ایک سو پندرہ فٹ ہے جس کی تقسیم اس طرح ہے۔

(1) پہلی منزل 50 فٹ (2) دوسری منزل 25 فٹ (3) تیسری منزل (گنبد اپنے کلس سمیت) 40 فٹ،...... گنبد کا اندرونی گھیراؤ 50 فٹ ہے۔ دیواروں کی اونچائی 41 فٹ موٹائی 13 فٹ ہے۔ دیواروں میں جگہ جگہ منقش اور منبت لکڑی کے آرائشی شہتیر نصب ہیں۔

مقبرے کے آٹھوں کونوں پر ڈھلوان، مینار اور اوپر کی منزل پر کسی قدر دبا ہوا گنبد اس عمارت کے انوکھے طرز تعمیر کا مظہر ہیں۔ عمارت میں جگہ جگہ روغنی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں جن کا رنگ زیادہ تر نیلگوں اور سفید ہے۔ شیخ اکرام الحق کے الفاظ میں

"چھت پر کامل قوس کا گنبد اس چابکدستی اور مصاحت دانی سے مثمن کی گردن سے نصب کیا گیا ہے کہ وجدانی محراب کا یہ کرشمہ صدیاں گزرنے پر قائم ہے ...... سارے برصغیر ہندو پاکستان میں فقط یہی ایک مقبرہ ہے جس میں لکڑیوں کے شہتیر کام میں لائے گئے ہیں خواہ دیواریں ہوں، خواہ گنبد، تمام تر دوانچ موٹی پختہ اینٹیں لگائی گئی ہیں جو مقامی طور پر تیار کی گئیں اور انکی ضبط میں تشدید پیدا کرنے کے لیے مختلف مقامات پر منقش چوبی ٹکڑے لگے ہیں۔ جو ابن بطوطہ سے بھی خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔"

• اس عمارت میں اہرام مصر کی طرح شکوہ پراسراریت ، انفرادیت، تناسب، جمال اور جلال موجود ہے۔ میرے خیال میں اگر دنیا کی چند عظیم عمارتوں کی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں شاہ رکن عالم کے مقبرے کو ایک اہم مقام حاصل ہوگا۔ ڈاکٹر احمد نبی خان اس عمارت کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"رکن عالم کے مزار ذیشان کا اسلوب اس قدر دیرپا اور ہمہ گیر ثابت ہوا کہ ماہ وسال کی تبدیلیاں اس کی مقبولیت کو کسی طرح بھی متاثر نہ کر سکیں۔ حتیٰ کہ مغل دور کا طرز تعمیر بھی خاصے عرصے تک اپنی پوری باریکیوں اور رعنائیوں کے باوجود اس طرز پر حاوی نہ آ سکا اور مدتوں تک اس سرزمین پر ایسے مزارات بنتے تھے جو رکن عالم کے مزار سے متاثر ہی نہیں اس کی سراسر نقل معلوم ہوتے ہیں۔"

لیہ سے سات میل شمال پر پیر محمد راجن شاہ کا مقبرہ بالکل شاہ رکن عالم کے مقبرے کے طرز کا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ہی معمار نے دونوں مقابر تیار کیے ہیں۔

شاہ شمس سبزواری کا مزار

بیرون دولت گیٹ باغ عام خاص کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ سبز مونگیا رنگ کی یہ عمارت اپنی دلآویزی اور دلکشی میں فرد ہے۔ ابتدائی طور پر یہ مقبرہ 730ھ (1329ء) میں تعمیر ہوا۔ بارہویں صدی ہجری میں یہ عمارت خستہ ہوگئی۔ تو شمس سبزواری کے ایک مرید سیٹھ مہر علی نے 1194ھ (1770ء) میں اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ یہ ایک مربع عمارت ہے جس کی لمبائی اور چوڑائی 35,35 فٹ ہے۔ یہ عمارت شیخ اکرام الحق کے مطابق مثمن اور مثمین شکل میں شاہ رکن عالم کے روضے کے متتبع میں تعمیر کی گئی ہے باہر کی طرف 8 فٹ کی رنگین غلام گردش ہے مقبرے کے اندر گنبد چوبی کٹہرے کے نیچے شاہ شمس کا مدفن ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ فن تعمیر کے ان اسلامی نمونوں میں ہمیں چھوٹی اینٹ کا استعمال نظر آتا ہے۔ ملتان اور پنجاب کے دیگر علاقوں میں اینٹوں کا استعمال اس لیے بھی زیادہ ہے کہ اس میدانی علاقے میں پتھر نایاب تھے چنانچہ پرسی براؤن نے ملتان کی عمارتوں کے بارے میں غلط تو نہیں کہا کہ تزئین اور سجاوٹ کے لیے نقاشی، خطاطی اور کاشی گری سے کام لیا گیا ہے اور اینٹوں کے مسالے سے جوڑا گیا ہے۔ ماہرین کا یہ خیال ہے کہ مسالے کا یہ استعمال مسلمان ہندوستان میں لے کر آئے۔ برصغیر پاک و ہند کے لوگ اس سے ناواقف تھے جیسا کے سابقہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے کہ مساجد اور خانقاہوں کی تزئین کے لیے خطاطی اور نقاشی کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔ خطاطی میں قرآنی آیات اور اشعار استعمال کیے گئے ہیں۔ زیادہ تر اشعار فارسی کے ہیں۔ آیات اور اشعار مسجد اور خانقاہ کی مناسبت سے منتخب کیے جاتے تھے۔ بعض جگہ لکڑی، اینٹوں اور پتھر میں الفاظ کھودے گئے ہیں۔ اور بعض جگہ انہیں خوبصورت رنگوں میں لکھا گیا ہے ان کی ایک تعلیمی اہمیت بھی بنتی ہے۔

خطاطی کے بعد دوسرا طریقہ نقاشی کا ہے۔ محرابوں اور دریچوں کو بیل بوٹیوں سے سجایا جاتا تھا۔ تصویر کشی نہیں کی جاتی تھی کیونکہ یہ مذہبی طور پر ممنوع تھی۔ صرف نقش و نگار سے کام لیا جاتا تھا یہ فن بھی ملتان کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں فیروزی اور نیلے رنگ کی اینٹیں زیادہ استعمال کی جاتی رہیں۔ پھر بتدریج دیگر خوبصورت رنگ ان میں شامل کیے جانے لگے اور انہیں دلکش نقش و نگار سے بھی سجایا جانے لگا۔ ایسی منقش اور رنگین کاشی سلیں مغل دور کے اواخر میں یعنی 1550ء سے 1750ء تک منظر عام پر آنے لگیں۔

فن تعمیر میں کاشی گری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے یہ خاص طرح کا شوخ نیلا رنگ ہے جسے خاص نسخوں کے استعمال سے پیدا کیا جاتا تھا۔ مساجد اور خانقاہوں میں کاشی سلیں عام استعمال ہوئی ہیں۔ یہ تو ان عمارتوں کی تزئین کے طریقے تھے ماہرین نے انہی خوصیات کی بناء پر اس طرز تعمیر کو ملتان کا اسلوب تعمیر کہا ہے۔ ڈاکٹر احمد نبی

اپنے مضمون ''پاکستانی فن تعمیر کا ارتقا'' میں لکھتے ہیں۔

''اسی معاشرے نے فن تعمیر کو ایک نیا اسلوب بھی دیا جسے ملتان کا اسلوب تعمیر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ اسلوب خالصتاً وسطی ایشیائی فن تعمیر سے مستعار اور متاثر تھا اور اس کی ساری جزئیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ گو اس کے ابتدائی سوتے ہمیں بلوچستان کے شہر بیلا یا آج کے بہاولپور، رحیم یار خان اور آدم واہان میں ملتے ہیں لیکن اسی سلسلے میں مہتمم بالشان ابتدا خود حضرت بہاء الحق کے مزار سے ہوتی ہے اور انتہا انہیں کے بزرگ پوتے حضرت رکن عالم کے مزار ذیشان سے پاکستان کے اسلامی فن تعمیر کے اسلامی اسلوب میں۔ بہاء الحق کے مزار کو وہی حیثیت حاصل ہے جو وسطی ایشیاء کے اسلوب تعمیر میں سامانیوں کے مقبرے کو حاصل ہے اور مزار رکن عالم کی حیثیت یہاں وہی ہے جو گور امیر اور تاج محل کو یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس قسم کے مزارات کی تعمیر کی روایت برصغیر میں اس عہد سے پہلے کہیں اور کبھی نہیں تھی یہ مزارات ان بزرگ صوفیائے کرام نے اپنی زندگی میں اپنی آخری آماجگاہ کے طور پر تعمیر کرائے تھ اور پختہ اینٹ سے بنے تھے۔ ان کی تقسیم عام طور سے تین طبقوں میں ہے۔ ڈھلواں دیواریں، مہتمم بالشان گنبد، لکڑی کے شہتروں سے بنے ہوئے دیواروں کے قالب اور بیرونی اور اندرونی سطح پر مختلف سائز کی ساری یا روغنی رنگدار اینٹوں کی تزئین اس طرزِ تعمیر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ یہ تزئین وسجاوٹ بعض اوقات اقلیدسی شکلوں میں ہے۔ یا گل بوٹے میں یا پھر قرآنی آیات جو لکڑی پر کندہ بھی ہیں۔ مزار رکن عالم اس طرز کا شاہکار ہے جہاں اس قسم کی تزئین کے نمونے اپنے انتہائے کمال پر ملتے ہیں۔''

م قیصرانی اپنے مضمون ''فن تعمیر'' میں ملتانی فن تعمیر کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ملتانی اسلوب تعمیر نے آنے والے ادوار میں پورے برصغیر کے فن تعمیر کو بہت زیادہ متاثر کیا...... تغلقوں کے عہد میں دہلی میں تعمیر ہونے والی عمارتیں مثلاً غیاث الدین تغلق کا مقبرہ، بارہ گنبد یا اس کے پاس کی مسجد اس ملتانی فن تعمیر کا چربہ تھی...... اس ملتانی فن تعمیر کا اثر اب تک مزارات کی تعمیر میں کارفرما ہے۔ اب بھی اس علاقے میں مزارات یہاں

تک کہ بہاولپور، بہاولنگر اور چولستان میں مساجد بھی اسی طرز پر تعمیر کی جاتی ہیں۔"

2۔کوزہ گری

کوزہ گری اور ظروف سازی بھی ایک مفید فن ہے۔ یہ بھی اسلامی فن کے حسن و جمال کا مظہر ہے اور تمام اسلامی ممالک میں موجود ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مٹی کے ظروف بھی صوفیانہ مسلک کی دین ہیں۔صوفیاء کی سادگی اور درویشانہ اسلوب زیست نے مٹی کے برتنوں کو مقبول بنایا۔آنجوڑے، ڈولیاں (مٹی کی گردیاں) آٹا گوندھنے کے تھال، فیرنی کی چھوٹی پلیٹیں، گلاس، ہانڈیاں، مٹکے، صراحیاں، وضو کے لیے استارے (لوٹے) مٹی کے کھلونے...... یہ سب مٹی سے بنائے جاتے تھے۔ یہ سب ظروف ملتانی گھروں میں بکثرت استعمال میں لائے جاتے تھے اور زمانہ جدید میں بھی ان کا رواج کم نہیں ہوا۔ ملتان میں اب بھی چمکیلے روغنی ظروف گلی، الواح اور اینٹیں وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوزہ گری کا فن یہاں بھی موجود تھا، ملتان ان دونوں قدیم شہروں کے درمیان واقع ہے اور ان کا ہم عصر ہے اس لیے یقیناً یہاں کے لوگ بھی فن کوزہ گری سے واقف تھے لیکن ملتان کے فن کوزہ گری پر ایران کے گہرے اثرات ہیں۔ ایران میں کوزہ گری بہت مقبول رہا ہے۔ سادہ مٹی سے کوزہ گری کی جاتی تھی پھر انہیں پکا لیا جاتا تھا۔ ان پر نقاشی اور خطاطی بھی کی جاتی تھی اور انہیں رنگدار بھی بنایا جاتا تھا۔ تاریخی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ ایران اور ملتان کے گہرے مراسم رہے ہیں اس لیے یہ قیاس درست ہے کہ ملتانیوں نے فن کوزہ گری سے اثر قبول کیا ہوگا۔فن کوزہ گری کے نمونوں اور ان کی نقاشی سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ملتان ایرانی فن کوزہ گری سے متاثر تھے۔ ملتان کے گلدان کاشی گری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔گلدانوں کے علاوہ صراحی کے فن نے ایک مختلف شکل اختیار کی۔ یہ صراحی مختلف شکلوں میں سادہ پختہ مٹی ۸ سے بنائی جاتی ہے۔مٹی کے اوپر ہی آرائش کی جاتی ہے جس پر بعد میں رنگ بھر دیئے جاتے ہیں۔صراحی کا یہ انداز ہمیں ملتان اور اس کے گرد و پیش کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتا۔ ملتان کے فن کوزہ گری میں گلدان اور صراحی کو قابل ذکر نمونے قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس طرح ملتان کے ہر دور میں اونٹ کے چمڑے سے تیار شدہ منقش اشیاء یہاں کے مخصوص فن کا مظہر رہی ہیں۔ زمانہ قدیم میں خوبصورت کمانیں بنائی جاتی تھیں کیونکہ تیر اندازی کا فن ملتان میں بڑا مقبول رہا۔صوفیاء کے مدرسوں میں طالب علموں کو تیز اندازی سکھائی جاتی تھی اس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ خود حافظ جمال ملتانی ماہر تیر انداز تھے۔ گویا یہ اسلحہ سازی کے سلسلے میں کا اہم کاروبار تھا۔کمانوں پر نقش و نگار اور بیل بوٹے بنائے جاتے تھے۔علامہ عتیق فکری کے مطابق تیر کمان پر لوگ نقاشی کا کام کرتے تھے اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کمان کو ایسی حکمت عملی سے طاقت ور بناتے تھے کہ اچھا جوان بھی اس پر چلہ نہیں چڑھا سکتا تھا۔تلوار کی میان پر بھی یہ لوگ سونے کے ورق چڑھا کر نقاشی کا کام کرتے تھے۔عرض ملتان میں یہ کام تقریباً سات سو برس سے رائج تھا۔ملتان میں محلہ کمنگروں کا آج بھی موجود ہے، اونٹ کے چمڑے سے ٹیبل لیمپ، گلدان، مرتبان اور آرائش کی دیگر چیزیں تیار کی

جاتی تھیں۔

ملتان کے قدیم پیشے کاشی گری، کمنگر، سوتری وٹ، زین ساز، چوڑی گر، دبگر (مٹی اور کاغذ سے ملا کر اشیاء بنانے والے) پونگر (رنگریز یا رنگ ساز) پاولی (نور باف) ٹلاری، پٹولی (ریشم باف)، معمار، چوب تراش وغیرہ فنون مفیدہ کے موجود اور مروج رہے ہیں اور آج بھی ہیں ان کے فن پر کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح مذہبی روایات اور صوفیانہ مسالک کے اثرات مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔

3۔قالین بافی و پارچہ بافی

مساجد اور خانقاہوں کی سجاوٹ اور تزئین کے سلسلے میں قالین بافی، دریاں، چادری، لنگیاں دریائی اور سوسی وغیرہ کا مفید کام شروع ہوا۔ زمانہ قدیم میں قالین بافی کا فن بطور خاص عروج پر تھا۔ شیخ اکرام الحق ارض ملتان میں لکھتے ہیں۔

> ''ایرانی اثرات کے ساتھ یہ صنعت بھی ملتان آئی۔ سوت اور اون کو ملا کر قالین تیار کئے جاتے مگر ایرانی اونی قالینوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اس لیے ان کو چنداں فروغ حاصل نہ ہوا البتہ تقسیم کے بعد اونی قالین بننے لگے جو زرمبادلہ کے حصول کے لیے انگلستان کو خاصی مقدار میں برآمد کئے جاتے ہیں اور اچھی قیمت پاتے ہیں۔''

محولہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم سے قبل ملتانیوں کو قالین بافی میں اتنی مہارت نہیں تھی کہ ان کے قالین ایرانی قالینوں کا مقابلہ کر سکتے مگر تاریخ میں یہ واقعہ درج ہے کہ شاہ جہان نے حرم پاک کے لیے جو قالین بھیجا وہ ملتان سے بنوایا گیا تھا۔ یہ واقعہ ملتان کے کاریگروں کی مہارت کی دلیل ہے۔ علامہ عتیق فکری نے اپنے مضمون میں چوہدری عبدالحق چشتی مرحوم کا ذکر کیا ہے جو فن قالین بافی کے ماہر تھے وہ لکھتے ہیں۔

> 1923ء میں جب لندن میں قالین بافی کے شاہکار نمائش میں پیش کئے گئے تو چوہدری عبدالحق صاحب نے بھی ایک قالین اور دو نمونے تیار کر کے وائسرائے ہند کی معرفت لندن بھجوائے ......شومئی قسمت کہ وائسرائے کی بیگم قالین دیکھ کر للچا گئیں اور انہوں نے قالین تو اپنے ہاں رکھ لیا مگر وہ نمونے لندن بھجوا دیئے۔ لندن میں مصنوعات پر تقسیم انعامات کا موقع آیا تو قالین کے ان دو نمونوں کو سیکنڈ پرائز ملا۔ ساتھ ہی انہوں نے لکھ بھیجا کہ اگر مکمل قالین ہوتا تو فسٹ پرائز دیا جاتا۔''

سید اولاد علی گیلانی لکھتے ہیں:

''ملتان کے قالین ولایت میں بڑی بڑی نمائشوں میں معقول انعام اور تحفہ جات حاصل کر چکے ہیں۔''

قالین بافی کے ساتھ جس صنعت کو فروغ ہوا وہ پارچہ بافی کی صنعت تھی جس میں ملتان کی دریاں، چادریں اور لنگیاں مشہور ہوئی۔ ملتان میں یہ کام صدیوں سے ہو رہا ہے اور علامہ عتیق فکری کے مطابق

''عربوں کی آمد سے پہلے بھی یہاں پر ریشمی کپڑا بننے والے موجود تھے ...... ملتان کی دریاں، تعصیلہ اور لنگیاں، ریشمی دوشالے صدیوں سے مشہور ہیں۔ ہندوستان کی صنعت کے تذکرے میں ملتان کو کبھی بھی مورخوں نے فراموش نہیں کیا جب کبھی کپڑے کی صنعت کا ذکر آیا ہے ۔ریشمی کپڑے کے لیے ملتان کا نام خصوصی طور پر لیا گیا ہے۔ اس وقت بھی سر پر باندھنے والی لنگی جو خالص ریشم سے بنی جاتی ہے کابل اور پشاور وغیرہ میں بھی جاتی ہیں اور یہ سوائے ملتان کے اور کہیں تیار نہیں ہوتیں۔''

ملتان کی دریوں، کھیسوں اور چادروں کو اب بھی ملک بھر میں اور ملک سے باہر بھی شہرت حاصل ہے۔ان صنعتوں نے کھڈیوں کو عام رواج دیا۔اس فن میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ دور جدید میں گل ٹیکس، آرٹیکس، علی ٹیکس اور دوسرے کارخانوں کی بنی ہوئی مصنوعات یورپ کی منڈیوں اور نمائشوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔

آج گھریلو دستکاری اور فنونِ مفیدہ سے متعلق صنعت وسیع پیمانے Large Scale کی انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں وجود میں آ چکی ہیں۔لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج چمنیوں سے نکلنے والا دھواں، متحرک اور پیچیدہ مشینوں کی آواز اور لہلہاتے کھیت ملتان کی ترقی یافتہ معاشرے کی گواہی بنچکی ہیں۔مگر یہ فیض اللہ والوں کا ہے جن کے مقابر ملتان اور اہل ملتان کے سر پر مہربان چادر کی طرح سایہ فگن ہیں۔

4 فن خطاطی

مسلمانوں نے ہمیشہ فن خطاطی کو بڑی اہمیت دی۔ اس کا ایک سبب قرآن پاک کی کتابت کے ذریعے سعادت کا حصول اور کتاب اللہ کا تحفظ تھا اور دوسری وجہ رسم الخط کے جمالیاتی خصائص تھے۔عربی زبان خط کے اعتبار سے بہت سی جمالیاتی خوبیوں کی حامل رہی ہے پھر زمانہ قدیم میں پریس کی عدم موجودگی کی وجہ سے زیادہ تر انحصار کتابت پر تھا چنانچہ اس لیے بھی فن خطاطی کی اہمیت اور بڑھ گئی اور اسے شعوری طور پر رواج دیا گیا۔(قرآن مجید کے علاوہ دیگر علمی اور ادبی کتابیں بھی کتابت کی جاتی تھی۔ چنانچہ فنِ خطاطی کے اصول مرتب کیے گئے اور کئی خط ایجاد

ہوئے۔ کتنے علماء اور صوفیاء کے علاوہ مسلمان حکمرانوں نے بھی خطاطی میں دلچسپی لی اور بعض مسلمان حکمران تو خطاطی میں بڑا شغف رکھتے تھے۔ بابر، ہمایوں اور اکبر نے فن خطاطی اور خطاطوں کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ بابر اور بہادر شاہ ظفر تو خود بھی خطاطی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

پاک و ہند میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے ساتھ عربی رسم الخط کا اجراء ہوا لیکن بعد میں یہاں نسخ کی نسبت نستعلیق کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق جب ہمایوں 947ھ میں ایران گیا تو واپسی پر اپنے ہمراہ مصور، جلد ساز اور خطاط لے کر آیا۔ جن سے مقامی فنکار فیض یاب ہوئے اور خط نستعلیق ہندوستان میں بھی رائج ہو گیا۔ یہاں کے ماہرین میں سے مہر نظام اور کاتب الملک وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس کے بعد سید عماد حسنی کے تلامذہ میں سے عبدالرشید دیلمی جیسے خوش خط کاتب یہاں آئے جنہوں نے خطاطی میں برصغیر پاکستان و ہند میں بھی ایران و وسط ایشیا کا سا اسلامی ماحول پیدا کر دیا۔ اس طرز میں لکھنے والے بہت سے نامور کاتب ہر عہد میں ملتے ہیں اور یہ روایت حسن اتفاق سے پاکستان و ہند میں آج بھی موجود ہے۔

مسلمانوں نے فن تعمیر، فن کوزہ گری و برتن سازی اور قالین، الواح اور کتبات میں بھی خطاطی کو استعمال کیا۔ بعض جگہ اسلامی علوم کی تدریس کے ساتھ ساتھ فن خطاطی کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ صوفیاء نے خاص طور پر اس فن میں دلچسپی لی اسے بطور پیشے کے اختیار کیا اور تصوف کی کتابیں تحریر کی۔ صوفیاء ملفوظات قلم بند کئے گئے۔ صوفیانہ مجالس میں ایک نہ ایک مرید خطاط پیدا ہوتا تھا۔ جو مرشد کے ملفوظات رقم کرتا رہتا تھا۔ یوں صوفیاء نے اس فن میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

ملتان کے صوفیاء نے فن کتابت کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے دور میں خطِ نستعلیق کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ حضرت نے جو مدرسہ قائم کیا اس میں دینی علوم کے علاوہ خطاطی اور جلد سازی کے فنون بھی سکھائے جاتے تھے ان دنوں شمس الدین بلخی جیسا خطاط بھی ملتان میں موجود تھا۔ جس سے بہت سے لوگوں نے فن خطاطی سیکھا۔ علامہ عتیق فکری ''نقش ملتان'' میں لکھتے ہیں۔

> ''...... مدرسہ میں مختلف فنون بھی سکھائے جاتے تھے ان میں خاص کر خطاطی اور اعلیٰ قسم کی جلد سازی کا کام بھی تھا۔ جیسا کہ ہم نے قباچہ کے علمی دور میں ذکر کیا ہے کہ محمد بلخی جیسا خطاط اس زمانے میں ملتان میں موجود تھا اور اس کے کئی اہل ملتان میں سے شاگرد تھے۔ عرفی اپنے تذکرے میں شمس الدین بلخی کی خطاطی کے بارے میں لکھا ہے
>
> درخط بدرجۂ کہ ابن البواب انگشت برحرف او توانند نہاد و ابن مقلہ دیدہ از مشادہ دلبران خط او برنتوانند داشت۔''
>
> ...... اس فن کی سرپرستی سے یہ بھی مطلب تھا کہ طالب علموں میں

معاشی ضروریات کو پورا کرنے کی استعداد پیدا کی جائے تاکہ معاشرے پر بوجھ نہ بنیں۔"

علامہ عتیق فکری نے ایک اور جگہ عوفی ہی کے حوالے سے شمس الدین بلخی کا ذکر یوں کیا ہے۔

"شمس الدین بلغی عالم وشاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کا خطاط تھا۔ اور اپنے دور کے مشہور ومعروف خطاط ابن البواب اور ابن مقلہ سے فن خطاطی میں بڑھا ہوا ہے۔"

اسی طرح بعد کے زمانے میں بھی اس فن میں بڑی دلچسپی لی جاتی رہی۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق "ملتان" میں لکھتے ہیں۔

"منشی غلام حسن شہید، منشی نور الدین انصاری نے عاشق محمد بوہت وڈے خطاط سن اینہاں تو وکھ عبدالشکور، فدا حسین، خلیل الرحمٰن، صالح محمد جمالی، حبیب اللہ انصاری، سلیم چشتی، طفیل محمد تے شیر محمد مرحوم دا ناں ہمیشہ صف اول دے کاتباں وچ لکھیا ویسی۔"

ترجمہ:۔ منشی غلام حسین شہید، منشی نور الدین انصاری اور عاشق محمد بہت بڑے خطاط تھے۔ ان کے علاوہ عبدالشکور، فدا حسین، خلیل الرحمٰن، صالح محمد جمالی، حبیب اللہ انصاری، سلیم چشتی طفیل محمد اور شیر محمد مرحوم کے نام ہمیشہ صف اول کے کاتبوں میں لکھے جائیں گے۔)

منشی غلام حسن شہید کے ملفوظات مرتبہ محمد یار میں مرقوم ہے کہ نواب بہاولپور کے منقش قرآن حکیم کا ایک ورق کسی طرح ضائع ہوگیا۔ ملک بھر کے خطاطوں نے کوشش کی کہ ایسا ورق تیار کیا جائے جو باقیاوراق کی خطاطی اور آراستگی سے الگ دکھائی نہ دے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر منشی صاحب نے کمال مہارت کا مظاہرہ کیا کہ جدید ورق کوکوئی پہچان بھی نہ سکا کہ اصل ہے یا نقل۔

قرآن مجید کے علاوہ تصوف کی بیشتر کتابیں مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ بعض کتابوں کو صوفیاء اپنے ہاتھوں سے نقل کر کے دوسرے صوفیاء کو بھیجتے تھے۔ ابن عربی کی "فصوص الحکم" ان کتابوں میں سرفہرست ہے۔ ملتان میں جب اس کا قلمی نسخہ پہنچا تو صوفیاء نے اس کی نقول ہندوستان کے دیگر شہروں میں پہنچائیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ صوفیاء کوفن خطاطی سے کتنی دلچسپی تھی۔ خطاطی کا یہی فن بعد میں مصوفی کا سرچشمہ بھی ثابت ہوا۔ مصوری کی ابتداء خانقاہوں کی تصویریں بنانے سے ہوئی اور بعد میں فطرت کی تصویرکشی اور مناظر کی خوبصورت تصویریں بنائی جانے لگیں۔ گویا خطاطی اور مصوری شانہ بشانہ پنپتی رہیں اور اس فن میں کاغذ کو خاصا دخل رہا۔ ہندوستان میں مسلمانوں ہی نے کاغذ کے استعمال کو رواج دیا۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں۔

"مغل دبستان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصور اور خطاط دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ مغلوں کی تیار کرائی ہوئی کتابوں میں

نظم و نثر خوشنویس لکھتا تھا اور تصاویر مصور بناتا تھا یعنی فن تصویر کے ساتھ ساتھ فن خوشنویسی ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا ایسی بلندیوں پر پہنچ گیا کہ شاید دنیا کی کسی زبان کا رسم الخط آج تک ان بلندیوں کو نہیں چھو سکا جن پر عربی اور فارسی خطاطی کو ہمارے باکمال خوشنویسوں نے پہنچا رکھا ہے۔ یہ دونوں فن صرف کاغذ کی وجہ سے ترقی پذیر ہوے۔ اور ہندوستان میں کاغذ درآمد کرنے والے مسلمان تھے۔ ہندوؤں کی قدامت پرستی کا تو یہ حال تھا ک جس زمانے میں ایشیاء کے اکثر ممالک کاغذ استعمال کر رہے تھے۔ ہندو اپنا وہی بھوج پتر لیے بیٹھے تھے۔ پندرہویں صدی تک بھی ہندوستان میں کاغذ کا رواج کالعدم تھا۔ صرف مغربی ساحل کے گجراتی تاجر سمندر پار کے تاجروں کے ساتھ کاروبار کرنے کی وجہ سے کاغذ استعمال کر رہے تھے''

اس ضمن میں علامہ عتیق فکری کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

''طالب علموں کے لیے کاغذ کا بھی انتظام تھا۔ کاغذ بنانے کا کارخانہ بھی تھا جس میں اچھا کاغذ تیار ہوتا تھا...... غرض اسی طرح ملتان میں کاغذ بنانے کا محلہ قائم ہوا۔ اور آج تک کاغذ کٹوں کا محلہ موجود ہے اور برطانیہ کے دور تک یہ لوگ دیسی چمکیلا کاغذ بناتے تھے۔ یوں ساتویں صدی سے چودھویں صدی تک ملتان میں اس کا عروج رہا۔''

فن خطاطی کے ساتھ مسلمانوں نے جلد سازی کی طرف بھی توجہ دی کیونکہ کتاب کو جلد میں ہی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ جلد سازی میں چمڑا، گتہ، کاغذ اور کپڑا استعمال کیا جاتا ہے۔ (جلد پر مختلف طریقوں سے نقش و نگار بھی بنائے جاتے تھے۔ قرآن مجید کی جلد سازی خوبصورت طریقے سے کی جاتی تھی اور بعض اوقات اس پر سونے کے پانی سے خطاطی بھی کی جاتی تھی) ملتان میں خطاطی کا فن آج بھی زندہ ہے علامہ عتیق فکری نے میاں غلام حسین کا ذکر کیا ہے جو اپنے دور کے بہت بڑے خطاط اور صوفی عالم تھے اور اندرون حسین آ گاہی محلہ کمنگراں میں رہتے تھے۔ حضرت مولانا مہر علی شاہ صاحب سے انہیں عقیدت تھی اور وہ بھی ان سے خاص انس رکھتے تھے۔ دونوں کا وصال بھی ایک سن میں ہوا ان کے آباؤ اجداد حضرت غوث بہاء الدین زکریا سے پہلے براستہ ایران ملتان آئے تھے، نقاشی، خطاطی اور کتابوں کی جلد سازی کا کام ملتان میں انہیں کی وجہ سے اپنے عروج کو پہنچا تھا۔ علامہ عتیق فکری کے مطابق

''بغداد اور کابل میں ان کے (میاں غلام حسین) کے ہاتھ کے لکھے خطاطی کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ حج سے واپسی پر والی بغداد نے کئی

دن انہیں اپنا مہمان ٹھہرایا تھا اور ان سے عربی قطعے لکھوائے تھے۔"

دورِ جدید میں ملتان میں خطاطی کی شغف کے بارے میں سجاد حیدر ملک اپنے مضمون "فن خطاطی" میں لکھتے ہیں۔

"ملتان فن خطاطی کا مرکز بن گیا ہے جس کی روح رواں وہاں کے نوجوان خطاط ابن کلیم ہیں......ان کے والد محمد حسن خان کلیم رقم اور دادا حافظ محمد عبداللہ بھی عمدہ خطاط تھے۔ ابن کلیم نے اپنے چھاپے خانے میں دبستان فروغ خطاطی کے زیر اہتمام خطاطی پر کتابیں شائع کی ہیں انہیں خط نسخ، ثلث اور محقق کے امتزاج سے ایک نیا خط بنام خط رعنا ایجاد کرنے کا دعویٰ بھی ہے......ملتان کے ایک سکول ٹیچر غلام فرید بھٹی نے طغرا نویسی میں خاص مقام پیدا کیا وہ عرصے سے طغرا نویسی کو اپنائے ہووے ہیں اور اس سلسلے میں متعدد نمائشیں منعقد کر چکے ہیں۔ محدود وسائل کے باوجود فن سے ان کی لگن قابل داد ہے۔"

اسی طرح ملتان کے معروف مصور اور شاعر زوار حسین بھی خطاطی کے فن میں ماہر ہیں۔ ملتان آرٹس کونسل کے ذوالفقار بھٹی بھی خطاطی میں مہارت رکھتے ہیں۔

5۔ فن طب

سرزمین ملتان کے دور قدیم میں ہیت، نجوم، طب اور موسیقی کے فنون بے حد مقبول تھے اور تعلیم کا حصہ تھے۔ ہندو پنڈت اپنے گھروں میں ان علوم کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ابوریحان البیرونی جو چھٹی صدی ہجری میں تقریباً چار سال تک ملتان میں قیام پذیر رہا اپنی معروف تصنیف "کتاب الہند" میں اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ ملتان میں ان علوم کی تعلیم کا باقاعدہ اہتمام تھا۔ جب مسلمان ملتان میں آباد ہوئے تو وہ اپنے ساتھ جن علوم وفنون کا ذخیرہ لائے ان میں طب کا فن بھی شامل تھا۔ مسلمان علماء بالخصوص صوفیاء کو طب کے فن سے بڑی رغبت تھی کیونکہ یہ ایک قابل قدر ذریعہ معاش بھی تھا۔ اکثر صوفیاء نے فن طب ہی کو ذریعہ معاش بنایا۔ حکیم رازی، بوعلی سینا اور ابوالقاسم زہراوی نے فنون طب میں بڑی تحقیق کی اور کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی کتابیں صدیوں تک یورپ میں داخل نصاب رہی ہیں۔ ہندوستان میں بھی مسلمان حکمرانوں نے شفا خانے تعمیر کرائے۔ اکبر کے دور میں حکیم علی گیلانی نے بوعلی سینا کی کتاب قانون کی شرح لکھی۔ حکیم محمد اکبر ارزانی کی کتاب "طب اکبر" ہندوستان میں برسوں تک شامل نصاب رہی۔ طب کے میدان میں مسلمانوں کی خدمات کی بناء پر عبدالمجید سالک نے کہا ہے کہ:

"......ان تمام کارناموں کے بعد مسلمانوں کی طب کو محض "طب

یونانی'' قرار دینا بہت بڑی بے انصافی ہے بلکہ اس کو اسلامی طب کہنا
ہر اعتبار سے صحیح ہو گیا۔''

ملتان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد طب کے فن میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ اکثر صوفیاء نے اس فن کو بطور پیشے کے اپنایا اور روحانی و اخلاقی علاج کے ساتھ جسمانی اور مادی عوارض کا علاج بھی کرتے تھے۔ خواجہ معین الدین اجمیری، حافظ محمد اسماعیل، منشی غلام حسن شہید، خواجہ غلام فرید اور کئی ایک صوفیاء طب میں مہارت رکھتے تھے۔

ملتان کے حکیم سلیمان انصاری کا نام بہت مشہور ہے جنہیں طب میں بڑا کمال حاصل تھا۔ شیخ اکرام الحق کے مطابق آپ کو ''ارسطوئے دوراں کہا جاتا تھا۔''

حکیم شیخ محمد سلیمان انصاری اٹھارویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے اور طباعت و حکمت میں معروف ہوئے۔ ان کا مطب اندرون پاک دروازہ محلہ حافظ داؤد میں واقع تھا۔ تشخیص مرض میں خاص طور پر ماہر تھے۔ اس طرح حکیم شاہ بخش بھی دیسی طب میں خاص مہارت رکھتے تھے ان کا مطب محلہ قدیر آباد میں تھا۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ ایک بار ملتان کے ایک نواب نے حکیم اجمل خان کو اپنے علاج کے لیے بلوایا تو انہوں نے کہلوا بھیجا کہ جب ملتان میں حکیم شاہ بخش موجود ہیں تو پھر میری کیا ضرورت ہے۔ ایلوپیتھی کے علاج سے پہلے ملتان میں طب کا فن ہی مروج تھا اور ملتان کے کئی اطباء جن میں حکیم شیر محمد اعوان، حکیم اسماعیل، حکیم بلند خان، حکیم رحیم بخش انوری، حکیم قمر دین، حکیم خلیل، حکیم فیروز الدین، حکیم یزدانی قریشی ہاشمی، حکیم واحد بخش وغیرہ شامل ہیں۔ ملک بھر میں شہرت رکھتے تھے، ملتان میں اطباء کے کئی خاندان موروثی طور پر آج بھی یہی فن اپنائے ہوئے ہیں۔

6۔ عرس میلے وغیرہ

سرزمین ملتان میں عرس، میلے، کھیل تماشے بھی مقابر اور مزارات کی سالانہ تقریبات کے حوالے سے تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا ایک اہم حصہ رہے ہیں اس قسم کے بیشتر میلے کسی نہ کسی خانقاہ یا بزرگ کے ساتھ وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ زمانہ قبل اسلام میں بھی اس قسم کے میلے ہوتے تھے۔ لوگ دور دراز سے بتوں کی یاترا کے لیے آتے تھے۔ اس کا تفصیلی ذکر پہلے باب میں ملتان کی قدامت کے حوالے سے آ چکا ہے۔ بعض میلے غسل میلے (Bathing Fairs) کہلاتے تھے۔ ان میں یہ عقیدہ کارفرما ہوتا تھا کہ مخصوص تالابوں یا کنوئیں کے پانی سے نہانے کی بدولت بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں یا جسم پوتر (پاک) ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ملتان کے رام چوترا، رام تیرتھ اور سورج کنڈ کے میلے مشہور ہیں۔

مسلمان صوفیاء کے مقبروں میں مخدوم عبدالرشید حقانی کی خانقاہ کا کنواں مشہور ہے جو صرف میلے کے موقع پر چلایا جاتا ہے۔ پیراں غائب کے میلے میں بچوں کے بال کٹوائے جاتے ہیں۔ پاکپتن شریف میں بابا فرید کے دربار کے بہشتی دروازے سے گزرنا عقیدت مندوں کے لیے باعث رحمت اور سعادت ہے چنانچہ یہ دروازہ عرس کے موقع

پر کھولا جاتا ہے۔

عرس اور میلے تبلیغ کا ایک ذریعہ بھی رہے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے لوگوں کو متوجہ کرنا زیادہ آسان اور سہل تھا۔ ان میلوں ٹھیلوں میں صحیح معنوں میں مقامی ثقافت کے مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں۔...... ایسی ثقافت جس میں اس مٹی کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ ان میلوں میں کٹھ پتلیوں کے تماشے، تھیٹر اور ان میں دکھائی جانے والے لوک تماشے جو لوک کہانیوں پر مبنی ہوتے ہیں لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ ان تفریحی مشاغل کے علاوہ طاقت کے مظاہرے بھی ہوتے تھے یعنی گھڑ سواری کے مقابلے، نیزہ بازی، کبڈی اور کشتی کے کرتب بھی کھائے جاتے تھے۔ سید اولاد علی گیلانی کے مطابق

> ''میلوں اور تماشوں کے موقع پر جواں لوگ پڑ کوڑی، جھمر، تلیانی، نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ وغیرہ کے مقابلے بڑے شوق سے کرتے ہیں اور ایسے موقع پر اس قسم کے کھیل خاص طور پر رونق اور تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔'' (مرقع ملتان ص 194)

پہلوانی کا فن بھی بطور خاص ملتان میں مقبول رہا ہے۔ یہاں کے پہلوان برصغیر کی ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں کے درباروں میں بڑی عزت پاتے تھے۔ کئی پہلوان خاندان آج بھی ملتان شہر میں آباد ہیں۔ ملتان میں شاہ شمس کا میلہ، شاہ رکن عالم کا عرس اور غوث بہاء الدین زکریا ملتانی کے سالانہ جلسے ہر سال باقاعدگی سے ہوتے ہیں جن میں تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔

7۔ فن موسیقی اور سماع

یوں تو اسلام کے بعض فقہی مذاہب کے مطابق موسیقی کو ناجائز اور ناپسندیدہ عمل ٹھہرایا گیا اور یہی وجہ ہے کہ بعض فقہا کے کہنے پر سلاطین وقت نے موسیقی کو ممنوع قرار دیا۔ ہندوستان میں سلطان التمش (633ھ/ 1235ء) نے بھی اس دباؤ کے تحت موسیقی کو ممنوع قرار دے دیا تھا لیکن ان فقہا کے برعکس صوفیاء اور درویشوں کے بعض سلسلوں نے روحانی ترفع اور وجد و حال کی خاطر موسیقی، رقص اور سماع کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ ضروری تصور کیا۔ تاہم رقص و سماع کی محافل کے لیے خاص شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمتہ نے اس کی حلت و حرمت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ حضرت معین الدین چشتی اجمیری نے جو ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے بانی مبانی تھے، موسیقی اور سماع کو پھیلانے میں بڑا حصہ لیا ان کے سارے پیروکار سماع اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔

التمش کے بعد سلطان فیروز شاہ اول رکن الدین (1339ء) نے اس فن کی سرپرستی کی۔ غیاث الدین بلبن (686ھ/ 1265ء) خلجی سلاطین اور خاندان سادات نے بھی موسیقی کے بارے میں سرپرستانہ رویہ اختیار کیا

امیر خسرو جیسا ماہر موسیقی اور نابغۂ روزگار انہیں درباروں سے وابستہ رہا۔ افغان سلاطین بھی موسیقی کی محفلوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ بابر نے تو موسیقی کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس کی ساری اولاد (مغل بادشاہ) ماسوائے اورنگ زیب عالمگیر کے موسیقی کی قدردان اور سرپرست رہی۔ البتہ اورنگ زیب کے دور میں موسیقی متروک ہو گئی۔ لیکن اس کے امراء وغیرہ موسیقی کی سرپرستی کرتے رہے۔ چنانچہ اورنگ زیب کے ایک درباری امیر شاہ قبار بن عبدالجلیل الحارثی نے موسیقی کے فن پر سترہ مخطوطات نقل کرائے جواب تک محفوظ ہیں، ان میں الکندی، الفارابی، ابن سینا، ابن منجم، ابن زیلہ، عبدالقادر، ابن غیبی اور دوسرے ماہرینفن کے دقیع رسالے شامل ہیں۔ اورنگ زیب کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ اول، جہاندار شاہ اور شاہ عالم ثانی نے موسیقی کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے دور میں عملی اور نظری طور پر ایرانی موسیقی کے اثرات غالب رہے۔ برصغیر پاک و ہند میں فن موسیقی میں مسلمانوں کے حصے کے بارے میں ڈاکٹر اسد علی لکھتے ہیں۔

> ''مسلمان جب ایران ہوتے ہوئے ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ ترقی یافتہ نظام موسیقی بھی لائے ادھر عرب حکمران بھی فن موسیقی کی سرپرستی کرتے رہے اور رعایا نے بھی ان کی اتباع کی ابن سینا، فارابی اور الکندی جیسے عظیم المرتب علماء اس کی حمایت کرتے تھے اور انہوں نے موسیقی کے بارے میں عظیم ترین کتابیں لکھیں۔ دھیرے دھیرے دمشق، بغداد اور غرناطہ فن موسیقی کے خصوصی مراکز بن گئے اور عرب موسیقی نے یورپ کو بہت کچھ دیا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان کی ہندوستان میں آمد کے وقت تک عرب، ایران اور وسط ایشیائی باشندے موسیقی کو وراثتاً اپنے ساتھ لا چکے تھے۔ اس تفصیل کو دینے کی پانچ خاص وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ ایک طرف ہندوستان ایک ترقی پذیر نظام موسیقی رکھتا تھا دوسرے عربوں اور بعد کے صوفیاء نے ایران اور عرب وغیرہ سے تقویت حاصل کر کے اپنی ریاضت میں موسیقی کو بہت اہمیت دی، تیسرے ہندوستان کے متعدد مسلم حکمران فن موسیقی کے عظیم سرپرست رہے ہیں۔ چوتھے امیر خسرو، میاں تان سین اور شرقی خاندان کے متعدد ایسے عظیم فنکار ہندوستان میں آئے ہیں جنہوں نے مختلف راگ راگنیوں کو جنم دیا اور باجے کے آلات کو ایجاد کیا اور اصلاح کی۔ مسلم صوفی شعراء بھی موسیقی سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔''

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ ہندستان مسلمانوں کو موسیقی سے ہمیشہ لگاؤ رہا مسلمان عربی اور ایرانی موسیقی سے واقف تھے حقیقت یہ ہے کہ موجودہ فن موسیقی عربی، ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کا حسین امتزاج ہے۔ اگر چہ عبدالمالک آروی کے مطابق:

''اسلامی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی میں بنیادی اختلافات ہیں۔ یہ اختلافات کا نتیجہ ہے قومی فرق و امتیاز، ملکی آب و ہوا اور مقامی خصوصیات کا، چنانچہ فارسی (اسلامی) میں بارہ پردے یا مقامات ہیں۔ ہندوستانی موسیقی میں سات با این ہمہ اسلامی ہند کے قبل اہل عرب ہندوستانی موسیقی سے واقف تھے۔''

دف، دمامہ، نگارہ اور نفسیری خالصتاً عربی ساز ہیں۔ (Cocal Organs) پھونک سے بجنے والے آلات موسیقی نڑ، ونجھلی، مرلی، بنسری، شہنائی (شرفاہ) گھوگھو وغیرہ خالص سندھی اور ملتانی ہیں۔ بہرحال ہمارے یہاں ایرانی، عربی اور ہندوستان ساز اور باجے موجود ہیں۔ راگ راگنیوں کا فن بھی ہے۔ جس پر ہندی ثقافت کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ صوفیاء نے بالخصوص موسیقی سے دلچسپی لی ہے۔ سماع اور قوالی تو ان کی محفلوں کا جزو لاینفک بن گئے تھے۔ ملتان صوفیاء کا مرکز رہا ہے یہاں کے صوفیاء نے بھی موسیقی میں گہری دلچسپی لی۔ سماع اور قوالی یہاں کی خانقاہی زندگی کا حصہ رہے ہیں چنانچہ ملتان میں موسیقی کے ارتقاء کے بارے میں شیخ اکرام الحق لکھتے ہیں:

''آریاؤں کا شغف موسیقی اور اس کے متعلقات سے رقص نہ صرف معاشرت بلکہ اعتقادی رسوم میں دخیل تھا اود مندروں میں بھی پوجا کے دوران عورتیں جنہیں اپسرائیں کہا جاتا تھا۔ پیتل کے تھالوں میں پھول اور پوجا کی چیزیں لے کر رقص کرتی تھیں۔ اور بھجن گائے جاتے تھے۔ سنگیت کے ودیالے تھے قلعہ سکہ جو دریائے راوی کے مشرق میں ملتان کا ذیلی حصار تھا وہاں متعدد مندر تھے اور رقص اور سنگیت کی تعلیم کے لیے بہت بڑا ودیالہ تھا۔ صنم کدہ آدیتہ میں ...... بت کے سامنے نامور رقاسائیں اور موسیقار عام طور پر اور اماوس کی راتوں میں خصوصاً اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ معرکہ آرائی میں بھی دھرید گانے اور بجانے کا رواج تھا جس طرح جنگ میں بینڈ باجے اب کام میں لائے جاتے ہیں۔ عربوں کے عہد میں ماسوا ملتان کے اسلامی دور میں بھی موسیقی میں زیادہ ترقی ہوئی کی نہیں آئی۔''

علامہ عتیق فکری ملتان کی موسیقی کی ترقی کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''ہمیں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ امیر خسرو جیسا ماہر فن موسیقی جسے متفقہ طور پر نائک تسلیم کیا گیا ہے ملتان میں ایک عرصہ تک قیام کرے اور ملتان میں فن موسیقی میں ترقی نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ صوفیاء کی مجلس میں سماع لازم ہو۔ امیر خسرو کے فن کا اثر ضرور ملتان پر ہوا ہو گا کیونکہ امیر خسرو ہندوستانی موسیقی میں ایک نئے رنگ اور روپ سروپ کا اضافہ کرنے والے ہیں۔ جنہوں نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج سے ایک نئے انداز اور سکول کا اضافہ کیا اور اس زمانے میں یہ فنی ترقی پسندی تھی یقیناً پانچ سال کی مدت میں ملتان کی موسیقی میں بھی اس انداز کا اثر پورے طور پر ہوا ہو گا۔''

یوں تو ملتان میں موسیقی اور لے کاری کا فن زمانہ قدیم سے لے کر زمانہ جدید تک مسلسل مقبول اور پسندیدہ رہا لیکن صوفیاء کی بدولت موسیقی میں سماع اور قوالی کو خصوصی ترقی ہوئی خانقاہوں اور مزارات پر اکثر قوالی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور آج بھی اس کا رواج کم نہیں ہوا۔ عرس کے ایام میں قوالیاں معمولات کا ایک اہم حصہ سمجھی جاتی ہیں ہم نے صوفیاء کے ذکر میں فرداً فرداً ان کے مشاغل سماع کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ سماع کے جائز اور ناجائز ہونے میں علماء کے مختلف گروہوں میں اختلاف رہا ہے لیکن صوفیاء کی اکثریت نے اسے جائز تسلیم کیا جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ البتہ سماع کے آداب ضرور مقرر کئے گئے جن میں سے چند آداب یہ ہیں۔

1۔ گردن جھکا کر بیٹھیں

2۔ ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھیں

3۔ ہر ایک اپنے آپ کو پوری طرح سماع میں محور کھے

4۔ دوران سماع باتیں نہ کریں

5۔ اِدھر اُدھر دیکھنے سے باز رہیں

6۔ ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں اور تکلف کے ساتھ کسی حرکت کا مظاہرہ نہ کریں

7۔ اسی طرح بیٹھیں جس طرح نماز میں تشہد کے لیے بیٹھتے ہیں

8۔ دل کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ میں مشغول رکھیں اور منتظر رہیں کہ دیکھئے اس سماع کی برکت سے ان کے لیے پردۂ غائب سے کیا انکشاف ہوتا ہے۔

9۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں تا کہ اختیاری طور پر اٹھ نہ کھڑے ہوں اور نہ حرکت کرنے لگیں ہاں اگر مغلوب

الحال ہو کر ان میں سے کوئی اٹھ کھڑا ہو تو اس کی امداد و موافقت کریں۔ اگر اس کی پگڑی گرنے لگے تو سب کے سب ہاتھ پھیلا دیں۔

چنانچہ سماع کے دوران عام طور پر ان آداب ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ تصوف کی کتابیں سماع اور قوالی کے تذکرے سے بھری پڑی ہیں۔

محمد اکرم خان ''معدن الموسیقی'' میں لکھتے ہیں کہ ہر قسم کی قوالی امیر خسرو کی ایجاد ہے انہوں نے موسیقی کے لحاظ سے قوالی کی ان اقسام کا ذکر کیا۔

باگیری، گونڈ اور ملا کو ملا کر

سوہنی قوالی، برج کی سنگت سے

بہار قوالی، کانڑا کی سنگت سے

بسنت قوالی، سوہنی اور پنچم بہار کی سنگت سے

تالوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ امیر خسرو نے سترہ تالیں ایجاد کی جن میں سے سوم تال قوالی کی تھی یہ تال سات الفاظ کا ٹھیکہ رکھتا ہو۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کہ قوالی کی ایجاد حضرت امیر خسرو کی مرہون منت ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک باکمال موسیقار اور ماہر فن کی حیثیت سے انہوں نے سماع اور موسیقی میں جدتیں پیدا کیں لیکن حضرت امیر خسرو سے پہلے خواجہ معین الدین قطب الدین بختیار کاکی، بہاء الدین زکریا، عبدالرشید حقانی اور بابا فرید گنج شکر کی محافل سماع کا ذکر ان کے احوال میں کیا جا چکا ہے اور ان کے قوالوں کے نام بھی لکھے جا چکے ہیں جو اپنے زمانے میں شہرت رکھتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ سماع کا رواج امیر خسرو کی بدولت پڑا۔ مختصر یہ کہ موسیقی اور سماع جیسے اہم اور مقبول تہذیبی و ثقافتی مظاہر بھی دراصل صوفیاء ہی کے مرہون منت رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔

(ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ - ڈاکٹر روبینہ ترین)



سیّد زاہد علی واسطی

پیروں فقیروں کا شہر

ملتان تو بھائی! پیروں فقیروں کا شہر ہے۔ یہاں بڑے بڑے اولیاء، صوفیاء، علماء، اور حکمرانوں کا مدفن و مقابر ہیں۔ان میں سے بہت سوں کے آستانوں و آرام گاہوں کی نشاندہی اس شہر میں آنے والے سیاحوں اور زائرین کے لیے ضروری ہے۔ جنہوں نے اپنی زندگی میں ایسے ایسے کام کئے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کے نام زندہ ہیں۔ بلکہ بعض کے مدفن تو آج بھی مرجع خلائق ہیں۔ ان میں سے بعض کا شمار ایسے روحانی طبیبوں میں ہوتا ہے جو باطنی امراض کا علاج کرتے تھے۔ بعض کے سپرد حق تعالیٰ کی جانب سے ملت اسلامیہ کی اصلاحِ احوال تھی۔ بعض کے بابرکت ماحول نے اکتساب فیض سے ہزاروں قلوب کو نور ایمان سے روشن کیا۔ ملتان کی گلی گلی۔ کوچہ کوچہ ایسے بزرگانِ دین، مشائخ و اصفیا کے مدفن سے بھری پڑی ہیں۔ ملتان میں ایسے ایسے سپوت بھی تھے جن کے کارناموں سے چشم فلک آج تک حیران ہے۔ ہم نے یہ فہرست بڑی کاوش وجستجو سے حروج تہجی کے لحاظ سے تیار کی ہے۔ اور ملتان کے مشہور مدفن و مقابر کی ڈائرکٹری ہے۔

(الف)

احمد سعید کاظمیؒ:۔ حضرت مولانا آپ 1913ء میں امروہہ۔ یوپی میں پیدا ہوئے۔ 1935ء میں ملتان آ بسے۔ دینی حمیت علی بصیرت۔ پاکیزہ کردار جیسی نادر روزگار شخصیت نے لاکھوں کو فیضیاب کیا۔ 1982ء میں رخصت ہو گئے۔ عیدگاہ میں آپ کا مقبرہ ہے۔

اویس کھگہ ”خواجہ حضرت:۔ آپ حضرت مخدوم صدر الدینؒ کے زمانے میں ملتان آئے تھے۔ 11 محرم 700ھ کو فوت ہوئے۔ شاہ رکن عالمؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بستی دائرہ نزد بی بی پاکدامن آپ کا شاندار مقبرہ ہے۔ 11 محرم الحرام کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

اللہ داد گرمانیؒ۔ مولانا۔ آپ صاحب الیسرؒ کے مرید تھے۔ ملتان شہر کے ریلوے سٹیشن کے نزدیک آپ کا مزار ہے آپ کا انتقال 1215ھ میں ہوا تھا۔ 23 جمادی الثانی کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

اکبر شاہ پیر حضرت:۔ آپ کشف و کرامات والے بزرگ تھے۔ بخاری سید زادے تھے۔ دور دور سے لوگ

آپ سے دعا کرانے آتے تھے۔ محلہ ہزاریاں شہر ملتان میں ایک ٹیلے پر چوبی کٹہرے میں آپ کا مزار ہے۔

اسمٰعیلؒ حافظ محمد:۔ اپنے زمانے کے بے مثل قاری خوش الحان تھے۔ بے انتہا متقی و پرہیز گار بزرگ تھے۔ تمام عمر درس قرآن و تدریس علوم دینوی میں گزار دی۔ پاک بی بی کے قبرستان میں 1273ھ میں دفن ہوئے۔

احمد معشوقؒ حضرت شیخ:۔ آپ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے مقرب خلفاء میں سے تھے آپ قندھار سے ملتان آئے۔ اللہ تعالیٰ کی یاد میں پہروں آنکھیں بند کئے رہتے۔ زاری و گریہ فرماتے۔ سنا ہے کہ آپ کو بشارت ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے توسل سے بھی جنت الفردوس میں داخل کریں گے۔ آپ 733ھ میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کی مرقد حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے مقبرے کے اندر واقع ہے۔

ابوالحسنؒ حضرت سید:۔ آپ حضرت موسیٰ پاک شہید کے دوسرے بیٹے تھے۔ آپ کی عرفیت سید یحییٰ تھی اور اس ہی نام سے مشہور تھے۔ خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ مابین پاک دروازہ حرم دروازے کے اندر آپ کا مزار ہے۔

احمد شاہؒ حضرت سید:۔ آپ ایک نیک دل متقی بزرگ تھے ہمہ وقت یاد اللہ میں گزارتے تھے عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ 1340ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ لوگوں نے وہیں مزار بنا دیا۔ یہ مزار محلہ کچی سرائے۔ نزد عام خاص باغ میں واقع ہے۔

ادہمؒ حضرت پیر:۔ آپ ولی اللہ تھے۔ استغراق میں رہتے تھے۔ آپ کی وفات پر لوگوں نے احتراماً آپ کی قبر غیر معمولی لمبی بنا دی تھی۔ یہ نوگزی قبر مشہور ہے اور بوہڑ دراوزہ کے اندر بازار میں ایک گلی محلہ درکھاناں میں ہے۔ جو گلی میں دور سے نظر آ جاتی ہے۔

(ب)

بہاء الدین زکریاؒ حضرت شیخ الاسلام:۔ آپ کا مقبرہ قلعہ کہنہ پر ہے چھٹی صدی ہجری کے مشہور طریقت و معرفت کے بزرگ تھے۔ لاکھوں عقیدت مند آپ کے پروانہ وار زیارت کرنے آتے ہیں۔ 7 صفر 666ھ کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ حضرت شیخ قطب الاقطاب رکن عالم کے جد امجد تھے۔ ہر سال 7 صفر کو آپ کا عرس بڑی شان سے منایا جاتا ہے۔

برہان شاہؒ پیر سید:۔ نواب مظفر خان کے عہد میں آپ کے علم و عمل کا طوطی بولتا تھا۔ بڑے متبحر عالم، زہد و تقویٰ میں لا ثانی تھے۔ آپ کا مزار بطرف جمعہ خالصہ چاہ مٹھے والا متصل گورستان ایک بارہ دری میں موجود ہے۔

بسنت شاہؒ پیر: مجذوب تھے 961ھ میں وفات ہوئی۔ محلہ گنج میں متصل مکان حافظ صاحبؒ اپنے حجرے میں دفن ہوئے۔ پہلے ایک قبرستان تھا جو گنج شہیداں کہلاتا تھا اب قبرستان نہیں ہے مگر محلہ گنج کہلاتا ہے۔

بدرخ عالمؒ مولانا شاہ:۔ شیخ الاسلام کے معاصر تھے۔ مخدوم جہانیاں کے اتالیق تھے۔ مدرسہ بہائیہ میں پڑھاتے تھے۔ خانقاہ بہاء الدینؒ میں دفن ہیں۔

بانگا بلیلؒ پیر:۔ حضرت بہاء الدینؒ کی مسجد کے مؤذن تھے۔ اندرون دہلی دروازے میں دفن ہیں ان کے

نام سے محلہ موسوم ہے۔

بغدادیؒ حاجی:۔شاہ شمس سبزواری کے ساتھ ایک لڑکا ہمراہ آیا تھا۔ وہ حاجی بغدادی کے نام سے مشہور ہوا۔ بہت سی کرامات ان سے منسوب ہیں۔ آپ کا مزار دولت دروازے کے باہر مقبرہ شاہ شمس واقع ہے۔

برہان الدینؒ شاہ:۔ آپ شاہ رکن عالمؒ کے استاد تھے۔ محلہ کتب فروشاں اندرون بوہڑ دروازہ چبوترے پر مزار ہے۔

باقر خان نواب:۔ 1733ء میں ملتان کا گورنر تھا۔ نیو ملتان میں اب بھی ان کی مسجد باقر آباد موجود ہے۔ 1738ء میں انتقال ہوا۔ ان کی قبر کہیں نہیں ہے۔ حضرت بہاء الدینؒ کی ڈیوڑھی میں دفن ہیں۔ آپ مزار کے اندر جانے کے لیے ان کے اوپر سے گزرتے ہیں۔

پاک دامنؒ بی بی:۔ اصلی نام بی بی راستی تھا۔ حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالمؒ کی والدہ حضرت صدر الدین عارف کی اہلیہ تھیں۔ بے پناہ علم طریقت و معرفت میں کاملہ تھیں۔ آپ 695ھ میں فوت ہوئیں۔ شہر ملتان کے ریلوے سٹیشن کے باہر مزار ہے۔

(ج)

جندے شاہؒ پیر:۔ امان پورہ کے قریب محلہ جندے شاہ میں ایک مرتفع چبوترے پر آپ کا مزار ہے۔ خدا رسیدہ تھے۔ لوگ نت مرادیں مانگتے تھے۔ ان کے پہلو میں پانچ شہیدوں کی قبریں ہیں آپ کا عرس 22 شوال کو ہوتا ہے۔

جمال چشتیؒ حافظ محمد:۔ جب تک آپ حیات رہے۔ سکھ ملتان میں نہ گھس سکے۔ بہت بڑے بزرگ تھے۔ عام خاص باغ سے مشرقی جانب ایک قلعہ نما چار دیواری میں آپ کا مقبرہ ہے۔ آپ کے نام پر حافظ جمال روڈ ہے۔ 5 جمادی الاول کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

جھنڈا پیر:۔ جیل کے اندر ایک چبوترے پر ایک مزار ہے روایت ہے کہ آپ کہتے تھے۔ کہ یہاں دوزخ بنے گی انگریزوں نے وہاں جیل تعمیر کر دی۔ عقیدت مند قیدی منت مرادیں مانگتے ہیں۔

جلال الدین قاضیؒ:۔ بہت بڑے عالم دین اور بزرگ تھے۔ آپ حضرت نظام الدینؒ اولیا کے خلیفہ تھے جس محلہ میں ایک چبوترے پر آپ کا مزار ہے وہ محلہ آپ کے نام سے موسوم ہے۔ آپ کی وفات 733ھ میں ہوئی تھی۔

جنیدؒ پیر سید:۔ آپ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت تھے۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے بہت قریب تھے۔ 7 شوال 658ھ میں وفات ہوئی اندرون پاک گیٹ آپ کا مزار ہے۔

چپ سائیںؒ پیر:۔ منشی عبدالرحمٰن خان ملتان میں ان کے خلیفہ ہیں۔ 1946ء میں وفات پائی قلعہ کہنہ پر لب سڑک ان کا مزار ہے۔

(ح)

حامد علی خانؒ حضرت مولانا:۔ رام پور سے سند فضیلت حاصل کی تحریکِ مصطفیٰ کے امام تھے۔علوم دینوی کے بحر ذخار تھے۔ 1977ء میں آپ نے ملتان کو تباہ ہونے سے بچایا۔جنوری 1980ء کو وفات پا گئے۔قلعہ کہنہ پر جامعہ غوثیہ قادریہ کے صحن میں مقبرہ ہے۔

حسن پروانہؒ:۔شاہ بوہڑ گیٹ سے سٹیشن جانے والی سڑک پر قبرستان اور ایک کالونی آپ کے نام سے موسوم ہے۔اس قبرستان میں ایک ٹیلے پر آپ کا مزار ہے۔غیر مسقف ہے۔آپ سید زادے تھے پروانہ تخلص تھا۔ کہتے ہیں کہ یہاں سب سے پہلی قبر آپ کی بنی تھی۔

حسن خجندیؒ خواجہ سید:۔آپ حضرت بہاء الدینؒ کے فیض یافتہ بزرگوں میں سے تھے۔علوم باطنی میں کامل تھے۔ہم کلام شخص کے دل کا حال جان لیتے تھے۔آپ 689ھ میں وفات پا گئے۔خانقاہ بہاء الدین زکریا کے صحن میں جنوبی برآمدے کے باہر دفن ہیں۔

حسین آگاہیؒ:۔اصل نام شاہ منصور تھا۔والد کا نام ابوجعفر تھا امام موسیٰ کاظم سے شجرہ جا ملتا تھی۔ہمیشہ جذب کی حالت میں رہتے تھے۔ایک سو تین سال کی عمر پائی۔663ھ میں فوت ہوئے۔ملتان کا مشہور بازار حسین آگاہی میں آپ کا مزار ہے۔

حسین کاہ برؒ شیخ:۔حضرت بہاء الدینؒ کے ہم عصر تھے۔گھاس کھودنا اور بیچنا آپ کا پیشہ تھا۔بہت اللہ والے بزرگ تھے بعد میں مجذوب ہو گئے۔ساتویں صدی ہجری میں انتقال ہو گیا۔اندرون بوہڑ گیٹ آپ کا مدفن ہے۔

حیات حافظ محمد:۔عالم فاضل بزرگ تھے خوش الحان قاری تھے۔چاہ آوے والا گورستان پیر عمر میں دفن ہیں۔

حسین خانؒ شاہ:۔ابدالی مسجد کے احاطے میں ایک مقبرہ ہے جس میں سدوزئی قبیلہ کے حکمران سو رہے ہیں۔باہر دو قبریں ہیں جن میں ایک نواب زاہد خان اور دوسرے ان کے بیٹے نواب شاکر خان اپنے دور کے ملتان کے گورنر تھے۔

(خ)

خیر محمدؒ حضرت مولانا:۔آپ حضرت تھانویؒ کے خلیفہ تھے۔تعمیرِ پاکستان میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔آپ کا شمار جامع الکمالات ہستیوں میں ہوتا ہے۔خیر المدارس کے بانی تھے۔22 اکتوبر 1970ء کو انتقال ہوا۔مدرسہ خیر المدارس کے مشرق میں آپ کا مدفن ہے۔

خدا بخشؒ خواجہ:۔خواجہ محمد موسیٰؒ کے فرزند تھے۔تفسیر و فقہ میں باکمال تھے۔25 جمادی الاول 1311ھ وفات ہوئی۔مزار محلہ کمنگراں میں موجود ہے۔

(د)

دانا شہیدؒ شاہ:۔ نام سعد الدین تھا۔ لوگوں نے بگاڑ کر دانا شہید کر دیا۔ حضرت بہاء الدینؒ کے خاص مقربین میں سے تھے۔ منگولوں نے جب ملتان پر حملہ کیا تو 7 شعبان 669ھ کو شہید ہو گئے دہلی دروازے کے اندر آپ کا مقبرہ موجود ہے۔

دُلا درویش پیر:۔ اصلی نام ولی محمد تھا۔ حضرت بہاء الدینؒ کے مرید تھے۔ محلہ آغا پورہ کی مسجد میں پیش امام تھے۔ وفات کے بعد وہیں دفن ہیں۔

دلیرؒ حضرت شاہ: مرالی قوم کے بزرگ تھے۔ دیوان ساون مل جب گورنر ملتان تھا تو آپ کی بہت تکریم کرتا تھا۔ آپ 1228ھ میں وفات پا گئے۔ باغیچہ مرزا جان اندرون دہلی دروازے مسجد مولانا خیر پوری کے بالمقابل آپ کا مقبرہ ہے۔

دربرؒ شاہ: قلعہ کہنے پر آپ کا مزار ہے وصفی طور پر آپ کا یہ نام پڑ گیا۔ ورنہ نام کچھ اور تھا۔ آپ سلطانہ رضیہ سلطانہ کے دور میں جب گورنر فیروز جلال الدین کی ملتان میں عملداری تھی ۔ یہاں تشریف لائے تھے اور 644ھ میں فوت ہوئے۔

دولت شاہؒ پیر:۔ بیرون دولت دروازے دونوں سڑکوں کے درمیان ایک مقبرہ ہے آپ حضرت بہاء الدینؒ کے خادم تھے۔ اس ہی زمانے میں فوت ہوئے۔

داؤد حضرت شاہ:۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ محمد بن قاسم کے ساتھ ملتان آئے۔ آپ عالم دین تھے موضع طرف دائرہ چوک شاہ عباس آپ کا مدفن ہے۔

دادا پیر:۔ اپنے زمانے کے ولی کامل تھے۔ لوگوں نے احتراماً قبر لمبی بنا دی۔ یہ لمبی سی قبر محلہ حمام اندرون بوہڑ دروازے موجود ہے۔

(ر)

رکن عالمؒ حضرت شاہ:۔ آپ کا مقبرہ قلعہ کہنہ پر ہے ملتان کی نشانی ہے اور ملتان کی شان اسی سے ہے سطح زمین سے ڈیڑھ سو فٹ بلند ہے۔ آپ غوث العالمین حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے پوتے تھے۔ آپ کا وصال 7 جمادی الاول 747ھ کو ہوا۔ ہر سال 7 جمادی الاول کو عرس ہوتا ہے۔

رکن الدین حر حضرت مسکین:۔ آپ علم و معرفت کے عالم تھے۔ جو سڑک حافظ جمال کو جاتی ہے۔ محلہ خلاصی لائن میں متصل گورستان چبوترے پر آپ کی قبر ہے۔ 27 رمضان 1321ھ کو انتقال ہوا ہر سال 21 رمضان کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

(س)

سراج الدین چشتیؒ:۔ مولانا خدا بخش خیر پوری کے خلیفہ تھے۔ دہلی دروازے کے باہر ایک مسجد میں عمر بھر

درس دیتے رہے۔ وہیں ایک حجرے میں رہتے تھے 1309ھ میں انتقال ہوا متعلقین نے وہیں دفن کر دیا یہ مسجد اب بھی انہیں کے نام سے موسوم ہے۔

سوہن شاہ شہید پیر: قلعہ کہنہ کی ڈھلان پر ایک مسجد کے قریب ایک مزار ہے جس میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ کی لڑائی میں لڑتا ہوا۔ اس کا نام پیر سوہن شاہ تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ شاہ رکن عالمؒ کے مریدوں میں سے تھے۔

سعید خان قریشی:۔ شہزادہ مراد بخش گورنر ملتان کے درباری شاعر تھے۔ جو 1651ء میں ملتان میں گورنر تھا۔ وفات رمضان میں 1087ھ میں ہوئی۔ اندرون دہلی دروازہ آپ کے نام سے محلہ سعید خان قریشی آباد ہے۔ وہیں ان کا دو منزلہ مقبرہ ہے۔

(ش)

شمس الدین سبزواریؒ حضرت شاہ:۔ آپ بہت عظیم مبلغ تھے۔ ہزاروں غیر مسلموں کو مسلمان کیا عام خاص باغ کے شمال کی جانب عظیم مقبرہ میں دفن ہیں اب وہاں کربلا بھی بن گئی ہے۔ آپ کا انتقال 27 صفر 794ھ میں ہوا۔ ہر سال 27 صفر کو عرس ہوتا ہے۔

شہر اللہ حضرت مخدوم:۔ آپ بہاء الدین زکریاؒ کے سجادہ نشینوں میں سے تھے۔ انتہائی متقی پرہیز گار بزرگ تھے۔ آپ کا انتقال 23 ذوالحج 920ھ کو ہوا آپ کی قبر حضرت بہاء الدینؒ کے مقبرے کے اندر ہے۔

شفیع حضرت مولانا مفتی محمد:۔ مدرسہ قاسم العلوم کے بانی تھے تعلیم دین میں عمر گزار دی۔ 32 سال مسلسل درس دیتے رہے۔ آپ کا انتقال 13 جمادی الاول 1398ھ کو ہوا۔ آپ کی کچی قبر حسن پراونہ کے گورستان میں ہے۔

شفیع مولانا محمد:۔ اپنے وقت کے جید عالم خوش الحان قاری تھے۔ عام خاص باغ کی مسجد میں درس دیتے رہے۔ انتقال کے بعد مسجد کے صحن میں دفن ہیں مسجد ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔

شاہ نواز خان نواب:۔ ملتان کے نواب تھے۔ دیوان کوڑا مل گورنر ملتان سے جنگ میں شہید ہوئے۔ مقبرہ شاہ شمس میں آپ کی قبر ہے۔

شاہ علیؒ مردان پیر:۔ آپ عراق سے آئے تھے۔ آپ کا سلسلہ حضرت اویس قرنیؒ سے جا ملتا ہے۔ 27 رجب 1282ھ کو وفات ہوئی۔ حرم دروازے کے باہر آپ کا مقبرہ ہے۔ آپ کا عرس 27 رجب کو ہر سال منایا جاتا ہے۔

شاہ نواز خان شہید نواب:۔ نواب مظفر خان کے بیٹے تھے۔ باپ کی طرح بہادر تھے ملتان کی خاطر سکھوں سے لڑتے ہوئے جون 1818ء کو شہید ہوئے آپ کی قبر خانقاہ حضرت بہاء الدین میں مسجد کی پشت پر اب بھی موجود ہے۔

(ص)

صدر الدین عارفؒ حضرت شیخ:۔ حضرت بہاء الدینؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ پیدائش 1244ء کو ہوئی۔ علوم باطنی میں عارف زمانہ تھے۔ 1309ء کو وفات پائی۔ آپ کا مزار حضرت بہاء الدینؒ کے پہلو میں موجود ہے۔

(ع)

عظیم الدین شاہؒ پیر:۔ آپ مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتے تھے۔ 1207ھ میں ملتان آ گئے اور 1231ھ میں انتقال ہو گیا۔ نواب مظفر خان ان کا بہت معتقد تھا۔ دولت دروازے کے باہر آپ کا مزار ہے۔ 13 جمادی الثانی کو ہر سال آپ کا عرس ہوتا ہے۔

عمر سہروردی حضرت:۔ حضرت بہاء الدینؒ کے زمانے میں سندھ سے آئے تھے۔ ملتان کے ایک نواب نے آپ کے نام بہت ساری زمین لکھ دی۔ یہ قبرستان پیر عمر مشہور ہو گیا۔ اسی میں آپ دفن ہیں یہیں پیر بابا دادا کی قبر ہے جن کا عرس ہر سال 26 ذیقعد کو ہوتا ہے۔

عبید اللہ ملتانیؒ مولانا:۔ آپ مولانا خیر پوری کے خلیفہ تھے۔ بہت متقی بزرگ تھے آپ نے ملتان میں سکھوں کے عہد کے بعد روحانی فیض رسانی کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کا انتقال 20 جنور 1888ء کو ہوا آپ کا مقبرہ محلہ قدیر آباد میں ہے۔ 6 جمادی الاول کو عرس ہوتا ہے۔

عنایت ولایت پیر:۔ اصلی نام محمد عیسیٰ تھا۔ حضرت موسیٰ پاک شہید کے لڑکے تھے۔ حرم دروازے النگ پر مزار موجود ہے۔

عبد الخالقؒ حضرت پیر: حضرت تونسویؒ کے مرید تھے۔ فقہ حدیث میں صاحب کمال تھے۔ 13 شعبان 1343ھ کو وفات پائی۔ محلہ تارنگج میں مزار ہے۔

علی اکبرؒ حضرت:۔ آپ کا نسب آٹھ پشتوں میں حضرت شاہ شمس سے جا ملتا ہے۔ آپ کا عالی شان مقبرہ سورج میانی میں ہے۔

عطاء اللہ شاہ بخاری حضرت شاہ:۔ اپنے وقت کے فقید المثال عالم تھے۔ شعلہ بیان مقرر تھے۔ جماعت احرار کے بانیوں میں سے تھے۔ نظریہ پاکستان سے اختلاف رکھتے تھے۔ انتقال 21 اگست 1961ء کو ہوا۔ آپ کی کچی قبر مسلم ہائی سکول ملتان کے قبرستان میں ہے۔

علی محمد خان خوگانی نواب:۔ ملتان کے 1752ء میں گورنر تھے۔ احمد شاہ ابدالی پی پھٹ پھڑوا کر مروا دیا۔ ان کے نام سے چوک بازار میں مسجد علی محمد موسوم ہے۔ ماہ جون 1181ھ میں قتل ہوا تو حسن پروانہ قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اب بھی کچی قبر میں مدفن ہے۔

عبد الرشید حضرت پیر:۔ پیر عمر کے بھائی تھے محلہ یار بندیاں بازار چوڑی سرائے میں ایک محراب میں انکی قبر ہے۔ بہت کرامات منسوب ہیں۔

عبد الرشید کرمانیؒ حضرت:۔ آپ حضرت بہاء الدین کے استاد تھے۔ فقید المثال عالم تھے مسجد کڑے والی میں درس دیتے تھے وہیں دفن ہیں۔

عبد العزیز خان نواب:۔ 1760ء میں ملتان کے گورنر تھے۔ 1762ء میں راجہ کوڑا مل کے ساتھ تھے

نواب زاہد خان سے جنگ میں مارے گئے۔ایس پی چوک ملتان میں لب سڑک ان کے والد سلطان حیات خان اور عبداللہ خان، انور خان کے مدفن ہیں۔

(غ)

غلام منشیؒ خواجہ:۔آپ خواجہ جمال چشتیؒ سے بیت تھے۔انگریزوں نے 19 محرم 1265ء کوشہید کر دیا تھا۔ آغا پورہ محلّہ میں ایک خوبصورت مقبرہ ہے۔19 محرم کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔

غلام محمد مولانا:۔مفسر قرآن مدرس حدیث تھے۔29 ربیع الاول 1340ھ کو فوت ہوئے۔آپ کا مزار محلّہ بدرو شیر خان دلی دروازے۔مسجد غلام کے حجرے میں موجود ہے۔

(ف)

فضل شاہ پیر:۔اپنے وقت کے بزرگ درویش تھے۔شہزادہ مراد بخش ان کا مرید تھا۔محلّہ کاشی گراں مسجد کے قریب آپ کا مزار ہے۔

فتح شاہ پیر:۔نہایت شیریں زبان عالم تھے مسجد میں درس دیا کرتے تھے 25 محرم 1305ھ کو وفات پائی۔مسجد قریشیاں محلّہ کوٹلہ تولے خان میں دفن ہیں۔

(ق)

قطب الدین کاشانیؒ قاضی:۔بہت بڑے جید عالم تھے۔کاشان سے حکمران ملتان قباچہ کی دعوت پر ملتان آئے۔حضرت بہاء الدینؒ نے آپ کے اقتدا میں نمازیں پڑھیں۔679ھ میں فوت ہوئے قلعہ پر سٹیڈیم کے عقب میں ایک ٹیلے پر آپ کا مزار ہے۔

قالے شاہ پیر:۔پانچویں صدی ہجری میں ملتان آوے۔بہت سی کرامات منسوب ہیں۔لوگوں نے نام بگاڑ کر قالے شاہ کہنا شروع کر دیا۔ملتان کا مشہور بازار کالے منڈی آپ کے نام سے موسوم ہے۔اسی بازار میں آپ کا مقبرہ ہے۔

(ک)

کلیم اللہ حضرت پیر:۔اسی محلّہ میں آپ کا مزار ہے۔شریعت وطریقت کے باکمال بزرگ تھے۔آپ کی دعا فوراً قبول ہو جاتی تھی لوگ دور دور سے دعا کرانے آتے تھے اب بھی مزار پر لوگ دعائیں مانگتے ہیں۔

(گ)

گوہر سلطان پیر: دہلی دروازے کے باہر دائیں جانب ایک نوگز کی قبر یہ یہ غوری سردار تھے۔غوری سلطان بگڑ کر گوہر سلطان ہو گیا تھا۔

(ل)

لڈن کڈن پیر:۔ایک مقبرہ کے اندر دو حقیقی بھائی دفن ہیں۔علیحدہ پردے میں ان کی بہن دفن ہے محلّہ

کپڑی ٹپولیاں اندرون پاک دروازے ان کا مزار ہے۔ تینوں درویش حق تھے سب 668ھ میں فوت ہو گئے۔ 7 شعبان کو عرس ہوتا ہے۔

(م)

موج دریاؒ حضرت:۔ یہ آپ کا وصفی نام تھا حضرت شاہ یوسف گردیز سے قبل آپ ملتان میں موجود تھے شاہ گردیزؒ نے آپ کے پاس قیام کیا تھا۔ پل موج دریا اور یہ کالونی انہی کے نام سے موسوم ہے۔

موسیٰ پاک شہیدؒ:۔ اصل نام سید ابوالحسن تھا۔ دسویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے علماء آپ کے سامنے زانو قلمبندتہ کرتے تھے ایک لنگاہ نے آپ کو ذاتی رقابت کی بناء پر شہید کر دیا 23 شعبان 1020ھ میں فوت ہوئے پاک دروازے کے اندر مقبرہ ہے۔ 23 شعبان کو عرس ہوتا ہے۔

موسیٰ پاکؒ حضرت صدیقی:۔ علم وفضل کے ذخائر تھے جب تفسیر پڑھاتے ایک کیف کا عالم ہوتا تھا آپ کی بہت تصانیف ہیں۔ والد کا نام حافظ محمد حیات تھا۔ آپ 1261ھ میں وفات پا گئے۔ حسین آگاہی بازار کے اندر آپ کا مزار ہے 11 رجب کو عرس ہوتا ہے۔

مٹاں والاؒ پیر:۔ اصل نام فتح اللہ تھا حضرت محبوب سبحانی کی اولاد تھے آپ کے نام سے محلہ مٹاں والا آباد ہے وہیں دفن ہے۔

محمد مرادؒ حضرت پیر:۔ خواجہ محکم دین سیرانی کے مرید تھے۔ بہت کرامات منسوب ہیں پرانی کوتوالی نزد بیرون لوہاری دروازہ ایک احاطے میں آپ کا مزار ہے۔

مٹھو قاضی:۔ صاحب الیسرؒ کے مرید تھے 1364ھ میں انتقال ہوا حافظ جمال روڈ پر لب سڑک مزار ہے 22 ذیقعد کو عرس ہوتا ہے۔

معصوم شاہ سیدؒ:۔ آپ بخاری سید تھے ساتویں صدی ہجری میں ملتان آئے تھے۔ آپ کا مزار معصوم شاہ روڈ جو آپ کے نام سے موسوم ہے واقع ہے۔

موسیٰ شیخ:۔ آپ کی قبر بھی احتراماً بہت لمبی بنا دی گئی تھی محلہ جال ویڑھ اندرون پاک دروازہ نوگزی قبر آپ کی ہے۔

محلہ شاہ پیر:۔ آپ صاحب الیسرؒ کے مرید تھے چیت کے مہینہ میں عرس ہوتا ہے چاہ مصاحب شاہ والا میں ایک چبوترے پر آپ کا مزار ہے۔

مظفر خانؒ شہید:۔ نواب ملتان کے آخری مسلمان تاجدار تھے آخری دم تک سکھوں سے ملتان کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اپنے تمام خاندان سمیت شہید ہوئے 23 رجب 1334ھ تاریخ وفات ہے آپ کی قبر حضرت بہاء الدینؒ کی خانقاہ کے جنوبی برآمدے میں موجود ہے۔

معین الدین حضرت بلگرامی:۔ حضرت نواب مکرم خان نے آپ کو چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز کیا تھا

انہوں نے اس منصب کو بہت عدل و انصاف سے انجام دیا 13 شعبان 113ھ کو وفات پائی ان کی قبر روضہ موسیٰ پاک شہیدؒ کے احاطے میں واقع ہے۔

میرن بلوچ نواب:۔ آپ سید حامد بخش کے مرید تھے ان کو چوراسی ہزار بیگھہ زمین کا انہوں نے نذرانہ دیا تھا پیر خورشید کالونی میں چبوترے پر آپ کی قبر ہے کسی منچلے نے بلوچ لفظ مٹا کر بخاری لکھ دیا ہے حالانکہ آپ بخاری نہ تھے۔

مہربان مائی:۔ آپ کے شوہر شاہ حسین تھے۔ حضرت محبوب سلیمانی کے مرید تھے آپ کے انتقال پر مریدوں نے یہ مقبرہ بنوایا جو سول ہسپتال ملتان کے عقب میں واقع ہے یہ محلہ آپ کے نام سے موسوم ہے۔

(ن)

نور شاہؒ پیر:۔ موضع طرف مبارک متصل چاہ بٹی والا میں قبرستان کے اندر ایک جگہ دفن ہیں چونکہ آپ کی اجازت نہ تھی اس لیے مرقد نہیں بنائی گئی قبر کا تعین ایک مقام پر بتایا جاتا ہے۔

نظام الدینؒ حضرت مولانا:۔ آپ سیرا خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جھنگ کے باشندے تھے آپ کی وفات 17 شعبان 1319ھ کو ہوئی بستی چرنگ بیرون لوہاری دروازہ آپ کا مزار ہے

(و)

ولی محمدؒ چادر والی سرکار حضرت:۔ مورثِ اعلیٰ حجاز سے آئے اور کرنال میں آباد ہوئے آپ نے پاکستان میں آ کر ملتان کو روحانی اعزاز بخشا 23 جولائی 1981ء کو فوت ہوئے۔ حسن پروانہ کالونی میں آپ کا شاندار مقبرہ موجود ہے۔

ویڑھا شاہؒ پیر:۔ ایک متشرع بزرگ تھے جن کے نام پر محلہ ساگ ویڑھا مشہور ہے وہیں آپ کا مزار ہے۔

ولادت شہید حضرت:۔ نام وصفی ہے مگر اسی نام سے مشہور ہیں ساتویں صدی ہجری میں کسی جنگ میں شہید ہوئے اندرون دولت دروازہ آپ کا مزار ہے۔

(ی)

یوسف گردیزؒ حضرت شاہ:۔ آپ 1086ء میں ملتان تشریف لائے آپ عظیم دینی رہنما تھے قرامطیوں کا آپ نے قلع قمع کر دیا اندرون ملتان کی آبادکاری کی بنیاد آپ نے ڈالی 531ھ میں آپ کی وفات ہوئی اندرون بوہڑ دروازہ آپ کا مقبرہ مرجع خلائق ہے۔

یوسفؒ محمد خواجہ:۔ آپ حضرت شاہ جمال کے والد تھے۔ برہان کے قبرستان میں مدفن ہے۔ برابر میں آپ کی اہلیہ کا مدفن ہے۔

(تاریخِ سرزمینِ ملتان – سیّد زاہد علی واسطی)



شیخ محمد اکرم ایم اے

ملتان میں تبلیغی اور صوفیانہ سرگرمیاں

سہروردی اور دوسرے سلسلے

تصوف کے ہندوستانی سلسلوں میں سب سے زیادہ شہرت چشتیہ خاندان کو ہے (اور فی الواقع اس میں کئی خصوصیتیں ایسی تھیں جنہیں ہندوستانی حالات خاص طور پر ساز گار تھے۔ (مثلاً موسیقی اور سماع کا رواج، ادبیت اور شعرو شاعری سے اُنس، ملائمت غیر مسلموں کے ساتھ غیر معمولی رواداری)۔ اور جنہوں نے اس کی مقبولیت اور اشاعت میں بڑی مدد دی۔ مسلمانوں کی روحانی تربیت میں بھی اس سلسلے کے بزرگان کبار نے بڑا حصہ لیا) لیکن سہروردیہ سلسلہ بھی چشتیہ کی طرح بہت پرانا ہے۔ اور خصوصاً تبلیغی کاموں میں تو شاید اس کا پلہ چشتیہ سے بھاری ہے۔

کشمیر میں اسلام کبرویہ سلسلے کے بزرگوں (مثلاً امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ) اور ان کے صاجزادے میر محمد ہمدانیؒ) نے پھیلایا جو سہروردیوں کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ اعظم تھے۔ اس وقت مشرقی بنگال کی سب سے بڑی زیارت گاہ سلہٹ میں ایک سہروردی (شاہ جمال یمنی) کا مزار ہے۔ گجرات کے قدیمی دارالخلافہ یعنی شہر احمد آباد کی سب سے بڑی زیارتیں یعنی حضرت قطب عالمؒ اور حضرت شاہ عالمؒ کے سر بفلک روضے سہروردی یادگاریں ہیں۔ اور پاک پٹن سے مغرب کے علاقے یعنی سندھ، مغربی اور بلوچستان کو تو بابا فریدؒ بھی بہاء الدین زکریاؒ سہروردی کی ولایت کا جزو مانتے تھے۔

چشتیوں اور سہروردیوں میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں اور اس امر کا بھی عام رواج تھا کہ ایک شخص دونوں سلسلوں کے بزرگوں کو بہ نگہِ غائر دیکھیں تو ان کا امتیازی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ چشتیوں کی خصوصیات ہم بیان کر چکے۔ سہروردی امورِ شرعی میں ان سے زیادہ محتاط تھے۔ ان کے ہاں سماع بہت کم تھا۔ خلاف شرع امور پر وہ فوراً ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ دوسرے مذہبوں کے ساتھ ان کا برتاؤ غیر معمولی رواداری کا نہ تھا۔ تبلیغ کا جوش بھی ان میں زیادہ تھا۔ سیر و سفر کا شوق بھی انہیں چشتیوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ بالعموم چشتیوں کا رنگِ ''جمالی'' تھا۔ سہروردیوں کا ''جلالی'' ان سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ اگرچہ دارالخلافہ کی نازک مزاج اور حساس ہستیوں کو سہروردی سے بڑی حد تک مسخر نہ کر سکے۔ لیکن اطرافِ ملک میں انہوں نے اسلام کا ڈنکا خوب بجایا۔ اور اسلام کی بڑے

پُرجوش طریقے سے اشاعت کی۔

افسوس ہے کہ سہروردیوں کی مکمل تاریخ مرتب نہیں ہوئی اور آج تو اس کے لیے مواد نہیں ملتا۔ سہروردیوں نے کام زیادہ تر اسلامی ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی مرکزوں سے دور رہ کر کیا۔ ان کی روحانی کوششوں کو دارالخلافے کی تیز برقی روشنی نے اجاگر نہیں کیا۔ اور اتفاق سے ان میں اہل قلم حضرات کی بھی بہتات نہیں۔ چشتیوں میں سے اکثر اصحاب سجادہ (مثلاً حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، بابا فریدؒ، حضرت سلطان المشائخ، سید گیسو درازؒ) ایک خوشگوار ادبی رنگ کے حامل بلکہ شاعر تھے۔ ان کے مریدوں میں امیر خسروؒ، امیر حسن سنجری، ضیاء الدین برنی مورخ جیسے کامل الفن ادیب اور شاعر موجود تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کارنامے بڑی آب و تاب سے بیان ہوئے اور ہماری روحانی زندگی کا جزو بن ہو گئے۔ لیکن سہروردیوں کی ٹھوس مذہبی خدمات سے (جن کی بدولت مغربی اور مشرقی پاکستان میں اسلام کا بول بالا ہوا) ایک عام بے خبری ہے۔

شیخ بہاء الدین زکریا سہروردیؒ

ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کے موسسِ اعلیٰ شیخ بہاء الدین زکریاؒ تھے۔ ان کے دادا مکہ معظّمہ سے پہلے خوارزم اور وہاں سے مضافاتِ ملتان میں تشریف لائے اور نانا منگولوں کے حملے میں وطن چھوڑ کر ہندوستان آئے۔ اور کوٹ کروڑ میں آباد ہو گئے۔ شیخ بہاء الدینؒ یہیں 1182ء میں پیدا ہوئے۔ آپ بارہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد آپ خراسان چلے گئے۔ اور سات برس تک علومِ ظاہری و باطنی کی تکمیل کی۔ پھر بخارا میں یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اور مدینہ منورہ میں پانچ سال تک روضہ نبوی کی مجاوری کی اور شیخ کمال الدین محمد یمنی سے علم حدیث کی سند لی۔ پھر بغداد گئے اور شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔

فوائد الفواد میں حضرت سلطان المشائخ کی زبانی لکھا ہے کہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ مرشد کی خدمت میں فقط سترہ دن رہے تھے کہ انہیں خرقہ خلافت مل گیا۔ اس پر شیخ الشیوخ کے یارانِ قدیم نے شکایت کی کہ ہم تو ایک مدت سے اوراد و وظائف میں مشغول ہیں اور ابھی منزل مقصود تک نہیں پہنچے لیکن یہ نووارد چند ہی روز میں کامیاب ہو گیا۔ اس پر شیخ نے فرمایا کہ تم لوگ گیلی لکڑیاں لائے ہو جن میں دیر سے آگ لگتی ہے زکریا چوب خشک لایا تھا جو ایک ہی پھونک مارنے سے بھڑک اُٹھی۔

خلعتِ خلافت سے سرفراز کرنے کے بعد بالغ نظر مرشد نے آپ سے فرمایا کہ اب آپ ملتان جائیں اور وہاں اقامت اختیار کر کے وہاں کے لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچائیں۔ (سیر العارفین ص 109) چنانچہ آپ ملتان آئے اور جلد ہی وہاں بڑا اعتبار و اقتدار حاصل کر لیا۔ بلکہ ملتان، سندھ، بلوچستان کے علاقے کو آپ کی روحانی سلطنت سمجھا جاتا تھا۔ آپ کے حالات پر حال ہی میں ایک کتاب انوار غوثیہ کے نام سے خادمان درگاہ نے شائع کی

ہے۔

جس میں کتب تاریخ کے اندراجات کے علاوہ خاندانی روایات بھی جمع کی ہیں۔ انوارِ غوثیہ کے مطابق ممالک اسلامی سے واپسی کے بعد شیخ بہاء الدین نے ایک عرصہ صوبہ سرحد کی ایک پہاڑی پر گوشۂ عزلت میں عبادت کی۔ جسے اب کوہ شیخ بودین (کوہ شیخ بہاء الدین) کہتے ہیں۔ انوارِ غوثیہ میں لکھا ہے کہ ''حضرت کے وعظ سن کر ملک سندھ اور علاقۂ ملتان اور لاہور کے اہل ہنود میں سے بھی بے شمار خلقت نے جس میں بہت متمول تاجر اور بعض والیانِ ملک بھی تھے دین اسلام اختیار کیا اور حضور کے مرید ہوئے۔'' اس کے علاوہ ''حضرت نے عامۂ خلائق کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے زراعت اور تجارت کے کام کو رفتہ رفتہ بڑھایا۔ اطراف ملتان میں جہاں کہیں اچھا موقع ہوا افتادہ جنگلوں کو آباد کرایا۔ چاہات اور نہریں احداث کرائیں۔ ...... اور تجارت کی طرف بھی حضرت نے بہت توجہ فرمائی۔'' (انوارِ غوثیہ ص 48-49)

شیخ کبریا بابا فرید گنج شکر سے جو ملتان سے تھوڑے فاصلے پر پاکپتن میں مقیم تھے۔ آپ کے دوستانہ تعلقات تھے بلکہ بعض تو کہتے ہیں کہ آپ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ ایک دفعہ آپ نے بابا فرید کے نام رقعہ لکھا جس کا ایک فقرہ تھا ''میانِ ماو شما عشق بازی است'' بابا فرید نے جواب دیا ''میانِ ماو شما عشق است بازی نیست'' آپ کے زمانے میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے اور خلفا مثل قاضی حمید الدین ناگوری اور شیخ جلال الدین تبریزی ہندوستان تشریف لائے۔ لیکن چشتیہ بزرگوں کی کشش نے انہیں اپنا لیا اور انہوں نے سہروردی کے سلسلہ کو فروغ دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ قاضی حمید الدین ناگوری کے تو فقط تین مرید تھے۔ اور شیخ جلال الدین تبریزی نے بھی بنگالہ جانے سے پہلے بہت کم لوگوں کو مرید کیا۔ یہ کمی شیخ بہاء الدین زکریا نے پوری کی اور ان کی وجہ سے سہروردیہ سلسلہ کو ہندوستان میں اہم جگہ مل گئی۔ ان کے زمانے میں شیخ الاسلام سید نور الدین مبارک غزنوی اور شاہ ترکمان بیابانی بھی سہروردی سلسلے سے تھے۔ لیکن سلسلہ ان سے بہت چلا نہیں اور ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کا مورث اعلیٰ شیخ بہاء الدین زکریا کو ہی سمجھنا چاہیے۔

آپ کے زمانے میں ناصر الدین قباچہ جو سلطان محمد غوری کا غلام تھا ملتان کا گورنر تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک کی وفات تک تو وہ بادشاہ دہلی کا وفادار صوبیدار بنا رہا۔ لیکن جب اس کا غلام التمش بادشاہ بنا تو قباچہ نے بھی خودمختاری کا رادہ کیا۔ شیخ بہاء الدین زکریا اور قاضی شرف الدین قاضیِ ملتان نے خط لکھ کر التمش کو اس کے منصوبوں کی اطلاع دینا چاہی قضارا دونوں کے خط قباچہ کے ہاتھ جا لگے۔ قاضی کو تو فوراً اس نے قتل کرا دیا اور شیخ سے باز پرس شروع ہوئی شیخ نے صاف کہا کہ یہ خط میں نے لکھا ہے اور ارشادِ الٰہی کے مطابق لکھا ہے تمہاری کوششوں سے سوائے مسلمانوں کے خون بہنے کے اور کچھ نہ ہوگا۔ شیخ کا ملتان میں اتنا اثر تھا کہ ناصر الدین قباچہ کو انہیں آزار پہنچانے کی ہمت نہ ہوئی۔ بالآخر اس نے التمش کے خلاف بغاوت کی اور التمش اس کا تعاقب کر رہا تھا کہ وہ دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا اور اس کی جگہ ایک نیا صوبیدار مقرر ہوا۔

اسی طرح نقل ہے کہ جب 1257ء میں منگول ملتان میں داخل ہو گئے اور برج اور مورچے گرا کر شہر میں قتل و غارت شروع کرنے کو تھے تو حضرت مخدوم العالم شیخ بہاء الدین زکریا ایک لاکھ درہم نقد لے کر پہنچے اور مغلوں کو یہ رقم ادا کر کے شہر کو ان کی تباہی سے بچایا۔

سہروردیہ سلسلہ میں سماع کی وہ افراط نہیں جو چشتیہ سلسلے میں ہے اور شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ عام طور پر سہروردی چشتیوں کی نسبت احکام شرعی کی تعمیل میں زیادہ محتاط رہے ہیں۔ مثلاً سیر الاولیاء میں لکھا ہے، منقول ہے کہ ان دنوں شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ قدس سرہ کا ایک فرزند ناگور میں آیا اور جب اس نے سنا کہ (سلطان التارکین) شیخ حمید الدین (صوفی ناگوری خلیفہ اعظم حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ) نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتے تو شور برپا کیا اور چند ظاہر بین عالموں کو لے کر آپ کے مکان پر پہنچا اور رونا شروع کیا۔ (ص 141)

سہروردی چشتیوں کی طرح سماع کے معاملے میں غلو نہیں کرتے بلکہ عموماً اس سے مجتنب ہیں لیکن ان میں سے بعض بقول شیخ جمالی "بر سبیل ندرت" سماع سنتے ہیں۔ چنانچہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی نسبت بھی لکھا ہے کہ جب عبداللہ نامی ایک قوال خوش کلام ملک روم کی طرف سے ملتان آیا شیخ زکریاؒ کی خدمت میں حاصل ہو کر کہا کہ شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے میری قوالی سن کر سماع کیا تو شیخ نے فرمایا کہ اچھا اگر حضرت نے سنا ہے تو ہم بھی سنیں گے۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ اور اس کے ساتھی کو حجرے میں بلایا اور حجرہ بند کر کے قوال سے کہا کہ کچھ پڑھو قوال نے غزل شروع کی

مستان کہ شرابِ ناب خُور دند
از پہلوئے خود کباب کر دند

شیخ پر کیفیت طاری ہوئی تو انہوں نے چراغ گل کر دیا جس سے حجرے میں اندھیرا ہو گیا لیکن اتنا نظر آ رہا تھا کہ شیخ گردش کر رہے ہیں۔

سماع سے شیخ کی دلچسپی مشہور فارسی شاعر عراقی کی صحبت کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئی۔ وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے تھے اور ان دنوں اثنائے سیر و سیاحت میں ملتان تشریف لائے تھے۔ شیخ بہاء الدین سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ وہ کہتے تھے۔ "بر مثال مقناطیس کہ آہن را کشد۔ شیخ مرا جذب می کند۔ و مقید خواہد کرد۔ ازیں جا زُود تر باید رفت۔" شیخ نے بھی اپنے مرشد کے خواہر زادہ کی بڑی خاطر داری کی۔ اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی اور عراقی ایک عرصہ ملتان میں مقیم رہے۔ وہ نہایت دل گداز شعر لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ نفحات الانس میں مولانا جامی لکھتے ہیں کہ جب شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں عراقی نے چلہ کشی شروع کی تو ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ ان پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو گئی انہوں نے ذیل کی غزل کہی اور اسے بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
زچشمِ مست ساقی وام کردند

برائے صید مُرغ جان عاشق
ززلف ماہر و یاں دام کردند
بعالم ہر کجا رنج و مُلامت
بہم بُردند و عشقش نام کردند
چو خود کردند رازِ خویشتن فاش
عراقیؔ را چرا بدنام کردند

اہل خانقاہ نے اس پر اعتراض کیا۔ کیونکہ خانقاہ میں سوائے ذکر اور مراقبہ کے کوئی اور چیز رائج نہ تھی۔ انہوں نے شیخ سے بھی اس کا شکایت کی لیکن انہوں نے فرمایا کہ یہ چیزیں تمہیں منع ہیں اسے منع نہیں۔ اور آخری شعر پر تو کمال خوشنودی کا اظہار کیا۔ (نفحات الانس ص 542)

عراقی کے علاوہ آپ کے دوسرے مشہور اہل قلم مرید امیر حسینی تھے جو کنز الرموز، زاد المسافرین اور نزہت الارواح کے مصنف ہیں۔ گلشن راز جو شیخ محمود شبستری کی مشہور مثنوی ہے۔ حضرت امیر حسینی کے سوالات کے جواب میں لکھی گئی۔ وہ کنز الرموز میں شیخ بہاء الدین اور شیخ صدر الدین کی تعریف میں لکھتے ہیں

شیخ ہفت اقلیم قطب اولیا
واصل حضرت ندیم کبریا
فخر ملت و بہائے شرع و دیں
جانِ پاکش منبع صدق و یقیں
از وجود او بہ نزدِ دوستاں
جنت الماوئ شُدہ ہندوستاں
منکہ رُداز نیک و از بد تا ختم
ایں سعادت از قبولش یا فتم
رختِ ہستی چوں بروں بست از میاں
کرد پروازِ ہُما بر آشیاں
آں بلند آوازۂ عالم پناہ
سرور عصرِ افتخارِ صدر گاہ
صدر دین و دولت آں مقبولِ حق
نہ فلک بر خوانِ جودش یک طبق!

شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ہندوستانی مریدوں میں آپ کے صاحبزادے شیخ صدر الدین عارف اور پوتے۔

شیخ رکن الدین ابوالفتح کے علاوہ اُچ شریف کے بخاری سیدوں کے موسسِ اعلیٰ سید جلال الدین منیر شاہ میر سرخ بخاریؒ اور سندھ کے لال شہباز قلندرؒ قابل ذکر ہیں۔

آپ کی وفات 771ھ میں ہوئی۔ مزار خاک پاک ملتان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے اور اس کے قرب و جوار میں بعض بڑی مبارک و متبرک ہستیاں دفن ہیں۔

شیخ صدرالدین

شیخ بہاء الدین کی وفات 1264ء میں ہوئی اور آپ کے صاحبزادہ شیخ صدرالدین جانشین ہوئے (غالباً ہندوستان میں موروثی سجادہ نشینی کی یہ پہلی مثال ہے جس پر بعد میں اُچ کے قادری پیروں نے بھی عمل کیا) شیخ صدر الدین کی بہت سی کرامات بیان کی جاتی ہیں۔ میر حسینی سادات نے کنز الرموز میں ان کی نسبت لکھا ہے

آل بلند آوازۂ عالم پناہ
سرورِ دیں، افتخارِ صدر گاہ
آبِ حیواں قطرۂ بحرِ و لش
چوں خضر علمِ لدنی حاصلش
معتبر چوں قول او افعال او
ہم بیان او گواہِ حال او
ملک معنی جمع در فرمانِ او
ہم بکسب و ہم بمیراث آن او

ہندوستان کے مشائخ میں شاید سب سے پہلے آپ تھے جنہیں شیخ ابن العربی کے نظریوں اور تصانیف کے متعلق اطلاع ملی۔ ہم مشہور شاعر عراقی کا ذکر کر چکے ہیں۔ جو شیخ صدرالدین کے بہنوئی تھے اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مرید خاص۔ جب عراقی ملتان سے بلادِ روم کو واپس گئے تو (ایشیائے کوچک کے مشہور) شہر قونیہ میں ان کی ملاقات شیخ محی الدین ابن العربی کے مشہور خلیفہ شیخ صدر الدین قونوی سے ہوئی اور ایک عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ عراقی نے وہیں فصوص الحکم کا مطالعہ کیا اور اس سے متاثر ہو کر لمعات لکھی۔ ان دنوں عراقی کی شیخ صدرالدین سے خط و کتابت تھی چنانچہ انہوں نے قونیہ سے یہ تفصیلات شیخ کو ایک خط میں لکھیں۔ سیر العارفین میں شیخ جمالی لکھتے ہیں "وعراقی از آنجا در روم رسید و در شہر قونیہ در آمد و آنجا شیخ صدر الدین قونوی خلیفہ شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ بود۔ چند گاہ در صحبت ایشاں میگزرانید و نسخہ لمعیات در قونیہ تصنیف کرد و ازاں جا کتابے متضمن کلمات و نکات عرفان بجانب حضرت سلطان العارفین شیخ صدر الدین عارف پسرِ بزرگ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نوشتہ است کہ مارا الآن بہ صوفی صحبتے اُفتادہ است کہ لماتش این است۔ معلوم نیست کہ حضرت ایشاں چہ جواب نوشتند۔" (ص

189)

شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ

1285ء میں شیخ صدر الدینؒ کی وفات ہوئی اور ان کے صاحبزادے شیخ رکن الدین ابوالفتح ان کے جانشین ہوئے۔ان کے حسن خلق اور پرہیزگاری کی سب تاریخیں گواہ ہیں۔آپ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے براہ راست مرید اوراس کے علاوہ اپنے والد کے خلیفہ تھے۔اپنے زمانے میں آپ کو بڑا عروج ہوا۔سلطان علاء الدین خلجی آپ کا بڑا معتقد تھا۔اس کی زندگی میں آپ دو دفعہ دہلی آئے۔بادشاہ نے بڑی عقیدت سے استقبال کیا اور رخصت کے وقت کئی لاکھ تنگے نذر کئے۔آپ نے وہ رقم لے کر مستحقین میں تقسیم کر دی۔سلطان علاء الدین کا بیٹا قطب الدین خلجی حضرت سلطان المشائخ کے خلاف تھا۔اس نے شیخ رکن الدین کو ملتان سے بلایا۔مقصد یہ تھا کہ حضرت سلطان المشائخ کے مقابلے میں ایک اور بارگاہ دہلی میں قائم ہو۔تاکہ حضرت کا اثر و رسوخ کم ہو۔لیکن شیخ رکن الدین اور سلطان المشائخ اس تپاک و محبت سے ایک دوسرے کو ملے اور ان کا سلوک اتنا دوستانہ رہا کہ بادشاہ کے سب منصوبے خاک میں مل گئے۔سلطان المشائخ شیخ کے استقبال کو اپنی اقامت گاہ سے نکل کر حوضِ علائی تک گئے اور سب سے پہلے ان سے جا کر ملے۔جب اس کے بعد بادشاہ نے شیخ رکن الدین سے پوچھا کہ اہلِ شہر میں سب سے پہلے کس نے آپ کا استقبال کیا ہے تو آپ نے سلطان المشائخ کی نسبت اشارہ کر کے فرمایا۔"کسیکہ بہترین اہل شہر است۔" اس کے بعد آپ کی اور سلطان المشائخ کی بڑی پُر لطف صحبتیں رہیں جن میں مذہب، تصوف اور تاریخ کے دلچسپ نکتے حل ہوتے رہے۔

سیر العارفین میں ضیاء الدین برنی کے حوالے سے نقل ہوا ہے کہ جب بنگالہ سے واپسی پر سلطان غیاث الدین تغلق کی اس کے بیٹے جونا خان (محمد تغلق) نے نوتعمیر چوبیں محل میں ضیافت کی تو آپ بھی موجود تھے کھانا ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا کہ آپ نے بادشاہ سے کہا کہ جلدی باہر نکلو۔بادشاہ نے کہا کہ کھانا ختم کر کے باہر آتا ہوں۔ آپ باہر نکل آئے۔لیکن بادشاہ نے آپ کے ارشاد پر فوراً عمل نہ کیا اتنے میں چھت گری اور بادشاہ دب کر مر گیا۔ جب حضرت سلطان المشائخ نے انتقال کیا تو آپ دہلی میں تھے۔اور نماز جنازہ آپ نے ادا کرائی۔

سلطان محمد بن تغلق بھی آپ کا قائل تھا۔جب کشلو خان نے سلطان کے خلاف بغاوت کی اور سلطان نے اسے شکست دے کر حکم دیا کہ اہل ملتان کے خون سے نہریں بہا دو اور قاضی شہر کریم الدین کی کھال کھنچوا دی تو شیخ رکن عالم ننگے پاؤں بادشاہ کے پاس گئے اور اہل شہر کی سفارش کر کے ان کی جانیں بچائیں۔(تاریخ معصومی) عصامی اس وقت کی نسبت لکھتا ہے۔

ابو الفتح، شیخِ زماں رکنِ دیں
مگر بُد دراں ہفتہ عزلت گزیں

چو بشنید در شہر طوفانِ خوں
برہنہ سر و پائے آمد بروں
کشادہ زبانِ شفاعت گری
ہمے گفت شاہا جہاں پروری
بسے خوں فشاندی دریں بوم و بر
زتیغت گرفتہ جہاں خونِ تر
بر اہلِ گنہ، نزد اہلِ صفا
پسندیدہ ترہست عفو از جزا
کنوں دست داراز سیاست گری
چوشد نوبتِ عفو و رحم آوری
چوبشنید آں شاہِ آفاق گیر
شُد از شیخ مشفق شفاعت پذیر
ببرند بندِ اسیراں تمام
گزار ند مُرغانِ عاجز زدام

آپ کا مزار قلعہ کے اندر ایک بڑے عالیشان روضے میں ہے۔ اصل میں یہ روضہ غیاث الدین تغلق نے (شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے قریب دفن ہونے کی آرزو میں) اپنے لیے تعمیر کرایا تھا لیکن اس نے دہلی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ اس کے بیٹے سلطان محمد بن تغلق نے یہ روضہ شیخ رکن عالم کی تدفین کے لیے دیا۔ اس روضے کی بلندی سو فٹ کے قریب ہے۔ لیکن چونکہ اس کی بنیاد ہی پچاس فٹ کے قریب بلند ہے اس لیے عمارت بہت اونچی ہو گئی ہے اور تیس تیس میل سے صاف نظر آتی ہے۔

بالجملہ یہ کہنا صحیح ہے کہ خاندان خلجی اور خاندان غلامان کے عہد حکومت میں سہروردیوں کا اثر و رسوخ چشتیوں سے کم نہ تھا اور بالخصوص سلطان علاء الدین خلجی، سلطان غیاث الدین تغلق، سلطان محمد تغلق جس حد تک شیخ رکن الدین کا پاس ادب کرتے تھے اتنا انہوں نے اسی اور شیخ حتیٰ کہ حضرت سلطان المشائخ کا بھی نہیں کیا۔ شیخ رکن العالم نے یہ اثر خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کے لیے استعمال کیا۔ مثلاً جب آپ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت میں دہلی تشریف لائے تو جس روز آپ آئے اس روز بادشاہ نے دو لاکھ تنگے آپ کی نظر کئے اور پھر جب آپ دہلی سے رخصت ہونے لگے تو پانچ لاکھ تنگہ دیا آپ کو یہ رقمیں جس جس روز ملیں اسی روز آپ نے خلق خدا میں تقسیم کر دیں۔

اسی طرح سیر الاولیاء میں لکھا ہے کہ جب حضرت شیخ رکن العالم ڈولے میں سوار ہو کر حضرت سلطان

المشائخ کی ملاقات کے لیے آئے اور مصنف کے والد ڈولے میں شیخ کے لیے کھانا رکھنے لگے تو ڈولے میں ہر طرف کاغذ ہی کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ مصنف کے والد نے انہیں ایک طرف کر کے کھانا رکھنے کے لیے جگہ نکالنی چاہی تو شیخ رکن العالم نے حضرت سلطان المشائخ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا ''آپ کو معلوم ہے یہ کاغذات کیسے ہیں۔'' پھر خود ہی کہنے لگے کہ یہ حاجت مندوں کی عرضیاں ہیں جو وہ مجھے اس لیے دے دیتے ہیں تا کہ میں بادشاہ تک پہنچاؤں لیکن انہیں کیا معلوم کہ میں آج کس بادشاہ کے پاس جا رہا ہوں۔ (ص 123)

سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ کا قاعدہ تھا کہ آپ ان سب عرضیوں کے ساتھ جو ضرورت مند آپ کے تخت رواں پر ڈال دیتے بادشاہ کے پاس پہنچتے اور ایک خادم کو ہدایت کرتے کہ یہ عرضیاں بادشاہ کے سامنے رکھے۔ چنانچہ بادشاہ یہ سب عرضیاں آپ کی موجودگی میں پڑھواتا۔ ہر عرضی پر حکم لکھواتا اور جب تک لوگوں کی مطلب برآری نہ ہو جاتی آپ وہاں سے نہ ہلتے۔ (ص 143)

تاریخ فیروز شاہی میں آپ اور آپ کے خاندان کی نسبت ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:۔

ہمچناں در تمامی عصر علائی شیخ رکن الدین کہ شیخ بن شیخ بن شیخ بود۔ بر سجادہ شیخ صدر الدین و شیخ بہاء الدین در ملتان مستقیم بود و کدام شرف و بزرگی و جلالت و منقبت ازاں بہتر و ازاں بالاتر بود کہ پدرِ او صدر الدین و جدِ او شیخ بہاء الدین زکریا باشد و در ہم عہدِ علائی شیخ رکن الدین داد طریقت مشائخ میداد و حق تکمیل مریدان میگذاشت و سجادۂ پدر و جد را منور میداشت و تماما اہالیے دریائے سندھ از ملتان و اچ و فرودتر و مرطیہ بآستان متبرک شیخ رکن الدین قدس اللہ سرہ العزیز تشبث و تعلق نمودہ بودند و چندیں علما از شہر و دیارِ ہند مریدان خدمت و شدہ و در کشف و کرامت شیخ رکن الدین کسے را شبہے و شکے نماندہ بود و ماٰثر خاندان بزرگوار او از وصف بیروں است و شیخ بہاء الدین زکریا را درمیان سالکان و خدا طلبانِ ''باز سپید'' گفتندے اعنی ہر کہ خود را بجناح او بہ بند و بخدا رسد و شیخ الاسلام صدر الدین با اوصاف کمال و تکمیل سخاوت در غایت افراط داشت و چنداں مال کہ خدمت او را از میراث پدر رسید از وفور اعطا آن بزرگ را پیشتر ایام در قرض گزشتے۔''

شیخ رکن الدین کی وفات 1334ء میں ہوئی۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ وفات سے تین ماہ پہلے آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ فقط نماز کے لیے حجرہ سے باہر آتے۔ بالآخر 16 رجب کو نماز عصر کے بعد آپ نے اپنے خادم خاص کو حجرہ میں بلا کر کہا کہ ہماری تجہیز و تکفین کا انتظام کر لو۔ اس روز نماز مغرب کے لیے آپ حجرہ سے

باہر نہیں آئے بلکہ امام کو بلا کر حجرے کے اندر ہی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے نوافل کے لیے سر سجدہ میں رکھا اور اسی حالت میں جان بحق تسلیم کی۔

آپ کی کوئی اولاد نہ تھی آپ کا فیض آپ کے خلفائے عظام نے جاری رکھا اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کی وفات کے ساتھ ملتان کے پیرانِ عظام کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور مغربی پنجاب اور سندھ کا روحانی مرکز ملتان سے اچ میں منتقل ہو گیا۔ جہاں پہلے آپ کے خلیفہ اعظم حضرت مخدوم جہانیاں اور ان کے بھائی سید راجو قتال اور پھر قادری بزرگوں نے ارشاد و ہدایت کی شمعیں روشن کیں۔

آپ کے خلفاء میں سے مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے علاوہ شیخ وجیہہ الدین عثمان سیاح سنامی قابلِ ذکر ہیں۔ موخر الذکر ان قابل عزت ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے محسن کش خسرو خان کی اشرفیاں لینے سے انکار کر دیا تھا ان کے علاوہ شیخ رکن الدین ابوالفتح کے ایک اور نامور مرید حاکم شاہ تھے جو پہلے کیچ مکران کے گورنر تھے بعد میں دنیا ترک کر دی اور شیخ سے خرقہ حاصل کرنے کے بعد اُچ اور سکھر کے درمیانی علاقہ میں ارشاد و ہدایت اور تبلیغ اسلام پر مامور ہوئے۔ آپ کی وفات 1368ء میں ہوئی۔ مزار ریاست بہاولپور میں ہے۔

(آبِ کوثر - شیخ محمد اکرام ایم اے)



ڈاکٹر محمد امین

صوفیانہ فکر

تصوف کیا ہے؟ تصوف کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہے مختلف صوفیہ اور علماء نے اپنے اپنے انداز اور اسلوب میں تصوف کی تعریف کی ہے۔ جو تصوف کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

نوری:۔ ابوالحسن نوری کا قول ہے: تصوف نام ہے تمام حفوظ نفسانیہ کا ترک۔

کتانی کا قول ہے تصوف اخلاق حسنہ کا نام ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی تصوف کو فقہ باطن کہتے ہیں اور ان کے خیال میں تصوف صفائی باطن مع پابندی شرع کا نام ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی ''فتوح الغیب'' میں تصوف کی آٹھ بنیادی خصلتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

1۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح سخی ہونا۔

2۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی طرح راضی ہونا۔

3۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی صبر کرنا۔

4۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی طرح مناجات کرنا۔

5۔ حضرت یحیٰ علیہ السلام کی طرح غربت اختیار کرنا۔

6۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح صوف پہننا۔

7۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح سیر کرنا۔

8۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح فقر اختیار کرنا۔

یہ صوفیہ کے خصائل ہیں کشف المحجوب میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ مستشرقین نے بھی تصوف کی تعریف کی ہے۔ اے۔ جے۔ آربری۔ تصوف کو آفاقی رویہ سمجھتے ہیں جو انسانی روح کی خدا کے ساتھ ذاتی رابطے کی آفاقی اور شدید خواہش کا مظہر ہے۔ جے سپنسر ٹری منگھم کے خیال میں تصوف اسلام میں ان رجحانات کا نام ہے۔ جن کا مقصد خدا اور انسان کے درمیان براہ راست رابطہ ہے۔ یہ چند تعریفیں صرف تعارف کیلئے درج کی گئی ہیں۔ یہ تمام خصوصیات ہمیں ملتان کے صوفیاء اور ان کے فکر میں عکس ریز نظر آتی ہیں۔

ملتان ایک قدیم شہر ہے جو ہزاروں سالوں سے آباد چلا آ رہا ہے۔ ملتان اولیا کا مسکن ہے یہ مدینۃ الاولیاء ہے۔ تصوف کی تاریخ میں ملتان کو کئی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔

قدیم ملتان کے گردونواح کا ایک بدھ مت کا پیروکار شہزادہ رائے چاولہ اسلام قبول کر کے حضرت دیوان چاولی مشائخ کے نام سے مشہور ہوا۔ جنہیں برصغیر کا پہلا صوفی کہا جاسکتا ہے۔ بڑے بڑے جید صوفیا نے اُن سے اکتساب فیض کیا۔ جن میں بابا فرید گنج شکر اور عثمان مروندی جیسے عظیم صوفیا شامل ہیں۔ حضرت دیوان چاول شائخ نے 131ھ میں شہادت پائی۔ محمود غزنوی نے ان کا مزار تعمیر کرایا۔

ملتان میں تصوف کا آغاز حضرت یوسف گردیزی کی آمد سے ہوتا ہے۔ یہ عالم اسلام میں تصوف کے عروج کا دور تھا۔ یوسف گردیز 450ھ میں پیدا ہوئے۔ اور 531ھ میں وفات پائی ایک روایت کے مطابق جب آپ ملتان تشریف لائے تو موج دریا کے یہاں قیام فرمایا۔ یوسف گردیز عبادات کے ساتھ ساتھ انصاف اور مظلوموں کو حق دلوانے کی تاکید کرتے تھے۔ آپ نے خشیت الٰہی اور توکل کو شعار کیا۔ آپ سے کئی کرامات منقول ہیں۔ آپ کے فضائل میں قابل ذکر خشیت الٰہی، توکل اور مظلوموں کی دادرسی کے اوصاف ہیں۔ ان کے بعد حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی شخصیت ہے۔ جو شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے۔ بہاؤالدین زکریا ملتانی نے برصغیر میں سلسلہ سہروردیہ کا آغاز کیا۔ اور یہ آغاز ملتان سے ہوا۔ انہوں نے اپنے شیخ کی تصنیف عوارف المعارف کا درس جاری کیا۔ عوارف المعارف تصوف کی ابتدائی اہم کتابوں میں شمار ہوئی ہے جس میں تصوف کے تمام مسائل پر بحث ہے۔ خاص طور پر صوفیانہ فضائل اور اخلاق حسنہ پر آپ نے ''کشف المحجوب'' کا قلمی نسخہ تیار کیا۔ جو نسخہ زکریا ملتانی کے نام سے مشہور ہوا اور اب طبع ہو چکا ہے۔ بہاء الدین زکریا ملتانی نے اوراد کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ ایک رسالہ ''شروط اربعین'' بھی آپ کے نام سے منسوب ہے۔ آپ کی مجالس میں بڑے بڑے علماء اور صوفیاء شرکت کرتے تھے اور تصوف کے نکات پر بحث ہوتی تھی۔ ان میں فارسی کے مشہور شاعر عراقی اور خسرو کے نام قابل ذکر ہیں۔ عراقی کے کلام پر وحدت الوجود کی چھاپ نظر آتی ہے۔ بہاء الدین زکریا کے بیٹے صدر الدین عارف کی وساطت سے ملتان کے صوفیاء ابن عربی کی مشہور تصنیف ''فصوص الحکم'' سے متعارف ہوئے۔ اور یہیں سے فصوص الحکم کا تذکرہ برصغیر کے دیگر علاقوں تک پہنچا۔ ایک روایت کے مطابق شاہ رکن الدین عالم نے عوارف المعارف کی طرز پر ''فتاوی صوفیہ'' لکھی۔ آپ کے مرید مولانا علی بن احمد غوری نے ''کنز العباد'' کے عنوان سے کتاب لکھی۔ جو سلسلہ سہروردیہ میں آئین کی حیثیت رکھتی ہے۔ سلسلہ سہروردیہ عبادات کے ساتھ ساتھ آداب وفضائل پر خاص طور پر زور دیتا ہے۔

اسی زمانے میں شاہ شمس سبزواری ملتان تشریف لائے جو مسلک کے لحاظ سے اسماعیلی تھے۔ ان کے گنان کو اسماعیلیوں کے یہاں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے گنان صوفیانہ دانش سے معمور ہیں۔ ان کے گنان کے موضوعات میں حمد، دنیا کی بے ثباتی، فنا، موت کی حقیقت، قیامت کا ذکر، اخلاقی پندر نصائح، لالچ، حسد، جھوٹ، غصہ، کینہ کی تلقین اور نیک اعمال کرنے کی تاکید کے مضامین شامل ہیں۔ اور گنان کے یہی مقبول موضوعات ہیں ان کے

ایک گنان کے چند اشعار بطور نمونہ مندرجہ ذیل ہیں۔

اے سہاگا اس دنیا دے وچ کیا گن آوے
کیا گن ویکسی نال سہاگا

اے سہاگا تو اس دنیا میں کیا لے کر آیا ہے اور ساتھ کیا لے کر جائے گا

اے سہاگا نا گو تو آیو نا گو تو ویکسی
کر گن وِچ و پیار سہاگا

اے سہاگا تو خالی ہاتھ آیا ہے اور خالی ہاتھ جائے گا۔ نیک اعمال کا کاروبار کر

اے سہاگا دیہی تیری خاک رلے سی
کیڑے کھاون ماس سہاگا

اے سہاگا تیرا جسم خاک میں مل جائے گا۔ اور کیڑے تیرا گوشت کھائیں گے۔

اے سہاگا تتیاں تھمبیاں تس گلے لگسی
کوکاں کرے ڈاڈو ڈاڈ سہاگا

اے سہاگا آگ کے گرم ستون تیرے گلے لگیں گے قیامت کے دن اور تُو بہت شور مچائے گا۔

اے سہاگا اے گنان مہارس پیر شمس بولیا
ساچا لنگسی پار سہاگا

اے سہاگا پیر شمس نے یہ حکمت والا گنان کہا ہے۔ صرف سچا کنارے پر پہنچے گا۔

یہ گنان صوفیانہ فکر کے معروف تصورات پر لکھے گئے ہیں جو نیک اعمال اور اخلاق کریمانہ کی تلقین کرتے ہیں۔ صوفیا کا یہی انداز تبلیغ تھا۔

اسی زمانے میں اوچ شریف بھی تصوف کا مرکز تھا۔ وہاں محمد غوث بندگی نے سلسلہ قادریہ کی بنیاد رکھی سید موسیٰ پاک شہید 1545/952ء میں اوچ شریف میں پیدا ہوئے۔ اور بعد میں ملتان کو اپنا مسکن بنالیا۔ اور سلسلہ قادریہ کا آغاز کیا۔ جو عوام میں سب سے زیادہ مقبول سلسلہ ہے نویں صدی ہجری تصوف کے عروج کا عہد ہے اسی دور میں تصنیف و تالیف کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ سید موسیٰ پاک شہید سے ملتان میں تصوف کے ایک نئے باب کی ابتداء ہوئی اور سلسلہ قادریہ کو تقویت ملی۔ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا آپ کی تصنیف ''تیسیر الشاغلین'' کو سالکین قادریہ کے لئے نصاب کی حیثیت حاصل ہے۔

تصوف کو فقہ باطن کہا جاتا ہے۔ تیسیر الشاغلین ایک طرح سے فقہ باطن کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں نماز اور دیگر اذکار، وظائف کی روحانی تشریح کی گئی ہے۔ کتاب کا آخری باب تصوف کے مباحث پر محیط ہے۔ فکری اعتبار سے یہ کتاب سید موسی پاک شہید کے بصیرت افروز فرمودات سے معمور ہے۔ جہاں انہوں نے درویش کو ہاں

اے درویش ! کہہ کر مخاطب کیا ہے۔تیسیر الشاغلین ، فارسی میں تصنیف کی گئی۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔کتاب میں شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کے اقوال سے بطور خاص استفادہ کیا گیا ہے۔حقیقت نماز کے باب میں شیخ عبدالقادر جیلانی کا یہ قول نقل ہے کہ ماسوا سے کٹ کر اللہ سے تعلق جوڑنے کا نام نماز ہے۔

وضو کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے نماز کے اندر حضوری کا دارومدار وضو کی حضوری پر ہے۔اور نماز میں جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی وضو میں غلطی اور غفلت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔پانی بہانے کا بھی خیال رکھو اور شیطان کے وسوسوں کا دروازہ اپنے اوپر نہ کھولو‘‘۔

سید موسیٰ پاک فرماتے ہیں اے درویش ہوش مندی سے کام لو۔اور پوری سعی و کوشش کرو کہ تم غیر اللہ سے دور رہو۔۔۔۔اور صرف اسی کی یاد میں محو رہو۔ بلکہ اسکی حاضری میں رہو اور ایک سانس بھی اس یاد سے خالی نہ ہو۔ورنہ خود دیکھو گے حسرت اور ناکامی اپنے پر پھیلا کر تمہارے اوپر چھا جائے گی‘‘۔

سید موسیٰ پاک شہید شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے ہیں۔آپ نے 1010ھ /1607 میں شہادت پائی۔ پہلے اوچ شریف میں دفن کیے گئے ۔اور بعد میں ملتان میں مدفون ہوئے۔

ایک روایت کے مطابق بابا فرید گنج شکر بھی ملتان کے قریب ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔اور بسلسلہ تعلیم ملتان میں مقیم رہے۔ وہ فقیر زاہد تھے۔ان کے افکار میں فقر و زہد کو اہمیت حاصل ہے۔انہوں نے شریعت اور طریقت میں ہم آہنگی پیدا کی اور راسخ العقیدگی کی تلقین کی۔انہوں نے فرمایا زکوٰۃ تین قسم کی ہے ۔شرعی زکوٰۃ ڈھائی فی صد سے ادا ہو جاتی ہے طریقت میں زکوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی ضروریات سے زائد ہر چیز اللہ کی راہ میں دے دی جائے۔اور حقیقت میں زکوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی ہر چیز حاجت مندوں میں تقسیم کر دی جائے۔ خواہشات نفسانی انسان کو محتاج اور مجبور بنا دیتی ہیں۔اس لئے فقر اور قناعت اختیار کرنا چاہیے۔ان کے دوہوں میں دنیا کی بے ثباتی اور خدا سے لو لگانے کی تلقین ملتی ہے۔

فریدا خاک نہ نندیئے خاکوں جھیڈ نہ کوئے

جیوندیاں پیراں تلے مویاں اوپر ہوئے

جو بن جاندے نہ ڈراں جے شوہ پریت نہ جائے

فریدا کیتی پریت بن سک گئے کمھلائے

اٹھ فریدا ستیا جھاڑو دے مسیت

تو ستا رب جاگدا تیری ڈاھڈے نال پریت

بابا فرید سلسلہ چشتیہ کے عظیم صوفی تھے۔ ملتان میں سلسلہ چشتیہ کے حوالے سے شاہ ابوبکر وراق کا نام قابل ذکر ہے۔نواح ملتان تونسہ میں محمد سلیمان تونسوی بھی سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے عوارف المعارف ، فصوص الحکم کے ساتھ ساتھ امام غزالی کی تصنیف احیاء العلوم کا بھی درس جاری کیا۔احیاء العلوم امام غزالی کی معرکۃ

الآرا تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔ ملتان کے متاخرین صوفیاء میں سے حافظ محمد جمال ملتانی اور خواجہ حبیب اللہ ملتانی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

آخر میں خواجہ غلام فرید کا ذکر کرنا ناگزیر سمجھتا ہوں ۔ جو سرائیکی وسیب کے وحدت الوجودی صوفی شاعر ہیں ۔ان کی تصانیف میں دیوان فرید۔ مقابیس المجالس اور فوائد فریدیہ کو تصوف کے حوالے سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خواجہ فرید منصور ہلاج اور ابن عربی کو اپنا مرشد کہتے ہیں۔ اور دیگر وحدت الوجودی شعرا کی طرح مشق کو اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں کہ عشق کے بغیر سلوک کی منازل طے نہیں ہوسکتیں۔

عشق ہے ہادی پریم نگردا　　عشق ہے رہبر راہ فقر دا
عشقوں حاصل ہے عرفان

عشق سے عرفان حاصل ہوتا ہے اور عشق کی انتہاء یہ ہے

ہر صورت وچ دلدار ڈٹھم　　کل یار اغیار کوں یار ڈٹھم

وحدت الوجود کی تشریح دیکھئے۔

جگ وہم خیال تے خواب　　سب صورت نقش برآب
جے پچھدیں حال حقیقت　　سن سمجھ اتے رکھ عبرت
جیویں بحر محیط ہے وحدت　　کل کثرت شکل حباب

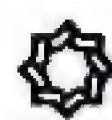
وحدت الوجود کے نقطہ نظر سے یہ دنیا وہم اور خواب وخیال ہے اور تمام نقوش فانی ہیں۔ کثرت محض حباب ہے اور خدا کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے۔

اے حسنِ حقیقی نورِ ازل　　تینوں واجب تے امکان کہوں
تینوں مسجد، مندر دیر کیوں　　تینوں پوتھی تے قرآن کہوں
تینوں خالق ذات قدیم کہوں　　تینوں حادث،، خلق جہان کہوں
بے رنگ کہوں بے مثل کہوں　　بے صورت ہر ہر آن کہوں

خواجہ غلام فرید نے 6 ربیع الاول 1319ھ 24 جولائی 1901 کو وفات پائی۔ خواجہ فرید وحدت الوجودی مسلک کے آخری صوفی شاعر ہیں۔

آیا وقت فرید چلن ڈا　　گزریا ویلھا ہسن کھلن دا
اوکھا پینڈا یار ملن دا　　جان لباں تے آندی اے

ملتان کے صوفیانہ فکر کی یہ چند نمائندہ خصوصیات ہیں جو تاریخ تصوف میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ اور ملتان کے صوفیاء کی خدمات کو اجاگر کرتی ہیں۔



مآخذ

1۔ اولاد علی گیلانی سید، مرقع ملتان 1938ء، جاذب پبلشرز لاہور 1995ء

2۔ حسن رضا گردیزی، شاہ یوسف گردیز 1983ء، کاروان ادب ملتان صدر

3۔ حکم چند، تواریخ ضلع ملتان 1884ء، لاہور

4۔ روبینہ ترین ۔ شبیر حسن اختر، شاہ شمس سبزواری، 2007ء، حیات و آثار (تاریخی تناظر میں)، شعبہ اردو بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

5۔ شاکر حسین شاکر، حضرت یوسف گردیز و شمس سبزواری، کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان

6۔ شاکر حسین شاکر، ملتان، عکس و تحریر 2012ء، سخنور فورم، شمع گھی اینڈ جنرل ملز لمیٹڈ ملتان

7۔ شبیر حسن اختر، ملوھیا: سدا سہاگن 2004ء، سرائیکی ریسرچ سنٹر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

8۔ محمد امین ڈاکٹر، مقالاتِ فلسفہ 1994ء، بیکن بکس ملتان

9۔ محمد امین ڈاکٹر، خواجہ فرید ۔ فکر و فن 2001ء، سرائیکی ادبی بورڈ ملتان

10۔ محمد سبطین رضا۔ افتخار علی گیلانی، تذکرہ سید موسیٰ پاک شہید گیلانی 2011ء شعبہ علوم اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

11۔ موسیٰ پاک شہید گیلانی، تیسرا الشاغلین فارسی 1309ھ مطبع صدیقی فیروز پور انڈیا، مہر عبدالحق ڈاکٹر اردو ترجمہ 1997ء، بیکن بکس ملتان

فاروق انصاری

مدینۃ الاولیاء کی پرشکوہ مساجد

ملتان برصغیر کے ان تاریخی شہروں میں سے ایک ہے جس کی تاریخ ہزاروں برسوں پر محیط ہے۔ یہاں اسلام کی روشنی محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ ہی پہنچی۔ تبلیغ دین کے لیے اولیاء نے اس شہر کو اپنا مسکن بنایا اور مدینۃ الاولیاء اس کی شناخت بن گئی۔ ملتان کا نام ذہن میں آتے ہی ایک ایسے شہر کا نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے جہاں اولیاء کرام کے مزارات ہیں اور ان کے روحانی فیوض کی برکات آج بھی یہ شہر سمیٹے ہوئے ہے۔ محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ ہی ملتان میں اسلام کی روشنی پھیلی تو یہاں مساجد کی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مساجد کی تعداد بڑھتی گئی اور اب شہر میں سینکڑوں نئی اور پرانی مساجد اپنے خوبصورت طرز تعمیر، پرشکوہ گنبدوں اور میناروں کے ذریعے اس شہر کے حسن میں اضافہ کر رہی ہیں۔ قدیم اور جدید مساجد کا یہ حسین امتزاج ہمیں جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کی جامع مساجد اور عیدگاہیں اندرون شہر کی قدیم مساجد اور نئی کالونیوں میں تعمیر ہونیوالی جدید مساجد میں روزانہ لاکھوں افراد خدائے بزرگ و برتر کے حضور سربسجود ہوتے ہیں۔

یہاں اتنی مساجد ہیں کہ شمار ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بعض مقامات پر تو دو مساجد ساتھ ساتھ ہیں۔ ہر مکتب فکر کے مسلمان مسجد کا احترام کرتے ہیں۔ مسجد کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کو سعادت سمجھا جاتا ہے۔ مسجد کی تعمیر، مرکب، زیب و زینت اور آرائش کو وجہ نجات سمجھا جاتا ہے۔ اس میں فرقہ کی کوئی قید نہیں۔ ملتان کی مساجد کے بارے میں اس مضمون کے لیے سفر کی ابتداء ہم گھنٹہ گھر سے کرتے ہیں۔ اگر گھنٹہ گھر سے کچہری تک جائیں تو سب سے پہلے گھنٹہ گھر کے بالکل سامنے نوابوں والی گلی کے سرے پر ایک خوبصورت مسجد ہے کچہری روڈ میں داخل ہوتے ہی دو مساجد بالکل قریب ہیں اس سے ذرا آگے سڑک پر دائیں جانب ایک مسجد گلی کے سرے پر اور ایک گلی کے اندر ذرا فاصلے پر۔ اس سے آگے بڑھیں تو دائیں جانب محلہ خواجگان یا محلہ گنج بازار میں ایک مسجد ہے۔ سڑک کے اسی مقام پر بائیں طرف ایک گلی اتر رہی ہے ایک مسجد وہاں ہے۔ کچہری روڈ پر ذرا آگے بڑھیں تو سینما کے سامنے ایک خوبصورت مسجد ہے اور آگے بڑھیں تو مارکیٹ کے سامنے سڑک کے دائیں جانب ایک ایک مسجد اور ایک دینی مدرسہ ہے اور آگے بڑھیں تو سڑک کے دائیں جانب محکمہ صحت کے دفاتر کے سامنے ایک مسجد ہے اور آگے بڑھیں تو گرلز

کالج کے سامنے مقامی ہوٹل سے پہلے ایک چھوٹی سی مسجد ہے ایک مسجد کچہری کے احاطہ میں ہے۔ گھنٹہ گھر سے کچہری تک زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہے اتنے سے فاصلے میں پندرہ مساجد ہیں اب تمام شہر کی مسجدیں کون کیسے شمار کرے گا۔

ویسے تو ہر مسجد متبرک اور واجب الاحترام ہے لیکن جس مسجد میں آدمی بچپن سے نماز ادا کرتا آیا ہو اس سے ایک جذباتی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے میں بچپن سے ہی مسجد حمام والی میں نماز پڑھتا آیا ہوں۔ اگرچہ لوہاری دروازہ سے منتقل ہوئے مجھے عرصہ دراز گزر چکا ہے لیکن یہ مسجد میرے دل میں بسی ہوئی ہے۔

مسجد حمام والی اونچی جگہ پر تعمیر شدہ عمارت ہے اس کا صدر دروازہ مشرقی جانب گلی کی سطح سے تقریباً چار فٹ بلند ہے۔ مغربی جانب النگ کے اندرونی جانب سڑک ہے۔ سڑک کی سطح سے مسجد تقریباً آٹھ فٹ بلند ہے۔ ادھر کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں ہے۔ مرکزی عمارت ایک وسیع دالان پر مشتمل ہے جس کی چھت پر تین گنبد ہیں۔ دالان کے شمال اور جنوب میں دو دو فٹ کھلی جگہ ہے جس سے عمارت ہوادار ہو گئی ہے۔ عمارت کے اندرونی جانب دیواروں پر نہایت خوبصورت نقش بنے ہیں جس سے مسجد کے حسن میں اضافہ ہوا ہے اور وہ دیدہ زیب بن گئی ہے۔ فرنٹ پر نہایت خوبصورت کاشی کی ٹائلیں لگی ہیں۔ مسجد کا وسیع صحن ہے اور جوتے رکھنے کے لیے کافی کھلی جگہ چھوڑی ہوئی ہے۔ وضو خانہ مسجد کے اندر ہے اس جگہ اب سے پچاس برس پہلے چھت ڈال دی گئی جس سے ملتان میں گرمی کے پیش نظر سہولت تو مل گئی مگر مرکزی عمارت کا حسن مجروح ہوا۔ دالان کے مغربی جانب ایک حجرہ ہے۔

ہم جمعہ کی نماز ہمیشہ مسجد حمام والی میں پڑھتے تھے۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ تساہل کی وجہ سے ہمیں دیر ہو جاتی جب ہم پہنچتے تو نماز ہو چکی ہوتی۔ پھر ہم دوڑ کر وہاں سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر مسجد دربار والی میں پہنچتے۔ وہاں جمعہ نماز نسبتاً ذرا دیر سے ہوتی تھی۔ مسجد دربار والی بھی اونچی جگہ پر تعمیر شدہ ہے۔ پرانی طرز کی عمارت ہے اس کے مشرقی جانب گلی ہے جس می چند ایک دکانیں ہیں جن کی چھت مسجد کے صحن کا حصہ ہے۔ مسجد سے ملحق مغربی اور جنوبی جانب مکانات ہیں۔ شمالی جانب ایک بغلی گلی ہے جو النگ پہ کھلتی ہے۔ اسی گلی میں مسجد کا صدر دروازہ ہے۔ جو گلی سے چھ سات فٹ بلندی پر ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ مسجد دربار والی سے ذرا آگے شاہ گردیز کی طرف جائیں تو گلی دوشاخہ ہو جاتی ہے وہیں مشرقی جانب ایک بغلی گلی میں ایک مسجد ہے جو فرشی منزل پر نہیں بلکہ پہلی منزل پر ہے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہیں۔ دوشاختہ گلیوں میں بائیں جانب والی گلی میں آگے جائیں تو بہت بڑا احاطہ ہے اس احاطہ میں حضرت شاہ گردیزؒ کا مزار بھی ہے۔ مامر بارگاہ بھی ہے جو لکڑی کے ستونوں پر قائم ہے۔ چھت بھی لکڑی کی ہے جس پر نہایت خوبصورت بیل بوٹے اور نقش و نگار بنے ہوئے ہیں بہت بڑا ہوا دار ہال کمرہ ہے۔ ایک خوبصورت مسجد ہے جسے شیر شاہ سوری نے ملتانی کاشی کی ٹائیلوں سے مزین کیا تھا۔ احاطہ میں بہت سی کھلی جگہ ہے جہاں عشرہ محرم میں تقریبات اور ماتم ہوتا ہے۔

چوک بازار میں جنوب کی طرف جائیں تو تھانہ کپ کے قریب پاک دروازہ بازار اور حرم دروازہ بازار کے سنگم سے تھوڑا پہلے مسجد علی محمد خان کی پُرشکوہ عمارت ہے یہ مسجد ولی محمد خان کے نام سے مشہور ہے۔علی محمد خان ملتان کا صوبیدار تھا یہ مسجد اور نالہ علی محمد اس کے عہد کی یادگار ہیں۔نالہ تو پاٹ دیا گیا ہے اور اس کا نام ونشان تک مٹ گیا ہے اب یا تو وہاں سڑکیں بن گئی ہیں یا عمارات تعمیر کر دی گئی ہیں مسجد ایک بلند جگہ پر واقع ہے نیچے چاروں طرف یا تو پختہ دکانیں ہیں یا دیوار کے ساتھ لکڑی کے کیبن بنے ہوئے ہیں۔صدر دروازہ شمال کی جانب ہے اندر ایک دالان اور باقی صحن ہے۔مسجد 1757ء میں تعمیر ہوئی تقریباً اڑھائی سو سال قدیم ہے۔اس کے نقش ونگار اب مٹتے جا رہے ہیں کہنگی کے باوجود عمارت مستحکم ہے۔مرمت طلب اور نئے سرے سے آرائش کی متقاضی ہے۔

چوک بازار میں ہی ایک مسجد کی شاندار عمارت ہے۔یہ مسجد پھول ہٹ کہلاتی ہے۔کسی زمانے میں مسجد کے باہر پھول اور گجرے فروخت کرنے والوں کی دکانیں تھی۔اب بھی کچھ لوگ وہاں پھول بیچتے نظر آتے ہیں۔مسجد بازار کے فرش سے دو فٹ بلند ہو گی اس کا صدر دروازہ بہت بلند ہے اور مشرق کی طرف بازار میں کھلتا ہے۔حسین آگاہی کے دروازہ کی چڑھائی چڑھیں تو گلی کمان گراں کے دائیں جانب ایک مسجد ہے جو ہے تو قیام پاکستان سے پہلے کی مگر زیادہ پرانی نظر نہیں آتی۔ذرا آگے جائیں تو بائیں جانب گلیوں میں ایک پرانی مسجد ہے ہر قدیم مسجد کی طرح اس میں ایک چرخی والا کنواں تھا ڈول سے پانی نکالا جاتا تھا جو وضو اور دیگر ضروریات کے کام آتا تھا حکیم رشید سندھی کا مطب اور ہائش گاہ بھی وہیں قریب تھی۔اسی علاقے میں ایک اور مسجد تھی جہاں مولانا احمد سعید کاظمیؒ وعظ فرمایا کرتے تھے۔یہ تشکیل پاکستان سے پہلے کی بات ہے میں صرف ان کا وعظ سننے جمعہ کے روز لوہاری دروازہ سے چل کر تپتی دھوپ میں وہاں جاتا تھا۔یہ غالباً وہی مسجد تھی جہاں مولانا عبدالحق محدث نماز پڑھایا کرتے تھے۔مسجد علی محمد خان سے بوہڑ دروازہ بازار میں داخل ہوں تو وہاں ایک مسجد ہے جو قیام پاکستان کے بعد تعمیر ہوئی مسجد کے ایک طرف بازار ہے اور دوسری طرف گلی ہے مغربی جانب ملحق دکانیں ہیں اور مشرقی جانب ایک تکونے سرے پر آ کر مسجد ختم ہو جاتی ہے۔معصوم شاہ روڈ پر کبھی سلور کا کارخانہ ہوتا تھا جس میں جست کے برتن بنتے تھے اس کے ذرا آگے بائیں جانب پہلی منزل پر ایک مسجد ہے اور آگے چلیں تو دائیں طرف رائٹرز گلڈ کالونی ہے یہاں ایک بہت وسیع اور شاندار مسجد ہے۔شمس آباد کالونی میں ایک وسیع مسجد ہے۔

گلگشت کالونی میں داخل ہونے سے پہلے پیر خورشید کالونی ہے۔سڑک کنارے ایک وسیع اور ماڈرن عمارت کی مسجد ہے ایک مسجد بچہ ہاؤس کے عقب میں ایک گلی میں ہے گول باغ کے بالکل سامنے ایک بہت بڑی وسیع اور شاندار مسجد ہے جس کے احاطہ میں دینی مدرسہ بھی قائم ہے۔طلبہ کی ایک بڑی تعداد وہاں علمی خزانے سے مستفید ہو رہی ہے۔وہاں کے اساتذہ کا شمار قابل اور جید علماء میں ہوتا ہے۔ایک خوبصورت مسجد گلگشت کالونی میں گردیزی مارکیٹ کے عقب میں ہے۔

قدیر آباد مولانا عبدالودود کی وجہ سے جانا پہچانا علاقہ ہے اسی محلہ میں ایک طباخ کی دکان ہے۔ دکان کے مغربی جانب مسجد ٹاہلی والی ہے۔ کافی قدیم مسجد ہے اور پرانے طرز کی بنی ہوئی ہے۔ دکان کے شرقی جانب ایک تنگ گلی ہے جس میں ذرا آگے جا کر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو بالائی منزل پر ہے۔ ایک بہت ہی قدیم طرز کی خاصی بڑی مسجد حضرت عبید اللہؒ کی خانقاہ سے ملحق ہے۔ دراصل یہ بہت بڑا احاطہ ہے حضرت عبید اللہؒ کی اولاد کے کئی مکانات بھی اسی احاطہ میں ہیں۔ یہاں درس بھی ہوتا ہے۔ اسی مسجد کے سامنے گلی کے موڑ پر ایک اور قدیم وسیع اور خوبصورت مسجد ہے لوگ اسے نوابوں والی مسجد کہتے ہیں اس کی کرسی بلند نہیں ہے یہاں سے آگے جائیں تو ایک گلی مڑنے کے بعد دوسری گلی کے نکڑ پر مسجد خدکہ ہے یہ مسجد پہلے بھی بہت خوبصورت تھی مزید تزئین و آزائش کے بعد اس میں مزید خوبصورتی پیدا ہو گئی ہے۔

نواں شہر چوک پر سینما کے سامنے ایک درمیانہ مسجد ہے چوک سٹیٹ بنک کی طرف چلیں تو سڑک کے دائیں طرف کڑی مصری خان ہے اور بائیں طرف نواں شہر کا وسیع محلہ۔ کڑی مصری خان میں پہلی ہی گلی میں ایک مسجد ہے۔ ایک مسجد شاہ حسن پروانہ روڈ پر بہت ہی قدیم طرز کی ہے۔

نواں شہر کے مرکزی بازار میں داخل ہوں تو انکم ٹیکس دفاتر کے عقب میں کافی اونچی کرسی پر ایک بہت پرانی مسجد ہے اس کے فرنٹ پر آدھی زمین دوز ایک یا دو دکانیں ہیں۔ بازار کیا ہے بس گلی سی ہے۔ آگے جائیں تو بخاری کالونی سے ذرا پہلے ایک خاصی بڑی مسجد ہے۔ نواں شہر کی دوسری گلی میں ذیلی ڈاکخانہ کے پاس مسجد درکھاناں والی ہے۔ طارق روڈ پر پہنچیں تو ایک چھوٹی سی دو منزلہ مسجد ہے۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا قبرستان ہے۔ طارق روڈ کے پرلی طرف جونئی ماڈرن طرز کی کالونی آباد ہوئی ہے اس میں کیک کافی کشادہ اور خوبصورت مسجد تعمیر ہوئی ہے۔

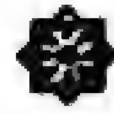
ابدالی روڈ پر پریس کلب سے آگے بڑھیں تو ایک قدیم، وسیع اور کشادہ، شان و شوکت کی حامل بڑے بڑے گنبدوں والی ابدالی مسجد ہے عمارت میں اور اضافی گنجائش پیدا کرنے کے لیے کئی بار اس میں ترمیم و اضافہ ہو ہے۔ یہ ہر وقت گہما گہمی رہتی ہے تبلیغی جماعت کا مرکز ہے۔

قلعہ کہنہ پر ایک مسجد شاہ بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ کے احاطہ میں ہے۔ ایک مسجد شاہ رکن عالمؒ کی خانقاہ کے احاطہ میں ہے۔ حرم دروازہ سے سٹی ریلوے سٹیشن کی طرف چلیں تو سڑک کے بائیں طرف محلہ کی گلیوں میں ایک پرانی مسجد ہے بازار لوہے ہٹ میں ایک بلند کرسی پر سڑک کے کنارے ایک مسجد ہے۔ برج کے پاس ایک بہت بڑی قدیم طرز کی مسجد ہے اس میں وضو کے لیے ایک تالاب ہے جس پر چھت ہے۔ ایلکنواں ہے۔ یہ مسجد جنازہ گاہ کے نام سے مشہور ہے۔ سٹی سٹیشن کی پرلی طرف قبرستان پاک مائی میں ایک قدیم طرز کی وسیع و عریض شاہی مسجد طوطلا والی ہے۔ ممتاز آباد میں ایک بہت بڑی مسجد "نوری مسجد" کہلاتی ہے۔ مسجد سے ملحق ایک دینی مدرسہ ہے لوہا

دروازہ میں فاطمہ جناح ہسپتال کے قریب گلی میں ایک مسجد ہے جو املی والی مسجد کہلاتی ہے۔ یہاں کسی زمانے میں مفتی محمد شفیع روزانہ فجر کی نماز کے بعد قرآن کریم کا درس دیا کرتے تھے۔ تشکیل پاکستان سے قبل اہل ہنود کا ایک بہت بڑے احاطہ میں گئو شالہ تھے۔ انتقال آبادی کے بعد یہاں دینی مدرسہ ''خیر المدارس'' قائم ہوا اس کے مہتمم مولانا خیر محمد جالندھری تھے اس مدرسے کی مسجد بھی بہت دیدہ زیب ہے۔

اور اب ذکر ملتان کی تاریخی عید گاہوں کا۔ قیام پاکستان سے پہلے مجھے صرف دو عید گاہیں یاد ہیں ایک تو بہت بڑی اور پُرشکوہ عمارتی والی عید گاہ جو شہر سے بہت دور ہوتی تھی۔ اس وقت عید گاہ اور قلعہ کہنہ کے درمیان سب کھیت ہی کھیت تھے۔ اب مکانات اور بنگلے اور کالونیاں بن گئی ہیں۔ یہ عید گاہ ملتان کے مسلمان فرمانروا نواب عبدالصمد خان نے 1735ء میں تعمیر کرائی تھی اور شاہی عید گاہ کہلاتی ہے۔ دوسری عید گاہ باغ خاص و عام کے عقب میں ہے یہ مغلیہ دور کی یادگار ہے مغلیہ دور میں باغ خاص و عام اتنا محدود نہ تھا تقریباً تمام شاہی محلات اسی علاقہ میں تھے۔ ایک اور تیسری عید گاہ ملتان چھاؤنی کے علاقہ میں تھی یہ وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی چھوٹی سی مسجد تھی اب یہاں نئی شاندار اور پُرشکوہ عمارت تعمیر کرائی جا رہی ہے۔

(روزنامہ جنگ ملتان - فاروق انصاری)



عمر کمال خان ایڈووکیٹ

ملتان کے ممتاز فقہاء اور مفتیانِ دین

ملتان اور اہل ملتان کی مذہب دوستی آج کی نہیں صدیوں کی بات ہے۔ اسلام کی حقانیت کا جو رنگ ملتان میں نظر آیا وہ کہیں اور دکھائی نہیں دیا۔ پیروں اور فقیرں کی یہ سرزمین صدیوں سے آباد اور فیض یاب ہے۔

دار الامان جنت نشان ملتان ابتداء فینش سے ہی تہذیب وتمدن کا گہوارہ، علم و ادب کا گنجینہ، مرکز شریعت و معرفت اور مرجعہ عدل و انصاف رہا ہے۔ وادی سندھ میں اس کی مرکزیت اور ہر دور میں صوبائی درمقام ہونے کی وجہ سے اس کی سیاسی اہمیت ہندوستان کے کسی بڑے بڑے شہر سے کسی طرح بھی کم نہ تھی اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے یہ شہر ہمیشہ وقت کے حکمرانوں کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ نیز مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیاء سے جن علماء فضلاء اور مشائخ نے برصغیر کی طرف رخ کیا ان کا پہلا پڑاؤ ملتان ہی ہوتا تھا جس کی وجہ سے علماء پہلے پہل ملتان میں ہی علم وعرفان کی قندیلیں روشن کرتے تھے جہاں سے پھر باقی ہندوستان میں علمی ضوفشانی ہوتی تھی ان عوامل کے علاوہ سلطانی دور حکومت اور مغلیہ عہد میں ملتان میں طویل عرصہ تک امن امان رہا جس کی وجہ سے ملتان علم و عرفان ے مقام کے طور پر منفرد مقام حاصل کر گیا۔ دور سلطانی کو فی الحقیقت علمی لحاظ سے ملتان کے فقہا کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا قطب الدین کاشانی کے مدرسہ کی ابتداء اسی دور میں ملتان میں ہوئی مدرسہ بہائیہ نے بھی حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ رحمت کی ذات صفات کی زیر سرپرستی اسی دور میں دنیا میں نام پیدا کیا ان مدارس کے فارغ التحصیل طلباء نے ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل کر فقہ اسلامی کی ترویج وترقی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اس دور کے مشہور فقہا حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ رحمت قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی شرف الدین اصفہانی، فقیہ وقت شیخ فضل اللہ بن محمد ملتانی، مولانا ظہیر الدین محمد، مولانا سید احمد حنفی ملتانی، مولانا منہاج الدین سراج اور مولانا عبداللہ تلمبوی تھے سلاطین خاندان لنگاہ کے دور حکومت میں بھی ابتدا فتنہ دین الٰہی کی وجہ سے علم وعرفان کی ترقی کی راہیں کچھ عرصہ کے لیے مسدود ہوگئیں اور اس کے اثرات ملتان کی علمی زندگی پر بھی مرتب ہوئے لیکن حضرت مجدد الف ثانی علیہ رحمت اور ان جیسے دیگر عارفان حق کی کاوشوں سے ارتداد دین مبین کے تمام فتنے صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو گئے اور علماء وفقہا کا وقار اور مدرسوں کی رونق دوبارہ قائم ہوگئی اس دور کے

ملتانی فقہا میں قاضی جلال الدین ملتانی، مولانا وجیہ الدین عراقی، مولانا عزیز الدین تلتبوی ملتانی علم و فقہ اصول شریعت میں کامل تھے لیکن یہ سب کچھ اورنگزیب عالمگیر کی زندگی تک تھا اس اولوالعزم بادشاہ کی وفات کے ساتھ ہی مغلوں کی وسیع وعریض سلطنت کی بساط ہی الٹ گئی صرف پچیس سال کے اندر نااہل آرام طلب عیاش حکمرانوں، بے درد نااہل خوشامدی نوکر شاہی خودسر باغی اقوام کی لوٹ کھسوٹ اور مرہٹہ جاٹ اور سکھ گردی کے ہاتھوں سے مغل سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔ رہی سہی کسر غیر ملکی حملہ آوروں نے نکال دی اور مغل اس قدر کمزور ہو گئے کہ انہیں اپنے ہاتھوں ہی سے ستلج کے ادھر پنجاب ملتان سندھ کشمیر کے صوبے پہلے نادر شاہ افشار اور پھر احمد شاہ درانی کے حوالے کرنے پڑے اس طوائف الملوکی کا شکار ملتان بھی ہوا1758ء کو مرہٹوں کا ایک لشکر ملتان کے بیرون جات کو لوٹ کر چلا گیا 1764ء میں سکھوں کی بھنگی مثل نے ملتان پر پہلا حملہ کیا اور کافی جانی و مالی نقصان پہنچایا 1771ء میں پھر سکھوں کی بھنگی مثل ملتان پر حملہ آور ہوئی لیکن افغان فوجوں کی آمد کا سن کر ملتان سے سکھوں نے راہ فرار اختیار کی 1773ء میں سکھوں نے چالاکی سے ملتان پر قبضہ کرلیا اور سکھوں کے اس قبضہ کے دوران ملتان کا اسلامی کردار بری طرح مسخ ہوا شعائر اسلامی کی ادائیگی مسلمانوں کے لیے ناممکن ہوگئی اسلامی نظام حکومت تباہ ہوگیا اور اسلامی ادارے نیست و نابود ہو گئے 8 فروری 1780ء بمطابق 1194ھ تیمور شاہ درانی نے بڑی جدوجہد کے بعد سکھوں کو ملتان سے نکالا اور نظام حکومت نواب مظفر خان کے سپرد کیا۔ اور کئی سالوں کے بعد پہلی مرتبہ ملتان میں اذان اللہ اکبر وقال اللہ الرسول کا غلغلہ دوبارہ بلند ہوا اس وقت ملتان میں فقہا اور علماء کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ اور فقہ کا نظام عنقا تھا مدرسے اور مسجدیں خالی اور زبوں حالی کا شکار تھیں۔ نئے ناظم ملتان نواب مظفر خان نے 1780ء کو نظام حکومت سنبھالتے ہی اسلامی اقدار اور نظام ہائے حکومت اور ملتان کے اسلامی تشخص کی بحالی کی طرف توجہ دی۔ اور اپنی عسکری دفاعی اور گوناں سیاسی الجھنوں اور سکھ گروہ کے مضر اثرات کے باوجود محکمہ فقہ کی تنظیم جدید اسلامی مدارس کے دوبارہ احیاء اور عوام کو احکام شریعہ سے روشناس کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1780ء فی الحقیقت ملتان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سال ہے اور باوجودیکہ 38 سال بعد 1818ء میں ملتان پر سکھوں کا غلبہ بھر ہو گیا لیکن ملتان میں علم وعرفان کی جو قندیلیں نواب مظفر خان کے دور میں روشن ہوئیں۔ ان کی ضوفشانی اور تابنا کی آج تک قائم و دائم ہے۔ میں نے اس مضمون میں 1780ء سے لے کر 1980ء کے دو سالہ عرصہ کے مشہور فقہا کے کارناموں کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔

گزشتہ دو سو سال ملتان کی تاریخ کا ایک طویل عرصہ ہے۔ یہ عرصہ اسلامی دور، سکھ دور، انگریزی دور اور پاکستانی دور کو محیط کئے ہوئے ہے ان ادوار کی فقہی ضروریات مختلف تھیں۔ اور مسلمانان ملتان کی عمرانی ضروریات بھی ہر دور میں مختلف تھیں لیکن یہ بات حیران کن ہے کہ ملتان میں گزشتہ دو سو سال میں فقہا کی عظیم اکثریت کا تعلق صوفیائے چشت سے ہے، ملک کے لحاظ سے فرقہ پرستی سے نفرت کرتے تھے۔ اور انسان دوستی محبت اور بھائی چارہ کے علمبردار تھے، اس کا نتیجہ یہ رہا کہ ان فقہا کی بدولت انگریزی دور کے چند سالوں کے سوا باقی تمام سیاسی عوامل کے

تحت مسلمانوں کے مابین فرقہ پرستی کے اکا دکا واقعات ہوئے اس سارے طویل عرصے میں ملتان کے علماء وفقہا اور مفتیان دین متین کے مابین بے حد ہم آہنگی اور اتفاق رہا۔ اور مسلمانوں کے مابین اتحاد اور یگانگت قائم رہی۔ گزشتہ دو سو سالہ دور میں ملتانی فقہا کے سرخیل ''حضرت حافظ محمد جمال اللہ ملتانیؒ'' تھے جو حضرت قبلہ عالم نور محمد مہاروی علیہ رحمت کے خلیفہ مجاز اور ملتان میں چشتیہ سلسلہ تصوف کے احیا جدید کے بانی تھے آپ جہاں شہباز طریقت تھے وہاں آفتاب شریعت تھے اور چشتیہ سلسلہ تصوف کے ضابطوں کے تحت اپنے بحر علمی وفقہی مہارت چھپاتے تھے۔ ان کی فقہی استعداد کے بارے میں حضرت مولانا عبدالعزیز پرہاروی جو اپنے وقت کے عظیم عبقری اور خلیفہ تھے، کی رائے قابل ملاحظہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت حافظ محمد جمال اللہ صاحب علم کے بحر ذخار تھے آپ نہایت ہی رفیق اور مشکل فقہی مسائل میں از روئے فکر اور احسن الناس تھے جو ہمیں کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ پیش آتا اور ہم آپ کی طرف رجوع کرتے تو آپ اس مسئلہ کے حل اشکال میں ایسی واضح اور اچھی تقریر فرماتے کہ جس سے بہتر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، فی الحقیقت خانقاہی نظام کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے ان کی روحانی عظمتوں اور مقام کے بارے میں تو لوگوں نے جواد کو محفوظ کو رکھا ہے لیکن ان کی فقیہانہ اہلیت اور علمی کاوشوں کو درخو اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ فی الحقیقت اس دور میں حافظ صاحب سے زیادہ بڑا فقیہہ اور کوئی نہیں گزرا آپ 1713ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ کسب علم بھی ملتان کے فقہا سے حاصل کیا اور زندگی کا ایک طویل عرصہ درس و تدریس میں صرف کیا آپ کے شاگردوں میں حضرت خواجہ خدا بخش خیر پوری علیہ رحمت مولانا قادر بخش، مولانا محمد موسیٰ صدیقی، مولانا عبدالعزیز پرہاروی، مولانا محمد گل محمد احمد پوری گزرے۔ آپ کے ہم عصر علماء میں حضرت مولانا محمد کامل جید عالم تھے اور مشکل سے مشکل فقہی مسائل کے حل میں کامل تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں اصول فقہ کی مشہور کتاب متین کی شرح اور اس دور کے فقہا میں بہت مشہور تھی۔ حضرت حافظ کے نامور شاگرد مولانا عبدالعزیز پرہاروی کا نام لیے بغیر کوئی تذکرہ فقہا ملتان مکمل نہیں ہو سکتا۔ پورے پنجاب کی تاریخ میں اس پایہ کے عبقری کی نظیر نہیں ملتی آپ عالم فاضل فقہ بے بدل، اور ولی برحق تھے۔ آپ کو علم لدنی حاصل تھا۔ فرقہ خلافت حضرت حافظ جمال اللہ ملتانی سے حاصل کیا آپ حدیث فقہ، عقائد علم الکلام طب ریاضی، نجوم، معیشت، جفر، رمل جملہ علوم یعنی متداولہ پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ مختلف دقیق اور عمیق علوم پر دو سو کتب اور رسائل تصنیف کئے فقہ پر ان کی کتاب بزاس بے حد مشہور ہے، قلیل عمر پائی 39 سال کی عمر میں 1822ء میں وفات پائی حضرت حافظ صاحب کے شاگرد مولانا خواجہ محمد موسیٰ صدیقی کے شاگرد اور مرید قاضی محمد نادر فقہ اسلامی یگانہ روزگار تھے دور سدوزئی میں قاضی کے عہدہ پر فائز تھے۔ اور سخت گیر قاضی تھے بڑے جرات مندانہ فیصلے کرتے تھے۔ ملتان میں ان کے بارے میں ضرب المثل ہے ''اوپر قادر نیچے نادر'' آپ کا سال وفات 1848ء ہے۔

اس دور کے ایک اور فقیہ اور نامور عالم جناب حضرت مولانا خواجہ عبید اللہ صاحب بھی چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے اور حضرت حافظ صاحب کے خلیفہ خواجہ خدا بخش خیر پوری کے خلیفہ تھے۔ آپ جملہ فقہی علوم میں کامل مہارت رکھتے تھے خاص طور پر علم میراث میں عالم بے بدل تھے آپ کا مدرسہ عبیدیہ آج تک تعلیم علم میراث کے

سلسلہ میں مشہور ہے آپ نے علم میراث پر ایک جامع رسالہ بھی تصنیف کیا۔ جو آج تک فقہ کے طلباء میں بے حد مقبول ہے آپ نے 1305ھ میں وفات پائی اور اپنے پیچھے اپنے خاندان میں علماء فضلاء فقہا کی ایک طویل روایت چھوڑ گئے۔ آپ کے ہم عصر فقہا میں حضرت مولانا علی مردان صاحب اویسی اور سید غلام حسین قاضی مظفر گڑھ کے نام بے حد مشہور ہیں۔ یہ اصحاب اس دور میں عالم فقہ میں مہارت اور حل مسائل شرعیہ میں اپنی بصیرت کی وجہ سے دور و نزدیک مشہور تھے۔ مولانا عبید اللہ صاحب کے ہم عصر غیر مقلد اہلحدیث مسلک کے مفتی مولانا جند وڈہ ساکن جلال پور پیروالہ تھے۔ وہ اپنے مسلک کے مفتی تھے لیکن ان کی بدمزاجی ضرب المثل تھی مولانا خواجہ عبید اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ان کے فرزند مولانا عبدالرحمٰن صاحب بھی علم فقہ میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ آپ نہایت قابل استاد تھے۔ تقریباً پچاس سال کی عمر میں کسی نے پوچھا تو آپ نے بتایا کہ میں فقہ کی کتاب توضیح تلویح کے بیاسی دورے مکمل کر چکا ہوں۔ ان کے ہم عصر مفتیان اور علماء کرام میں مولانا محمد مراد صاحب سیت پوری، مولانا فتح محمد سہارنپوری اور مولانا محمد اکرم سرہانوی قابل ذکر ہیں۔ چودھویں صدی ہجری میں بیسویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ملتان میں مفتی عبدالعلیم صاحب کی فقہی امور میں اہلیت کا ہر طرف غلغلہ تھا۔ بڑے بڑے عالم ان کے سامنے طلباء کو درس دینے سے کتراتے تھے۔ آپ نے ابیات علم میراث کی شرح لکھی۔ جو آج تک طلباء فقہ میں بے حد مقبول ہے۔ آپ کے ہم عصر علماء و فقہا میں مولانا سلطان محمود تلیری والے، مولانا نظام بخش صدیقی، مولوی برخوردار اندرون پاک دروازہ ملتان شہر اور مولوی رحیم یار چودھویں صدی ہجری کے نصف تک علم و فقہ اسلامی کے مشہور عالم ہو گزرے ہیں۔ مولوی برخوردار صاحب نے حضرت عبدالعزیز پرہاروی صاحب کی فقہ کی مشہور کتاب ''براس'' کی شرح لکھ کر شہرت دوام حاصل کی۔

چودھویں صدی ہجری میں ملتان کے ایک اور نامور فقیہہ حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی رحمت علیہ تھے جن کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ آپ ملتان کے ایک اور فقیہہ حضرت حافظ جمال الدین گھوٹوی صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ نیز آپ نے مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا عبدالحق رام پوری سے بھی کسب علم کیا تھا۔ اس کے بعد آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور محدث مدینہ حضرت مولانا عبدالباقی لکھنویؒ سے دورے حدیث پڑھا۔ آخر میں فخر العلماء استاد المحدثین حضرت سیدنا پیر مہر علی شاہ صاحب علیہ رحمت سے حدیث تصوف اور دیگر علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ جب ہر طرح سے کامل ہو گئے تو آپ نے سب سے پہلے مدرسہ عالیہ رامپور میں درس دینا شروع کیا۔ لیکن جلد ہی اپنے استاد مولانا جمال الدین گھوٹوی کی مسند درس پر متمکن ہوئے اور جلد ہی آپ کے علم اور فقہ پر عبور اور تدریسی مہارت کی شہرت پورے عالم اسلام میں پھیل گئی۔ 1925ء میں آپ کو جامعہ عباسیہ بغداد الجدید کا شیخ الجامعہ مقرر کیا گیا۔ بعد میں آپ ناظم اعلیٰ اوقاف اور انسپکٹر جنرل مدارس عربیہ ریاست بہاولپور کے مناصب پر فائز ہوئے آپ اس دور کے مفتی اعظم تھے آپ بے حد وجیہہ انسان تھے اور غیر معمولی جسمانی طاقت کے مالک تھے۔ جس کی وجہ سے آپ روزانہ بیس گھنٹے متواتر طلباء کو پڑھاتے تھے اور اتنی محنت کرتے تھے کہ طلباء کے تمام مشکل ، اور حل ،

طلب مسائل آسان ہو جاتے تھے۔ مارچ 48ء میں آپ خالق حقیقی سے جا ملے۔ گزشتہ ادوار کے علماء اہل سنت کے ہم عصر اہلحدیث علما وفقہا کا تذکرہ بھی برمحل ہوگا۔ ملتان میں اہلحدیث خیالات کا پرچار مولانا سلطان محمود صاحب نے شروع کیا وہ 1975ء میں ڈیرہ اسماعیل خان سے تشریف لائے اور محلہ قالین باخان میں ایک مسجد اہل حدیث کا اجراء کیا اور ساتھ ہی مدرسہ اہل حدیث قائم کر کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے فرزند مولانا عبدالحق صاحب محدث اور فقیہہ تھے اور مولوی سید نذیر حسین دہلوی کے مدرسہ اہل حدیث سے فارغ التحصیل تھے انہوں نے فقہ اہل حدیث کا درس تقریباً چالیس سال تک دیا۔ وہ اپنے مسلک کے کامل مفتی تھے۔ اس مسلک کے ایک اور نامور محدث اور فقیہ مولانا عبدالتواب ملتانی تھے۔ آپ کا شمار مولوی نذیر حسین دہلوی کے نامور شاگردوں میں ہوتا تھا۔ ان کا قابل فخر کارنامہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی فقہ پر کتاب بلوغ المرام جس میں احادیث کو فقہی اصولوں پر مرتب کیا گیا ہے کا سلیس اردو ترجمہ معہ حواشی اور مسائل کی تخریج اور اسمائے رجال پر کام ہے۔ موجودہ دور میں فقہ اہلحدیث کے نامور فاضل شیخ الحدیث مولانا سلطان محمود محدث جلال پوری میں جو حجاز سے سند فضیلت حاصل کر کے تعلیم و تعلم میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ فقہ اثنا عشری کے سلسلہ میں بھی ملتان قابل فخر فقہا کا ملجاو ماوا رہا ہے اس سلسلہ میں ابتداء شیعہ مسلمانان ملتان کی قیادت کا سہرا سادات شاہ گردیز کے سر رہا ہے۔ مسجد شاہ گردیز کے خطیب ہر دور میں نامور فقہا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید زین العابدین صاحب سابق خطیب مسجد شاہ گردیز کا نام اولیت کا حامل ہے۔ آپ اپنے مسلک کے کامل مفتی تھے۔ اس مکتب فکر کے ایک اور عالم اور مجتہد سید محمد باقر شاہ صاحب چک نمبر 38 خانیول مشہور اثنا عشری فقیہہ اور مدرس ہو گزرے ہیں۔ وہ ارسطو جاہی خاندان کے مشہور شیعہ عالم شریف العلماء مولانا سید شریف حسین کے شاگرد رتھے۔ انہوں نے اپنے چک میں قائم کردہ مدرسہ میں مسلک اثنا عشری کی تعلیم تقریباً پچاس سال کے قریب دی ہے۔ آج پاکستان میں کوئی ہی جگہ ہو جہاں ان کے شاگرد موجود نہ ہوں۔ ان کے ہم عصر علماء اثناعشری میں مولانا سید علی نقی فاضل لکھنؤ۔ سلطان المدرسین مولانا فدا حسین قتال پوری کے نام نامی فقہا اثناءعشری میں قابل ذکر ہیں۔ آج کل سید گلاب شاہ صاحب بانی مدرسہ مخزن اسلام الجعفر یہ سورج میانی اور مفتی سید عنایت علی شاہ صاحب نقوی خطیب مسجد شاہ گردیز و مولانا سید مرتضےٰ شاہ صاحب و مولانا محمد یار صاحب بانی مدرسہ محمدیہ علی پور مسلک اثناءعشری کے کامل مفتی اور فاضل رجل ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے ملتان کے حساس اہل علم و دین حضرات کو ہندوستان کی بگڑتی ہوئی سیاسی صورت حال اور امن عامہ کی دگرگوں حالت اور ہندوستان کے مشہور دینی مدارس یعنی مدرسہ دارالعلوم دیو بند مدرسہ عالیہ رامپور، مظاہر العلوم سہارن پور، مدرسہ امینیہ، مدرسہ عبدالرب، دہلی جامعہ قاسمیہ مراد آباد اور ندوۃ العلماء کی ملتان سے دوری کی وجہ سے کسب علوم دینیہ میں طلباء ملتان کی گوناں گوں مشکلات کا بے حد احساس تھا۔ نیز موجودہ پاکستان کی حدود جو کہ ایک مسلم اکثریت کا علاقہ تھا میں معیاری دینی مدارس کی کمیابی کی وجہ سے جو علمی خلاء تھا اسے پُر کرنا بھی مطلوب تھا۔ چنانچہ ایسے ہی چند دردمند علماء کے نزدیک قیام پاکستان سے پہلے ملتان میں اعلیٰ دینی مدارس کا قیام ایک

ناگزیر حقیقت بن چکا تھا۔ چنانچہ اس سمت میں سب سے پہلے غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی نے مسلک اہل سنت والجماعت کی تعلیم وتبلیغ کے لیے ملتان میں مدرسہ انوار العلوم کچہری روڈ سال 1944ء میں قائم کیا۔ 1946ء میں مولانا مفتی محمد شفیع ملتانی نے مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا اور اگست 1947ء میں مولانا خیر محمد صاحب جالندھری جب اپنے وطن سے ہجرت کر کے ملتان تشریف فرما ہوئے تو انہوں نے گیان استھان کی جائیداد میں مدرسہ خیر المدارس کا دوبارہ اجراء کیا۔ 1949ء میں مولانا حضرت حامد علی خان شیخ التفسیر مدرسہ عالیہ رام پور کے عہدہ جلیلہ سے استعفیٰ دے کر ملتان تشریف لائے اور مدرسہ اسلامیہ خیر المعیاد میں درس نظامی کا اجراء کر کے اسے دارالعلوم بنا دیا۔ ان بزرگوں کی شبانہ روز کاوشوں سے ہی ملتان فقہی علوم کے مرکز کے طور پر پاکستان کے نقشہ پر ابھرا۔ ملتان میں ان مدارس کے قیام سے پہلے قائم شدہ مدرسوں میں مدرسہ عبیدیہ، مدرسہ اہل حدیث، باب العلوم اثناء عشری اور مدرسہ نعمانیہ کے نام قابل ذکر تھے۔ ان جدید مدرشوں کے قیام کے بعد اب ملتان میں فقہ کی تعلیم کا پہلے سے بہتر انتظام ہو گیا اور فتاویٰ اب انفرادی حیثیت سے جاری ہونے کی بجائے ان دینی مدارس کے دارالافتاء سے باقاعدگی کے ساتھ قابل مفتیان دین متین کی زیرِ نگرانی اعلیٰ پیمانے پر جاری ہونے شروع ہوئے نیز مبتدی مفتیوں اور علماء کے لیے تربیت وفن فتاویٰ نویسی کا پہلے سے بہتر انتظام ہو گیا قیام پاکستان کے بعد جن فقہا نے شہرت دوام حاصل کی ان کے حالات مختصراً پیش خدمت میں ان علماء کے سرخیل غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی کا نام نامی محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ حل مسائل میں یکتا ہیں اور آپ کے فتاویٰ کی عوام وخواص اور فقہا میں بڑی قدر افزائی ہوئی ہے آپ عظیم محقق نامور محدث اور علم کے بحر ذخائر میں اور درس نظامی کے ہر شعبہ پر کامل عبور رکھتے ہیں لیکن آپ کو فقہ کی کتاب ہدایہ کے پڑھانے سے بے حد رغبت تھی۔ آپ کے تحت دارالافتاء میں مفتی امید علی خان ایک اعلیٰ تحقیقی ذہن کے مالک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ جہاں وہ مسائل کی باریک تہہ تک پہنچ جاتے تھے وہاں وہ فتاویٰ صادر کرنے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے۔ مدرسہ انوار العلوم کے دارالافتاء کے مفتی عبدالکریم اور مفتی سید مسعود علی شاہ صاحب کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر اپنے فن میں یکتا تھے۔ فتاویٰ کے حل کے سلسلے میں ان کا مقولہ تھا کہ "جواب دینے میں جلدی نہ کرو۔ فوراً جواب دو گے تو خسارہ میں رہو گے۔" آج کل ان کی مسند پر مفتی غلام مصطفیٰ صاحب رضوی فائز ہیں۔ آپ شعبہ تخصص فی الفقہ و قانون کے جامعہ اسلامیہ بہاولپور سے سند فضیلت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے فتاویٰ فقہا کی نگاہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

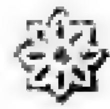
مدرسہ قاسم العلوم کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ملتانی مسلک حنفی دیوبندی کے کامل مفتی تھے آپ بلند پایہ فقیہہ عظیم محدث اور بہترین استاد تھے۔ آپ نے سند فضیلت حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی صاحب سے حاصل کی اور ان کے یہ استادان کی صلاحیتوں پر فخر کرتے تھے۔ اصول فقہ کی تعلیم کے سلسلہ میں حامی، ہدایہ اخیرین، کنز ودقائق، شرح وقایہ پر آپ کو کامل عبور تھا۔ مدرسہ قاسم العلوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کو جو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی ویسی کسی کو آج تک حاصل نہیں ہوئی۔ وہ 1952ء میں مدرسہ قاسم العلوم سے منسلک

ہوئے جلد ہی وہ تدریس کے ساتھ ساتھ دار الافتاء کے شعبہ کے مہتمم مقرر کر دیئے گئے مفتی صاحب کے اساتذہ سب اہل کمال تھے اور مفتی صاحب نے ان سے کسب علم میں کمال کر دیا۔ تا آنکہ ان کے اساتذہ بھی ان کی اہلیت کے معترف ہو گئے۔ 1957ء میں مولانا عبدالخالق صاحب کی وفات پر انہیں مدرسہ قاسم العلوم کا شیخ الحدیث مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر مفتی صاحب نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا اور اپنی محنت شاقہ، علم حدیث سے محبت، طبعی ذہانت اور بلند عزائم کے بل بوتے پر جلد ہی مولانا عبدالخالق جیسے عظیم محدث کی جگہ پُر کر دی بلکہ ان سے بھی بلند مرتبہ پایا اور پورے برصغیر میں بطور محدث اور فقہ اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ مفتی صاحب نے قاسم العلوم میں بطور مفتی کم از کم دس ہزار فتاویٰ جاری کئے۔ اس کے علاوہ رویت ہلال، عائلی قوانین، قادیانی مسئلہ، مشینی ذبیحہ، زکوۃ وغیرہ جیسے اہم مسائل پر رائے دیکر اپنا بلند فقہی مقام تسلیم کرایا مدرسہ قاسم العلوم کے درالافتاء کے مفتی محمد انور شاہ صاحب اور مولانا مفتی محمد اسحاق صاحب کی فقہی اہلیت مسلمہ ہے۔ مولانا مفتی محمود کے ہم عصر علماء میں مولانا خیر محمد صاحب جالندھری بھی علماء فقہاء پاکستان میں بلند مقام کے مالک تھے۔ آپ کو اصول فقہ میں تخصیص النظر میں کمال حاصل تھا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند آپ کی فقہی قابلیت اور الماء وامت کے معترف تھے۔ آپ کی زیر نگرانی مدرسہ خیر المدارس کے دارالافتاء میں 1972ء تک بائیس ہزار نو سو چراسی فتاویٰ جاری ہو چکے تھے۔ مدرسہ خیر المدارسؒ کے دارالافتاء کے ابتدأبیس سال مہتمم حضرت قاری مفتی محمد عبداللہ صاحب کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ آپ کے قلم سے ہزار ہا فتویٰ جاری ہو چکے ہیں اور پیچیدہ مفتی مسائل کے حل میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ آپ اسلامی مشاورتی کونسل کے رکن بھی ہیں۔ مولانا خیر محمد کی وفات کے بعد مدرسہ خیر المدارس کا اہتمام مولانا محمد شریف صاحب فرزند ارجمند جناب مولان خیر محمد صاحب مرحوم کے سپرد ہوا۔ آپ اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوئے آپ کا علمی اور فقہی مقام مسلمہ تھا۔ آپ اس سال اللہ کو پیارے ہوئے ہیں۔ آپ کے جانشین آپ کے بھائی مولانا عبدالحق صاحب ہوئے ہیں جو ایک بلند پایہ فقیہہ اور قابل مفتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد مدرسہ عبیدیہ کے مہتمم حضرت مولانا عبدالکریم صاحب علیہ رحمت تھے آپ اعلیٰ پایہ کے فقہ اور صاحب علم وعرفان بزرگ تھے۔ انہیں بھی اپنے بزرگوں کی طرح مفتی ملتان کا اعزاز حاصل تھا۔ ان کے جانشین حضرت مولانا عبدالشکور صاحب اپنے والد حضرت مولانا عبدالکریم اور دادا حضرت عبدالعلیم صاحب علیہ رحمت کے معتمد اور شاگرد رشید تھے۔ انہوں نے فقہ کی تعلیم اور فتویٰ نویسی کا فن اپنے ان کامل بزرگوں سے حاصل کیا اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔ آپ فقہی امور میں باریک بین اور صاحب الرائے تھے اور علم میراث میں فاضل اجل تھے۔ آپ کی وفات 1981ء میں ہوئی آپ کے جانشین مولانا مفتی عبدالودود صاحب ہیں جو درویشی منش ظاہری نام ونمود سے بے پرواہ اعلیٰ پایہ کے فقیہ ہیں۔ یہاں مختصراً ایک اور صوفی عالم فقیہ وقت اور فقیر حضرت مولانا سید ابو محمد امام شاہؒ صاحب ساکن مہر آباد لودھراں کا ذکر برمحل ہوگا۔ آپ حضرت مولانا غلام محمدؒ صاحب گھوٹوی کے شاگردان رشید میں سے تھے اس کے علاوہ آپ نے کسب علم حضرت مولانا محمد امیر صاحب ومولانا نورالدین شاہ پوری سے حاصل کیا اور جب علوم

دینی میں کامل ہو گئے تو درس تصوف حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی علیہ رحمت سے حاصل کر کے ان سے خرقہ خلافت کا اعزاز حاصل کیا اور اپنے موضع مہر آباد میں مدرسہ خدمت اسلام قائم کیا۔ جہاں اٹھاون سال فی سبیل اللہ اپنے فقہ و حدیث کا درس دیا۔ آپ تمام علوم متدادلہ میں کامل تھے اور آپ کی حیثیت علاقہ لودھراں، شجاع آباد اور بہاولپور کے مفتی کی تھی۔ آپ کے قلم سے ہزار ہا فتاویٰ جاری ہوئے اور ہزاروں لوگ مسائل حل کرا کے فیض یاب ہوئے۔

گزشتہ دو سال میں ملتان میں جن طالبان حق نے فقہی امور میں کمال پیدا کیا اور جن علماء اور مفتیان دین متین نے فقہ اسلامی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ ان کا اجمالی خاکہ پیش خدمت ہے۔ جس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فقہائے ملتان نے گزشتہ دو سو سال کے عرصہ میں ملتان کی سابقہ فقہی اعلیٰ روایات کا اعادہ کر کے ملتان کی عظمت کا بول بالا کیا ہے۔

(ماہنامہ آستانہ زکریا ملتان - عمر کمال خان ایڈووکیٹ)



ادب

محمد اسلم میتلا

ملتان میں فارسی

یہ بات طے ہے کہ فارسی ایک قدیم زبان ہے اور کئی اسلامی ممالک میں لکھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی یہ زبانِ زمانہ قدیم سے مروج ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کو سمجھنے، بولنے اور لکھنے والے کم ہو رہے ہیں کیونکہ سرکاری تعلیمی اداروں میں اس زبان کو پڑھانے کے لیے یا تو استاد میسر نہیں یا پھر مضمون ہی نہیں پڑھایا جاتا۔ حتیٰ کہ یونیورسٹی کی سطح پر بھی صورتحال زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے کیونکہ بعض یونیورسٹیوں میں ایم اے کا امتحان تو لیا جاتا ہے مگر مضمون پڑھایا نہیں جا رہا۔ یہ صورتحال اس لیے بھی تشویشناک ہے کہ تمام قدیم اسلامی علوم اور تاریخ پر لکھی گئی کتب کا بڑا حصہ فارسی میں ہے اور وہ کتب پرانی لائبریریوں میں اچھی یا خستہ حالت میں آج بھی موجود ہیں اور منتظر ہیں کہ کوئی بھلا آدمی آئے اور کم از کم وہ خاک تو جھاڑ دے جو ایک طویل عرصے سے ان پر جمی ہوئی ہے۔

سرزمین ملتان پر ایرانی تہذیب و تمدن کے اثرات تو اس وقت سے مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے جب دارا اول ایرانی بادشاہ نے دریائے سندھ کے دائیں کنارے تک کے علاقے کو زیرنگیں کر لیا اور سرزمین ملتان کے بیشتر علاقے سمیت ساحل سمندر تک کے خطے کو اپنی سلطنت کی انیسویں اقلیم قرار دے دیا اور یہاں سے گیارہ ٹن سونا ہر سال بطور خراج وصول کیا جاتا تھا۔ ایران پر بیرونی حملوں کی صورت میں یہاں سے فوجی سپاہی اور ہاتھی بھی بھیجے جاتے تھے۔ جنگی ساز و سامان اس کے علاوہ تھا۔ یہ صورتحال 527 ق م تک جاری رہی۔ سکندر اعظم کے والد فلپس کو کئی بار ایرانیوں نے مغلوب کیا۔ ان شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے سکندر نے ایران پر حملہ کیا اور ایران شکست کھا گیا۔ ایرانی فوج کی طرف سے ملتان اور سندھ کے سپاہی بے جگری سے لڑے جس کے نتیجے میں سکندر نے ملتان پر بھی حملہ کر دیا۔

فاتح اقوام کی زبان اور تہذیب کے اثرات مفتوح علاقے پر مرتب ہونا فطری بات ہے۔ یہی صورتحال ارض ملتان کی زبان، تہذیب اور تمدن پر بھی صادق نظر آتی ہے۔ مقامی زبانوں پر فارسی اور عربی کے الفاظ نہ صرف مقامی زبانوں میں کثرت سے نظر آتے ہیں بلکہ ان زبانوں کا حصہ بن گئے ہیں۔ وقت کی رفتار نے ان اثرات کو کس طرح مدھم نہیں ہونے دیا۔

اولیاء کرام اور صوفیاء کی آمد نے تصوف کو فروغ دیا اور فارسی میں تخلیقات سامنے آنے لگیں۔ شاہ یوسف

گردیز (1058 تا 1136) کے بارے میں یہ روایت عام ہے کہ آپ ملتان تشریف لائے تو شیر پر سوار تھے اور آپ کے مقبرہ پر یہ شعر درج ہے

دانی سوار شیر کہ درد ست مار کرد
مخدوم شاہ یوسف اینجا قرار کرد

حضرت بہاء الدین زکریاؒ (1169 تا 1226) سلسلہ سہروردیہ کے نامور بزرگ تھے۔ وہ خود بھی فارسی زبان کے شاعر تھے۔ ان کا مشہور شعر ہے

ملتان مابجنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کند

فخر الدین عراقی بھی حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی صحبت میں رہتے تھے اور فارسی شاعری کرتے تھے۔ عراقی کے اشعار ملاحظہ فرمائیں

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
زچشم مست ساقی وام کردند
چو خود کردندر اِ خویشتن فاش
عارقی راچرا بدنام کردند

حضرت مخدوم حمید الدین حاکم جو شاہ رکن عالم ملتانیؒ کے مرید تھے بھی صاحب دیوان فارسی شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے مرشد کی شان میں قصیدہ کہا۔

فدا کن حاکماں جاں رابنام شیخ رکن الدینؒ
کہ ہستی تو مریدو ہم غلام شیخِ رکن الدینؒ

سلطان محمد بن سلطان غیاث الدین 1270ء میں گورنر ملتان تھا۔ اس کی محفل شعراء اور ادباء سے بھری رہتی تھی اور اس میں شاہنامہ فردوسی، دیوان سنائی، دیوان خاقانی اور خمسہ نظامی پڑھے جاتے تھے۔ ایک دفعہ شیخ سعدی شیرازی کو ملتان آنے کی دعوت دی گئی مگر وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ آ سکے۔ البتہ انہوں نے دو کتابیں گلستان اور بوستان قلمی ضرور بھجوا دیں۔ 1284ء میں مغلوں نے تیمور خان کے تحت لاہور اور دیپالپور کے نواح میں حملہ کر دیا۔ سلطان محمد نے دریائے راوی کے کنارے مقابلہ کیا مگر دشمنوں نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ اس وقت کے مشہور شاعر امیر خسرو بھی اس جنگ میں شریک تھے۔ چنانچہ اپنی مثنوی ''قرآن السعدین'' میں اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ملتان زبان کا ایک لفظ ''دجل'' بھی استعمال کرتے ہیں

من کہ برسر نمی نہادم گل
بار برسر نہادو گفتا ''دجل''

مغل اگرچہ ترکمانی نسل سے تھے اور ترکی بولتے تھے مگر فارسی کے رائج الوقت ہونے کی وجہ سے اس کی سرپرستی کی۔اس طرح سرکاری ادبی اور مکاتیب کی زبان فارسی بنگ ئی۔البیرونی کی کتاب مالللہند کے مطابق فلسفہ اور طب کی سنسکرت کی کتابوں کا عربی اور فارسی میں ترجمہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔فارسی کو زیادہ فروغ اکبر کے عہد میں ہوا۔عہد شاہجہاں میں سکندر نامی ایک مشہور شاعری فارسی کا گزار ہے۔حاجی فتح اللہ ایک معلم تھے جن سے اورنگزیب کی دختر زیب النساء نے فارسی میں خط و کتابت تھی اور ان کے لیے فارسی میں القاب بھی لکھے گئے۔1530 تا 1751ء مغلیہ عہد میں مختلف وقتوں میں مغل شہزادے، مراد بخش اورنگزیب، داراشکوہ اور معزالدین یہاں گورنر رہے۔ان کے دور میں بھی فارسی ہی علمی اور دفتری زبان رہی۔مشہور روحانی بزرگ موسیٰ پاک شہی کے مرید شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے حضرت موسیٰ پاک شہید سے بیعت سال 952ھ میں کی اور انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

ملتان چہ عجب کہ دل پذیر افتادہ است
چوں منزل پیر دستگیر افتادہ است

ملتان میں فارسی نثر میں تصنیف شدہ کتب میں اخبار الاخیار مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے مرشد حضرت موسیٰ پاک شہید کی خدمت میں رہ کر مدون فرمائی "بحر سرائر" گیلانی خاندان کا فارسی میں تذکرہ ہے جو ملا سعد اللہ قادری نے خانقاہ میں بیٹھ کر تحریر کیا۔"گل بہار" قادر بخشی قریشی کی تحریر ہے جو 1775 اشعار پر مشتمل ہے اور غوث الاعظیم اور سہروردی مشائخ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔"تذکرۃ الملوک" افغانوں کی تاریخ ہے۔توفیقہ شریف میں خواجہ خدا بخش خیر پوری نے مسلمہ وحدت الوجود پر روشنی ڈالی ہے۔سردلبر براں میں مولانا خدا بخش خیر پوری کے حالات ہیں۔تذکرۃ الملتان مخدوم یوسف سجادہ نشین نے 1261ء میں تحریر کی۔انوار جمالیہ منشی غلام حسین کی تصنیف ہے جو 1245ء میں لکھی گئی جس میں حافظ جمال اللہ ملتانی کے حالات ہیں۔رسالہ نور الہدیٰ منشی غلام حسن نے اپنے پسر غلام یٰسین کے لیے لکھا۔منشی غلام حسن شہید خواجہ حافظ جمال اللہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔انگریزوں نے انہیں شہید کیا تو ان کی زبان پر شہادت کے وقت یہ شعر تھا۔

سر در قدم یار فدا شد چہ بجا شد
ایں بار گراں بود ادا شد چہ بجا شد

منشی غلام حسن فارسی کے شاعر بھی تھے اور دیوان حسن ان کے کلام فارسی کا مجموعہ ہے۔نمونہ کلام سے

شد جلوہ گر جمال تو در روئے ہر ہمہ
اے ہمہ ولیک نمودار در ہمہ

نواب سرفراز خان صفدر پسر نواب مظفر خان بھی فارسی کے شاعر تھے۔ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں

صحبت رنگین ما با او بود رشک چمن
اور بجائے گل نشیند من بجائے عندلیب

شیون و شادی بناشد خود بغیر از ہمدماں
گشت صدر بینوازیں ہم نوائے عندلیب

عبداللہ خان شاعر ملتان جو نواب سرفراز خان کے ماموں زاد تھے وہ فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

دل خود ا تو پاک از کین ماکن
نمی خواہم وفا، ترک جفا کن
فلک گر بر تو اے شاعر ستم کرد
تو عرض اندر جناب مرتضیٰ کن

طالب ملتانی نے بھی فارسی شاعری کی اپنے کلام کلیات طالب ملتان میں درج ذیل قطعہ لکھا

مہ ذی الحج و تاریخ ہفتم
مرا فرمود پیدا رب مطلق
چو فکر اسم تاریخی نمودم
سروش غیب گفتا مظہر الحق

پٹھان اور سکھ عہد میں (1707 تا 1849) فارسی ہی سرکاری اور دفتری زبان رہی۔ خط و کتابت بھی اسی زبان میں ہوتی تھی۔ فارسی میں قدیم نادر نسخے اب بھی اہل علم گھرانوں میں موجود ہیں۔ کرنل عبدالرشید نے تذکرہ شعرائے پنجاب (فارسی) میں ملتان کے درج ذیل شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔(5) بہاء الدین زکریا، شیخ رکن الدین، فدائی ملتانی، محمد سعید قریشی، شیخ اللہ داد، محمد شفیع بیدل، تحسین ملتانی، شیخ عبدالباقی باہو، فاروق ملتانی، میگ راج، ملا نادر، گوہر بخش، میر محمد شفیع، فضلی ملتانی، محمد اعجاز، سعید ملتانی، منشی غلام حسن، اسحاق ملتانی، جان محمد ملتانی، عزیز الدین چالاک ملتانی، حیدری ملتانی، شہاب ملتانی، ضیا اللہ ملتانی، فخر الدین عراقی، فرید الدین گنج شکر، سید علی محسن فرضی ملتانی اور سید اولاد علی گیلانی۔ سکھوں کے عہد میں مراسلت فارسی میں ہوتی تھی۔(6) دیوان ساون مل کا ایک مراسلہ ملاحظہ فرمائیں

کارداران کوٹلہ بدانند

آنکہ زمینان غیر آباد کوٹلہ آفتادہ اند۔ آنکس کارداران مالکان واہی و چاہان نو احداث کنند و بہ خشت پختہ مرمت طودند آبادی نمایند۔ بہاولی بر اجناس اورزاں از ششم حصہ کو خواہند بروقت و دو روپیہ بیگھ پنبہ دانہ دار از روئے ضبط اراضی متصرف شوند، زیادہ طلبی نکنند کہ آنہا بہ خاطر جمع واہی چ چاہان نواحداث کہ بخشت پختہ مرتب لمودہ آباد ساز داکات بکرمی 1899۔

مولوی محمد شریف متخلص مسکین ملتانی نے ملتان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد نواب بہاول پور کے دربار میں وسط انیسویں صدی عیسوی میں بطور درباری شاعر خدمات سرانجام دیں۔ ان کی فارسی غزل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

رُخشی دیباچۂ رنگیں کتاب نیک فالی را
خطش نقشے است دلکش کلک صنع لایزالی را
الٰہی تاگل و بلبل دریں بستاں سرا باشد
بود مسکیں ستائش گر حضور خان عالی را

ملتان میں مساجد، مقابر اور مزارات پر جو کتبے موجود ہیں وہ تمام فارسی زبان میں ہیں۔ بہاء الدین زکریاؒ، شاہ یوسف گردیزؒ، حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ، حافظ جمال اللہؒ، سید عظیم الدین شاہ علی مردان، اللہ داد گرمانی، خواجہ موسیٰ صدیقی پر فارسی کتبے موجود ہیں۔ اسی طرح مسجد علی محمد خان، ساوی مسجد بیرون لوہاری گیٹ کوٹلہ تولے خان میں بھی تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک کتب کا تعلق ہے فارسی میں غیر مطبوعہ مواد مخطوطات کی صورت میں باغ لانگے خان لائبریری میں موجود ہے (جن میں دیوان مغربی انیس القادریہ غوث عبدالقادر گیلانی کے سترہ خطوط بزبان فارسی) اسلامی تاریخ جہان خان لودھی از نعمت اللہ مہروی، مرغوب الغلوب (دیوان شمس تبریز) مناجات و حکایات از حافظ سلطان، مجموعہ وظائف چشتیہ، تاریخ تحفہ العالم، زیبا نگار، تصنیف مخدوم حاجی (قصہ سسی پنوں) (7) کتاب معرفت، زلیخا منظوم، لذت النساء، مرغوب القلوب (فارسی نثر تصنیف) حضرت شمس تبریز از قلم عبدالعلیم قادری شامل ہیں۔
ارض ملتان کے مصنف شیخ اکرم الحق نے شعر العجم فی الہند کے عنوان سے فارسی کے شاعروں کا تذکرہ مرتب کیا جن میں حسن ملتان کے علاوہ دیگر شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں فارسی شاعری کی مختصر تاریخ بھی دی گئی ہے۔
جدید دور میں بھی فارسی شاعری میں ملتان کے شعراء کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اسد ملتانی اردو اور سرائیکی شاعری میں بڑا نام ہیں۔ انہوں نے بھی فارسی میں شاعری کی اور ملتان پر فارسی میں نظم کہی۔ اسرار خودی پڑھ کر علامہ اقبال سے نظم میں سوالات کئے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

دارم امید کہ آن فلسفی صاحب دل
بکشاید بہ کرم عقدہ ایں سائل خویش

علامہ نسیم طالوت عربی اور فارسی ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے دو آتشہ کے عنوان سے ایک نظم کہیں جس میں ایک مصرعہ سرائیکی اور ایک فارسی میں تھا۔

نسیم آساں شدہ مشکل بیا ایں جا مشو بے دل
پنل گھر وچ گیو سے مل تھئے دلدار ہمسائے

فارسی زبان و ادب کی ترویج اور تدریس میں موجودہ دور میں ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر زبیدہ، ڈاکٹر بشیر انور، ڈاکٹر اسلم انصاری، پروفیسر یوسف خورشید کی خدمات نہایت قابل قدر ہیں۔ سید حسن رضا گردیزی کی فارسی سے دلچسپی اور محبت کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔

(ملتان نامہ-محمد اسلم میتلا)

محمد اسلم میتلا

ملتان میں کتب خزانے

کتاب اور علم دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ کسی بھی قوم کے افراد میں علم کی دولت جس قدر زیادہ ہوگی وہ اسی قدر ترقی یافتہ اور مہذب کہلائے گی۔ زمانہ قدیم سے ہی علم کی اہمیت رہی اور اس کو پھیلانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ اور ایسا کرنا اس زمانے میں سوائے کتاب کے استعمال کے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اگرچہ جدید دور میں میڈیا نے بھی علم پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن کتاب کی اہمیت آج بھی کسی طرح کم نہیں ہوئی۔

اہل علم کے دل میں کتاب سے محبت کا جذبہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ مسلمانوں میں لاتعداد علمی شخصیات پیدا ہوئیں۔ اور ان کو اس مقام تک پہنچانے میں کتب دوستی اور کتب خانوں کی موجودگی نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کتب خانوں میں صرف مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ غیر اقوام نے بھی اسلامی علمی مراکز میں آ کر استفادہ کیا۔ مغرب کی جانب سے ہندوستان پر جن حملہ آوروں نے حملے کئے انہوں نے اپنی ثقافت اور علمی قابلیت سے یہاں کی مقامی آبادی کو فائدہ پہنچایا اور یہاں کے اہل علم سے بھی استفادہ کیا۔ اس طرح علمی سطح کے برصغیر میں بلند کرنے میں آبادی کے اس اختلاط نے بھی مدد دی۔ اس کے علاوہ صوفیا کی آمد اور علما فضلا کی آمد بھی علم کی اشاعت کا باعث بنی۔ وہ لوگ ذاتی طور پر جہاں علم کی دولت سے مالا مال تھے۔ وہاں اپنے کتب خزانے بھی لائے جس سے علم کی اشاعت کا کام سہل ہوتا چلا گیا۔ چونکہ ہندوستان کو راستہ ملتان کی راہ سے جاتا تھا۔ اس طرح علما، فضلا، اور اولیا جب یہاں سے گزرتے تھے تو ان میں سے کچھ یہاں رہائش پذیر ہو جاتے تھے۔ جب یہ اہل علم لوگ یہاں آئے تو علم کی اشاعت کے لیے مدارس قائم کئے اور ان میں کتب کا فراہم کیا جانا پہلی ضرورت تھی۔ اس دور میں صرف قلمی کتب سے ہی گزارا کیا جاتا تھا کیونکہ چھاپہ خانہ تو بہر حال بعد میں وجود میں آیا۔ اس دور میں طالب علم اور علم لوگ سبھی بسیار نویس ہی نہیں خوش نویس بھی ہوتے تھے جب استاد سبق دیتا تھا تو وہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح جہاں علم کا حصول سہل ہو جاتا تھا وہاں جب تک طالب علم فارغ التحصیل ہوتا تھا اس کے پاس اس کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتب کا ذخیرہ بھی تیار ہو جاتا تھا۔　ملتان میں جن شخصیات نے کتب خانے قائم کئے اور اس سرزمین کو کتب خزانے سے مختلف ادوار میں مالا مال کیا ان میں محمد بن قاسم، بہاء الدین زکریاؒ، شاہ یوسف گردیزؒ، سلطان محمد شہید، ناصر الدین قباچہ، مولانا

سماء الدین شامل ہیں۔ وقت کے گزرنے اور حوادث زمانے کی وجہ سے ان کتب خانوں کا صرف نام باقی رہ گیا ہے لیکن علم کی اشاعت میں جو خدمات سرانجام دی گئیں ان کے نتیجے میں نسل در نسل علم کے شیدائی لوگ پیدا ہوتے رہے۔ اور کتب دوستی اور کتب اندوزی کا سلسلہ جاری رہا۔

جدید عہد میں ملتان میں انگریزوں کی آمد کے بعد ملتان میں ایک سوسائٹی 1850ء میں قائم ہوئی جس سے پہلے پہل انگریز ہی استفادہ کرتے تھے۔ اس کے بعد ہندو قارئین کی اجارہ داری رہی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمان قارئین کو بھی استفادہ کا موقع ملا اور لائبریری کی انتظامیہ میں بھی مسلمانوں کو شریک کیا جانے لگا۔ بعد ازاں اس کا نام پبلک لائبریری باغ لانگے خان رکھا گیا۔ اس میں اردو، عربی، فارسی، ملتانی، سندھی، بلوچی، پنجابی، پشتو، سنسکرت، ہندی، گورمکھی زبانوں پر 25000 سے زائد کتب موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میونسپل لائبریری 1954ء میں قلعہ کہنہ قاسم باغ کے غربی جانب قائم کی گئی جس کا افتتاح سید علمدار حسین گیلانی نے کیا۔ اس میں بھی قدیم و جدید کتب موجود ہیں۔ اس میں باقاعدگی سے اردو، انگریزی روزنامے ہفت روزہ، ماہنامے، منگوائے جاتے ہیں۔ ان نسبتاً بڑی لائبریریوں کے علاوہ تمام تعلیمی اداروں نے بھی اپنی اپنی لائبریریاں قائم کر رکھی ہیں۔ جن میں درسی ضرورتوں کے علاوہ بھی کتب دستیاب ہیں۔

نجی لائبریریوں میں گردیزی خاندان کے سید محمد ناصر گردیزی نے کتب خانہ قائم کیا۔ جس میں مطبوعہ کتب کے علاوہ نادر مخطوطات بھی موجود ہیں۔ درگاہ موسیٰ پاک شہید میں موجود کتب خانہ میں بھی مطبوعہ کے علاوہ قلمی نسخے موجود ہیں۔ عبدالحلیم خویداد میں بھی نادر مخطوعات موجود ہیں۔ سید عباس حسین گردیزی نے بھی ذاتی لائبریری میں مطلوبہ کے علاوہ نادر قلمی نسخے جمع کر رکھے ہیں۔ علامہ عتیق فکری نے ذاتی شوق کی تکمیل میں ہزاروں کتب کا ذخیرہ کیا۔

سردار پور جھنڈیر (میلسی) میں مسعود جھنڈیر ریسرلائبریری پاکستان کی سب سے بڑی پرائیویٹ لائبریری قائم شدہ ہے جو جھنڈیر برادران (میاں مسعود احمد، میاں محمود احمد، میاں غلام احمد) کی علم دوستی کا بھرپور اظہار ہے۔ اس لائبریری میں ایک لاکھ دس ہزار کتب پچھتر ہزار رسائل و جرائد اور تین ہزار مخطوطات ہیں۔ قرآن مجید کے 1133 قلمی نسخے موجود ہیں۔ دیگر مخطوطات اسلامی علوم کے علاوہ فلسفہ منطق طب زبان منظوم و نثر ادب تصوف تاریخ ہندسہ وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ مخطوطات میں سات سو سال تک پرانے مخطوطات موجود ہیں۔ علامہ اقبال کے ہاتھ سے لکھے ہوئے دو خطوط بھی اس ذخیرہ میں شامل ہیں۔

قاضی اللہ بخش (جلالپور پیر والا) کے کتب خانے میں بھی مخطوطات کا ذخیرہ ہے۔ اسی طرح اسد نظامی (جہانیاں) کے پاس ہزاروں قدیم مطبوعہ کتب اور سینکڑوں مخطوطات پر مشتمل کتب خانہ موجود ہے۔ زیادہ تر کتب انہیں وراثت میں ملی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد یہ کتب خانہ بند پڑا ہے۔ تاہم اپنی وفات (2001) سے قبل اکثر کتب اور اخبارات جو ڈھیر کی شکل میں پڑے تھے جلد بندی کرا گئے تھے۔

ملتان چھاؤنی میں سید عبدالغنی بخاری نے اپنی ذاتی جائیداد پر 1910ء میں ایک لائبریری قائم کی جس میں تقریباً چار ہزار مطبوعہ قلمی کتب کا خزانہ اکٹھا کیا گیا۔ اور سید سلیمان ندوی نے اس کا افتتاح کیا۔ یہ لائبریری انجمن نصرت الاسلام کے تحت قائم رہی۔

خانیوال کے احسن علی خان کے پاس اور آنسہ عقیلہ خانم صاحبہ کے پاس مطبوعہ وقلمی کتب کا قابل قدر ذخیرہ اپنی اہمیت کا حامل ہے۔ راقم الحروف (محمد اسلم میتلا، اسلم لائبریری جہانیاں) میں ملتانیات، بہاولپوریات، سیاسیات، ادب، دینیات کے موضوع کے تحت اردو، سرائیکی، پنجابی، انگریزی، فارسی اور عربی میں نایاب کتب موجود ہیں۔ علاوہ ازیں چالیس کے قریب قلمی نسخے جن میں قلمی قرآن شریف بھی موجود ہیں۔ نواح ملتان میں بھی ذاتی لائبریریاں مختلف قصبات اور دیہات میں موجود ہیں جو نسل در نسل علمی خاندانوں کی دلچسپی کی آئینہ دار ہیں۔

اب تک ہم نے کتب خانوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ قلمی نسخوں اور مخطوطات کے تذکرہ کے بغیر موضوع کے حوالے سے بات مکمل نہیں ہوگی۔ مختلف کتب خانوں/ لائبریریوں اور شخصیات کے پاس نادر قلمی نسخے اور مخطوطات موجود ہیں جو صدیوں سے محفوظ چلے آ رہے ہیں۔ یہاں یہ اظہار بھی بے محل نہ ہوگا کہ ملتان سے قلمی نسخوں اور مخطوطات کے مختلف اوقات میں دیگر شہروں یا غیر ممالک میں منتقل ہو جانے کی وجہ سے ملتان اپنی علمی دولت سے محروم ہوتا چلا آیا ہے۔ لاہور کے فقیر خاندان کے پاس ملتان سے لے جائے گئے قلمی نسخے اور مخطوطات موجود ہیں۔ فقیر عزیز الدین جو سکھ عہد میں بااثر تھے۔ نہیں ملتان کے شرفا اپنے بزرگوں کے محفوظ کردہ علمی نوادر کے تحائف دے کر اپنے کام نکلواتے رہے (1) اسی طرح انگریزی عہد میں مسٹر ہملٹن کمشنر ملتان جسے فارسی پر خاصا عبور تھا بھی یہاں سے ملتان کیا مرا سے قلمی کتب حاصل کر کے اپنے ساتھ انگلستان لے گیا (2)

اب بھی جو قلمی نسخے اور مخطوطات مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے پبلک لائبریری باغ لانگے خان میں موجود قلمی نسخوں اور مخطوطات کی تفصیل ''پبلک لائبریری باغ لانگے خان کی سو سالہ تاریخ'' میں معروف دانشور عمر کمال خان نے صفحہ 173 پر دی ہے۔ تعداد مخطوطات 103 ہے۔ عربی، فارسی، سرائیکی، پنجابی، اردو، سندھی، انگریزی، پشتو زبانوں میں یہ مخطوطات موجود ہیں۔ یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مخطوطات پر سن تحریر بھی درج ہے۔ مشہور مخطوطات جو فارسی زبان میں ہیں درج ذیل ہیں۔ 1۔ مفتاح الفتوح (1220ھ) 2۔ مناجات و حکامات (1239ھ) 3۔ انتخابات از لطائف سیریہ (1296ھ) بدائع المنظوم (1214ھ) مرغوب القلوب (1252ھ) قصہ سسی پنوں (1251ھ) چہار گلزار (1226ھ) سکندر نامہ (1351ھ) لذت النساء (1189ھ) مخزن اسرار (1189ھ) تاریخ خان جہان لودھی۔

عربی

1۔ کتب طب (1356ھ) 2۔ رسالہ فی معرفتہ التقویم (1258ھ) 3۔ البیع تا کتاب الوصایہ (1149ھ) 4۔

بحتہ الابرار (1259ھ)، اصول شرح (1228ھ) اہلدایۃ شرح البدایہ (1230ھ)

اردو

1۔ مجموعہ مرثیہ جات (1247ھ) نقش حمیدیہ (1981ء) تذکرہ اولیائے ملتان (1981ء)

سرائیکی

1۔ مناقب العجائب (1334ھ) 2۔ رسالہ جات متفرق کرسی نامہ وغیرہ

پنجابی

1۔ مجموعہ رسائل فقہی (1194ھ)

سندھی

1۔ شاہنامہ اسلام

انگریزی

1۔ مقالہ ڈاکٹریٹ نسبت فارسی شعرا

پشتو

1۔ مجموعہ رسائل ومسائل، 2۔ شرح کنز، 3۔ مثنوی رشل البیان

کتب خانہ ناصریہ (گردیزی خاندان) میں بھی نادر قلمی نسخے موجود ہیں۔ جن میں کلام پاک کے قلمی نسخے فن کتابت کا شاہکار ہیں۔ رنگ یاقوت نیلم پکھراج کو پیس کر سوئی کی نوک سے جذب کاغذ کئے گئے ہیں۔ ہر صفحے پر سونے کے ورق کا حاشیہ لگا ہوا ہے۔ (2) تزک جہانگیری کا ایک ایسا قلمی نسخہ جس پر شہنشاہ جہانگیر شاہجہان اورنگزیب کے ہاتھ کی تحریریں موجود ہیں۔ (3) میر اکبر کے نام سے چہار وید کا دارا شکوہ کا قلمی ترجمہ موجود ہے۔

عبدالحلیم خوائیداد کیکتب خزانے میں (1) دارا شکوہ کی تصنیف التوحید (4)، (2) ایرانی فرمانرواؤں اور مغل شہزادوں کے خطوط وفرامین (3) شمس الدین التمش کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید۔ (4) کشف المحجوب کا قلمی نسخہ (5) عجائبات عالم (6) گلستان سعدی جن کے سرورق میں تین کاغذ استعمال کئے گئے ہیں (7) فیاض القوانین (مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے خطوط وفرامین)

سید عباس حسین گردیزی کی لائبریری میں (1) دیوان حافظ قلمی 1234ھ (2) سکندر نامہ 1214ھ قصص الانبیا فارسی 1224ھ (3) نور طرز مرصے اردو قلمیے مصنفہ محمد عطا حسین 1161ھ، (4) طور نامہ فارسی 1066ھ، (5) تحفۃ المومنین قلمی منظوم فارسی 1291ھ، (6) شاہنامہ فردوسی مصور ومطلا ان کے علاوہ کثیر قلمی نسخوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔

اللہ بخش اسد نظامی (چک نمبر 10/114 جہانیہ) میں سینکڑوں قلمی نسخے موجود ہیں۔ جن میں (1) نجات

المسلمین (2) برہان العاشقین 855ھ (3) تفسیر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (4) تفسیر از یعقوب چرخی (5) تحفۃ الاحرار 805ھ از مولانا جامی زبدۃ الخلاصہ 870ھ (6) ملفوظاتِ عبدالرشید حقانی (7) تکمیل الایمان (8) دیوان خواجہ فرید، تحریر مولانا غلام محمد حداد داجلی 1316ھ موجود ہیں۔ علاوہ ازیں خواجہ غلام فرید کے خطوط بھی موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ اللہ بخش اسد نظامی کی وفات کے بعد بند ہے۔

راقم الحروف محمد اسلم میتلا اسلم لائبریری نعمت والہ چک نمبر 10/115 آر تحصیل جہانیاں ضلع خانیوال کے پاس چالیس قلمی نسخے موجود ہیں۔

(1) مجالس الذکر 1116ھ　　(2) قرابادین قادری 1126ھ

(3) حصار الیمان 1148ھ　　(4) کتاب الانشا 1257ھ

(5) خیر التجاریب 1278ھ　　(6) الفاظ ادویہ 1279ھ

(7) مثنوی مولانا روم 1316ھ　　(8) دیوان خواجہ فرید قلمی (سید چراغ شاہ) 1910ء

(9) سیفل نامہ 1332ھ　　(10) کتاب المعماء 1233ھ

(11) قصہ دل افروز (سیفل) 1341ھ　　(12) طب اکبر 1273 شامل ہیں۔

مطبوعہ اثاثے میں:

(1) دیوان اردو خواجہ غلاف فرید 1884ء (2) دیوان اوحدی 1883ء۔

فوٹوسٹیٹ میں خواجہ فرید کے ہاتھ سے تحریر کردہ تین کتب موجود ہیں

(1) نفحات الانس 1279ھ　　(2) شرح گلشن راز 1218ھ

اور　　(3)　　کتاب توحید

شامل ہیں۔ یہ کتب خواجہ صاحب کی تحریر میں ہیں۔ تصنیف نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ قرآن مجید قلمی انیسویں صدی عیسوی کے تحریر کردہ بھی موجود ہیں۔

(ملتان نامہ۔ محمد اسلم میتلا)



شوکت نعیم قادری

ملتان کے حوالے سے ایک اُردو تلمیح

ملتان، بلاشبہ دنیا کا قدیم ترین آباد شہر Living City ہے۔ اسے مدینتہ الاولیا اور درگاہوں کا شہر The City of Saints and Shrines بھی کہا جاتا ہے اور اب تو ملتان کو ایک اور خطاب (آموں کا شہر) The City of Mangoes (1) سے بھی نوازا گیا ہے اگر چہ اس کی یہ پہچان بہت قدیم ہے۔

ملتان ثقافتی، سماجی، لسانی، تعلیمی، مذہبی اور تاریخی حوالے سے اپنی منفرد شناخت اور اہمیت رکھتا ہے۔ اس تناظر میں ملتان کا حوالہ کسی تلمیح کی صورت میں بھی دَر آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ یقیناً ملتان کے حوالے سے اور تلمیحات بھی ہوں گی مگر اس مختصر ترین تحریر میں صرف ایک اردو تلمیح کو موضوع بحث بنایا گیا ہے مگر اس سے پیش تر بر سبیل تذکرہ ایک نظر صنعتِ تلمیح پر ڈالتے ہیں

تلمیح عربی زبان کا کلمہ ہے اور اسم مونث ہے۔ اس کے لغوی معانی ''اشارہ کرنا'' یا ''اچٹی ہوئی نگاہ ڈالنا'' کے ہیں۔ اس کا مادہ لفظ ''لمح'' ہے جس کا مطلب ''پلکیں جھپکنا'' ہے۔ اس وضاحت سے تلمیح کی ایک اہم خصوصیت، اختصار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تلمیح کا انگریزی مترادف Allusion ہے۔

''علمِ بیان کی اصطلاح میں جب کوئی لکھاری اپنی تحریر (نظم ونثر) میں ایسے الفاظ لائے جو قرآنی آیات، حدیثِ نبوی ﷺ، ضرب المثل، کسی تاریخی، نیم تاریخی واقعہ یا کسی مشہور شخص، جگہ یا چیز کی جانب اشارہ کریں تو اسے صنعتِ تلمیح کہا جاتا ہے۔''

اب ہم موضوع بحث تلمیح کی جانب آتے ہیں۔ یہ تلمیحی معاورہ یوں ہے:

''وہ پانی ملتان گیا، وہ پانی ملتان بہہ گیا یا وہ پانی ملتان آ گیا''۔ جس کے معانی یہ ہیں: اب موقع جاتا رہا، وہ بات گئی گزری ہوئی یا ہو گئی۔ وہ بات جاتی رہی، وہ بات اب کوسوں گئی، رات گئی بات گئی، وہ بات ہی نہ رہی۔''

ان تمام وضاحتوں کے بعد ہم اس تلمیح کے پس منظر کی طرف آتے ہیں۔ اس کے پس منظر کے لیے میرے پیش نظر یہ تین ماخذات ہیں۔ خزانۂ تلمیحات از محمود نیازی (2) بھگت کبیر حیات و تعلیمات از ڈاکٹر عبدالحفیظ اور فرہنگِ آصفیہ۔

اس تلمیح کا پس منظر یہ ہے کہ ایک دفعہ بھگت گورکھ ناتھ، بھگت ریداس سے ملنے آیا۔ پیاس محسوس ہونے پر جب اُس نے پانی مانگا تو اسے خیال آیا کہ بھگت ریداس ذات کا چمار ہے۔ پس اُسے اس خیال سے ہی کراہت محسوس ہوئی۔ اس نے پانی تو بنے میں تو بھروالیا لیکن پیا نہیں اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے پانی پینے کی بات ٹال گیا پھر وہ وہاں سے اٹھ کر بھگت کبیر داس کے پاس چلا گیا اور اُس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔ اتفاق سے وہ پانی بھگت کبیر داس کی کمالی نامی بیٹی نے پی لیا۔ پانی پیتے ہی اس پر تینوں لوک روشن ہو گئے (3)۔ جب بھگت گورکھ ناتھ کو اس پانی کی صفات معلوم ہوئیں اور اسے پتہ چلا کہ اس کے پیتے ہی کمالی نے بڑا درجہ حاصل کر لیا ہے تو وہ بہت پچھتایا اور دوبارہ بھگت ریداس کے پاس آ کر پانی مانگا۔ ریداس کو اپنے علم سے معلوم ہوگا تھا کہ اس وقت اس نے اپنے ابھیمان یعنی گھمنڈ کی وجہ سے پانی نہیں پیا تھا۔ اس عرصے میں کمالی کے سسرال والے بنارس آئے اور اسے ملتان (جہاں اس کی سسرال تھی) لے گئے۔ بھگت ریداس نے بھگت گورکھ ناتھ کی بدقسمتی پر یہ دوہا پڑھا۔

پیاوے تھے جب پیا نہیں تب تم نے یہ ابھمان کیا

بھولا جوگی پھرے دِوانہ وہ پانی ملتان گیا

بھگت ریداس اور بھگت کبیر داس دونوں رامانند کے چیلے تھے۔ تواریخ کی کتب میں کمالی کو بھگت کبیر داس کی بیٹی لکھا گیا ہے مگر اس بات کی صحت میں کلام ہے۔ بھگت کبیر داس اور اس کی بیوی لوئی کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ان دونوں کا ایک بیٹا اور بیٹی تھی۔ جب کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بھگت کبیر داس اور لوئی میں زن وشو کا تعلق نہ تھا اور ان کے یہاں بچوں کا وجود بھی کشف و کرامات کی وجہ سے تھا۔ ایک مرتبہ کبیر نے دریا میں ایک بچے کی لاش دیکھی انہوں نے اس کے کان میں کچھ کہا بچہ زندہ ہو گیا اور رونے لگا۔ کبیر کے ایک پڑوسی کی لڑکی مر گئی۔ کبیر، والدین کی اجازت سے لاش اپنے یہاں لے آئے، اور اسے زندہ کر لیا۔ لوئی نے ان دونوں کی پرورش کی اور یہ کمال اور کمالی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ (4)

بعض لوگوں کے نزدیک یہ واقعہ کچھ یوں تھا کہ ایک دفعہ ایک نجومی ایک صاحب کمال درویش کے پاس اپنی مراد لے کر گیا۔ درویش کو اس پر رحم آ گیا اور اس نے اسے اپنا جھوٹا پانی پینے کو دیا۔ نجومی نے کراہت کی وجہ سے پانی نہ پیا۔ اتفاقاً وہیں ایک لڑکی بیٹھی کھیل رہی تھی، جس کی نسبت ملتان ٹھہری تھی، وہ درویش کے اشارے پر فوراً پانی پی گئی اور صاحب کمال ہو گئی۔ نجومی یہ حقیقت جان کر دوبارہ سوال لے کر آیا۔ اس وقت درویش نے یہ دوہا پڑھا۔

چت کر مانگا ہت کر دیا تیرے من گلیان گیا

بھولا نجومی پھرے دِوانہ وہ پانی ملتان گیا

اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ بات جا رہی کہ گھر بیٹھے تیری مراد پوری ہوتی تھی۔ اب تو ملتان جا کر تیرا کام بنے تو بنے۔

ڈاکٹر عبدالحفیظ نے اپنی تصنیف ''بھگت کبیر...... حیات و تعلیمات'' میں بھگت کبیر داس اور کمالی کے حوالے

سے اسی قسم کا ایک واقعہ درج کیا۔ اگرچہ اس میں ملتان کا حوالہ تو نہیں ہے مگر یہ واقعہ بھی موضوع بحث تلمیح سے مناسبت رکھتا ہے۔

ایک دن کمالی کنویں سے پانی بھر رہی تھی، ایک پیاسے برہمن نے اس سے پانی مانگا، پانی پی کر جب اسے معلوم ہوا کہ کمالی جولاہے کی بیٹی تو وہ بہت ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے بے دھرم کر دیا۔ دونوں بھگت کبیر داس کے پاس آ گئے۔ کبیر داس نے برہمن کو بتایا کہ آخر پاک اور ناپاک کیا چیز ہوتی ہے؟ سینکڑوں لاشیں اور منوں پتیاں پانی میں سڑا کرتی ہیں، کروڑوں آدمی زمین میں دفن ہیں اور اسی مٹی سے وہ برتن بنائے جاتے ہیں جن میں تم پانی پیتے اور کھانا کھاتے ہوں۔ کھانا کھاتے وقت تم صرف دھوتی باندھے رکھتے ہو وہ دھوتی جولاہے کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ مکھیاں غلاظت اور مردار پر بیٹھتی ہیں اور وہاں سے اُڑ کر تمہارے کھانے پر بیٹھتی ہیں کیا تم اُن کو روک سکتے ہو؟ (5)

شیخ محمد ابراہیم ذوق نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں اس تلمیحی محاورہ کو برتا ہے۔ شعر دیکھئے: (6)

تھا ذوق پہلے دہلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

ایک اور جگہ یہی شعر کچھ تبدیلی کے ساتھ یوں بھی آیا ہے۔ (7)

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تابِ حسن
اے ذوق پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا

حواشی و حوالہ جات

1۔ "At last, Multan gets the title of "The City of Mangoes", thanks to the municiple Corporation. It was alongstading demand of the people of Multan." (Dawn Nov. 26, 2000)

2۔ خزانۂ تلمیحات، محمود نیازی ملک بک ڈپو، لاہور سن ندارد، ص 10-9۔

3۔ لوک کا مطلب ہے دنیا، جہان، عالم۔ لوک کی تین قسمیں ہیں۔

i۔ سورگ لوک یعنی عالم بالا جہاں دیوتا رہتے ہیں۔

ii۔ مِرت لوک یعنی دنیائی فانی جس میں ہم رہتے ہیں۔

iii۔ پاتال لوک یعنی زیرِ زمین

4۔ بھگت کبیر۔ حیات و تعلیمات، ڈاکٹر عبدالحفیظ نگارشات، لاہور، 2002ء، ص 46۔

5۔ ایضاً ص 47,46

6۔ کلیاتِ ذوق (جلد اول) محمد ابراہیم ذوق، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1967ء، ص 166

7۔ فرہنگِ آصفیہ، مولوی سید احمد دہلوی، اردو سائنس بورڈ، لاہور 1995ء،

لغات

1۔ القاموس الجدید (عربی اردو لغت)، مولانا وحید الزماں قاسمی کرانوی ادارہ، اسلامیات، لاہور، 1990ء

2۔ جامع اللغات، خواجہ عبدالمجید اردو سائنس بورڈ، لاہور، 1995ء

3۔ فرہنگِ آصفیہ، مولوی سید احمد دہلوی، اردو سائنس بورڈ، لاہور 1995ء

4۔ فیروز اللغات، مولوی فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور، سن ندارد

5۔ فیروز اللغات (اردو عربی)، فیروز سنز، لاہور، سن ندارد

6۔ لغات نظامی، گلوب پبلی شرز، لاہور، 1985ء

7۔ نور اللغات، مولوی نور الحسن نیر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1989ء

8۔ ہندی اُردو لغت راجہ راجیسور راؤ اصغر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1998ء

9۔ Arabic-English Dictionary, F. Steingass, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1979.

(نتائج فکر۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ شوکت نعیم قادری)



حنیف چودھری

ملتانی زبان کا ارتقاء: خواجہ فرید کے حوالے سے

ہر ادیب عام طور پر اپنے خیالات کا اظہار مادری زبان ہی کے ذریعے بہتر طریقے سے کرتا ہے۔ خاص طور پر صوفیائے کرام، سنتوں اور سادھوؤں نے مقامی زبان ہی کو اپنے پرچار کا وسیلہ بنایا۔ خواجہ غلام فرید نے جس زبان میں کافیاں اور دوہڑے کہے ہیں۔ اس کو بہاولپوری یا ملتانی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بہاولپوری اور ملتانی ایک ہی زبان کے دو نام ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایک نام کیوں نہیں رکھا گیا؟ اگر بہاولپوری اور ملتانی ایک ہی زبان کے نام ہیں تب پنجابی زبان کس زبان کو کہا جاتا ہے اور ملتانی اور پنجابی زبان میں کیا فرق ہے؟

پنجابی زبان کے دانشور اور زبان دانی کے ماہرین ملتانی اور بہاولپوری کو پنجابی کی اپ زبان مانتے ہیں اور اپنے اس قیاس کو الفاظ کے مخرج اور بولنے پر منحصر کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ دہلی سے اٹک تک اور بہاولپور سے ہزارہ تک سارا علاقہ پنجاب تھا۔ بولی ہر بارہ کوس پر بدل جاتی ہے۔ یہ زبان پنجابی بھاشا جو سارے پنجاب کی لوک بولی تھی مقامی بولی کے الفاظ کی ادائیگی تبدیلی کی وجہ سے الگ الگ علاقوں میں جدا جدا انداز سے بولی جانے لگی اور ان علاقوں کے نام پر ملتانی، بہاولپوری اور پوٹھوہاری وغیرہ ان کے نام رکھے گئے۔

سندھی دانشور اس رائے کے خلاف اپنے خیالات/نظریات الگ پیش کرتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ ملتانی، بہاولپوری کا نکاس (مخرج) سندھی زبان سے ہے کیونکہ بہاولپور اور ملتان، سندھ حکمرانی کے تحت تھے۔ اس لیے جس زبان نے جنم لیا اُس کا خمیر علاقے کے شاسک ورگ (روزمرہ) کے زیر اثر سندھی زبان سے پیدا ہوا۔

بہاولپوری دانشور محمد بشیر ظامی اپنی کتاب ''بہاولپوری ملتانی زبان دا ادب'' میں لکھتے ہیں:

> ''سندھی زبان سے اس کا تعلق اور اشتقاق بہت گہرا ہے بلکہ ان دونوں میں یگانگت، وحدت خاندانی کے بے شمار شواہد ملتے ہیں۔''

بہاولپوری اور ملتانی کا سندھی زبان سے رشتہ تو ملتان اور بہاولپور والے مانتے ہیں۔ مگر اس بات کو نہیں مانتے کہ یہ پنجابی زبان کی اپ بھاشا ہے۔ بلکہ یہ پنجابی کو بھی ملتانی اور بہاولپور کی ہی ایک بدلی ہوئی شکل مانتے

ہیں۔ ہم اس بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں۔ پہلے ہم دوسرے دانشوروں کے نظریات، آرا اور خیالات درج کرتے ہیں۔

سندھی اور ملتانی کے ماہرین لسانیات ونسلیات اور دانشوروں کے خیال کے مطابق آریائی قوم کے جس گروہ نے سب سے پہلے سندھ کی سرزمین پر قبضہ کیا وہ اپنے ساتھ اپنی ماں بولی بھی لے کر آیا تھا۔ چونکہ اس آریائی ٹولے نے ملتان (مول ستھان) کو اپنی راجدھانی (دارالخلافہ) بنایا تھا۔ اس لیے اس نسبت سے اس زبان کا نام ملتانی پڑ گیا۔ اور جو جو علاقے اس کے تحت تھے وہاں وہ آریائی زبانیں بولنے لگے۔ اس لیے یہ لوگ (ماہرین لسانیات) یہ دعویٰ کرتے ہیں یہ زبان نہ صرف بہاولپور ملتان، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان اور مشرقی بلوچستان میں بولی جاتی ہے بلکہ صوبہ سرحد کے آس پاس ریاست چترال کے دور دراز علاقے کافرستان اور کشمیر میں بھی اس زبان کے اثرات ملتے ہیں۔ اس لیے ملتانی زبان کئی ارتقائی منازل سے گزر کر اب موجودہ شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لیے یہ کسی بھاشا کی اپ بھاشا (کسی زبان کی شاخ) نہیں بلکہ واضح اپنا وجود رکھتی ہے۔ (1)

ملتانی زبان میں جس قدر سنسکرت، عربی، فارسی اور پشتو وغیرہ زبان کے الفاظ ملتے ہیں۔ اتنے پنجابی یا کسی اور علاقائی زبان میں نہیں ملتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملتان کی وہ راجنتیک مہتتا (سیاسی اہمیت) ہے جو اس کو الگ الگ جاتیوں اور قوموں کی راجدھانی (دارالحکومت) بننے کے سبب حاصل رہی۔ جہاں مختلف وقتوں میں جن قوموں نے حکومتیں قائم کیں۔ انہوں نے اپنی بولی/زبان کے اثرات بھی اس پر چھوڑے۔ چونکہ جب ملی (ملھی یا ملوھی) قوم کا زور ختم ہوا تو بودھوں نے اس زبان میں پراکرت کے الفاظ کی ملاوٹ شروع کر دی۔ پھر آگے چل کر پراکرت نے سنسکرت کا رنگ اختیار کر لیا۔ (2)

سنسکرت کے پراچین لفظ (قدیم الفاظ) روگ، مندر، پتر، آس، لون وغیرہ آج بھی ملتانی زبان میں موجود ہیں۔ مگر جگ گردیاں (زمانے کی اتھل پتھل) کے ساتھ ساتھ آوازوں (Alphbet) کی تبدیلیوں کے تحت الفاظ کا روپ بدل دیا جاتا ہے (ایک لفظ ایک علاقے میں ایک ڈھنگ سے بولا جاتا ہے جبکہ دوسرے علاقے میں دوسرے ڈھنگ سے زبان میں لایا جاتا ہے۔ جیسے بھارت کے ایک علاقے میں لچھن بولتے ہیں دوسرے میں لکھن، اکھر اور کھتری اور چھتری وغیرہ) جیسے تداتی سے تد، کپ سے کچھ اور کِداں سے کِڈاں بن گیا۔ کتابوں میں ہے کہ 981ء تک ملتانی زبان کی شاعری سنسکرت بھاشا کے ساتھ ملتی جلتی تھی۔ 712ء میں جب محمد بن قاسم نے ہندوستان میں فتح حاصل کی تو سندھ سے لے کر ملتان تک کا علاقہ اس کی عمل داری میں آ گیا۔ تب وہاں کی زبان میں پرورتن (نئی تبدیلی) شروع ہوئی حکمرانوں کی زبان عربی تھی۔ اس لیے عربی کے الفاظ ملتان کی زبان میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔ لگ بھگ دو صدیوں تک یہ عمل جاری رہا۔ 953ء میں جب ممتاز سیاح ابنِ حوقل بغدادی یہاں آیا تو اس وقت اگرچہ ملک کے اندر تجارتی لین دین مقامی زبان میں ہوتا تھا۔ مگر عدالتوں اور سرکاری محکموں میں عربی رائج ہونے کے سبب اس کا اثر دیسی زبان پر لگاتار ہوتا رہا۔ نویں صدی عیسوی کے آخری دنوں میں ویلمیاں کا داخلہ

سندھ کی وادی میں ہوا اور ملتان پر قبضہ کر لیا اور سرکاری سطح پر فارسی زبان بولی جانے لگی۔ جس کے سبب فارسی کے بہت سے الفاظ ملتانی زبان میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔ جہاں تک کہ جب پٹھانوں کی حکومت کا آغاز ہوا تو پشتو کے بہت الفاظ اس میں داخل ہونے لگے۔ مثال کے طور پر پشتو کے لفظ ''شوم'' کے معنی ''آرام کرنا'' ہے جب کہ ملتانی میں کنجوس کو ''شوم'' کہتے ہیں۔ پشتو میں خوشبودار گھاس کو ''بوٹی'' کہتے ہیں جبکہ ملتانی زلاآن میں آج بھی یہ لفظ انہی معنوں میں پر چلت (رائج) ہے۔

ملتانی زبان کا اپنا الگ وجود ہونے کے تاریخی شواہد بھی ملتے ہیں۔ ممتاز سیاح ابن حوقل (حوقل) ملتانی زبان کو ملتانی کہتا ہے۔ آئینِ اکبری میں بھی اس کا نام ملتانی ہے۔ پھر فارسی کے ممتاز شاعر امیر خسرو بھی اپنے سفرنامے میں یہاں کی زبان کو ملتانی کہتے ہیں۔ اگر یہ پنجابی زبان کی اَپ بھاشا ہوتی تو یہ دانشور اس امر پر ضرور روشنی ڈالتے۔ جہاں سندھی اور ملتانی کے میل جول کا تعلق ہے تو یہاں کی (ملتان کی) سیاسی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی سرحدیں آپس میں ملی ہوئی ہیں ملتانی، سندھی سے آگے بڑھ چڑھ کر رہی ہے۔ لیکن ثقافتی روایات ملتان ہی کو میسر تھیں۔ اس سے سندھی محروم رہی سندھی زبان میں جو ادب ہے وہ ملتانی ادب کے بعد ہی تخلیق ہوا۔ عبداللطیف بھٹائی (1752-1688) سندھی کے پہلے شاعر تسلیم کیے گئے ہیں۔ اس کے برعکس ملتانی زبان میں کووتا (شاعری) پانچویں صدی ہجری میں شروع ہو چکی تھی۔ بابا فرید گنج شکر ملتانی زبان کے صوفی شاعر تھے اس لیے ملتانی کسی بھاشا کا حصہ نہیں یہ سوتنتر (ملاوٹ سے پاک) زبان ہے۔

بھارتی پنجابی دانشوروں کا نکتہ نظر

ہم یہاں بھارت کے پنجابی محققوں کے خیالات پر مبنی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ سنیتی کمار چیٹر جی کا خیال ہے کہ پندرویں صدی عیسوی سے پہلے آریائی، پنجاب اور سندھ میں دراوڑوں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر چکے تھے اور اس علاقے کا نام ''سپت سندھو'' رکھا گیا تھا۔ اس وقت کی مروجہ آریائی زبانوں کو ویدک بھاشا کہا جاتا تھا۔ آگے چل کر مغربی علاقے کی اس زبان کو اُدیچی کہا جانے لگا۔ مہاتما بدھ کے وقت سنسکرت، لوک بولی رہ چکی تھی۔ بلکہ یہ ارتقائی منزل عبور کر کے پراکرت کے دور میں پہنچ گئی تھی۔ مہاتما بدھ کے جو اقوال تحریری شکل میں سامنے آئے ہیں ان کو ''پالی'' زبان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پھر مسلمانی دور شروع ہونے تک بھارت میں اپ بھاشا رائج ہو جاتی ہے دانشوروں نے مغربی علاقے کی اپ بھرنش کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، براچڑ، ناگر، اپ ناگر۔ ناگر میں سے ہندی اور اس کی اپ بھاشائیں نکلی ہیں۔ اپ ناگر سے پنجابی نے جنم لیا ہے اور براچڑ سے اجوکی (آجکل کی) سندھی زبان نکلی۔ ملتان کا علاقہ ایک طرف سندھ سے ملا ہوا ہے۔ کسی وقت لاہور ملتان پر ایک ہی زبان چھائی ہوئی تھی۔ ملتان پر جیسا کہ پہلے بتایا کہ کئی قوموں کی حکمرانی رہی ہے انہوں نے ملتانی زبان کو متاثر کیا۔ مگر بنیادی طور پر یہ لاہوری زبان سے جڑی رہی۔ ان دونوں شہروں کی زبان اپ بھرنش سے نکلی ہے اور امیر خسرو نے تھوڑے سے فرق

کے ساتھ ملتانی اور لاہور کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ملتانی میں تخلیقات شروع ہوگئی تھیں۔ دراصل ساہت رچنا (ادبی تخلیقات) پنجابی ہی تھی۔ برج بھاشا اور اودھی بھاشا میں ساہت رچنا (آج کل کی کھڑی زبان ہندی سے) بہت پہلی شروع ہوگئی تھی۔ مگر آج یہ پوری طرح ہندی کے زیرِ اثر ہے۔ بالکل اسی طرح ماجھی بولی کو اجو کی پنجابی بھاشا کا درجہ حاصل ہے۔ تو اس وقت اس کی سگی بہن ملتانی اس کی اپ بھاشا مانی جانے لگی۔ اس میں جو بھی ادب تخلیق ہوا وہ پنجابی زبان کے گھیرے میں آجاتا ہے۔ پس ہمارے خیال کے مطابق ملتانی، برج بھاشا کی طرح پنجابی بھاشا کا ہی ایک جز ہے۔ مگر سندھی کی اب بھاشا کسی طرح بھی نہیں۔

ملتانی زبان کے نام میں اختلاف

ملتانی زبان کے نام کے بارے میں آپس میں کئی طرح کے اختلافات ہیں۔ بہاولپور کے لوگ اس کو بہاولپوری یا ریاستی بولی کا نام دیتے ہیں۔ جبکہ اردگرد کے علاقوں میں جھنگوی یا مظفر گڑھی بھی کہتے ہیں سندھ کے قرب و جوار اور چولستان میں اس بولی کو سرائیکی زبان کے نام سے پکارتے ہیں۔ تاہم سرائیکی نام کے بارے میں ہم یہاں مختصر سا خاکہ دے رہے ہیں۔

محمد بشیر احمد ظامی اپنی کتاب ''بہاولپوری ملتانی زبان و ادب'' میں لکھتے ہیں۔ ''بعض کا قول ہے کہ پرانے علاقے کی بحری اور بری شاہراؤں پر جو سرائیں آباد تھی اُن سب کا انتظام بالعلوم ملتان والوں کے ہاتھ میں تھا۔ بلکہ دہلی سے لے کر ایران تک کئی سراؤں کے منتظمین یہی تھے۔ اور یہ لوگ اپنے عملے سمیت بہاولپوری ملتانی بولتے تھے اور اسی میں گفتگو کرتے تھے۔ پس اس زبان کے کارواں سراؤں میں مروج ہونے کی وجہ سے سندھ کے لوگ اسے سرائیکی کہنے لگے''۔

مذکورہ بالا اقتباس سے جہاں سرائیکی نام کی اصلیت کا پتہ چلتا ہے وہاں اس سچائی کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ سرائیکی جس کو ملتانی بہاولپوری، مظفر گڑھی اور جھنگوی وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اس کی پیدائش (وکاس) کیسے عمل میں آئی۔ یہاں تک مذکورہ خیالات کا تعلق ہے کہ بحری اور بری راستوں پر جو کارواں سرائے قائم ہوتی تھیں ان کا انتظام چلانے والے ملتان کے رہنے والے تھے اور وہ اپنے عملے کے ساتھ بہاولپوری ملتانی بولتے تھے اس میں خیال اور تجویز کا آمیزہ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ہاں یہ بھید بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان سراؤں میں ٹھہرنے والے غیر ملکی تاجر وغیرہ کام کاج اور لین دین کے سلسلے میں اس علاقے کے باشندوں سے بات چیت اور تبادلہ خیالات کے لیے مقامی بولی کے الفاظ سیکھتے ہوں جبکہ مقامی لوگوں کو باہر سے آنے والوں کی زبان سیکھنا پڑتی ہوگی۔ اس وقتی ضرورت نے اس وقت رائج زبان میں کئی اہم تبدیلیاں پیدا کر لی ہوں گی۔ اس وقت اس زبان میں فارسی اور عربی کے الفاظ شامل ہو گئے ہوں گے۔''

اب سوال اٹھتا ہے کہ ملتانی یا بہاولپوری کا نام سرائیکی کیسے پڑا۔ مذکورہ کتاب کے مصنف لکھتے ہیں:

''مطالعہ اور مشاہدہ سے ظاہر ہے کہ کسی ملک یا علاقے کی زبان اس ملک یا علاقے کے رہنے والے قبیلوں، قوموں، باشندوں کے نام کے ساتھ منسوب و موسوم ہوتی ہے اور وہاں کے باشندے اس زبان کو اسی نام سے پکارتے اور اُسے پسندِ عام اور قبولیت تام کا شرف بخشتے ہیں۔ پھر وہ نام خاص و عام میں ہر دل عزیزی حاصل کر کے بھاشا کا مالک بن جاتا ہے۔''

اس نظریئے کی تائید دوسری زبانوں کے ناموں سے بھی ہوتی ہے اور خاص طور پر اردو زبان سے اور بھی زیادہ تائید ہوتی ہے کہ لشکر گاہوں میں بولے جانے کی وجہ سے اس کھڑی زبان کا نام ''اردو'' پڑ گیا۔ دہلی کے رہنے والوں نے اس کا نام دہلوی۔ دکن کے رہنے والوں نے دکنی اور گجرات کے لوگوں نے اس کا نام گجراتی رکھ لیا۔ ایسے کارواں سرائیوں میں رائج بولی جانے والی زبان کو سرائیکی کا نام دیا۔

ہم یہاں ایک اور خیال پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ بھارت کے وِدوانوں اور زبان دانوں یعنی ماہرین لسانیات کے مطابق ملتانی کو لہندا یا لہندی نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ جس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ ملتانی پنجاب کے پچھمی جانب واقعہ ہے اور اسی طرف سورج غروب ہوتا ہے اس نسبت سے مغربی جانب کو لہندا کہتے ہیں۔ اس وجہ سے بھارتی ماہرین لسانیات ملتانی زبان کو لہندی کے نام سے پکارتے ہیں۔ مقامی لب و لہجہ کے فرق کے باعث لہندی زبان کو آگے چھوٹی چھوٹی اپ زبانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جیسے جھنگوی، پوٹھوہاری، دھنی وغیرہ۔ اس تقسیم کے مطابق دمودر کی ہیر کو جھنگوی بولی میں لکھا ثابت کیا گیا ہے۔ قدیم جنم ساکھی کو جہلمی بولی میں لکھا ہوا بتاتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید نے اس زبان میں کافیاں لکھی ہیں جو بہاولپور میں رائج ہے۔ صوفی شعراء نے جو ملتان اور اس کے آس پاس رہنے والے تھے انہوں نے اپنے پرچار کے لیے اس زبان ہی کو ذریعہ بنایا۔ پہلے بابا فرید گنج شکر کا نام سامنے آتا ہے جو پنجابی شاعری کے امام مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے مقامی زبان میں کھپانے کے لیے کئی اضافے کئے۔ ہم یہاں وہ حروف تہجی پیش کرتے ہیں جن کی آوازوں کو سرائیکی میں تبدیل کر کے بولا جاتا ہے۔

فارسی	اردو	ملتانی	پنجابی
ج	ج	ج	ڄ
ج ن	ج ن	ج	ج ن
x	ڈ	ڈ	ڈ
گ	گ	گ	گ ن
ن	ن	ن	ن

ملتانی زبان کی خصوصیات

جب کبھی کسی ملک کے باشندوں سے ان کی زبان کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ اپنی زبان کی تعریف میں جذباتی ہو کر اس کی اچھائیوں کے پل باندھ دے گا۔ یہاں تک کہ کسی شخص نے کسی بہاولپوری دوست سے اس کی زبان کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ دوست میں مسلمان ہوں اس لیے میری نظر میں عربی کی اہمیت زیادہ ہے۔ ویسے ہماری زبان کے سامنے عربی ہیچ ہے۔ اس بات میں جذبات کا زیادہ دخل ہے۔ مگر لسانیات کے ماہرین کا کہنا کہ اس زبان کی تحقیق اور چھان بین سے پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان بہت ہی امیر ہے اور شاعرانہ تخیل، جذبات اور رومانس کی تصویر کشی کی پوری پوری یوگتا (صلاحیت) رکھتی ہے عربی کی طرح یہ زبان طویل مضمون کو مختصراً پیش کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس زبان کے الفاظ کا بھنڈار بھی بہت وسیع ہے۔

اس زبان کی ہر دل عزیزی کا یہ حال ہے کہ بابا فرید گنج شکر کے شلوک جو گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہیں۔ عام سطح کا انسان بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے ست گورو (عزت مآب) بابا نانک دیو، گورو ارجن دیو نے بھی اس زبان کی مٹھاس کی بنا پر اپنی بانی (صوفیانہ کلام) میں اس کو جگہ دی۔ شاہ حسین لاہوری نے بھی اپنی کافیوں میں اس زبان کے الفاظ استعمال کیے۔ سہل اور سادگی کی بنا پر اس زبان کی ادائیگی میں کوئی دقت نہیں پیش آتی۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس زبان کے حروف تہجی دیر بعد وجود میں لائے گئے پہلے اُسے سندھی کی طرح خط نسخ میں لکھا جاتا تھا۔ گورو صاحبان کیز مانے میں گورمکھی میں لکھا جانے لگا۔ آریائی نسل کے حکمرانوں کے زیرِ اثر اس کو خط نستعلیق میں لکھا جانے لگا آج کل اسی رسم الخط میں سرائیکی/ ملتانی لکھی جاتی ہے۔ مگر نئے حروف ایجاد ہونے سے اس کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ سب سے بڑی وجہ تو رسم الخط کی عدم ٹکسال ہے کوئی ادیب/ شاعر ''پانی'' کو ''پانڑیں'' لکھتا ہے۔ تو کوئی ''پانی'' کو صرف ''پانی'' پر ہی اکتفا کرتا ہے اس طرح زبان کی مقبولیت متاثر ہو رہی ہے۔

اس زبان کی شاعری میں قصیدہ، مثنوی، رباعی، دوہڑے، کافی اور غزل وغیرہ شعری روپ میں موجود ہیں۔ چونکہ یہ زبان آریائی زبانوں سے نکلی ہے اس لیے اس میں ہندی شاعرانہ روپ بھی پایا جاتا ہے۔ یہاں تک ہی نہیں اس میں ہندی وچار دھارا (سوچ کی لہر) بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر اردو شاعری میں عام طور پر عاشق مرد ہے محبوب بھی مرد۔ ہندی شاعری میں اس کے الٹ عورت عاشق ہے اور مرد معشوق۔ اسی ثقافتی رویے کو ملتانی/ سرائیکی نے بھی اپنایا ہے۔ خواجہ صاحب کی کافیوں میں سوہنی، سسی، مومل وغیرہ عاشق ہیں۔ مہینوال، رانجھا، پنوں، مینڈھر معشوق ہیں۔ یہ ہندی ثقافت کا اثر ہے خواجہ صاحب نے عورت کو عاشق قرار دے کر پھر اُن مشکلوں کا ذکر کیا ہے جو عورتوں کو پیش آتی ہیں۔ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ خود خواجہ صاحب نے برج بھاشا کے ادب کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ کیونکہ اُن کی کافیوں میں ''سانول''، ''مٹھڑی، مٹھی، چندری بہت دفعہ استعمال ہوا ہے اور کرشن جی کی ''مرلی'' اور دیگر باتوں کے بارے میں ذکر آیا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی کافی دیکھیں

تتی　رو　رو　واٹ　نہاراں
کڈیں　سانول　موڑ　موہاراں

جیں کارن سوہنی جھاگی پھراں ڈوہاگی ویس براگی
جیندیں ڈیکھاں سانول ساگی تھیواں باغ بہاراں

یار بروچل وسم سولڑا جیں دے سانگے مانیم تھلڑا
خان پنلڑا نہ کر کلڑا توں سنگ چانگے چاراں

(3)

ہمارے خیال کے مطابق جس طرح وارث شاہ نے پنجابی کو عروج بخشا ہے اسی طرح خواجہ صاحب نے سرائیکی/ ملتانی زبان کو شہرت کے آسمان تک پہنچایا ہے اور یہ ثابت کر دیا کہ حقیقت اور مجاز کے رنگ کو ابھارنے کے لیے یہ زبان بے پناہ قدرت رکھتی ہے اور خود خواجہ صاحب نے اس زبان کے ذریعے صوفیوں اور دانشوروں سے داد وصول کی ہے۔

حوالہ جات

1۔ آریا جب اپنی سرزمین سے چل کر وادیٔ سندھ پہنچے تو وہاں وسیو، پنی، اسُر وغیر بڑے بڑے قبائل موجود تھے، ان کی بودو باش، معاشرت اور ثقافت عروج پر تھی۔ یہاں کے باشندے پہلے ہی ایک ایسی بولی/ زبان استعمال میں لا رہے تھے جو آریاؤں کے آنے اور آباد ہونے سے پہلے وہاں کے لوگ اور قومیں وجود میں لا چکی تھیں آریا بھی اپنے ساتھ اپنی بولی/ زبان لائے۔ جس کے نام کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ پانی نے اس کو ''چھندس'' کا نام دیا۔ پنڈتوں نے اسکو ویدی سنسکرت، ابتدائی سنسکرت، آریہ پراکرت بھی کہا۔ مگر اب یہی نام رائج ہے ...... ویدی وہ بولی/ زبان ہے جس میں رگ وید، سام وید یا یجر وید کا منتروں والا حصہ اور اتھروید کا پہلا حصہ شامل ہے۔ ''پنجابی زبان دا پچھوکڑ'' (صفحہ 50,84) آگے چل کر مزید وضاحت کی گئی ہے کہ بعد میں آنے والے ہر نسلی گروہ نے اپنے سے پہلے گروہ کو مارا پیٹا اور اس کو ہجرت پر مجبور کیا۔ اگر چہ وہ تمام آبادی تو نہ ختم کر سکا نہ ہی علاقے/ ملک بدر کروا سکا۔ اس لیے ہوتا یہ رہا کہ مقامی زبان اور حملہ آوروں کی زبان برابر برابر چلتی رہیں اور دونوں زبانیں ایک دوسرے کے الفاظ مستعار لے کر کام چلاتی رہیں۔ آخر میں حملہ آور نہ صرف مقامی رنگ میں رنگے گئے بلکہ اپنی مقامی بولی ہی کو اپنا لیا۔

2۔ ماہر لسانیات پروفیسر محمد آصف خان اس نظریے سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''یہ تو ماننا پڑے گا کہ سنسکرت زیر استعمال اور چالو زبانوں سے مستعار بول کر اپنا ''بھنڈار'' بھرتی ہے۔ کھوجیوں (نقادوں) نے بہت سارے ایسے بولوں کا پتہ لگا گیا ہے جو منڈا۔ دراوڑی، یونانی وغیرہ کے بولوں سے لے کر سنسکرت میں استعمال کئے گئے ہیں اور تو اور رگ وید کے کئی ایسے بولوں کا پتہ چلا ہے جو منڈا اور دراوڑی زبانوں میں سے ادھار لیے ہوئے ہیں۔ میری کھوج کے مطابق اگر سنسکرت کے جسم سے دوسری زبانوں کا لبادہ اتار دیا جائے تو نیچے ننگ دھڑنگ ویدی زبان رہ جاتی ہے۔ (پنجابی زبان دا پچھوکڑ۔ صفحہ 37)

3۔ پہلے بند میں ''کڈیں'' کی جگہ ''کڈی'' دوسرے بند میں ''جیندیں'' کی جگہ ''جیندی'' تیسرے بند میں ''جیں'' کی جگہ ''جیدی'' اور ''مانیم'' کی جگہ ''مانڑیم'' لکھا ہے جبکہ ''نہ کر کلڑا'' کی جگہ کلہڑا لکھا ہے۔ ان غلطیوں سے جہاں زبان کی لطافت مجروح ہوئی ہے وہاں اشعار کا وزن بھی بگڑا ہے۔

(مطالعہ فرید کا ایک نیا رُخ – مترجم و مرتب: حنیف چودھری)



شبیر حسن اختر

اُردو کی جنم بھومی

اردو کے مولد اور اس کی پیدائش کی جستجو میں سب سے پہلے ماہر لسانیات حافظ محمود شیرانی نے اس فارمولے کو اپنایا اور یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ اردو نے وادیٔ سندھ کے وسطی علاقہ پنجاب میں بولنے والی زبان کی کوکھ سے جنم لیا تھا اس وقت تک اس خطے میں بولی جانے والی سب سے بڑی زبانوں سرائیکی اور پنجابی کے مابین جغرافیائی اور لسانی فاصل قائم نہیں ہوئی تھی۔ ماہر لسانیات ڈاکٹر مہر عبدالحق نے آ کر یہ حد فاصل قائم کرنے کے بعد یہ ثابت کیا کہ اردو کی جنم بھومی اس علاقہ میں تھی جہاں سرائیکی بولی جاتی تھی۔

حافظ صاحب کا مقالہ ''پنجاب میں اردو'' 1949ء میں مکتبہ معین الادب نے لاہور سے شائع کیا اور مہر صاحب کا مقالہ 1967ء میں ''ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق'' کے عنوان سے اردو اکیڈمی بہاولپور نے شائع کیا۔ اس مقالہ پر آپ کو ڈاکٹریٹ کی سند دی گئی تھی۔ یہ دونوں حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ اردو نے عربی، ترکی اور فارسی بولنے والے حملہ آور فاتحین کی زبانوں اور مفتوح باشندوں کی زبانوں کے اختلاط اور ملاپ کے نتیجے میں جنم لیا تھا۔ مقامی لوگوں کی یہ زبانیں بھی فاتحین کی آمد کے بعد ان کے لسانی تسلط کے باعث معرض وجود میں آئی تھیں اس طرح اردو کی ولادت اور جائے ولادت کے بارے میں حافظ محمود شیرازی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق نے یک زبان ہو کر اس تصور کو باطل قرار دیا کہ اردو مغل فرمانرواؤں کے عہد میں دلی اور اس کے نواح میں بولی جانے والی کھڑی زبان یعنی برج بھاشا یا پھر جنوبی ہند میں بولی جانے والی دکنی اور کاٹھیاواڑی پر فاتحین کی زبانوں کے تسلط کے باعث وجود میں آئی تھی۔

حافظ محمود شیرازی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق کی جدید ترین تحقیق سے یہ نظریہ اس لیے رد ہوا کہ

(الف):

اگر اردو زبان مسلم فاتحین کی آمد کے بعد ان کے لشکریوں کی بولیوں اور مقامی مفتوحین کی بولیوں کے اختلاط سے پیدا ہوئے تو اس اختلاط کے ابتدائی مراحل دلی اور دکن میں ان فاتحین کی آمد سے بہت پہلے وادیٔ سندھ میں طے ہو چکے تھے۔ سندھ میں مسلم حکومتوں کے قیام اور اس کے بعد دلی گولکنڈہ اور گجرات میں مسلم ریاستوں میں

مغل عہد میں دلی کے پیہ تخت سے پورے برصغیر میں ایک ہمہ گیر مسلم سلطنت کے قیام میں آٹھویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی تک کا نہایت طویل فاصلہ موجود ہے یعنی مسلم لشکریوں اور مقامی آبادیوں کی زبان کی میل جول تقریباً سوا سو برس پہلے ہو چکی تھی یہ اتنا بڑا تفاوت ہے کہ برصغیر کے مشرقی حصے کو اردو کی جنم بھومی قرار دینے کا کہیں کوئی قرینہ نظر نہیں آتا۔

(ب):

شیرانی صاحب اور مہر صاحب دونوں نے اس خیال کو رد کیا کہ اردو مشرقی ہند میں بولی جانے والی برج بھاشا یا دوسری کھڑی بولیوں میواتی یا ہریانوی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ حافظ صاحب نے ان زبانوں کے بجائے پنجاب کے مشرقی حصے میں بولی جانے والی زبان پنجابی کو اردو کی ماں قرار دیا۔

(ج):

جبکہ مہر صاحب نے پنجابی لہندا اور سرائیکی کے لسانی فرق کو واضح کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ لسانیات کی روح سے سرائیکی ان دونوں زبانوں سے الگ مستقل قائم بالذات زبان ہے جس کی صوتیات ذخیرہ الفاظ صرف ونحو اور لب ولہجہ کے علاوہ تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی پس منظر بھی ان دونوں سے سراسر جدا ہے۔ اس حیثیت سے یہ زبان فاتحین کی زبانوں کے ملاپ سے نئی زبان کے ظہور میں آنے کا سبب بنی جسے اردو کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل اپنے ضخیم مقالہ میں لسانیات کے سائنسی اصولوں کے مطابق سرائیکی کی اصلیت اور اردو کے ساتھ اس کے تعلق کی وسیع بحث کے دوران نہ صرف زبانوں کی عالمی تقسیم ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی پراکرتوں کی ماہیت پنجابی لہندا اور سرائیکی کے فرق سرائیکی علاقے کے جغرافیائی اور تاریخ، سرائیکی میں فارسی اور عربی کے الفاظ، سرائیکی کی ہمسایہ زبانوں، سرائیکی ادب اور سرائیکی کے قواعد پر مفصل روشنی ڈالی ہے جبکہ آپ نے اردو کے ساتھ اس کے تعلق کے ضمن میں قدیم اردو اور سرائیکی کا موازنہ دونوں زبانوں کے اصول وقواعد کا تقابلی مطالبہ بھی پیش کیا جس میں انہیں تحقیق اور تجسس کے بے کراں صحرا کی خاک چھاننی پڑی اس صبر آزما صحرانوردی کے دوران آپ نے مختلف اضلاع کی بولیوں کے نمونے جمع کئے اور ان کے مطابق لمبے چوڑے تقابلی چارٹ مرتب کئے۔ اس بھاری بھرکم Documentation اور طویل مباحثہ کو یہاں نقل کرنے کی بجائے اپنے موضوع کی حدود میں رہ کر اس تحقیق کے اہم نکات کی تخلیص پر اکتفا کریں گے جو ملتان میں اردو کی اولین تخم ریزی اور پھر ملتان میں اردو ادب کے ارتقاء سے دلچسپی رکھنے والے سکالرز کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔

اردو کے ساتھ سرائیکی کا تعلق

مہر صاحب کی اس جدید تحقیق کے مطابق ''ملتانی (سرائیکی) کا اردو کے ساتھ سب سے بڑا اور پہلا تعلق یہ ہے کہ جن حالات کے تحت اردو معرض وجود میں آئی بالکل انہیں حالات کے زیر اثر ملتانی نے جنم لیا اور جن عوام کے

کارفرما ہونے سے اردو پیدا ہوئی بالکل انہی یا ان کے عین مشابہہ عوامل سے ملتانی زبان منصۂ شہود پر آئی۔ (ص960)۔

انہوں نے اردو زبان کی تخلیق کے بارے میں مولوی عبدالحق کی کتاب کا یہ اقتباس نقل کیا کہ

(1): ''جب مسلمان فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے اور اہل ہند سے ان کا میل جول روز بروز بڑھتا گیا اور وقت ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر ہوتا چلا گیا جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کی جس کا ان سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔''

(2):...... غرض ہندوستانیوں کے اس میل جول اور خلط ملط سے ایک نئی زبان نے جنم لیا جس کا نام بعد میں ''اردو'' رکھا گیا۔ اردو کے معنی لشکر کہیں اور لشکری زبان جیسی ہوتی ظاہر ہے یعنی آدھا تیتر آدھا بٹیر اس لیے اول الوہ ثقہ لوگ اس کے استعمال سے بچتے رہے...... لیکن رفتہ رفتہ اس کے قدم جمتے گئے اور مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں شعراء نے اس بچے کو اپنے سایہ عافیت میں لیا اور پال پوس کر بڑا کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے بالترتیب سید شمس اللہ قادری کی تاریخ ''زبان اردو'' نصیر الدین خیال کی ''داستان اردو'' اور سید محمد قادری کی تصنیف ''ارباب نثر اردو'' کے درمیان اقتباسات بھی دیئے۔

(3): ''ہندوستان میں مفتوحین کا اثر فاتحین پر پڑا لیکن فاتحین کا تمدن ایسا نہ تھا کہ وہ مفتوحین کے تمدن میں ضم ہو جاتا۔ اس لیے دونوں تمدنوں کے ملنے سے ایک تیسرے تمدن کا ظہور ہوا یہی کیفیت زبان کی نسبت پیش آئی فاتحین اپنی زبانوں کو ہندوستان میں عام نہ کر سے۔ لیکن ہندوؤں کی زبان بھی ان کی عام زبان نہ ہو سکی بلکہ دونوں اقوام کی زبانوں کے اختلاط سے ایک تیسری زبان وجود میں آئی جو اردو کے نام سے مشہور ہے۔''

(شمس اللہ قادری)

(1): ''جس طرح سندھ خاص میں عربی و ہندی ایک ہو رہی تھی اسی طرح کچھ دنوں بعد مغربی و شمالی ہند میں بھی وہی دونوں شیر و شکر دکھائی دینے لگیں اور یہ اسی اختلاط اور اشتراک کا نتیجہ تھا کہ عام لوگوں سے گزر کر

عزبی بھی ادیبوں اور کویئوں کے شیریں دکھنوں سے ٹپکنے اور آخر دیوتاؤں کے پاک منہ سے بھی جھڑنے لگی۔
اسی اختلاط کا نام کسی زبان کی ترقی و وسعت کے مدارج طے کر کے کسی خاص بام تک اس کا پہنچنا ہے۔ ہماری بھاشا کی یہی وہ تدریجی ترقی و وسعت تھی جس نے پردیسیوں کو بھی پرچا کر اپنا کر لیا اور ان کی بے تکلف زبانوں سے آخر ایک نیا خطاب (اردو) پا کر اسے تسلیم کر لیا"۔

(نصیر حسین خیال)

"ہندوستان کی مقبول خاص و عام زبان اردو کی بنیاد اس وقت پڑی جبکہ مسلمان فاتحوں نے کوہ ہندوکش کو عبور کر کے سرزمین ہند میں قدم رکھا اور آریہ ورتھ کے باشندوں سے میل جول قائم کیا۔ جوں جوں ان دونوں قوموں کے تعلقات میں وسعت پیدا ہوتی گئی مسلمانوں کی عربی، فارسی اور ہندوستان کی آریائی زبانوں کے باہمی ملاپ سے ایک مخلوط زبان یعنی اردو عالم وجود میں آئی۔"

(شمس الدین قادری)

انہوں نے ان اقتباسات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اردو زبان "نتیجہ ہے دونوں مختلف زبانیں بولنے والی قوموں کے باہمی میل جول اور ربط و اتحاد کا اس قدرتی ضرورت کا جو دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے تعلقات بڑھانے میں پیش آئی۔

سرائیکی

ساتھ ہی مہر صاحب نے سرائیکی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ

"ادھر ملتانی زبان کی تاریخ بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ جونہی عرب مسلمانوں نے اور ان کے فارسی، ترقی اور بلوچی زبانیں بولنے والے عساکر نے وادیٔ سندھ میں قدم رکھا ایک نئی زبان کی بنیاد پڑنا شروع ہوگئی۔ وادیٔ سندھ تقریباً چار سو سال تک مسلمانوں کی حکومت کا مرکز اور اسلامی تہذیب و تمدن اور تعلیم و تعلم کا گہوارہ بنی رہی۔ اس دوران میں مقامی زبان نے قالب بدلنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ ایک نئی زبان وجود میں آ گئی۔ بعد سندھ کی اسلامی حکومت تباہ ہوگئی اور ملک

پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا ہے، بلکہ عربی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ الواثق باللہ کے زمانے تک دربار خلافت سے سندھ میں گورنر مقرر ہو کر آتے تھے اور منصورہ ان کا مستقر حکومت تھا۔ جب خلافت بغداد کو انحطاط شروع ہوا تو سندھ میں خلفاء کی حکومت برائے نام رہ گئی اور ملک میں عربوں کے جو قبائل آباد تھے ان کے سرداروں نے بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں یہ حکومتیں کشمیر کی سرحد سے بحر فارس اور سیستان و مکران تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے حکمران سلاطین کے تسلط تک مسلسل سندھ پر قابض متصرف تھے۔'' (تاریخ زبان اردو)

(از شمس الدین قادری)

''سندھ کے فاتحین عرب کے مسلمان تھے یہ لوگ جب سندھ میں آئے تو اپنے ساتھ میں عربی زبان اور عربی تمدن لیتے آئے اور اسے ملک میں اس قدر پھیلایا کہ سندھ، شام و عراق کا نمونہ بن گیا۔ سندھ میں کم و بیش پانچ سو سال ان کی حکومت رہی ہے۔ اس عرصہ میں عراق و عرب کے سینکڑوں قبائل نے آ کر سندھ میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں کے باشندوں کے ساتھ اس قدر اختلاط بڑھایا کہ دونوں میں امتیاز کرنا اجنبی کے لیے دشوار ہو گیا۔ ''ابن حوقل جو چوتھی صدی کا مشہور سیاح ہے جب سندھ آیا تو دیکھا کہ یہاں کہ ہندو مسلمان دونوں کی ایک سی معاشرت ہے دونوں ایک زبان بولتے ہیں۔ سندھ میں عربی ہندی بولی جاتی ہے ملتان میں ملتانی اور فارسی کا رواج ہے گویا عربی اور عربی زندہ فارسی نے مقامی بولی کو اس طرح اثر انداز کیا کہ ایک نئی زبان معرض وجود میں آ گئی۔''

ہمارے مؤرخین اردو زبان کو شاہ جہاں کے عہد کی پیداوار سمجھتے چلے آتے ہیں گو بعد کی تحقیقات نے نے نہیں پیچھے جانے پر مجبور کر دیا ہے تاہم محمود غزنوی سے پہلے کی تاریخ پر ان کی نگاہ نہیں پڑتی ہے کیونکہ اردو کو نواح دہلی کی زبان سمجھا جاتا ہے اور اس کی ابتدائی شکل برج بھاشا کھڑی بولی ہریانوی یا میواتی کو تسلیم کیا جاتا ہے اگر محمود غزنوی سے پہلے کے چار سو سال کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہو گا کہ وادئ سندھ کو ایک نئی زبان کے پیدا کرنے میں تقدم حاصل ہے اس نئی زبان کا کوئی واضح نام نہیں رکھا گیا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو اسی نئی زبان

کولاہوری کہتا ہے اور ابوالفضل اسے ملتانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

حالانکہ دونوں نام اصل میں ایک ہی زبان کے لیے استعمال ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ بھاشا اردو کی تاریخ ترکوں اور مغلوں کے وقت سے نہیں بلکہ اس سے کئی صدی بیشتر یعنی اصل عربوں کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔

فتح سندھ وملتان کے مسلمانوں کی رفتار ترقی بہت سست پڑ گئی اور ملتان سے دہلی پہنچنے میں انہیں کوئی پونے پانچ سو سال لگے اور یہی وہ پونے پانچ سو سال ہیں جو وادئ سندھ میں ایک نئی زلاآان کے معرض وجود میں آنے کے ذمہ دار ہیں اگر اردو سے مراد وہ زبان ہے جو دہلی اور نواح دہلی میں ترقی پذیر ہووی ہے تو اس کا ملود برج بھاشا کا علاقہ ہے اور اگر اس مراد نئی زبان ہے جو اس پانچ سو سال دور میں بیرونی مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے میل جول اور اختلاط سے پیدا ہوئی تو اس کا مولد وادئ سندھ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔

مہر عبدالحق اس تحقیق کو پیر حسام الدین الراشدی کی تائید بھی حاصل ہے ان کا یہ کہنا ہے کہ سندھ اور ملتانی ہی میں اردو زبان کا بیج پڑا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب مرکز ثقل ملتان منتقل ہوا تو سینکڑوں، ہزاروں قبائل دہلی کی طرف نقل مکانی کر گئے اس طرح سندھ میں پیدا ہونے والی نئی زبان دہلی پہنچی۔ جن قبائل نے ان علاقوں میں سکونت اختیار کی وہ اس کے گرد ونواح میں جا کر سکونت اختیار کی وہ نئی بولی بولنے والے تھے اور صدیوں سے وادئ سندھ میں رہتے چلے آ رہے تھے۔

سید سلمان ندوی بھی اس رائے سے متفق ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''مسلمانوں کی عربی وفارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے پھر پنجابی اور بعد میں دہلی۔ ان کے قول کے مطابق علامہ بیرونی نے جن کا سن وفات 420ھ ہے ملتان اور سندھ میں رہ کر اپنی کتاب ''الہند'' تصنیف کی تھی اس کتاب میں انہوں نے جس لہجے اور طرز ادا میں ہندی الفاظ لکھے ہیں وہ ملتانی اور سندھی شکل میں ہیں۔''

ورنیکولر ریسرچ سوسائٹی گجرات سے شائع ہونے والی پروفیسر سینتی کمار چیٹر جی کے بیان سے بھی مہر عبدالحق کی تحقیق کی تصدیق ہوتی ہے ان کا کہنا ہے کہ ''ترکی اور ایرانی فاتحین کے ہمراہ جو پنجابی مسلمان دہلی میں آئے انہوں نے یہاں کی زبانوں کو متاثر کیا اور ایک نئی زبان دارالخلافہ کی کاروباری زبان بن گئی۔''

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے سرائیکی اردو کے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے خارجی شواہد کے علاوہ داخلی شواہد کا بھی جائزہ لیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی زبان سے زیادہ قریب ہے دونوں کے اسماء اور افعال کے آخر میں الف آتا ہے دونوں میں جمع کا طریقہ کار مشترک ہے دونوں میں جمع کے جملوں میں صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے اولیات اور ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے دونوں زبانیں تذکیر وتانیث کے قواعد میں بھی متحد ہیں جبکہ برج ہریانوی اور میواتی سے جنہیں اردو کی اساسی زبانیں کہا گیا ہے اردو کا اس طرح کا گہرا تعلق نہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مؤقف کی تائید میں اردو کی قدیم شعری ادب کی چھان بین کر کے اس

ادب میں سرائیکی الفاظ کی کثرت کی طرف بھی اشارہ دیا ہے آپ نے امیر خسرو کی تصنیف ''خالق باری'' کے علاوہ بھگت کبیر گرونانک قطب شاہ اور قدیم دکنی شعراء جن میں ولی دکنی بھی شامل ہیں کے کلام میں ایسا ذخیرہ الفاظ دریافت کیا جو خالص سرائیکی کے الفاظ ہیں۔

سرائیکی کے مختلف نام

علاقوں کی نسبت سے علاقائی ناموں سے موسوم ہوا کرتی تھی۔ ملتان اور اس کے نواح میں اسے ''ملتان'' کا نام دیا گیا۔ بہاول پور کے علاقہ میں اسے ''بہاولپوری'' یا ''ریاستی'' تو یہ زبان ''اُچی'' کہلائی۔ بلوچی اور پشتو بولنے والے لوگ پہاڑوں سے اتر کر اس میدانی علاقے میں آئے تو انہوں نے اسے ''ہندکو'' کا نام دیا۔

ڈیرہ غازی خان کے بلوچی بولنے والوں نے اسے ''جگدالی'' یعنی کسانوں کی زبان کہا۔ مظفر گڑھ میں کسان کو جٹ کہا جاتا ہے اس لیے اس ضلع میں زبان ''جٹکی'' ہوگئی۔ جنوبی یعنی لاڑ کے لوگوں نے اسے سرداروں کی مہذب زبان سمجھ کر احتراماً ملتانی ہی لکھا گیا ہے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں کے مؤرخ ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں اس زبان کو ملتانی لکھا۔ لیکن گزشتہ صدی کے اواخر میں جب یہاں کے لوگوں نے اپنی لسانی وحدت قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی تو انہوں نے اسے ناموں کی کثرت اور انتشار سے بچانے کے لیے سرائیکی کا نام دینے کا فیصلہ کیا جو بڑی تیزی کے ساتھ ہر سطح پر اب تک رائج ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اگرچہ اپنے مقالہ میں اسے ''ملتانی'' لکھا ہے لیکن مقالہ کی اشاعت کے بعد انہوں نے اپنے بے شمار مضامین تبصروں اور کتابچوں میں ملتانی کی بجائے ''سرائیکی'' ہی کہا ہے۔

اردو لسانیات کا قبلہ درست کرنے کی ضرورت:

حافظ محمود شیرازی نے جب اردو کی جائے ولادت، زمانہ ولادت کا سراغ لگانے کی ضرورت پر زور دیا تو ان کے نظریے کو تسلیم کرنے میں بہت سے لوگوں نے تعامل سے کام لیا اور اس بات پر بضدر رہے کہ اردو کی تخلیق اور پیدائش گنگا اور جمنا کے دوآبے میں مغلوں کے عہد سے ہی شروع ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور نے قدامت پرستوں کے اس رویے پر ان الفاظ میں اظہار افسوس کیا۔

> ''زبان اردو کا زبان پنجابی سے جتنا قدیم اور جتنا جتنا گہرا تعلق ہے اتنا کسی اور زبان سے نہیں ہے اردو دنیا کی ایک ایسی عجیب وغریب زبان ہے جو ہمیشہ، غلط فہمیوں میں گھری رہی اور اس کو اپنوں اور بیگانوں نے اسی کی بے تعصبی، ہمہ گیری اور باہمی اور باہم اور بے ہم رہنے کے باوجود ہمیشہ نقصان پہنچانے ہی کی کوشش کی۔ اس کی شکل وصورت ہر دور میں بہت سوں کو دھوکا دیتی رہی اسی طرح اس کا آغاز وارتقاء کی

نسبت بھی بڑے بڑے ادیب اور محقق اکثر بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے ہیں اور انہیں اب تک بھی بھٹکتے رہے ہیں۔

اس گمراہی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے پنجابی زبان کے اس حصے کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے جو اس نے اردو کے بننے اور ترقی کرنے ادا کیا...... بعض لوگ غلط فہمی یا مقامی تعصب کی وجہ سے اردو کو ہندی یا سندھی یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ ایسی غلطی ہے کہ اس کو مان لینے کی وجہ سے ہر منزل پر نت نئی غلطیوں کو گوارا کر لینا پڑتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی بن کر بلند پایہ صاحبان علم وفضل کو بھی گمراہ کر دیتا ہے۔"

ڈاکٹر زور نے یہ رائے اس وقت دی جب ڈاکٹر مہر عبدالحق کی تحقیق منظر عام پر نہیں آئی تھی اس لیے انہوں نے سرائیکی کی بجائے پنجابی کے حوالے سے اردو لسانیات کا قبلہ درست کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے اپنی کتاب ہندوستانی "فونیٹکس" کے حوالے سے پنجاب کو اردو کا مولود قرار دینے کے نظریہ کو مستحکم اور مسلم الثبوت قرار دے کر اس تنازعے کو ختم کرنے کی تلقین کی ہے اور لکھا ہے کہ:

"جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دو آبہ گنگ و جمنی کی زبان میں بہت کم فرق تھا۔ برج بھاشا کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں۔ چنانچہ میں نے اپنے مقالہ میں اس نظریہ کو شرح وربط کے ساتھ بیان کیا۔ اس مقالہ کی تکمیل کے بعد راقم الحروف نے صوتیاتی نقطہ نظر سے اس کی مزید توثیق کی اور اس سلسلے میں جو علمی تحقیقات تھیں ان کو کتاب صورت میں ہندوستانی "فونیٹکس" کے نام سے 1930ء میں پیرس میں شائع کیا۔ بعد میں اس نظریہ کی مزید وضاحت اور اہل اردو میں اشاعت کے لیے ایک اردو کتاب ہندوستانی لسانیات جو 1932ء میں شائع ہوئی۔ غرض 1928ء کے بعد سے اہل اردو اور ماہرین لسانیات کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اردو کے سرزمین پنجاب میں پیدا ہونے اور لسانیاتی نشوونما حاصل کرنے کا نظریہ مستحکم اور مسلم الثبوت بن گیا"۔

(ملتان اردو کی جنم بھومی- تحقیق: شبیر حسن اختر)



شبیر حسن اختر

ملتان میں طباعت و صحافت کا ارتقا

پندرہویں صدی کا واقعہ ہے کہ ایک شخص سیاہ لبادہ میں ملبوس رات گئے پیرس کے سب سے بڑے گرجا ''نوترے دیم'' کی مہیب عمارت کے سامنے کھڑا چپ چاپ کچھ سوچ رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح مستغرق کھڑا رہا۔ اچانک اس نے ہاتھ اٹھایا اس کے ہاتھ میں پانچ اوراق پر مشتمل ایک چھوٹی سی کتاب تھی جسے اس نے تاریکی میں ڈوبی ہوئی ''نوترے دیم'' کی بلند اور وسیع عمارت کے پس منظر میں دیکھا اور یہ کہہ کر چل دیا۔ ''یہ اسے فنا کر دے گی!''

سادہ لباس میں ملبوس یہ شخص خود اسی گرجا کا راہبِ اعظم ڈام کلاڈے تھا اور اس کے ہاتھ میں پیر لومبارڈ کی Clossa in Epistle کا مطبوعہ نسخہ تھا جو پہلی مرتبہ نورمبرگ میں لکڑی کی ایک چھوٹی اور بھدی سی دستی مشین سے چھپ کر نکلا تھا۔ ڈام کلاڈے پادری ہونے کے ساتھ ایک شاعر بھی تھا۔ ایک فلسفی اور ایک منجم بھی۔

''یہ اسے فنا کر دے گی''

راہب اعظم کا یہ مختصر جملہ ان انقلابات کی پیشگوئی کرتا ہے جو چھاپہ خانہ کی بدولت انسانی تہذیب میں واقع ہوئے۔ وکٹر ہیوگو نے اسی واقعہ کے پس منظر میں نشاۃ الثانیہ کا سہرا مارٹن لوگھر کی جگہ چھاپہ خانہ کے موجد گٹن برگ کے سر باندھا ہے اور لکھا ہے کہ اگر چھاپہ خانہ نہ ہوتا تو پوری انسانی تہذیب قرونِ مظلمہ کے بھنور میں پھنسی رہتی۔ ڈام کلاڈے کے اس مختصر سے جملے میں نہ جانے کتنے اسرار پوشیدہ تھے...... ''یہ اسے فنا کر دے گی!'' ......یعنی ''یہ مطبوعہ اوراق عظیم عمارت کو مسمار کر دیں گے'' ......یا...... ''نورمبرگ کی بھدی سی چھوٹی چوبی مشین کے پیٹ سے نکلے ہوئے یہ چند کاغذ پھیل کر نوترے دیم کی فلک بوس عمارت کو یوں اپنی لپیٹ میں لے لیں گے کہ پھر کسی کو اس کی صورت تک دیکھنا نصیب نہ ہو گی!''

یہ تمام خدشات صحیح نکلے۔ گٹن برگ کی یہ ایجاد نہ صرف کلیسا کے لیے پیامِ مرگ ثابت ہوئی، بلکہ اس مشین نے انسان کی تخلیقی مظاہر کی نوعیت ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ جس وقت تک انسان کو اپنی خلاقی کے اظہار کے لیے طباعت کا وسیلہ حاصل نہیں تھا اس وقت تک وہ اپنے مافی الضمیر کو سنگ و خشت کے پیرائے میں ہی ادا کرنے پر مجبور تھا۔ مصر

کے یہ اہرام روم اور یونان کے یہ کوہ پیکر کلیسا، ہندوؤں کے یہ ہیبت ناک معابد، یہ سب کے سب انسان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سنگین تصانیف ہیں۔ ان کی ہر اینٹ ایک حرف کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کی دیواریں ان حروف پر مشتمل جملے ہیں جو اپنے اندر ہزار ہا معنی رکھتے ہیں۔ ان معابد اور منادر کے یہ محراب گویا موزوں مصرعے ہیں جو ستونوں اور طاقچوں کے ردیف اور قوافی کا سہارا لے کر طویل نظم کی صورت میں مکمل ہوئے ہیں۔ لیکن یہ گراں بار تصانیف وقت کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں۔ ان تصانیف کی تکمیل میں انسان کی خلاقیت کو مذہب، عقائد اور اوہام کے دائرہ میں محدود رہنا پڑتا تھا اور ویسے بھی یہ کام جوئے شیر لانے سے کم مشقت طلب نہیں تھا۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد نے انسانی ذہن کو اس قید سے آزاد کر دیا اور آج اسی کی بدولت انسانی تہذیب مندروں اور معابد کے زندان سے نکل کر عہدِ حاضر کی کھلی فضا میں داخل ہوئی ہے۔ چھاپہ خانہ نے فنِ تعمیر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن اپنے تصورات اور محسوسات کے بیان کے لیے اس قدر سہل اور کھلی راہیں وا کر دیں کہ اب انسانی خارا شگافی اور کوہ کنی کی بجائے کاغذ اور قلم کے مختصر سے زادہ راہ کے ساتھ ان منازل تک جا پہنچا ہے۔ جن کا تصور گٹن برگ سے پہلے کے لوگوں کے اذہان میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہومر، شکسپیئر، فردوسی، خیام اور غالب کا پیام شاید ہی آج کسی کو سننا نصیب ہوتا۔ اگر انسان اس جرمن نژاد موجد کے کرشمہ سے محروم رہ جاتا۔ شعر اور ادب کے علاوہ چھاپہ خانہ نے انسان کی سماجی زندگی میں حیرت ناک تبدیلیاں کی ہیں، وہ اس پر متزاد ہیں۔ چھاپہ خانی کی ایجاد سے پہلے سماجی اصلاح کا تصور محض ایک مفروضہ تھا۔ چھاپہ خانہ نے اس مفروضہ کو انقلاب کے روپ میں ڈھال دیا۔

سائنس کی اس نعمتِ عظمیٰ نے جہاں پوری تہذیب کے دھارے کو بدل دیا وہاں اس نے برصغیر پاک و ہند کے ظلمت کدہ کو بھی اپنی روشنیوں سے منور کیا ہے۔ اس برِصغیر میں چھاپہ خانے کی ترویج برطانوی عہد میں ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ ایجاد خود بھی مختلف ادوار میں نئے روپ دھارتی رہی۔

آج کی صحبت میں ہم ملتان میں طباعت اور اس کے متعلقات یعنی صحافت، نشر و اشاعت کتابت اور جلد سازی کے ارتقاء کا ذکر کریں گے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس قطرہ پر گہر بننے تک کیا کیا گزری ہے۔

ملتان میں طباعت کی تاریخ صرف نصف صدی کے مختصر عرصہ میں پھیلی ہوئی ہے سب سے پہلا پریس غالباً 1920ء میں بلدیہ نے اپنے دفتری کام کے لیے لگایا تھا۔ یہ چھاپہ خانہ ہاتھ سے چلتا تھا اور اس کی چھپائی خاص مسالہ سے بنے ہوئے بھاری بھرکم پتھروں سے ہوتی تھی جنہیں ادھر سے اٹھا کر ادھر رکھنے کے لیے کم از کم دو مشٹنڈوں کی ضرورت پڑتی تھی یہ ایک عجیب اور مختصر سا لکڑی کا ڈھانچہ ہوتا تھا۔ جس پر دن بھر میں زیادہ سے زیادہ دو سو داب کاغذ چھپ سکتے تھے۔ بلدیہ کے بعد ایک ہندو طابق سونو رام نے پُل شوالہ پر اسی طرح کا ایک دستی پریس لگایا تھا۔ اس پریس کا نام وکٹوریہ پریس تھا۔ چھاؤنی میں ایک اور ہندو طابع بدھو رام نے ایڈورڈ پریس کے نام سے انگریزی کا ایک دستی چھاپہ خانہ لگا تیا تھا۔ چوتھا دستی پریس مول چند مدان نے بوہڑ گیٹ کے بہر نو بہار پریس کے نام سے لگایا تھا۔ یہ تمام چھاپہ خانے اب ناپید ہو چکے ہیں۔

بھاپ کے انجن سے چلنے والا سب سے پہلا پریس حسین آگاہی میں کرشنا سٹیم پریس کے نام سے قائم ہوا۔ اب اس جگہ پریس کی بجائے برف خانہ چل رہا ہے۔ اس پریس کے مِلک رام کشن تھے۔ اس پر 22x19 کا کاغذ چھپتا تھا۔ اس پریس کی مشین مین شیخ نور حسن تھے۔ ملتان میں اس وقت جتنے بھی مشین مین ہیں تقریباً سبھی انہیں کے شاگرد ہیں شیخ نور حسن اعظم گڑھ (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ 1922ء میں یہاں آئے اور یہیں کے ہو رہے آخری عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔ جناب اسد ملتانی نے ان کی سرپرستی کی اور وہ ان کے پریس (مطبع شمس) میں آخری دم تک رہائش پذیر رہے۔ انہوں نے 1965ء میں وفات پائی۔ مسلمانوں میں سب سے پہلا پریس مولوی فیض احمد اویسی نے 1921ء میں فخر مجتبیٰ کے نام سے قائم کیا۔ یہ دستی پریس تھا جو اسی حالت میں ختم ہوا۔ 1922ء میں مولوی عبدالسلام قادری نے مسلم حمیدیہ کے نام سے موسوم ہوا۔ اور پھر مولوی محبوب احمد اویسی نے 1928ء میں اس پریس کو خرید کر اقبال برقی پریس کے نام سے جاری کیا اور 30x20 کی پہلی مشین اس میں نصب کی۔ یہ پریس بعد میں ہندو مسلم فسادات کے دوران بحق سرکار ضبط ہوا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے شیخ مظفر الدین نے بھی چوک شہیداں میں زمیندار سُدھار پریس کے نام سے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا تھا جو اس وقت تک چل رہا ہے۔

قیام پاکستان کے ساتھ ملتان بھر کی طباعت میں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور بیسیوں پریس قائم ہوئے۔ ان میں یونین پرنٹنگ پریس، پرویز پرنٹنگ پریس، سید الیکٹرک پریس، صدیقیہ پرنٹنگ پریس، ہمدرد پرنٹنگ پریس، الہلال پرنٹنگ پریس، سجاد آرٹ پریس، فدا آرٹ پریس اور کوہستان پریس قابل ذکر ہیں۔ ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے چھاپہ خانے بھی نئی مشینوں سے مزین ہوئے۔ ملتان میں روزنامہ ''امروز'' کی اشاعت سے یہاں کی طباعت انقلابی دور میں داخل ہوئی یہ پہلا پریس ہے جس نے لیتھو روٹری مشین نصب کی اور اب اس چھاپہ خانہ میں جدید ترین آفسٹ مشین نصب کر دی گئی ہے۔

حال ہی میں ایک صنعت کار نے یہاں ٹن پرنٹنگ کا کارخانہ لگایا جو جدید ترین مشینوں سے آراستہ ہے۔ یہ کارخانہ پاکستان کے معدودے چند کارخانوں میں سے ہے جو ٹین پر چھپائی کا کام کرتا ہے۔ اس کارخانے کے قیام سے ملکی صنعت میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے۔

اسد ملتانی مرحوم کے قول کے مطابق ملتان میں صحافت کا ابتداء اردو کے مایہ ناز انشا پرداز مہر مہدی مجروح نے کی تھی۔ انہوں نے ایک ہفت روزہ اخبار یہاں سے نکالا جو کچھ عرصہ چل کر ختم ہو گیا۔ ایک ہندو پروہت ملک رُگناتھ رائے نے Peace کے نام سے انگریزی میں ایک ہفتہ وار اخبار نکالا۔ یہ اخبار تبلیغی نوعیت کا تھا جو افریقہ، ملایا، برما اور جاپان تک جاتا تھا۔ اس کے بعد ملتان کی صحافت کا باقاعدہ آغاز یہاں کے مایہ ناز شاعر جناب اسد ملتانی کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے 28 نومبر 1922ء کو ''الشمس'' کے نام سے ہفتہ وار اخبار اور ''انعام'' کے نام سے ماہنامہ نکالا۔ دونوں اخبارات کرشنا سٹیم پریس میں چھپتے تھے۔ ہفتہ وار ''الشمس'' کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ ہفتہ وار ''الشمس'' کی لوح پر جناب اسد ملتانی کا نام طابع و ناشر کی حیثیت سے لکھا ہوتا تھا۔ مدیر کی جگہ تہور حسین تہور کا نام لکھا ہوا تھا۔

جو محض برائے نام تھا۔ ادارت کے تمام فرائض اسد مرحوم ہی سرانجام دیتے تھے۔ ہفتہ وار الشمس ملتان کا پہلا باقاعدہ اخبار تھا۔ جو اس قدر مقبول ہوا کہ ہندوستان کے طول و عرض کو عبور کر کے جاوا، عراق اور مشرقی افریقہ تک پہنچتا تھا۔

ہفتہ وار الشمس ہندو مسلم کشاکش کی وجہ سے 1923ء کے وسط میں بند کر دیا گیا۔ لیکن اس نے اس تھوڑے سے عرصہ میں یہاں کی صحافت میں ایک ایسی روح پھونک دی کہ اس کے بعد بہتیرے اخبارات منظر عام پر آنے لگے اور بالآخر یہ سلسلہ روزنامہ اخبار کے اجراء پر منتج ہوا۔ 1934ء میں حضرت اسد ملتانی کے بھائی خان محمد اکرم خاں نے روزنامہ ''شمس:: جاری کیا جو 1954ء تک پوری آب و تاب سے شائع ہوتا رہا۔ یہ اخبار اس وقت جاری ہوا جب مغربی پنجاب میں اردو روزناموں کی تعداد صرف پانچ تھی۔ ان کے نام یہ ہیں روزنامہ زمیندار لاہور۔ روزنامہ سیاست لاہور۔ روزنامہ احسان لاہور۔ اور روزنامہ شمس ملتان۔ خبروں، تبصروں، زبان و ادب اور سیاسی شعور کے اعتبار سے روزنامہ ''شمس'' ملک کے بڑے اخباروں میں سے کسی طور بھی کم تر نہیں تھا۔ اسد مرحوم کی جاندار نظموں نے اس اخبار کو اور بھی جاذبیت بخشی۔ ابتدا میں یہ اخبار کرشنا سٹیم پریس میں چھپتا تھا۔ 1935ء میں اخبار نے اپنا پریس ''مطبع شمس'' کے نام سے قائم کیا۔ یہ پریس اب بھی موجود ہے۔

سیاسی بیداری کا زمانہ آیا تو ملتان کی صحافت نے ایک اور کروٹ لی۔ کانگرس اور مسلم لیگ کی کشاکش اور ہندو اور مسلمان کا جذبۂ مسابقت ملتان کی صحافت میں نشاۃ الثانیہ کا پیامبر ثابت ہوا۔ اس وقت کے میدانِ صحافت میں مسلمانوں کا پلہ زیادہ بھاری تھا اور یہاں اسد ملتانی، محمد اکرم خاں (شمس)، واحد ندوی، شیخ مظفر الدین (زمیندار سدھار)، منشی عبدالرحمٰن خان (مجاہد اسلام) اور پیرزادہ کشفی الاسدی اور مولانا نور احمد فریدی کے قلم کا سکہ چلتا تھا۔ جناب واحد ندوی نے ''اسلام'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا جو ان کے زورِ تحریر کی منہ بولتی تصویر تھی۔ ندوی صاحب کا اندازِ نگارش منفرد تھا۔ ملتان کی صحافت میں ہندو اہلِ قلم خال خال نظر آتے ہیں۔ ان میں مظفر گڑھ کے پنڈت ایشور دت (مدیر ''ویر کیسری'' اور ''گھن چکر'') ملتان کے ہندو تاجر دیوان ایشور دت (مدیر بیدار) معروف سیاسی کارکن ہمت رائے (مدیر ''مسافر'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایک قوم پرست ہندو ودیا پرکاش نے بھی ''شانِ ہند'' کے نام سے اخبار جاری کیا تھا۔ اس طرح قیام پاکستان سے قبل تک مل ملا کر تقریباً گیارہ پرچے ملتان سے باقاعدی سے شائع ہوتے تھے۔

اس عہد کے مقامی اخبارات کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ عہد ملتان کی مقامی صحافت کا زریں عہد تھا۔ جاندار اداریے، سیاسی مقالات، پُرمغز مراسلات اور ادبی اور علمی شہ پاروں کی اشاعت ان کا طرہ امتیاز تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت کے اخبارات میں انگریزی، فرانسیسی اور روسی زبانوں کے کلاسیکی ادب کے تراجم بھی مل جاتے ہیں اور یہ تراجم یہیں کے ادیبوں کی ذہانت کا نتیجہ ہوتے تھے۔ برصغیر کے دیگر مایہ ناز ادیب اور انشاء پردازوں کی تحریریں ملتان کے اخبارات میں برابر چھپتی رہی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ملتان کی مقامی صحافت متعدد وجود کی بنا پر انحطاط پذیر ہو گئی اور اس کی جگہ لاہور اور

کراچی کے اخبارات یہاں کے قارئین کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ روزنامہ شمس 1954ء سے آگے نہ چل سکا۔ اسی طرح روزنامہ زمیندار سدھار بھی بالآخرم توڑ بیٹھا۔ قیامِ پاکستان کے وقت روزنامہ "کارزار" بڑی آب وتاب سے نکلا۔ لیکن وہ بھی زیادہ دیر نئے حالات کی تاب نہ لا سکا بالآخر جب امروز، نوائے وقت اور کوہستان ملتان سے چھپنا شروع ہوئے تو ملتان میں اِکا دُکا ہفتہ وار اخبارات کے سوا مقامی صحافت کے باقیات کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہا۔

ملتان میں وقتاً فوقتاً چھپنے والے باقاعدہ اور بے قاعدہ اخبارات کے اجراء میں زعمائے ماسبق کے علاوہ ارشد ملتانی (صدائے حق) میر حسان الحیدری (آستانہ زکریا) عاشق حسین حسینی (قانون) عتیق فکری (قائد) طاہر کپور تھلوی (طلوع) صالح محمد جمالی (جرس) احمد خاں درانی (سیر وسفر) اطہر سلیم مسعودی (تحریک) رشید ترین (تقاضے) زاہدہ رفعت (حاشیئے) فاروق احمد اویسی (نوائے ملتان) اور قادر بخش قادری (رہبر دیہات) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ کئی سال یہاں سے "پاک کھلاڑی" کے نام سے ایک ماہنامہ نکلتا رہا لیکن اسے "فلم ڈائجسٹ" کر کے لاہور منتقل کر دیا گیا ہے۔ ایک اور ماہنامہ "بلوچی دنیا" کے نام سے چاکر خاں بلوچ نکال رہے ہیں جو مولانا نور احمد فریدی کے صاحبزادے ہیں۔

ملتان میں طباعت اور صحافت کی ارتقاء کے پیش نظر یہاں پر نشر واشاعت کا کام انتہائی مایوس کن حد تک محدود رہا ہے۔ قدیم ترین ناشرین میں حافظ شمس الدین نور الدین کا نام آتا ہے جنہوں نے ملتانی زبان کے ادب کی نشر واشاعت تک اکتفا کیا ہے، یہ فرم عرصہ چالیس سال سے موجود ہے۔ مولوی خیر الدین صابر اور مولوی خدایار فیض احمد نے بھی ملتانی زبان کی تصانیف شائع کی ہیں۔ یہ لوگ مذہبی کتب شائع کرتے رہے۔ مولوی کاظم علی، غلام اصغر چوک بازار ملتان سے اہل تشیع کی مذہبی کتب شائع کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ڈیرہ غازی خان کے صدیقی حضرات نے بھی یہاں صدیقیہ کتب گھر کے نام سے ایک اشاعت گھر قائم کیا ہے۔ انہوں نے احادیث، تاریخ، فقہ اور دیگر مذہبی علوم کی بہت سی کتابیں چھاپی ہیں۔ گھٹیا ناول شائع کرنے والوں کی تعداد اتفاق سے یہاں خاصی زیادہ ہے۔ لیکن ادبی اور علمی کتب کی اشاعت کا کام یہاں قریب قریب ناپید ہے۔ بزمِ ثقافت ملتان نے البتہ ملتانی زبان کے کلاسیکی ادب کی اشاعت کا کام شروع کیا تھا۔ ملتان میں اشاعت کے خاطر خواہ بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے مصنفین کو بہت سی مشکلات کا سامنہ کرنا پڑتا تھا۔ کلامِ پاک کی اشاعت بھی ملتان میں قریب قریب مفقود رہی ہے۔ حال ہی میں مفتی محمد عبداللہ صاحب نے یہ کارِ خیر شروع کیا۔ اِدارہ اشاعت علوم اسلامیہ نے ماہوار کتابچے چھاپنے کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ اس کے علاوہ منشی عبدالرحمٰن خان کئی علمی کتابیں شائع کر چکے ہیں۔

کتاب کا فن طباعت سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ ملتان علمی گہوارہ ہونے کے اعتبار سے اس فن میں کسی شہر سے پیچھے نہیں رہا۔ اور اس سرزمین نے بڑے بڑے مایہ ناز خوش نویس پیدا کئے ہیں۔ جہاں تک پریس کی کتابت کا تعلق ہے اس فن کا آغاز منشی نور الدین انصاری مرحوم نے کیا۔ آپ بوہڑ گیٹ کے رہنے والے تھے ان کے بعد استاد بدر الدین مرحوم لاہور سے آئے اور نوبہار پریس میں ملازم ہوئے۔ مولوی عبداللہ انہی کے شاگرد ہیں۔ جو ملتان میں

برس ہا برس تک اس فن کی خدمت کرتے رہے۔ اس وقت وہ بہاول پور کے سرکاری پریس میں ملازم ہیں۔ ان کے ہمعصر شیخ محمد عبداللہ المعروف ''گز بھر'' بھی قدیم کاتبوں میں سے ہیں وہ بھی بہاولپور کے سرکاری پریس میں کام کرتے ہیں۔ کشنا سٹیم پریس میں جب مشینی چھاپہ خانہ قائم ہوا تو منشی غلام جیلانی صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے ملتان میں فن کتابت اور فن مصوری دونوں کو ساتھ ساتھ فروغ دیا۔ فن کتاب میں ان کے بہت سے شاگرد اب بھی یہاں موجود ہیں۔ ملتان کے معروف مصور اور ڈیزائنر منشی عاشق محمد اور منشی فدا حسین انہی کے شاگرد ہیں۔ منشی عاشق محمد اس وقت کراچی میں اور منشی فدا حسین ملتان میں موجود ہیں۔ یہ دونوں سگے بھائی ہیں۔

بزرگانِ کتابت کی آخری نشانی اس وقت استاد شیر محمد ہیں جو عرصہ چالیس سال سے کتابت کر رہے ہیں۔ بہاول پور میں شائع شدہ خواجہ فرید کا باترجمہ دیوان، کشفی صاحب کی روحِ اسلام اور مولانا نور احمد خاں فریدی کی اکثر تاریخی کتابیں انہی کے حسن قلم کا نتیجہ ہیں۔ استاد شیر محمد کے بعد کی پود میں منشی نذر حسین، منشی محمد سلیم، منشی طفیل احمد قادری، منشی نذر محمد، منشی عبدالغفار شاد، منشی صالح محمد جمالی، تاثیر نقوی اور منشی عبدالمجید قابل ذکر ہیں۔ اس وقت کے نوجوان خوش نویسوں میں منشی خلیل الرحمٰن، منشی محمد اسلم اور یوسف طاہر فن کی جدید تکنیک میں نمایاں ہیں۔

طباعت کے ساتھ جہاں صحافت، کتابت اور نشر و اشاعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے وہاں جلد سازی کا فن بھی اس کے ساتھ ملزوم اور مربوط ہے۔ اندرون بوہڑ دروازہ کا بازار جو زمانہ قدیم سے کتب فروشی کا مرکز چلا آیا ہے۔ فنِ جلد سازی کیا گہوارہ رہا ہے۔ استاد غلام مرتضیٰ مرحوم یہاں کے فنِ جلد سازی میں کلاسیکی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت سی ایسی جلدیں باندھی ہیں، جو بلا شبہ اس فن کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم جلد سازوں جو بزرگ اس وقت زندہ ہیں ان میں مولوی شہاب الدین اندرونِ بوہڑ گیٹ اور مولوی عبدالرحمٰن کا نام باقی رہ گیا ہے۔ مولوی شہاب الدین قیمتی اور نادر کتب کی جلد بندی اور آرائش کے ماہر ہیں۔ مولوی عبدالرحمٰن نے جلد بندی کے کام کو بھی آگے بڑھایا ہے۔ اور اس وقت بہت بڑے کاپی گھر کے مالک ہیں۔



شاکر حسین شاکر

ملتان میں نعت کا جہان

ملتان کو جہاں بہت سے ناموں سے پکارا اور لکھا جاتا ہے وہاں اس کا ایک معروف نام مدینۃ الاولیاء بھی ہے اسی نام کی وجہ سے یہاں کے لوگ مدینہ منورہ اور حضور پاک ﷺ سے بے تحاشا محبت کرتے ہیں۔ اولیاء کی وجہ سے ملتان کا ماحول دینی ہے۔ زمانہ قدیم سے لے کر آج تک اس کی فضاؤں میں محبوب عالمؐ کی ثناء کی محافل کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ملتان نے اپنے ہر دور میں ثناء رسالت مآبؐ کا علم بلند رکھا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل یہاں پر نعت گوئی کی ایک مضبوط روایت موجود تھی۔ تاریخ میں ملتا ہے کہ جب اس علاقے میں کتابوں کا وجود نہیں تھا تو تب بھی بارگاہ رسالت مآبؐ میں عقیدت کے پھول نچھاور کئے جاتے تھے۔ تب نعتیں میلاد کی محافل میں پڑھی جاتی تھیں۔ ملتان کی شعری روایت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملتان کے شعراء کرام نے اپنے دور میں مروجہ اصناف میں نعتیں کہی ہیں۔ یہاں کے شاعروں نے کبھی نظم کے انداز میں نعت کہی تو کبھی مسدس کی شکل میں طبع آزمائی کی۔ نعتیہ دوہڑوں کے علاوہ موجودہ دور کے اہم شعراء کرام نے نعتیہ ہائیکو بھی کہے۔ کہیں پہ غیر منقوط نعتیہ شعری مجموعے منظر پر آئے تو کبھی اردو کے علاوہ سرائیکی، پنجابی اور ہریانوی شعرا نے بھی نعت کہنے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کے علاوہ یہاں کے بہت سے اولیاء کرام نے بھی عربی فارسی میں شاعری کی تو انہوں نے بھی نعت کہہ کر اپنے آپ کو غلامان رسولؐ میں داخل کرایا۔ انہی بزرگوں کا فیض ہے کہ ان کے مزارات میں آج بھی رات دن محافل نعت سجائی جاتی ہیں۔ ملتان کا مجموعی ماحول دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی خواتین نے نعت کو زندہ رکھنے میں بہت کردار ادا کیا ہے اب بھی ملتان میں بے شمار گھرانے ایسے ہیں جہاں صبح کا آغاز تلاوت قرآن پاک اور نعت سننے اور پڑھنے سے ہوتا ہے۔ ملتان کی علمی و مذہبی عظمتوں کا تذکرہ خلیق احمد نظامی نے یوں کیا ”ملتان ہند کے قدیم ترین علمی مرکزوں میں سے تھا۔ 713ھ میں جب محمد بن قاسم نے ملتان کو فتح کیا تو اس نے حجاج بن یوسف کو ایک خط میں ہدایت کی کہ اپنی فتوحات کا دائرہ ہمیشہ وسیع کرتے رہو اور اشاعت اسلام کا خاص خیال رکھو۔ جو بڑا یا پرانا شہر ہو وہاں مسلمانوں کے لیے مسجد ضرور تعمیر کرو۔“ یوں آہستہ آہستہ ملتان اسلامی سرگرمیوں کا محور بنتا گیا۔ یہ ملتان ہی کا وصف ہے کہ یہاں اردو شاعری سے پہلے فارسی اور عربی میں شعر کہے جاتے تھے۔ خاص طور پر فارسی زبان میں اس لیے طبع آزمائی کی جاتی

رہی کہ ایک عرصہ تک فارسی ملتان کی سرکاری زبان رہی۔ قباچہ کے عہد حکومت میں ملتان کی علمی ادبی سرگرمیاں پورے عروج پر تھیں۔ قباچہ کی علم دوستی کی وجہ سے ملتان اہل علم کا مرکز بنتا گیا۔ خاص طور پر یہ بلبن کے دور میں ملتان علمی اعتبار سے دوسرے شہروں سے نمایاں ہو گیا جب بلبن نے اپنے بیٹے سلطان محمد (بغراء خاں) کو ملتان کا حکمران مقرر کیا تو شہزادے کی علم دوستی اور سخاوت کی شہرت کو دیکھتے ہوئے علماء، ادیب، شاعر اور فنکار ملتان جمع ہونے لگے۔ ان تمام کی وجہ سے دربار میں بڑی رونق لگی رہتی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب دربار کی زبان فارسی تھی۔ اسی طرح ساتویں صدی میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے علاقہ میں سب سے پہلی یونیورسٹی قائم کی۔ (یاد رہے کہ آج بھی ان کا مزار نعت گوئی و نعت خوانی کے حوالے سے ایک بڑا مرکز ہے۔) گیارھویں صدی میں حضرت شاہ یوسف گردیزؒ نے ملتان میں پہلا کتب خانہ قائم کیا۔ کتابوں کا ذکر آ گیا ہے تو آپ کو بتاتے چلیں کہ اس علاقے میں جب پہلا پریس لگا جس کا نام ''ریاض نور'' تھا۔ اسی پریس سے 1850ء میں ملتان کا پہلا اخبار ''ریاض نور'' شائع ہونا شروع ہوا۔ اس علاقے میں جو پہلا نعتیہ مجموعہ شائع ہوا اس کا نام معراج نامہ جدید (از منشی نبی بخش) مطبوعہ 1888ء ہے جو 16 صفحات پر مشتمل ہے۔ 1850ء سے 1888ء تک یقینی طور پر بہت سی کتب منظر عام پر آئی ہوں گی۔ لیکن لائبریری میں ان کے نسخے دستیاب نہیں۔ کم از کم 100 کے قریب نعتیہ مجموعے ایسے ہیں جو شائع تو ملتان سے ہوئے لیکن ان کی تاریخ اشاعت کا علم نہیں یوں ہم مطبوعہ مجموعوں کو سامنے رکھیں تو ہمیں پہلا نعتیہ مجموعہ 1888ء یہی ملتا ہے۔ اس کے بعد دوسری کتاب 1890ء مولوی عبید اللہ کی ''مولود شریف'' ملتی ہے۔ اس کے بعد ہمیں مختلف کتب خانوں میں 1901ء گل محمد زائد کی ''فرحت العاشقین'' اور غلام نبی عطر کی ''کاپی گلزار'' ملتی ہے۔ کرنل عبدالرشید نے تذکرہ شعرائے پنجاب (فارسی) میں ملتان کے 30 شعرا کا حوالہ دیا ہے۔ جنہوں نے یقینی طور پر حمد و نعت کے علاوہ اپنی شاعری میں تصوف کا رنگ دیا ان شعراء کرام میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ، ابو الفتح رکن الدینؒ، وفائی ملتانی، علی محمد منالی، محمد سعید قریشی، شیخ الہداد، محمد شفیع بیدل، تحسین ملتانی، شیخ عبدالباقی باہو، فاروق ملتانی، مینگر راج، ملا نادر، نادر گوہر بخش، رائی حضوری، منشی غلام حسن، میر محمد شفیع، فضلی ملتانی، محمد اعجاز سعید ملتانی، امیر حسین بن عالم ابی الحسین ملتانی حسینی، اسحاق ملتانی، حسن دہلوی، ثم ملتانی، جان محمد ملتانی، عزیز الدین چالاک ملتانی، حیدری ملتانی، شہاب ملتانی، ضیاء الہ ضیاء ملتانی، شیخ محمد فخر الدین عراقی ملتانی، فرید الدین گنج شکرؒ، سید علی بخش مذہبی ملتانی، ملا سفید ملتانی اور سید اولاد علی شاہ گیلانی شامل ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے یہاں کی فضاؤں میں فیض سرمدی، مولوی عبید اللہ، حافظ اللہ بخش، شائق الہ دتہ مولوی نور الدین، امیر حیدر، میرن بہاولپوری، مرزا صاحب بیگ بہاولپوری، میاں قاضی، گل محمد، مولوی الہ بخش خادم نور محمد کربلائی، بہار ملتانی، حاجی میاں برکت علی، حافظ شمس الدین، حافظ فیض رسول، اکبر شاہ، محمد اعظم، غلام حیدر فدا غلام محمد عاشق، غلام قادر جیلہ، محمد بخش آہیر، محمد یوسف، حافظ حمید الدین، جندن ملتانی اور محمد اکمل کے علاوہ بہت سے شعراء نے نعت کی شمع کو روشن کیا۔ یہ وہ بزرگ تھے جنہوں نے ملتان کے اولیاء کی تعلیمات سے اکتساب فیض کیا۔

یہاں کی محفلوں میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی، حضرت شاہ شمسؒ سبزواری، حضرت شاہ یوسف گردیزؒ، حافظ محمد جمالؒ ملتانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، منشی غلام حسن ملتانیؒ، حضرت موسیٰ پاکؒ اور حضرت عبید اللہ ملتانی کی تعلیمات کا بہت اثر تھا۔ جس وجہ سے شعر و ادب کی دنیا میں نعت کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ عہد گزشتہ میں ملتان میں سیماب اکبر آبادی ناطق جالندھری، غنچہ امروہوی، کشفی ملتانی، اسد ملتانی، تاثیر نقوی، صابر خلیل اور صابر دہلوی نے عشق مصطفیٰؐ کے دیپ نعت کی شکل میں جلائے۔ ان تمام شعراء کرام کے اسلوب نعت میں کلاسیکی رنگ نمایاں رہا۔ جس سے یہاں کی توانا روایت نعت کا پتہ چلتا ہے۔

ملتان کی اولین تاریخ کے مطابق حضرت بابا فرید شکرؒ گنج، حضرت امیر خسرو، امیر حسن سنجری اور شیخ علی متقی نے اپنے ہاں نہ صرف محفل نعت کو فروغ دیا اور خود بھی نعت میں طبع آزمائی کرتے رہے۔

ملتان کے دوسرے دور شاعری میں جب ہم جاتے ہیں تو ہمیں اس دور میں سید علی حیدر ملتانی، منشی غلام حسن شہید ملتانی (جن کو ملتان کا پہلا اردو کا شاعر کہا جاتا ہے) قاضی گل محمد، منیر ملتانی، صابر ملتانی، ارشد گورگانی، مخدوم شیخ حسن بخش قریشی، خان بہادر، سید حسن بخش گردیزی، طاہر ملتانی، ناطق جالندھری، غنچہ امروہی، قادر بخش ممتاز، راجہ محمد عبداللہ نیاز، پروفیسر شیخ عبداللطیف تپش، وحشت ملتانی، بہار آزاد ملتانی، کشفی ملتانی، اسد ملتانی، عظیم الدین بسمل، تہور حسین تہور، محمد جان شاد لاہوری، خدا بخش شہدا اور سید جعفر شاہ گردیزی دکھائی دیتے ہیں۔ جنہوں نے نظم غزل، حمد، مرثیہ، نوحہ کے علاوہ نعت میں بھی طبع آزمائی کی اور ملتان کے نعتیہ ادب کی روایت کو مضبوط کیا۔ عصر رفتہ میں ملتان کے نعتیہ ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس میں ہمیں معروف شعراء نعت کے ساتھ جڑے دکھائے دیتے ھیں۔ ان شعراء میں حکیم سید عبدالمجید راہی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا افق کاظمی، ضیا صدیقی، آغا شیر احمد خاموش، کیفی جام پوری، صابر دہلوی، صوفی دہلوی، سید قتیل جعفری، گلچیں کرنالی، آغا صادق، نسیم ملک ملتانی، آغا اعجاز اکرم، خلیق ملتانی، ادب سیمابی، رنگین فیروز آبادی، انور مرزا جالندھری، جدی سیمابی، صادق مصور، قیصر ہوشیار پوری، پروانہ بجنوری، وزیری پانی پتی، طاہر کپور تھلوی، شفیق حیدر آبادی، قمر لکھنوی، سرمد مظاہری، سرور بجنوری، اقبال ساغر صدیقی، اطہر سلیم مسعودی، سید ریاض حسین رضوی، خلیل ہمدانی، غافل کرنالی، غلام رسول عبید، عبدالعزیز شرقی، مہر عبدالحق، بیگم نصرت رشید، مولانا خدا بخش، اظہر، تاباں عابدی، فاطمہ بلگرامی، سید محمود علی، امید ملتانی، علامہ خاکی، پروفیسر عرش صدیقی، لالہ صحرائی، سید قدرت نقوی، اقبال گیلانی، عبدالمجید خان ساجد، شیم شمسی، سید مومن گردیزی، حفیظ رومانی، تصدق رسول، رفیق خاور جسکانی، زاہد حسین سالک اور ریاض انور شامل ہیں۔ جنہوں نے گاہے بگاہے نعت کہہ کہ ملتان کی نعتیہ تاریخ میں اپنے ہونے کا ثبوت دیا۔ ملتان میں نعت کے موجوہ دور میں جن سینئر شعراء کرام نے اس کو دبستان کا درجہ دلایا ان میں عزیز حاصل پوری، ڈاکٹر عاصی کرنالی، سید حیدر گردیزی، ہلال جعفری، سید اصغر علی شاہ، ڈاکٹر اسلم انصاری، حزیں صدیقی، ایاز صدیقی، پروفیسر حسین سحر، اقبال ارشد، تابش الوری، ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر انور جمال، ساغر مشہدی، عیش شجاع آبادی، ڈاکٹر طاہر تونسوی، منصور ملتانی، دل محمد واجد، مقصود زاہدی، ممتاز العیشی، مذاق العیشی،

پرواز جالندھری، سید صفدر حسین صفدر، خادم کھیتلی، تابش صمدانی، منیر فاطمی، اختر جعفری، نجم الاصغر شاہیا، ارشد ملتانی، سید کرامت گردیزی، تاثیر وجدان، رحمٰن فراز، فرخ درانی، خادم رزمی، سلمان غنی، سید ضیاء شبنمی، انوار انجم، نذیر قیصر، وفا حجازی، سید محسن نقوی، حبیب فائق، اصغر ندیم سید، جابر علی سید، زوار حسین، سید فخر الدین بلے، شوکت رسول پوری، محمد اسلم یوسفی، فدا بخاری، بیدل حیدری، جاوید عابدی، مولانا ذوالفقار حیدر، راغب، مولانا حسن رضا، شمیم شمسی، ثمر بانو ہاشمی، حبیب محمد حبیبی، سید شیدا حسن زیدی، الیاس عشقی، کرنل دل نواز دل، مناظر حسین نظر اور دیگر شعراء نے اپنی قیدتوں کا اظہار نعت کہہ کر کیا مندرجہ بالا بہت سے شعراء کرام صاحب تصنیف بھی ہیں۔ جو نعتیہ مجموعے کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہیں کی محنت و ریاضت کی وجہ سے آج سرزمین ملتان خوشبوئے ثناء مصطفٰیؐ سے معطر ہے۔ انہی کی نعتوں کو نعت خوانوں کی ٹولیاں ربیع الاول اور رمضان المبارک میں پڑھتی ہیں۔ اصل میں یہی وہ شعراء کرام ہیں جن کی وجہ سے ملتان میں نعتیہ مشاعروں کا انعقاد تسلسل سے ہوا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں نعتیہ محافل کا انعقاد ایک تحریک بن گیا ہے اور ان کے بعد آنے والی نسل نے ایک عبادت کے طور پر نعت کہنے کے عمل کو جاری رکھا اس نسل کے ہراول دستے میں نوشابہ نرگس، وسیم ممتاز، عارف معین بلے، قمر رضا شہزاد، رضی الدین رضی، اطہر ناسک، اختر شمار، ناصر بشیر، سلیم ناز، فرحت عباس، شفیق آصف، مختار علی، عظمت کمال، مرتضٰی اشعر، معصومہ شیرازی، تحسین غنی، نوازش علی ندیم، حسن شارق، رہبر صمدانی، فرتاش سید، ظفر کامران، گل نوخیز اختر، راجہ کوثر سعیدی، منور جمیل، مشتاق کھوکھر، ندیم بھابھہ، ضیاء ثاقب بخاری، سہیل عابدی، حسنین اصغر تبسم، طاہر نسیم خورشید بیگ میلسوی، محمد جمال محسن، عظیم حیدر سید، طارق اسد، افسر علی افسر، ڈاکٹر شوذب کاظمی، نثار احمد طالب، عباس ملک، بہار النساء بہار، کوثر ثمرین، علی اطہر شوکت، شاہد عباس، عذرا شوذب، افتخار شفیع، شناور اسحاق، عباس تابش، مشکور قطب پوری، ساحل نقوی، مبشر وسیم لودھی، شوکت مہدی، غضنفر عباس، صدف زائر بخاری، عذرا وحید، ماہ طلعت زاہدی، سید مسعود کاظمی، ذکاء اللہ انجم ملغانی، اختر معظم، حکیم نذیر آصف خیال، ڈاکٹر خان محمد، ساجد انیس مضطر، خالد قلندری، شہناز نقوی، فاطمہ نقوی، شہلا نقوی، قدیر طاہر، قاسم عدیل، حامد کرتار پوری، طارق جامی، آنس معین بلے، عیش شجاع آبادی، پروفیسر طاہر فاروقی، نور احمد غازی، اقبال احمد جاوید ہاشمی، سید ظہور احمد شاہ، اکبر بخاری، مجید سالک، نور صابری، عبدالدشاد شاد، ڈاکٹر حفیظ بصر شوکت ہاشمی، محمد نواز اشم، نور محمد گدائی، فیض محمد سندھڑ، اللہ دتہ ملتانی، عاصم احمد رمضان طالب، علامہ خاکی، محمد اسلم میتلا، عبدالرحمٰن ارم، ایم اسلم ندیم، محمد طاہر رزاق، شعیب جاذب، آصف حیات کوثر یاسمین، ہمایوں نصیر، اعجاز خاور، ارشد عباس ذکی، فہیم ممتاز، سرور صمدانی، عبدالرحمٰن جامی، مستحسن خیال، شیر افگن جوہر، حق نواز خرم، رحیم طلب، حمید الفت ملغانی، اقبال بھپلا، حبیب الرحمٰن بٹالوی، ابن کلیم، لقمان ناصر، عمار یاسر مگسی اکرم انصاری، رضوانہ تبسم درانی، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، غلام حسین ساجد، فیاض رسول، راؤ وحید اسد، بربط تونسوی یاور حیدری، عون حسین سید، قیصر ہاشمی، بیدار وارثی، نیاز کوکب اور دیگر شامل ہیں۔

مجموعی طور پر ملتان میں کہی جانے والی نعت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر خوبصورت نعت

کہنے کی روایت بہت قدیمی ہے۔اس روایت کو ہر دور کے شعراء نے بڑی احتیاط سے آگے بڑھایا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ آج ملتان میں کہی جانے والی نعت کا تذکرہ پوری دنیا میں ملتا ہے۔ خاص طور پر یہاں کہی جانے والی نعت میں حضور پاک ﷺ کے جمال ظاہری، معجزات اور سیرت کے ساتھ ساتھ آپؐ کے اسوہ حسنہ، حالات زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے کیونکہ آپ کی ذات بابرکات ہر پہر پوری دنیا کے لیے رحمت عالم کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لیے ملتان کے شعراء نے سیرت طیبہؐ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نعت کہی جس وجہ سے نعت کے مجموعی حسن میں اضافہ ہوا۔ اس خطے کے شعراء نے جس انداز میں نعت کہی اس سے موضوعات میں تنوع آیا۔ خاص طور پر بہت سے شعراء کی نعت میں ذاتی اور انفرادی کیفیت کی بجائے امت مسلمہ کے لیے درد بھی دیکھا گیا جس سے دبستان ملتان کی نعت کے لیے نئے باب کھل کر سامنے آئے اس مختصر جائزے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملتان کی نعت پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ خیر وشر، نیکی و بدی، طاغوتیت اور الوہیت کے درمیان ایک خط امتیاز کھینچ کر سیرت طیبہ حضورؐ کی ذات اقدس کے نقوش اس انداز سے سامنے آرہے ہیں کہ رحمت عالم کی طرح یہ نعت بھی ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے گی۔

(جنگ مڈ ویک میگزین - شاکر حسین شاکر)



حفیظ خان

سرائیکی نعت گوئی عہد بہ عہد

دنیا کی دیگر زندہ زبانوں کی طرح سرائیکی میں بھی شعری اصناف ادب شروع ہی سے عمومی طور پر مذھبیات سے عبارت رہی ہیں۔ 712ء میں وادیٔ سندھ خصوصاً سرائیکی وسیب میں محمد بن قاسم کی آمد اور اسلامی اثرات کے نتیجے میں یہاں کی ادبی تہذیب و روایات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں میں سے سب سے نمایاں تبدیلی نثری و منظوم ادب میں حمد، نعت اور بعد ازاں مرثیے کا فروغ تھا۔ شروع شروع میں منظوم ادب کا زیادہ تر حصہ ایسی طویل نظموں پر مشتمل ہوتا تھا کہ جس میں اولین اشعار حمدیہ، پھر نعتیہ جن میں ولادت یا شعادت کا احوال و توصیف اور بقیہ نظم میں واقعات کربلا اور اس کے درمیان کہیں کہیں پند و نصائح یا فقہی مسائل کا بیان ہوتا تھا۔ گو کہ عرب اقتدار کے خاتمے کے بعد باقی وادیٔ سندھ کی طرح ملتان بھی مختلف سمتوں سے حملہ آوری کا نشانہ بنا رہا اور یہاں تخلیق کیا جانے والا ادبی سرمایہ ہر حملے کے بعد نذرِ آتش کیا جاتا رہا مگر اس کے باوجود بچ رہنے والے منظوم مذہبی ادب میں متفقہ طور پر حضرت مُلاں کی تخلیق ''نور نامہ'' کو پہلی دستیاب کتاب قرار دیا جاتا ہے جس کے بن تخلیق کے بارے میں قیاس 500 ہجری کا کیا جاتا ہے۔ مگر حافظ محمود شیرانی کے مطابق یہ 1054 ہجری اور کیفی جام پوری کے نزدیک یہ نظم 600 ہجری یعنی تیرہوی صدی عیسوی کے لگ بھگ تخلیق ہوئی۔ لیکن اگر اسی نظم کے ایک شعر کے پہلے مصرعے ''پنج سو سال جو گزرے آئے ہجر بعد رسولوں'' (ہجرتِ رسولؐ کو پانچ سو سال گزر گئے) پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حمدیہ اور نعتیہ نظم ہجرت نبیؐ کے پانچ سو برس گزرنے کے بعد چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں لکھی گئی۔

سرائیکی زبان میں نعت گوئی کی ابتدائی اشکال ہمیں حضرت محمدؐ کی سیرت پاک، حیات طیبہ، آپؐ سے وابستہ جامع صفات اور ان کی مُدحت کے یکجا بیان کی بجائے علیحدہ علیحدہ مگر ایک عنوان کے تحت مختص شدہ منظومات کی صورت دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً اگر سراپا مبارک بیان کرنا مطلوب ہوتا تو ایسی تخلیقات کو ''حلیہ مبارک'' کا نام دیا جاتا۔ آپؐ کی دنیا میں تشریف آوری کا بیان رقم کیا جانا چاہیئے ہوتا تو ''مولود شریف'' نظم کی جاتیں۔ اسی طرح سرور کائنات کی عظمت کے بیان میں لکھی گئی نظم ''تاج نامہ'' کہلاتی۔ معراج کے واقعہ کا ذکر کرنے کے لیے ''معراج نامہ'' اور آپؐ کی شادی کے بیان میں ''بارات نامے'' تحریر کیے جاتے۔ آپؐ کے وصال فرمانے کے واقعہ سے متعلق شعراء نے

''وصال نامے'' تخلیق کیے۔ موضوعات کے لحاظ سے لکھی گئی ان مذہبی منظومات میں ''معراج نامے'' اور ''مولود شریف'' عوامی سطح پر نہایت مقبول موضوع قرار پائے۔ سرائیکی کے قدیم منظوم ادب میں میاں قبول فقیر (580 ہجری) اور دودے شاہ (571 ہجری) جب کہ بعد کے ادوار میں میاں قادر یار اور حافظ محمد یار (تیرہویں صدی ہجری) کے ''معراج نامے'' نہایت مقبول ہوئے۔ جب کہ مولود شریف کے عنوان تلے لکھی گئی نظمیں تو ہر دور میں بے پناہ مقبول رہیں۔ سرائیکی وسیب میں مقبولیت کے اعتبار سے مولود شریف ہی نعت کا نہ صرف مترادف قرار پائی بلکہ عملی طور پر سمجھی بھی گئی۔ خالصتاً ولادت باسعادت کے واقعے پر مشتمل طویل نظموں میں مولوی غلام قادر قریشی کا ''تولد نامہ'' اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ اسی طرح قدیمی شعراء نے حضور کریمؐ سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار نعتیہ سہ حرفیاں، نعتیہ ڈھولے، نعتیہ سہرے، نعتیہ گھڑولیا، نعتیہ جوگی نامے، بارہ ماہ محمدیؐ اور نعتیہ طوطے نامے لکھ کر بھی کیا۔

سرائیکی منظوم ادب میں نعت گوئی نے ایک موثر و معروف صورت اس وقت اختیار کی کہ جب کافی لکھنے جانے کا آغاز ہوا۔ کافی عمومی طور تصوف کے مضامین سے عبارت سمجھی جاتی ہے جس میں وحدت الوجود کے فلسفہ کا بیان بنیادی حیثیت رکھتا ہے مگر کافی لکھنے والے صوفیاء نے بھی نعتیہ مضامین کو اپنی منظومات کا حصہ بنایا۔ اگرچہ شاہ حسینؒ اور بابا بلھے شاہؒ نے نعتیہ مضامین کی نسبت دیگر مذہبی معاملات کو اپنی ترجیحات مین رکھا کہ جن میں انسان، خدا اور کائنات کے باہمی ربط کی عقدہ کشائیاں کی گئیں تھیں لیکن حضرت سلطان باہوؒ (1631-1691) کے دور سے نعتیہ منظومات کا شروع ہونے والا سلسلہ اٹھارویں صدی عیسوی میں سچل سرمستؒ تک پہنچا تو سرائیکی زبان میں نعتیہ ادب میں ایک بھرپور اثر پذیری کے ساتھ موجود تھا۔ حضرت سلطان باہوؒ کے دور کے دیگر نعت گو شعراء میں شیخ عبداللہ ملتانی اور نعمت رام نعمتی بھی اہمیت کے حامل رہے۔ سچل سرمستت سے قبل ایک اہم نام علی حیدر ملتانی کا بھی ہے۔

شاعری کے اسی دور میں کئی اور بڑے نام بھی سامنے آئے جنہوں نے آقائے دو جہاںؐ کے حضور اپنے گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے سرائیکی دینی منظومات کو بُنت اور معنویت کے لحاظ سے بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ ان شعراء میں چراغ اوان، مولوی لطف علی، روحل فقیر، عبدالحکیم اُچوی، صوفی مراد فقیر، خواجہ محکم الدین سیرانی، حافظ محمد جمال ملتانی، عثمان فقیر، منشی غلام حسن گامن، غلام محمد بہاولپوری، امیر حیدر میرن، بیدل فقیر، حمل فقیر لغاری، نواب ولی محمد لغاری اور صدیق فقیر نمایاں ترین کہ جاتے ہیں۔ ان کے فوری بعد کے عہد میں شاہ محمد دیدڑ، غلام علی فقیر، محمد محسن بے کس، پھاپھل حفظانی، صالح محمد مسکین، دیوان خوشدل، غلام سکندر غلام، شاہ نصیر الدین نقشبندی، صوفی رکھیل شاہ، سید فاضل شاہ، سید مصری شاہ، مولوی اللہ بخش فدوی، مولوی برخوردار، سردار کوڑے خان جتوئی، اللہ بخش طالب، خواجہ عاقل جوگی، خواجہ محمد یار فریدی، مضطر ملتانی، خواجہ نازک کریم، اللہ ڈیوایا پرجوش، جندن ملتانی، مولوی غلام حیدر، مولوی اللہ بخش جانباز اور گل محمد عاشق ملتانی سرائیکی نعتیہ شاعری میں بھی معروف رہے۔

اسی عہد کا ایک بڑا نام خواجہ غلام فریدؒ کا ہے۔ انہوں نے ایک صوفی شاعر ہونے کے ناطے جہاں ابن العربی کے فلسفۂ وحدت الوجود کی شعری تفہیم کی وہیں حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو بھی ایک نیا زاویہ فکر عطا کیا۔ روایتی نعت

گوئی جس میں آپؐ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ موضوعات کے حوالے سے خراج محبت پیش کیا جاتا تھا، خواجہ فریدؒ کی شاعری میں یہ تمام پہلو یکسو ہو کر جدید نظم کی صورت میں سامنے آئے۔ اس لحاظ سے تولد نامے یا مولود شریف کے قدیمی اندازِ عقیدت کو نئی جہتیں ملیں تو نعت کی اثر انگیزی فزوں تر ہو گئی۔ خواجہ فریدؒ نے کافی کے اسلوب میں نعت کہتے ہوئے جب اس میں واردات قلبی کو سمویا تو نعت کے اشعار کسی ایک خطے کے شاعر کے افکار سے ماورا ہو کر آفاقیت کے درجے پر فائز ہو گئے۔

ان کے ہم عصروں میں اگرچہ خواجہ محمد یار بل بل، میاں محمد بخش نوروز، گامن کروڑی، ڈِتن ملتانی، سید مبارک شاہ احمد پوری، بابا جمال شاہ، قاضی راضی، حسرت ملتانی، سید خیر شاہ، مولوی محمود مولائی، احمد بخش سندھی، صالح محمد صالح، میر علی نواز علوی، منشی کمال خان مگسی، سید جلال کلیم، اللہ بخش شائق، منشی تیغ علی کمتر، امام بخش امام، جان محمد گداز اور مرید حسین راز جیسے کوی قادر الکلام شعراء اندرون سندھ تا ڈیرہ اسماعیل خان اور سرگودھا تا رحیم یار خان اپنا اپنا مخصوص حلقہ اثر رکھتے تھے مگر نعت گوئی میں خواجہ غلام فریدؒ جیسی معنویت اور کمال عقیدت کا بیان کم ہی دیکھنے کو ملا۔ سرائیکی نعت گوئی کے اس عہد کو بلا بحث و تمیز خواجہ غلام فریدؒ کا عہد کہہ سکتے ہیں۔

بیسوی صدی عیسوی میں اگرچہ سرائیکی نعت گوئی کا سورج خواجہ فریدؒ کے شعری اسلوب کے اثرات تلے طلوع ہوا مگر ان کے عہد کے آخر میں لیجنڈری حیثیت اختیار کر جانے والے شاعر خرم بہاولپوری نے سرائیکی غزل کے آغاز کے ساتھ ساتھ کافی، حمد اور نعت کہنے میں بھی اپنا علیحدہ تشخص قائم کیا۔ بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں خرم بہاولپوری کے ہم عصروں میں مخدوم نو بہار، بخی راضی فقیر، مولانا عزیز الرحمٰن عزیز بہاولپوری، بابا شیر محمد شیرن، منشی برات علی، صابر مبارک پوری اور خوشتر جتوئی کے اسمائے گرامی سرائیکی نعت گوئی کے حوالے سے اہمیت کے حامل رہے ہیں۔

اسی عہد سے ملحقہ برسوں سرائیکی زبان میں نعت گوئی کے اعتبار سے ایک اور اہم نام نور محمد سائل کا ہے۔ عشقِ مصطفیٰ ﷺ میں سرشار ہو کر انہوں نے لاتعداد نعتیں کہیں جو ان کی شہر کا باعث ہوئیں۔ ان کا سیدھا سادہ مکالمے کا سا انداز پڑھنے اور سننے والے کے دل میں تو گھر کرتا ہی ہے مگر آنکھیں بھی پرنم کر دیتا ہے۔

نور محمد سائل کے ہم عصروں میں یتیم جتوئی بھی نعت گوئی کے میدان میں اسی تب و تاب اور اسی اُٹھان سے مدحتِ رسولؐ میں مصروف رہے۔ یہ دونوں شعراء اپنی سلاست اور سادگی کے سبب ایک جیسی شہرت کے حامل رہے۔ ان کے دور میں سرائیکی نعت گوئی نے فنی اور فکری اعتبار سے ترقی کی واضح منازل طے کیں جن کے سبب ان کے دور آخر کے ساتھی شعراء غلام حسن حیدرانی، حافظ عبدالکریم دلشاد، سفیر لاشاری، سید عاصم اچوی، خواجہ محمد دین اور محمد امیر مجروح جیسے شعراء نعت گوئی کی طرف ملتفت رہے۔ ان شعراء میں سے حافظ عبدالکریم دلشاد، صالح اللہ آبادی، جانباز جتوئی، فیض محمد دلچسپ نے کافی گوئی میں مروج اسلوب اور ڈکشن کو نعت لکھنے میں بھی استعمال کیا اور یوں سرائیکی نعت گوئی میں ان شعری روایات کو پھر سے زندہ کیا کہ جو خواجہ غلام فریدؒ کے دور سے قبل پسندیدہ سمجھی جاتی رہی تھیں۔ جبکہ

سفیر لاشاری اور محمد امیر مجروح کے ہاں نعت لکھنے کے عمل میں قدیم روایات اور جدید رجحانات دونوں کو بھرپور طور پر برتا گیا۔ اسی دور کے دیگر اہم شعراء میں سید حسن رضا گردیزی، خواجہ عبداللہ اخگر اور نقوی احمد پوری کا ذکر کیے بغیر بات شاید ادھوری رہے۔ یہ تینوں شعراء بنیادی طور پر نعت گو نہیں تھے۔ سید حسن رضا گردیزی نے جہاں سرائیکی نظم نگاری میں انقلاب برپا کیا وہیں خوبصورت نعتوں سے بھی مشام جاں کو معطر کیے رکھا۔ خواجہ عبداللہ اخگر نے غزل اور مرثیہ نگاری میں اپنا حلقۂ ادب پیدا کیا جو ان کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ مگر ان کی نعتیہ تخلیقات نے بیسویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر کے سرائیکی ادب میں اپنا الگ تشخص قائم کیے رکھا۔

بیسویں صدی عیسوی کی آخری چوتھائی میں شاید ہی کوئی سرائیکی شاعر ایسا ہو کہ جس نے غزل، نظم یا کافی کہنے کے ساتھ ساتھ حمد اور نعت رقم کرنے کی سعادتیں نہ سمیٹی ہوں۔ کہیں کوئی بھی دیوان شائع ہوا تو اس کے ابتدائی صفحات حمد اور نعتیہ کلام کے لیے مختص کیے جانے کو ہمیشہ باعث نجات اُخروی جانا گیا۔ مشاعرے ہوں یا نعتیہ محافل، ان کے لیے خاص اہتمام سے نعت لکھنا سرائیکی شاعری میں کارہائے عقیدت میں شمار ہوتا چلا آ رہا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ سرائیکی شاعری کے اس عہد میں جہاں سرور قریشی، امید ملتانی، ایم بی اشرف، بخت فقیر، عبدالرحمٰن آسی، محمد بشیر احمد سعیدی، دلنور نور پوری، سائل صابری، محمد رمضان طالب، عصیم قادری، فیض سندھڑ، ناظم صابری اور محمد اسلم میتلا کے نعتیہ مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے وہیں ارشد ملتانی، سید محسن نقوی، حبیب فائق، رشید قیصرانی، انجم لاشاری، اقبال سوکڑی، عزیز شاہد، تنویر سحر، ممتاز عاصم، مظہر مسعود، ثاقب قریشی، رفیق احمد پوری، صادق جندی ہوت، شوخ ریاستی، رحیم طلب، وفا چشتی، شیدا چشتی، اللہ بخش یاد، عباس ملک اور اقبال بھلا نے بھی اپنے اپنے انداز میں مدح رسول کا فریضہ سرانجام دیے رکھا اور یہ سلسلہ اب کچھ اور بھی فزوں تر ہوا چاہتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ زمانہ کوئی بھی ہو، زبان کوئی بھی ہو، خطہ کوئی بھی ہو، دربارِ نبوتؐ میں اشک بار آنکھیں، کپکپاتے لب اور تھرتھراتی زبانیں تا قیامت یونہی گلہائے عقیدت نچھاور کرتی رہیں گی۔ یہ کائنات کئی کائناتوں پر محیط سہی مگر اس کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ، ازل سے ابد کے دورانیے میں کسی بھی لمحے اپنے خالق کے محبوب کا ذکر کیے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔

(روزنامہ جنگ ملتان – حفیظ خان)



علامہ عتیق فکری

برصغیر پر ملتان کے علمی اثرات

جس طرح ملتان اپنی قدامت کی وجہ سے عظمت کا حامل ہے اسی طرح علم وادب اور فنون میں بھی اس کی رفعت مسلم ہے جن اہل علم اصحاب نے قبل اسلام اور اسلامی دور کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ملتان کی وسیع وعریض علاقے سے کیسی کیسی علمی شخصیتیں نمایاں ہوئی اور ان کی علمی تحقیقی کاوشوں کے اثرات پورے برصغیر میں کس انداز سے ہوئے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے تاریخ کے اوراق اس کی پوری پوری شہادت دیتے ہیں کہ ملتان کے علمی اثرات پورے برصغیر پر ہوئے ہیں۔

جب کہ محمد بن قاسم نے 95ء میں ملتان کو فتح کر لیا تو یہاں پر مسلمانوں نے اسلامی علوم کو فروغ دینا شروع کیا عرب مسلمانوں کی پورے سندھ اور ملتان میں آبادیاں قائم ہوئیں اس طرح دمشق اور بغداد جو اس وقت علمی طور پر مرکزی صورت اختیار کر رہے تھے سندھ اور ملتان پر اس کے اثرات پڑنے لگے تھے۔

پہلا علمی دور

بنو امیہ نے ملتان میں علوی حکومت کا 279ء میں خاتمہ کر دیا اس دور میں ملتان اسلامی نظام حیات کا گہوارہ نظر آتا تھا جو بھی صاحب علم سیاح یہاں سے گزرا اُس نے ملتان کی تہذیب وتمدن کی بڑی تعریف کی یہاں تک کہ محمود غزنوی نے ملتان کو فتح کیا اس کے دور میں البیرونی جیسا محقق برسوں ملتان رہا اور یہیں اس نے ہندی علوم کی کئی کتابوں کے ترجمے عربی میں کیے اور ملتان ہی میں بیٹھ کر اس نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب، کتاب الہند لکھی اس وقت ملتان اسلامی فلسفے کا مکمل دبستان تھا، ایتک طرف محدث وفقہی تھے تو دوسری طرف اسمٰعیل مذہب کے پیروکار جن کے مذہب کی بنیاد فلسفے اور باطنی علوم پر تھی اس طرح ملتان ایک طرف روایتی علوم کا گہوارہ تھا تو دوسری طرف علوم عقلیہ کا دبستان تھا محمود غزنوی کے بعد مسعود کے دور میں حضرت یوسف شاہ گردیزی تشریف لائے، مصنف نزہتہ الخوائز لکھتے ہیں ''یوسف بن ابوبکر الگردیزی عابد وزاہد شب بیدار اور فقیہہ تھے۔ 250ء گردیز میں پیدا ہوئے تکمیل علوم کے بعد ملتان چلے آئے یہاں تدریس وتبلیغ شروع کی اور بے شمار افراد نے فیض حاصل کیا ملتان ہی میں 531ھ میں وصال ہوا دراصل یہ پہلی باقاعدہ درس گاہ تھی جو محمود غزنوی کے بعد ملتان میں اسلامی علوم کی ترویج کے لیے قائم

ہوئی لیکن محمود کے جانشینوں نے اس طرف توجہ نہ کی پھر بھی انفرادی طور پر بعض درس گاہیں اشاعت علوم میں سرگرم رہیں یہاں تک کہ 605ھ میں غوث بہاء الحق زکریاؒ کی علمی درس گاہ علم وفنون کا مرکز بن کر ابھری آپ چونکہ بہت مالدار تھے اس لیے طالب علموں کے تمام اخراجات آپ پورے کرتے بزرگان دین کے ملفوظات اور تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ آپ کی درسگاہ سے ہزاروں طالب علم قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ خطاطی علم قرأت اور تجارت کے مہر بن کر نکلے آپ کے زمانہ میں شمل الدین بہت بڑا خطاط شاعر اور عالم ملتان کو شاعری اور فن خطاطی سے خاص طور پر نواز رہا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب ناصر الدین قباچہ کا دربار علماء اور فن کاروں سے بھرا ہوا تھا عوفی اور منہاج سراج جیسے مورخ وفقیہی اور فضلی ملتانی، یگانہ روزگار عالم منہاج الدین اور کمال الدین جیسے محدث اور عربی ادب کے ماہرو ں کا ملتان میں ہونا اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ملتان کا یہ پہلا علمی دور جس کے اثرات براہ راست پورے برصغیر پر پڑے نہایت ہی اہم اور موثر تھا۔

ان اثرات کا اُس وقت پتہ چلتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمدان سے عراقی بالکل نوجوانی کے عالم میں قلندروں کے ٹولے کے ساتھ ملتان پہنچتا ہے اور غوث بہاء الحق زکریاؒ ملتان کے آستانے کا فقیر بن جاتا ہے لیکن جب یہ فقیر بیس سال کے بعد یہاں سے مشرق وسطیٰ کا سفر کرتا ہے تو بڑے بڑے جابر حکمران عراقی کے استقبال کو تخت شاہی سے اتر کر شہر سے باہر عراقی کے قدموں کو بوسہ دیتے ہیں یہی عراقی جب مصر میں داخل ہوتا ہے تو سلطانِ مصر عراقی کے علم وفضل سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ علمائے مصر کو سرکاری طور پر ہدایت کی جاتی ہے کہ ہفتے میں ہمیں ایک بار عراقی کے علم وفضل سے مستفید ہونے کے لیے اس کا درس سنا کریں یہی صورت حال سید امیر الحسینی کی تھی جس نے کئی سال حضرت غوث بہاء الحق کی درسگاہ میں گزارے جب مرات میں قیام کیا تو چاروں طرف سے طالب علم درگاہ مذکورہ سے اکتساب علوم کر کے اپہار، بنگال، ملایا، مالابار، گجرات، احمد آباد یہاں تک کہ انڈونیشیا تک جا پہنچے۔ قاضی فخر الدین ملتانی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مالا بار چلے گئے اور کالی کٹ مالا بار کے قاضی مقرر ہوئے اور درس کو بھی جاری رکھا اُن کے شاگرد زین الدین جیسے عالم مالا بار ہی رہے جو کئی کتابوں کے مصنف تھے خود قاضی فخر الدین کے لڑکے بعد میں مالا بار میں درس دیتے رہے ساتویں صدی میں ملتان سے لے کر اوچ اور ٹھٹھہ تک مدرسے قائم تھے اور ہزاروں طالب علم یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ جب مولانا قطب الدین کاشانی ماوراء النہر سے ملتان آئے تو ناصر الدین قباچہ نے ملتان میں بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا اور ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی مولانا قطب الدین کاشانی اس مدرسہ کے صدر الہام تھے اسی طرح اوچ میں بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا وہاں منہاج سراج 622 میں صدر الہام مقرر ہوا غرض درس گاہوں کا ایک جال تھا ملتان اور آس پاس کے علاقوں میں پھیلا ہوا اور علوم وفنون کے حصول کے لیے طلباء دور دور سے آتے تھے کوٹ کروڑ جیسی بستی میں حضرت بہاء الحق زکریاؒ ملتانی نے ساتوں قرائتوں میں قرآن حفظ کیا اور اسی طرح حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے کھتے والا بستی میں اسی طرح قرآن پڑھا اس سے بڑھ کر اور کیا توقع اس دور میں کی جاسکتی ہے۔ لیکن ساتویں صدی ہجری میں ملتان اور آس پاس کے علاقوں میں علوم وفنون

کا یہ حال تھا کہ کہیں تو علوم عقلیہ کا درس ہو رہا ہے تو کہیں ہاتھی دانت کے بہترین کاریگر فنی نمونے تیار کر رہے تھے ایران کے مشہور فلسفی ناصر خسرو نے مصری اسمٰعیلی حکومت کے مشن پر جب سفر کیا تو اس سے دو صدی پیشتر ملتان علوم عقلیہ کا مرکز تھا کیونکہ علوی سادات اسمٰعیلی عقائد اور فلسفہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور تیسری صدی کے شہروں میں ملتان میں فلسفے کو رواج دے چکے تھے۔

ساتویں صدی 650ھ کے وسط سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے آخر تک ملتان سے علمائے کرام پورے برصغیر میں برابر پھیل رہے تھے۔ مولانا بہاء الدین ملتانی علاؤ الدین خلجی کے دور میں ملتان سے دلی پہنچے وہاں بہت بڑی درسگاہ قائم کی اور تمام عمر درس دیتے رہے دلی ہی نہیں علی گڑھ جیسے علمی شہر میں قطب الدین کاشانی ملتانی کے فرزند شہر (علی گڑھ) میں عہدہ قضا پر فائز ہوئے اور وہیں رہے منصب قضا ان کی اولاد در اولاد میں منتقل ہوتا رہا اور یہ خاندان عہدہ قضا کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہا مولانا شہاب الدین ملتانی فقہ اور عربی ادب میں کمال رکھتے تھے۔ علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں ساری عمر دہلی میں درس دیتے رہے لوگ ان کے فتوؤں پر عمل کرتے تھے مولانا کے ایک اور صوفی عالم تھے جو شیخ صدر الدین ظفر آبادی ملتان کے نام سے مشہور تھے 705ھ میں پیدا ہوئے ملتان ہی میں جملہ علوم کی تعلیم حاصل کی حضرت رکن الدین ملتانیؒ نے فرقہ خلافت عنایت فرمایا فریضہ حج کرنے کے بعد ظفر الدین ملتانی دہلی میں لوگوں کو جہالت سے نکال کر علم کی طرف لا رہے تھے تمام عمر دلی میں گزار دی اسی دہلی میں انہی دنوں شیخ عثمان دین داؤد ملتانی نے حضرت شیخ المشائخ نظام الدینؒ کے حکم سے گجرات کا سفر اختیار کیا شیخ عثمان ملتانی فقہ اور تصوف کی کتب کے حافظ تھے ہدایہ بزدوی، قوت القلوب اور امام غزالی کے احیا العلوم گویا حفظ تھیں گجرات میں مرتے دم تک درس دیتے رہے دکن حیدر آباد میں بھی ملتان کے علما نے درس و تدریس سے لوگوں کو مستفید کیا۔ 850ھ سلطان علاؤ الدین بہمنی کے دور میں قاضی ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی دکن کے شہر بیدر پہنچے اور علاؤ الدین بہمنی کے دونوں بیٹوں نظام شاہ اور محمد شاہ کے دور حکومت سے پہلے بیدر کے قاضی مقرر ہوئے پھر قاضی القضا ہوئے اور درس بھی دیتے رہے جب انتقال فرمایا تو کئی کتابوں کے مسودے لکھے تھے ان میں عربی زبان میں مصارف العلوم و الفنون بلند پایہ کتاب تھی ان کے فرزند بھی بڑے جید عالم تھے اور ابراہیم ملتانی کے نام سے مشہور تھے دکن ہی میں درس دیتے رہے وہیں انتقال فرمایا۔ اس طرح اور بھی کئی عالم دکن میں مسند درس پر نظر آتے ہیں قاضی ابراہیم کے والد فتح اللہ چونکہ معقولات کے عالم تھے چنانچہ قاضی ابراہیم کی وجہ سے دکن میں فلسفہ کا درس عام ہو گیا اور شیخ بو علی سینا اور تفتازانی کی فلسفہ پر شرح کا رواج ہوا ان کے والد فتح اللہ ایک واسطے سے تفتازانی کے شاگرد تھے دکن میں مولانا صدر شریف بھی فلسفے کا درس دیتے تھے غرض ملتان میں منقولات و معقولات کا دور مولانا فتح اللہ کی کاوشوں سے شروع ہوا تھا۔

دوسرا علمی دور

یہ ملتان کا دوسرا علمی دور تھا جس نے پورے برصغیر پر اپنا اثر چھوڑا مولانا فتح اللہ کے شاگرد مولانا عزیز اللہ تلنبوی ملتان سے دہلی پھر بدایوں اور سنبھل وغیرہ میں رہے ان کے ساتھ مولانا عبداللہ تلنبوی بھی تھے دونوں فقہ اور معقولات میں وافر علم رکھتے تھے اس وقت ہندوستان میں سکندر لودھی کی حکومت تھی مولانا عبداللہ نے تو دہلی میں سکونت اختیار کی اور سکندر لودھی نے ان کا انتہائی احترام کیا اور وہیں ان کے سپرد بہت بڑا مدرسہ کیا جہاں وہ فقہ اور معقولات کا درس دیتے رہے اور بقول تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف مولانا عبداللہ کے درس سے بڑے بڑے جید عالم بن کر نکلے اور پورے برصغیر میں اشاعت علوم کے لیے پھیل گئے بقول ملا عبدالقادر بدایونی شیخ عبداللہ کے درس سے چالیس سے زیادہ جید عالم بن کر نکلے مثلاً میاں لاڈن جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری، میراں سید جلال بدایونی وغیرہ اہم ہیں مولانا عزیز اللہ نے سنبھل میں سکونت اختیار کی مولانا کا حافظہ بلا کا تیز تھا اور مشکل مسائل حل کرنے میں ید طولی رکھتے تھے بغیر مطالعہ کئے کتاب پڑھاتے تھے اکثر لوگ مشکل اور پیچیدہ سوالات بطور امتحان پیش کرتے اور مولانا عزیز اللہ سیکنڈوں میں حل کر دیتے تھیان کے سب سے قابل شاگرد مولانا حاتم سنبھلی تھے جن کے درس سے سینکڑوں شاگرد علامہ اجل بن کر نکلے اور عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ کے مصنف بھی حاتم سنبھلی کے شاگردوں میں سے تھے علماء اور مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مولانا فتح اللہ مولانا عزیز اللہ اور مولانا عبداللہ کی وجہ سے ہندوستان میں علوم اسلامیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

مولانا فتح اللہ کی شخصیت تاریخ ملتان میں بڑی اہمیت رکھتی ہے مصنف سیر العارفین مولانا شیخ جمالی نے جن کی ملاقات مولانا فتح سے ملتان میں رہی ہے ان کے درس و تدریس کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے کہ ملتان کے بہت بڑے ماہر تعلیم تھے اور فن خطاطی میں بھی ماہر تھے ان کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد برصغیر میں پھیلی ہوئی تھی اس بیان کی تصدیق مورخ تاریخ فرشتہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے فرشتہ لکھتا ہے۔

ایک مرتبہ سلطان حسین لنگاہ نے قاضی محمد جو فضل و کمال سے آراستہ تھا قاصد بنا کر گجرات سلطان مظفر کی خدمت میں روانہ کیا حسین لنگاہ نے قاضی سے کہا کہ جب واپس آنا تو سلطان مظفر سے درخواست کرنا کہ وہ تمہیں اپنے محلات و عمارات وغیرہ کی سیر کرائے تاکہ ملتان میں ہم بھی ان جیسی ایک عمارت تعمیر کرائی قاضی محمد جب گجرات پہنچا اور پھر واپسی کے وقت محلات وغیرہ کی سیر کی تو واپس ملتان آکر سلطان حسین لنگاہ سے عرض کی کہ حضور آپ اگر پورے سال کا محصول بھی خرچ کر دیں تب بھی ایک عمارت کی تعمیر دشوار ہے یہ سن کر حسین لنگاہ بہت مایوس ہوا عماد الملک تولک نے جو اس وقت عہدہ وزارت پر مامور تھا حسین لنگاہ کی خدمت میں عرض کی ''حضور ہر سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے علیحدہ علیحدہ خصوصیت عنایت کی ہے اگر دکن، مانوہ، گجرات اور بنگالہ کے ممالک زرخیز ہیں اور وہاں عیش و عشرت آسانی کے ساتھ حاصل ہو سکتے ہیں تو ملتان کی سرزمین مردم خیز ہے اور محترم و معزز ہے ظاہر ہے کہ بزرگان

دین ملتان جس سرزمین میں گئے معزز و محترم رہے۔

ملتان کے علمی اثرات

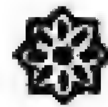
اللہ تعالیٰ کا شکر ہے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے خاندان کے افراد عالیشان شہر ملتان میں موجود ہیں جو بہلول شاہ لودھی کے مہمان خصوصی اور اس کے سمدہی شیخ یوسف سے ہر طرح افضل و بہتر ہیں اس طرح طبقہ بخاریہ میں چند بزرگ ایسے موجود ہیں جو ظاہری اور باطنی کمالات میں حاجی عبدالوہاب پر فضیلت رکھتے ہیں اسی طرح فرقہ علماء میں مولانا فتح اللہ اور ان کے شاگرد مولانا عزیز اللہ بھی خاک پاک ملتان سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کے وجود پر سارا ہندوستان فخر کر رہا ہے۔'' اسی طرح ہندوستان کی قدیم درس گاہوں کے مصنف مولانا ابوالحسنات لکھتے ہیں

> ......''نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان سے آئے مولانا عبداللہ دہلی اور مولانا عزیز اللہ سنبھل میں فرکش ہوئے یہ سکندر لودھی کا عہد حکومت تھا ان دونوں بزرگوں کا بڑے تزک و احتشام سے خیر مقدم کیا گیا کچھ ان کے فضل و کمال اور کچھ بادشاہ کی قدر شناسی سے بہت جلد ان کی علمی عظمت ہندوستان میں ہر چہار طرف قائم ہو گئی انہوں نے سابق معیار فضیلت کو کسی قدر بلند کر دیا قاضی عضد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکا کی کی مفتاح العلوم بھی داخل نصاب کیں اور بھی بہت سے منطقی فسلفیانہ اور ادبی کتابیں تفسیر وغیرہ داخل نصاب ہوئیں۔''

یہ تھی دوسرے علمی دور کی مختصر روداد جس کی وجہ سے پورے برصغیر میں علمی اطوار میں تبدیلی آئی اور پورے دوسو سال تک یہی تعلیم پورے برصغیر میں جاری رہی یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا دور آیا اور اسلامی علوم میں مزید اضافہ ہوا لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جاسکتی کہ کیا اس وقت ملتان کی علمی درس گاہیں خاموش تھیں؟ نہیں وہ اپنا کام برابر جاری رکھے ہوئے تھیں باوجود اس کے کہ مغلوں کے دور حکومت میں لاہور کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی مگر ملتان اور اس کے گرد ونواح کی درس گاہیں اسی طرح جید علماء اور صوفیا پیدا کر رہی تھیں اختصار سے کام لیتے ہوئے میں مولانا حافظ جمالؒ کی درس گاہ کا ذکر کرتا ہوں حضرت شیخ حافظ جمال ملتانی ملتان میں ہی پڑھے اور یہیں اپنی درسگاہ قائم کی اور سینکڑوں علماء اس درس گاہ سے عالم و فاضل بن کر نکلے ہیں یہاں فقط دو شخصیتوں کا ذکر کروں گا ایک مولانا عبدالعزیز پرہارسی ضلع مظفر گڑھ اور دوسرے مولانا خدا بخش ملتانی، مرقد خیر پور ٹامیوالی مولانا عبدالعزیز قریباً 34 برس کی عمر میں فوت ہو گئے تھے ان کی تصانیف کی تعداد سو سے اوپر ہے اگر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے معاشیات اور سیاسیات کا شعبہ لے لیا جائے تو علمی لحاظ سے بعض علماء کی رائے ہے کہ مولانا عبدالعزیز شاہ ولی اللہ سے علوم میں وافر

حصہ رکھتے ہیں مصر کے علماء مولانا کی کتابوں کے حوالے دیتے ہیں موجودہ دور کے مصری عالم ابوزہرہ، جن کی تصانیف علمی طور پر تسلیم شدہ ہیں وہ بھی اپنی کتابوں میں مولانی کا کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں مولانا عبدالعزیز جملہ علوم وفنون میں علامہ اجل تھے دہلی اور لکھنؤ سے ان کے پاس مسائل آتے تھے اور وہ حل کرتے تھے مولانا نے مظفر خاں اور سکھوں کا ابتدائی زمانہ پایا تھا تفسیر و حدیث سے لے کر عقائد و ادب فلسفہ و طب سے فلکیات اور نجوم جفر سے لے کر اصول فقہ تک پر آپ کی تصانیف احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مولانا خدا بخشؒ کی ذات گرامی تھی آپ نے اندرون دولت گیٹ محلہ بڑے کمہاراں درس والی مسجد جہاں بابا فریدؒ تک پڑھتے رہے ہیں برسوں قرآن و حدیث اور فقہ کا درس دیا اور طالب علموں کو روحانی تعلیم سے زینت بخشی پچھلی عمر میں خیر پور ٹامیوالی میں سکونت اختیار کی اور وہیں انتقال فرمایا آج بھی ملتان میں بریلوی اور دیو بندی عقائد کی درس گاہیں اسلامی علوم کا گہوارہ ہیں اور پورے پاکستان سے نہیں دوسرے اسلامی ممالک سے بھی طالب علم علوم اسلامیہ کی تکمیل کے لیے آتے ہیں۔

(چند رآب - علامہ عتیق فکری)



ڈاکٹر عذرا شوذب

ملتان میں اُردو مرثیہ وسلام کی روایت

مرثیہ وسلام اُردو شاعری کی وہ اصناف ہیں جن میں شاعر واقعۂ کربلا کو بنیاد بنا کر اس واقعے کے اخلاقی و اصلاحی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے سیّد الشہداء امام حسینؑ اور اُن کے رفقاء کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ یہ اصناف اُردو شاعری میں آغاز سے ہی موجود ہیں۔ صنفِ سلام کے تمام اشعار مقفی ہوتے ہیں۔ غزل کی طرح اس میں مطلع و مقطع بھی ہوتا ہے۔ پرانے شاعر عام طور پر سلام کی ردیف ''سلام'' ہی رکھتے تھے مگر اب اس قید کی پابندی ضروری نہیں۔ ''سلام'' کی فضا بطور مجموعی سوگوار نہیں ہوتی۔ جدید شعراء نے صنفِ سلام کو نئی نئی جہتوں سے آشنا کر دیا ہے۔ اُردو مرثیے کی صنف بھی مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد ایک نئی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ملتان زمانہ قدیم سے علم وادب اور تہذیب وثقافت کے بڑے مرکز کے طور پر مشہور ہے۔ سرائیکی شاعری میں سلام و مرثیے کی روایت بہت قدیم ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں اُردو شاعری کا رواج عام ہوا اور اُردو غزل و نظم، حمد و نعت کے ساتھ مرثیہ، سلام، نوحہ اور منقبت جیسی اصنافِ سخن کو بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ ذیل میں ملتان میں اُردو سلام و مرثیے کے منتخب شعراء کا نہایت مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

کشفی ملتانی:

اصل نام فقیر اللہ بخش تھا۔ 15 جنور 1902ء کو پیدا ہوئے اور ملتان کی نسبتِ خاص کے باعث ملتانی کہلائے۔ ملتان میں ان کی ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ قیامِ پاکستان سے پہلے غنچہ امروہوی کے ساتھ ہفت روزہ ''باغ و بہار ملتان'' کے ایڈیٹر رہے۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کے سلام اہلِ بیت اطہار سے والہانہ عقیدت و مودّت کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

منڈلا رہی ہے حسرت ہر سمت آسماں پر
چھائی ہوئی خزاں ہے زہراؑ کے گلستاں پر
رستے رُکے ہوئے ہیں فوجیں کھڑی ہوئی ہیں
یہ جور بے کسوں پر یہ ظلم کارواں پر

کیفی جامپوری:

کیفی جام پوری یکم اپریل 1905ء میں جام پور میں پیدا ہوئے اور 16 اکتوبر 1971ء کو ملتان میں وفات پائی۔ پیشۂ تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کے کلام میں حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم اور سرائیکی و فارسی نظم و غزل شامل ہیں۔ ایک سلام کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ ان میں کیفی جامپوری نے پرانے شعراء کی طرح ردیف بھی ''تجھ پر سلام'' ہی رکھی ہے:

اے غریب و بے نوا تجھ پر سلام
کشتۂ تیغِ جفا تجھ پر سلام
فاطمہ کے مہ لقا تجھ پر سلام
نورِ عین مصطفیٰؐ تجھ پر سلام

عزیز حاصلپوری:

عزیز حاصلپوری 31 دسمبر 1917ء کو پیدا ہوئے۔ نعت، غزل اور تاریخ گوئی میں کمال حاصل کیا۔ ان کے شعری مجموعے ''جامِ نور''، ''کشت زارِ غزل''، ''صحیفۂ نور''، ''تضمینِ مبین''، ''جمالِ نور'' اور ''اساسِ جنوں'' ہیں۔ عزیز حاصلپوری مذہبی شاعری کو پلِ صراط سے گزرنے کا عمل سمجھتے ہیں اور اس مرحلے کو کامیابی سے سَر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے سلام کے ان اشعار سے اس امر کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے:

السلام اے مہِ تابانِ شبستانِ بتول
اے حسینؑ ابنِ علیؑ سبطِ نبیؐ، جانِ رسولؐ
مظہرِ شانِ محمدؐ ہے تری ذاتِ شریف
قرۃ العینِ علیؑ جاں و دلِ جانِ بتول

ذوالفقار حیدر راغب:

1918ء میں نوگاؤں سادات ضلع مراد آباد یوپی انڈیا میں پیدا ہوئے۔ 1948ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے تو ملتان میں قیام پذیر ہوئے۔ کچھ عرصہ غزل کہی مگر بہت جلد صرف حمد و نعت اور منقبت و سلام کو اپنی شاعری کا محور بنالیا۔ ایک سلام میں میدانِ کربلا کی دھوپ کی شدت کا بیان کیا ہے:

تپش دھوپ کی وہ جو پانی اُبالے
اسی میں ہو آغوشِ زہراؑ کے پالے

شوکت رسولپوری:

15 جولائی 1918ء کو قصبہ پلول ضلع گوڑگانواں بھارت میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ملتان میں سکونت اختیار کی اور یہیں وفات پائی۔ شوکت رسولپوری نے دینی شاعری کو ہی اپنی مرکز ومحور بنایا اور حمد و نعت، منقبت، نوحہ وسلام میں طبع آزمائی کی۔ ایک سلام میں امام حسینؑ کو دینِ پیمبر کی اصل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

واللہ کائنات کا رہبر حسینؑ ہے
اصل و اصولِ دینِ پیمبرؐ حسینؑ ہے
شوکت کمال و اوج بھی تو ہیں انہی کے نام
المختصر مشیّتِ داورِ حسینؑ ہے

فدا بخاری:

اصل نام فدا حسین تھا۔ 28 اکتوبر 1918ء کو تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ شعر وسخن کا آغاز سولہ سال کی عمر سے کیا۔ غزل، نظم، سلام، قصیدہ میں طبع آزمائی کی اور آخرکار صرف مداحی اہلِ بیت کو مستقل اختیار کر لیا۔ ایک سلام میں امام حسینؑ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حسینؑ ابنِ علیؑ رازدارِ الا اللہ
حسینؑ ابنِ علیؑ لا الہ کا مطلب ہے
حسینؑ تو نے دیا ہے شعورِ آزادی
حسینؑ تیری بدولت بشریت مہذّب ہے

فدا بخاری نے ایک مرثیہ ''قمر بنی ہاشم'' کے عنوان سے کہا۔ اس مرثیے میں عام فہم تراکیب، مانوس تشبیہات اور آسان لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے:

عباسؑ ہے حیدر کی جلالت کا قرینہ
عباسؑ ہے اخلاص و مروّت کا خزینہ
عباسؑ ہے شبیرؑ کی ہاتھوں کا نگینہ
عباسؑ علمدار ہے سقائے سکینہ
عباسؑ وفادارِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے
عباسؑ علمدارِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے

مذاق العیشی:

اصل نام محمد نواز غوری 1919ء میں فیروزپور چھاؤنی مشرقی بھارت میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے

بعد سے ملتان قیام پذیر رہے، یہیں وفات پائی۔ عیش فیروزپوری کے شاگرد تھے۔ غزل، نظم، نعت، منقبت، مرثیہ و سلام میں طبع آزمائی کی۔ حضرت عباسؑ کے حال میں ایک پچیس بند کا مرثیہ کہا۔ اس مرثیے میں جدید موضوعات کو پیش کرتے ہوئے دنیا کی حقیقت بتائی ہے:

ہے یہ چڑھتے ہوئے سورج کی پجاری دُنیا
ہوسِ دولت و زر کی ہے بھکاری دُنیا
امتحاں گاہ مشیّت ہے ہماری دُنیا
کربلا عشقِ حقیقی کی ہے ساری دُنیا
سانحے ہوتے ہیں ہر روز یہاں ہوتے ہیں
کربلا والے مگر لوگ کہاں ہوتے ہیں

زائر بخاری:

سیّد عزادار حسین زائر بخاری سید پور سادات ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ نعت، منقبت، مرثیہ، سلام اور نوحہ جیسی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ملتان میں ہی وفات پائی۔ زائر بخاری نے مرثیے میں جدید انداز اختیار کیا ہے اور امام حسینؑ کی عظمت و بزرگی کا بیان اس طرح کیا ہے:

حسینؑ مقصدِ انسانیت کی روحِ جلیل
حسینؑ فدیۂ حق ہے شبیہِ اسماعیل
حسینؑ مشنِ رسالت کی زندگی تکمیل
حسینؑ وارث اطوار و آرزوئے خلیل
کوئی نہ موت نہ ایسا حیات میں ہو گا
حسینؑ سا نہ کوئی کائنات میں ہو گا

ڈاکٹر مقصود زاہدی:

ڈاکٹر مقصود زاہدی بنیادی طور پر صنفِ رباعی کے شاعر تھے مگر انہوں نے دیگر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ انہیں زبان و بیان پر کامل عبور حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے سلاموں میں کربلا کے واقعے کو حق و باطل کا معرکہ قرار دیا ہے۔

یہ رزم تھی حق و باطل کی سب نے مانا تھا
حسینؑ حق تھے وہ باطل سے ساز کیوں کرتے
حسینؑ حق پہ نہ ہوتے تو آج سارا جہاں
بُھلا کے ظلم کو بنتا یزیدیت کا حلیف

ہلالؔ جعفری:

سیّد اشرف علی جعفری 1921ء میں ریاست الور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ملتان میں قیام کیا۔ عمر کے آخری حصے میں اسلام آباد چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کی نعتوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک سلام میں عقیدت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

موتی سجا رہا ہوں حریم نگاہ میں
ہوں اشک بار یوسفِ کربل کی چاہ میں

تاباںؔ عابدی:

اصل نام شہر بانو تھا۔ 1922ء میں نوگانواں سادات یوپی بھارت میں پیدا ہوئیں اور تقسیمِ ہند کے بعد ملتان میں قیام پذیر ہوئیں۔ 16 ستمبر 2001ء یہیں وفات پائی۔ ان کے شعری مجموعے ''جلوۂ تاباں''، ''پیکرِ احساس'' اور ''جذبوں کا سفر'' کے عنوان سے سامنے آئے۔ غزل، نظم، سلام، منقبت و قصیدہ میں طبع آزمائی کی۔ ایک سلام کے دو شعر ہیں:

حسینؑ محرمِ اسرارِ زندگی بن کر
حیات و مت کا رشتہ ملا دیا تو نے
حسینؑ جھک گئے کونین تیرے قدموں پر
سر اپنا جب تہہِ خنجر جھکا دیا تو نے

شفقتؔ کاظمی:

شفقت کاظمی کی شہرت کا بنیادی حوالہ صنفِ غزل ہے۔ ان کی دینی شاعری میں ''سلام'' بھی اہم ہیں اور ان کے سلاموں میں اہلِ بیت اطہار سے گہری عقیدت موجود ہے۔ ایک سلام میں امام حسینؑ کے حضور نذرِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہر زباں پر ہے یوں تو نام ترا
کاش سمجھے کوئی پیام ترا
غیر سے ہم کو واسطہ ہی نہیں
نقش ہے لوحِ جاں پہ نام ترا

قمرؔ لکھنوی:

اصل نام سیّد قمر رضا تھا۔ 1921ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ان کا مجمو

کلام ''شامِ تنہائی'' ان کی وفات کے بعد 1990ء میں شائع ہوا۔ غزل کے علاوہ حمد و نعت اور سلام و منقبت جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ ایک سلام میں امام حسینؓ کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

مقصدِ جنگ بدل جاتا ہے کردار کے ساتھ
دل کو جیتا نہیں جاتا کبھی تلوار کے ساتھ
رُک گئے ذکرِ حسین ابنِ علی پر آ کر
حادثے جو بھی چلے وقت کی رفتار کے ساتھ

حزیںؔ صدیقی:

اصل نام عفیف الدین تھا۔ 1922ء میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد روہتک سے ملتان آئے۔ 1995ء میں یہیں وفات پائی۔ صنفِ غزل ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ ہے اور ملتان کے قادر الکلام شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ حمد و نعت بھی کہی اور سلام بھی۔ ان کے سلاموں میں امام حسینؓ کے جذبۂ ایثار کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

قربان کیا حق پہ گھرانے کا گھرانہ
کیا جذبۂ ایثار ہے کیا ظرفِ وفا ہے
ظالم کے مقابل وہ ترا نعرۂ بیباک
آزادیٔ اظہار کے دَر کھول گیا ہے

اسلم یوسفی:

1922ء میں پیدا ہوئے اور ہجرت کے بعد ملتان میں قیام پذیر ہوئے۔ غزل، نعت، منقبت، سلام، قطعہ سب میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ اسلم یوسفی نے اپنے سلاموں میں امام حسینؓ کو زیست کی تاریک راہ کا روشن چراغ قرار دیا ہے۔

کربلا اے کربلا تیرے شہیدوں کا لہو
زندہ و بیدار ہے قطرہ بہ قطرہ جُو بہ جُو
ڈوبتی نبضوں کو تحریکِ بقا نامِ حسینؓ
زیست کی تاریک راہوں میں چراغِ جستجو

اشفاق حسین خاور:

اشفاق حسین خاور یکم ستمبر 1923ء کو ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ غزل، نظم، نعت اور سلام میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کے سلام اہلِ بیتِ اطہار سے والہانہ عقیدت و محبت کا ثبوت ہیں۔

نبیؐ پہ آلِ نبیؐ پہ سلام بھیجتا ہوں
حسینؑ ابنِ علیؑ پہ سلام بھیجتا ہوں
وہ معرفت کا سمندر وہ صبر کا دریا
مَیں اُس کی تشنہ لبی پہ سلام بھیجتا ہوں

خادم رزمی:

اصل نام خاور حسین۔ یکم فروری 1932ء کو پیدا ہوئے۔ چند برس قبل کبیر والہ میں وفات پائی۔ رثائی مجموعۂ کلام ''زادِ محشر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ خادم رزمی نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ایک سلام میں امام حسینؑ کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ثبوتِ حق میں ضرورت جہاں پڑی ہے حسینؑ
وہیں حیات تجھے ہی پکارتی ہے حسینؑ
تری صدا ہے تعارف مقامِ انساں کا
دیارِ زیست میں تو صبحِ آگہی ہے حسینؑ

مجروح اکبر آبادی:

اصل نام محمود رشید تھا۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے اور ملتان میں 1972ء میں وفات پائی۔ مجروح سلام، نوحے اور مرثیے کے شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک مرثیے میں شہادت حسینؑ کے بعد ذوالجناح کی خیامِ حسینی میں واپسی کا نقشہ کھینچا ہے:

پہنچا درِ خیام پہ جس دم وہ بے قرار
سیدانیوں نے گھیر لیا آ کے ایک بار
زینب نے دیکھا حال جو بھائی کا راہوار
تڑپا جگر تو گر پڑی غش کھا کے دلفگار
بے وارثوں کا گلشنِ ہستی اُجڑ گیا
خیموں میں وا حسینؑ کا اِک شور پڑ گیا

حبیب محمد حبیب:

حبیب محمد حبیب کا مرثیہ بعنوان ''بیتِ سعادت'' 1974ء میں ملتان سے شائع ہوا۔ یہ مرثیہ جناب عباس کے حال میں ہے۔ حبیب محمد حبیب نے دینی شاعری میں جدید طرزِ احساس کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ایک

بند میں جناب عباسؑ علمدار کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عباسؑ ہے کتابِ محبت کا سرورق
یاد آ رہا ہے اس سے وفا کا سبق سبق
جلوہ فگن ہے ذہن کے مطلع پہ وہ شفق
جس سے مرے شعور کا روشن ہے ہر طبق
خدمت گزار خاص، یہ حق کے ولی کا ہے
اُم البنین کا لال ہے بیٹا علیؑ کا ہے

قتیلؔ جعفری:

قتیل جعفری بھی ملتان میں قیام پذیر رہے۔ غزل کے علاوہ نعت و منقبت و سلام بھی کہتے رہے۔ ان کے سلام کے دو شعر ہیں:

لختِ دل زہراؑ و علیؑ نوکِ سناں پر
پروردۂ آغوشِ نبیؐ نوکِ سناں پر
افشا ہوئے اسرارِ خفی نوکِ سناں پر
ناطق ہوا قرآنِ جلی نوکِ سناں پر

خادمؔ کیتھلی:

خادم کیتھلی بھی تقسیمِ ہند کے بعد ملتان میں آباد ہوئے۔ غزل، حمد، نعت، منقبت اور سلام میں طبع آزمائی کی۔ ان کے سلام عقیدت و محبت اہلِ بیت کا اظہار ہیں:

سرمایۂ جہاں ہے شہادت حسینؑ کی
گنجِ مرادِ زیست ہے عظمت حسینؑ کی
خادم وہ دل ہے لائقِ تعظیم و احترام
جس دل میں ہے بسی ہوئی اُلفت حسینؑ کی

پرواز جالندھری:

اصل نام اعجاز حسین تھا۔ 1924ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ 1949ء میں پاکستان آئے اور ملتان میں قیام پذیر ہو گئے۔ 1988ء میں وفات پائی۔ غزلوں کا ایک مجموعہ ''برگِ آ گہی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نعت، سلام اور منقبت بھی کہتے تھے۔ ان کے ایک سلام میں غمِ حسینؑ کی عظمت کا بیان ہوا ہے:

تو بھی عظیم ہے ترا غم بھی عظیم ہے
تیری رضا، رضائے بصیر و علیم ہے
نوکِ سناں پہ دوشِ محمدؐ کا شہسوار
پرواز بے نیازئ ربِّ کریم ہے

حیدر گردیزی:

محمد حیدر گردیزی ستمبر 1924ء میں ملتان میں پیدا ہوئے، 7 جون 1991ء کو وفات پائی۔ اُردو کے علاوہ سرائیکی میں بھی شاعری کی۔ ہائیکو کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ حیدر گردیزی کے مرثیوں کی تعداد پچیس سے زائد ہے۔ ان کے مرثیوں میں نادر تراکیب و تشبیہات ملتی ہیں۔ جناب عباسؑ کی ولادت کا حال ملاحظہ فرمایئے:

مولا علیؑ نے کان میں اُس کے اذان دی
جعفر کی ڈھال حمزہ کی لا کر کمان دی
اُم البنین نے اپنی شگفتہ زبان دی
زینب نے تو دُعاؤں کی چادر سی تان دی
حسنین آئے نور کا ہالہ لیے ہوئے
خوشیوں کا دل میں کوہِ ہمالیہ لیے ہوئے

بیدلؔ حیدری:

اصل نام عبدالرحمٰن تھا۔ 20 اکتوبر 1926ء کو غازی آباد ضلع میرٹھ یوپی میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد کبیروالہ ضلع ملتان میں رہائش پذیر ہوئے۔ غزل، نعت، نعت اور سلام میں طبع آزمائی کی۔ بیدل حیدری کے مرثیوں میں جدید انداز اپنایا گیا ہے۔ ان کے مرثیے نسبتاً مختصر ہوتے ہیں۔ ایک مرثیے میں واقعہ کربلا سے متعلق کہتے ہیں:

اس سانحے پہ چشمِ شرافت بھی رو پڑی
جنّ و ملائکہ کی جماعت بھی رو پڑی
پیغمبرِ خدا کی شریعت بھی رو پڑی
اکبر کی لاش پر تو مشیّت بھی رو پڑی
انسانیت کا منہ سے کلیجہ نکل گیا
زینب جو روئی گنبدِ خضرا دہل گیا

عاصی کرنالی:

اصل نام شریف احمد ہے۔ 2 جنوری 1927ء کو کرنال (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ملتان میں آباد ہوئے۔ عاصی کرنالی کا شمار ملک کے ممتاز شعراء و ادبا میں ہے۔ وہ ایک پختہ کار اور صاحبِ طرز سخنور ہیں اور ان کی متعدد شعری و نثری تصانیف شائع ہو کر ناقدین ادب سے داد حاصل کر چکی ہیں۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ایک سلام میں امام حسینؑ کی جنگ کو اصولوں کی سربلندی کے لیے کی جانے والی کاوش قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

یہی تو نکتہ ہے شبیرؑ کی شہادت میں
اُصول پر نہ کسی سے مفاہمت کیجئے
رُکوں تو آپ کے نقشِ قدم چراغ بنیں
مرے امام عطا یہ بھی منزلت کیجئے

ایاز صدیقی:

ایاز صدیقی 1932ء میں روہتک ضلع حصار میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد ملتان میں آباد ہوئے۔ حمد و نعت، غزل و سلام، منقبت جیسی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ شعری مجموعہ "نقدِ ہنر" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے سلاموں میں امام حسینؑ سے عقیدت و محبت کا رنگ جھلکتا ہے۔ شہادت حسینؑ پر ایک سلام میں اظہارِ غم اس طرح کیا ہے:

دشت میں آلِ محمدؐ کا چمن لوٹا گیا
اے فلک تجھ سے یہ منظر کس طرح دیکھا گیا
عرشِ دیں کے چاند تارے خاک و خون میں مل گئے
وہ ستم ٹوٹے زمیں پر آسماں تھرا گیا

اصغر علی شاہ:

25 فروری 1933ء کو پیدا ہوئے۔ نظم، غزل، قصیدہ، مختصر مثنوی، نعت، منقبت تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ زبان و بیان پر بھرپور گرفت رکھتے ہیں۔ ان کے سلام پر بھی عقیدت و مودّت کا رنگ گہرا ہے

منفرد نام ابدیت کا دیا رکھا ہے
جس کو شبیر نے لبردوشِ ہوا رکھا ہے
ارضِ گمنام کا شبیر کی قربانی نے
مرتبہ عرشِ معلٰی سے ملا رکھا ہے

شہر بانو نقوی:

شہر بانو نقوی 1935ء میں جگراؤں ضلع لدھیانہ (بھارت) میں پیدا ہوئیں۔ گھر کا ماحول علمی و مذہبی تھا۔ اسی ماحول کے زیرِ اثر شعر گوئی کا آغاز کیا۔ غزل، حمد و نعت اور سلام و منقبت میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ایک مرثیہ ''ماہ بنی ہاشم'' بھی کہا ہے جس کا آخری بند درج ذیل ہے:

بانو یہ بصد عجز دُعا مانگ خدا سے
اس سال زیارت کروں حضرت کی دُعا سے
اُمید بڑی ہے مجھے مولا کی عطا سے
سب کچھ مجھے مل جائے درِ آلِ عبا سے
سب کام سرانجام ہوں عباسؑ کا صدقہ
پورے مرے سب کام ہوں عباسؑ کا صدقہ

مضطر بجنوری:

اصل نام سیّد انیس حیدر زیدی ہے۔ 29 جولائی 1936ء کو پیدا ہوئے۔ رباعی، قطعہ، سلام اور نوحہ جیسی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کے سلام مودتِ آلِ محمدؐ کا نمونہ ہیں۔ ایک سلام کے دو شعر یہ ہیں:

رائیگاں ان ظالموں کے دل کا ارماں کر گئے
جان دے کر زندۂ جاوید ایماں کر گئے
دولتِ دنیا خجل ہے فیض ہے وہ آج تک
موتیوں کو خاک کے ذرّوں سے حیراں کر گئے

ثمر بانو ہاشمی:

ثمر بانو ہاشمی 1935ء میں کرنال (بھارت) میں پیدا ہوئیں۔ تقسیم ہند کے بعد ملتان میں قیام پذیر ہوئیں۔ شاعری کا شوق انہیں ورثے میں ملا۔ غزل، نعت، منقبت اور سلام میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ایک سلام میں امام حسینؑ کو انسانیت کا قافلہ سالار قرار دیتے ہوئے کہتی ہیں:

دیں کا نشاں خلوص کا معیار ہیں حسینؑ
انسانیت کے قافلہ سالار ہیں حسینؑ
پھیلی ہے ان کے دَم سے ہدایت کی روشنی
انسانیت کی قسمتِ بیدار ہیں حسینؑ

تابش صمدانی:

طفیل احمد تابش صمدانی 22 اگست 1927ء کو بیکانیر راجھستان (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کی دلچسپی حمد و نعت اور منقبت و سلام میں بہت زیادہ تھی۔ غزل بھی کہیں۔ شعری مجموعہ ''تعبیر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کے سلام میں جدید و قدیم اسلوب کی آمیزش صاف دکھائی دیتی ہے۔ 2002ء میں ملتان میں وفات پائی۔

تصور میں شہیدِ کربلا کا روئے زیبا ہے
خوشا نکھرا ہوا چمکا ہوا رنگِ تمنا ہے
رضا کی شان پیاسے ہیں وگرنہ اختیار ان کا
اُدھر قبضے میں کوثر ہے اِدھر ٹھوکر میں دریا ہے

ڈاکٹر طاہر تونسوی:

اصل نام حفیظ الرحمٰن، یکم جنوری 1948ء کو پیدا ہوئے۔ نظم و نثر میں بہت سی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی نعت اور سلام میں عقیدت کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان کے سلام کے دو اشعار ملاحظہ فرمایئے۔ ان اشعار میں غم کی جھلک موجود ہے:

منظر وہ شامِ غم کا لہو منظروں میں تھا
کرب و بلا کا عکس سبھی آئنوں میں تھا
سجاد سوگوار کے ہاتھوں میں تھی مہار
کچھ بیڑیوں کا شور انہی دائروں میں تھا

اقبال ارشد:

22 اکتوبر 1940ء کو انبالہ مشرقی پنجاب (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ غزل و نظم ان کا خاص میدان ہے۔ بچوں کی شاعری اور دینی شاعری کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سلام میں عقیدت کا انداز ملاحظہ فرمایئے:

حرفِ نوکِ سناں کربلا کربلا
سرخی داستاں کربلا کربلا
اشکِ ابرِ کرم العطش العطش
خونِ ریگِ رواں کربلا کربلا

ڈاکٹر اسلم انصاری:

30 اپریل 1940ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ غزل و نظم کے عمدہ شاعر ہیں اور ملک گیر پہچان رکھتے ہیں۔

شعری مجموعہ ''خواب و آ گہی'' شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکا ہے۔ان کی ایک عزائیہ نظم کا شعر ہے:

اقدار زندہ ہیں تو اسی داستاں سے ہیں
گوہر وفا کے سارے یمِ بیکراں سے ہیں

نوشابہ نرگس:

نوشابہ نرگس 1945ء میں سہارنپور بھارت میں پیدا ہوئیں اور بالکل کم عمری میں پاکستان آ گئیں۔نوشابہ ملتان کی خواتین شعراء میں خاص مقام رکھتی ہیں۔اصنافِ نثر میں سفرنامہ و افسانہ اور اصنافِ شعر میں غزل، نظم، نعت، منقبت اور سلام کہتی ہیں۔ایک سلام میں امامِ عالی مقام کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں:

امام سلسلۂ اصفیا کہیں اس کو
کہ تاجدارِ جہانِ وفا کہیں اس کو
ضمیرِ خاک ہے اس کے لہو سے تابندہ
چراغِ طور سرِ کربلا کہیں اس کو

حسین سحر:

اصل نام خادم حسین ہے۔12/اکتوبر 1942 کو پیدا ہوئے۔نظم و غزل، حمد و نعت، سلام و منقبت سب اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ایک سلام میں اس طرح اپنی مودّت کا اظہار کیا ہے:

دشتِ بلا میں منزلِ جاں سے گزر گئے
زندہ ہیں حشر تک جو رہِ حق میں مر گئے
خود بجھ گئے وہ ظلم کے طوفان میں سحر
روشن چراغِ عدل و مساوات کر گئے

منیر فاطمی:

اصل نام منیر حسین ہے۔11 ستمبر 1948ء کو پیدا ہوئے۔اصنافِ نظم کے ساتھ ساتھ سفرنامے بھی تحریر کیے۔ملتان میں ہی وفات پائی۔اصنافِ سخن میں غزل، نظم، گیت اور سلام کہے۔ایک سلام میں امام حسینؑ کی حریت و جاںنثاری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پھر آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے
عطا ہو حق و صداقت کا ولولہ ہم کو
یہ دورِ کرب و بلا ہے خدائے بخشندہ
حسینؓ ابنِ علیؓ کا دے حوصلہ ہم کو

ساغر مشہدی:

محمد ظفر علی شاہ ساغر مشہدی 15 مارچ 1946ء کو حاجی پور تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا آغاز 1968ء میں ہوا۔ غزل، نظم، قطعہ، رباعی، سلام، نوحہ، قصیدہ، مرثیہ، ہائیکو تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کے ایک مرثیے ''قرآنِ ناطق'' کے آغاز کا بند ملاحظہ فرمایئے:

یہ حقیقت ہے کہ انساں زینتِ کونین سے
راکبِ دوشِ فلک ہے عظمتِ کونین ہے
قاریِ لوحِ جہاں ہے قسمتِ کونین ہے
آئینۂ نورِ فطرت عشرتِ کونین ہے
طائرِ فکرِ بشر کا آشیاں ہے لامکاں
ہے پرِ جبریل سے بھی تیز تر اس کی اڑاں

ڈاکٹر محمد امین:

12/دسمبر 1946ء کو ساہیوال میں پیدا ہوئے۔ غزل و نظم کے علاوہ ہائیکو کے حوالے سے خاص پہچان رکھتے ہیں اور ملک بھر میں پہچانے جاتے ہیں۔ ایک سلام کے دو اشعار ملاحظہ فرمایئے:

حسینؑ ابنِ علیؑ پیکرِ صداقت ہے
حسینؑ حوصلہ و عزم کی علامت ہے
ہر ایک عہد کے مظلوم کی حکایت ہے
حسینؑ عظمتِ کردار کی نہایت ہے

ڈاکٹر شوذب کاظمی:

12/اگست 1958ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ تین شعری مجموعے ''ہر لفظ کے لب پر صلِ علیٰ''، ''نقشِ دوام'' اور بحضور قائد اعظم'' شائع ہو چکے ہیں۔ غزل، نظم، نعت، منقبت اور سلام میں اہلِ بیت اطہار کی محبت کا رنگ صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک سلام میں اہلِ کربلا کی ثابت قدمی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سلام اُن کربلاؑ کے بے سر و ساماں شہیدوں پر
رہے ثابت قدم جو سر کٹا کر بھی اُصولوں پر
نہیں اُترے گا سر سے قرض پوری آدمیت کے
کیا احسان جو شہ نے قیامت تک کے لمحوں پر

اُردو سلام کے درج بالا شعراء کے علاوہ اسد ملتانی مرحوم، علامہ طالوت مرحوم، آغا شیر احمد خاموش مرحوم، اُفق کاظمی مرحوم، احساس فرخ نگری محروم، شمس الاسلام عالی مرحوم، فقیر نور جعفری مرحوم، رنگیں فیروز آبادی مرحوم، میکش لکھنوی مرحوم، استاد صدیق مرحوم، طارق جامی صدیقی مرحوم، سیّد فخر الدین بلے مرحوم، حامد کرتارپوری مرحوم، آنس معین بلے مرحوم، عیش شجاعبادی مرحوم، فدا نقوی مرحوم، قاسم عدیل مرحوم، گفتار خیالی مرحوم، اطہر سلیم مسعودی مرحوم، حکیم گلچیں کرنالی مرحوم، ارمان عثمانی مرحوم، حق نواز مرحوم، طاہر فاروقی مرحوم، شفق حیدر آبادی مرحوم، صادق مصور مرحوم، زوار حسین مرحوم، اختر جعفری، عارف معین بلے، ضیا شبنمی، نور احمد غازی، انور جمال، فیاض تحسین، ممتاز اطہر، وسیم ممتاز، عذرا وحید، ماہ طلعت زاہدی، مسعود کاظمی، ذکا اللہ انجم ملغیانی، مشتاق کھوکھر، اختر معظم، خاور اعجاز، حکیم نذیر آصف خیال، عارف منصور ملتانی، سہیل عابدی، قمر رضا شہزاد، رضی الدین رضیؔ، شاکر حسین شاکرؔ، شفیق آصف رہبر صدانی، نجم الاصغر شاہیا، عظمت کمال، شارق جاوید، نوشی انجم، انیس مضطر، ضیاء ثاقب بخاری، خالد سعید قلندری، معصومہ شیرازی، شہناز نقوی، فاطمہ نقوی، شہلا نقوی، عون حسین سیّد، علی اطہر شوکت ملتان میں اُردو سلام کے اہم نام ہیں۔ ملتان میں مرثیہ و سلام کا یہ سفر جاری ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پچھلے ساٹھ برسوں میں ملتان میں اُردو مرثیے و سلام کی روایت نے اپنی جڑیں گہری کی ہیں۔ یہ اصنافِ سخن خاص تہذیبی پس منظر رکھتی ہیں اور ملتان کے اُردو شعراء ان اصناف کی آبیاری اور عروج کی کوشش میں مصروف ہیں۔

(آ گہی کے شہر میں - ڈاکٹر عذرا شوذب)



ڈاکٹر مختار ظفر

اُردو شعری روایت

(سیاسی' سماجی اور فکری پس منظر)

زندگی کی طرح فن بھی ایک نامیاتی (Organic) حقیقت ہے اور فن جس روپ میں بھی ہو' اپنے تمدنی مزاج اور تہذیبی اقدار سے متشکل ہوتا ہے۔ اس لئے ہر فنی روایت علاقے کے مخصوص تہذیبی مزاج کی جلوہ ساماں ہوتی ہے اور یہ مخصوص مزاج اس علاقے کے لوگوں کے جمالیاتی احساسات اور فکری نظریات سے متعین ہوتا ہے۔ پھر ایسا علاقہ جہاں تہذیب نے صدیوں کا سفر کیا ہو' اپنی خاص تمدنی روایات کا امین ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ملتان کی اردو شعری روایت کا بھی اپنا ایک رنگ ہے' جس میں ماضی کے تجرباتِ زندگی اور مقامی تصوراتِ حیات کے بھی نقوش ہیں اور جدید رجحانات کے پرتو بھی۔

ملتان کی شعری روایت ☆ کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ داخلی پہلو جذباتی اور فکری معنویت سے متعین ہوتا ہے جبکہ خارجی پہلو جمالیاتی اسلوب اور اظہار کی تکنیک سے۔ چونکہ اسلوب میں ذاتی سطح پر شخصی اور علاقائی سطح پر اک عہد کے ادبی و تہذیبی رجحانات منعکس ہوتے ہیں' اس لئے روایت کی تشکیل میں فکری و جذباتی معنویت کا عنصر زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ لہٰذا خطہ ملتان کی شعری روایت بھی چند متعینہ اسالیب کی پیروی کا نام نہیں بلکہ اس میں تاریخی شعور بھی شامل ہے اور تاریخی شعور میں ایلیٹ ☆☆ کے مطابق ماضی کی ماضیت (Pastness of Past) بھی شریک ہوتی ہے اور ماضی کی موجودگی کا تصور بھی۔[1]

ملتان کی ماضیت کئی رنگوں سے عبارت ہے۔۔۔۔"اس کی وسعت اور عتیقیت' جاگیردارانہ نظامِ زندگی' علمی پس منظر' مابعدالطبعیاتی نظریات"۔۔۔۔ ملتان کی قدامت کا تعین ابن حنیف ° علامہ عتیق فکری °° اور ڈاکٹر روبینہ ترین نے اپنی تحقیقات میں ۲۵۰۰ ق م سے کیا ہے اور حفیظ خان آج سے آٹھ ہزار سال قبل کا سراغ دیتے ہیں۔[۲] بعض محققین کے مطابق وادیِ دجلہ و فرات کی سمیری تہذیب ملتان کی ہم عصر تہذیب ☆ تھی لیکن ڈاکٹر مہر عبدالحق نے' ڈاکٹر رفیق مغل کے حوالے سے کہا ہے کہ' سمیرئین (سائیتھین) تہذیب دنیا کی سب سے پرانی تہذیب رہی ہے۔ اس کی کرنیں سب سے پہلے سمیر ☆☆ یعنی عراق کے شمال میں پھوٹیں' پھر قدیم ترین جغرافیائی معلومات

سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سمیر کے علاقے کی جنوب مشرقی سرحد وادیِ سندھ یعنی موجودہ پاکستان تک تھی۔ ان کے مطابق موہنجوڈارو، ہڑپہ، ڈیرہ اسماعیل خان اور نواح کوئٹہ کہ جہاں سے قدیم تہذیب کے آثار برآمد ہوئے ہیں، کو ایک (اینٹی کلاک وائز) دائرے کی سی شکل میں ملادیا جائے تو ملتان اس کا مرکز بنتا ہے۔ لہٰذا وادیِ سندھ کی ساری تہذیب ملتان کے گرد گھومتی ہے۔[۳] ڈاکٹر وزیر آغا کا بھی کہنا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کا مولد سمیر تھا اور یہ آریاؤں کی تہذیب سے قطعاً مختلف تھی۔[۴] اس لئے ملتان جو محل وقوع کے اعتبار سے ہمیشہ وادی سندھ کا مرکز رہا ہے اسی سمیرئین تہذیب سے وابستہ تھا۔ ان تحقیقی آرا سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ملتان وادی سندھ کا مرکز رہا ہے اور وادی سندھ دنیا کی قدیم ترین تہذیب شمار ہوتی ہے۔ پیر حسام الدین راشدی نے بھی شاید اسی لئے کہا کہ ملتان جو تاریخی واقعات اور حوادث کا منبع ہے اس کے تہذیبی رشتے اور تمدنی عناصر پاتال تک ہیں۔[۵]

علمی اعتبار سے بھی ملتان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ یہ قبل از بعثتِ رسول اکرمؐ اور بعد، دونوں مرحلوں میں علم وفضل کا مرکز رہا ہے۔ طوفانِ نوح کے بعد، یہاں کے حکمران ہرنا کشپ کے سب سے چھوٹے بیٹے ''پرہلاد''° کا مندر توحید پرستی کا بھی مرکز تھا اور ہندوؤں کے لئے یونیورسٹی کی بھی حیثیت رکھتا تھا۔ منوجی°° کو بھی اسی درسگاہ کا تعلیم یافتہ تصور کیا جاتا ہے۔[۶] اسلام کے بعد ملتان کو علمی گہوارہ بنانے میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مدرسہ بہائیہ کا بڑا کردار ہے جو اقامتی یونیورسٹی کے طور پر مختلف علوم وفنون کا مرکز تھا اور جس کے علم وفن کی کرنیں بیرونی دنیا میں دور دور تک پہنچی تھیں۔ اس مدرسے کے مقابلے میں ناصر الدین قباچہ نے ''دارالعلوم'' قائم کیا جہاں منطق وفلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔[۷]

وادیِ سندھ کی تہذیب مراجاً گادری تھی اس لئے اس کے عوام کے اعتقادات جادو کی رسوم پر بھی مشتمل تھے۔ ان کی ساری زندگی پر گنڈا، تعویز، ٹونے، ٹوٹکے، جنتر منتر چھائے ہوئے تھے۔ آج کے پاکستانی معاشرے میں وادی سندھ کے یہ عناصر بہت حد تک موجود ہیں۔ وزیر آغا کا بھی کہنا یہ ہے کہ پاکستانی کلچر کا کچا مواد وہی ہے جو آج سے تقریباً پانچ چھ ہزار پہلے وادی سندھ کی تہذیب میں موجود تھا۔[۸] ''سندھ میں اردو'' کی مصنفہ ڈاکٹر شاہدہ بیگم کا بھی یہی موقف ہے کہ اس تہذیب میں جادوٹونے اور ارواح کو اہمیت حاصل تھی۔[۹] اس وقت یہاں جو اقتصادی نظام رائج تھا اس میں حکمران طبقے کے استحصال کا شکار زراعت، تجارت اور صنعت وحرفت سے وابستہ عام محنت کش تھے جو زوال پذیر بدھ مت کے پیروکار تھے۔ کسان جو اس غیر فعال جاگیردارانہ نظامِ معیشت کا سب سے اہم عنصر تھا، محکومانہ طرزِ زیست میں جکڑا ہوا تھا۔[۱۰] گویا اسلام کی آمد سے پہلے یہاں کی سوسائٹی جاگیردارانہ نظامِ معیشت کی بنیاد پر ذات پات اور طبقاتی درجوں میں منقسم تھی۔ اس قسم کے نظامِ زیست کو سخت قوانین کی جبری پابندیوں پر ہی قائم رکھا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں جو طرزِ احساس جنم لیتا ہے وہ جبریت کے خوف سے لرزاں ہونے کی بنا پر معاشرتی روایات کی سختی سے پابندی کو ہی عزت وشرف کا معیار سمجھتا ہے۔ اس لئے یہاں آزاد خیالی اور عقلی رویے جنم نہ لے سکے اور طبقۂ زیریں کے مظلوم لوگ، دنیا کی بے ثباتی اور ذات کی نفی کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کے اسیر ہوگئے جس

سے یہاں کلاسیکی طرزِ احساس نے جنم لیا۔

محمد بن قاسم ☆ کی آمد اور اس کے ساتھ اسلام کے مساواتِ انسانی کے تصورات کی اشاعت سے یہاں کے مفلوک الحال انسان کو جاگیرداروں اور برہمنوں سے نجات ملی۔ کسانوں کو خدا کی زمین پر مالکانہ حقوق مل گئے [۱۱] مگر بعد میں مسلمان بھی یہاں کے پرانے جاگیردارانہ نظامِ زیست کا شکار ہوگئے جس نے پھر طبقاتی رویوں کو جنم دیا۔ سلطان محمود غزنوی ☆☆ کے حملوں سے لے کر سلطنت مغلیہ کے دور تک یہاں امن و امان درہم برہم رہا۔ ان حالات میں معروضیت کے بجائے داخلیت کے رجحانات پنپنے لگے۔ آرزوؤں کی پائمالی نے یہاں کے انسان کو اپنی بے بضاعتی اور زندگی کی بے ثباتی کے تصورات کا اسیر کردیا۔

مغلیہ دور تک ملتان کی صدیوں کی وسعتیں سمٹ کر ایک صوبے میں محدود ہوگئیں جو جغرافیائی اور سیاسی طور پر ملتان، دیپال پور، بھکر، تھٹہ، چار سرکار اور اٹھاسی پرگنوں پر مشتمل تھا اور ملتان اس صوبے کا ہیڈکوارٹر تھا۔[۱۲] سولھویں صدی عیسوی میں اکبرِ اعظم نے مغلیہ سلطنت کی قدرتی خطوط پر حد بندی کی تو اس نے وادی سندھ کو ملتان اور تھٹہ دو الگ صوبوں میں تقسیم کر کے ملتان کو پنجاب میں شامل کرلیا۔ اورنگزیب نے جب انتظامی آسانی اور لسانی بنیادوں پر مملکت مغلیہ کو اکیس صوبوں میں تقسیم کیا تو پنجاب کے بھی دو حصے ہوگئے۔[۱۳]

مغلوں کے عہدِ حکومت میں بھی تجارتی، دفاعی اور حربی حوالے سے اس کی خاص اہمیت کے پیشِ نظر مغل شہزادے یہاں کے صوبیدار مقرر ہوتے رہے۔ شاہجہان کا بڑا بیٹا مراد بخش یہاں صوبیدار رہا۔ خود اورنگزیب عالمگیر ۱۶۴۱ سے دو سال تک یہاں گورنر رہا۔[۱۴] ملتان کی یہ Strategic اہمیت بیرونی ترکتازیوں کا سبب بنی رہی۔ کبھی یہ مغلوں کے زیرِ نگیں رہا، کبھی ایرانیوں اور افغانیوں کے اور کبھی سکھوں اور انگریزوں کے، یہاں تک کہ آزادی کی صبح طلوع ہوئی اور وادی سندھ کی قدیم و عظیم تہذیب سمٹ کر ایک چھوٹے سے ڈویژن کی شکل اختیار کرگئی۔

اسی سیاسی مدوجزر کی بنا پر یہاں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہوئی جس کے طرز احساسات پر مابعدالطبعیاتی تصورات غالب تھے، اس لئے یہ صدیوں کے جاگیردارانہ نظام کی طبقاتی درجہ بندیوں اور ملوکانہ اور آمرانہ نظاموں کے تحت جبری قوانین کا پابند رہا۔ پیر حسام الدین راشدی ☆ کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہزاروں انقلابات آئے مگر اس شہر کی محکم اور مستحکم روایات کی بنیادیں جوں کی توں قائم رہیں۔[۱۵]

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں صوفیائے کرام کے ایک طویل سلسلے نے احترامِ انسانیت کے رویوں سے اسلام کی اشاعت کی۔ علمی مراکز قائم کر کے اسلامی و فنی تعلیمات سے یہاں کی تیرگیوں کو روشن کیا اور یوں ایک اسلامی تمدن کی تشکیل کی۔

صوفی اور شاعر میں یوں بھی قدرِ مشترک ہے۔ وہ بھی شاعر کی طرح اشیا کے باطنی اور روحانی رشتوں کی تلاش کرتا ہے کیونکہ دونوں کا طرزِ احساس معروضی اور تجریدی ہونے کی وجہ سے داخلی اور تجسیمی ہوتا ہے اور یہی تمثیلی و تجسیمی طرزِ احساس کلچر کی بنیاد بنتا ہے۔[۱۶] چونکہ ملتان کے اسلامی کلچر کی تشکیل میں صوفیائے کرام نے بنیادی رول

ادا کیا تھا اس لئے سماجی انتشار اور معاشی محرومیوں کے تناظر میں صوفیاء کی تزکیۂ نفس کی تلقین نے یہاں کے روایتی معاشرے کے داخلی طرزِ احساس کو اور مستحکم کیا۔ اس سے راضی بہ رضائے الٰہی کے رویوں نے جنم لیا۔ انہی رویوں نے یہاں کے انسان کو سماجی روایات کی پابندی اور مابعد الطبعیاتی تصورات کی اسیری پر قانع کر دیا۔

حسن عسکری ☆ نے فرانس کے مسلمان اور صوفی رنے گینوں (عبدالواحد یحییٰ) کے حوالے سے کہا تھا کہ روایتی ادب اور روایتی فنون صرف روایتی معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں اور روایتی معاشرہ وہ ہے جو مابعد الطبعیات ☆☆ کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔ مابعد الطبعیات (Metaphysics) سے مراد وہ شے ہے جو طبعیات یا موجودات سے ماورئی ہو۔ اس کا روایتی مفہوم وہ علم یا سائنس ہے جو ہستی کو اس کی عینی شکل میں بیان کرنے کی سعی کرتی ہے۔ یہ ان اصولوں کو دریافت کرتی ہے جو کائنات کے بنیادی اصول (کلیاتِ اولیٰ) ہوتے ہیں۔

پھر روایت کا تعلق مابعد الطبعیاتی اصولوں سے اس لئے بھی ہے کہ ان اصولوں کے ساتھ حقیقت کا ایک واضح تصور منسوب ہوتا ہے اور حقیقت کا تصور چونکہ ایک ہے اس لئے اصلی اور بنیادی روایت بھی ایک ہے۔[17] یعنی روایت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ابنِ عربی کے تصورات کی بھی پہلی شرط یہ ہے کہ روایت بدل نہیں سکتی۔[18] ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی ایلیٹ کے حوالے سے ادبی روایت کے جو مفاہیم متعین کئے ہیں ان کے مطابق یہ اظہار کے اس تسلسل کا نام ہے جو ہر دور کے انقلابات سے متاثر ہو کر بھی اصل سے جدا نہیں ہوتی۔[19] اس حوالے سے دیکھنا یہ ہے کہ ملتان کی ادبی (شعری) روایت نے کیا رنگ اختیار کیا اور اپنے سماجی نظامِ فکر اور روایات کے حوالے سے اس کی کس طرح تشکیل ہوئی۔

ملتان کے صوفیاء میں سہروردیہ ☆☆☆ مکتب فکر نے طریقت پر شریعت کی بالادستی پر اصرار کر کے یہاں کے سماج میں کلاسیکی مزاج کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کیا۔ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی راسخ الاعتقادیت کے دفاع، طریقت کے مقابل میں شریعت کی بالادستی پر زور اور اس ضمن میں عقل پسندی، انسان دوستی اور رواداری سے گریز، عقیدہ پرستی اور دنیاوی معاملات میں مکمل شرکت نیز آزادخیالی اور انحراف پسندی کے خاتمے کے رویوں نے یہاں کے سماج میں کلاسیکی مزاج کی مزید تشکیل اور فروغ میں مدد دی۔ ۔۔۔۔ اس کے مقابلے میں بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ ☆☆☆☆ کا نظام فکر عقلیت پسندانہ رجحانات پر مشتمل تھا۔ عمومی صوفیانہ رواج کے برعکس وہ انسانی عقل کی ہمہ گیری اور عظمت کے قائل تھے۔ انھوں نے جس جماعت خانے کی بنیاد رکھی وہ فعال اور تخلیقی مرکز تھا اور انسان دوستی کے آدرش کو برقرار رکھنے کا واحد ذریعہ بھی۔[20] یہی وہ دو بنیادی فکری رویے ہیں جن کی بناء پر دینی و لادینی یا کلاسیکی اور ترقی پسندانہ طرزِ احساس پیدا ہوئے کیونکہ سجاد ظہیر ☆ کی رائے کے مطابق ترقی پسندی کے عقائد میں رواداری، عقلیت پسندی اور ہر انسان کی آزادیٔ ضمیر کا احترام شامل ہے۔[21] ۔۔۔۔ جب کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے خلفاء نے بھی روحانی ترقی کے لیے شریعت کی پابندی پر زور دیا اور مادی و روحانی معاملات میں مرتب اور مسلمہ قواعد کی پابندی کو لازمی قرار دیا، نیز کلاسیکی اندازِ نظر کے لیے زندگی کی مادی ضرورتوں کے جس احساس کی

ضرورت تھی اسے بھی قائم رکھا۔ یہی وہ مابعد الطبعیات تھی جس کی بنیاد ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق قرآن مجید ہے۔[۲۲]

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے راسخ الاعتقادیت کی طرزِ فکر کا جو بیج بویا تھا اور جس کی آبیاری اُن کے سلسلہ سہروردیہ کے خلفاء نے کی تھی، اس نے شیخ احمد ☆☆ سرہندی کے اکبر کے الحادی فکر سے تصادم کے اثرات قبول کئے۔ تب ملتان کے ایک بے باک اور جید عالم جلال الدین ملتانی نے بھی اکبر کے اس الحادی طرز فکر کی مخالفت کی۔ وہ اس وقت آگرہ کا قاضی تھا۔ اسی پاداش میں اُسے دکن بھیج دیا گیا جہاں سے وہ مکہ جا کر راہی عدم ہوا۔[۲۳] بعد میں اکبر کے سیکولر اندازِ فکر کے خلاف مجددی طرزِ احساس کی نمائندگی جس شہنشاہ یعنی اورنگزیب عالمگیر نے کی تھی وہ بھی ملتان میں دو سال تک صوبیدار رہ چکے تھے۔ ظاہر ہے ملتان کی راسخ الاعتقادیت کی فضائیں انھیں بھی راس آئی ہوں گی۔

حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے خلفاء نے بھی انھیں قوتوں سے اپنی ذہنی وابستگی رکھی جنھوں نے راسخ الاعتقادیت کے احیاء اور کلاسیکی رویوں کی ترویج کے لیے کام کیا۔ حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کو صوفیائے متفلسفین میں سے اسی صوفی دانشور (شیخ شرف الدین یحییٰ منیری) سے خاص لگاؤ تھا جسے ہندوستان میں مسلم راسخ الاعتقادیت کے احیاء کی تحریکوں کا نظریہ ساز قرار دیا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے وحدۃ الوجودی میلانات سے اسلامی رجحانات کو متمیز کیا تھا اور اسلام کے تصورِ توحید اور فلسفۂ عبودیت کو اُجاگر کیا تھا۔ شیخ احمد سرہندی، اورنگزیب عالمگیر، شاہ ولی اللہ اور علامہ محمد اقبال کی تعلیمات میں شیخ منیری کے اثرات واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔[۲۴]

شیخ احمد سرہندی کی اسی دینی تحریک کو شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان نے نیا خون دیا تھا۔ یہی تحریک دیو بند کے مدرسہ کی صورت میں مشعلِ راہ بنی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ ☆ اور حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کے فکری دھاروں میں مماثلت کے ساتھ عملی مشابہت کے پہلو بھی ہیں۔ ایک نے ملتان کو تاتاریوں کی دست برد سے محفوظ رکھا اور دوسرے نے اسلامی ثقافت کے تحفظ کے لیے احمد شاہ ابدالی کو مدد کی دعوت دی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جس صحیح روحانیت کا ذکر کیا ہے[۲۵] وہ دونوں میں موجود تھی کیونکہ یہ دین و دنیا کے توازن سے وجود میں آئی تھی۔۔۔۔ تاہم حضرت بہاء الدین زکریا ☆☆ ملتانیؒ کی روحانیت نے کلاسیکی طرز عمل کو ہی رواج دیا۔

انیسویں صدی میں سہروردیہ خانقاہی نظام کے زوال پر چشتیہ سلسلے نے قیادت کا علَم اُٹھایا۔ اگرچہ اس کے سوتے ملتان ہی سے حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے فکر و نظر سے پھوٹے ہوئے تھے تاہم انیسویں صدی میں ملتان کے اس سلسلے کی فکری و عملی جہت ایک حد تک ولی اللہی انداز و طرزِ عمل سے وابستہ نظر آتی ہے۔ حضرت شاہ جمال نے اسلامی اقدار کے تحفظ و فروغ کے لیے جو تین طریقے (ہدایت و تبلیغ، درس و تدریس اور باطل قوتوں کے خلاف عملی جہاد) اختیار کیے[۲۶] ان کی بنیاد پر یہ دینی تحریک گو شاہ صاحب کی ''فک کل نظام'' کی طرح ہمہ گیر انقلاب کی داعی تو نہ تھی لیکن اصلاحی اور دفاعی ضرور تھی۔ آپ کے خلیفہ خواجہ خدا بخش نے مدرسہ رحیمیہ میں شاہ ولی اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا اور شاہ جمال کے ہمراہ سکھوں کا مقابلہ میدان جنگ میں کیا۔[۲۷] اسی فکر کا چراغ شاہ محمد سلیمان

تونسوی ⭘ کی صورت میں جلتا رہا۔ آپ ولی اللہی تحریک کے مجاہد اعظم سید احمد بریلوی کے ہم عصر تھے۔

اگرچہ صدیوں کے تاریخی عمل نے اس مکتبہ فکر پر راسخ الاعتقادیت کے گہرے اثرات مرتب کیے تھے اس کے باوجود انیسویں صدی میں چشتیہ سلسلے کے اولین تخلیقی دور کی نمایاں خصوصیات برقرار رہیں یعنی انسان دوستی، رواداری، وسیع المشربی، وسعت خیال اور سماع۔[۲۸] یہی وہ زمانہ تھا جب سکھوں کی چیرہ دستیوں سے ملتان کی تہذیبی اور تمدنی قدریں تباہی کا شکار ہوئیں، مگر ۱۸۴۹ء میں جب پنجاب انگریزی مقبوضات میں شامل ہوا تو اہل ملتان نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ سکھ دور حکومت نے انھیں خوف، دہشت اور بربریت کے سوا کچھ نہ دیا تھا لیکن جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا شعلہ بھڑکا تو اہل ملتان جذباتی اور ذہنی سطح پر اس جذبۂ انقلاب سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ جنگِ آزادی کے بارے میں سرعام تذکرے ہونے لگے۔ پوسٹ آفس کے پاس دیسی سپاہیوں کے جمگھٹے اور خطوط کے انتظار میں بے صبری کے مظاہرے اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ انھیں تحریک میں شرکت کے لیے کسی سگنل کا انتظار تھا۔ انگریز سرکار کی احتیاطی تدابیر اور حفاظتی انتظامات میں بھی ''بغاوت'' کا انکشاف ہوا اور اس پاداش میں ایک صوبیدار اور دس جوانوں کو پھانسی دی گئی۔[۲۹] یوں حریت اور آزادی کی جو شمع یہاں روشن ہونے والی تھی بجھ کر رہ گئی۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر کے اُسے فکرِ نو سے آشنا کیا۔ مثلاً دہلی ☆ کالج کے قیام کا مقصد ہندوستانی عوام کو جدید علوم سے آراستہ کرنا اور ان کے قدیم اندازِ فکر اور راسخ اعتقادات پر جدیدیت کے اثرات مرتب کرنا تھا۔[۳۰] اسی کے فکری اثرات نے نئے سماجی نظام کی تشکیل میں مدد دی جبکہ علم و فضل کا قدیم گہوارہ، ملتان اس نوع کے افکار و نظریات اور جدید مذہبی رجحانات سے نابلد رہا کیونکہ سکھوں نے اپنے دور حکومت میں جو علمی شمعیں گل کر دی تھیں وہ دوبارہ جل نہ سکیں۔ پھر انگریزوں نے بھی یہاں جدید علوم کی کوئی درسگاہ نہ کھولی۔ یہی وجہ تھی کہ ملتان عرصے تک کلاسیکی اندازِ فکر کا اسیر رہا۔ صرف چشتیہ مکتب فکر کے صوفیاء نے آزاد خیالی، انسان دوستی اور رواداری کے جو بیج بوئے تھے وہی آہستہ رو جدیدیت کی بنیاد بنے۔ اس کلاسیکی طرزِ احساس کے تناظر میں جیلانی کامران کے یہ الفاظ مستعار لے کر کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ''ملتان کی تہذیب کلاسیکی تصوف کی کائنات ہے۔''[۳۱]

چشتیہ نظامِ فکر ☆ میں خواجہ غلام ☆☆ فریدؒ کی ذات ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی مسحور کن نواؤں نے ملتان اور اس کے نواح کی پوری فضاؤں میں گنگناہٹ کا رس گھول دیا۔ اس کے وجودی نظامِ فکر میں انسان دوستی، فرقہ بندی سے بیزاری، عقیدہ پرستی سے انحراف اور روشن خیالی جیسے امتیازی اوصاف پائے جاتے ہیں اور یہی تصورات ایک روشن خیال معاشرے کی تشکیل کے مُؤید ہیں کیونکہ یہ تصورات فرقہ پسندی کی بناء پر منافرت، تشدد پسندی اور عصبیت کے بجائے عام لوگوں کے لیے فکری آسودگی کے نقیب ہیں۔ چنانچہ سبط حسن ☆☆☆ کے مطابق یہی تصورات روشن خیالی کی بنیاد ہیں۔ ان کے بقول ہماری شعری روایت کی فکری بنیاد ہی وحدۃ الوجود کے نظریے پر استوار رہی ہے۔ اس لیے کہ اسی نظریے کے تحت پوری کائنات، عالمگیر انسانی معاشرے کی میراث بن جاتی ہے۔[۳۲] اس طرح ایک طرف خواجہ فریدؒ کی شاعری اور اس کے فکری نظام نے یہاں روشن خیالی اور رواداری کی روایت کو مستحکم

کیا اور دوسری طرف نو آبادیاتی نظام جبر کے ردعمل میں خودی اور اس کے استحکام کا بھی تصور دیا کیونکہ قاضی جاوید کے مطابق ان کی مابعد الطبعیات میں دیگر وحدت پسندوں کے برعکس فرد کی آزادی اور خود اعتمادی قائم رہتی ہے اور وہ اس لیے کہ اس صوفی دانشور کے نزدیک فرد اور خدا کے ملاپ کا آدرش اعلیٰ خودی کے استحکام اور اس کی تکمیل سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر ان کے خیالات اور شخصیت پر عہدِ فراق کا غلبہ ہے۔ اسی بناء پر ان کے صوفیانہ اور عاشقانہ دونوں قسم کے کلام میں ہجر و فراق اور اس کے کرب و اندوہ کی دردناک فضا پائی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک فرد واحد کا یہ کوئی روحانی کمال نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو ہستیِ مطلق میں ضم کر دے۔[۳۳] ان کی یہ بات خودی کے اثبات پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ خودی اور فراق کے سلسلے میں ان کے خیالات علامہ اقبال سے مماثلت رکھتے ہیں۔ خواجہ غلام فریدؒ کی وفات ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء کو ہوئی۔ اس وقت علامہ اقبال کی شاعری کا ابتدائی دور تھا۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خواجہ غلام فریدؒ نے علامہ مرحوم کے فلسفہ خودی کی فکری بنیاد پہلے رکھی۔ علامہ طالوت نے بھی یہ کہہ کر اس موقف کی تائید کی ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری کا سب سے بڑا رنگ، رجائی و پیغامی ہے اور سب سے بڑا پیغام ان کا حسن ازل کے ساتھ عشق و محبت کا پیدا کرنا ہے اور یہ وہ پیغام ہے جو بعد میں علامہ اقبال نے بھی اردو اور فارسی کے ذریعہ قوم کو پہنچایا۔ خود علامہ اقبال نے بھی فرمایا کہ جس قوم میں فرید اور اس کی شاعری موجود ہے اس قوم میں عشق و محبت کا موجود نہ ہونا تعجب انگیز ہے۔[۳۴]

ان تمام رجحانات کے باوجود یہاں کا معاشرہ معاشرہ ٹھہراؤ کا شکار رہا اور اس ٹھہراؤ کی وجہ یہاں کے نظامِ زیست کی طبقہ بندی ہے۔ یہاں کے مقتدر طبقے نے اپنے زیریں طبقے کو ہمیشہ جبر کے سائے میں رکھا۔ ان پر علم کے دروازے بند کر کے انھیں بے گانۂ شعور رکھا گیا۔ اس صورتحال میں سماجی تبدیلیوں کے تجربے کس طرح ہو سکتے تھے؟ تاہم صوفیانہ فکر کے متذکرہ دو دھاروں نے یہاں فکر و فن کے چراغ جلائے رکھے۔ ایک نے پہلے راسخ الاعتقادیت کے رویوں سے یہاں کے طرزِ احساس میں کلاسیکی مزاج کی تشکیل کی اور دوسرے نے صوفیانہ آزاد خیالی کے تصورات سے روشن خیالی اور ترقی پسندانہ نظریات کو فروغ دیا۔ چنانچہ یہی وہ علمی، روحانی اور فنی روایات تھیں جنھوں نے یہاں کے تمدن کو متشکل کرنے میں بنیادی رول ادا کیا۔ اس تمدن کے مزاج پر روایتی طرزِ احساس کی گہری چھاپ ہے۔ ان ہی رویوں کی وجہ سے یہاں کی سماجی طرزِ زیست میں پرانی روایات سے چمٹنے کا عمل جاری رہا۔ اسی وجہ سے یہ معاشرہ نئے تجربوں سے عاری رہا جس کے اثرات شعری روایت پر بھی پڑے۔ اسی بناء پر کلاسیکی شعری روایت سے جدیدیت کی طرف سفر بھی آہستہ رو رہا ہے۔ ملتان کے کلاسیکی مزاج نے بیرونی دنیا سے بھی یہی رنگ اخذ کیا۔ یہاں کے شعراء عاشقانہ شاعری میں بالعموم غالبؔ اور داغؔ سے متاثر رہے جبکہ قومی شاعری میں حالیؔ، اکبرؔ، ظفر علی خاںؔ اور اقبالؔ سے۔ اس لیے یہاں کی شاعری کا مزاج کلاسیکی روایت کا حامل رہا، بعد میں داخلی محرکات اور خارجی اثرات کے تحت یہاں کے مزاج کی تبدیلی جدید شعری روایت کے آغاز کا باعث بنی۔ اس طرح ملتان کی شعری روایت کا سفر کلاسیکی انداز سے جدیدیت کی طرف مقابلتاً بہت آہستہ رو رہا۔



حواشی

☆ روایت(Tradition): ادب کی دنیا میں "روایت" سے وہ ماضی مراد ہے جو لکھنے والے کو ورثے میں ملا ہو اور جس کی طرف وہ اپنی رہنمائی کی غرض سے رجوع کر سکتا ہے اس سے ادبی محاسن کی مختلف جہات سے شناسائی حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس ادبی ماضی میں بہت کچھ شامل ہے مثلاً زبان کے پیرائے' اصناف' ہیئت' صنائع بدائع' دینی' ثقافتی اور اخلاقی اقدار' کائنات کے ادنیٰ و اعلیٰ ترین مظاہر کو سمجھنے سمجھانے کے زاویے وغیرہ۔ (منتخب ادبی اصلاحات' ص ۳۰۴) مزید تفصیل حاشیے میں نمبر ا کی ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

☆☆ T.S. Eliot: (1888-1965) An American English Poet, , Play-writer and critic ------ a leader of modernist movement in literature. (Some details are in context)

o ابنِ حنیف مرحوم: مورخ' صحافی اور دانش ور۔ اصل نام مرزا ظریف بیگ۔ والد کا نام مرزا محمد حنیف بیگ۔ حصار (انڈیا) کے پروردہ۔ قیامِ پاکستان کے بعد بالآخر ملتان میں مقیم ہو گئے۔ "امروز" ملتان کے سب ایڈیٹر رہے۔ تاریخی تحقیق کا بہت بڑا حوالہ تھے۔ بھولی بسری کہانیاں۔ تخلیقِ کائنات۔ مصر کی قدیم مصوری۔ دنیا کا قدیم ترین ادب اور مصر کا قدیم ترین ادب' معروف تصانیف ہیں۔ موخرالذکر دونوں کتابوں پر ہجرہ ایوارڈ اور اکادمی ادبیات نے اول انعام سے نوازا۔

oo عبدالمجید' علامہ عتیق فکری: (۱۵ جولائی ۱۹۱۷ء۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۸۶ء) محقق' مورخ اور ادیب۔ پیشہ زردوزی' سندھ تھیٹریکل کمپنی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(گزشتہ سے پیوستہ) اور ریڈیو پاکستان ملتان سے وابستہ رہے۔ ماہنامہ "سبیل" اور ماہنامہ "جرس" بھی شائع کرتے رہے۔ رسالہ "آستانۂ زکریا" ملتان اور ہفت روزہ "تقاضے" کے مدیر رہے۔ بیشتر کتابوں کے مصنف ہیں۔ انسان اور خدا۔ ملتان کا سماجی اور ثقافتی ارتقاء۔ العتیق العتیق۔ نقشِ ملتان جلد اول و دوم کے علاوہ بہت سی تصانیف کیں۔

☆ انسائیکلوپیڈیا' مسلم انڈیا (طلوعِ اسلام سے پہلے) پہلی کتاب زیرِ ادارت سید قاسم محمود' ص ۲۴' الفیصل لاہور ۲۰۰۶ء

☆☆ سمیریئن: قدیم بابل کے ایک ضلع "سمیر" کے رہنے والے قدیم باشندوں کو (سائیتھین) "سمیریئن" کہا جاتا ہے۔ مصر' بابل اور نینوا کے باشندے اپنے آپ کو سام بن نوح کی اولاد سمجھتے تھے اس لیے وہ سامی النسل کہلاتے تھے۔ ان میں عبرانی' آرامی' عرب اور اسیری شامل تھے۔ ان کے برعکس انھوں نے غیر سامی النسل لوگوں کو اپنے سے الگ سمجھتے ہوئے "سمیریئن" کا نام دے دیا جو ایک علاقائی نام ہے۔ سمیر کے لوگوں نے اعلیٰ درجے کی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ علم الآثار کی جدید ترین تحقیقات سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ دنیا کی اولین تہذیب و تمدن کا مرکز و منبع

مصر نہیں بلکہ سمیر تھا۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے پاکستان کے آثار قدیمہ کے نامور محقق مرزا ابنِ حنیف اور رفیق مغل جیسے ماہرین کی مساعی جمیلہ کے حوالے سے کہا ہے کہ سمیر کی تہذیب میں اور ہڑپہ، رنگیل پور، ڈیرہ اسماعیل خان سے کوئٹہ کے نواح تک اور پھر پتن منارا اور اس کے اردگرد کے اثری مقامات سے لے کر موہن جوداڑو اور کوٹ ڈیجی تک براستہ بلوچستان جو تہذیبی اثرات ملے ہیں ان میں ایسی مماثلت اور یکسانی ہے جو دونوں تہذیبوں کو ایک ہی ماخذ سے منسلک کرتی ہے۔ (ڈاکٹر مہر عبدالحق، تھل، ص ۶۳، ۶۴، لوک ورثہ اشاعت گھر، اسلام آباد)

o پرہلاد بھگت: ملتان کے راجہ حرن کشاب ست جگ کا بیٹا تھا۔ ہندو اساطیر کے مطابق حرن کشاب کو برہما نے وچن دیا تھا کہ وہ امر ہوگا اور اس پر زمین، پانی اور آگ، دن اور رات کے دوران میں کوئی بددعا، زہر، ہتھیار اور جادو اثر نہیں کرے گا۔ اس پر راجہ نے رعایا کو حکم دیا کہ وہ اسے خدا مانتے ہوئے سجدہ کریں لیکن پرہلاد نے باپ کی سختی کی پروانہ کی اور پرم وشنو کی پرارتھنا کرتا رہا۔ راجہ کے ظلم وستم بھی بیٹے کو اپنی راہ سے نہ ہٹا سکے۔ آخرکار راجہ نے سونے کا ایک ستون تعمیر کرا کے اسے آگ سے گرم کرنے کا حکم دیا اور پرہلاد کو اس سے باندھ دیا تاکہ یہ خدا پرست جل کر راکھ ہو جائے۔ مگر اس ستون سے نارستھ اوتار ایک شیر کی صورت میں نمودار ہوا۔ کشاب کا پیٹ چاک کیا اور بیٹے کو تخت نشین کر دیا۔ پرہلاد کے مندر کے نقوش ملتان کے قلعہ کہنہ پر موجود ہیں۔ (سید محمد لطیف۔ ملتان کی قدیم تاریخ، ص ۳۲، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۶ء) مزید تفصیلات حفیظ خاں کی ''مآثرِ ملتان'' (جلد اول) میں ص ۳۶ تا ۵۶ ملاحظہ کیجیے۔

oo منوجی: ہندوؤں میں ایک بہت بڑے فاضل کا نام جس نے دھرم شاستر بنایا۔ دھرم شاستر منوسمرتی ہندو قوانین کی مفصل تصنیف ہے۔

☆ محمد بن قاسم: (۵۷ھ/۶۹۳ء۔۔۔۷۱۵ء) جرنیل اور حکمران۔ ثقفی خاندان کا سپوت، حجاج بن یوسف کا چچا زاد، طائف میں پیدا ہوا، والد بصرے کا گورنر رہا۔ مزید تفصیل حوالہ نمبر ۱۰ کے تحت حواشی میں ملاحظہ کیجیے۔

☆☆ محمود غزنوی، سلطان: (دورِ حکومت ۹۷۷ء۔۔۔۱۰۳۰ء) افغانستان، خراسان، سیستان اور مشرقی ایران پر مشتمل عملداری، غزنی کا مہم جو اور بہادر سلطان۔ ہندوستان پر سترہ کامیاب حملے کیے۔ ۱۰۰۵ء میں ملتان کو اپنے زیرِ نگیں کیا۔ ۴ جنوری ۱۰۲۶ء کو ہندوؤں کے سب سے بڑے اور عالی مندر سومنات کو تسخیر کیا۔ ساری زندگی جنگ و جدل میں گزری۔ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت، اس کی سلطنت بحیرۂ خزر اور عراق سے دریائے گنگا تک اور بحیرۂ ارال اور ماوراالنہر سے بحیرۂ عرب، سندھ اور راجپوتانہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ (اردو انسائیکلوپیڈیا، ص ۹۱۳)

☆ حسام الدین راشدی: (۲۰ دسمبر ۱۹۱۱ء۔۔۔ یکم اپریل ۱۹۸۲ء) سندھ کے نامور مورخ، محقق، مصنف۔ ابتداء میں صحافت کو ذریعہ معاش بنایا۔ اپنے ذاتی کتب خانے میں عربی، فارسی، سندھی اور انگریزی کی نادر و نایاب کتابیں جمع کیں۔ سندھ کے اکثر فارسی مخطوطات کو ایڈٹ کر کے شائع کیا اور ان کی شہرت پوری علمی و تحقیقی دنیا تک پہنچی۔ انجمن ترقی اردو (پاکستان) اور اردو کالج کراچی کے بانیوں میں سے ہیں۔ ترقیِ اردو بورڈ (کراچی) اور مرکزی اردو بورڈ لاہور کے بھی اساسی رکن رہے۔ حکومتِ پاکستان نے ''نشانِ امتیاز'' اور ایران نے دو مرتبہ ''نشانِ

سپاس'' سے نوازا۔ (انسائیکلو پیڈیا' پاکستانیکا' ص ۴۵۳' ۴۵۴)

☆ محمد حسن عسکری: (۱۹۲۲۔۔۱۹۷۸ء) افسانہ نگار' مبصر اور نقاد' استاد اور بہت ہی قد آور ادبی شخصیت۔ متعدد کتابوں کے مرتب' مصنف اور مترجم ہیں۔ کئی افسانوی اور تنقیدی مجموعے شائع ہوئے۔ ان کے مضامین' ۲۰ ویں صدی کے اردو ادب میں گہرے علمی انہاک اور غیر معمولی تنقیدی بصیرت کی نادر مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ ان کا ادبی سفر مسلسل دریافتوں کا سفر تھا اور ان دریافتوں نے ہمارے لئے نئے خطوں اور نئی زمینوں سے آشنا ہونے کا راستہ نکالا۔ تہذیبی مسائل ہوں یا تصوف' شاعری ہو یا افسانوی ادب' موسیقی ہو یا مصوری' فنِ تعمیر ہو یا فلم اور فوٹوگرافی' عسکری صاحب کا دانش ورانہ ذہن نئے مباحث پیدا کرتا ہے۔ (''دیباچہ'' از ڈاکٹر سہیل اور پیش لفظ از ڈاکٹر آصف فرخی۔ مقالات محمد حسن عسکری مرتبہ شیما مجید' علم و عرفان پبلشرز لاہور)

☆☆ مابعد الطبعیات (metaphysics):

(According to dictionary) It is the branch of philosophy that systematically investigates first causes and then the nature of ultimate reality dealing with the nature of existance and further knowledge.

☆☆☆ سہروردیہ مکتب: یہ سلسلہ شہاب الدین سہروردیؒ سے منسوب ہے۔ مزید تفصیلات حواشی میں ۱۹ ویں نمبر کی ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔

☆☆☆☆ فرید الدین مسعود گنج شکر: (۱۱۷۳ء/۵۶۹ھ۔۔ ۷ مئی ۱۲۶۸/۶۶۴ھ) سلسلہ چشتیہ کے معروف بزرگ وصوفی اور (بقیہ اگلے صفحہ پر)

☆ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۰ فروری ۱۷۰۲۔۱۷۶۲ء): محدث' مفکر' فلسفی' مدبر اور دور رس وژن کے مالک۔ علومِ متفرقہ میں اس قدر جامعیت کے حامل عالم بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ تفسیر پر ان کی تصنیف "الفوز الکبیر فی اصولِ التفسیر" معرکے کی تصنیف ہے۔ تصوف اور فلسفے پر ان کی متعدد کتابوں میں ''حجتہ اللہ البالغہ'' کمال کی کاوش ہے۔ آپ نے دین کی ہمہ جہتی خدمت کی اور صاحبِ تجدید و اجتہاد کا مقام حاصل کیا۔ انھوں نے کارل مارکس سے پچاس سال قبل معاشی انصاف کے پروگرام کی Outline دی تھی۔ ابوالکلام آزاد (تذکرہ) میں لکھتے ہیں: وہ جو دورِ آخر کے فاتح اور سلطانِ عصر ہونے کا مقام اور قطبیتِ وقت کا درجہ (تھا)' وہ صرف اور صرف حجتہ الاسلام شاہ ولی اللہ ہی کے لئے تھا۔

☆☆ بہاء الدین زکریا ملتانی' شیخ: (۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء۔۔ ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء) ملتان میں سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم صوفی' روحانی بزرگ۔ آپ کے جدامجد مکہ معظمہ سے خراسان اور پھر ملتان میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپؒ حفظِ قرآن کے بعد خراسان چلے گئے اور سات بزرگانِ دین سے علومِ ظاہری و باطنی حاصل کیے۔ بغداد میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے خرقۂ خلافت پا کر ملتان آئے اور سلسلہ سہروردیہ کی بنیاد رکھی۔ ملتان میں آپ کا روضہ مبارک مرجع

خلائق ہے۔ (اردو انسائیکلوپیڈیا، ص ۲۴۸، ۲۴۹) مزید تفصیل آگے متن میں آئے گی

O حضرت شاہ جمالؒ اور خواجہ محمد سلیمان تونسوی: خطۂ ملتان میں تہذیبی اقدار کے تحفظ اور معاشرے کی اخلاقی اور (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(گزشتہ سے پیوستہ) روحانی اصلاح کے لئے جن باعمل صوفیاء نے دفاعی تحریک اٹھائی اس کا سرچشمہ خواجہ نور محمد مہاروریؒ چشتی نظامی تھے۔ حضرت شاہ جمالؒ اور خواجہ سلیمان تونسویؒ ان ہی کے خلیفہ تھے۔ حافظ شاہ جمال نے علم و فن کی اشاعت کے لیے ملتان میں ایک مدرسہ قائم کیا اور تین طریقوں سے اصلاح کی۔ حضرت محمد سلیمان تونسوی نے ۱۸ویں صدی کے اواخر اور ۱۹ویں صدی عیسوی کے اوائل میں معاشرتی اصلاح اور احیائے دین کے لئے قابل ذکر کام کیا۔ امراء و سلاطین، عوام اور صوفیاء و علماء کی اصلاح پر مشتمل آپ کی خدمات متنوع اور وسیع تھیں۔۔۔۔۔۔ (تاریخِ مشائخ چشت، ص ۶۰۹، ۶۱۰، حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ اور ان کے خلفاء، ص ۲۸۵)

☆ دہلی کالج: ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں نیا تعلیمی نظام رائج کرنے کے لئے جو انگریزی ادارے قائم کیے، ان میں فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دہلی کالج انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تربیت گاہ تھا۔ مولوی عبدالحق نے اسے انگریزی اثرات کا سب سے بڑا منبع قرار دیا ہے۔ اس کالج نے ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی۔ عملی طور پر اس کالج کی تین شخصیتیں تین فکری دھاروں کا سرچشمہ بنیں۔۔۔۔ مولوی مملوک علی، امام بخش صہبائی اور ماسٹر رام چندر۔ مملوک علی شاہ ولی اللہ کے دبستان کے مبلغ اور Anti-imperialist تھے۔ (آزردہ، شیفتہ اور غالب کے دوست) امام بخش صہبائی کی علمی وضع داری اور روشن خیالی کے اثرات کی مزید اشاعت مولوی ذکاء اللہ اور نذیر احمد دہلوی نے کی۔ ماسٹر رام چندر آزاد روی کے علمبردار تھے۔ یوں اس کالج نے نئی فکری بنیادیں اور نئی فکری رویے جنم دیئے۔ اسی سرچشمے سے مسلمانانِ ہند کے دو بڑے فکری دھاروں کے سوتے پھوٹے۔ دیوبند اور علی گڑھ۔ دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتوی نے مولانا مملوک علی سے استفادہ کیا تھا اور سرسید احمد خان نے بھی اسی ''کانِ نمک'' اور ''مخزنِ اسرار'' سے کسب فیض کیا تھا۔ (تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند، جلد ۸، ص ۱۷، ۹۲)

☆ چشتیہ نظامِ فکر: تصوف کا یہ سلسلہ حضرت علیؓ کی نویں پشت میں سے ایک نیک طینت ہستی خواجہ ابواسحٰقؒ (۳۷۴۔۴۵۹ء) سے منسوب ہے۔ آپ نے حسبِ حکم شیخ، خراسان کے مشہور شہر چشت میں سکونت اختیار کر لی۔ یہی نسبت اس سلسلے کی شہرت کا باعث ہے۔ برصغیر میں چشتیہ کے امام الطریق خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (۵۳۶۔۶۳۳ء) کے علاوہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۳۵)، خواجہ فریدالدین مسعود اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ (۶۳۶۔۷۲۵ء) سلسلہ چشتیہ کے معروف صوفیا میں سے ہیں۔ (ڈاکٹر محمد حسین آزاد القادری، تاریخِ مشائخِ قادریہ رزاقیہ، ورسٹائل پرنٹرز لاہور، ۲۰۰۸)

☆☆ خواجہ غلام فریدؒ: (۱۸۴۱ء۔۱۹۰۱ء) عظیم سرائیکی شاعر۔ جامع کمالات شخصیت۔۔۔ صاحب حال صوفی

، ماہرِ فنِ موسیقی، دینی سکالر، فارسی، ہندی، اردو اور سندھی زبانوں کے ماہر۔ ان کی شاعری عظیم تخلیقات میں شمار ہوتی ہے۔ دیگر تفصیل متن میں دی گئی ہے۔

☆☆☆ سید سبطِ حسن: (۱۹۱۶ء۔ ۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء) ترقی پسند دانش ور، مورخ، صحافی، ادیب، ترقی پسند تحریک کے سرخیل۔ تصانیف: شہرِ نگاراں (حیدر آباد دکن کی یادیں)، ماضی کے مزار، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، موسیٰ سے مارکس تک، نویدِ فکر، انقلابِ ایران۔ آپ کے انتقال کے بعد یہ چار کتابیں شائع ہوئیں: پاکستان میں یورشِ افکار (انگریزی) سخن در سخن (فیض کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں)، افکارِ تازہ، ادب اور روشن خیالی۔

۱۔ عابد صدیق، مغربی تنقید کا مطالعہ، ص ۱۷۶، ثاقب پرنٹرز اینڈ پبلشرز ملتان

According to T.S. Eliot, "Tradition is not solely, or even primarily, the maintenance of certain dogmatic beliefs. These beliefs have come to take their living form in the course of the formation of a tradition. What I mean, tradition involves all those habitual actions, habits and customs, from the most significant religious rites to our conventional way of greeting a stranger, which represent the blood kinship of the same people living in the same place........ It is also "a way of feeling and acting which characterizes a group throughout generations, and it must largely be unconscious," : moreover it is the means by which the vatality of the past enriches the life of the present. (Wasteland and other poems)

۲۔ O مرزا ابنِ حنیف، ''سات دریاؤں کی سرزمین''، ''تین پراسرار خطے اور ملتان'' ص ۲۳۱، کاروانِ ادب ملتان، بار اول ۱۹۸۰ء

O عتیق فکری، نقشِ ملتان، جلد اول، ص ۳۴، ۳۵، فکری اکیڈمی، ملتان ۱۹۸۲ء

O ڈاکٹر روبینہ ترین، ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ، ص ۲۴، بیکن ہاؤس، ملتان، طبع اول ۱۹۸۹ء

O حفیظ خان، مآثرِ ملتان (جلدِ اول)، ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان ۲۰۱۱ء

۳۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق، ''ملتانِ ما''، امروز ملتان، پہلی قسط ۴۔ اپریل ۱۹۸۷ء

۴۔ آزاد کوثری‘ پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں‘ ص ۲۵ ری پبلکن بکس ٹمپل روڈ لاہور‘ بار اول ۱۹۸۸ء
نیز ”ملتانِ ما“ امروز ملتان‘ پانچویں قسط ۹ مئی ۱۹۸۷ء

۵۔ پیر حسام الدین راشدی‘ ”تقریظ“ تاریخ ملتان (از مولانا نور احمد فریدی) جلد دوم‘ ص ا‘ قصر الادب‘
رائٹرز کالونی ملتان‘ بار اول ۱۹۷۷ء

۶۔ نقشِ ملتان‘ جلد اول‘ ص ۴۴۹

۷۔ تاریخ ملتان‘ جلد اول‘ ص ۷۷
ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ‘ ص ۱۳۲۔۔۔۔نیز
منشی عبدالرحمٰن‘ آئینہ ملتان‘ ص ۲۰۹ مکتبہ اشرف المعارف‘ ملتان

۸۔ پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں‘ ص ۱۴‘ ۱۵

۹۔ ڈاکٹر شاہدہ بیگم‘ سندھ میں اردو‘ ص ۲۸‘ اردو اکیڈمی سندھ‘ کراچی ۱۹۸۰ء

۱۰۔ پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں‘ ص ۸۵

محمد بن قاسم نے ایران میں کردوں کی بغاوت کو فرو کیا۔ فارس کے شہر شیراز کا گورنر مقرر ہوا۔ بلند فکر‘ بہادر نوجوان اور عادل حکمران تھا۔ حجاج بن یوسف کے حکم پر ۷۱۱ء میں سندھ پر لشکر کشی کی۔ راجہ داہر کی ساٹھ ہزار فوج کو شکست دی اور پورے سندھ پر قابض ہو گیا۔ مذہبی رواداری اور انتظامی حکمت عملی سے اس نے لوگوں کے دل جیت لیے۔ پھر وہ ملتان پہنچا اور یہاں سے آگے پنجاب و کشمیر بھی فتح کرنا چاہتا تھا کہ حجاج بن یوسف کو موت نے آن لیا اور محمد بن قاسم بنوامیہ کی گروہی عصبیت اور منتقم المزاجی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ گورنر عراق نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور ۷۱۵ء میں اسے قتل کر دیا۔
(انسائیکلوپیڈیا‘ پاکستانیکا‘ ص ۸۳۰)

محمد بن قاسم کو قید میں بہت اذیتیں دی گئیں مگر وہ ثابت قدم رہا اور اپنا مرثیہ خود لکھا۔ چند اشعار کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے ۔

اگر میں اس وقت واسط کی سرزمین میں
زنجیروں کے حوالے کر دیا گیا ہوں
اور میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں
تو کیا ہوا
میں تو اس سے پہلے فارس کے بہت سے جوانوں کو
لرزہ براندام کر چکا ہوں
اور بہت سے بہادروں کو موت کا مزہ چکھا چکا ہوں

اگر مجھے اطمینان و سکون نصیب ہوتا
تو میدانِ جنگ کو شبِ عروسی بنا دیتا
انھوں نے مجھے ضائع کر دیا
اور کیسا سورما انھوں نے ضائع کر دیا
میں ان کے لیے میدان میں
گھمسان کی جنگ کے لیے
اور محاذ پر ان کی حفاظت کے لیے
قابل قدر اثاثہ ثابت ہوتا

(انسائیکلوپیڈیا' مسلم انڈیا (طلوع اسلام کے بعد) ص ۱۳۹' ۱۴۰)

۱۱۔ پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں' ص ۸۵

۱۲۔ Dr. Ashiq Durrani, Multan Under The Afghans, P 25, Bazme Saqafat, Multan, 1981.

۱۳۔ Tara Chand, The History of Freedom Movement in India, P72, Volume 1, Book Traders, Lahore.

۱۴۔ علامہ عتیق فکری' نقشِ ملتان' جلد دوم' ص ۱۵۹' علامہ عتیق فکری اکیڈمی' ملتان ۱۹۸۷ء

۱۵۔ تاریخِ ملتان' جلد دوم' ص ۱

۱۶۔ سجاد باقر رضوی' تہذیب و تخلیق' ص ۱۷' مکتبہ ادب جدید' لاہور پہلی اشاعت ۱۹۶۶ء

۱۷۔ محمد حسن عسکری' وقت کی راگنی' ص ۱۰۸' مکتبہ محراب' لاہور' بارِ اول ۱۹۷۹ء

۱۸۔ تحسین فراقی' جستجو' ص ۱۹۵' یونیورسل بکس' لاہور' بارِ اول ۱۹۸۷ء

۱۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ' اشاراتِ تنقید' ص ۱۱۸' مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد ۱۹۸۶ء

شیخ شہاب الدین سہروردی: (شعبان ۵۳۹ھ۔۔یکم محرم ۶۳۲ھ) آپ ایران کے شہر زنجان کے مضافات میں واقع قصبہ ''سہرورد'' میں پیدا ہوئے جسے چوتھی صدی میں ابنِ حوقل نے بڑے شہروں میں شمار کیا ہے۔ سلسلۂ نسب تیرہ (۱۳) واسطوں سے حضرت صدیقِ اکبرؓ سے جا ملتا ہے۔ تصوف کی دنیا میں آپ کی حیثیت ایک عارفِ کامل اور صاحبِ کشف و کرامات کی ہے۔ آپ نے اپنے چچا شیخ ابوالنجیب سہروردی جو خود بھی متقی اور اللہ والے تھے سے کسبِ فیض کیا اور ان کی وفات (۵۶۴ھ) کے بعد ان کی مسند سنبھالی اور سلسلہ سہروردیہ کے موسسِ ثانی قرار پائے۔ آپ کے متعدد خلفاء میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ' شیخ جلال الدین تبریزیؒ' سعدی شیرازی' شیخ فرید الدین عطار اور شیخ شریف الدین سہروردی (حیدرآباد)

بھی شامل تھے۔ شیخ سعدی نے اپنی کتاب ''بوستان'' میں ان کا ذکر کیا ہے

مقالاتِ مرداں بمردی شنو نہ سعدی کہ از سہروردی شنو

(مردوں کی باتیں ایک مرد سے سنو۔ سعدی سے نہیں بلکہ سہروردی سے سنو)

شیخ شہاب الدین نے مخلوقِ خداوندی کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے متعدد کتابیں اور رسائل تحریر کیے جن میں تصوف، علم الکلام، فلاسفۂ قدیم، منزلِ سلوک معروف ہیں۔ قرآن پاک کی تفسیر کے موضوعات پر مدلل بحث کی۔ ''تاریخِ ادبیات عرب'' میں آپ کی اکیس تصانیف کا تذکرہ ہے۔ ان میں ''عوارف المعارف'' سب سے زیادہ مبسوط، مشہور اور جامع تصنیف ہے۔

مسلک کے اعتبار سے آپ کا شمار شافعیہ کے آئمہ کبار میں ہوتا تھا۔ فقہ میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ عقائد میں امام ابوالحسن الاشعری کے پیروکار تھے۔ آپ کے معتقدات اور صوفیانہ مسالک کو امام یافعی نے اپنی کتب ''نشر المحاسن'' اور ''مرہم العلل'' میں بیان کیا ہے۔ آپ کو عربی اور فارسی میں کافی دسترس تھی اور شعر خوب بھی کہا کرتے تھے۔ مثلاً

تصرمت وحشة الليالی واقبلت دولة الوصالی

وصار بالوصل لی حسوداً من كان فی هجركم رثی لی

(محبوب کے ہجر و فراق کی شبِ وحشت ختم ہوگئی اور وصل کی نعمت حاصل ہوگئی۔ تمھارے ہجر کا مارا ہر شخص مجھے دولتِ وصل حاصل ہو جانے کی وجہ سے میرا حاسد بن گیا ہے اور جو تمھارے فراق میں تھا اس نے میرا مرثیہ کہا۔)

آپ کی چار فارسی رباعیات بھی احمد رازی کی 'ہفت اقلیم'' میں منقول ہیں:۔

اے دوست! وجود و عدمت اوست ہمہ سرمایۂ شادی و غمت اوست ہمہ

تو دیدہ نہ داری کہ ببنی او را ورنہ زِقدم تا بسرت اوست ہمہ

(اے دوست! تیرا وجود و عدم سب کچھ وہی (ذات) ہے۔ تیری خوشی اور ترے غم کا سامان سب کچھ وہی ہے مگر تو ایسی آنکھ نہیں رکھتا کہ اسے دیکھے ورنہ تیرے سر سے پاؤں تک میں وہی موجود و عیاں ہے)

(حکیم شمس الدین قادری، شیخ شہاب الدین سہروردی، مرتبہ طارق محمود، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۷ء)

۲۰۔ قاضی جاوید، پنجاب کے صوفی دانش ور، ص ۹۰ تا ۹۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، طبع اول ۱۹۷۹ء

۲۱۔ سجاد ظہیر، روشنائی، ص ۳۵۰، مکتبہ دانیال کراچی، طبع دوم ۱۹۸۶ء

۲۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۱۲۹، ایسٹ پبلشرز کراچی، نیا ایڈیشن ۱۹۷۳ء

۲۳۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد، ابوالفضل (احوال و آثار)، ص ۳۷، ۳۸ (حاشیہ) ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور

۲۴۔ پنجاب کے صوفی دانش ور، ص ۱۲۳، ۱۲۴ (فٹ نوٹ)

۲۵۔ پاکستانی کلچر، ص ۱۲۹

۲۶، ۲۷۔ ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ، ص ۱۸۰، ۲۹۸، ۳۰۴

۲۸۔ پنجاب کے صوفی دانش ور، ص ۲۴۶

۲۹۔ Syed Moinul Haq, The Great Revolution of 1857, P 248.
Pakistan Historical Society Karachi, 5. 1968.

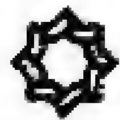
۳۰۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۲۰۲، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۱۹۸۵ء

۳۱۔ جیلانی کامران نے کہا تھا ''ہماری تہذیب کلاسیکی تصوف کی کائنات ہے'' (بحوالہ) نئی نظم کے تقاضے از جیلانی کامران، ص ۱۰، مکتبہ عالیہ لاہور، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۵

۳۲۔ سید سبطِ حسن، ''ادب اور روشن خیالی'' (مرتبہ سید احمد جعفر)، ص ۱۳۲، مکتبہ دانیال کراچی پہلی بار ۱۹۹۰ء

۳۳۔ پنجاب کے صوفی دانش ور، ص ۲۸۴، ۲۵۸، ۲۸۷

۳۴۔ عبدالرشید نسیم طالوت، ''مقدمہ'' دیوانِ فرید، ص ۱۱۰، ۴۷، عزیز المطابع، بہاول پور، ۱۹۴۳ء



وسیم ممتاز ایڈووکیٹ

گلستانِ شاعری میں ریشم دِلان ملتان

طامس گرے نے اپنے مشہورِ عالم مرثیہ میں تحریر کیا تھا کہ وہ کسی غیر معروف قبرستان میں کھڑا ہو کر سوچتا تھا کہ اِن گمنام قبروں میں نہ جانے کتنے ملٹن اور نہ جانے کتنے شیکسپیئر دفن ہیں۔ جنہیں کوئی جانتا نہیں۔ کچھ لوگ گمنام پیدا ہوئے۔ گمنامی میں زندہ رہے اور گمنامی کے سائے میں آسودہ خاک ہوئے۔ سرزمین ملتان عصرِ نو میں موجود شہروں میں قدیم ترین شہر ہے۔ ہزاروں سال کی تاریخ کا حامل یہ شہر شروع سے علم و عرفان کا مرکز رہا ہے۔ لیکن ہزاروں سال پہلے اِس خطے میں یقیناً شاعری ہوتی ہوگی۔ پرانے تذکروں میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ سنسکرت اور ہندی زبان میں اِس خطہ میں شعر و ادب کی ترویج ہوئی لیکن وہ سب شاعری معدوم ہو چکی ہے۔ اِس عہد کے شعراء گمنامی میں تہہ خاک ہو گئے۔ اگرچہ ہند میں اِسلام کی ضیاء باریوں کے ابتدائی دور کا شعر و ادب بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ لیکن یہ بات خوش آئند ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد شعر و ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ ملتان اپنی قدامت کی وجہ سے ہر عہد میں عظیم روایات کا امین رہا ہے۔ ہندوازم کے کئی معروف لوگ اِس خطہ میں شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ دریاؤں کے سنگم پر میدانی علاقے کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں علماء کا ڈیرہ رہا ہے۔ حضرت سعید الدین محمد عوفی، مولانا جامی، شیخ سعدی اور امیر خسرو نے ملتان میں قیام کے دوران جوہر پارے تخلیق کیے۔ شیخ سعدی نے شہرۂ آفاق کتاب بوستان کا بہت ساحصہ ملتان میں تخلیق کیا۔ مولانا جامی نے معروف نعت:

نسیما　جانبِ　بطحیٰ　گزر　کن
زا　حوالم　محمدؐ را　خبر　کن

شیخ الاسلام حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ کے مزار پر حاضری کے وقت تحریر کی۔ امیر خسرو نے بھی کئی شہرۂ آفاق تخلیقات کوٹلہ تولے خان کے ایک ٹیلے پر بیٹھ کر رقم کیں۔ گلستان شاعری میں ملتان کی شاعری کو مختلف ادوار میں منقسم کر کے تحقیق طلب مواد منصۂ شہود پر لایا جا سکتا ہے۔

حضرت بہاؤ الدین زکریا نے عربی اور فارسی زبان میں خوبصورت شاعری کی اور پیشانی ملتان پر سرنوشت بننے والا شعر

ملتان مابہ جنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

غوث العالمین حضرت بہاؤ الدین زکریا سے منسوب ہے ۔ اسی طرح حضرت کا لکھا جانے والا قصیدہ غوثیہ آج بھی اہلِ دل کا وظیفہ ہے ۔ گلستان شاعری میں ریشم دِلان ملتان کے تذکرہ کے لیے ضروری ہے کہ ملتان میں بولی جانے والی مختلف زبانوں اور اُن زبانوں کی اصناف سخن کے حوالے سے گفتگو کی جائے ۔ ملتان میں عہد قدیم میں سنسکرت ،ہندی اور ملتانی بولی جاتی تھی ۔ رفتہ رفتہ یہاں عربی ، فارسی ،سرائیکی ،اُردو، پنجابی، سندھی اور ہریانوی زبانیں بولی جانے لگیں ۔ ذیل میں ترتیب سے اِن زبانوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے والی عظیم شخصیات کا تذکرہ شامل تحریر کیا جارہا ہے۔

سرائیکی :۔

عظیم سرائیکی محقق ڈاکٹر مہر عبدالحق رقمطراز ہیں کہ ملتانی زبان جھونپڑیوں سے اُٹھتے ہوئے دھویں اور گندم کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی ہے ۔ سرزمینِ اولیاء ملتان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان سرائیکی ہے ۔ یہ زبان اس سرزمین میں پائی جانے والی آموں کی مٹھاس اور کھجوروں کی توانائی کی آئینہ دار ہے۔ سرزمین ملتان کی قدامت کی طرح یہ زبان بھی تابندہ روایات کی حامل ہے۔ سرائیکی زبان میں شعری اصناف میں میلادنامہ ،نورنامہ، معراج نامہ ،نعت، منظوم قصہ گوئی ، کافی ، ڈوہڑے ،مرثیے ،نوحے ، مناقب، قطعات، مثنوی، غزل، نظم، چھلا، لولی اور سہرے شامل ہیں ۔اس مرحلے پر بابا فرید گنج شکر کے شلوک اور علاوہ ازیں سہ حرفی کی اصناف کا تذکرہ بھی ضروری ہے ۔ سرزمین ملتان اور اس کے مضافات میں توانا شعری روایات کا تسلسل جاری ہے۔ لیکن راقم الحروف صرف ملتان کے چند سرائیکی ریشم دلان کا تذکرہ کرے گا۔ کیفی جام پوری فرماتے ہیں کہ تذکیہ نفس اور تطہیرِ قلب کے ذریعے قربِ الٰہی کے حصول کا نام تصوف ہے ۔ سرائیکی شاعری تصوف کے مضامین سے مالا مال ہے۔

بابا فرید الدین گنج شکر :۔

سلسلۂ چشتیہ کے عظیم رہنما حضرت بابا فرید گنج شکر 7 مئی 1280ء کو موضع کوٹھیوالا ملتان میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں بدھلہ روڈ پر موضع کوٹھیوالا موجود ہے جہاں آپ کے والد حضرت جمال الدین سلیمان کا مزار بھی موجود ہے لیکن بہت سے تذکروں میں یہ بات تحریر ہوئی ہے کہ آپ بورے والا کے قریب عظیم صوفی بزرگ دیوان چاولی مشائخ کے قریب بستی میں پیدا ہوئے اور وہیں حضرت کے والد کا مزار ہے لیکن قرائن سے یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ بدھلہ روڈ پر واقع موضع کوٹھیوالا ہی آپ کی جائے تولد ہے۔ آپ کے اشلوک زبان زدِ عام ہیں یہاں تک کہ بابا گورونانک نے بھی آپ کے اشلوک سے استفادہ کیا۔ شیخ الاسلام حضرت بہاؤ الدین زکریا حضرت بابا فرید الدین گنجِ شکر کو گاجروں کا تحفہ ارسال کرتے تھے ۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر شیخ الاسلام کو موسمِ بہار کے بیر تحفہ میں بھیجتے تھے۔ ایک مرتبہ غوث العالمین نے گاجریں ارسال نہ کیں تو حضرت گنجِ شکر نے بھی بیر نہ بھیجے ۔ غوث العالمین نے اِس بات

کی شکایت کی تو حضرت بابا فرید الدین گنج شکر نے ملتانی زبان میں شعر بھیجا۔ شعر یہ ہے۔

ہتھروں وٹوں ہتھرے تے پیروں وٹوں پیر
تساں نہ بھیجیاں گاجراں اساں نہ بھیجے بیر

حضرت شاہ شمس سبزواری :۔

حضرت شاہ شمس سبزواری 1164ء میں سبزوار، ایران میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں رہے آپ کا روحانی مقام اظہر من الشمس ہے۔ آپ کی شاعری مختلف کتب میں مرقوم ہے۔

حافظ محمود شیرانی :۔

حافظ محمود شیرانی نے سال 1054ء میں شہرہ آفاق تصنیف نور نامہ تخلیق کی جو آج بھی بہت سے لوگوں کے معمول کا وظیفہ بنی ہوئی ہے۔ اس مرحلہ پر پروفیسر شوکت مغل کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنہوں نے تلاش و جستجو کر کے نور نامہ کو اس کی اصلی شکل میں شائع کیا۔

حضرت حافظ جمال اللہ:۔

سرزمینِ ملتان میں چشتیہ سلسلے کے عظیم پیشوا حضرت حافظ جمال اللہ ملتانی کی سرائیکی کافیاں زبان زدِ عام ہیں۔ آپ کی سہ حرفی چرخہ نامہ اس قدر مقبول تھی کہ لوگ اس کے حافظ تھے۔ سہ حرفی کو اہتمام کے ساتھ بچوں بالخصوص بچیوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ اسی عہد میں ایک معروف شاعرہ بی بی مخفی بھی حضرت حافظ جمال اللہؒ سے متاثر تھیں۔ ان کی تین کتب مخفی اسرار، تعلیم النساء اور عشق حقانی کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت حافظ جمال اللہؒ کی سہ حرفی مقبول عام ہوئیں اگرچہ اس صنف میں پہلی سی حرفی حبیب جو 1080ء میں فوت ہوئے سے ملتی ہے لیکن بعد ازاں اس صنف کو حضرت حافظ جمال اللہؒ نے اجاگر کیا۔

عبیداللہ ملتانی:۔

عبیداللہ ملتانی حضرت خواجہ خدا بخش خیر پوری کے خلیفۂ مجاز اور مرید باصفا تھے۔ فارسی کے ساتھ سرائیکی زبان میں خوبصورت شاعری کی۔ آپ کی تحریر کردہ مولود شریف، ہیر رانجھا، چھریاں تے تیر سرائیکی کی معروف تحریریں ہیں۔

منشی غلام حسن شہید:

حضرت حافظ جمال اللہ ملتانی کے خلیفہ مجاز تھے۔ عربی، فارسی کی طرح سرائیکی کے بھی باکمال شاعر تھے۔ آپ کی لکھی ہوئی کافیاں آج بھی محافل سماع میں اہتمام کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ آپ عربی اور فارسی کلام میں حسن تخلص رکھتے تھے جبکہ سرائیکی کلام میں آپ نے گامن تخلص اختیار کیا ہے۔ آپ کے فارسی کلام کی ہمہ گیری کی بنیاد پر آپ کو سعدیٔ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔

مولوی خیر الدین صابر ملتانی:۔

ہر چند اس عظیم شاعر کا کلام فارسی اور سرائیکی میں آگرہ سے شائع ہوا لیکن اس دور میں ان کے دیوان نایاب ہیں۔ بہر نوع ان کی یہ کافی آج بھی مختلف مجالس میں پڑھی جاتی ہے۔

سب صورت حق دی ہے
کُل قید کے مطلق دی ہے

مضطر ملتانی:۔

1878ء میں ملتان چھاؤنی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا لکھا ہوا قصیدۂ توحید آج بھی زبان زدِ عام ہے۔ یارب ذوالجلال، بے مثل بے مثال، میڈی کیا مجال، تیڈی ثناء محال۔

اسد ملتانی:۔

آپ دسمبر 1902ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بھی اردو، فارسی، شاعری کی طرح بھرپور سرائیکی شاعری کی۔ آپ نے نعت، غزل، قطعہ اور کافی تحریر کر کے اپنا نام پیدا کیا۔ آپ کی یہ نظم ہر گھر میں پڑھی جاتی ہے۔

اے ویلھا نور حضور دا ہے
گھر گھر جلوہ طور دا ہے
ایں وقت فرشتے لہندے ہن تحفے رحمت دے گھن آندے ہن
سہرے پاک نبی دے گاندے ہن گھر گھر جلوہ طور دا ہے
اے ویلھا نور حضور دا ہے

حسن رضا گردیزی:۔

1914ء میں پیدا ہونے والے اس عظیم ریشم دل نے اردو، فارسی اور سرائیکی میں فنی پختگی سے آراستہ نظمیں کہیں، سرائیکی میں آپ کے مجموعہ ''ڈھابے ڈھوڑے'' کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق:۔

نے سرائیکی زبان کی ترویج و اشاعت میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے مصر کے شہر بوصیر کے عظیم شاعر شرف الدین بوصیری کے شہرہ آفاق قصیدہ بردہ شریف کا سرائیکی زبان میں منظوم ترجمہ کر کے خود کو امر کر دیا ہے۔ سرائیکی شاعری میں آپ کی کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔

خادم ملک ملتانی:۔

نے سرائیکی غزل کو نئی جہتیں عطاء کیں۔ آپ نے سرائیکی کی تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔

حسین سحر :

1942ء میں جلال آباد میں فیروز پور میں پیدا ہونے والے خادم حسین نے پہلے اپنا قلمی نام سحر رومانی رکھا۔ بعد میں آپ حسین سحر ہو گئے۔ 1969ء میں کیفی جام پوری نے سرائیکی شاعری کے نام سے کتاب شائع کی۔ جس

میں سحر رومانی کا تذکرہ موجود ہے۔ سحر رومانی نے ایک مکتوب کے ذریعے صاحبِ تصنیف کو لکھا تھا کہ انہیں سرائیکی میں پہلی آزاد نظم اور جدید غزل کہنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اُس کتاب میں سحر رومانی کی نظم بھی شائع کی گئی۔

امید ملتانی:۔

امید ملتانی 1920ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ شہرہ آفاق شاعر اسلم انصاری کے برادرِ اکبر تھے۔ آپ کی سرائیکی نعت کی کتاب مدنی سئیں سرکار کو صدارتی ایوارڈ مل چکا ہے۔ آپ نے بھی کمال فنی لوازمات کے ساتھ سرائیکی ڈوہڑا، غزل، نعت، قطعات، گیت، ملی نغمے تحریر کئے۔ سرائیکی مجلس کے صدر رہے اور سرائیکی طرحی غزلیات کی کتاب مینگھ ملہار ترتیب دی۔

ارشد ملتانی:۔

1924ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ سرائیکی کے صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ اردو کے بھی کمال خوبصورت شاعر تھے۔

اختر جعفری:۔

اختر جعفری عرصہ حاضر میں اردو اور سرائیکی کے صاحب طرز شاعر ہیں۔ آپ نے بھی سرائیکی غزل کو نئے جہان عطاء کئے ہیں۔

حبیب فائق:۔

1934ء میں پیدا ہوئے۔ سرائیکی شعروادب میں تحقیق کے میدان میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

اکبر ہاشمی:۔

اکبر ہاشمی نے سرائیکی زبان میں مختصر موضوعاتی نظمیں تحریر کر کے سرائیکی زبان کی وسعت میں اضافہ کیا ہے۔

اقبال حسن بھپلا:۔

1943ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے سرائیکی ڈوہڑہ اور غزل میں خوبصورت پیرائے میں طبع آزمائی کی۔

اللہ بخش یاد:۔

اللہ بخش یاد نے سرائیکی شاعری میں نظم، غزل، ڈوہڑا اور تمام اصناف سخن میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

سرائیکی شاعری کے باب میں اسلم انصاری، ممتاز العیشی، عاشق ملتانی، بہار ملتانی، جندن ملتانی، رفعت عباس، مقبول گیلانی، مشتاق کھوکھر، فدا ملتانی، ضیاء ثاقب بخاری، سلیم قیصر، عباس ملک، اشولال، مشکور قطب پوری، فرحت ملتانی، عامر فہیم، حیدر گردیزی، اے ڈی نسیم ملک، حکیم نذیر آصف خیال، خاکستر بکھروی، راشد جلیل، ابن کلیم، شاغل شیر

شاہی، منیر فاطمی، محترمہ سحر سیال، عبدالطیف بھٹی، طارق جامی، پروفیسر شمیم عارف، اکرم رونگھا، نواز سومرو، اجمل خاموش، ملک اکبر اٹھنگل، طفیل بلوچ، خالد اقبال، قمر قتالپوری، بشیر ملتانی، عالیہ انمول، فضل کمال خان بادوزئی، پروفیسر عبدالباقی، فہیم ممتاز، غفور بلوچ، عیسن شاہ بخاری نمایاں ریشم دلان ہیں۔

اردو شاعری:۔

اردو زبان برصغیر میں رابطے کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ سرزمین ملتان میں زبان اردو کی ہر دور میں بہت خدمت کی گئی ہے۔ مجھے اپنے بچپن کے ایام یاد ہیں جب ایک طرف بزمِ ضیائے ادب اور دوسری جانب بزم عیش شعروادب کی خدمت میں مصروف عمل تھیں۔ وہ زمانہ تھا جب ملتان میں حافظ مظہر الدین اور ماہر القادری ایسے نابغۂ روزگار لوگ موجود تھے۔ استاد شاعر حضرت علامہ عیش فیروز پوری بھی موسم سرما میں کوئٹہ سے ملتان آ کر قیام کرتے تھے۔ ملتان کے ادبی اُفق پر شاعروں کی ایک کہکشاں چمک اور دمک رہی تھی۔ اصناف اردو شاعری میں غزل، نظم، قطعہ، رباعی، نعت، مرثیہ، مناقب نظمیں نمایاں ہیں۔ ملتان میں اُردو غزل کے طرحی مشاعرے اور نعتِ رسول مقبول ﷺ پر تواتر کے ساتھ طرحی مشاعرے ہوئے۔ اس ضمن میں بزمِ ضیائے ادب کے لیے حضرت صابر دہلوی اور بزمِ عیش کیلئے مذاق العیشی کی خدمات کو کسی صورت فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ بزمِ نور کے لیے تابش صمدانی اور بزمِ حسان کے لیے ہلال جعفری کی خدمات بھی نمایاں ہیں۔ ملتان میں اردو ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے اُردو ادب اکیڈمی کا تسلسل کے ساتھ کام ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ سخن ورفورم، ملتان آرٹس فورم، ممتاز العیشی اکیڈمی، بزم گل، فدایانِ ادب مضرابِ سخن، سخن سرائے، ورسٹائل آرٹس فورم، انصارِ ادب، بزمِ تابش بھی مسلسل خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔

اردو غزل:۔

اردو غزل میں ملتان کی حیثیت ایک مکمل دبستان کی ہے۔ عصرِ موجود میں کوئی اس بات کی دلیل طلب کرے تو بجا طور پر پروفیسر اسلم انصاری، پروفیسر اصغر علی شاہ، پروفیسر انور جمال، ایاز صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، اختر جعفری، پروفیسر حسین، سحر اقبال، ارشد کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس تذکرے میں کرامت گردیزی، شوذب کاظمی، قمر رضا، شہزاد رضی الدین رضی، ذکا انجم ملغانی، رہبر صمدانی، شاکر حسین شاکر، نوازش علی ندیم، شارق جاوید، شفیق آصف، مسعود کاظمی، سلیم قیصر، ظہور چوہان، مرتضیٰ اشعر، ڈاکٹر خان محمد ساجد، ضیاء ثاقب بخاری، تحسین غنی، احمد رضوان، ممتاز اطہر، نوشاد قاصر، سلیم ناز، شاہد ملک، نور احمد غازی، نسیم شاہد، نبیل طور، راؤ محمد اکبر اقبال جاوید ہاشمی، شیر افگن جوہر، برزم راتی، راجہ کوثر سعیدی، عبدالرحمٰن جامی، مستحسن خیال، مرتضیٰ زمان گردیزی، ڈاکٹر یوسف تو قیر، خالد سعید قلندری حمید عاکف، سہیل عابدی، راؤ وحید اسد، سرور خلیل صمدانی، عمار یاسر مگسی، محمد اکرم انصاری، فدا ملتانی، شمس ملتانی، فہیم ممتاز، ساحل نقوی، شمشاد کوثری، افسر علی افسر اور آصف حیات شیخ، حناء شیخ اور قیصر مگسی کے اسماء گرامی بھی نمایاں ہیں۔ ماضی قریب میں کشتِ شاعری کو سیراب کرنے والے نابغۂ روزگار لوگ پروفیسر عاصی کرنالی

حزیں صدیقی، مذاق العیشی، ممتاز العیشی، حیدر گردیزی، ارشد ملتانی، پرواز جالندھری، علامہ طالوت عزیز حاصل پوری، تابش صمدانی، منیر فاطمی، اسلم یوسفی، مقبول تنویر، قمر لکھنوی، امید ملتانی، صوفی آذر ملتانی، صبوحی دہلوی، وحشت ملتانی، خادم ملک ملتانی، فرحت ملتانی، قاسم عدیل، سلیمان غنی، مرزا انور جالندھری، ظاہر کپور، تھلوی راغب، مرادآبادی، آغا صادق، صادق مصور، بربط تونسوی، عیش شجاع آبادی، مشتاق کھوکھر اور راشد نثار جعفری تھے۔

اردو کے اصناف سخن میں مختلف شخصیات نے جو نمایاں خدمات سرانجام دیں اس میں ہر شخصیت ایسی ہے جس پر سیر حاصل بحث کی جا سکتی ہے۔ اس لئے راقم نے اردو کی مختلف اصناف پر کام کرنے والے نمایاں ریشم دلان ملتان کا ذکر کا صرف اجمالی ذکر کیا ہے۔

اردو نعت:۔

نعت رسولِ مقبول ﷺ کی صنف دیگر زبانوں کی طرح اردو کی بھی مقبول صنف ہے جیسا کہ پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ ملتان کی فضاء تصوف کی آغوشِ عافیت سے نور آثار ہے۔ اس لئے ملتان میں نعت گوئی کے حوالے سے بے مثال کام ہوا ہے۔ 60 کی دہائی میں مختلف تنظیموں کی طرف سے نعتیہ مشاعرے برپا ہوتے رہے۔

70 اور 80 کی دہائی میں بزم حسان اور بزم نور کے زیر اہتمام تواتر سے طرحی نعتیہ مشاعرے برپا ہوئے جس میں حضرت عاصی کرنالی، حزیں صدیقی، مذاق العیشی، ممتاز العیشی، پروفیسر اصغر علی شاہ، تابش صمدانی، بلال جعفری، امید ملتانی، احمد دہلوی، ایاز صدیقی، استاد صدیق اور بہت سے شعراء تواتر کے ساتھ شرکت کرتے رہے۔ بعد ازاں منصور ملتانی (عارف منصور) کراچی سے ملتان ٹرانسفر ہو کر آئے تو دبستان وارثیہ اور مقصودہ بیگم ادبی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ردیفیہ مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب سالانہ ردیفیہ مشاعرہ ممتاز العیشی اکیڈمی کے اشتراک سے راقم کے غریب خانے پر منعقد ہوتا ہے۔ جس میں کراچی سے قمر وارثی، عارف منصور اور ملک کے دیگر حصوں سے مشاہیر شعراء کرام شرکت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ملتان کے متذکرہ بالا شعراء ان احمد بھی بخوبی احسن قلمبند کی ہے۔ اس سلسلے میں مشتاق کھوکھر کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں لالہ صحرائی ادبی ٹرسٹ اور بزم تابش صمدانی کے زیرِ اہتمام بھی نعتیہ مشاعرے منعقد ہوئے۔

ملتان میں رثائی ادب پر بھی لازوال کام ہوا ہے۔ علاوہ ازیں بزرگان دین، صحابۂ کرام، اہل بیت اطہاء کی مناقب بھی خوب تخلیق ہوئی ہیں۔ سلام کے سلسلے میں جناب مرتضیٰ اشعر کی مرتب کردہ کتاب س سلام اور ارشد عباس ذکی کی مرتب کردہ کتاب میر انیس سے فرتاش سید تک قابل ذکر ہیں۔ ملتان کے تقریباً تمام شعراء نے رثائی ادب میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ صحابۂ کرام کی مناقب اور اولیاء عظام کی مناقب کیلئے علامہ افق کاظمی، عزیز حاصل پوری، عاصی کرنالی، مذاق العیشی، ممتاز العیشی اور خادم کیتھلی کی خدمات نمایاں ہیں۔ اس ضمن میں کچھ عرصہ ملتان میں حافظ تونسوی بھی رہائش پذیر رہے۔ ان کی لکھی گئی مناقب کو کافی پذیرائی ملی۔

تضامین:

کسی بڑے شاعر کوخراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اُن کے کلام کو تضمین کیا جائے۔ اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت کے مکمل سلام پر جناب ہلال جعفری نے تضمین تحریر کی۔ اسی طرح مولانا حسن رضا بریلوی کے کلام پر بھی تضمین لکھی گئی۔ ہلال جعفری نے کشکول ہلال کے نام سے نعتیہ تضامین شائع کیں جن میں تقریباً ایک صد مشاہیر شعراء کے کلام پر تضمین تحریر کی گئی ہے۔ عزیز حاصل پوری نے بھی مختلف تضامین تحریر کیں۔ تضمینِ مبین کے نام سے ان کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جناب ایاز صدیقی نے بھی تضمین پر کام کیا۔ بنا بریں حضرت اُفق کاظمی نے تضمین پر نمایاں کام کیا۔ میرے والد ممتاز العیشی نے کلامِ اقبالؔ پر تضمین تحریر کی۔ رہبر صمدانی نے بھی جناب تابش صمدانی کے کلام پر تضمین تحریر کی ہے۔

تراجم:

اردو زبان میں مختلف ریشم دلانِ ملتان نے تراجم کا بھی حسین کام کیا۔ میرے والد نے اِس ضمن میں شیخ سعدی کے کلام کا منظوم ترجمہ کیا۔ اِس ضمن میں اِس عہد کا سب سے نمایاں کام پروفیسر حسین سحر کا ہے۔ جس پر جس قدر خراجِ عقیدت پیش کیا جائے کم ہے۔ اُنہوں نے قرآنِ پاک کا منظوم ترجمہ ''فرقانِ عظیم'' کے نام سے شائع کیا۔

رباعی، قطعات:

ملتان میں تقریباً تمام مشاہیر شعراء نے قطعات اور رباعی پر بھی نمایاں کام کیا ہے لیکن رباعی کے کہنے میں جناب مقصود زاہدی اپنی مثال آپ تھے۔

نظم:

ملتان میں اُردو نظم کہنے کی روایت بھی بڑی نمایاں ہے۔ جناب اسلم انصاری، جناب عاصی کرنالی، جناب اقبال ارشد، جناب رحمان فراز، جناب ڈاکٹر علی اطہر، جنابہ نوشابہ نرگس، جنابہ ماہ طلعت زاہدی، جناب اصغر شاہیہ، جناب عرش صدیقی، جناب فیاض تحسین، پروفیسر انور جمال، جناب رضی الدین رضی، جناب پروفیسر خالد سعید کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ہائیکو:

ہائیکو ایک جاپانی صنف ہے۔ جس پر ملتان کے مختلف شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ اِس صنف کو متعارف کرانے میں جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، حیدر گردیزی، اختر شمار، رضی الدین رضی اور شاکر حسین شاکر کی خدمات نمایاں ہیں۔

ملتان میں فارسی شاعری:

ملتان میں فارسی شاعری کی روایت بھی بڑی توانا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ، حضرت حافظ جمال اللہ ملتانیؒ، حضرت عبید اللہ ملتانیؒ، صابر ملتانیؒ، اسد ملتانیؒ، حضرت شاہ بخشؒ عاصی، پروفیسر اسلم انصاری

مذاق العیشیؒ"، ڈاکٹر زبیدہ صدیقی کا کلام کافی پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ حضرت خواجہ حسن شہید کا فارسی کلام اُنہیں شہرتِ دوام دے چکا ہے۔ اِس آفاقی کلام کی بنیاد پر اُنہیں ثانیٔ سعدی کہا جاتا ہے۔ اسلم انصاری کے فارسی کلام کا حکومتِ ایران نے اُنہیں سرکاری اعزاز سے نوازا اور تہران میں ایک شاہراہ کا نام اسلم انصاری سے منسوب کیا۔ پروفیسر زبیدہ صدیقی کے فارسی دیوان "**یتفجر المنہار**" کو بھی ایران میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ جنابِ اسد ملتانی کا فارسی کلام ہماری دھرتی کے لیے قیمتی اثاثہ ہے۔

ملتان میں پنجابی شاعری:

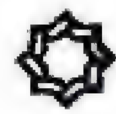
پنجابی شاعری بھی اپنے پہلو میں کئی اصنافِ سخن کی حامل ہے۔ پنجابی شاعری میں نعت، غزل، مرثیہ، نوحے، گیت، قطعات، چندرانا، لاواں، ودائی، چھلے دے گیت، ماہیے، نظم اور مثنوی کی اصناف نمایاں ہیں۔ ملتان میں پنجابی اکیڈمی نے پنجابی شاعری کے فروغ کے لیے مسلسل جدوجہد کی ہے۔ ریشم دِلانِ ملتان میں عرش صدیقی، چاچا جگ، فانی امرتسری، ولی محمد واجد، حسین سحر، پروفیسر امین، ڈاکٹر خان محمد ساجد، شفیق آصف، مشکور صابری، پروفیسر رزاق شاہد، طاہر سلیم، بیدار وارثی، لقمان ناصر اور اکرم انصاری کی خدمات نمایاں ہیں۔

ملتان میں ہریانوی ادب:

دیگر زبانوں کی طرح ملتان میں ہریانوی شاعری بھی فروغ پذیر ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جنابِ رشید روہتکی ملتان میں ہریانوی شاعری کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ اِن دِنوں جنابِ شوکت روہتکی اور اسلم قریشی کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔

گلستانِ شاعری میں اگر ریشم دِلانِ ملتان کے کارہائے نمایاں کو دیکھا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں رہے گی کہ دبستانِ ملتان کسی بڑے سے بڑے شہر کے مقابلے میں پیچھے نہیں:

علم و عرفان کا صدیوں سے رہا ہے مرکز
پھر بھی پسماندہ میرا خطۂ ملتاں کیوں ہے



حوالہ جات:

1) ضلع ملتان تاریخ، ثقافت، ادب مرتبہ پروفیسر نوید شہزاد
2) سرائیکی شاعری مرتبہ کیفی جام پوری
3) تاریخ ملتان مصنف چودھری کرم الٰہی بدر
4) سرائیکی مزاحیہ شاعری مرتبہ فیض بلوچ

(5) س سلام مرتبہ مرتضیٰ اشد

(6) میر انیس سے فرتاش سید تک مرتبہ ارشد عباس ذکی عمار یاسر مگسی

(7) ملتان عکس وتحریر مرتبہ شاکر حسین شاکر

(8) ہم زندہ لوگ ہیں مرتبہ مامون طاہر رانا

(9) مہکتے حرف شائع کردہ پریس کلب ملتان

ثقافت

عتیق فکری

سماجی اور ثقافتی ارتقا

ملتان اپنی قدامت کے لحاظ سے اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ ہڑپہ، موہن جوڈارو، اور عراق میں بابل و نینوا وغیرہ۔ یوں تو ملتان کی تاریخ کا تاریخی اظہار سکندر اعظم کے حملہ سے شروع ہوتا ہے۔ مگر اس سے بہت کچھ آگے نکل جاتے ہیں اور مٹی کی تہوں میں مدفون خزانوں سے اپنے لیے بہت کچھ تاریخی جواہر پار سے تلاش کر لیتے ہیں۔ جب ہم ان مدفون خزانوں پر نظر کرتے ہیں تو پھر ان کو سلسلۂ تاریخ کی روشنی میں لاکر اُن کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ملتان کی تاریخی قدامت اور اس کی روایتی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے ملتان قبل از مسیح 2500 سے کم نظر نہیں آتا۔ ملتان کے قلعہ کہنہ سے جو تحریری نقوش برآمد ہوئے ہیں وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ملتان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا آغاز ہڑپہ اور موہن جوڈارو کے ساتھ ساتھ ہوا تھا۔ پھر جو روایتیں ہندو ثقافت و مذہب سے وابستہ ہیں ان کی روشنی میں تو ملتان کی قدامت اور بھی مُسلّم ہو جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ملتان میں جو قوم ابتداء میں آباد تھی وہ ڈراویڈین تھی اس کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں اور وہ ایک زمانے تک یہاں اپنی تہذیبی زندگی کو ترقی دیتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے پہلے آریہ حملہ آور جو قریباً 1700 قبل مسیح پنجاب کے راستے سے پھیلے ان کا پہلا مقام میرے نزدیک ملتان اور آس پاس کے علاقے ہیں، اس کی خاص وجہ پرہلاد بھگت کی داستان ہے جو آریہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور یہ داستان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے ملتی ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں کودنا اور آگ کا سرد ہو جانا ہے۔ اُسی طرح پہلاد بھگت کو بھی آگ میں بٹھایا جاتا ہے اور وہ نہیں جلتا۔ غرض ہندو مذہب کے مطابق یہ واقعہ لاکھوں برس پہلے ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ملتان میں قدیم زمانہ سے لوگ اسے بڑا مقدس مقام سمجھ کر یہاں یاترا یعنی زیارت کے لیے آتے تھے۔ اس طرح ہم اس بات کے کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ملتان اس کرہ ارضی پر اپنی قدامت کے لحاظ سے اور اپنے خاص لسانی مزاج کے لحاظ سے انفرادیت رکھتا ہے۔

آریا کی آمد نے ملتان کو ایک نئی صورت دینی چاہی لیکن ملتان کی قدیم ڈروادیڈین آبادی نے اسے اپنے اندر جذب کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن حملہ آوروں نے انہیں ابھرنے نہ دیا اور وہ لوگ ملتان کے آس پاس

کے علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ہمیں اُن قبیلوں کا پورا پورا علم ہے۔ وہ سیاہ رنگ کے ڈراویڈی آج بھی اپنے خالص لسانی انداز میں پہچانے جا سکتے ہیں۔ گو تغیر زمانہ نے اُن میں یہ کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے مگر ہزاروں سال بعد بھی اُن میں وہ انداز کہیں نہ کہیں نمایاں ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلی صورت تو یہ ہے کہ جس طرح وہ پہلے اپنی قدیم صنعت سے تھے آج بھی ان میں وہ صنعت موجود ہے دریا کے کناروں پر یہ لوگ آباد تھے ملتان اور گردونواح کے علاقہ میں جہاں سے دریا گزرتا ہے وہاں ''لائیں'' نام کی لکڑی بے تحاشا پائی جاتی ہے یہ لوگ اس کی ٹوکریاں ،جھونپڑیاں اور دراوزے تک بناتے تھے۔ آج بھی یہ صنعت موجود ہے۔

غرض آریا حملہ آوروں نے ان کی جگہ لے لی اور اپنے ساتھ بہت سی داستانیں مذہبی رسومات اور دیوتاؤں کی پوجا وغیرہ لائے۔ اس طرح ملتان میں ڈراویڈین اور آریا ثقافت کے ملاپ سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ ایک زمانہ اس طرح گزر گیا۔ لیکن جب ہم سکندر اعظم کو ملتان پر حملہ آور پاتے ہیں تو ہمیں ملتان میں ملوہی نامی قوم کا نام ملتا ہے جو سکندر اعظم سے ملتان کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں نظر آتی ہے۔ خود مورخین کو اس بات کا اعتراف ہے کہ سکندر اعظم کو یہاں پر بڑا سخت مقابلہ کرنا پڑا اور یہیں اُسے شانہ میں تیر لگا گو زخم اچھا ہو گیا مگر اس کا زہر اثر کر گیا اور اسی زہر کے بخار سے وہ کچھ عرصہ بعد مر گیا۔

تاریخوں میں ملوہی قوم کا ذکر ہمیں 1000 قبل مسیح ملتا ہے۔ ہندوستان میں گلدہ (بہار) میں قریباً 5 قبل مسیح ملا قوم موجود تھی۔ بدھسٹ انڈیا کے مصنف نے مگدھ میں جن قوموں کا ذکر کیا ہے اُن میں ملا قوم بھی شامل اور آریا قوم اپنے وقار کے لحاظ سے بھی تسلیم شدہ تھی۔ کیونکہ قدیم ہندی رسم و رواج کے مطابق اکثر اعلیٰ قبیلوں کی سرداری تسلیم کی جاتی تھی۔ ادھر ملتان اور ساہیوال اور سانگلہ اور اس کے گردونواح میں یہ قوم آباد تھی۔ کیونکہ جب ملتان پر سکندر کا حملہ ہوتا ہے تو اس وقت ملتان پر اسی قوم کی آبادی تھی۔ اب ہمیں اس بات کا سراغ مل جاتا ہے کہ ملتان میں بدھ مذہب کا نشو نما اور تعلیمی مرکز ہونا لازمی تھا کیونکہ جب مہاتما بدھ کے اپنے شہر میں اور آس پاس کے علاقہ میں ملوہی آباد تھے اور انہوں نے بدھ مذہب کو قبول کیا تو پھر ملتان میں بدھ مت کا پھیل جانا بالکل حقیقت پر مبنی ہے جبکہ سارے ہندوستان پر مذہب کا اثر کافی سے زیادہ ہو چکا تھا اور پھر سکندر کے بعد تو اشوک اور کنشک وغیرہ نے بدھ مذہب کے پھیلانے میں پوری پوری کوشش کی۔ جب اس سے پہلے بلخ تک بدھ کے بھکشو پہنچ چکے تھے۔ ملتان میں چونکہ سورج دیوتا کی پوجا ہوتی تھی اور بدھ مذہب بالکل برہمن ازم کے خلاف ایک سماجی اور طبقاتی ردِعمل کا نتیجہ تھا اس لیے ملتان میں بدھوں نے اپنا تعلیمی مرکز قائم کر لیا اور برابر علمی مناظرے ہوتے رہتے۔ یہ سلسلہ قریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ محمد بن قاسم نے 95ھ کے قریب ملتان کو فتح کر لیا۔

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ہمیں گزشتہ دور کے ثقافتی ارتقاء کا قدرے جائزہ لے لینا ضروری ہے۔ قدیم سندھ اور بابل کے تجارتی تعلقات قبل مسیح دو ہزار سال اس طرح واضح ہیں کہ اب اس میں کسی قسم کے

شک کی گنجائش نہیں سارگون اول کے زمانہ کی جو چیزیں آثار قدیمہ سے برآمد ہوئی ہیں ان میں عمل، جس کو بابل والے سندھو کہتے تھے، ہاتھی دانت کی چیزیں، ساگوان کی لکڑی کے ساتھ ساتھ اوزان کے نام مثلاً ''من'' کا لفظ اور اسی قسم کی کافی مثالیں دستیاب ہو چکی ہیں جو خاص ڈراویڈین ناموں پر بابل وغیرہ میں پکاری جاتی تھیں۔ خود ڈراویڈین بھی تو 3000 قبل مسیح سندھ اور پنجاب میں آباد ہوئے تھے۔ جن کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ وہ عمان اور عدن وغیرہ کے راستے سے یہاں آئے تھے۔ ڈراویڈین ہی سامی رسم الخط لے کر سندھ وملتان میں رائج کرنے والے تھے۔ انہی کے ہاں طوفانِ نوح کی روایت بابل سے آئی تھی جو بعد میں مختلف انداز سے پرانوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ بابل اور یمن وغیرہ کے تجارتی تعلقات جس طرح سندھ اور ملتان کے ساتھ وابستہ تھے اس کی مثال دیگر علاقوں سے دستیاب ہوتی ہے۔ قبل مسیح 1700 سو سال سمیراس جو نینوا پر حکمران تھی۔ سندھ و ملتان پر بھی اس کا تسلط تھا۔ اس بات سے ہمیں اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ ملتان کا رابطہ بابل ونینوا سے بطور ایک سلطنت کے تھا۔ اور یہاں جو مال جاتا ہوگا وہ بطور تحائف کے بھی جاتا ہوگا۔ ان تمام شواہد کی بنا پر ہم اس بات کے کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ملتان اس وقت اپنے زمانہ کے لحاظ سے خاصا ترقی یافتہ شہر ہوگا۔ پھر دونوں طرف دریاؤں کا ہونا ایک طرف راوی اور دوسری طرف چناب، کشتیوں کے ذریعے مال کی آمد و رفت یقیناً یہ سب باتیں ایک متمدن شہر کی معاون ہو سکتی ہیں۔ سکندر سے پہلے یہاں ایرانیوں کی حکومت بھی ایک زمانہ تک رہی اور دارا کی شکست کے بعد یونانیوں کا اثر سندھ ملتان اور گندھارا وغیرہ پر پڑا۔ جب تک یونانی تہذیب کا اثر پنجاب اور ملتان پر ہوا۔ اس سے ہزار سال پہلے کالڈین (بابلی) تہذیب کے ملتان پر اثرات ہو چکے تھے۔ کیونکہ بابلی حروف تہجی جن کو ڈراویڈین یہاں لائے تھے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ ملتان سے جو خروف نکلے ہیں اُن میں سے اکثر ستاروں کی علامتیں ہیں۔ جن کو محققین نے تقابلی مطالعہ سے ثابت کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اہلِ ملتان علم ہیئت سے بھی ہزاروں سال پہلے آشنا ہو چکے تھے۔ اور وہ ان کے اثرات اور تقدس کے بھی قائل تھے۔ کیونکہ خود بابل میں بھی علم ہیئت اور ستارہ پرستی اس زمانے میں اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ ڈراویڈین یہ سب کچھ اُدھر سے ہی لائے تھے۔ ادھر خود آریا جب ملتان پر قابض ہوئے تو ان کے پاس وہی دیومالا تھی جو سارے شمالی عرب اور یونان وغیرہ میں پھیل چکی تھی۔ اس طرح ہم ملتان کے ثقافتی ارتقاء پر بیرونی اثرات کا بخوبی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ ملتان اپنے ثقافتی ارتقا میں ہزاروں سال پہلے بھی آج کی طرح عراق اور یمن وغیرہ سے تجارتی لوگوں کے ذریعے پورا پورا رابطہ رکھتا تھا اور عراق و عرب کی ثقافتی خوشبو ملتان میں بھی پائی جاتی تھی جبکہ تاجر لوگ ہزاروں سال پہلے اس ثقافتی خوشبو کے درمیان حقیقی رابطہ تھے۔ حملہ آور قومیں اور ڈراویڈین تاجر ملتان کے ثقافتی ارتقاء کے حقیقی عوامل ہیں۔

اب ہم علم ہیئت کی قدیم علامتوں کے نقوش پیش کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم ایک ایسی وضاحت پیش کرتے ہیں جس سے ہمارے تحقیقی مقاصد کی تصدیق ہوتی ہے۔ موہن جو ڈارو کے اثریاتی عجائبات سے ثابت ہوتا

ہے کہ قدیم وادیٔ سندھ کے لوگ علم ہیئت سے ضرور واقف تھے۔ بعض اشیاء پر مخصوص برجوں کی علامتیں منقش ہیں یہ اثریاتی عجائبات نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہیں۔ اسی طرح قدیم قلعہ ملتان سے برآمد شدہ منقش اشیاء کے مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نئے پتھر کے زمانہ میں پنجاب کا انسان بھی علم ہیئت و نجوم سے ہندسہ سے کافی حد تک واقف تھا۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل نشانات ہماری راہبری کرتے ہیں۔

علمِ نجوم

(ا) قدیم ملتانی حروف ( ) یہ حروف دائرۃ البروج (جوز) کی علامت ہے جو اپنے ارتقائی دور میں بدل کر آج کل راس چکر میں اس طرح رائج ہے۔

(ب) ( ) منطقۃ البروج میں چوتھے برج اسد کی یہی علامت ہے جو اپنے ارتقائی دور میں متوازیت کو بدل کر عمودی ہو گئی ہے۔ آج علم نجوم کی علامت اس چکر کی علامتوں میں " " اس طرح استعمال ہوتی ہے۔

(ج) میزان کی شکل ہے جو جدید دائرۃ البروج میں اس طرح استعمال ہوتی ہے

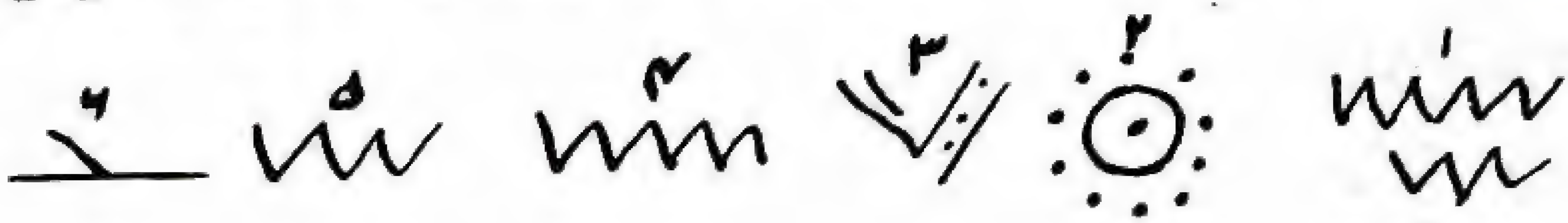
(د) جدید علمِ نجوم کے راس چکر کی علامتوں میں جمالیاتی اقدار نے اس قدیم عقرب (آٹھویں) برج کی علامت کو کافی حسین بنا دیا ہے۔ جدید علامت یہ ہے

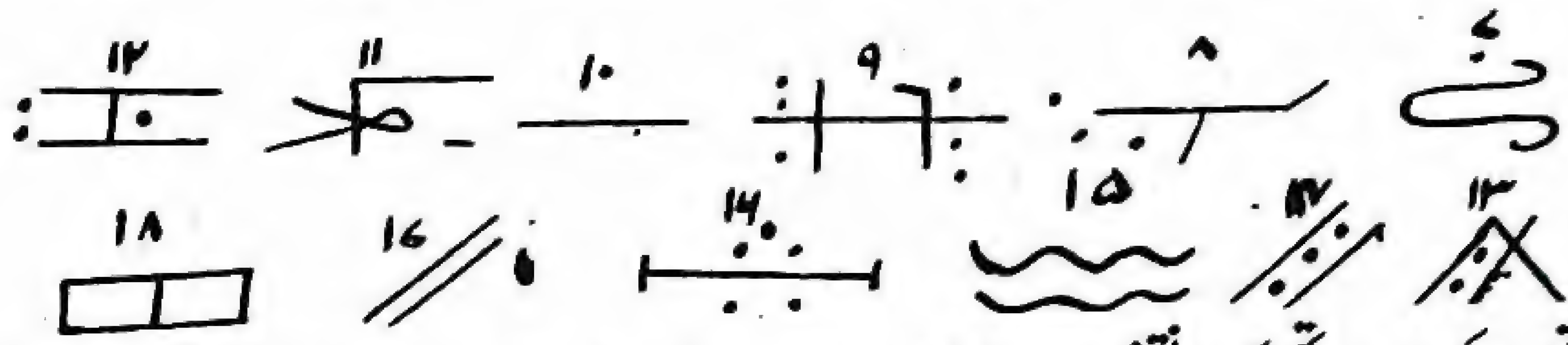
(ر) برج دلو "Aquarius" "مرد" آدمی کی قدیم علامت ہے اس دلو کی جدید علامت یہ ہے

علم ہیئت: یہ علم کواکب میں آفتاب کی قدیم ترین علامت ہے اور جدید علم ہیئت میں اس طرح استعمال ہوتی ہے ⊙ قدیم نقش کاروں نے دو قوموں کے گرد اگرد حلقہ نقاط سے آفتاب کی کرنوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسے مصوری کی سادہ شکل نہ سمجھئے بلکہ یوں سمجھئے کہ ملتان کی مٹی کے برتن بنانے والوں نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ جس طرح قوموں میں ستارہ پرستی رائج تھی اور جس ستارہ کی پوجا کرتے تھے یا جس قسم کی فطرتی قوتوں کی نسبت اُن کی طرف منسوب تھی اس کا لحاظ رکھتے ہوئے مٹی کے برتنوں پر نشان کھینچ دیتے۔ کیونکہ قدیم زمانہ مشرقی لوگوں کا اعتقاد ستاروں پر بطور صفات خالق تھا۔ یعنی فلکی ستارے صفاتِ خداوندی کا حقیقی پرتو یا حقیقی مظہر خیال کئے جاتے تھے۔ ملتان کے سفالی حروف سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہاں کے لوگ اس علم میں خاص درک رکھتے تھے۔ پاک و ہند میں علمِ نجوم کے ایسے ماہر دیکھنے میں آئے تھے کہ انگلیوں پر حساب لگا کر سورج اور چاند گرہن بنا دیتے تھے۔ غرض اہلِ ملتان علمِ نجوم وغیرہ میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔

ایک اور شہادت بھی ہمیں اس سلسلے میں مہیا ہوتی ہے، وہ یہ کہ مصر سے ایک کتاب علمِ طب کی شائع ہوئی

تھی۔ اُس کتاب کا نام ''رجوع الشیخ الی الصباح'' تھا۔ اس میں چند فلقی اثرات اوران کے نقوش بھی دیئے ہیں۔





سب سے بڑی تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ نقش جو مصری کتاب میں تھے اُن میں ملتان سے ملتے ہوئے نقش بھی تھے جن کا تعلق برجوں سے تھا۔ ان حروف کی تاثیر بھی کتاب مذکور میں بیان کی گئی ہے۔ ان حروف کے علاوہ مینخی حروف بھی اس کتاب میں موجود تھے۔ یہ حروف جن پر ہم نے نمبر دیئے ہیں ملتانی حروف سے ملتے ہیں۔

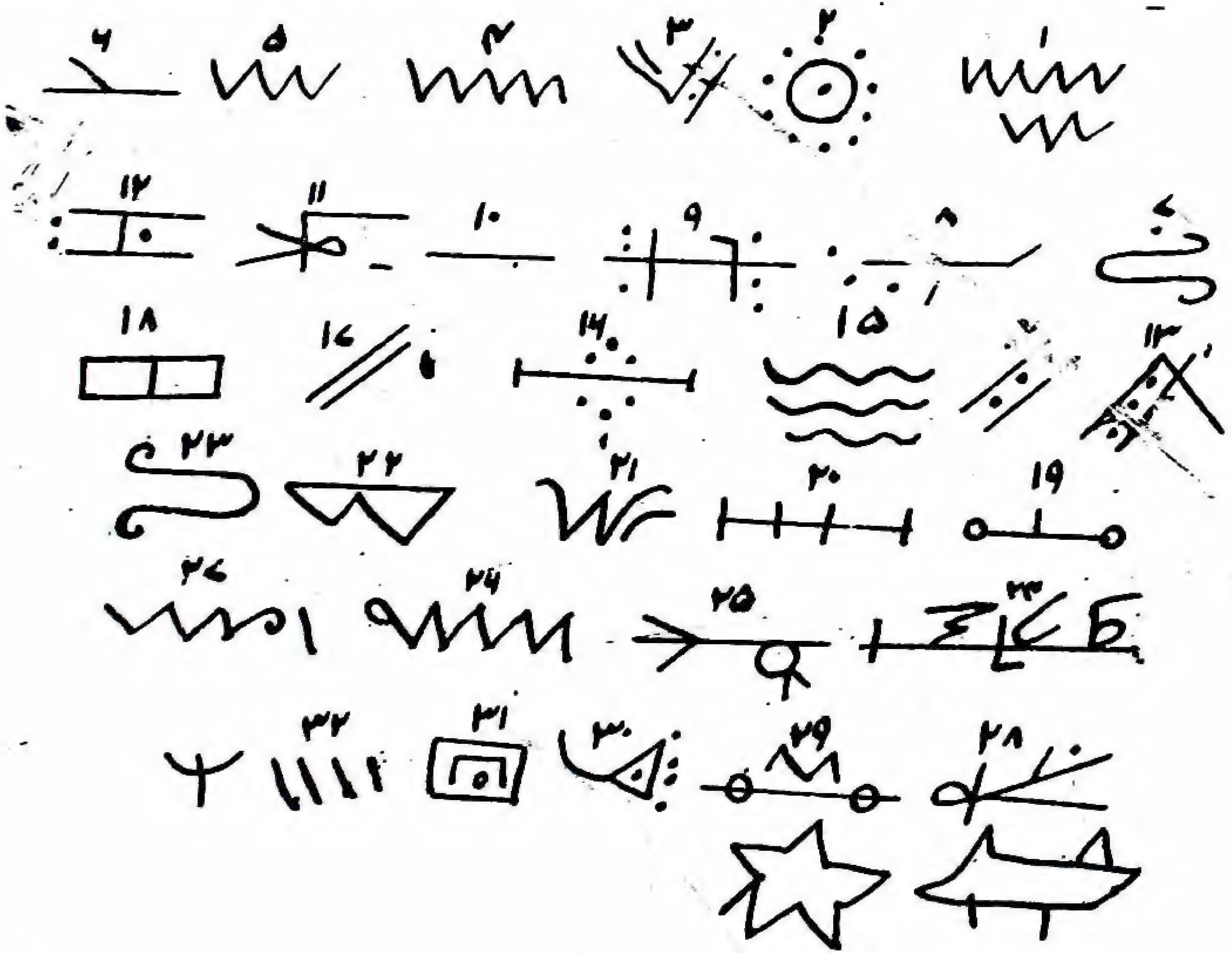
غرض ملتان سے نکلے ہوئے حروف میں سے سورج اور ستاروں وغیرہ کی علامتیں موجود ہیں۔ یہ نشان بہت سی چیزوں کی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔ مرحوم وحید اختر کی رائے ہے کہ درمیان کا نقطہ سورج کی علامت اور دونوں قوسیں مل کر جو گول دائرہ کی صورت بناتی ہیں، عطارد، قمر اور مریخ وغیرہ کی علامت ہیں جو سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں اور دیگر نقطے تمام ستاروں کی علامت ہیں۔

ساتویں صدی قبل مسیح یا آٹھویں صدی قبل کے آغاز تک سمندر کے راستے جانے والے تاجر آرین نہ تھے، بلکہ ڈراویڈین تھے جو ہواؤں کے رُخ کے ساتھ کشتیاں چھوڑ دیتے تھے۔ یہ لوگ انہی ساحلوں سے ہوتے ہوئے بابل جا پہنچتے تھے اور درآمد کی جن چیزوں کے نام یورپ میں رائج کئے گئے تھے مثلاً سلیمان علیہ السلام کا آئیوری (ہاتھی دانت) (ایپ) بے دُم کے بندر، پی کاک (مور) اور لفظ رائس (چاول) سنسکرت یا پالی زبان کے لفظ نہ تھے، بلکہ تامل زبان کے الفاظ تھے۔ وہاں یہ ڈراویڈی تاجر حروف تہجی کی کتابت سے آشنا ہوئے جو اس کتاب سے اخذ کی گئی تھی جسے سامیوں سے پہلے گورے رنگ عکاؤئین (کالڈین) نے ایجاد و استعمال کیا تھا۔ ان حروف تہجی کو پہلے خانہ بدوش سامی اقوام بابل سے مغرب، یعنی شمال مغرب اور جنوب کی طرف لے گئی تھیں۔ بعض خاص الفاظ جو ہندوستانی سوداگروں نے سیکھتے تھے۔ ان الفاظ سے حد درجہ مشابہ ہیں جو ان سامی اقوام کے کتبات میں لکھے ہوئے ملتے ہیں اور اہلِ بابل کے اوزان بھی دریافت ہوتے ہیں اور یہ دونوں اس عہد سے پہلے کے ہیں۔ جب ہندوستانی سوداگروں نے اس سرزمین پر تجارتی سفر کئے اور رسم الخط کو وہاں سے اُڑا لائے تو اسے ہندوستان کی علمی بول چال کی زبان کے مطابق بوسیع کر کے اختیار کرلیا گیا۔ تقریباً ایک ہزار بعد یہی اختیار کردہ حروف تہجی جو ہندوستان برما، سیا، لنکا میں آج تک رائج ہیں۔ براہمی یعنی لیپی ''خط بزرگ'' کے نام سے بھی یہی خط موسوم ہے، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ درمیانی وقفہ میں مثلاً راجہ اشوک کے عہد میں اس کا کیا نام رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ تمام ہندوستانی رسم الخط رفتہ رفتہ اسی سے اخذ کئے گئے ہیں گو صوری طور پر اختلاف پیدا ہوتا گیا۔ لیکن اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام ہندوستانی رسم الخط قطعاً

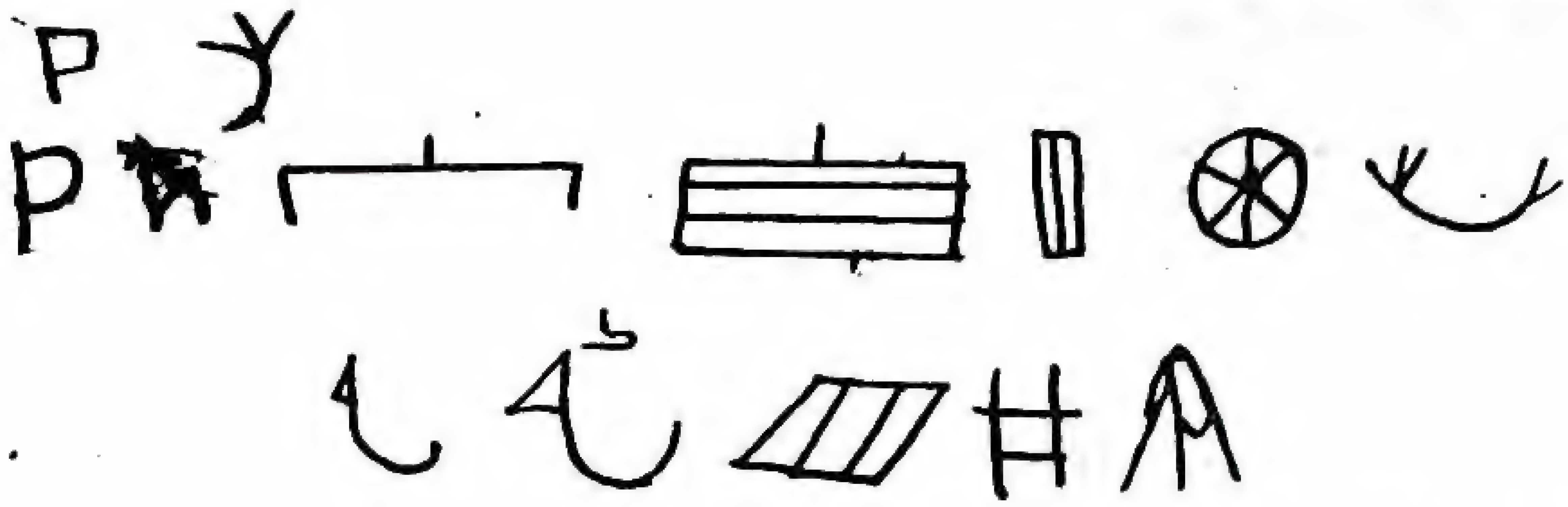
آریائی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کو متعارف کرانے والے ڈراویڈین سوداگر ہیں اگرچہ پروہتوں اور مذہبی راہنماؤں نے ہدوستانی لٹریچر کی دوسرے معنوں میں بے مثال خدمت کی لیکن چونکہ اس قسم کی ایجادیں اُن کے ذاتی مفاد کے سراسر خلاف تھیں اس لیے کہ یہ مذہبی گروہ نہ تھا بلکہ سوداگر اور بے تعصب علمی حلقے تھے کہ جن کی بدولت ہندوستان اور سندھ کے فن تحریر میں مفید اضافے اور ترقیاں ہوئیں۔

اب ہم کالڈین (بابل) حروف تہجی کے چند نقوش پید کریں گے جو چار ہزار سال قبل مسیح رائج تھے اور پھر ملتان کے پرانے قلعہ سے نکلے ہوئے وہ حروف بھی آپ کے سامنے لائیں گے تا کہ قدیم مماثلت ثابت ہو جائے۔ مزید برآں اپنی نوعیت کے حروف جنوبی ہند کے آثار قدیمہ سے بھی برآمد ہوئے ہیں جو قدیم ملتانی رسم الخط کے مشابہ ہیں۔ ملتان کا قدیم قلعہ جواب ابن قاسم باغ کے نام سے معروف ہے سطح زمین سے قریباً چالیس اور پچاس فٹ تک بلندی پر واقع ہے۔ یہ قلعہ اپنے اندر بے بہا تاریخی خزائن رکھتا ہے اس قلعہ کے اندر بعض مقام پر بڑی لمبی لمبی غاریں تھیں جو راقم نے خود مشاہدہ کی ہیں مگر اب بند کر دی گئی ہیں۔ مگر کہیں کہیں اب بھی نشان باقی ہیں۔ قریباً سولہ برس پہلے راقم اور ابن حنیف صاحب نے جن کو آثار قدیمہ سے انتہائی دلچسپی ہے ان غاروں کی وساطت سے کچھ مٹی کے مرقوم ٹکڑے برآمد کیے۔ اس سے پہلے بھی وحید اختر اور میں نے اس قلعہ سے کچھ چیزیں بڑی کاوش سے نکالی تھیں جو اب بھی وحید اختر مرحوم کے ذاتی میوزیم میں موجود ہیں۔ اور کچھ تحریری نقوش ابن حنیف کے پاس بھی موجود ہیں جن کی مکمل فہرست انشاء اللہ ''نقش ملتان قدیم وجدید'' میں پیش کی جائیں گی۔

مختصراً قلعہ ملتان سے نکلے ہوئے مٹی کے ٹکڑوں اور کھلونوں اور برتنوں پر مرقوم نشان ملاحظہ ہوں۔



مذکورہ بالا ملتان کے تحریری نقوش کو بھی آپ نظر میں رکھیں اور پھر موہن جوڈارو کے نقوش بھی سامنے رکھیں اور موازنہ کریں۔ موہن جوڈارو کے نقوش



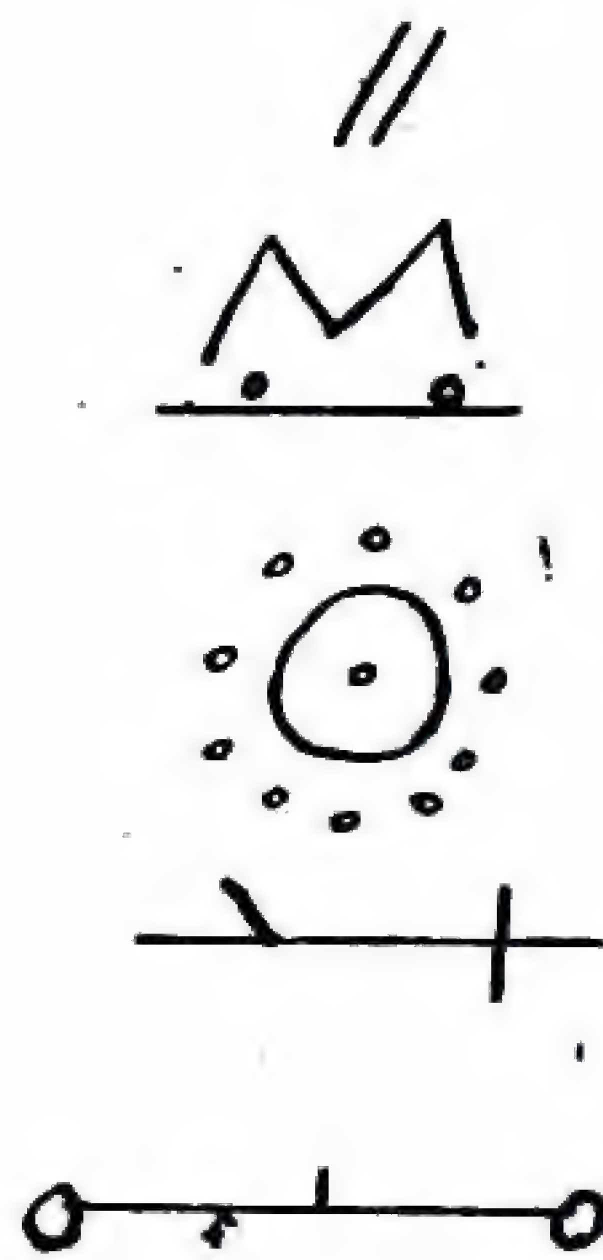
ا۔ یہ شکل سامی ابتدائی تصویری رسم الخط کی ہے اور اونٹ کی علامت ہے۔

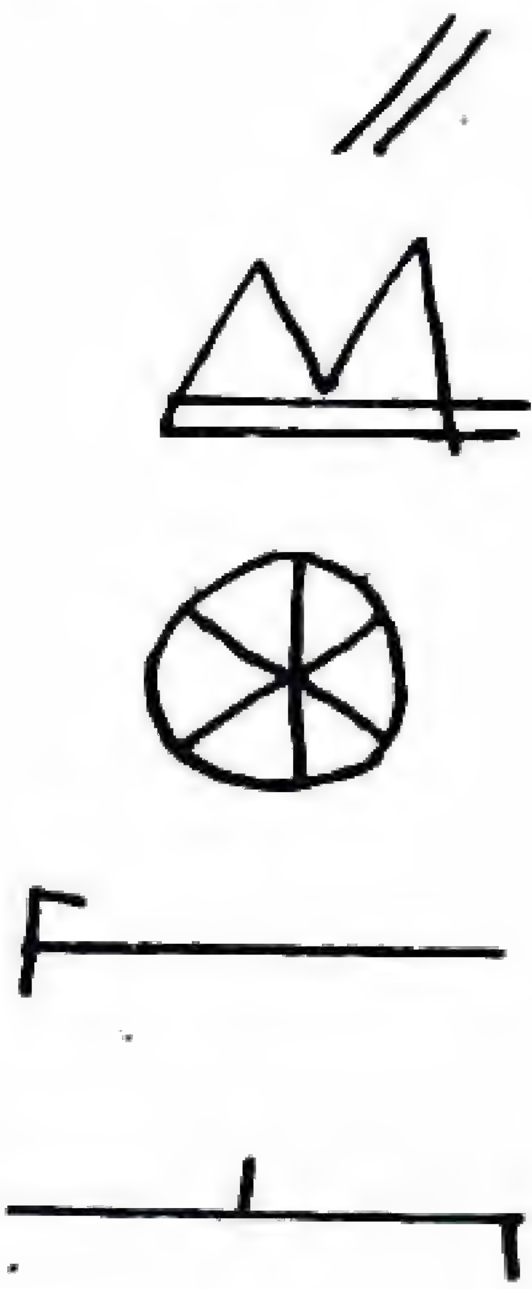
اب سامی رسم الخط کا نمونہ ملاحظہ ہو۔



قدیم سامی خط موہن جوڈارو اور ملتانی خط کا اب ان حروف سے موازنہ کریں جس کا نقشہ مرحوم وحید اختر نے مرتب کیا تھا۔ مختصر موازنہ

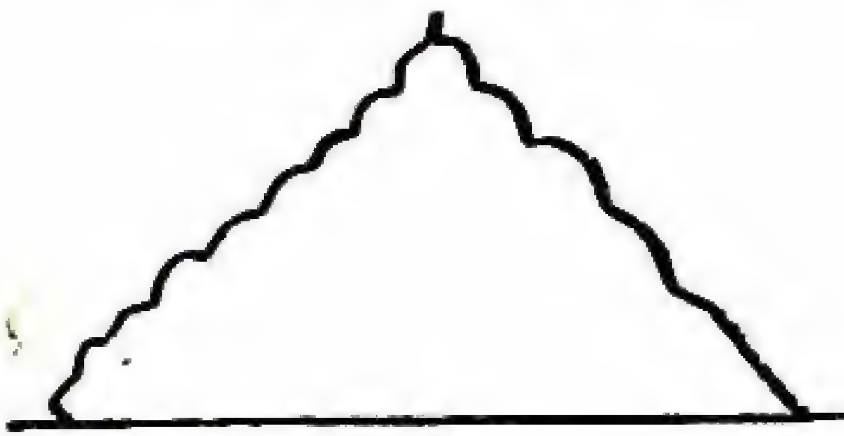
ملتان کے قدیم حروف | موہن جوڈارو کے حروف

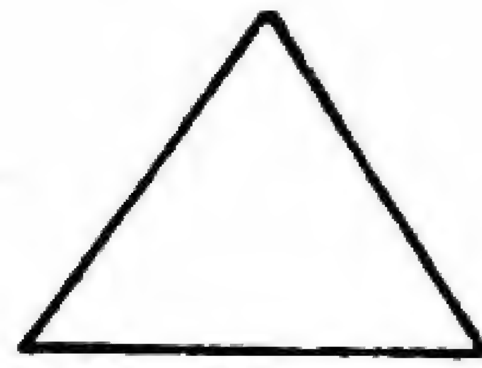




اس بات کو اس جگہ ضرور ملحوظ رکھا جائے کہ بعض حروف مقامی طور پر صوتی اور اپنی خاص تاریخی رفتار اور تغیر و تبدل کے مرحلوں سے گزرتے ہیں جن کا اثر حروف کی صورت پر لازمی پڑتا ہے۔ اشارتی خط نے جیسے جیسے ترقی کی اس کی ہجائی صورت میں بھی تبدیلی واقع ہوتی گئی۔ اس کے باوجود بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان شارتی خطوط

کے پس پردہ وہ تاریخی روابط کی کارفرمائی ہمیں جزیرہ نما عرب اور بابل کی طرف لے جاتی ہے۔ بابلی اور عمانی نشانات اس کی تائید کرتے ہیں۔ 1916ء میں جب رائیگر (جنوبی ہند) کی قبریں کھودی گئیں تو ان سے برآمد ہونے والے برتنوں پر جو نشانات پائے گئے تھے وہ مصری قبور کے برتنوں سے بہت زیادہ مشابہ ہیں اور یہ بھی رجحان پایا جاتا ہے اور اکثر محققین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ جنوبی ہند کے سارے علاقے میں بلکہ اس کے اندر بھی مصری اہرام کی طرح مندروں کی صورت میں مثلاً مصری اہرام اور قدیم ہندی مندر کی تعمیری صورت بھی اسی وضع کی ہے وہی خالص مثلث طرزِ تعمیر۔

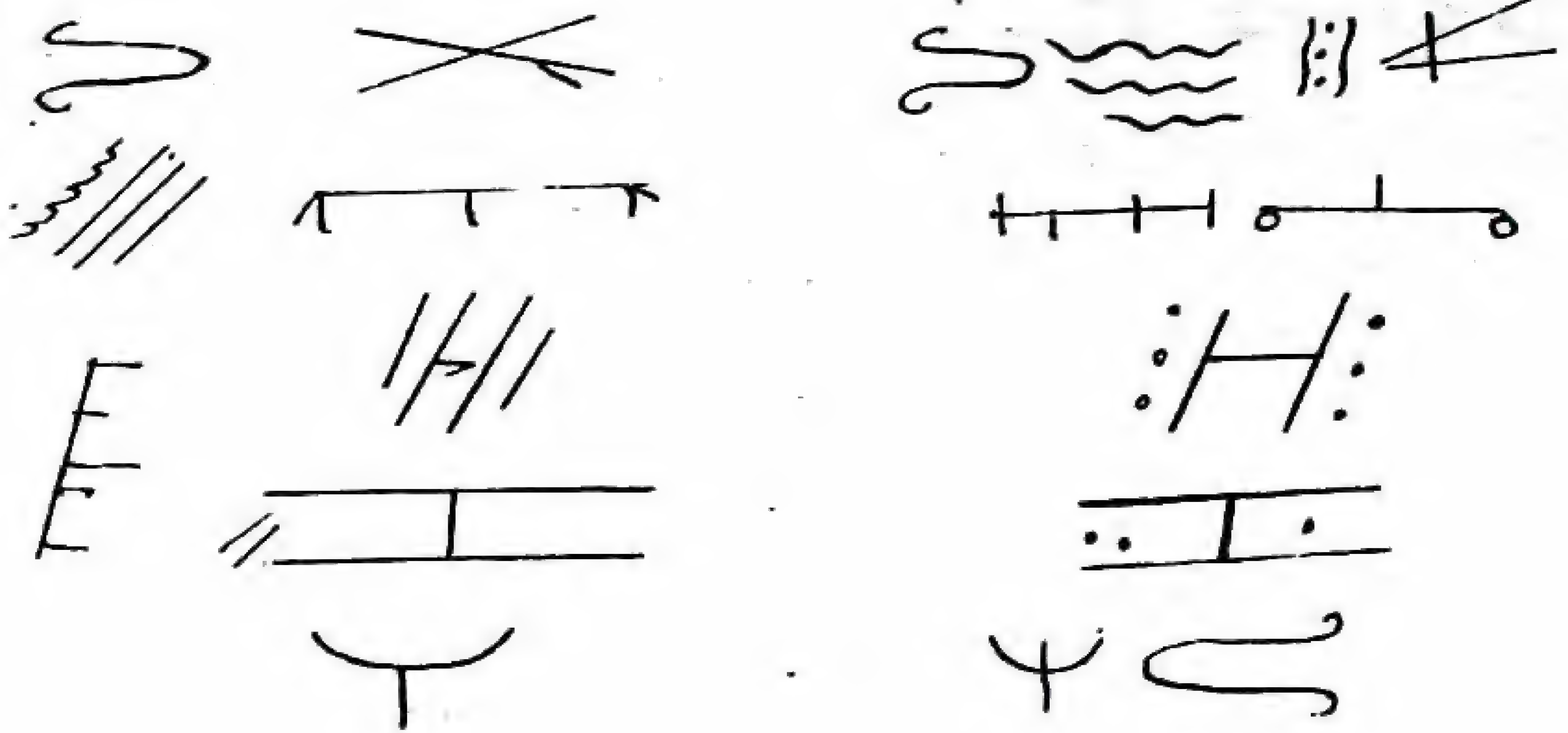




پھر کرشن جی کی پیدائش اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی داستان بالکل ایک ہے۔ فرعون کا تشدد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ٹوکری میں ڈال کر دریا میں بہا دینا۔ یہی کچھ کرشن جی کی پیدائش کی داستان ہے۔ کرشن کا اژدھا کو مارنا حضرت موسیٰ کا بھی فرعون کے دربار میں سانپوں کو اپنے عصا کو اژدھا کی صورت میں تبدیل کر کے اُن سانپوں کو ختم کرنا وغیرہ۔ غرض یہ داستان بالکل ایک طرح کی ہے اور کوئی فرق نہیں۔

ہندوستانی آثار قدیمہ کے ماہر جناب غلام یزدانی صاحب نے رائیگر سے نکلے ہوئے رسم الخط کو برہمی رسم الخط قرار دیا ہے جو متفقہ طور پر قدیم پاکستانی، ملتانی اور ہندوستانی رسم الخط خیال کیا گیا ہے۔ بنگال کے لسانی ماہرین میں سے جو بنگالی اور دیگر زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرنے پر مامور ہیں۔ مذکورہ ''رائیگر'' کے پرانے خط پر تحقیق کر کے 1935ء میں ڈاکٹر پران ناتھ نے ''ٹائمز آف انڈیا'' میں موازنہ شائع کیا کہ مصر اور بحیرہ روم سے برآمد شدہ برتنوں کے نشانات بھی اسی سے ملتے جلتے ہیں۔

اور ہم یہ پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ ڈراویڈین اس خط کو کالڈین سے لے کر آئے تھے اور مصر و بحیرہ روم میں کالڈین خط کے اثرات بھی تسلیم شدہ ہیں۔ کیا ہم اس تحقیق کے نتیجہ کو یوں نہیں پیش کر سکتے کہ وادئ سندھ، ملتان، ہڑپہ سے یہ خط نکلتا ہوا جنوبی ہند جا پہنچا ہو۔ کیونکہ ڈراویڈین بھی تو اِدھر ہی سے چل کر اُدھر پہنچے ہیں۔ اور یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ سندھ و پنجاب سے ڈراویڈین گزر کر ہی اُدھر گئے ہیں اور حیدرآباد دکن اور اس کے آس پاس پہاڑیوں میں آج تک ڈراویڈین نسل موجود ہے اور یہ رسم الخط ملتان سے نکلتا ہوا جنوبی ہند میں جا پھیلا۔ گو وہاں پر کافی تبدیلی ہوگئی ہوگی۔ مگر بعض حروف کی شکلیں قائم رہیں۔



مذکورہ حروف کے تقابلی مطالعہ سے اب اس بات کا کافی ثبوت مل جاتا ہے کہ کالڈین تہذیب وتمدن ایرانی تمدن اور سندھ ملتان سے لے کر جنوبی ہند تک سب ایک دوسرے کو متاثر کرتے رہے ہیں اور تاجروں، حملہ آوروں اور مبلغوں کے ذریعے یہ اثرات وقتاً فوقتاً اپنا کام کرتے رہے۔ ہم اس بات پر یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ملتان اور اس کے گردونواح کے علاقے، جن میں شمالی سندھ اور مشرق کی طرف لاہور سے جالندھر تک یہ سب ایک علاقہ تصور ہوتا تھا اور ملتان میں شامل ہوتا تھا۔ قدیم جغرافیہ دانوں نے ملتان سے صرف ملتان کا شہر ہی مراد نہیں لیا۔ بلکہ سندھ اور پنجاب کو ملا ہی کہا ہے۔ جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے عرب اور ہند کے تعلقات میں تحقیقی طور پر ثابت کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ملتان سے مقصود صرف ایک شہر نہیں بلکہ پورا صوبہ ہے جو کبھی پوری ایک ریاست بلکہ سلطنت تھا۔ مصر کے وزیر مہلبی نے چوتھی صدی ہجری میں لکھا ہے کہ اس کی حدود وسیع ہیں۔ پچھم کی طرف مکران اور دکن میں منصورہ (سندھ) تک اس کی وسعت ہے۔ دریائے سندھ کے پاس جو قنوج تھا 300 میں وہ ملتان میں تھا۔ اُس زمانہ میں ایک لاکھ اور پچپن گاؤں اسلامی ریاست کی حدود میں تھے۔''

اسی طرح کتاب حدود العالم من المشرق الی الغرب میں ملتان کے متعلق چوتھی صدی کا جغرافیہ دان لکھتا ہے، ''ملتان ہندوستان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے یہاں ایک بہت بڑا بت ہے جس کی یاترا کے لیے تمام ہندوستان سے لوگ آتے ہیں اور اس بت کا نام ''مولتان'' ہے۔ یہ مضبوط اور ریگستانی جگہ ہے۔ لاہور بھی بڑا شہر ہے۔ ایک حاکم ملتان کے بادشاہ کے تحت ہے۔'' اسی طرح داتا گنج بخش ہجویریؒ ''کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ لاہور مضافاتِ ملتان میں سے ہے۔ غرض ملتان کی حدود کا وسیع ہونا ایک زمانہ میں مسلم تھا۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے

ہوئے ملتانی زبان اور تہذیب وتمدن کا وسیع علاقہ کو اپنے احاطہ میں لے لینا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے اور خود ''پنج ناد'' کا اطلاق بھی ملتان کے ایک خاص علاقہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے اب ''پنج ند'' کہتے ہیں۔ قدیم ہند کی تحقیقی کتابوں میں اسی علاقہ کو ''پنج ناد'' کہا گیا ہے۔ اور لفظ ''پنجاب'' بعد میں اسی کا ترجمہ کر کے اس خاص خطہ کی جگہ کو نہیں بلکہ جن حدود میں سے یہ دریا گزرتے ہیں بلکہ مجموعی طور پر اس علاقہ کو پنجاب کا نام دیا گیا۔ لیکن آج لسانی تعصب کی بنا پر اس قسم کی باتیں خواہ مخواہ ابن الوقت قسم کے لوگوں کی مطلب براری اور مقاصد دنیوی کے حصول کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ خیر ہمیں ان جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ملتان بہر حال ایک وسیع علاقہ پر بھی ایک زمانہ میں بولا جاتا تھا۔ مول معنی جڑ۔ کسی شے کی حقیقت و بنیاد۔ استھان بمعنی مقام و خاص جگہ۔ گو ''مول استھان'' کے معنی حقیقت کی زمین، یا حقیقی زمین یا جگہ۔ ملتانی زبان کا ایک محاورہ بھی یہاں اس کے معنی کی وضاحت میں مدد دیتا ہے۔ جب کبھی کوئی کسی سے جھگڑا کرتا یا دو آدمی لڑے ہیں تو ایک جوش میں آ کر یہ کہہ دیتا ہے کہ ''مَیں میڈے مُول کوں جانڑداں'' یعنی میں تمہاری پیدائشی حقیقت (بنیاد) کو جانتا ہوں۔ گویا تمہارے حسب ونسب اور تخم تک سے واقف ہوں۔ اس محاورے کی روشنی میں ہماری رسائی ملتان کی اصل معونی حقیقت تک ہو جاتی ہے۔ گویا ملتان سرزمین مقدس ہے۔ جیسے بیت المقدس۔ جن لوگوں نے ملتان کو ملوہی قوم کی وجہ سے مولستھان کہا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ اس کے علاوہ ملتان میں جو سورج دیوتا کا بت تھا اس کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ عرض کیے دیتا ہوں جس پر توجہ نہیں دی گئی۔

سارے ہندوستان میں کہیں بھی سورج دیوتا کا بت ان معنوں میں نہیں تھا۔ سورج کی تمام قدیم تمدنی مذاہب میں جن کے ہاں اصنام پرستی کا رجحان تھا۔ مقدس قوت اور زمین کو روشنی بخشنے والا۔ زندگی اور حرارت دینے والا۔ غرض تخلیق کائنات تک کی نسبت اور قوت کی نسبت سورج کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ملتان میں بھی سورج دیوتا کا بت تھا۔ غرض ہم پھر ان قدیم نشانات کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو ہمیں لسانی اہمیت پر مجبور کرتے ہیں۔

ان حروف کی روشنی میں قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لسانی اور تحریری قدامت اور پھر جدید ملتانی جس میں عربی فارسی وغیرہ کے الفاظ شامل ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں پھیل کر پنجابی اردو وغیرہ کے لیے بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی۔ علامہ اسد ملتانی مرحوم لکھتے ہیں:

> ''ملتان زمانہ قدیم سے وادئ سندھ کا سب سے اہم شہر اور کئی تہذیبوں کا علمی مرکز رہا ہے۔ علمی مرکز زبان کا بھی گہوارہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ملتانی زبان ہمیشہ سے ان تمام علاقہ کی اہم ترین زبان رہی ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی مغربی پاکستان میں رقبہ اور بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے سب سے اہم زبان یہی ہے اور اس لیے ہماری قومی اردو کے بعد سب سے زیادہ قابلِ توجہ ملتانی زبان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض سیاسی اتفاقات کی بنا پر پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی

تک کی تو ایک حیثیت پیدا ہوگئی ہے مگر ان سب میں نمایاں طور پر بڑی اہم زبان ملتان کا علمی انحطاط ملتانی بولنے والوں کی ذہنی انتشار اور غیر ذمہ داری ہے۔ کیونکہ انہوں نے ضلع ضلع کی بولی کو الگ نام دے کر ملتانی زبان کی وسعت کو نادانستہ طور پر محدود کر دیا اور اس کی جامعیت کو نقصان پہنچایا۔

موجودہ ملتانی زبان کا آغاز اس زمانہ سے ہوا جب عرب کے مسلمان سندھ سے گزر کر ملتان تک پہنچے۔ یہیں اس مشترکہ زبان کی بنیاد پڑی۔ جس نے بعد میں ایک طرف لاہور پہنچ کر پنجابی اور دوسری طرف دہلی، دکن وغیرہ پہنچ کر اردو کی صورت اختیار کر لی۔ جہاں تک سندھ کا تعلق ہے خود اہلِ سندھ ملتانی زبان کو سرائیکی کہتے ہیں جس کے معنی سرداروں کی زبان یعنی شاہی زبان ہے۔ گویا ملتانی زبان سندھ کی ''اردوئے معلّٰی'' ہے، بہرحال اب یہ مسئلہ علمی طور پر مسلم ہو گیا ہے کہ اردو زبان کا مولد ملتان ہے اور ملتانی زبان اردو زبان کی ماں ہے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ملتانی زبان کے بارے میں جرمن اور انگریزی میں تو کتابیں موجود ہوں لیکن اردو میں اس کا ذکر تک نہ ہو۔ انگریزی میں مسٹر او برائن نے ''گلاسری آف ملتان لینگوج''، یعنی ''ملتانی زبان کی فہرست الفاظ'' تیار کی۔ جس کا مقدمہ بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ پچھلی صدی میں عیسائی مشنری نے چاروں انجیلوں کا ترجمہ ملتانی زبان میں شائع کیا تھا۔ اسی طرح کوئی پچیس برس ہوئے مولوی نیر الدین صابر ملتانی مرحوم نے قرآن مجید کے پہلے پارے کا ملتانی ترجمہ شائع کیا تھا۔''

علامہ اسد ملتانی کے اس تحقیقی بیان سے بھی ملتانی زبان کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

محمد بن قاسم کا فاتحانہ حملہ، ملتان پر (95 ہجری)

داہر کی سرکشی اور کشتیوں کے لوٹنے کی پاداش میں حجاج بن یوسف نے سندھ پر محمد بن قاسم کو لشکر کشی کا حکم دیا۔ محمد بن قاسم سندھ کو فتح کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اور مورخ تاریخ سندھ لکھتا ہے:

''اب محمد بن قاسم سندھ کے مفتوحہ ممالک کا انتظام کر کے دریائے راوی کے پار اترا، جو سکہ اور ملتان کے درمیان واقع تھا اور سکہ کے شمالی جانب بہتا تھا فوج ملتان کے سامنے گھاٹ پر اتری۔ سپہ سالار نے فوراً فوجی تربیت دے کر فوج کو جنگ کے لیے آمادہ کر لیا۔ غالباً اس کو خبر لگ گئی ہو گی کہ غنیم مقابلہ کے لیے آ رہا ہے۔ چنانچہ تھوڑے وقفہ کے بعد ملتانی فوج نمودار ہوئی جو زیر کمان والی سکہ تھی۔ غالباً اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ سکہ کی شکست کا بدلہ عربی فوج سے یہاں لے گا۔ اس نے بڑا زبردست حملہ کیا اور اس سختی سے کیا کہ اگر عربی فوج تجربہ کار نہ ہوتی تو اس سے شکست کھانے میں کوئی شبہ نہ تھی۔ یہ جنگ شام تک ہوتی رہی۔ مسلمانوں کے مشہور افسر ''زادہ بن عمیرہ'' نے اس جنگ میں شہادت پائی اور اس شہادت نے تو مسلمانوں میں اتنا جوش پیدا کر دیا کہ ہر مسلمان سرفروشی کے لیے تیار ہو گیا چنانچہ ایک پُر زور حملہ کر کے غنیم کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ جنہوں نے قلعہ میں جا کر پناہ لی۔

چچ نامہ میں ہے کہ دوسرے دن بھی قلعہ سے باہر نکل کر ملتانی فوج حملہ آور ہوئی۔ مگر پسپا کر دی گئی اور پھر قلعہ سے باہر نکلنے کا ان کو حوصلہ نہ ہوا اور فصیل سے تیر پتھر وغیرہ برسانے لگے۔ عربوں نے یہ دیکھ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بیس روز تک وہ اس کوشش میں رہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی رخنہ نظر آئے گھس پڑیں اور فتح کر کے اپنے کو فاقوں سے نجات دلائیں۔

ایک دن اتفاقاً ایک شخص قلعہ سے نکلا، جو گرفتار کر لیا گیا اس نے پناہ مانگی اس کو پناہ دی گئی اس سے قلعہ کا حال دریافت کیا گیا۔ اور وہ مقام معلوم کرنے کی کوشش کی گئی جو کمزور ہو اور بآسانی توڑ کر قلعہ کے اندر جا سکیں۔ چنانچہ اس نے ایک جگہ شمالی جانب دریا کے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔ محمد بن قاسم نے منجنیق اسی طرف نصب کرائی اور دو تین دن تک اس قدر پتھر برسائے کہ آخر وہ دیوار ٹوٹ گئی اور راستہ نکل آیا۔

ملتانی فوج نے جب دیکھا کہ دیوار شکست کے قریب ہے تو دروازہ کھول کر نکل آئی اور بہت سخت حملہ کیا۔ مسلمان تو اس کے منتظر ہی تھے۔ انہوں نے جم کر ایسا سخت مقابلہ کیا کہ ملتانی فوج نہ ٹھہر سکی اور بدحواس ہو کر ایسی بھاگی کہ تعاقب کرنے والے عربوں کا بھی خیال نہ رہا۔ شہر کا پھاٹک کھلا رہ گیا اور عرب فاتحانہ طور پر اندر داخل ہو گئے۔ امن پسند شہری ہر طرح محفوظ رہے البتہ مسلح فوج کے سپاہی جو برسرِ پیکار تھے تقریباً چھ ہزار مارے گئے۔ اور ان کے اہل و عیال گرفتار کر لئے گئے۔ لوٹ کا مال جمع ہوا اور تمام مسلمان سپاہیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر سپاہی کے حصہ میں سوا سو درہم آئے اور ہر سوار کو چار سو درہم ملے۔ یہ واقعہ 95 ہجری کا ہے۔''

اس دولت کے حصول کی ایک روایت جو کتابوں میں منقول ہے وہ یہ ہے کہ جب محمد بن قاسم نے ملتان فتح کر لیا تو ایک پجاری نے محمد بن قاسم کو بڑی گہری سوچ میں پایا۔ کیونکہ فتح کے بعد جس قدر مالِ غنیمت ملتا تھا وہ حجاج کے کہنے کے مطابق پورا نہیں ہوتا تھا۔ پجاری نے پوچھا تو محمد بن قاسم نے وجہ فکر ظاہر کر دی۔ اس پر پجاری نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ ہمارا زوال آ گیا ہے اور خدا آپ کا مددگار ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی مخالفت بے کار ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیئے کہ ہر طرح سے آپ کی مدد کریں۔

زمانۂ قدیم میں کشمیر کا ایک شہزادہ یہاں کا حاکم تھا۔ جس کا نام ''جے بادین'' تھا اپنے آخر زمانہ میں ترکِ دنیا کر کے عابد ہو گیا اور شب و روز کی ریاضت میں زہد و اتقا کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ کوئی اُس کا ہمعصر دولت میں نہ تھا۔ راجہ نے دولت کی فراوانی دیکھ کر شہر کے مشرق کی جانب ایک حوض تیار کرایا۔ جو ایک سو گز کے دَور میں تھا۔ اور اس کے وسط میں ایک خوبصورت مندر بنوایا جس کا دَور پچاس گز تھا۔ اس مندر میں ایک کمرہ دس گز لمبا آٹھ گز چوڑا تھا اس میں سونے کی راکھ کر کے چالیس مٹکے بھر کر رکھ دیئے اور ساتھ ہی دو سو بتیس من سونا بھی رکھ دیا اور اوپر سے اس کو پات دیا اور اس پر ایک مندر تعمیر کر کے سونے کی مورتی نصب کر دی اور حوض کے گرد درخت لگوا دیئے جو آج تک موجود ہیں۔ محمد بن قاسم اٹھ کھڑا ہوا اور برہمن کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا محمد بن قاسم نے تاریکی میں ایک شخص کو محسوس کر کے تلوار کھینچ لی۔ وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ برہمن نے کہا کہ صاحب وہ یہی طلائی بت ہے۔ اس کی آنکھیں یاقوت کی ہیں جو اندھیرے میں روشن نظر آتی ہیں۔ مورتی وہاں سے ہٹائی گئی تو دروازہ نظر آیا۔ اندر سے 230 من سونا اور تیرہ ہزار دو سو من سونے کی خاک تابنے کے مٹکوں میں سے ملی۔

اس دوران حجاج کا خط پہنچا:

> ''اے چچا کے لڑکے! تمہیں یاد ہوگا تمہاری روانگی سے پہلے میں نے خلیفہ ولید بن عبدالمالک سے وعدہ کیا تھا کہ بیت المال سے جس قدر روپیہ اس مہم میں خرچ ہوگا اس کی دگنی رقم داخل کی جائے گی۔ اس عہد کو پورا کرنا ہم پر فرض ہے۔ اپنی فتوحات کا دائرہ ہمیشہ وسیع کرتے رہو۔ اشاعتِ اسلام کا خاص خیال رکھو۔ جو بڑا قدیم شہر ہو وہاں مسلمانوں کے لیے مسجد تعمیر کیا کرو!''

محمد بن قاسم نے خط کے پہنچتے ہی خزانے کا سونا مع طلائی بت اور ملتان کے مال غنیمت کا پانچواں حصہ کشتیوں کے ذریعے دیبل کے راستے عراق روانہ کر دیا۔ حجاج یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ جنگ کے خرچ سے دوگنا خزانہ مل گیا اور راجہ داہر کا سر نفع میں آیا۔

قبل اسلام ملتان اپنی تہذیبی زندگی کے قریباً اڑھائی ہزار سال گزار چکا تھا۔ اب اس کا مزاج کسی نئی طرزِ ادا کی تلاش میں تھا۔ کیونکہ تہذیب و ثقافت ہمیشہ کسی نئی روح کی تلاش میں رہتی ہے جو اس میں نئے سرے سے پھلنے پھولنے اور متنوع انداز میں نئی صورت اختیار کرنے کی قوت پید کر دے۔ یہ نئی روح اسلام نے پھونکی۔ مسلمان جب بنی اُمیہ کے زمانہ میں اگر ایک طرف مغرب میں سپین تک اپنے فاتحانہ قدم جما چکے تھے تو مشرق میں مکران سے ہوتے ہوئے محمد بن قاسم کی کمان میں ملتان تک سرحدِ اسلام میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ملتان والوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر کیا کیا جائے تاریخ تہذیب و تمدن میں ہمیشہ نئی تحریکات آگے بڑھنے میں ہمیشہ کامیاب رہتی ہیں۔ مسلمانوں کو بھی اس میں پوری پوری کامیابی ہوئی اور ایک صدی کے اندر ہی اندر مسلمان مشرق و

مغرب پر چھا گئے اور پرانی تہذیبوں نے نئی روح کو اپنے مردہ جسم کے لیے ایک تاریخی ارتقاء کی نعمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ یہی اصول مسلمانوں کے واسطہ سے عمل میں آیا۔ سندھ اور ملتان کی فتح نے مسلمانوں کے لیے ایک حد تک ہندوستان کی راہ آسان کر دی۔ اب عرب تاجر اور عالم ملتان وسندھ کا رخ کرنے لگے۔ اس طرح اسلامی علوم اور عربی زبان کے لیے ملتان مرکز بننے لگا۔ اور عربی تہذیب و ثقافت کا پیوند ملتانی تہذیب و ثقافت نے بھی قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کی اور رفتہ رفتہ عربی لباس و زبان شعر و ادب کا چرچا ہونے لگا۔ محمود غزنوی کے حملوں سے پہلے ملتان میں عرب تہذیب کے اثرات پورے طور پر نمایاں ہو چکے تھے۔ کیونکہ ملتان میں محمد بن قاسم نے عربوں کی خاصی تعداد آباد کر دی تھی۔ اب ملتان میں مندروں کے ساتھ مسجدیں بھی تعمیر ہو چکی تھیں اور سب سے پہلی مسجد محمد بن قاسم نے ملتان میں تعمیر کرائی اور وہ شہر کے درمیان میں تھی، اور اس کے قریب قدیم مندر یا بت خانہ بھی تھا جسے منہدم نہیں کیا گیا تھا۔ یہ مسجد اسلامی ثقافت کی پہلی یادگار تھی۔ محمد بن قاسم معتوب صورت میں واپس گیا اور اس کی جگہ میر داؤد نصر بن ولید، جو بنو سامہ سے تھا ملتان کا حاکم ہوا۔ اس طرح ملتان میں ہباری خاندان جو کسی زمانہ میں قبل اسلام اور شروع زمانہ میں کعبہ کا متولی چلا آتا تھا۔ اسی قبیلہ کے افراد میں سے سندھ اور ملتان میں آ کر آباد ہوئے اور دونوں جگہ ان کی حکومت قائم ہوئی۔ ملتان میں سب سے پہلے ابن ...... قریباً 290ھ میں آتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"ملتان میں ایک قوم رہتی ہے جو دعویٰ کرتے ہیں ہے کہ وہ سامہ بن لوی کے خاندان سے ہے ان کو لوگ بنو منبہ کہتے ہیں اور وہی وہاں کا بادشاہ ہے اور وہ امیر المومنین کا خطبہ پڑھتے ہیں۔ ہندوستان کے راجہ جب ان سے لڑنے کے لیے آتے ہیں تو وہ بھی ملتان سے اپنی فوج لے کر لڑنے کے لیے نکلتے ہیں اور اپنی قوت و دولت کے سبب اُن پر غالب آتے ہیں۔"

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہ اس وقت ملتان میں عرب حکومت کتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ ہندو اپنے مقدس مقام کو فتح ہوئے دو برس گزرنے پر مسلمانوں سے نہ لے سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی خاصی تعداد ملتان میں آباد ہو چکی تھی اور ان کا نظم و نسق خاصا مضبوط تھا۔ اس کے 20 سال بعد مشہور مورخ مسعودی ملتان میں وارد ہوتا ہے اور ملتان کے متعلق لکھتا ہے:

"ملتان کا امیر جیسا کہ ہم نے کہا ہے، یہاں کی سلطنت سامہ بن لوی بن عالب کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے پاس فوج اور دولت ہے۔ ملتان کی اسلامی حکومت بڑی سرحدوں میں سے ایک سرحد ہے۔ ملتان کے تابع اس کے چاروں طرف ایک لاکھ بیس گاؤں ہیں جو شمار میں آتے ہیں اور یہیں وہ مشہور بت خانہ ہے۔ امیر ملتان کی زیادہ تر

آمدنی ان خوشبو دار لکڑیوں سے ہے جو دور دور سے اس بت خانے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ جب کبھی ہندو راجہ ملتان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور مسلمان ان کے مقابلہ سے عاجز آ جاتے ہیں تو دھمکی دیتے ہیں کہ ہم اس بت خانے کو توڑ دیں گے تو ہندو فوجیں واپس چلی جاتی ہیں۔ میرا ملتان جانا 300ھ کے بعد ہوا اس وقت وہاں بادشاہ اب اللباب منبہ بن اسد قریشی کی تھا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی ملتان آتا ہے اُس وقت ملتان کی قریشی اس وقت ملتان کی قریشی حکومت کمزور ہو چکی تھی اور قرامطہ کی آمد سندھ میں شروع ہو جاتی ہے۔ مسعودی کے چالیس سال بعد ملتان میں اصطخری 340ھ میں آتا ہے اور ملتان کے متعلق اپنی کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے کہ:

"ملتان منصورہ سے آدھا ہے۔ اسے فرج الذہب (سنہری سرحد) بھی کہتے ہیں یہاں ایک مورتی ہے جسے ہندو بہت مقدس خیال کرتے ہیں اور دور دراز شہروں سے اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور بت خانہ اور پجاریوں کے مصارف کے لیے ہر سال اس پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے ہیں۔ ملتان کا نام ملتان اس بت کی وجہ سے پڑا ہے، یہ بت خانہ ایک شاندار محل ہے۔ جو ملتان کے بازار میں ایک بڑے آباد اور بارونق مقام پر ٹھٹھیروں اور ہاتھی دانت والے بازار کے درمیان تعمیر کیا گیا ہے۔ محل کے وسط میں ایک گنبد ہے جس میں بت نصب ہے۔ اس کے گرد پجاریوں کے مکانات ہیں۔ یہ مورتی انسانی شکل کی ہے اور اینٹ اور گچ کی مٹی سے بنی ہوئی ہے۔ اور کرسی پر پالتی مارے ہوئے بیٹھی ہے۔ اس کا سارا جسم سنجاف کے چمڑے کی طرح ایک سرخ چمڑے سے منڈھا ہوا ہے اور صرف آنکھیں نظر آتی ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مورتی لکڑی کی ہے اور بعض سمجھتے ہیں کہ لکڑی نہیں ہے اس کا جسم کبھی کھولا نہیں جاتا ہے، اس کی دونوں آنکھیں جواہر (یعنی یاقوت) کی ہیں اور سر پر سونے کا تاج ہے۔ مورتی کرسی پر پالتی مارے دونوں ہاتھ گھٹنوں کی طرف بڑھائے اور اپنے ہاتھ اس پر رکھے ہووے ہے گویا چار کی گنتی پر انگلی ہے لوگ جو مال و دولت اس مورتی پر چڑھانے کے لیے لے آتے ہیں اسے امیر ملتان لے لیتا

ہے۔ اور اس سے پجاریوں پر بھی خرچ کیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی رجہ ملتان پر چڑھائی کرتا ہے تو وہ (مسلمان امیر) بت کو نکال کر جلا دینے کی دھمکی دیتا ہے جس پر حملہ آور واپس لوٹ جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندو راجے ملتان کو کبھی کا تباہ و برباد کر دیتے ملتان محفوظ اور مستحکم شہر پناہ سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے لیکن منصورہ اس سے بھی زیادہ سرسبز و شاداب اور آباد ہے۔ ملتان کا نام بیت فرج الذہب (سونے کے گھر کا سوراخ) اس لیے رکھا گیا ہے کہ جب شروع میں اسے فتح کیا گیا تو اس وقت مسلمانوں میں بڑی تنگی اور عُسرت تھی۔ جب یہاں سونے کا ڈھیر مل گیا تو وہ خوشحال اور فارغ البال ہو گئے۔

ملتان کے باہر قریباً ڈیڑھ میل پر بہت سی عمارتیں ہیں جن کو چندراؤ کہا جاتا ہے۔ امیر ملتان کی چھاؤنی وہیں ہے۔ شہر میں جمعہ کے دن وہ ہاتھی پر سوار ہو کر نماز کے لیے آتا ہے۔ یہ قریشی اور سامہ بن لوی کی نسل سے ہے جو ملتان پر قابض ہو گیا ہے امیرِ منصور کے تابع نہیں ہے مگر خلیفۂ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے۔"

اصطخری کے بیان سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ملتان اس وقت لوی خاندان کی حکومت تھی۔ گویا 340ھ تک یہاں کی حکومت خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھتی تھی اور یہاں کی مالی حالت بھی بڑی اچھی تھی۔ اور یہ علاقہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا اور یہاں تاجروں اور سیاحوں کی آمد و رفت ہر وقت رہتی تھی۔ کیونکہ انہی سیاحوں کے بیانات ہیں کہ ملتان سے بلخ تک تجارتی راستہ تھا۔ اور بشاری مقدسی کے بیان سے تو ملتان کی تہذیبی زندگی کا خاکہ بھی نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتا ہے کہ:

"ملتان والے شیعہ ہیں۔ اذان میں حی علی الخیر العمل کہتے ہیں۔ اور اقامت میں دو دفعہ تکبیر کہتے ہیں۔ ملتان میں خطبہ مصر کے فاطمی خلیفہ کا پڑھتے ہیں اور اسی کے حکم سے یہاں کا بندوبست ہوتا ہے اور یہاں سے برابر تحائف مصر کو بھیجے جاتے ہیں۔

ملتان منصورہ سے چھوٹا ہے مگر اس سے زیادہ آباد ہے۔ پھل گویا یہاں زیادہ نہیں ہیں مگر سستے ہیں۔ اور (عراق کی بندرگاہ) سیراف کی طرح سال کی لکڑی کے کئی کئی منزل کے مکانات ہیں۔

یہاں بدکاری اور شراب خوری نہیں ہے اور جو اس جرم میں پکڑے جاتے ہیں ان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ یا کوئی اور سخت سزا دی جاتی ہے۔ خرید و فروخت میں یہاں کے لوگ نہ جھوٹ بولتے ہیں نہ کم تولتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر و مدارات کرتے ہیں۔ اکثر باشندے عرب ہیں سرسبزی اور دولت ہے۔ بازار میں کوئی عورت بناؤ سنگھار کیے ہوئے نہیں ملتی۔ اور نہ کوئی عورتوں سے راستہ میں علانیہ بات کرتا ہے۔ پانی اچھا ہے۔ زندگی عیش و مسرت اور خوشدلی سے گزرتی ہے۔ فارسی زبان سمجھی جاتی ہے۔ تجارت کا نفع خاصہ ہے۔ جسم تندرست ہیں لیکن شہر تنگ اور میلا ہے۔ مکانات تنگ ہیں آب و ہوا خشک اور گرم ہے۔ لوگوں کی رنگت گندم گوں اور سیاہ ہے۔ ملتان کا سکہ مصر کے فاطمی سکہ کے مطابق بنایا گیا ہے۔''

ملتان کے متعلق جو کچھ بشاری نے لکھا ہے اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ملتان میں قرامطہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور عرب یہاں پر زیادہ آباد تھے اور ہندو بہت کم تھے۔ لیکن سب سے اہم بات فاطمی حکومت کا خطبہ اور تحفے تحائف کا مصر کی حکومت کو بھیجتے رہنا اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس تحریک کا براہِ راست تعلق مصر سے تھا اس کی تفصیل نقشِ ملتان میں ملاحظہ فرمائیں۔

غرض مقدسی سے پہلے 367ھ میں ابن حوقل ملتان کے لوگوں کا رہن سہن بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کا لباس ایک طرح کا ہے اور بالوں کو چھوڑنے کا طریقہ بھی ایک سا ہے اور یہی ملتان والوں کی وضع ہے۔ منصورہ اور ملتان اور اس کے اطراف میں سندھی اور عربی بولی جاتی ہے اور مکران والوں کی زبان فارسی ہے اور مکرانی ہے کرتوں کا لباس نمایاں ہے۔ مگر تاجر لوگ قمیض اور چادر استعمال کرتے ہیں جس طرح عراق اور فارس کے لوگ ہیں۔ گویا تمدنی طور پر عربوں کی آمد اور مکران و ایران کے لوگوں کے میل جول نے ملتان میں نئی نئی رسمیں اور لباس و رہن سہن نے اثر کیا۔ اور مشرقی ہند سے ان کی صورت و سیرت میں اسلام کے اثر سے تبدیلی پیدا ہو گئی۔''

ملتان زمانۂ قدیم ہی سے علمی مرکز رہا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے صدیوں پہلے یہاں بدھوں کا بہت بڑا تعلیمی ادارہ قائم تھا۔ اس کے ساتھ ہندوؤں کا بھی روحانی اور علمی مرکز ملتان رہا ہے۔ کیونکہ قدیم روایت کے مطابق

ملتان میں پرہلاد بھگت کی مدد کو وشنو دیوتا کا اوتار نرسنگھ ظاہر ہوا تھا۔ اس لیے اسے اس نسبت سے اوتار بھومی بھی کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے جب محمد بن قاسم کی کمان میں ملتان کو فتح کیا تو رفتہ رفتہ اسلامی علوم کو یہاں فروغ ہونے لگا اور عرب قبیلوں کے قیام کی وجہ سے یہاں عربی زبان فروغ پانے لگی۔ دوسری صدی کے آخر میں ملتان میں عربی شاعری وجود میں آئی۔ خود علامہ جاحظ جیسا عربی ادب کا ماہر ملتان کے ایک عربی شاعر کا ذکر اپنی تصنیف میں بڑے اچھے انداز میں کرتا ہے۔ اس ملتانی شاعر کا نام ہارون تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ میدان جنگ میں ہاتھیوں کی سونڈ اور دوسرے اعضا سے لپٹ کر اسے بری طرح زخمی کرتا جس کی وجہ سے ہاتھی بدحواس ہو کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلتا۔ ہارون ملتانی نے اپنی اس شجاعت اور کارناموں کو قصیدوں میں بیان کیا تھا اور یہ قصیدے جب جاحظ کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں قلمبند کر لیا تھا۔ عربی سے اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

ہارون ملتانی اشعار میں اپنی بہادری یوں بیان کرتا ہے:

1۔ میں اطمینان سے دھیرے دھیرے ہاتھی کی طرف چلا حالانکہ انہوں نے اس کی سونڈ میں تلوار بھی تھما دی تھی۔

2۔ میں دل ہی دل میں خیال کر رہا تھا کہ یہ تو ایسا ہاتھی ہے جو صیقل شدہ شمشیر سے حملہ آور ہوتا ہے۔

3۔ اگرچہ اس کی زد سے پیچھے ہٹ جاؤں تو بزدل اور احمق تو میری معذرت قبول کرے گا۔ لیکن

4۔ قوم کے دلاوروں کے نزدیک میں روسیاہ تصور کیا جاؤں گا۔ اور یہ ایسی گہری سیاہی ہے جیسے رات کی تاریکی ہوتی ہے جس کو ہر طرف سیاہی نے چھپا لیا ہو۔ میں بے حد رسوا اور نہایت ذلیل ہو جاؤں گا۔

5۔ اور یہ بات مجھے سخت ناپسند تھی۔

6۔ اس لیے میں نے جست لگا کر اس کو زخمی کرنا شروع کیا

7۔ پھر میں اس کے سینے سے چمٹ گیا۔ اور جب اس نے مجھے اپنی سونڈ میں لپیٹنا چاہا تو میں اور زیادہ چمٹ گیا............

غرض اگلے اشعار میں ہارون ملتانی ہاتھی کو زخمی کرتا ہے اور اس کے دانت توڑ دیتا ہے اور فاتحانہ شان و شوکت کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہاتھی حواس باختہ ہو کر میدان سے بھاگ جاتا ہے۔

اسی طرح دیگر فنون کے ماہرین کے نام بھی کہیں کہیں کتابوں میں مل جاتے ہیں اور ملتان چوتھی صدی ہجری میں اسلامی اور ہندو تہذیب کا نمونہ نظر آنے لگتا ہے۔

ملتان کے متعلق ابن رستہ کا بیان

ملتان کے بارے میں جو سب سے زیادہ تفصیلی بیان ہے اب وہ ملاحظہ فرمائیے اور یہ سب سے پہلا بیان

ہے۔ ابن رستہ لکھتا ہے:

''ملتان وہ شہر ہے جہاں سے دریائے سندھ الگ ہوتا ہے۔ یہ دریا، دریائے دجلہ کے مانند اور اس سے بڑا ہے۔ ملتان میں ایک قوم ہے جس کا خیال ہے کہ سامہ بن لوی ایک شاخ بنو منبہ کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہی قوم ہندوستان کے اس حصہ میں حکمران ہے اور خلیفۂ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھتی ہے اور سندھ کے شہر منصورہ کے قریب رہتی ہے۔ اور ملتان میں ایک بت ہے جس کی آمدنی بہت زیادہ ہے اور بنو منبہ ہی اس کی آمدنی (جو اس بت پر نذرانے دیئے سے وصول ہوتی ہے) کے مالک ہیں۔ ایک مدبر شخص نے ان ملکوں کی سیاحت کی ہے اور ان میں مقیم بھی رہا ہے۔ مجھے بتایا کہ اس بت کی آمدنی بے شمار ہے بعض دفعہ جب ہندوستان کے دوسرے راجے بنی منبہ سے جنگ کرنے کے لیے لشکرِ جرار کے ساتھ ملتان پر حملہ کرتے ہیں تو بنی منبہ بھی ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنی فوجی قوت اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے ان پر غالب آ جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ ملتان کے بت کی لمبائی 20 گز سے زیادہ ہے۔ اور آدمی کی شکل وصورت کا ہے۔ ایسے کمرے کے اندر ہے جس کے اوپر ایک بڑی چھت ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ اس کا بنانے والا کون ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دو ہزار سال پہلے کی تعمیر ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ بت آسمان سے اترا ہے اور انہیں اس کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بت کے کچھ پجاری بھی ہیں جو اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور مصارف بت کے چڑھاووں سے چلتے ہیں۔ یہ مصارف ان وظائف کے علاوہ ہیں جو پجاریوں کو ملتے ہیں۔ اور جس سے وہ اپنے کھانے پینے کے مصارف چلاتے ہیں۔ سارے ہندو اس بت کی یاترا کرتے ہیں۔ اور جب کوئی مالدار آدمی مرنے لگتا ہے تو وہ بت سے تقریب حاصل کرنے کے یے اپنا آدھا یا کُل مال اس بت کے نام وصیت کر جاتا ہے۔ لوگ سال بھر یا اس سے بھی زیادہ مسافت طے کر کے اس بت کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اور

یہاں اپنا سر مُنڈواتے ہیں۔ بائیں جانب سات بار طواف کرتے ہیں اور یہ سب بت کے تقرب اور خوشنودی کے خیال سے کرتے ہیں۔ اس کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہیں زمین پر لوٹتے اور خضوع و خشوع کا اظہار کرتے، بت کے چار چہرے ہیں اس لیے جس طرف بھی آدمی رخ کرے وہ اس کے سامنے ہی رہے گا۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قابلِ پرستش معبود ہے۔ غرض بت کا ہر طرف چہرہ اور سامنا ہی ہے پشت نہیں ہے۔ جدھ دیکھو اس کا چہرہ تمہارے سامنے ہوگا اور لوگ طواف کرتے ہوئے ہر ہر رخ کی طرف مڑتے ہیں تو سجدہ کرتے جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو آنکھیں نکال کر اس کی آستین پر رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں، کہ اے بھگوان! میں نے تیری رضا جوئی کے لیے اپنی آنکھیں تیرے حضور پیش کی ہیں۔ بس میری عمر دراز کر، مجھے روزی دے اور میرے یہ کام اور ضرورتیں پوری کر دے۔ بعض ایسے لوگوں نے مجھے بتایا جنہوں نے بچشمِ خود ایسے لوگوں کو دیکھا جو ایک ایک سال کی مسافت طے کرتے ہیں اور ان کے کندھوں پر سرخ صندل کے دو اتنے بڑے بڑے بوٹے ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک بوٹا ایک آدمی کے وزن کے برابر ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح لاتے ہیں کہ پہلے تین میل ایک ٹکڑا لاتے ہیں اور یہاں اسے رکھ کر واپس جاتے ہیں اور دوسرا ٹکڑا اور آگے لے کر جاتے ہیں اور پھر اسے وہاں رکھ کر پہلے ٹکڑے کو لے جاتے ہیں اور اس طرح ٹکڑوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے بت کے پاس ملتان پہنچ جاتے ہیں۔ بعض لوگ بت سے اپنی جان بھینٹ چڑھانے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اور ایک لمبی لکڑی لے کر اس کا سرا انتہائی تیز اور نوکیلا بنا دیتے ہیں پھر اسے زمین پر گاڑ کر خود اس کے اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ لکڑی کا تیز اور نوکیلا سرا اپنے پیٹ میں چبھو دیتے ہیں کہ وہ پشت کے راستے سے باہر نکل آتا ہے اور اس طرح اپنی جان دے دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے بت کی رضا جوئی اور قربت حاصل ہوگئی ہے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بہت سا سامان و دولت لا کر بت کے سامنے لا ڈالتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ خداوند! میرا یہ حقیر نذرانہ قبول فرما۔ اس بت کے پجاری نہ عورتوں کے پاس جاتے ہیں، نہ گوشت کھاتے اور نہ کوئی جانور ذبح کرتے ہیں۔ اور نہ گندے میلے کپڑے پہنتے ہیں اور بتوں کے حضور جاتے وقت خوشبو لگا لیتے ہیں ان کے علاوہ دوسرا شخص نہ تو بتوں کو خوشبو لگا سکتا ہے اور نہ انہیں چھو سکتا ہے اور جب لوگ بتوں کے حضور جاتے ہیں تو گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرتے ہیں، کہ ہماری طرف نظرِ کرم ہو، ہم پر رحم کیجیو۔ روتے اور انتہائی عاجزی سے دعا مانگتے ہیں اس بت کا باورچی خانہ بھی ہے۔ جس میں سفید بہترین قسم کے چاول اور بت کے لیے عمدہ مچھلیوں اور سبزیوں کے کھانے پکائے جاتے ہیں اور ان میں خوشبو ڈالی جاتی ہے پھر ایک لمبا چوڑا کیلے کا پتہ، جس میں ایک دو آدمی لیٹے جا سکیں بت کے سامنے بچھایا جاتا ہے اور اس پر نصف قدِ آدم کے بلندی سے چاول گرایا جاتا ہے پھر جو سب سے بلند مرتبہ مقدس پجاری ہوتا ہے وہ کیلے کے پتے سے اس پر پنکھا جھلتا ہے۔ اور چاول کے بخارات بت کے چہرے تک جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ بت نے چاول کھا لیے ہیں کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے نہیں کھا سکتا۔ کھانے سے پہلے بت کے کمرے کے گرد چنگ، طنبور اور طبل بجتے ہیں۔ اور کبھی کبھی سو سو داسیاں جو اس کام کے لیے ہوتی ہیں بت کے گرد رقص کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم ناچ کر اور گا کر بھگوان کو خوش کرتی ہیں۔ پھر گویا بت کھانا کھاتا ہے۔ مگر کھانے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اور کھاتے وقت دروازہ بند، اور پھر کھول دیا جاتا ہے اور کھانا بت کے سامنے سے اٹھا لیا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ بت نے یہ سب خیرات کر دیا ہے۔ پھر بت کے پاس سے گزرنے والے انسان، جانور اور پرندے کھاتے ہیں اور چڑیوں اور کتوں تک کو نہیں روکا جاتا۔ اور کہتے ہیں اس بت کی روزانہ خیرات ہے۔ بت کو دودھ سے اور کبھی گھی سے غسل دیتے ہیں۔ پھر اس کے غسل شدہ دودھ اور گھی وغیرہ سے مریضوں کو شفا کی غرض سے نہلاتے ہیں۔"

یہ بیان ملتان کی تاریخی عظمت اور اس کے قدیم بت کی تاریخی حیثیت متعین کرنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

اگر قدیم روایات کے تحت یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ملتان کا یہ بت شروع اسلام کے زمانہ یعنی 290 ہجری کی روایت کے مطابق دو ہزار برس قبل کا بت تھا تو اس بات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قریباً 1300 کے لگ بھگ جا پہنچتا ہے۔ پھر ایک سال کی مدت کا طویل سفر زیارت وغیرہ۔ ان حقائق کو مدنظر رکھیں تو پھر اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ملتان کا علاقہ تمدن و ثقافت کے کن کن مراحل سے گزرا ہو گا۔ اور حملہ آوروں کی یلغار سے کس قسم کی تبدیلیوں کا شکار ہوا ہو گا۔ اور اس نے اپنے قدیم روایات کا تحفظ کس طرح کیا ہو گا۔ اس کی تصریح ''نقش ملتان'' میں ملے گی۔

لیکن یہ تمام باتیں ایک طرف، اور قرامطہ کی ملتان میں بغاوت اور پھر ان قدیم آثار کا مٹا دینا جو ہزاروں سال سے ملتان میں موجود تھیں ایک بہت بڑا ثقافتی حادثہ ہے۔ کیونکہ اس بت اور مندر کو حلیم بن شیبان نے مسمار کر دیا تھا۔ اور وہاں پر مسجد تعمیر کر دی تھی۔ نہ جانے اس وقت کیا تعصب تھا کہ محمد بن قاسم کی تعمیر کردہ مسجد کو بھی بند کر دیا گیا اور پھر اس کے بعد کوئی روایت نہیں ملتی۔ تاریخی بیانات سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ہباری قریشی خاندان کی ایک شاخ بنو منبہ ملتان پر تیسری صدی کے شروع میں قابض ہوئی تھی اور اسی خاندان کے افراد مسلسل ملتان پر حاکم رہے۔ لیکن چوتھی صدی ہجری 375 یا اس سے کچھ آگے پیچھے قرامطہ کی حکومت قائم ہوئی ہے۔ جلم بن داؤد بن نصر تھا جس کو محمود غزنوی نے شکست دے کر گرفتار کرلیا۔ اس طرح ملتان بہت بڑے طوفانی حملوں اور کشت و خون سے گزرا۔ اسی دور میں ملتان کے ثقافتی سرمایہ کو نقصان پہنچا اور ملتان کا شہر بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ جس کو مؤرخین نے تذکرہ کیا۔ آخر میں کچھ عرصہ بعد مسعود کا زمانہ میں یہاں شاہ یوسف گردیز سے آئے۔ بہت بڑے عالم تھے اور روحانی مقام بھی انہیں حاصل تھا۔ نئے سرے سے شہر کے آباد کرنے کی طرف ان ہی کی وجہ سے ہوئی اور ملتان پھر ایک بار ترقی اور آبادی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ اس دور میں اُدھر خلافت عباسیہ روبہ زوال تھی اِدھر غوری خاندان برسرِ اقتدار آ رہا تھا۔ آخر شہاب الدین غوری 571ھ میں ملتان پر حملہ آور ہوا اور ملتان کو ایک بار پھر تباہی کا سامنا کرنا پڑا مگر اس دفعہ کچھ نرمی ظاہر ہوئی غرض اس طرح ملتان میں آئے روز حملہ آوروں کی وجہ سے تمام علمی و ادبی سرمایہ تباہ ہوتا رہا اور سوائے جید عربی حوالوں اور قدیم روایات کے جو زبانی تھیں اور کوئی سند ملتان کے متعلق بطور ثبوت کے نہ رہی۔ اگر یونانی اور عربی حوالے بھی نہ ہوتے تو نہ جانے ملتان کا تاریخی خاکہ کیسے مرتب ہوتا۔ البتہ قدیم قلعہ کی نچی طور پر کھدائی میں جن حروف کو محفوظ رکھا اس نے اس کی قدامت کا ثبوت مہیا کر دیا۔ اور آج ہم اس پر یہ کہنے کے لائق ہو گئے کہ بابل و نینوا اور موہن جوڈارو، ہڑپہ کا ہمعصر اور ہم زبان شہر اپنے مرکزی تقدس کی حیثیت سے قدیم ترین شہر ہے جس کا تقدس سارے ہندوستان میں مسلم ہے۔

ثقافتی اثرات کا ایک جائزہ

ساتویں صدی ہجری میں ملتان علم و حکمت کا پھر مرکز بن گیا۔ ملا کاشانی کا مدرسہ ملتان میں حسین آگاہی دروازہ کے عین سامنے قلعہ کہنہ کی فصیل کے ساتھ اور کچھ اندر تک تھا اور ایک مسجد بھی تھی جس کے آثار اب ختم ہوئے

ہیں۔اس میں بڑے بڑے علماء نے درس لیا۔خود غوث بہاء الدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ اسی مسجد میں جا کر نماز ادا کرتے تھے۔اس کے علاوہ بہت سے بزرگوں نے ان جیسے ملتانی مدرسوں اور مسجدوں سے تعلیم حاصل کر کے نام پیدا کیا تھا۔ گویا اس زمانہ میں ملتان ایک بلند پایہ یونیورسٹی کی سی اہمیت رکھتا تھا۔یہاں تک کہ بابا فریدؒ جیسے بلند پایہ بزرگ اسی ملتان سے تعلیم کی دولت سے بہرہ ور ہوئے اور پھر دوسری جانب رخ کیا اور ملتانی زبان کی بھی خدمت کی۔آج بھی ان کے ڈوہڑے لوگوں کی زبان پر ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو علم وحکمت کا یہ حال ہے کہ لوگ جوق در جوق ملتان کھچے چلے آتے ہیں اور دوسری طرف یہ حال ہے کہ یہاں سے علم حاصل کر کے برما، ملایا اور بنگال ،ادھر صوبہ بہار اور گجرات کاٹھیاواڑ میں اور سندھ سے لے کر خرسان اور افغانستان کی سرحد تک علم وعمل کی مشعل روشن کرنے کے لیے متعین ہوتے ہیں۔بقول حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ہمارے بڑے بھائی یعنی غوث بہاء الدین زکریا سے ستر ہزار طالب علم ظاہری اور باطنی فیض حاصل کر کے اطرافِ عالم میں پھیل گئے۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو شخص کسی جگہ دس پندرہ برس رہ کر علم حاصل کرے وہ یقیناً وہاں کی تہذیب وثقافت سے متاثر ہوگا۔اور جہاں جائے گا یقیناً وہاں کچھ نہ کچھ اثر ڈالے گا۔ہمیں قوموں میں اسی طرح علم و فنون اور طرزِ معاشرت میں تبدیلی ہوتی آئی ہے تو پھر ملتان جیسے قدیم اور مقدس شہر کو جہاں لوگ کسی زمانے میں اپنے گناہوں کی تلافی اور نذرِ عقیدت لے کر آتے ہوں اس شہر کی ثقافتی اور سماجی زندگی کا اثر کس طرح دور دراز شہروں پر نہ ہوا ہوگا۔ہم اس کی ایک تاریخی مثال پیش کرتے ہیں باوجود اس کے کہ اس میں تقدس کا کوئی دخل نہیں۔بغداد سے زریاب نامی گویا اندلس میں چلا جاتا ہے اور وہیں سکونت اختیار کر لیتا ہے اس کے علم اور موسیقی سے اہلِ اندلس اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ اسی کی طرح بال ترشواتے ہیں لباس کی وضع قطع وہی اختیار کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ زریاب خاص قسم کا چمچہ کھانے کے وقت استعمال کرتا تھا اہلِ اندلس نے اسی وضع کے چمچے اپنے دستر خوانوں پر رکھنے شروع کر دیئے۔جب ایک مغنی سے لوگ اس قدر متاثر ہوتے ہیں تو پھر ایک قدیم مقدس شہر جس کے ساتھ کئی مقدس ہستیاں اور ان کی داستانیں وابستہ ہوں اور پھر وہ ایک علمی مرکز کی حیثیت رکھتا ہو، وہاں کی ثقافت و معاشرت سے دوسرے شہروں کے لوگ کیسے متاثر نہ ہوں!

اس سے ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ملتان ہی کی ثقافت کا اثر ان تمام علاقوں پر ہوا ہے بلکہ خود ملتان حملہ آوروں اور باہر سے آنے والے لوگوں اور قوموں سے خاصا متاثر ہوا ہے اور ہمیشہ اسی میل جول اور ثقافتی ارتقا ہوتا رہتا ہے لیکن خود اس علاقے کا اپنا بھی تو ایک خاص مزاج اور اس کی ایک خاص تہذیبی روایت ہوتی ہے جس کے سہارے وہ زندہ رہتا ہے۔جس میں ان کی خاص اپنی زبان اور طرزِ زندگی کا اظہار اور ہزاروں سال کی داستان ہوتی ہے یہی داستان بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے ایک وحدت پیدا ہوتی ہے۔اس طرح قوموں میں اس وحدت کے ذریعہ ایک نہ مٹنے والی ثقافت وجود میں آتی ہے یہی ثقافت حقیقی معنوں میں قوموں کے ایک مثالی فکر کی نشان دہی کرتی ہے اور آنے والے دور میں وہی ثقافت روحانی طور پر مؤثر ثابت ہوتی ہے۔بنی نوع انسان کے ہر تمدنی دور

میں قدیم ثقافتی تخم ریزی ہی کے ذریعے نئے اندازِ فکر اور فنون کے پودے پھلتے پھولتے ہیں۔ مصریوں، یونانیوں اور کلدانیوں کے ثقافتی اثرات جو ایک دوسرے پر ہوتے رہے ہیں اس کا کون انکار کر سکتا ہے۔ اسی قسم کی صورتِ حال علاقۂ ملتان اور جنوب مشرقی ہند، اس کے ساتھ ساتھ بابل ونینوا، ایران وغیرہ کے میل جول سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن ملتان کے اس تقدس نے جو اسے اوتار بھومی (یعنی دیوتا کی پیدائش کی جگہ) ہونے کی وجہ سے حاصل تھا، اپنے گرد و پیش کے علاقوں پر خاصہ مؤثر ہوا ہوگا۔ یہ اصولی بات ہے کہ مقدس شہر کے رسم و رواج کو اکثر لوگ مذہبی روایات میں داخل کر لیتے ہیں۔ اس کی مثال ہولی کا تہوار ہے، جس کا واقعہ کے طور پر ہونا ملتان سے وابستہ ہے اور یہ تہوار قریب قریب سارے ہندوستان میں منایا جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ملتان کے تاریخی تقدس کا ثقافتی اثر ہے کہ آج سارے ہندوستان میں ہزاروں سال سے ہولی کا تہوار منایا جاتا ہے۔ گو ملتان آج ان ہندوستانی روایات کے پجاریوں سے خالی ہے اور پاکستان بن جانے کے بعد یہ تہوار اب نہیں منایا جاتا لیکن بھارت میں آج بھی ملتان کی مذہبی ثقافتی روایت کا دن اسی طرح شان و شوکت سے منایا جاتا ہے اور یہ ملتان کی سارے بھارت اور پاکستان پر قدامت کے لحاظ اور تقدس کی حیثیت سے فوقیت ہے جس کا انکار کرنا تاریخی روایت اور قدیم ثقافت کے ساتھ ناانصافی ہے۔

علمی ثقافتی دور

قباچہ کا دورِ حکومت بھی ملتان کے لیے ایک خاصہ علمی دور تھا۔ قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد ناصر الدین قباچہ بھٹنڈہ اور اس سے کچھ اوپر کے علاقہ سے، لیکن اور ملتان اور سندھ تک اس کی حکومت میں شامل تھا۔ التمش اور قباچہ دونوں قطب الدین ایبک کے داماد تھے۔ ہندوستان کی حکومت اس طرح ان دونوں میں تقسیم ہوئی۔ ملتان اس وقت اپنے ثقافتی اور علمی وقار کے لحاظ سے ہندوستان کے دوسرے شہروں پر فوقیت رکھتا تھا۔ کیونکہ ملتان میں اس وقت غوث بہاء الدین زکریاؒ اور دیگر علماء کی وجہ سے علمی طور پر مرجع خلائق تھا اور جو بھی عالم عرب و عراب سے رخ کرتا سیدھا ملتان پہنچتا۔ سہروردیہ اور چشتیہ کے صوفیاء اور مشائخ یاں شریعت و طریقت کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔ مقامی علماء کے علاوہ باہر سے اہل علم و دانش کی مجلسیں گرمائے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے ملتان کا ذکر کرتے ہوئے سیر الاولیاء کا مصنف لکھتا ہے:

"قبہ دریں ایام ملتان قبۃ الاسلام عالم بود۔ فحول علماء آنجا حاضر بودند"

ایسا ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ ادھر التمش جیسا پرہیزگار اور نیک دل بادشاہ تخت دہلی پر متمکن تھا جس کی مجلس میں بڑے بڑے مشائخ اور عالم موجود تھے اس لیے قباچہ نے بھی ملتان میں علماء کرام اور ادباء کی دریا دلی سے دل نوازی کی اور ہر طرف اہل فن کھچ کر ملتان میں جمع ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ تاتاریوں کی قتل و غارت سے بھی بڑے بڑے علماء جان کی حفاظت کے لیے ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ ملتان راستے میں پڑتا تھا اس لیے ان کا قیام اول ملتان میں ہوتا

اور قباچہ ان کی بڑی تکریم کرتا اور انہیں انعام و اکرام سے نوازتا۔ یہاں تک کہ محمد عوفی جیسے مؤرخ و تذکرہ نگار کی قسمت بھی قباچہ کے دامن سے وابستہ ہوئی اور وہ قباچہ کے علمی دربار کی اس طرح عکاسی کرتا ہے:

''یہ دربار علماء و فضلاء سے پُر ہے، یہ ایک ایسا آسمان ہے جس میں ارباب کمال کے ستارے چمکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بوستان ہے جہاں فضل کی کلیاں اور ہنر کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں۔''

عوفی نے چند اہل علم کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جن میں سے الاجل المحترم شمس الدولہ والدین سید الندما، محمد الکاتب البلخی فخر الشعراء ضیاء الدین السنجری اور ملتان کے فضلی ملتانی قابل ذکر ہیں۔ جن کی شاعری اور علمی عظمت اس دور میں مسلم تھی۔ شمس الدین بلخی عالم و شاعر ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کا خطاط تھا اور اپنے دور کے مشہور و معروف خطاط ابن البواب اور ابن مقلمہ سے فن خطاطی میں بڑھا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسا جوان ہے جس کی نظیر چرخ پیر نے نہیں دیکھی۔ اور چکر لگانے والے آسمان نے اس جیسا جامع صفات کسی اور کو نہیں پایا۔

یہ حال تو بلخی کی خطاطی کا تھا مگر اس کی شاعری کا بھی یہی حال تھا کہ اسے انوری کا ہم پلہ قرار دیا گیا۔ ''در شعر عدیل انوری'' یہاں تک کہ بلخی کو تاج الفضلاء اور مفخر القدماء جیسے القاب سے نوازا گیا۔ قباچہ کی مدح میں اس نے جو کچھ شعر کی زبان میں لکھا اور سنایا اس پر اس کی بڑی قدر کی گئی۔

خود علامہ عوفی مصنف ''لباب الالباب'' جس نے ملتان کے دور کی علمی اور ثقافتی روداد قلمبند کی۔ فضلی ملتانی کا ہم درس تھا۔ فضلی ملتانی نے جب بخارا تک کا حصولِ علم کے لیے سفر کیا اور اہلِ علم لوگوں سے فیض یاب ہوا تو اس زمانے میں عوفی بھی اسی مکتب میں ان کے ساتھ شریکِ سبق تھے۔ امام فخر الدین رازی کی جامع النصیر وہیں حفظ کی۔ جب فضلی ملتان واپس آیا تو قباچہ نے اسے اپنا مصاحبِ مجلس بنا لیا۔ فضلی کی علمی قابلیت نے اسے بڑے بڑے علماء کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اور خود قباچہ اس کی حد سے زیادہ قدر کرتا تھا۔ فضلی نے بھی قباچہ کی شان میں قصائد لکھے:

اے ظفر ہمدم ترا از بخت برتا آمدہ
نامۂ تائید تو اِنّا فتحنا آمدہ
ناصر دیں خسرو دنیا قباچہ شاہِ مشرق
اے مہ چتر تو برگر دونِ مینا آمدہ
گر مثالت فی المثل رفتہ سوئے فعفور چین
بے توقف زد جواب تو اطعنا آمدہ

اس کے علاوہ فضلی ملتانی نے جو رباعیاں کہی ہیں اس سے اس کی شعری ذہانت کا پتہ چل جاتا ہے:

کردی مہیم زآں شبِ گیسو کہ تراست
نیکوست رفت و لیک بدخو کر تراست

در پہلوئے تیر مژہ مردم کش
احسنت زہے کماں ابرو کہ تراست

آغاز نہاد فتنہ بارش چہ کنم
چوں داشتہ ام محرم رازش چہ کنم
بسیار زخشم دست بر دست زدم
کوہ تاہ نشد دست لدازش چہ کنم

ہر لالہ کہ چشم کوہساری بودست
صد قطرہ زخون تاجداری بودست
مپسر بقدم سبزۂ بستان گستاخ
کاں وسمہ ابروی نگاری بودست

فضلی ملتانی کے ساتھ مولانا منہاج الدین خورجانی کا نام لینا بھی ضروری ہے اور قباچہ کی نظرِ عنایت مولانا پر خاص تھی۔ اوچ میں جو مدرسہ فیروزیہ تھا قباچہ نے اس کا پرنسپل مولانا منہاج الدین کو مقرر کیا۔ مولانے نے اسے بڑے احسن طریقے سے چلایا۔ قباچہ کی شکست کے بعد مولانا ہندوستان چلے گئے۔ اسی طرح جب ماورالنہر سے مولانا کاشانی تاتاریوں کی غارت گری اور سفاقی کے زمانہ میں ہجرت کر کے ملتان پہنچے تو قباچہ نے ملتان میں ان کے لیے بھی بہت بڑا مدرسہ قائم کیا اور ساتھ ہی ایک مسجد تعمیر کرائی۔ مولانا کاشانی تازیست اس مدرسہ کے پرنسپل رہے جیسا کہ تاریخ فرشتہ میں آیا ہے:

"چوں مولانا قطب الدین کاشانی از ماوراءلنہر بہ ملتان ہجرت رسیدہ۔ شاہ ناصر الدین قباچہ والیِ ملتان سرائے با مدرسہ برائے او بنا نمود و مولانا کہ علامہ روزگار بودند بامداد دراں و رسہ نماز گزارہ تدریس گفتن بہ پرداخت۔"

اس طرح تمام عراق وعجم کے رائج کردہ علوم وفنون کے لیے ملتان اور ہندوستان کے لیے راہیں کھل گئیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ بغداد کی عباسیہ خلافت کا خاتمہ ہو رہا تھا اور تاتاریوں کی یورشیں مشرقی اور شمالی یورپ سے لے کر ہندوستان تک کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ خود قباچہ کے زمانہ میں ملتان پر تاتاری مغلوں کا حملہ ہوا اور اسے پسپا کر دیا گیا تھا۔ ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ مشرق وسطیٰ میں کسی بھی طرف آرام کی زندگی لوگوں کو نصیب نہ تھی۔ اس انتشار و بے چینی سے ثقافتی مرکزوں کو اس قدر نقصان پہنچ چکا تھا کہ تاریخ ان پر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکی۔ اصفہان،

بخارا اور بغداد کی تباہی عالمِ اسلام کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ شیخ سعدی نے جو مرثیہ بغداد کی تباہی پر لکھا ہے اس سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلامی ثقافتی اور تہذیبی مرکزوں پر کیا گزر چکی تھی۔ یہی غارت گری ملتان کی طرف بھی کئی بار بڑھتی رہی جس کو قدرت نے بچائے رکھا۔ قباچہ سے شکست کھانے کے بعد ایک بار پھر مغلوں نے ملتان پر حملہ کیا، مگر اس دفعہ غوث بہاء الدین زکریاؒ نے ایک لاکھ تنکہ یعنی رائج الوقت سکہ مغلوں کو دے کر ملتان کو تباہی سے بچا لیا۔ اس طرح اس وقت ملتان کی صورتِ حال یہ تھی کہ ملتان علمی گہوارہ تھا اور ہر فن کے ماہر یہاں سکونت اختیار کر چکے تھے۔

بلبن نے اپنے شہزادوں کی اعلیٰ پیمانے پر تربیت کی تھی۔ ان کے لیے جید علماء مقرر تھے۔ اور ادباء و شعراء جن کی علمی حیثیت مسلم تھی ان کی مجلس میں بلبن دونوں شہزادوں کو تربیت کے لیے بھیجتا تھا۔ اس طرح ایک شہزادہ باذوق اور ذہین بن گیا۔ شہزادہ محمد کی دلچسپی نے اس کے گرد ادباء و شعراء کا ایک وسیع حلقہ قائم کر دیا۔ جب شہزادہ محمد کو بلبن نے ملتان کا حاکم مقرر کر کے روانہ کیا تو اس کے ساتھ اہلِ علم کا جمِ غفیر بھی تھا۔ ایک تو ملتان پہلی ہی سے علم و فن کا گہوارہ بن چکا تھا اب آسمانِ علم کے درخشاں ستارے ایک دور میں اکٹھے ہو گئے اور ملتان کے دن رات علم کی روشنی سے منور نظر آنے لگے۔

ملتان میں اس وقت شیخ صدر الدین فرزند شیخ الاسلام غوث بہاء الدین زکریا کی مجلسِ علم و فضل بڑے عروج پر تھی کہ دہلی اور دوسری جگہوں کے اہلِ علم بھی ملتان آ گوے تھے مورخ برنی شہزادہ محمد کی مجلس کی یوں عکاسی کرتا ہے۔

> ''وہ (شہزادہ محمد) نہ صرف اپنی شجاعت وہ نبرد آزمئی، تدبر اور بصیرت کی وجہ سے سب کی نظروں میں مقبول تھا، بلکہ اپنی عام عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی خواص و عام اور مشائخ و علماء سب کی نگاہوں میں محبوب تھا۔ اس کی تہذیب و شائستگی کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو دن کا دن اور رات کی رات گزر جاتی، لیکن اپنا زانو تک نہیں بدلتا۔ کسی نے اس کی زبان سے کوئی نا ملائم لفظ نہیں سنا۔ مشائخ سے ان کا ادنیٰ خادم بن کر ملتا۔ ایک روز عثمان اور حضرت شیخ بہاء الدین کے فرزند حضرت صدر الدین دوسرے درویشوں کے ساتھ شہزادہ کے یہاں ایک مجلسِ سماع میں شریک ہوئے۔ عربی اشعار پر ان درویشوں پر وجد طاری ہو گیا اور وہ رقص کرنے لگے۔ شہزادہ بھی دست بستہ کھڑا ہو گیا اور زار و قطار رو رہا تھا۔''

اس وقت علمی مجلسوں میں با قاعدہ آج کی طرح تنقید و تبصرہ ہوتا۔ قدیم شعرا کے اشعار پڑھے جاتے اور

ان پر خوب بحث ہوتی اور اہل علم اپنی اپنی رائے دیتے۔ برنی لکھتا ہے:

''شہزادہ کی مجلس فضلاء و شعراء سے ہمیشہ بھری رہتی تھی اور اس میں برابر شاہنامہ فردوسی، دیون سنائی، دیوان خاقانی اور خمسہ نظامی پڑھے جاتے۔ پھر ان پر بحث و تحیص ہوتی۔ اگر مجلس میں کوئی قدیم شعر ایسا پڑھ دیتا جو پند و نصائح سے بھرا ہوتا تو شہزادہ اس کو سن کر رونے لگتا!''

مذکورہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجلسیں کیا تھیں، باقاعدہ ایک قسم کا اس زمانے کے مطابق تنقیدی اجلاس ہوتے تھے جس میں آزادئ خیال اور تنقید فن دونوں کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ انہی مجلسوں میں حسن سنجری اور امیر خسرو جیسے امام فن و شعر و سخن موجود ہوتے تھے جن کی ادبی زندگی آج بھی چراغِ راہِ فن ہے۔ غرض پانچ یا چھ سال تک یہ علمی اور فنی دربار ملتان میں قائم رہا اور شہزادہ محمد کی شہادت کے بعد یہ علمی دربار منتشر ہو گیا۔

ہمیں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ امیر خسرو جیسا ماہر فن موسیقی جسے متفقہ طور پر نائک تسلیم کیا گیا ہے، ملتان میں ایک عرصہ تک قیام کرے اور ملتان میں فنِ موسیقی میں ترقی نہ ہو جبکہ صوفیاء کی مجلس میں سماع لازم ہو۔ امیر خسرو کے فن کا اثر ضرور ملتان پر ہوا ہوگا۔ کیونکہ امیر خسرو ہندوستانی موسیقی میں ایک نئے رنگ اور روپ سروپ کا اضافہ کرنے والے ہیں۔ جنہوں نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج سے ایک نئے انداز اور سکول کا اضافہ کیا۔ اور اس زمانے میں یہ فنی ترقی پسندی تھی۔ یقیناً پانچ سال کی مدت میں ملتان کی موسیقی میں بھی اس انداز کا اثر پورے طور ہوا ہوا گا۔ اسی طرح امیر خسرو نے جتنے اعلیٰ قصیدے لکھے ہیں وہ اکثر ملتان میں لکھے ہیں اور وہ شہزادہ محمد کی شان میں ہیں۔ کیونکہ ملتان میں دوسرے شعراء سے سبقت لینے کی امنگ ملتان میں شہزادہ محمد کی علمی دربار کی وجہ سے تھی۔ ان ہی دنوں میں امیر خسرو نے فریابی اور کمال اسمٰعیل کے قصیدوں کو سامنے رکھ کر شہزادہ محمد کی شان میں قصیدے کہے تھے۔

لیکن ہم اگر ایران کے بہت بڑے شاعر و فلسفی کا ذکر نہ کریں تو یہ ملتان کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ جہاں ملتان کی سرزمین سے ہزاروں طالب علم فیض یاب ہو کر نکلے، وہاں فخر الدین عراقی جیسا فردِ فرید بھی صفحہ اول میں اپنی قلندرانہ شان کے ساتھ قلعہ کہنہ ملتان کی خانقاہ غوث بہاء الدین زکریاؒ کے حجرہ میں اپنی مشہور غزل لکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عراقی ہمدان سے بالکل نوجوانی کے عالم میں قلندروں کے ٹولہ کے ایک خوبصورت لڑکے کے عشق میں سر کے بال اور بھنویں وغیرہ منڈوا کر اسی ٹولے کے ساتھ قریہ قریہ، گاؤں گاؤں گھومتا ہوا ملتان پہنچتا ہے۔ نگاہِ غوثیہ کا شکار ہو جاتا ہے اور مریدی میں داخل ہو جاتا ہے بیس برس تک ملتان میں آستانۂ زکریا سے فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مُرشد اپنی دختر نیک اختر عراقی کے عقد میں دے دیتا ہے۔

عراقی کی استعدادِ باطنی ملتان میں اس قدر نکھرتی ہے کہ عراق و مصر تک عراقی کا شہرہ پھیل جاتا ہے اور ایک دنیا عراقی کے علم و فضل اور شانِ قلندرانہ کی گرویدہ ہو جاتی ہے جب غوث بہاء الدین زکریا کا وصال ہو جاتا ہے تو

خرقۂ خلافت اور سجادہ نشینی عراقی کے سپرد ہوتی ہے۔ لیکن عراقی کی قلندرانہ آزادی اور محفل شعر و سماع سے ملتان کے علماء اس کے خلاف سلطانِ وقت سے شکایت کرتے ہیں، مگر عراقی اس سے پہلے کہ اسے خانقاہ چھوڑنے کو کہا جائے خود ملتان چھوڑ کر ایران چلا جاتا ہے غرض ایران و عراق اور مشرکت اس کی انتہائی تکریم کی جاتی ہے اور مصر میں تو علمائے مصر کو یہاں تک حکم دیا جاتا ہے کہ ہفتہ یا مہینہ میں ایک بار عراقی کا درس سنا کریں۔ اس طرح عراقی مصر میں قونیہ میں آتا ہے اور شیخ اکبر ابن عربی کے خلیفہ شیخ صدر الدین کی صحبت اختیار کرتا ہے اور وہیں ابن عربی کے مسلک کو بھی جذب کرتا ہے اور نصوص الحکم کا اس عمر میں درس لیتا ہے اور اس کی ایک نقل ملتان میں شیخ رکن عالم کی خدمت میں روانہ کرتا ہے۔ اس طرح عراقی فلسفہ و تصوف اور شعر کی دنیا کا صفِ اول کا فرد شمار ہونے لگتا ہے۔ خود علامہ اقبال عراقی کے مسئلہ زبان و مکان کا ذکر اپنے خطبات میں کرتا ہے اور عراقی کی مشہور غزل:

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
زچشم مست ساقی دام کردند

اقبال اور ملتان

غوث بہاء الدین زکریا کے خلفاء میں سے ہم ایک ایسے صاحبِ علم و عرفان بزرگ کا تذکرہ کرتے ہیں جس کے افکارِ عالیہ سے پیدا شدہ فلسفیانہ عنوانات نے بیسویں صدی کے شاعر و فلسفی علامہ اقبال مرحوم کو بھی متاثر کیا۔ کون ہے جو اس بات کا انکار کرنے کی جرات کرے کہ فکرِ انسانی ہمیشہ ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ ارتقائے فکر کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان گو زمانی طور پر کئی صدیوں کا فاصلہ رکھتا ہو، لیکن مسائل و نظریات ہمیشہ تاریخی طور پر متاثر کرتے رہے ہیں۔ تہذیب و تمدن اور فکر و عمل کی ارتقائی صورت پذیری اس بات کی شاہد ہے کہ بنی نوع انسان ہمیشہ روایات و نظریات سے استفادہ کرتی رہی ہے۔ یہی وہ اثر و نفوذ ہے جو علامہ اقبال پر بھی اثر انداز ہوا تھا۔ جس کو بہت کم لوگوں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

جس بات کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ ملتان کے مکتبۂ ہائے فکر کی بات ہے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ ملتان علوم و فنون کا ہزاروں سال گہوارہ رہا ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری تو علمی طور پر اپنے ہمعصر شہروں میں ممتاز نظر آتا ہے۔ جبکہ غوث بہاء الدین زکریا اور کاشانی کی درسگاہ طالب علموں کے لیے ظاہری اور باطنی علوم کے لیے نعمتِ عظمیٰ تھی۔ درسگاہِ زکریاؒ کا ایک صوفی طالب علم ایک زمانہ تک پختگی فکر سے مالا مال ہو کر اور عرفانِ باطنی کے سمندر سے جواہرِ انمول حاصل کر کے خراسان میں رشد و ہدایات کی شمع روشن کرتا ہے۔ جسے سید امیر الحسینی کے نام سے دنیا اچھی طرح جانتی ہے۔ ایران کے معروف صوفی فلسفی شاعر محمود شبستری کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں، جن کی صوفیانہ علم الکلام کی منظوم تصنیف گلشنِ راز آج تک علم و عرفان کے پروانوں کو اپنی طرف بلا تامل کھینچ لیتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے اس دور میں جبکہ مسلمانوں میں سیاسی زوال کے اسباب مکمل ہو چکے یعنی خلافت عباسیہ

مشرقِ وسطیٰ میں اپنا اقتدار کلی طور پر کھو چکی تھی اور ہلاکو خان کے ہاتھوں عالمِ اسلامی میں ایک خون کا دریا بہہ چکا تھا۔ ساتھ ہی احساسِ خودی اور خود اعتمادی مسلمانوں میں ختم ہو چکی تھی۔ ایسے وقت میں امیر الحسینی نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے 18 سوال لکھ کر محمود شبستریؒ کی خدمت میں ارسال کئے۔ یہ سوال منظوم تھے۔ علامہ شبستری نے بھی جواب منظوم ہی دیا اور اس کا نام ''گلشنِ راز'' رکھا۔ علامہ اقبالؒ نے انہی 18 سوالوں میں سے 9 سوال لے کر ''گلشن راز جدید'' لکھی۔ سید امیر الحسینی کے ان سوالات کو علامہ اقبال نے کیوں اپنا موضوع بنایا۔ علمی دنیا سے رابطہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ اپنے وقت کا نابغہ (Ginias) جب تک کسی بات کو اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں پاتا اس وقت تک وہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتا۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ملتان کی علمی فضا سے تربیت یافتہ طالب علموں کی بصیرت کتنی دور رس تھی اور فکر کی بلندی آنے والے تقاضوں کو چھو رہی تھی۔ گویا جن مسائل کو چھ سو برس بعد پیدا ہونا تھا امیر الحسینی کی پختہ فکر نے پہلے پیش کر دیا۔ ملتان کے اس طالب علم صوفی کی بلندیٔ فکر کا تاریخ نے پورا پورا ثبوت مہیا کیا۔ جبکہ مغربی لادینیت نے قلب کی گہرائیوں سے احساسِ خودی کو محو کرنے کی سعی لاحاصل کی تو علامہ اقبال کی نظرِ انتخاب میں جہاں رومی کو اپنے لیے راہبر مان لیتی ہے وہاں اپنی تصنیف یعنی ''گلشنِ راز جدید'' کے لیے سید امیر الحسینی کے سوالات کو کتاب کے مواد اور تجربہ وارداتِ تاریخی کے لیے موضوعِ فکر بتاتی ہے۔ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں کہ جب کسی فرد کے خیالات کو یا مفکرانہ مسائل کو اس کے ہمعصر لوگ یا بعد میں آنیوالے مفکرین اپنا موضوع فکر بناتے ہی تو اس شخص کی علمی اور مفکرانہ عظمت کا اقرار کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ یقیناً یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ موضوعِ فکر بنانے والا مفکر اسے فکر ونظر کے اسلوب و انداز سے ہمنوا ہے اور اپنے مفکرانہ تجربات کے اظہار کے لیے اس پہلے شخص کا معترف اور اس کے خیالات سے ضرور متاثر ہے۔ اس لحاظ سے علامہ اقبال جہاں اوروں سے متاثر ہے میرے نزدیک جبکہ شواہد خود علامہ اقبال کی زبان وقلم سے موجود ہیں اس اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اب ہم اُن سوالات کو پیش کرتے ہیں اور پھر ان کے جواب میں علامہ اقبالؒ کے صرف تین تین شعر پیش کریں گے۔ جو صاحب مکمل جواب مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ زبورِ عجم میں گل راز جدید مکمل چھپی ہوئی دیکھ سکتے ہیں۔

سوالات و جوابات ملاحظہ ہوں:

سوال نمبر 1

نخست از فکرِ خویشم در تحیر
چہ چیز است آنکہ گویندش تفکر
کدا میں فکر مارا شرط راہ است
چرا گہ طاعت و گاہے گنہ است

جواب

درونِ سینۂ آدم چہ نور است
چہ نور است ایں کہ غیب او حضور است
من اورا ثابت سیار دیدم
من اورا نور دیدم نار دیدم!
گہے نازش زبرہان و دلیل است
گہے نورش زجانِ جبرئیل است

سوال 2
چہ بحر است ایں کہ علمش ساحل آمد؟
زقعرِ اوچہ گوہر حاصل آمد؟

جواب
حیاتِ پُر نفس بحرِ روانے
شعور و آگہی اورا کرانے
چہ دریائے کہ ژرفِ موجدار است
ہزاراں کوہ صحرا برکنار است
مبرس. از موج ہائے بیقرارش
کہ ہر موجش بروں جست از کفارش

سوال 3
وصالِ ممکن و واجب بہم چسیت؟
حدیثِ قرب و بُعد و بیش و کم چسیت؟

جواب
سہ پہلو ایں جہانِ چوں و چند است
خود کیف و کم اورا کمند است
جہانِ طوسی و اقلیدس است ایں

پۓ عقلِ زمیں فرسا بس است ایں
زمانش ہم مکانش اعتباری است
زمین و آسمانش اعتباری است

سوال 4

قدیم و محدث از ہم چوں جدا شد
کہ ایں عالم شد آں دیگر خدا شد
اگر معروف و عارف فراتِ پاک است
چہ سودا اور سرِ ایں مُشتِ خاک است

جواب

خودی را زندگی ایجاد غیر است
فراقِ عارف و معروف خیر است
قدیم و محدثِ ما از شمار است
شمارِ ما طلسمِ روزگار است
دما دم دوش و فردامی شماریم
بہ ہست و بود و باشد کار داریم

سوال 5

کہ من باشم مرا از من خبر کن
چہ معنی دارد اندر خود سفر کن

جواب

خودی تعویذِ حفظِ کائنات است
نخستیں پرِ تو ذاتش حیات است
حیات از خوابِ خوش بیدار گردد
درونش چوں یکی بسیار گردد

نہ اور اب نمودِ ما کشودے
نہ مارا بے کوشدِ او نمودے

سوال 6

چہ جزو است آنکہ او از کل فزوں است؟
طریقِ جستنِ آں جزو چوں است؟

جواب

خودی زاندازہ ہائے افزون است
خودی زاں کل کہ تو بینی فزوں است
زگردوں بار بار افتد کہ خیزد
نہ بحرِ روزگار افتد کہ خیزد
جزار در زیرِ گردوں خود نگر کیست
بہ بے بالی چناں پرواز گیر کیست

سوال 7

مسافر چوں بود رہرو کدام است؟
کہ اگویم کہ او مردِ تمام است؟

جواب

اگر چشمے کشائی بر دلِ خویش
دورونِ سینہ بینی منزلِ خویش
سفر اندر حضر کردن چنیں است
سفر از خود بخود کردن ہمیں است
کسے ایں جاند اند ما کجائیم؟
کہ در چشمِ مہ و اختر نیائیم

سوال 8

کدامی نکتہ رافطن است انا الحق
چو گوی ہر زہ بود آں رمزِ مطلق

جواب

من انسہ رمزِ اناالحق بار گویم
دگربا ہند و ایراں راز گویم
معنے در حلقۂ دیر ایں سخن گفت
حیات از خود فریبے خور دومن گفت
خدا خفت و وجودِ ماز خوابش
وجودِ ما نمودِ ما زخوابش

سوال 9

کہ شد برسرِ وحدت واقف آخر؟
شناسائے چہ آمد عارف آخر؟

جواب

تہِ گردوں مقامِ دل پذیر است
ولیکن مہر و ماہش زود میر است
بدوشِ شام نقشِ آفتابے
کواکب راکفس از ماہتابے
پرو کہسار چوں ریگ روانے
دگرگوں می شود دریا بآنے

یوں تو والیانِ ملتان علم وفضل کی خدمت میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے لیکن حسین خاں لنگاہ کے زمانہ میں علوم وفنون کو بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ باوجود اس کے مولانا عزیز اللہ اور عبداللہ یہ دونوں بھائی ملتان چھوڑ کر دہلی اور سنبھل جا بسے تھے۔ مگر پھر بھی ملتان میں ہر فن کے ماہرین اور علماء کا ایک جم غفیر درس وتدریس میں پورے طور پر حصہ لے رہا تھا۔ اور اس کے باوجود کہ ملتان آئے دن تباہی و بربادی سے دو چار ہوتا تھا مگر اس کی تاریخی علمی اور فنی زندگی میں حتی الوسع کمی نہیں ہونے پائی۔ مولانا عبداللہ اور مولانا عزیز اللہ ہندوستان میں علم وفضل کی بارش برسا رہے تھے اور مولانا سعد اللہ

لاہوری ملتان میں علم وفضل کے خزانے لٹا رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ نہیں ملتان میں بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہر حال اس دور میں حسین خاں لنگاہ ملتان کے لیے بہت فیاضی سے کام لے رہا تھا اور علمی و ثقافتی ترقی ہر وقت اس کے پیش نظر تھی۔ مولانا ابوالحسنات ندوی ''ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں'' نامی کتاب میں لکھتے ہیں:

''سلاطینِ ملتان میں سے حسین خاں لنگاہ علوم وفنون کا بہت بڑا مُربی گزرا ہے۔ مصنفین اور اربابِ فضل وکمال کا سرپرست اور مددگار تھا۔ ہمیشہ مالی امداد اور مناسب وظائف سے ان کی ہمت افزائی کیا کرتا تھا۔ جس کے باعث اس کے حدودِ حکومت میں فضلاء اور اربابِ علم و فن کی بڑی کثرت وجمیعت ہوگئی تھی اور ملتان علمی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کی حکومتوں میں ممتاز تھا شاہ حسین لنگاہ نے متعدد مدرسے قائم کئے جن میں ممتاز ومشہور اساتذہ وقت مشغول درس و تدریس رہتے تھے۔''

تاریخ فرشتہ میں ایک روایت آتی ہے جس سے حسین خان لنگاہ کی ثقافتی ترقی کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔ سکندر لودھی اور مظفر شاہ گجراتی سے حسین خاں لنگاہ کے دوستانہ مراسم بڑھنے شروع ہوئے۔ شاہ حسین نے سوچا کہ مظفر شاہ کی طرح محل وعمارات تعمیر کرائے اس غرض سے اس نے قاضی محمد کو جو اپنے فضل وکمال میں یکتائے روزگار تھا بھیجا تا کہ گجرات کا پوری طرح ثقافتی جائزہ لے کر آئے۔ فرشتہ کا بیان ہے:

''حسین خاں لنگاہ نے قاضی محمد کو جو فضل وکمال سے آراستہ تھا، قاصد بنا کر سلطان مظفر کی خدمت میں روانہ کیا۔ حسین حاں لنگاہ نے قاضی محمد کو تاکید کر دی تھی کہ جب تم سلطان مظفر سے رخصت ہونے لگو تو درخواست کرنا کہ اپنے خاص ملازمین کو تمہارے ساتھ اس غرض سے کرے کہ تمام محلات وغیرہ تمہیں دکھا دیں۔ سلطان حسین لنگاہ کی منشا تھی کہ سلاطینِ گجرات کے مذاق کے مطابق ان کے محلات کی طرزِ تعمیر کے مطابق خود بھی ملتان میں محل تعمیر کرائے۔''

غرض قاضی محمد گجرات پہنچا اور تحائف و ہدیئے پیش کر کے رخصت کے وقت بادشاہ کے حکم سے منازلِ سلطان کی سیر کرنے کی درخواست کی۔ سلطان مظفر نے اپنے خدمتگاروں کو قاضی محمد کے ہمراہ کر دیا۔ اس طرح گجرات کے تمام منازلِ سلطانی کی سیر کر لی۔ قاضی محمد گجرات سے ملتان واپس آیا اور جوابِ پیغام ادا کرنے کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ گجرات کی عمارتوں کا کچھ حال بھی بیان کرے۔ قاضی محمد نے بادشاہ سے کہا کہ گجراتی منزلوں کی خوبی بیان کرنے سے زبان قاصر ہے۔ حضور اس دعاگو کی گستاخی معاف فرمائیں۔ اگر تمام مملکتِ ملتان کا یکسالہ

خراج اس طرح کی ایک عمارت تعمیر کرانے میں صَرف کر دیا جائے تو بھی احتمال ہے کہ عمارت تمام ہوگی یا نہیں۔ حسین شاہ اس گفتگو سے بہت ملول ہوا۔ عماد الملک تو لک نے جو منصبِ وزارت پر فائز تھا جرات کر کے بادشاہ سے عرض کی کہ اقبالِ شاہی روز افزوں باد، حضور کے حزن و ملال کا سبب کیا ہے؟ حسین شاہ لنگاہ نے جواب دیا کہ شاہی کا لفظ تو میرے نام کا جزو ہو گیا ہے۔ لیکن حقیقتاً میں اس مرتبہ کی رفعت و شان سے محروم ہوں اور اس بد نصیبی کے باوجود بھی روزِ قیامت میرا حشر گروہ شاہاں میں ہوگا۔ عماد الملک نے جواب دیا کہ بادشاہ کو اس خیال پر رنجیدہ نہ ہونا چاہیے۔ خدا نے ہر ملک کو ایک خوبی کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ جو دوسرے ممالک میں نادر الوجود ہے۔ اگر گجرات، دکن، مانڈہ، اور بنگالہ کے ممالک اپنی زرخیزی میں مشہور ہیں اور وہاں اسبابِ عیش و عشرت آسانی اور خوبی کے ساتھ حاصل ہو سکتے ہیں تو خاکِ ملتان مردم خیز ہے۔ ظاہر ہے کہ بزرگانِ ملتان جس سرزمین میں گئے معزز و مکرم رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ حضرت غوث بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کا خاندانِ عالی شان ملتان کے اندر اب بھی موجود ہے جو معزز مہمان بہلول لودھی اور اس کے سمدھی شیخ یوسف سے ہر طرح بہتر و افضل ہیں۔ اسی طرح طبقہ بخاریہ میں چند بزرگ افراد ملتان میں ایسے موجود ہیں جو ظاہری اور باطنی کمالات میں حاجی عبدالوہاب پر فضیلت رکھتے ہیں۔ اسی طرح فرقۂ علماء میں مولانا فتح اللہ اور ان کے شاگردِ رشید مولانا عزیز اللہ بھی خاکِ ملتان سے پیدا ہوئے ہیں اور ان بزرگوں کے وجود پر سارا ہندوستان فخر کر رہا ہے اور یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ حسین خاں لنگاہ اس بات سے نہایت خوش ہوا۔

ملتان سے گئے ہوئے دونوں بھائی عزیز اللہ اور عبداللہ ہندوستان پہنچے تو ان کا جس طرح استقبال کیا گیا۔ وہ تاریخوں میں موجود ہے۔ خود سکندر لودھی مولانا عبداللہ سے اس قدر مرعوب تھا کہ مولانا کے درس میں جاتا تو خاموش ایک طرف بغیر اطلاع کے بیٹھ جاتا۔ جب مولانا درس سے فارغ ہوتے تو سلام عرض کرتا۔ مولانا عبداللہ تا حیات علومِ اسلامیہ اور فلسفہ کا درس دیتے رہے۔ ''ہندوستان کی قدیم درسگاہوں'' کا مصنف مولانا ابوالحسنات لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں انہی دنوں بھائیوں سے علومِ اسلامیہ کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح مولانا عزیز اللہ سنبھل میں جا کر مقیم ہوئے۔ اور سینکڑوں طلبہ اکتسابِ علوم کر کے اپنے دور کے مجتہد کہلائے۔ ان میں سے ایک مولانا شیخ حاتم ثم سنبھلیؒ ہیں جن کے متعلق تاریخ بنی اسرائیل کے مصنف لکھتے ہیں:

> ''مولانا محمد حاتم علامۂ وقت، اعلیٰ درجہ کے سخی اور متواضع تھے۔ اس زمانہ میں کوئی ایسا عالم جامع معقول و منقول نہ تھا۔ خصوصاً علمِ علام اور اصول و فقہ اور ادب میں بے نظیر تھے۔ فقہ میں گویا امام اعظم ثانی تھے ...... مدتوں انواغ علوم کا فیض آپ کی ذات سے جاری رہا۔ آپ صوری اور معنوی کمالات کی جامع شخصیت تھے۔''

ایسی شخصیت کن کی شاگرد تھی اور کس سے روحانی فیض حاصل کیا تھا؟ اس بارے میں یہی مصنف لکھتا ہے:

> ''(مولانا محمد حاتم سنبھلی) قیل و قال ظاہری کو ترک کر کے اپنے استاد

شیخ عزیز اللہ کے مرید تھے، جو کہ بہت بڑے عالم ربانی اور ولی کامل تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی جو اکبر کے زمانہ کا مورخ اور اکبری دین کی مخالفت کرنے والا تھا۔ مولانا حاتم کا شاگرد تھا اور مولانا محمد حاتم نے جب انہیں کلاہ اور شجرہ اپنے استاد کا دیا تو ملا عبدالقادر کے والد کو کہا کہ یہ میں نے اس لیے دیا ہے کہ میرے استاد عزیز اللہ کی نسبت سے علوم ظاہری سے بھی مستفید ہو۔''

مولانا عزیز اللہ کے فرزند مولانا عبدالرحمٰن ملتانی بھی اس دور میں یگانۂ روزگار تھے۔ اور علوم عقلیہ اور شریعہ کا لاہور میں درس دیتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد مولانا منور تھے۔ مصنف جواہر اسرائیل لکھتا ہے کہ:

''شیخ منور عالم بن شیخ عبدالمجید بن شیخ عبدالشکور بن شیخ سلیمان لاہور کو پانچویں واسطہ سے غوث بہاء الدین زکریا ملتانی سے فیض حاصل تھا دوسری طرف شیخ منور کو مولانا عزیز اللہ کے فرزند مولانا عبدالرحمٰن ملتانی کی شاگردی حاصل تھی۔''

یہی مصنف لکھتا ہے:

''(منور عالم) صورت و سیرت میں دلفریبی، زبان و بیان میں دلربائی بہت کچھ تھی۔ اکثر اپنے زمانہ کے جلسے میں اپنے حسن تقریر سے مناظرہ کو پیچیدگی اور الجھاؤ سے نکال کر تحقیق کے درجہ میں پہنچا دیتے تھے۔ جب میر فتح اللہ شیرازی بیجا پور دکن سے شہنشاہ اکبر کے فرمان کے مطابق آگرہ میں آئے تو ایک روز شیخ منور عالم سے بھی علم و دانش کی گفتگو ہوئی بہت سی پرانی لاینحل باتیں شیخ منور کی موشگافی سے فیصلہ کو پہنچیں۔ فتح اللہ شیرازی نے آپ کی تعریف کی۔''

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے کہ:

''995ھ میں عضد الدولہ علامہ میر فتح اللہ شیرازی کو جو صاحب دانش ملا مرزا جان کے ہم درس اور میر غیاث الدین منصور کے بالواسطہ شاگرد مشہور تھے۔ صوبہ کا جب منصب صدارت فتح اللہ شیرازی کو ملا اور سارنگ پور پہنچے تو شیخ منور سے بھی ملاقات ہوگئی۔ شیخ منور نے مقدمہ علوالع شرح فتح اللہ کے سامنے پیش کی جس کو خود عقیم اور منتج اشکال کے مطالب میں لکھا تھا اور انہیں اس پر فخر تھا۔ فتح اللہ نے

دوسرے روز فرمایا کہ میں نے اس باب میں چند باتیں لکھی ہیں۔ جن سے جواب پر اعتراض واقع ہوتے ہیں کسی شخص کو میرے ساتھ روانہ کر دو میں ان کو صاف کر کے اس شخص کے ہاتھ روانہ کر دوں گا۔ منور عالم کا آدمی دو تین منزل ساتھ گیا اور بغیر جواب کے واپس کر دیا گیا۔"

یعنی میر فتح اللہ شیرازی جیسے معقول عالم سے مولانا عبدالرحمٰن ملتانی کے شاگرد منور عالم کے اشکال کا جواب نہ ہو سکا۔ میری عرض اس سے یہ بیان کرنا ہے کہ معقولاتِ اور علومِ شرعیہ میں ملتان کے مدرسۂ فکر میں کتنی پختگی اور علم میں کتنا رسوخ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہندو پاک کی علمی تاریخ لکھی جاتی ہے تو ملتان سب سے پہلے نمبر پر آتا ہے۔ کیونکہ پہلا دارالعلم اور دار السلام ہر شہر میں کوئی نہ کوئی ایسا علاقہ ہوتا ہے جس کی اہمیت ثقافتی مرکز ہونے کی وجہ سے تاریخی طور پر مسلم ہوتی ہے۔ ملتان میں ہم حسین آگاہی کا اندرونی علاقہ جو شمال مشرق میں دولت گیٹ سے جاملتا ہے اور مشرق میں دہلی گیٹ سے اس علاقہ میں ایسی ایسی فن کار شخصیتیں ہوئی ہیں جن کا مقام یقیناً تاریخ میں انفرادیت رکھتا ہے۔ حسین آگاہی کے اندرونی علاقہ کی اہمیت کا سب سب بڑا سبب قلعہ کہنہ کی نزدیکی ہے۔ دولت گیٹ اور حسین آگاہی تو بالکل قلعہ کے مقابل ہیں۔ لوہاری گیٹ بھی کچھ اسی قسم کی صورتِ حال رکھتا ہے۔ حکام کی رہائش اور اعلیٰ طبقہ کے افراد کی آبادی کا ایک حصہ اکثر قلعہ میں سکونت رکھتا تھا۔ اس لیے نزدیکی علاقہ میں ہر قسم کے فن کار آباد تھے تاکہ حکامِ وقت سے رابطہ قائم رہے۔ اس طرح اعلیٰ درجے کے مصور، نقاش، کمان گر، اسلحہ ساز اور انجینئر وغیرہ حسین آگاہی کے اندرونی علاقہ میں آباد تھے۔ میاں غلام حسین جو اپنے دور کے بہت بڑے خطاط اور صوفی عالم بھی تھے اپنے قبیلہ کے ساتھ اندرون حسین آگاہی محلّہ کمان گراں میں رہتے تھے۔ حضرت مولانا مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف والوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور شاہ صاحب بھی ان سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ اکثر ایک دوسرے کو ملتے رہتے تھے۔ خط و کتابت بھی رہتی اور ایک سن میں دونوں کا وصال واقعہ ہوا تھا۔ راقم نے بھی نوجوانی میں میاں غلام حسین صاحب کی مجلسیں دیکھی ہیں۔ حسین آگاہی کے چوراہے پر اکثر ایک بڑے پلنگ پر بیٹھے ہوتے تھے اور اکثر صوفی مشرب لوگ اور خطاط ان کے پاس آتے۔ مجلسِ شعر اور صوفیانہ انداز کی گفتگو جاری رہتی۔ اپنے آباؤ اجداد کے متعلق فرماتے تھے کہ وہ غوث بہاء الدین زکریا سے پہلے براستہ ایران ملتان میں آئے تھے، نقاشی اور خطاطی اور کتابوں کی جلد سازی کا کام ملتان میں ان کے آباؤ اجداد کی وجہ سے اپنے عروج کو پہنچا تھا۔ بغداد اور کابل میں ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطاطی کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ حج سے واپسی پر والیٔ بغداد نے کئی دن انہیں مہمان ٹھہرایا تھا اور ان سے عربی قطعے لکھوائے تھے۔ ملتان کی مسجدوں پر جو کاشی گری کا کام نظر آتا ہے اس کے ماہر تھے۔ اور اکثر مسجدوں میں ان کے فن کے نمونے آج بھی تحسین پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر کبھی موقع ملا تو ان کے فن کے نمونے "نقش ملتان" نامی کتاب میں پیش کیے جائیں گے۔ حال ہی میں ایک مسجد کی تکمیل ہوئی ہے جو ان کے بھائی میاں اللہ وسایا کی نگرانی میں مکمل ہوئی ہے۔ نقاشی کے کام کا شاہکار ہے۔ یہ مسجد صوفی عطا محمد خاکوانی نے بنوائی۔

قریباً دو لاکھ روپے اس کے اوپر صرف ہوا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ملتان کے نقاشوں کی آخری یادگار ہے۔ جو بیرون لوہاری گیٹ چوک فوارہ کے جنوب میں واقع ہے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی فنی بلندی کی مستی کی وجہ سے اور اس کے ساتھ تعلیم کی کمی کی وجہ سے یا مرکزی شہروں کی دوری کی وجہ سے گمنامی میں رہ جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ان کے فن پارے دنیا کے بڑے بڑے عجائب خانوں میں موجود ہوتے ہیں لیکن انہیں کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی وہ اپنی شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک استاد اللہ بخش نقاش بھی ہیں جو اسی حسین آگاہی کے اندر رہتے ہیں۔ دو پہر اور شام کے بعد اکثر دہلی مسلم ہوٹل حسین آگاہی میں چائے پینے کے لیے آبیٹھتے ہیں۔ بالکل سادہ مزاج مگر قدرے جذباتی آدمی ہیں۔ اس وقت فنِ نقاشی میں وہ فردِ واحد ہیں۔

ایک دفعہ نواب بہاول پور کے ہاں کسی بہت بڑے برطانوی سفیر کی آمد تھی۔ نواب صاحب کی خاص بگھی کی ایک کھڑکی پر ایسی خراشیں آ گئی تھیں کہ وہ بھدی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بگھی فرانس سے بن کر آتی تھی۔ اس پر ریاست کا خاص نشان منقش تھا اور بہت ہی نفیس کام اس پر کیا گیا تھا۔ مگر وقت بہت کم تھا اور فرانس سے بن کر آنا کارے دارد تھا۔ ملتان ہی کے ایک ملازم نے کہا کہ یہ کام ملتان میں ہوسکتا ہے۔ نواب صاحب کو یقین نہیں آتا تھا۔ بادلِ نخواستہ بگھی کی کھڑکی ملازم کے ہاتھ ملتان روانہ کی گئی۔ راقم بھی اس کام سے عملی دلچسپی رکھتا تھا وہ کھڑکی استاد اللہ بخش کے پاس لائی گوی اور انہوں نے اس کی مرمت کر دی۔ نواب صاحب کی خدمت میں جب یہ کھڑکی پیش کی گئی تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہا۔ استاد اللہ بخش کی مرمت نے کھڑکی کی خراشیں مٹا دی تھیں اور اصل نقش اور مرمت میں کوئی فرق محسوس تک نہ ہوتا تھا۔ جس دن کے لیے وہ بنوائی گئی تھی وہ دن گزر گیا۔ بعد میں نواب صاحب نے نور محل میں اُستاد اللہ بخش کے کام کو جگہ دی۔ اور کافی عرصہ تک استاد اللہ بخش نواب صاحب کا کام کرتے رہے۔ قدِ آدم شیشوں پر بھی راقم کے سامنے کام ہوا۔ خود راقم نے بھی عملی طور پر استاد اللہ بخش، استاد عبداللہ اور استاد الٰہی بخش کے ساتھ حصہ لیا اور وہ نواب صاحب کے محل کی زینت بنے۔ ان پر فارسی اشعار بھی کھدائی کے ذریعے نمایاں کیے گئے۔ اسی طرح ایک خاص پلنگ بنایا گیا جس پر سونے کے ورق چڑھا کر قدیم نقاشی کا کام کیا گیا۔ جس میں سیاہ سفید اور سبز رنگ جو زمردی قسم کے رنگ کی جھلک دیتا ہے، استعمال کیا گیا۔ یہ کام استاد خدا بخش بڑے اور استاد عبداللہ نے کیا تھا۔

سب سے قدیم اور اعلیٰ نقاشی کے نمونے انہی لوگوں کے بزرگوں کے تونسہ شریف کے روضے اور مسجد میں ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض زیورات کے رکھنے کی صندوقچیاں اتنی اعلیٰ فنی شاہکار تھیں جو ان لوگوں نے بنائی تھیں۔ اسی طرح تیر و کمان پر یہ لوگ نقاشی کا کام کرتے تھے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کمان کو ایسی حکمتِ عملی سے طاقت ور بناتے تھے کہ اچھا جواب بھی اس پر چلہ نہ چڑھا سکتا تھا۔ تلوار کی میان پر بھی یہ لوگ سونے کا ورق چڑھا کر نقاشی کا کام کیا کرتے تھے۔ غرض ملتان میں یہ کام تقریباً سات سو برس سے رائج تھا اور اب رفتہ رفتہ ناپید ہو چکا ہے اور اس کی معمولی سی یادگار باقی رہ گئی ہے۔ چمڑے کے شیڈ لیمپ جو ملتان میں تیار ہوتے تھے نقاشی کے اس فن

کی باقیماندہ صورت ہے۔

چمڑے کی منقش صنعت کے موجود بھی یہی لوگ ہیں۔ کسی زمانہ میں عطر اور تیل وغیرہ کے لیے چمڑے کی کپیاں بنتی تھیں۔ پہلے ان پر یہ کام ہوتا تھا پھر اس کو ترقی دے کر گلدان بنائے جانے لگے جن کو تین استادوں نے بیک وقت رائج کیا استاد خدا بخش جو آج بھی 92 برس کی عمر میں زندہ ہیں، دوسرے استاد محمد بخش اور تیسرے استاد خدا بخش بہرہ۔ اس کے بعد اسی خاندان کے دوسرے لوگوں نے اس فن کو کافی ترقی دی۔ خاص کر استاد اللہ بخش نقاش مرحوم نے اس فن کو عروج پر پہنچایا۔ انہی نے شیڈ لیمپ بنانے میں پہل کی اور آج یہ فن حسین آ گاہی میں اپنے عروج پر ہے۔ اور سمندر پار ملکوں میں اس کی زبردست مانگ کی وجہ سے ہمارا ملک کافی زرِ مبادلہ حاصل کرتا ہے۔

اسی طرح یہاں تعمیرات کا ماہر خاندان بھی آباد ہے۔ جو سکندرِ اعظم کے وقت ملتان آ کر آباد ہوا تھا۔ یہ لوگ فن تعمیر میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان میں لکڑی کے کام کے ماہر بھی تھے۔ ان کے بزرگوں سے میری اکثر ملاقات رہتی تھی۔ نسل کے اعتبار سے یہ لوگ یونانی آرین تھے۔ بلو آنکھیں، قد خاصے لمبے، چوڑی کلائی، سرخی مائل گورے رنگ کے یہ لوگ ابھی تک یونانی خصوصیات کے حامل تھے۔ ان کے بزرگوں کے ہاتھ کا لکڑی کا کام مشرقی انداز کا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ مستری حیات محمد صاحب جو سو سال سے بھی زیادہ عمر کے ہو کر پاکستان بننے کے بعد فوت ہوئے ہیں۔ ماہر انجینئر تھے۔ اچھے اچھے انگیز ماہرِ تعمیرات ان سے مشورے لیتے تھے اور ساتھ ہی ان کی شکل وصورت دیکھتے تھے۔ مستری صاحب کہا کرتے تھے کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ہم یونانی ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے بزرگوں کا کام دیکھنا ہے تو بہاول پور سے آگے (کسی خانقاہ سے ملحق) ایک مسجد کا دراوزہ ہے، دیکھو جو لکڑی کے کام کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس مشرقی طرزِ فن کی ہلکی سی بھی جھلک نہیں ہے۔ آج بھی ان میں سے ایک دو فرد ایسے موجود ہیں جو اپنے کام کے ماہر ہیں۔ نشتر کالج کا جو ماڈل لکڑی کا اس وقت بطورِ یادگار وہاں موجود ہے وہ اسی خاندان کے ایک فرد استاد غلام محمد کا تیار کردہ ہے۔ مشہور سیاسی ورکر محترمہ بیگم جی اے خان جن کا خاوند کسی زمانے میں ملتان جیل کا سپرنٹنڈنٹ تھے اور پہلی جنگ عظیم میں انصاری گروپ کے ساتھ ترکی اور مصر وغیرہ میں گئے تھے، پٹھان فیملی سے تھے، اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی پر قریباً 1938ء کا واقعہ ہے مغلیہ آرٹ کے نمونہ پر ایک مُسہری (شب عروسی کے لیے خاص پلنگ) بنوائی جس کے لیے انہوں نے لاہور، دہلی وغیرہ سے مختلف ڈیزائن منگوائے تھے۔ مگر ملتان کا ڈیزائن پسند آیا اور یہیں کے استاد غلام حسین واستاد احمد حسن جو لکڑی کی مشبت کاری کے ماہرین میں سے تھے مسلسل تین ماہ کام کرتے رہے۔ اس مسہری کی چھت اور پائے وغیرہ پر سونے کے ورق چڑھا کر ملتانی نقاشی کا کام استاد خدا بخش اور استاد عبداللہ کرتے رہے اس مسہری کے مخمل کے خاص قسم کے پردے بھی بنوائے گئے جس پر سنہری سلمہ ستارہ کا کم مسلسل دو ماہ راقم مقالہ بھی بمعہ اپنے شاگرد کے کرتا رہا۔ میرا خیال ہے اگر اس وقت وہ مغل آرٹ کے نمونہ کی مسہری تیار ہو تو شاید ایک لاکھ روپیہ تو یقیناً خرچ آ جائے۔ غرض اس یونانی مستری کے خاندان کے افراد اپنے فن میں ماہر تھے۔

اسی علاقہ میں مستری حسن بخش کے فرزند استاد اللہ بخش جو آج بھی اپنی قلندری اور سادگی کی وضع قطع میں کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں برسوں نواب بہاول پور کے ہاں فن تعمیر کے سلسلے میں ملازم رہے۔ یہ پست کاری اور انجینئری میں بڑا ملکہ رکھتے ہیں اور جدت پسند واقع ہوئے ہیں۔ مگر وہی مشرقی طرز کی استغنا کہ گھر سے باہر نہ نکلنا، اور گمنامی کی زندگی کو ترجیح دینا ان لوگوں کا شعار ہے۔ اسی علاقہ میں ماہر اسلحہ حافظ شیر محمد صاحب رہتے تھے جو وفات پا چکے ہیں اپنے زمانہ کے اسلحہ کے ماہر تھے لوہے کو کمانا اچھی طرح جانتے تھے۔ بے آواز کا پستول بھی بنانا جانتے تھے۔ ہمیں اس دن ان کے فن کا پتہ چلا جب 1933ء میں بلوچستان کی ریاست جھل کے نواب یوسف علی خان مگسی مرحوم نے ان سے ایک زرہ تیار کرائی۔ قصہ یوں ہے کہ نواب صاحب مذکور نے ترکی جنرل انور بیگ کی یونیفارم کی طرح کی ایک یونیفارم میرے والد بزرگوار سے تیار کرائی جسے وہ سبی کے شاہی جرگہ کے موقع پر استعمال کرنا چاہتے تھے ان کی خواہش تھی کہ یونیفارم میں ایسی صفت ہونی چاہیے کہ اگر کوئی خنجر، تلوار یا بندوق وغیرہ سے حملہ کر دے تو سینہ اور بازو محفوظ رہیں۔ والد صاحب نے یونیفارم تیار کی جس پر زردوزی کا کام بھی تھا۔ اب مسئلہ حفاظتِ حملہ کا تھا حافظ شیر محمد صاحب سے اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ انہوں نے ایک ماہ کے اندر ایک زرہ تیار کی جس پر بندوق کی گولی چلائی گئی۔ خنجر کی ضرب دی گئی مگر زرہ نہ کٹ سکی۔ غرض یونیفارم کے اندر وہ زرہ رکھ دی گئی۔ حافظ صاحب کہا کرتے تھے کہ ہمارے آباؤ اجداد بابر کے زمانہ میں آئے تھے اور اسلحہ سازی کا کام کرتے تھے برطانوی افسران کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس خاندان کے اکثر افراد آج بھی مشینری کے کام کے ماہر اور مغل کہلاتے ہیں۔ کپڑے سینے کی مشینوں کی مرمت اور پرزے ڈھالنے کا کام اب بھی یہ لوگ دہلی گیٹ کے اندر کرتے ہیں۔

اسی علاقہ کی ایک اور شخصیت کا ذکر نہ کرنا ملتان کی خاص صنعت کو نظر انداز کرنا ہے یوں تو ملتان کے فن کاروں کا حصہ تاج محل کی تعمیر میں بھی تھا۔ کہ شاہ جہاں نے ملتان کے فن کاروں کو ہمیشہ ترجیح دی تھی اور شاہ جہاں کا جمالیاتی شعور تاریخ ہند میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے یہ شاہ جہاں کا ذوق ہی تھا کہ دہلی کا لال قلعہ اور تاج محل جیسی عمارتیں عالمِ وجود میں آئیں۔ مگر جن صاحب کا ذکر ہم کرنے والے ہیں وہ چودھری عبدالحق چشتی مرحوم ہیں۔ جو فنِ قالین بافی کے ماہر اور بڑے متین انسان تھے۔ اندرون حسین آ گاہی محلہ قالین بافاں میں ان کا کارخانہ تھا۔ کافی آدمی ملازم تھے اور دور دراز ملکوں میں یہ قالین بھیجے جاتے تھے یہ خاندان غوریوں کے زمانہ حکومت میں یہاں آ کر آباد ہوا۔ مرأۃ احمد کا مصنف لکھتا ہے کہ شاہ جہاں نے حرم شریف کے لیے جو قالین تیار کروایا تھا وہ ملتان سے بن کر گیا اس سے بڑی سعادت اور سند اس فن کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ تو رہی اس دور کی بات۔ حکومتِ برطانیہ کے زمانہ 1933ء میں جب لندن میں قالین بافی کے شاہکار نمائش میں پیش کئے گئے تو چودھری عبدالحق صاحب نے بھی ایک قالین اور دو نمونے تیار کر کے وائسرائے ہند کی معرفت لندن بھجوائے۔ کیونکہ برآمدان کے لیے وائسرائے ہی اس وقت واحد ذریعہ تھا۔ شومئی قسمت کہ وائسرائے کی بیگم قالین دیکھ کر للچا گئیں اور انہوں نے قالین تو اپنے ہاں رکھ لیا، مگر دو نمونے لندن بھجوا دیئے۔ لندن میں مصنوعات پر تقسیم انعامات کا موقع آیا تو قالین کے ان دو نمونوں پر سیکنڈ

پرائز ملا۔ ساتھ ہی انہوں نے لکھ بھیجا کہ اگر مکمل قالین ہوتا تو فسٹ پرائز دیا جاتا۔ یہ اطلاع براہ راست چودھری عبدالحق صاحب کو ملی تو وہ آگ بگولہ ہو گئے اور صورت حال معلوم کرنے کے لیے وائسرائے کو خط لکھا۔ بیگم وائسرائے نے معذرت لکھی اور ایک ہزار روپے بھیجے۔ مگر چودھری صاحب نے روپیہ واپس کر دیا۔

غرض قالین بافی اور ریشمی دریائی کا کام ملتان میں صدیوں سے رائج تھا۔ میں نے ''تھا'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اب یہ صنعت ملتان سے رخصت ہو چکی ہے قالین بافی تو چودھری صاحب کی وفات کے چند سال بعد ہی ختم ہو گئی تھی البتہ دریائی کا سلسلہ قدرے جاری ہے۔ قدیم زمانہ میں ملتان اور بلخ و بخارا سے ریشم ملتان پہنچتا تھا۔ راقم کے محلہ میں چونکہ اس کام کے کرنے والے بھی موجود تھے اور برطانیہ کے زمانہ حکومت میں تاشقند اور بخارا وغیرہ سے ریشم کے بیوپاری آتے تھے۔ ان سے قدیم تاجرانہ تعلقات کی روایتیں بھی سنی جاتی تھی۔ اس بنا پر ہمیں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ عربوں کی آمد سے پہلے یہاں پر ریشمی کپڑا بُننے والے موجود تھے۔ اور ان تجارتی تعلقات کی وجہ سے یقیناً ملتان اور بخارا وغیرہ کی ثقافتی زندگی پر متبادل اثرات ہوئے ہوں گے۔ جبکہ خود بُدھوں کے بھکشو بلخ اور بخارا تک قبل از اسلام پہنچ چکے تھے۔ ملتان کی دریائی، تحصیلہ اور لنگیاں، ریشمی دوشالے صدیوں سے مشہور ہیں۔ ہندوستان کی صنعت کے تذکرے میں ملتان کو کبھی بھی مؤرخوں نے فراموش نہیں کیا جب کبھی کپڑے کی صنعت کا ذکر آیا۔ ریشمی کپڑے کے لیے ملتان کا نام خصوصی طور پر لیا گیا ہے۔ اس وقت بھی سر پر باندھنے والی لنگی جو خالص ریشم سے بنی جاتی ہے کابل اور پشاور وغیرہ میں بھیجی جاتی ہیں۔ اور یہ سوائے ملتان کے اور کہیں تیار نہیں ہوتیں۔



ارشد ملتانی

ملتان کا سماجی و ثقافتی ارتقا

تاریخ انسانی کا عظیم ترین طوفان جب اپنی تباہیوں اور قہر سامانیوں کے بعد ختم ہوا تو اس وقت حضرت نوح علیہ السلام کے پیروکاروں کی وسیع و عریض کشتی سطح ارضی پر آ کر رکی۔ حدِ نگاہ تک پانی اور آسمان کی یک رنگی سے اُکتائی ہوئی بے چین آنکھیں زمین کا جائزہ لینے لگیں۔ زمین کی قربت کے احساس اور اس کے خشک اور حیات آفرین لمس سے دل خوشی کے مارے جھوم اٹھے۔ زمین کا عالم اس وقت عجیب تھا۔ جیسے اس نے سبز کائی کا حسین لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ ہر طرف ویرانی اور غمنا کی کا تسلط تھا۔ دھیرے دھیرے سورج کی تمازت نے رنگ جمایا اور زمین خشک ہوگئی۔ کشتی پر سوار انسانوں کا ہجوم ٹھنڈی ٹھنڈی معصوم دھرتی سے ہمکنار ہوا۔ یہ زمین پر زندگی کی ہماہمی کی نشاۃ ثانیہ تھی اور قرنہا قرن کے طویل اور نہ ختم ہونے والے دور کا آغاز۔ کشتی پر سے اُتر کر مختلف انسانی گروہ اِدھر اُدھر دوبارہ آباد ہونے لگے اور ایک تازہ حیات کی تعمیر میں مصروفِ عمل ہو گئے۔ ایک قدیم کتابی روایت کہتی ہے کہ اُن میں سے ایک گروہ نے اپنے رہنے کے لیے جو مقام چنا وہی بعد میں ملتان کے نام سے مشہور ہوا اور اسی جگہ ملتان کی معاشرت و ثقافت نے اپنی ابتداء کی۔

لیکن اس وقت بات ابتداء کی نہیں، انتہا یعنی ارتقاء کی ہو رہی ہے۔ میں اس اہم اور جان لیوا موضوع پر پچھلے دو دنوں سے مسلسل سوچ رہا ہوں۔ لکھنے سے پہلے خیال آیا نوادرات کی نمائش ہو رہی ہے اسے دوبارہ توجہ سے دیکھا جائے شاید ارتقاء کی کوئی کڑی ہاتھ آ جائے۔ لیکن میں جس وقت پھر نوادرات قدیم کو دیکھنے گیا تو وہاں کچھ دید ترین نوادر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف الماریوں اور شوکیسوں میں سجے ہوئے زنگ آلود سکے اور مٹی کی ٹھیکریوں کی عظمت تھی اور دوسری طرف زندہ و تابندہ آنکھوں کی نُدرت۔ سچی بات تو یہ ہے میں جلدی سے بھاگ آیا کیونکہ میں نے ملتان کے سماجی اور ثقافتی ارتقاء پر سوچنا تھا۔

میرے ذہن میں ایک بزرگ صوفی کی کتاب میں پڑھی ہوئی ایک عجیب و غریب حکایت گونجنے لگی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ حضرتِ خضر کو اللہ میاں نے حیاتِ دوام سے نواز کر انہیں سمندروں کی نگرانی پر مامور کر دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ تبدیلی آب و ہوا کی خاطر زمین پر بسے ہوئے شہروں کی سیر کو بھی چلے آتے ہی۔ ایک دفعہ وہ موج

میں آئے تو ملتان پہنچ گئے۔ سارا دن وہ ملتان کی خوشحالی اور آراستگی سے محظوظ ہوتے رہے۔ آخر انہیں بھوک لگی اور وہ کھانے کی ایک دکان میں جا گھسے۔ دکاندار ایک چاق و چوبند خاتون تھی۔ ان کے طلب کرنے پر انواع و اقسام کا کھانا سامنے آیا تو حضرت خضر بہت حیران ہوئے کیونکہ برتن تمام کے تمام سونے کے تھے۔ بہرحال کھانے کے بعد وہ قیمت ادا کر کے جانے لگے تو خاتون دکاندار نے بڑے ادب سے کہا۔ بابا! برتن بھی اپنے ساتھ لے جائیں یہاں یہ رواج نہیں ہے کہ برتن واپس لئے جائیں!!

اس واقعے کو صدیاں گزر گئیں۔ ایک دفعہ پھر حضرت خضر موج میں آئے اور ملتان پہنچ گئے۔ گھومتے پھرتے انہیں احساس ہوا کہ ملتان میں اب سادگی آ چکی ہے۔ وہ چمک دمک اب نہیں رہی۔ بہرصورت انہیں بھوک نے ستایا اور وہ ایک دکان پر کھانا کھانے گئے۔ اب کے انہوں نے دیکھا کہ کھانا مٹی کے برتنوں میں آیا اتفاق سے کھانے کے دوران اُن کے ہاتھ سے مٹی کا ایک پیالہ ٹوٹ گیا۔ چنانچہ کھانے کی قیمت وصول کرتے ہوئے دکاندار نے پیالے کا جرمانہ بھی ہتھیا لیا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ اس حکایت میں ملتان کے سماج اور ثقافت کے ارتقاء کا کون سا پہلو ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ملتان کے سماجی اور ثقافتی ارتقا کا یہی ثبوت ہے کہ وہ سونے کے دور سے مٹی کے زمانے کی طرف آیا ہے۔ ہمارے سماج اور ہماری ثقافت کا خمیر مٹی سے اٹھا ہے۔ جو ثقافت اور جو سماج سونے اور چاندی کے برتنوں سے جنم لیتے ہیں ان سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ملتان میں شاید کبھی سونے کے برتنوں کا دور آیا ہو لیکن وہ دور اہل ملتان کا دور نہیں ہوگا۔ وہ دور یقیناً باہر سے آیا ہوگا اور باہر سے آئی ہوئی ثقافت اور باہر سے آیا ہوا سماج ہمارا سماج نہیں ہوسکتا!

ملتان میں آج بھی سونے اور چاندی کے برتنوں والے مل جائیں گے مگر وہ ملتانی سماج اور ثقافت کے امین نہیں ہوں گے۔ میں اپنے سماج اور اپنی ثقافت کے ارتقا سے مایوس نہیں ہوں کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں ملتان کے دینو کمہار کا چاک ابھی تک پوری قوت سے گھوم رہا ہے اور اس کی فنکار انگلیاں بدستور سوندھی سوندھی چکنی مٹی سے گھڑے، لوٹے اور لوٹکیاں تخلیق کر رہی ہیں۔ سوہارے تیلی کا گرانڈیل بیل منوں وزنی کالے کلوٹے اور گھسے پٹے کولہو سے تیل نکال رہا ہے اور شموں کسان کی جواں شب بیداریاں صدیوں پرانے ہل سے زمین کو شادیابیاں بخش رہی ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ ملتان کی ثقافت اور اس کا سماج ارتقا پذیر ہے اور زندہ ہے اور باہر سے آئے ہوئے چمکتے ہوئے سماج و ثقافت سے نبرد آزما ہے۔

تیری عظمت پہ ہے نثار ارشدؔ
اے مری زندگی، اے مرے ملتان



فرخ درانی

شہر کا سماجی اور ثقافتی ارتقا

ملتان کی تہذیب و ثقافت اتنی ہی قدیم اور عظیم ہے جتنی کہ انسانی تاریخ۔ ملتان دنیا کے تہذیب و تمدن کے قدیم ترین مراکز میں سے ایک ہے۔ ہم محمد بن قاسمؒ کی فتوحات پڑھیں یا ابنِ بطوطہ کا سفر نامہ، چینی سیاح اور مورخ ہیون سانگ کے واقعات سفر پڑھیں یا سکندرِ اعظم کے حملے کے واقعات، مہاراجہ بکر ماجیت کے عہد کی تاریخ پڑھیں یا چندر گپت اور سمندر گپت موریہ کے حالات، ہم تزکِ تیموری پڑھیں یا تزکِ بابری۔ ہمیں ان تمام مختلف الاقامت اور مختلف النوع تواریخ میں اگر مشترک ملتی تو صرف ایک بات، اور وہ ہے ملتان اور اس کے تہذیبی اور ثقافتی حالات و واقعات۔ نہ سکندر اعظم نے کبھی محمد بن قاسم کو دیکھا اور نہ ہی ابن بطوطہ نے ہیون سانگ کو، نہ تیمور نے کبھی بابر کو دیکھا اور نہ ہی بکر ماجیت نے کبھی چندر گپت موریہ کو لیکن ان سب کی آنکھوں نے ایک چیز کو دیکھا تھا اور وہ ہے ملتان اور اس کی تہذیب و ثقافت۔ ملتان کی اس عظمت و قدامت کو دیکھ کر یوں گمان گزرتا ہے کہ خدا نے ''کن'' کہا اور نتیجے کے طور پر آدمؑ کے ساتھ ملتان بھی موجود تھا۔ ملتان اور اس کے نواحی علاقے تاریخ کے قدیم ترین ادوار سے علم و ادب، شعر و سخن، صنعت و حرفت، تصور و ولایت، طب و حکمت اور جذب و سلوک کا مرکز و محور رہے ہیں۔ اس کی تفصیلات اور جزئیات کے لیے ایک ضخیم و جسیم اور کحیم و شحیم کتاب کی ضرورت پڑے گی۔ یہاں صرف یہ امر قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ جب ہم ملتان کی ثقافت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے شہر ملتان یا مضافات یا نواحیاتِ ملتان مراد نہیں ہوتے بلکہ وادیٔ سندھ اور چناب کے درمیان کے وہ تمام علاقے مراد ہوتے ہیں جہاں جہاں ملتانی زبان، ملتانی شعر و ادب اور ملتانی تہذیب و ثقافت کا اثر و نفوذ رہا ہے۔ مجھے احباب و اقارب کی دل آزاری مقصود نہیں مگر یہاں ملتانی زبان و ادب کا ذکر کرتے وقت میرا یہ دعویٰ ہے کہ پاک و ہند میں بولی جانے والی کوئی زبان بھی ملتانی سے زیادہ قدیم، ملتانی سے زیادہ وسیع اور ملتانی سے زیادہ میٹھی نہیں۔ ملتانی زبان دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے لیکن بدقسمتی سے حکومتوں کی سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے ملتانی ادب کی وہ تشہیر و اشاعت نہ ہو سکی اور اسے وہ فروغ و ترقی نہ مل سکی جو چند دوسری زبانوں کو ملی۔ یہ بظاہر ناقابلِ یقین سی بات معلوم ہوتی ہے مگر یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے کہ ملتانی زبان کے حروفِ تہجی کی تعداد دنیا کی ہر زبان کے حروفِ تہجی سے زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ملتانی بولنے

والا دنیا کی ہر زبان کے ہر لفظ وحرف کے صحیح تلفظ کر سکتا ہے، مگر دنیا کی کوئی بھی اور زبان بولنے والا ملتانی زبان کے سب الفاظ وحروف کا تلفظ نہیں کر سکتا۔ ملتانی زبان کے عظیم صوفی شاعر خواجہ فرید کا دنیا کے کسی عظیم شاعر سے تقابل کیا جا سکتا ہے۔ ملتانی کے قدیم شعراء اللہ داد، اسد، اللہ یار، سرور، غلام رسول ڈڈا، فیض تونسوی، شیرن، اور نواز کو آسانی سے صفِ اول کے شعرا میں رکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ملتانی کے صرف ایک شاعر فیض تونسوی کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔ یہ شاعر جو ایک غریب پھاٹکی ہے لیکن پنگھٹ پر جاتا ہے اور وہاں حسن و دلفریبی کے جو مناظر دیکھتا ہے انہیں یوں نظم کرتا ہے:

ہِک ڈِہاڑے چاہ کر کیں میں خان دے چاہ تے ڳیوم
چاہ دی چاہ وچ بے کس تھی کیں بھُل گئے ہوش نہ ریہوم
بھُل گئے تھیٹر فلم تماشے سِین عجائب تھِیوم
اِیں چن دی لک رس کتی میکوں پھاٹک وِسری رِیہم
ڈیہیں ابھریے دا گھوتیں گیوم تیں شام دے ویلھے دا بس
کئی آوِن کئی مُڑ کیں ونجن چالاں کل دیاں شتریاں
پوش جنہاں دے مثل پریاں دے صاف شفات تیں سُتھریاں
پَر ہِک خار اُنہاں وچ کوجھی کل حرارتیں پتھریاں
پرناں ہائی اے خار اِنہاں دی اوپریاں منڈھ لاریاں
آدم زاد دے نال بھلا کیا بولن پریاں زادیاں
سینہ صاف تیں ستھرا سِدھا جیں تیں ڈُو گُل لٹکن
لٹک لٹک دی لچک دے وچ ہِک بے ڈُو دَل دَل جھٹکن
ہولی لوڑتیں حملہ تھیندا اڈاڈھی لوڑ تیں چٹکن
یاڑ بہشتی لوکاں دا ونج دیدال اُٹلا اٹکن!
آیاں ڈیکھو حن دیاں راڑیاں پی کے مانٹر دے پنگے
کون ہوے کجھ منگے!

لیکن ملتان کے سماجی اور ثقافتی ارتقا کا ذکر کرتے ہوقت ملتانی زبان وادب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ان سماجی اور ثقافتی محرکات وعوامل کا ذکر بھی ضروری ہے، جو ہر چند کہ ملتانی زبان وادب سے متعلق نہیں، لیکن پھر بھی وہ ملتان کی تہذیب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اس وقت ملتان میں ملتان کے قدیم ترین باشندوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں جتنی ان باشندوں کی ہے جو تقسیم سے صدیوں پہلے اور پھر تقسیم کے فوراً بعد ملتان میں وارد ہوئے۔ لیکن ملتان کی آب وہوا اور ٹھوس اور غیر متزلزل تہذیب کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہر نئے آنے والے کو اپنے مخصوص رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ چنانچہ آج وہ سب

لوگ ملتانی ہیں جو کچھ تو گردیز سے آئے تھے اور کچھ گیلان سے، کچھ رہتک سے آئے تھے اور کچھ حصار سے۔ ملتان نے گردیز اور گیلان اور ہتک اور حصار کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ یعنی:

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
اب امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

اس قلبِ ماہیت کے بعد اب جب میں ملتان کے قدیم ترین باشندوں کی تلاش میں نکلتا ہوں تو مجھے سوائے ارشد ملتانی کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ لیکن پرانے ملتان کے اندرون حرم گیٹ، پاک گیٹ، دہلی گیٹ، دولت گیٹ اور لوہاری گیٹ کے تنگ و تاریک کوچوں اور چھوٹی اینٹوں سے بنے ہوئے پرانے ٹھنڈے سیم زدہ مکانوں میں اب بھی ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو ابدالآباد سے نسلاً بعد نسلاً یہاں مقیم ہیں۔

ملتان کی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا ذکر کرتے وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ملتان میں ہر دور میں زیادہ تر وہ سماجی اور سیاسی جماعتیں رہی ہیں اور آج تک ہیں جنہوں نے ہمیشہ حق و صداقت کا ساتھ دیا ہے اور اپنے نصب العین پر جرأت اور پامردی سے قائم رہی ہیں۔ کسی بھی حکومت کی بے جا خاطر خوشامد، چاپلوسی اور کاسہ لیسی نہیں کی۔ صداقت و شرافت اور جرأت و استقامت ہمیشہ ملتانی خون کا خاصہ رہی ہے۔ ملتان کے قلعہ کہنہ پر بنی ہوئی لاٹ ملتانیوں کی غیرت و حمیت اور حب الوطنی کی ہمیشہ گواہی دیتی رہے گی۔

وفاداری ملتانی تہذیب و تمدن کا خاصا ہے۔ وفاداری کا نام آتے ہی نہ جانے کیوں میرے ذہن میں قسور گردیزی کی تصویر آ گئی جو ہمیشہ ضربِ مخالف میں رہے ہیں اُن پر اس سلسلے میں مصائب و آلام کے کیا کیا پہاڑ نہ ٹوٹے مگر انہوں نے اپنی روش کہتے ہیں کبھی نہیں چھوڑی:

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

میرے ایک اَن پڑھ دیرینہ دوست جو تقسیم کے بعد کبھی ملتان نہیں آئے تھے۔ کل تقسیم کے بعد پہلی بار میرے ہاں تشریف لائے۔ حسن پروانہ کالونی کو دیکھ کر سکتے میں آ گئے اور حسن پروانہ کالونی میں واقعہ جب میرے مکان کے محل وقوع کو دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی حالت بگڑ رہی ہے آخر انہوں نے انتہائی غصّے کے جذبات میں مجھ سے کہا "تم نے یہ مکان یہاں کیسے بنوایا یہاں تو میرے دادا کی قبر تھی!"

موجودہ ملتان اپنی سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لحاظ سے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ ملتان میں اس وقت آٹھ کالج، چار بڑی ہسپتالیں اور اسماعیل آباد اور گُل ٹیکس کے علاوہ بے شمار صنعتی کارخانے ہیں اور رائٹرز گلڈ ملتان اور بزمِ ترقی ادب کے علاوہ بے شمار علمی و ادبی ادارے اور محفلیں اور قسور گردیزی کی جماعت کے علاوہ بے شمار سماجی تحریکیں اور سیاسی جماعتیں موجود ہیں اور یہ ملتان کے ایک روشن مستقبل کی دلیل ہے۔

نمید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ گر رگِ تاک است

ملتان کی نشاۃ ثانیہ میں ثقافتی لحاظ سے تغیر و تبدل اور تعمیر و ارتقا کا عمل برابر جاری ہے۔

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا



قاسم رضا

ملتان میں تھیٹر کی عہد بہ عہد روایت کی دلچسپ تاریخی داستان

تخلیق آدم اور جنت سے اخراج کا کھیل تو خیر سماوی تھا لیکن زمین پر آدم اور حوا کا دو مختلف مقامات پر نزول اور بچھڑ جانے کے بعد ان کا ملاپ پہلا المیہ اور طربیہ ڈرامہ تھا جس کے بعد کرہ ارض کی سٹیج پر ہابیل اور قابیل کا رزمیہ کھیل ہوا اور پھر واقعات اور تماثیل کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو کہ آج بھی جاری ہے۔ ڈرامہ انسان کی تمام تر داخلی اور خارجی کیفیات، جذبات، احساسات، جمالیات اور نظریات و تجربات سے عبارت ہونے کے باوصف تنازع، بقا وارتقاء میں انفرادی و اجتماعی کرب و انبساط، تشکیک و استعجاب، ایقان و ابہام، سود و زیاں، تعمیر و تخریب، سفر و حضر اور تمام تر ظاہری و باطنی خوبیوں اور خامیوں، توانائیوں اور کمزوریوں اور جسمانی، روحانی، فکری اور احساساتی صلاحیتوں اور عاجزیوں پر محیط ہے۔

شعر و ادب الفاظ کا کھیل ہے اور کلام و بیان حروف و نطق کا، خطاطی، خطوط و دوائر کا کھیل ہے اور مصوری رنگوں کا، موسیقی صوت و سماعت کا کھیل ہے اور رقص اعضاء کا مجسمہ سازی سنگ و آہن کا کھیل ہے اور تعمیر آب و گل کا۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر تمام فنون اور ایجادات و اختراعات بھی ذوق تخلیق کار کی نتیجہ جمادات و بناتات کی اثر آفریں جمالیاتی تہذیب کا کھیل ہیں لیکن ڈرامہ میں اظہار و ابلاغ کی تکمیل کے لیے انسان کو اپنے تمام تر حواس اور وجودی و محسوساتی اور مشاہداتی و تجرباتی صلاحیتوں اور قوتوں کو سرانجمن اس طرح بروئے کار لانا پڑتا ہے کہ دائرہ اکثر پیش کردہ ماحول اور کرداروں کے مربوط اظہار و ادا کے گرد مرتب ہو کر ابلاغ کے مقصود تقاضوں کی وسعت و تجدید پر پورا اترے۔ الغرض ڈرامہ فکر و عمل کا کوئی تجریدی یا حادثاتی کھیل نہیں ہے بلکہ ہر دور اور ہر خطے میں نظریات و عقائد سے ہمرشتہ اور پیوستہ رہا ہے۔

ڈرامہ اور زندگی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، زندگی ہے تو ڈرامہ ضرور وجود میں آئے گا۔ اس کی صورت چاہے آئیڈیل ہو یا حقیقت پسندی پر بہرحال ڈرامہ زندگی کا ایک سماجی، تاریخی اور تخلیقی عمل ہے جس کے ذریعے زندگی کی حقیقتوں سے آگاہی ہوتی ہے اور اندر کا انسان جاگتا ہے اور اسے ذہنی آسودگی کے مواقع مہیا کرتا ہے۔

ملتان میں ڈرامے کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی اس شہر کی قدامت۔ ابھی تک ملتان کی پرشکوہ تاریخ اپنے سینے میں کئی سربستہ راز لیے کھڑی ہے اور اس چھپی تاریخ کا کھوج لگانا باقی ہے۔ جہاں تک ملتان میں ڈرامے کی روایت کا تعلق ہے تو حاضر موجود مختلف تاریخی کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ملتان کی وسیع وعریض سرزمین جس کا کسی زمانہ میں راجپوتانہ سے لے کر لسبیلہ، کشمیر کی سرحدوں تک خط کھینچا جاتا تھا، اس میں ڈرامہ موجود ہے۔ ملتان کی سرزمین پر 1300 سال قبل مسیح میں ڈرامے کی بنیاد قائم ہو چکی تھی دنیا کی دوسری قوموں میں اس انداز کی کوئی ڈرامائی منظوم مکالماتی کہانی موجود نہیں تھی اور جب یونان کا ہومر کا وجود بھی نہیں تھا۔ یوں ملتان ڈرامے کی سب سے اول سرزمین کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ ''رگ وید'' کے منظوم مکالمے آج بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔

قدیم زمانے میں لوگوں کو جمع کر کے بیانیہ نظمیں جن میں دیوتاؤں، بادشاہوں یا کسی واقعے کا ذکر ہوتا تھا بھاٹ لوگ سنایا کرتے تھے۔ ''رگ وید'' میں ہمیں اس بیانہ ڈرامے کے کئی حصے مل جاتے ہیں۔ مثلاً ''راون اور اندر'' کے مکالمے۔ ان دونوں دیوتاؤں کے مکالموں سے ہمیں ڈرامے کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔

ڈرامہ شکنتلا اجین (مالوہ) کے راجہ بکر ماجیت جس کا زمانہ چوتھی یا پانچویں صدی تصور کیا جاتا ہے، اس کے درباری شاعر ''کالیداس'' نے لکھا تھا کہ اجین کی رانی ہی ملتان کے سورج مندر میں رقص کیا کرتی تھی اور دیوتا کو خوش کرتی تھی۔ یقیناً کالیداس بھی ملتان میں آیا ہوگا اور پھر وشوامتر ملتان کے علاقے کا ہی رہائشی تھا اور شکنتلا اس کی بیٹی تھی۔

قدیم ملتان کی سلطنت میں جو ڈرامے کھیلے جاتے تھے وہ اپنے پلاٹ کے لحاظ سے یونانی ڈرامے سے بالکل علیحدہ نظر آتے ہیں۔ مثلاً چندر گپت جس کی لشکر کشی اور حکومت کی ابتدا سکند کے جانے کے بعد بقول مورخین اسے ''پنجند'' کہہ لیں یا ملتان کی سلطنت کا علاقہ کہہ لیں یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ یہ چوتھی قبل مسیح کی بات ہے جب یونانی ڈرامے اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اسی ''چندر گپت'' پر ایک ڈرامہ لکھا گیا تھا اور اسی سے بعض مورخوں نے ''چندر گپت'' کے حالات بھی اخذ کئے ہیں۔ W.H. Wilson اور دیگر مغربی مورخین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''ہندی ڈرامہ'' کو ہند کے مغربی سواحل اور مغربی صوبہ جات میں فروغ حاصل ہوا نہ کہ مشرقی ہند کے صوبہ جات میں۔ اس زمانے کے ناٹک بلا تکلف کھلے میدان میں آسمان کے نیچے کھیلے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی ایرانیوں اور ہندوؤں سے متاثر ہو کر تمثیل نگاری کا فن اپنایا۔ کھلے آسمان کے نیچے گل بکاؤلی، سیف الملوک، ہیر رانجھا، سسی پنوں کے ناٹک پیش کئے۔ کوٹلہ تولے خان کے موچی ناٹک کے دلدادہ تھے اور ان میں سے اکثر سوانگ بھر کے بڑے بڑے بازاروں اور سڑکوں پر مکمل پیش کرتے تھے۔ مرد تو خیر ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے لیکن عورتیں اور بچے اپنے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں سے یہ ناٹک دیکھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہی نہیں کہ کوٹلے کے موچی اس قسم کے ناٹک پیش کیا کرتے تھے بلکہ شہر میں پٹولی اور پاک دروازے کے پار چہ باف رنگ ریز اور پھٹے ساز بھی اس قسم کے ناٹک پیش کیا کرتے تھے۔

ملتان میں مظفر خان کے دور میں بھی ڈرامے ہوتے تھے۔ ساون مل کے دور سے لے کر برطانوی دور حکومت تک ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں پہلی دفعہ ایک بڑی تھیٹر کمپنی پونا سے آئی۔ اس تھیٹر کے ڈائریکٹر سید عباس علی تھے۔ وہ اپنے فن داؤدی کی بنا پر بہت مقبول ہوئے۔ یہاں تک کہ ملتان کی خوبرو اور پسندیدہ مغیہ لالاں جان نے بلاتکلف سٹیج پر چڑھ کر عباس علی سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

یہ 1920ء کی بات ہے جوگندر نامی سکھ کا وکٹوریہ تھیٹر حسین آگاہی میں آیا یہ بہت بڑا تھیٹر تھا۔ اس میں تقریباً 10 پردے تھے جن میں ہمہ قسم کے رنگا رنگ مناظر، پہاڑ، دریا، شہر اور گلستان بنے ہوئے تھے۔ اس تھیٹر میں تقریباً 25, 30 ایکٹر کام کرتے تھے۔ اس تھیٹر میں ''نور اسلام'' کا کھیل بڑے اہتمام کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ اس کھیل میں روم کے عیسائی بادشاہ کے مسلمانوں پر مظالم دکھائے گئے تھے۔ اس تھیٹر کی مقبولیت نے ملتان کے مشہور دیوان آتما نند شرر کو جو فطری طور پر ایک خالصتاً تھیٹریکل شخصیت تھے، کو اس بات پر آمادہ کیا وہ اس تھیٹر کو خرید لیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے جوگندر سنگھ سے وکٹوریہ تھیٹر خرید لیا اور کچھ عرصہ غالباً دو سال تک ملتان میں نور اسلام اور آغا حشر مرحوم کے ڈرامے ''صید ہوس''''سفید خون'' وغیرہ پیش کیے اور پھر کمپنی کو لے کر کہیں اور چلے گئے۔

اتنے میں یہاں مشہور سیٹھ حبیب کا تھیٹر آیا اور آتے ہی اپنا مشہور زمانہ کھیل ''موہنی بی اے'' پیش کیا۔ اس تھیٹر کا ساز و سامان بھی اے انداز تھا۔ کوئی پندرہ سولہ کے قریب بڑے بڑے خوشنما پردے تھے اور اسی طرح سے چار گنا ان پردوں کے فلاٹ تھے اور ڈریسنگ روم میں بھی بے شمار پوشاکیں جگمگا رہی ہوتی تھیں۔ فرنیچر بھی کافی تھا۔ اس تھیٹر میں تقریباً 50، 60 اداکار کام کرتے تھے۔ اس تھیٹر میں دو سگی بہنیں جن کا تعلق پارسی مذہب سے تھا، یہ دونوں بہنیں مل کر گانا گاتی تھی۔ ان کی اردو بھی بمبئی کی اردو ایسی تھی۔ لوگ جہاں ان کی اداؤں پر مرتے تھے وہاں ان کی زبان پر ہنستے تھے۔

1923ء میں گلوب تھیٹر بڑے انتظار کے بعد ملتان آیا۔ اس تھیٹر کا بڑا شہرہ تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد تک جن تھیٹریکل کمپنیوں نے ملتان میں پڑاؤ ڈالا ان میں الیکونڈ تھیٹریکل کمپنی، کنہیا سنگھ کی تھیٹریکل کمپنی، آغا حشر تھیٹریکل کمپنی، سندھ تھیٹریکل کمپنی، میڈن تھیٹریکل کمپنی، وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی، الفیٹن تھیٹریکل کمپنی، امپیریل تھیٹریکل کمپنی، سورج وجے تھیٹریکل کمپنی، نیو ایرا تھیٹریکل کمپنی، بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنی، باب جتو رام تھیٹریکل کمپنی، بابو عبدالسلام تھیٹریکل کمپنی، ہارڈنگ تھیٹریکل کمپنیاں ملتان میں آتی رہیں ان کی تعداد تقریباً 65 ہے جو مختلف اوقات میں ملتان میں پڑاؤ ڈالتی رہیں۔

بوہڑ گیٹ کا ''نور محل سینما'' جسے بعد میں تاج محل سینما کا نام دیا گیا اس میں تھیٹر ڈرامے ہوا کرتے تھے۔

حسین آگاہی ملتان میں جہاں اب محفل سینما کی عمارت ہے، یہاں کبھی بہت بڑا تھیٹر ہال تھا جسے سیٹھ ''درباری لعل'' نے تعمیر کرایا تھا۔ اسی طرح حسین آگاہی میں جہاں کبھی عثمانیہ مارکیٹ ہوا کرتی تھی اس کے ایک کونے

پر ''سیٹھ بدھو رام'' نے تھیٹر بنوایا تھا اور یہاں بھی تھیٹر ڈرامے کھیلے جاتے رہے۔ سرکلر روڈ کے متوازی حسین آگاہی پہنچ کر جہاں پر سڑک سرکلر روڈ سے مل جاتی ہے، اس سڑک کے اختتام پر ایک بڑا میدان تھا جسے دسہرہ میدان کہا جاتا تھا، اب یہ میدان سکڑ کر بہت چھوٹا ہو گیا ہے۔ یہاں ہر سال پتلے کاغذ اور تیلیوں سے ایک بہت اونچا بت بنایا جاتا تھا اور ایک بڑی سٹیج بنائی جاتی تھی جس پر دس دن تک ڈرامہ پیش کیا جاتا تھا۔

50ء کی دہائی تک کے ملتان کے معروف تھیٹر اداکاروں میں حکیم امیر علی ہاشمی، ولی محمد قلندر، بالکش نیتر و وکیل، رام نارائن تیرہ، بہاری لعل، خوشی رام، غلام محمد، جمعہ خان، رحیم بخش لودھی، سید عباس علی، جتنی رام، غلام رسول حسرت، محمد بخش سوداگرہ، حکیم حضور بخش، محمد شفیع شامل ہیں جنہوں نے تھیٹر اداکاری میں انمٹ نقوش چھوڑے۔

قیام پاکستان کے بعد ملتان میں ''تمبو نما تھیٹرز یا سفری تھیٹرز'' کا خاصا رواج رہا۔ یہ سلسلہ اب بھی کسی نہ کسی صورت جاری ہے۔ یہ تھیٹر زیادہ تر میلوں، ٹھیلوں اور بزرگان دین کے عرس پر لوگوں کو تفریح کا سامان مہیا کرتے تھے۔ سفری تھیٹر کے حوالے سے ایک نام ''بالی جٹی'' کا بھی آتا ہے۔ بالی جٹی کا تھیٹر بھی ملتان میں باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ بالی جٹی اکثر ''کالا چولا اور لاچہ'' پہنتی تھی۔ گانے، ڈانس، ڈائریکشن غرض ہر شعبے میں عبور حاصل تھا۔ 8 فٹ اونچی چھلانگ لگا کر سٹیج پر انٹری دیتی۔ ملتان میں عنایت حسین بھٹی کے شاگرد درویش بھٹی جن کا تعلق دنیا پور سے ہے، نے بھی ملتان کے تھیٹر کے لیے بہت کام کیا۔ محمد شفیع کنول، کوثر ملک، اے ڈی ساغر، رفیق حیدری اور بھی بہت سے آرٹسٹ تھیٹر سے وابستہ رہے۔

ملتان میں ڈرامے کی روایت کو آگے بڑھانے میں کالونی ٹیکسٹائل ملز نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اس ٹیکسٹائل ملز کی اپنی تھیٹریکل کمپنی تھی جو بہار کے موسم میں میلے پر ڈرامے کیا کرتی تھی۔

کالونی ٹیکسٹائل ملز کے تھیٹر میں جو ڈرامے کھیلے گئے ان میں ''لشکاں'' بہت مقبول ہوا۔ 60ء کی دہائی سے لے کر 80ء کی دہائی تک کا زمانہ ملتان میں ڈرامے کی روایت کو مضبوط کرنے میں نمایاں اور زریں دور ہے۔ سکولوں کی سطح پر تو 60ء کی دہائی کے آغاز سے سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ مسلم ہائی سکول اس وقت سب سے نمایاں تھا۔ ملتان میں ان 30 سالوں کے عرصے کے دوران بہت سی ڈرامیٹک سوسائٹیاں ڈرامیٹک کلب معرض وجود میں آئے جن کی تعداد ایک سو سے زیادہ بنتی ہے۔

مئی 1982ء میں ایک یادگار جشن تمثیل ہوا جس میں پہلی بار 17 ڈرامیٹک سوسائٹیوں اور کلبوں نے ڈرامے پیش کئے۔ یہ جشن تمثیل 17 مئی 1982ء سے لے کر 1982ء تک جاری رہا۔

سید محمد قمر زیدی جنہیں دنیا ایس قمر زیدی کے نام سے جانتی ہے، ملتان میں Opero کی روایت کے بانی ہیں۔ اوپیرا میں شاعری یا میوزک پس منظر میں ہوتا ہے۔ آرٹسٹ ان بولوں اور میوزک پر پرفارمنس دیتا ہے۔ جیسے ہیر رانجھا کا ڈرامہ چل رہا ہے۔ ہیر وارث شاہ بیک گراؤنڈ میں پڑھی جا رہی ہے۔

70ء کی دہائی سے ڈرامہ کمرشل ہو گیا۔ اس کے کچھ تقاضے ہی تبدیل ہو گئے اور ایک ایسی روایت ڈالی گئی

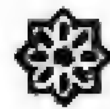
جو کسی نہ کسی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ جو آرٹسٹ ملتان میں تھیٹر کرتے رہے ان میں منور سعید، قوی خان، خالد عباس ڈار، عظمیٰ گیلانی، جمیل فخری، اورنگزیب لغاری اور ان جیسے بہت سے نام شامل ہیں۔

ملتان کے سٹیج پر ''ون مین شو'' کے حوالے سے انور جٹ کا نام آتا ہے۔ سرزمین کا ایک ایسا ہیرا تھا جو مٹی میں مل گیا۔ موسیقی، کمپیئرنگ، صداکاری، اداکاری، رائٹر غرض ہر شعبے میں اس شخصیت کی خدمات کا اعتراف اہل فن کرتے ہیں۔

80ء کی دہائی کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ ملتان میں سے تھیٹر ڈرامہ بالکل ختم ہو گیا۔ ملتان میں ایک وقت یہ تھا کہ تھیٹر سینما گھروں میں تبدیل ہوئے اور پھر 90ء کی دہائی سے یہ روایت بھی چلی کہ بہت سے سینما گھر تھیٹروں میں تبدیل ہوئے۔ ملتان میں ڈرامے کے نام پر پچھلے پندرہ سالوں سے جو کچھ ہوا اس نے ملتان کی صدیوں پر محیط ڈرامے کی عظیم روایت کو داغ دار کر دیا۔

تھیٹر کی ہزاروں سال پر محیط روایت یوں ختم ہونے والی نہیں ہے۔ سنجیدہ تھیٹر صرف ہمارے ہاں ختم ہوا ہے لیکن دنیا بھر میں یہ جاری ہے۔ دنیا بھر میں تھیٹر کے فنکار کو جو عزت دی جاتی ہے وہ ٹیلی ویژن اور فلم کے آرٹسٹ بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ جب سنجیدہ تھیٹر آ گیا تو یہ کمرشل تھیٹر ختم ہو جائے گا اور ملتان میں سنجیدہ ڈرامے کا سفر وہیں سے شروع ہو گا جہاں سے یہ سلسلہ ٹوٹا تھا۔

(روزنامہ خبریں ملتان - قاسم رضا)



محمد عامر خان بھٹہ

ملتان کے میلے

میلے انسانوں کی تفریح کا ذریعہ ہیں میلے کب شروع ہوئے اور کس نے ایجاد کئے اس بابت معلوم نہیں ہو سکا برصغیر ہند میں ہندوؤں نے اپنے میلے شروع کئے تو مسلمانوں نے اپنے میلے شروع کر دیئے ان میلوں کو جہاں خانقاہوں کے سجادہ نشینوں نے فروغ دیا وہاں ہندو برہمنوں نے بھی فروغ دیا خانقاہوں کے سجادہ نشینوں نے ان میلوں کو اپنی کمائی کا ذریعہ بنالیا۔ میلوں میں مختلف کھیل تماشے پیش کئے جاتے تھے ہر قسم کی دکانیں لگائی جاتی تھیں حلوائیوں کی دکانیں زیادہ لگائی جاتی تھیں ان میلوں میں شہروں اور دیہات کے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہوتے تھے ان میں دیہاتی خواتین زیادہ تعداد میں شرکت کرتی تھیں۔ بچے بھی میلوں میں اپنے والدین کے ساتھ جاتے تھے اور کھیل تماشے دیکھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ مداری، بندر اور ریچھ کا ناچ دکھانے والے بھی تماشا دکھا کر چار پیسے کما لیتے تھے۔ گھوڑوں، اونٹوں اور بیلوں کی دوڑ بھی میلوں میں دکھائی جاتی تھی میلے اگرچہ دو چار روز کے لیے لگائے جاتے تھے مگر یہ مقررہ دنوں سے کچھ دن زیادہ لگے رہتے تھے سرکس کا شو میلوں کا خاص ایونٹ ہوتا تھا میلوں سے واپس آنے والے لوگ اپنے اہل خانہ کے لیے مٹھائی کے علاوہ برتن، کپڑے اور دیگر اشیاء ضرور لاتے تھے مگر پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد ہندوؤں کے میلے بند ہو گئے اور پھر اس کے تقریباً دس سال بعد مسلمانوں کے میلے بھی بند ہو گئے اور یادگاریں باقی رہ گئی ہیں ملتان کے مشہور میلوں کی تفصیل یہ ہے۔

سید شیر شاہ کا میلہ:

شیر شاہ کی خانقاہ ملتان شہر سے تقریباً 10 میل کے فاصلہ پر ہے اس خانقاہ کے سجادہ نشین اپنے آباؤ اجداد کے اعزاز اور یاد میں 15 مارچ سے 21 مارچ کے دوران چار یوم کے لیے یہاں میلہ لگواتے تھے اس خانقاہ کے بزرگ پیر سید شیر شاہ سے عقیدت رکھنے والے مریدین دور دراز سے آتے تھے مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان، ملتان، خانیوال اور دیگر شہروں سے بھی لوگ میلہ دیکھنے آتے تھے خانقاہ کے سجادہ نشین اپنے مریدوں کو رہائش اور طعام فراہم کرتے تھے لنگر عام بھی جاری ہوتا تھا لنگر کے طعام کو تبرک سمجھا جاتا تھا۔ یہ مریدین خانقاہ کے سجادہ نشین کو نذرانے دیتے تھے۔ یہ ایک بڑا میلہ ہوتا تھا۔ خانقاہ شیر شاہ کے سجادہ نشین اس میلہ کے منتظم ہوتے تھے۔ دنگا فساد سے بچاؤ

کے لیے پولیس کی ڈیوٹی لگائی جاتی تھی پولیس سجادہ نشین کی ہدایت کے مطابق ڈیوٹی دیتی تھی میلہ میں آنے والے شرپسندوں سے نمٹنے کے لیے سجادہ نشین اپنے ذاتی ملازمین کو بھی چوکس رکھتے تھے اب یہ میلہ پہلے والی رونق سے نہیں لگتا۔

شاہ کوٹ کا میلہ:

یہ میلہ تقریباً 22 ہاڑ (7 جولائی تا 8 جولائی) شاہ کوٹ میں دو یوم کے لیے لگتا ہے۔ یہ میلہ بھی شاہ کوٹ کی خانقاہ شیخ سرور کے عرس مبارک پر لگتا ہے میلہ میں شیخ سرورؒ کے مریدین اور عقیدت مند آتے ہیں اس میلے کا انتظام بھی اس خانقاہ کے سجادہ نشین کرتے ہیں یہ میلہ اب بھی لگتا ہے مگر پہلے جیسی رونق نہیں ہوتی مہنگائی نے اس میلہ کی رونق کو ختم کر دیا ہے۔

مخدوم رشید کا میلہ:

یہ میلہ ہاڑ کی 15 تاریخ کے بعد پہلی جمعرات سے شروع ہوتا ہے اور آئندہ تین جمعراتوں کو منایا جاتا تھا یعنی چار جمعرات چار دن کے لیے لگتا تھا یہ میلہ بھی خانقاہ مخدوم رشید کی یاد میں لگتا تھا اس میلہ میں بھی مخدوم رشید کے عقیدت مند شرکت کرتے تھے مریدین کی رہائش اور طعام کا بندوبست کیا جاتا تھا مریدین اور عقیدت مند خانقاہ کے سجادہ نشین کو نذرانے پیش کرتے تھے یہ میلہ بھی بڑا میلہ ہوتا تھا دیہات میں ہونے کی وجہ سے دیہات کی خواتین بھی کثیر تعداد میں شرکت کرتی تھیں مگر اب یہ میلہ بھی بے رونق ہو گیا ہے اس میلہ کی اہم ترین بات یہ ہے کہ اس خانقاہ پر ایک کنواں ہے یہ کنواں سال بھر بند رہتا ہے جب میلہ شروع ہوتا ہے تو اس کنوئیں کو کھول دیا جاتا ہے عقیدت مند اور مریدین اس کنوئیں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پیتے ہیں اور اسے شفا سمجھتے ہیں۔ بیمار آدمی اس کنوئیں کے پانی سے نہاتے ہیں بیمار بچوں کو بھی نہلاتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اس پانی میں شفا ہے۔ جب میلہ ختم ہوتا ہے تو اس کنوئیں کو جنت کے درخت کے پتوں سے ڈھانپ دیتے ہیں پھر سال بعد میلہ شروع ہونے پر کھولتے ہیں۔

شاہ شمس کا میلہ:

ملتان شہر میں بیرون دولت گیٹ شاہ شمس سبزواری کا مزار ہے اس مزار پر حضرت شاہ شمس کے نام سے میلہ لگتا ہے یہ میلہ ہر سال عید (عید الفطر، عید الاضحیٰ) کے بعد جمعہ کے دن شام کے وقت تین گھنٹوں کے لیے لگتا ہے میلہ کے ابتدائی چند سال بعد یہ میلہ خانقاہ کے سجادہ نشین نے تین دن منانا شروع کر دیا تھا خانقاہ سے ملحق وسیع اراضی تھی میلہ بھرپور انداز میں لگتا تھا شہر کے لوگوں کا بڑا ہجوم آتا تھا دیہاتی لوگ اور شاہ شمس سبزواریؒ کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد اس میلہ میں شریک ہوتی تھی میلہ میں ہر تفریح کا بندوبست ہوتا تھا سرکس، موت کا کنواں، تھیٹر اہم آئیٹم تھے قیام پاکستان کے بعد مزار سے ملحق اراضی رہائشی مکانوں کے لیے فروخت ہوگئی اور یہ رہائشی کالونی بن گئی۔ میلہ منانے کے لیے اراضی نہ رہی جس سے میلہ لگنا مشکل ہو گیا اب میلہ تو لگتا ہے مگر پہلے جیسی رونق اور چہل پہل نہیں

ہوتی ہے۔

پیر جہانیاں کا میلہ:

یہ میلہ جمعہ خالصا کے مقام پر حضرت پیر جہانیاں کی یاد میں لگتا ہے یہ میلہ بھی ہاڑ کے مہینے میں ایک جمعرات کو لگتا ہے یعنی جون میں (15 جون سے 15 جولائی تک) اس عرصہ میں ایک جمعرات میلہ کے لیے مقرر کر لی جاتی تھی اب بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ میلہ ایک دن کے لیے لگتا ہے مگر چاروں تک جاری رہتا ہے۔ یہاں پر کوئی خانقاہ نہیں ہے مگر ایک فقیر کی جھونپڑی ہے۔ بعض اوقات اس میلہ میں گھڑ دوڑ بھی ہوتی تھی مگر اب نہیں ہوتی ہے۔ میلہ اب بھی لگتا ہے مگر جو رونق قیام پاکستان سے قبل ہوتی تھی وہ اب بالکل نہیں ہے۔

عابد خان کا میلہ:

یہ میلہ دریائے چناب کے کنارے پر واقع گاؤں لنگڑیال میں عابد خان باغ کے مقام پر منایا جاتا تھا۔ یہ میلہ ساون کے مہینہ (جولائی، اگست) میں ہر اتوار منایا جاتا تھا اس میلہ میں ہندو بھی شریک ہوتے تھے یہاں کوئی خانقاہ نہیں ہے۔ صرف ساون منانے کے لیے یہ میلہ منایا جاتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد لوگوں نے اس میلہ میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ملتان کے لوگوں نے ساون منانا بھی چھوڑ دیا جس سے یہ میلہ ہی ختم ہو گیا اب یہ میلہ ماضی کی یاد بن کر رہ گیا ہے۔

ہندوؤں کے میلے

بدھلہ سنت کا میلہ:

یہ میلہ شہر سے باہر دور ڈگرانہ میں بدھلہ سنت کے مقام پر منایا جاتا تھا اس جگہ ہندوؤں کا مشہور مندر ہے یہاں ایک بڑا تالاب ہے ہندو اس تالاب پر نہاتے تھے اور اس مندر میں عبادت کرتے تھے ہندو اس جگہ کو بہت متبرک سمجھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ اس تالاب پر نہانے اور اس مندر میں عبادت کرنے سے ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر اس کے لیے انہوں نے ہندو سال کا پہلا دن مقرر کر رکھا تھا جو انگریزی ماہ کے مطابق 15 اپریل کا دن ہوتا تھا یہ میلہ دو دن کے لیے منایا جاتا تھا یہ میلہ بڑا رونق والا ہوتا تھا۔ ہندو بڑی تعداد میں اس میلہ میں شریک ہوتے تھے اور بے حد خوش ہوتے تھے ہندو عورتیں بھی اس میلہ میں شرکت کرتی تھی مگر تعداد تھوڑی ہوتی تھی میلہ میں شریک ہونے والے کی ہر طرح سے حفاظت کی جاتی تھی۔ بدھلہ سنت ہندو آبادی کا مرکز تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ہندو ہندوستان چلے گئے اور یہ میلہ ختم ہو گیا اور یاد باقی رہ گئی۔

سورج کنڈ کا میلہ:

ملتان شہر سے باہر کافی دور ایک موضع کائیاں پور ہے یہاں پر ہندو اپنا میلہ مناتے تھے۔ یہ میلہ سال میں دو

بار منایا جاتا تھا میلہ بھادوں، ماگھ یعنی اگست اور ستمبر کے مہینوں کے دوران ایک دن کے لیے پھر جنوری اور فروری میں ایک کبھی دو دن کے لیے منایا جاتا تھا اس جگہ بھی تالاب اور مندر تھا ہندو حسب روایت اس تالاب پر نہاتے تھے اور مندر میں خصوصی عبادت کرتے تھے جہاں تفریح ہوتی تھی وہاں عبادت بھی ہوتی تھی تقسیم ہند کے بعد ہندوستان چلے جانے سے یہ میلہ بھی ختم ہو گیا ہے ایک یاد رہ گئی ہے۔

رام تیرتھ کا میلہ:

یہ ہندوؤں کا مذہبی میلہ تھا۔ یہ صرف جمعہ خالصہ کے مقام پر منایا جاتا تھا بھادوں کے مہینہ میں جب نیا چاند نکلتا تو یہ میلہ لگتا ہندو خوب پوجا پاٹ کرتے کرتے خوب خیرات کرتے اس میلہ میں ہندو برہمن اور سادھو بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں کے ہندوستان چلے جانے سے یہ میلہ بند ہو گیا ہے۔

جوگ مایہ کا میلہ:

یہ میلہ ملتان شہر کے باہر سٹی ریلوے سٹیشن ملتان کے قریب قبرستان مائی پاک دامنہؒ کے قریب منایا جاتا تھا اس جگہ اب بھی محلہ جوگ مایہ کے نام پر آباد ہے یہ میلہ بھی سال میں دو بار منایا جاتا تھا ہندو سال کے مطابق ماہ چیت (مئی اور جون کے مہینوں میں) میں چار دن تک بڑے جوش و جذبے سے منایا جاتا تھا۔ دوسری بار ماہ اسوں (ستمبر اور اکتوبر) میں چار دن تک منایا جاتا تھا اس جگہ ہندوؤں کی ایک دیوی ''جوگ مایہ'' کے نام سے ایک مندر ہے اس مندر کے پاس ہی ایک تالاب تھا۔ یہ میلہ ہندو عورتیں مناتی تھیں مرد ہندو برائے نام اس میلہ میں شرکت کرتے تھے البتہ ہندو عورتوں کی حفاظت کا سخت انتظام کیا جاتا تھا ہندو عورتیں اس تالاب پر نہاتی تھیں مندر میں پوجا پاٹ کرتی تھیں مندر تو موجود ہے جو ایک مہاجر کو الاٹ کیا گیا ہے۔ البتہ تالاب بند ہو چکا ہے۔ اور اُس کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہے ہندوؤں کے بھارت چلے جانے سے یہ میلہ ختم ہو گیا ایک یاد باقی رہ گئی ہے۔

بیساکھی کا میلہ:

بیساکھی ہندوؤں کا ایک مذہبی تہوار تھا بیساکھی کی پہلی تاریخ کو دریائے چناب کے کنارے ایک دن کے لیے میلہ مناتے تھے۔ بیساکھی کی چھٹی کرتے دریا پر نہاتے اور تفریح مناتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ میلہ بھی ختم ہو گیا صرف ماضی کا قصہ رہ گیا ہے۔

میلہ نارسنگھ چوداس:

یہ ہندوؤں کا مذہبی میلہ تھا یہ بھی بیساکھی کے نئے چاند کے نکلنے پر منایا جاتا تھا یہ میلہ شام کے وقت تین گھنٹوں کے لیے ملتان کے قدیم قلعہ پر لگتا تھا قلعہ پر حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مزار کے پہلو میں ہندوؤں کے ایک اوتار پرہلاد بھگت کا مندر ہے جسے بھارت میں بابری مسجد شہید کیے جانے کے ردعمل میں ملتان کے لوگوں

نے گرا دیا تھا۔ میلہ میں ہندو اس مندر میں پوجا پاٹ کرتے تھے یہ میلہ بھی مذہبی تھی۔ مذہبی ہندو یہ میلہ مناتے تھے تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں کے بھارت چلے جانے سے یہ میلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

زندگی کی تیز رفتاری جس طرح ہماری ثقافتی سرگرمیوں کو نگل رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ یہ میلے جو ثقافت کے بہتے دھارے ہیں، شاید خشک ہو جائیں گے اور ہم انہیں ماضی کی یادوں میں ڈھونڈ سکیں گے۔

(روزنامہ پاکستان ملتان-محمد عامر خان بھٹہ)



حکیم غلام یزدانی قریشی ہاشمی

ملتان کی عورتیں

عورت اور مرد کی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ کسی زمانے میں مردوں کی طرح عورتیں بھی باہمت ہوتی تھیں شہری عورتیں بھی اپنے طور پر بہت کچھ کام کرتی تھیں۔ پردے کا بھی پورا اہتمام رکھتی تھیں۔ جب کہیں دن کو ان کو جانا ہوتا تو ڈولی میں سوار ہو کر جاتی تھیں۔ اور دور جانا ہوتا تو تانگے یا موٹر میں جاتی تھیں اور ان کے چاروں اطراف کپڑے کے پردے لٹکا دیئے جاتے تھے۔ بعض عورتیں صرف اندھیرے وقت میں کہیں جاتیں بیماری کی حالت میں بھی باپردہ لے جائی جاتیں۔ بعض عورتیں تو ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر نبض دکھاتیں۔ تاکہ کسی غیر کا ہاتھ ہاتھ ان کو نہ چھوئے۔ ملحق گھروں میں کھڑکیاں یا دروازے ہوتے۔ اس راستے سے ایک دوسرے ہاں آتیں جاتیں۔ فارغ اوقات میں اکٹھی ہو بیٹھتیں اور اپنے اپنے کام میں بھی لگی رہتیں۔ اپنا گھر کچھ مناسب کھلا تھا۔ گوندی بیر اور نیم کے درخت بھی تھے اس طرح اکثر چہل پہل رہتی۔

چند مشاغل

1۔ چمڑے کے جوتے مثلاً کھسہ، پوٹھوہار، منڈا، کنالی وغیرہ کے اوپر لے حصہ پر سفید یا سنہری تلے یا ریشم سے خوبصورت بیلیں بنائی جاتیں۔ جس سے جوتے بڑے دیدہ زیب ہو جاتے۔ کئی عورتیں سفید یا رنگ دار سوتی یا ڈی ایم سی کے دھاگے سے کروشیا کے ساتھ تکیے یا بستر کی چادریں یا میز پوشیں بناتیں۔ کئی سوئی کے ساتھ کپڑوں پر رنگ برنگ کے بیل بوٹے بناتی تھیں جو کہ بڑے خوبصورت اور دل کو لبھانے والے ہوتے تھے۔ آجکل اس قسم کی بنائی، کڑھائی مشینوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔ لیکن ان میں وہ دل کشی نہیں ہوتی۔ کچھ عورتیں ریشم کے دھاگے سے بڑی بڑی چادروں پر آریا سوئی سے بیل بوٹے بناتیں ان کو گھگا کہتے تھے۔ پہاڑی علاقوں کی عورتیں ان کو بڑے شوق سے اوڑھتی تھیں۔

2۔ عورتیں لکڑی کے چوکھٹے پر سوتی، ریشمی دھاگے تان کر ازار بند وغیرہ بناتی تھیں۔

3۔ سلائیوں کی مدد سے اونی دھاتوں سے سوئیٹر، جرابیں اور مفلر وغیرہ مختلف خوبصورت ڈیزائنوں میں بنے جاتے تھے۔ جو بڑے مقبول ہوتے تھے۔

4۔ بچوں اور بڑوں کے لیے بھی کپڑے گھر پر سینے کا رواج تھا۔ کچھ عورتیں سوئی کرتے سیتی تھیں۔ گریبان کالر اور کندھوں پر بڑی خوبصورت بیلیں بناتی تھیں جو بہت پسند کی جاتی تھیں۔ اجرت پر بھی لوگ دوسروں سے بنواتے تھے۔

5۔ مونگ یا ماش کی دال کو کچھ ابال کر اس میں مصالحہ جات ملا کر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنائیں جاتی تھیں پھر ان کو سکھا کر رکھ لیا جاتا تھا۔ ضرورت کے وقت ان کو پانی میں ڈال کر دوبارہ سالن کی طرح پکاتے اور کھاتے تھے ان کو ''وڑیاں'' کہا جاتا۔ یہ آجکل بھی بنا کر فروخت ہوتی ہیں ہر دور کی لذیذ اور چٹپٹی غذا جانی جاتی ہے۔

6۔ موسم گرما اور درمیانی موسم میں چھوٹی میٹھی خمیری روٹی تل لگا کر پکانے اور کھانے کا عام رواج تھا۔ دو چار سکھیاں مل کر اس کے بنانے کا اہتمام کرتیں۔ دار چینی اور چنے کی دال کو ابال کر پانی چھان لیتے۔ پھر اس پانی اور دہی میں چینی ملا کر اس سے آٹے کو گوندھتے اور چھوٹی چھوٹی روٹیا بنا کر چادر پر پھیلا دیتے۔ چند لمحوں کے بعد وہ پھول کر خمیری ہو جاتی تھیں پھر ان کو گھی یا تیل میں تل لیتے یں اور استعمال کرتے ہیں کچھ لوگ ان کو خشخاش یا خربوزے کے بیج کا مغز بھی لگا دیتے ہیں اس طرح یہ کھانے میں اور بھی لذیذ ہو جاتی تھیں یہ ''ڈولی روٹی'' کہلاتی ہیں۔

7۔ گھروں میں اپنے ہاں قلفہ بنا کر مل کر کھانے کا رواج بھی ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گھروں میں فالودہ یا جیلی بھی بنا کر اس کے ساتھ استعمال کی جاتی تھی۔ اپنے ہی ہاتھ سے چیزیں بنا کر مل کر کھانے کا تو مزہ ہی ہور ہوتا ہے۔ وہ عمدہ بھی ہوتی ہیں۔ خالص بھی اور پاکیزہ بھی۔

8۔ موسم گرما میں آم کا ایک خاص قسم کا مربہ بنایا جاتا تھا۔ کچے آم چھیل کر اس کو گٹھلی سمیت لمبائی میں کاٹ لیا جاتا تھا۔ گٹھلی سے مغز نکال دیتے۔ اس کے ساتھ چھوہارے کھوپرہ کی پتلی قاشیں بادام کی چھلی ہوئی گریاں، پستہ ملا کر پانی میں پکاتے کہ وہ گل جاتیں۔ پھر اس میں چینی ڈال کر پھر نرم آنچ پر پکاتے کہ شیرہ گاڑھا اور پختہ ہو جائے۔ اس کو بڑے مزے سے کھایا جاتا۔ کچھ شوقین تو اس میں تھوڑا سا زعفران اور چھوٹی الائچی بھی شامل کر لیتے۔ اس کو ''شیریں کلیاں'' کہا جاتا تھا۔ بڑا محبوب مربہ بن جاتا تھا۔

9۔ موسم سرما میں مل جل کر سوہن حلوہ بناتے اس طرح تین چار گھنٹے ہنسی خوشی باہم مل کر بیٹھتے اور باتیں کرنے اور کام کرتے رہنے کا سنہری موقع ہاتھ آ جاتا تھا۔ یہ (سوہن حلوہ) اکثر رات کو پکایا جاتا۔ گھریلو عورتیں گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر مل بیٹھتیں۔ کڑاہی میں دودھ، آٹا سمنک، کو ملا کر آگ پر گاڑھا کرنا شروع کر دیتے اور جب پکتے پکتے کھویا سا بن جاتا تو گھی سے اس کو بھونا جاتا۔ پھر چینی ڈال کر گھی ملاتے اور بھونتے جاتے۔ آخر میں میوہ جات اور بادام کی گری، پستہ اور الائچی وغیرہ شامل کرتے اور بعد ازاں تھالوں میں پھیلا دیتے اور ٹھنڈا ہونے پر استعمال میں لاتے۔ ایسے مشاغل جہاں باہم مل بیٹھنے کا موقع میسر کرتے،

محبت یگانگت، ایک دوسرے کی مدد، اعتماد کا موقع مہیا کر کے خوشی کے مواقع بھی عطا کرتے تھے۔ آج کل تو سوہن حلوہ ملتان کی شناخت بن گیا ہے۔ ملک کے کونے کونے کے علاوہ غیر ممالک بھی جاتا ہے اور تجارتی بنیاد پر تیار کر کے بکثرت برآمد بھی کیا جاتا ہے۔

10۔ کچھ عورتیں زندگی کی ضروریات مثلاً کھیس، دریاں، کھانے پینے کی چیزیں، چوڑیاں، مٹی کے برتن، کھلونے، سبزیاں وغیرہ اٹھا کر گلی کوچوں میں پھر کر بیچتیں تھیں۔

اُن دنوں میں کچھ عورتوں نے گھروں میں آٹا پیسنے کی چکیاں بھی لگا رکھیں تھیں۔ وہ اپنی ضرورت کے لیے آٹا پیسنے کے علاوہ دوسرے ضرورت مندوں کے لیے بھی اجرت آٹا پیستی تھیں۔ بعد میں یہ ضرورت اونٹوں بیلوں سے کھینچی جانے والی چکیوں سے پوری ہونے لگی۔ بعدازاں بجلی سے چلنے والی چکی کا رواج ہو گیا اور آج کل تو رولر کے ذریعے بھی آٹا پیسا جاتا ہے۔ آٹا جتنا باریک پیسا جائے اور استعمال میں لایا جائے وہ اتنا ہی مضر صحت ہوتا ہے ایسا باریک پسا ہوا آٹا، قبض جیسی موضی مرض کے پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

عورتیں گھر کے کام کاج خود انجام دینے میں خوشی محسوس کرتی تھیں اور کھانا خود پکاتیں اور گھر کے سب افراد ایک ہی دستر خوان پر مل بیٹھ کر کھاتے۔

صاحب حیثیت گھر والے اپنے کھانے میں سے ہمسایوں کو ضرور کچھ بھیجتے۔ بعض اوقات برتن لے کر کئی ایک ہمسائے آ جاتے اور تھوڑا بہت ہر ایک کو دیا جاتا۔ عورتیں اپنے گھر والوں کے کپڑے خود دھوتیں تھیں۔

صابن مل کر کپڑے دھونے کے علاوہ کھار یا صابن کے ٹکڑوں کو پانی میں گھول کر ان میں کپڑے ڈال کر آگ پر ابال کر دھونے کا رواج عام تھا۔ اس طرح کئی ایک کپڑے ایک ساتھ دھل جاتے۔ آج کل واشنگ مشین نے اس طریقہ کو اختیار کر کے مقبول عام بنا دیا ہے۔ اب تو کپڑوں کو خشک کرنے کے لیے بھی مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں۔

زمانے کے رسم و رواج میں دن بدن تبدیلیاں آتی جا رہی ہیں تن آسانی، خود پسندی، بناوٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یہ بھی ایک وجہ ہے جس سے بیماریاں بڑھتی اور اچھے اخلاق و نیک کردار میں کمی آتی جا رہی ہے۔ سادگی اور محنت و مشقت ہی کامیاب زندگی گزارنے کے راز ہیں۔

مردوں کے میلے ٹھیلے

دنیاوی زندگی بڑا پر آشوب عرصہ حیات ہوتا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی ذمہ داری سے دو چار رہتا ہے۔ دنیا کے یہ کام کاج جب اس کو تھکا دیتے ہیں تو وہ سکون اور راحت چاہتا ہے۔ قدرت نے اس کے اس پہلو کا بھی خیال رکھا ہے۔ دن کو کام اور رات کو آرام کیلئے ترتیب دے دیا ہے۔ جن علاقوں میں دن یا رات لمبے ہوتے ہیں وہاں کے رہنے والے بھی کوئی نہ کوئی وقت آرام و سکون کے لیے مختص کر لیتے ہیں۔ جو ان کی تھکن دور کرنے کے علاوہ تازگی اور شگفتگی مہیا کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں۔

عورتوں کی نسبت مردوں کو ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے بھاگ دوڑ زیادہ کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے وہ

گھر کے دھندوں سے نجات پا کر موسم گرما میں بالخصوص سیر سپاٹے کے لیے ادھر اُدھر چلے جایا کرتے ہیں۔ یہ ساعتیں قدرت سے ہم آہنگی اور حقیقی خوشی و سکون کا باعث ہوا کرتی تھیں۔ انداز بود و باش بدل جانے کی وجہ سے آج کل ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر وغیرہ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ تاہم پورا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات بے جا ذہنی کوفت اٹھانا پڑتی ہے ان دنوں ہر محلّہ میں کچھ زندہ دل لوگ ایک جمعیت بنا لیتے تھے جس کو معرکہ کہا جاتا تھا۔ اس کا ایک امیر مقرر کیا جاتا۔ اس کو "خلیفہ" کہتے تھے۔ تمام ساتھی اس کے پاس مقرر کردہ رقم جمع کراتے تھے۔ جس کو "پتی" کہا جاتا تھا۔ کسی مقام پر جانے کا پروگرام بنایا جاتا۔ زیادہ پسندیدہ مقام "باغ عابد خاں"، "منا بھگت" وغیرہ ہوتے تھے۔ کھانے پکانے کا سامان، گراموفون، ہارمونیم، ڈھولک، بنجو وغیرہ ساتھ لے جاتے۔ اس کے علاوہ تاش، لڈو اور کیرم بورڈ وغیرہ بھی ساتھ ہوتے یہاں صبح سے شام تک قیام کیا جاتا ناشتہ میں عام طور پر حلوہ پوری، دوپہر کو مرغی وغیرہ کا سالن، چپاتی، پلاؤ، زردہ اور عصر کے وقت آم، دودھ کی لسی یا آئسکریم وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا۔ ہر فرد طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے کام میں مشغول ہو جاتا اور اس کو خوش اسلوبی سے نپٹاتا۔ چھوٹے بڑے، اعلیٰ ادنیٰ کا کوئی امتیاز نہ ہوتا فالتو وقت میں لوگ اپنی پسند میں محو ہو جاتے کوئی تاش کھیل رہا ہے تو کوئی لڈو کھیلنے میں مشغول کوئی سازینہ بجا رہا ہوتا تو کوئی کسی اور کام میں مشغول، جو تیراک ہوتے وہ ندی نالے میں نہاتے، غرضیکہ یہ دن دنیا کے ہر غم بھلا کر گزارا جاتا۔ عصر کے وقت واپسی کی تیاری شروع ہو جاتی۔ غروب آفتاب کے لگ بھگ ہر فرد اپنی اپنی سواری کس لیتا اور اس کا رخ اپنے گھر کی طرف کر لیتا۔ یہ سب لوگ اکٹھے جاتے اور اکٹھے ہی واپس آتے، جو کھانا دانہ بچ جاتا تو ہر فرد کو حصہ رسدی دے دیا جاتا۔ اور وہ اپنے گھر والوں کو بھی کھلا کر اس خوشی میں شریک کرتا۔ بعض اوقات اس قسم کے شغل میلے گھروں پر بھی منعقد کیے جاتے۔ تمام پتی دار اپنے حصے کی رقم خلیفہ کے پاس جمع کراتے، کوئی کھانے کی چیز مثلاً پکوان، ٹکی لڈو، سوہن حلوہ یا آئس کریم بنا کر کھاتے پیتے۔ کسی مذہبی تہوار، عید میلاد النبیؐ، مساجد میں ختم قرآن پاک وغیرہ کے مواقع پر بھی اس انداز پر عمل کیا جاتا، اس طرح باہم تعلقات اور محبت نشو و نما اور محلّہ داروں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا۔

ملتان علم و دین کا گہوارہ ہونے کے علاوہ بہت سے اولیائے کرام کی آرام گاہ بھی ہے۔ اہلیان ملتان بڑے نیک دل اور شخصیت پرست بھی ہیں۔ بزرگان دین کے عرس بڑے ذوق و شوق سے منعقد کرنے کے دلدادہ ہیں۔ ان مواقع پر ان کے اجتماع اور توجہ بڑی دیدنی ہوتی ہے۔ یہ اجتماع کئی کئی دن جاری رہتے ہیں۔ ان میں محافل وعظ و نصیحت کے علاوہ قرآن خوانی، نعت خوانی اور قوالی بھی ہوتی ہے۔ کئی ایک خانقاہوں پر تو سارا مہینہ یا اس مہینہ کی ہر جمعرات کو خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ موسمی پھل خاص قسم کی مٹھائیاں بکثرت فروخت ہوتی ہیں۔ مسالہ دار قتلمہ، زرد رنگ کا حلوہ، جلیبیاں زیادہ شوق سے کھائے اور بطور تحفہ گھر پر لے جائی جاتی تھیں۔

خوشی کے موقع پر مثلاً شادی، میلے یا خوشگوار موسم کے دنوں میں لوگ سٹیج ڈرامے، ناٹک، پتلی کا ناچ وغیرہ بڑے شوق سے رچاتے۔ فنکار قسم کے لوگ سنے سنائے قصوں کو ڈرامے کی شکل میں تبدیل کر کے مظاہرہ کرتے۔

''روشن ضمیر''، ''ہیر رانجھا''، ''سسی پنوں'' کے قصے بڑی دلچسپی سے سٹیج کیے جاتے۔ یہ ڈرامے عام طور پر رات کو برپا کیے جاتے۔ تا کہ شوقین بعد فراغت لطف اٹھا سکیں۔ ایک سٹیج بنایا جاتا، جس پر آگے پیچھے چار پردے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لٹکائے جاتے ان کے آگے پیچھے فنکار حسب موقع مظاہرہ کرتے اور داد پاتے۔ ڈرامے کے بول زیادہ تر شاعرانہ اور سرائیکی زبان میں ہوتے۔ مثال کے طور پر:

سسڑی عزرائیل کوں آکھیا ڈے نہ ڈھیر ڈراوے
جنیں آکھ اتھ بھیجے تیکوں آکھ ہونکوں خود آوے
ہے قانون کھتوں دا ایہہ باجھ وصال مراوے
ساہ ڈیساں دلچسپ ہونکوں جیڑھا وچھڑیا پنل ملاوے

سسڑی کوں ماء آکھے دھی آ عید ہے سوبھ قدر دی لج پر وردی
تیل پھلیل عطر لا جلدی تھی حقدار اجر دی وقت مہر دی
چھوڑ خیال پنل دے سارے وارث بن ہیں گھر دی ہاں سڑ دی
حال وٹا دلچسپ نہ اپنا تانگھ مٹا دلبر دی کیچ نگر دی

سر چا ہنجڑوں پونج تے آکھیوس اماں بیشک عیدے عید سعیدے
عید ہوندی ہے وسدیں دی رل گئی عید بعیدے درد شدیدے
عید کریساں پنل دے رلڑے پڑھساں حمد حمیدے تھرسم دیدے
ازل کنوں دلچسپ پنل دی ہاں میں مفت خریدے تھیم رسیدے

بڑی سادگی کے ساتھ واقعات کو پیش کیا جاتا ہر دیکھنے والا متاثر ہوتا اور مدت تک ان کو یاد کر کر کے لطف اٹھاتا۔ ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے تمام فنکار سٹیج پر آ کر سازوں کی دھن پر حمد باری تعالیٰ بڑی پر اثر انداز میں پیش کرتے اور پھر ڈرامہ شروع ہو جاتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انداز میں تبدیلی آنے لگی۔ کیمرہ ایجاد ہوا۔ سلائیڈ بنی پھر اس پر چھاپ شروع ہوئی۔ ہو بہو تصویر اور کردار ضبط میں آنے لگے، تیز روشنی اور پروجیکٹر کے ذریعے یہ تصویر پردے پر دکھائی جانے لگیں۔ اس طرح یہ سہولت بھی حاصل ہو گئی کہ ایک مرتبہ کا کھیل ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ کھیل کھانے کے لیے سینما ہال بن گئے۔ جب چاہا ضروری سامان کے ساتھ ڈرامہ دیکھ کر حظ اٹھالیا۔ اس طرح قدرت نے یہ بات بھی ہمارے ذہن نشین کرادی۔ کہ ہم جو کچھ اس دنیا میں کہتے یا کرتے ہیں وہ اس فلم کی طرح بعینہٖ موجود ہے اسی طرح انسان کا کیا گزرا دکھا کر یوم حساب مطمئن کیا جائے گا کہ اس کے اعمال کے مطابق اس سے سلوک کیا جا رہا ہے۔ کوئی کمی بیشی نہیں کی جا رہی۔ اس طرح یہ تنبیہ بھی ہو گئی کہ ہم اپنے اعمال و کردار کو صحیح راہ پر گامزن رکھیں تا کہ برے

اعمال ہمارے لیے پشیمانی کا باعث نہ بنیں۔اس طرح جگہ بہ جگہ زندہ ڈراموں کے دکھانے کا اہتمام اور تکلف بھی ہونے لگا۔

ملتان میں سب سے پہلا سینما گھر حسین آگاہی کی گھاٹی کے دامن میں محلہ جٹو شاہ سے ملحق ''پریم سینما'' کے نام سے بنا جس کو اب ''حشمت محل'' کہتے ہیں۔اور چھاؤنی میں امپریل سینما کے نام سے تعمیر کیا گیا۔ان دنوں صرف متحرک تصاویر دکھائی جاتی تھیں جو بے آواز ہوا کرتی تھیں آہستہ آہستہ متحرک تصاویر میں حسب کردار بول چال کا اہتمام بھی ہوگیا، پھر کئی سینما گھر بن گئے۔جن کی ملتان میں آج کل تعداد بیس کے لگ بھگ ہے۔

شادی کے رسم و رواج

باہم ربط کو قائم اور نوع انسانی کو پھیلانے کا ے فطری انداز شادی ہے اس طرح ایک نئی نسل جنم لیتے ہے۔ اس موقع پر مرد عورتیں بڑی مسرت و شادمانی سے اس کا اہتمام کرتے ہیں۔شادی کی مقررہ تاریخ سے کم از کم ایک ہفتہ پہلے لڑکی کا کہیں آنا جانا موقوف کر دیا جاتا ہے۔اور وہ گھر کے افراد اور قریبی عزیزوں کے گھیرے میں رہتی ہے۔ خوب کھلانے پلانے کے علاوہ جسمانی عافیت اور بناؤ سنگھار کا اہتمام شروع کر دیا جاتا ہے۔اس رسم کو ''ماہیوں'' کہتے ہیں۔شادی کی مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے مہندی لگانے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ پھر ابٹن وغیرہ کے ذریعہ رنگ و روپ کے نکھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سہاگ کی رات یا اس سے پہلے نکاح کی رسم ادا کی جاتی ہے۔حاضرین کی موجودگی میں دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو قبول کر کے زندگی مل جل کر گزارنے کا عہد کرتے ہیں اس خوشی کے موقع پر حاضرین کی اشیائے خورد و نوش سے تواضع کی جاتی ہے اور چھوہارے وغیرہ بھی بانٹے جاتے ہیں۔مبارک! مبارک! کی صدائیں بلند ہوگی تھیں۔ کمین اور نوکر چاکر لوگ انعام وصول کرتے ہیں۔لڑکی والے دولہا کو دلہن کے گھر خویش و اقارب کے جھرمٹ میں لے جاتے ہیں اور اس کو دلہن کے پاس بٹھاتے ہیں۔ہنسی خوشی کی باتیں ہوتی ہیں۔ کچھ رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ دلہن کی بہنیں دولہا کی جوتی چھپا لیتی ہیں۔اس حرکت میں شریک لڑکیوں کو کچھ رقم دے دلا کر دولہا جان چھڑاتا ہے۔ دلہن کی رخصتی کا انتظام شروع ہو جاتا ہے۔ دولہا والے اپنی سواریاں کس لیتے ہیں اور ''شکریہ شکریہ'' کہتے مسکراتے آگے بڑھتے ہیں۔اور ادھر لڑکی والے دلہن کو لے کر ان کے پیچھے چلتے رہتے ہیں کئی ایک کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر چہروں کو پژمردہ کر دیتے ہیں تاہم حوصلہ برقرار رکھتے ہوئے دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ دلہن کو سواری میں بٹھا دیتے ہیں۔ کسی زمانے میں بارات پیدل اور دولہا خوب سجائے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر آتا تھا اور رخصتی کے وقت دلہن کو پالکی میں سوار کر کے رخصت کیا جاتا تھا لیکن اب بے حجابی کے دور میں وہ تمام اطوار بدل گئے ہیں۔موٹر کاروں میں باراتیں بڑی سج دھج اور پٹاخوں دھماکوں کے ساتھ آتیں اور واپس جاتی ہیں۔اس شوشا پر اپنی حیثیت کو بڑھا چڑھا کر دکھانے پر ہزاروں روپے نذر آتش کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسرے یا تیسرے دن دولہا والے اپنے خویش و اقربا اور احباب کی دعوت کرتے ہیں اس کو دعوت ولیمہ کہتے ہیں

تیسرے یا چوتھے دن دلہن اپنے ماں باپ کے گھر آتی ہے تو اس کی آمد پر ایک تقریب ہوتی ہے۔ قریبی عزیز و رشتہ دار عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ اس کو "ست وارا" کہتے ہیں۔ اپنی دعوت ولیمہ تو تین دن تک ہوتی رہی تھی پہلے دن تو رشتہ داروں کے لیے دوسرے دن ہمسائگان اور احباب کے لیے اور تیسرے دن اطباء حضرات کے لیے خورد و نوش کا پرتکلف اہتمام کیا گیا تھا۔ والد مرحوم کے ایک دوست حاجی قادر بخش مرحوم نے اس کام کی ذمہ داری بڑی دلجوئی اور خوبی کے ساتھ نبھائی۔ روزانہ نئے قسم کے کھانے پیش کیے گئے۔ ایک زمانہ تھا کہ شادی کے موقع پر احباب و اقارب کے گھر افراد خانہ کی تعداد کے مطابق مٹی کے پیالے میں سالن اور مٹی کی طشتری میں چاول اور روٹی بھجوا دیتے تھے پھر گھر پر بلا کر دستر خوانوں پر کھانا کھلایا جانے لگا۔ اس کے بعد میز پر کھانا سجانے اور کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا رواج پڑا۔ اور آج کل تو سٹینڈوں یا میزوں پر کھانا سجا دیا جاتا ہے۔ اور ہر فرد خود پلیٹ چمچ وغیرہ اٹھا کر اپنی پسند کا کھانا اس میں لیتا اور چل پھر یا بیٹھ کر کھانا پسند کرتا ہے اس انداز خورد و نوش سے البتہ نہ اطمینان سے کھایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ہر آدمی کو ہر چیز میسر آتی ہے۔ صرف تکلیف اور تکلف ہی میسر آتے ہیں۔ ماضی قریب میں لڑکے والے کئی دن پہلے ہی ڈھول، نقارے، شہنائی کی گونج سے شادی کا اعلان کرنا شروع کر دیتے تھے اور یہ مشغلہ کئی دن تک جاری رہتا۔ ان دنوں نکاح خوانی کا سلیقہ بھی سادہ تھا۔ اقارب اور احباب کی مجلس میں نکاح خوانی شرعی طریقہ سے ایجاب و قبول سے کراتے تھے۔ بعد ازاں دستاویزی نکاح خوانی کا طریقہ شروع ہو گیا۔ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ آج کل تو یہ ساعتیں فلم میں محفوظ کرنے کا طریقہ بھی شروع کر دیا گیا ہے اس میں بہت حد تک کھاوے کا دخل بھی ہے۔ رونق کو وقتی طور پر بڑھانے کا بھی یہ ایک طریقہ ہے۔ بہت کم اس فلم کو دیکھنے یا کھانے کی طرف رغبت کی جاتی ہے۔ البتہ تاریخ کا ایک حصہ ضرور بن جاتی ہے۔ حالانکہ ضرورت تو اس کی ہے کہ ہم اپنی توجہ اور سرمایہ آئندہ پیدا ہونے والی نسلوں کی عمدہ پرورش اور تربیت پر خرچ کریں۔ جس کی ہم جیسے اسلامی ترقی پذیر ملک کو زیادہ ضرورت ہے تاکہ دنیا کی زندگی سنور جائے اور آخرت میں سرخروئی نصیب ہو۔

(کچھ یادیں کچھ باتیں۔ حکیم غلام یزدانی قریشی ہاشمی)



سجاد حیدر پرویز

ملتانی لوک قصے

اس علاقے میں بے شمار لوک قصے موجود ہیں جن پر کافی حد تک کام ہو چکا ہے۔ سرائیکی لوک قصوں پر ظامی بہاولپوری مرحوم، طاہر غنی مرحوم اور اشرف بزدار کی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ یہاں صرف چار ایسے قصے دیئے جا رہے ہیں جنہیں لوک قصے کا مقام بھی حاصل ہے اور وہ ملتانی علاقے کی نمائندگی تاریخی، سماجی اور معاشرتی لحاظ سے بھی کرتے ہیں۔ قصہ ''گانموں سچا'' اور قصہ ''ناہر بادشاہ'' تاریخی حیثیت کے حامل ہیں پہلے قصے کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے اور دوسرے کا مظفر گڑھ سے ہے۔ قصہ ''سمی راول'' تونسہ تحصیل اور پہاڑی علاقے کی لوک داستان ہے جبکہ قصہ سخی بادشاہ ملتان کے تھیٹر میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

1) قصہ گانموں سچار:

گانموں سچار پر ''شخصیات'' کے ضمن میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کا حوالہ ''اکھا'' میں بھی آیا ہے۔ وہ صاف گو انسان تھا اور اس کی صاف گوئی سے امرائے سلطنت کی بدعنوانیاں ظاہر ہو جاتی تھیں۔ کیونکہ گانموں خان بھرے دربار میں بے کم و کاست باتیں سنا دیا کرتا تھا۔ لہٰذا درباری اس کے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے غازی خاں کو اس کے خلاف بھڑکایا اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ گانموں اکثر و بیشتر غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔ غازی خان نے ان کی باتوں پر یقین نہ کیا۔ البتہ ان کی تسلی کی خاطر گانموں کا امتحان لینے کا ارادہ کیا۔ درباریوں نے استدعا کی کہ اس کا امتحان لینے کی غرض سے دربار میں اسے ایسا قصہ سنانے کا حکم دیا جائے جو سو فیصد سچا اور طویل ہو۔ پھر ہم اس کی کذب بیانی پر اسے ٹوکیں گے۔ یہ قصہ اس علاقے میں قصہ گانموں سچار کے نام سے مشہور ہے اور یہاں اس قصے کا اردو خلاصہ جناب عبدالقادر لغاری کی کتاب ''تاریخ ڈیرہ غازی خان'' سے نقل کیا جاتا ہے۔ ''گانموں خان نے قصہ شروع کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں ہمیشہ جہاں پناہ کے ہمراہ شکار پر جایا کرتا تھا مگر ایک روز میرے دل میں شکار پر جانے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ اور میں اکیلا ہی چلا گیا۔ آٹھ دس دن سیر و شکار میں دل بہلانے کے بعد دربار شاہی سے غیر حاضری کا احساس پیدا ہوا۔ دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوا تو صحرا میں ایک عالی شان قلعہ دیکھا جس کا نام بدن تھا۔ اس قلعہ میں نینوں کے پھاٹک، چشم کے برج، خوبی کے محل، شرم کے دروازے اور زلف کے تالے تھے۔

جب میں قلعے کے اندر داخل ہوا تو دو تخت نظر آئے جن پر بخت بادشاہ اور علق وزیر جلوہ افروز تھے۔ ان کے جلو میں نیت اور صحت نامی دو باندیاں دست بستہ کھڑی تھیں۔ دروازہ پر گناہ اور ثواب نامی پہرہ دار پہرہ دے رہے تھے۔ بادشاہ کا دربار مجھے پسند آیا اور میں نے وہاں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ اور وزیر کے گھر دو بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام دل شہزادہ اور نظر وزیر رکھ لیے گئے۔ جب ان بچوں کے پالنے کا مسئلہ درپیش ہوا تو بادشاہ نے نیت نوکرانی کو قناعت کے گاؤں سے تربیت نامی دایہ کو بلانے کے لیے روانہ کیا۔ جب بچے سیانے ہو گئے تو ان بچوں کو تعلیم کے لیے ملک اصفحام کے گاؤں فہم سے قاضی شعور کو مقرر کیا گیا۔ تحصیل علم کے بعد قاضی صاحب ان بچوں کو دربار میں لایا تو بادشاہ کے دریافت کرنے پر اس نے عرض کی کہ سلیقہ حیا عزت اور آبرو کی مستند کتاب پڑھا چکا ہوں۔ بچوں کی کامیابی پر بادشاہ نے ان کو حسن کے لباس اور تعظیم کے اسلحہ سے سجایا۔ ان کو سواری کے لیے سند اختیار دیا جس کی لگا توکل تھی۔ ایک دن بادشاہ کو خواہش ہوئی کہ کوئی رفاہ عام کا کام کیا جائے۔ وزیر نہ مشورہ دیا کہ بہترین تجویز یہی ہے کہ اجاڑ علاقوں کو آباد کیا جائے اور سب سے موزوں علاقہ توبہ کوٹ ہے۔ اس علاقہ کی آبادکاری کے لیے شہزادہ دل بادشاہ اور نظر وزیر منتخب کیے گئے۔ جب وہ اس ویرانہ کی طرف روانہ ہوئے تو وہ مدت تک راستہ میں بھٹکتے رہے۔ نظر وزیر نے ایک بڑے درخت پر چڑھ کر دور کسی جگہ دھواں اٹھتا ہوا دیکھا اور دونوں نے اس جگہ کا رخ کیا۔ وہ جگہ ایک فقیر کی مچان تھی۔ جو ایک ٹیلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ فقیر نے جب ان سے سنا کہ وہ توبہ کوٹ آباد کرنے چلے ہیں تو وہ ہنس پڑا کیونکہ ان جیسے ہزاروں آئے تھے مگر وہاں کے چھ بدمعاشوں نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا تھا۔ ان بدمعاشوں کے نام حرکت (شوشہ)، بدکاری، شیطان، گمان، وسوسہ اور نفس تھے۔ جو نہ مرتے ہیں نہ اس علاقے کو آباد ہونے دیتے ہیں۔ شہزادے نے جواب دیا کہ وہ بھی ان کو کمزور نہ سمجھے کیونکہ وہ بھی تعظیم کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اختیار کے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ فقیر نے انہیں بتایا کہ تمہاری کامیابی کے لیے کسی جھدی (رہنما کامل) کی ضرورت ہے اور خوش قسمتی سے وہ فقیر ان کی امداد پر راضی ہو گیا۔ کیونکہ وہ بذات خود مرد کامل تھا۔ اس فقیر نے انہیں لاحول واللہ کی دھونی دی اور استغفار کے اسلحہ کی مدد سے صبر کی گودڑی میں ڈالا اور پھر انہیں ہدایات دیں۔ ایک طویل سفر کرنے کے بعد وہ نفع نامی خانقاہ پر پہنچے۔ جہاں کا مجاور جفع (ریاضت) تھا۔ وہ اپنی پلکوں سے خانقاہ پر جھاڑو دے رہا تھا۔ اس خانقاہ سے بہت بڑے فاصلہ پر توبہ کوٹ آیا۔ جس کے دروازے پر زاری (آہ و بکا)، برج شکرانہ اور محل مطلب کے تھے۔ اس قلعہ میں ہدایت کے تخت پر شہزادہ جلوہ افروز ہوا اور فقیر واپس چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد شہزادہ نے وزیر کو اندرون علاقہ روانہ کیا تا کہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر آئے۔ وزیر کی روانگی کے بعد چھ بدمعاش شرفاء کا لباس پہن کر اور لمبی لمبی تسبیحیں ہاتھوں میں لے کر شہزادہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے شہزادہ کو بتایا کہ وزیر تمہارا خیر خواہ نہیں کیونکہ وہ دنیا کی بہترین نعمتوں سے آپ کو محروم رکھتا ہے۔ یہ نعمتیں پریم رس کے جام، باغ دیدار کے بیر اور آب زمزم ہیں۔ بادشاہ وزیر سے متنفر ہو گیا اور اس کی واپسی پر غصہ سے بے قابو ہو کر اسے مارنے دوڑا۔ وزیر نے بھاگ کر جان بچائی۔ جنگل میں اس کی ملاقات جھدی فقیر سے ہوئی اور شہزادے کو خوش کرنے کے لیے ان

نعمتوں کے حصول کی خاطر اس سے طالب امداد ہوا۔ فقیر نے اس کی حاصل مراد نامی بادشاہ کی طرف رہنمائی۔ آخر کار وہ اسے گمنامی کے جنگل میں معرفت کے باغ کے اندر خوشی کے تخت پر بیٹھا ہوا مل گیا۔ اس بادشاہ نے اسے کامل مراد بادشاہ کی طرف بھیجا۔ وزیر کو یہ بادشاہ صفوان کے جنگل میں مسکینی کے تخت پر نظر آیا۔ وزیر نے وحدت دریا سے گزر کر عاشقی دروازہ پار کیا۔ کامل مراد نے بتایا کہ نعمتیں اگرچہ دستیاب ہوسکتی ہیں مگر ان کے لیے بڑی تگ و دو کی ضرورت ہے۔ ان کے طالب کو مشکلات کی تین منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔ پہلی منزل میں دریائے حسین کو جوبن کی کشتی کے ذریعے طے کرنا ہوگا۔ اس کشتی کے ملاح رمز و، غمزہ، نیازی اور غمازی ہیں۔ دوسری منزل میں شہرت کا شہر ہے جس کا کوتوال تہمت ہے۔ اس شہر کی گلیاں خرابی اور کوچے خواری ہیں۔ وہاں کے منشی کا نام غرض ہے۔ معرفت کا سودا کرنے کے لیے بھروسہ نامی دلال موجود ہے جس کا ترازو قسمت، نصیبہ باٹ ہیں۔ تیسری منزل دریائے جرأت ہے جہاں حسرت کی کشتی میں غیرت کا ملاح تمہیں پار پہنچائے گا۔ وزیر کامل مراد بادشاہ سے رخصت ہوکر دریائے حسن پر پہنچا جہاں انہوں نے اعمال نامہ کا کرایہ طلب کیا جو اس کے پاس مفقود تھا۔ مجبوراً اسے واپس کامل مراد کے پاس آنا پڑا اور اس کی سفارش سے دریا کو پار کیا پھر وہ شہرت کے شہر پہنچا۔ جہاں اکیلے گزرنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ ازروئے قانون دو کا ہمسفر ہونا لازمی تھا۔ اس وقت جھدی فقیر پہنچ گیا اور وہ اس کے ساتھ مل کر شہر پہنچا۔ اس سے پرے پریم رس کا قلعہ تھا جس کے نہ تو دراوزے تھے اور نہ ہی سیڑھیاں۔ اسی شش و پنج میں جب وہ گھوڑے سے اترنے لگا تو گھوڑے نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور وہ اختیار کے گھوڑے پر سوار ہوکر توکل کی لگامیں سنبھالے قلعے میں داخل ہوگیا۔ اس قلعہ کے اندر ایک باغ تھا جہاں پودوں پر بلاتفریق موسم پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور ایک شخص ان پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھا۔ اس مالی کا نام ارادہ تھا۔ جو پرہیزگاری کے مشکیزہ سے آب زمزم پودوں کو دے رہا تھا۔ جب وہ مالی سے باتیں کر رہا تھا تو عجز اور نیاز وہاں آئے جو شہزادی پریم رس کے دربار میں حاضری دینے جارہے تھے۔ وزیر نے ان کے ذریعہ ایک عرضداشت شہزادی کی خدمت میں روانہ کی۔ جس میں ان نعمتوں کی استدعا کی۔ شہزادی نے ان کو حکم دیا کہ وزیر کو حاضر کیا جائے۔ جب عجز اور نیاز شہزادی کے حکم کے تحت وزیر کو بلانے کے لیے جانے لگے تو شہزادی نے ان کو واپس بلالیا اور ان کی بجائے اپنی دو خادماؤں مہر اور محبت کو روانہ کیا۔ جب وزیر شہزادی کے حضور حاضر ہوا تو اس نے فرمائش کی کہ دل بادشاہ کو لے آئے اور اس کے بعد جملہ خواہشوں کو پورا کیا جائے گیا۔ وزیر نے سفر کی مشکلات کا حوالہ دے کر اپنی معذوری کا اظہار کیا تو شہزادی نے خیال پیادہ اور شہر محبت نامی اپنی خادماؤں کو روانہ کیا۔ شہزادی پریم رس کے حکم پر جب شہزادہ سفر کی تیاری کر رہا تھا تو چھ بدمعاشوں کو بھی اس سفر کا علم ہوگیا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر شہزادہ شہزادی پریم رس کے پاس چلا گیا تو ہماری قدر و قیمت خاک میں مل جائے گی۔ للہذا انہوں نے دل بادشاہ کو سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ بخت بادشاہ نے عقل وزیر سے کہا ''دیکھا'' ہمارے لوگوں کے کرتوت پہلے تو تمہارا بیٹا توبہ کوٹ سے فرار ہوگیا۔ اب شہزادہ بھی جانے کو تیار ہے۔ بخت بادشاہ نے تجویز پیش کی کہ ان کی گوشمالی کے لیے اختیار کی فوجیں شرم کے اسلحہ سے لیس ہوکر جائیں اور شہزادہ کو گرفتار کرکے پیش کریں۔ مگر وزیر نے اختلاف

رائے کرتے ہوئے رائے دی کہ بے حیائی کی فوج بے شرمی کے اسلحہ سے لیس کر کے روانہ کی جائے۔ جس پر بادشاہ نے اتفاق کیا۔ اس فوج نے بہت جلد شہزادے کو گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا اور اسے غار غفور میں فکر اور اندیشہ نامی پہریداروں کی تحویل میں قید کر دیا گیا۔ شہزادی پریم رس کو جب شہزادے کی گرفتاری اور قید کا علم ہوا تو اس نے شاہ حسن کو اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ حاضر ہونے کا حکم دیا۔ شاہ حسن نے اپنے چار سفید ہروں بھروں (بے مقصد) خواہ مخواہ۔ زور مسائیں (زبردستی) اور بالکل بخت بادشاہ کے پاس روانہ کیا اور شہزادے کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ بخت بادشاہ نے اس مطالبے کو منظور نہ کیا اور اپنے سفر احمق، بیوقوف، بے فکر اور کوتاہ اندیش کو شاہ حسن کے پاس روانہ کیا۔ جب صلح صفائی سے کام نہ بن سکا تو شاہ حسن نے عشق کے گھوڑے، حسن کی فوجیں اور نینوں کے تیروں سے بخت بادشاہ پر حملہ کیا۔ بخت بادشاہ کو جب اس لشکر کی آمد کا علم ہوا تو وہ سخت گھبرایا اور تاب نہ پا کر حیرانی کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ حملہ آور شہزدے کو واپس لے کر چلے گئے۔

2) قصہ ناہر شاہ:

ضلع مظفر گڑھ کے جنوب میں ''سیت پور'' کی ریاست تھی۔ جہاں اسلام خاں لودھی نے جو کہ بہلول خاں لودھی حاکم ہندوستان کا رشتہ دار تھا، نے 1455ء میں ناہروں کی حکومت قائم کی۔ ان ناہر بادشاہوں کی سادہ لوحی کے متعلق بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔ مگر ''قصہ ناہر شاہ'' کو علاقہ سے باہر بھی شہرت ملی اس قصے کو مظفر گڑھ کے مایہ ناز شاعر کشفی ملتانی مرحوم نے 1964ء میں منظوم کیا اور یہ ان کے اخبار ہفت روزہ ''بشارت'' میں شائع ہوا۔ اس قصے سے اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

روایت جو آئی جو اک سرد رات
ٹھٹھرنے لگی ٹھنڈ سے کائنات
بہر سمت شور شغالاں اٹھا
کچھ ایسا کہ سر پر بیاباں اٹھا
سنی شاہ نے بھی یہ چیخ و پکار
ہو شور شیطاں سے بے قرار
کہو کیا ہے ہنگامہ ہاؤ ہو
تراچہ تراچہ ہے کیا، کو بکو
وزیر ایسا ہوشیار اور کارداں
جسے مانتے تھے بڑے پہلوان
صاف ذرا سوچ کر پھر کہا صاف

شغالوں میں لو بانٹتا ہوں لحاف
وئی ٹھنڈ سے پھر نہ ہو گا نذار
دعا دیں گے زندہ رہے تاجدار
مگر گیدڑوں کا جو تھا شور و شر
وہ بڑھتا ہی گیا اور بھی الحذر
جو پوچھا کبھی شاہ نے، اے وزیر
مچاتے ہیں کیوں شور شیطان شریر
وزیر اس کا چونکہ تھا حاضر جواب
ادب سے پکارا کہ عالی جناب
نہیں گیدڑوں کا یہ شور نشور
ادا شکریہ کر رہے ہیں حضور

3) قصہ سمی راول:

یہ ایک پرانی لوک داستان ہے جب تونسہ کی سنگھر ندی (برساتی نالہ) اپنے پورے جوبن پر بہتی تھی۔ تونسہ شریف اس ندی کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ٹوبھے کے علاوہ پینے کے پانی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس بستی میں کالو نامی لودھی رہتا تھا جو موچیوں کا کام کرتا تھا۔ یہ ٹھنڈے مزاج کا ملنسار، مخلص، نیک اور شریف انسان تھا۔ اس کے دو بچے تھے ایک بیٹی سمی اور دوسرا بیٹا۔ سمی سیرت وصورت دونوں میں منفرد تھی۔ صورت من موہنی، جسم سنگ مرمر سے تراشا ہوا، سیاہ زلفیں، غزالی آنکھیں، کونج کی گردن۔ وہ آسمانی مخلوق دکھائی دیتی تھی۔ ایک دن علی الصبح وہ ٹوبھے سے پانی بھرنے گھر سے نکلی تو لوٹ کر نہ آئی۔ ماں سخت پریشان ہوئی۔ باپ اور بھائی کا بھی برا حال تھا۔ اس کی تلاش کے لیے ہر ممکن حربہ اختیار کیا گیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ دن گزرتے گئے۔ اس دوران باپ بیٹی کو تلاش کرتا رہا اور ماں گھر میں بین کرتی رہی۔ ایک دن بستی کی ایک عورت اسے ملنے آئی اور صلاح دی کہ بستی کی مسجد میں ایک پیر پٹھان تشریف لائے ہیں جو پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تو اپنی مراد لے کر ان کے پاس جائے تو خالی ہاتھ نہ لوٹے گی۔ سمی کی ماں اس عورت کے ساتھ پیر کے پاس گئی اور رو کر کہانی بیان کی۔ پیر پٹھان نے جلال میں آ کر کہا ''جاؤ تمہیں تمہاری بیٹی جلد مل جائے گی۔'' اللہ میاں نے پیر پٹھان کی دعا سن لی اور تیسرے دن سمی گھر لوٹ آئی۔ ماں بیٹی کو گلے لگا کر رو رو کر ہلکان ہوئی جاتی تھی۔ لوگ کالو موچی کے گھر آ کر مبارکباد دے رہے تھے۔ ایسے میں سمی نے جو اپنا حال احوال بیان کیا وہ یہ تھا۔ ''جس دن میں ٹوبھے پر پانی بھرنے گئے تو وہاں ایک جوان اپنے اونٹ کو پانی پلانے آیا۔ مجھے دیکھ کر نہ جانے اس کے من میں کیا آئے کہ اس نے بے خوفی سے مجھے اپنے کجاوے میں ڈالا اور چل پڑا۔

اس نے میری منت سماجت کو کوئی اہمیت نہ دی اور مجھے جنگل میدان پہاڑ عبور کر کے بہت دور لے گیا۔ تین دن کی مسافت کے بعد ہم اس کے گھر پہنچے۔ جہاں چاروں طرف سیاہ وسفید پہاڑ تھے اور درمیان میں ٹھنڈے پانی کا چشمہ تھا اور وادی میں بلوچوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اس کی ماں بہن اسے مل کر بہت خوش ہوئیں اور اس کی واپسی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ جب انہوں نے مجھے دیکھا تو استفسار کیا۔ راول شرم کے مارے کچھ نہ بتا سکا تو میں نے تمام بات کہہ سنائی۔ راول کی ماں غصے ہوئے۔ اسے ظلم اور شیطانی کام قرار دیا۔ اس پر روال نے بتایا کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ سمی سے محبت کرنے لگا ہے اور اس سے شادی کا خواہاں ہے مگر راول کی ماں نے مجبور و بے کس لڑکی سے شادی کی اجازت نہ دی۔ راول کی بہن جس کا نام شیریں تھا۔ وہ بھی بھائی کی اس حرکت پر خوش نہ تھی۔ اس سے میرا اداس چہرہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ میں ہر وقت اللہ سے اپنے گھر پہنچنے کی دعا مانگتی۔ آخر ایک دن راول کی ماں نے اسے مجھ کو گھر واپس پہنچانے کا حکم دیا۔ راول نے کہا وہ سمی کے بغیر جی نہ سکے گا۔ اس کی ماں یہ جواب سن کر خاموش ہوگئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ راول جذباتی نوجوان ہے۔ ادھر دن بہ دن میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن شیریں نے غصے میں بھائی سے کہا وہ مجھے گھر چھوڑ آئے نہیں تو بستی پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ راول نے جواب دیا کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اور سمی کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ اس پر شیریں نے کہا کہ تم خودغرض ہو۔ یہ محبت نہیں ظلم ہے۔ محبت تو یہ ہے کہ محبوب کی خوشی کی خاطر اپنی جان دے دی جائے نہ کہ محبوب کی خوشیاں چھین لی جائیں۔ اس پر راول نے سر جھکا لیا اور کجاوے میں مجھے بستی چھوڑ گیا۔ راول اول درجے کا شریف تھا۔ اسے اس کے عشق نے ڈاکو بنا دیا مگر وہ نیت کا صاف تھا۔ میں اس کی بہن شیریں کے خلوص اور اس کی ماں کی شفقت کو کبھی نہ بھلا سکوں گی۔'' سمی کے لوٹ آنے پر ایک نئی زندگی شروع ہوئی۔ سمی کو راول کے جذبات سے بھری اور بے بس آنکھیں یاد آئیں۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ تو راول کے عشق میں دیوانی ہو چکی ہے۔ ادھر راول سے سمی کی دوری برداشت نہ ہوتی تھی۔ دونوں طرف عشق کی آگ نے سب کچھ جلا دیا۔ ایک دن سمی کا دل بہت اداس تھا۔ وہ گھڑا اٹھا کر ٹوبھے پر پہنچی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہاں راول اس کی راہ تک رہا تھا۔ پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ راول اتنا طویل سفر کر کے سمی سے ملنے آتا۔ پھر وہی ہوا جو ایسی داستانوں میں ہوتا ہے۔ ایک چغل خور کو ان کی ملاقاتوں کی خبر ہوگئی اور اس نے یہ بات پوری بستی میں مشہور کر دی۔ بدنامی ہونے پر کالو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ بالآخر بستی چھوڑ کر سنگھڑ کی دوسری طرف گیارہ میل دور جا کر آباد ہوا۔ سمی کا دل راول کے لیے بے چین رہتا اور راول بے خبری میں ٹوبھے کے چکر لگاتا رہتا۔ سمی یہ سوچ کر دن گزارنے لگی کہ شاید کبھی راول اسے تلاش کرتا یہاں تک آ جائے۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ راول دن رات ٹوبھے پر ڈیرے ڈال کر محبوب کے دیدار کی دعائیں مانگتا رہا۔ سمی جو پھول کی طرح معصوم تھی۔ کملائی گئی۔ راول سے متعلق خدشات اسے دیمک کی طرح چاٹنے لگے۔ اور یوں انتظار کی اذیت نے اسے موت کی وادی میں لا دھکیلا۔ راول بھوک پیاس سے بے نیاز اسے بستی بستی ڈھونڈتا رہا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک قبر پر ایک نوجوان روتے ہوئے بین کر رہا ہے۔ ''میری پیاری بہن سمی۔ ہم نے تو

بدنامی کے خوف سے تونسہ چھوڑا تھا پر تو ہمیں ہی چھوڑ گئی۔'' راول نے اندازہ لگا لیا کہ یہ نوجوان سمی کا بھائی ہے اور سمی مرگئی ہے۔ وہ دیوانہ وار سمی کی قبر سے لپٹ کر رونے لگا اور کہا میں بدبخت راول ہوں۔ اب میں ساری زندگی اپنی سمی کی قبر پر گزاروں گا۔ آخر راول نے سمی کی قبر پر رو رو کر جان دے دی۔ یہ خبر ہر طرف مشہور ہو گئی کہ ایک سچا عاشق اپنے عشق میں سرخرو ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ اکٹھا ہوا اور راول کو سمی کی قبر کے قریب دفنا دیا گیا۔ آج بھی تونسہ کے شمال میں گیارہ میل دور ''چھپے شیخ'' کے قبرستان میں ''راول سمی'' دنیا کے جھگڑوں سے بے نیاز محو استراحت ہیں۔ سرائیکی کی اس لوک داستان کو غلام حسن حیدرانی مرحوم نے ''سمی'' کے عنوان سے منظوم کیا جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

4) قصہ سخی رنگیلا

سخی رنگیلا بادشاہ شاہی دربار میں آتا ہے اور آ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ پھر نقیب سے کہتا ہے کہ تمام دروازے کھول دو اور اعلان کر دو کہ سخی رنگیلا کے دربار میں جو سوالی سوال کرے گا پورا کیا جائے گا۔ نقیب اعلان کرتا ہے سب سے پہلے جٹ فقیر آتا ہے۔ وہ نقیب سے کہتا ہے کہ میں دریا کے کنارے بیٹھا تھا دریا میں طغیانی آئی اور اس میں میرے بیوی بچے اور گھر بار سب ڈوب گیا۔ اکیلا بچا ہوں بادشہ سے کہہ کہ اللہ کے نام پر ایک کنواں عنایت کرے۔ نقیب جا کر بادشاہ کو بتاتا ہے۔ بادشاہ کہتا ہے کہ اسے ''چٹ والا کھوہ'' دے دو۔ فقیر پوچھتا ہے کہ وہاں آبادی ہوتی ہے؟ نقیب بتاتا ہے کہ نہیں۔ اس پر اس نے کہا کہ اچھا میں محنت کر کے اسے آباد کر لوں گا۔ بادشاہ سے جا کر کہو کہ ایک جوڑا بیلوں کا دے۔ بیل ملے تو اس نے ہل مانگا۔ بادشاہ نے کہا کہ دس روپے دے دو خود بنوا لے گا۔ اب اس نے بیج کا مطالبہ کیا تو پانچ بوری گندم مل گئی۔ اب اس نے آٹا پیسنے والی چکی مانگی۔ لہٰذا اسے ایک بار پھر رقم دی گئی تا کہ چکی خرید سکے۔ فقیر نے کہا کہ سب کچھ مل گیا۔ اب آخری سوال ہے کہ چکی پیسنے والے بھی دو۔ بادشاہ نے کہا ''دیکھو نقیب'' میں نے فقیر کے سب سوال پورے کیے ہیں یہ سوال بھی ضرور پورا کرو۔ ایک لونڈی اس کے حوالے کر دو۔ اب جٹ فقیر روانہ ہوتا ہے اور حاجی فقیر آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کس کی نگری ہے۔ اور کس کا دربار لگا ہے۔ نقیب کہتا ہے کہ سخی رنگیلے کا دربار ہے۔ حاجی فقیر کہتا ہے کہ بادشاہ سے کہو میں چھ حج کر چکا ہوں۔ ساتویں کی تیاری ہے۔ خدا کے نام پر ایک ہزار روپیہ دیا جائے۔ اس دوران خزانچی کہیں چلا جاتا ہے۔ لہٰذا بادشاہ فقیر سے وعدہ کرتا ہے کہ کل آ کر ایک ہزار روپیہ لے جائے۔ اب مست الست سائل فقیر آجاتا ہے۔ وہ آ کر پوچھتا ہے کہ کس کی نگری ہے۔ نقیب جواب دیتا ہے کہ سخی رنگیلے کی نگری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ مگر نقیب اسے یقین دلاتا ہے۔ فقیر کہتا ہے کہ اچھا بادشاہ سے کہو کہ آ کر میرا سلام کرے۔ بادشاہ کہتا ہے کہ میں دو قدم چلتا ہوں دو قدم اسے آگے آنے کو کہو۔ دونوں آمنے سامنے آتے ہیں تو فقیر کہتا ہے تم سخی بادشاہ ہو اور کسی کو خالی نہیں لوٹاتے۔ میرا یہ سوال ہے کہ مجھے تین دن کے لیے تاج شاہی عطا کرو۔ جب تخت پر بیٹھوں گا تو دعا کروں گا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں خدا کو راضی کرنے کے لیے یہ بھی کر گزروں گا مگر کچھ مہلت دو۔ میں اپنے بیوی بیٹے اور بیٹی سے مشورہ کر لوں۔ بیٹی اختر بانو کو دربار میں بلاتا ہے۔ مشورہ کرتا ہے۔ پھر اجمل شہزادے کو

بلاتا ہے آخر میں بیوی کو بلاتا ہے۔ تینوں اسے سائل کو خالی نہ لوٹانے کا مشورہ دیتے اور راضی بہ رضا رہنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ نتیجتاً بادشاہ فقیر کو تخت وتاج حوالے کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح یہ کہے ویسا کرنا۔ اب فقیر بادشاہ نقیب سے عجیب وغریب فرمائش کرتا ہے۔ جسے وہ چاروناچار پورا کرتا ہے۔ فقیر بادشاہ نقیب کے ذریعے اعلان کراتا ہے کہ اس بادشاہت میں جتنے فقیر ہیں وہ جو خیرات لے آئیں پندرہ آنے شاہی خزانے میں جمع کرائیں۔ ایک آنے پر خودگزارہ کریں نہیں تو میں خود مانگوں گا۔ سخی رنگیلا تین دن بعد لوٹتا ہے اور نقیب سے کہتا ہے کہ فقیر بادشاہ سے جا کر کہو کہ وعدے کے مطابق شاہی واپس کرے مگر وہ کہتا ہے کہ سخی رنگیلا کون ہے؟ اسے دھکے دے کر نکال دو۔ میں خود سخی رنگیلا ہوں۔ نقیب دھکے دیتا ہے تو اصل سخی رنگیلا شکوہ کرتا ہے۔ اس پر نقیب کہتا ہے کہ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ میں اس کا کہا مانوں۔ آخر کار سخی رنگیلا بیوی بچوں کے ہمراہ جنگل کا رخ کرتا ہے۔ بھوک سے بے تاب ہو کر چھوٹے بچے بھیک مانگنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اس دوران حاجی فقیر جا کر نقیب سے ملتا اور ہزار روپے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے صحیح صورتحال معلوم ہونے پر سخی رنگیلا کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور جنگل میں اسے ڈھونڈ نکالتا ہے اور پیسوں کے وعدے کا مطابق مطالبہ کرتا ہے کہ جیسے بھی ہو وعدہ پورا کرو اور ایمان بچاؤ۔ بادشاہ کہتا ہے کہ میرے پاس تو مال وزر تو نیں ہے۔ میرا بیٹا لے جاؤ اور اپنا پیسا پورا کر لو۔ فقیر کہتا ہے کہ یہ مجھے سرآنکھوں پر مگر اس کا ہزار ملے گا نہیں۔ لہٰذا کچھ اور بھی شامل کرو۔ سخی رنگیلا اپنی ملکہ کو بھی اس کے ہمراہ کر دیتا ہے۔ حاجی فقیر ان کو لے کر عادل سوداگر کی شاہی میں پہنچتا ہے جس کی بیوی یہودن ہے وہ اپنے خاوند سے کہتے ہے مجھے یہ مسلمان لڑکا اور نوکرانی لے دو۔ اس کا نقیب معلومات لے کر آتا ہے کہ حاجی فقیر غلام اور لونڈی ایک ہزار روپے میں بیچنا چاہتا ہے۔ عادل کہتا کہ انہیں لے آؤ دیکھ کر رقم ادا کی جائے گی۔ عادل جب ملکہ اور شہزادے کی شکل دیکھتا ہے تو شاہانہ صورت دیکھ کر ان سے علیحدگی میں حقیقت حال جاننا چاہتے تو ملکہ بھول کر کہتی ہے کہ ہماری رقم پانچ سو ہے۔ لہٰذا عادل حاجی فقیر کو کہلا بھیجتا ہے کہ پانچ سو لینے ہیں تو لے ورنہ دونوں کو چھین لیں گے اور تمہیں تہہ خانے میں ڈال دیں گے۔ حاجی فقیر کہتا ہے میرا کیا ہے؟ میں باقی کی رقم سخی رنگیلے سے پوری کروں گا۔ اور بیچ کر چلا جاتا ہے۔ ادھر ملکہ کو برتن صاف کرنے اور شہزادے کو جوتے صاف کرنے پر لگا دیا گیا۔ ادھر حاجی فقیر دوبارہ سخی رنگیلے کے پاس باقی پانچ سو کا مطالبہ لے کر جا پہنچا اور اسے دوبارہ وعدہ ایفا کرنے اور ایمان بچانے کو کہا۔ اس پر سخی رنگیلا اپنی بیٹی کو اس کے حوالے کرتا ہے تا کہ وہ اسے بیچ کر اپنی رقم پوری کر سکے۔ جب حاجی شہزادی کو لے کر فروخت کرنے کے لیے نکلتا ہے تو اسے ہنود قصاب ملتا ہے جس کی عمر سو برس سے زیادہ ہے۔ قصاب شہزادی کو بازو سے پکڑ کر دیکھتا ہے اور رقم پوچھتا ہے۔ فقیر پانچ سو بتاتا ہے۔ ہنود قصاب کہتا ہے کہ میں نے ایک ایک بوٹی فروخت کر کے پیسہ پیسہ اکٹھا کیا ہے۔ میرے پاس اڑھائی سو روپے ہیں لینے ہیں تو ٹھیک ورنہ چھرا مار کر پیٹ چاک کر دوں گا اور لڑکی بھی چھین لوں گا۔ اس پر حاجی کہتا ہے کہ مجھے پیٹ چاک نہیں کرانا، میں باقی کی رقم سخی رنگیلے سے پوری کروں گا۔ اب ہنود قصاب شہزادی کو شادی کے لیے کہتا ہے مگر وہ انکار کرتی ہے۔ اس دوران ایک شخص کا گزر ہوتا ہے۔ وہ قصاب کو اس کے اڑھائی سو دے کر شہزادی کو آزاد کراتا ہے۔ شہزادی جنگل کی طرف بھاگ جاتی

ہے۔ حاجی فقیر رنگیلے کے پاس پہنچتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب میں حاضر ہوں۔ حاجی فقیر کہتا ہے، سر آنکھوں پر۔ اب وہ قبرستان میں آواز لگاتا ہوا آتا ہے۔ قبرستان کا مالک آواز سن کر اڑھائی سو روپے میں غلام خرید لیتا ہے اور اسے کام سمجھاتا ہے کہ کسی بھی میت کو پانچ روپے لیے بغیر دفن نہیں کرنا۔ عادل بادشاہ کی یہودی بیوی ملکہ کو برتن نہ دھو سکنے پر سزا دیتی ہے اور شہزادے پر نولکھا ہار چوری کرنے کا الزام لگاتی ہے اور جلاد کو حکم دیتی ہے کہ اسے مار کر آنکھیں نکال کر میرے سامنے پیش کرو۔ اتنے میں یہودن کا بیٹا آ کر کہتا ہے کہ ہار اس کے پاس ہے۔ اب شہزادے کو ایک اور لڑکے کے ہمراہ جنگل میں لکڑیاں چننے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ یہ دونوں اسی قبرستان میں آتے ہیں۔ لکڑیاں چن کر تھک چکے ہوتے ہیں اس لیے شہزادہ اپنے ساتھی لڑکے سے کہتا ہے کہ ذرا درخت تلے آرام کر لوں۔ جاگوں تو لوٹ چلیں گے۔ دوسرا لڑکا سوچتا ہے چلو میں بھی سو جاؤں۔ ایسے میں سانس چوسنے والا سانپ درخت سے اترتا ہے اور اجمل شہزادے کا سانس چوس لیتا ہے۔ دوسرا لڑکا جاگتا ہے۔ اجمل شہزادہ جگانے پر نہیں جاگتا تو وہ واپس جا کر اس کی ماں کو اطلاع دیتا ہے۔ ملکہ دوڑ کر قبرستان میں بیٹے کی لاش پر پہنچتی ہے۔ وہ بیٹے کی لاش قبرستان دفنانے کے لیے لاتی ہے۔ شام کا وقت ہے سخی رنگیلا اور ملکہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں پاتے۔ سخی رنگیلا کفن دفن کے لیے پانچ روپے طلب کرتا ہے ملکہ معذوری ظاہر کرتی ہے تو وہ اسے بھیک مانگ کر پانچ روپے پورے کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ ملکہ پیسہ پیسہ مانگ کر پانچ روپے لے کر آ جاتی ہے اور سخی رنگیلا اسے کوٹھڑی میں بیٹھنے کا کہتا ہے اور خود قبر تیار کرنے نکلتا ہے۔ ایسے میں شہزادی ہانپتی کانپتی آتی ہے اور گر جاتی ہے۔ پیاس کا اظہار کرتی ہے۔ بادشاہ اسے کہتا ہے کہ تم لاش کا منہ نہ دیکھنا میں تمہارے لیے پانی لے آؤں۔ شہزادی کو پیچھے سے خیال آتا ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے سے میت کا منہ دیکھنا چاہیے۔ کپڑا اٹھا کر دیکھتی ہے تو بھائی کو پہچان لیتی ہے۔ سخی رنگیلا اسے دوسرے کمرے میں بیٹھنے کو کہتا ہے کہ میں قبر تیار کر لوں تو اس کی ماں اور تم کو بلاتا ہوں۔ اتنے میں جوگی اور جوگن آتے ہیں۔ جوگن لڑکے کو دیکھ کر کہتی ہے کہ اس لڑکے کو سانس چوسنے والے سانپ نے ڈسا ہے۔ تو بین بجاؤ جب تک سانپ آ کر سانس نہ ڈالے گا میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گی۔ جوگی کہتا ہے کہ نہ جانے سانپ کہاں کا ہے اور لڑکے کو کہاں ڈسا ہے۔ میں ایسے خواہ مخواہ بین بجاتا رہوں مگر جوگن کہتی ہے کہ تم کوشش کرو، کامیابی ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جوگی بسم اللہ بڑھ کر بین بجاتا ہے۔ ناگ آ کر شہزادے میں سانس ڈالتا ہے۔ شہزادہ اٹھ کر جوگی سے جھگڑتا ہے کہ یہاں میری لکڑیاں پڑی تھیں کہاں گئیں؟ شور سن کر سخی رنگیلا ملکہ اور شہزادی بھی آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں لاش پڑی تھی۔ جوگی بتاتا ہے کہ یہ زندہ ہو کر تمہارے سامنے موجود ہے۔ ماں بیٹے سے چمٹ کر اجمل اجمل کہتی ہے تو سخی رنگیلا پہچان لیتا ہے اور بیوی اور بیٹے سے ملتا ہے۔ بیٹی پیچھے کھڑی ہوتی ہے وہ بھی باپ سے گلے لگ کر ملتی ہے۔ یہ قصہ منشی غلام رسول حسرت ملتانی نے بھی نثر و نظم میں ڈرامائی شکل میں "سخی رنگ رنگیلا" کے نام سے لکھا۔ 32 صفحات کا یہ ناٹک گزشتہ صدی کے دوران کم از کم نصف درجن اشاعتیں دیکھ چکا ہے۔

(ملتانی (ملتان کی تاریخ، تہذیب و ثقافت) - سجاد حیدر پرویز)

ملک منیر احمد بھٹہ

ملتانی زبان میٹھی اور جادو بھری

اللہ تعالیٰ نے ارض و سما پیدا کیے پھر انسان کو پیدا کیا پھر اس انسان کو ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے لیے زبان بھی دی۔ الہامی کتابیں بھی نازل ہوئی۔ انجیل عبرانی زبان میں نازل ہوئی۔ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا۔ لسانی تحقیقات اپنی جگہ سوچنے اور سمجھنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر دیا تو پھر انسان کو بات چیت کے لیے زبان بھی اسی نے دی۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد جس طرح روئے زمین پر پھیلتی گئی اپنے اپنے علاقوں میں زبان بھی بدلتی گئی۔ میں زبانوں پر بحث کیے بغیر اپنی ملتانی زبان کی بات کرتا ہوں۔ جسے آج کل سرائیکی زبان کہا جاتا ہے یہ زبان کیسے آئی اس کی ترقی کیسے ہوئے یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ ایک بات واضح ہے کہ یہ زبان کی جنوبی پنجاب میں سندھ کے چند علاقوں میں اور بلوچستان کے علاقہ ناڑی میں بولی جاتی تھی اور بولی جاتی ہے۔ ہندوستان کے چند علاقوں میں بھی یہ زبان بولی جاتی ہے اور اب بھی بولی جاتی ہے یہ زبان بڑی فصیح و بلیغ ہے اس زبان کے بولنے والے ہر زبان با آسانی بول لیتے ہیں اور اسی زبان کا لہجہ با آسانی اختیار کر لیتے ہیں کہ کسی دوسرے کو یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ بولنے والا ملتانی ہے یا اہل زبان ہے جو زبان وہ بولتا ہے یہ خوبی اور صفت کسی دوسری زبان بولنے والے میں ہرگز ہرگز نہیں مثلاً پٹھان اپنی پشتو یا بلوچی کے علاوہ جب اردو، انگریزی یا کوئی دوسری زبان بولتا ہے تو اس کا لہجہ پٹھانوں والا ہی رہتا ہے بدلتا نہیں ہے دیگر زبان بولنے والوں کا بھی لہجہ اسی طرح رہتا ہے بدلتا نہیں ہے۔ راولپنڈی، میانوالی اور جہلم میں بولی جانے والی زبان ہندکو کہلاتی ہے لوگ اسے جہلمی زبان بھی کہتے ہیں اس زبان میں بھی ملتانی زبان کے بے شمار الفاظ شامل ہیں لہٰذا ملتانی زبان جہاں قدیمی زبان ہے وہاں یہ بڑی عظیم زبان بھی ہے اور بہت وسیع علاقے میں بولی جانے والی ہے۔

ملتان ماضی بعید میں مختلف ادوار میں آبادیوں کا مرکز اور دارالحکومت رہا۔ جس سے ایک عظیم تہذیب پیدا ہوئی دوسرے علاقوں سے آنے والے لوگ جب ملتان میں آئے تو وہ یہاں کے مقامی باشندوں سے گھل مل گئے۔ ان کے گھل مل جانے سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی۔ یہ تہذیب سندھ، پنجاب اور اس سے دور دراز علاقوں تک پھیل گئی مگر اس کا مرکز ملتان تھا ان لوگوں کا اسلوب زندگی اور رسم و رواج یکساں تھے ان کی بولی کا انداز مختلف تھا۔ جس

میں (س) اور (م) کی آواز شامل تھی یہ الفاظ اشیاء کے ناموں کے ساتھ ملا کر بولے جاتے تھے اور یہ بات دوسری زبانوں میں نہیں ملتی تھی پھر ایسا انقلاب آیا یہ تہذیب اس میں بہہ گئی۔ شہر برباد ہو گئے۔ بہت سے لوگ مارے گئے، نکل گئے اور نکال دیئے گئے۔ جب آرین یہاں آئے اور آباد ہوئے انکی اپنی زبان تھی مگر ملتانی زبان میں کوئی تبدیلی نہ آئی یہ اپنی اصل حالت میں قائم رہی۔ سنسکرت زبان نے بھی ملتانی زبان پر اپنا اثر ڈالا مگر یہ اثر انجام کار بے اثر رہا۔

ملتانی زبان ملتان کے علاوہ ریاست بہاولپور، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، بلوچستان اور شمالی پنجاب کے علاقوں میں تھوڑے سے ردو بدل کے ساتھ بولی جاتی تھی آج بھی بولی جاتی ہے اور یہ زبان بحیرہ عرب کے ساحل سے لے کر راجپوتانہ کے ریگستان کے کناروں تک بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ یہ زبان آج بھی موجودہ پاکستان کی سب سے بڑی استحصال ہونے والی زبان ہے یہ زبان بڑی بلیغ اور فصیح ہے۔ اس زبان کو اپنے اپنے علاقوں کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً میانوالی والی، بہاولپوری، اوچی، لہندا، ہندکو وغیرہ چونکہ ملک میں نسلی اور علاقائی تعصب پیدا کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس تعصب کو ختم کرنے کے لیے ملتانی زبان کو سرائیکی زبان کا نام دے دیا گیا ہے۔ سرائیکی کے معنی سرداروں کی زبان ہے یہ زبان وادی سندھ کے صدر مقام کی زبان تھی۔ اس بنا پر اس زبان کو سندھ کے باج گزار علاقوں میں سرائیکی کہا جاتا تھا۔ اس زبان کا تانا بانا ملتانی، دراوڑی، آریائی، سنسکرت، بدھ، پراکرت، زرتشی، پہلوی، اسلامی عربی، اسلامی پارسی، نصرانی، انگریزی زبانوں سے ملکر بنا ہے۔

ملتان میں آرین گروہ شمالی مغربی پہاڑوں سے آتے رہے ان کی زبان پشاچی تھی اس زبان کی ایک قسم درچڈہ بولی تھی اس بولی نے ملتانی زبان کو بہت سا ذخیرہ الفاظ مل گیا اس کے بعد آنے والی قوموں کی بولیاں بھی ملتانی زبان میں ملتی رہیں۔ مثلاً سیرانی قوم کی زبان سیرین میں لفظ سنگو کے معنی محترم دوست ہے۔ اسے ملتانی زبان میں سنگی یا سنگتی کہتے ہیں یہ لفظ آج بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسطرح نا ہار (صبح کا ناشتہ) ہے ملتانی زبان میں اسے نراہنہ (ناشتہ) کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ماضی میں سندھ ملتان کا حصہ تھا۔ 111ھ میں تمیم بن زید والی سندھ و ملتان کے انتقال پر سندھ ملتان سے الگ ہو گیا۔ اس علیحدگی سے سندھی اور ملتانی زبان کا تعلق بھی منقطع ہو گیا اس کے بعد دونوں زبانوں کی ترقی بھی الگ الگ ہوئی۔ سندھی زبان دان اس بات کو مانتے ہیں کہ موجودہ سندھی زبان کا آغاز تقریباً ایک ہزار سال قبل سامنون کے زمانہ میں ہوا یہ زمانہ غالباً علیحدگی کے زمانہ کے قریب ہے۔ سندھی زبان کی ادبی صورت تقریباً 1500ء میں صوفیہ کرام کی کوششوں سے پیدا ہوئی۔

سندھ سے الگ ہو جانے کے بعد ملتان کی دو زبانیں تھیں ایک عام سنسکرت زدہ مخلوط زبانوں کا مجموعہ جسے ملتانی کہا جاتا تھا۔ دوسری عربی۔ یہ حالت عربی حکومت کے دو سو سال تک قائم رہی۔ عربی سیاح جب ملتان میں آئے تو انہوں نے ملتان میں عربی اور ملتانی زبانوں کو مستعمل پایا۔ بشاری مقدسی 375ھ (985ء) نے فارسی زبان کو عربی

اور ملتانی زبانوں کے ساتھ مستعمل پایا۔

یہ شاید دیلمی اور خراسانی زبانوں کی وجہ سے تھی یا شاید اسماعیلی اثر کی وجہ تھی یہ بات مسلمہ ہے کہ فارسی زبان کو زیادہ فروغ سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے بعد ملا۔ ملتانی زبان میں عربی اور فارسی کے استعمال سے روزمرہ کی بول چال میں بھی بہت سے الفاظوں کو مستعمل بنا دیا اس طرح تقریباً ساٹھ یا ستر فی صد الفاظ ملتانی زبان میں عربی اور فارسی زبان سے لیے گئے اور آج یہ ملتانی زبان میں شمار ہوتے ہیں۔ (یعنی سرائیکی زبان)

اردو لفظ	ملتانی لفظ	عربی ماخذ	مطلب
لوٹا	کروہ	کروہ	گول
بکری کے شانہ کا گوشت	کتیف	کتف	شانہ
پیاز	وصل	بصل	پیاز
لسن	تھوم	فوم	لسن
قمیض	قمیض	قمیض	قمیض

اردو لفظ	ملتانی لفظ	فارسی ماخذ	مطلب
وضو کیلئے مٹی کا لوٹا	استاوہ	افتابہ	لمبی گردن والا لوٹا
مٹی کا برتن	ڈول	دول	مٹی کا برتن
بالائی	ملائی	بالائی	اوپر والی شے
مسالہ کوٹنے والا برتن اور ڈنڈا	ہمام دستہ	ہاون دستہ	مسالہ یا دوائی کوٹنے کا لوہے کا برتن اور دستہ
عورت (بیوی)	زال	زال	عورت (بیوی)
معماروں کا لپائی کا اوزار	گرمالہ	گل مالہ	مٹی کی لپائی کا اوزار

ملتانی زبان پر مختلف زبانوں کے اختلاط کا بڑا اثر ہے۔ یہ زبان بڑی میٹھی اور بلیغ ہے۔ اس کے بعض الفاظوں میں محبت کے اظہار کے ساتھ قربانی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

مثلاً ہائے ڑی میں صدقے تھیواں۔۔ میڈی جند

ہائے ڑی میں مر ونجاں

نفرت کے لیے بھی ایسے نفرت انگیز الفاظ ہیں

ہٹ اوئے پرے مر

ہٹ اوئے پرے دفع تھی

ہٹ اوئے پرے گل

ونج اوئے شالا چٹ تھیویں

عورتوں کے استعمال والے الفاظ

ہٹ ڑی موئی پرے ونج مریا پرے ونج گل

ہٹ ڑی کستی رن۔ہٹ ڑی کنجری رن

ہٹ وے کنجر مویا

ہٹ ڑی چوھڑی رن

اسی طرح ہمدردی کے لیے بھی کئی الفاظ ہیں۔جن میں سچائی ہوتی ہے۔اور دعا بھی ہوتی ہے۔مثلاً

ونج وے شالا سدا رہنویں

شالا تتی واہ نہ لگی

شالا سکھی وسو۔عمراں مانڑیں۔شالا وسدے رہو

ہائے ڑی مرن اوندے دشمن

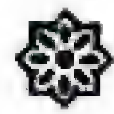
شالا دشمناں دے منہ وچ مٹی پووے

ملتانی زبان کے اروف بیالیس ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے

حرف	آواز	
ا	الف	
ب	بے	
ب	بے	(بال یعنی بچہ)
ت	تے	
ٹ	ٹے	
ث	سے	
ج	جیم	ج۔جیم
چ	چے	
ح	حے	
خ	خے	
د	دال	
ڈ	ڈال	
ڈ	ڈال	(ڈوئی)

ذ	ذال	
ڑ	اڑے	
ز	زے	
ژ	اژے	
س	سین	
ش	شین	
ص	صوآد	
ض	ضوآد	
ط	طوئے	
ظ	ظوئے	(زوئے)
ع	عین	
غ	غین	
ف	فے	
ق	کاف	
ک	کاف	
گ	گاف	
ڱ	گاف	
ل	لام	
م	میم	
ن	نون	
ݨ	انڑ	(نڑ)
و	وا	
ہ	ھے	(حے)
ء	ہمزہ	
ی۔ے	یہ چھوٹی اور بڑی	

(ملتان تہذیب وثقافت کے آئینے میں - ملک منیر احمد بھٹہ)



سیّد زاہد علی واسطی

فن خطاطی اور ملتان

ملتان کے علاقوں میں تو اسلام کا اثر و نفوذ پہلی صدی ہجری میں ہی شروع ہو چکا تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ علاقہ آج سے کچھ اوپر تیرہ سو سال قبل مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے عربوں نے آ کر جب ملتان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ملتان دیو مالائی مہیب کالی مائی کے سائے میں پروان چڑھ رہا تھا۔ یہاں بڑے بڑے مندر تھے جن پر اونچے اونچے کلس تھے، جہاں سر منڈے پروہت، نیم عریاں داسیاں اور قہرمان تاجداروں کے سجدہ ریز مجبور د مسحور پجاری تھے، آپ کو کیا بتائیں۔ علم تحریر و تقریر تو بڑی بات ہے قلم و کتاب کا نام لینا بھی گناہ تھا۔ یہ حقوق تو صرف اونچی ذات کے پنڈتوں کے لیے ہی محفوظ تھے۔ اگر ان کے علاوہ کوئی اور قلم اور کتاب کا نام بھی لیتا تو ہندو دھرم بھرشٹ ہو جاتا تھا۔ الغرض علامہ اقبال کے تصور میں حال کچھ ایسا تھا

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر

ادھر یہ صورت تھی۔ ادھر پہلے پہلے جب جبرائیل علیہ السلام غار حرا میں آ گئے تو حضور سرور کائنات ﷺ کو سورۃ ''العلق'' کی پہلی پانچ آیتیں سنائیں اور عرض کیا پڑھیئے آپ گھبرا گئے۔ آپ کو پڑھنا نہ آتا تھا۔ عرض ہوا فکر مت کریئے۔ سب علم اللہ ہی سکھاتا ہے دوسری صورت ''القلم'' تھی جو آسمان سے اتری، جس میں تینوں چیزوں کی قسم کھائی گئی یعنی ن۔ قلم اور لکھنے کی۔ میں تو محدثین اور مفسرین نے بتایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے رسول اللہ ﷺ سے کہ پہلی چیز جو حق تعالیٰ نے پیدا کی وہ قلم تھا، پھر ''نون'' پیدا کیا اور وہ دوات ہے۔ اور قلم نے اس دوات سے لکھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری تربیت کی ابتداء ہی پڑھنے اور لکھنے سے ہوئی اور قلم کو یہ شرف اور اعزاز حاصل ہے کہ خود پروردگارِ عالم نے قلم کو اشاعت علم کا ذریعہ، وسیلہ اور واسطہ قرار دے دیا۔

تاریخ کے ابتدائی ادوار میں تحریر کی مختلف شکلیں تھیں پھر انسان کا جمالیاتی ذوق اس فن تحریر میں محاسن پیدا کرتا رہا۔ محدثین اور مورخین کا خیال تو یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام کو خوش نویس اور خطاطی کا ہنر

عطا کیا گیا تھا۔ یہ وقت ہماری عمر کی بساط سے تو باہر ہی تھا۔ مگر ماہرین فن کہتے ہیں تو درست ہی ہو گا۔ مگر حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق جس نے اولاً عربی تحریر لکھی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ انہی کے قبیلے نبطی کی نسبت سے وہ تحریر خط نبطی کہلانے لگی اور مدتوں تک یہی خط نبطی نجد و حجاز کے علاقوں میں رائج رہا۔ جب اہل حیرہ کچھ بیدار ہوئے اور لکھنے پڑھنے کا شوق چلا ہو گا تو انہوں نے خط نبطی میں اصلاحات کر ڈالیں اور اصلاحات شدہ خط، خطِ حمیری کہلانے لگا۔ حضور کریم ﷺ کے زمانے میں یہی رسم الخط رائج تھا۔ اور آپ ؐ کے مکتوبات خطِ حیری میں تحریر کئے جاتے تھے۔ اس خط کو نجد و حجاز سے کوفہ لا گیا گیا۔ جب اس خط کی نوک پلک ٹھیک ٹھاک کی گئی تو آراستہ شدہ خط کو خطِ کوفی کہا جانے لگا۔ خط کوفی نے مدتوں نہیں بلکہ صدیوں تک ملک و ملت کی خدمت کی لاکھوں کتابیں، رسالے، اسناد، دستاویزی، شجرے، احکامات فرامین خطِ کوفی میں رقم کئے گئے۔

خلافتِ صدیقیؓ میں حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن پاک چمڑے کے ٹکڑوں پر خط حیری میں تحریر فرمایا تھا۔ عہد عثمانیؓ میں جس قدر قرآن پاک لکھے گئے، سب کے سب خط حیری میں تھے عہد بنو امیہ کے دور میں خط کوفی میں اصلاحات ہوئیں اور مابعد خط نسخ نے جگہ لے لی۔ عہد عباسیہ میں ضحاک بن عجلان قرآن پاک کے مشہور خطاط گزرے ہیں جنہوں نے بہت سے قرآن پاک رقم کئے۔ اسحاق بن عماد نے اسی دور میں خط ضحاک میں ترمیم کی جس کی جگہ مشہور خطاط ابنِ مقلہ نے لی جو تاریخ خطاطی میں مقتدر جانے جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں مولانا جامیؒ فرماتے ہیں:

ابنِ مقلہ وضع کرد ایں شش خط از خطِ عرب
ثلث دریحاں و محقق نسخ و توقیع درِ عاع

کہا جاتا ہے کہ دنیائے اسلام میں اور خاص طور پر ملتان کی سرزمین میں فنِ خطاطی کا جو بھی فیضان ہے وہ ابن مقلہ کا مرہونِ منت ہے۔ ابن مقلہ کے بعد ابنِ البدیع، ابن التواب، یعقوب مستعصمی، مرمر بن مرہ اور ایسے بے شمار نام ہیں جنہوں نے اس فنِ خطاطی میں کمال حاصل کئے۔ سرزمین ملتان جسے اہل تصوف نے مدینۃ الاولیا اور قبلۃ الاسلام قرار دینے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ یہاں محمد بن قاسم کی آمد کے بعد ہی عربی خط کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ مختلف امصار سے بزرگان دین، علماء و فضلاء نے مختلف ادوار میں ملتان کا رخ کیا۔ ان میں سے سب ہی فن خطاطی میں طاق تھے۔ حضرت شاہ یوسف گردیزؒ اور حضرت بہاء الدین زکریاؒ جیسے اصفیا کے قدوم میمنت الزدم نے ملتان کو رونق بخشی تو علمائے کرام نے حضرت منہاج الدین ملتانی التوفی 797ھ حضرت کمال الدین بلخی ثم ملتانی التوفی 629ھ حضرت مولانا جلال الدین بلخی ثم ملتانی التوفی 710ھ، قاضی قطب الدین کاشانی ثم ملتانی التوفی 743ھ شاہ حسین قادری ملتانی التوفی 902ھ، ملا سعید الدین التوفی 907ھ شیخ شہاب الدین ثم ملتانی 794ھ ملا حجت اللہ ملتانی التوفی 719ھ رحم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین معروف خوشنولیس و خطاط تھے۔ مذکورہ مقتدرہ شخصیتوں نے جس قدر روحانیت کے علاوہ علم و ادب کو فروغ دیا اسی قدر فن خوش خطی میں اپنی یادیں چھوڑ دیں۔ ان حضرات کے

تحریر کردہ کتبے، طغرہ اب بھی بعض کتب خانوں میں موجود ہیں جو محو حیرت کر دیتے ہیں۔

برصغیر پاکستان و ہند میں مسلمانوں کی آمدت اور کتابت کی تاریخ یکساں پرانی ہے لیکن دیگر علوم کی طرح فن خطاطی کی تابندگی اور رعنائی مغلیہ عہد میں پیدا ہوئی۔ مغل بادشاہوں اور شہزادوں نے اس عروس الفنون کی زلفیں سنواریں۔ کاکل و گیسو دراز کئے، ان کی شہرہ آفاق قدر دانی، فن خطاطی درحقیقت اہلِ فن کو کشاں کشاں دہلی، لاہور اور ملتان لے آئی۔ قرآن کا ہی وہ اعجاز تھا جس نے کوفی رسم الخط سے جدید نسخ اور نستعلیق خط کا ایک طویل سفر طے کرایا اور پھر قرآنی تحریر میں ایسے ایسے اسلوب پیدا کئے۔ جنہیں قمری رسم الخط، گلزاری رسم الخط اور خود کوفی رسم الخط کے بے شمار اقسام کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس تنوع تحریر کو دیکھ کر سچ مچ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

بابر بادشاہ خود ایک لاجواب خطاط تھا اس نے خط نسخ سے خطِ بابری کا اختراع کیا۔ تیموریوں کی عام رسم تھی کہ وہ خود قرآن پاک ہاتھ سے لکھ کر مدینہ منورہ بھیجتے تھے۔ بابر کا سلسلہ تلمذ جا کر میر علی قبریزی سے ملتا ہے۔ جہانگیری دور میں ایک مشہور خطاط حضرت عبدالعزیز ملتانی قریشی گزرے ہیں جنہوں نے کمال خطاطی سے جہانگیر کو مسحور کیا تھا۔ میر ملا قیوم قندھاری ثم ملتانی نے اپنی آخری عمر ملتان میں ہی بسر کی اور فن خطاطی میں گم ہو گئے۔ شاہ جہاں کے عہد میں ملا عبدالحق شیرازی کے تلامذہ میں سلطان محمود قریشی ملتانی کے تحریر کردہ بعض خطوط جب بادشاہ شاہ جہان کی نظر سے گزرے تو اس نے ملتان سے ان کو بلا کر دربار کی زینت بنا دیا مگر اس اللہ کے بندے کو ملتان کی یاد نے بڑپا دیا۔ آپ پھر واپس ملتان آ گئے اور ملتانیوں کو اپنے فن کے رموز سے آشکار کرتے کرتے عمر گزار دی۔ نعمان بن سعید انصاری ہراتی ثم ملتانی کے تحریر کردہ کاشی پر طغرے بخط کوفی آج بھی بعض قدیم ملتان کی مساجد پر موجود ہیں۔ اکبری دور کے ملا قدیم بن حسن ملتانی، بادشاہ اکبر کے کاتب خاص تھے۔ آپ نے جب یہ رباعی خط کوفی میں لکھ کر بادشاہ کے سامنے رکھی تو ابن مبارک اور ابوالفضل فیضی جیسے حضرات نے دانتوں میں انگلیاں دبا لیں۔

ایا خجستہ خصالے کہ ساکنانِ فلک
برآستانِ تو دارند سیل و ربانی
چہ صاحبت است کہ گویم حال خستہ خود
کہ حال خستہ دلاں را تو خوب مے دانی

اس ہی دور میں میر عبداللہ ملتانی نے اپنی خوشنویسی کے ڈنکے ملتان سے دہلی تک بجوا دیئے۔ شیخ سعدی شیرازیؒ المتوفی 691ھ خود ایک اعلیٰ درجہ کے خوشخط خطاط تھے۔ آپ کو ملتان سے بہت انس تھا اور سنا جاتا ہے کہ آپ ملتان بھی تشریف لائے تھے آپ کی تحریر کردہ گلستان اب بھی ملتان کے کسی ذاتی کتب خانے کی زینت ہے۔

ملتان میں تیرہویں صدی ہجری میں بڑے بڑے خطاط پیدا ہوئے۔ نواب مظفر خان شہید کے دور گورنری میں فنِ خطاطی کو ملتان میں بہت تقویت پہنچی۔ حضرت حافظ جمالؒ چشتی ملتانی المتوفی 1236ھ حضرت خواجہ خدا بخش چشتی ملتانی المتوفی 1251ھ حضرت منشی غلام حسن شہید ملتانی المتوفی 1265ھ حضرت پیر دلیر قادری ملتانی جیسے جید

بزرگوں نے فنِ خطاطی کو نہ صرف عام کیا بلکہ عامتہ الناس میں اس کی حق الوسیع اشاعت وترویج کی۔ بذاتِ خود نواب مظفر خان شہید ایک نفیس خطاط تھے اور فن خطاطی میں تمام اسرار ورموز سے واقف تھے۔

حضرت سید عبدالنبی ملتانی شہید کا نام صرف جنگ آزادی کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اعلیٰ ذوق کی خطاطی میں مشہور تھا۔ مخدوم عبدالہادی مولانا قاضی نور مصطفےٰ قریشی شہید ملتانی علی مردان قادری ملتانی المتوفی 1288ھ، حضرت قاضی عبیداللہ چشتی ملتانی المتوفی 1301ھ خواجہ خدا بخش ملتانی سید جلال الدین ملتانی المتوفی 1275ھ جیسے نفوس قدسیہ نے اپنے مریدین وحلقہ احباب میں فن خطاطی کو جو پذیرائی بخشی وہ اپنی عدیم المثال مقام رکھتی ہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آ جانے کے بعد ملتان میں فن خطاطی کو از سرنو عروج حاصل ہوا۔ اس میں حضرت محمد حسن خان کلیم رقم کا نام تو نا قابلِ فراموش ہے۔ جنہوں نے ملتان میں خوشخطی وفن خطاطی کی شمع روشن رکھی۔

بعض خاندانوں میں اس فن کی روایت بطور میراث محفوظ رہی جس میں ملتان کے مولوی حسین بخش ملتانی کا خاندان معروف ہے جن سے بیشتر حضرات زبردست نقار اور خطاط تھے۔ ان لوگوں نے خط نستعلیق سے اجتہاد کیا اور بہت سارے اسلوب اپنائے۔ ان میں حضرت کلیم رقم خطاطی کی آئمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے برخوردار ابن کلیم آج کل ملتان میں فن خطاطی کے ماہر اور سرفہرست خطاط مانے جاتے ہیں۔ ابن کلیم کی خطاطی میں تنوع ملتان ہے انہوں نے خط بابری کے قواعد وضوابط کی نوک پلک درست کر کے خط رعنا ایجاد کیا۔ یہی انفرادیت ان کو جدید دور کی خطاطی میں کہاں سے کہاں لے گئی جس میں ان کو شاہ خالد گولڈ میڈل ایوارڈ مل گیا۔

استاد سلیم چشتی ملتان میں استاد غلام جیلانی کے شاگرد ہیں۔ ان اساتذہ کرام میں سے ہیں۔ جنہوں نے برصغیر کے اعلیٰ صفات ماہر خطاطوں سے استفادہ حاصل کیا۔ ان کے علاوہ اب منظور احمد، صالح محمد عبدالشکور، فدا حسین، نذر محمد اور منشی طفیل احمد قادری کے علاوہ بیسیوں بے نظیر خطاط ملتان میں اپنے فن کا جادو جگاتے رہے اور انہیں کے دم سے خطاطی کی روایت ملتان میں زندہ ہے۔ گویا سرزمین ملتان کو یہ فخر حاصل ہے کہ فن خطاطی کے اعلیٰ اقدار کی پاسبانی یہاں ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ اسلاف کی تحریروں میں اصلاحات، قدامت میں جدت کے اسلوب کی آمیزش کے ساتھ ساتھ روایات کہنہ کی پاسداری بہ تکریم فن انجام دی جاتی رہی۔ جس میں خط رعنا کی ایجاد، ملتان کے لیے اعزاز سے کم نہیں اور فن برائے فن کے حوالے سے زندہ جاوید مثال ہے۔

ملتان کی قدیم عمارات کے در و دیوار اور سقف ومحراب پر کتبوں کی صورت میں خطاطی کے جو نمونے موجود ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملتان میں خطاطی کی روایت کتنی قدیم ہے اور شاندار ہے۔ ملتان کے نقاشوں، کاشی کاروں اور کنگروں نے بھی خطاطی کی اعلیٰ روایت کو محفوظ رکھنے میں جان لڑا دی کیونکہ خطاطی میں ان فنون کا بھی ایک لازمی حصہ تھا اور اب بھی ہے۔

حضرت بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں جب عربی دروازے سے داخل ہوتے ہیں تو سامنے ایک برآمدہ نظر آتا ہے جس میں سات محرابیں ہیں۔ ہر محرابی پر ملتانی روایتی کاشی کاری اور نقاشی وخطاطی کے خوبصورت نمونے

چنائی میں چھوڑی ہوئی جگہ میں جڑے ہوئے ہیں جو کہ کاشی کاری کی نیلی پکی ہوئی کئی اینٹوں کو جوڑ کر بنائے گئے ہیں۔ درمیانی محراب کے اوپر نو عدد کاشی کاری کی نیلی اینٹوں کو جوڑ کر نادر الوجود کتبہ لگا ہوا ہے۔ یہ کتبہ گل کاری سے مزین ہے۔ اس کتبہ کے اوپر ''اِنَّ اکرَمکُم عِندَ اللهِ آتقکُم'' خط نسخ میں تحریر ہے اور اسی خط میں ''وَالآخِرۃ لِمَنِ اتَّقیٰ'' لکھا ہوا ہے۔ درمیان میں خوبصورت طغریٰ میں سورۃ اخلاص گول دائرے میں جس کے اطراف میں دو ترنج ہیں۔ جن میں اسمائے باری تعالیٰ تحریر ہیں ان کے علاوہ فارسی اشاعر خط نستعلیق میں فن خطاطی و مہارت کی داد طلب کرتے ہیں۔

حضرت شاہ رکن عالمؒ کے مزار مبارک میں تو ایک چوبی محراب، غربی جانب اپنی مثال آپ ہے۔ فن خطاطی سے حظ رکھنے والوں کے لیے یہ سوغات ہے۔ چوبی کندہ کاری کا لازوال نمونہ شاید و باید کسی دوسری جگہ پاکستان میں دستیاب ہو سکے۔ اس محراب کی پیشانی پر افقی و عمودی پٹیاں ہیں جن پر نہایت باریک اور نفیس کندہ کاری سے گل کاری کو مزین کیا گیا ہے جس کے گرداگرد تین اطراف ایک چوڑی پڑی ہے۔ اس پٹی پر دائیں طرف سے قرآنی آیۃ الکرسی نہایت نفاست سے خط ثلث و کوفی امتزاج سے کندہ کاری میں ابھاری گئی ہے۔ یہ سب آرائشی نقوش میں خطاطی کی دیدہ زیب پیش کش ہے۔ اس پٹی کے اطراف مکرر، ہر سہ اطراف پر ایک چوڑی پڑی ہے جس پر کندہ کاری سے اس آرائشی حسین و جمیل کام کو دوام بخشا گیا ہے۔ یہ سب کام ساتویں صدی ہجری میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور آج تک اپنی قدامت کے باوجود فن خطاطی و چوبی کندہ کاری کا لازوال شاہکار ہے۔

ملتان کی قدیم و جدید مساجد کے در و دیوار محراب و منبر پر فن خطاطی کے ایسے نادر نمونے پائے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر انسان عش عش کر اٹھتا ہے۔ نواب علی محمد خان ابدالی دور میں ملتان کے گورنر تھے چوک بازار میں ان کے نام سے مسجد موسوم ہے اس کی دیواروں پر خط نستعلیق میں فارسی کے اشعار تحریر ہیں۔ منبر کے اوپر دروازے پر خط نسخ میں ''لَمَسجِد اسِسَ عَلَی التَقویٰ ...... المُطُّھرِینَ ''(سورۃ التوبہ 108) نہایت دلکشی و رعنائی سے تعمیر مسجد قبا کی یاد دلاتی ہے۔

اٹھارویں صدی کے شروع میں مغل حکومت کی طرف سے عبدالصمد خان ملتان کے گورنر لگے تو انہوں نے ملتان کی عید گاہ تعمیر کرائی تھی جو آج تک ان کی یاد دلاتی ہے۔ عید گاہ بیرونی دروازے کے باہر اب حضرت کاظمیؒ کا مقبرہ زیر تعمیر ہے۔ تو صاحب عید گاہ کے صحن کے منبر کے اوپر والے دروازے پر نہایت حسین خطِ نستعلیق میں اس مسجد کے تعمیر کنندہ کا یادگار کتبہ اب بھی اس طرح ہے ''بتوفیقات سبحانی و تائید ربانی ...... چھل ہجری تمام رسید۔'' جس کے اطراف اور افقی جوانب میں خط نسخ میں اسمائے باری تعالیٰ تحریر ہیں جو حسن اور دلکشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

اسی دور کی ایک اور مسجد شہر ملتان میں گڑ منڈی اور چوڑی سرائے والے چوک میں بادشاہ فرخ سیر کے دور میں تعمیر کرائی گئی تھی جسے پھول ہٹ کہتے ہیں۔ اس مجد میں ایزدی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ فی الوقت اندر سے مسجد سجاوٹ و آرائش کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ ہے۔ صحن میں دروازے کے اوپر ڈیڑھ فٹ سنگ مرمر کی عمودی و افقی تختیاں

اس طرح نصب ہیں کہ ہر سہ اطراف سے دروازے کو مدد کئے ہوئے ہیں جن پر انتہائی جلی خط نسخ میں آیۃ الکرسی تحریر ہے۔ یہ کام سنگی کندہ کاری میں اپنی مثال ہے۔ دل چاہتا ہے کہ بس پڑھتے اور دیکھتے ہی رہیں۔ دائیں اور بائیں دروازوں پر سنگی کاری میں فارسی کے اشعار درج ہیں۔ دائیں دروازے کی محراب پر

چراغ مسجد محراب و منبر
ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و حیدرؓ

اور بائیں دروازے کی محراب پر

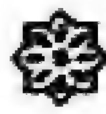
دو چشم من فدائی چار گوہر
علیؓ، فاطمہؓ، شبیرؓ، وشبیرؓ

یہ سب سنگی کندہ کاری خط نستعلیق میں اپنے حسن تحریر کا جادو جگا رہی ہے

آپ اس چوک سے جب حسین آگاہی کی جانب چلتے ہیں تو کوچہ پونگراں کے ملحق ایک مسجد ہے اس کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اس پیش دروازے پر کاشی کاری سے نیلی روغنی اینٹوں کے اوپر آیۃ الکرسی خط نسخ میں تحریر ہے۔ یہ تقابلی سنگی کاری اور کاشی کاری میں ایک ہی آیت قرآنی کے حسن خطاطی کا مظہر ہے۔ ویسے تو ملتان کا ہر گوشہ فن خطاطی کا داد طلب ہے مگر ریلوے سٹیشن ملتان چھاؤنی پر ایک نو تعمیر شدہ مسجد کو انتہائی اہتمام و تندہی کے ساتھ زیبائش و آرائش آیات قرآنی سے بخشی گئی ہے۔ وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ مسجد کی بالائی منزل پر محراب کو نیم دائرہ شکل میں تقسیم کر کے ''خط رعنا'' میں آیۃ الکرسی کی تحریر انتہائی جاذب نظر و دلنشیں ہے۔ درمیانی جگہ میں ''انَّ المساجد اللہ فلا تدعو مع اللہ احَد ا'' ایسے حسین انداز میں مزین کیا گیا ہے کہ خطاط نے اپنے فن کی بلندوں کو چھولیا۔ ہم یہی کہہ سکتے ہیں:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نبخشد خدائے بخشندہ

(تاریخ سرزمینِ ملتان - سید زاہد علی واسطی)



بالکشن ابر بی۔اے و دیوان آتم آنند شرر صاحب

ملتانی کہاوتاں اور اکھانڑ

ملتانی زبان میں کئی ہزار سے زیادہ کہاوتیں مشہور ہیں مگر ہم نے سہولت کے لحاظ سے اس سلسلہ کو مختلف جلدوں میں منقسم کر دیا ہے فی الحال اس ٹریکٹ میں مفصلہ ذیل اقسام کی کہاوتاں و اکھان درج کئے جاتے ہیں امید ہے ناظرین دلچسپی کے سے پڑھیں گے۔

تواریخی کہاوتاں

اندھا راجہ بیداد نگری۔ ٹکے سیر وسل ٹکے سیر نسری۔

عام طور پر یہ کہاوت فضول خرچی کے متعلق استعمال ہوتی ہے اور فضول خرچوں کو اندھا راجہ کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ اردو میں بھی اسی قسم کا شعر ہے اندھیر نگری چوپٹ راجہ، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔ ہمیں یہ کہاوت وہ تواریخی قصہ یاد دلاتی ہے جو درج ذیل ہے۔

کہتے ہیں کسی ملک کا راجہ بیوقوفی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی سلطنت میں ہر ایک چیز دو پیسے سیر تھی۔ ایک دفعہ اس راجہ صاحب کے پاس ایک مقدمہ پیش ہوا آپ نے فیصلہ میں مدعا علیہ کے برخلاف پھانسی کا حکم دے دیا۔ ملزم ذرا پتلا دبلا انسان تھا۔ اس لیے راجہ صاحب نے حکم دیا کہ اس کی جگہ ایک موٹا تازہ شخص پھانسی پر لٹکا دیا جاوے۔ اتفاق سے ایک سادھو اور اس کا چیلہ اس نگری سے گزرے۔ سپاہیوں نے چیلے کو پکڑ لیا اور پھانسی کے لیے میدان میں لے آئے۔ اسے حکم دیا گیا کہ جو کچھ اس نے کہنا ہو تو کہہ دے اس نے سادھو سے کچھ بات چیت کی اور ان کی آپس میں تکرار ہو گوی۔ ایک کہتا تھا کہ میں پھانسی چڑھوں گا دوسرا کہتا میں چڑھوں گا۔ اس اثنا میں راجہ صاحب بھی وہیں پہنچ گئے اور تکرار کا سبب دریافت کیا۔ سادھو نے جواب دیا کہ جو شخص آج پھانسی پر چڑھے گا وہ آج سیدھا بہشت میں جائے گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میں بہشت جاؤں۔ اور میرا چیلا چاہتا ہے کہ وہ جائے۔ راجہ صاحب نے کہاں کہ تم دونوں میں سے کوئی پھانسی نہ چڑھے بلکہ میں چڑھتا ہوں اور میں بہشت جاؤں گا۔ یہ کہہ کر راجہ صاحب پھانسی پر لٹک گئے اور سادھو اور چیلا کی جان بچ گئی۔

دستک کولیاں دی تے مغز فوجداری دا

روایت ہے کہ دیوان ساون مل کے وقت ایک شخص کو کوئلوں کی خریداری کا پروانہ ملا وہ شخص پروانہ لے کر کوئلہ فروش کی دکان پر آیا۔لیکن اس نے آتے ہی اس پر اپنے بے جا رعب جمانا شروع کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آپس میں لڑائی ہوگئی اس وقت دکاندار نے یہ کہاوت استعمال کی۔ مطلب یہ تھا کہ پروانہ تو تمہارے پاس کوئلوں کی خریداری کا ہے لیکن تم اپنا رعب اس طرح دکھاتے ہو جیسے کوئی افسر آ گیا ہو۔

کھا ملتان دی نسری تاں وطن دیہ وِسری

نہ ہی صرف آج کل بلکہ پرانے زمانے میں بھی ملتان کی مصری دور دراز ملکوں میں بھیجی جاتی تھی اور بڑے بڑے امیر اپنے گھروں میں اس کو استعمال کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔تب ہی سے یہ کہاوت بولی جاتی ہے۔مطلب یہ کہ اگر تو ملتان کی مصری کھالے تو تجھے سب کچھ حتیٰ کہ وطن تک بھی بھول جائیگا۔

لال کتاب بولیندی توں جا کی ڈاند لڑایا کیوں
کھل کھا کے کیتُس موٹا ڈاند داڈاند تاں سورو پیہ چوٹا

اردو میں لال کتاب اس چیز کی بابت استعمال ہوتا ہے کہ جس سے مصیبت کے وقت مدد لی جائے اور وہ رہبر کامل کا کام دے۔ یہ کہاوت دیوان ساون مل کے زمانہ سے پیشتر بھی بولی جاتی تھی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک تیلی نے اپنا بیل پالا ہوا تھا۔ اس کا بیل کھا پی کر خوب موٹا وہ گیا اتفاق کی بات اس کے بیل نے ایک دوسرے شخص کے بیل کو ضرب شدید پہنچائی اور اس کا بیل اجل کا شکار ہوا۔اس شخص نے عدالت میں قاضی صاحب کے پاس درخواست کی اور انصاف کا طالب ہوا۔قاضی صاحب نے اپنا رجسٹر یا لال کتاب دیکھی۔اور یہ فیصلہ دیا جو کہاوت مشہور ہے۔خلاصہ مطلب یہ کہ تیلی نے اپنا بیل کیوں اتنا موٹا کیا کہ وہ دوسرے کمزور بیل کی موت کا باعث ہوا۔اب میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ تیلی بیل کے بدلے بیل دے اور ساتھ ہی ایک سو روپیہ بطور جرمانہ ادا کرے۔ یہ کہاوت تواریخی نکتہ خیال سے دلچسپ ہے کیونکہ اس سے اُس زمانہ کے مقدمہ اور فیصلے پر کچھ حد تک روشنی پڑتی ہے۔

ملتان دا ساون، لیہ دا کر، جھنگ کا مُولا

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (پہلا) ملتان میں ساون کا مہینہ مشہور ہوتا ہے۔وجہ یہ ہے دیگر مہینوں میں کثرت گرمی پڑتی ہے اور اس میں بارش وغیرہ ہو کر ٹھنڈک پڑ جاتی ہے شاعروں کے نکتہ خیال سے بھی ساون کا مہینہ افضل سمجھا گیا ہے۔اور شاعر عموماً موسموں کی بابت جب بھی کوئی مضمون باندھتے ہیں تو ساون کے مہینے کو پیش نظر رکھتے ہیں۔کسی شاعر نے ساون کی رُت کی بابت یوں کہا ہے۔

دل کو مرغوب ہے ٹھنڈی جو ہوا ساون کی
مانگتا ہوں میں سدا حق سے دعا ساون کی
یاد آتا ہے وہ سبزہ وہ گھٹا ساون کی
شکل دکھلاوے پھر اب جلد خدا ساون کی

دیکھئے آنکھ سے کس کس کے برستا ہے لہو
یار ہاتھوں میں لگاتا ہے حنا ساون کی
ابر بھاگا ہوا جاتا ہے خدا خیر کرے
آج بدلی نظر آتی ہے ہوا ساون کی

لیہ دا کرم یعنی لیہ کے لوگ عموماً سخاوت میں مشہور ہوتے ہیں۔ اور جھنگ کے لوگ صحت وخوشی کے لیے مشہور ہیں۔ اسی لیے یہ بات ضرب المثل بن گئی ہے۔ دوسرا مطلب اس کہاوت کا یہ ہوسکتا ہے۔

ملتان دا ساون: ملتان کا حاکم دیوان ساون مل ہو گزرا ہے۔

لیہ دا کرم: لیہ کا حاکم کرم نرائن جو ایک مشہور کاردار دیوان صاحب تھا۔

جھنگ دا مولا: اور جھنگ کا صوبہ دار مول راج ہو گزرا ہے یہ بھی دیوان ساون مل کے وقت ایک مشہور کاردار تھا۔ گویا یہ کہاوت تواریخی نکتہ خیال سے دلچسپ ومعنی خیز ہے۔ کیونکہ اس میں تین شہروں کی مشہور اشیاء کا یا مشہور سابقہ حکمرانوں کا پتہ لگتا ہے۔

وہ کہاوتاں جن میں دلچسپ ومعنی خیز سچائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے

اماں بابو دا مٹھا نان، اوپرے چھک ڈھپ سٹن، آپریں سٹن چھاں

ماں باپ کو جو محبت اولاد کے ساتھ ہوتی ہے وہ کسی اور کے ساتھ نہیں ہوتی۔ مصیبت کے وقت جب تمام دوست واحباب ورشتہ دار وغیرہ انسان کو چھوڑ جاتے ہیں۔ والدین کسی صورت میں قطع تعلق نہیں کرتے یعنی طوطا چشم کی امید والدین سے بعید ہے۔

اُٹھ چنگا مال۔ کھٹے سونا تے کھاوے جال

مویشیوں میں اونٹ سب سے مفید جانور ہے۔ کیونکہ کھاتا تو محض جال جیسی نکمی چیز ہے۔ لیکن کام خوب دیتا ہے اور اس لحاظ سے سونا کماتا ہے۔

اساں پردیسی تُساں وطناں دے سائیں، ڈے نہ جھڑکاں ٹروسوں سجھائیں

ایک غریب الوطن کہتا ہے پیارے میں تو اس پردیس میں پردیسی ہوں۔ اور آپ یہاں کے باشندے ہمیں طعنے نہ دو۔ کیونکہ صبح ہوتے ہی ہم اس جگہ سے کسی اور طرف روانہ ہو جائینگے۔

او بہال دے اگوں ٹو ہے

مطلب یہ کہ جلدی کرنے سے ہر ایک کام بگڑ جاتا ہے۔ دیر آید درست آید کے مسئلہ کو مدِ نظر رکھ کر کام کرنا چاہیے۔ فارسی میں کہا گیا ہے تعجیل کار شیاطین بود۔

بی دے گھر کاج، چوڑے رنگ نہ رسو، کوئی ڈہارہ بچو، تاں پرے پرے بچو

مطلب یہ کہ زبردست آدمی خواہ تمہارا دوست ہی کیوں نہ بن جائے اگر تمہیں سلامتی مطلوب ہے تو اس سے پرے پرے رہنا چاہیے۔ بلی اگر چوہوں کو دعوت بھی دیوے تو جو دشمنی اس کو ازل سے چوہوں کے ساتھ ہے وہ مٹ نہیں سکتی۔

بٹھ رناں دی دوستی کھڑی جنہیں دی مت۔ آپے لیندیاں دوستی، آپے ڈیندیاں ڈس

لعنت ہے عورت ذات کی دوستی پر اور ہزار بار لعنت ہے۔ ان میں تمیز تو ہوتی ہی نہیں کہ کام سوچ بچار کر کریں۔ خود ہی دوسروں کے ساتھ آشنائی پیدا کرتی ہیں اور خود ہی اس بات کو مشتہر کرتی ہیں۔ اردو کا ایک شعر ہے۔

کتنا چھپایا راز محبت نہ چھپ سکا
افسانہ ان کے عشق کا مشہور ہو گیا

بی بی کنوں پئے بھاری۔ ٹکے دی رن دو ٹکے دیاں جلواں

یہ محاورے عموماً اس وقت استعمال ہوتے ہیں جب کوئی چیز خرید کی جاوے۔ مگر اس کی آرائش پر خرید سے دوگنا تگنا زیادہ روپیہ خرچ ہو جاوے۔ اسی کہاوت سے تعلق رکھتا ہوا ایک مشہور شعر ہے۔

حجامت کرانے منگایا تھا نائی
تو انعام میں اس نے مانگی لائی
مثل مجھے برمحل یاد آئی
دھیلے کی گوڈیا ٹکا سر منڈائی

بارچاون ویلے چنگا بھلا، گھال بھرن ویلے ڈورا

یہ اس وقت کسی کسان کی بابت کہا جاتا ہے جو فصل اٹھانے کے وقت ہوشیار ہو، مگر جب لگان وغیرہ دینے کا وقت آئے تو بہرہ بن جائے۔

بھٹ وے دلبر تیری یاری۔ وداع نہ کیتو جُلدی واری

اے دلبر تیری دوستی و آشنائی پر لعنت! تجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ تو جاتی دفع مجھے الوداع کہتا۔

پارن سوکھا تاں سیون اوکھا

کسی کام کو بگاڑنا بہ نسبت بنانے کے بت ہی سہل امر ہے ٹوٹی ہوئی چیز مشکل سے بنتی ہے۔ کسی استاد کا شعر ہے:

اے شیشہ گرو تم سے اک عرض میری ہے
دل ٹوٹا بنا دو تو عجب شیشہ گری ہے

پٹیا پہاڑ تے نکلیا چولا

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام پر بہت سا قیمتی وقت اور زر کثیر صرف کیا جائے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلے۔

پکڑ نہ میڈی گسنی یار۔ میڈا ویر جو آندا پیا ہے

اے دوست میری کلائی چھوڑ دے، کیونکہ میرا بھائی دور سے دیکھتا آ رہا ہے۔

پرنا خوشی نال ہے، نہ تاں ہے مرنا

جو شادی لڑکا اور لڑکی کی حسب منشا ہو تو وہی اصل شادی شمار کی جاتا ہے۔ ورنہ اسے شادی کی بجائے بربادی کہنا چاہیے۔

پلے ہووے سچ تاں کھڑا تھی کے نچ

مطلب یہ کہ اگر تم راستی پر ہو تو بے دریغ سچی بات لوگوں کے منہ پر سنا دو۔ سعدی صاحب

راستی موجب رضائے خدا است

کس ندیدم کہ گم شد از راہ راست

زال تے بال ڈوہیں روبرو چنگے، اوڈھر تھیوں تاں دشمن بند ہے نہ علاج نہ ٹونا مندے

عورت اور فرزند اس وقت تک اچھے رہتے ہیں جب تک کہ آنکھوں کے سامنے ہوں نظر سے اوجھل ہونے پر دشمنی اختیار کر لیتے ہیں اور ایک دفعہ کے بگڑے ہوئے پھر ان کا سدھرنا محال ہے

ٹُر نہ سگے آپ، لعنت گوڈیاں کوں

مطلب یہ کہ انسان کام تو خود نہ کر سکے، مگر اس کا الزام دوسروں کے سر پر تھوپ دے۔ اردو کا محاورہ ہے ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ فارسی میں مہتے یں خوئے بدرا بہانہ بسیار۔

جیڑھے راہ نہ ونجے اوندا پندھ کیوں پچھے

جب انسان نے کسی کام کو کرنا ہی نہیں، تو اس کی بابت مفصل حالات دریافت کرنا بالکل فضول اور حماقت میں داخل ہے۔

نھوڑوہ نیگر تے نہ ڈیو، کندھ ایرے تے آسی۔ یا جیہی ماتیہی ماسی، کندھ ایرے تے آسی

اگر لڑکی سے کوئی بات قابل اعتراض ہوگئی ہے تو یہ محض اس کا قصور نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی والدہ بھی اسی طرح کی ہوگی۔ کہا جاتا ہے جیسی روح ویسے فرشتے۔ فارسی کا مشہور مصرع ہے "ایں خانہ ہمہ آفتاب است"۔

سخی کولوں شوم بھلا، جیڑھا تُرت ڈیوے جواب

مطلب یہ کہ اُس سخی سے جو سخاوت کے وقت سینکڑوں بہانے ڈھونڈے وہ کنجوس بدرجہا بہتر ہے جو فوراً کہدے میں کچھ نہیں دے سکتا خلاصہ یہ کہ دان کرنے کے وقت حیلہ بہانہ ڈھونڈنا فضول ہے۔ مثل ہے نیک کر دریا میں ڈال۔

شادی دی بُکھ، بیڑی دی دُھپ، غریب دی چپ، مترائی دی مک

دنیا میں چار چیزیں نہایت ہی تکلیف دہ ہیں پہلی وہ بھوک جو انسان کو بیاہ اور شادی کے موقع پر محسوس ہو،

دوسری وہ دھوپ جو کسی کو کشتی میں برداشت کرنی پڑے، تیسری وہ خاموشی جو غریب اختیار کرے۔ قہر درویش بر جان درویش۔ چوتھی وہ غصہ جو سوتیلا باپ یا سوتیلی ماں اپنے سوتیلے بچہ پر ظاہر کرے۔

کرمزدوری تے کھا چوری

محنت بغیر پھل لائے نہیں رہتی۔ اس لیے جو محنت و مشقت کریگا وہ اس کا بدلہ ضرور پائیگا۔ سعدی صاحب کہتے ہیں، مزد آں گرفت جان برادر کہ کار کرد۔ ایک اور صاحب محنت کی بابت لکھتے ہیں:

ناجی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

کھاوچ متھا تاں جتی وچ دھیان

ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ پیشانی لیکچرار کی طرف، دھیان جوتی کی طرف

کاں، کراڑ کتے دا، وسانہ کریں ستے دا

کوے، کرار، اور کتے کا اگر چہ وہ سوتے ہی ہوں اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ ان کی ذات سے ڈرنا ہی بہتر ہے۔

کھیتی سر سیتی

کھیتی اس وقت سیراب ہوتی ہے اور انسان اس کا اس وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے جب کہ وہ اس میں خوب دل لگا کر کام کرے۔ کام کے بغیر کھیتی کا ہونا محال ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کھیتی سر کے ساتھ ہے۔

گلاب دا پھل، ڈیکھ ڈیکھ پئی بھل

عورتوں کو گلاب کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ وہ نازک بدن و گل اندام ہوتی ہیں۔ یہ کہاوت عموماً طعنہ کے طور پر بولی جاتی ہے۔ جو عورتیں گھر کے کام کاج سے نفرت کرتی ہیں اکثر انہی کی بابت بولی جاتی ہے۔

غریب کوں ما نہ جڑیں ہا

مطلب یہ کہ امیر لوگوں کا سب ساتھ دیتے ہیں لیکن غریب کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ایک مشہور مصرع ہے "تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات"۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ غریب کا دنیا میں پیدا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔

عشق دا راہ نہ سوکھا ہے، لاون سوکھا پر پالن اوکھا ہے

عشق کی منزلیں بہت کڑی ہیں۔ اگرچہ عشق کا روگ لگا لینا ایک سہرا امر ہے لیکن اس کا نبھانا ایک مسکل بات ہے

عشق کا منصب لکھا جس دن میری تقدیر میں
آہ کی نقدی ملی، صحرا ملا جاگیر میں

مُٹھی پُتراں کوں کیوں جڑیندی ہائی ما

مطلب یہ کہ غریب یا نکھٹو آدمی اور بیوقوف انسان دنیا میں نہ پیدا ہوں تو بہتر ہے ٹ ہم اس کے دو معنی

لے سکتے ہیں غریب یا بیوقوف انسان

موئی رن گِٹے دی سٹ، مرد مرے تاں سر دی سٹ

عورت کا مر جانا یہ ایک قسم کی ضرب شدید ہے جو انسان کو ٹخنہ پر لگے۔ یعنی انسان کو سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر مرد مر جائے تو یہ ایک ایسی چوٹ ہے جو کسی کو سر میں لگے کسی عورت کا خاوند مر جائے تو کہتے ہیں کہ اس کا سرتاج جاتا رہا۔

نہ ڈوہ بگانی گاں، ماری لت تاں بھنی بھاں

دوسرے کے کام میں بے جا دخل دینے سے سراسر نقصان اٹھانا پڑتا ہے

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

نہ گڈوی نہ ڈلا، اشنان کرن چلیا

اہل ہنود میں نہانے کے وقت گڑوی اور انگوچھے کا استعمال لازمی ہے اس لیے جو شخص ان دونوں کے بغیر نہانے جائے وہ نکما خیال کیا جاتا ہے۔

نہ کھا او ترک دا مال، تاں اگلے کوں وی گال

حرام کا مال کسی صورت انسان کو نہیں پچتا۔ اس لیے فارسی میں کہا گیا ہے: مال حرام بود بجائے حرام رفت

نہ کم دانا کار دا، اجایا جھگا جال دا

یہ محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی چیز کو ناکارہ کہہ کر بلایا جائے۔

نہ ڈو چونہ پچھ وچ، میں گھوٹ دی بوا

یہ محاورہ اس قوت استعمال کیا جاتا ہے جب نہ کسی کو بلایا گیا ہو اور نہ اس کو دعوت وغیرہ دی گئی ہو۔ لیکن وہ خواہ مخواہ خانہ دار بنا پھرے۔

وہ کہاوتاں جو ظریفانہ طور میں استعمال ہوتی ہیں

اندھی رن کوں لگا بھاگ، کھیرنی کوں ڈیوے ہنگ دا واگ

مطلب یہ کہ جب کمینے و رذیل انسان حسن اتفاق سے ترقی کر جاتے ہیں تو ان سے وہ وہ باتیں ظہور میں آتی ہیں جن کی بیوقوفوں سے بھی امید نہیں کی جاسکتی۔

باکدی کیوں ہیں، گھدی کوہن ویندے نی نا کوئی پڑھن تاں نہیں گھدی ویندے

ایک دفعہ ایک طالب علم نے جسے پڑھنے لکھنے سے سخت نفرت تھی۔ ایک بکری کو دیکھا جسے جلاد سلی خانہ کی طرف ذبح کرنے کے لیے لے جا رہا تھا اور وہ بکری بار بار چلا کر استدعا کر رہی تھی۔ کہ اے جلاد خدا کے واسطے رحم

کر۔لڑکا کہتا ہے، اے بکری تو کیوں چلا رہی ہے تجھے کوئی مکتب تو نہیں لے جا رہے، تجھے تو صرف ذبح کرنے کے واسطے لے جا رہے ہیں، کوئی تجھے استادوں کا ڈر نہیں، کوئی تجھے سبق تو یاد نہیں کرنا پڑے گا۔ گویا کہ موت پڑھنے لکھنے سے بدر جہا بہتر ہے۔

بُکھا کرار وہیاں پھولے، ڈُو پیسے پلے، پُتر ٹاٹے پور چلے

معمولی سی پونجی پر سوچنا کہ میں کیا کرو اور کس طرح خرچ کروں۔ اس سے بعید ہے۔ یہ کہاوت کم ظرفوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہ مثل اُن پر بھی صادق آتی ہے کہ جن کے پاس روپیہ کچھ نہ ہو اور وہ اپنے کاغذات دیکھتے رہیں کہ کہیں سے رقم ہاتھ لگ جاوے۔

ترائے اَن کوگن، بھیڈ پوچھلی، ڈبی منج تے ڈاڑھی والی رن

دنیا میں تین چیزیں بے فائدہ اور بدزیب ہوتی ہیں۔ ایک وہ بھیڑ جس کی دم ہو، دوسرا وہ بھینس جس کے سینگ وضع ہوں۔ تیسرا وہ عورت جس کو داڑھی نکل آئے۔

جنگل جَٹ نہ چھیرے، ہٹی نے کرار، بیڑی تے مُہانا بھَن گھتیسی ہانتھاڑ

جاٹ کو جنگل میں، کرار کو دکان پر، اور ملاح کو کشتی پر ہرگز ہی نہیں چھیڑنا چاہیے کیونکہ یہ اس وقت سخت تکلیف کا باعث ہو سکتے ہیں۔

چار چور، چوراسی اساں، حملہ کیتا چوراں، دھر کیو سے اساں، بعت چوراں، تاں شابس اساں

ہم چوراسی آدمی تھے، ہم پر چار چوروں نے حملہ کیا۔ ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور آخر جان بچا لی۔ ہماری بہادری ہے کہ ہم نے ایسا دلیرانہ کام کر کے اپنی جان بچائی، کیونکہ سنا ہوگا، جان بچی اور لاکھوں پائے۔

دال تاں ٹبر پال میڈے پُتراں دی مچھی دل دی اچھی میڈی دھیاں دی، ساگ لگے بھاگ میڈے پُتراں کوں، گوشت دل دا دوست، بڈھی بڈھے دا

دال میرے لڑکوں کو پالنے والی ہوتی ہے۔ یعنی بہ سبب سستی ہونے کے ایک پیسہ کی دال گھر کے تین چار آدمیوں کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس لیے گھر کے پالنے والی کہا گیا ہے۔ میری لڑکیوں کو مچھلی زیادہ مرغوب ہے۔ ساگ کھانے سے میرے لڑکوں کی قسمت جاگ اٹھے گی۔ گوشت بڈھے اور بڈھی عورت کو پسند خاطر ہوتا ہے یہ کہاوت ظریفانہ طور پر استعمال ہوتی ہے۔

سُنجی رن دے آندے گئے، ڈسا پاپا ڈھاندھے گئے

یہ محاورہ عموماً کم ظرفوں و نالائق آدمیوں کی بابت استعمال ہوتا ہے۔

ہک ڈاڑھی بھنبھری ڈاڑھی ہک ڈاڑھی چولہا ڈاڑھی، ہک ڈاڑھی چھیلا ڈاڑھی، ہک ڈاڑھی وچھیاں گابیاں ڈاند لتاڑی، ہک ڈاڑھی طوطیاں ٹکی ڈاڑھی، ہک ڈاڑھی بُہاری وڈی ڈاڑھی، احمقاں بھوکا ڈ۔نہدے ڈُکھ

ایک ظریف طبع شخص ڈاڑھی کی مفصلہ ذیل قسمیں یہاں کرتا ہے ایک وہ ڈاڑھی ہوتی ہے جو تمام چہرے پر

برابر ہو۔ بال خوب اُگے ہوئے ہوں۔ دوسری وہ ہوتی ہے کہ دونوں گالوں کی طرف ڈاڑھی اُگی ہوئی ہو۔ لیکن تھوڈی پر بال ندارد ہوں۔ چھیلا داڑھی وہ ہوتی ہے جو ایک نوجوان البیلے اور مضبوط شخص کے منہ پر اُگی ہوئی ہو۔ چوتھی داڑھی وہ ہوتی ہے جو کسی جگہ پر اگی ہوئی ہو اور کسی جگہ پر نہ اُگی ہوئی ہو۔ پانچویں داڑھی وہ ہوتی ہے جس کے بال اچھی طرح سے اگے ہوئے نہ ہوں اور ایسا معلوم کہ کسی جانور نے چونچ سے بال اُکھاڑ ڈالے ہیں اور آخر الذکر ڈاڑھی وہ ہوتی ہے جو بہت لمبی ہو لیکن اس میں ایک امر تکلیف دہ ہے وہ یہ کہ اگر کسی وقت کسی جگہ آگ سلگانی پڑ جائے تو لمبی داڑھی والے کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں اس کی داڑھی کو ہی آگ نہ لگ جائے اور اس کا صفایا نہ ہو جاوے۔

گدڑ دراکھ نہ پکڑی تھو کھٹی

یہ کہاوت ہمیں وہ قصہ یاد دلاتی ہے جس میں ایک لومڑی نے بہت کوشش کی کہ ایک خوشہ انگور درخت سے پکڑے۔ لیکن جب اس میں ناکامیاب ہوئی اور دوسرے جانوروں نے اسے شرمندہ کیا تو وہ کہنے لگی کہ میں نے انگور اس لیے نہیں توڑے کہ وہ کھٹے تھے مطلب یہ کہ جب انسان کسی کام کی بابت شیخی بگھارے مگر وہ کر نہ سکے تو بہانہ کر کے ٹال دیتا ہے۔

پاولی دی دُڑ ہک پند یلے تائیں، ملا دی دوڑ مسیت تائیں

اردو میں بھی اسی قسم کا محاورہ ہے ملا کی دوڑ مسجد تک۔ مطلب یہ کہ چلاہے پند یلے اور ملا مسجد سے باہر قدم نہیں رکھتے۔

مال اوٹھا، گھر کوٹھا، پُتر جیٹھا

ایک دفعہ ایک ملتانی نے دوسرے سے کہا کہ میں مویشیوں میں سب سے افضل جانور اونٹ سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کام بہت دیتا ہے ریگستانوں میں بلا پانی کئی کئی دن گزارا کر لیتا ہے اور اسباب دلانے و باربردارے کے لیے بھی از حد مفید ہے۔ دیگر میں مکانوں میں سب سے اچھا کوٹھے کو پسند کرتا ہوں باعث یہ ہے کہ دفعہ روپیہ خرچ کیا انسان کو بارش آندھی، طوفان، گرمی، سردی، غرضیکہ تمام تکلیفات سے بچاؤ رہتا ہے۔ اور میں لڑکوں میں سب سے برتر بڑے لڑکے کو سمجھتا ہوں جو گھر کا کام کاج سمجھانے کے قابل ہوتا ہے اور دیگر تمام اقوام بھی بڑے لڑکے کو افضل سمجھا گیا ہے دوسرا ملتانی جواب دیتا ہے نہیں میں تم سے متفق الرائے نہیں ہوں میں یہ کہتا ہوں

مال بکری، گھر چھپری، پتر اوہو جیڑھا اپڑی

مویشیوں میں سب سے اچھا مویشی بکری ہے جس پر دام بھی کم خرچ آویں اور سال میں دو تین بچے بھی دے دیوے اور جس سے دودھ کا بھی فائدہ ہو۔ گھروں میں گھر جھونپڑی افضل ہے جب بارش سے خراب ہو جائے یا آگ لگ جاوے۔ تو انسان نئی بنا لیوے۔ لڑکا وہ اچھا ہے جو مصیبت کے وقت کام آوے کہ بڑا اور سب سے پہلا لڑکا۔ سچ تو یہ ہے فکر ہر کس بہ ہمت اوست

میں کنواری میڈا یار پنیوئی، ونج کو کیساں ظالماں ڈاڑھا ظلم کیتوئی

ایک عورت کہتی ہے میں تو ابھی کنواری ہوں مگر میرے دوست و آشنا کی لوگوں نے شادی کرا دی ہے۔
میں حاکموں کے پاس جا کر فریاد کروں گی کہ لوگوں نے مجھ پر ایسا ظلم ڈھایا ہے۔
منگیا تاں ٹنگیا، پرنا تاں گلیا، ٹکے وی لگے، جوان وی اڑیا

مطلب یہ ہے کہ جب انسان کی منگنی ہو جاتی ہے تو وہ کچھ حد تک مقید ہو جاتا ہے کیونکہ اس کو ایک اور جان کی بھی فکر کرنی پڑتی ہے۔ جب انسان کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ والدین سے قطع تعلق کر لیتا ہے اگر چہ والدین شادی پر ہزار ہا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ مگر عموماً میاں بیوی شادی کے بعد والدین سے جدا ہو جاتے ہیں یہ بھی آج کل کا فیشن ہے۔

ملاں جی کچھ کھاسو، جیا بسم اللہ، مُلاں جی کچھ ڈیسو، نعوذ باللہ

مطلب یہ ہے کہ مُلا جی کھانے پینے کے وقت تو تیار اور ہوشیار ہوتے ہیں لیکن جب خیرات کا موقع آتا ہے تو بات بھی نہیں سنتے

صاحب ڈتا جالن، رن نجی نال، کھاڑا کھاندی روپاں ٹنا پیوے دال، ہاتھی وانگ تیلی ناں توے گانگن لال۔ چھپر پینڈی گھگھرا، تر وہا کرے رومال۔ گزاں وانگن ہینگدی، سارے ویڑھے داسنگھار

خدا نے ہمیں ایسی دانا عورت کا ساتھ دیا ہے تو جس وقت کھانے پہ آتی ہے تو دال روٹی کے برتن چٹ کر جاتی ہے جو ہاتھی کی طرح پتلی اور توے کی مانند سرخ ہے لہنگا اتنا چھوٹا پہنتی ہے کہ بس خدا کی پناہ۔ رومال پھارتے میں قینچی کی مانند تیز ہے اور گدھے کی طرح گلا پھاڑتی ہے اور میرے لیے تمام گلی کوچوں میں ایک بدنما زیور ہے۔

جگو دے ڈورے پٹھے، میناں اُکتے چھپر وٹھے، مل بکریاں قصائی کُٹھے، بھونکن چور تاں نسن کُتے

جگو ایک مشہور ملتانی شاعر ہو گزرا ہے۔ اس نے اپنے تمام بیتوں میں اُلٹے مضامین باندھے ہیں۔ مثلاً ایک یہ جو کہاوت ہے ہمیشہ بارش چھپروں پر پڑتی ہے قصاب بکریوں کو ذبح کرتا ہے اور کتے چوروں پر بھونکتے ہیں لیکن اس کہاوت میں بالکل الٹا مضمون دیا گیا ہے کہ بارش پر چھپر برسے بکریوں نے قصائی کو ذبح کیا۔ اور چور کتوں پر بھونکے۔ اردو میں بھی اسی قسم کے کئی مضامین باندھے جا چکے ہیں۔ کئی شاعر لفظوں کو اُلٹا کر مضمون باندھتے ہیں مثلاً ذیل کے اشعار میں لفظوں کو ملاحظہ کیجئے

مجھے مار کیوں نہ ڈالے تیری زلف اُلٹ کے کافر
کہ سکھا رکھا ہے تو نے اسے لفظ رام الٹا
صبح اس نے ایک پھینکا جو دکھا کے ماش مجھ کو
تو اشارہ میں نے سمجھا ہے لفظ شام الٹا

وہ کہاوتاں جو طنزاً استعمال ہوتی ہیں

شے ڈیوں گلی تے، میہڑاں ڈیویں تلی تے

یہ محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی کو چیز عطا کرے مگر اس کا احسان بھی اسی وقت جتا دیوے۔ اس ضمن میں ایک اردو شاعر کہتا ہے

جو احسان کر کے جتانے لگے
وہ اپنے کئے کو مٹانے لگے

ماپے پتر گھوڑے گھنے

یہ کہاوت اس وقت بولی جاتی ہے جب کسی شخص کے والدین مفلسی میں مبتلا ہوں مگر ان کا لڑکا اپنی ناداری و مفلسی کی پرواہ نہ کرتا ہو۔ اپنی حیثیت سے باہر قدم رکھے۔ اردو میں اسی قسم کا محاورہ ہے۔ اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانا۔ اسی سے تعلق رکھتا ہوا ایک اردو شعر ہے۔

قرض کی پیتے تھے مے اور ہم سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ہتھاں مہندی پیراں مہندی، اپنے میہنڑیں بناں کو ڈیندی

یہ ضرب المثل اس قت استعمال ہوتی ہے جب کوئی شخص اپنی ذمہ داری دوسرے کے سر پر ڈالے۔ اردو میں بھی اسی قسم کا محاورہ ہے۔ طویلے کی بلا بندر کے سر۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہوسکتا ہے۔ مہندی دیکھنے میں سبز رنگ کی ہوتی ہے لیکن جب لگائی جاتی ہے تو سرخ رنگ کی ہو جاتی ہے۔ یعنی جب کسی شخص کے دل میں کچھ اور ہو مگر منہ سے وہ کچھ اور کہہ رہا ہو۔ اس وقت بھی یہ مستعمل ہوتا ہے۔ اردو کا شعر ہے۔

مہندی سے تمہارے ہیں طور
منہ پر کچھ اور دل میں کچھ اور

پاولی دے پتر ہرن سانبھیا، دڑ ہو دڑ ہو کے مار گھتیا

مطلب یہ کہ کمینے شخص کو اگر کوئی قیمتی چیز مل جائے تو وہ ضرور اس کی بیقدری کرے گا اسی قسم کی ایک ملتانی ضرب المثل ہے۔ جٹ کیا جانے کچا لوکھا۔ اردو میں بھی آتا ہے۔ کتے کو گھی ہضم نہیں ہوتا۔ قدر زر زرگر بداند قدر جوہر جوہری

مامر گئی ننگی دھی داناں بشکی رکھیں داانددھاناں نین سکھ

یہ محاورہ اپنی حیثیت سے زیادہ کام کرنے کے وقت مستعمل ہوتا ہے۔ اردو میں بھی اسی قسم کا ایک محاورہ ہے۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل۔

کمینے دی یاری وِٹھوئیں داڈنگ

یعنی کمینے لوگوں سے دوستی کرنا سراسر نقصان اُٹھانا ہے

دہڑک دہڑک موئی تے پیکے نے پئی

یہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص کام بہت کرے مگر نتیجہ نہ نکلے

سائیں دے من بھانی تے کانی وی رانی

عورت خواہ کالی ہو یا کانی مگر جب خاوند کو دل پسند ہے تو اس کے لیے وہی عورت تمام خوبصورت عورتوں سے بڑھ کر ہے:

کالے گورے پر نہیں موقوف کچھ

دل کے آئینے کے اور ہی ڈھنگ ہیں

جواں دمی ڈھیری تے گڈاں رکھوالا

طنزاً اس وقت بولی جاتی ہے جب انسان سے کوئی بیوقوفانہ کام سرزد ہو۔

ہوڈوڈی تے وچ خیر

یہ محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب انسان ضدی تو پرلے درجے کا ہو مگر جن باتوں پر ضد کرے وہ عقل سے بعید ہوں

مُلاں بُڈن منظور کیتا، پر ہتھ ڈیون منظور نہ کیتا

یہ کہاوت ملاں لوگوں کی ہمت ظاہر کرتی ہے۔

گوگی آپ جوگی

یہ محاورہ خودغرض وخود پسند اشخاص پر عائد ہوتا ہے۔

موسمی کہاوتاں

بساکھ جیٹھ وُٹھے، ساون بھادوں مُٹھے

جب بیساکھ اور جیٹھ کے مہینے میں بارش ہو جائے تو ساون اور بھادوں کے مہینے میں فصل اچھی نہیں ہوتی۔

بدروں بد بلا، وت وی ساون ہووے ہا

یہ کہاوت عموماً بھادوں کے مہینے میں بولی جاتی ہے بھادوں میں گرمی کا زور ہوتا ہے لوگ گرمی سے تنگ ہو کر ساون کے مہینے کو یاد کرتے ہیں۔

چیت وساکھ گُھمے، جیٹھ ہار سُمے، ساون بھادوں دھانوے، اسوں کاتیں تھولا کھاوے، طبیباں پاس مول نہ جاوے

چیت بساکھ یعنی 10 مارچ سے 15 مئی تک جو موسم ہوتا ہے وہ ایسا خوشگوار ہوتا ہے کہ جس میں انسان سیر

وسیاحت کرے تو بہت اچھا ہے۔ جیٹھ ہاڑ یعنی 15 مئی سے 15 جولائی تک ایسا موسم ہوتا ہے جس میں صحت کو برقرار رکھنے کے لیے دوپہر کو نیند لازمی ہے۔ اسی طرح ساون بھادوں 15 جولائی سے تقریباً 15 ستمبر تک کے موسم میں کم کھانا ازحد مفید ہے۔ جو شخص ان باتوں میں پر عمل کرتا ہے اس کو کبھی کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس جانے کی حاجت نہیں رہتی۔

بدراں دی پنڈ تے کیتس دے چھوارے دی چاہ

ماہ بھادوں کی کھجور، اور ماہ کاتک کے چھوارے نہایت ہی لذیذ اور خوشگوار ہوتے ہیں۔

ماس کھاوے ماس ودھے گھیو کھاوے کھوپری، کھیر کھاوے کایا ودھے، ساگ کھاوے اوجھری

گوشت کھانے سے گوشت بڑھتا ہے۔ گھی کھانے سے کھوپڑی کو تقویت پہنچتی ہے دودھ پینے سے چربی، اور ساگ کھانے سے دماغ کو قوت ملتی ہے۔

جو ساوے تے کوئی نہ آوے، جو پکے تاں ملن سکے

جب کام کا موقع ہوتا ہے تو کوئی مدد کو نہیں آتا لیکن جب فائدے اٹھانے کا وقت ہوتا ہے تو سب دوست و آشنا موجود ہو جاتے ہیں۔

روزمرہ کی بول چال کے متعلق و دیگر نصیحت آمیز کہاوتاں

جند ڈتی ہس تاں روزی وی ڈیسی

جس پاک پروردگار نے ہمیں زندگی جیسی انمول چیز عطا کی ہے وہ ہمیں روزی سے کبھی بے بہرہ نہ رکھے گا۔ پس ہمیں بہرصورت روزی مل ہی رہے گی۔

شاہو کاراں نے رنگ وٹایا کہ حال ہے غریباں دا

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جب امیروں کا برا حال ہو تو اس وقت غریبوں کی مصیبت کا اندازہ لگانا نہ ہی صرف مشکل بلکہ محال ہے۔ دوسرا یہ کہ جب دولت مند اصحاب غربا کی مدد نہ کریں تو غریبوں کا کیا حشر ہوگا۔ امیروں کا فرض ہے کہ وہ غریبوں کی مدد کریں اگر وہ نہ کریں تو اور کون کریگا حضرت ذوق کہہ گئے ہیں:

دنیا کا مال و زر جمع کیا تو کیا اے ذوق
کچھ فائدہ بے دست و کرم اٹھا نہیں سکتا

ساری گال ان جل دے ہتھ ہے

یہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی چیز کو قسمت پر چھوڑا جائے۔ اگر ہماری قسمت میں کسی جگہ جانا ہوگا تو اس جگہ کا آب و دانہ ہمیں ضرور وہیں کھینچ کر لے جائیگا:

کہاں ہم کہاں تم ہو یہ جو ساتھ

یہ تھی بات سب آب و دانہ کے ہاتھ

آج وس کے وت نہ وساں

اردو میں محاورہ ہے آج برس کے پھر نہ برسوں۔ جب مینہہ خوب برسا کرتا ہے تو اس کی طرف یہ فقرہ کہہ کر کثرت بارش کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ گویا مینہہ یہ کہتا ہے کہ سب دنوں کی کسر آج ہی نکال دوں اور پھر برسنے کی حاجت نہ رکھوں ۔

انوں دی دنیا اِن تھی ونجے

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے زمانہ کا پلٹ جانا، ایک عالم کا دشمن ہو جانا

یہ کس منہ کی ترچھی نظر ہو گئی
کہ دنیا ادھر کی اُدھر ہو گئی

اوتاں اکھ اُٹھا کے وی نہیں ڈیکھدا

اس کے معنی ہیں بے التفاتی کرنا۔ مارے شرم کے آنکھیں سامنے نہ کرنا:

اللہ رے ناز کی کہ حیا بار ہو گئی
کل مجھ کو آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا نہ یار نے

اکھ لگ گئی ہے

اس کا مطلب نیند آنا یا عشق ہونا کا ہے۔ اردو کا ایک مشہور شعر ہے

اب کے کچھ اور ڈھب سے آنکھ لگی
نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی

اوٹھ دے منہ وچ جال دی بو

جال ایک درخت کا نام ہے جو اونٹ ہر وقت کھانا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو وہ جال ہے۔ ہر وقت اسے اسی کی فکر لگی رہتی ہے۔ یہ محاورہ اسی وقت بولا جاتا ہے جب ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے جیسے تمہارے خیالات ویسے تمہاری زبان سے کلمے نکلتے ہیں۔

کئی دمور ہے پتن نے تیڈا اوچھوڑا اوے یارنمی روح کتن تے

پہلے چار لفظ جملہ معترضہ ہیں آگے مطلب یہ ہے۔ ایک عورت اپنے عاشق کے فراق میں کہہ رہی ہے میں تمہارے عشق میں بیقرار ہوں مجھ سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ کاتنا جو میرا فرض ہے اس میں بھی میرا جی نہیں لگتا۔

کئی واہن جھلارین روندی مر ویساں گامنا یار ڈیدیاں تیڈی راہیں

پہلے تین لفظ بطور جملہ معترضہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کئی ندیاں بہہ رہی ہیں اے گامن یار تم ابھی تک نہیں آئے میں تمہارے فراق میں تمہارا راستہ دیکھتے دیکھتے ہی مر جاؤں گی۔

جج پرائی احمق نچے

بلا درخواست و دعوت دوسروں کے کام میں دخل دینا بیوقوفی میں شامل ہے۔

تیڈے سر تے گھڑا میڈا ڈھاک تے گھڑی۔ پکڑ نہ گسنی سجنا میڈی سینگی کھڑی

ایک عورت اپنے آشنا سے مخاطب ہے تو گھڑا لیے کھڑا ہے میرے پاس گھڑی ہے۔ اے دوست میری کلائی نہ پکڑ میری سہیلی سامنے کھڑی ہے ایسا نہ ہو انجام مین ندامت اٹھانی پڑے۔

ڈانور وانگ سبو کم فریب دا ہس

مکڑی فریب کے لیے مشہور ہے اس لیے یہ محاورہ فریبی انسان کی نسبت استعمال ہوتا ہے۔

پانجانی منگدی گامنا یار۔ تیڈے ڈیکھن دی بکھی ہاں

گامن ایک مشہور ملتانی عاشق ہو گزرا ہے۔ وہ ایک دفعہ کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا کھجوریں اتار رہا تھا ایک عورت پاس سے گزری اور اس کو دیکھ کر کہنے لگی۔ اے گامن دوست میں کھجوروں کا گچھا نہیں مانگتی میں صرف دیدار کی بھوکی ہوں۔

ترس نہ آئیو گامنا یار کیہرے ویلے دی کھڑی ہاں

اے گامن دوست تمہیں رحم نہیں آتا جو میں اتنی دیر سے تمہاری منتظر ہوں اور تم بے مروتی سے کام لے رہے ہو۔

زال دا مرید تاں دل وچ خراب

مطلب یہ کہ زن مریدی ایک بڑی برائی ہے۔ زن مرید انسان کا دنیا میں جینا زندہ درگور ہونا برابر ہے۔

ٹوبے دھاندی صاحباں تے پانی آن پلا، ایو پانی کُتیاں لکیا ہے دھاون دی جا

صاحباں ایک مشہور معشوق ہو گزری ہے اس کی بابت یہ کہاوت مشہور ہے کہ ایک دفعہ وہ حوض پر نہا رہی تھی اس کا جان نثار عاشق وہاں سے گزرا اور اس سے کہنے لگا اے صاحباں کچھ پانی تو پلا دو۔ وہ جواب دیتی ہے یہ پانی خراب ہے کیونکہ کتے اس کو خراب کر جاتے ہیں دوسرے یہ نہانے کی جگہ ہے تو کسی اور جگہ جا کر پانی پی۔

چھتی بھمبی ٹالی تلے سخن کتوئی، ہا دیں کوئی سخناں دا کوزا چھلا دی مور گدوئی

ایک عورت اپنے آشنا کی بیوفائی کا تذکرہ کرتی ہے ایک خوشگوار سایہ دار شیشم کے درخت کے نیچے تو نے مجھ سے وعدہ وصل کیا لیکن او ستمگر تو بیوفا نکلا تو نے اپنی دی ہوئی انگشتری بھی مجھ سے واپس لے لی ہے۔

بڑی تکلیف تیر ہجر میں او بے وفا پائی
خدا شاہد ہے ہم نے دل لگا کر کیا سزا پائی

یار آیا ہادی، ہا، کہیں مہمانی ڈتی ہادی۔ چھج بھوں دا، تاں بُجا منہ دا

ایک عورت دوسری سے سوال کرتی ہے کیا تمہارا آشنا آیا تھا۔ وہ ہاں کہتی ہے۔ پھر سوال کرتی ہے تو

اس کی کیا خاطر تواضع کی تھی۔ پھر دوسری جواب دیتی ہے۔ چھج بھوں دا بجا منہ دا۔ گنوار لوگوں میں یہ دونوں الفت و پیار کی نشانیاں گنی جاتی ہیں۔

نہ ڈیوے نہ کھواوے۔ اجایا شاہ سڈواوے

یہ اس وق کسی شخص کی بابت استعمال ہوتا ہے جو عوام الناس کو بغیر کچھ کھلائے پلائے مفت کا نام حاصل کرے اور معتبر بنا پھرے اور اپنے آپ کو شاہ صاحب کہلوائے۔

آ گت تھولی تاں اجاپت بہوں

اس مثل کا نتیجہ یہ ہے کہ کم آمدنی اور زیادہ خرچ والوں کو انجام میں پشیمانی اٹھانی پڑتی ہے۔

اُبھریا چندر نال اُبھرن تارے، تھیسن راہی فجر دوست پیارے

اے دوست اس وقت چاند اور ستارے آسمان پر نمودار ہو گئے ہیں مگر صبح ہوتے ہیں سب یہاں سے گم ہو جاوینگے۔

آتن وچ سہیلیاں نت کھیڈن تے ہسن، میکوں باج تاؤں بار دے راتیں ڈیہاں تھئیں چین

اس جوانی کے زمانے میں تمام میری نوعمر ہمجولیاں کھیل کود میں مشغول ہیں لیکن اے جان عاشق مجھ دکھیاری کو بغیر تمہارے دن کو چین ہے نہ رات کو آرام

دن کٹا فریاد ے اور رات زاری سے کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا خواری سے کٹی

کسی اور استاد کا شعر ہے

نہ سیر باغ خوش آوے نہ بھاوے گل میرے جی کو
ملے جب تک نہ ہم سے دوستو وہ گلبدن اپنا

ڈیون دے نہ جائے چار قوم، مُلا، بھٹ، برہمن، ڈوم

دنیا میں چار قومیں کسی کو کچھ نہیں دیتی، یعنی مُلا، بھٹ، برہمن اور ڈوم سخاوت سے بالکل بے بہرہ ہیں۔

لونی پنڈ دا کیہاں سواد، آندراں دی ویری گامنا یار، ایہ تاں ڈنگراں دا کھاج

اے گامن دوست نمکین کھجور کا کوئی مزہ نہیں۔ بلکہ یہ تو پیٹ کے لیے بھی مضر ہے۔ اور دراصل یہ جانوروں کی خوراک ہے۔

گھر لکھ دا باہر ککھ دا

یہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی دولت مند شخص اپنی دولت کو چھپائے۔

میں پلپانی میڈا یار پٹولی، سمجھ نہ سگاں تیڈی مٹھی بولی

میں ذات کی جولاہی ہوں میرا دوست پٹولی ہے اس لیے میں اپنے پیارے کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوں۔

آ وو نجو سجنا گھر بار تساڈا، کھاؤ پیوا اپنا تواپتر وٹا اساڈا

دوستو ہمارا سب گھر بار آپ کی مرضی پر چھوڑا جاتا ہے لیکن کھانا وغیرہ آپ ہی پکاؤ اور آپ ہی کھاؤ۔

بھلا دلبر تساڈے عشق پھٹیاں سوائے تساڈے بدھیسن کو پٹیاں

اے میرے دل کو لبھانے والی صورت میں تمہارے عشق میں مرمٹا۔ اگر اب کوئی علاج کر سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ اور میری مرض کو پہچان کر ٹھیک دوا دے سکتے ہو۔ درد مندِ عشق زا دارد بجز دیدار نیست

صدقے کیتی تیڈی چھاں ساکوں کُتے کنوں چھڑا

ایک دفعہ ایک فقیر کسی عورت سے دودھ کی لسی کا سوال کر رہا تھا کہ خدا کے واسطے مجھے کچھ پلا دو اتفاق سے اسے کتا بھونکنے لگا وہ اب کہتا ہے میں تیری لسی کو چھوڑتا ہوں تو مجھے خدا کے واسطے کتے سے چھڑا۔

کرم دا لیکھا کون مٹاوے

قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ جو ہونا ہے وہ بہر صورت ہو کر رہتا ہے

چاک کے تقدیر کو ممکن نہیں کرنا رفو
سوزنِ تدبیر گر ساری عمر سیتی رہے

ہک وچھوڑا یار دا، ڈوجی رات کالی

ایک تو مجھے دوست کا فراق مارے جا رہا ہے دوسرا تاریک رات کا ہونا بھی ایک مصیبت سے کم نہیں جس شخص پر یہ دونوں مصیبتیں پڑیں اس کا بس خدا ہی حافظ ہے۔

بڈھا نہ مرے نہ منجا ڈیوے

یہ بوڑھے لوگوں کی بابت استعمال ہوتا ہے جو نو جوانوں کی آزادی کے لیے سدِ راہ ہوتے ہیں۔

آنمی سگدا اگا منا یار، میکوں سرکار دا سڈا

اے دوست میں تمہارے پاس نہیں آ سکتا کیونکہ مجھے سرکار کا بلاوا آ گیا ہے۔

ڈیوے دی چُت تلے اندھیرا

اردو میں محاورہ ہے چراغ تلے اندھیرا۔ اگرچہ تمام کمرے میں اُجالا کرتا ہے مگر جہاں پر لیمپ یا چراغ رکھا جاتا ہے وہاں ضرور تاریکی ہوتی ہے۔

بال دا چھوٹا پرناون گالن ہے

بچوں کی چھوٹی عمر میں شادی کر دینا ان کی زندگی کو تلخ اور برباد کر دیتا ہے۔ جس کی بچپن میں شادی ہو جاتی ہے اکثر جوانی میں یہ شعر ان کی زبان پر ہوتا ہے ان کی حسرت کا اظہار کرتا ہے

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر

ہمیں تو موت ہی آتی شباب کے بدلے

بھا چاون آئی چوکے دی سئین بن بیٹھی

یہ محاورہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کے مکان پر چند دن کے لیے آئے اور پھر مالک مکان بن بیٹھے۔ اور ناجائز فائدہ اٹھائے۔ اور جب کسی پر احسان کیا جاوے تو وہ اس کا بیجا فائدہ اٹھاوے۔

نانگ دا کھادا بچدے پر نظر دا کھادا نہیں بچدا

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو سانپ کاٹے تو وہ بچ جاتا ہے اگر کسی کو نظر لگے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ یعنی نظر بد سانپ سے بھی زیادہ مہلک ہے۔

آپ لڑھدی ویندی بناں کوں متاں ڈیندی

یہ ان لوگوں کی بابت بولا جاتا ہے جو خود تو راہ بد پر جاویں لیکن اَوروں کو راہ راست پر جانے کے لیے کہیں۔ دیگراں رانصیحت خودرا فضیحت۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں ہم مجسم ہی فضیحت کیوں نہ ہوں پھر بھی اوروں کو نصیحت چاہیے

گالیں دے گالیں تان ٹکے دے موٹھ

یہ محاورہ ان لوگوں کی بابت استعمال ہوتا ہے جو باتیں بہت کریں لیکن عملی طور پر ان سے کچھ نہ ہو۔

جایا پتر چندر بھان چولھے بھانہ منجے وان

نام بڑا اور درشن تھوڑے۔ مفلسی کا تو یہ حال ہے کہ گھر میں آگ اور چارپائی تک نہیں لیکن برخوردان کا نام چندر بھان رکھا جارہا ہے۔

گھر دا بہمن ڈاند برابر

گھر کی چیز کی انسان کو قدر نہیں ہوتی گھر کا بیل اور برہمن ایک جیسے سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان اپنی قدر چاہتا ہے تو وطن سے باہر نکلے۔

کھٹو آیا ڈردا، نکھٹو آیا لڑدا

جو لوگ کماتے ہیں وہ تو گھروں میں عموماً شانت ہو کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن جو اَوروں کے محتاج ہوتے ہیں وہ ہر وقت گھر میں فساد لڑائی مچاتے رہتے ہیں۔ یہ محاورہ عموماً گھروں میں استعمال ہوتا ہے۔

(ضرب الامثال ملتان - مسٹر بالکشن ابر بی۔ اے و دیوان آتم آنند صاحب شرر)



سیّدہ شہناز نقوی

یادوں کے جھروکوں سے جھانکتا ماضی کا ملتان

زندگی کا ایک حصہ ایسا بھی ہوتا ہے جہاں چاروں طرف گہما گہمی ہونے کے باوجود خاموشی ہی محسوس ہوتی ہے اور اس معصوم عمر اور بہت بچپن مین بچہ کبھی خاموشی میں باتیں کرتا ہوا اور کبھی باتوں میں خاموشی محسوس کرتا ہے۔

آج جب میں سوچتے سوچتے عمر کے اسی حصے کی جانب گئی تو حیرت انگیز انکشاف ہونے لگے کہ میں اس وقت بمشکل تین سال کی ہونگی جب جملے بھی بولنے میں مشکل ہوتی تھی مگر شاید شعور کا احساس زیادہ تھا میں وہ لمحے وہ یادیں وہ خوشبوئیں اب بھی اسی طرح تازہ محسوس کرتی ہوں۔

ایک جملہ ادا کئے بغیر اتنے کام کر لیتی تھی کینٹ کی آبادی کم تھی ہر محلے کے لوگ ایک دوسرے کے روزمرہ سے آشنا ہوتے تھے ایک دوسرے کے دکھ درد سے واقف رہتے میرے والدین دادا، دادی کے ساتھ صدر بازار کے پاس احاطہ جگن ناتھ میں رہتے تھے۔

یہاں کا نظم وضبط مثالی تھا اسی لیے یہاں صدر بازار جسے اب ہم لوگ کینٹ کہتے ہیں یہاں پر کئی محلے آباد تھے جن میں ایک نمایاں نام جو بابو محلے کہلاتا تھا جسے اب چکی والی گلی کہتے ہیں سے شروع ہو کر پیچھے تک جاتا ہے یہاں پر تمام گھر ڈبل سٹوری تھے اور اب بھی ہیں خاص طور پر یہاں ''شیروں والا گھر'' قابل توجہ تھا آج بھی یہ بابو محلہ موجود ہے مگر عمارتوں کی وہ شان وشوکت جو پہلے تھی اب نہیں نظر آتی۔ شاید مکینوں کی توجہ اب گھر کی ظاہری غور پر کم ہوگئی ہے یہاں گھروں کی بالکونیاں اور لکڑی کی بنی کھڑکیاں جن پر انتہائی نفیس طریقے سے کٹائی کر کے نقش ونگار بنے ہوئے ہیں بہت خوبصورت لگتے ہیں پاکستان بننے سے پہلے یہاں ہندو بابو یعنی کلرک لوگ رہتے تھے۔

یہاں ایک اور احاطہ جگن ناتھ بھی اپنی خاص وجوہات کی بنا پر ایک منفرد پہچان رکھتا تھا اس احاطے میں ہندوؤں کا تاجر طبقہ رہتا تھا یہاں پر بھی زیادہ تر ڈبل سٹوری گھر ہیں دو یا تین مرلے کے مکانوں میں بنے یہ گھر بھی اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں۔

اس احاطے کے پیچھے یعنی چوڑی والی گلی کے رائٹ سائیڈ پر لال کرتی کا علاقہ تھا جہاں اب نان کلچہ اور رنگ ساز وغیرہ کی دکانیں ہیں بزرگوں سے یہی سنا ہے کہ یہاں پر پہلے ہندو چوکیدار، چپڑاسی رہائش پذیر تھے ان

لوگوں کو جو یونیفارم سرکاری طور پر ملتا وہ لال کرتا اور سفید شلوار ہوتی تھی اور یہ لوگ وہی لال کرتا ہی سارا دن پہنے رکھتے اور یہی لال کرتا اس علاقے کی پہچان بن گیا یہاں کے مکینوں کا آپس میں پیار اور لحاظ مثالی تھی۔

یہاں کا صدر بازار جو محبوب بیکری سے شروع ہوتا ہے اور سیدھا بامن جی چوک تک اختتام پذیر ہوتا ہے یہ واحد بازار پورے ملتان میں کھلا بازار محسوس ہوتا۔

میں جب بھی کینٹ کے چرچ کے آگے سے دادا جان کے ساتھ گزرتی تو سوچتی کہ ہم لوگ ادھر کیوں نہیں جاتے اس چرچ کا گیٹ اور وہاں پر لگے درخت، خاموش ماحول اور چرچ کی چھت اور صلیب کا نشان مجھے بہت متاثر کرتا اس کم سنی کی عمر میں بول تو سکتی نہیں تھی مگر دل میں سوال ہمیشہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر ہم سب لوگ کینٹ کے ہر کونے میں جاتے ہیں یہاں کبھی کیوں نہیں جاتے ان دنوں تمام لوگوں کو صبح کو جلد اٹھنے کی عادت تھی کیونکہ فجر کی نماز اور پھر قرآن شریف کی تلاوت زندگی کا لازمی جزو تھا جب اب بہت کم رہ گیا ہے تو ہر صبح دادی جان ہمیں ایک دو سکے دے کر ''شاہ جی'' کے بک سٹال پر بھیج دیتیں جو تھانے سے پہلے چوک پر تھا وہ ہمیں دیکھ کر ایک اخبار پکڑا دیتے ہیں اور میرا بھائی یہ پانچ منٹ کا کام تقریباً پندرہ منٹ میں کرتے کیونکہ راستے میں دکانوں پر لگے بورڈ ان پر بنی تصویریں دیکھتے ہوئے خراماں خراماں چلتے جاتے اور بک سٹال پر رسالوں پر بنی رنگین تصویریں دیکھتے رہتے وہاں سے واپس آتے تو پھر دادی جان زین کے کپڑے کے چھوٹے چھوٹے سفید رنگ کے تھیلے اور سلور کے ڈھکن والے چھوٹے دو ڈبے پکڑا دیتیں اور ہم سیدھے حاجی صاحب جو حلوہ پوری بناتے تھے وہاں جا کر رش میں کھڑے ہو جاتے۔

انہیں جا کر سکے پکڑا دیتے اور وہ سب سے پہلے ہمیں حلوہ پوری اور چنے ڈبوں میں ڈال کر دیتے اور تاکید کرتے کہ بچو سیدھے گھر جانا حاجی صاحب پوری بنانے کے تمام مراحل کو ہم حیران ہو کر دیکھتے رہتے اور بہت لطف اندوز ہوتے وہ پیڑا اٹھاتے اور ایک سیکنڈ میں اسے پھیلا پھیلا کر کڑاہے میں ڈالتے جاتے بس تھپ تھپ کی آواز آتی اور پوریوں کے ڈھیر لگاتے جاتے۔ سرخ و سفید شکل وصورت کے زندہ دل حاجی شریف صاحب سفید کرتے اور چیک دار تہمند پہنتے اور ساتھ ساتھ ہر گاہک سے خوش کلامی کرتے نظر آتے۔ اسی عمر میں جب کبھی بیمار ہو جاتے تو سیدھے اپنے احاطے کی گلی کے ساتھ ڈاکٹر اعظم انکل کا کلینک تھا (جہاں اب ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان ہے)

کبھی کبھار اپنے والد کے ساتھ قریب ہی راشن ڈپو بھی جاتی وہاں ان کا ہاتھ پکڑے کھڑی رہتی آٹا اور چینی ان دنوں کھلی بازار میں نہیں ملتی تھی صرف اور صرف یہ چیزیں راشن کارڈ جس پر گھر کے افراد کی تعداد درج ہوتی تھی اتنا ہی مہینے کا راشن لینے کی اجازت ہوتی ہر طرف سے لوگ ابو سے دعا سلام لینے لگتے کوئی کہتا آؤ وکیل صاحب، کوئی شاہ صاحب کہتا۔ میرے والد کینٹ کے شاید ان چند پہلے وکیلوں میں سے تھے جن کے پاس کینٹ کے گھروں اور دکانوں کے مقدمات اور گھریلو جھگڑوں کے مقدمات ہوتے تھے اسی لیے وہ ہر شام دلمیر پیڑا ہاؤس (پرانی دکان) کے ساتھ اوپر ایک آفس میں پریکٹس کرتے تھے 1965ء سے 1982ء تک وہ یہاں پریکٹس کرتے رہے۔ بچپن میں اکثر میں بھی ان کے ساتھ آفس میں بیٹھی رہتی اور آفس جاتے آتے دلمیر کی دکان سے پیڑوں والی لسی ایک بڑے سے سلور

ے کا اس میں ضرور پہنچتی ڈمپر پیڑا ہاؤس بھی صدر کی مشہور دکانوں میں سے ایک دکان ہے۔ آج بھی لوگ یہاں کے پیڑے اور برفی پاکستان کے دوسرے شہروں میں گفٹ کے طور پر لے کر جاتے ہیں اور جب بھی ابو دلیپ پان ہاؤس جو کہ اس وقت محبوب بیکری کے سامنے پرنس کلاتھ ہاؤس کے باہر چھوٹی سی دکان ہوتی وہاں جاتے تو میں وہاں سے میٹھا پان ضرور لیتی وہ انکل بھی دلیپ کمار اور کبھی وحید مراد کے بالوں کا سٹائل بناتے میرے والد نے ان کی دکان کا مقدمہ بیس یا پچیس سال لڑا آخر ان کو وہاں سے اپنی پان کی روایتی اور مشہور دکان کو گجر کھڈہ شفٹ کرنا پڑا۔

وقت گزرتا گیا اس پرانے کینٹ میں تبدیلیاں آنے لگیں جو پہلے فوجی گراؤنڈ ہوتا تھا جہاں پر فوجی ایکسر سائز وغیرہ کرتے اور محرم میں وہاں رات کو مجلس ہوا کرتی تھی دیکھتے دیکھتے وہاں پر شاپنگ سنٹر بن گئے جہاں پر ملتان کی مشہور دکانیں ایک نئے انداز سے اہل ملتان کے لیے ایک تحفہ ثابت ہوئیں جن میں کارواں بک سنٹر، بک لینڈ اور جیولرز کی دکانیں شامل ہیں وہ قائم ہوئیں۔ اسی لائن میں میمن برادری کے نہایت خوبصورت گھر بھی تھے ان مکینوں کا کلچر ہمیں اپنے کلچر سے تھوڑا مختلف محسوس ہوتا ان کے بات چیت اور لب ولہجہ اور خواتین کے پردے یعنی برقعے کا انداز مختلف ہوتا جو ہمیں متاثر کرتا۔

یہاں پر نئے نئے شاپنگ سنٹر بننے کے بعد ملتان والوں کے رہن سہن اور روزمرہ میں ایک ماڈرن انداز آنے لگی نئی نئی کتابیں، نئی پیکنگ کے انداز، بچوں کے لیے کارٹون کی کتابیں، انگریزی لٹریچر اور اردو لٹریچر کی پرانی اور نئی کتابیں اور جدید عید کارڈ اور وش کارڈز کی آمد نے ایک ہلچل مچا دی ان دنوں ان دکانوں پر کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ہوتی تھی نوجوان طالب علم لڑکے لڑکیاں اور پروفیسرز کا رش رہتا میں نے شیخ سعدی کی دو کتابیں پانچ پانچ روپے کی پہلی مرتبہ یہیں سے خریدیں تھیں اسی طرح محبوب بیکرز نے روایتی بسکٹوں اور کیک وغیرہ کی روایت کو توڑا فریش کریم کیک اور کون آئس کریم کا رواج شروع ہوا اور شام کے وقت تمام شوقین خواتین و حضرات بمعہ فیملیز اس دکان پر کھڑے نظر آتے جدید ہوٹل اور دیگر ضروریات زندگی کی ماڈرن چیزوں کا یہ علاقہ ایک مرکز اور پہچان بن گیا بقول شاعر

کھو گئے ناز جلا کر ہمیں یادوں کے دیئے
کس طرح کھوئے ہوئے وقت کے آثار ملے

خاص طور پر کپڑے سلوانے کے لیے خواتین کا چوڑی گلی اور لاہور ٹیلر ہاؤس پر رش بہت بڑھتا گیا ڈوپٹوں کی رنگائی اور کڑھائی کا بھی یہ گلی مرکز بن گئی اور آج بھی اس کی رونق اسی طرح ہے آج بھی خاص طور پر چاند رات کو صدر چھاؤنی کی چوڑی گلی کی رونق مزید دوبالا ہو جاتی ہے جو ملتان والوں کے لیے ایک تہوار اور یادگار لمحوں میں بدل جاتی ہے تمام بچھڑے دوست یہاں اس رات مل جاتے وہ یادگار لمحے تو واپس نہیں آ سکتے مگر یادوں میں اس کتاب کے ورق ضرور چھانے جا سکتے ہیں۔

میری یادوں میں شیخ صاحب کی کپڑوں کی دکان جو اس وقت بھی ماڈرن تھی یاد ہے اور غازی سپورٹس کی

واحد دکان جہاں سے اہل ملتان کھیلوں کا سامان خریدتے تھے یہ دکان بھی اس وقت ماڈرن تھی کیونکہ کھیلوں کی ان ڈور گیمز اور آؤٹ ڈور گیمز اس وقت بھی یہیں سے مل جاتی تھی اس دکان کے سبز آنکھوں والے انکل مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہیں جو مجھے ہر بوار پر جب میں ابو کے ساتھ ان کی دکان میں جاتی تو ضرور مجھے میری پسند کا گفٹ دیتے۔

صدر بازار میں صبح صبح ہر دکان میں ریڈیو پر قوالیاں سنائی دیتیں خاص طور پر وہ قوالی ''بھر دے جھولی میری یا محمدؐ'' اور جوں جوں دن چڑھتا پھر نور جہاں اور مسعود رانا کے گانے سننے کو ملتے جو رات گئے تک ایک سماں باندھ دیتے گانوں میں زیادہ تر وہ گانا ''چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دے'' اور ''میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا'' بہت زیادہ آن ائر ہوتے ہمیں گانوں کے بول تو اس وقت سمجھ نہیں آتے تھے مگر گلوکار کے احساسات اور جذبات کو اور آواز کے اتار چڑھاؤ کو سن کر میں بھی خوشی یا اداسی کا موڈ بنا لیتی یہ سلسلہ تقریباً بارہ سال جاری رہا گلگشت سے روزانہ صدر چھاؤنی آتے جاتے راستوں کو دیکھتے رہتے جب ایک کھلا میدان ایک بلڈنگ میں تبدیل ہو گیا پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ ریڈیو سٹیشن کی بلڈنگ ہے اور پھر ہم بھی وہاں بچوں کے پروگرام میں شامل ہوتے ہوتے کالج کی طرف سے یونیورسٹی میگزین کے پروگرامز تک شامل رہے پہلی مرتبہ جب اس بلڈنگ میں گئی تو والد صاحب نے ایک سفید بالوں والے بزرگ سے ملوایا شاید ان کا نام وقار عظیم تھا جو ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر ہوں گے۔

جب تک میں دادی جان کے ساتھ کینٹ میں رہی تو ایک خاص روایت جس میں ہر چیز کو سلیقے سے رکھنا برتنا اور تحمل کے ساتھ کام وقت پر صفائی کے ساتھ کرنا معمول تھا مگر پھر زندگی میں یہ بات دیکھنے کو کم کم نظر آئی۔ یہاں کی گزری ہر شام مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے جب ہم سب بچے اس کھلے احاطے میں کھیلتے اور مغرب کے فوری بعد ایک آواز جس کے ہم روزانہ منتظر ہوتے وہ اس بابا جی کی ہوتی جو سائیکل پر چنا چنا جور گرم بابو میں لایا مزیدار جور گرم کی آوازیں لگاتے اس آواز کو سن کر ہم سڑک کنارے کھڑے ہو کر کاغذ کی کون میں گرم گرم چنے لیتے چند سالوں بعد نجانے کیوں وہ بابا جی آنا چھوڑ گئے اور ہم بچے بہت اداس ہوتے اس وقت یہ بابا جی صدر چھاؤنی کی ہر گلی سڑک پر سے ضرور گزرتے لن کی آواز سے ہم بچپن سے ہی اتنے مانوس ہو چکے تھے کہ پھر ان کا نہ آنا ہمارے لیے بہت اداسی کا باعث تھا۔

چھٹی کے دن صبح کے وقت ادھر اُدھر سے یعنی دوسرے محلوں سے بڑے لڑکے کرکٹ کھیلنے ہمارے احاطے میں آجاتے اور ہم چھوٹے بچے بچیاں اپنے اپنے والد کے ساتھ کمپنی باغ چلے جاتے اور وہاں خوب بھاگتے کھیلتے بڑے ایک طرف بیٹھے باتیں کرتے رہتے ایک درخت پر میرے والد نے اپنا نام حیدر رضا نقوی درخت کی چھال پر نقش کیا ہوا تھا H.R.N لکھا ہوا تھا جو انہوں نے مجھے دکھایا اور بتایا کہ جب وہ سکول کے دنوں میں کمپنی باغ پڑھنے آتے تھے تو اس وقت انہوں نے لکھا تھا اس بات کو اس وقت گزرے بیس سال ہو چکے تھے کمپنی باغ سے واپسی پر کبھی دیر ہو جاتی تو راستے میں تھانے کے پاس ایک چائے کا ہوٹل تھا شاید وہ اب بھی ہے وہاں پر کافی مجمع لگا ہوتا دیکھتے اب معلوم ہوا کہ وہ معروف شاعر حزیں صدیقی صاحب کی بیٹھک ہوتی تھی جہاں علمی و ادبی گفتگو کی جاتی تھی اسی

چوک سے نئے نئے ڈیزائن کے رنگ برنگے غبارے بھی خریدتے۔

ڈاکٹر محمد حسین کی دکان بھی آج تک اسی پرانے ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس شخص نے آج بھی ماضی کے صدر کے مکانوں کا نقشہ اور وہاں کے مکینوں کی روایت اور اخلاق دیکھنا ہو تو وہ ڈاکٹر محمد حسین کی دکان دیکھ کر اور ان سے مل کر اندازہ لگا سکتے ہیں وہ جالی کے دروازے وہ روشندان وہ دیواروں پر بنی کھڑکیاں اور دیواروں کے اندر چھوٹی چھوٹی راہداریاں جہاں پر فالتو سامان رکھ دیا جاتا تھا موجود ہیں دروازوں کی کنڈیاں جو نیچے سے اوپر کی جانب دروازے اور چوکھٹ کے درمیان لگائی جاتی تھیں اس دکان پر آج بھی ویسے ہی دکھائی دیتی ہیں۔

انہی دنوں محبوب بیکری کے سامنے ہی موسیقی کے شوقین حضرات کے لیے گیت سنگیت کی ماڈرن دکان بھی نظر آنے لگی جہاں سے ماضی اور حال کے تمام گانے (Cassettes) کیسٹوں پر میسر تھے میرے والد تقریباً روزانہ ہی یہاں سے ایک دو کیسٹیں ضرور خریدتے اور پھر ان کا نمبر لگا کر TDK کے مضبوط گتے کے ڈبوں میں احتیاط سے رکھ لیتے یہ بات شاید 1978ء کے دور کی ہے۔ ملتان صدر آرمی کا علاقہ ہونے کی وجہ سے اہم تو تھا ہی مگر صدر بازار اور اس کے اردگرد کی نئی مارکیٹوں نے اس کی اہمیت میں بہت اضافہ کردیا یہاں کا نظم وضبط اپنی مثال آپ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ رہن سہن بدلتا گیا کلچر بدل گیا مادی ترقی نے ہر انسان کے شب و روز کو متاثر کیا۔

ظاہری اور باطنی طور پر انسان ترقی کے نام پر فطرت سے دور ہونے لگا دن رات صبح و شام کی مصروفیات بدل گئیں مگر سب کچھ بدلنے کے باوجود شام کی اداسی اور خاموشی نے اپنا عفریت قائم رکھا اتنے سال گزرنے کے بعد میں جب بھی صدر بازار شاپنگ کے لیے جاتی ہوں تو اس احاطے اس نیم کے گھنے درخت کو جا کر ضرور دیکھتی ہوں یہ وہی نیم کا درخت تھا جس کے نیچے میں اکثر جا کر بیٹھ جاتی اور وہاں شام کے بعد چڑیوں کے شور کو سن کر ہمیشہ پریشان رہتی کہ آخر یہ چڑیاں اتنا شور کیوں کرتی ہیں کیا یہ بھوکی ہیں یا پیاسی ہیں ان کے آشیانے پر کسی نے قبضہ کرلیا ہے میں ان کے اس شور سے پریشان ہو کر سوچتی کہ آخر اس شور کی دنیا میں ان کی معصوم آوازوں کو کوئی سنتا کیوں نہیں ہے یہ یادیں ہر دم میرے ذہن میں تازہ رہتیں کہ جب میں بازار میں بے جوڑ شادی شدہ جوڑوں کو دیکھتی تو میرا معصوم دل کرتا کہ میں فلاں کا ہاتھ فلاں کے ساتھ کردوں میری اس بات کو سن کر سب لوگ بہت انجوائے کرتے تھے بقول شاعر:

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

(روزنامہ پاکستان ملتان- سیدہ شہناز نقوی)



ظہور دھریجہ

قدیم تہذیبی و ثقافتی مرکز

تاریخی اعتبار سے ملتان ایک ذات نہیں ایک کائنات کا نام ہے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ ملتان کائنات کے اُن چند خاص شہروں میں سے ایک ہے جو ہزار ہا سالوں سے مسلسل آباد چلے آ رہے ہیں۔ ماہرین کا اس بات پر بھی کامل اتفاق ہے کہ تاریخ عالم میں ملتان صرف ایک شہر کے طور پر نہیں بلکہ ایک تہذیب ایک معاشرت اور ایک سلطنت کے طور پر کرہ ارض پر موجود رہا۔ 373ھ کی ایک تصنیف ''حدود العالم بن الشرق الی الغرب'' میں سلطنت ملتان کے بارے لکھا گیا ہے کہ ملتان کی سرحدیں جالندھر پر ختم ہوتی ہیں۔ ایک اور کتاب ''سیر المتاخرین'' میں لکھا ہے کہ یہ خطہ بہت زیادہ زرخیز ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع و عریض بھی ہے، ایک طرف ٹھٹھہ، دوسری طرف فیروز پور، جیسلمیر اور کیچ مکران تک کے علاقے اس میں شامل ہیں۔ ابوالفضل کی مشہور کتاب ''آئین اکبری'' میں درج ہے کہ ملتان بہت بڑی اقلیم ہے اس میں تین سرکار ملتان خاص، دیپال پور اور بھکر شامل ہیں۔ کتاب میں لکھا ہے کہ قدیم ہونے کے ساتھ ملتان کی تہذیب و ثقافت بہت مضبوط ہے۔ یہ علاقہ بہت بڑا تجارتی اور ثقافتی مرکز بھی ہے۔ تغیرات زمانہ اور ہزاروں برسوں سے حملہ آوروں مسلسل کی ریشہ دوانیوں کے باوجود اس خطے نے اپنی منفرد تہذیبی شناخت کو قائم اور زندہ رکھے ہوا ہے۔ یہ بھی وقت اور حالات کی ستم ظریفی ہے کہ آج ملتان کو جنوبی پنجاب کی غلط ترکیب پر پکارا جا رہا ہے اور بے شناخت لولہا لنگڑا صوبہ بنانے کے دلاسے دیئے جا رہے ہیں۔ کل ملتان کیا تھا؟ اور اس کے مقابلے میں لاہور کی کیا حیثیت تھی؟ اس کا تذکرہ حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ کی کتاب ''کشف المحجوب'' ''لاہور یکے از مضافاتِ ملتان است'' کی صورت میں موجود ہے۔ (2 جون 1818ء) سلطنت ملتان پر رنجیت سنگھ کے قبضے کے بعد سب کچھ لوٹ کر لاہور لے جایا گیا تو آج لاہور لاہور ہے اور ملتان کو لاہور والے ایک ''پنڈ'' یعنی گاؤں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ!

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے

کچھ عرصہ پہلے کراچی سے ایک تحقیقی کتاب موسوم بہ Paradise Gods شائع ہوئی۔ اس میں اس خطے بارے لکھا گیا کہ وادی مہران (مرکز ملتان) ایسا خطہ ہے جہاں انسان نے پہلی مرتبہ اپنے دو پاؤں پر کھڑا ہونا اور چلنا شروع کیا۔ جہاں تہذیب ایجاد ہوئی اور انسان کو مہذب بنانے کے عمل کا آغاز ہوا۔ اس علاقے میں سب سے پہلے فنِ تحریر ایجاد ہوا۔ خشت سازی اور پختہ عمارتیں تعمیر کرنے کے کام سب سے پہلے یہاں شروع ہوا۔ کتاب میں مزید لکھا گیا کہ اس علاقے نے پوری کائنات میں سوتی کپڑا سب سے پہلے متعارف کرایا۔ وزن اور پیمائش کے ایسے پیمانے یہاں ایجاد ہوئے کہ بال برابر بھی فرق نہ ہوا۔ نہریں کھود کر زمین سیراب کرنے اور بحری تجارتی کے عمل کا آغاز اس خطے سے شروع ہوا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سرائیکی خطہ اور اس کا مرکزی شہر ملتان آج سے نہیں بلکہ ہزار ہا سالوں سے تہذیبی، ثقافتی اور روحانی مرکز کے طور پر قوموں اور تہذیبوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ان علاقے نے جتنے سائنسدان، ہنرمند اور عالم فاضل پیدا کیے شاید ہی کسی خطے نے پیدا کیے ہوں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اس علاقے میں پناہ حاصل کرنے والے کچھ دوست اس علاقے کی عظمت سے انکار کر رہے ہیں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ملتان سرائیکی خطے کا بڑا تہذیبی مرکز ہے۔ یہاں سینکڑوں مقامات ایسے ہیں جہاں تحقیق کرنے کی ضرورت ہے مگر ریسرچ کیلئے ایسے جذبے کی ضرورت ہے جیسا کہ حکمرانوں کے دل میں لاہور کیلئے ہے اور اتنے سرمائے کی ضرورت ہے جتنا کہ کم از کم لاہور کے شاہی قلعے پر خرچ ہوتا ہے۔ ملتان کا تاریخی قلعہ تہذیبی اور ثقافتی اثاثہ ہے اسے بچانے اور محفوظ کرنے کا کام کون کرے گا؟۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر جنوبی ایشیاء کا بہت بڑا روحانی مرکز بھی ہے۔ یہاں غوث العالمین حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی، شاہ رکن عالمؒ، شاہ صدر الدین، والئی ملتان نواب مظفر خان شہید کے مزارات ہیں ملتان کو مدینۃ الاولیا کہا جاتا ہے۔ لیکن زائرین کو کسی طرح بھی کوئی سہولت میسر نہیں۔ یہاں داتا دربار لاہور کی سہولتوں کے برعکس کوئی میوزیم، کانفرنس ہال، مدرسہ، لائبریری اور مسافر خانہ نہیں۔ اور تو اور زائرین کیلئے پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں۔ اس طرف توجہ دینے کی خاص ضرورت ہے۔

قلعے پر موجود ہزاروں سال پرانی عبادت گاہ پرہلاد مندر کو گرا کر یہاں کی تاریخ کو مسمار کرنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ پرہلاد ہمارے مذہب اسلام کے آنے سے پہلے توحید پرست تھا لہٰذا پرہلاد مندر کو ایسے ہی جذبے سے بحال کرنے کی ضرورت ہے جیسے میاں نواز شریف کے گزشتہ دور حکومت میں سکھوں کے گردواروں کی بحالی کے لیے چار کروڑ روپے کی گرانٹ مہیا کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی قلعے پر ناجائز تجاوزات ایس ٹی این، پولیس کاؤنٹر اور فون ٹاور وغیرہ کو گرا کر اس کی اصل حیثیت بحال کرنا چاہیئے تاکہ حضرت زکریاؒ سئیں کی روح قبر سے خوش ہو کر یہ کہہ سکے:

ملتان ماء بجنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پابنہ کہ ملک سجدہ می کنند

ملتان کی تاریخ، ثقافت اور آثار قدیمہ کو محفوظ کرنے کیلئے میوزیم اور ریسرچ سنٹر قائم کرنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ بہتر ہوگا کہ حکومت اس سلسلے میں معقول گرانٹ مہیا کرے، ایسا نہ ہو کہ پیارے وطن پاکستان کے ایک اہم حصے کی تاریخی میراث مٹ جائے اور باہر سے آنے والے سیاح یا پھر ہماری آنے والی نسلیں ہم سے اس خطے کا تاریخی اور جغرافیائی شجرہ طلب کریں تو ہمارے پاس کچھ نہ ہو اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔

کسی بھی خطے کی ساجی عظمت و تہذیبی قدامت کی گواہی کہاوتوں اور ''اکھاݨ'' سے حاصل ہوتی ہے۔ نومبر 1992ء میں ہم پہلی عالمی سرائیکی کانفرنس میں شرکت کیلئے دہلی گئے تو ہمیں ملتان سے ہجرت کر جانیوالے بہت لوگ ملے، ان میں سے ایک عمر رسیدہ شخص نے سرائیکی میں ایک ''اکھاݨ'' سنائی کہ ملتان کے بارے ہمارے بزرگ صدیوں سے یہ بتاتے آئے ہیں کہ ''جنیں نہ ڈٹھا ملتان او ہندو نہ مسلمان'' میں سمجھتا ہوں کہ ملتان کی عظمت بارے لاہور کی پنجابی کہاوت ''جنے لہور نی ویکھیا او جمیا نی'' کے مقابلے میں ملتان کے بارے سرائیکی کہاوت ''جنیں نہ ڈٹھا ملتان، او ہندو نہ مسلمان'' زیادہ مضبوط اور طاقتور ہونے کے ساتھ زیادہ فصیح و بلیغ بھی ہے۔

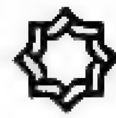
دوسرا واقعہ بھی اسی طرح ہے کہ آگرہ میں ہم تاج محل دیکھ رہے تھے پروفیسر شوکت مغل بھی ساتھ تھے اور ہمارے سرائیکی میزبان نے بتایا کہ آگرہ کی تعمیر میں ملتان کے ہنر مندوں اور کاریگروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے، انہوں نے پروفیسر شوکت مغل کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ نے سرائیکی اکھاݨ پر کام کیا ہے ایک ہندی کہاوت ایسی ہے جس سے ملتان کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے، کیا آپ اس کہاوت بارے جانتے ہیں؟ پروفیسر نفی میں جواب دیا اس پر سرائیکی میزبان بتایا کہ کہاوت یہ ہے کہ

''آگرہ اگر، دلی مگر، ملتان سب کا پدر''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہنر مندی اور کاریگری میں آگرہ کے کاریگروں کا بھی نام ہے، دہلی والے بھی کسی سے کم نہیں مگر ملتان سب کا باپ ہے۔ یہ ہے ملتان کی تہذیبی، ثقافتی اور ساجی عظمت۔ حملہ آوروں نے ملتان اور سرائیکی وسیب کو مار مار کر بے شناخت کیا آج ملتان اور سرائیکی وسیب کے شناخت کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ صدیوں تک جگ جہان نے ہمیں اور ہمارے خطے کو دیکھا، آج ہمیں اُن کو دیکھنے کی ضرورت ہے اور اپنے وسیب کا چہرہ اور اپنی تہذیبی شناخت درست کرنے کی ضرورت ہے۔

سیاسی اعتبار سے ملتان کی اہمیت ہزار ہا سالوں سے مسلمہ رہی، پوری وادی سندھ سرائیکی خطے کا نام ہے۔ تاریخی کتب میں سرائیکی خطے کو ''سپت سندھو'' (سات دریاؤں کی سرزمین) کا نام دیا گیا۔ سندھو یا

سندھ کا مطلب دریا اور پانی ہوتا ہے، دریائے سندھ کا نام صرف سرائیکی وسیب میں سندھ ہے جبکہ آج کے صوبہ سندھ میں اسے مہران کہا جاتا ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آج ہمارے سندھی بھائیوں کو ہم سے الگ شناخت اور صوبہ ملا ہے تو وہ سرائیکی کی قدامت اور عظمت کا انکار نہ کریں میں تاریخی طور پر عرض کر رہا ہوں کہ سندھ صوبہ اور اس کا دارالحکومت ''اروڑ'' بہت بعد کی بات ہے پہلے آج کا پورا سندھ مکران، کشمیر اور راجھستان تک کے علاقے سلطنت ملتان کا حصہ تھے اور ملتان سب کا دارالحکومت تھا۔ ابھی کل کی بات ہے مغلیہ عہد میں یہ بات زبان زد عام رہی کہ'' دلی کا تخت اس کا جس کا ''ملتان مضبوط'' ملتان ہی وہ خطہ ہے جس کی تہذیبی ثقافتی اور سیاسی اہمیت بہت اہم ہے۔ آج اگر کوئی ہمارے ملتان یا سرائیکی وسیب کی تاریخی اہمیت سے انکار کرتا ہے تو گویا یہ بات تاریخ سے ناواقفیت کے ساتھ ہمارے جذبات سے کھیلنے کے مترادف ہے۔



انور جٹ

گائیکی اور لے کاری

موسیقی کی دنیا میں لے ایک بنیادی حصہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کائنات میں ہر چیز کی طرف غور سے دیکھیں اور توجہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ہر ذی روح میں لے موجود ہے۔ ان میں سے ایک طبقہ ایسا ہے جو لے پر قائم نہیں وہ ہیں حیوان۔ رہا انسان تو یہ بنیادی طور پر لے کی ارتقائی منزلیں طے کرتا چلا آرہا ہے اور کرتا رہے گا۔ چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان میں تین قسم کی لے ہر وقت قائم رہتی ہے چال، نبض، دل کی دھڑکن اگر ان تینوں میں سے ایک قسم کی لے میں بھی فرق آجائے تو اس آدمی کے متعلق دوسرے لوگوں کی سوچ مختلف ہونے لگتی ہے۔ لے کا عطیہ اللہ تعالیٰ نے صرف انسان ہی کو عطا کیا ہے۔

ملتان ایک تاریخی اور ثقافتی شہر ہے یہاں فن لے کاری نے جو مقام حاصل کیا اور جن جن شخصیتوں نے اس فن کو عوام سے روشناس کرایا۔ اگر ان شخصیات کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ہماری کم علمی، بے حسی اور بے انصافی کی دلیل ہوگی۔ ملتان کی سرزمین لے کاری اور سُر سَواد کے خزانے سے ہمیشہ مالا مال رہی ہے۔ اس علاقے میں آج سے چار صدی پیشتر استاد کوڑے خان اول اور ان کے بھائی پیارے خاں جو کہ اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ بحیثیت نقیب دہلی سے ملتان تشریف لائے یہ لوگ اس صدی کے شاہی منظور نظر تھے۔ ملتان میں آمد کے بعد استاد کوڑے خاں اول اور استاد پیارے خاں کا اس فن میں انداز ایک دوسرے سے جداگانہ رہا۔

خان صاحب پیارے خاں کی اولاد میں ان کے فرزند اللہ وسایا خاں اور بخشائے خاں شہنائی نوازی میں منفرد تھے۔۔۔۔ اور خاں صاحب کوڑے خاں اول کے فرزند لال خاں اور پوتے میاں اللہ ڈوایا خاں نقارچی۔ میاں حسن بخش ستار نواز۔ میاں الٰہی بخش شہنائی نواز اور میاں رحیم بخش عرف بھیموں خاں نقارچی اور نچاوجی اپنے فن میں مثال نہیں رکھتے تھے۔۔۔۔ میاں بھیموں خاں کے فرزند استاد کوڑے خاں ثانی جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، نے اپنے والد سے نقارے کے ذریعے لے کاری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ استاد بھیموں خاں نے اس فن کی تعلیم اپنے بھائی میاں اللہ ڈوایا خاں سے حاصل کی تھی۔ اور میاں اللہ ڈوایا خاں نے یہ تعلیم بڑی خوش اسلوبی سے اپنے بیٹے میاں غلام محمد کو بھی دی۔

استاد کوڑے خاں ثانی ۱۹۴۰ء میں لے کاری کے فن کو مزید چار چاند لگانے کے لئے گھر والوں کو اطلاع

کئے بغیر دہلی روانہ ہوئے اور اپنے تایا ابا میاں اللہ ڈوایا خاں کے شاگرد میاں عاشق حسین ہاشمی جو کہ نامور گائیک خاں صاحب تو کل حسین خاں کے چھوٹے بھائی تھے، کے پاس دہلی میں جا کر ٹھہرے اور خواہش ظاہر کی کہ مجھے لال قلعہ دہلی والے خاں صاحب استاد میاں نتھو خاں کا شاگرد کرائیں ۔۔۔۔۔ ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ استاد کوڑے خاں ثانی کے والد محترم استاد بھیموں خاں اپنے اکلوتے بیٹے کی تلاش میں دہلی پہنچ گئے اور بیٹے کو کوسا کہ تو اتنے بڑے لے کار گھرانے کا چشم و چراغ ہوتے ہوئے دہلی والوں کا شاگرد ہونے آیا ہے۔ اس پر میاں عاشق ہاشمی نے عرض کیا کہ اگر چہ آپ لے کے عالم ہیں لیکن آپ کا بچہ لے نہیں بلکہ طبلہ سیکھنے آیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کوڑے خاں ثانی کو یہ شوق پورا کرنے کی اجازت دے دی۔ چونکہ اس وقت استاد نتھو خاں صاحب موجود نہ تھے۔ ان کے جانشیں استاد گامی خاں دہلی میں موجود تھے استاد بھیموں خاں نے کہا کہ پہلے میں گامی خاں کو سن لوں پھر فیصلہ ہوگا۔ لہذا اس وقت کے معروف اور نامور کئی شخصیتوں میں الا ئچی بٹ گئی اور استاد گامی خاں نے اس محفل میں طبلہ پر تین تال با قاعدہ طور پر سنایا۔ اس پر استاد بھیموں خاں نے انہیں بے حد داد دی اور اسی محفل میں کوڑے خاں کی شاگردی کی رسم ادا کر دی گئی۔ استادی شاگردی کی رسم سے فارغ ہوتے ہی حاضرین مجلس نے شدت سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم مدت سے ملتان کے لے کار گھرانے کا نام سنتے آئے ہیں۔ اور استاد بھیموں خاں اس گھرانے کے نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان سے لے کاری کے فن کی کوئی بات سنوائی جائے۔ تب استاد بھیموں خاں نے لے کاری کے صحیح اصولوں کی روشنی میں بلمپت تال سواری پانچ تال کا پیش کار پیش کیا۔ پہلے ہی قاعدے کی اٹھان پر حاضرین نے بے تحاشا داد دی سواری پانچ تال کے بعد دھمار تال (چودہ ماترے) پیش کیا اور ہر قاعدہ جب اس تال کے جھول کے مطابق بجا تو دلی کے اہل فن اور کسب دانوں نے اٹھ اٹھ کر دادیں بھی دیں اور ہر بول کے دوبارہ سننے کی فرمائش کی حالانکہ لال قلعہ کے باج میں تین تال صف اول میں شمار ہوتا ہے اور ان کہ ہاں اس تال کا پہلا قاعدہ ہی راونی سے بجا لینا اپنی عاقبت سنوارنے کے برابر سمجھا جاتا ہے .... لیکن میاں بھیموں خاں نے بھی تین تال اس ٹھوس اور نفیس انداز میں پیش کیا کہ ہر قاعدہ، ٹکڑا، گت، پرن پیش کار اور تہائی تین تال میں سے ہی تھی .... اہل کسب ملتان میں لے کار گھرانے اور یہاں کی لے کاری کے فن سے اتنے متاثر ہوئے کہ آج بھی ہندوستان میں اس لے کاری کے فن کے بارے میں ذکر ہو تو ملتان کا نام پہلے لیا جاتا ہے۔

بہر حال اس محفل کے بعد کوڑے خاں ثانی برس ہا برس استاد گامی خاں سے تعلیم لیتے رہے اور طبلہ کا ریاض بھی کرتے رہے اور اس کے بعد جب واپس وطن لوٹے تو ملک میں بہت جلد اپنے فن کا لوہا منوا لیا اور کئی برس استاد نزاکت علی خاں اور استاد سلامت علی خاں کی سنگت میں رہے۔

استاد میاں اللہ ڈوایا خاں نقارچی نے لے کاری کے فن کو وہ مقام بخشا اور اس فن کو ایک اچھوتے اور مختلف انداز میں پیش کیا کہ اس وقت کے اساتذہ فنکار میاں فقیر بخش نچاوی، میاں قادر بخش نچاوی اور ان کے والد میاں بلنگ خاں، میاں اللہ رکھا امرتسری، میاں فتح دین ڈل، میاں کرم الٰہی قصوری، میاں میراں بخش گلوالیا،

میاں نبی بخش کالرے والے، بھائی سنتو امرتسری، بھائی مہندا امرتسری، بھائی نصیرا اور بہت سی منفرد شخصیات جن میں نامور گائیک بھی شامل ہیں، کے درمیان اپنے فن کا مظاہرہ کر کے لوہا منوالیا۔

ان کے گھرانے میں لے کاری کی عجب بات یہ پائی جاتی تھی کہ جو تال بھی پیش کرتے، بجانے سے پہلے ہاتھ سے تالی دے کر پڑھتے جس سے لے کا درجہ عیاں ہو جاتا۔ یہ بات کسی اور گھرانے کو نصیب نہ تھی۔

جب ملتان کے لے کاری کے فن کا بول بالا برصغیر پاک و ہند میں ہوا تو ۱۹۱۸ء میں جالندھر، جو کہ موسیقی کا گڑھ سمجھا جاتا ہے، کے لوگوں نے جالندھر سالانہ کلاسیکی موسیقی کانفرنس جو کہ ہربلبھ کے میلے کے موقع پر منعقد کی جاتی تھی، میں شمولیت کے لئے میاں اللہ ڈوایا نقارچی کو دعوت دی۔ اس محفل میں پاک و ہند کے لَے اور سُر کے عالم لوگ بڑی تعداد میں شامل تھے مثلاً پنڈت وشنو ڈگبر، پنڈت بھاسکر راؤ جی، اونکار ناتھ ٹھاکر، کرشن راؤ گوالیار والے، ماسٹر کرشنا بمبئی والے اور ان کے علاوہ پنجاب کے چاروں گھرانے کے یعنی تلکونڈی، شام چوراسی، ہریانہ اور کپورتھلہ اور ہزاروں کی تعداد میں ہندو مسلم لوگ موجود تھے۔ اس محفل میں جب میاں اللہ ڈوایا خاں صاحب کا نقارہ سٹیج پر پہنچا تو تمام لوگوں میں لہر دوڑ گئی کہ ایسی نفیس محفل میں یہ عجیب اور بے ڈھب ساز محفل کو خاک محظوظ کرے گا۔ لیکن اس شخصیت نے ایسے نفیس اور ملائم انداز سے چوب استعمال کی کہ ہر بول کی شفافی سامعین پر گہرا اثر چھوڑتی چلی گئی۔ اور لوگوں کا چین وسکون لٹ گیا۔ ان کے بعد جالندھر کے نقارچی خاندان کے نمائندوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہ کی اور نہ ہی سننے والوں نے ان کی ضرورت محسوس کی۔

میاں اللہ ڈوایا خاں کے بعد ان کے بھائی میاں فیض بخش اور ان کے فرزند خورد میاں غلام محمد نے بھی اپنے آبائی فن کو جاری رکھا اور میاں فیض بخش کے صاحبزادے حسن بخش عرف حسو نے اس فن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتھا کلی ناچ کی طرف زیادہ توجہ دی۔ آج کل وہ ڈانس ڈائریکٹر ہیں اور اس خاندان کے ایک اور فرزند محمد رمضان عرف بانا نقارے کے فن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ میاں اللہ ڈوایا خاں نقارچی سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے جن میں لالو خاں اور بلے خاں طبلچی کے والد خلیفہ رحیم بخش شامل ہیں۔ پس یہی وہ خاندان ہے جس نے لے کاری کے فن کی وجہ سے اس دور میں شاہی انعامات حاصل کئے۔ مثلاً ملکہ الزبتھ سے اور والئی ریاست بہاولپور کی تاج پوشی کے موقعہ پر اللہ ڈوایا خاں کو بہت بڑے اعزاز سے نوازا گیا۔

ملتان میں موجودہ ثقافتی ساز بجانے کے ماسٹر جن کے نام قابل ذکر ہیں۔ شہنائی نوازوں میں محمد شریف خاں، غلام محمد شہنائی نواز کے بیٹے، اللہ وسایا خاں عرف وسو، نور محمد شہنائی نواز کے بیٹے اور طبلہ ماسٹروں میں بلے خاں، لالو خاں، استاد محمد شریف خاں بھوانی والے اور استاد معشوقے خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔

(تاریخ ملتان - منشی عبدالرحمٰن خان)



اللہ دتہ نسیم

موسیقی اور موسیقار

ملتان کی قدامت دور افتادہ گرد آلود صدیوں کی کہانی، تاریخی کتب کے سوا اور کوئی سنانے والا آج موجود نہیں۔ تاریخی کتب بھی ملتان کے پورے ماضی پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں۔ ارباب ذوق کے ہاں سے بسا اوقات ایسی نادر تحریریں مل جاتی ہیں۔ جن سے ماضی کے بعض گمنام گوشوں پر روشنی پڑ ہی جاتی ہے۔ جیسے ملتان کے معروف موسیقار اور بزم چناب کے سیکرٹری ملک اللہ دتہ نسیم ملتان میں موسیقی کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں:

محمد بن قاسم کی آمد پر ملتان میں متعدد سنگیت ودیالوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دریائے راوی کے کنارے جو اس وقت ملتان کے نواح میں بہتا تھا ایک قلعہ ''سکر طلائی'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ نام اس کے آہنی بڑے دروازے کی وجہ سے تھا۔ معتبر ہندو کتب تواریخ میں اس قلعے میں ایک مشہور سنگیت ودیالے کا ذکر کیا گیا ہے جہاں رقص و موسیقی اور نرتکاری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ امیر گھرانوں کی خوبرو لڑکیاں نیم برہنہ پروہتوں کے سامنے جو سانپوں کے ہار لٹکائے بیٹھے ہوتے، رقص و سرور کی پر تکلف محفلیں سجاتی تھیں۔ غالباً اس وقت کی موسیقی دھرپد سے ملتی جلتی ہوگی اور اسی طرح سے رقص کتھک کلاسیکی انداز میں ہوگا۔ یہ صرف ایک اندازہ ہے۔ اس زمانے میں سورج دیوتا آدیتا (دیول) کے مشہور مندر میں جو دنیا کی سات مشہور ہیکلوں میں شمار ہوتا تھا۔ نامور رقاصائیں اور موسیقار مغنی اطراف و جوانب سے آدیتہ کی طلائی اور سیندوری مورت کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خصوصاً اماوس کی راتوں میں جب چاند کی آخری تاریخ ہوتی ہے۔ فنکار اس بت کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے اور گاتے بجاتے تھے۔

تاریخی کتب کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کی مہارانی پنگلا مشہور عالم رقاصہ پدماوتی کا رقص دیکھنے کے لئے اجین سے چل کر ملتان آئی۔ اس زمانہ میں نہ سڑکیں تھیں نہ شاہراہیں۔ راستے دشوار گزار تھے اور جنگلوں سے پٹے پڑے تھے لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود پدماوتی کی کشش اور لازوال شہرت نے مہارانی کو یہ دور دراز کا سفر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

ہندوؤں میں موسیقی اس حد تک رائج تھی کہ عبادت اور جنگ کے معرکوں میں بھی موسیقار دھرپد گاتے

اور مرونگم پر مختلف النوع پرن بجاتے تھے۔ مندروں میں رات دن سنکھ و ناقوس اور طاؤس بجتے تھے اور دیوداسیاں بتوں کے سامنے گاتی بجاتی اور رقص کرتی رہتی تھیں۔ خاص طور پر لڑائی کے دیوتا کرتکیا کے مندر میں، جو کمان ہاتھ میں لئے مورتی پر سوار بیٹھا تھا۔ رات دن بڑے بڑے دمامے بجائے جاتے تھے جن کے بلند بانگ آہنگ پر مہابیر رقص کرتے اور جے کار کے ترانے گاتے تھے۔ یہاں تک کہ ملتان کے اشواپتی راجے اپنے گھوڑوں کو بھی ڈھول کی دھن پر نچاتے تھے اور یہ رقص اسپاں اب بھی دیہات میں مروج ہے۔

اس وقت ہندو آبادی میں موسیقی یقینی طور پر مقبول ہو گی کیونکہ یہ فن ہندوؤں کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی طرح سے رام لیلا کی منڈلیوں میں رامائن اور مہا بھارت کے واقعات کے ناٹک پیش کئے جاتے تھے۔ جن کا بیشتر حصہ موسیقی سے مرتب ہوتا تھا۔ اسیر، عنبر اور گلال کی گلابی اور قرمزی دھول میں شعاؤں کو معکوس کیا جاتا تھا۔ جن کی بوقلموں روشنی میں چندن کی پتلیوں جیسی سندر رقاصائیں تتلیوں کی طرح رقص کرتی نظر آتی تھیں۔ اور یہ ناٹک تقریباً موسیقی میں ادا کئے جاتے تھے۔

لیکن تاریخ ہمیں اس دور دراز زمانے کے منفرد گلوکاروں اور باکمال اساتذہ فن کے نام بتانے سے قاصر ہے۔ یہاں تک کہ ہم مسلمانوں کے دور میں داخل ہو جاتے۔ لیکن پھر بھی ہماری جستجو دھندلا جاتی ہے اور کوئی لازاول مغنی سامنے نہیں آتا۔ تغلق بادشاہوں کے زمانے میں موسیقی کی محفلیں کوٹلہ تغلق خاں میں جہاں ان بادشاہوں کے محلات تھے منعقد ہونے کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی کہ ان مجالس میں نائیک گوپال کمار نزل اور امیر خسرو جیسے عظیم مغنی شرکت کرتے تھے اور ان نامورفن کاروں کے مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ جن میں اکثر امیر خسرو ان پر بازی لے جاتے تھے۔ وہ نائیک گوپال کے مشکل راگوں کو ترانوں کی دھن میں گا کر ایک ایسی ندرت پیش کرتے تھے کہ نائیک گوپال سر دھن کر رہ جاتا تھا۔ امیر خسرو ایک عرصہ ملتان میں مقیم رہے جہاں آج کل دستکاری سکول ہے۔ یہاں اس زمانےٗ میں ایک سرائے تھی جس کے صحن میں ایک بڑا چبوترہ تھا جہاں خسرو ستار بجاتے تھے اور نئے راگ ایجاد کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں انہوں نے راگ غارا، مرپُر د اور زیلف وغیرہ وضع کئے اور ہندو نائیک کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ مزید انہوں نے نقش وگل اور قوالی کی داغ بیل ڈالی۔ چنانچہ اس زمانے میں یہاں قوالی کا بڑا چرچا تھا۔ خسرو اور عراقی کی غزلیں بہت مقبول تھیں۔

نخستیں باده کاندر جام کردند
بچشم مست ساقی دام کردند

اکثر مجالس میں گائی جاتی تھی۔ چنانچہ اس غزل کے مقطع

چو خود کردند راز خویشتن فاش
عراقی را چرا بدنام کردند

کو سن کر حضرت بہاؤالدین زکریاؒ ملتانی پر وجد طاری ہو گیا۔ انہیں عراقی سے اس درجہ محبت ہوئی کہ اپنی لڑکی ان

سے بیاہ دی۔ محلہ کمنگراں کے معروف عالم دین مولوی حسین بخش کا خانوادہ اسی پشت سے ہے۔ صوفیا کی مجلس میں قوالی بہت مقبول تھی۔

۱۲۹۴ء میں جب علاؤالدین نے ڈھاکے پر فوج کشی کی اور ۱۳۱۰ء میں جب ملک کافور نے جنوبی ہند پر یلغار کی تو اس وقت وہاں موسیقی اعلیٰ پیمانے پر رائج تھی۔ چنانچہ وہاں سے کچھ ماہرین فن شمالی ہند میں لا کر آباد کیے گئے جن میں سے دو چار پسندیدہ گلوکار ملتان بھی بھیجے گئے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلجی اور تغلق دور میں یہاں موسیقی کا خاصا چرچا تھا۔ مغل دور میں بھی یہاں موسیقی زوروں پر تھی اور بادشاہوں کی آمد پر یہاں کے مشہور عالم ماہرین فن جمع ہو جاتے تھے اور ملتان کی مجالس کو گرماتے تھے۔ چنانچہ اس فن کی مقبولیت کے مدنظر جہاندار شاہ نے نعمت خاں نامی رقاص کو یہاں گورنر مقرر کیا تھا۔ غرض کہ مغل دور میں بھی اس فن کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

انیسویں صدی میں اگرچہ انگریزی دور شروع ہو چکا تھا۔ تاہم یہاں موسیقی کا چرچا بدستور تھا۔ گامن خاں سرودنواز اور اللہ ڈوایا نقارچی بڑے مشہور فن کار تھے۔ گامن خاں دھرپد اور ٹپہ گاتے تھے۔ ان کی گائی ہوئی ملتانی کافیاں بھی بہت مقبول تھیں۔ راقم نے ان کا طنبورہ بھی ان کے ورثاء کے ہاں دیکھا تھا۔ اس کا پیٹ بڑے حجم کا تھا۔ ایک آدمی بمشکل اس ساز کو اٹھا سکتا تھا۔ اس تان پورے کے بلند بانگ آہنگ سے گامن خاں کی آسمان جاہ آواز کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں یہاں دو ایک مشہور گائیکہ عورتوں کالو جان اور لالاں کا نام بھی سرفہرست تھا۔ کالو کی کافیوں کے ریکارڈ بھی بڑے پسندیدہ تھے۔ اس معروف گلوکارہ کی آواز میں بلا کی کشش تھی۔ چنانچہ ہندوستان کی مایہ ناز مغنیہ زہرہ بائی آگرے والی کالو جان کی کافیاں سننے کے لئے ملتان آئی اور کافی کی تکنیک سے متعارف ہوئی۔ کہتے ہیں زہرہ بائی، کالو جان کی پرسوز آواز سے یہاں تک مسحور ہوئی کہ آخر اسے کالو جان کو کالو بائی کہنا پڑا۔ کالو بائی عام طور پر شہنائی کی سنگت کے ساتھ گاتی تھی۔ اس سے اس کی بلند اور تابناک آواز کی نشاندہی ہوتی ہے۔ کالو جان سے ہندو اور مسلمان یکساں طور پر متاثر تھے۔ ہندو خاص طور پر اسے اپنی مجالس میں بلاتے اور ملتانی کافیاں سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ یہ لوگ عموماً اپنی مجالس سورج کنڈ، منا بھگت اور گیان تھلہ میں منعقد کرتے تھے اور نامور گویوں کو ان مجالس میں بلاتے تھے۔

سورج کنڈ میں محفل موسیقی

پہلی جنگ عظیم کے بعد یہاں موسیقی کا سیلاب اُمڈ آیا اور ملتان کی فضا نغمہ و آہنگ سے معمور ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں آئے دن سنگیت سمیلن برپا ہوتے تھے جن میں ملک کے ماہر موسیقار شرکت کرتے تھے۔ سنگیت کی ان ترنم ریز محفلوں کا ذکر طوالانی ہے تاہم دو تین سمیلن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک ۱۹۳۲ء میں سورج کنڈ کے مندر میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اس محفل کا ساعت افروز سرور بہت پر کیف تھا۔ اس سمیلن

میں امرتسر کے مایہ ناز گلوکار بھاوی لال، انبالے کے دھرم پال گوالیار کے کرشنا راؤ پنڈت مشہور فنکار توکل حسین خاں کے والد میاں مولا بخش اور ملتان کے مشہور ولی برادران نے شرکت کی۔ مزید ملک کے مایہ ناز سازندے بھی اس سمیلن میں شریک ہوئے۔ میاں ملنگ بوہن والا اپنے فن میں یکتائے روزگار طبلہ نواز تھا جو نہایت دھیمی آواز میں طبلہ بجاتا تھا۔ یہاں تک کہ برسات کی ترشح کا گمان ہونے لگتا۔ میاں ملنگ اس زمانے کے ماہرین اساتذہ میں چوٹی کے فنکار تھے۔

پربت سنگھ نے مردنگم پر چال پرستار کے انوکھے پرن بجا کر میاں ملنگ اور دیگر سامعین کو حیرت میں ڈال دیا۔ پربت سنگھ اپنے وقت کے مشہور مردنگم نواز تھے۔ وہ مردنگم گلے میں ڈالے کھڑے تھے اور اسی حالت میں جوش وخروش کے ساتھ پرن بجا رہے تھے۔ مردنگم پر زور کی تھاپ پڑنے سے ان کی بنارسی پگڑی سر سے پاؤں تک لٹک گئی تھی۔ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ان کے سانس کے ساتھ ہوا میں لہرانے لگی تھیں۔ لیکن ان کا سرخ چہرہ مسرت سے تمتما اٹھا تھا۔ داد کے ڈونگے برس رہے تھے۔ خصوصاً میاں ملنگ کی تحسین تو جادو کا کام کر رہی تھی۔ اسی طرح سے فریدی برادران نے آبنوس کی ستاریں بجائیں اور راگ پوریا دھنا سری کے مختلف انگ نہایت خوشنما انداز میں پیش کئے۔ بھائی لال نے شام کے بعد راگ مالکونس میں خیال پیش کیا۔ خیال کے بول تھے ''بولی ٹھولی کا ہے کرت ری ناز'' ایک سماں بندھ گیا۔ وکرتانین اور پٹے کچھ اس انداز میں ادا کئے جا رہے تھے کہ سامعین انگشت بدنداں تانوں کے زیر و بم کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے جنات کے ٹولے بھائی لال کے اردگرد والہانہ رقص کر رہے ہوں۔ بہر حال بھائی لال کا گایا ہوا یہ یادگار خیال آج تک میرے حافظے سے محو نہیں ہوا۔

پنڈت کرشنا راؤ گوالیار کے موسیقی کالج کے وڈوان پرنسپل تھے۔ انہوں نے کلیان ٹھاٹھ کا ایک انوکھا کھاڈو سمپورن راگ چندر کانت سنا کر سامعین کو تو کیا موسیقار اساتذہ کو بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ کرشنا راؤ پنڈت ہندوستان کے متعدد ماہرین موسیقی کے استاد گردانے جاتے ہیں۔ وہ اب بھی زندہ ہیں۔ اور موسیقی کی ترویج میں اب بھی مصروف ہزار ہا شاگردوں کو فارغ التحصیل کر رہے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی صفت میں نے یہ دیکھی تھی کہ گاتے وقت چہرے کے نقش ونگار میں کجی پیدا نہ ہوتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک ساکت بت بیٹھا صرف اپنے ہونٹ ہلا رہا ہے۔ چہرے پر کسی قسم کا تناؤ نظر نہ آتا تھا اور نہ ہی جسم میں کوئی فروعی حرکت پیدا ہوتی تھی۔ یہ کمال میں نے صرف پنڈت جی میں دیکھا تھا۔ بعض گویوں کی تو یہ حالت ہوتی تھی کہ گاتے گاتے اور بازو ہلاتے ہلاتے اپنی جگہ سے دو دو گز سفر کر جاتے ہیں۔ اور چہرے کو یوں مسخ کرتے ہیں کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا اور ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ جیسے فضا سے دست و گریباں ہو رہے ہوں۔ خدا انہیں معاف کرے۔ ہمارے یہاں بھی سردار بخش اور ولی محمد برادران کی یہی حالت تھی۔ تان لگاتے لگاتے اٹھ کر مجلس کے دائرے سے باہر نکل جاتے تھے۔ یہ دونوں بھائی تھیٹریکل انداز کے گانے گاتے تھے اور آغا حشر مرحوم کے بڑے مداح تھے۔

گوالیار کے پنڈت کرشنا راؤ اپنے ساتھ دو شاگرد بھی لائے تھی۔ یہ تیرہ چودہ سال کی عمر کے سانولے رنگ کے لڑکے آنکھوں سے اندھے تھے جو گیئے رنگ کی پگڑیاں اور اسی رنگ کے کھدر کے چولے اور دھوتیاں زیب تن کئے یہ بچے بھی سمیلن میں گانے کے لئے بے قرار نظر آتے تھے۔ پربت سنگھ ابھی ہانپتے ہانپتے پسینہ پونچھ رہے تھے کہ ان بچوں کا نام پکارا گیا۔ یہ بچے تان پورہ سنبھال کر بیٹھے ہی تھے کہ پنڈت کرشنا راؤ نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ ملتان والوں کو راگ ملتانی میں بلمپت اور درت خیال سنائیں گے۔ یہ خاصا مشکل راگ ہے اور ملتان کی ایجاد ہے لیکن ملتان کے لوگ اسے گا نہیں سکتے۔ یہ راگ یہاں کم گایا جاتا ہے۔ بہر حال ان بچوں نے تانپورہ سنبھالا اور ہم آہنگ ہو کر گانا شروع کیا ''سائیں رے سندر سر جنوا'' ایک سماں بندھ گیا۔ بچوں کے شگفتہ اور پُر کیف تانوں کا تسلسل مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ چھوٹے قد کے بور رنگ کے دو گھوڑے جادیں کھڑی کئے شانہ بشانہ کسی لامتناہی سڑک پر سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ یقین مانیئے میں نے آج تک کسی گویے سے ایسا صحیح ملتانی راگ نہیں سنا۔

سورج کنڈ کے مندر میں یہ سمیلن سال بہ سال منعقد ہوتا تھا اور اس میں ملک کے سرآمد روزگار گویے شرکت کرتے تھے۔ یہ سنگیت میلہ پنڈت نروتم دت کی صدارت میں ہوتا تھا جو اس مندر کے مہامنتری تھے۔ بھورے رنگ کے بوڑھے پنڈت کی بھنویں گانا گاتے وقت ناچنے لگتی تھیں اور ماتھے پر شکن پڑنے لگتے جن میں ان کا تلک بعض اوقات چُھپ جاتا تھا۔ ان کے پاس پرانے مندروں کی ایک پوتھی تھی جس میں ملتان کے مندروں اور بتوں کی شکل وصورت کو بیان کیا گیا تھا اور ان رسموں اور تہواروں کی تفصیل درج تھی جو ان مندروں سے متعلق تھے۔

اس دور میں گھر گھر میں گانے کا چرچا تھا۔ ہندوؤں کے گھروں میں تو خاص طور پر اس فن کو بڑی مقبولیت تھی۔ صبح سویرے اکثر ہندو گھرانوں میں پرارتھنا گائی جاتی تھی اور اکثر مکانوں کی بالائی منزلوں سے ہارمونیم اور ستاروں کے ساتھ ہندو لڑکیوں کے گانے کی آواز سنی جاتی تھی۔ یہ لڑکیاں اکثر ولیکار، میاں کی ٹوڑی، آساوری اور للت گاتی تھیں بعض معزز ہندو خاندانوں کی لڑکیاں شہر کی گائیکہ عورتوں سے بھی زیادہ اچھا گاتی تھیں۔ مشہور ادیب اور ڈرامہ نویس تھیٹریکل دیوان آتمانند شرر کی دو بھتیجیاں ومولا اور موہنی بڑی سلجھی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ گورے رنگ اور لانبے قد کی یہ کونلیں بھڑکیلی ساڑھیاں زیب تن کئے خانگی مجلسوں میں ہل چل ڈال دیتی تھیں۔ تان پورے کے ساتھ گاتی تھیں اور اپنی شرمیلی اداؤں میں کھو جاتی تھیں۔ انہیں ٹھمری اور غزل پر خاصا عبور تھا۔ ان کے بھائی دیوان چاند نارائن بھی بڑے اچھے رقاص تھے۔ اسی طرح چھاؤنی کے سری کرشن گھڑی ساز کی دو لڑکیاں اکثر گھریلو محفلوں کو اپنے گیتوں سے گرماتی تھیں۔

پنڈت جیون لال ملتان کے ایک بڑے خوشنما رئیس تھے۔ کشمیری پنڈت تھے۔ شکل وصورت سرخ وسپید اور شاداب تھی۔ قیصر ولیم جیسی بھوری بھوری مونچھوں کو کاسمیٹک لگا کر صبح سویرے اپنی بہو چندر لیکھا کے ساتھ

اپنے بنگلے میں راگ گلن گاتے تھے اور اسی طرح سے لالہ بالکشن تبرہ وکیل کی دولڑکیاں ششی اور کلاوتی بھی راگ ادھیائے میں کھوئی رہتی تھیں۔

مسلمان موسیقار

اس وقت ملتان میں دیگر ماہرین فن کے علاوہ ہردلعزیز اور ممتاز زمانہ مسلمان گلوکار توکل حسین خان بھی موجود تھے۔ توکل جیسا گویا میں نے زندگی بھر نہیں سنا اور شاید ایک عرصہ تک ایسا گلوکار پیدا نہ ہو سکے۔ اور آج بھی بڑے بڑے فنکار اگر جسارت کریں کہ توکل خاں جیسی گائیکی پیش کریں تو شاید یہ لوگ اس کی گرد تک نہ پہنچ سکیں۔ موٹی موٹی آنکھیں، بیٹھی ہوئی ناک، سانولے رنگ اور درمیانے قد کے اس خراباتی مغنی آتش نفس کی آواز میں وہ جادو تھا کہ کوئلیں اس آواز کی بازگشت کے گرد طواف کرتی تھیں۔ اس کی مہین آواز آبادیوں میں گم ہو جاتی تھی۔ اس لطیف آواز میں بلا کا لوچ تھا۔ وہ کلارنٹ کے ساتھ گاتے تھے اور بعض اوقات تاراستھان کے آخری سرتک آواز کو بلند کر کے کلارنٹ کے ساتھ گاتے تھے اور بعض اوقات ان کی آواز پر عورت کی آواز کا گمان ہونے لگتا تھا۔ فطرت کا یہ شاہکار گویا موسیقی میں اپنے زمانے کا سنگ میل تھا خیال، ٹھمری، غزل اور کافی یکساں لطافت اور شگفتگی کے ساتھ پیش کرتا تھا اور سرگم میں دلکش انگریزی بینڈ بجاتا تھا۔ یہاں تک کہ انگریز بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے ایک انگریز سے میں نے ان کی بینڈ طرازی کی بابت تاثرات چاہے تو کہنے لگا:۔

"Very nouvel and adeft in haroonizing notes"

توکل خاں مخدوم محمد رضا شاہ گیلانی کے مرید تھے۔ اس لئے اکثر مخدوم صاحب کی مجالس میں چہکتے رہتے تھے۔ مسلمانوں میں مخدوم صاحب مرحوم موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اور اکثر سماع کی محفلوں میں ماہرین فن کو دعوت دیتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ خود بھی کبھی کبھی موسیقی کا شوق فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ چاندنی رات میں دربار پیران پیر کے دیوان خانے کی چھت پر محمد حسین نگینے والے کے نغموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ بھورے خاں مشہور رقاص بھی محفل میں تشریف لائے۔ محمد حسین نگینہ اکثر نعتیں اور غزلیں گاتے تھے۔ ان کے ساتھ سانولے رنگ کا ایک نوعمر لڑکا تھا۔ جس کی مہین آواز محمد حسین کی موٹی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ بھورے خاں کتھک ناچ میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ بھورے خاں کے رقص کی دھڑکنوں سے طبلے کے بول نکل رہے تھے۔ رقص و موسیقی کے جادو نگار منظر کی یاد اب بھی میرے دل سے محو نہیں ہوتی۔ مخدوم صاحب سال بہ سال شیر شاہ اسٹیشن کے قریب مختارواں کے عرس کے موقع پر بڑے بڑے ماہرین گلوکار بلاتے اور محفل سماع قائم کرتے تھے ان میں توکل خاں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جہاں تلیری باغ مظفر گڑھ کی کوئلیں صبح پانچ بجے کے قریب توکل خاں کی بلند اور فلک شگاف آواز کی بازگشت کے ساتھ گاتی تھیں۔ یہ میں نے خود سنی تھیں۔ اس سرور آگیں محفلوں کی یاد اب بھی دلوں کو گرماتی رہتی ہے۔ مخدوم محمد رضا شاہ کے علاوہ مسلمان رؤسا

میں خان بہادر مخدوم حسن بخش گردیزی بھی تھے جو سر پر ململ کے پورے تھان کا رسے نما عمامہ باندھ کر اپنی عالیشان کوٹھی کے دالان میں تخت پر بیٹھ کر ستار بجاتے تھے اور وہ ایک خاص سامعین سے سفید شیشوں والی بے فریم عینک سے جھانک جھانک کر داد طلب کرتے تھے۔

ان دلدادگان موسیقی کی بابت ذکر کرنے سے میرا مقصد یہ بتانا تھا کہ اس زمانے میں موسیقی کا بڑا چرچا تھا۔ شہر میں توکل خاں کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے استاد موجود تھے۔ استاد صادق علی خاں، رحمت خاں، عنایت خاں، پنڈت بنواری لال اور پنڈت گنپتی اپنے دور کے مشہور و معروف گلوکار تھے۔ استاد صادق علی اکثر نوابزادوں کے استاد تھے اور حلاوت اور شیرینی میں اپنی مثال آپ تھے۔ توکل خاں کے ساتھ اکثر محفلوں میں الجھے رہتے تھے۔ کلاسیکی موسیقی کے ماہر تھے۔ آج کل اکثر پشاور ریڈیو سے فارسی غزلیں گاتے ہیں۔ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اس لئے گوشہ گیر ہوتے جا رہے ہیں۔ موصوف کا آبائی گھر شام چوراسی ہے۔ یہ قصبہ پنجاب میں موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں سے نکل کر ہمارے سامنے ایسے ایسے سحر طراز فنکار گزر گئے ہیں کہ جن کی اسماء گرامی موسیقی کی تاریخ میں درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ موجودہ دور کے لاثانی گلوکار سلامت علی خاں نزاکت علی خاں اسی قصبے کے ہیں۔ استاد علی کی طرح پنڈت گنپتی بھی یہاں کے چند نوابوں کے استاد تھے۔ پنڈت جی بھاری بھرکم جسم کے وضعدار خوبرو آدمی تھے۔ زعفرانی رنگ کے کھدر کے کپڑے زیب تن کرتے تھے۔ دو گھوڑوں کی بگھی میں سوار چاندی کے دستے والا ڈنڈا ہاتھ میں تھامے بڑی تمکنت کے سے نواب عبدالقادر خان خاکوانی کو موسیقی کی تعلیم دینے جایا کرتے تھے۔ خاکوانی نوابوں میں بھی موسیقی کا خاصا شوق تھا۔ عبدالقادر خان کے علاوہ نواب عطا محمد خاں خاکوانی بھی کبھی کبھی چاندنی راتوں میں زنانہ ہسپتال کے قریب جہاں ان کا مکان تھا، اپنی چھت پر ہارمونیم باجے کے ساتھ گاتے سنائی دیتے تھے۔ باوا گنپتی ان کے بھی استاد تھے۔ اور ملتانی کافی پر خاصا عبور تھا۔ ان کے گراموفون ریکارڈ بھی پسندیدہ تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ مہنت ٹائپ آدمی تھے۔

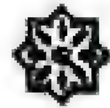
اسی طرح پنڈت بنواری لال تھے۔ چٹے گورے سرو قد ایک آنکھ میں پھولا بڑے نازک مزاج آدمی تھے۔ ہندو لڑکیاں اکثر ان کے گرد جمع رہتی تھیں۔ ریشم کے تاجر بدانی نے انہیں اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ جہاں یہ بڑے ناز و نعم سے رہتے تھے۔ حنائی رنگ کی گائے کا دودھ پیتے تھے اور رات دن موسیقی کی ترویج کرتے رہتے تھے۔ راگنی بھیم پلاسی پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اکثر ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاں مندروں اور نالے کے کنارے منعقدہ محفلوں میں بلائے جاتے تھے۔ اکثر امراء ان کے دوست تھے۔ دلی دروازے کے زمیندار شیخ سلطان بخش خاص طور پر ان کی آؤ بھگت کرتے تھے۔ اور اپنی مجلسوں میں بلاتے تھے۔ جہاں یہ زیادہ تر راگنی بھیم پلاسی کی ٹھمری گاتے تھے آواز میں سوز تھا۔

رحمت علی خاں بھی ان دنوں ملتان میں تھے۔ کمان قد، لانبے آدمی، چوڑا چکلہ سینہ، لمبوترہ منہ، خشخشی

داڑھی، ترکی ٹوپی اور شلوار، کبھی کبھی اچکن بھی زیب تن کرتے تھے۔ چوک بازار میں ایک بالا خانے پر مقیم، یہ بھی ایک استاد آدمی تھے۔ ریحانے کے موسیقی طراز خاندان کے فرد تھے۔ جہاں یہ کلاسیکی موسیقی گاتے تھے وہاں قوالی اور نعت کے بھی دلدادہ تھے۔ گانے کے دوران اتنا بڑا منہ کھول لیتے تھے کہ ایک ٹینس کی سالم بال اندر چلی جائے۔ ایک ہاتھ تان پورے پر ہوتا تو دوسرا ہوا میں لہراتے رہتے تھے۔ صوفی منش ہونے کی وجہ سے انہیں اکثر مزاروں پر قوالی کے لئے بلایا جاتا تھا۔

یہ گلوکار اور ان کے علاوہ بیشتر معروف اور مترنم موسیقار ماہ بہ ماہ اماوس کی رات کو حکیم بلدیو داس کے مکان گلی کنگراں میں اکثر اوقات صبح تک گاتے رہتے تھے۔ ہندو عقیدے کے مطابق چاند کی آخری تاریخ یعنی اماوس کی رات کو صبح تک گانا چاہیے تاکہ آسیب ٹل جائے اور اندھیرے میں یلغار نہ کرسکیں چنانچہ اس عقیدے کے مطابق حکیم بلدیو داس کے مکان پر سنگیت کاری ہوتی تھی اور بڑے بڑے فنکار اماوس میں شریک ہوتے تھے۔ سرشام اس محفل کا آغاز ہو جاتا تھا۔ سب سے پہلے حکیم صاحب کا بھتیجا مدن موہن گاتا تھا۔ مدن بتدریج دریائے موسیقی میں اتر رہا تھا۔ حکیم صاحب یہ سب اہتمام مدن کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے۔ مدن کی آواز پرسوز مہین تھی وہ عموماً راگ بہاگ میں ٹھمری گایا کرتے تھے۔ ''چوریاں بار بار مرکائیں'' اس راگ پر اسے خاصا عبور تھا اور وہ شام کے راگوں میں بہاگ کو معتبر راگ گردانتے تھا۔ مدن کے بعد باقی گلوکار صبح تک گاتے رہتے تھے۔ اماوس کی ان مجالس میں بڑے نامور گلوکار سننے میں آتے تھے۔

(تاریخ ملتان - منشی عبدالرحمٰن خان)



شبیر حسن اختر

ملتان میں پہلا تھیٹر

تھیٹر ملتان کا ایک قدیم مشغلہ تھا۔ لیکن اس کی جگہ فلم نے لے لی ہے۔ یہ نہیں کہ یہ فن یہاں سے مفقود ہے اور اب یہاں کے ڈرامے اسٹیج نہیں کئے جاتے لیکن وہ پہلی سی گہما گہمی نہیں۔ لیکن فلم کی آمد سے پہلے کا ذوق و شوق امتداد زمانہ کی نذر ہو چکا ہے۔ اب یہاں نہ کوئی اعلیٰ درجے کا تھیٹریکل ہال ہے اور نہ وہ ساز و سامان جو پرانی تھیٹریکل کمپنیوں کو میسر تھا۔ لوگوں میں تھیٹر کا شوق بھی چنداں امید افزا نہیں ہے۔ فلم انڈسٹری کے اجراء پر تھیٹر کے بیشتر ایکٹر اور فنکار تھیٹر کو خیر باد کہہ کر فلم اسٹار بن گئے اور تھیٹر کا اسٹیج بتدریج پسماندہ اور اداس ہو گیا۔

علامہ اقبال اور دیگر دانشوریوں تو فلم کو ایک میت سے تعبیر کرتے رہے اور یہ کہ فلم سراسر بت گری ہے اور مردہ جیتے جاگتے انسانوں کے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ لیکن یہ انتباہ بھی صدائے صحرا ثابت ہوا اور اس نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی یہاں تک کہ پرماننڈ تھیٹر کے منڈوے کو بھی یار لوگوں نے ستارہ ٹاکیز (حشمت محل سینما) میں بدل دیا۔ چنانچہ سینما اس وقت تھیٹر سے زیادہ مقبول ہے۔ حالانکہ ہال میں اندھیرا ہو جاتا ہے اور تماشائیوں پر حنوط شدہ لاشوں کا گمان ہوتا ہے۔ دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور نفاست پسند آدمیوں کا دم بسا اوقات گھٹنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس تھیٹر سینما کے مقابلے میں روشنیوں کا شہر ہوتا ہے اور اسٹیج پر جیتی جاگتی زندگی اپنی تمام رعنائیوں سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور تماشائیوں کے مسرت افروز چہرے روشنی میں تمتما اٹھتے ہیں۔ لیکن زندہ دلی کی ان آسائشوں کے باوجود لوگ زیادہ تر سینما دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اگرچہ لاتعداد سینما ہال ہیں لیکن یہ عوام کی عیاشی کے لئے ہیں خواص کا رجحان تھیٹر پسند ہے۔ وہاں اتنے آپیرے اور تھیٹر ہال ہیں کہ جن کا شمار نہیں اور جن کا ساز و سامان کا تصور تک ہمارے ہاں میسر نہیں۔

دور افتادہ ہندو دور میں یہاں مہا بھارت، رامائن بھگت سور داس اور ہلاد بھگت کے ناٹک رام لیلا کی منڈلی میں پیش کئے جاتے تھے۔ جن میں لڑکے لڑکیاں سوانگ بھر کر کھلے میدان میں یہ مذہبی قصے دوہراتے تھے۔ خاص طور پر ہولی اور دسہرے کے تہواروں میں یہ ناٹک خاص طور پر مقبول تھے۔ کہیں کرشن مراری بنسری بجاتے اور گوپیوں سے چھیڑ خانی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں راجہ دشرتھ رانی کیکئی کے ساتھ رتھ میں سوار نظر آتے ہیں اور کہیں بھیشم پتامہ

اپنا گرز اٹھائے رن میں اپنے جوہر دکھاتے نظر آتے تھے۔ یہ تمام کھیل پردوں اور اسٹیج کے بغیر کھلے آسمان کے نیچے ایک قسم کے چوپال میں ہوتے تھے اور تماشائی ارد گرد بیٹھے ان پراچین کہانیوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ ہندوؤں کے ان تہواروں میں ناقوس اور سنکھ بجائے جاتے تھے۔ اور مردنگم پر پرن پرستار پیٹے جاتے تھے ہفت رنگ ساڑھیوں کے جھرمٹ میں قوس وقزح کے رنگوں کی نمائش کرتے تھے۔ غازے ابٹنے اور تلنک بڑی مہارت سے لگائے جاتے تھے۔ اور عنبر اور گلال کی دھول اڑائی جاتی تھی اور شعلوں کی روشنی میں پارے کی پتلیوں جیسی چکوریاں میدان میں نکل آتی تھیں اور ایک والہانہ رقص پیش کر کے تماشائیوں میں ہیجان پیدا کر دیتی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی کلاوتی چھم سے چوپال سے نکل کر مردنگم پر کتھک رقص پیش کرتی۔ غرض کہ اس زمانے کے ناٹک بلا تکلف کھلے میدان میں ننگے آسمان کے نیچے کھیلے جاتے تھے۔

مسلمانوں کے دور میں بھی یہ رسم ایک مدت تک جوں کی توں رائج رہی اور مسلمانوں نے بھی ایرانیوں اور ہندوؤں سے متاثر ہو کر تمثیل نوازی کا فن اپنایا اور یہ بھی کھلے آسمان کے نیچے گل بکاؤلی، سیف الملوک، ہیر رانجھا اور سسی پنوں وغیرہ کے ناٹک پیش کرنے لگے۔ ناٹک اکثر گا کر پیش کیے جاتے تھے۔ ''بادشاہ کا بھنگی ہوں۔ میں جھاڑو دینے والا'' یہ مصرع گا کر بھنگی بادشاہ کے دربار میں جھاڑو دیتا تھا۔ قصہ گو جب قصہ شروع کرتا تو کہتا ''ایک تھا راجہ ایک تھی رانی۔ دونوں پر آئی تھی جوانی'' تو رانی راجہ بھی بن سنور کر کھیل کے میدان میں نکل آتے تھے۔ میں نے بچپن میں ایسے کئی کھیل تماشے دیکھے تھے۔ کوٹلہ تولے خان کے موچی ناٹک کے بڑے دلدادہ تھے اور ان میں سے اکثر سوانگ بھر کے بڑے بڑے بازاروں اور سڑکوں پر کھیل پیش کرتے تھے۔ مرد تو خیر ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے لیکن عورتیں اور بچے اپنے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں سے یہ ناٹک دیکھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہی نہیں کہ صرف کوٹلے کے موچی اس قسم کے ناٹک پیش کیا کرتے تھے بلکہ شہر میں پٹولی اور پاک دروازہ کے پارچہ باف، رنگ ریز اور ٹھپے ساز بھی اس قسم کے ناٹک پیش کیا کرتے تھے۔۔۔۔۔۔

بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں پہلی دفعہ ایک بڑی تھیٹر کمپنی پونا سے آئی۔ اس تھیٹر کے ڈائریکٹر مشہور گلوکار سید عباس علی تھے۔ موصوف ملتان میں اپنے لحن داؤدی کے بنا پر بہت مقبول ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک رات جب تھیٹر کے کھیل میں سید عباس علی موسیقی کا نور پھیلا رہے تھے تو یکا یک ملتان کی خوبرو اور پسندیدہ مغنیہ لالاں جان بلا تکلف اسٹیج پر چڑھ گئی اور سید عباس علی سے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ سنتے ہیں کہ وہ بالآخر سید عباس علی کی موسیقی سے مسحور ہو کر ملتان کو خیر باد کہہ کر ان کے ساتھ چلی گئی تھیں۔

سید عباس کی کمپنی مرصع اور مصفی اردو اور مترنم زبان میں ڈرامے کھیلتی تھی۔ زیادہ ڈرامے اصلاحی ہوتے تھے۔ زبان ''فسانہ عجائب'' کی اردو سے ملتی جلتی تھی اکثر ڈرامے موسیقی میں ادا کیے جاتے تھے۔ بیشتر ڈرامے پرارتھنا اور حمد و ثناء سے شروع ہوتے تھے جس میں ڈرامے کے بیشتر مترنم فنکار حصہ لیتے تھے۔ سید عباس علی کا تھیٹر زنانہ ہسپتال کے نزدیک ایک بڑے چبوترے پر ڈرامے اسٹیج کرتا تھا۔

غالباً ۱۹۲۰ء میں یہاں جوگندر سنگھ نامی سکھ کا وکٹوریہ تھیٹر پر مانند ہال حسین آگاہی میں آیا۔ یہ بہت بڑا تھیٹر تھا۔ اس میں تقریباً دس پردے تھے جن پر ہمہ قسم رنگا رنگ پہاڑ، دریا، شہر اور گلستان بنے ہوتے تھے۔ جنگل کے سین پر پردے کے ساتھ سر سبز شاخوں اور سبز پتوں والے فلاٹ استعمال کئے جاتے تھے تاکہ سین ہر زاویئے سے جنگل نما ہو اور ایکٹروں کے ملبوسات تقریباً ان کے کردار کے مطابق مہیا کئے جاتے تھے۔ اس تھیٹر میں تقریباً پچیس تیس ایکٹر کام کرتے تھے۔ یہ تھیٹر نور اسلام کا کھیل بڑے اہتمام سے کرتی تھی۔ اس کھیل میں روم کے عیسائی بادشاہ کے مسلمانوں پر مظالم دکھائے جاتے تھے اور آخری سین میں مسلمان ہیرو کے کودنے کا تھا کہ آگ گلزار ابراہیمی میں بدل جاتی تھی۔ جلتی آگ کا تختہ الٹ دیا جاتا تھا اور اس میں سے ایک چمکتا ہوا چمن برآمد کیا جاتا تھا جس میں ہمارا ہیرو گلال اور ابیر کی سبز گلابی اور عنابی کرنوں میں پھولوں کے جھولے پر سوار جھولتا نظر آتا تھا۔ شہر میں اس وقت اس کھیل کا بڑا چرچا تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ یہ کھیل دیکھنے کو جاتے تھے۔ ہال کی روشنی میرے لئے خیرہ کن تھی کیونکہ ان دنوں یہاں برقی روشنی نہ تھی اور ہماری آنکھیں زیادہ تر اندھیرے سے مانوس تھیں لیکن تھیٹر میں دس بارہ گیس لیمپ روشن ہونے کی وجہ سے چندھیا دینے والی روشنی میں اسٹیج پر ایکٹروں کے رنگا رنگ بھڑ کیلے لباس خوشنما نظر آتے تھے۔ اس تھیٹر میں باقر مرزا ایک مزاحیہ ایکٹر تھے۔ وہ دہلی سے تشریف لائے تھے۔ زمانہ گزرا ہے میں نے ان جیسا مزاحیہ ایکٹر نہیں دیکھا۔ لمبے قد، گورے رنگ کے مرزا نما آدمی تھے۔ عموماً پاجامہ قمیض اور سلیپر پہن کر اسٹیج پر آتے اور اگر چپ سادھ کر بھی کھڑے ہوتے تھے تو لوگ ہنسنے لگ جاتے تھے۔ مزاح گویا ان کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ اس کمپنی میں صادق نامی ایک نوجوان بہت بلند آواز گلوکار تھا جس کی کشش اکثر شائقین موسیقی کو کھینچ لاتی تھی۔ اس تھیٹر کی مقبولیت نے ملتان کے مشہور دیوان آتما نند شرر کو جو فطری طور پر ایک تھیٹریکل انسان تھے۔ اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس تھیٹر کو خرید لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے جوگندر سنگھ وکٹوریہ تھیٹر خرید لیا اور کچھ عرصہ ملتان میں نور اسلام اور آغا حشر مرحوم کے ڈرامے صید ہوس، سفید خون وغیرہ پیش کئے گئے اور پھر کمپنی کو لے کر کہیں اور چلے گئے۔

اتنے میں یہاں بمبئی کے مشہور سیٹھ حبیب کا تھیٹر پر مانند کے ہال میں وارد ہوا اور آتے ہی اپنا کھیل موہنی بی اے پیش کیا۔ عوام نے اس کھیل کو بے حد پسند کیا اور یہ ڈرامہ کم از کم دس بارہ دن پیش ہوتا رہا۔ اس ڈرامے میں موہنی کا پارٹ بمبئی کی ایک سرو قد نازنین سلومی نے پیش کیا۔ سلومی ایک آہو چشم پارسی لڑکی تھی۔ یہ اداکارہ واقعی اتنی حسین تھی کہ اسے دیکھنے سارا شہر امڈ آیا تھا۔ یہ ایک ماڈرن ایکٹریس تھی۔ قرمزی رنگ کی زرتار ساڑھی زیب تن کئے اور ایک نفیس بیگ ہاتھ میں لئے موہنی اسٹیج پر گاڑی سے اترتی تھی۔ واقعی ایک انجن دھواں اڑاتا گاڑی کو کھینچ کر اسٹیج پر لے آتا تھا اور موہنی ایک ادائے عشوہ طرازی کے ساتھ مسکراتی ہوئی ایک ڈبے سے پلیٹ فارم پر اترتی تھی۔ گاڑی کے پس منظر کے پردے پر اسٹیشن بنا ہوا تھا۔

اس تھیٹر میں قمر نامی ایک خوبصورت گلوکار بھی تھا۔ جس کی شکل ترک سالار انور پاشا سے ملتی جلتی تھی اور وہ اس تھیٹر کا سب سے سریلا گلوکار تھا۔ شیریں فرہاد کے کھیل میں فرہاد کا پارٹ ادا کرتا تھا۔ چہرے کی جاذبیت فطری

اداکاری اور رواں دواں موسیقی نے اس اداکار کو بھی شہرت کے پر لگائے تھے۔ اس تھیٹر کا ساز و سامان بھی بے انداز تھا۔ کوئی پندرہ سولہ کے قریب بڑے بڑے خوشنما پردے تھے اور اسی طرح سے چار گنا ان پردوں کے فلاٹ تھے۔ اور ڈریسنگ روم میں بھی لاتعداد پوشاکیں جگمگا رہی تھیں۔ فرنیچر بھی کافی تھا۔ اس تھیٹر میں تقریباً پچاس ساٹھ اداکار کام کرتے تھے۔ ان میں دو پارسی بہنیں فرخ شیریں اور کامگار شیریں ایک دوسرے سے بہت مشابہ تھیں یہ گورے رنگ کی چینی کی پتلیاں جب کالے لباس میں اسٹیج پر آتیں تو تماشائیوں میں ایک برقی رو دوڑ جاتی تھی۔ یہ دونوں بہنیں مل کر گانا گاتی تھیں۔ ان کی اردو بھی وہی بمبئی کی اردو تھی۔ لوگ جہاں ان کی زبان پر ہنستے تھے وہاں ان کی اداؤں پر مرتے تھے۔ اور ان میں چند دل جلے ایسے بھی تھے جو ٹھنڈی گرم آہوں کے ساتھ ساتھ ان پر پھولوں کے ہار اور روپے بھی نچھاور کرتے رہتے تھے لیکن میں نے یہ دیکھا تھا کہ اس وقت کے تماشائی آج کل کے تماشائیوں کے طرح سے چھچھورے پن کا ثبوت نہ دیتے تھے اور نہ اتنا شور مچاتے تھے بلکہ تہذیب کے دائرے میں رہ کر خاموشی سے پھولوں کے ہار اور روپے اسٹیج پر پھینکتے رہتے تھے۔ یہ ان کی زندہ دلی کی نشانی تھی۔ غل غپاڑہ بہت کم ہوتا تھا۔

یہ تھیٹر موہنی بی اے کے علاوہ اور بھی بہت اچھے ڈرامے "وامق عذرا، خون جگر، گل بکاؤلی، علی بابا، بغداد کا چور وغیرہ پیش کر کے تقریباً چھ مہینے بعد یہاں سے لاہور روانہ ہو گئی۔

۱۹۲۳ء میں گلوب تھیٹر بڑے انتظار کے بعد ملتان میں آیا۔ اس تھیٹر کا بڑا شہرہ تھا۔ اس دور کے لوگ تھیٹر میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ فٹبال اور تھیٹر کے علاوہ اور مشاغل کمیاب تھے۔ البتہ کبھی کبھار کوئی بڑا سرکس آ جاتا تھا۔ لیکن اس وقت کے مستانے لوگ تھیٹر کے دیوانے تھے۔ چنانچہ گلوب تھیٹر کی آمد پر شہر میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ اس تھیٹر میں کچھ دیکھے بھالے نامور اداکار ملازم تھے جو مختلف ڈراموں کے لئے مخصوص تھے۔ ڈراپ سین کا پہلا پردہ قرمزی رنگ کی مخمل کا تھا جس پر چھوٹے چھوٹے چمکدار موتیوں اور گوٹا کناری سے خوش آمدید لکھا ہوا تھا۔ بے شمار پردے تھے جن پر پینٹرز نے یقیناً بڑی محنت سے نایاب سین بنائے تھے۔ پہاڑ، صحرا اور دشت، پرتکلف بازار اور پرشکوہ عمارات اپنی اپنی جگہ خوب تھے۔ اور آرکسٹرا بھی خاصا مترنم تھا۔ پہلی رات اس کمپنی نے کھیل نازنین پیش کیا۔ نازنین کا پارٹ واحد نامی ایک نوعمر لڑکے نے ادا کیا۔ نہایت خوبصورت اور نفیس گورے رنگ کا یہ آہو چشم لکھنوی لڑکا بڑا جادوگر تھا۔ دلکشی اور اداکاری کا یہ عالم کہ تماشائی دم بخود نظر آتے تھے۔ نفاست یہ کہ عورتیں بھی یہ نہ پہچان سکیں کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ عشوہ و ادا کے دلدادگان نے اسے شہر آشوب قرار دیا۔ صبح شہر میں اس کا بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ نازنین نہایت پسندیدہ ڈرامہ تھا اور اداکار نہایت موزوں تھے۔ کھیل پاس ہو گیا اور تقریباً ایک ہفتہ چلتا رہا۔

(تاریخ ملتان - منشی عبدالرحمٰن خان)



کتابیات

1۔ سات دریاؤں کی سرزمین — ابنِ حنیف — فکشن ہاؤس لاہور 1997ء

2۔ ملتان قدیم وجدید — ارشد حسین ارشد — بزم ترقی ادب ملتان 1968ء

3۔ ارضِ ملتان — اکرام الحق شیخ — شعبہ نشرواشاعت الاکرام ملتان

4۔ تاریخ پاکستان قدیم دور — یحیٰی امجد — سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 1989ء

5۔ تواریخ ملتان — بالکشن بترا — ملتان 1926ء

6۔ تاریخ ملتان — کرم الٰہی بدر — رہبر ایجنسی لاہور 1978ء

7۔ سیرِ ملتان — رائے زادہ تیرتھ رام — آریہ سٹیم پریس لاہور 1916ء

8۔ جنگِ ملتان — سیّد غلام جیلانی — کوہِ نور پریس لاہور

9۔ تواریخ ضلع ملتان — منشی حکم چند — نیو امپیریل پریس لاہور 1884ء

10۔ ملتان کے صحافتی دفینے — حنیف چوہدری — سرائیکی ریسرچ سنٹر زکریا یونیورسٹی ملتان

11۔ نواب مظفر خان شہید اور اسکا عہد — عمر کمال خان — فاروقی کتب خانہ ملتان

12۔ ملتان ڈسٹرکٹ بار کی سو سالہ تاریخ — عمر کمال خان — بزم ثقاف ملتان 2008ء

13۔ ملتان لنگاہ دور میں — عمر کمال خان — بزم ثقافت ملتان 1995ء

14۔ ملتان ذی شان — منشی عبدالرحمٰن خان — عالمی ادارہ اشاعت علوم ملتان 1985ء

15۔ آئینہ ملتان — منشی عبدالرحمٰن خان — مکتبہ اشرف المعارف ملتان 1972ء

16۔ تصویر ملتان — خلیق ملتانی — بغداد الجدید عباسیہ اکاڈمی 1947ء

17۔ تاریخ ملتان (زمانہ قدیم سے 1947) پروفیسر ڈاکٹر محمد عاشق خان درانی، بزم ثقافت ملتان 2007ء

18۔ ملتان ماضی وحال کے آئینے میں — سیّد سبطین گیلانی — بیکن بکس ملتان 1994ء

19۔ ملتان — ڈاکٹر مہر عبدالحق — پنجابی ادبی بورڈ 1980ء

20۔ ملتان کے بادشاہ، نامور گورنر اور حملہ آور۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق بیکن بکس ملتان 1994ء

21۔ نقش ملتان (جلد اوّل) علامہ عتیق فکری فکری اکیڈمی ملتان 1982ء

22۔ نقش ملتان (جلد دوم) علامہ عتیق فکری فکری اکیڈمی ملتان 1987ء

23۔ میرے زمانے کا ملتان فاروق انصاری بزم ثقافت ملتان 2007ء

24۔ سرزمین ملتان مولانا نور احمد خان فریدی۔ قصر الادب ملتان 1976ء

25۔ تاریخ ملتان مولانا نور احمد خان فریدی۔ قصر الادب ملتان 1977ء

26۔ ملتان اور مؤرخین مولانا نور احمد خان فریدی۔ قصر الادب ملتان 1985ء

27۔ تاریخ ملتان سیّد عباس حسین گردیزی سیّد حُر ریاحی گردیزی شاہ گردیز ملتان

28۔ ملتان کی ابتدائی تاریخ سیّد محمد لطیف مترجم ریحان اقبال سرائیکی ریسرچ سنٹر ملتان

29۔ ملتان کی قدیم تاریخ سیّد محمد لطیف مترجم جمشید اقبال بیکن بکس ملتان 2006ء

30۔ ملتان نامہ محمد اسلم میتلا سرائیکی ریسرچ سنٹر 2005ء

31۔ دیکھ لیا ملتان ڈاکٹر سیّد زاہد علی واسطی بیکن بکس ملتان 2002ء

32۔ تذکرۃ الملتان سیّد روشن شاہ یوسف سابع
مترجم ڈاکٹر بشیر انور سرائیکی ریسرچ سنٹر ملتان 2004ء

33۔ مرقع ملتان سیّد محمد اولاد علی گیلانی فیروز پرنٹنگ پریس لاہور 1938ء

34۔ ملتان تہذیب و ثقافت کے آئینے میں ملک منیر احمد بھٹہ جھوک پبلشرز ملتان 1999ء

35۔ ملتانیات سیّد سبطین گیلانی کتاب نگر ملتان 2006ء

36۔ ملتان اُردو کی جنم بھومی شبیر حسن اختر بزم ثقافت ملتان 2005ء

37۔ ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی
میں صوفیائے کرام کا حصہ ڈاکٹر روبینہ ترین بیکن بکس ملتان 1986ء

38۔ ملتان بحثیت ادبی مرکز فارسی ڈاکٹر رفیع الدین احمد کاظمی لکھنؤ 1991ء

39۔ مقالات ملتان زاہد سلیم گوندل سخن ور فورم 2013ء

40۔ ملتان میں اُردو نثر کا آغاز و ارتقا ڈاکٹر عذرا شوذب بزم ثقافت ملتان 2009ء

41۔ آگہی کے شہر میں ڈاکٹر عذرا شوذب بزم ثقافت ملتان 2009ء

42۔ خلاصۃ العارفین مترجم ڈاکٹر محمد بشیر انور بیکن بکس ملتان 2003ء

43۔ حضرت شاہ یوسف گردیز اور حضرت شاہ شمس سبزواری — شاکر حسین شاکر — کتاب نگر ملتان 2007ء

44۔ معاشر ملتان — حفیظ خان — ملتان انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ

45۔ یادِ ماضی — فاروق انصاری — بزم ثقافت ملتان 2005ء

46۔ ملتان عکس وتحریر — شاکر حسین شاکر — سخن ورفورم ملتان 2011ء

47۔ فائل روزنامہ جنگ ملتان۔لاہور

48۔ فائل روزنامہ نوائے وقت ملتان۔لاہور

49۔ فائل روزنامہ خبریں ملتان


50۔ فائل روزنامہ پاکستان ملتان

51۔ فائل روزنامہ امروز ملتان

52۔ ماہنامہ رابطہ کراچی

53۔ ماہنامہ آستانہ زکریا ملتان




ملتان۔ دائم آباد
(ملتان۔ تاریخ، ادب، ثقافت اور تصوف)
خلیل احمد